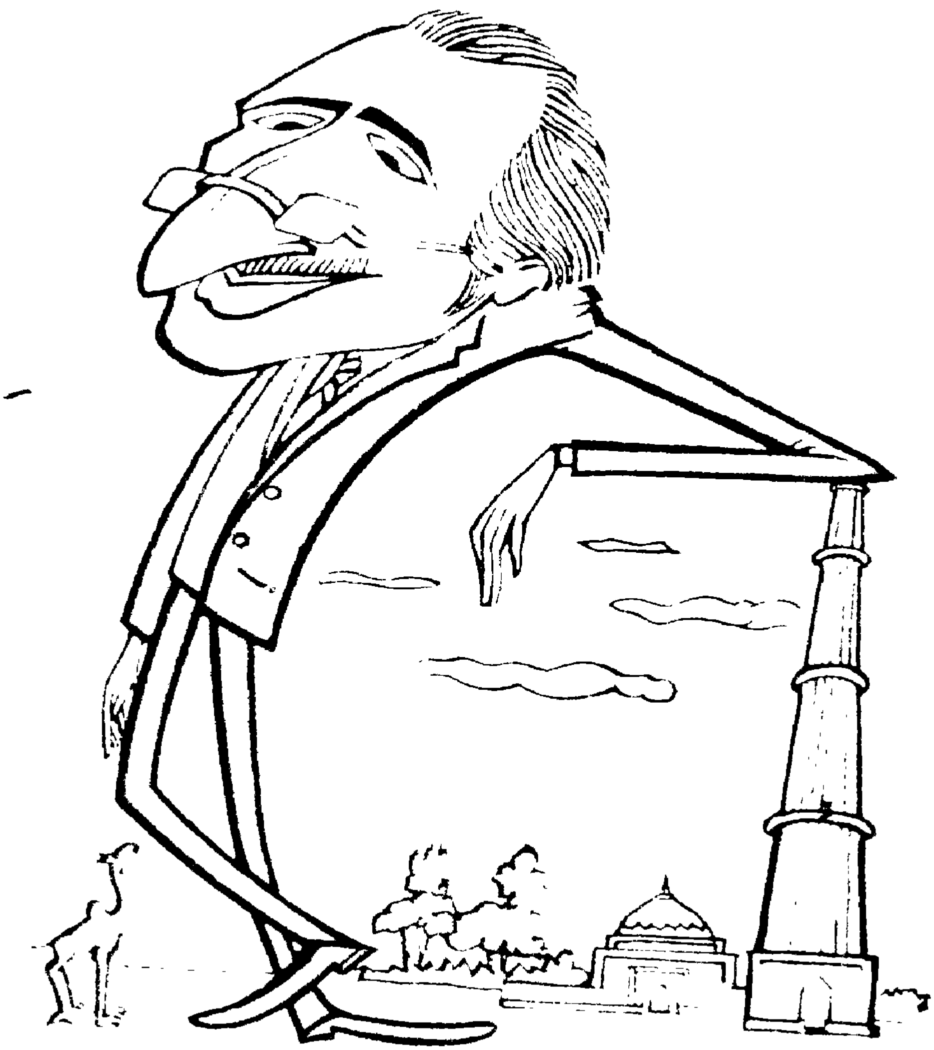


کنھیا لال کپور



KANAHYALAL KAP



Guest Editor
KHAWJA ABDUL GHAFOOR

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

ـنامہ

مہمان مدیر: خواجہ عبدالغفور

کنہیا لال کپور نمبر

: ۱۴
: ۱
ری ۱۹۸۱ء

ایڈیٹر:
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ، منظور احمد، مسیح انجم

مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

ز ۲۵ روپے
بیرونِ ہند سے ۳۵ شلنگ

فی پرچہ: (۵) روپے
ق: سعادت علی خاں
منیجر: سمیع جلیل

ڈنگ: محترمہ بک بائنڈنگ ورکس، پرانی حویلی حیدرآباد ★ طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۲

خط و کتابت کا پتہ: ۱۳۱- بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد: فون: 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد

ڈسٹری بیوٹرس برائے:

۱۔ موہن میکن بریوریز ۲۔ انڈین ییسٹ کمپنی لمیٹڈ ۳۔ ہمدرد، روح افزا

۴۔ پانی پت فوڈ پراڈکٹس ۵۔ ڈبرو فوڈ پراڈکٹس ۶۔ کیننگ انڈسٹریز ٹر

۷۔ سورنا فوڈ پراڈکٹس ۸۔ ہارکو، سری نگر ۹۔ ڈرک بھوٹان فوڈ پراڈکٹ

۱۰۔ سیڈونا کیننگ کمپنی وغیرہ



سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچئے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لئے اس کے ڈبے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے

تیار کنندگان:

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس گلزار حوض حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

سنگ وخشت (تنقید)

گردِ کارواں (سوانح)

شیشہ وتیشہ (شخصیت۔تاثرات)

بال و پَر (انٹرویو)

چنگ ورباب (انتخاب کپور)

انتخاب کالم ــ میں دیکھتا چلا گیا

... نمبر

نام : کنہیا لال کپور
والد : شری لالہ ہری رام کپور
والدہ : شریمتی دیوکی کپور
تاریخ پیدائش : ۲۷ جون ۱۹۱۰ء
مقام پیدائش : چک ۴۱۱ ، تحصیل سندری ، ضلع لائل پور (پاکستان)
ذات : کھتری

تعلیم : ایم ۔ اے (انگریزی)
پیشہ : درس و تدریس (پرنسپل ڈگری کالج)
اولادیں : سات (تین لڑکے اور چار لڑکیاں)
تصانیف : سات (سنگ و خشت ، شیشہ و تیشہ ، چنگ و رباب ' نوک نشتر ، بال و پر ' نرم گرم ، گرد کارواں)
وفات : ۵ رمئی ۱۹۸۰ء بمقام پونا

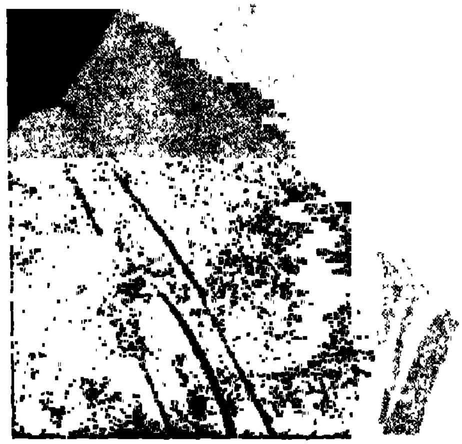
مکرمی جناب بھارت چند کھنہ صاحب!

تسلیم - آپکا نوازش نامہ ملا۔ آپ نے حسب معمول زندہ دلان حیدرآباد کے سالانہ ادبی اجلاس کی صدارت کے لئے خاکسار کو مدعو کیا ہے ۔ حسبِ معمول میری صحت اجازت نہیں دیتی کہ آپ کے حکم کی تعمیل کروں - معذرت چاہتا ہوں - خط کا جواب کافی دنوں کے بعد دے رہا ہوں - تاکہ آپ اندازہ کر سکیں جو شخص بیس دن میں خط کا جواب بھجواتا ہے - وہ بھلا صدارت کے لئے کسطرح موزوں ہے - بہر حال سخت شرمندہ ہوں - اور دوبارہ معذرت خواہ بھی - خدا زندہ دلان حیدرآباد کو خوش اور سلامت رکھے یہ آپکا بھجوایا ہوا تیرھواں دعوت نامہ تھا -

آپکا

کنہیا لال کپور

عکس تحریر : جناب کنہیا لال کپور



انتقال سے چند دن قبل لی گئیں تصویریں





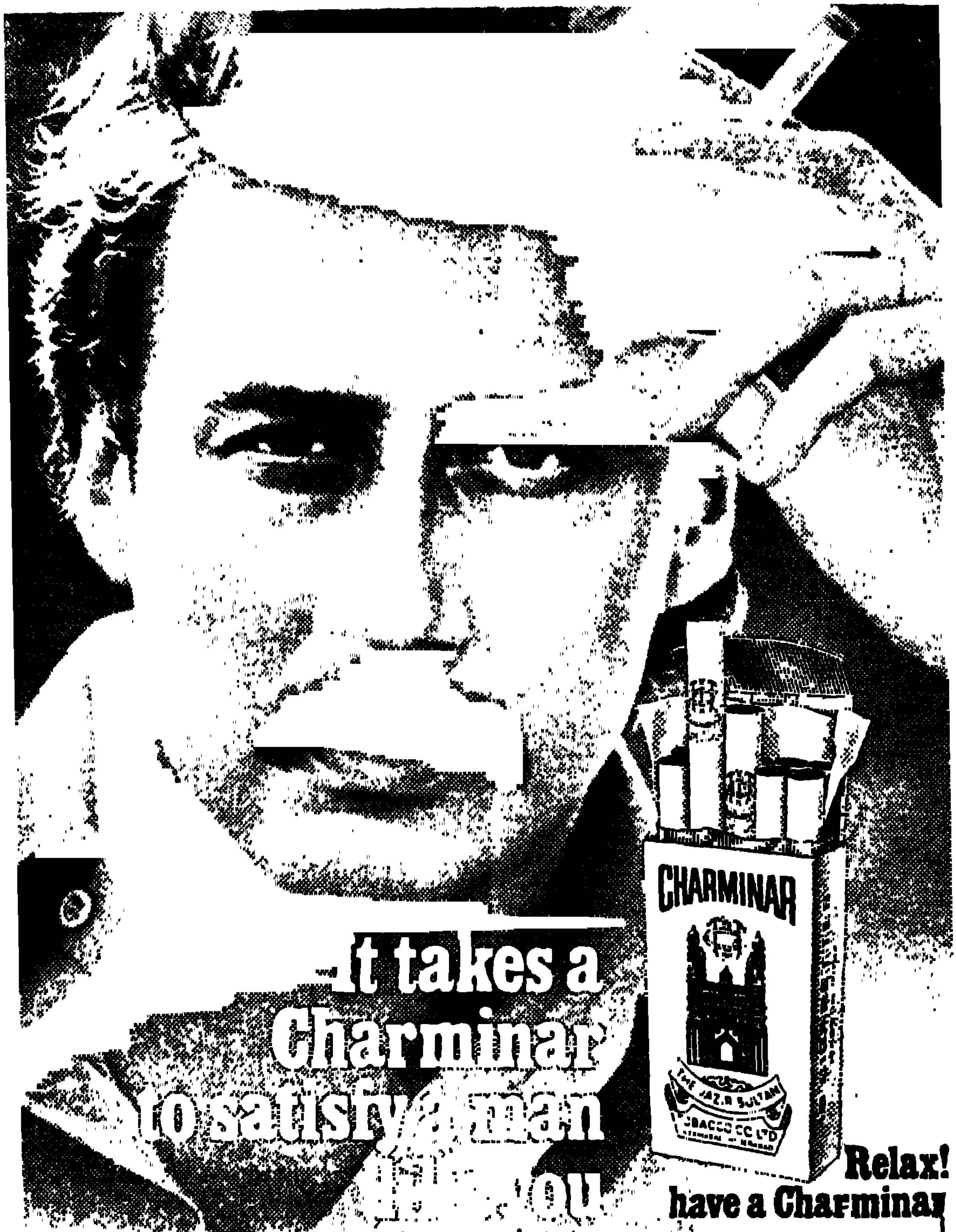




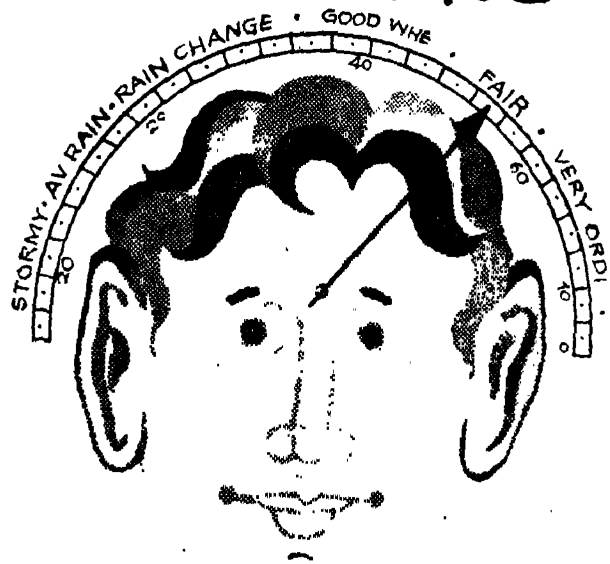
مہاراشٹرا اردو اکیڈمی کے زیرِ اہتمام اپریل ۸۰ء میں منعقدہ جلسہ میں
(دائیں سے بائیں) خواجہ عبدالغفور، انتظار حسین، ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا، احمد ہمیش، کنہیا لال کپور اور مجتبیٰ حسین



پرنسپل کپور، اپنے کالج کے طلبا کو مخاطب کر رہے ہیں۔


t takes a
Charminar
to satisfy a man
CHARMINAR
Relax!
have a Charminar

آپ بھی
انسانی بادپیما بن سکتے ہیں



اور اپنے درد و تکلیف کے ذریعہ
آندھی وطوفان کی پیش قیاسی کر سکتے ہیں!



واپیہ طبی تحقیقات سے اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ فضائی دباؤ کا تغیر و تبدل انسانی شریانوں میں موجود پانی کی مقدار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جب ہوا کے دباؤ میں کمی آجاتی ہے جیسا کہ طوفان سے قبل ہوا کرتا ہے تو پانی کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً شریانیں سوج جاتی ہے جس کی بنا پر جوڑوں میں درد شروع ہو جاتا ہے۔

بدقسمتی سے اگر آپ سوزش شرائین میں مبتلا ہو جائیں تو آپ خود اس کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ چاہے یہ درد کیسا ہی ہو **زندہ بام** اسکو رفع کرنے میں مدد دیتا ہے یہ اسلئے بنایا گیا ہے کہ اسکو سوزش شرائین کے شدید درد کے ازالہ کیلئے ہی تیار کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ یہ درد سر، جسمانی درد اعصابی درد، نزلہ، زکام، کھانسی اور اسی قبیل کے امراض کیلئے بھی مفید ہے۔ اور کیا چاہیئے! چونکہ آپ زندہ بام صرف بیرونی طور پر استعمال کرتے ہیں اسلئے آپ ترشہ کی بنیاد پر آپکے خون کے ذرات میں بگاڑ پیدا کرنیکا خطرہ نہیں مول لے سکتے ہیں!

اس پر غور کیجیئے!

زندہ بام
درد کا محفوظ و موثر
نجات دہندہ

کارخانہ زندہ طلسمات
عنبر پیٹھ - حیدرآباد ۵۰۰۰۱۳

AA/KZT/1129

باقر مہدی

عجوبی کپور کا ایک نامکمل مطالعہ

مجھے کنہیالال کپور کی تحریروں میں ایک طرح کی مقناطیسی کشش ملتی ہے۔ شاید یہ کشش اُن کے بے لوث طنز میں عیاں و پنہاں ہے۔ مدتیں گزریں ادم پرکاش نے انھیں "بچھو" کے لقب سے یاد کیا تھا اور لکھا تھا:

> "اس کے طنز و مزاح کا سب سے بڑا مرکز خود اس کی شخصیت ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں کو کبھی نہیں چھپاتا بلکہ انھیں منظر عام پر لاتا ہے۔ ان پر لوگوں کو ہنسنے کی دعوت دیتا ہے اور نہ صرف خود اس ہنسی میں شریک ہوتا ہے بلکہ اس کا قہقہہ سب سے بلند ہوتا ہے اس کی "اینٹیں اور پتھر" لوگوں کو ہی نشانہ نہیں بناتے بلکہ وہ خود اپنے آپ کو بھی ان کا نشانہ بناتا ہے۔ وہ دُنیا کو آئینہ ضرور دکھاتا ہے تاکہ وہ اپنے چہرے کے بدنما دھبے اس میں دیکھ سکیں مگر وہ اس آئینہ میں خود اپنا چہرہ دیکھنے میں بھی باک نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ گم راہ خضر ہے جس کا کام دوسروں کو راہ دکھانا بھی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ادب کے تہہ خانے میں جدید ترین بچھو ہے اور اردو طنز کی لغت میں حرفِ اوّل اور (فی الحال) شاید حرفِ آخر بھی"
>
> ("چنگ و رباب" ص ۱۴۰ - ۱۵)

مگر کپور ایک ایسا بچھو ہے جس کے کئی ڈنک ہیں۔ اس کا زہر فوری اثر کرتا ہے اور قیامت ہے کہ یہ اثر دیرپا بھی ثابت ہوا ہے ایک معنی میں کپور اردو کا وہ محبوب ہے جو خود قاتل بھی اور قتیل بھی ہے اور اس کے دلربائی کے عناصر ترکیبی تبسم، زہرخند، نشترزنی پہلو دار وار اور سب سے بڑی بے ساختگی اور نرالے شعور کے ساتھ یعنی کپور ایک ساتھ شریر بچہ بھی ہے اور ایک تجربہ کار شمشیر زن۔ مجھے اس کی کتابیں پڑھتے ہوئے بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ان تحریروں کے پیچھے محرک "عبقری شخصیت" کو دیکھوں، وہ شخصیت جو احساس برتری اور احساس کمتری کی دیواریں توڑ کر تعمیر ہوتی ہے؟ وہ نظر جو پتھر کا جگر چیر کر پیدا ہوتی ہے۔

اور اپنے سارے شرارے بھی رکھتی ہے۔ عرصہ ہوا میں نے ایک شعر لکھا تھا ؎

خود اپنے آپ پہ ہنسنے کا فن سکھا مجھ کو
خدا بنا کے فرشتوں سے پھر لڑا مجھ کو

مجھے تو فرشتوں سے لڑنے کی توفیق نہ ملی مگر کپور نے "خدا" اس کے فرشتوں اور انسانوں کا قلع قمع بھی کیا ہے۔ اور جی بھر کر ہنسایا بھی ہے کپور کے "فارمولا" کا عطر نہیں نکالا جا سکتا اس لئے کہ اس پودے میں ایک ساتھ کیکٹس گلاب، جوہی اور نہ جانے کتنے بے نام شہری جنگلی پھولوں کے خوشے ہیں۔ زہر میں شیرینی، شیرینی میں نشہ، نشہ میں وہ تبسم زیر لب کا سرور ملتا ہے جس کا تجزیہ کوئی عطار (نقاد) نہیں کر سکتا اور غضب یہ ہے کہ کپور کو اس کا علم بھی تھا اسی لئے اس نے کبھی اپنا ڈھول نہیں پیٹا کیونکہ وہ طنز نگار اگر یہ کام کرے تو ڈفلی والا بن جاتا ہے۔ کپور صرف ڈھول کے پول سے ہی واقف نہیں تھا بلکہ وہ "بہانگ دہل" کارناموں کو بھی خوب سمجھتا تھا ورنہ وہ اپنی قبر کے کتبے پر یہ شعر نہ لکھواتا ؎

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

اپنے مضمون "اردو ادب کا آخری دور" میں اپنا مختصر تعارف کپور نے "فرحت بخش زہرناکی" سے یوں کرایا تھا:

"طنز نگار تھے یا کم از کم سمجھتے تھے کہ طنز نگار ہیں آپ کی ذات صنفِ طنز پر سب سے بڑی طنز تھی صرف ایک کام کا مضمون لکھا جو "غالب جدید شعراء کی ایک مجلس میں" کے عنوان سے مشہور ہوا۔ بقول اعجاز بٹالوی ان کا پیشہ اوائل عمر میں پگڑی اچھالنا اور وقتِ پیری میں پگڑی بندھوانا تھا۔

پاکستان سے بھاگنے کے بعد فیروز پور کی ایک ٹوٹی پھوٹی مسجد میں پناہ لی اور آخری عمر میں مسلمان ہونے پر اظہارِ تاسف کرتے رہے صحیح زبان لکھنے کی کئی بار کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ عالم شباب میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے قبر میں دو چار دفعہ اٹھنے کی سعی کی لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ... مقبرہ موگا میں بنا لوح

تربت پر یہ شعر کندہ تھا ؎ کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

کنہیالال کپور کا یہ مضمون ایک طرف تو اردو کے پرانے تذکروں کی ہنسی اڑاتا ہے تو دوسری طرف خود مصنف کو "پارہ پارہ" کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی "حالت" پر بھی "نشتر کے آنسو" ٹپکاتا ہے، یہی نہیں اس کے طنز میں وہ دل خراش آہ بھی چھپی ہوئی ہے جو مظلوم کے تبسم میں عیاں ہوتی ہے۔ سیدھا سادا تعارف نہیں ہے۔ اس میں ان ناقدوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے جو کپور کی ساری ادبی اہمیت ایک ہی مضمون سے منسلک کئے ہوئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ کپور نہایت ہی بے باک، شگفتہ بیان اور نوکیلے اسلوب نگارش کے مالک تھے جبھی تو وہ ایک مختصر سے

مضمون میں اردو کی عام حالت، مسلمانوں کی زبوں حالی، طنز کی زندگی میں اہمیت اور سب سے بڑھ کر اس جراءت آمیز دردمندی کا اظہار کرتے ہیں جس کو صرف طنزِ ملیح کے نام سے نہیں یاد کیا جا سکتا ہے۔ یہ طنزِ ملیح، نوحہ، قہقہہ، آنسو اور ان دیکھے زخموں کی سوزش سے مرکب ہے اثر انگیز بھی ہوتا ہے اور دیرپا بھی رہتا ہے۔

نقوش کا "طنز و مزاح نمبر" کا مطالعہ، یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ کپور کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے مگر ان کا وہی مشہور مضمون منتخب کر کے مرتب نے ان کی ادبی اہمیت کو سبک کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے کہ "غالب جدید شعراء کی ایک مجلس میں" کپور کی صرف ایک خوبی کو پیش کرتا ہے یعنی پیروڈی جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ وہ لاکھ سخنی سہی مگر کسی 'دلیر قامت' شخصیت سے کم نہیں تھے یہ تو ہماری تنقید کی کم ظرفی ہے جس نے پطرس اور رشید احمد صدیقی کو سر پر چڑھایا اور کنہیا لال کپور کو بڑی حد تک نظر انداز کیا اردو کے نامور ناقد یعنی کلیم الدین احمد، احتشام حسین اور آل احمد سرور نے ان کی تحریروں کا جائزہ نہ لیا۔ ہمارے دوست مجتبیٰ حسین کہتے ہیں کہ "اردو مزاح کا قطب مینار گر گیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تو وہ اَدھوری حقیقت بیان کرتے ہیں اس لئے کہ کنہیا لال کپور تو "قطب مینار" قسم کی شخصیت بن ہی نہیں سکتے تھے اس لئے کہ "بلند شخصیت" میں وہ لچک نہیں ہوتی جو کہ ایک طنز نگار کے لئے ازبس ضروری قرار دی گئی ہے ہاں ان کو یگانہ کے اس شعر کے آئینے میں سمجھا جا سکتا ہے۔

بلند ہو تو کھلے مجھ پہ زور پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

اور مزاح اور طنز نگار، بڑے بڑوں کی "لغزشِ پا" کو ہی اپنا نشانہ بناتا ہے یعنی وہ "بڑوں" کو اپنی بلندی سے دیکھتا ہے اور اپنے لئے بقول غالب ایک نیا منظر بناتا ہے کپور کو بھی لاہور سے ویسا ہی "عشق" تھا جیسا کہ رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ سے مگر رشید صاحب کو ان کے شاگردوں اور اقبالیوں نے بہت بلند مقام عطا کیا اور کپور کا اپنا حلقہ نہ تھا وہ یک تنہا مردِ میدان تھا اس کے سب دوست تھے اور سب دشمن کہ یہی اعلیٰ فنکار کا وطیرہ رہا ہے اسی لئے کپور کو برسہا برس سے نظر انداز کیا جا رہا ہے پاکستانی ناقدروں سے کیا شکایت کہ کپور ایک کافر تھا اصلی معنوں میں اور دوسرے وہ کھلم کھلا اپنے ملحد ہونے کا اعلان کرتا تھا۔ ایسے "طنز نگار" کو کوئی کیوں اپنائے؟ اس لئے کہ اپنی ساری رواداری کے باوجود اردو کا حلقہ خاصا دقیانوسی تھا اور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کپور کی زندگی اور ان کی موت کے بعد کوئی بھی اعلیٰ درجہ کا مضمون نہیں لکھا گیا ان پر لکھنے سے نہ شہرت کی توقع کی جا سکتی ہے اور نہ انعام کی اور مغرب کی طرح ہمارا ماحول بھی تجارتی ہے۔ کپور کا کون مول اٹھائے گا؟

میں کنہیا لال کپور کی کتابوں کا کیا جائزہ لے سکتا ہوں؟ میرے پاس نہ تو وہ تنقیدی آلات، اصطلاحات اور سانچے ہیں جن میں کپور کو قید کر کے ان پر عملِ جراحی کیا جائے۔ اور نہ وہ نظر ہے جو ایک ساتھ پہاڑ اور گلہری

کے دل کو چیر کر ہیرا نکال لائے: بس تو صرف ان کے مضامین کے بارے میں چند صفحات لکھنے کی "جراءتِ طفلاں" کرسکتا ہوں اس لیے کہ کپور کے اندر بیک وقت ایک شاعر، ایک افسانہ نگار، ایک طنز نگار، ایک فنکار، ایک مصلح، ایک اعلیٰ درجہ کا صحافی، ایک انشائیہ نگار، ایک نہایت شگفتہ 'داستاں گو' وغیرہ چھپے ہوئے ہیں۔ اتنے جناتوں کو ایک بوتل سے نکال کر ان کو الگ الگ خانوں میں بند کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے اور پھر ہر "جنات" سے اس کے کارناموں کی داستانیں سننا اور ان کا تجزیہ کرنا یہ تو "بقول شاعر" یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے "۔ مگر ایک وعدہ نبھانا ہے اور ان کے مضامین کا ایک تجزیہ کرنے کی کوشش ناتمام کرسکتا ہوں جو کہ خلش کو اور بڑھا دے کیا پتہ کل کوئی ایسا ناقد پیدا ہو جو کپور کی ادبی اہمیت کا مکمل جائزہ لے سکے؟ کیا پتہ!؟

کپور کی پہلی کتاب "سنگ وخشت" پڑھتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ پہلی بار پڑھنے کے بعد جس شئے نے مجھے اس کو دوبار پڑھنے کی ترغیب دلائی تھی وہ تھا ان کا ہندوستان کی سماجی فضا کا بے باکانہ تجزیہ ــــ یعنی وہ ماحول جس میں ہم نے پرورش پائی ہے تعصبات اور توہمات کے تانے بانے سے بنی ہوئی خوں ریز فضا ــــــــ اور وہ خونی فضا آج بھی چھائی ہوئی ہے۔ کپور مشترکہ تہذیب کے قتیل ہیں اسی لئے وہ اس کو مجروح ہوتے دیکھتے ہیں تو طنز ملیح کے نازک آلہ کو چھوڑ کر "خدا لگتی" کہنے لگتے ہیں اس لئے کہ طنز صبر کو ہضم کرنے کے بعد ہی اُبھرتا ہے۔ "سنگ وخشت" کے مضامین میں بڑا تنوّع ہے۔ ان مضامین کو "نوجوانی کی لغزشیں" کہہ کر ٹالا نہیں جاسکتا۔ "سنگ وخشت" اصل میں کپور کے کارناموں کی اولین خشت ہے اور اسی مرکز سے وہ سنگ باری کی ابتدا کرتے ہیں اس میں یوں تو سولہ مضامین شامل ہیں مگر وہ اپنا "پہلا پتھر" تعارف ہی میں نشانے پر جا دیتے ہیں۔ کپور نے پہلی بار اپنا تعارف یوں کرایا تھا۔

> " نام کنہیا لال کپور۔ مگر بہت کم احباب مجھے اس نام کی رعایت سے جانتے ہیں۔ قد چھ فٹ اہلِ زبان سا دل و دماغ تو نہیں البتہ جسم ضرور رکھتا ہوں۔

پیش لفظ میں اپنے فن کا تعارف بھی خاصے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔

> " اب رہا سوال یہ کہ میں مزاح نگار ہوں یا طنز نگار، اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ میں ابھی کچھ نہیں ممکن ہے کہ اگر پانچ سات برس کسی دہلوی استاد سے اردو پڑھوں اور اتنے ہی برس کسی لکھنوی ماہر فن سے اصلاح لوں اس کے بعد پچھلی شہر، ملیح آباد، فتح پور اور گونڈہ کی زیارت کروں کہ ان میں سے ہر شہر علم و ادب کا مکہ ہے تو شاید کچھ بن جاؤں مگر یہ شاید ایک نہایت مبہم اور موہوم شاید ہے "

اس مختصر سے تعارف میں ان کا مزاح اور طنز دونوں ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں مگر ان کے ابتدائی مضامین میں بھی آہستہ آہستہ طنز و مزاح سے قدم آگے ہی رہتا ہے اور آخری مضمون "اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے" میں اکثر جگہ تنہا طنز کی کارفرمائی نظر آتی ہے اس لیے کہ کپور لاکھ چاہیں کہ خندہ پیشانی سے صرف مسکرا دیں ان کے تبسم میں زہرناکی اُبھر ہی آتی ہے اور اس طرح اپنا وار کر جاتے ہیں۔ "ریڈیو خریدا ہے" ان کا مضمون آج کچھ طفلاں،

معلوم ہوتا ہے اس لیئے اب یہ "لعنت" ہر گھر کی رونق بن چکی ہے اور انھوں نے (TV) ٹی۔وی پر اپنا وار نہیں چلایا۔ ورنہ ریڈیو کے بجائے اب ٹی۔وی بھی "گلے کا ہار" بنی ہوئی ہے ۔ان کا ایک مضمون "بڑے آدمی" آج بھی تر و تازہ ہے خاص کر جب وہ یہ لکھتے ہیں :

" یہ کہ بڑے آدمی کو سوائے دو باتوں کے اور کسی قسم کی فکر نہیں ہوتی اول یہ کہ اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھالیا ہے دوسرے یہ کہ اس کے کُتّے نے پیٹ بھر کر کھانا کھالیا ہے کیونکہ اس کے خیال میں دنیا میں صرف دو جاندار بستے ہیں' وہ اور اس کا کتّا۔اس کے علاوہ بڑے آدمیوں میں یہ خوبی ہے کہ وہ دماغ کے بغیر گزارہ کرسکتے ہیں کیونکہ نہ انھیں سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی وہ کچھ سوچنا چاہتے ہیں۔ان کے پاس سونے کے لئے متعدد "دماغی قلیے" ہوتے ہیں۔"

کپور' یہاں اُن حضرات کو اپنا نشانہ بنا رہے ہیں جو سماجی مرتبہ حاصل کر چکے ہیں اور یہ ماحول آج بھی قائم ہے ان کی جگہ وزیروں نے لے لی ہے غرض کہ کپور کا طنز اپنی جگہ پر اب بھی وار کرتا ہے اور یہ بات کہ طنز نگار کے وار "برسر قلم" ہوتے ہیں تو یہ بھی "خندۂ بے جا" ہے طنز' زخم لگاتا ہے مگر نشان نہیں چھوڑتا آدمی دل مسوس کر رہ جاتا ہے' پھر ہمارے ماحول کا موٹی کھال والا بڑا آدمی۔جی اسی پر تو مشہور کارٹونسٹ لکشمن روز وار کرتا ہے۔یہ "بڑا آدمی" ہر روز اخبار میں اسی وار کا انتظار کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ "بے حسی" اتنی فزوں تر ہے کہ تلوار بھی سوئی کی طرح چبھنے لگی ہے اسی لئے طنز نگار اپنا وار کرتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اب "موٹی کھال" پہ زخم بھی نہیں لگتے ہیں مگر کپور کبھی کھسیانی ہنسی نہیں ہنستے اور نہ کھمبے نوچتے ہیں البتہ اپنا نشانہ بدل دیتے ہیں "سنگ وخشت" میں " رہیئے اب ایسی جگہ چل کر" ایک پُر لطف مضمون ہے اور آج بھی پڑھا جاسکتا ہے کپور کے پاس ایسے درجنوں مضامین ہیں اسی لئے میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ایک مضمون کپور کے کمال فن کے لیئے کافی نہیں ہے۔اس مضمون میں ایک سوشلسٹ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ آج ترقی پسندوں پر لاگو نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ "خطرناک" نہیں ہے۔"

" ہمارے ایک اور ہمسائے ہیں جو سوشلسٹ واقع ہوتے ہیں۔آپ ہر وقت مہیب اور خطرناک الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں مثلاً زلزلہ آئے گا۔ایک زبردست طوفان اُٹھے گا۔بجلیاں کڑکیں گی۔خون کی ندیاں بہہ نکلیں گی آپ کو ناز ہے کہ آپ نے سوشلزم کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ آپ نے آج تک صرف لینن کی سوانح عمری پڑھی ہے اور وہ سوانح عمری جس کا روسی زبان سے فرانسیسی، فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوا ہے۔اپنی ہر تقریر کا آغاز ماسکو سے کرتے ہیں۔"

کپور اپنوں اور غیروں پر طنز کرتے ہوئے رو رعایت نہیں کرتے۔وہ ان طنز نگاروں میں ہیں جو بغیر زد پہ لیئے موقع ملتے ہی وار کر جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ کپور کا تنقیدی شعور بھی بہت بلند ہے اپنے ایک

مضمون "اردو افسانہ نویسی کے چند نمونے" میں انھوں نے "اردو افسانے" کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے ہیں خاص کر ترقی پسند افسانے کے بارے میں بہت سی 'خرافاتی' باتیں لکھی گئی ہیں۔ آج جبکہ افسانہ پر بحث کا بازار گرم ہے ان کا یہ مضمون اور بھی لطف دیتا ہے تمہید کے چند جملے ملاحظہ ہوں :

"آج کل شعراء کی جگہ افسانہ نویسیوں نے لے لی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہمیں مرحوم علامہ اقبال کا نعم البدل نہیں مل سکا لیکن مرحوم منشی پریم چند کے ایک سے زیادہ جانشین پیدا ہو چکے ہیں ___ اور اس کے بعد کپور نے افسانوں کے نمونے پیش کئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ آزادی سے پہلے کے افسانوی دور پر طنز تھا، مگر اردو افسانوں کو آج بھی پرانے وار سے "مجروح" نہیں تو ہدف ملامت ضرور بنایا جا سکتا ہے آخر آدمی جب پرانے مضامین پڑھتا ہے تو ان میں کیا تلاش کرتا ہے ؟ یہی نہ کہ وہ "زنگ آلودہ" ہونے کے بعد بھی تفنن طبع کا سامان مہیا کرتے ہیں یا نہیں؟

اس نقطۂ نظر سے سنگ وخشت کا مطالعہ آدمی کو کپور کا "گرویدہ" بنا دیتا ہے مجھے تو آج بھی ان میں تازگی کی جھلکیاں نظر آئیں یعنی زردی میں چھپی ہریالی ۔ یہ صحیح ہے کہ کتاب کا سب سے اچھا مضمون "غالب جدید شعراء کی مجلس میں" ہے اور اس مضمون کی کامیابی اس کی لاجواب پیروڈی میں ہے جو "حقیقی شاعری" کی سطح پر پہنچ کر خندہ زنی کرتی ہے۔ اس مضمون کو شائع ہوئے تقریباً ۳۵ سال گزر گئے مگر اس کی لطافت آج بھی بڑی حد تک باقی ہے اس لئے کہ کپور کے فن میں ایک تیکھا شاعر بھی چھپا ہوا تھا جب ہی تو وہ فیض کی نہایت خوبصورت نظم کی اتنی اچھی پیروڈی کر گئے۔ عزیز احمد نے ترقی پسند ادب (مطبوعہ مارچ ۱۹۴۵ء) میں صرف کنہیا لال کپور ہی کا ذکر کیا ہے اور سنگ وخشت کے دو مضامین جدید افسانہ نویسی کے چند نمونے اور غالب جدید شعراء کی ایک مجلس میں کو "اہم ترین مضامین" قرار دیئے۔ میں نے یہ مضمون بارہا پڑھا ہے جدید شاعری کو ہدف ملامت بنانا آسان ہے اس لیے کہ ابتدائی جدید شاعری کے نمونے خود کو نشانہ بننے کے لئے پیش بھی کرتے تھے لطف تو جب آتا ہے کہ اچھی جدید نظموں کی پیروڈی یوں کی جائے کہ شاعری کے مضحک پہلوؤں کے ساتھ ساتھ شعری محاسن بھی ابھر آئیں راشد کی نظم کی پیروڈی مشہور نہ ہوئی مگر یہ بھی اعلیٰ درجہ کی نظم ہے اس نظم میں کپور نے راشد کی کئی نظموں — 'انتقام' وغیرہ کو ملا کر ایک خوبصورت پیروڈی بنائی ہے۔ اس نظم میں راشد کا ابتدائی لب ولہجہ استعارے اور پیکر تراشی کی بڑی خوبی سے "نقل اتاری" ہے خاص کر یہ بند ملاحظہ ہو !

آ مری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
تاکہ میں چوم ہی لوں عارضِ گلفام ترا
اور اربابِ وطن کو یہ اشارہ کر دوں
اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شبِ عیش گزر جانے پر بہرِ جمع درم و دام نکل جاتا ہے
چھوڑ کر بستر سنجاب وسمور

کپور کی پیروڈی کی سب سے بڑی خوبی وہ "بخیۂ لب ادھیر" ہے جو اپنے اندر "خاموش قہقہے" یوں بند رکھتا ہے نظم ختم ہوتے ہی آدمی بے اختیار ہنسنے لگتا ہے اور طنز اپنا کام بھی کر جاتا ہے یعنی "زخمی" ہنسنے لگتا ہے اور یہی پروڈی کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ نقل کو اصل کے درجے تک پہنچا دے یہ الگ بات ہے کہ نقل اور اصل میں تفاوت باقی رہتا ہے۔ اس مضمون کی کامیابی کی ایک وجہ غالب کی ہر فن شخصیت بھی ہے اگر کوئی اور شاعر اس مجلس کا مہمان خصوصی ہوتا تو ایسی دلچسپ لازوال فضا تعمیر نہ ہو پاتی ــــ یقیناً کپور کا یہ مضمون ان کے ابتدائی دور کا ہی نہیں ان کے بہترین مضامین میں بھی بہت اہم ہے مگر یہ تو کپور کی پہلی کتاب ہے اور کپور کے طنز و مزاح کے لیے سفر کی پہلی منزل ہے۔

شاید کپور اردو کے واحد طنز نگار ہیں جنھوں نے ہندو مسلم فسادات پر کئی مضامین نہایت سنجیدگی سے لکھے ہیں اور آپسی اختلافات کی نوعیت کو ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ قومی لباس، اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے، شن شن شاہ خارستان وغیرہ ان کا خیال ہے کہ سارا جھگڑا مطلب پرست سیاستدانوں نے کھڑا کر رکھا ہے وہ اپنے طنز میں غیر جانبدار ہو کر دونوں کو مطعون کرتے ہیں۔ خارستان کے چند جملے ملاحظہ ہوں جو "زہرِ ہلاہل" سے لکھے گئے ہیں لیکن جنھیں میں تریاق، بھی سمجھتا ہوں :

"خارستان میں پچاس فیصدی لوگ نیم پاگل ہیں لیکن خارستان میں ایک بھی پاگل خانہ نہیں ہے۔ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں مثلاً ایک نیم پاگل کہتا ہے "بٹیر متبرک پرندہ ہے اس کا گوشت نہیں کھانا چاہیئے۔" دوسرا جواب دیتا ہے "بٹیر کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے، میں ضرور کھاؤں گا" اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ نیم پاگل ایک دوسرے کے گھروں کو کبھی کبھی اپنے گھروں کو آگ لگا کر تالیاں پیٹنے لگتے ہیں۔"

"خارستان میں سب عجیب الخلقت انسان "راہنما" ہیں۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ راہنما جن کی کھوپڑیوں میں دماغ سرے سے غائب ہے۔ راہنما جن کی کھوپڑیوں میں دماغ تو ہے مگر اس کی ساری چولیں ڈھیلی ہیں۔ ہر دو قسم کے راہنماؤں کا شغل "آدم بازی" ہے۔ بٹیروں اور مرغوں کے بجائے یہ لوگ آدمی پالتے ہیں اور ان کو آپس میں لڑا کر اپنے لیئے تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔۔۔"

"سماجی لحاظ سے خارستان میں دو جماعتیں ہیں قصاب اور دبیل، قصابوں کا پیشہ ذبح کرنا اور دبیلوں کا ذبح ہونا ہے۔"

"خارستان کی خاص چیز یہاں کا نیلام گھر ہے جہاں ہر اتوار کو روحیں نیلام کی جاتی ہیں۔ نیلام گھر کا مالک روح فروش کو حاضرین کے سامنے پیش کرنے کے بعد باآواز بلند کہتا ہے "فلاں ابن فلاں، اپنی روح بیچنا چاہتا ہے ۔۔۔ یہ سیاح لکھتا ہے کہ اس نے ایک دفعہ ایک راہنما کی روح صرف سات آنے میں خریدی۔"

"خارستان میں کئی متبرک مقامات ہیں جہاں "پاکیزگی" کے سوا سب کچھ ہے ۔۔۔"

کپور اپنے مضامین میں ایک دل جلے کے پھپھولے پھوڑنے کا منظر نہیں پیش کرتے ہیں بلکہ غالب نے جیسا کہ

کہا تھا "ایک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آدے" تو کپور خارستان میں آبلہ پا بن کر رہا اور اسی "جنون" میں فسادات پہ زہرخند کرنے کے بجائے "چیختا" رہا کہ یہ پاگل پن بند کرو، ایسے "شش شش شان" کے رہنے والو! اس مسئلہ کو موضوع بنا کر لکھنا دشوار ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کے کسی بھی اہم طنز نگار نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جرات نہیں کی اس لئے وہ لوگ "ڈرپوک" تھے اور کپور ان جیالوں میں ایک تھا جو مذہبی تعصب سے یکسر پاک تھا۔ اس قسم کے مضامین لکھنا رشید احمد صدیقی اور پطرس کے بس کی بات نہ تھی۔ پطرس تو خیر ایک پاکستانی مدبر بن گئے تھے اور رشید صاحب مسلمانوں کی شرافت کے امین۔ یہ دونوں کپور کے مقابلے میں خاصے تنگ دائرے میں "قہقہہ لگانے" کے عادی ہیں۔ کپور تنہا ہر محاذ پر اپنے تیر و نشتر سے وار کرتا رہا تمام عمر ایک معنی میں ڈان کیوٹے کی طرح لڑتا رہا اور اس کے بیشتر مضامین وادیٔ پُرخار میں آبلہ پائی کی داستانیں ہیں۔

شاید کپور واحد طنز نگار تھا جس نے اردو زبان کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ صرف اپنی کتاب "نرم و گرم" کا انتساب ہی اس کے نام نہیں کیا بلکہ "برج بانو" ایسا لازوال مضمون بھی لکھ گیا تھا۔ یہ مضمون اس کی کتاب "نوک نشتر" کا پہلا مضمون ہے میں نے اسے کئی بار پڑھا ہے اس کو طنزیہ و مزاحیہ قسم کے مضامین کے خانے میں بند نہیں کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ یہ ایک اردو پریمی کا نوحہ ہے مگر رنج آمیز ایک طنز ہے مگر مرہم بہ کف ایک چیخ ہے مگر دلوں کو ہلا دینے والی خاموشی بھی رکھتا ہے۔ "برج بانو" آج بھی بے وطن ہے۔ اور دربدر رسوا ہو رہی ہے کپور کو اردو سے اتنی گہری محبت تھی اس کا اندازہ اس مضمون کو بار بار پڑھنے سے ہی لگایا جا سکتا ہے بے شک پطرس اور رشید احمد صدیقی بھی اردو سے بے پناہ محبت کرتے تھے مگر وہ اس کی تباہ حالی پر اس طرح "نوحہ کناں" نہیں ہو سکتے تھے۔ کپور کا یہ مضمون آج بھی سخت سے سخت دل انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ واقعی ہندوستان کی تاریخ میں ہندو مسلم فسادات کے علاوہ بھی بہت سے مظالم ہوئے ہیں اور ان کا نشانہ اردو زبان رہی ہے اور کپور کے یہ جملے پتھر پر لکیر کی طرح ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ (شاید)

"تمہارا گھر پاکستان ہے؟" یہ بالکل غلط ہے۔ پاکستان میری فتوحات میں سے ہے میرا اصلی اور قدیمی وطن ہندوستان ہے۔ میں دِلّی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ بچپنا جھونپڑی میں اور شباب لال قلعہ دہلی میں بسر ہوا۔ مجھے ہندوستان کے شہنشاہ نے مُنہ لگایا ایوان عام میں مجھے سب سے اونچی مسند پر بٹھایا گیا اور جس وقت میرا ستارہ عروج پر تھا کوئی بنگالی گجراتی سندھی حسینہ میرے حسن بھڑک اور طنطنے کی تاب نہ لا سکی میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستان میں رہونگی۔۔۔"

اور اس مضمون کے آخری جملے پڑھئے تو عام، معلوم، پامال سی حقیقت بھی درد میں ڈھل جاتی ہے ــــ "حکومت قانون بنا سکتی ہے لیکن عوام کے فطری رجحانات کو نہیں بدل سکتی ہے جب تک ہندوستان میں قلفی والے، سکھ ڈرائیور اور چنا زور گرم بیچنے والے موجود ہیں حکومت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی ــــ" خدا کی قسم

بڑی ضدی ہو تم " برج بانو مسکرا رہی ہے اور میں قلفی والے کے الفاظ زیرِ لب دہرا رہا ہوں " لاجو
شاندار! بے نظیر! ——"

یہ نہیں کہ کپور ہمیشہ زہریلی تحریر ہی لکھتے تھے۔ ان کے یہاں 'خالص مزاح' بھی کتنے مضا
میں ملتا ہے جیسے "سخن فہم" "کاٹھ کا اُلو" "کامریڈ شیخ چلی" "سلیم و انارکلی" "بے تکلفی" "سامع" "ٹیوٹر" "پریس
کانفرنس" "صداقت" اور کتنے ہی مضامین اس کے ہر مجموعہ میں مل جائیں گے۔

کیا یہ جان کر حیرت نہیں ہوتی ہے کہ ایسی پیچیدہ شخصیت رکھنے والا نہایت معصومیت سے
پھولوں اور بچوں کی طرح ہنس بھی سکتا تھا جس کے تبسم میں پاکیزگی قہقہہ میں خلوص اور جس سے بغل گیر ہونے
کو دوستی کا یقین ہو جائے —— کہا جاتا ہے کہ دنیا کے بہترین طنز نگار اکثر یک رخے ہوتے ہیں جیسے سو
یعنی نشتر زنی میں ماہر مگر خندۂ معصوم سے بیگانہ مگر کپور کے لئے یہ کہنا یقیناً اس کے ساتھ زیادتی ہوگی ا
کی وجہ یہ تھی کہ کپور میں ایک ساتھ کئی "جنات" قید تھے اور وہ موقع موقع سے ان سب سے کام لیتا
وہ بہت شوخ اور شریر بھی تھا اور جلن گکڑہ بھی اور اپنی "معصومانہ حرکتوں" پر قارئین کے انسو
اور زخمی دلوں پر ہنسی اور بے لوث ہنسی کے پھائے بھی رکھتا جاتا تھا، کون ہے جو ستم زدہ نہیں ہے
ع کس کی حاجت روا کرے کوئی

مگر کپور کے دواخانے میں ہر مرض کا علاج نہ سہی سیر و تفریح کا مکسچر (MIXTURE)
مضمون میں مل جاتا ہے اور پڑھنے والا ان کو ہضم کر کے ایک لمحے کے لئے ہی سہی "خوش" ہو جاتا ہے
یہ جانتے ہوئے بھی آئنسٹائن نے کہا تھا کہ (ONLY PIGS ARE HAPPY) صرف سوّر خوش ہیں
مجھے تو کپور ایک "شعبدہ باز" شخصیت کا مالک نظر آتا ہے اپنی جادو کی چھڑی یعنی قلم
خار، خار سے پھول، پھول سے خرگوش اور خرگوش سے بچھو بنا سکتا تھا اور پھر یہ عمل الٹا بھی کر
تھا یعنی بچھو سے خرگوش، خرگوش سے پھول اور ممکن ہے کہ وہ کسی 'خارستان' کے بھوکے کو دیکھ کر بچھ
کو گوبھی کے پھول میں بدل دے اور یہ اعلان بھی کرے کہ اے خارستان کے باسیو! یہ پھول کھا کر تم
میں لڑنا بھول جاؤ گے اور شاید وہ یہ دیکھ کر مایوس ہو کہ کوئی اس کا "گوبھی کا پھول" کھانے کو تیار نہیں
اس لئے کہ خارستان والے "بھوک" کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ انھیں پھول اور خار میں کچھ فر
نظر نہیں آتا ہے۔

جس فنکار کے پاس "جادو کی چھڑی" ہو، وہ اپنی اہمیت منوا کر رہتا ہے۔ یہ الگ با
ہے کہ "موٹی کھال والے" کوڑے کو نشتر پر ترجیح دیتے ہیں اور کپور کے پٹارے میں ہر چیز ہے یعنی کوڑا
موجود ہے۔ قہقہہ بھی ہے اور وہ طنز ملیح بھی ہے جو طنز و مزاح کی روح ہے۔

اپنا مضمون ختم کرتے ہوئے مجھے اس کا احساس ہے کہ کپور کے متنوع فن کا جائزہ تشنہ ہی رہا ہے یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ 'ناقد' کے نام ہی سے ہنسنے لگتا تھا اور میرا مضمون پڑھ کر قہقہہ لگائے گا کہ جب کچھ بس نہ چلا تو "مجھے "جادوگر" بنا کر تنقید کا وار کر دیا۔
ظاہر ہے کہ کپور ایسی ہمہ گیر شخصیت کو "تنقید" میں قید کرنا امر محال ہے وہ جادوگر نہ سہی مگر اس کے بے شمار پہلو تو ہیں ہی اور بے چارہ ناقد کپور کے ایسے ستم ظریف کا ہمنوا ہو کر صرف یہی کہہ سکتا ہے ؎

کوئی جادو کی چھڑی رکھتا ہے
"غ" سے ہر خوف بھگانے والا ــــ یعنی
کنہیا لال کپور عرف بچھو ــ

ڈاکٹر عبدالستار دلو

کنہیا لال کپور

ایک تاثر

ہمارے ادب کی بدقسمتی رہی ہے کہ یہ اکثر اوقات اشتہار پسند PUBLICITY ORIENTED ر
یہ اشتہار پسندی اسے کسی سیاسی، سماجی یا ادبی تحریک یا ادارہ سے ملی یا پھر اُن کے دوستوں کے حلقے سے۔ ترقی پسند تحریک نے
ادیبوں اور شاعروں کو بلند مقام پہ فائز کر دیا۔ جدیدیت کی تحریک نے بہت سے کم سواد اور کمزور شاعروں اور ادیبوں کو وہ شہرت بخ
کہ جو انھیں اپنے بوتے پہ کبھی نصیب نہ ہوتی۔ یہاں پر میں نے سرسید تحریک کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ میرا یہ ایمان ہے کہ سر
تحریک نے واقعتاً حق دار کو حق دیا، شبلی، آزاد، نذیر احمد، ذکاء اللہ اور حالی وغیرہ کی شہرت اور ان کے ادبی اور علمی مرتبہ کو
کلیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بات اردو ادب میں مشہور ہے اور میرے خیال میں اس سے انکار مشکل ہے کہ غالب کی طرح اگر
سو بھی کوئی متوازن سوانح نگار اور ناقد ملتا تو مومن کی شخصیت بھی اتنی دبی دبی سی نہ ہوتی جو آج دکھائی دیتی ہے۔ گذشتہ صد
ادب دربار داری اور بادشاہ نوازی کے زیر اثر پنپا۔ درباروں نے نیستی کو ہستی میں تبدیل کر دیا اور ہستی نیستی میں بدل گئی۔
انجمن ترقی اردو نے اور انجمن ترقی اردو کے ایک مخصوص حلقے نے عبدالحق کو جس بلند مقام پہ فائز کیا، وہ اس کے حق دار تھے، مگر
مشکل ہے کہ پنڈت دتا تریا کیفی اس شہرت اور عظمت کے مستحق نہیں جو عبدالحق کو ملا۔

ہمارا آج کا دور مختلف قسم کی تحریکوں سے ہٹ کر اشتہار پسندی کا دور ہے جسے روزناموں، ہفتہ واروں اور ما
سے تقویت ملی ہے۔ اخباروں اور رسالوں کے بھی اپنے حلقے بنے ہوئے ہیں اور اکثر ادیب اور شاعر اور ناقد انھیں
حلقوں سے وابستہ ہیں اپنے رسوخ کے بل بوتے پر یا اپنی فعال طبیعت کے سہارے (ایڈیٹروں کے پاس بار بار
دینا آج کے دور میں ضروری ہے) انھیں شہرت ملتی ہے۔ کتابوں کی رسم اجرا، معمولی معمولی باتوں پہ اخبار میں اپنے فو
سے خبروں کا شائع کرنا (جو اب اکثر لوگ دوستوں کی بجائے خود بھی کر لیتے ہیں) اُن کی شہرت کا باعث بنتا ہے۔

اور اس میں ان کی فکر و فن اور ادبی مرتبہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مذکورہ غیر صحت مند طریقوں سے شہرت پانے کی مثالیں ہمارے ہاں بہت ہیں۔ ادبی شہرت کا ایک طریقہ اخباروں میں کالم نویسی بھی ہے، جس کی ادبی حیثیت ہمیشہ مشکوک ہی رہتی ہے۔

اس طویل تمہید کا مقصد یہ بتانا ہے کہ کنہیا لال کپور جو اردو کے منفرد طنز و مزاح نگار ہیں اپنی اسی خاموش پسندی اور لیئے دیئے رہنے کے انداز کی وجہ سے (جس سے وہ اپنا کوئی حلقہ پیدا نہیں کر سکے) طنز و مزاح نگاروں میں وہ شہرت حاصل نہیں کر سکے جس کے وہ مستحق تھے۔ منشی سجاد حسین، سرشار، مرزا فرحت اللہ بیگ وغیرہ کو فی الحال اگر ہم نظر انداز کریں تو نثر میں احمد شاہ بخاری پطرس، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور کنہیا لال کپور سے اردو طنز و ظرافت کا مثلث بنتا ہے جس کے زاویئے برابر برابر کے ہیں۔ مگر زندہ دلان پنجاب نے پطرس کی وہ قدر و منزلت کی کہ چند بلند پایہ مضامین سے وہ اردو طنز و مزاح میں ہی نہیں، مجموعی طور پر سارے اردو ادب میں امر ہو گئے۔ ان کی شہرت کا باعث وہ مقامات بلند بھی ہیں جن پر وہ فائز رہے، مثلاً آل انڈیا ریڈیو کی ڈائرکٹر شپ، انگریزی کی پروفیسری (جس میں ان کے باکمال شاگرد پیدا ہوئے اور جس سے ان کا حلقہ وسیع ہوا) اور اقوام متحدہ میں پاکستان کی مستقل ممبری ـــــ محمد طفیل نے نقوش کے خاص نمبر مرتب کر کے پطرس کی اہمیت کو اور زیادہ پائدار بنا دیا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی اپنی ارفع و اعلیٰ ادبی شخصیت کے علاوہ انھیں علی گڑھ کے ارباب ادب سے بھی طاقت و توانائی ملی، اگرچہ رشید احمد صدیقی کے تعلق سے کسی طرح کے علاقائی تعصب کو بہت زیادہ اہمیت دینا مشکل ہے تاہم ارباب علی گڑھ کی طرف سے رشید احمد صدیقی کے مضامین کی جو پذیرائی ہوئی اور اُن کے گرد ایک حلقہ بلکہ ہالہ بنا اُس سے ان کی تابناکی میں اضافہ ہی ہوا۔ پطرس اور رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح میں مقامی اثرات اور فضا اور ماحول کا عکس ہے۔ کنہیا لال کپور کو اس کے برعکس کوئی حلقہ اور کوئی تحریک اور ادیب اور ناقد شاگردوں کا کوئی کارواں نصیب نہ ہو سکا جس کے وہ میر کارواں بنتے ـــــ کپور کی شہرت و عظمت اِسی مجبوری کا شکار بنی ورنہ واقعتاً کپور کی ادبی اہمیت ایک طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے دو چند ہو جاتی۔ چنانچہ آج کپور کی ادبی اہمیت جو کچھ ہے وہ ان کے اپنے بوتے پر ہے، انھیں اس ضمن میں کوئی سہارا نہیں ملا بلکہ انھوں نے اپنی ذاتی اور محض ذاتی صلاحیتوں پر اپنے لیئے مستقل جگہ بنالی ہے۔

آج سے تقریباً ۲۰۔۲۲ سال قبل اسکولوں اور کالجوں میں مضامین پطرس اور خنداں و مضامین رشید کے ساتھ کپور کی سنگ و خشت اور نوک نشتر کا بول بالا تھا۔ اساتذہ اپنے شاگردوں کے ادبی ذوق کو جِلا بخشنے کے لیئے ان کے مضامین پڑھنے کی سفارش کرتے تھے۔ پطرس اور رشید احمد صدیقی کے مضامین کی فضا بہت ٹھوس ہوتی تھی اور مقامی رنگ سمجھنا قدرے دشوار ہوتا تھا، لہذا کپور کے عام فہم عموی طنز و مزاح کو عام قبولیت حاصل تھی، "سنگ و خشت"، "نوک نشتر" کے بعد "یکے بعد دیگرے"، "چنگ و رباب"، "بال و پر"، "گردِ کارواں" ان کی کتابوں میں اضافہ کرتی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کپور کا حلقۂ اثر بڑھتا گیا اور صحت مند ادب کا عام قاری کنہیا لال کپور کی کتابوں کا منتظر نظر آتا اور اسکول کی لائبریریوں سے کپور کی کتابوں کے منتظر طلبار کی ایک قطار دکھائی دیتی، اسکول کے باہر بھی دوستوں کے حلقوں میں کنہیا لال کپور کی کتابوں کے عاشق و شیدائی قطار باندھے کھڑے رہتے، یہ بات شاید رشید احمد صدیقی اور پطرس کے بارے میں صحیح نہیں۔

اردو میں طنز و مزاح کی روایت بہت پرانی ہے، مگر نثری تعلق سے اس کی عمر نسبتاً کم ہے، نذیر احمد، منشی سجاد حسین سرشار، فرحت اللہ بیگ کے بعد گزشتہ ۴۰ ۔ ۵۰ سال کے عرصہ میں پطرس، رشید احمد صدیقی اور کنہیا لال کپور کے علاوہ قاضی عبدالغفار، شوکت تھانوی، کرشن چندر، منٹو، ابراہیم جلیس وغیرہ کئی ادیبوں نے اس فنِ لطیف پر خصوصی توجہ کی اور لق ہر طنز نگار کا دائرۂ فکر اور مقصد تحریر جداگانہ ہے اور اسلوب مختلف مثلاً منٹو کا طنز ہلکا اور سبک ہے، اس میں وہ شدت نہیں جو قاضی عبدالغفار کے یہاں "لیلیٰ کے خطوط" میں دکھائی دیتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ قاضی صاحب کا مقصد بھی اتنا ہی شدید ہے جتنا کہ اُن کا طنز۔ ان کا مقصد سونے والے کے دماغ میں گھس کر ان کے خانوں کو بند کرنا۔ وہ اپنی زبان کو گنگ ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

کپور کا طنز کرشن چندر، منٹو، اور قاضی عبدالغفار کے طنز سے مختلف ہے اس میں نہ کرشن چندر کی مینا کاری ہے نہ منٹو کی سبک روی ـــ کنہیا لال کپور نے چھ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں ـــ سنگ و خشت، شیشہ و تیشہ، چنگ و رباب نوکِ نشتر، بال و پَر اور گردِ کارواں ـــ اور ہر جگہ کپور کی دلچسپ شخصیت نمایاں ہے اور اس دلچسپی میں نسبتاً توازن قائم رہتا ہے ـــ کپور نے دورِ حاضر میں سانس لینا سیکھا۔ اور اس کے طلسمی اور قدرے زہریلے جھونکوں کو محسوس کیا ہے ادب کی رفتار، سماج میں تیزی سے پیدا ہونے والی تبدیلیاں اور ان کے اثرات کے تحت فکری جہت اور رفتار میں وقوع تبدیلیاں کپور کے طنز و مزاح کا مرکز ہیں، کپور کا طنز شخصیات پر نہیں بلکہ موضوعات اور مسائل پر ہے۔ وہ ایک کامیاب طنز نگار ہیں جنھوں نے اپنی ظرافت سے اس کو جلا دی ـــ کپور کے یہاں نہ بے جا طوالت ہے نہ غیر ضروری اختصار جو کا نویسوں کی خصوصیت ہے۔ وہ اِنسانی فطرت اور خصوصاً ہندوستانی ذہنیت و فطرت سے بخوبی واقف ہے، مشاہدہ تیزی اور نظر کی باریکی کپور کے مضامین کی بڑی خصوصیت ہے ـــ وہ مریض ذہنوں کا معالج ہے اور خود مریض نہیں۔

کپور کا طنز ستھرا اور پُرلطف معلوم ہوتا ہے جس میں سوقیانہ رنگ کے امتزاج کے لئے ذرہ بھر بھی جگہ نہیں۔ کپ نے فطرتِ انسانی کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کی تحریر صاف، سلیس دل آویز اور رواں ہے۔ اس کے یہاں طنز ایک خوبی بن آیا ہے، خامی نہیں اور اِسی لیئے اس کا طنز "جزویست از پیغمبری" بن گیا ہے۔ وہ پہلے طنز کے تیز تیز تیر چلاتا تھا اس کے بعد کی تحریروں میں طنز تیز کارتوس بن کر برسے اور پھر اس طنز نے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی صورت اختیار کر لی۔ (وہ زمانہ کے ساتھ چلتے ہیں) ایسے ایٹم اور ہائیڈروجن بم جن سے نوعِ انسانی کے لئے خطرہ نہیں بلکہ جو اس کی پرورش کے ذمہ ہیں ـــ

کپور کا طنز صرف طنز ہی نہیں تنقید بھی ہے جو ہماری ذہنی، تہذیبی، تمدنی، سماجی اور اقتصادی زندگی سے ہٹ جاسے ادب پر بھی وارد ہوتی ہے "غالب ترقی پسندوں کی محفل میں"، "حالی جدید شعراء کی محفل میں"، "چینی شاعری" بہت سے دوسرے مضامین ادبی تنقید بن گئے ہیں۔ دراصل یہ تنقید نگاری کا انوکھا، نرالا، شستہ اور حسین طرز جو اردو کو کنہیا لال کی دین ہے۔ "شیشہ و تیشہ" کے "چند فلمی سین" بھی سماج اور ہماری مردہ ذہنیت پر وار کرنے کامیاب ہوئے ہیں۔ اسی طرح "سنگ و خشت" میں متعدد مضامین کپور کی خلاقانہ طبیعت اور شوخی و رعنائی کے نمونہ ہیں۔ "ریڈیو خریدا ہے؟" "اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے"۔ "قومی لباس" وغیرہ بھی کپور کے قابلِ قدر

ایک اچھا ادیب سماج کا معالج ہوتا ہے۔ کپور بھی ایک اچھا معالج ہے۔ کپور کی فنکارانہ عظمت کا راز اس کی بے تکلفی میں ہے۔ وہ بغیر کسی تکلیف کے خلوصِ نیت سے لکھتا ہے۔ اس بے تکلفی اور خلوص نے اسے کامیاب فنکار بنا دیا ہے۔ اس کا طنز تعمیری ہے تخریبی نہیں

اپنی کتاب "نوکِ نشتر" میں کپور کا مضمون "برج بانو" اردو دوستی سے بڑھ کر اردو پرستی ظاہر کرنے میں ہماری سب سے زیادہ مدد کرتا ہے اس میں کپور کا اندازِ بیان (style) بدل گیا ہے۔ شائد اس لئے کہ اس مضمون کی نوعیت ہی نرالی ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں اس کے اپنے اندازِ بیاں کے دھیمے پن پر کوئی اثر نہیں آیا ہے اور تمثیل نگاری کا ایک آدرش بن گیا ہے۔ کپور طنز نگار ہی نہیں بلکہ طنز کا بادشاہ ہے۔

"افسانے کا پلاٹ" اور "اُردو افسانہ نویسی کے چند نمونے" بھی ہمارے افسانوی ادب پر ایک صحت مند تنقید بن گئے ہیں۔ جس میں اس کامیاب فنکار نے حقیقت سے رومان تک تمام افسانوی قسموں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ اور افسانہ نگاری کا سہارا لے کر عورتوں کے پیچھے دوڑنے والوں پر بھاری بھرکم طنز کیا ہے۔ وار کیا ہے، اس لئے نہیں کہ وہ عورت کے حسن سے متاثر نہیں ہو سکتا یا عورت سے اسے نفرت ہے، عورت پر جو ایمان نہ لائے وہ کافر! عورت مرد کے لئے اور مرد عورت کے لئے پیدا ہوا ہے۔ لیکن جب عورت غیر معمولی طور سے اعصاب پر سوار ہو جائے تو لعنت بن جاتی ہے۔ لیکن "اعصاب پر عورت نہیں تو کیا ہاتھی گھوڑے سوار ہوں گے" یقیناً عورت سوار ہوگی۔ اور عورت کے اعصاب پر مرد لیکن ایک حدِ فاصل ضروری ہے۔ اقبال کو ہندوستانی ادیبوں، شاعروں، صورت گروں اور افسانہ نویسوں پر بھی اعتراض تھا کہ ان کے اعصاب پر غیر معمولی طور سے عورت سوار ہے۔ ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

کپور اپنے مضامین میں اس شعر پر توجہ دینے کی دعوت دیتا ہے۔

کپور کی کتاب "بال و پر" ہے۔ اس میں اس کے مضامین "گیارہ کھاتر" "آزادی کی قسم" "پیغام" بلند قسم کے طنزیہ، اور "اپنی یاد میں" "سبز باغ" "چوپٹ راجہ" وغیرہ کامیاب مضامین ہیں۔ جنھوں نے اُردو ادب کے اس شعبہ میں ہم جیسے طنزیات و مضحکات کہیں گے ایک نئے اہم باب کا اضافہ کیا ہے۔ کپور کی تحریروں میں دلچسپی اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم اسے دوسروں کے ساتھ خود اپنا مذاق اُڑاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ "اپنی یاد میں" لکھتا ہے :-

"پروفیسر کپور بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں دیکھ کر بیک وقت ابراہیم لنکن، قائدِ اعظم جناح اور آر۔ ایل۔ اسٹیونسن کا خیال آتا تھا، وہ حد سے زیادہ لمبے اور دبلے تھے۔ جب بیٹھتے تو معلوم ہوتا کہ کھڑے ہیں اور جب کھڑے ہوتے تو ایسا لگتا کہ کھڑے ہی نہیں بلکہ گر پڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ خدا نے اسے ایک ایسا چہرہ عطا فرمایا تھا جس میں شنکر جیسا کارٹونسٹ تو دلچسپی سے حصہ لے سکتا تھا۔ . . . چغتائی جیسا مصور ناک بھوں چڑھا لیتا ہے۔" "کنہیا لال ہمیشہ آج کا کام کل کی بجائے پرسوں کیا کرتے تھے۔" دراصل یہی وجہ ہے کہ لوگ بعض اوقات اس کی تحریروں پر ہنسنے کی بجائے اس سے ہمدردی ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ یہاں پر کپور کے یہاں سے چند اقتباسات بے محل نہ ہوں گے جو تنقید اور طنز کے مثالی نمونے ہیں۔

"زبا، ترقی پسند افسانے وہ ہیں جن میں مزدور پر ظلم اور مزدور کی عورت سے عشق کیا جاتا ہے۔ ان افسانوں میں عموماً سرمایہ دار، سڑک کوٹنے والی، کارخانوں میں کام کرنے والی، اور گھر میں برتن صاف کرنے والی مزدور عورتوں کو پھسلانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اکثر روپیہ یا شہرت کا لالچ دے کر ان کی عصمت پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔"

" سو فیصدی ترقی پسند افسانے وہ ہیں جن میں بھائی بہن سے اور بیٹا ماں سے عشق کرتا ہے۔ عموماً یہ بھائی بہن نہایت تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر فرائڈ کا مطالعہ کیا ہوتا ہے اور ان کی نظر میں بہن بہن نہیں ہوتی بلکہ عورت ہوتی ہے۔"

" رومانی افسانوں میں وہ افسانے بھی شامل ہیں جن میں کوئی نرس یا کسی شادی شدہ عورت سے جو تیمارداری کرنے آئی ہو، محبت کرتا ہے۔ جب کبھی اس کا درجۂ حرارت ۱۰۴ ، ۱۰۵ سے اوپر ہو جاتا ہے تو اسے عشق کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ اور وہ یہ نہیں جانتا کہ اسے ٹائیفائڈ ہے یا عشق۔ چنانچہ ایک طرف وہ ایڑیاں رگڑتا ہے تو دوسری طرف وہ نرس کا ہاتھ اس زور سے بھینچتا ہے کہ وہ بیچاری درد کے مارے چلا اٹھتی ہے۔ مگر وہ کوڑھ مغز ہونے کی وجہ سے یہ نہیں سمجھتی کہ مریض اس سے اظہارِ عشق کر رہا ہے۔"

(اردو افسانہ نویسی کے چند نمونے)

" ایک عام ہندوستانی اپنے تمام آلام و مصائب کا ذمہ دار دو اور صرف دو چیزوں کو ٹھہراتا ہے۔ یعنی انگریز اور قسمت، دو چیزیں اس کے اعصاب پر اکثر سوار رہتی ہیں۔ مذہب اور عورت، دو چیزوں سے اسے سخت نفرت ہے۔ صفائی اور پابندیٔ وقت، دو چیزیں اسے از بس پسند ہیں۔ دخل در معقولات اور شور۔"

" تقریباً ہر ہندوستانی مذہب کے نام پر بیوقوف بنایا جا سکتا ہے، مذہب پر تو وہ بکا ہوا ہے۔ وہ اپنے مذہب سے اس لئے محبت نہیں کرتا کہ یہ اسے خدا کے قریب لاتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اسے اپنے ہم وطنوں سے دور لئے جاتا ہے۔ ہر ہندوستانی کو ایک خدا چاہیئے پرستش کے لئے نہیں بلکہ اپنے ہمسایہ سے لڑنے کے لئے۔ ہندوستان مذاہب کا گھر ہی نہیں بلکہ کارخانہ ہے۔ یہاں ہر آدمی متقی اور خدا پرست ہے جسے خدا سے محبت اور خدا کے بندوں سے نفرت ہے۔"

"ایک عام ہندوستانی کی ذہنیت اور سیرت"

ممکن ہے رشید احمد صدیقی اپنی ظرافت کے لئے خام مواد شعر و ادب سے لیتے ہوں۔ پطرس نفسیات سے اور فرحت اللہ مُردوں سے لیکن کپور یقیناً اپنے طنز اور ظرافت کے لئے خام مواد اپنے سماج، ماحول اور سیاست سے حاصل کرتا ہے جو زیادہ دائمی، پر اُمید، حوصلہ بخش اور ادب میں زیادہ دوام ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی، پطرس اور فرحت اللہ کی تحریروں میں جو ان کے نقطۂ نظر کی محدودیت سے کمی آگئی ہے کپور کے یہاں واضح طور پر یہ کمی دور ہو گئی۔ اگر رشید احمد صدیقی نے اپنی تحریروں کو علی گڑھ کے ماحول ہی تک رکھا تو کپور کے یہاں ساری فضا سمٹ سمٹا کر ایک اور خالص ہندوستانی ہو گئی ہے۔ جس میں ملک کے سماجی، سیاسی، عمرانی، معاشی اور اقتصادی حالات نہایت شدت کے ساتھ نمایاں ہیں۔ "سنگ و خشت" کا مضمون "قومی لباس" جو خطوط کی صورت میں ہے۔ ہندوستان کی اس مکدر سیاسی ماحول کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب ۱۹۴۶ء میں لاہور ریذیڈنٹ کے بعد تقسیم کا مسئلہ بڑا اور نہایت نازک مسئلہ تھا اور گاندھی جناح کی خطوط بازی اپنے شباب پر تھی۔ اور جناح منطقی اور تاریخی "حقائق" کی روشنی میں اپنے آپ کو مذہبی، تمدنی، لسانی اور ادبی ہر حیثیت سے جداگانہ قوم کا فرد ثابت کر کے مسلمانوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ یہاں پر ہیرا لال اور اکبر علی دونوں بالترتیب ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

کپور کے طنز کی ایک اور خوبی جو اُسے رشید صاحب سے علیحدہ کرتی ہے۔ تسلسل اور واقعات و موضوع سے ہم آہنگی ہے۔ وہ رشید صاحب کی طرح عورت، ادب، آرٹ اور اخلاق پر لمبی لمبی بحثیں، نہیں چھیڑتا بلکہ جیسے بن سے بغیر کسی الجھاؤ کے اپنے موضوع کو آگے بڑھاتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے رشید صاحب کے مقابلہ میں اس کا طنز زیادہ عام فہم ہوتا ہے۔ جزئیات نگاری اس کی تحریر کی ایک

خصوصیت ہے — بڑے آدمی، فلمی شاہکار، کامریڈ شیخ چلی، شگفتگی اور زندہ دلی کے ساتھ اپنے سماج اور ملک کی علمی بے راہروی، کم فہمی، تجاہل اور معصومیت پر ایسا طنز ہیں کہ ہماری سوسائٹی کا المیہ واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

رشید احمد صدیقی کے بعد اردو طنزیات و مضحکات میں کپور ہی پہلا صاحبِ فکر ادیب ہے جو زندگی کی اصلی روح سے بیگانہ نہیں معلوم ہوتا اور اپنی ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے اپنی تحریروں میں معنویت و جامعیت پیدا کرتا ہے۔ اس کی تحریر میں مبالغہ ہونے کے باوجود بے کیفی نہیں آنے پائی ہے، وہ ہر صورت میں زندگی سے پُرخلوص طریقے سے ملتا ہے، رنگ بھرتا ہے، اسے شیریں بنانے میں کوشاں ہے۔ اور اس سے محبت کرتا ہے۔ اس نے اردو طنز اور مزاح میں نرمی اور لوچ پیدا کر کے اردو کی بڑی خدمت کی ہے اور اُسے اظہار و بیان کا پُرکیف انداز بخشا ہے، وہ زندگی کا بہت بڑا نباض ہے، اس کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں وسیع معنی کو بیان کرنے کی صلاحیت نے اردو طنز و ظرافت کو اختصار اور معنویت کے راستے دکھائے ہیں اور ادب کو نئی وسعتیں عطا کی ہیں۔

کپور کا طنز بچھو کا ڈنک ہے جو بہت ہی پریشان کن ہوتا ہے۔ اس میں وہ شعریت نہیں جو ہمیں رشید احمد صدیقی اور پطرس کے یہاں ملتی ہے۔ وہ ہنستا ہے مگر اس کی ہنسی میں جو کڑواہٹ ہے وہ کافی دیر تک مُنہ کا مزا بگاڑے رہتی ہے۔ ابتدائی فن پاروں میں اس نے طنز کے ساتھ مزاح کی ضرورت کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس نے اس ضرورت کو محسوس کیا تھا کہ طنز کے لئے مزاح کی ضرورت ہے لیکن بعد کی تحریروں میں (خصوصاً بال و پر کے مضامین میں) تلخی و ترشی زیادہ آگئی ہے جو طبیعتوں پر زیادہ بار گزرتی ہے اور ذہن کے عمیق ترین گوشوں کو کھرچ ڈالتی ہے لیکن کون جانے! ممکن ہے کپور عرفی کی طرح سوچ رہے ہوں ع

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی

پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ میں "موجودہ معاشرتی اور سیاسی ہلچل میں طنز نگار کو موضوع و مواد کی کمی نہیں، غلامی مغربیہ کی نقالی، اقتصادی زبوں حالی، بے روزگاری، جنسی بے راہروی، غمِ دوراں اور غمِ جاناں، فرقہ پرستی، رجعت پرستی، ترقی پسندی، رشوت، چور بازاری، سرمایہ داری، صنعتی دَور کی قدروں میں تصادم، قریب آزادی، جمہوریت، حقوقِ انسانی، انجمن سازی، موت کی سوداگری اور کفن فروشی — اَن گنت موضوع ہیں جن کی کل کہیں نہ کہیں سے ٹیڑھی ہے اور طنز نگار کی حساس، ہمدرد اور دُور رس نگاہ اس ٹیڑھے پن کا پتہ چلا لیتی ہے۔ کپور کے یہاں مندرجہ بالا قریب قریب سبھی چیزیں اپنے طنز کا موضوع و مواد بن چکی ہیں۔

کپور کی خود اپنے متعلق کچھ بھی رائے ہو، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے وہ اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں کلی سے چٹک کر پھول اور آگ سے بھڑک کر شعلہ ہوگیا ہے۔ وہ ہمارے ادب میں ٹمٹماتا ہوا چراغ نہیں بلکہ سو کینڈل پاور کا بلب ہے۔ وہ جگنو کی طرح ایک آدھ بار چمک کر اندھیرے میں غائب نہیں ہوگیا بلکہ اردو ادب کا مستقل نقش بن گیا ہے۔ ■■

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

کنہیا لال کپور کا عصری شعور

عصری شعور کی کارفرمائی کے بغیر ادب، ادب نہیں ہو پاتا۔ یا کم از کم اس مثبت اور صحت مند کردار کا حامل نہیں رہتا جس کا اس کو حامل ہونا چاہیے۔ ادب کے جامع اور وقیع ہونے کے اور بھی معیارات ہیں۔ لیکن جس معیار کو ہر دور میں بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے وہ ادیب کا عصری شعور اور ادب کی معاشرتی حیثیت اور معنویت ہے۔ یہ کسی ایک زبان، علاقے اور عصر تک محدود نہیں، ہر زبان، علاقے اور ہر عصر کے لیے یہی معیار وجہ افتخار اور باعثِ امتیاز رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہم کسی ادب پارے کو خواہ وہ کسی دور کی تخلیق ہو، عالی مرتبت قرار دیتے اور قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھتے ہیں تو محض اس لیے کہ اس میں اپنے عصر کی روح پائی جاتی ہے۔ یہی روحِ عصر ہے کہ وہ ادب اپنے دور میں بھی زندہ تھا، آج بھی زندگی بردوش ہے اور کل بھی دمکتا اور مہکتا رہے گا۔

اُردو شعر و ادب میں "ادب برائے زندگی" اور "عصری آگہی" کی اصطلاحات کو مروج ہوئے عرصہ ہی کیا گزرا ہے لیکن اُردو شعر و ادب اپنے ابتدائی دور میں بھی ان اصطلاحات کے مفاہیم سے عاری نہیں رہا۔ بہت کم، کم یا زیادہ، یہ باتیں اور ہیں۔ اسی اساسی عنصر سے جن ادیبوں اور شاعروں نے گریز کیا ہے۔ انہوں نے کچھ دیر کے لیے چکا چوند کیفیت پیدا کرلی ہو لیکن وہ دور تک نہ چل سکے۔ تاریخ ادب میں ان کے لیے کوئی خاص جگہ نہیں رہی وہ کھوٹے سکے کی طرح کہیں چلے تو چلے ہوں لیکن ان کو بہرحال ٹکسال باہر ہونا تھا وہ ٹکسال باہر ہوئے

شعر و ادب میں عصری شعور اوروں سے زیادہ طنز و مزاح نگاروں اور طنز و مزاح کے لیے ضروری ہے عصری شعور کے بغیر طنز و مزاح ممکن ہی نہیں تیسرے درجے کی ظرافت اور پھکڑپن کی بات اور ہے۔ دیگر فن کار ایسا شاید کرلیں لیکن طنز و مزاح نگار زمانے سے الگ، اپنے خول میں بند اور اپنی ذات میں محصور نہیں رہ سکتے۔ ان کو خلا میں نہیں اسی سرزمین پر اپنے پاؤں

رکھنے ہوتے ہیں۔ انھیں زندگی کے ساتھ چلنا، زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھنا، یہاں کے سرد و گرم کو محسوس کرنا، روز و شب کا جائزہ لینا، پیچ و خم سے گزرنا اور رنگ و آہنگ سے باخبر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل کی دھڑکنیں ہی محسوس نہیں کرتے اور دلوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو بھی گنتے ہیں۔ یوں کہیے، سارے جہاں کا درد، طنز و مزاح نگاروں کے جگر میں ہوتا ہے۔ یہ بات اُن طنز و مزاح نگاروں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے جو باضابطہ طور پر کسی دبستانِ فکر اور "ازم" سے متعلق نہ ہوں۔ ان فنکاروں کے ہاں تو اور ہی کیفیت ہوتی ہے جو کسی مخصوص مکتبِ خیال اور نظریۂ حیات سے وابستگی کا اقرار و اعلان کرتے ہیں۔ کنہیا لال کپور نے اگرچہ کسی "ازم" سے خود کو منسلک نہیں کیا لیکن اپنے طور پر وہ ایک خاص فکری رویے کے حامل اور نظریۂ حیات کے حامی ہیں۔ انسان دوستی اور انسانیت پرستی کا رویہ! جو ہر اچھے اور عظیم فنکار کا نصب العین رہا ہے۔

کنہیا لال کپور بنیادی طور پر طنز نگار ہیں۔ مزاح اُن کے ہاں ذیلی ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو جس چیز کو اُن کے ہاں مزاح سے موسوم کیا جاتا ہے وہ بھی طنز کی شگفتگی اور زندہ دلی ہے ورنہ ان کا طنز بڑا بھاری اور کاری ہوتا ہے اور تکلف بر طرف والا! ـــــ ایسے طنز نگار کو غیر معمولی باشعور، خاصا چابک دست، باریک بین اور اپنے زمانے کا نبّاض ہونا پڑتا ہے۔ تھوڑی بہت بھول چوک بھی ہو جائے تو وہ اپنے طنز کا آپ شکار ہو جاتے ہیں۔ اپنی طنز نگاری اور معاشرہ کے لیے طنز کی ضرورت کا کپور کو بھی احساس ہے۔ اپنے مضامین کے مجموعہ "شیشہ و تیشہ" کے "پیش لفظ" میں انہوں نے لکھا ہے:

"کسی مفکر کا قول ہے کہ ہندوستان کو مزاح کے بجائے طنز کی ضرورت ہے۔ حُسنِ اتفاق دیکھیے کہ وہ حسین مفکر میں ہی ہوں۔"

یہاں انھوں نے، ہندوستان کو مزاح کے بجائے طنز کی ضرورت، کہہ کر اپنے طنز کی سماجی معنویت کی طرف خود ہی اشارہ کر دیا ہے۔ کپور کے طنز کا اپنے معاشرے سے گہرا تعلق ہے کہ اس میں روحِ عصر کی جھلکیاں بیک نظر محسوس کی جا سکتی ہیں۔ ان کا طنز 'برائے طنز' نہیں، 'برائے اصلاح' ہے، 'برائے اصلاحِ معاشرہ'! معاشرے کی اصلاح کے اس مقصد کے لیے کپور نے زندگی کو اپنی آنکھوں اور اپنے زاویے سے دیکھا، غور کیا اور خاصے غور و فکر کے بعد، قارئین کو بھی دعوتِ فکر دینے کے لیے اپنے نتیجۂ فکر کو صفحۂ قرطاس پر پیش کیا۔ کپور نے مغربی زبانوں کے ادب اور خاص طور پر طنز کا غیر معمولی مطالعہ کیا ہے۔ وہ مغربی طنز سے متاثر بھی ہیں لیکن مرعوب نہیں۔ ان کے ہاں مغرب کی تقلید نہیں ملتی، استفادہ ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے اس استفادہ کو اردو ادب کی روایت سے مربوط کرتے ہوئے ہندوستانی معاشرے اور مزاج سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کپور کی طنز نگاری ایک طرحداری کی حامل ہو گئی ہے جو اردو کے روایتی طنز سے جدا ہوتے ہوئے بھی اردو ادب کا وقیع سرمایہ اور آبرو ہے۔

کنہیا لال کپور نے ۱۹۳۶ء سے لکھنا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اردو میں ترقی پسند تحریک اور اس کے متوازی حلقۂ اربابِ ذوق کی سرگرمیاں عام ہوتی جا رہی تھیں، اپنے حلقۂ احباب میں ترقی پسندوں اور اربابِ ذوق کے ارکان کے باوجود کپور نہ تو ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور نہ حلقۂ اربابِ ذوق سے۔ وہ ترقی پسندوں کے ساتھ بھی رہے اور انہوں نے حلقۂ اربابِ ذوق میں اپنے مضامین بھی پڑھے اور پھر ہر دو کے ادبی کارناموں اور موقف کو اپنے طنز کا صید بھی بنایا۔ ادبی زاویے سے یہ دور خصوصاً شاعری میں نت نئے تجربوں کا دور تھا۔ غزل سے بیزاری اور برہمی کے باعث آزاد اور معرّیٰ نظم نگاری رواج دی جا رہی تھی۔ آج آزاد اور معرّیٰ شاعری موقر اور محترم ہے لیکن ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ اس کو ناپسندیدہ بلکہ تحقیر

ی نظروں سے دیکھنے والے بھی کافی تھے۔ فی الوقت آزاد اور معریٰ شاعری کے حسن و قبح سے بحث نہیں لیکن کپور نے اس وقت جب کہ ایسی شاعری مشکوک تھی اور معاشرے میں اس کی پذیرائی نہیں ہو رہی تھی، معاشرے کے ردعمل کو اپنی پیروڈیوں کے ذریعہ عمدہ اور دل کش انداز میں پیش کیا۔ ایک حد تک یہ درست ہے کہ کپور کا یہ رویہ نئے شعری تجربوں کی راہ میں حائل ہوا۔ اور کپور نے یوں ادبی قدامت پسندی کا ثبوت دیا لیکن یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اس خصوص میں جو بے راہ روی کے اندیشے تھے کپور نے اس کا سدباب کرنے میں ایک اہم حصہ ادا کیا۔ اگرچہ آزاد اور معریٰ نظم نگاروں میں کئی ایک کپور کے دوست اور بعض تو عزیز تھے لیکن کپور نے اپنے عصری شعور کا ثبوت دیتے اور ان روابط کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے ردعمل کا برملا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں ان کے مضامین "چلنی شاعری" "سناتے کا مرض" "غالب جدید شعراء کی ایک مجلس میں" اور حالی، ترقی پسندوں کی محفل میں، اہمیت رکھتے ہیں۔ یہاں انھوں نے اپنی شعری صلاحیتوں کو بھی بروئے کار لایا ہے تحریف نگاری کے زاویے سے اگر ان مضامین میں کپور نے بے مثال نمونے پیش کئے ہیں تو اسی کے ساتھ آزاد اور معریٰ شاعری پر اس سے زیادہ جامع طنز شاید ممکن بھی نہ تھا۔ کپور کی مقبولیت میں ان مضامین کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ یہ فن پارے اس قدر معروف ہیں کہ ان سے مثالیں دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بس ایک مثال کافی ہوگی غالب کے اس شعر ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے، خدا کرے کوئی

کو ذہن میں رکھیے۔ کپور جدید شاعری کو ہدف ملامت بناتے ہیں:

جنوں ہوا ، جنوں ہوا
مگر کہاں ، جنوں ہوا
کہاں ہوا وہ کب ہوا
نہیں ہوں میں یہ جانتا
مگر جدید شاعری
میں کہنے کا جو شوق ہے
تو بس یہی ہے وجہ کہ
دماغ میرا چل گیا
یہی سبب ہے جو مجھے
جنوں ہوا جنوں ہوا
(غالب، جدید شعرا کی ایک مجلس میں)

ونیز جدید شعراء کو نشانہ بناتے ہوئے انھوں نے فیض، راشد اور اپنے دیگر ہمعصروں کی تخلیقات کی خوب خوب تحریف کی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس بھی پڑھتے چلیں، کپور نے ایسے ترقی پسندوں پر جنھوں نے اس تحریک کو اپنے ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا چاہا اور استعمال کیا بڑا لطیف طنز کیا ہے۔ ترقی پسند حالی سے اپنا رشتہ قائم کرتے ہیں جبکہ کپور نے حالی ہی کی زبان سے ترقی پسندوں پر طنز کیا ہے۔ "ترقی پسند شاعر" کی ترکیب پر حالی کہتے ہیں؛

مجھے یہ ترکیب کچھ ذو معنی سی معلوم ہوتی ہے۔ میں ہمیشہ اس کا مطلب یہ لیتا ہوں کہ ترقی پسند شاعر وہ ہے جو اُردو شاعری کے بجائے اپنی ترقی چاہتا ہے۔" (حالی، ترقی پسندوں کی محفل میں)

کپور کا تعلق پنجاب سے رہا۔ کچھ اس دور اور اُن حالات کا قیاس کیجیے جب کہ اہلِ پنجاب اور اہلِ لکھنؤ و دہلی زبان اور اہلِ زبان کی اصطلاحوں کے چکر میں رہے اور ایک دوسرے پر اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے کوشاں ا۔ کچھ ایسا لگتا ہے کہ کپور کو اس سلسلے میں تلخ تجربات سے دو چار ہونا پڑا۔ اوروں نے چپ سادھ لی ہو۔ لیکن کپور کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ اہلِ زبان کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور ایسے شستہ و شائستہ انداز میں کہ اہلِ زبان بھی کپور کے زبان و بیان کی داد دیے بغیر نہ رہ سکیں۔ کپور کی زبانی سماعت فرمائیے، اہلِ زبان کی تعریف:

"اہلِ زبان اس لیے اہلِ زبان نہیں کہلاتے کہ وہ واقعی اچھی زبان بولتے یا لکھتے ہیں بلکہ اس لیے کہ حسنِ اتفاق سے وہ ان اضلاع کے گرد و نواح میں پیدا ہوئے تھے جہاں کہ آج سے دو سو سال پہلے زبانِ اردو کو فروغ حاصل ہوا۔" (اہلِ زبان)

طنز نگار کو مزاح نگار سے زیادہ چوکس اور زبان و بیان پر قدرت و قابو کا حامل ہونا چاہیے۔ الفاظ کا چابک دستی کے ساتھ استعمال بھی بسا اوقات خاصا غضب ڈھا جاتا ہے کامیاب طنز کے لیے معاشرے کی ناہمواریوں کا باریک بینی سے جائزہ لینا چاہیے۔ علاوہ ازیں بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کے اظہار کی جرأت بھی طنز نگار کے لیے لازمی ہے۔ خیالِ خاطرِ احباب، پاسِ معاشرہ، اور لحاظِ اربابِ حکومت، ہو تو طنز کی دھار کند ہو جاتی ہے، طنز ٹھٹھر جاتا ہے۔ کپور نے زندگی اور زمانے کا ہر رنگ اور ہر رخ سے مطالعہ کیا ہے، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ۔ اسی کے ساتھ وہ اپنے خیالات کے اظہار میں کسی تکلف سے کام نہیں لیتے اس کا اندازہ یوں بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کا پہلا مضمون "نقصان" کرشن چندر کے افسانے "یرقان" کی پیروڈی تھا۔ جس کو محض اس لیے تلف کر دیا گیا کہ کپور نے اس میں نہایت بے باکی کے ساتھ اور دوٹوک انداز میں کرشن چندر کے اسلوب کا خاکہ اڑایا تھا۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کپور کے کرشن چندر سے گہرے اور قریبی مراسم تھے۔ بڑے آدمیوں، سیاست دانوں اور اربابِ حکومت کے تعلق سے بھی کپور کا یہی رویہ تھا بلکہ مزید تیکھا، تلخ اور ترش!
—— ہم سب بڑے آدمیوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھار تو ایسا لگتا ہے کہ اس معاشرے میں سوائے "میں" کے اور سب بڑے ہیں۔ اور جو ہیں ہی بڑے، اُن کا تو پوچھنا ہی کیا ہے؟ اپنے آپ میں مگن اور عقل و فہم سے ماورا۔ کپور کے قلم سے ان کا تعارف:

"بڑے آدمی کو سوائے دو باتوں کے اور کسی قسم کا فکر نہیں ہوتا۔ اول یہ کہ اس نے پیٹ بھر کھانا کھا لیا ہے؟ اور دوسرے یہ کہ اس کے کتے نے پیٹ بھر کھانا کھا لیا ہے؟ کیونکہ اس کے خیال میں دنیا میں صرف دو جاندار بستے ہیں۔ وہ اور اس کا کتا۔ اس کے علاوہ بڑے آدمیوں میں یہ خوبی ہے کہ وہ دماغ کے بغیر گزارہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ انہیں سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور نہ ہی وہ کچھ سوچنا چاہتے ہیں۔" (بڑے آدمی)

اور یہ بڑے آدمی نہیں، بڑے آدمیوں میں بھی بڑے آدمی ہیں، سیاست داں، بلکہ خصوصی بڑے آدمی کہیے، یعنی وہ سیاستداں

ہو گاندھی جی سے اپنا رشتہ استوار کرتے ہیں۔ تحریروں اور تقریروں کی حد تک: خدارا یہ نہ سمجھیے کہ عملاً بھی۔ کیونکہ گاندھی کی شخصیت کو یہ اتنی زحمت دینا گوارا نہیں کرتے۔ یہ تو کنہیا لال کپور ہی کا کیا، ہم سب کا بھی مطالعہ ہے۔ کپور نے اس کو بس اسلوب میں پیش کر دیا ہے:

"میں ترنگے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ باپو کے بلیدان کو کبھی نہیں بھولوں گا، لیکن باپو کے بتائے ہوئے اصولوں پر کبھی عمل نہیں کروں گا۔ میں بات بات میں گاندھی جی کی دہائی دوں گا لیکن مجھے گاندھی جی کی دہائی دی جائے گی تو میں اس کی بالکل پروا نہیں کروں گا۔ ایک سچے دیش بھگت کی طرح دیش کا روپیہ اس وقت تک برباد کرتا رہوں گا۔ جب تک کہ دیش کا دیوالیہ نہیں پٹ جاتا۔ اندھا یا بہرہ ہو جانے کے بعد چاہے مجھے لاٹھی کے سہارے یا اسٹریچر پر سوار ہو کر آنا پڑے میں ریٹائر ہونا پسند نہیں کروں گا اور تب تک گدی سے چمٹا رہوں گا۔ جب تک کہ میرا جنازہ دفتر سے نہیں نکلتا۔ (آزادی کی قسم)

یہاں طنز قدرے واضح ہے، اور حقیقت پسندانہ۔ گویا طنز نہیں، حقیقت محض ہو۔ اپنے اسی راست اور رو رعایت سے عاری طنز کے باعث کپور کا نشانہ چبھتا ہوا ہوتا ہے وہ مزاح کم ہی پیدا کرتے ہیں اور اپنے طنز کے نشتروں سے شکار تلملاتا چھوڑ جاتے ہیں۔

سیاست دانوں کو اپنے طنز کا نشانہ کس نے نہیں بنایا اور بہت کم اوقات، مثبت انداز میں۔ کپور نے بھی سیاست کی خوب خبر لی ہے۔ انتخابات کا میدان سے کون نہیں جانتا کہ یہاں کیا نہیں ہوتا۔ یہ میدان کس کے ہاتھ آتا ہے، کب اور کیوں؟ ایسا راست اور تند و تلخ طنز، کوئی عجب نہیں سیاست دانوں کے لیے ناقابل برداشت رہا ہو لیکن کپور ہیں کہ کسی پاس و لحاظ کے بغیر انتخابات کی صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں:

"دوسرا امیدوار آخر دم تک ڈٹا رہا کہ نہایت سخت جان واقع ہوا تھا۔ اس کو سیٹھ صاحب کے مقابلے میں صرف پانچ فیصد ووٹ ملے تھے اور بیچارے کی ضمانت بھی ضبط ہو گئی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ تعلیم یافتہ تھا۔ "سیاست" کو سمجھتا تھا۔ شاید عوام کی خدمت بھی کر سکتا تھا مگر اس کمبخت نے غلطی یہ کی کہ اپنا نشان "ھما" منتخب کر لیا اور آپ جانتے ہیں کہ اپنے دیس میں "کاٹھ کا الو" کے مقابلے میں "ھما" کو کون پوچھتا ہے۔" (کاٹھ کا الو)

کاٹھ کا الو، سیٹھ صاحب کا انتخابی نشان تھا، جو منتخب ہوئے۔

"انارکلی" اردو کا معروف ترین ڈرامہ مغل حکمران اکبر اعظم کے دربار کی ایک روایت پر مبنی ہے۔ ادبی طور پر امتیاز علی تاج کے ڈرامہ کو جو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس سے کپور نے استفادہ کیا ہے لیکن ڈرامہ نگاری یا امتیاز علی تاج کے اسلوب مغل سلطنت کے رنگ ڈھنگ کو طنز و مزاح کا نشانہ بنانے کی بجائے موجودہ دور کے حکمرانوں اور انداز حکمرانی کی قلعی کھول دی ہے۔ عصر حاضر کے حکمرانوں کی دل چسپیاں، ان کے فکر کی سطحیت، رموز مملکت، کابینہ کی خر مستیاں، پارلیا کی بوالعجبیاں اور اسی نوع کی کارروائیوں کو کپور نے بیدار مغزی اور ہنرمندی کے ساتھ اپنے طنز کے دائرہ میں سمیٹ لیا ہے

طنز کے ساتھ کہیں کہیں مزاح کی چاشنی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ انداز بیان نے طنز و مزاح کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے، ایک جادو جگا دیا ہے۔ کپور کے اس مضمون میں اکبر اعظم یہاں اکبر اعظم بھی اسی دور کے ہیں اور سلیم، انار کلی اور دیگر کردار بھی ——— امریکی سگار، لتا منگیشکر اور طلعت محمود کے گانوں کے رسیا ہیں سلیم ہے بی ایس سی کا طالب علم، انگریزی لباس، انگریزی گفتگو اور ہندوستانی فلموں کا شوقین۔ انار کلی بھی اس کے ساتھ غرارہ اور قمیص میں ملبوس، بیراکی اور شینس کی چمپین۔ بیربل پارکر ۵۱ سے لکھتے اور فون استعمال کرتے ہیں اور ابوالفضل سوٹ زیب تن فرماتے۔ اور خدا حافظ کی بجائے "گڈ بائی" کہتے ہیں۔ اس طرح حکمرانوں اور طرز حکمرانی سے ماوراء کپور نے عصر حاضر کے معاشرے پر بے حد اچھوتے اور کاری طنز کیے ہیں۔ پوچھیے تو اس مضمون کا کینوس مزید کشادہ اور عصری زندگی کے کئی پہلوؤں پر محیط ہے ——— آل انڈیا ریڈیو کی تقاریر اور روس کا اسٹالن پرائز کپور کے قلم کی زد میں ہیں! انار کلی کو سلیم سے محبت کرنے کے جرم میں سزا دینے کے مسئلہ پر اکبر کی کابینہ کا خاص اجلاس، دیوانِ خاص، شاہی قلعہ لاہور میں ہو رہا ہے۔ ہر رکن اظہار خیال کرتا ہے، سزائیں تجویز کی جاتی ہیں۔ اور مسترد۔ ملا دو پیازہ اپنی تجویز پیش کرتے ہیں۔

"ملا دو پیازہ: میرے خیال میں انار کلی کو سزا کے طور پر آل انڈیا ریڈیو کی تمام تقاریر سننے پر مجبور کیا جائے۔

اکبر: یہ بہت سنگین سزا ہوگی۔ ہمارا ذاتی تجربہ ہے کہ صابر سے صابر سامع بھی آل انڈیا ریڈیو کی تقاریر کی ایک دو منٹ سے زیادہ تاب نہیں لا سکتا۔

بیربل: اس سزا کے متعلق کیا خیال ہے؟

اکبر: کہیے۔

بیربل: انار کلی کو وہ تمام روسی ناول پڑھنے کے لیے کہا جائے جن پر اسٹالن پرائز مل چکا ہے۔

اکبر: یہ سزا حد سے زیادہ منتقمانہ ہوگی۔ (سلیم اور انار کلی)

بعض مواقع پر طنز محض کے باعث کپور کے مضامین میں دلآویزی کا فقدان اور تاثیر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ "چار زندہ دل سیاست داں" ایک ایسا ہی مضمون ہے۔ ہمارے سیاست دانوں پر طنز کے سلسلے میں رشید احمد صدیقی کے "ارہر کے کھیت" کا جواب اردو میں شاید ہی ملے۔ لیکن تاثیر کی کمی کے باوجود "چار زندہ دل سیاست داں" میں کپور نے سیاسی مسائل پر دلچسپ چوٹیں کی ہیں:

"میں تو دن رات یہ سوچا کرتا ہوں اگر آدمی بادام کے چھلکے، اخروٹ کے چھلکے، کیلے کے چھلکے اور سنگترے کے چھلکے کھایا کرے تو نہ صرف زندہ رہ سکتا ہے بلکہ لمبی عمر بھی پا سکتا ہے۔" (چار زندہ سیاست داں)

کمیٹیوں اور کمیشنوں کا قیام، مسائل کو ملتوی کرنے بلکہ ان سے فرار حاصل کرنے کا شستہ و شائستہ اور آج کے طرز حکمرانی کا محبوب رویہ ہے۔ کیسے کیسے مسائل اور معاملات کی چھان بین کے لیے کمیشن قائم کیے جاتے ہیں کہ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔ کپور کے ہاں مبالغہ سہی لیکن ایسا زیادہ بھی نہیں۔ چوتھے سیاست داں کی زبانی:

"ابھی کل ہی خیال آیا پچھلے پچاس سال میں جتنے بھونچال آئے ہیں ان کے متعلق ایک کمیشن قائم کرنے

کا ارادہ ہے جو یہ تحقیق کرے گا آیا شاہ جہاں قدرتی موت مرا تھا یا اُسے زہر دے دیا گیا تھا یا اس نے خود کشی کر لی تھی۔ پھر ایک اور کمیشن قائم کروں گا جو پتہ لگائے گا کہ میں تمام قدیم اور جدید سیاست دانوں سے کیوں عقلمند ہوں؟" (چار زندگی سیاست داں)

ادراب کمیٹیاں جو ضروری اشیار کی قیمتوں کے بارے میں ہیں۔ تیسرے سیاست داں:

"پانچ کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ پہلی اس بات کی تحقیق کرے گی آیا قیمتیں بڑھی ہیں یا محض افواہ ہے۔ دوسری اس بات کا فیصلہ کرے گی کس حد تک بڑھی ہیں۔ تیسری یہ سراغ لگائے گی کیوں بڑھی ہیں۔ چوتھی یہ تجویز کرے گی انھیں فوراً بڑھنے سے روکنا اور پانچویں یہ انکشاف کرے گی انھیں بڑھنے سے کسی طرح بھی روکا نہیں جا سکتا۔" (چار زندہ دل سیاستداں)

سچ پوچھیے تو عصر حاضر کے سیاست دانوں اور ان کی غیر ذمہ دار سیاست کا ایک اہم سبب جمہوری نظام ہے۔ جمہوریت کی لاکھ خوبیاں ہوں مگر دو چار خامیاں ہو سکتی ہیں۔ ان میں ایک اہم خامی یہ بھی ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں جمہوریت میں زبانی جمع خرچ زیادہ ہے، سیاست دانوں کو ان کے عمل سے نہیں ان کے قول سے جانچا اور منتخب کیا جاتا ہے۔ بھلا کپور جیسا فنکار اس سلسلے میں خاموشی کیسے اختیار کرتا۔ جمہوریت پر معنی خیز طنز ہے۔

جمہوریت میں زبان قینچی کی طرح، چلنے لگتی ہے مگر دماغ سوچنا بند کر دیتا ہے۔ جمہوریت کو اسی لیے پسند کیا جاتا ہے کیونکہ عوام گفتار کو کردار پر ترجیح دیتے ہیں۔" (چچا سلیمان)

جمہوریت اور سیاست دانوں کے تذکرے کے ساتھ وکلا کا حوالہ ناگزیر ہے۔ دراصل یہ ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں۔ ایک ہی منظر کے دو حصے۔ وکلا پر کپور کا طنز سیاست دانوں پر طنز سے کہیں زیادہ زہرناکی کا حامل ہے انہوں نے یہاں سیاست دانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ بظاہر یہ مبالغہ آرائی لگتی ہے لیکن ایسا نہیں ہے انھوں نے حقیقت کو اپنے انداز میں آئینہ دکھا دیا ہے اور بس!

"ایک دفعہ نجانے خدا کو کیا سوجھی کہ اس نے چلا کر کہا۔ صداقت۔ چشم زدن میں دنیا میں صداقت کا ڈنکا بجنے لگا اور بے چارہ جھوٹ دم دبا کر دنیا سے بھاگ گیا۔ تمام لوگ حتی کہ وکلا اور سیاست داں بھی سچ بولنے لگے۔" (صداقت)

زندگی کے اور کون سے موضوعات ہوں گے جن پر کپور نے اظہار خیال نہیں کیا۔ انھوں نے رنگا رنگ موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور یہ ان کا کمال فن ہے کہ ان کے ہر مضمون میں بے ساختگی، آمد اور رواں دواں کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کے فن کا بنیادی مقصد معاشرے کی ناہمواریوں اور غیر ضروری جذباتیت کو نشانہ بنانا ہے۔ جہاں بھی انھوں نے ناہمواریوں اور غیر ضروری جذباتیت کو راہ پاتے دیکھا اپنا فرض انجام دیا۔ اپنے مضمون "جمود" میں انھوں نے ان افراد پر کاری ضرب لگائی ہے جو خود تو لکھتے لکھاتے نہیں، ادب میں جمود کا رونا روتے ہیں۔ یہ ادب میں جمود نہیں ان افراد کی بے عملی ہے"۔ جنگ کی برکتیں" میں جنگ کے دوران حالات کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ارباب بست وکشاد اور ان کی پیدا کردہ کساد بازاری کو ہدف طنز بنایا گیا ہے"۔ خارستان" میں ملک کے فرقہ وارانہ فسادات"۔ پھر لکھیے" اور زوتی کو کسی طور فلمی صنعت کپور کی تنقید کا مرکز ہیں۔ مضمون "ریڈیو" میں غیر دلچسپ ریڈیائی پروگراموں کی رسوائی ہوتی ہے اور جدید "آرٹ"——— "جدید آرٹ" ہمارے طنز و مزاح نگاروں کا دلچسپ موضوع رہا ہے۔ جدید شاعری کی طرح کنہیالال کپور نے جدید آرٹ پر بھی

اظہار خیال کیا ہے اور جدید آرٹ کے عجائب و غرائب پر اپنے ردِعمل کو مزاح کی چاشنی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ طنز و مزاح کی ایسی آمیزش کپور کے یہاں کم ملتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"ایک دفعہ یونیورسٹی میں جدید آرٹ کی نمائش ہو رہی تھی۔ ہم چونکہ نہ قدیم اور نہ جدید آرٹ سمجھتے ہیں اس لیے ہم نے اس نمائش کو دور سے سلام کرنے میں ہی خیریت سمجھی۔ مگر ہمارے ایک لکھنوی دوست کہ جدید آرٹ پر جان چھڑکتے ہیں ہمارے ہاں آ ٹپکے اور اصرار کرنے لگے ہم بھی ان کے ساتھ یونیورسٹی ہال چلیں۔ وہاں جا کے دیکھتے ہیں کہ ایک سے ایک عجیب تصویر ہے۔ ایک تصویر کا نام ہے "دو بہنیں" لیکن دو بہنوں کی دو موم بتیاں دکھائی گئی ہیں۔ ایک تصویر ہے "دلہن" جو پیرا شوٹ سے ملتی جلتی کوئی چیز نظر آتی ہے۔ ایک اور تصویر رقاصہ ہے۔ لیکن رقاصہ کہیں نظر نہیں آتی۔ البتہ ایک سارنگی گھنگھرو باندھ کر ناچ رہی ہے۔ ہمارے آرٹسٹ دوست ان تصویروں کو دیکھ دیکھ کر اچھل پڑتے تھے اور بار بار فرماتے "واللہ کیا بات پیدا کی ہے" ہم پوچھتے "کہاں"۔ وہ جواب دیتے "صاحب دماغ چاہیے جدید آرٹ کو سمجھنے کے لیے۔" (میلے ٹھیلے)

یہ تو آرٹ اور جدید آرٹ کی بات تھی۔ لیکن یہ بھی دیکھیے کہ ہم سب کا آرٹ کیا ہے:

"یہی تو ہمارا آرٹ ہے کہ ہم کچھ بھی نہ ہوتے ہوئے بہت کچھ ہیں۔" (سلیم اور انارکلی)

کپور کا ایک مضمون ہے "عورت، محبت، زندگی، انسان" — اس کو کپور کے فن کا حاصل اور نچوڑ کہیے۔ کپور کے زندگی کے غائر مطالعے، ان کے تخیل کی بلندی مشاہدے کی وسعت اور فکر کی گہرائی کا یہ مضمون واضح ثبوت ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ایک ایک جملے میں انھوں نے اپنے فکر و فن کی دنیا کو سمیٹ لیا ہے۔ کوزے میں دریا کو بند کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ ہر جملہ اپنی جگہ قولِ محال کی حیثیت رکھتا ہے۔ موزونیت برجستگی اور حلاوت کے باعث لائق داد بھی۔ کپور نے اپنے ماحول کا کتنی عمدگی، کتنی ندرت مگر کیسی احتیاط اور اہتمام کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ جیسے انھوں نے ماحول کو اپنے میں جذب کر لیا ہو، ماحول کا حصہ بن چکے ہوں۔ عصری شعور کا یہ رنگ رخ بہت کم فنکاروں کے حصے میں آتا ہے طویل اقتباسات دینے کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت! دو ایک مختصر سے اقتباسات درج ہیں۔ عورت کے بارے میں کپور کے فکر و فن کا نچوڑ:

"عورت ارضِ مشرق میں صید اور ارضِ مغرب میں صیاد ہے۔ عورت ہندوستان میں آنسو، ترکی میں مسکراہٹ اور انگلستان میں خندۂ بے باک ہے۔ عورت جب محبت کرتی ہے تو ابوالہول کی پہیلی نفرت کرتی ہے تو بپھری ہوئی شیرنی اور حسد کرتی ہے تو کڑکتی ہوئی بجلی ہے۔ اس کا سب سے بڑا مطالعہ خوشامد سب سے بڑا راز دار آئینہ اور سب سے بڑی کمزوری محبت ہے۔" (عورت، محبت، زندگی، انسان)

اور اب زندگی:

"زندگی مصر کی شہزادی کلیوپٹرا ہے۔ جو ہر عاشق کی محبت کا دم بھرتی ہے مگر جو کسی سے وفا نہیں کرتی..... زندگی میراجی کی نظم ہے جس کے ایک سے زیادہ مطالب ہو سکتے ہیں..... زندگی دلدل ہے جس میں ہر شخص کچھ اس طرح دھنس جاتا ہے کہ نہ خود نکل سکتا ہے نہ اسے نکالا جا سکتا ہے۔" (عورت، محبت، زندگی، انسان)

آخر میں انسان، جس کو اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر بڑا ناز ہے اور کیوں نہ ہو:

"انسان اشرف المخلوقات ہے کیونکہ لومڑ سے زیادہ چالاک، بھیڑیئے سے زیادہ خونخوار اور اونٹ سے زیادہ کینہ ساز ہے۔" (عورت، محبت، زندگی، انسان)

کیسی شدید، بے رحم اور زہر میں بجھی ہوئی طنز نگاری ہے لیکن حقیقت سے کس قدر ہم آہنگ۔ ہر طنز نگار کے لیے طنز کے ایسے کڑکتے وار ممکن نہیں۔ یہ انہی طنز نگاروں کا منصب ہوتا ہے۔ جو معاشرے اور اپنے اطراف واکناف میں رچ بس گئے ہوں۔ جن کو معاشرے کی صلاح وفلاح اور زندگی اور زمانے کے اثباتی اقدار اور ہر شئے سے بڑھ کر عزیز تر ہوں، ہر قدم پر مقدم ہوں۔ جن کا عصری شعور تابناک اور طرحدار ہو۔ جن کو اپنی بصارت سے زیادہ اپنی بصیرت پر اعتماد ہو —— اور یہ بصیرت جن کو درون پردہ کا نظارہ کراتی اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے میں اعانت کرتی ہو۔ ایسے فن کار ہر زبان وادب میں کم ہیں، اردو میں بھی —— لیکن، کپور کا شمار ایسے ہی معدودے چند فنکاروں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے طنز کو معاشرتی اصلاح کے ایک اہم وسیلہ کے طور پر استعمال کیا اور ادب میں اس کے موقف کو موقر اور مستحکم کیا۔ ۞۞

فضل جاوید

کپور بحیثیت پیروڈی نگار

کنہیالال کپور دورِ حاضر کے صفِ اول کے طنز و مزاح نگاروں میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ڈی ایم کالج موگا (پنجاب) میں پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے۔ انگریزی ادب کے استاد تھے اور انگریزی ادیبوں اور طنز نگاروں سے کافی متاثر تھے۔ ان کی تحریروں میں خاص طور پر سوئفٹ اور اسٹیفن لی کاک کی طرز کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ وہ ایک کامیاب طنز نگار تھے۔ ان کا طنز بالکل غیر جانب دارانہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ خود کو بھی اپنے طنزیہ تیروں کی زد میں لے آتے ہیں۔ ہر طنز و مزاح نگار کی طرح کپور نے بھی پیروڈی کو منہ لگایا۔ چونکہ پیروڈی انگریزی ادب سے ہو کر ہی ہمارے ادب میں داخل ہوئی ہے اس لیے کپور کی لکھی ہوئی پیروڈیاں فنی خصوصیات سے لبریز ہوتی ہیں۔ گہرا مشاہدہ، وسعت فکر اور دوسرے علوم سے واقفیت نے ان کی پیروڈیوں کو ایک نیا بانکپن عطا کیا ہے۔ وہ ہنستے ہنساتے سماج اور معاشرے کی خامیوں اور نقائص کو اجاگر کرتے ہیں ـــــ ان کی لکھی ہوئی پیروڈیوں کو پیروڈی کے کسی بھی جائزے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پیروڈی یونانی زبان کے لفظ پیروڈیا سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں جوابی نغمہ۔ پیروڈی دراصل اس مضحکہ خیز تصرف کا نام ہے جس میں اصل سنجیدہ تخلیق کے الفاظ اور خیالات مزاحیہ تاثرات کے ساتھ بدل دیئے جاتے ہیں۔ کسی تخلیقی سرمایہ کو مدنظر رکھ کر پیروڈی نگار اصل مصنف یا شاعر کے اسلوب بیان، اس کے تیور اور اس کے انداز فکر کو مزاحیہ شکل میں کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ اصل تخلیق کے سنجیدہ خیالات یکسر بدل جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ مزاح لے لیتا ہے۔ کبھی کبھی اصل تخلیق سے چند مصرعے یا کوئی نثری حصہ پیروڈی میں شامل کرنا کوئی نقائص نہیں بلکہ یہ پیروڈی کا حسن سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ایک روشن مثال کپور کی نظم "لکا تی" ہے جو دراصل فیضؔ کی شہرۂ آفاق نظم "تنہائی" کی بے مثال پیروڈی ہے۔ جب قاری اس پیروڈی کے آخری مصرعہ پر پہنچتا ہے جو دراصل اصل نظم کا ہی مصرعہ ہے تو اس کے ذہن پر فیض کی نظم پرچھائیں کی طرح ابھرنے لگتی ہے۔ کپور کی یہ پیروڈی اپنی تمام تر فنی خصوصیات سے معمور ہے۔ کپور کا مقصد یہاں فیض کا مذاق اڑانا نہیں ہے بلکہ ان کی نظم تنہائی کا مخصوص

انداز اور طرزِ بیان ہے کہ اس کے فن کو اپنے طور پر نمایاں کرنے کا خیال ہے تاکہ قدردانوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے بغیر تشبیہ و استعارے کا سہارا لیے طرزِ بیان کو ہلکے پھلکے مضامین میں جس طرح کپور نے صرف کیا ہے یہ انہی کا حصہ ہے فیض کے آخری مصرعہ کو پیروڈی میں نئے انداز سے پیش کر کے فیض کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ پیروڈی ملاحظہ ہو:

فون پھر آیا، دلِ زار نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامنِ افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمۂ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

پیروڈی ایک ایسی صنف ہے جس میں نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی ہوتی ہے۔ منظوم پیروڈیوں کا ایک خطیر سرمایہ ہمارے ادب میں موجود ہے لیکن نثر کے میدان میں پیروڈی نگار اترتے ہوئے گھبراتا ہے کیونکہ نثر طویل ہوتی ہے اور یہی طوالت کا خوف اس کے اشہبِ قلم کی باگ پکڑ لیتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ نظم کے مقابلہ میں نثری پیروڈیوں کی تعداد کم ہے۔ لیکن جو کچھ بھی نثر میں لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے وہ ایک پیروڈی کی بقا کے لیے ایک نیک فال ہے۔ سنجیدہ لکھنے والوں نے جب بھی اس شوخ صنف کو منہ لگایا یہ ایک نئی شان سے ابھری ہے۔

کپور نے "غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں" لکھ کر پیروڈی کی نئی راہیں متعین کی ہیں۔ اس صنف کو ایک ایسے انداز سے روشناس کر دیا جس سے ہمارا ادب واقف نہیں تھا۔ نثر کے جدید دور میں اس پیروڈی کا مقام اہم ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس پیروڈی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اس پیروڈی کی خوبی یہ ہے کہ یہ بیک وقت نظم آزاد کے عام رجحانات، ان رجحانات کو درست ثابت کرنے کے اقدامات اور شاعروں میں پیدا ہونے والی فضا کی بڑے دلیرانہ انداز میں تحریف کر کے کامیاب ہوتی ہے۔"

"حالی ترقی پسند ادیبوں کی محفل میں" کپور کی ایک پیروڈی ہے اس میں بھی وہی مقصد ہے جو اول الذکر پیروڈی میں پوشیدہ ہے۔ اس میں مجاز کی شہرہ آفاق نظم "آوارہ" کے چند بندوں کی پیروڈی بہت خوبی سے کی گئی ہے۔

جی میں آتا ہے کہ اٹھ کر آج ساغر توڑ دوں
مار کر پتھر یہ خنجر اپنا خنجر توڑ دوں
توڑنے سے پہلے کشتی اس کا لنگر توڑ دوں
اپنا سر پھوڑوں نہ پھوڑوں غیر کا سر پھوڑ دوں
ہائے حسرت کیا کروں اف ہائے حسرت کیا کروں

جی میں آتا ہے کہ اٹھ کر آشیاں کو پھونک دوں
پھونک دوں یہ چاند تارے آسماں کو پھونک دوں
پھونک دوں کشتی کو اپنی بادباں کو پھونک دوں
مہرباں کو پھونک دوں نامہرباں کو پھونک دوں
وائے حسرت کیا کروں اف ہائے حسرت کیا کروں

"انارکلی" کپور کی ایک اور پیروڈی ہے۔ اس میں ہماری کھوکھلی معاشرت پر ایسے تیکھے طنز ہیں جو ہماری بدلتی ہوئی تہذیب رہن سہن اور ذہنیت پر تازیانے کا کام کرتے ہیں۔ سلیم اور انارکلی کا معاشقہ آج کی یونیورسٹیوں کے کیمپس کی صحیح تصویر کھینچ دیتا ہے۔ اکبر اعظم کا ریڈیو سیلون پر طلعت کے گانے سننا اور تان سین سے بیزاری اور خبروں سے نفرت کا اظہار۔ غرض یہ سب کچھ اس موڑ کی طرف اشارے ہیں جو آج ہماری سوسائٹی کو ہر قدم پر ملتے ہیں۔ یہ پیروڈی اصل کی طرح ڈرامہ کی شکل میں ہے۔

کپور کے ایک مضمون "ترقی پسند غالب" میں بعض بعض جگہ پیروڈی کا سا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

غالب کو ترقی پسند بننے کی دھن سوار ہوتی ہے۔ وہ اپنے ہی دیوان سے مختلف غزلوں کے مصرعے لے کر ایک غزل کے مصرعے کو دوسری غزل کے مصرعے سے باندھ دیتے ہیں۔ اس طرح کپور نے غالب ہی کے کلام کو الٹ پلٹ کر انہیں ترقی پسند بناتے ہوئے اس میں پیروڈی کا سا رنگ پیدا کر دیا ہے۔

"چند فلمی سین" میں کپور نے فلمی مکالموں کی پیروڈی کی ہے اور جذباتیت کا مذاق اڑایا ہے۔

کنہیا لال کپور نے جب "میر کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ" لکھا تو پیروڈی ایک نئے انداز سے واقف ہوئی۔ یہ ان کی شاہکار پیروڈی ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین اسے پیروڈی کی ایک اچھی مثال بتاتے ہیں۔ یہ پیروڈی کپور کے مجموعے "شیشہ و تیشہ" میں شامل ہے۔ یوں تو بہت سے مضامین میں کہیں کہیں پیروڈی کا رنگ آجاتا ہے لیکن اس پیروڈی کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے۔ میر کے مختلف اشعار کی روشنی میں انہیں مالیخولیا کا مریض ثابت کر دینا ایک بالکل انوکھا طرز تخیل ہے۔ واقعاتی یا منطقی نقطہ نظر سے میر کو مالیخولیا ہونا غلط سہی لیکن اس میں پوشیدہ ندرت، شگفتگی، برجستگی اور مزاح کا جو عنصر ہے وہ یقیناً پیروڈی کی اہلی خصوصیت سے مزین ہے۔ ایک طویل اقتباس اس پیروڈی کے حسن کو چکاچوند کرنے کے لیے کافی ہے۔

میگڈوگل کے خیال میں مالیخولیا کے علامات یہ ہیں (۱) افسردگی (۲) بے خودی (۳) توہم گری (۴) خودکشی کی خواہش (۵) جسم کا گھلنا ـــــ یہ پانچوں علامات میر میں یا یوں کہیے میر کی شاعری میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ افسردگی کو ہی لیجیے میر کا مشہور شعر ہے۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے ٭ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ہر شام میر پر گہری افسردگی چھا جاتی ہے۔ آخر کیوں؟ شام کے وقت تو عموماً شاعر لوگ نہایت خوش و خرم نظر آتے ہیں کیونکہ وہ اس وقت نئی نئی شیروانیاں پہن کر، کلے میں پان دبا کر مشاعروں میں جلوہ افروز ہوتے ہیں اور پھر میر کو تو خاص طور پر خوش ہونا چاہیے تھا کہ وہ مشاعروں کے بادشاہ تھے۔ مشاعرے تو کیا وہ عالم پر چھائے ہوئے تھے۔

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا

ظاہر ہے کہ دل کے بجھا سا رہنے کا سبب یہ نہیں مشاعرے میں سودا سے ٹکر لینے کا ڈر تھا۔ وجہ وہی ہے جو میگڈوگل نے بتائی ہے یعنی مالیخولیا۔

نوحہ گری میر کی شاعری کا جزو ہے اور میر ان لوگوں میں سے ہیں جو شبنم کی طرح نہیں بلکہ ابر کے مانند روتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد رونا میر کا روزگار ہوگیا تھا۔ فرماتے ہیں

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات ؎ اب یہی روزگار ہے اپنا

رونے کے موضوع پر میر نے لاجواب اشعار کہے ہیں اور جب ہم ان اشعار کی فنی خوبیوں کی بجائے ان کے پس منظر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ میر کو مالیخولیا نے کہیں کا نہ رکھا تھا اور بے چارے کی ساری عمر رونے میں کٹی فرماتے ہیں:

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

اسی غزل کا ایک شعر ہے ؎

یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا دن کو جوں توں شام کیا

گو یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ وہ دن کو زیادہ روتے تھے یا شب کو۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ رات کے وقت بلند آواز سے روتے تھے ؎

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

..... یہ بات واقعی عجیب ہے کہ جنون اور جوہر قابل میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ قدرت کی یہ ستم ظریفی ہے کہ عموماً اہل کمال جسمانی لحاظ سے نامکمل اور دماغی لحاظ سے بیمار ہوتے ہیں۔ ہومر، ملٹن، سُورداس اندھے تھے۔ بائرن لنگڑا۔ بی تھوون بہرا، مائکل اینجلو پاگل۔ چارلس لیمب چھ ماہ پاگل خانے میں رہا۔ جان کیٹس اور اسٹیونسن کو تپ دق تھا۔ اور میر کو مالیخولیا۔

کنہیالال کپور کی پیروڈیوں کا جائزہ لینے کے بعد میں اس مضمون کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں جس میں اردو ادب کے قدآور نقادوں پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر احتشام حسین، ڈاکٹر کلیم الدین احمد، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور قاضی عبدالودود کا انداز لے کر احمد جمال پاشا نے کنہیالال کپور پر تنقیدی نوٹ لکھے ہیں۔ "کپور ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" دراصل احمد جمال پاشا کی ایک پیروڈی ہے۔ ایک ہی شخصیت پر جب مختلف تنقید نگار حملہ آور ہوتے ہیں تو بعض کو اس میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اور بعض صرف اس کی خامیوں اور نقائص پر ہی نظر رکھتے ہیں۔ کچھ اس کی مجموعی خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہیں اور بعض ایسے بھی ناقد ہوتے ہیں جو صرف اپنے وضع کئے ہوئے اصولوں کی روشنی میں ہر چیز کو پرکھنا چاہتے ہیں۔ اس مضمون میں ان سب نقادوں کے نشانِ ملامت بنے ہوئے کنہیالال کپور الگ کھڑے ہوئے مسکرا رہے ہیں اور ادب ایک انوکھے انداز کی پیروڈی سے مالا مال ہوگیا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ پیروڈی کی ابتدا کنہیالال کپور کے ہاتھوں ہوئی۔ جب انھوں نے

غالب جدید شعراء کی ایک مجلس میں" کی تخلیق کی۔ یہ ایک الگ بحث طلب موضوع ہے۔ عبادت بریلوی کپور کی اس خوب صورت پیروڈی سے بے حد متاثر ہو کر انہیں پہلا پیروڈی نگار تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ کپور سے پہلے بھی اردو میں کافی پیروڈیاں لکھی جا چکی ہیں۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ کنہیالال کپور نے کرشن چندر کی تحریک پر لکھنا شروع کیا تھا۔ اور سب سے پہلے انھوں نے کرشن چندر کے افسانے "یرقان" کی پیروڈی "خفقان" کے عنوان سے کی۔ اور بقول ان کے یہ مضمون کرشن چندر کی ایماء پر پڑھے جانے کے بعد تلف کر دیا گیا۔ اس طرح ہمارا ادب کپور کی پہلی تخلیق کردہ پیروڈی سے محروم رہ گیا۔ ▣□

ادارہ شگوفہ
کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کیجا سکتی ہیں

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵/- روپے
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	مجموعۂ کلام	۵/۵۰ روپے
تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰ روپے
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	"	۶/- "
فقط	یوسف ناظم	"	۶/- "
تو تو میں میں	پرویز یداللہ مہدی	ڈرامے	۱۰/- "
چوڑی کے غلام	" " "	مضامین	۷/- "
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	"	۸/- "
سمن زار	خواجہ عبدالغفور		۸/- "
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعۂ کلام	۸/- "
انڈین کاجو	عاتق شاہ	مضامین	۸/- "
شوشے	ارشد علی خاں		۱۰/- "
بھلاویں کا داغ	عظمت بھلاواں	مجموعۂ کلام	۷/- "
گوبھی کے پھول	ناظم انصاری		۱۰/- "
گھوکرو کے کانٹے	علی صائب میاں	"	۵/- "
بہرحال	مجتبیٰ حسین	مضامین	۷/- "
چوں چوں کا مربہ	پاگل	مجموعۂ کلام	۶/- "

کنہیالال کپور کی طنز نگاری

مناظر عاشق ہرگانوی

لمبے لمبے بازو — لمبے لمبے ہاتھ ۔ لمبی لمبی ٹانگیں — سڈول نہیں بلکہ بے ڈول! — جن میں اگرچہ مستقیمی ضرور تھی مگر حسین بناوٹ نہیں — لمبی پیٹھ پر ہلکا سا جھکاؤ اور کمر کے گرد مجبورانہ قسم کی حسینانہ لچک — لیکن کنہیالال کپور کی لچک میں موت کی دعوت نہیں زندگی کا ایک مسلمہ اور بے باک ڈھب پایا جاتا تھا — ویسے خود کنہیالال کپور کو اپنے اس پتلے جسم کا کافی احساس تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ ایک انگریز خاتون سے ملے تو اس کا یہ احساس ایک نہایت طنزیہ لطیفے کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس خاتون نے کپور کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے کہا۔ "YOU ARE AS THIN AS A NEEDLE" کپور صاحب

کپور صاحب نے بے ساختہ بھولپن سے جواب دیا "محترمہ! آپ ذرا مبالغہ سے کام لے رہی ہیں۔ چند ایک سوئیاں مجھ سے موٹی بھی ہوتی ہیں"

کنہیالال کپور طنز نگار تھے اور کامیاب طنز نگار تھے۔ وہ ان اقدار اور اشخاص کو تختۂ مشق بناتے تھے جنہیں بے نقاب کرنے کے لیے شاہین کی نظر اور چیتے کا جگر چاہیے۔ طنز کپور کے نزدیک ایک قسم کا شگفتہ تنقید ہے اور طنز نگاری ایک مقدس شغل۔ ادب میں افادیت کے وہ پہلے دن سے ہی قائل تھے۔ انھیں کسی کی دل آزاری یا دل شکنی مطلوب نہیں تھی۔ البتہ جہالت خود غرضی اور ریاکاری کو بے نقاب کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔

کپور بنیادی طور پر طنز نگار تھے اس لیے اپنے حلیے اور جسم کی بناوٹ سے بھی طنز نگار معلوم ہوتے تھے۔ جہاں تک مذاق اڑانے اور مذاق بننے کی بات ہے، کپور خود کہتے ہیں کہ مذاق اُڑانے کے متعلق سب سے بڑا مذاق یہ ہے کہ جب کبھی مزاحیہ نگار

نشانہ چوک جاتا ہے وہ بے چارہ خود مذاق کا نشانہ بن جاتا ہے۔ شاید اسی لیے یسوع مسیح نے انجیل مقدس میں فرمایا تھا "کسی پر نقید مت کرو تاکہ کوئی تم پر تنقید نہ کرے۔" مزاح اور خاص کر طنز بہت حد تک ایک قسم کی شگفتہ تنقید ہے۔ میری دانست میں اچھی طنز لکھنے کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ اچھا ہاضمہ ـــ تیز و طرار طبیعت اور دماغی توازن ـــ اگر ان تینوں میں سے ایک چیز کی بھی کمی واقع ہو جائے تو طنز طنز نہیں رہتی، دشنام یا ہجو بن جاتی ہے۔

راشن اور پروپگنڈا کے دور میں ہاضمے اور دماغی توازن کے ٹھیک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی تیز و طرار طبیعت، تو اس کے متعلق عرض ہے۔ ع

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے!

حالانکہ کپور نے طنز و مزاح کا جو سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان سے ان کی طبیعت کے تیز و طرار ہونے کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ سبز باغ دکھاتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"آج کل تو وکالت صرف دور کے ڈھول ہو کر رہ گئی ہے۔ آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا جاتی ہیں اور موکل نظر نہیں آتا۔ آپ کے سے لائق آدمی کو تو انشورنس ایجنٹ ہونا چاہیے تھا۔ بس وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ مہینے بھر میں اگر ڈیڑھ سو کیس کمپنی کو دیتے تو دو ہزار کمیشن بنتی۔ آپ بن بیٹھے وکیل۔ آمدنی صفر۔ خرچ بے حساب۔ نتیجہ پریشانی۔ اجی وکیل صاحب! وکالت بھی کسی قسمت والے کی چلتی ہے ورنہ اکثر تو گھر سے کچہری اور کچہری سے گھر کے چکر میں ہی پڑے رہتے ہیں۔ آپ تو خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہزاروں ایسے کام ہیں جو آپ کر سکتے ہیں۔"

(سبز باغ)

کپور کے اس طرح کے مضامین کو ہم شاطرانہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ ادب کی اس صنف (طنز و مزاح) کو زندگی کا آئینہ بخشتے ہیں۔ "جانشین" سے یہ اقتباس دیکھیے!

(ایک کمرے کے انٹرویو بورڈ امیدواروں سے انٹرویو کر رہا ہے۔ نارد مُنی ایک امیدوار کے بھیس میں کمرے میں داخل ہوتے ہیں)

انٹرویو بورڈ کا ایک ممبر: تعلیم؟ قابلیت؟ سفارش؟

نارد مُنی: فرسٹ کلاس ایم اے ہوں۔ یونیورسٹی میں دوئم رہا تھا۔

دوسرا ممبر: سفارش؟

نارد مُنی: سفارش کوئی نہیں۔

تیسرا ممبر: (قہقہہ لگا کر) سفارش کوئی نہیں اور ملازمت حاصل کرنے آئے ہیں!"

طنز ادب کی ایک اہم صنف ہے اور ادب چونکہ زندگی کا نباض ہے اس لیے وہ قوم کی مخصوص نفسیات، عصری میلانات اور نفسی محرکات کی آئینہ داری کرتا ہے۔ یوں دیکھیں تو ہر ادب کی کروٹوں میں اس عہد کے معاشی، معاشرتی اور نفسی واردات سے تشکیل پذیر ہونے والی مخصوص قومی نفسیات رنگ افروز ہوتی نظر آتی ہے۔ کپور کے بیشتر طنزیہ و مزاحیہ مضامین اسی نفسیاتی اہمیت کے حامل ہیں۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔

کہ پارلیمنٹ کا ممبر بنتے ہی
ہر بالغ دنابالغ کا راشن تگنا کردوں گا۔
پانچ سال کے لیے کسی شخص پر انکم ٹیکس نہیں لگنے دوں گا۔
آٹے کا بھاؤ پندرہ روپے من سے پندرہ آنے من کردوں گا۔
گھروں میں جتنے چوہے ہیں، ان سب کو چن چن کر مروا دوں گا۔
اپنے حلقے میں ایک بھی آوارہ کتے کو نہیں رہنے دوں گا۔
ہر طالب علم کی فیس معاف کرا دوں گا۔
ہر چھوہڑ بیوی کو خاوند کی مارپیٹ سے بچانے کا انتظام کروں گا۔
کسی بھی گندے نالے کو گندا نالہ نہیں رہنے دوں گا۔ (کاٹھ کا اُلّو)

کپور نے اپنے عہد کے مختلف النوع معاملات اور گوناگوں ناہمواریوں اور عام زندگی کے بے ڈھنگے پن کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کا معاشرہ تو ان کے طنز و مزاح کا موضوع ہے ہی ساتھ ہی ان کا طنز ان کی خود کی ذات کی الجھنوں اور ذاتی معاملات کی تلخیوں کا نتیجہ بھی ہے، انھوں نے ذاتی معاملات یا نجی زندگی کی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے یعنی ان کے طنز و مزاح کی اساس ذاتی اغراض و مقاصد پر بھی ہے۔ "اپنی یادیں" کے تحت خود کے بارے میں لکھتے ہیں:

"۱۹۴۲ء میں انھوں نے ایک چونکا دینے والا مضمون "غالب ترقی پسندوں کی مجلس میں" لکھا اور ۔۔۔ اردو کی ساری ادبی دنیا میں مشہور ہو گئے، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ بائرن کی طرح ایک صبح اٹھے اور انہوں نے اپنے کو مشہور پایا لیکن یہ ٹھیک ہے کہ انہیں مشہور ہونے کے لیے شدید انتظار نہیں کرنا پڑا۔ یہ شہرت ان کے حق میں مُہر ثابت ہوئی کیونکہ بہت جلد انھوں نے محنت سے لکھنا ترک کر دیا۔"

طبی نقطۂ نظر سے سردی کے موسم میں سر کے بال عموماً گرتے ہیں۔ اس حقیقت کی تال میل کپور جنت بے نظیر کشمیر سے جوڑتے ہیں:

ایک بار کچھ دوست گھیر گھار کر انھیں کشمیر لے گئے۔ کشمیر کے متعلق مشہور ہے کہ اگر بھنا ہوا مرغ بھی اس سرزمین میں ہو تو اس کے بال و پر دوبارہ نکل آتے ہیں لیکن ان پر کشمیر کی آب و ہوا کا اثر یہ ہوا کہ سر کے آدھے سے زیادہ بال جھڑ گئے۔ یعنی گنجے ہونے سے بال بال بچے۔ اس واقعہ کے بعد انھوں نے کبھی کشمیر کا رخ نہیں کیا۔" (اپنی یادیں)

یوں تو کپور نے اردو طنز و مزاح نگاری میں اپنا الگ رنگ پیدا کیا ہے۔ لیکن وہ پطرس بخاری سے متاثر رہے ہیں۔ اپنے طنزیہ مضمون "پیر و مرشد" میں کپور لکھتے ہیں:

"پطرس بڑے استاد تھے ..... حافظہ غضب کا پایا تھا۔ اکثر جب کوئی نئی کتاب پڑھتے تو دوسرے دن کلاس روم میں اس کا خلاصہ اتنی صحت کے ساتھ بیان کرتے کہ لکچر سننے کے بعد محسوس ہوتا کتاب انھوں نے نہیں ہم نے پڑھی ہے۔

ایک بار فرانسیسی برگساں کی کتاب LAUGHTER (مزاح) کی وضاحت فرماتے وقت انھوں نے طنز و مزاح سے متعلق بہت دلچسپ باتیں بتائیں۔ فرمایا ۔۔۔ "انسان ہی صرف ہنستے ہنسانے والا جانور ہے۔"

میں نے کہا "جناب بندر بھی ہنستا ہے۔"

ہنس کر فرمایا "کیونکہ وہ انسان کا جدِّ امجد ہے۔"

بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا "ہنسنے کے لیے عقل کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے وقوف کو لطیفہ سنانا تضیع اوقات ہے۔ اگر ایک آدمی کیلے کے چھلکے سے پھسل پڑے تو دوسرے اس پر ہنستے ہیں۔ لیکن اگر ایک بھینس کیلے کے چھلکے سے پھسل کر کیچڑ میں گر پڑے تو باقی بھینسیں اس پر کبھی نہیں ہنسیں گی کیونکہ بھینس کے پاس عقل نہیں ہو تبھی تو یہ محاورہ ایجاد ہوا عقل بڑی یا بھینس ...... ہمدردی یا ترحم کا جذبہ ہنسی کے لیے زہر قاتل کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص سائیکل چلاتے وقت گر پڑے ...... تو آپ اس پر ہنسیں گے۔ لیکن اگر اسے سخت چوٹ آئی ہو تو آ کبھی نہیں ہنسیں گے۔ اگر ایک ریلوے گارڈ گاڑی چلنے سے پہلے ہر مسافر کو سخت سُست کہے، کھڑکی میں سے باھر جھانکنے والے ہر بچے کو سرزنش کرے، ہر بوڑھے کو فہمائش کرے کہ اسے ڈبے میں فوراً داخل ہونا چاہیے اور خود چلتی گاڑی میں سوار ہوتے وقت گر پڑے تو تمام مسافر قہقہے لگا کر اس کی بے بسی کا مذاق اڑائیں گے کیونکہ ان میں سے کسی کو اس کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوگی۔

ایک ہی چیز المیہ اور طربیہ ہو سکتی ہے۔ سوال صرف ہمدردی کا ہے۔ فرض کیجیے بھرے میلے میں کوئی شخص اعلان کرے کہ میری بیوی کھو گئی ہے۔ کچھ لوگ اس پر ضرور ہنسیں گے۔ یہ بات دوسروں کے نقطۂ نگاہ سے طربیہ ا خود اس شخص کے نقطۂ نظر سے المیہ ہے ...... مزاح بالکل اسی طرح تیار کیا جا سکتا ہے، جیسے صابن یا خوشبودار فارمولا یہ ہے کہ دونوں چیزوں میں نامطابقت پیدا کر دیجیے۔ مثال کے طور پر یہ کہنے کی بجائے —— ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں، یہ کہیے ع

ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں

مزاح پیدا ہو جائے گا۔"

ہر دور میں اصناف ادب میں تجربے ہوتے رہے ہیں اور جدّت پسندی کا دور دورہ رہا۔ ایسے میں اچھی بر تخلیقات سامنے آنا فطری ہے۔ ترقی پسندوں کے دور کے آغاز میں اور اس کے بعد بھی غزل اور نظم کے سانچے وسعت لانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ لیکن کپور "ترقی پسند غالب" میں اصناف سخن کے سلسلے میں جس باریک بینی اور جس گہرے طنز سے کام لیتے ہیں وہ ان کا حصہ ہے:

غالب: جدّت لکھنوی اسٹیج پر تشریف لائیں۔

جدّت لکھنوی: مرزا صاحب! مصاحب دہلوی نے تو صرف نظم سے توبہ کی ہے، میں نے شاعری سے توبہ کر لی ہے

غالب: تعجب، آخر اس انقلاب کی وجہ؟

جدّت لکھنوی: اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو وجہ بھی ظاہر کیے دیتا ہوں ؎

غزل سے مجھے اس لیے دشمنی تھی
کہ آساں نہیں ہے غزل اچھی کہنا

بڑا مارنا پڑتا ہے اس میں پتّا
بڑی دور کی لانا پڑتی ہے کوڑی
جو سچ پوچھیے ایک نشتر غزل کا
ہے سو لاکھ بے کیف نظموں پہ بھاری
مگر چاہتی ہے غزل وہ ریاضت
کہ جس کے تصور سے لرزہ ہو طاری
چنانچہ بڑے چھوٹے "مصرعے" ملا کر
میں لکھتا رہا ایسی مہمل سی نظمیں
کہ پڑھ کے جنہیں آئے قاری کو غصّہ
پڑھی نظم دلی کی مجلس میں میں نے
تو مزدور نے ایک یوں مجھ کو ٹوکا
"ابے دیکھ تو تو یہ کیا کر رہا ہے
اسی دن سے کی میں نے نظموں سے توبہ
کہ مشکل بہت شاعری کا ہے شعبہ
چنانچہ میں خاموش ہوں چھ برس سے
فقط اللہ ہو اللہ ہو کر رہا ہوں"

بات میں بات پیدا کرنے کا فن کپور کو خوب آتا ہے۔ ان کے فن کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے لیکن ایسے میں بھی ان کا طنز نشتر چبھوتا رہتا ہے :

انارکلی : بات شادی کی ہو رہی تھی، قصہ انگریزوں کا لے بیٹھے۔ تم بھی عجیب پروفیسر قسم کے عاشق ہو۔

سلیم : پروفیسر کون؟ یادش بخیر پروفیسر آل احمد سرور تو نہیں۔ انہوں نے چند کامیاب غزلیں کہی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں کسی سے عشق تو نہیں کیا؟

انارکلی : (جھک کر) ہاں۔ کیسے نہیں کیا۔ یاد ہے ان کی تازہ غزل کا مطلع ؎

کبھی سر ان کے قدموں میں کبھی ہاتھ ان کے دامن پر
طبیعت ان دنوں کچھ لاابالی ہوتی جاتی ہے

سلیم : مکرر، مکرر، سبحان اللہ یہ شعر نہیں سحر ہے۔ واللہ کیا تیور ہیں، اس شعر کے۔

انارکلی : یہ آل انڈیا مشاعرہ لکھنؤ نہیں ہے۔ سلیم کہ تم یوں اچھل اچھل کر داد دے رہے ہو...... بات شادی کی ہو رہی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی نہیں۔

(سلیم اور انارکلی)

واعظ، ناصح اور فلسفی قسم کے لوگ کہتے ہیں کہ اگر زندگی میں باقاعدگی نہ ہو تو انسان کبھی خوش نہیں رہ سکتا حالانکہ بہت سے توہمات کی طرح باقاعدگی کا وہم بھی ان لوگوں کے دماغ کی پیداوار ہے جو کم ہمت واقع ہوئے ہیں جنہیں زندگی سے ڈر لگتا ہے، جو کبھی کھل کر اس لیے زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ کپور مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ہمارے ایک دوست کھانے پینے کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ آم وہ اس لیے نہیں کھاتے کہ اس کی تاثیر گرم ہوتی ہے۔ امرود سے اس لیے بدکتے ہیں کہ اس کے کھانے سے ہیضہ ہو جانے کا خدشہ ہے۔ کیلے کو دور سے سلام کرتے ہیں کہ یہ متقل ہوتا ہے۔ سنگترہ اس لیے ناپسند ہے کہ اکثر ترش ہوتا ہے۔ دہی بڑوں سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ انھیں کھانے سے گلا خراب ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ دنیا کی آدھی نعمتوں سے انھوں نے اپنے کو محروم رکھا ہے اور یہ سب اس لیے کہ بیمار نہ ہو جائیں۔ لطف یہ کہ اکثر بیمار رہتے ہیں۔ کبھی اس لیے کہ فلاں پارٹی میں غلطی سے ایک گلاب جامن کھالیا تھا۔ کبھی اس لیے کہ ایک دوست نے زبردستی انہیں سنگترے کا رس پلا دیا تھا۔" (بے قاعدگیاں)

کپور کے طنز و مزاح میں وسیع مشاہدہ، گہرا مطالعہ اور تجربات کی ہمہ گیری بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کے یہاں لطافت اور شگفتگی کی بھی کمی نہیں ہے۔ وہ زبان کے شعبدے اور جملوں کے کرتب بھی دکھاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انسانی نفسیات کی باریکیوں سے بھی واقف کراتے ہیں۔ یوں تو انھوں نے مزاحیہ مضامین لکھے ہیں، لیکن طنز کی جادوگری میں کامیاب نظر آتے ہیں! ○

خواجہ عبدالغفور

کنہیالال کپور
ستم ظریف

ستم ظریفی بڑا ہی پُرمعنیٰ لفظ ہے۔ اس سے مراد وہ مذاق یا ظرافت ہے کہ جس میں ایک حد تک بے رحمی اور بے دردی سے کام لیا جاتا ہے اور صورت واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ غم اور الم میں بھی کوئی پہلو مزاح کا نکل آتا ہے۔ ستم ظریفی میں تضحیک تذلیل یا ایذارسانی کے جذبات ہوتے ہیں اور نہ یہ مقصد ہوتا ہے کہ کسی کو دُکھ پہونچایا جائے۔ موقع محل ایسے نازک ہوتے ہیں کہ روتے میں بھی آنسو کے بجائے مسکراہٹ اُمڈ پڑتی ہے۔ غالبؔ کا شعر ہے ؎

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی
بڑھ کر ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

اکبر الہ آبادی فرماتے ہیں :-

جب کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر
ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو آتا کیا ہے

کنہیالال کپور کا مزاح اسی نوعیت کا ہے اور ان کی نگارشات کو بجا طور پر ستم ظریفی کی اعلیٰ مثال کہا جا سکتا ہے۔ اور وہ خود ایک بے مثال ستم ظریف ہیں۔ ان کی ساری نگارشات خود برداشتہ مزاح کی صنف سے تعلق رکھتی ہیں کہ وہ خود اپنا مذاق اڑانا جانتے ہیں۔ وہ بھی بہت عمدگی سے۔ "پیرومرشد"۔ "میری آپ بیتی"۔ "اپنی یاد میں" جیسے مضامین میں۔ اُنہوں نے اپنے آپ پر طنز و مزاح کے وار کیئے ہیں۔ کنہیالال کپور صرف نام کے کنھیا تھے۔ اُنہوں نے عورت، دولت، قوت کا کبھی پیچھا نہیں کیا۔ ان کا کہنا ہے "میری زندگی سنسنی خیز واقعات سے یکسر خالی ہے۔ میں نے کبھی محبت کی نہ بلیک مارکٹ۔ نہ کسی کو قتل کیا نہ قتل ہونے سے بال بال بچا۔ حُسن کا تعاقب کیا نہ جاہ و منصب کا۔ عمر بھر تندرست رہا نہ بیمار۔ نہ فارغ البال ہوں نہ رہینِ ستم ہائے روزگار۔" اُن کی زندگی کی ڈگر اسطرح کی تھی۔

ہر مصیبت کا دیا ایک تبسم سے جواب
اس طرح گردشِ دوراں کو رلایا میں نے

وہ خود اپنے متعلق اس طرح رقمطراز ہیں۔

"عمر بھر زندگی نے مجھ سے اور میں نے زندگی سے مذاق کیا ہے اس کے باوجود میرا نظریۂ حیات قنوطی ہے رجائی نہیں۔"

— زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن "

ان کی گھریلو زندگی خوشگوار رہی اور ان کا رول ایک فرض شناس، ذمہ دار اور شریف مشفق باپ کا رہا۔ پروفیسری اور پرنسپلی بڑی دیانت داری سے کی۔ انگریزی زبان و ادب کے دلدادہ تھے اور اردو کے عاشق۔

اپنی تحریر کے متعلق خود لکھتے ہیں۔

"بخدا اگر مجھے اس چیز یا اس شخص سے ہمدردی نہ ہوتی تو میں کبھی اس کا مذاق اڑا کر اسے بہتر بنانے کی کوشش نہ کرتا"

۱۹۳۶ء میں انہوں نے پہلا مضمون کرشن چندر کے مشہور افسانے یرقان کی پیروڈی خفقان کے نام سے لکھا۔ اس کے بعد کے مضامین اخبار میں (۱۹۴۷) چینی شاعری (۱۹۴۸ء) وغیرہ ہیں لیکن ان کا ادبی شاہکار (۱۹۴۲) میں شائع ہوا۔ "غالب جدید شعراء کی مجلس۔" جس سے ان کی قابلیت مسلم ہوگئی اور ادبی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔

دعوت نامہ کے ذریعہ غالب کو جنت سے بلایا جاتا ہے ہر طرح کی تعظیم و تکریم اور حسب مرتبہ آداب کے بعد جب فرمائش ہوتی ہے تو غالب اپنی غزل کا مطلع سناتے ہیں۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو — ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

اس پر دور جدید کے شاعر داد و تحسین کے بجائے تمسخرانہ طور پر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شعر بے معنی ہے اور سمجھاتے ہیں کہ مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ اور اگر معشوق کے نام کے عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط کیوں برباد کرتے ہیں۔ اور حضرت غالب کے کلام پر اصلاح دی جاتی ہے۔

خط لکھیں گے کیوں کہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور۔ چاہے مطلب کچھ نہ ہو۔ جس طرح میری ایک اک نظم کا کچھ بھی تو مطلب نہیں۔ خط لکھیں گے کیوں کہ الفت ہے ہمیں۔ میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں یعنی عاشق ہیں تمہارے نام کا۔

اس کے بعد بیچ بیچ میں بحث مباحثے ہوتے ہیں ہر شاعر اپنا کلام سنانے کیلئے بے تاب ہے۔ حضرت غالب بیزارگی سے کہتے ہیں۔

اب مقطع عرض کرتا ہوں۔ — عشق نے غالب نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اس پر واہ واہ تو کیا پھر اصلاح ہوتی ہے۔

عشق نے ہاں ہاں تمہارے عشق نے
عشق نے سمجھے؟ تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا۔
اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں
اور چل تو سکتا ہی نہیں

جانے کب بجتا ہوں میں
یعنی نکما کردیا۔
اتنا تمہارے عشق نے
گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں
یعنی تمہارے عشق نے
اتنا نکما کردیا۔

کچھ اور نامی گرامی شعراء کے کلام کو اس طرح پیش کیا ہے :

پہلا بند : بول کبوتر بول
دیکھ کوئلیا کوک رہی ہے
من میں میرے ہوک اٹھی ہے
کیا تجھ کو بھی بھوک لگی ہے
بول غٹر غوں بول کبوتر
بول کبوتر بول

دوسرا بند : بول کبوتر بول
کیا میرا ساجن کہتا ہے
کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے
کیوں میرے طعنے سہتا ہے
بھید یہ سارے کھول کبوتر
بول کبوتر بول

تحریف نگاری :۔ (پیروڈی) نگارش کی وہ صنف ہے کہ جس میں کسی شاعر یا ادیب کی تخلیق یا اس کی سنجیدہ فکر کو توڑ مروڑ کر اس میں تقلب و تصرف کرکے یا حذف و اضافہ سے ظرافت پیدا کی جاتی ہے۔ اور تضحیک و تنقیص مقصود ہوتے ہیں۔ بالعموم مشہور اور مقبول اشعار یا تحریروں پر ہاتھ صاف کیا جاتا ہے۔ ہنسی ہنسی میں کچھ ایسی باتیں کہہ دی جاتی ہیں کہ جو کڑوی نہیں لگتیں۔ اس کی مثال کسی نے ایسے دی ہے کہ سرکس میں سنجیدہ کرتب دکھانے والے کی نقل جوکر اپنے مخصوص انداز میں کرتا ہے۔ لیکن یہ نقالی بھونڈی نہیں ہوتی بلکہ ایسے ماہرانہ انداز سے کی جاتی ہے۔ جیسے وہ سنجیدہ آرٹسٹ اپنے کرتب دکھا رہا ہے۔

پیروڈی کا مقصد تفریحی ہوتا ہے۔ چنانچہ کنہیالال کپور نے شہرت اسی سے حاصل کی۔ گو تحریف نگاری ان کا شعار رہا نہ اسلوب لیکن نئے انداز اور جدت طبع نے ان کو مقبول بنایا۔

اسی طرح انھوں نے :۔ مجاز کی نظم "آوارہ" کی پیروڈی ۔۔ اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں" لکھی :

جی میں آتا ہے کہ اُٹھ کر آج ساغر توڑ دوں
مار کر پتھر یہ خنجر اپنا خنجر توڑ دوں
اپنا سر چھوڑوں نہ چھوڑوں غیر کا سر توڑ دوں
وائے حسرت کیا کروں اُف ہائے حسرت کیا کروں
جی میں آتا ہے اُٹھ کر آشیاں کو پھونک دوں
پھونک دوں یہ چاند یہ تارے پھونک دوں
پھونک دوں کشتی کو اپنی بادباں کو پھونک دوں
مہرباں کو پھونک دوں نامہرباں کو پھونک دوں
وائے حسرت کیا کروں اُف ہائے حسرت کیا کروں

غالب کے مشہور اشعار کی ترتیب کو بگاڑ کر نظم کے انداز میں پیروڈی پیش کرنے کا ایک انوکھا انداز انھوں نے اختیار کیا:

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — کس کی حاجت روا کرے کوئی
جان تم پر نثار کرتا ہوں — شرم تم کو مگر نہیں آتی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
موت کا ایک دن معین ہے — اور درویش کی صدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

اشعار کے مقابلہ میں نثر کی پیروڈی کچھ زیادہ ہی مشکل ہوتی ہے لیکن اس پر بھی یہ مہارت تامہ رکھتے ہیں :

" گبار کھاتر ۔ پنڈت اَب بُل کلام آجاد سے ماجرت (معذرت) کے ساتھ ۔
شپھیکے موہ ترم ۔ (شفیقِ محترم) ۔
انکلابات ہیں جمانے کے ۔ کہاں کلا احمد نگر کہاں دلی !
کل اسیرے دامے فرنگ تھا ۔ آج اسیرے کھمے جلفے (خمِ زلف) ہندی ہوں
ارتھات بھارت ورش کے شکشا منتری کی حیثیت سے ہندی جبان کا پرچار
کر رہا ہوں ۔
یہ تو تم نے سُن لیا ہوگا کہ ۲۶ر نومبر کو دلی میں اُردو کی فاتحہ پڑھی گئی اور اردو کا جنا جا
اسی ویرانے میں ٹھکانے لگا جہاں گالب مرحوم کی کبر ہے . . . .
بہت دنوں کے بعد کھت لکھنے کی توفیق ہوئی ہے ۔ وجہ یہ کہ بہت مسروف رہا ۔
مثال کا یہ حال ہے کہ اس کے بعد بھی جب تمہیں کھت لکھ رہا ہوں ۔ تلسی رامائن نجر کے
سامنے ہے ۔ الماری میں رکھا ہوا دیوانِ حافظ میری طرف اشکبار آنکھوں سے دیکھ رہا ہے
لیکن کیا کروں بھارت کا شکشا منتری ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ جیب نہیں دیتا کہ
حافظ کا شیدائی ہوتے ہوئے بھی دیوانِ حافظ پڑھ سکوں . . . . . .
سمے سمے کی بات ہے کل گالب کا دور تھا آج تلسی داس کا ہے' دل پر جو گجرتی ہے سو گجرتی ہے ۔
آپ کا پنڈت اَب بُل کلام آجاد

اور بھی قابلِ ذکر تحریف کے نمونے حسب ذیل ہیں :-

• گالب کے اُڑیں گے پُرزے ۔ کابا کس منہ سے جاؤ گے گالب ۔ مَے سے گرج نشاط ہے کس روسیاہ کو ؟

اس کے علاوہ (۱) سلیم اور انارکلی (۲) میر کی شاعری کا نفسیاتی جائزہ (یہ مقلوبی پیروڈی ہے) ۔ (۳) جاناں حاتم طائی کا اسٹوین کی تلاش میں ۔
(۴) اُردو ادب کا آخری دور (۵ محمد حسین آزاد کی آبِ حیات کی پیروڈی) بھی لائقِ ستائش ہیں ۔ ان کے مضامین میں انکم ٹکس مُنکر نکیر سے
ملاقات ۔ ٹیوٹر ۔ علامہ ظہور ۔ چینی شاعری ۔ زندہ باد ۔ صداقت ۔ کامریڈ شیخ چلی ۔ اُردو افسانہ نویسی کے چند نمونے ۔ چند مقبول عام

فلمی سین۔ ہندوستان دیکھئے۔ پیرومرشد۔
خود اپنی تحریف نگاری کے علاوہ " پیروڈی اور پیروڈی نویس " کے عنوان سے دیگر شعرا کے کلام کے دل چسپ منتخبہ نمونے بھی پیش کئے ہیں۔
اپنے مضمون میں میر تقی میر کی مشہور غزل پر پنڈت ہری چند اختر کی پیروڈی کی نقل کی ہے :

ہستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اک اضطراب کی سی ہے

پیروڈی :
اک طرف پاؤں اک طرف جوتا — میری حالت جراب کی سی ہے
دل خانہ خراب کی حالت — دل خانہ خراب کی سی ہے

منوہر سہائے انور کے ویدانت کے فلسفہ کو ملاحظہ فرمائیے :

زمین و آسماں کچھ بھی نہیں ہے — جہاں ہم ہیں وہاں کچھ بھی نہیں ہے
حقیقت میں وہیں سب کچھ ہے انور — حقیقت میں جہاں کچھ بھی نہیں ہے

اس پر ہری چند اختر کی تحریف کا نمونہ پیش کیا ہے :

مرے بچے بہت اچھے ہیں لیکن — مرے بچوں کی ماں کچھ بھی نہیں ہے
ہمیں ہم ہیں ہمارے خانداں میں — ہمارا خانداں کچھ بھی نہیں ہے

بالغوں کے لئے پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں، چھٹی کتاب کے نام سے بھی انھوں نے مزاحیہ، بیانیہ انداز میں چھوٹے چھوٹے پیراگراف میں ان کی جو نگارشات ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں :
• جانوروں کا بیان " محاوروں کا بیان وغیرہ۔
اسی طرح سوال و جواب I، II، III، IV کے عنوان سے بڑے دلچسپ سوال جواب ظریفانہ انداز میں لکھے ہیں۔
• ہند سماچار"، سنڈے ایڈیشن میں ان کا مستقل عنوان تھا : میں دیکھتا چلا گیا " اس کے تحت سیاسی، ثقافتی، سماجی مسائل سے متعلق، دلچسپ موضوعات پر بے ساختہ خامہ فرسائی کی ہے۔
ان کی تصنیفات میں سے حسب ذیل بہت مقبول ہیں :

۱ سنگ و خشت ۲ گستاخیاں ۳ شیشہ و تیشہ ۴ نوک نشتر
۵ چنگ و رباب ۶ بال و پر ۷ نرم گرم ۸ گرد کارواں

کنھیا لال کپور نے ویسے تو آپ بیتی اور سوانح حیات کے انداز میں بہت کچھ لکھا ہے، جس کی وجہ سے ان کی زندگی کے متعلق معلومات کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن " اپنی یاد میں " اپنے متعلق خود لکھتے ہیں :

"آج ۲۰ جون ۱۹۶۰ء کو مشہور طنز نگار کنھیا لال کپور اس دنیا سے گزر گئے۔ خدا بخشے بہت سی خامیاں تھیں مرنے والے میں۔ روحانی طور پر ان کی وفات اسی دن واقع ہوگئی تھی جب آج سے تیرہ برس پہلے انھیں لاہور چھوڑنا پڑا تھا لیکن جسمانی طور پر وہ آج انتقال کر گئے۔ غالباً دنیا کے وہ پہلے ادیب تھے جو پیدا ایک بار ہوئے لیکن مرے دو بار۔"

اس بات کی کہیں وضاحت نہیں ملتی کہ انھوں نے ۲۰ رجون سنہ ۱۹۶۰ء کو اپنی رحلت کا دن کیوں منتخب کرلیا تھا۔ ان کی تحریروں میں کہیں قنوطیت ہے نہ سیاست نہ بیزاری۔ وہ زندگی میں مسکراتے، ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے نظر آئے حتیٰ کہ اپنی موت کو بھی وہ ایک کھیل سمجھتے رہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"...... اپنے خاندانی ڈاکٹر کی پیشین گوئی کے مطابق آج سے کم ازکم بیس برس پہلے مرجانا چاہئے تھا۔"

پرہیز کے مقابلہ میں علاج کو بہتر سمجھتے رہے کہ پرہیز ہر روز کرنا پڑتا ہے لیکن علاج صرف ان دنوں کہ جب آدمی بیمار ہو۔

ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں:

" میری زندگی کا حیرتناک واقعہ بس یہ ہے کہ میں آج تک کیسے زندہ ہوں :"

پاکستانی افسانہ نگار احمد ہمیش نے اپریل سنہ ۱۹۸۰ء کے سیمنار میں کنھیا لال کپور کی موجودگی میں بتایا کہ کچھ عرصہ قبل لاہور میں یہ خبر گرم تھی کہ کنھیا لال کپور انتقال کرگئے اور ان کے تعزیتی جلسے کی تیاریاں ہورہی تھیں کہ اس خبر کی تردید ہوگئی۔ اس وقت ہم نے کہا کہ اس طرح کی افواہیں فال نیک ثابت ہوتی ہیں۔ اور یہ امید ظاہر کی کہ اب یہ اپنی صدسالہ سالگرہ تک ضرور زندہ رہیں گے اس پر انھوں نے کچھ نوجوانوں کی طرف دیکھ کر کہا اور ان ہی سے مخاطب ہوکر کہا، کیوں نہیں اگر یہ اپنی زندگی کو صحت مند اور ضبط و نظم کی پابند بناکر رکھیں گے تو میرے صدسالہ جشن میں ضرور شریک ہوسکیں گے۔

ہمیں پتہ تھا کہ ۲۷ رجون سنہ ۱۹۸۰ء کو ان کی عمر ستر برس کی ہوگی اور ہم نے ان کو لکھا تھا کہ بمبئی میں یہ جشن اعلیٰ پیمانہ پر منایا جائے گا۔ اپنے آخری خط مورخہ ۱۸ ارمارچ سنہ ۱۹۸۰ء میں انھوں نے پونا سے جواب دیا :

" آپ کا دوسرا عنایت نامہ پڑھ کر باچھیں کھل گئیں، خاص کر یہ فقرے پڑھ کر مُنہ میں پانی بھر آیا کہ جشن کپور کا اہتمام کیا جائے گا جہاں ایک معقول نذرانہ بھی پیش کئے جانے کی امید ہے۔ سوچا آپ کی خدمت میں عرض کیا جائے حضور نذرانہ بھجوا دیجئے جشن رہنے دیجئے۔ میں ان دنوں اپنے سب سے چھوٹے لڑکے مسٹر سریندر کپور کے ہاں پونا میں ہوں اور یہاں ہی اب مقبرہ بنوانے کا ارادہ باندھا ہے۔ اگر مناسب نذرانہ مل جائے تو مقبرہ کی تعمیر شروع کردی جائے۔"

اسی خط میں آگے لکھا ہے :

" میں اب کسی دن بھی بمبئی آسکتا ہوں۔ ویسے ۲۷ رجون کو میں ستر سال کا ہوجاؤں گا۔ ہمارے پنجاب میں تو یہ رواج ہے جب ادیب ستر بہتّر کا ہوجاتا ہے تو اسکو ستر جوتے لگائے جاتے ہیں اور پوچھا جاتا ہے :-

___ " لکھنے سے توبہ کرتے ہو یا اور لگائے جائیں"۔ خدا جانے تمہارا شہر میں کیا رواج ہے"۔

میں نے انھیں یقین دلایا تھا کہ ہمارے ہاں ایسا کوئی رواج ہے نہ ایسی روایت۔ آپ کو بھی آنا ہوگا اور ہم ضرور شایانِ شان جشن منائیں گے۔ اور ضرور مناتے۔

وہ اپریل سنہ ۱۹۸۰ء والے سیمنار کے لئے بمبئی میں ہمارے مہمان رہے اور ہند و پاک افسانہ نگاروں کی محفل میں اپنی پُرمزاح، دلچسپ اور پُرلطف تقریر سے بیسیوں کا دل موہ لیا۔

۱۹۷۱ء میں سید ساجد علی نے کنھیا لال کپور مرحوم کے عنوان سے مرثیہ لکھا ہے ؎

ہزاروں لاکھوں کے ارمان تیرے ساتھ گئے
ترقیات کے امکان تیرے ساتھ گئے
نہ جانے کتنے ہی عنوان تیرے ساتھ گئے
ادب یہ ہوتے جو احسان تیرے ساتھ گئے
جہانِ طنز میں اک نعمتِ عفور تھا تو
دھرم کی بندشوں سے جا سے دُور دُور تھا تو
یہ میں نے مانا کہ اک جام ناصبور تھا تو
مگر ہزار کپوروں میں اک کپور تھا تو

یہی نوحہ آج بھی ہماری زبان پر ہے اور ہم سمجھتے ہیں ؎

بندۂ آزاد را شانِ دگر
مرگ او را می دہد جانِ دگر

کنہیا لال کپور کے چند خطوط

29-1-77

پیارے خواجہ عبدالغفور صاحب!

تسلیم: "گل و گلزار" ملی۔ دیکھ اور پڑھ کر دل گل و گلزار ہوگیا۔ حالانکہ آپ کی دانست میں باغ باغ ہونا چاہیئے تھا۔ آپ کے کچھ مضامین تو خاصے کی نہیں معرکے کی چیز ہیں۔ جیسے 'ہم کہیں اور سنا کرے کوئی' کیا آپ انہیں جانتے ہیں۔ 'وقتِ پیری شباب کی باتیں'

"ایمرجنسی" پر اگر آپ مضمون نہ لکھتے تو اچھا تھا۔ ایمرجنسی سے ڈرایا ڈرایا جاسکتا ہے۔ اس پر مضمون نہیں لکھا جاسکتا ــــ کچھ مضامین میں آپ مزاح نگار کم اور تنقید نگار زیادہ نظر آتے ہیں مثلاً آخری تین مضامین ہیں انہیں اگر اس کتاب میں شامل نہ کیا جاتا تو شاید حجم کے گھٹ جانے کے علاوہ کتاب کی عظمت اور افادیت پر کوئی اور اثر نہ پڑتا۔ بہرحال لکھتے رہیئے کیونکہ آپ خواجہ لوگ غضب کے ہوتے ہیں۔ ایک خواجہ پانی پت سے اٹھا اور بمبئی میں آکر سارے ہندوستان پر چھاگیا۔ دوسرا حیدرآباد سے اٹھا اور اس نے بمبئی جیسے بیابان کو گل و گلزار میں تبدیل کر دیا۔ اب اگر تیسرا خواجہ کہیں سے بھی نہ اٹھے تو کسی کو افسوس یا گلا نہیں ہونا چاہیئے۔

یہ قومی راج کیا بلا ہے؟ معلوم ہوتا ہے گل و گلزار سے زیادہ قیمتی کوئی چیز ہے کہ آپ نے گل و گلزار بھجوانے کا RISK تو لے لیا باوجودیکہ آپ کو میرا پتہ معلوم نہ تھا لیکن قومی راج کا پرچہ بھجوانے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ گل و گلزار بھجوانے کے لئے دلی شکریہ قبول فرمایئے۔ بیگم صاحبہ کو کریڈٹ دیجئے کہ انھوں نے آپ کو ایک اور اچھی کتاب لکھنے کی اجازت اور فرصت مرحمت فرمائی۔ اور ہاں انہیں میرا آداب بھی پہنچا دیجئے۔ آپ کا جاں نثار ــــ اختر نہیں۔ (کنہیا لال کپور) (موگا پنجاب)

بمبئی والے خواجہ۔ تجھ پہ لاکھوں سلام

آپ کا دوسرا نوازش نامہ ملا۔ پہلا جناب رام لال نابھوی کے نام تھا۔ جو غلطی سے یا جان بوجھ کر مجھے بھجوایا گیا تھا کہ مزاح نگار اس طرح بھی مزاح پیدا کرتے ہیں۔

آپ کا دوسرا عنایت نامہ پڑھ کر باچھیں کھل گئیں۔ خاص کر یہ فقرے پڑھ کر منہ میں پانی بھر آیا کہ جشنِ کپور کا اہتمام کیا جائے گا۔ جہاں ایک معقول نذرانہ بھی پیش کئے جانے کی امید ہے۔ سوچا، آپ کی خدمت میں عرض کیا جائے "حضور! نذرانہ بھجوا دیجئے۔ جشن رہنے دیجئے" میں ان دنوں اپنے سب سے چھوٹے لڑکے مسٹر سریندر کپور کے ہاں پونا میں ہوں۔ اور یہاں ہی اب مقبرہ بنوانے کا ارادہ باندھا ہے۔ اگر مناسب نذرانہ مل جائے تو مقبرہ کی تعمیر شروع کر دی جائے۔ آپ نے

آپ نے ضرور موگا کے پتہ پر خطوط لکھے ہونگے۔ مگر میں موگا سے رخصت ہوتے وقت ڈاکخانہ والوں کو ہدایت کر آیا تھا کہ میرا کوئی خط ری ڈائرکٹ نہ کرنا تاکہ میں اس کا جواب نہ دینے کے گناہ سے بچ سکوں ـــــ میں اب کسی دن بمبئی آسکتا ہوں۔ ویسے ۲۷؍جون کو میں ستر سال کا ہوجاؤں گا۔ ہمارے پنجاب میں تو یہ رواج ہے جب ادیب ستر بہترا ہوجاتا ہے اس کو ستر جوتے لگائے جاتے ہیں اور پوچھا جاتا ہے" لکھنے سے تو بہ کرتے ہویا اور لگائے جائیں" خدا جانے مہاراشٹرا میں کیا رواج ہے۔

میں نے آپ کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا تھا۔ وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ یعنی میں نے خدا لگتی کہی تھی آپ پر احسان نہیں کیا تھا ـــ آپ کبھی کسی کام سے پونا آئیں تو غریب خانہ پر ضرور تشریف لائیں مجھے آپ سے مل کر ازحد مسرت ہوگی۔

بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب۔ عزیزان کو پیار۔ خدا آپ کو ہمیشہ اچھے حال اور بمبئی میں رکھے۔

نیازمند

کنہیالال کپور (پونا۔ بمبئی)

8-1-72

ڈیر مولانا مصطفیٰ کمال (پاشا) صاحب

جے شگوفہ!

آپ کو نیا سال مبارک ہو۔ دُعا ہے کہ آپ ہر سال نئے شگوفے چھوڑتے رہیں۔

آپ کا نوازش نامہ کل ملا۔ اِس پر ستم یہ کہ آپ وسط جنوری میں سالنامہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمائش کی ہے، کوئی نہ کوئی مضمون بھجوا دوں۔ ایک مختصر سا مضمون 'نہ کا ہو سے دوستی' ارسالِ خدمت ہے۔ اگر پسند آئے تو چھاپ دیجئے۔ ورنہ اِس پر لاحول پڑھنے کے بعد تلف کر دیجئے۔

اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

نیازمند۔ کنہیالال کپور

موگا (پنجاب)

5-1-78

ڈیر سید مصطفیٰ کمال (پاشا) صاحب!

تسلیم:

عنایت نامہ آپ کا ملا۔ 'شگوفہ' کے سالنامہ کے لئے ایک مختصر مضمون ــــ "چار زندہ دل سیاستدان" ارسالِ خدمت ہے۔ اگر پسند آئے اور ابھی کتابت مکمل

نہ ہو چکی ہو اس لیئے چھاپ دیجئے ۔ ٹائیٹل پیج پر ہی سہی ۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل دیر سے کر رہا ہوں ۔ وجہ ؟ پنجاب میں سردی کی لہر آئی ہوئی ہے ۔ دماغ منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ بیگم مصطفیٰ کمال (پاشا) کی خدمت میں آداب۔ خدا ان کا سایا آپ پر اور آپ کا سایہ شگوفہ پر ہمیشہ رکھے ۔ خیر اندیش

سالِ نو مبارک !
یعنی 365 میں سے 360 دن ۔
کیونکہ 5 جنوری کو مبارکباد پیش
کر رہا ہوں ۔ کنہیالال کپور

کنہیالال کپور

موگا (پنجاب)

30-3-78

ڈیر مولانا مصطفیٰ کمال (پاشا) صاحب

تسلیم !

آپ کا محبت نامہ ملا جس خلوص سے آپ نے مجھے مدعو کیا ہے ۔ اس کا تقاضا تو یہ تھا، حیدرآباد میں سر کے بل آؤں ۔ لیکن افسوس اِس بیماریٔ دل نے کہیں کا نہیں رکھا۔ اس لئے سیدنا! جہاں آپ نے مجھے اتنی بار معاف کیا ہے ۔ ایک بار اور معاف کر دو۔

اگر زندگی اور صحت رہی تو اگلے سال انشاءاللہ ضرور حاضر ہونگا بشرطیکہ آپ کا اشتیاق یونہی قائم رہا ۔ آپ کی کانفرنس کی کامیابی کے لئے دُعا کرتا ہوں ۔

بیگم کمال پاشا صاحبہ کی خدمت میں آداب ۔ دوبارہ معذرت کے ساتھ ۔

آپ کا
کنہیا لال کپور
موگا (پنجاب)

ڈاکٹر ایس جے صادق

کنہیا لعل کپور

کنہیا لعل کپور ۲۷ر جون ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے اس سلسلے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "میں ایک روایت کے مطابق ۲۷ر جون ۱۹۱۰ء اور دوسری کے مطابق یکم نومبر ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوا" چونکہ ۲۷ر جون والی تاریخ کو انھوں نے کئی بار دہرایا۔ وہی قرین قیاس ہے۔ ذکر تونسوی سے جب خود ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا "پہلی جنگ عظیم جنگ کے شروع ہوتے ہی) پیدا ہوا۔ تیسری جنگ عظیم میں اس جہاں سے کوچ کروں گا۔ زیادہ اصرار کیا گیا تو کہا۔ افسوس رحمۂ حچگان برائے ۱۹۸۰ء نرس اپنے ساتھ لے گئی۔ اپنے محبوب کے ساتھ نقل مکانی کرانے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر رجسٹر اپنے ساتھ چلا جانا واقعی غضب ہے۔

کنہیا لال کپور کا مقام پیدائش چک ۴۹۱۱ تحصیل سندری ضلع لائل پور (پاکستان) ہے۔ یہ گاؤں پاکستان کے شہر کمالیہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ان کے دادا کا نام نانک چند کپور تھا جو ایک معمولی قصبہ لونگہ سرخود ضلع سرگودھا (پاکستان) میں معمولی تھے۔ کپور نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے :

"میں ذات کا کھتری ہوں پیشہ آبا یقیناً سپہ گری نہیں بلکہ دوکان داری تھا۔ ان کے والد لالہ ہری رام کپور نے مڈل تک تعلیم حاصل کی تھی اس کے بعد وہ پٹواری مال ہو گئے۔ ان کی والدہ کا نام شریمتی دیو کی کپور تھا جنھوں نے ۱۹۱۸ء میں انتقال کیا جبکہ کپور کی عمر بمشکل آٹھ سال تھی۔

خاندانی روایت کے بارے میں انھوں نے تحریر کیا کہ ان کے بزرگ دوکان دار تھے اور وہ بھی معمولی نوعیت کے۔ ان ہونے کے برابر تھی۔ وہ اُردو اور انگریزی سے ناواقف تھے۔ کپور کا بچپن قصبہ چک ۴۹۸ میں بسر ہوا۔ ان کے والد کے احباب میں

محمد عیسیٰ خاں۔ گاؤں کے پرائمری اسکول کے ہیڈماسٹر
خان چراغ خاں۔ گاؤں کے نمبردار

اور گاؤں کے زمین دار جو بلوچ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا بچپن نہایت غیر دلچسپ رہا۔ گاؤں میں ننانوے فیصدی مسلمان بلوچ آباد تھے۔ جو کہ قطعاً ان پڑھ تھے۔ گاؤں میں صرف ایک پرائمری اسکول تھا۔ کوئی لائبریری نہیں تھی۔ وہ لکھتے ہیں۔ "جس گاؤں میں میرا بچپن بسر ہوا وہ تین چیزوں کے لیے مشہور تھا۔ بلوچ۔ ڈھول اور کتّے

بلوچ نہایت نیک اور اللہ والے لوگ تھے۔ میں نے ان سے زیادہ خداترس انسان آج تک نہیں دیکھے۔ عام طور پر وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے جب کوئی نوجوان بُرائی کی طرف راغب ہوتا تو بوڑھے اسے سمجھاتے کہ خدا اور رسول کو کیا مُنہ دکھاؤ گے۔ یہ محض ان کا تکیہ کلام ہی نہ تھا بلکہ اصولِ زندگی بھی۔ انہیں ان پڑھ بلوچوں نے مجھے انسانیت کا پہلا سبق دیا۔"

بچپن میں کپور کتابی کیڑے تھے۔ اُردو کی کوئی کتاب یا رسالہ مل جاتا تو اُسے ختم کیے بغیر نہ اٹھتے۔ بچپن میں پریم چند۔ سدرشن رتن ناتھ سرشار۔ ڈپٹی نذیر احمد، اقبال، تلوک چند محروم کو انھوں نے پڑھا اور ان سب سے متاثر ہوئے۔

ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول میں ہوئی ان کے استاد مولوی محمد عیسیٰ فارسی اور اُردو کے عالم تھے۔ تدریسی کتب پڑھانے کے علاوہ انھوں نے کپور کو گلستاں اور بوستاں کے رموز سے بھی آگاہ کیا اور کبھی کبھی قرآن کی کسی آیت کا ترجمہ آسان اُردو میں سمجھانے کے بعد کہتے دیکھو کتنے کم لفظوں میں کتنی بڑی بات کہی گئی ہے۔

گاؤں کے پرائمری اسکول میں تعلیم ختم کرنے کے بعد انہوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ ضلع لائل پور (پاکستان) میں داخلہ لیا اور 1928ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹریکولیشن فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور صوبہ بھر میں دوم رہے۔ اس کے بعد ڈی ایم کالج موگا سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجہ اول میں کامیاب ہوئے اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔ بی اے ڈی اے۔ وی کالج لاہور سے ۱۹۳۲ء میں درجۂ اول میں کامیاب ہوئے اور انگریزی و سنسکرت کے مضامین میں یونیورسٹی بھر میں اول رہے اور دو یونیورسٹی میڈل حاصل کیے۔ اسی سال کپور نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے کی کلاس میں داخلہ لیا۔ جہاں انہیں احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم پروفیسر پروفیسر مدن گوپال سنگھ مرحوم سے پڑھنے کا موقع ملا پطرس کی شخصیت سے اس دوران انہوں نے اثر قبول کیا۔ 1934ء میں کپور نے ایم اے انگریزی کا امتحان بدرجہ دوم کامیاب کیا۔ ان کے ہم عصروں میں صرف فراق گورکھپوری ہی ایک ایسے شخص ہیں ..... جنہوں نے تعلیم کے میدان میں شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔

1934ء میں والدین نے ان کی شادی پشپاوتی سے کردی جو قصبہ کوٹ مومن ضلع سرگودھا کے ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں چونکہ قصبہ میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لیے وہ تعلیم سے بے بہرہ رہیں۔ جب شادی ہوئی اس وقت کپور بی اے کے تیسرے سال میں پڑھتے تھے اور ان کی عمر اکیس (21) برس کی تھی۔ کپور ایم اے پاس کرنے سے پہلے ایک لڑکی کے باپ بن چکے تھے ان کے تین لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئیں۔ بڑے لڑکے کا نام موہن کپور ہے جو ایم اے تک تعلیم پا چکے ہیں۔ ان کے ایک بیٹے کا نام سریندر کپور ہے جو کہ اردو سے قطعی واقف نہیں۔ کپور صاحب کو اپنی بیوی سے کبھی شکایت نہیں رہی ان کی گھریلو زندگی کافی خوشگوار رہی۔ وہ ایک دوسرے پر طنز کرنے کی بجائے (جو کہ ازدواجی زندگی میں جھگڑے کا اصل سبب قرار پاتا ہے) ہمسایوں اور ملک

کے رہنماؤں پر نکتہ چینی کر کے دل بہلاتے رہے۔ وہ ایک شریف شوہر اور فرض شناس باپ بنے رہے۔

۱۹۳۴ء میں ان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ چند دن بے کار بیٹھے رہنے کے بعد وہ ڈی اے وی کالج لاہور میں کمپوزیشن ٹیچر مقرر ہوئے۔ نقوش کے آپ بیتی نمبر میں تنخواہ پچھتر (75) روپے ماہوار لکھی ہے مگر میرے نام خط میں انہوں نے سو روپے تنخواہ بتلائی ہے۔ وہ ڈیڑھ سال کے بعد تخفیف کے کلہاڑے کی زد میں آگئے جس کی وجہ سے انہیں ٹیوشن کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ ان کے ٹیوشن والے مضمون میں اسی سانحہ کی بازگشت سنائی دیتی ہے ______

ان دنوں وہ ایک سستے سے بورڈنگ ہوم ہند و ہوسٹل لاہور میں رہا کرتے تھے۔ اسی ہوسٹل میں کرشن چندر اپنے بھائی مہندر ناتھ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ چند دن بعد پھر انہیں ڈی اے وی کالج میں دوبارہ ملازمت مل گئی اور تقسیم ہند تک وہ اسی کالج میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ تقسیم کے بعد وہ لاہور سے نکلے۔ فسادات کے حادثہ جانکاہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ لاہور ان کا مکہ تھا۔ لاہور چھوٹنے کا انہیں آخری دم تک افسوس رہا۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ڈی ایم کالج موگا ضلع فیروز پور میں نوکری کر لی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۳ء تک یہ پروفیسر رہے۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۴ء تک وائس پرنسپل رہے۔ اپریل ۱۹۶۴ء میں پرنسپل ہوئے۔ اس کے بعد (۱۹۷۴ء) وہ ڈی ایم کالج موگا کی پرنسپلی سے سبکدوش ہو کر ارجن داس کالج دھرم کوٹ (فیروز پور پنجاب) کی صدارت پر منتقل ہو گئے۔ دل کا دورہ (1975ء دیوالی کا تہوار) پڑنے کے باعث اس نئی نوکری کو بھی چھوڑا۔

پروفیسر سید حسن عسکری پروفیسر جمیل مظہری کے ساتھ انھیں بھی جون 1975ء میں پانچ ہزار روپیوں کا غالب ایوارڈ دیا گیا۔

کپور صاحب کی صحت ہمیشہ خراب رہی۔ ان کے مضامین کی صحت کے بارے میں جابجا اشارے بکھرے پڑے ہیں ان کے کردار اپنی گفتگو کی ابتدا صحت پر تبصرے سے کیا کرتے ہیں۔ "پاگل" کے لفظ کو انہوں نے مضامین میں ہزارہا بار دہرایا ہے ہاضمہ کی فکر انہیں ہمیشہ لگی رہتی ہے۔ اپنے خاندانی ڈاکٹر کی پیشگوئی کے مطابق انہیں آج سے کم از کم بیس برس پہلے مرجانا چاہیے تھا۔ وہ پرہیز کے مقابلے میں علاج کو بہتر سمجھتے تھے۔ کہتے تھے۔ پرہیز ہر روز کرنا پڑتا ہے لیکن علاج صرف ان دنوں میں کرایا جاتا جب آدمی بیمار ہو۔

طنز نگاروں کی صحت ہمیشہ خراب رہتی ہے۔ عظیم بیگ چغتائی کو دق تھا اور یہی مرض الموت ثابت ہوا۔ رشید احمد صدیقی پچھتیس سال تک ایک ہی گردے پر زندہ رہے۔ ان کا علاج کرنے والے ڈاکٹر مر گئے مگر یہ تندرست نہ ہو سکے۔ کپور صاحب نحیف و نزار آدمی ہیں۔ اور اپنی صحت سے غفلت برتنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اور ایک نہ ایک بیماری میں مبتلا رہتے ہیں۔ مزاح نگار مجتبیٰ حسین سے ان کی خط وکتابت رہی ہے۔ وہ کبھی بھی خطوط کا جواب وقت پر نہیں دیتے تھے۔ وجہ وہی صحت کی خرابی۔ صحت کی خرابی کی بنا پر انہوں نے اپنے کئی اہم سفر منسوخ کر دیئے۔ شگوفہ والے مصطفےٰ کمال گواہ ہیں کہ زندہ دلان حیدرآباد کے سالانہ جلسوں میں شرکت کی دعوت پر معذرت کر لیا کرتے تھے۔ ثناء اللہ بٹ کشمیر یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر کے بیان کے مطابق کپور صاحب بیمار تھے۔ اس لئے انہوں نے ان کی کوئی مدد نہیں فرمائی۔ "اپنی یادیں" کے عنوان سے انہوں نے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس کا اقتباس دیا جاتا ہے۔

صحت ان کی ہمیشہ خراب رہتی تھی مگر وہ اس طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے صحت تو خراب ہے ہی اگر اس کا افسوس کروں گا تو دماغ بھی خراب ہو جائے گا۔" مجھے ایک خط میں لکھا کہ

"عمر بھر تندرست رہا نہ بیمار۔ میری زندگی کا حیرت ناک واقعہ بس یہ ہے کہ میں آج تک کیسے زندہ ہوں؟"

جب وہ دہلی کا سفر اختیار کرتے تو گھر والے احتیاطاً باڈی گارڈ کو بھی ان کے پیچھے لگا دیتے کہ کہیں حضرت سفر میں ہی ٹیں نہ بول جائیں۔

کہتے ہیں پنجابی بڑے Aggressive ہوتے ہیں۔ کنہیا لال کپور کہنے کو تو پنجابی تھے مگر فطرتاً لکھنؤ کے واقع ہوئے تھے۔ تقسیم کے بعد کپور کو ہندوستان کے دوسرے شہروں میں نوکری مل سکتی تھی۔ ان کا تعلیمی ریکارڈ کافی روشن رہا۔ کسی بڑے شہر کے انتخاب کی بجائے انہوں نے موگا جیسے گاؤں کی راہ لی۔ اس سے ان کی سہل پسندی کا ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے کبھی جدوجہد نہیں کی نہ اپنی زندگی کے لیے اور نہ ادبی زندگی کے لیے۔ موگا میں تقرر ہوا تو وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہ کون تصور کر سکتا تھا کہ پنجاب کا یہ قیدی پونہ جا کر مرے گا۔ کپور صاحب ڈھائی تین سال قبل اپنے بچوں کے ساتھ پونا چلے آئے تھے اور گوشہ نشینوں کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ ۲۷ جون کو وہ ستر سال کے ہو جاتے مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ کپور صاحب ۵ مئی ۱۹۸۰ء کو پونا میں انتقال کر گئے۔ دو دن بعد دلی کے بعض اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی۔ تاہم کئی دنوں تک اردو دنیا اس سانحہ اور اس کی تفصیلات سے بے خبر رہی۔ کپور کو اپنے پیشے سے کافی دلچسپی رہی۔ انگریزی زبان و ادب سے محبت آخری سانس تک قائم رہی۔ ہزارہا اردو کے اشعار انہیں یاد تھے۔ کھیل کے میدان سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ احباب کے خطوط کا جواب بہت دیر کے بعد دیتے تھے یا بالکل نہیں دیتے تھے۔ سفر سے گھبراتے تھے کیونکہ عموماً تھرڈ کلاس میں کرنا پڑتا تھا۔ نہانے اور بال بنانے سے انہیں نفرت تھی۔ عموماً ایک ہی تانی مہینوں تک بقول خود شرم و حجاب کے بغیر پہن لیتے تھے۔ باہر کوٹ پتلون پہنتے اور گھر پہ باریک اور مہین ململ کی دھوتی زیب تن کیے رہتے۔ کپور صاحب بہت دبلے پتلے جسم کے مالک تھے۔ ان کا قد پانچ فٹ ساڑھے دس انچ تھا۔ رنگ گندمی تھا۔ چہرے پر سوائے ناک کے اور کوئی دوسری چیز واضح نہیں تھی۔ آنکھوں پر لیڈ بریکٹ فریم بس چشمہ چڑھائے رکھتے۔ وہ خدا کی ہستی پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن اس کے بھیجے ہوئے کسی پیغمبر یا اوتار پر ایمان نہیں لا سکے۔ تمام مذاہب کی متبرک کتابوں کے صرف ان حصّوں کو اہمیت دیتے ہیں جن میں شریعت کے عناصر پائے جاتے ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ بے وقوفوں کو مذہب کی توسط سے بڑی کامیابی کے ساتھ بھانس لیا جا سکتا ہے۔ ان کی رائے تھی کہ خدا کے وجود کو ضرور تسلیم کر لینا چاہیے۔ کیونکہ دنیا میں بیک وقت اتنی خوب صورتی اور اتنی بد صورتی پیدا کرنا کسی بہت بڑے اعلیٰ اور برتر وجود کا کام ہے۔ وہ کسی "ازم" کے قائل نہیں تھے۔ سوائے ریشنل ازم کے۔ ان کی دانست میں ہر طنز نگار اول اور آخر ریشنل یعنی Rationalism ہوتا ہے۔

کپور صاحب پطرس، کرشن چندر، مولانا صلاح الدین مرحوم (ایڈیٹر ادبی دنیا مرحوم) چودھری نذیر احمد، چراغ حسن حسرت سے متاثر ہوئے۔ غیر ملکی ادیبوں میں جیسے اسٹیفن لی کاک، سولیفٹ، والٹیر، اناطول فرانس سے انہوں نے اثر قبول کیا۔ مگر ادبی کاوشوں کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ ان کی رہنمائی سوائے ایک شخص کے کسی نے نہیں کی اور اس شخص

کا نام کنہیا لال کپور ہے۔

کہتے ہیں کہ طنز نگار کو ذرا ٹیڑھا ہونا چاہیئے۔ ٹھیکرے جیسا طنز نگار بھی ایک حد تک ٹیڑھا واقع ہوا تھا۔ ان کی زندگی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کبھی بھی ابنارمل نہیں رہی۔ کپور کی عام زندگی جس طرح گذری اس میں بہت کم واقعات و حادثات پائے جاتے ہیں۔ وہ ایک اوسط طالب علم کی طرح میٹرکیولیشن، ایف اے، بی اے، ایم اے کے مراحل طے کرتے رہے۔ کپور یہ نہیں سمجھتے کہ ہر اچھا ادیب واقعی اچھا انسان بھی ہو سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہر اچھا ادیب مجتہد ہوتا ہے اس لیے ایسے روایتی نقطۂ نظر سے اچھا انسان نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کپور نے روایتی اخلاق کی حدود سے گذر جانے کی کوشش کی ہو۔ ان کے زندگی کے نظام میں ایک توازن اور باقاعدگی اور احتیاط شامل ہو چکی تھی۔ غریب الدین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے مالی اعتبار سے وہ کبھی لاابالی پن اختیار نہ کر سکے۔ اگرچہ ایسے کئی موقع آئے تھے۔ جب وہ اپنے دیرینہ خاندانی افلاس سے انتقام لیکر زندگی کو بے اختیار اور پرمسرت لہروں کے حوالے کر بیٹھتے لیکن وہ کبھی ایسا نہ کر سکے۔ وہ ایک مخصوص سماجی انضباط کے پنجے سے رہائی نہ پا سکے یسماجی اعتبار سے وہ بیشتر باتوں میں اپنے پڑوسیوں اور ہمسایوں کے ساتھی ہیں۔ وہ کوئی علیحدہ ڈھول پیٹنے والی یا حیرت ناک شخصیت نہیں ہیں۔ ان کا حلقۂ احباب بہت مختصر تھا۔ اگر یوں کہا جائے کہ انہوں نے کوئی ایسا دوست نہیں بنایا جس پر وہ جی جان سے مٹ جاتے تو زیادہ سچی بات ہوگی۔ یوں کہنے کو تو کپور صاحب کے سینکڑوں دوست ہیں مگر انہوں نے اپنا دل کسی کو نہیں دیا۔ کرشن چندر کے خیال کے مطابق انہوں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی دنیا میں کسی نے ان کو محبت کے قابل نہیں سمجھا۔ حیرت اس بات پر نہیں کہ عمر بھر کوئی رادھا نہیں ملی۔ بلکہ اس پر ہے کہ انہیں کبھی کوئی سدا ما بھی نہیں ملا۔ کرشن چندر نے اپنی ایک کتاب کا انتساب الفاظ میں کیا تھا "کنہیا لال کپور کے نام جس نے کسی سے محبت نہیں کی" کپور کو عورت سے زیادہ واسطہ نہیں رہا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کم بخت جسم پر مرتی ہے۔ دماغ پر اس لیے نہیں مرتی کہ بے چاری کے پاس دماغ ہوتا ہی نہیں۔ کپور صاحب کا موضوع محبت کبھی نہیں رہا۔ انھوں نے رومانی افسانے لکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہاں ان کا پہلا مضمون کرشن چندر کے مشہور رومانی افسانے یرقان کی پیروڈی بہ عنوان خفقان ہے (1936) کپور صاحب جذباتی نہیں ہیں۔ وہ اگر کسی کو اپنی محبت سونپتے ہیں تو اس کی وجہ جذبات نہیں ہوتے بلکہ ان کا دماغ ہی اس محبت کا فیصلہ کرتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ زندگی علی بخش حجام کا کند استرا ہے جس کے چرکوں کی کوئی بھی تاب نہیں لا سکتا۔

کپور کرشن چندر کی طرح فلموں میں اپنی قسمت آزمائی کی اور اس سلسلے میں انھوں نے بمبئی اور کلکتہ کا سفر کیا۔ لیکن اس سفر سے انہیں کچھ حاصل نہ ہوا۔ سوائے اس کے کہ ایک دو مضامین جو انھوں نے ان شہروں پر لکھے۔ فلموں میں ان کے لکھے ہوئے ڈائیلاگس کو ڈائرکٹروں اور پروڈیوسروں نے (اپنے ڈرائیوروں کے ساتھ مل کر) تبدیل کر کے ان کا حلیہ بگاڑ دیا۔

کپور صاحب نے موگا میں مستقل طور پر بس کر اپنے فن کو کافی نقصان پہنچایا۔ اگر وہ دنیا میں ذرا گھوم پھر لیتے تو بہترین طنز کے نمونے پیش کیے ہوتے۔ ان کے مضامین میں تنوع کی جو کمی ہے وہ پوری ہوگئی ہوتی۔ وہ ہر عظیم فنکار کی طرح زندگی سے کبھی مطمئن نہیں ہوئے۔ ٹھیکرے کی طرح وہ اس بات کے قائل ہیں کہ گہری قنوطیت سے ہی گہری طنز پیدا ہوتی ہے۔

حالانکہ عمر بھر زندگی نے مجھ سے اور میں نے زندگی سے مذاق کیا ہے۔ اس کے باوجود میرا نظریۂ حیات قنوطی ہے۔ رجائی نہیں۔
فکر تونسوی نے اپنے مضمون "مسخرہ" میں شکایت کی ہے کہ ان کی گفتگو سمجھ میں کم آتی ہے۔ جذبات سے زیادہ نزدیک ہوتی ہے۔ کپور جو کچھ کہتے ہیں۔ اس سے اتنا بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ سنجیدگی سے بات کر رہے ہیں یا مذاق کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے "تجاہل عارفانہ" کی ترکیب ان کی شخصیت کے لیے نہایت موزوں ہے۔ "نازک خیالیاں" کے اکثر مضامین بحیثیت پہلو طنز نگاری کی مثالیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بات سنجیدہ ہے یا مضحکہ خیز۔

کنہیا لال کپور اپنی تحریروں میں اساتذہ کے اشعار برمحل استعمال کرتے ہیں۔ اور عمر کے ساتھ ساتھ اشعار پر ان کا انحصار بڑھتا گیا اور انہیں لاکھوں اشعار یاد ہو گئے۔ خاص طور پر غالب کی شاعری سے انہیں والہانہ عشق تھا اور اس کے ہزار ہا اشعار از بر تھے۔ انہیں ایسا ادب پسند نہیں تھا جو سیاست کا حلقہ بگوش تھا۔ انھوں نے پسند تحریک میں سیاست کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے کئی مضامین لکھے۔

کپور صاحب ایک ذہین طالب علم رہے ہیں۔ اسی ذہانت سے کام لے کر وہ اپنے احباب کو اُلّو بناتے رہتے تھے۔ ان کے پاس خوب صورت چہرہ نہیں تھا۔ ان کا جسم بے ڈھنگا تھا۔ یہی ذہانت ... انہیں لوگوں کی مضحکہ خیز کمزوریوں کو دیکھنے کا موقع دیتی رہی۔ اس قسم کی ذہانت اور گفتگو کی تیزی و طراری ان کے کئی مضامین کا طرہ امتیاز ہے۔ اس باتیں بنانے کے فن نے انہیں طنز نگار بنا دیا۔ ان کے کئی مضامین اس کا ثبوت ہیں کہ یہ مضامین نہیں بلکہ بے تکلف دوست کی گفتگو ہے جو اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر آپ کو سنا رہا ہے۔

کپور اور کرشن چندر لاہور کے ہندو ہوسٹل میں رہا کرتے تھے اور کرشن چندر کی جذباتیت اور سنجیدگی کا مذاق اڑانے کے لیے کپور صاحب انہیں ہمیشہ بناتے رہتے۔ اقبال اور غالب پر بیجا تنقید کرتے اور اوٹ پٹانگ اور مضحکہ خیز گفتگو کر کے کرشن چندر کو زچ کر دیتے۔ اسی قسم کی ایک گفتگو کے بعد کرشن چندر نے ان سے کہا۔ تم بنا سکتے ہو۔ تمہاری باتیں کافی دلچسپ اور تیکھی ہوتی ہیں تم طنز نگار کیوں نہیں بن جاتے۔

بن تو جاؤں لیکن مجھے لکھنا نہیں آتا۔

لکھنا تمہیں بہانے سے نہیں مشق کرنے سے آئے گا۔ اس کے بعد کپور نے لکھنا شروع کیا۔ اور طنز نگار بن گئے۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء سے لکھنا شروع کیا۔ ان کا پہلا مضمون "خفقان" تھا۔ دوسرا "چینی شاعری"۔ ۱۹۴۲ء میں انہوں نے ایک چونکا دینے والا مضمون غالب ترقی پسندوں کی مجلس میں لکھا اور اردو کی ساری ادبی دنیا میں مشہور ہو گئے۔ یہ "ادبی دنیا" لاہور میں شائع ہوا تھا شریڈن وارن ہیسٹنگز کے خلاف پارلیمنٹ میں ایک تقریر کی وجہ سے اب تک یاد کیا جاتا ہے۔ کپور اُردو کی دنیا میں غالب والے مضمون کی وجہ سے یاد رکھے جائیں گے۔ انھوں نے اپنے پیچھے دس تصانیف چھوڑی ہیں۔ اُردو طنز کی روح کو سمجھنے کے لیے ان تصانیف کا مطالعہ ضروری ہے۔

۵۵

ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی

فکر تونسوی کا خط

مہمان مدیر کے نام ...

عزیزی خواجہ عبدالغفور!

"عزیزی" کا لفظ عام طور پر چھوٹوں کے لئے مستعمل ہوتا ہے اور میری معلومات کے مطابق آپ مجھ سے آٹھ نو مہینے چھوٹے ہیں ـــــ ویسے میری معلومات بالعموم ناقص ہوتی ہیں مگر میں اس نقص کو کبھی مانتا نہیں اور آپ جانتے ہیں جو کسی کی نہ مانے اُسے سب مانتے ہیں۔

مگر عزیزم! تُو نے یہ کیا غضب کیا کہ شگوفہ کے کپور نمبر کی "مرتبی" اختیار کر لی۔ اور مجھے مصطفیٰ کمال کے سامنے فاش ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ شریف زادہ بلکہ سید زادہ، اتنا انمول قسم کا مرنجان مرنج کہ دوسروں کی ہر دروغ بیانی کو راست گفتاری سمجھ کر پی جائے، اسے دیکھتے ہی، بے محابا جی چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ بے نیازی دکھاؤ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ نیازمندی دکھائے ـــــ بے نیاز کو شرمندہ ہونے کا بار بار خاموش چانس دیتا رہے۔

ہمارے خواجہ! آپ نے کپور نمبر کے لئے لکھنے کی دعوت دے کر مجھے واقعی شرمندہ ہونے کا چانس دے دیا۔ اُس سید زادے نے مجھے پہلے اس نمبر میں شمولیت کے لئے مدعو کیا تھا۔ میں نے اُس سے اُسی فرسودہ بے نیازی کا سلوک کیا اور وہ اتنا خوش ہوا کہ خاموش ہو گیا۔ خاموشی ہی شاید اس کی طمانیت ہے۔ خدا ایسی طمانیت ہر ایک کو نصیب کرے۔ موجودہ گنجلک اور انتشار زدہ عہد کا علاج تو اسی میں ہے ـــــ مگر ہائے، کسی کو اتنا شریف زادہ بلکہ سید زادہ بھی نہیں ہونا چاہیئے ورنہ کون جانے، درمیان میں کوئی خواجہ عبدالغفور آ دھمکے گا اور کہے گا "صاحب! سلام میرا" اور پھر وہی شرمندگی بے بس، سینۂ کائنات کا راز فاش کہ چھپائے نہ بنے اور دکھائے بھی نہ بنے۔

بہرکیف مصطفیٰ کمال سے میری ندامت اور معذرت وغیرہ کا بوجھ آپ اپنے کندھے پر ڈال لیجئے اور پھر سنئے کہ کنہیا لال کپور کے انتقال کا ملال مجھے اتنا نہیں ہوا۔ جتنا یہ سوچ کر ہوا کہ ہمارے قومی پریس نے اس منفرد طنز نگار کے انتقال

کو اتنی اہمیت بھی نہیں دی۔ جتنی وہ اس تانگے میں جتے گھوڑے کی خبر کو دیتا ہے جو کسی ایکسی ڈنٹ میں قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتا ہے۔ اخبار خاموش، ریڈیو اور ٹیلی ویژن گنگ۔ جیسے کپور کا انتقال نہ ہوا ہو۔ "ماس میڈیا" رحلت کر گیا ہو۔ خواجہ جانی! اس بات پر گرہ لگا لو، کہ اگر لندن میں کسی لارڈ کی کتیا مر جائے تو ہمارا قومی پریس اس کا ہفتوں ماتم سا تا ہے۔ اُن کی قومیت کے جھنڈے تک سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ صرف اس لیئے تاکہ اُن کی قومیت، بین الاقوامیت کا مرتبہ حاصل کرلے۔

کاش! ہمارا اردو ادب بھی کسی لارڈ کی کتیا ہوتا تو وی۔ آئی۔ پی بن سکتا تھا ——— خیر وہ کتیا تو انگریز تھی، اس لیئے انگریزی اخبار تو اسے وی۔ آئی۔ پی بناتے ہوئے نہیں ہچکچائے، مگر میں نے دہلی کے ایک اردو روز نامہ کے ایڈیٹر کے سامنے یہ سانحۂ ارتحال پیش کیا تو حیرت سے بولے "اچھا؟ کیا کپور صاحب واقعی جہاں سے گذر گئے۔ ہمیں تو اس کی کوئی خبر نہیں"۔

میں نے کہا "خبر کیسے ہوتی، آپ اخبار جو نکالتے ہیں"۔

لیکن غفور صاحب! دوسری صبح بھی اُن کا اخبار، کپور کے انتقال کی خبر سے محروم تھا۔ میں نے جلے بھنے لہجے میں پوچھا "کیا تکلیف ہوتی آپ کو، اگر آج بھی وہ خبر چھاپ دیتے"۔

ارشاد فرمایا "اجی! ہم روزانہ اخبار شائع کرتے ہیں۔ باسی خبریں نہیں چھاپتے"۔

"آپ اُن کی ایوچری ہی چھاپ دیتے"۔

"چھاپ دیں گے۔ مگر ہمارے پاس کپور صاحب کی کوئی فوٹو نہیں ہے"۔

حالانکہ غفور صاحب! ان کے دفتر میں ہیما مالنی کی کئی پوزوں والی فوٹوئیں موجود تھیں۔ آہ! غلطی کپور صاحب سے ہی ہوئی۔ انہیں رحلت فرمانے سے پہلے یہ ضرور سوچنا چاہیئے تھا کہ وہ ہندوستان کے ہر اخبار کو اپنی فوٹو ارسال کر چکے ہیں یا نہیں۔ آئندہ مرنے والے اردو ادیبوں کو مشورہ دیجئے، کہ وہ اس غلطی کا ازالہ کر دیں ورنہ ع

ان کی (تمہاری) داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

مگر خواجہ جی! ان گلوں شکووں کی بھی اب ٹریجڈی یہ ہے کہ یہ اتنے موثر رہے نہ اذیت دہ ——— ایک روٹین سی رہ گئی ہے، جسے ہم اپنے اوپر، جیسے جبراً و قہراً بھگتے جا رہے ہیں۔ کسی بھی "چھپنے" کا کوئی رسالہ (جسے عام طور پر ادبی رسالہ تک کہہ دیا جاتا ہے) نظر سے گزرے۔ وہ ایک آدھ اردو ادیب کے انتقال کے "سیاہ حاشیے" سے ضرور آراستہ ہوتا ہے۔ کئی رسالے اگر تاخیر کا شکار ہو جائیں (اور اکثر و بیشتر ہوتے ہیں) تو وہ سیاہ حاشیوں کی تعداد بڑھا دیتے ہیں۔ دو، تین، چار، چھ تک کی بیک وقت رحلت کر ڈالتے ہیں ——— گذشتہ دنوں مجتبیٰ حسین سے گفتگو ہوئی تو اس نے بھی بظاہر ہنس کر اور بباطن جل بھن کر کہا "نکر صاحب! اب تو ہمارا یہ عالم ہے کہ جس اردو ادیب کو ہم زندہ سمجھتے ہیں، درحقیقت وہ مر چکا ہوتا ہے۔ بچارے ادبی رسالے بھی مجبور ہیں۔ تاخیر ان کے نصیب میں ہے تو تاخیر سے سیاہ حاشئے ہمارے نصیب میں ہیں"۔

میں نے عرض گذاری "مجتبیٰ! میرا عالم قدرے مختلف ہے کہ میں ادبی رسائل کی بجائے جنازوں کو عینی

شاید سمجھتا ہوں یعنی جب بھی کسی کا جنازہ جاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو بے ساختہ منہ سے نکل جاتا ہے:

"لو بھئی! ایک اور اردو جاننے والا گیا۔"

وہ تو شکر کیجئے کہ اردو اکیڈمیوں اور گرانٹ یافتہ اردو اداروں نے ان جنازوں پر ریشمیں اور مخملیں چادریں اڑھانے کا تاریخی فرض اپنے شانے پر لے لیا ہے اور ہماری نوحہ گری کچھ رنگین اور لذیذ ہوگئی ہے ورنہ ہم مرتے تبھی تو یوں، جیسے کوئی لاوارث لاش، سیوا سمیتی کے سہارے سپردخاک کردی جاتی ہے اور زندگی (جو مرنے والوں کے لئے نہیں ہوتی) پھر رواں دواں ہوجاتی ہے۔ اور اس یاد سے بھی بے نیاز ہوجاتی ہے کہ ہاں، کوئی طنز نگار کنہیا لال کپور تھا جو گذر گیا اور نجانے کس طرف نکل گیا۔

خواجہ صاحب جی! کیا ہمارے نصیب میں یہی رہ گیا ہے کہ ہماری نگاہیں، اب اردو ادیبوں کے جنازے کے طلوع ہونے کے انتظار میں رہیں کہ کب وہ اس خاک پاک ریختہ سے اٹھے اور ہم اس کے لئے ماتمی جلسے کا اہتمام کریں میرے بے بس کرب کی کیفیت کا ذرا اندازہ لگا سکتے ہیں آپ؟ کہ جب کنہیا لال کا تعزیتی جلسہ دہلی کی غالب اکیڈمی کے ہال میں منعقد ہوا۔ تو جانتے ہیں، ماتم گساروں کی تعداد کتنی تھی۔ تین سو نشستوں والے ہال میں صرف اٹھارہ حضرات تشریف فرما تھے۔ (تشریف اس لئے کیونکہ یہ ان کی کپور نوازی ارتھات ذرہ نوازی تھی) اور ان اٹھارہ میں سے آٹھ مقررین تھے، جو اردو دانشوری کے میدان میں ادبی زعما اور مشاہیر شمار کئے جاتے تھے۔ ماتمی جلسے کے اختتام بالخیر پر ایک خاتون کو جو مسلسل اونگھنے میں غلطاں تھیں، شانے جھنجوڑ کر یہ اطلاع دی گئی کہ ماتم ہوچکا اور آپ اب اپنا مصلّی اٹھائیے۔

غفور میاں! مجھے یوں لگا جیسے یہ کپور کا ماتم نہیں ہے، جلسے کا ماتم ہے۔

میں تو اللہ تعالیٰ کی یہ نوازش (بے جا نہیں، جا) سمجھتا ہوں کہ کنہیا لال کپور، اردو ادب کے جہان سے موت کے مرغزار میں پہنچ گئے جہاں، اردو کے جہان کی سی ریاکاری، لذت سے چور چور تصنع اور بغیر صفات کے ذات بازی اور شور و غوغا کی تہوں میں چھپی ہوئی مردہ خاموشی نہیں ہے ـــ ہاں، کپور صاحب ان غلیظ تکلفات سے آزاد ہوگئے، جس میں ہم سب نے اسے مقید کر رکھا تھا۔ خلیل جبران نے کہا تھا کہ موت دراصل روح کا ایک طربیہ لمحہ ہوتا ہے کیونکہ وہ جسم کے حبس سے رہائی پائی ہے۔ اس کی مسرت اِسی میں ہوتی ہے کہ وہ روح، روح الامین سے جاکر مل جاتی ہے جس سے اسے علٰحدہ کرکے مہجور بنادیا گیا تھا۔

میں نے خلیل جبران کا حوالہ اس لئے دیا ہے کیونکہ ہم اہلِ ادبا اردو جب تک کسی عظیم مفکر اور فلاسفر کا حوالہ نہ دیں اس وقت تک ہماری دانش وری مشکوک رہتی ہے۔ اور میں بھی اپنے آپ کو متشککین میں شامل نہیں کرنا چاہتا۔ عظیم کہلانے کے لئے انسان کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔

بہرکیف غفور صاحب! کپور واقعی خوش بخت تھا۔ رہائی پاگیا، مرغزار طرب میں پہنچ گیا اور اپنے پیچھے فکر تونسوی وغیرہ کو چھوڑ گیا۔ شاید یہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہ باقی ماندہ زندہ حضرات! بھری منڈی مگر پھر بھی سُونی

محفل کے پالش کئے ہوئے ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ میں تو چلا۔ مری بلا سے تم بوم رہو یا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلکہ بوم ہی رہو۔

کپور صاحب کا طنزیہ ادب کتنا قد آور تھا، اس کا ناپ تول نقادانِ کرام کا شغل ہے، ان کی شخصیت کتنی باغ و بہار تھی۔ میں اس پر کئی بار لکھ چکا ہوں۔ اعادہ صرف اکتاہٹ پیدا کرتا ہے۔ وہ لاہور میں ۱۹۴۵ء سے میرے مشفق رہے اور اسے چاہے میری اندھی عقیدت سمجھئے کہ میں اُنہیں ۱۹۴۵ء سے ہی اپنا گورو تسلیم کرتا چلا آیا ہوں۔ وہ ۱۹۴۵ء میں بھی عالم و فاضل شخصیت تھے اور ۱۹۸۰ء میں بھی عالم و فاضل ہی رہے۔ اُن کے متبسم مرغزار پر کبھی "ڈاؤن فال" نہیں آیا۔

میں یہ دعویٰ کر کے بھی سُرخرو نہیں ہونا چاہتا۔ عہدِ حاضر میں ایسی سُرخروئی کا چلن عام ہو گیا ہے کہ میں، کپور صاحب کے ساتھ برسوں چائے پیتا رہا، ان کی معیت میں سگریٹ نوشی فرماتا رہا۔ ہم برسوں اِکٹھے گھومے، کھائے، جاگے، سوئے ـــــ نہیں، ہمارے درمیان قہقہوں کا مشترکہ رشتہ تو تھا، لیکن وہ جو گورو اور چیلے میں ایک اَن کہا سا احترام جاری و ساری رہتا ہے۔ وہ ان کی زندگی میں بھی جاری و ساری تھا اور جبکہ وہ ساتھ چھوڑ گئے، بے وفا نکلے، وہ احترام میری سانسوں میں آج بھی جاری و ساری ہے۔

اور غور میاں! ان ذاتی تعلقات کے "رواجی پروپیگنڈہ" کے بعد مجھے وہ واقعہ آج بھی تبسم زیرِ لب کر دیتا ہے کہ ایک مرتبہ لاہور کے کافی ہاؤس میں ایک شاعر اپنی غزلیں سنا رہے تھے۔ اپنے بے وزن اور گھٹیا شعر سُنا سُنا کر اہلِ محفل کے مذاق کا نشانہ بن رہے تھے۔ اچانک کپور صاحب نے اس کے اشعار پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسانا شروع کر دیئے۔ شاعر مذکور، کپور صاحب پر جیسے ریشہ خطمی ہو گیا۔

جب وہ کپور صاحب سے داد لے چکا تو کپور نے اُسے کہا "حضور! آپ ذرا ایک زحمت فرمائیے۔"

"فرمائیے۔"

"آپ ذرا میرے غریب خانے تک تشریف لے چلئے، آپ سے ایک ضروری کام ہے۔"

"فرمائیے، کیسا کام ہے۔"

"کوئی خاص نہیں۔ میں آپ کی ملاقات صرف اپنی بیوی سے کروا دوں گا اور اسے بتاؤں گا کہ ڈارلنگ! تم مجھ پر خواہ مخواہ کڑھتی رہتی ہو ورنہ دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ بھونڈے انسان موجود ہیں۔"

فکر تونسوی

'شگوفہ' کے عام شمارہ کی قیمت فروری ۱۹۸۱ء سے دو روپے پچاس پیسے ہوگی۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

کنہیا لال کپور

افسوس کہ طنز و مزاح نگاروں کی صفِ اوّل کا اِمام۔ ظرافت و بذلہ سنجی کی انجمن کا صدر، مخلص دوست، بہترین دشمن علم و دانش کا سرچشمہ ہم سے چھن گیا۔ آج ہندوستانی ادب کو ظرافت کی چاشنی سے نمکین بنانے والا اِس دنیا سے اُٹھ گیا۔ ایک عہد جو پطرس، امتیاز علی تاج، شوکت تھانوی سے شروع ہوا تھا کنہیا لال کپور کی وفات پر ختم ہوگیا۔ لیکن وہ مرا نہیں اور نہ مر کر مٹے گا۔ اس کی تحریریں اس کی یادیں اُسے اور ہمیں زندہ رکھیں گی۔ میری آنکھوں کے سامنے آج بھی کپور صاحب کی جیتی جاگتی عجیب و غریب شخصیت گھوم پھر رہی ہے۔ وہ لمبا قد، چھریرا بدن، لمبی ناک، اُس پر ایک خاص انداز کا چشمہ آج بھی مجھے اسی طرح دکھائی دے رہا ہے مگر یہ محض ذہنی تسلی ہے اور یہ ایک تلخ حقیقت کہ اب ہم دوبارہ کنہیا لال کپور کو دیکھ نہیں پائیں گے۔

میں کنہیا لال کپور کو پچھلے تینتیس ۳۳ برس سے جانتا تھا اور جب بھی کبھی موگہ کے قریب سے گزرتا تھا تو ان سے ملے بغیر نہیں جاتا تھا۔ ایک بار میں اسی طرح موگہ کے پاس سے ہوکر امرتسر جارہا تھا تو میں اُن سے ملنے گیا۔ اس وقت وہ کالج میں تھے اور کلاس لیے ہوئے تھے لیکن مجھے دیکھتے ہی فوراً کلاس میں بلا لیا اور طالب علموں سے کہا کہ میں آپ کو انگریزی کی مردہ شاعری کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔ اب اردو کی زندہ شاعری سُنئے۔ میں نے لاکھ عُذر کیا لیکن ایک نہ سُنی اور آدھ گھنٹے تک شعر سُنتے رہے۔ بعد میں مجھ پہ اور میری شاعری پہ ایک لیکچر بھی دے ڈالا۔

کنہیا لال کپور ایک صابر اور قانع انسان تھے۔ حصولِ زر و جاہ کی خواہش نے کبھی اُن کو پریشان نہیں کیا۔ مرنج مرنجان قسم کے آدمی تھے۔ دوستداری ان کے لئے ایمان کا درجہ رکھتی تھی اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ بہت کم آدمیوں کو دوست بناتے تھے۔ خط لکھنے یا خط کا جواب دینے میں اُن کے تساہل کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک بار میں نے ایک خالص مزاحیہ فلم بنانے کا ارادہ کیا اور اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ اس کی کہانی اور سکرپٹ کون لکھے۔ بالآخر میری نگہہ انتخاب کپور صاحب ہی پر پڑی اور میں نے انہیں نہایت ہی مودبانہ طریقہ سے لکھا کہ گو کہ میں جانتا ہوں کہ آپ فلمی کہانیاں یا سکرپٹ وغیرہ لکھنے سے گریز کرتے ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری یہ فلم ہر لحاظ سے انفرادی حیثیت رکھے اور اِسی غرض سے میں نے آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ ڈیڑھ ماہ تک اِس خط کا جواب نہ آیا۔ میں نے یاد دہانی کرائی لیکن جواب پھر بھی ندارد۔ ایک روز مجھے دہلی میں مِل گئے تو میں نے شکوہ

اکہ اگر میری درخواست قابلِ شرفِ قبولیت نہیں تھی تو کم از کم میرے خطوط کا جواب تو مرحمت فرماتے۔ یہ سُن کر اپنی مخصوص ہنسی ہنستے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے اپنی طرف کھینچا اور کہا کہ بیدی صاحب! آپ ہرن پر گھاس لادنا چاہتے ہیں تو میں حاضر ہوں۔ میں یہ جواب ن کر مایوس تو ہوا لیکن میری نظروں میں ان کی عظمت اور خودداری میں اضافہ ہوا۔

کپور صاحب کے ایک مضمون میں میں نے پڑھا تھا کہ جب دو دوست مدت کے بعد ملے تو ایک نے دوسرے سے افل کا گلہ کیا اور ایک نے کہا کہ میں تو آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا۔ دوسرے نے کہا میں بھی تو آپ کو شریف ہی سمجھتا تھا پہلا بولا: آپ تو صحیح ہی سمجھتے تھے، غلطی مجھ سے ہوئی۔ ایک روز کپور صاحب نے کہا کہ بیدی صاحب میں تو آپ کو شریف ہی سمجھتا تھا۔ اس وقت یہ لطیفہ میرے ذہن میں تھا تو میں نے پہلو بچاتے ہوئے کہا کہ معافی چاہتا ہوں لیکن میں نے تو آپ شریف نہیں سمجھا۔ اس پر پھر بڑے زور سے ہنسے اور کہنے لگے کہ بیدی صاحب اس بار صرف مجھ سے ہی نہیں بلکہ آپ سے بھی لطی ہوئی ہے۔ غالب صد سالہ جشن کے سلسلہ میں دہلی میں غالب انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا جہاں ایوانِ غالب کے علاوہ اعلیٰ انے پر لائبریری اور غالب میوزیم بھی قائم کیا گیا۔ میں غالب انسٹی ٹیوٹ کا ٹرسٹی ہوں اور مجلسِ انتظامیہ کا رکن بھی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے ہر سال غالب ایوارڈ دینے کا بھی فیصلہ کیا۔ جس شخص نے اردو ادب میں نثر یا نظم سے کوئی نمایاں کام کیا ہو، وہ اس ایوارڈ کا مستحق ہوتا ہے چنانچہ پہلا غالب ایوارڈ کنہیا لال کپور کو دیا گیا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے ان کی عزت افزائی تو ہوئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ غالب ایوارڈ کے وقار میں بھی اضافہ ہوا۔

علامہ اقبال کا شعر ہے کہ

> ؎ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
> بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

واقعی یہ سچ ہے کہ اس طرح کے لوگ دنیا میں روز روز نہیں وارد ہوتے اور جب وہ کارِ جہاں سے فارغ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ جاتے ہیں تو دنیا انھیں دیر تک یاد کرتی ہے اور ان کے نقشِ قدم پہ چلنے کی سعی کرتی ہے۔ ■■

رام پال (جالندھر)

ادبی کنہیا

وہ گیتا ضرور پڑھتا ہوگا۔ گو اس نے مجھے نہ کبھی کوئی شلوک سنایا نہ ہی نرک سورگ کا خوف دلا کے اس راہ راست پہ لانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے چبھتے ہوئے ذومعنی فقرے۔ براہ راست نہ سہی بالواسطہ اس نے کچھ عرصہ کے لیے جالندھر کی کورو کشیتر بھومی میں اپنا "ارجن ضرور بنا لیا تھا۔ اور میں جو زبان اردو کے موجودہ دور سے گھبرا کے روزانہ اردو اخبار کے مدیران کے دورخی رویہ۔ یعنی جو فارسی لپی یا رسم الخط میں ہندی کی حمایت پہ ا لکھتے۔ ادبی رسائل کے ارباب وکشاد جو بجائے جدیدہ کی صوری) اور معنوی شکل وصورت سنوارنے کے جب ملتے کی ناقدرشناسی کا رونا روتے۔ دوردرشن اور آکاش وانی والے احباب جب ملتے تو یہی کہتے۔ بھئی تم تو اردو لکھ آج کل آپ جیسوں کو کون سمجھتا ہے۔ اس لیے ہم آپ کو سٹوڈیو میں بلانے کی زحمت نہیں دیتے۔ لائبریریوں میں کا والے نئی نسل کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں۔ ہنس کے ایک گمنام گوشے میں پڑے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے کہتے:" آپ خود ڈھونڈ لیں۔ ہمیں تو یہ زبان آتی نہیں۔"

فلموں میں ظاہری طور پر جگمگاتے اور باطنی طور پہ بجھے بجھے ستارے جب اس بیچاری زبان پر غلط تلفظ دعا دا بولتے تو میں سر پکڑ کے رہ جاتا۔ حتیٰ کہ جب میں نے ایک دن ایک نوجوان افسر کو یہ کہا۔ کہ "میاں میں آپ ک ہوں"۔ اور اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "صاحب مشکک کا ڈر سے آپ کا کیا مطلب"۔ یعنی لوگ اب ہم سے ا معنی بھی پوچھتے ہیں۔ تو پھر بھلا آپ کا قلم کیا اس رن بھومی میں اپنا کام کر سکے گا۔ کیونکہ میرے سامنے میرے دہ دد اور احباب ہیں، عزیز و اقارب ہیں جن کی میں عزت بھی کرتا ہوں اور ان سے پیار بھی۔ لیکن جہاں تک اردو کی حما ادبی جنگ کا تعلق ہے۔ ان کی فوج تعداد میں کہیں زیادہ مہارتھی پرانے اور جہاندیدہ۔ نئے سورمے دلیر اور باہمت

ل وجان سے اردو کو شکست دینے پہ تلے ہیں۔ اور میں تذبذب کے عالم میں ہوں۔ تب، میرے کندھے پہ پر ادبی کنہیا ہاتھ رکھ
نہایت شفقت آمیز لہجے میں کہتا: "گھبراؤ مت۔ قلم اٹھاؤ۔ اور نہ سہی۔ ہم دونوں ہل کر ان سب کا مقابلہ کریں گے۔" اِن کے
یہ میں نے پھر سے پتوار سنبھالے اور افسانوی کشتی کھینے لگا۔

ماصل جناب کنہیا لال کپور بنیادی طور پر تو معلم ہی تھے۔ وہی تحمل وہی دھیما پن۔ وہی میانہ روی اور کالج سے باہر بھی
معقول، احباب کی محفل میں وہ بات سے بات نکال کے بحث کے دوران پیچیدہ مسئلہ کو نہ گرمی سے نہ تلخی سے بلکہ نہایت
باری سے حل کیا کرتے تھے۔ لیکن چوٹ اتنی گہری۔ اتنی تیز۔ کہ مخالف تلملا اٹھے۔ ان کا یہ ادبی لطیفہ تو اب بھی مختلف اوقات
مختلف ناموں سے دہرایا جاتا ہے کہ کسی مجلس میں کسی بات پر بحث چھڑ گئی اور اس نوبت پہ جا پہنچی جہاں سفلہ پن تہذیب کا ازل
پھلانگتا ہوا بنیادی نقطہ سے ہٹ جاتا ہے۔ کپور صاحب کی یہ خوبی بھی کہ وہ چھچھورے پن پہ نہیں اترتے تھے۔ انھوں نے جب
حالت دیکھی تو نہایت انکساری سے کہا: "صاحب میں تو آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا۔" اس نے نہایت ترش لہجے سے
کر جواب دیا: "میں بھی آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا۔" اور کپور صاحب نے سر جھکا کے ان کی اس دلیل پر آمنا و صدقنا کہتے
نہایت دھیمے لہجے میں کہا: "صاحب آپ جو سمجھتے تھے ٹھیک سمجھتے تھے۔ غلطی اس خاکسار سے ہوئی۔ معاف فرمائیں۔" اور
ور صاحب کے اس مخصوص طنزیہ لہجے اور ذو معنی فقرے پر غور ہی کر رہے تھے کہ تمام اہل محفل قہقہہ زار ہو گئے۔ یہ ادبی کنہیا
جس میں محبت اور سیاست اس انداز سے رچی بچی تھی کہ اس نے زندگی میں بہت سے کنس مارے جو اللہ ان کی تمنّی پسند
ریک کو کچلنے کے درپے تھے۔ بہت سے جرائد مروائے جو ادب کے ہر پہلو میں عورت کا جسم اور شراب کی بدبو سونگھ کے
سے محظوظ ہو کے افسانہ نگار، مقالہ نگار، مدیر اور ہر شخص کو گالیوں سے نوازتے تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی بھی گری ہوئی
بات نہیں کی۔ حتیٰ کہ انھوں نے سیاست دانوں سے بھی پنجہ لڑایا۔ فلموں پہ گہرا طنز کیا۔ کالے بازار کے سوداگروں کے
اب اٹھائے۔ جہالت کے خلاف جدوجہد کی۔ وہ شیشہ و تیشہ کا سہارا لے کے راستے کے پتھر کو تراش خراش کے بت بنا دیتے
ہم کافر بھی سجدہ کے قابل نہ سہی۔ لیکن دل میں اثر کرنے والا تو کہہ سکتے ہیں۔ نرم گرم باتوں نے اسے گفتار کا غازی بنا دیا
لوگوں کے کردار سنوارنے کو بے بال و پر اور بے سر و پا باتوں میں لقمان کی حکمت بھر دی۔ کہاں تک گنواؤں اور پھر اس ہمہ گیر
ی۔ ازلی۔ جبریل اور ابلیس کی جنگ میں خود میر کارواں بن کے بہت سے ارجن پیدا کیے۔ اب ایسا لگتا ہے کہ گو
مانی طور پر پرنسپل کنہیا لال کپور مر گیا۔ لیکن کیا وہ مر سکتا ہے؟ یقیناً نہیں۔

میری اور کپور صاحب کی گہری دوستی کی بنیادی وجہ وہ تضاد تھا جس کے تحت قدرت دو مخالف قوتوں میں ہم آہنگی پیدا
کر کے ایک دوسرے کو اتنا نزدیک لاتی ہے جس طرح منفی اور مثبت بجلی کے تاروں کی دوستی سے برقی رَو پیدا ہوتی ہے
بدی اور نیکی دونوں ہی۔ اس عالم گیتی کا کارخانہ چلاتے ہیں۔ اب یوں سمجھیے کہ جنوب میں واقع حیدرآباد اور شمال کا شہر
بالندھر، دونوں کے اتصال سے شگوفے کھلتے ہیں۔ خیر، یہ جملہ معترضہ تھا۔ آمدم برسر مطلب۔ وہ کالج کے پرنسپل تھے۔ بروں
ہے۔ میں جیل کا سپرنٹنڈنٹ تھا اور بیت [illegible] عہدے پر فائز رہا۔ وہ ثواب بانٹتے تھے۔ گناہ میرا حق تھا (اتفاق کی
بات ہے کہ میں خود گناہ گار نہیں آیا بلکہ افسانہ نگار بن گیا) جیلوں کے باشندوں کی داستانیں اکٹھا کرتے کرتے اور انہوں نے
تعلیم میں طنز اور طنز سے تعلیم۔ دونوں کا رشتہ جوڑ کے جو قلمی گلدستے بنائے

وہ خود ایک نہایت سخی۔ دبلے پتلے اور نہایت لانبے آدمی واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں بھی کہاہے کہ گورنمنٹ لاہور میں جب وہ داخل ہونے گئے تو اس انٹرویو بورڈ کے ایک نہایت وجیہہ اور خوب صورت شخص۔ میری مراد جناب عطاء اللہ شاہ بخاری "پطرس" سے ہے۔ انہوں نے انہیں دیکھ کے کہا کہ کیا آپ شروع ہی سے اتنے لمبے ہیں یا آج خاص اہتمام کرکے آئے ہیں۔ لیکن ایک بات برسبیل تذکرہ۔ جب بھی ہماری ملاقات کے دوران پطرس کا نام کسی سلسلہ میں بھی آیا خواہ معلم کی یاد چاہے ایک ادبی قطب مینار کی صورت میں یا آل انڈیا ریڈیو کے قبل از تقسیم زمانے کے تذکرہ کے طور پر کپور صاحب کا سر عقیدت سے ضرور جھکا۔ بعینہ میں بھی، میں سیالکوٹ کالج کا طالب علم تھا۔ جس کالج نے (اب فقط اردو کے ادبا کے نام گنوا دوں گا جن کا تعلق اس خاکِ پاک سے تھا) شاعر مشرق علامہ اقبال، فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، جوگندر پال، کرشن موہن اور کتنے ہی ادیبوں کو پیدا کیا۔ گو مجھے اُن سے علم حاصل کرنے کا موقع تو نہیں ملا۔ لیکن اس کالج کے اساتذہ میں سے شمس العلماء جناب مولوی میر حسن اور سوامی رام تیرتھ بھی تھے۔ اول الذکر میر تھے جن کا کارواں ان کے وصال کے بعد بھی چلتا رہا اور موخرالذکر تیرتھ تھے جن کا نام "رام" پوتر تھا۔ ہے اور رہے گا۔ علامہ اقبال نے دونوں کو خراج عقیدت پیش کی ہے اور ان کا نام زبان پر آتے ہی میں نے سر جھکایا، تو یہ میرا فرض ہے۔

خیر وہ چھ فٹ سے زیادہ لمبے تھے۔ اور میں اوسط قد کا اچھے تن و توش کا حامل۔ ان کے ہونٹوں پہ ایک سدا بہار مسکراہٹ رہتی اور میرے ماتھے پر تیوریاں جو ہمیشہ کا حصہ تھیں۔ وہ عالم تھے۔ گو میں جاہل تو نہیں۔ لیکن بہ نسبت خاک راہ عالم پاک۔ لیکن ان ظاہری اختلافات کے باوجود ہم میں چند باتیں مشترک تھیں۔ پہلی بات کہ وہ جب لاہور کی مجلسوں کا ذکر کرتے تو باتیں کرتے تھکتے نہ تھے۔ یعنی ۱۹۴۷ء سے قبل کے دس برس اور بھولے بسرے افسانے وہ اس روانی اور اس شگفتگی سے بیان کرتے کہ میں سنتے ہوئے نہ تھکتا تھا۔ ایک روز بات بات میں مجھے کہنے لگے کہ تو بھی لاہور کی کوئی بات سنا۔ میں نے کہا۔ سنانے کو تو بہت کچھ ہے لیکن سماجی جانور ہونے کے ناطے قیام طعام کا ذکر کروں گا۔ کیونکہ جب میں نے لاہور سنٹرل جیل میں ٹریننگ شروع کی تو دوسری عالمی جنگ جوبن پر تھی، اور مجھے لامحالہ "دالمنڈی" میں چندماہ ہندو ہوٹل میں رہنا پڑا۔ انھوں نے مزید سننے سے انکار کر دیا۔ اور میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ زور سے مارا اور کہا۔ "زندہ باد۔ اس ہوٹل نے اپنی روایت قائم رکھی۔" میں حیران تھا کہ کپور صاحب یکدم جوش میں کیسے آگئے۔ لیکن انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ میاں میں اور کرشن چندر دونوں ایک سال سے زائد عرصہ اس نہایت گھٹیا، ذلیل، بوسیدہ، باسی اور معصدم جذلو۔ وہیں رہے اور میں نے تقریباً اپنی ادبی زندگی کا آغاز وہیں سے کیا۔ ان ہی نیم تاریک اور اب گرے کہ تب گرے کمروں میں اور کرشن چندر کی بہت سی کہانیاں ان ہی رستے۔ ٹپکتے کمروں میں لکھی گئیں۔ اور بہت سے ترقی پسند مصنفین جن کا نام بعد میں اردو ادب میں بہت چمکا۔ اس کے سیلن والے دالان میں جو شاندہ قسم کی چائے پیتے وہیں پر مجلسیں منعقد ہوتیں۔ اسے یاد کرو تو اب بھی جھرجھری سی آتی ہے۔ اور ذہن کے جھروکوں سے جھانکو تو ایک عجیب سی طراوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ اور انھوں نے پھر میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ یہ ان کی ایک مخصوص عادت تھی اور پھر نہایت سنجیدگی سے کہنے لگے۔ "پاس فسٹ ڈویژن میں" میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا تو انھوں نے قہقہہ لگا کے کہا۔ "تجھے مرنے کے بعد دوزخ میں بھی تکلیف نہیں ہوگی۔ اور یہ روایت ہندو ہوٹل کے تمام پرانے مکینوں کو اللہ نے دی ہے۔"

خیر اس ضمن میں ایک لطیفہ اور سن لیجیے۔ میں اور کپور صاحب، دونوں آکاش بانی جالندھر پر مدعو تھے۔ ایک مشترکہ سا پروگرام تھا۔ "اردو ادب میں پنجاب کا حصہ"۔ ہم دونوں کے ملنے کی جگہ ڈسٹرکٹ لائبریری ہوا کرتی تھی۔ اور وہ پیار سے مجھے "پیرِ مغاں" کہا کرتے۔ ۱۱ بجے قبل دوپہر ریکارڈنگ تھی۔ سردیوں کے دن تھے۔ دھوپ بہت خوش گوار تھی۔ سٹوڈیو کوئی ایک کیلومیٹر کے قریب تھا۔ مجھے علم الکف کا تھوڑا بہت شوق ہے۔ یونہی پڑھتا رہتا ہوں۔ دورانِ ملازمت میں نے سینکڑوں مجرموں کے ہاتھ بھی دیکھے بلکہ پرنٹ لیے۔ اس کا ذکر چھڑ گیا۔ کہنے لگے "یار۔ رام پال۔ اگر تو سپرنٹنڈنٹ جیل کی بجائے کسی غیر ملک میں پامسٹ ہوتا تو" چٹخارے لے کر کہنے لگے۔ "انگلیاں گھی میں سر کڑھائی میں۔ کیونکہ دنیا کے کسی حصے میں بے وقوفوں کی کمی نہیں ہے۔" اور ایک واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ وہ غلطی سے لاہور اسٹیشن سے ان دنوں کے سکینڈ کلاس میں سوار ہو گئے۔ گاڑی چل پڑی تھی۔ ٹکٹ تھا نہیں۔ اس ڈبے میں ایک انگریز قبضہ کیے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر ناک بھوں چڑھایا۔ لیکن میں نے جلدی سے اس کا دایاں ہاتھ تھام کے وہ اٹکل پچو باتیں کیں کہ وہ قائل ہو گیا۔ راستے میں ایک ٹی ٹی آیا بھی۔ لیکن اس انگریز نے جھڑک دیا۔

اب ہم ریڈیو اسٹیشن پر تھے۔ پروگرام ریکارڈ کیا اور چیک کا انتظار کرنے لگے۔ پروگرام ایگزیکٹو نے فرمایا۔ کل لے جائیے۔ کلارک چھٹی پہ ہے۔" اور چلو چھٹی ہوئی۔ اب اس تمام جھنجھٹ میں دوپہر ہو چکی تھی۔ بھوک لگ رہی تھی باہر نکلے تو ایک سڑی بسی چائے کی دوکان تھی۔ کپور صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے ان کی طرف۔ اتفاق کی بات۔ دونوں کی جیب میں ریزگاری کی صورت میں مشکل سے ایک روپیہ تھا۔ کپور صاحب نے حساب لگایا۔ ساٹھ پیسے کے دو کپ اور چالیس پیسے کی نمکین سیویاں دال۔ میں نے حیرانگی سے ان کی طرف دیکھا۔ انھوں نے ہنس کے کہا۔ "پیرِ مغاں۔ میخانے میں فوراً گھس جاؤ۔ ورنہ میں یہ ماننے سے انکار کروں گا کہ تم لاہور میں ہندو ہوٹل گوالمنڈی میں کبھی رہے ہو۔ کیونکہ وہاں کا باسی اس سے بھی ذلیل جگہ بیٹھ کے چائے چھوڑ تاڑی پی سکتا ہے۔" اور آج بھی جب میں کبھی آکاش بانی کے نزدیک اس دوکان کی طرف دیکھتا ہوں تو نہ معلوم میرے سینے سے ایک ہوک کیوں اٹھتی ہے۔ اس ہنسوڑ طنز نگار کا ایک رخ جو عام قارئین سے ہمیشہ پوشیدہ رہا ہے، وہ تھا ان کی سنجیدگی جس میں بے پناہ رنجیدگی گھلی ملی تھی۔ ان پر مشہور امریکی مزاح اور طنز نگار مارک ٹوین کا یہ قول: "جو ظاہر میں ہنستے ہیں باطن میں روتے ہیں۔

Those who laugh the most - are the saddist"

پوری طرح پورا اترتا تھا۔ مجھے چونکہ ان کے ساتھ تنہائی میں بہت سے لمحے گزارنے کا اکثر موقع ملا ہے۔ اور میں ان کی شخصیت کے اس پہلو کو بہ نظرِ غور مطالعہ کیا ہے۔ شاید ان کو اس عمر میں ایک ایسے ہمدم، ہمدرد کی ضرورت تھی جو ان کے صرف لطیفے ہی نہ سنے۔ ان کے غم میں بھی شریک ہو سکے۔ ایسے موقعوں پر کبھی کبھی ان کی آنکھیں بھر آتیں اور وہ اپنی موٹی دبیز عینک کے نم آلود شیشے پونچھنے لگتے۔ وہ کثیر الاولاد تھے، پیشے کے معلم۔ بنیادی طور پر مخلص اور ایماندار۔ لہٰذا جو بھی کمایا ان بچوں کی تعلیم، تربیت، بیاہ شادی اور دیگر خانگی جھمیلوں میں خرچ ہو گیا۔ جب وہ ریٹائر ہو کے موگہ سے جالندھر پہنچے تو میں اگر انھیں تہی دست نہیں کہہ سکتا۔ تو تنگدست ضرور کہوں گا۔

جالندھر میں آنے کی ایک وجہ یہ بھی کہ یہ پنجاب کا سب سے بڑا شہرِ صحافت ہے اور یہاں سے قریباً ایک درجن اردو، ہندی اور پنجابی کے روزانہ اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اور اس جگہ انھوں نے روزانہ "ہند سماچار" اردو میں بطور کالم نگار ایک روزانہ فیچر "میں دیکھتا چلا گیا" لکھنا شروع کیا۔ جو جلد ہی عوام میں خاصہ مقبول ہو گیا۔ مگر مرحوم چونکہ ذہنی طور پر صحافی

نہ تھے، ادیب تھے۔ لہٰذا اس میں بقول ان کے کنہیا لعل کپور تو پیدا نہ کر پائے مگر کپور لعل کنہیا ضرور بن گئے۔ مگر اس مصروفیت سے تھوڑی بہت آسودگی ضرور آگئی۔ مگر ہاتھ کھلا نہ ہوا۔ کبھی کبھی وہ اس عالم میں بھی ایک نہایت معمولی سی بات میں وہی اپنا مخصوص انداز ضرور پیدا کر لیتے۔

ایک روز شام کو انھوں نے گھر واپس جانا تھا۔ میں ساتھ تھا، ایک رکشا والے کو بلایا۔ اس سے کرایہ فلاں جگہ کا پوچھا۔ اس نے متوقع کرایہ سے کہیں بڑھ کے مطالبہ کیا تو اس سے ہنس کر کہنے لگے "بھئی کرایہ میری لمبائی کے لحاظ سے مت مانگو۔ بلکہ اس مقام کے فاصلے کی لمبائی کے حساب سے مانگو۔ وہ رکشا والا بھی شاید ان پڑھ ہونے کے باوجود صاحب دل تھا۔ ہنس کے کہنے لگا۔ "آپ جو دیں گے لے لوں گا۔ کیونکہ آپ کا آدھا حصہ تو رکشا سے کہیں اونچا ہوگا۔ اس کا کرایہ معاف"۔ ہم سب ہنس پڑے۔

وہ اپنے ناشروں سے بہت نالاں تھے۔ اور انہیں عجیب وغریب ناموں سے یاد کرتے تھے۔ اور خاص طور پر ان کا ذکر کرتے ہوئے ان کے طنزیہ لہجے میں ایک عجیب وغریب قسم کا کرب ودرد ہوتا۔ جسے وہ لاکھ چھپانے کی کوشش کرتے لیکن خون کے آنسو ٹپک ہی پڑتے۔ کہنے لگے کہ فلاں دہلی کے پبلشر نے ان کی کتابیں چھاپنے کا وعدہ کیا۔ وہ مان گئے۔ مائلٹی طے ہوگئی۔ دونوں خوش۔ ایک سال بعد جب وہ دہلی گئے تو پبلشر سے حساب مانگا تو اس نے کہا۔ "کپور صاحب، آپ کے حصے میں ایک روپیہ تیرہ آنے بنتے ہیں۔ اور تب ایک درد بھری مسکراہٹ سے کہنے لگے "میاں مندر میں پرشاد چڑھا دینا"۔ اور اس کے بعد وہ پھر کبھی اس ناشر کے پاس نہیں گئے۔ پاکستان، لاہور میں کسی پبلشر نے ان کی تمام کتابیں چھاپیں اور اس کی اطلاع برسوں بعد انہیں ملی۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے۔ "میاں" معاوضہ تو کیا ملنا تھا۔ البتہ اتنا شکر ہے کہ اس نیک بخت نے مجھے پاکستان کی نئی نسل سے متعارف کرا دیا۔ جالندھر میں ان کے بہت سے ناشران سے مراسم تھے۔ اب ایک تو مشرقی پنجاب میں اردو کے پبلشرز بہت کم رہ گئے ہیں اور جو ہیں وہ لیت ولعل کرتے ہیں۔ وہ بھی سچے ہیں کہ یہاں اُردو زبان کی کتاب کی نکاسی بہت کم ہے۔ اور بقول کپور صاحب۔ میاں۔ وہ نام نہیں۔ دام چھاپتے ہیں۔

ایک روز ہم نے فیصلہ کیا کہ اگلے دن فلاں تقریب میں اکٹھا چلیں گے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ "رام پال۔ تم "ضرور۔ جی۔ ضرور" کی دوکان پر آجانا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا "کپور صاحب۔ یہ کونسی جگہ ہے؟" انھوں نے ہنس کے ایک مشہور پبلشر کا نام لیا۔ اور میں نے اس نئے القاب کی وجہ تسمیہ پوچھی۔ کہنے لگے کہ پچھلے چھ آٹھ مہینوں سے جب بھی کتاب چھپوانے کی بات آتی ہے وہ کہتا ہے۔ "ضرور۔ جی ضرور"۔ لیکن آج تک وہ ضرور، شرمندہ تعبیر نہ ہوئی۔ اور پھر مخصوص انداز میں ہاتھ پر ہاتھ مار کے کہنے لگے۔ وہ چائے ضرور ہی ضرور پلواتے ہیں۔ اور بڑے اہتمام سے اس لیے ان کی دوکان پر چلنے کا کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن آج تک نہ ہی انھوں نے اس کی بدخوئی کی۔ نہ ہی اس کے "ضرور۔ جی ضرور" میں کیڑے نکالے۔ ہمیشہ یہ کہتے بھئی اپنا اپنا جنون ہے۔ ہم لکھے بنا نہیں رہ سکتے۔ وہ کمائے بنا نہیں رہ سکتے۔ وہ بھی مجبور۔ ہم بھی مجبور۔"

ایک اور ناشر کا نام انھوں نے "سوچیں گے" رکھا تھا۔ یہ حضرت بھی کئی مہینوں سے سوچ رہے تھے کہ جناب کنہیا لعل صاحب کپور مشہور طنز نگار کی مشہور زمانہ کتابوں کو کس شان وشوکت سے شائع کیا جائے۔ اور کپور صاحب جب بھی ان کے ہاں جاتے کتابوں کے سرورق۔ کاغذ۔ کتابت۔ چھپائی۔ جز بندی اور جلد بندی اور دیگر جزویات کے متعلق

وہ ایک نہایت خوبصورت سبز باغ انہیں دکھاتے اور پھر کہتے۔ آپ بھی سوچیے۔ ہم بھی سوچتے ہیں کہ اس اسکیم میں کوئی سقم تو نہیں رہ گیا۔ آخر ایک روز کپور صاحب کہنے لگے کہ سنو میاں، پیر مغاں۔ ان کی سوچ ختم ہوی۔ اب صرف میری سوچ ہی باقی ہے۔" میں نے کہا "خیریت" انھوں نے جواباً پھٹ سے کہا۔

"آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ ناشر صاحب نے سوچ لیا ہے کہ میری تمام کتابیں ہندی میں چھاپیں گے۔ میں نے عرض کی بھی کہ ہندی کی اپنی مٹھاس ہے اردو کی اپنی شیرینی۔ گو مطلب دونوں کا ایک ہے۔ لیکن ترجمہ میں پوری طرح سے مطلب ادا نہ ہوسکے گا۔"

پھر کپور صاحب ہنسنے لگے۔ اور حسب معمول ہاتھ پر ہاتھ مار کے کہنے لگے سنو غالب کا ایک شعر ہے اور مشہور عالم۔ اس کا اردو اصل اور ہندی نقل سنو۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اب اس کا ہندی ترجمہ۔ بہت محنت کے بعد۔ یہ ہی ہوسکتا ہے کہ

ان کے درشن سے جو آجاتی ہے مکھ پہ لالی
وہ سمجھتے ہیں کہ روگی کی دِشا اُتم ہے

اور اس ہی ہلکی پھلکی ذہنی رو میں انھوں نے ایک اور شعر کا بھی ترجمہ سنایا۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

کہنے لگے۔ بھئی ہندی انوواد یوں ہی ہوسکتا ہے۔

مرتیو کا اک دوس نسچت ہے
نندرا کیوں راتری بھر نہیں آتی

میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ کپور صاحب ادبی کنہیا تھے۔ نہ معلوم انھوں نے کتنے مایوس شدہ ارجنوں کے ہاتھ میں قلم پھر سے تھما دیا۔ یاسیت کو آسیت میں بدلا۔ اور ان کے خیالات کے ترکش کے تیر پھر سے دوبارہ کاغذوں کے کوروکیشیت میدان میں الفاظ بن بن کے برسنے لگے۔ میں بھی اتفاق سے یا خوش قسمتی سے انہیں میں سے ایک تھا۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے لگے "بھئی رامپال۔ تم نے افسانہ لکھنا کیوں بند کر دیا ہے۔" میں نے عرض کی۔ "صاحب کس لیے لکھوں۔ اردو پڑھتا کون ہے" کہنے لگے۔ "اپنے لیے لکھو۔ ورنہ یہ جرم و مجرم کی داستانیں جو تمہارے ذہن میں کلبلا رہی ہیں وہ تمہارے دل و دماغ پہ ڈاکہ مار کر انھیں گرفتار کر دو۔" اور پھر میرے مطبوعہ افسانے جو ابھی رسالوں میں ہی تھے انہیں نکال کے ترتیب دی۔ کتاب کیسے چھپی ایک لمبی داستان ہے۔ جس کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ مختصراً اتنا عرض ہے کہ چھپ گئی۔ پنجاب کے محکمۂ السنہ کی مالی اعانت سے۔ اب میں نے کپور صاحب سے عرض کی کہ "یا حضرت، اس کا دیباچہ تحریر فرمائیں۔" انھوں نے فرمایا۔ "بہتر" تیسرے دن مجھے گھر میں کاغذ پکڑا گئے۔ میں خوش تھا کہ چلو۔ اس بہانے کپور صاحب نے میرے افسانے تو پڑھ ڈالے

میں نے مزید گریدنے کو ایک روز ان سے پوچھا "کپور صاحب۔ آخر آپ نے میرے افسانے پڑھ ہی ڈالے!" حیرانگی سے کہنے لگے۔ "میں نے تمہارا ایک بھی افسانہ آج تک نہیں پڑھا" اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ میں نے ان کے دیباچے سے خود ان کا لکھا اقتباس پڑھ کے سنایا۔

"میری رائے میں رامپال صاحب اپنی ذات میں افسانہ نگاری کا ایک نیا اسکول ہیں۔ وہ ایک ایسا چراغ ہیں جن سے ہزاروں چراغوں کے روشن ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ انھوں نے افسانہ نگاری کو ایک نئی روایت سے روشناس کرایا ہے اور اس لحاظ سے ان کا شمار، نئی طرح ڈالنے والوں میں کیا جا سکتا ہے۔"

انھوں نے عینک اتار کے شیشے صاف کیے اور اس ہی صاف گوئی سے فرمایا "سنو بھئی رامپال۔ میں کالج کا پرنسپل رہا ہوں۔ مجھے سکول کے بچوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور یہ تمام باتیں اسکول کی سطح کی ہیں۔" میں کیا کہتا، گویا سناٹا تھا۔ اب اس ہی کتاب پر مجھے اتر پردیش اُردو اکادمی نے انعام سے نوازا ہے۔ لیکن وہ مجھے مبارک باد دینے کو زندہ نہ رہے۔ ان کا لکھا دیباچہ میرے لیے تبرک ہے۔

جناب کپور، کوئی فوق البشر نہ تھے، نہ ہی اہل جنات سے تعلق تھا کہ محیر العقل کارنامے سرانجام دے سکیں۔ بس مجھ اور آپ جیسے عام انسان تھے۔ خاندانی روایتوں میں جکڑے ہوئے۔ گھریلو پریشانیوں میں گھرے ہوئے۔ جالندھر میں وہ اپنی شادی شدہ لڑکی کے ہاں فروکش تھے اور صرف اس لیے کہ ایک تو جالندھر حالیہ پنجاب میں ادبی شہر ہے جہاں ان کو ذہنی خوراک میسر آتی تھی۔ دوسرے روزنامہ "ہند سماچار" سے تعلق چھوٹا موٹا سلسلۂ روزگار تھا۔ لیکن اس کے علاوہ وہ اپنے کالم "میں دیکھتا چلا گیا" کی وساطت سے وہ اپنی اندرونی خلش مٹا سکتے تھے۔ "لا نا مخفی۔ میرا قلمدان والا سلسلہ نہ سہی۔ لیکن تعمیری نکتہ چینی کے وہ ماہر تھے۔ مگر ایک ہندوستانی۔ بالخصوص متوسط طبقہ کا۔ کتنی دیر لڑکی کے ہاں رہ سکتا ہے خواہ وہ اپنا کھائے اپنا خرچ کرے اور جبکہ اس کے اپنے لڑکے برسرِ روزگار ہوں سو یہ بات کپور صاحب کے احباب میں بہت دیر سے گشت لگا رہی تھی کہ کپور صاحب اپنے لڑکے کے پاس پونہ جا رہے ہیں۔ اور یہ افواہ بہت بار بنی۔ مٹی اور بکھری۔ کپور صاحب اسے ٹال رہے تھے۔ کیونکہ پونا ان کی طبیعت اور قلم کی مناسبت سے انہیں راس نہ تھا۔ بلکہ ایک دفعہ اس ہی سرگرم افواہ کی بنا پر بزم فروغ اُردو نے ان کے اعزاز میں ایک شام منائی اور انہیں ایک تھیلی میں کچھ رقم پیش کی۔ اس شام انھوں نے حسب معمول اپنے مخصوص لہجہ میں کہا۔

"حضرات۔ دراصل اس وقت تک مجھے اسٹیج پر نہیں آنا چاہیے تھا۔ جب تک کہ میں تھیلی کھول کے موعودہ روپے گن کے اپنا اطمینان نہ کر لیتا۔ لیکن خیر تھیلی میرے پاس ہے اور پونہ کا پروگرام حسب معمول فی الحال ملتوی ہے۔ اب آئندہ آپ مجھے پھر کب نوازیں گے۔ کیونکہ جالندھر سے چلے جانے کے پروگرام بنتے اور بگڑتے ہی رہیں گے۔ میں اور آپ زندہ ہیں۔"

لیکن کسے علم تھا کہ یہ جانے کا پروگرام آخر بن کر ہی رہے گا۔ اور ایسا بنے گا کہ پھر واپس آنے کا پروگرام نہ بن سکے گا۔ آخر وہ دن آ ہی گیا جس دن کپور صاحب نے پھر میرے ہاتھ پر اپنا زوردار ہاتھ مار کے کہا: "رامپال۔ یار آخر مجھے پونہ جانا ہی پڑا۔" ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ لیکن آنکھیں پرنم تھیں۔ آخر یاروں کے یار تھے۔ میرا بھی دل بھر آیا لیکن ساٹھ ستر برس کے آدمی بلک بلک کر رو دیا تو نہیں کرتے۔ باتوں باتوں میں بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ آخر تان اس بات پر ٹوٹی کہ پونہ میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد۔ وہ واپس جالندھر آ جائیں گے اور مکان کہیں اور جگہ کرایہ پر لے لیں گے۔ (ہاں۔ ایک بات اور کپور صاحب نے

فیسری کی۔ پرنسپل رہے۔ مشہور ادیب تھے۔ کوئی عیب نہ تھا۔ جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے شراب اور سگریٹ سے پرہیز تھا۔ سینما نہیں جاتے تھے۔ لیکن اپنا مکان کہیں بھی نہ بناسکے یہ حالت تھی)

لیکن کسے علم تھا کہ اب جہاں جارہے ہیں ہمیشہ وہیں رہیں گے۔ لامکان کے مکاں میں اور اب جب میں کبھی گلی کوچوں سے گذرتا ہوں۔ ان کی کتاب پڑھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ ؂

دوستی اُس کو مرے مدت ہوئی لیکن یونہی
کل جو الجلسنہ میں اس کو چھو لیا ٹھنڈا نہ تھا

۵۵

شگوفہ کے زیرِ اہتمام مطبوعات :

میر شمس الدین فیض ــ حیات اور کارنامے — تحقیقی مقالہ۔ لئیق صلاح
صفحات ۲۷۲ ۔ قیمت ۲۰ روپے

وسم سنگ : ممتاز شاعر مصطفےٰ مجاز کا شعری مجموعہ
صفحات ۱۳۶ ، قیمت مجلد ۱۵ روپے

نڈین کا جو : نامور افسانہ نگار عاتق شاہ کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ
صفحات ۱۲۰ قیمت مجلد ۸ روپے

لبدر : عرب اسرائیل جنگ ۷۳ء پر اردو میں پہلی اور منفرد کتاب
مصنفہ قاضی جلیل احمد (لندن)
صفحات ۱۲۴ قیمت ۸ روپے

صاب دل : ممتاز شاعر رشید عبدالسمیع جلیل کی غزلوں کا مجموعہ
صفحات ۱۳۶ قیمت ۱۲ روپے

شگوفہ پبلی کیشنز ۳۱۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

پرویز یداللہ مہدی

مزاحیہ ادب کا کنہیا

شاید دس بارہ برس پہلے کی بات ہے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کے کسی سالانہ اجتماع میں اُردو کے صفِ اول کے طنز و مزاح نگار شری کنہیا لال کپور کی شرکت کی خبر گرم تھی، چنانچہ بیشتر اراکین ادارہ انتظامات کی بھاگ دوڑ میں مصروف ہونے کے باوجود موقع بے موقع یہ مصرع بھی گنگناتے جارہے تھے ؎

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی

البتہ میں نے کسی کو ثانی مصرعہ گنگنا کے شعر مکمل کرتے نہ دیکھا، نہ سنا۔ اس کی وجہ غالباً یہی رہی ہو کہ ثانی مصرع میں مرزا غالب نے ایسی مبارک ساعت میں بھی اپنی افلاس زدہ زندگی کا اعتراف اس طرح کیا ہے ؎

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اور گھر میں بوریئے تک کے نہ ہونے سے غالب بڑے افسردہ خاطر ہوگئے تھے، جب کہ کارکنان زندہ دلانِ حیدرآباد اس ضمن میں خاصے مطمئن بلکہ سرور تھے۔ کیونکہ جس ہال میں پروگرام کا انعقاد عمل میں آنے والا تھا، وہ پہلے ہی بک ہوچکا تھا۔ شامیانوں، شطرنجیوں اور چاندنیوں کے آرڈر بھی ڈیکوریشن/پلائنگ کمپنی والوں کو جاچکے تھے ـــ بس ایک کنہیا لال کپور کے آنے کی دیر تھی ـــ

یوں تو ہر سال پروگرام کے انعقاد کے دن تک کپور صاحب کی آمد اور شرکت کے تعلق سے کسی نہ کسی کی زبانی کوئی نہ کوئی خبر سننے کو ملتی اور پھر ہر خبر خود بہ خود افواہ میں تبدیل ہو کر دم بھی توڑ دیتی، لیکن اس مرتبہ یہ خبر اس قدر گرم تھی کہ لگتا تھا جیسے اپنے انتہائی درجۂ حرارت کو پہنچ گئی ہے، اور اس کا سبب تھا وہ خط جو کپور صاحب کی طرف سے موصول ہوا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی کئی باران اجتماعات کے انعقاد کے زمانے میں کپور صاحب کے خط وصول ہوئے تھے جو محض معذرت نامے ثابت ہوئے تھے۔ لیکن اس بار جو خط موصول ہوا تھا اس میں کپور صاحب نے یہ امید افزا بات لکھی تھی کہ اس بار وہ ان تقریبات

ہیں دل سے شریک ہونا چاہتے ہیں ۔ بس خدا ڈاکٹر صاحب کے دل میں بھی ایسی ہی تڑپ پیدا ہونے کی دیر ہے ـــــ
کپور صاحب نے اپنے خط میں بھی ڈاکٹر صاحب کا حوالہ دیا تھا ۔ میں نے ان کے بارے میں ایک کارکن سے پوچھا ـــ یہ ڈاکٹر صاحب کون ہیں ۔؟ کوئی بہت بڑے نقادوں از قسم ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ وغیرہ ـــــ" کارکن پہلے تو خوب ہنسے پھر یہ کہہ کر میری غلط فہمی دور کردی ـــــ " یہ ادب کے ڈاکٹر نہیں بلکہ سردی، زکام، جاڑا بخار والے ڈاکٹر ہیں۔ کپور صاحب کے فیملی ڈاکٹر، جن کے بارے میں سنا ہے کہ کپور صاحب ان سے اپنا علاج معالجہ تو کم ہی کرواتے ہیں، البتہ کہیں کسی ادبی پروگرام میں شرکت کرنے سے بچنا ہو یا کسی کو ٹالنا ہو تو اپنے انہیں فیملی ڈاکٹر کے کندھے پر بندوق رکھ کر بہلانے کی گولی چلاتے ہیں، جو بشرطیکہ نشانے پر بیٹھتی ہے۔"

یہ تو خیر اندر کی بات تھی، لیکن باہر عوام میں کپور صاحب کی شرکت کی خبر بدستور گرم تھی۔ بلکہ کچھ با ذوق حضرات تو اس گرما گرم خبر میں سے بھاپ تک اٹھتی دکھائی دے رہی تھی۔ حالانکہ یہ خبر کی گرما گرمی کی بھاپ نہیں تھی، بلکہ یہ تو کارکنان حضرات کے دل سے اٹھتا مایوسی اور ناامیدی کا دھواں تھا جسے عوام سمجھ نہیں پائے ـــ

؎ دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

مایوسی کی اس دھواں دھواں فضا میں ایک برخوردار جن کی مسیں" ابھی ابھی بھیگنی شروع ہوئی تھیں اور شاید ادبی مطالعہ کو بطور فیشن کے اپنایا تھا یعنی باتصویر فلمی رسالہ غالباً ہیروئنوں کی نیم عریاں تصویروں کی مدد سے اپنے نیم بسمل مطالعہ کی پیاس بجھانے کی غرض سے خریدا کرتے تھے اور خالص ادبی رسائل صرف رعب جمانے کے لیے بغل میں دبائے گھوما کرتے تھے مجھ سے ٹکرائے اور کپور صاحب کا ذکر چھیڑ دیا جو ان دنوں شہر حیدرآباد کی "ہاٹ ٹاپک" (Hot topic) بنے ہوئے تھے۔ اپنی "مسوں" کی طرح بھیگی بھیگی زبان میں کہا ـــ "سُنا ہے کنہیا لعل کپور صاحب تشریف لا رہے ہیں!" میں نے اثبات میں گردن ہلا کر اس خبر پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ برخوردار بڑے خوش ہوئے پھر اسی بھیگے بھیگے بھولپن سے پوچھا ـــ "کپور صاحب اکیلے ہی تشریف لا رہے ہیں یا ان کے بڑے بھائی پرتھوی راج کپور اور بھتیجے راج کپور، شمی کپور اور ششی کپور بھی ان کے ہمراہ آ رہے ہیں ـــ" اس انکشاف پر میں چونک اٹھا۔ ایک بار پھر برخوردار کو سر سے پیر تک دیکھا پھر پوچھا ـــ " یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ادبی کنہیا لال کپور کی فلمی "کپوروں" سے رشتہ داری ہے ۔!اسی بھیگے بھیگے لہجے میں بولے ـــ " کسی نے نہیں کہا یہ میرا آئیڈیا ہے ۔!"

اس بار زندہ دلان کی تقاریب، کپور صاحب کی شرکت کے بغیر ہی کامیابی سے اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے تقاریب کے ہنگاموں پر ایسی عجیب وغریب "بارات" کا گمان ہوا۔ جس میں بینڈ باجے، دھوم دھڑاکا، آتش بازی، باراتیوں کی فوج سب کچھ تھا۔ اگر کوئی کمی تھی تو دولہا کی تھی۔

ابھی تقاریب کے ہنگامے پوری طرح ٹھنڈے بھی نہیں پڑے تھے کہ ہمیشہ کی طرح کپور صاحب کا معذرت نامہ وصول ہوا، جس میں انھوں نے اپنی عدم شرکت پر افسوس کا اظہار کیا تھا اور اس کے ساتھ یہ توقع بھی بندھائی کہ اگلی مرتبہ وہ ان تقاریب میں ضرور شرکت کریں گے۔ اگر خدا نے اور ان کے فیملی ڈاکٹر نے چاہا تو ـــــ!!

"کپور صاحب نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی، دنیا میں کسی نے ان کو محبت کے قابل ہی نہیں سمجھا۔ اس لحاظ سے وہ صرف نام کے "کنہیا" تھے۔!"

یہ الفاظ آنجہانی کرشن چندر کے ہیں۔ کرشن جی نے جس مخصوص "ضمن" میں اشارہ کیا ہے اس حد تک ہو سکتا ہے۔ یہ بات درست ہو۔

لیکن میرے خیال میں اس مخصوص باب کو چھوڑ کر کنہیا لال کپور بلاشبہ اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کے "کنہیا" کہلائے جا سکتے ہیں۔ کرشن کنہیا بھی شوخ، شریر، چنچل، اور نٹ کھٹ تھے۔

اور کنہیا لعل کپور کی تحریروں میں بھی شوخی، شرارت، ظرافت، چھیڑ، چٹکیاں، گدگدیاں، پھلجھڑیاں، آفتابیاں، ماہتابیاں، سبھی کچھ آپس میں گڈمڈ ہو گئی ہیں۔ اور مجھے آج بھی ان کے مضامین پڑھ کر اس کھٹے میٹھے پیپر منٹ (Papermint) کا لذت آمیز چٹخارہ ملتا ہے، جو میں اپنے لڑکپن میں کھایا کرتا تھا، اور جو آج کل عنقا ہیں — گوکل کے کرشن کنہیا "ماکھن چور" تھے اور اردو کے کنہیا لعل کپور اپنے شگفتہ طنز اور شستہ طنز سے اپنے قارئین کے "دکھ درد" غائب کر دیتے ہیں۔ کپور صاحب کے گدگداتے، مسکراتے مضامین پڑھ کر ایک اور مطلع صاف ہوتا ہے کہ "کرشن کنہیا" کی طرح ان کا مزاج بھی لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ البتہ اول الذکر کے ہونٹوں سے ہر دم "بانسری" لگی رہتی تھی۔ جیسے "دیاکل" رادھا اپنی بیرن "سوت" سمجھتی تھی جب کہ آخر الذکر "کنہیا" یعنی کپور صاحب نے "بانسری" کی جگہ قلم سنبھال لیا تھا۔ جسے ان کی "رادھا" یعنی مسز کپور نے غالباً اس لائق ہی نہیں سمجھا کہ "سوت" کا درجہ دیا جائے — کرشن کنہیا جب جوان ہوئے تو ان کے بے حساب چمتکاروں، ان کی بے شمار "لیلاؤں" میں "سُدرشن چکر" کا اضافہ ہو گیا جو ان کے انگوٹھے کے طور پر ہمیشہ چکراتا رہتا۔ جب بھی "کرشن کنہیا" کو اپنے کسی شترو (دشمن) کا وناش (خاتمہ) کرنا ہوتا۔ اس کا نشانہ لے کر "سُدرشن چکر" کو کسی راکٹ کی طرح چھوڑ دیتے۔ وہ دشمن کا "سرو ناش" کر کے پھر واپس اپنے محور کی طرف لوٹ آتا — کنہیا لعل کپور نے "سُدرشن چکر" کی جگہ طنز و مزاح کی اُڑن طشتری سنبھال لی تھی۔ جو سماج دشمن عناصر پر بجلی کی طرح کوندا کرتی۔ — کرشن کنہیا، زیادہ تر پنگھٹ کے تٹ پر "گوپیوں" کے گھیرے میں رہنا پسند فرماتے تھے — جب کہ کنہیا لعل کپور کے مجموعہ ہائے مضامین کے مطالعہ کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ موصوف اگرچہ کہ اول الذکر کی طرح "گوپیوں" میں گھرے رہنے کی تمنا ضرور رکھتے تھے، لیکن انہیں بعض ٹیکنیکل اور نان ٹیکنیکل مجبوریوں کی بنا پر ترقی پسند شعرا کا تا رہی کو "گوپیوں" کا نعم البدل سمجھ کر انہی کے گھیرے پر اکتفا کرنا پڑا — اور برسوں بعد جب یہ "گھیراؤ" خود بہ خود ٹوٹا تو کپور صاحب ترقی پسند شاعروں وادیبوں کی سنگت کے اسقدر عادی ہو چکے تھے کہ پھر "اصلی گوپیوں" میں ان کے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔

کرشن کنہیا اور کنہیا لال کپور میں ایک اور قدرے مشترک، قدرے مختلف انداز کی پائی جاتی ہے۔ کرشن کنہیا کے بارے میں مشہور ہے کہ انہیں اپنی گوپیوں کے "وستر ہرن" یعنی کپڑے غائب کرنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ اُسی طرح کپور صاحب کو اپنے زورِ قلم کے سہارے سماج کے ان ٹھیکیداروں کے ہوش و حواس "ہرن" کرنے اور ان کے پول کھول دینے میں مزا آتا تھا جو اپنی غرض اور فائدے کے لیے صرف انسان کے کپڑے ہی نہیں بلکہ خود انسان کا سودا کرنے تک سے نہیں چوکتے —

ہندو دھرم کی دھارمک اور مقدس کتابوں میں آیا ہے کہ "ماکھن چور" "نندکشور" کرشن کنہیا نے اپنے بالاپن (بچپن) میں گوکل باسیوں، کو اس خطرناک اژدہے کے زہر سے مکتی دلائی، جس کے پانچ منہ تھے اور جس نے جمنا ندی میں پناہ لے کر سارے پانی کو زہر ملا کر دیا تھا۔ اور جوانی میں انھوں نے اپنے دُشٹ اور لوبھی ماما کنس کے "آتیا چاروں" (ظلم و ستم) کا خاتمہ کرکے اپنے بھگتوں میں "کرشن بھکتی" کو اور مضبوط کیا ـــــ میں سمجھتا ہوں، ہر جنم میں کرشن کنہیا نے ظلم، ناانصافی، بھید بھاؤ، اُونچ نیچ کے خلاف آواز بلند کی ہے، چنانچہ اُردو طنز و مزاح میں کنہیا لعل کپور کے روپ میں بھی یہی فریضہ انجام دیا۔ یہی "کرتویہ" نبھایا ـــــ!!

اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ کنہیا لعل کپور کا شمار اُردو ادب کے معدودے چند قدآور طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا ہے لیکن جہاں تک ان کے جسمانی قدبت کا تعلق تھا خود انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے "مجھے دیکھ کر لوگوں کو بہ یک وقت ابراہیم لنکن قائداعظم محمد علی جناح، اور آر۔ ایل۔ اسٹیونسن کا خیال آجاتا ہے۔" گویا اس اعتبار سے کپور صاحب خود کو "قدآور" کم اور قدآور د زیادہ سمجھتے تھے۔ اور اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ جثے کے اعتبار سے وہ بے حد دُبلے پتلے اور دھان پان تھے۔ بالکل پتنگ کی "کھانپ" کی طرح اور اپنی اس منحنی جسامت کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے اونچے قد کو "آمد" سے زیادہ آورد پر محمول کرتے ہوئے خود کو "قدآورد" گردانتے تھے۔ چنانچہ "اپنی یاد میں" کے عنوان کے تحت اب سے بیس برس پہلے انھوں نے خود کو مرحوم تصور کرتے ہوئے ایک شاہ کار مضمون قلمبند کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ اپنی 'قدبت' کا مذاق خود یوں اڑایا ہے۔ "کنہیا لعل کپور صاحب بیٹھے ہوتے تو معلوم ہوتا کھڑے ہیں، اور جب کھڑے ہوتے تو لگتا کہ کھڑے نہیں ہیں بلکہ گرپڑنے کی تیاری کر رہے ہیں ـــــ"

کپور صاحب کے 'قدوقامت' کے تعلق سے پطرس بخاری کا یہ ریمارک تو خاصا مشہور ہے، جس کا ذکر خود کپور صاحب نے اس خاکے میں بطورِ خاص کیا ہے، جو انہوں نے اپنے "پیر و مرشد" پطرس بخاری کو خراج عقیدت کے طور پر نذر کیا ہے۔ کپور صاحب نے لکھا ہے کہ جب وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور میں استاد کی آسامی کے لیے انٹرویو دینے پہونچے تو سلیکشن بورڈ کے ممبروں میں استاذی پطرس بخاری بھی ایک ممبر کی حیثیت سے موجود تھے اپنے شاگرد رشید کو دیکھتے ہی پطرس بخاری نے اپنی فطری بذلہ سنجی کا سہارا لیتے ہوئے انٹرویو کا آغاز اس سوال سے کیا ـــــ "آپ ہمیشہ ہی اتنے لمبے دکھائی دیتے ہیں یا آج خاص اہتمام کرکے آئے ہیں۔"

کپور صاحب نے اپنے جسمانی قد کو اونچا دکھانے کا اہتمام کبھی کیا یا نہیں، مجھے اس کا علم نہیں۔ البتہ اپنے ادبی قد کو اونچا کرنے کے لیے وہ اپنی تحریروں کے علاوہ اپنی بذلہ سنج گفتگو میں ضرور خاص اہتمام کیا کرتے تھے ـــــ انہیں اپنا بانس کی طرح لمبا قد، شاید جوانی کے زمانے میں بڑا کھلتا تھا ہوگا۔ لیکن بعد میں وہ اپنے منحنی جثے اور غیر معمولی "طویل القامتی" پر کڑھنے کے بجائے اس پر اپنے ساتھ دوسروں کو بھی ہنسنے کے مواقع فراہم کرنے لگے ـــــ یہ مشہور لطیفہ نما واقعہ شاید آپ نے سنا یا پڑھا ہوگا کہ ایک ادبی مجلس میں ایک انگریز خاتون جو اچھا خاصا ادبی ذوق رکھتی تھیں، جب کپور صاحب سے متعارف ہوئیں تو ان کے نحیف و نزار جسم کو دیکھ کر کہنے لگیں۔ "کپور صاحب! آپ تو "سوئی" کی طرح پتلے اور باریک ہیں!"

جواب میں کپور صاحب نے مسکراتے ہوئے مگر حسرت آمیز لہجے میں فرمایا۔ "محترمہ! آپ کا مشاہدہ محدود معلوم ہوتا ہے

بعض سوئیاں بھی مجھ سے موٹی ہوتی ہیں ـــــ !"

کپور صاحب نے خود کو سوئی سے تشبیہہ دے کر کس قدر فراخ دلی سے اپنا مذاق اڑایا ہے۔ تاہم اگر کچھ دیر کے لیے کپ صاحب کو سوئی مان بھی لیا جائے تو میری نظر میں وہ ایک ایسی سوئی تھے جو طنز و مزاح کے دھاگے سے عام آدمی کے دل میں چھپے زخموں کو سی کر ان پر شگفتگی، ظرافت، مسکراہٹ اور قہقہوں کا ایسا ملا جلا "مرہم" رکھ دیتی کہ پر زخم شرطیہ مندمل ہو جاتا۔

کپور صاحب کے دل ہائے داغ داغ، کی جن کمزوریوں کا پتہ ان کے مجموعہ ہائے مضامین کے مطالعے سے چلتا ہے، ہیں اردو، غالب، طنز و مزاح، پطرس بخاری اور لاہور ـــــ ! آخر الذکر کے معاملے میں تو وہ اس قدر جذباتی واقع ہوئے تھے جب بھی کوئی ان کے روبرو لاہور کا سرسری ذکر بھی کرتا، وہ اپنا کلیجہ تھام کر رہ جاتے ؎

لاہور کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
ایک تیر ایسا مارا کلیجہ پہ ہائے ہائے ـــــ !

کپور صاحب نے اس سلسلہ میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔ "میں پچھلے سولہ سال سے ایک چھوٹے سے بنجر ریگستانی قصبے میں مقیم ہوں، دوست احباب اکثر سوال کرتے ہیں کہ میں نے جنت سے ہجرت کرنے کے بعد اس جہنم کو کیوں اپنا مسکن بنایا۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں، ماسوا اس کے کہ جب تک ہندوستان "لاہور" کا ثانی پیدا نہیں کرتا، میرے لیے ہندو کے تمام شہر اور قصبے برابر ہیں ـــــ !!"

"نقوش" کا تاریخی طنز و مزاح نمبر شاید ہی ادب کے کسی طالب علم کی نظر سے نہیں گزرا ہو۔ اس نمبر میں اس وقت کے تقر تمام قابل ذکر اور اہم طنز و مزاح نگاروں کو یک جا کیا گیا تھا۔ اس نمبر کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سبھی طنز و مزاح نگاروں کے کر بھی دیے گئے تھے۔ کارٹونسٹ مہاشے نے ہر کارٹون میں ادیب و شاعر کی ظاہری شخصیت اور جسمانی قد و قامت کے علاوہ ا ادبی قدر و قیمت اور قدبت کے ساتھ بھی برابر انصاف کیا تھا۔ اس نمبر میں کنھیا لعل کپور کو کارٹون کی شکل میں ڈھالتے ہوئے کارٹونسٹ نے بطور قلم کے قطب مینار کو کپور صاحب کی بغل میں کھڑا کر دیا۔ حسن اتفاق کہ کپور صاحب سے میرا یہ پہلا تصوری تعارف تھا۔ اس وقت تک وہ واقعی طنز و مزاح کے میدان کا قد ثابت ہو چکے تھے۔ بلکہ ان کی حیثیت اس پادری کی سی ہو چکی تھی جس کے آگے اپنے گناہوں کا اعتراف (confession) کیے کوئی مسیحی بندہ، پاک نہیں ہوتا ـــــ یہاں مجھے اپنی بدنصیبی کا اعتراف کرنے دیجئے کہ جس زمانے میں میں اردو ادب کے "گرجا" میں داخل ہوا، تب تک کنھیا لعل کپور طنز و مزاح کے نقارے بجانے میں دھوم مچا کر، اردو زبان و ادب اور ادیبوں و شاعروں۔ ساتھ ارباب اقتدار کی مسلسل بے مہریاں دیکھ کر اس قدر دکھی ہوئے کہ نام نہاد ادبی محفلوں، ہنگاموں و مشاعروں کا بائیکاٹ کر ہمیشہ کے لیے گوشہ نشین ہو گئے ـــــ اب ان کی حیثیت "تبرک" کی سی ہو چکی تھی۔ کبھی کبھار کسی رسالے کے مدیر کے بے حد اصر ان کی کوئی تخلیق شائع ہوتی اور خوشبو کی ایک لہر سی اٹھتی اور دل و دماغ کو معطر کر کے غائب ہو جاتی ـــــ کچھ سرپھرے اس خوشبو کے سہارے خوشبو کے خالق سے بالمشافہ ملنے کی کوشش کرتے اور ہر بار منہ کی کھاتے۔ کیونکہ صاحب اس کٹر پردہ دا کی طرح گوشہ نشین ہو چکے تھے جسے نہ تو آنگن میں پھیلی "دھوپ" چھو سکتی ہے، نہ برکھا کی بوندیں بھگو سکتی ہیں ـــــ اگلے د کے کسی شاعر نے پردۂ زنگاری کے پیچھے معمہ کی طرح موجود جس معشوق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ غالباً کپور صاحب اسی معشوق کی میں پردۂ زنگاری کے پیچھے گئے تھے، لیکن وہاں پہنچ کر جب انہیں نہ تو خدا ہی نظر آیا نہ صنم تو وہ شاید اسی خیال سے وہیں ٹک

کہ باہر آنے پر انھیں یقیناً سچ بولنا پڑے گا کہ جس معشوق کا بہت شور سنتے تھے۔ اس کا پہلے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اور اس طرح چونکہ بیچارے شاعر کی بڑی ہیٹی ہوتی، ان کی برسوں کی جمائی ساکھ خاک میں مل جاتی لہٰذا شاعر کی ساکھ بدستور جمائے رکھنے بلکہ اس کی دھاک بٹھانے کے لیے کپور صاحب وقفہ وقفہ سے پردہ زن گاری کے پیچھے سے "شگوفے" چھوڑتے رہتے خوشبو لٹاتے رہتے ـــ لیکن ان کا یہ پس پردہ راز ایک روز فاش ہو گیا کیونکہ ان کی طرز تحریر کی چنگاری صاف چغلی کھانے لگی تھی کہ اب پردہ زن گاری والے معشوق کی جنس تبدیل ہو گئی ہے اور اس کا نام کنہیا لعل کپور ہے ـــ!

اس سے پہلے کہ ان کے چاہنے والے اس پردۂ زن گاری کو چاک کر کے ان تک پہنچے، ۵ر مئی ۱۹۸۰ء کو کپور صاحب نے پردے ہی پردے میں "موت" سے سمجھوتہ کر لیا اور چپکے ہی چپکے اس دبیز پردے کے پیچھے چلے گئے جو قیامت سے پہلے فاش نہیں ہوتا ـــ

کپور صاحب کی موت سے اردو طنز و مزاح کا کیا نقصان ہوا ـــ وہ جب تک زندہ رہے اُن کی ذات سے اُردو طنز و مزاح کو کیا فائدے پہنچے، یہ بتانا نقاد حضرات کا کام ہے۔ البتہ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اردو طنز و مزاح کی "گودڑی" میں کنہیا لعل کپور، سچ مچ کا "لعل" تھے، اور "لعل" ہی کی طرح ہمیشہ چمکتے رہیں گے اور آنے والی نسلیں (بشرطیکہ اردو کو آئندہ نسل نصیب ہوی) انہیں اس طرح یاد کریں گی ـــ ع

سنا ہے اگلے زمانے میں ایک "کپور" بھی تھا
کہ جس کا نام کنہیا تھا، شوخ و نٹ کھٹ تھا
زبانِ اُردو کے طنز و مزاح میں ایک وہی
تھا "لعل" کی صورت چمکتا روشنی لٹاتا ہوا
کہ جس کے اُٹھتے ہی اُردو ادب کی محفل سے
لگا یوں جیسے چراغوں میں روشنی نہ رہی ـــ!!

بھارت چند کھنہ

کنہیا لال کپور

۲۷ جون ۱۹۱۰ء ضلع لائل پور کے ایک گمنام گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انگریزی زبان میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور دوران تعلیم سید احمد شاہ بخاری پطرس کے شاگرد ہونے کی سعادت بھی ان کو نصیب ہوئی کہ پطرس صاحب انگریزی مضمون کے پروفیسر تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد کنہیا لعل نے درس و تدریس کا پیشہ اپنایا اور لکچرار کے عہدہ سے ملازمت شروع کر کے موگہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

نکھرا ہوا گندمی رنگ، قد چھ فٹ کے لگ بھگ، جسم نہایت دبلا پتلا (ویسا ہی جیسا آجکل کا دودھ ہوتا ہے) لمبی گردن، لمبی ٹانگیں (ویسی ہی جیسی آجکل کے مزدوروں کی ٹانگیں ہوتی ہیں) چہرے کے نقوش انتہائی تیکھے، ذہین، چوکس آنکھیں، چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ — بحیثیت مجموعی جسم نازک مگر تیر کی طرح سیدھا، کسی بھی مجمع میں موصوف ہمیشہ سربلند اور اس لئے جاذب نظر رہتے۔ دوران ملازمت، طلباء اور اساتذہ میں یکساں ہردلعزیز رہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ موصوف بڑے خوش مذاق، ہنس مکھ، بذلہ سنج اور ہمیشہ دوسروں کا دکھ درد دور کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ایسا انسان اگر مقبول نہ ہوتا حیرت ہوتی۔

اردو ادب میں کنہیا لعل کپور کرشن چندر کے ہمعصر تھے اور اردو میں موجودہ صدی کے وسط سے پہلے ترقی پسند ادب کی جو تحریک پروان چڑھی تھی، اس میں یہ دونوں ادیب اپنی اپنی صف میں صفِ اوّل کے لکھنے والے تسلیم کر لئے گئے تھے۔ کرشن چندر کا شمار (اگرچہ وہ خود بھی اعلیٰ پایہ کے طنز نگار تھے) افسانہ اور ناول نگاری میں اور کنہیا لعل طنز و مزاح کے علمبردار تھے۔ ظاہر ہے کہ اردو ادب میں کوئی بھی مزاح و طنز نگار اس قدر بسیار نویس نہیں ہو سکتا جس قدر اردو ادب کی دوسری اصناف میں — اور جب ان دونوں نے لکھنا شروع کیا تو تصانیف کی تکمیل میں کرشن چندر نے، جو اپنے عام ہمعصر افسانہ و ناول نویسوں سے بھی کہیں زیادہ تیز لکھنے والے تھے، کنہیا لعل کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔
مگر جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مزاحیہ اور طنزیہ ادب میں، رتن ناتھ سرشار کو چھوڑ کر کوئی طنز نگار بسیار نویس نہیں ہوا — اور پطرس تو غالباً اردو ادب میں وہ واحد مزاح نگار تھے جنھوں نے ایک مختصر سی کتاب لکھی اور شہرتِ دوام حاصل کی۔
ایک مرتبہ جب کرشن چندر اور کنہیا لعل کے بارے میں، ان کی موجودگی میں، ان کی کاوشوں اور مرتبہ کے بارے میں خیالات کا

اظہار کیا جا رہا تھا تو کنہیا لعل نے اپنے اور کرشن چندر کے قد کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ پروردگار کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کم از کم ایک اعتبار سے تو میں کرشن چندر سے اونچا ہوں!

کنہیا لعل کپور کی نگارشات کے فن کے بارے میں کچھ کہنے کی جسارت سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "طنز کیا چیز ہے مزاح کیا ہے" کے بارے میں کچھ کہہ دیا جائے۔

طنز و مزاح وہ لطیف فن ہے جس میں بقول جگر مراد آبادی "کم نظر کا گزر نہیں" بلکہ "اہل ظرف کا کام ہے"۔ اس مشکل فن کا سب سے بڑا دشمن پھکڑپن ہے جو ذرا چوک ہو جانے سے طنز و مزاح کو حقیر کھائیوں کی پستیوں میں دھکیل دیتا ہے۔ اعلیٰ طنز و مزاح چابکدست قلمکار کی قوتِ مشاہدہ اور پر لطف اندازِ اظہار سے پیدا ہوتا ہے۔

لکھنے والے کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ دیکھنے والوں کی نظروں کے سامنے سے ریاکاری یا فریب کا جو پردہ پڑا ہوا ہے اُس کو چاک کر دے تاکہ زندگی کے اطراف جو ناہمواریاں رائج ہو گئی ہیں وہ صاف صاف نظر آنے لگیں اور اُن کے مضحک پہلوؤں پر نظر پڑتے ہی دل میں ایک گدگدی سی پیدا ہو اور لبوں پر تبسم پھوٹ پڑے۔

سماج کی صحیح قدروں سے انحراف اور اُسے سکۂ رائج الوقت سمجھ لینے کے خلاف طنز و مزاح نگار اپنے نوک و نشتر سے وار کرتے ہوئے نئے تبسم اور نئے قہقہے پیدا کرتا ہے تاکہ برائیوں کی اصلاح اُس کے اِس تادیبی حربہ سے ہو سکے۔

ہمارے ملکِ اَبد مدّت میں انسانی کردار کی اعلیٰ قدریں حصولِ آزادی کے بعد سے اس قدر خوار و زار ہوئی ہیں کہ بادشاہ محمد تغلق کی عہد میں بھی اتنی نہ ہوئی ہوں گی۔ علاقائی زبانوں کی اساس پر ریاستوں کی تقسیم کے بعد ملک بھر میں ہمارے قانون ساز، نیتا اور رہنما اکثر و بیشتر ایسے لوگ ہیں جن کے لئے علاقائی زبان بولنا اور اس کو سمجھنا جو انھوں نے ماں کی گود میں ہی سیکھ لیا تھا، کافی ہے۔ اس نااہلیت سے اور قومی کردار کے یکسر مسمار ہو جانے سے، ریاکاری، دھوکے دہی، چالبازی، ڈھکوسلہ دہی، چور بازاری، رشوت ستانی، گرانی وغیرہ نے زندگی درگور کر کے رکھ دی ہے۔ اس ماحول میں جو ناہمواریاں سماج میں پیدا ہو گئی ہیں وہ ملک کے طنز و مزاح نگاروں کے لئے نت نئے موضوعات پیش کرنے میں مددگار و معاون ثابت ہوئے ہیں۔

کچھ اس قسم کے سماج میں کنہیا لعل کپور نے لکھنا شروع کیا۔ درس و تدریس تو بہرحال اُن کا پیشہ ہی تھا، اس لئے ان کی نگارشات میں بلاواسطہ دکھانے اور اصلاحی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کا شعور پایا جاتا ہے۔ ان کے طنز و مزاح میں ایک حسین شگفتہ دلکشی ہے، وہ حقِ موضوعات سے حتی الامکان ہٹ کر وہ طبعِ انسانی کے متضاد پہلوؤں کی ناہمواریوں کو اجاگر کرتے ہوئے مزاح پیدا اور اُن پر طنز کرتے ہیں۔

دورِ حاضر کے لکھنے والوں میں کنہیا لعل یقیناً منفرد حیثیت کے حامل تھے۔ اُن کی نگارشات میں بلا کا اختصار ہے جو اچھے طنز کے لئے ایک بنیادی صفت ہے۔ ان کا طنز بہت لطیف اور ایک منفرد نزاکت کا حامل ہے۔ اُن کی تحریروں کو پڑھ کر کبھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی اور نہ ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے لٹھ چلا دیا ہو۔ بلکہ جس عیب، برائی اور زندگی کی ناہمواری کے خلاف انھوں نے قلم اٹھایا موضوع سے انحراف کئے بغیر اپنے نشانہ پر سے ناک نہیں ہٹائی، اور اس لئے ان کے طنز کا وار ہمیشہ کاری ہوتا تھا۔ الفاظ کی موزونیت کے اعتبار سے ان کے مضامین میں ایک شگفتہ روانی، ایک طرح کا بانکپن اور کشش ہے اور پھر اُس سطح جس سے گذر جانے پر مزاح میں مسخرہ پن نمودار ہو جاتا ہے، وہ اُس سے کوسوں دور رہے۔ طنز و مزاح کی تعریف خود کنہیا لعل نے یوں کی ہے: "لفظ اُلّو استعمال کئے بغیر کسی کو اُلّو کہنا طنز ہے۔ اپنے یا غیر پر ہنسنا مزاح ہے"!

کنہیا لعل کو اردو ادب میں شہرت ان کی پہلی تصنیف "سنگ و خشت" کے ۱۹۴۲ء میں منظرِ عام پر آنے سے ملی۔ اس کا ایک مضمون "مرزا غالب ترقی پسند شعرا کی محفل میں" طنز و مزاح کا ایک ایسا مرقع ہے کہ اُس کو پڑھ کر اُردو پڑھنے والے چونک پڑے۔ اس مضمون میں اَدبِ عالیہ کی قدروں کو جس طرح ترقی پسند شعرا نے پسِ پشت ڈال دیا تھا، اُس پر بھرپور لطف انگیز طنز

...کنہیا لعل کا یہ مضمون طنز و مزاح کے میدان میں یقیناً لاثانی اور لافانی ہے۔

"سنگ و خشت" کی بے پناہ مقبولیت کے بعد اُن کی دیگر تصنیفات یہ ہیں: "شیشہ و تیشہ" (۱۹۴۴)۔ "چنگ و رباب" ...ء "نوک و نشتر" ۱۹۴۹ء "بال و پر" ۱۹۵۴ء "نرم گرم" ۱۹۵۷ء "گرد کارواں" ۱۹۶۰ء "گستاخیاں" ۱۹۶۶ء اور "نازک خیالیاں" ...ء

...ء سے زندہ دلانِ حیدرآباد کی یہ کوشش رہی کہ طنز و مزاح کے اس ولی کو اپنی سالانہ کل ہند ادبی محفل کی زینت بنانے کا ...از حاصل کریں، مگر ہر مرتبہ موصوف نے صحت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے معذرت چاہی۔ ایک مرتبہ وہ خدا خدا کر کے آنے کے ...راضی بھی ہو گئے مگر اجلاس منعقد ہونے سے کچھ دن پہلے اُن کا لعمول کا مکتوب وصول ہو ہی گیا ـــ وہی عارضہ قلب، وہی عذر لنگ۔ وہ فرش ...اور نہیں چاہتے کہ حیدرآباد آکر اسٹریچر پر سے لیٹے لیٹے خطبہ صدارت عطا فرمائیں۔ موصوف نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ وہ خرابی صحت ...وجہ سے اس موقف میں نہیں تھے کہ اسٹریچر سے خطبہ صدارت عنایت کرنے سے جو مزاح پیدا ہو سکتا ہے اُس سے ہمیں نواز سکیں!

آخری مرتبہ میری ملاقات کنہیا لعل کپور سے ۱۹۷۹ء میں ایک جشنِ طنز و مزاح میں ہوئی تھی جسکو حکومت ہریانہ کے محکمہ اطلاعات ...چندی گڑھ میں منعقد کیا تھا اور جس میں فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر، شفیقہ فرحت نے بحیثیت نثر نگار اور شاعروں میں ...ل رام پوری، آفتاب لکھنوی اور نظر برنی نے شرکت کی۔ اس وقت بھی مجھے بڑی شدت اور مسرت سے محسوس ہوا کہ کنہیا لعل بقول ...دت خوش باش، جوکس، خوش مزاج ملنسار اور بات بات میں بات پیدا کرنے والے انسان ہیں۔ کچھ ماہ سے انھوں نے "پنجاب کیسری ...ند سماچار" اخبار میں ایک مختصر کالم بھی لکھنا شروع کیا تھا جو کافی مقبول ہو گیا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے ابھی تک کسی بھی نقاد کی کوئی ایسی تحریر نہیں پڑھی جس میں کنہیا لعل کپور کے کسی مضمون، کسی ...ضمون کے بارے میں کسی قسم کا عیب یا تشنگی کا اظہار کیا گیا ہو۔ برعکس اس کے جس نے ان کی نگارشات کو پڑھا خراج تحسین ...ئے بغیر نہ رہ سکا۔

۱۹۸۰ء اور سنہ ۱۹۸۱ء طنز و مزاح کے لکھنے والوں کے لئے بڑے منحوس ثابت ہوئے ہیں۔ پہلے ناظر خیامی نے ایک ریل کے ...سفر میں بعارضہ قلب اپنے ہم سفر جناب خمار بارہ بنکوی صاحب کی گود میں سر رکھے آخرت کا سفر طے کیا۔ اُن کے بعد ہمارے ...شہنشاہ طنز و مزاح سلیم خلیب نے دستِ اجل کو لبیک کہا۔ پھر گلی تلنگندوی صاحب زندگی کو ٹھکرا کر چل بسے اور بالآخر کنہیا لعل کپور ...نے اپنے خالق کی پناہ مانگ لی۔ طنز و مزاح کے میدان سے ان قابل قدر ہستیوں کے یکے بعد دیگرے چلے جانے پر ہم جس قدر سوگ ...منائیں کم ہوگا۔

ویسے تو یہ امر مسلمہ ہے کہ موت کی دسترس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ مگر ادارہ زندہ دلانِ حیدرآباد کی یہ حسرت کہ وہ کنہیا لعل ...کپور کو اپنی سالانہ محفل میں لاسکتے دل ہی دل میں رہ گئی ہے۔ بہر حال کنہیا لعل صاحب کا ایک خط ـــ جو آخری خط ثابت ہوا ـــ ...ہمارے لئے تبرک بن گیا ہے۔ تحریر کے ساتھ ساتھ صاحبِ تحریر کی خوش مزاجی اور مزاح نگاری کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ...اور یہ عالم اُس وقت کا ہے جب وہ مرض، درد، دوا اور پرہیز میں مبتلا تھے۔ اس خط کا عکس قارئین شگوفہ کی خدمت میں پیش ہے۔

(مذکورہ خط زیر نظر اشاعت میں علٰحدہ دیا جا رہا ہے)

رام لعل نابھوی

کنہیا لعل کپور کی یاد میں

یقین کرو یا نہ کرو۔ کنہیا لال کپور اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ یہ اب ایک اذیت ناک حقیقت ہے کہ وہ ہم میں موجود نہیں موت کا ایک وقت معین ہے۔ جب وہ وقت آجاتا ہے۔ زندگی موت کی تاریک وادیوں میں ابدی نیند سو جاتی ہے۔ میرے سامنے ایک بھیانک خلا ہے۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا کچھ سوجھتا نہیں۔ میں گہری تاریکی میں بھٹک رہا ہوں۔ ان کی یاد آرہی ہے۔ ایک کے بعد دوسری۔ یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چل رہا ہے۔ میں گم ہو رہا ہوں۔ میری زبان لڑکھڑا رہی ہے۔ میرے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔ صرف ایک ہی آواز میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔ کتنے اچھے تھے ہمارے کنہیا۔ اتنے پیارے کہ خدا کو پیارے ہو گئے۔

مگر نہیں۔ کپور اپنا جسم خاکی ہی تو لے کر گئے ہیں۔ باقی سب یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ وہ ایک رنگ میں نہیں ہر رنگ میں موجود ہیں۔ تاریکی ہمیشہ نہیں رہتی۔ مجھے ان کا مسکراتا، ہنستا، قہقہے لگاتا چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ فن کار کبھی نہیں مرتا۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ اس کا فن زندہ رہتا ہے۔ وہ درخشندہ ستارہ آج بھی درخشاں ہے۔ اس کی چمک۔ آب و تاب ویسی ہی ہے۔

ادیب قوم کی امانت ہوتے ہیں۔ ورثہ ہوتے ہیں۔ یہ امانت اور ورثہ ہمیں آنے والی نسلوں کے لیے سنبھالنا ہے۔

اس حقیقت کو کیسے جھٹلا دیا جائے کہ کپور کی موت اردو ادب کے لیے سانحہ ہے۔ بہت بڑا سانحہ اس لیے بھی کہ

"جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں"

اردو زبان کی سب سے مشکل صنف طنز و مزاح میں جس کے لکھنے والے پوری دنیا میں انگلیوں پہ گنے جا سکتے ہیں چالیس سال تک مسلسل لکھنے والا اور اس میدان کا شہسوار ایک ایسے وقت میں چلا گیا جب اردو زبان زوال سے نکل کر اپنا قدم پھر سے جما رہی تھی اور اردو ادب کو ان کی سخت ضرورت تھی۔ کپور کا قلم مرتے دم تک نئی ہی جولانیاں دکھاتی رہی۔ وہ برابر

مزاح نگاری کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہے۔ نظم و نثر کے بخئے اُدھیڑتے رہے۔ طنز کا نشتر لیے عمل جراحی میں مشغول رہے۔ وہ رکے ہی نہیں۔ وہ رکنا جانتے ہی نہیں تھے۔ اللہ نے طنز و مزاح کی دولت انہیں جس قدر دی انھوں نے فیاضی سے لٹا ڈالی۔ کپور آخر دم تک جوان تھے۔ ان کا قلم جوان تھا۔ ان کا دماغ جوان تھا۔ ان کی زبان جوان تھی۔ ان کا دل جوان تھا۔ وہ مسکراتے تھے ہنستے تھے۔ ہنہاتے تھے۔ قہقہے لگاتے تھے۔ پنجاب کے علاقہ میں ستر سال کی عمر تو سمجھی ہی کچھ نہیں جاتی۔ ایک ہنستی گنگناتی مچلتی زندگی دفعتاً موت کی آغوش میں چلی جائے گی۔ اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ یہ موت کپور کی نہیں۔ یہ موت اُردو ادب کے متوالوں کے ارمانوں اور حسرتوں کی موت ہے۔

شہر لاہور میں کیا نہیں تھا۔ کیا نہیں ہے۔ تبھی تو کہا جاتا ہے۔ جنہے لاہور نہیں دیکھیا۔ جمیاّ ہی نہیں "۔ لاہور شہر کے بسنے سے پہلے ہی یہاں ادب بستا تھا۔ ادیب بستے تھے۔ یہاں ادیب بنتے تھے۔ بنائے جاتے تھے۔ یہاں ادب پیدا ہوتا تھا۔ یہاں ادیب پیدا ہوتے تھے۔ یہ ادیبوں کا گہوارہ تھا۔ ادیبوں کا اکھاڑہ تھا۔ یہاں پنجاب کے دریائے ظفر علی خاں کی ہول ناک موجوں کے تھپیڑے تھے۔ یہاں ہری چند اختر۔ بڑے بڑے جغادری شعراء کو اپنے ایک شعر سے ہی نشانہ بنا دیتے تھے۔ یہاں کپور کے ہمعصروں میں بطرس، دیوانہ، کرشن چندر، فکر تونسوی، شفیق الرحمن۔ عبدالمجید سالک۔ امتیاز علی تاج۔ عبدالعزیز فلک پیما جیسے چوٹی کے ادیب تھے۔ مشاعرے ہوتے۔ ادبی محفلیں جمتیں۔ اپنے نام اچھالے جاتے۔ دوسروں کی پگڑیاں اچھالی جاتیں۔ کسی کی توند، کسی کی ٹوپی۔ کسی کی داڑھی۔ جملوں کی زد میں آتی۔ جوابی حملے ہوتے۔ ادبی دنگے ہوتے۔ ادبی دنگل ہوتے۔ ایک دوسرے کو چوٹیں دیتے۔ ایک دوسرے کی چوٹیں سہتے۔ ادب وہاں امپورٹ نہیں ہوتا تھا۔ ایکسپورٹ ہوتا تھا۔ ادب وہاں نکھرتا تھا اس تمدن میں پلے۔ پنپے۔ بڑھے۔ کنہیا لال چوٹی کے ادیب اور طنز و مزاح کے قطب مینار بن کر ہی لاہور سے نکلے۔ کپور کو لاہور چھوڑنے کا بہت غم رہا۔ انہیں لاہور ہمیشہ یاد آتا رہا۔ جب یاد کرتے ان کے سینے سے ایک ہوک اٹھتی۔ موگہ کے غیر ادبی ماحول میں پہنچے۔ دل قدرے ٹوٹ گیا۔ ادب کی دنیا سے کٹ چکے تھے۔ بکھرنے لگے۔ جالندھر پہنچے۔ کچھ ادبی ماحول بھی ملا۔ قدر بھی ہوئی۔ جان میں قدرے جان آئی۔ پونا جانا پڑا۔ پھر ادبی دنیا سے بچھڑ گئے۔ ذہنی خوراک نہ مل سکی۔ کہاں لاہور کہاں پونہ۔ دل قدرے ٹوٹ چکا تھا۔ ٹوٹنے لگا۔ آخر دل ہی تو ہے۔ ٹوٹ کر ہی رہا۔

میں پچھلے سال جالندھر ان سے ملنے گیا۔ کھانے پر باتیں لاہور کی ہی رہیں"۔ میں نے پوچھا" میاں۔ کوئی ادبی پرچہ اٹھائیے۔ آپ موجود۔ دس کتابیں بھی لکھ ڈالیں۔ سید احتشام حسین۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر محمد حسن جیسے مدبرین نے آپ کی قدر بھی خوب کی ہے اور ملا صرف ایک غالب ایوارڈ۔ ایسا کیوں"۔ اپنی مخصوص ہنسی میں بولے "کیوں بھئی یہ کیا کم ہے جو بلا مانگے مل گیا۔ میری اور خواجہ عبدالغفور صاحب کی کوششیں کہ چندی گڑھ اور بمبئی میں ان کا جشن منانے کی وہ صرف منظوری دے دیں۔ دھری کی دھری رہ گئیں۔ وہ ان باتوں سے لاپرواہ۔ اپنی تعریف خود کرنے اور دوسروں سے کرانے سے بے نیاز تھے۔ آخر بڑا آدمی بڑا بنتا ہی جب ہے جب اس کا کردار بڑا ہو۔ یہی کردار ہی تو ہے جو روشنی دے رہا ہے۔ بعض شاعروں اور ادیبوں کو دیکھا گیا ہے کہ ذرا شہرت ملی اور آپے سے باہر۔ عام زندگی کے تو ان میں ہی فرق آ گیا۔ کپور کی عالی ظرفی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی۔ جشن منوانے کے لیے جو پاپڑ بیلے جاتے ہیں وہ کون نہیں جانتا۔ کپور سے ملنا بلاشبہ ایک سعادت تھی۔ ان سے ملنا ایک عہد سے ملنا تھا۔ ان سے ملنا ادب کی ایک جیتی جاگتی تاریخ سے ملنا تھا۔

کپور صاحب کو قدرت نے ایک سدا بہار ذہن عطا کیا تھا۔ وہ بے خوف۔ بے باک تھے۔ وہ مزاح میں طنز اور طنز میں مزاح اس طرح ملاتے تھے کہ نشہ دو آتشہ ہو جاتا تھا۔ ان کی باتیں ان کی تحریروں سے زیادہ دل چسپ اور ظریفانہ ہوتی تھیں بلکہ تلخ سے تلخ پھبتی کو وہ ایسے شیریں الفاظ اور انداز سے ادا کرتے کہ کسی کو خلش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے الفاظ سے ہنساتے رہے۔ اس روتی بسورتی اعصاب زدہ دنیا میں وہ فطری شگفتگی سے دنیا کو محظوظ اور بشاش کرتے رہے۔ آج سب سے زیادہ ان کی دھیمی مسکراہٹ یاد آتی ہے۔

"ذرا دیکھو ستم ظریفی ہنسانے والا رلا کے اٹھا"

کپور صاحب ناظم تھے ناشر تھے۔ مصنف تھے۔ ایک نمبر کے مقدمہ باز تھے۔ وہ مصنفوں کو تصنیف کرتے تھے کسی مصنف کی یا کسی تصنیف کے بخیے ادھیڑتے تھے۔ مبصر تھے۔ نقاد تھے۔ مبلغ علم و فن تھے۔ وہ مقالے لکھتے تھے مضامین لکھتے تھے۔ خاکے لکھتے تھے۔ ترجمے کرتے تھے۔ وہ ایک نباض تھے۔ ایک حکیم تھے۔ وہ ایک جراح تھے معلم تھے متعلم تھے۔ بولتے پنجابی میں تھے۔ لکھتے اردو میں تھے۔ پڑھاتے انگریزی میں تھے۔ سنسکرت کے عالم تھے۔ مختلف علوم سے بہرہ ور تھے۔ سب سے بڑے بیروڑی باز تھے۔ اس ایک فن نے ہی انھیں دنیا سے روشناس کرایا۔ ایک دل چسپ واقعہ سنیے۔ آپ نے محکمہ السنہ پنجاب کے ایما پر ایک مقالہ "اردو نثر کے ارتقا میں پنجاب کا حصہ" لکھا اور پڑھا۔

ایک صاحب نے فرمایا۔ "صاحب مقالہ مختصر ہے۔ آپ سے اور بھی بہت کچھ جاننے کی خواہش تھی۔" برجستہ جواب ملا۔ "میاں ڈھائی سو روپیہ میں چار صفحات سے زیادہ لکھ کر نہیں دیتا۔ یہ تو ڈائرکٹر صاحب کی شرافت اور محبت نے بیس صفحات لکھوا لیے۔" محفل قہقہہ زار ہو گئی۔

"موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس"

اُردو زبان کی باوقار ہستی مولانا صلاح الدین احمد فرماتے ہیں:

"فصاحت۔ بلاغت۔ حسن انتخاب۔ الفاظ۔ احساس توازن مطالب۔ زور طبیعت۔ لطافت ذوق یہ سب برسوں کی مشق کے بعد جب ایک جگہ مل کر محفل جماتے اور خلوص کا چراغ نیم شب جلاتے تو ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ اور فن کی نئی نئی خصوصیتوں کی نوید لاتی ہے لیکن افسوس ہے کہ دور حاضر میں ادب اور ادب کے یہ تصورات مسلسل ماند ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ نوبت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ہر وہ برخود غلط نوجوان جو کسی محنت اور کسی کاوش کے بغیر چند الٹی سیدھی لکیریں لکھ کر کسی موسمی رسالے میں چھپوا لیتے ہیں۔ انشا پرداز ہونے کا مدعی بنتا اور ادیب کہلوانے پر اصرار کرتا ہے۔ اور اگر آپ اسے سمجھانے کی کوشش کریں اور اس کا دعویٰ فی الفور تسلیم نہ کریں تو وہ کسی انجمن بہبود مصنفین کی فہرست میں سے جھٹ اپنا رجسٹرڈ نمبر نکال لاتا ہے۔"

جی ہاں موثر کردار سے ہی فن کار ادب اور سماج میں اپنا مقام بنا سکتا ہے۔ ادبی دنیا میں نام نمود ملنا بہت مشکل ہے اس محاذ پر نہ پرگوئی کام آتی ہے نہ بسیار نویسی نہ کم گوئی نہ اختصار نویسی۔ مبلغ علم و فن کی ہر بات کو ناقدانہ طور پر پرکھا جاتا ہے کسوٹی پر کسا جاتا ہے کندن بننے سے پہلے تپنا پڑتا ہے۔ گلنا پڑتا ہے۔ تب کہیں ایک کنہیا کپور بنتا ہے۔ تب ہی آواز نکلتی ہے۔

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

زندہ دلان حیدرآباد، شگوفہ کا کپور نمبر شائع کرنے کے لیے، زندہ دلان پنجاب اور محفل طنز و مزاح چنڈی گڈھ کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے اپنی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ مدیر "اوراق" لاہور کا شکریہ جو اپنے تازہ شمارہ میں گوشۂ کنہیا لال شائع فرما رہے ہیں۔ مگر مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ کپور کی یاد میں بہت کم لکھا گیا ہے اور جو چھپا ہے وہ بہت مختصر۔ کیا ہم اس عظیم فن کار کا جو ایک مکمل انسان تھا اور جوڑ توڑ میں یقین نہیں رکھتا تھا اور پھر اردو ادب کا معمار تھا، کھل کر اور ٹوٹ کر ذکر بھی نہیں کر سکتے۔ ادیب کی قیمت ادیب کی قدر افزائی ہے اور پھر

"ادب ادب ہے ادب کا نہیں کوئی مذہب
خدا کے فضل سے یہ کفر ہے نہ یہ اسلام"

کپور نے ادبی رسالوں اور پرچوں کو اپنا خون پلایا ہے انہیں زندگی دی ہے۔ کیا مدیران کپور کو زندگی دیں گے؟ کیا آنے والی نسلوں کو اس کنہیا لال سے روشناس کرائیں گے جیسے انھوں نے دیکھا ہے۔ جانا ہے۔ پرکھا ہے تولا ہے جس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے؟ خدارا ادب سے بے ادبی دور کیجیے ورنہ کوئی مزاح نگار نہ زندہ رہنا چاہے گا نہ مرنا۔

میں نے "نقوش" کے شوکت تھانوی نمبر میں ارشاد تھانوی کا ایک مضمون پڑھا تھا جس میں شوکت مرحوم کی زندگی کے اہم واقعات کھل کر اور بے باکی سے بیان کیے گئے تھے۔ کیا کپور صاحب کے بارے میں کوئی ان کا پرانا ساتھی ان کی زندگی کے اوراق پلٹے گا یا محض وہی ہوگا جو ہوتا آیا ہے۔

ہوئے دوست رخصت ہوئی قبر بند
کھلا اب کہ کوئی کسی کا نہیں

رشید الدین (حیدرآباد)

کنہیا لال کپور (مرحوم)

۱۰ رمئی ۱۹۸۰ء کی شام میں میں روزنامہ "ملاپ" دہلی دیکھ رہا تھا کہ ایک چھوٹی سی خبر پر نظریں رک گئیں۔

"کنہیا لعل کپور چل بسے"

دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ لکھا تھا کہ ۵ رمئی ۱۹۸۰ء کو پونہ میں اردو کے ممتاز طنز نگار اور مزاح نگار کنہیا لعل کپور کا دل کا دورہ پڑھنے سے دیہانت ہو گیا۔ چند سال سے کپور اپنے لڑکے کے پاس پونہ منتقل ہو چکے تھے۔ اتنے بڑے ادیب کی موت کی خبر اخبارات میں اتنی دیسے اور اتنی مختصر شائع ہوئی یہ سوچ کے مجھے بڑا رنج ہوا۔

اپنا رنج ہلکا کرنے کے لیے میں نے اسی وقت مصطفیٰ کمال ایڈیٹر "شگوفہ" کو فون کیا۔ لیکن انھیں اس خبر کی کوئی اطلاع ہی نہیں تھی۔ سن کر بہت افسوس کرتے رہے۔ کہنے لگے رشید صاحب عجیب اتفاق ہے کہ ہم چند ماہ بعد حیدرآباد میں ان کا جشن منانے والے تھے اور وہ اس طرح اچانک خاموشی سے ہم سب چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر دوسرے دن اخباروں میں مصطفیٰ کمال صاحب کا تعزیتی بیان بھی نظر سے گذرا اور حیدرآباد میں یہ خبر عام ہو گئی کہ کنہیا لعل کپور اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ بھارت چند کھنہ صاحب نے ریڈیو سے مضمون پڑھا اور اخباروں اور رسالوں میں بھی کچھ لکھا گیا اور کچھ ادبی جلسوں میں تعزیتی قرار دادیں منظور ہوئیں۔ بس یہی ماتم اس عظیم طنز نگار کا کیا گیا۔

ماہنامہ "شگوفہ" یقیناً قابلِ مبارکباد ہے کہ اس نے کپور پر ایک نمبر نکالنے کا اعلان کیا اور اردو کے ایک مشہور مزاح نگار خواجہ عبد الغفور صاحب کو اس کا مہمان ایڈیٹر مقرر کیا۔ اہلِ حیدرآباد اس طرح کچھ نہ کچھ حق اس قلندر ادیب کا ادا کریں گے جو کبھی اس شہر کو نہیں آیا اور جب بھی زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ جلسے میں اسے مدعو کیا گیا تو اس نے ایک پُر لطف خط کے ساتھ اسے خوبصورتی کے ساتھ ٹال دیا۔

کنہیا لعل کپور سے مجھے شروع سے بڑی عقیدت رہی ہے۔ دراصل آج سے ۲۵ سال پہلے اورنگ آباد میں ان کی کتابیں پڑھ پڑھ کر ہی میں نے مزاح نگاری شروع کی تھی۔ اس طرح مزاح نگاری میں وہ میرے گرو ہیں۔ آج سے بیس سال قبل جب میرے دوست احمد جمال پاشا نے لکھنؤ سے اپنے مزاحیہ رسالے "اودھ پنچ" کا کپور نمبر نکالا تھا تو اس میں میں نے پہلی بار ایک

مضمون لکھ کر انھیں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ جب میں نے ایک خط لکھ کر اس مضمون کے بارے میں ان کی رائے جاننی چاہی تو انھوں نے جواب میں لکھا۔

" برادرم !
آپ کا خط ملا۔ تعجب ہے آپ کو میرے بارے میں اتنی ساری باتیں کس طرح معلوم ہیں۔ نہ میں آپ سے کبھی ملا۔ اور نہ آپ مجھ سے نہ میں نے آپ کو کبھی خط لکھا اور نہ آپ نے مجھے۔ مثل مشہور ہے کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے لیکن باہر کا بھیدی غضب ڈھائے۔ ایسی کوئی مثل نہیں۔ حالانکہ اب ہونا چاہیئے۔ بہرحال آپ نے خلوص سے میرے بارے میں کچھ لکھا جس کا شکریہ ادا کرنا بڑی بدتمیزی ہوگی۔"

یہ مختصر سا خط انھوں نے مجھے موگا (پنجاب) سے لکھا تھا۔ اس کے بعد نہ میں نے انھیں کبھی خط لکھا اور نہ انھوں نے۔ ویسے بھی خط لکھنے اور جواب دینے کے معاملے میں وہ کافی لاپرواہ واقع ہوئے تھے۔ سب کو جانتے تھے سب کی چیزیں پڑھتے تھے۔ مگر تعلقات استوار نہیں کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مغرور یا بددماغ تھے بلکہ ان کی طبیعت میں الگ تھلگ رہنے کا مادہ زیادہ تھا۔ لیکن اپنے مخصوص دوستوں سے وہ کھل کر ملتے تھے اور خوب چہکتے تھے۔

ان کی سات کتابیں تھیں اور سات ہی بچے تھے۔ اسی طرح ان کی سلفی اور مصنوعی اولاد کی تعداد مساوی تھی۔ کپور بہت گھریلو آدمی تھے۔ ہرچند وہ دنیادار نہیں تھے اور عملی زندگی کے بکھیڑوں سے دور بھاگتے تھے لیکن گھر والوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ آخری ایام میں وہ صرف گھر والوں ہی کے ہو کر رہ گئے۔ آج سے ۱۰ سال قبل وہ خود اپنے قلم سے اپنی موت پر ایک دلچسپ مضمون بھی لکھ چکے تھے۔ جس کا عنوان ہی "کنہیا لعل کپور مرحوم" تھا۔

کپور کا تعلق بنیوں کے خاندان سے تھا ان کے خاندان میں پڑھے لکھوں کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ لیکن کپور نے نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ انگریزی میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا اور لاہور ہی میں انگریزی کے لکچرر ہو گئے۔ ان کا تعلق پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں سے تھا اس لیے ان شہروں میں رہنے والوں کی ہوشیاری اور عیاری عمر بھر پیدا نہ ہو سکی۔

کپور تقسیم ہند کے سخت خلاف تھے۔ اس لیے انھیں زندگی بھر اس کا بڑا قلق رہا اور انھوں نے ہندوستان کے کئی بڑے شہر (جیسے دلی) کو چھوڑ کر موگا جیسے پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبے میں عافیت تلاش کی مرنے سے چند سال قبل وہ پونہ (مہاراشٹر) منتقل ہو گئے تھے جہاں ان کا لڑکا ملازم تھا۔ بمبئی میں مہاراشٹرا اردو اکیڈمی کا ایک جلسہ وہ آخری ادبی تقریب تھی جس میں انھوں نے شرکت کی اور احباب سے ملے۔

کپور کرشن چندر مرحوم کے طالب علم کے زمانے کے ساتھیوں میں سے تھے۔ یہی ساتھ بعد میں دوستی میں بدل گیا۔ کرشن چندر کپور کے فقروں اور چٹکلوں سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔ اور ان ہی کی ایما پر کپور نے مزاح شروع کی تھی۔ کپور ترقی پسند تھے اور ترقی پسندوں ہی میں گھرے رہتے تھے۔ لیکن ترقی پسندی تحریک کی کمزوریوں سے انھوں نے کبھی درگزر نہیں کیا۔ اسی سلسلے میں ان کا مضمون "غالب ترقی پسندوں کی محفل میں" خاصے کی چیز ہے۔

مطالبہ پاکستان کے خلاف بھی انھوں نے "مطالبات" کے عنوان سے ایک چبھتا ہوا مضمون لکھا تھا۔ جس پر اس زمانے میں پنجاب میں بڑی لے دے رہی تھی۔ اور آخر میں کپور کو اس مضمون کے تعلق سے تحریری معافی مانگنی پڑی۔ لیکن اس کے باوجود وہ زہر ہلاہل کو کبھی قند نہ کہہ سکے۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کنہیا لعل کپور سے میں کبھی نہیں ملا لیکن کپور کی کتابیں پڑھتے ہوئے میں نے ان کے ساتھ گھنٹوں گزارے ہیں۔ کبھی ان کے چست فقرے پر میں تنہائی میں بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ کبھی ان کے کسی چبھتے ہوئے فقرے پر مسکرا بھی

پڑا اور کبھی کسی طنزیہ جملے پر تلملا بھی اٹھا۔ اس وقت مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ جیسے کپور میرے کمرے کی کھڑکی سے لگے کھڑے ہیں۔ اور اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے ہیں کہ " برادرم! اس چوٹ کو ہلکے ہلکے سہلاؤ بڑا مزہ آئے گا"

اپنی روزمرہ زندگی میں کپور ہمیشہ خوش و خرم رہے۔ انھیں کسی COMPLEX نے غم زدہ اور رنجیدہ نہیں کیا۔ فسادات کے زمانے میں لاہور جیسے شہر میں بھی ان کی مسکراہٹ پھیکی نہیں پڑی۔ وہ جب لاہور جیسے علمی و ادبی شہر کو چھوڑ کر موگا جیسے پنجاب کے ایک دور افتادہ قصبہ میں آ گئے تب بھی ان کی مسکراہٹ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہاں بیٹھ کر بھی انھوں نے وہی دلچسپ مضامین لکھنے شروع کر دیئے اور اس طرح زندگی ایک بار پھر اس طرح معمول پر آ گئی جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں مجھے تو یہ بھی ہمارے معاشرہ پر کپور کا ایک گہرا طنز نظر آتا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کپور بہت دلچسپ اور مزیدار باتیں کرتے تھے اور ہمیشہ محفل کی جان بنے رہتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی یہ باتیں وبال جان بھی بن جاتی ہیں۔ اور یہ زیادہ اور دلچسپ باتیں کرنے والے کو اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر دفعہ کپور کے ساتھ بھی ایسا ہوا لیکن انھوں نے یہ ہر بار اپنی طبیعت کی مناسبت سے بات کو سنجیدہ شکل اختیار کرنے ہی نہیں دیا۔ ایک دفعہ باتوں ہی باتوں میں ان کے ایک لکچرر دوست ان سے الجھ پڑے اور سخت سست کہہ ڈالا۔ کپور نے یہ سن کر سنجیدگی سے کہا " دیکھئے پروفیسر صاحب ہم آپ کو ایک شریف آدمی سمجھتے تھے۔" یہ سن کر وہ لکچرر صاحب اور بھی آگ بگولہ ہو گئے اور کہنے لگے: "ہم نے بھی آپ کو ایک شریف آدمی سمجھا تھا۔ اس پر کپور نے حسب معمول سنجیدگی سے کہا " آپ صحیح سمجھتے تھے دراصل غلطی مجھ سے ہوئی" پہلے تو سب لوگ اس چوٹ کو نہ سمجھتے ہوئے خاموش رہے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد جب حاضرین کو اس جملے کی بلاغت کا احساس ہوا تو سارا اسٹاف روم قہقہوں سے گونج اٹھا اور اس طرح اپنی دلچسپ شخصیت کی وجہ سے کپور نے اتنے سنجیدہ ماحول میں قہقہے بکھیر دیتے اور پھر چوٹ الگ رہی

وہ خود بھی بہت اچھا اور بامزہ مذاق کرتے تھے۔ اور دوسروں کے مذاق سے بھی خوش ہوتے تھے۔ مثلاً ایک بار ایک انگریز خاتون نے ان کے دبلے پتلے اور سنکی جسم کو دیکھ کر ازراہ مذاق کہا "کپور صاحب! آپ اتنے پتلے ہیں جتنی کہ ایک سوئی ہوتی ہے۔" مذاق تو بہت عمدہ تھا اور وہ بھی ایک عورت کی طرف سے ایک لمحے کے لئے تو کپور سٹپٹا گئے لیکن بھلا وہ کیوں کسی سے پیچھے رہتے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے نہلے پہ دہلا دے مارا کہ " محترمہ آپ مبالغہ سے کام لے رہی ہیں ـــــ چند ایک سوئیاں مجھ سے موٹی بھی ہوتی ہیں۔"

اپنی عملی زندگی میں کپور بہت مخلص اور ملنسار رہتے تھے۔ ان کا مذاق کسی کی دل آزادی کے لیے نہیں بلکہ محض فضا اور ماحول کو دلچسپ بنانے کے لیے ہوتا تھا۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنا بھلا مانس اور اتنا چبھتا ہوا طنز کیوں کر لکھتا تھا تو اس کا جواب انھوں نے خود دیا تھا:

" طنز میرے بس کا روگ نہیں۔ اس پر میرا کچھ اختیار نہیں۔ وہ تو میری فطرت میں بغیر اتا پتا بتائے داخل ہو گیا ہے۔"

[نریش کمار شاد نے یہ انٹرویو جنوری ۱۹۶۳ء میں لیا تھا]

عظیم طنز و مزاح نگار

کنہیا لال کپور سے انٹرویو

کپور: آیئے شاد صاحب چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ بھئی بڑی مدت کے بعد آئے۔ اجازت ہو تو آپ کی آمد کی خوشی میں ایک فرسودہ شعر پڑھ لوں؟

شاد: نہیں قبلہ! خدا کے لیے نہیں۔ فرسودہ اشعار اور سال خوردہ خواتین سے مجھے نفرت ہے چڑ ہے۔

کپور: ہم شاید پندرہ برس کے بعد ملے ہیں۔

شاد: جی ہاں! تاریخ ہند میں یہ دوسرا "بھرت ملاپ" ہے۔

کپور: ایک لحاظ سے یہ "بھرت ملاپ" سے بھی بڑا ملاپ ہے۔ بھرت اور رام کی ملاقات تو چودہ برس کے بعد ہوئی تھی۔

شاد: آپ بجا فرماتے ہیں۔ ماشاء اللہ اب تو آپ اچھے خاصے بزرگ نظر آنے لگے ہیں۔

کپور: آپ کا اشارہ شاید میرے سفید بالوں کی طرف ہے۔ حضور! یہ بزرگی بکثرت مطالعہ کی عنایت نہیں بلکہ لاہور چھٹنے کے غم نے مجھے قبل از وقت بوڑھا کر دیا۔

شاد: ہائے لاہور، وائے لاہور۔ "کلکتہ" کی بجائے لاہور پڑھ کر اس شعر کا لطف لیجیے ؎

لاہور کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

کپور: اور فرمایئے کیسے گزر رہی ہے؟

شاد: جی رہے ہیں کمال کرتے ہیں۔ اور آپ؟

کپور: حال بہت برا ہے مستقبل بہت بدتر۔ اور عاقبت کی خبر خدا جانے!

شاد: معلوم ہوتا ہے زندگی نے آپ کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جس کے آپ مستحق تھے

کپور: زندگی ..... شاد صاحب! جب آپ ۱۹۴۷ء میں ایک دن میرے ہاں تشریف لائے تھے تو آپ ایک فسادی حادثے کی روداد مجھے سنائی تھی۔ یاد ہے وہ آپ کو؟

شاد: خدا جانے لاہور میں کتنے حادثوں سے دوچار ہوا ہوں۔ آپ کون سے حادثے کا ذکر کر رہے ہیں؟

کپور: ایک دن جب آپ دفتر سے گھر لوٹ رہے تھے تو ایک غنڈے نے جس کے ہاتھ میں چھرا تھا، آپ کا تعاقب کیا۔ آپ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے جا رہے تھے۔ اس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ شکار ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے آپ کی جانب چھرا پھینکا۔ آپ دہشت کے مارے بے ہوش

ہو گئے اور جب تک آپ کے اوسان بحال ہوئے تو آپ اٹھ کر پھر بھاگنے لگے۔

شاد : جی ہاں! یہ حادثہ تھا۔ لیکن آپ اس کی یاد دہانی کس غرض سے کرا رہے ہیں؟

کپور : شاد صاحب! میرے نزدیک زندگی دراصل ایک بے رحم غنڈا ہے جو شرفا کا روز اول سے پیچھا کرتا ہے۔ ہم اس سے بچ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سرپٹ بھاگتے ہیں۔ تھک کر گر پڑتے ہیں اور دم لے کر پھر بھاگنے لگتے ہیں۔

شاد : سبحان اللہ! خوب تشبیہ ہے۔ اس لیے کہ زندگی ہمیشہ شریف آدمیوں کے درپے آزار رہتی ہے غنڈوں سے کچھ نہیں کہتی۔

کپور : کہیے موگا میں کیسے آنا ہوا۔

شاد : میں ایک خاص کام سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

کپور : خدانخواستہ کہیں آپ مجھ سے انٹرویو لینے تو نہیں آئے!

شاد : آپ انٹرویو سے اتنا گھبراتے کیوں ہیں؟

کپور : انٹرویو سے نہیں، آپ کے سوالوں سے گھبراتا ہوں۔ "آپ کیوں پیدا ہوئے؟" "آپ کو طنز نگار کون کہتا ہے؟" "آپ نے اپنا پہلا مضمون کس سے لکھوایا؟" "آپ لکھنے سے کب توبہ کر رہے ہیں؟" "آپ کون سے غیر ملکی ادبا کے لطائف چراتے ہیں؟" "آپ کو ایسا کرتے وقت شرم کیوں نہیں آتی؟"

شاد : بہت خوب! لیکن آپ کا ان سوالوں کے جوابات دینے میں حرج ہی کیا ہے۔

کپور : حرج یہ ہے حضور کہ یہ سب میرے تجارتی راز ہیں۔ انھیں میں کیسے فاش کر سکتا ہوں۔

شاد : میں ان میں سے کوئی سوال نہیں پوچھوں گا۔ یہ فرمائیے کہ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا؟

کپور : کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ سوال کرنے کی بجائے آپ مجھے "قاشیں" سنائیں اور میں آپ کو دل کھول کر داد دوں تازہ نہیں تو پرانی ہی سہی۔ مثلاً ؎

کدوں کے بھی آس پاس رہی
گل رخوں سے بھی روشناس رہی
جانے کیا بات تھی کہ اس پر بھی
زندگی عمر بھر اداس رہی

شاد : چھوڑیئے کپور صاحب! شعر و شاعری کو فی الحال چھوڑیئے۔ اور میرے سوال کا جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائیے۔

کپور : ادبی زندگی کا آغاز! وہ تو پیدا ہوتے ہی ہو گیا تھا۔ شاد صاحب! آپ جانتے ہیں کہ پیدا ہونے کے بعد بچے کا سب سے پہلا فعل چیخنا اور چلاّنا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ایک طنز نگار بھی ساری عمر یہی کرتا ہے وہ بے ہودہ اشیا، یا اشخاص کو دیکھ کر چیختا ہے۔ دانت پیستا ہے۔ جیسے کہہ رہا ہو: "یہ سب کچھ کیوں ہے؟ اسے ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

شاد : پھر بھی آپ نے اپنا پہلا مضمون کب لکھا۔ اور کن حالات میں لکھا؟

کپور : پہلا مضمون ۱۹۳۶ء میں لکھا گیا۔ یہ کرشن چندر کے مشہور افسانہ "یرقان" کی پیروڈی تھا "خفقان"۔ ان دنوں کرشن چندر، مہندر ناتھ اور میں ہندو ہوسٹل لاہور میں رہا کرتے تھے اور تینوں بے کار تھے۔ اس مضمون کا مقصد کرشن چندر کی جذباتیت کا خاکہ اڑانا تھا

شاد : اس مضمون کا کیا حشر ہوا؟

کپور : بہت برا۔ اتفاق رائے سے تلف کر دیا گیا۔

شاد: آپ کا دوسرا مضمون کب لکھا گیا؟

کپور: دوسرا مضمون بعنوان "چینی شاعری" دسمبر ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا تھا۔ یہ "ادب لطیف" کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ مجھے یاد ہے جب کرشن چندر نے اسے پڑھا تو ہنس ہنس کے بے حال ہو گیا۔ لیکن جس مضمون نے "ادبی دنیا" میں ۱۹۴۲ء میں چھپا۔ اس کا عنوان تھا غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں"۔ اسی سال میری پہلی تصنیف "سنگ و خشت" مکتبہ جدید لاہور نے شائع کی۔

شاد: طنز و مزاح میں آپ کے نزدیک کیا فرق ہے؟

کپور: وہی فرق جو ایک پھول اور پتھر میں ہوتا ہے۔ یا جو شاخ گل اور تلوار میں ہے مزاح نگار زندگی کی ناہمواریوں کو ہمدردانہ نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے مزاح محبت اور طنز نفرت یا غصے کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ طنز کی تعریف میرے نزدیک وہی ہے جو ایک اچھے شعر کی ہے۔ یعنی اسے نشتر ہونا چاہیے۔ مزاح نگار کہتا ہے۔ "یا الٰہی یہ لوگ یا یہ چیزیں کتنی عجیب ہیں" طنز نگار چلاتا ہے۔ "یا خدا یہ چیزیں یا یہ لوگ کتنے بے ہودہ ہیں"

شاد: کن کن ملکی اور غیر ملکی ادبا سے آپ متاثر ہوئے؟

کپور: مجھے بہتوں نے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ مگر جب میں الٹا انھیں متاثر کرنے لگا تو انھوں نے اپنی کوششیں ترک کر دیں۔ مثال کے طور پر کرشن چندر نے مجھے اپنی ڈگر پر چلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے جلد پتہ چل گیا کہ وہ خود میری ڈگر پر چلنے لگا ہے۔

شاد: پھر بھی کچھ ادبا تو ہوں گے جن سے آپ نے اثر قبول کیا ہوگا۔

کپور: ایک ہو تو کہوں۔ رتن ناتھ سرشار، سجاد حسین، رشید احمد صدیقی، پطرس، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک (ملکی ادبا) سٹیفن لی کاک۔ والتیر، اناطول فرانس، سوفٹ، مارک ٹوین (غیر ملکی ادبا)

شاد: آپ کا بہترین طنزیہ یا مزاحیہ مضمون کون سا ہے؟

کپور: اس سوال کا جواب تو میرے نقاد ہی دے سکتے ہیں۔ میں آپ کو اپنے چند اچھے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے عنوانات بتا دیتا ہوں۔ ان میں سے آپ کو جو سب سے اچھا لگے اسے میرا بہترین مضمون سمجھ لیجیے۔

شاد: ارشاد۔

کپور: طنزیہ مضامین: غالب ترقی پسند شعرا کی ایک مجلس میں۔ اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے۔ ہندوستان دیکھئے۔ سلیم اور انارکلی۔ اہل زبان نے چراغ نے گلے۔ مزاحیہ مضامین: مس چینبلی، کاٹھ کا الو، جمود۔ چینی شاعر۔ علامہ ظہور۔ اردو ادب کا آخری دور۔

شاد: آپ کے نزدیک اس وقت اردو کا سب سے بڑا طنز و مزاح نگار کون ہے؟

کپور: ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے نزدیک جدید اردو ادب میں تین بڑے طنز نگار ہیں۔ رشید احمد صدیقی۔ کرشن چندر اور خاکسار۔ ان تینوں میں سب سے بڑا کون ہے؟ تو عمر کے لحاظ سے صدیقی صاحب۔ پھر خاکسار۔ (میں کرشن چندر سے دو سال بڑا ہوں) اور پھر کرشن چندر۔

شاد: کیا اردو کا طنز و مزاح اس قابل ہے کہ اسے متمدن ممالک کی زبانوں کے طنز و مزاح کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے؟

کپور: جی ہاں کیوں نہیں۔ دیکھیے چند متمدن ممالک میں تو طنز و مزاح نہ ہونے کے برابر ہے جیسے سوویٹ

روس، چین، برما، انڈونیشیا، لنکا، ملایا۔ ان کے مقابلے میں اُردو طنز و مزاح کو ہر وقت پیش کیا جا سکتا ہے۔ البتہ انگلینڈ، فرانس اور امریکہ کی بات دوسری ہے۔

شاد: کیا جدید ترین نسل میں بھی کوئی قابلِ ذکر طنز و مزاح نگار ہے؟

کپور: کم از کم نصف درجن اچھے طنز و مزاح نگار ہیں مثلاً مشتاق احمد یوسفی (مصنف چراغ تلے) احمد جمال پاشا (مصنف اندیشۂ شہر) نظیر احمد صدیقی۔ مصنف شہرت کی خاطر) محمد خالد اختر (مصنف ۲۰۱۱) امجد حسین (مصنف جملۂ معترضہ) اور سلے حمید۔

شاد: طنز و مزاح کے علاوہ ادب کی دوسری اصناف مثلاً شاعری، تنقید، ڈرامہ وغیرہ سے آپ کو کس حد تک دلچسپی ہے؟

کپور: اچھے اشعار پر سر دھنتا ہوں۔ تنقید بشرطیکہ وہ ضرورت سے زیادہ خشک اور الجھی ہوئی نہ ہو پڑھ لیتا ہوں۔ ڈرامہ پڑھنے سے پہلے اندازہ لگا لیتا ہوں کہ یہ ضرور پھسپھسا ہوگا۔ ناولوں کا صرف آخری باب پڑھتا ہوں اور افسانوں کا صرف عنوان۔

شاد: آپ کے نزدیک ہندوستان میں اُردو زبان کا کیا مستقبل ہے؟

کپور: میرے خیال میں وہی جو مقتول کا ہوا کرتا ہے یعنی نعش پوسٹ مارٹم کے بعد لواحقین کے سپرد کر دی گئی ہے۔ قاتل کو پھانسی کی سزا نہیں دی گئی بلکہ اسے باعزت بری کر دیا گیا ہے۔

شاد: آپ کے سیاسی نظریات کیا ہیں؟

کپور: میں کسی ازم کا قائل نہیں ہوں۔ سوائے ریشنل ازم کے۔ میری دانست میں ہر طنز نگار اوّل اور آخر نہلسٹ ہوتا ہے۔ اس کا کوئی سیاسی نظریہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ سیاست بذاتِ خود ایک ٹیڑھی لکیر ہے۔ اور طنز نگار ٹیڑھی لکیر کو کبھی پسند نہیں کرتا۔

شاد: آپ اپنے مضامین کیونکر لکھتے ہیں؟

کپور: بالکل اسی طرح جیسے آپ اپنی غزلیں اور قاشیں لکھتے ہیں۔ یعنی فونٹن پن سے روشنائی نہ ہو تو پنسل سے۔

شاد: آپ ادب میں افادیت اور مقصدیت کے کس حد تک قائل ہیں۔؟

کپور: صرف اسی حد تک جب افادیت اور مقصدیت ادب پر سوار نہ ہو جائیں۔ یعنی ایسی افادیت پسند کرتا ہوں جس پر ادب سوار رہتا ہے۔ مجھے وہ ادب ذرا بھی پسند نہیں جو سیاست کا حلقہ بگوش ہو۔ یعنی جب ادب کے دریچے سے سیاست اس طرح جھانک رہی ہو کہ دریچہ نظر ہی نہ آئے۔

شاد: کیا ہمارا ادب واقعی جمود کا شکار ہے؟

کپور: واقعی اس امر کی شکایت وہ لوگ کرتے ہیں جو جدید ترین ادبا کی تخلیقات سرے ہی سے نہیں پڑھتے اور جن کے نزدیک اردو ادب جوشؔ، فراقؔ اور منٹو کے ساتھ ختم ہو گیا۔ تقسیم ملک کے بعد متعدد لائقِ قدر تصنیفات منظرِ عام پر آئیں۔ مشتے از خروارے "آگ کا دریا"۔ "ایک چادر میلی سی"۔ "چراغ تلے"۔ "قاشیں"۔ "پرچھائیاں"۔ "دستِ صبا"۔

شاد: کیا ہر اچھا ادیب واقعی انسان بھی ہوتا ہے۔ آپ کا تجربہ کیا ہے؟

کپور: یہ نہایت لغو کلیہ ہے۔ اگر اچھے انسان سے آپ کی مراد وہ شخص ہے جو شراب نہیں پیتا۔ تماش بینی نہیں کرتا یا ہمسائے کی خوب صورت بیوی کو دیکھ کر سرد

آہیں نہیں بھرتا تو متعدد ادبا اچھے انسان ہرگز نہیں تھے۔ انگریزی ادب میں اخلاقی یا روایتی نقطۂ نگاہ سے آپ شیلی یا بائرن کا شمار اچھے آدمیوں میں نہیں کر سکتے۔ شیلی اپنے سیاسی گورو گاڈون کی بیٹی کو اغوا کرکے لے گیا اور بائرن اپنے معاشقوں کی وجہ سے آج تک بدنام ہے۔ لیکن وہ دونوں عظیم شاعر تھے۔ غالب۔ اختر شیرانی۔ مجاز۔ جگر (عمر کے پہلے حصے میں) اور میرا جی، سب رندان بلانوش تھے۔ لیکن ان کی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے! میری رائے میں ہر اچھا ادیب مجتہد ہوتا ہے۔ اس لیے اسے روایتی نقطۂ نظر سے کبھی اچھا انسان نہیں کہا جا سکتا۔

شاد: صحافت اور ادب میں آپ کے نزدیک کیا فرق ہے؟

کپور: جو آج کے اخبار اور "بالِ جبریل" میں ہے صحافت وہ چیز ہے جسے ایک بار پڑھنے کے بعد وہ دوبارہ پڑھنے کو جی نہ چاہے اور ادب وہ ہے جسے بار بار پڑھنے کے بعد بار بار پڑھنے کو جی چاہے۔ صحافت ہاتھ کی صفائی ہے اور ادب وہ جادو ہے جو سر چڑھ کے بولتا ہے۔

شاد: کیا یہ حقیقت ہے کہ طنز نگار سنجیدہ آدمیوں سے زیادہ یاس پرست ہوتا ہے؟

کپور: جی نہیں بلکہ یوں کہیے کہ طنز نگار سنجیدہ آدمیوں سے زیادہ رجائیت پرست ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ طنز کا حربہ استعمال کرکے وہ ایک بہتر دنیا معرضِ وجود میں لا سکتا ہے۔ اگر وہ یاس پرست ہوتا تو طنز کی تخلیق کرنے کی بجائے خودکشی کر لیتا۔ طنز نگار کا عقیدہ ہوتا ہے کہ آنکھیں آنسو بہانے کے لیے نہیں بلکہ چیزوں اور اشخاص کی کمزوریوں کو بھانپنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔

شاد: کیا یہ سچ ہے کہ طنز کا پودا معاشرتی ہیجان اور سیاسی کشمکش میں پنپتا ہے؟

کپور: طنز کا پودا تب پنپتا ہے جب طنز برداشت کرنے کے لیے جگر یا شعور ہو۔ یعنی جب لوگ طنز نگاروں کو اپنا دشمن نہیں بلکہ محسن سمجھیں۔ برنارڈ شا کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ وہ "آئرش" تھا۔ لیکن تمام عمر انگریزوں کا مذاق اڑاتا رہا۔ اور انگریز اس کی ہنسی میں شریک ہوتے رہے۔ اگر وہ انگلینڈ کی بجائے ہندوستان، پاکستان یا افغانستان میں ہوتا تو فوراً سنگسار کر دیا جاتا۔ والٹیئر نے فرانسیسی سیاست اور اور عیسائیت کی دھجیاں اڑائیں۔ لیکن وہ نہ صرف زندہ رہا۔ بلکہ سارے یورپ میں اس کی قدر بھی ہوئی۔ مارک ٹوین نے امریکیوں کا خاکہ اڑایا۔ لیکن امریکیوں نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔

شاد: اچھا آخر میں یہ فرمائیے کہ آپ کی ادبی زندگی میں آپ کی سب سے زیادہ رہنمائی کس نے کی؟

کپور: صرف ایک شخص نے جس کا نام ہے کنھیا لال کپور۔

شاد: واہ کپور صاحب واہ! انٹرویو کی اس مختصر غزل کا کیا خوب مقطع فرمایا ہے۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔ تضیع اوقات کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔

کپور: یعنی وہی بات ہوئی —

شاد: کیا —؟

کپور: ع دل شاد کیا اور چل نکلے

مضامین خوش خط روانہ کیجیے

کنہیا لال کپور

غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں

(دورِ جدید کے شعرا کی ایک مجلس میں مرزا غالب کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر شعرا تشریف فرما ہیں۔ مثلاً ن۔م۔ راشد، میراجی۔ ڈاکٹر قربان حسین خالص۔ میاں رقیق احمد خوگر۔ راجہ عہد علی خاں۔ پروفیسر غیظ احمد غیظ۔ بکرما جیت ورما۔ عبد الحیٔ نگار وغیرہ وغیرہ۔ یکایک مرزا غالب داخل ہوتے ہیں ان کی شکل و صورت بعینہ وہی ہے جو مولانا حالیؔ نے "یادگارِ غالب" میں بیان کی ہے ان کے ہاتھ میں "دیوانِ غالب" کا ایک نسخہ ہے تمام شعرا کھڑے ہو کر آداب بجا لاتے ہیں۔)

غالب: حضرات میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا اور اس مجلس میں مدعو کیا۔ میری مدت سے آرزو تھی کہ دورِ جدید کے شعرا سے شرفِ نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر: یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب: رہنے بھی دیجئے اس بے جا تعریف کو۔ من آنم کہ من دانم۔

دوسرا شاعر: تشریف رکھیے گا۔ کہیے جنت میں خوب گذرتی ہے۔ آپ تو فرمایا کرتے تھے۔ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن

غالب: (مسکرا کر) بھئی جنت بھی خوب جگہ ہے۔ جب سے وہاں گیا ہوں۔ ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شاعر: تعجب! جنت میں تو آپ کو کافی فراغت ہے۔ اور پھر ہر چیز میسر ہے۔ پینے کو شراب۔ انتقام لینے کو پری زاد ——— اور پر یہ فکر کوسوں دور کہ

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

باوجود اس کے آپ کچھ نکھ.........

تیسرا شاعر: (بات کاٹ کر) سنائیے اقبال کا کیا حال ہے۔

وہی جو اس دنیا میں تھا۔ دن رات خدا سے لڑنا جھگڑنا وہی پرانی بحث۔

مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

پہلا شاعر: میرے خیال میں وقت کافی ہو گیا ہے۔ اب مجلس کی کارروائی شروع کرنی چاہیئے۔

دوسرا شاعر: میں کرسی صدارت کے لئے جناب م۔ ن ارشد کا نام تجویز کرتا ہوں۔

(ارشد صاحب کرسی صدارت پر بیٹھنے سے پہلے حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کرتے ہیں)

م۔ن۔ ارشد: میرے خیال میں ابتدا مرزا غالب کے کلام سے ہونی چاہیئے۔...... میں نہایت ادب سے مرزا موصوف سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا کلام پڑھیں۔

غالب: بھئی جب ہمارے سامنے شمع لائی جائیگی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر سنائیں گے۔

م ن ارشد: معاف کیجیئے گا۔ مرزا اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے نہیں جائے گی۔ شمع کی بجائے یہاں پچاس کینڈل پاور کا لیمپ ہے۔ اس کی روشنی میں ہر ایک شاعر اپنا کلام پڑھیگا۔

غالب: بہت اچھا صاحب تو غزل سنئے گا۔

باقی شعرا: ارشاد۔

غالب: عرض کیا ہے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

(باقی شعرا ہنستے ہیں۔ مرزا حیران ہو کر ان کی جانب دیکھتے ہیں)

غالب: اجی صاحب یہ کیا حرکت ہے۔ نہ داد نہ تحسین۔ اس بے موقع خندہ زنی کا مطلب؟

ایک شاعر: معاف کیجیئے مرزا ہمیں یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔

غالب: بے معنی؟

ہیرا لعل: دیکھیئے نا مرزا آپ فرماتے ہیں خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔ اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا اور اگر آپ صرف معشوق کے نام کے ہی عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط برباد کرنا ہی کیا ضرور سادہ کاغذ پر اس کا نام لکھ لیجیئے

ڈاکٹر قربان حسین خالص: میرے خیال میں اگر یہ شعر اس طرح لکھا جائے تو موزوں ہے۔

خط لکھیں گے کیونکہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی
پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو۔
جس طرح سے میری اک اک نظم کا۔
کچھ بھی تو مطلب نہیں۔
خط لکھیں گے کیونکہ الفت ہے ہمیں۔
میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں۔
یعنی عاشق ہیں تمہارے نام کے

غالب:۔ یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ میرے اس شعر کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہیراجی:۔ جنوں! جنوں کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے اگر اجازت ہو تو کہوں۔

غالب:۔ ہاں ہاں بڑے شوق سے۔

ہیراجی:۔

جنوں ہوا۔ جنوں ہوا
مگر کہاں جنوں ہوا
کہاں ہوا وہ کب ہوا
ابھی ہوا یا اب ہوا
نہیں ہوں میں یہ جانتا
مگر جدید شاعری
میں کہنے کا جو شوق ہے
تو بس یہی ہے وجہ کہ
دماغ میرا چل گیا
یہی سبب ہے جو مجھے
جنوں ہوا۔ جنوں ہوا

غالب:۔ (ہنسی کو روکتے ہوئے) سبحان اللہ کیا برجستہ اشعار ہیں۔

م۔ن۔ ارشد:۔ اب مرزا غزل کا دوسرا شعر فرمائیے۔

غالب:۔ میں اب مقطع ہی عرض کروں گا۔ کہا ہے ؎

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحی زگاہ:۔ گستاخی معاف مرزا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح لکھا جاتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی۔

غالب:۔ کس طرح؟

عبدالحی زگاہ:۔

عشق نے ہاں ہاں تمہارے عشق نے
عشق نے سمجھے؟ تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا
اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں
اور چل تو سکتا ہی نہیں
جانے کیا بکتا ہوں میں
یعنی نکما کر دیا

اتنا تمہارے عشق نے
گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں
اٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں
یعنی تمہارے عشق نے
اتنا نکما کر دیا

غالب:۔ (طنزاً) بہت خوب بھئی غضب کر دیا۔
غیظ احمد غیظ:۔ اور دوسرا مصرع اس طرح لکھا جا سکتا تھا۔

جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک مجھے کچھ ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں
اور دل میں میرے جوش تھا
اس وقت تھا میں آدمی
اور آدمی تھا کام کا
لیکن تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا

غالب:۔ واللہ۔ کمال ہی تو کر دیا بھئی اب آپ لوگ اپنا کلام سنائیں۔
م۔ن۔ارشد:۔ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص جو جدید شاعری کے امام ہیں اپنا کلام سنائیں گے۔
ڈاکٹر خالص:۔ ابھی ارشد صاحب میں کیا ہوں۔ اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں۔ آپ جدید شاعری کی منزل میں اولیں سنگ میل۔ اس لئے آپ اپنا کلام پہلے پڑھئے۔
م۔ن۔ارشد:۔ توبہ توبہ۔ اتنی کسر نفسی۔ اچھا اگر آپ مصر ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے۔ "یہ عرض کیا ہے۔"

لکڑی جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
جس کے آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے
جس طرح دور کسی دشت کی پنہائی میں
رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرم شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں
ایسی تشبیہہ کی لذت سے مگر دور ہے تو
تو کہ اک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا
اپنے بے کار خدا کے مانند

دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خودکشی مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں پکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اور چپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں

آمری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
تاکہ میں چوم ہی لوں عارضِ گلفام ترا
اور اربابِ وطن کو یہ اشارہ کر دوں
اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور سب عیش گذر جانے پر
بہر جمع درم و دام نکل جاتا ہے
ایک بوڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس
چھوڑ کر بستر سنجاب و سمور

(نظم سن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ بہرا جی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ یہ نظم اس صدی کی بہترین نظم ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس میں انگیٹھی' بھوت اور دفتر تہذیب و تمدن کی مخصوص الجھنوں کے حامل ہیں)

(حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہیں)

غالب:۔ ارشد صاحب معاف کیجئے آپ کی یہ نظم کم از کم میرے فہم سے تو بالاتر ہے۔

غیظ احمد غیظ:۔ یہ صرف ارشد پر ہی کیا منحصر ہے۔ مشرق کی جدید شاعری ایک بڑی حد تک مبہم اور ادراک سے بالاتر ہے

م۔ن۔ارشد:۔ مثلاً میرے ایک دوست کے اس شعر کو لیجئے۔

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو ٭ پایاب ہے جو موج گذر جائے گی سر سے

اب بتائیے اس شعر کا کیا مطلب ہے؟

غالب:۔ (شعر کو دہرا کر) صاحب سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں۔ مگر باوجود ان کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م۔ن۔ارشد:۔ ابی چھوڑیئے اس حرف گیری کو۔ آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں۔ مگر خیر اس بحث میں کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اب ڈاکٹر حسین خالص سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خالص:۔ میری نظم کا عنوان ہے "عشق" "عرض کیا ہے۔"

عشق کیا ہے؟
میں نے ایک عاشق سے پوچھا
اس نے یوں رو کر کہا

عشق اک طوفان ہے
عشق اک سیلاب ہے
عشق ہے اک زلزلہ
شعلۂ جوالا — عشق
عشق ہے پیغامِ موت

غالب:۔ بھئی یہ کیا مذاق ہے نظم پڑھئے۔ مشاعرے میں نثر کا کیا کام؟

ڈاکٹر خالص:۔ (جھنجھلا کر) تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے؟ یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم۔ اور فرمایا تھا آپ نے ؎

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔

غالب:۔ میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے۔ نہ ترنم۔ نہ قافیہ۔ نہ ردیف۔

ڈاکٹر خالص:۔ مرزا صاحب یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے۔ آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا تھا ہم نے اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا ہے۔ اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کئے ہیں۔ جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ میری مراد رفعتِ تخیل۔ تازگی افکار اور ندرتِ فکر سے ہے۔

غالب:۔ رفعتِ تخیل۔ کیا خوب۔ کیا پرواز ہے ؎

میں نے ایک عاشق سے پوچھا اُس نے یوں رو کر کہا

ڈاکٹر خالص:۔ (چڑ کر) عاشق رو کر نہیں کہے گا تو کیا قہقہہ لگا کر کہے گا؟ مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

غالب:۔ مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

رفیق احمد خوگر:۔ اس کی وجہ مغربی شعرا کا تتبع نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی آزادی کا جویا ہے۔ اس کے علاوہ دورِ جدید کی رُوح۔ انقلاب۔ کشمکش۔ تحقیق۔ تجسس تعقل پرستی اور جد و جہد ہے۔ ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر ہوا ہے۔ اور لیرے اس نکتے کو تھیکرے نے بھی اپنی کتاب دلیٹی فیئر میں تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اسی لئے ہم نے محسوس کیا کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ دور میں وہ لطیف کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جو مثال کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے۔ قدیم شعرا اور جدید شعرا کے ما میں زمین و آسمان کا فرق ہے قدیم شعرا بقول مولانا آزاد حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے اور ہم جن میدانوں میں گم دوڑا رہے ہیں۔ نہ اُن کی وسعت کی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب و لطائف کا شمار

غالب:۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م۔ ن۔ ارشد:۔ خوگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والے بموں کی دنیا ہے۔ یہ بھوک۔ بیکاری انقلاب اور آزادی کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن و عشق گل و بلبل شیریں فرہاد کے افسانوں میں ضائع نہیں کر سکتے۔ شاعری کے لئے اور بھی موضوعِ سخن ہیں۔ جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا ؎

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گذری ہے

موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گذرے گی۔ اجداد پہ کیا گذری ہے
یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
یہ ہر ایک سمت پُراسرار کڑی دیوار یں
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہونگے

راجہ عہد علی خاں:۔ بہت خوب ـــ " یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے"۔ ایسے ہی مضامین سے ایک مضمون "ڈاک خانہ" ہے جو میری اس نظم کا جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا موضوع ہے۔

غالب:۔ ڈاک خانہ

راجہ عہد علی خاں:۔ مرزا اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ سُنئیے عرض کیا ہے۔

ڈاک خانے کے ہے اندر آج اُف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر آدمی
ان میں ہر اک کی تمنا ہے کہ دو
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل
بھاگ کر دیکھے کہ اس کی سائیکل
ہے پڑی باہر۔ جہاں رکھ کر اُسے
ڈاک خانہ میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے
جا رہے ہیں خط چہار اطراف کو
بمبئی کو، مصر کو، لندن کو، کوہ قاف کو
دیکھنا آئی ہے اک عورت لفافہ ڈالنے
کون کہتا ہے کہ اک عورت ہے یہ
یہ تو لڑکا ہے کسی کالج کا کہ
جس کے بال
خدو خال
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم
اُس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل
اُف ہماری لغزشیں
ہے مگر کس شخص کا یہ سب قصور
کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام
جھٹپٹا سا ہو گیا ہے شام کا
یا ہمارے ہے تمدن کا قصور

کہ ہمارے نوجوان
ڈاک خانے میں یہاں جب آتے لفافہ ڈالنے
اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں
کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں

(زوروں کی داد دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے مرحبا، بھئی کمال کر دیا کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کی سراسیمگی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔)

م۔ ن۔ ارشد:۔ اب ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غیظ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غیظ:۔ میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

ہیرا جی:۔ تو پھر وہی نظم سنا دیجیے جو پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی۔

پروفیسر غیظ:۔ آپ کی مرضی تو وہی سن لیجیے۔ عنوان ہے "لگائی"

فون پر آیا دل زار! نہیں فون نہیں
سائیکل ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمہ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

(نظم کے دوران میں اکثر مصرعے دو دو بلکہ چار چار بار پڑھوائے جاتے ہیں۔ اور پروفیسر غیظ بار بار مرزا غالب کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب مبہوت ہیں)

م۔ ن۔ ارشد:۔ حضرات میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے ملک کے اینٹی فاشسٹ جذبے کو خوب نبھایا ہے۔

رفیق احمد:۔ (سرگوشی کے انداز میں ہیرا جی سے) بکواس ہے!

م۔ ن۔ ارشد:۔ اب ہیرا جی اپنا کلام پڑھیں گے۔

ہیرا جی:۔ میری نظم کا عنوان ہے "بینگن"

غالب:۔ بینگن؟

ہیرا جی:۔ بینگن۔ اگر آپ آم کی صفت میں قصیدہ لکھ سکتے ہیں۔ تو کیا بندہ بینگن پر نظم لکھنے کا حقدار نہیں۔

غالب:۔ معاف کیجیے گا۔ نظم پڑھیے۔

ہیرا جی:۔ عرض کیا ہے:۔

چنچل بینگن کی چھب نیازی
رنگ میں تم ہو کرشن مراری
جاں گئی ہیں سکھیاں پیاری
رادھا رانی آہی نہ لوٹ ــــ
کرشن کنہیا ڈھونڈھ رہے ہیں
لیکن میں تو بھول چکا ہوں
بینگن سے یہ بات چلی تھی
بھوک لگی ہے کتنی ہائے
جی میں ہے اک بھون کے بینگن
کھاؤں لیکن رادھا پیاری
رنگ کو اس کے دیکھ کے مجھ کو
یاد آتے ہیں کرشن مراری
اس لئے بھوکا رہنا بہتر ــــ
چونکہ میں ہوں پریم پجاری

(ہر طرف سے داد دی جاتی ہے۔ بعض شعرا یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں۔ بھئی جدید شاعری میراجی کا ہی حصہ ہے)

م۔ن۔ ارشد:۔ اب جناب بکرماجیت ورما سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنا کلام سنائیں۔

بکرماجیت ورما:۔ میں حسبِ معمول کچھ گیت لکھے ہیں۔

غالب:۔ (حیران ہو کر) شاعر اب گیت لکھ رہے ہیں۔ مرے اللہ دنیا کدھر جا رہی ہے۔

بکرماجیت ورما:۔ مرزا آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنف قرار نہیں دئے گئے تھے۔ دورِ جدید کے شعرا نے انھیں ایک قابلِ عزت صنف کا درجہ دیا ہے۔

غالب:۔ جی ہاں ہمارے زمانے میں عورتیں۔ بھانڈ۔ مراثی یا اس قماش کے اور لوگ گیت لکھا کرتے تھے۔

بکرماجیت ورما:۔ پہلا گیت ہے! برہن کا سندیس" عرض کیا ہے:۔

اڑ جا دیس بدیس رے کوّے اڑ جا دیس بدیس
سن کر تیری کائیں کائیں
سن کر تیری کائیں کائیں

غالب:۔ خوب۔

بکرماجیت ورما:۔ عرض کیا ہے۔

سن کر تیری کائیں کائیں
آنکھوں میں آنسو بھر آئیں
بول یہ تیرے من کو بھائیں
مت جا نا پردیس رے کوّے اڑ جا دیس بدیس

م۔ن۔ ارشد:۔ بھئی کیا اچھوتا خیال ہے۔ پنڈت صاحب۔ میرے خیال میں ایک گیت آپ نے کبوتر پر بھی لکھا تھا۔ وہ بھی مرزا کو سنا دیجئے۔
بکرما جیت:۔ سنئے پہلا بند ہے:۔

بول کبوتر بول!
دیکھ کوئلیا کوک رہی ہے
من میں میرے ہوک اُٹھی ہے
کیا تجھ کو بھی بھوک لگی ہے
بول غٹر غوں بول۔ کبوتر
بول کبوتر بول!

باقی شعرا:۔ (یک زبان ہوکر) بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول۔
(اس اثنا میں مرزا غالب نہایت گھبراہٹ اور اسراسیمگی کی حالت میں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔)
بکرما جیت ورما:۔ اب دوسرا بند سنئے:۔

بول کبوتر بول!
کیا میرا ساجن کہتا ہے
کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے
کیوں میرے طعنے سہتا ہے
بھید یہ سارے کھول کبوتر
بول کبوتر بول!

باقی شعرا:۔ (یک زبان ہوکر) بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول۔
(اس شور و غل کی تاب نہ لاکر مرزا غالب بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں۔)

(سنگ وخشت)

کنہیا لال کپور

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے!

ٹیگور یا اقبال۔ کوہ ہمالیہ اور تاج محل کے علاوہ اپنے وطن میں بہت سی ہستیاں اور اشیا قابل ستائش ہیں۔ مثلاً مچھر۔ شاعر۔ عشاق یہ تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اپنے وطن میں مچھر زیادہ ہیں یا شاعر۔ مگر بہرحال دونوں کافی تعداد میں ہیں۔ مچھروں اور شاعروں میں اس لئے بھی مطابقت ہے کہ دونوں شمع روشن ہونے پر بھنبھنانا شروع کرتے ہیں نیز جس طرح مچھروں کی کئی قسمیں ہیں۔ اسی طرح شاعروں کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ (۱) شاعر جو اپنا کلام طبلہ اور سارنگی کے ساتھ گا کر سناتے ہیں۔ (۲) شاعر جو ساری عمر حکومت کے خلاف نظمیں لکھتے ہیں اور بعد میں کسی سرکاری محکمے میں نوکر ہو جاتے ہیں (۳) شاعر جو اپنی نظم کا گراموفون ریکارڈ اپنی آواز میں تیار کرواتے ہیں۔ اور پھر اسے خود ہی فروخت کرتے ہیں (۴) شاعر جو صرف طوائفوں کے لئے لکھتے ہیں (۵) شاعر جنھوں نے شاعری سکھانے کے کالج کھول رکھے ہیں۔ شعرا کے بعد اپنے وطن میں عشاق کا نمبر آتا ہے عشق ہماری گھٹی میں پڑا ہے چنانچہ اپنے وطن کا ہر شخص مجنوں و کوہکن کا نام لیوا ہی نہیں۔ بلکہ خود مجنوں اور کوہکن ہے عشاق کی صف اول میں کالجوں کے طالب علم ہیں ان کا عشق "والہانہ عشق" کہلاتا ہے۔ ان کو ہر لڑکی اور ہر عورت سے عشق ہو جاتا ہے۔ بازار میں سے گذرتی ہوئی عورتوں سے۔ ٹانگہ یا موٹر میں سوار کالج کی لڑکیوں سے۔ اسکولوں کی استانیوں سے۔ ہسپتالوں کی نرسوں سے۔ سینما کی ایکٹرسوں سے۔ خوبصورت جینی لڑکیوں کی تصویروں سے ان کے اظہار محبت کے طریقے بھی نرالے ہیں معشوق کی طرف گھور گھور کر دیکھنا معشوق کے قریب سے سرک کر گذر جانا۔ اس پر آوازے کسنا۔ اس کا نام کالج کی دیواروں، تختہ سیاہ اور بنچوں پر لکھنا۔ اس پر کاغذ کے غبارے یا چاک کے ٹکڑے پھینکنا۔ طالب علموں کے بعد عشاق کا دوسرا بڑا گروہ دکاندار طبقہ سے تعلق رکھتا ہے ان کا عشق "سوقیانہ عشق" کہلاتا ہے۔ انھیں ہر خوب صورت سودا خریدنے والی سے عشق ہو جاتا ہے۔ یہ اپنے عشق کا اظہار تب کرتے ہیں جب معشوق دکان سے باہر چلا جاتا ہے اس کی عدم موجودگی میں اس کے خد و خال، شوخی و شرارت کا تذکرہ چٹخارے لے لے کر دوکان کے دوسرے آدمیوں یا ہمسایوں سے کیا جاتا ہے عشاق کی تیسری جماعت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو پیر سال یا قریب مرگ ہیں ان کا عشق "صوفیانہ عشق" کہلاتا ہے ان کا مقولہ ہے "رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے"۔ یہ عبادت گاہوں، مندروں اور جلسوں میں عورتوں کی طرف دیکھ دیکھ کر دلی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ عشاق کی آخری جماعت وہ ہے جس کا عشق "غائبانہ عشق" کہلاتا ہے۔ اس جماعت کے افراد کو نادیدہ محبوب سے عشق ہو جاتا ہے۔ جیسے ریڈیو پر گانے والی تمام طوائفوں سے خوبصورت برقع میں چلنے والی عورتوں سے۔ ہالی ووڈ میں کام کرنے والی ایکٹرسوں سے ملک کی ہر نامور ادیبہ اور شاعرہ سے۔

(۲)

اپنے وطن میں ادبا کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انھیں کوئی شریف آدمی محلے میں مکان کرایہ پر نہیں دیتا۔ کوئی شخص ان کے ساتھ اپنی لڑکی کا رشتہ نہیں کرنا چاہتا اور ان کو ان کی نظموں اور مضامین کا کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا۔ مگر پھر بھی ان کا کافی احترام کیا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت سے ہندوستانی ادیب ہوا پر پلتے ہیں۔ چنانچہ جتنا بڑا ادیب ہوتا ہے اتنا ہی وہ افلاس زدہ ہوتا ہے۔ سب سے بڑا ہندوستانی ادیب وہ ہے۔ جس کے مرنے پر اس کے کفنانے اور دفنانے کے اخراجات میونسپل کمیٹی کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔ امریکہ اور انگلستان میں جب مصنف مرتے ہیں تو اپنے پیچھے لاکھوں پونڈ کی جائدادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہندوستان میں جب کوئی مصنف مرتا ہے، تو وہ یہ چھوڑ جاتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی چارپائیاں غلیظ بستر چند لوٹے اور قرضہ اتنا کہ مرحوم کی سات پشتیں بھی ادا نہ کر سکیں۔ اپنے وطن میں ادبا کی شاذ ہی دریا دلی سے تعریف کی جاتی ہے۔ اگر وہ کوئی اچھی چیز لکھیں تو یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ انھوں نے کہیں سے چرائی ہے اور اگر چرائی نہیں تو انھوں نے کسی مغربی شاہکار کا ترجمہ کر ڈالا ہے۔ اور اگر کبھی کبھار مان بھی لیا جائے کہ انھوں نے واقعی اچھی چیز لکھی ہے۔ تو یہ کہا جاتا ہے کہ ابھی وہ رذیل قسم کے ادیب ہیں۔ جنھیں موپساں اور چیخوف سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ چاہیں وہ کتنا زور ماریں۔ ان کی عظمت کا اعتراف ہمیشہ دبی زبان میں کیا جاتا ہے اور تان اس بات پر ٹوٹتی ہے کہ ہنوز دہلی دور است۔

(۳)

اپنے وطن میں تنقید کا بھی عجیب معیار ہے۔ صرف وہی کتابیں قابلِ قدر سمجھی جاتی ہیں جن کو ہر شریف آدمی بخوشی اپنی ماں یا بہن کے ہاتھ دے سکتا ہے۔ یعنی جن میں کوئی اصلاح کا پہلو موجود ہے۔ ہر ایک شاعر اور افسانہ نویس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ شاعر، افسانہ نویس اور ناولسٹ ہونے سے پہلے پیغمبر۔ واعظ اور خطیب ہو۔ اس کی ہر کہانی سبق آموز اور ہر نظم نتیجہ خیز ہو۔ چنانچہ اگر وہ ناول لکھے تو ضرور یہ دکھائے کہ نیک آدمی کو نیکی کی جزا ہر حال میں ملتی ہے۔ اور بدمعاش اپنے جرم کی پاداش میں ضرور پھانسی کے تختہ پر لٹکایا جاتا ہے۔ اگر وہ افسانے لکھتا ہے تو وہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ ہندوستانی بیوی اپنے بدکار خاوند کی خباثت کے باوجود اس سے محبت کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ کہ اگر وہ شاعر ہے تو وہ ہر مذہبی اصول کو اپنی نظم کا موضوع بنائے۔

(۴)

اپنے ملک کی فلمیں بھی عجیب ہیں۔ پندرہ پندرہ ہزار فٹ لمبی کہانیوں میں نہ تسلسل نہ پلاٹ۔ ہر ایک تصویر میں وہی ہیرو وہی ہیروئن۔ ایک درجن کے قریب گانے۔ پانچ چھ ناچ۔ بوس و کنار کے بغیر محبت۔ بے ربط مکالمے۔ بے معنی گیت۔ غیر قدرتی انجام — واقعی یہ عجیب ملک ہے۔ جہاں ڈائرکٹر کہانی لکھنے کے علاوہ گانے اور مکالمے بھی خود لکھتا ہے۔ ہیرو کا پارٹ بھی ادا کرتا ہے اور دو تین بار ہیروئن سے جھوٹ موٹ بیاہ رچانے کے بعد واقعی اس سے شادی کر لیتا ہے۔

(۵)

اپنے وطن میں فحش اشتہارات کی بھی افراط ہے۔ دیواروں پر درختوں کے تنوں کے ساتھ، نوٹس بورڈوں پر یہ اشتہار جلی قلم

لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی جگہ ان اشتہارات سے بچی ہے تو وہ آسمان ہی ہے۔ ان اشتہارات کو پڑھ کر ایک غیر ملک کا باشندہ یہی نتیجہ نکال سکتا ہے۔ کہ ہندوستان کا بچہ بچہ جنسی امراض میں مبتلا ہے بمعزز سے معزز اخبار میں اشتہار نمایاں جگہ پر شائع کئے جاتے ہیں۔ مگر ہم سب ان سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں۔ کہ ہمارا بڑے سے بڑا لیڈر بھی ان کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے۔

(۶)

اپنے وطن میں ہر اکیلی نوجوان لڑکی یا عورت شک کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اگر وہ اکیلی سیر کو جا رہی ہے۔ تو شکار پھانسنے کے لئے جا رہی ہے۔ اگر وہ اکیلی سفر کر رہی ہے تو مزدور من فرکش ہے۔ اگر وہ تن تنہا سکونت پذیر ہے۔ تو اس پر ہم گھناؤنے سے گھناؤنا الزام لگانے میں حق بجانب ہیں۔ اگر وہ کسی ایسے آدمی سے بات چیت کر رہی ہے جو اس کا بھائی یا باپ نہیں۔ تو مزدور اُس سے اظہار محبت کر رہی ہے۔ اگر وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رنگین مزاج ہے۔ اگر اندھیرے میں کہیں جا رہی ہے۔ تو مزدور اپنے عاشق کے گھر جا رہی ہے اور اگر وہ تاریکی میں کہیں سے آ رہی ہے۔ تو اپنے آشنا کے گھر سے آ رہی ہے۔ چونکہ اپنے وطن میں سوائے طوائف کے ہر ایک عورت غلام ہے۔ اس لئے ہر آزاد خیال عورت پر ہمیں طوائف کا شبہ ہوتا ہے۔

(۷)

واقعی اپنے وطن میں سب کچھ ہے...... نفاق۔ جہالت۔ غلاظت۔ مذہبی جنون ہمارے سٹیشنوں کے مسافر خانے۔ ہمارے ہوٹل۔ ریل گاڑیاں۔ غلاظت سے پُر ہوتی ہیں۔ مگر ہمارے تحمل کا یہ حال ہے کہ ہم سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں مسافر خانے ہوٹل میں صرف ایک آدھ گھنٹہ ٹھہرنا ہے۔ اس لئے اگر وہ گندے بھی ہیں۔ تو کیا مضائقہ ہے۔ ہمارے مذہبی جنون اور جہالت کی یہ حالت ہے کہ ہم جاہل سے جاہل مولویوں اور پنڈتوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بننے کو تیار ہیں وہ جس طرح ہمیں نچاتے ہیں۔ ہم ناچتے ہیں۔ بلکہ اُن کے اشاروں پر ناچنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ "کیونکہ مسجد کے سامنے ہندوؤں نے باجا بجایا ہے۔ اس لئے ہندو گشتنی ہیں" حالانکہ ابھی ابھی انگریزی پلٹن کا بینڈ قیامت بپا کرتا ہوا مسجد کے سامنے سے گزرا تھا۔ ابھی جس وقت مولوی صاحب نہایت انہماک کے ساتھ نماز ادا کر رہے تھے۔ "کیوں کہ اس مسلمان نے گائے ذبح کی ہے۔ اس لئے اس کی گردن اڑا دو" حالانکہ ہر روز انگریزی چھاؤنیوں میں فوجیوں کے لئے ہزاروں گائیں ذبح کی جاتی ہیں۔ اپنے وطن میں مذہبی پیشوا ہمیشہ مزے میں اور مذہب ہمیشہ خطرے میں رہتا ہے۔ مذہب کا اپنے وطن میں بہترین استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندو مسلم کو لڑوایا جاتا ہے۔ مذہب کی بدولت فرقہ وارانہ فساد کروائے جاتے ہیں۔ تو اسی کی بدولت اور غلامی کی زنجیروں کو مضبوط بنایا جاتا ہے۔ تو وہ بھی اسی کی بدولت۔ عجیب بات یہ ہے کہ متعدد بار لاکھ کھانے کے باوجود ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے مذہبی پیشوا اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے ہمیں اُلو بناتے ہیں۔

(۸)

مگر کہاں تک ذکر کیا جائے کہ اپنے وطن میں کیا کیا ہے اور کیا کیا نہیں۔ اپنے وطن میں سڑکیں ہیں۔ جن پر رات کو کبھی روشنی نہیں ہوتی۔ اور جن پر دن میں کبھی چھڑکاؤ نہیں ہوتا۔ ایسے جوتشی اور عامل ہیں جنھیں یہ معلوم نہیں کہ آج ہفتے کا کون سا دن ہے۔ مگر جو ہر وقت بتا سکتے ہیں۔ کہ قیامت کب آنے والی ہے۔ ایسی دکانیں ہیں۔ جو عین بدر رو کے اوپر واقع ہیں۔ مگر جہاں سے اشیا خریدنے میں کسی کو عذر نہیں۔ ایسے مغرب پرست انسان ہیں جو دروازے اور روشندان بند کر کے اپنی بیویوں کے ساتھ رقص کرتے

ہیں۔ ایسی کمین بیوائیں ہیں۔ جنھوں نے اپنے خاوند کا چہرہ تک نہیں دیکھا۔ ایسے سیاست داں ہیں جن کے نزدیک سیاست داتی کی انتہا چرخہ کاتنے میں ہے .... اینگلو انڈین مصنفوں کی نظر میں ہندوستان مہاراجوں، ہاتھیوں اور سپیروں کا ملک ہے حالانکہ اچھی طرح دیکھا جائے تو یہ نقالوں، غداروں اور کنگالوں کا وطن ہے۔

اپنے وطن میں محبت گناہ ہے۔ اور عشق جرم۔ مذہب پر جائز اعتراض کرنا کفر ہے اور پرانی روش کو چھوڑنا غداری .... صرف ایک چیز اپنے وطن میں نہیں اور وہ ہے خوبصورت عورتیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے۔ کہ ہمارے راجاؤں، نوابوں اور شعرا کو خوبصورت عورتیں لانے کے لئے پیرس اور لندن جانا پڑتا ہے۔ اس چیز کے علاوہ اپنے وطن میں سب کچھ ہے۔ ابو الاثر بجا فرماتے ہیں:۔

اپنے وطن کے دن رات نیارے
باغ اور آکاش۔ پھول اور ستارے
اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

(سنگ وخشت)

کنھیا لعل کپور

پیر و مرشد

پطرس میرے استاد تھے۔ ان سے پہلی ملاقات تب ہوئی۔ جب گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے انگلش میں داخلہ لینے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انٹرویو بورڈ تین اراکین پر مشتمل تھا۔ پروفیسر ڈکنس (صدر شعبہ انگریزی) پروفیسر مدن گوپال سنگھ اور پروفیسر اے ایس بخاری۔ گھر سے خوب تیار ہو کر گئے تھے کہ سوالات کا کرارا جواب دے کر بورڈ کو مرعوب کرنے کی کوشش کریں گے۔ بخاری صاحب نے ایسے سوال کیے کہ پسینے چھوٹنے لگے جونہی کمرے میں داخل ہو کر آداب بجا لائے انھوں نے خاکسار پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا "آپ ہمیشہ اتنے ہی لمبے نظر آتے ہیں یا آج خاص اہتمام کر کے آئے ہیں؟ لاجواب ہو کر ان کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"آپ شاعر ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"دیکھنے میں تو آپ مجنوں لاہوری نظر آتے ہیں۔

پروفیسر مدن گوپال سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "یہ خدا ان کی شکل خطرناک حد تک مجنوں گورکھپوری سے ملتی ہے"۔ پھر میری جانب متوجہ ہوئے۔ "آپ کبھی مجنوں گورکھپوری سے ملے ہیں؟"

"جی نہیں"

"ضرور ملیے۔ وہ آپ کے ہم قافیہ ہیں۔"

پھر پوچھا "یہ آپ کے سرٹیفکیٹ میں لکھا ہے کہ آپ کتابی کیڑے ہیں۔ جانتے ہو کتابی کیڑا کسے کہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ جو شخص ہر وقت مطالعے میں منہمک رہتا ہے۔"

"کتابی کیڑا وہ ہے، جو کتاب کی بجائے قاری کو کھا جاتا ہے۔"

پروفیسر ڈکنس نے بخاری صاحب سے دریافت کیا۔ "ان کے بی اے میں کتنے نمبر آئے تھے؟"

انھوں نے میرا ایک سرٹیفکیٹ پڑھتے ہوئے جواب دیا۔ ۳۲۹ فرسٹ ڈیویژن۔

"تو پھر کیا خیال ہے؟ پروفیسر مدن گوپال سنگھ نے پوچھا۔

بخاری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ داخل کرنا ہی پڑے گا۔ جو کام ہم سے عمر بھر نہ ہو سکا وہ انھوں نے کر دیا۔

پروفیسر ڈکنس نے چونک کر پوچھا "کون سا کام بخاری صاحب؟"

سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے فرمایا۔ "یہی بی اے میں فرسٹ ڈویژن لینے کا"

دوسرے دن کلاس روم میں گئے۔ بخاری صاحب کا ان دنوں عالم شباب تھا۔ پنتیس سال کے قریب عمر ہوگی۔ از قد گھنی بھنویں۔ سرخ و سفید رنگت۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبوترا چہرہ۔ شکل و شباہت کے اعتبار سے وہ افغان ایرانی دکھائی دیتے تھے۔ ریشمی گوون (Gown) پہن کر کلاس روم میں آتے تھے۔ حاضری لیے بغیر لیکچر شروع کیا کرتے۔ عموماً لیکچر سے پہلے اپنے عزیز شاگردوں سے دو ایک چونچیں ضرور لڑایا کرتے تھے ——— بلراج ساہنی (مشہور ہندوستانی اداکار) ان کا عزیز ترین شاگرد تھا۔ اکثر ایک آدھ فقرہ اس پر کستے تھے۔ کیا بات ہے۔ ساہنی آج کچھ کھوئے کھوئے نظر آتے ہو۔ جانتے ہو جب کوئی نوجوان اداس رہتا ہے تو اس کی اداسی کی صرف دو وجہیں ہوتی ہیں یا وہ عشق فرمانے کی حماقت کر رہا ہے یا اس کا بٹوہ خالی ہے۔"

لیکچر کسی کتاب یا نوٹس (Notes) کی مدد کے بغیر دیتے تھے۔ انگریزی کا تلفظ ایسا تھا کہ انگریزوں کو رشک آتا تھا۔ فرسودہ یا روایتی انداز بیان سے چڑھتی غلطی سے بھی کوئی عامیانہ فقرہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ ڈرامہ پڑھانے میں خاص کمال حاصل تھا۔ ہیملیٹ (HAMLET) پڑھا رہے ہیں تو چہرے پر وہی تاثرات پیدا کریں گے جو موقع محل کی عکاسی کرتے ہوں۔ کنگ لیر (King Lear) تو معلوم ہوتا کہ طوفانوں میں گھرا ہوا بوڑھا شیر غرا رہا ہے۔ شیکسپیئر کے مشہور کرداروں کی تقریریں زبانی یاد تھیں انہیں اس خوبی سے ادا کرتے کہ سامعین کو جھرجھری سی آجاتی۔

حافظہ غضب کا پایا تھا۔ اگر جب کوئی نئی کتاب پڑھتے تو دوسرے دن کلاس روم میں اس کا خلاصہ اتنی صحت کے ساتھ بیان کرتے کہ لیکچر سننے کے بعد محسوس ہوتا کہ کتاب انھوں نے نہیں ہم نے پڑھی ہے۔

ایک بار فرانسیسی فلسفی برگساں کی کتاب (Laughter) مزاح سے متعلق بہت دلچسپ باتیں بتائیں۔ فرمایا انسان ہی صرف ہنسنے والا جانور ہے۔"

میں نے کہا۔ "جناب بندر بھی ہنستا ہے۔"

ہنس کر فرمایا۔ کیونکہ وہ انسان کا جد امجد ہے۔"

بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ "ہنسنے کے لیے عقل کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے وقوف کو لطیفہ سنانا تضیع اوقات ہے۔ اگر ایک آدمی کیلے کے چھلکے سے پھسل پڑے تو دوسرے اس پر ہنستے ہیں۔ لیکن ایک بھینس کیلے کے چھلکے سے پھسل کر گر پڑے تو باقی بھینسیں اس پر کبھی نہیں ہنسیں گی۔ کیونکہ بھینس کے پاس عقل نہیں ہوتی۔ تبھی تو یہ محاورہ ایجاد ہوا۔ عقل بڑی یا بھینس ...... ہمدردی اور ترحم کا جذبہ ہنسی کے لیے زہر قاتل کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص سائیکل چلاتے وقت گر پڑے تو آپ اس پر ہنسیں گے اگر اسے سخت چوٹ آئی ہو تو آپ کبھی نہیں ہنسیں گے۔ اگر ریلوے گارڈ

گاڑی چلنے سے پہلے ہر مسافر کو سخت سست کہے۔ کھڑکی سے باہر جھانکنے والے ہر بچے کو سرزنش کرے ہر بوڑھے کو فہمائش کرے کہ اسے ڈبے میں فوراً داخل ہونا چاہیے اور خود چلتی گاڑی میں سوار ہوتے وقت گر پڑے تو تمام مسافر قہقہے لگا کر اس کی بے بسی کا مذاق اڑائیں گے۔ کیونکہ اُن میں سے کسی کو اس کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوگی۔

ایک ہی چیز المیہ اور طربیہ ہو سکتی ہے سوال صرف ہمدردی کا ہے۔ فرض کیجیے بھرے میلے میں کوئی شخص یہ اعلان کرے کہ میری بیوی کھو گئی ہے۔ کچھ لوگ اس پر ضرور ہنسیں گے یہ بات دوسروں کے نقطۂ نگاہ سے طربیہ اور خود اس شخص کے نقطۂ نظر سے المیہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مزاح بالکل اسی طرح تیار کیا جاسکتا ہے جیسے صابن یا خوشبودار تیل۔ فارمولا یہ ہے کہ دونوں چیزوں میں نامطابقت پیدا کر دیجیے۔ مثال کے طور پر یہ کہنے کی بجائے۔ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔ یہ کہیے ؎ ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں۔ مزاح پیدا ہو جائے گا۔"

بخاری صاحب مزاحیہ تقریر کرنے کے فن میں امام کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ سر عبدالقادر کا دور زریں تھا۔ ہر ادبی مجلس میں کرسیٔ صدارت اور سر عبدالقادر لازم و ملزوم تھے۔ یونیورسٹی ہال میں ایک ادبی مباحثہ ہو رہا تھا۔ موضوع زیر بحث تھا۔ The proper study of mankind is Women (صنف نازک ہی مطالعہ کا صحیح موضوع ہے) جب پروفیسر دیوان چند شرما، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین تقاریر کر چکے تو سر عبدالقادر نے بخاری صاحب کو اسٹیج پر تشریف لانے کو کہا۔ سامعین ہمہ تن گوش ہو گئے کہ انہیں پوری توقع تھی کہ اب ہنسی کے فوارے چھوٹیں گے۔ بخاری صاحب جھومتے جھامتے اسٹیج پر آئے۔ صاحب صدر کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ سامعین پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور فرمایا۔ صاحب صدر! میں بدقسمتی سے پروفیسر واقع ہوا ہوں۔ جس کالج میں پڑھاتا ہوں وہاں مخلوط تعلیم کا رواج ہے میرا تجربہ ہے کہ کلاس روم میں طلبا کی توجہ کا مرکز صنف نازک ہی ہوتی ہے۔ کوشش کے باوجود میں طلبا کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا اور بسا اوقات مجھے صنف نازک پر رشک آنے لگتا ہے صاف ظاہر ہے طلبا یہ نکتہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ صنف نازک ہی مطالعہ کا اصل موضوع ہے ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب صدر! صنف نازک کے مطالعہ کے بغیر سائنس کا مطالعہ ناممکن ہے۔ کیا آپ Magnetism (مقناطیسیت) کا مطالعہ صنف نازک کے بغیر مکمل سمجھیں گے جب کہ آپ جانتے ہیں کہ عورت سے زیادہ پُرکشش ہستی خداوند تعالیٰ نے پیدا نہیں کی۔ آپ Heat (حرارت) کا مطالعہ کرنے میں عورت کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ جب آپ جانتے ہیں کہ محفلوں کی گرمی عورت کی موجودگی کی مرہون منت ہے۔ کیا آپ Electricity (برقیات) کا مطالعہ کرتے وقت عورت کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ جب آپ کو معلوم ہے کہ حوا کی بیٹیاں بادل کے بغیر بجلیاں گرا سکتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب صدر! صنف نازک آرٹ کے مطالعے کے لیے ناگزیر ہے اگر لیونارڈو، رافیل اور مائیکل اینجلو نے عورت کے خط و خال کو قریب سے نہ دیکھا ہوتا تو کیا وہ ان لافانی تصاویر اور مجسموں کی تخلیق کر سکتے جن کا شمار عجائبات عالم میں ہوتا ہے۔ کیا کالی داس، شکنتلا، شیکسپیئر، روزالنڈ (Rosalind) دانتے، بیٹریس (Beatrice) کا تصور بھی ذہن میں لا سکتے۔ اگر انہوں نے صنف نازک کے مطالعے میں شب و روز نہ گزارے ہوتے ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب صدر! صنف نازک نے موسیقاروں سے ٹھمریاں اور دادرے، شاعروں سے مثنویوں اور غزلوں اور رقاصوں سے کتھک اور کتھاکلی کی تخلیق کرائی۔ اگر آج فنون لطیفہ ختم ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ

یہ ہے کہ ہم مطالعہ کے اصلی موضوع سے بھٹک گئے ہیں۔ ہم ان چیزوں کا مطالعہ کر رہے ہیں جن سے بجلی کے پنکھے سستی دیسی فلمیں اور اکثیر چنبل تو معرضِ وجود میں آسکتی ہیں لیکن "میگھ دوت" "تائیس اور منی پور رقص" کی توقع کرنا بے کار ہے۔"

مرحوم تقریر نہیں سحر کیا کرتے تھے۔ ان کی ساحری کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے ۱۹۳۲ء میں انھوں نے اپنے ایک شاگرد پروفیسر آر۔ یل مہتہ کے اصرار پہ ڈی اے۔ وی کالج لاہور میں گالزوردی کے ناول A man of property پر لیکچر دیا۔ پروفیسر مہتہ ان دنوں ڈی اے وی کالج میں ملازم تھے۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ مطلع ابرآلود تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ لاہور کے کالجوں کے سینکڑوں طلبا، وطالبات لیکچر سننے کے لیے ڈی اے کالج کے سائنس تھیٹر میں اکٹھے ہوتے۔ بخاری صاحب نے لیکچر کی تمہید اس فقرے سے کی: "خواتین وحضرات! ڈی اے وی کالج میں یہ میرا پہلا اور آخری لیکچر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کالج کے طلبا کا انگریزی کا تلفظ اتنا عجیب واقع ہوا ہے کہ جب وہ مجھے انگریزی میں بولتے ہوئے سنیں گے تو یہ سمجھیں گے میں انگریزی کی بجائے فرانسیسی یا جرمن میں تقریر کر رہا ہوں۔" مرحوم کو انگریزی فکشن (ناول) پر حیرت انگیز عبور تھا۔ جب وہ گالزوردی کے ناول کی وضاحت کر رہے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ خود مصنف اپنی تخلیق کا تجزیہ کر رہا ہے۔ طلبا ان کے لیکچر کے نوٹس لے رہے تھے۔ بخاری صاحب کی فصاحت وبلاغت کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک خوب صورت فقرے کے بعد دوسرا وضع کرتے تھے۔ اور طلبا تذبذب میں پڑ جاتے کہ کون کا فقرہ نوٹ کریں اور کونسا نظر انداز کریں۔ یک لخت باہر بارش تیز ہوگئی۔ بجلی ایک دم جو زور سے کڑکی تو کمرے کی تمام بتیاں گل ہوگئیں۔ بخاری صاحب نے سلسلہ تقریر منقطع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ گھپ اندھیرے میں اپنے اسی شگفتہ انداز میں تقریر کرتے رہے اور طلبا وا ندھیرے میں ان کے فقرے نوٹ کرنے کی کوشش میں محو رہے۔ کہیں سے شور وغل، چیخ وپکار کی آواز نہیں آئی۔ کمرے میں مکمل سناٹا۔ کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد بتیاں پھر روشن ہوئیں۔ بخاری صاحب نے ایک خفیف مسکراہٹ کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور اپنی تقریر جاری رکھی۔ اس تقریر کے سننے کے بعد اکثر طلبا، کا یہ رد عمل تھا کہ جو باتیں ان کے اپنے پروفیسر دو سال میں نہیں بتا سکے وہ بخاری صاحب نے ایک گھنٹہ کے دوران میں بتا دیں۔ اسی تقریر سے متعلق مجھے ان کا ایک فقرہ یاد ہے — "مشہور انگریز نقاد ڈاکٹر بیکر (BEKAR) نے انگریزی ناول پر آٹھ جلدیں لکھی ہیں جن کا مجموعی وزن کوئی چار سیر ہوگا۔ ایک اور انگریز نقاد جے بی پریسلے (J. B Prestly) نے ناول پر ایک کتابچہ لکھا جس کا وزن چار سو تولے ہوگا۔ میری رائے میں اگر بیکر کی تمام جلدیں ایک پلڑے میں رکھ دی جائیں اور پریسلے کا کتابچہ دوسرے میں تو یقیناً پریسلے کا پلڑا بھاری رہے گا۔"

سناتن دھرم کالج میں ایک ادبی مباحثہ ہوا۔ بخاری صاحب وہاں صاحب صدر کی حیثیت سے موجود تھے۔ موضوع زیر بحث تھا۔ frailty thy name is woman (عورت تمہارا دوسرا نام کمزوری ہے) لاہور کے بہترین مقرر اس مباحثے میں حصہ لے رہے تھے۔ ان میں سے اکثر یورپ کی سیر کر چکے تھے، انھوں نے اپنی تقاریر میں یوروپین عورتوں کو خاص طور پہ آڑے ہاتھوں لیا۔ کچھ نے ہندوستان کی تاریخ سے مثالیں دے کر ثابت کیا کہ عورت نے ہر گام پر مرد کو دھوکا دیا ہے۔ "مہارانی جنداں" کا ذکر کیا گیا۔ حوّا کی کمزوری کی طرف بھی بار بار اشارے کیے گئے۔ بحث کے اختتام پر بخاری صاحب نے فرمایا۔ میں نے مخالفین کے دلائل بڑے غور سے سنے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے دلائل صحیح

اور نتائج غلط ہیں۔ اگر یہ ٹھیک ہے کہ عورت مرد کو ہمیشہ گمراہ کرتی رہی ہے تو میرے خیال میں یہ مرد کی کمزوری اور عورت کی شہ زوری ہے۔۔۔۔۔ حالانکہ میں نے بھی یورپ کی سیر کی ہے لیکن عورت سے متعلق میرا تجربہ اتنا وسیع نہیں جتنا دوستوں کا جنہوں نے یورپ میں عورتوں کی کمزوری کا بیان چٹخارے لے لے کر لیا۔۔۔۔ کہا گیا کہ یورپ میں عورت شکار اور مرد شکاری ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں ہر شیر اور ہر عقاب کو کمزور سمجھنا چاہیئے۔ در اصل بات یہ ہے خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد۔ نہ عورت کانچ کی چوڑی ہے اور نہ مرد فولاد کا پنجہ۔

بخاری صاحب اپنے طلباء میں تنقیدی شعور پیدا کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ رٹے رٹائے فقروں سے انھیں نفرت تھی۔ ادھر کسی طالب علم نے کسی مشہور نقاد کے قول کا حوالہ دیا ادھر جھٹ انھوں نے پھبتی کسی "منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔ اجی حضرت یہ فرمان تو اے۔ سی بریڈلے (A. C. Bradley) کا ہے۔ خاکسار بریڈلے کی نہیں آپ کی رائے دریافت کرنا چاہتا ہے۔" جب ہمارا پہلا سہ ماہی امتحان ہوا تو میں نے اپنے پرچے میں متعدد مشہور نقادوں کے فقرے نقل کر دیے۔ بخاری صاحب نے مجھے "صفر" نمبر عطا کرتے ہوئے پرچے کے ٹائیٹل پیج پر لکھا "آپ کا سارا پرچہ واوین میں ہونا چاہیے۔ آپ نے جگہ جگہ ایف ایل لوکس (Lucas) اور پروفیسر کلر کوچ کے اقوال نقل کر دیئے ہیں۔ یہ دونوں کیمبرج میں میرے استاد تھے۔ یقیناً میں اس قابل نہیں کہ اپنے استادوں کا ممتحن بنوں۔ مجھے تو آپ کا امتحان لینا ہے۔"

کلاس روم میں کبھی کبھی جان بوجھ کر الٹی بات کہہ دیتے۔ ساری کلاس پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ جاتی۔ وہ ہر معترض کو ایسا دنداں شکن جواب دیتے کہ بے چارہ بغلیں جھانکنے لگتا۔ سارا پیریڈ بحث میں گزر جاتا۔ سب کو قائل کرنے کے بعد فرماتے "یہ بات میں نے صرف اشتعال دلانے کے لیے کہی تھی۔ ورنہ اس میں کون شک کر سکتا ہے کہ شیکسپیر بہت بڑا فن کار ہے۔ Seminar کے پیریڈ میں جہاں طلباء کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی۔ وہ ہر ایک طالب علم پر جرح کرتے تھے۔ ایسی کڑی جرح کہ طلباء کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگتیں۔ خون خشک ہو جاتا۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھا "آپ نے اپنے جواب مضمون میں لکھا ہے کہ ٹینی سن (Tennyson) کے کلام میں موسیقیت کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ موسیقیت سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

موسیقیت سے میرا مطلب یہ ہے کہ ٹینی سن کا کلام پڑھتے وقت ایک دلکش لے یا تال کا احساس ہوتا ہے

"لے یا تال کیا چیز ہے؟"

"آواز کا اتار چڑھاؤ۔"

"ٹینی سن کے کسی مصرعہ کا حوالہ دے کر بتایئے۔"

میں نے گھبراہٹ کے عالم میں یونہی ایک مصرع پڑھ دیا۔ فرمانے لگے "یہ تو اتنا کرخت ہے کہ اس کے مقابلے میں کوّے کی آواز زیادہ سریلی معلوم ہوگی۔ کہیں یہ بات تو نہیں کہ آپ موسیقی اور شور و غل کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔"

سیمینار (Seminar) میں اکثر ہندوستانیوں کی عادات پر دلچسپ تبصرہ کیا کرتے تھے۔ "ہندوستانی بھی عجیب لوگ ہیں۔ انگلینڈ میں اگر کسی کے گھر موت واقع ہو جائے تو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ یہاں کسی

کا دور کا رشتہ دار اللہ کو پیارا ہو جائے تو ساری رات دھاڑیں مار مار کر ہمسایوں کے علاوہ گلی محلہ والوں کی نیند حرام کر دیتا ہے۔"

"شور و غل کا ہماری زندگی میں کتنا دخل ہے۔ انگلینڈ اور فرانس میں سڑک پر چلتے ہوئے لوگ اتنی دھیمی آواز میں باتیں کرتے ہیں گویا کانا پھوسی کر رہے ہوں۔ ہم ہندوستانی "مدہم" کی بجائے "پنجم" میں باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ بخدا ہم بولتے نہیں چلّاتے ہیں۔"

"ہم ہندوستانی جب تقریر کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گھر والوں سے لڑ کر آئے ہیں۔ اور سامعین پر اپنا غصہ اتار رہے ہیں ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ماتمی قرارداد بھی ہم اسی انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے ہمسایہ ملک سے اعلانِ جنگ کر رہے ہوں۔"

"مبالغہ آمیزی ہماری طبیعت کا شعار بن چکی ہے یہاں ہر کانفرنس 'آل انڈیا' یا بین الاقوامی ہوتی ہے۔ چاہے شرکت کرنے والوں کی تعداد ایک درجن کیوں نہ ہو...... چند دن ہوئے میں نے موچی دروازے کے اندر ایک کان دیکھی جس میں ایک ٹوٹا ہوا ہارمونیم اور خستہ حال طبلہ پڑا تھا۔ سائن بورڈ پر لکھا تھا "انٹرنیشنل اکیڈمی آف میوزک اینڈ ڈانسنگ"۔

"ہندوستانی موسیقی میں سوز ہے جوش نہیں۔ کیمبرج میں ایک بار میں نے اپنے استاد کلر کوچ کو پکّے گانوں کے چھ سات ریکارڈ سنوائے۔ اس کے بعد ان کی ہندوستانی موسیقی کے بارے میں رائے دریافت کی۔ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگے۔ بور کرنے کے لیے ایک ہی ریکارڈ کافی تھا۔ آپ نے چھ سات سنوانے کا خواہ مخواہ تکلف کیا۔"

بخاری صاحب سے آخری ملاقات جون ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ تب وہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر کے عہدے سے سبک دوش ہو کر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہو چکے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ فرمانے لگے "آپ ڈی اے وی کالج میں یونہی وقت ضائع کر رہے ہیں۔ غیر ادبی ماحول میں رہنا ذہنی خودکشی کے مترادف ہے میں جلد ہی آپ کو گورنمنٹ کالج میں لانے کی کوشش کروں گا۔ ان دنوں تحریک پاکستان شباب پر تھی۔ کسی پروفیسر نے کہا اگر پاکستان بن گیا تو ہم کپور کو ہندوستان نہیں جانے دیں گے۔ البتہ انھیں مشرف بہ اسلام ہونا پڑے گا۔ بخاری صاحب نے چونک کر فرمایا۔ حضرت پہلے ہم اور آپ تو مشرف بہ اسلام ہو لیں۔ اس غریب کی باری تو بعد میں آئے گی۔ آخر ہم اور آپ میں کون سی مسلمانی رہ گئی ہے۔

آل انڈیا ریڈیو کا تذکرہ چھڑا کہنے لگے: "ایک بار میرے متعلق پارلیمنٹ میں کہا گیا کہ میں نے دوست اور شاگرد اکٹھے کر رکھے ہیں۔ میں نے اخبارات میں ایک بیان دیا جس میں کہا کہ 'یہ الزام سو فی صد درست ہے مگر اب اس کا کیا کیا جائے کہ بد قسمتی سے میرے تمام شاگرد اور احباب قابل ترین اشخاص واقع ہوتے ہیں۔ اور قابل دوست یا شاگرد جاہل دشمن سے ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔

بخاری صاحب ساٹھ اکسٹھ برس کی عمر میں ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کا مقبرہ دیارِ غیر میں بنا۔ ہندوستان اور پاکستان سے اتنی دور کہ ان کے شاگرد اور عقیدت مند اس پر آنسو بہانے یا شمع جلانے کی سعادت بھی حاصل نہیں کر سکتے لیکن فہم و فراست کی شمعیں جو وہ خود جلا گئے۔ ان کی روشنی ابدی ہے ان کی دین صرف مضامین پطرس نہیں۔ ان کی اصل دین ان کے وہ مایہ ناز شاگرد ہیں۔ جنہوں نے ادب اور فن میں نئی راہیں نکالیں اور جنہیں اپنے "پیر و مرشد" پر جسد خاکی کی آخری سانس تک فخر رہے گا۔

○○

کنہیا لعل کپور

فریادی

(کرشن چندر، کنہیا لال کپور کی نظر میں)

مجموعۂ اضداد ہے! راز سربستہ ہے! داماندہ راہرو ہے! سو فی صدی پرولتاری ہے۔ سو فیصدی بورژوا ہے سوالیہ نشان ہے؟ المیہ نظم ہے۔ سراسر رومانی ہے۔ یکسر قنوطی ہے کشمیری ہے! نالۂ یتیم ہے!!! لارنس عربی کے بعد دوسرا پُراسرار شخص ہے۔ گاندھی اور ظفر علی خاں کے بعد تیسرا خطیب ہے "——— یہ ہیں مختلف رائیں جن کا اظہار کرشن چندر کی شخصیت کے متعلق کیا گیا ہے حتیٰ کہ بے چارہ کرشن چندر ابوالہول کی پہیلی بن کر رہ گیا ہے۔ میری دانست میں کرشن چندر سیدھا سادا انسان ہے۔ اس کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہر خوب صورت عورت اپنا "بھائی" اور ہر بدصورت لڑکی اپنا "عاشق" تصور کر لیتی ہے۔ مجموعہ اضداد وہ صرف اس حد تک ہے کہ اس کی آنکھیں کشمیری، زبان پنجابی اور لباس یورپین ہے اور طبعاً و عملاً وہ بورژوا لیکن قولاً و تحریراً پرولتاری ہے۔ البتہ ایک اعتبار سے وہ عجیب و غریب ادیب ہے۔ نومبر ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے کہ لاہور میں اچانک اس نے خودکشی کر لی۔ لیکن ایک سال بعد دہلی میں زندہ ہو گیا۔ ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ میں اس کی دوسری وفات ہوئی۔ لیکن عدم آباد پہنچنے کی بجائے وہ پونا پہنچ گیا۔ اس وقت بمبئی میں ہے اور ابھی تک زندہ ہے۔ شاید اب کبھی نہیں مرے گا۔

وہ فطرۃً تلون کیش ہے۔ ہر تیسرے سال کے بعد ایک نئے امام کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے۔ لڑکپن میں اس کا امام ڈان جوان تھا۔ جوانی میں احمد شاہ بخاری، چند دنوں کے لیے وہ ڈبلیو زیڈ احمد پر ایمان لے آیا اور آج کل اس کا امام دیو کا رانی ہے۔ ایک ہی قسم کے قدرتی نظاروں، نسوانی جمالوں اور جنسی تجربوں سے وہ دیر تک مطمئن نہیں رہ سکتا۔ سرینگر سے پہلگام جاتے ہوئے کشمیری چہروں، برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں اور گنگناتے ہوئے پہاڑی نالوں سے متاثر ضرور ہوتا ہے لیکن جلد ہی ان سب کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ وہ لاری میں بیٹھے ہوئے کہتا ہے کہ ان آبشاروں کے مسلسل اور بے معنی شور میں موسیقی تلاش کر رہے ہو۔ پہلگام میں دو چار دن رہنے کے بعد اس کی طبیعت اکتا جاتی ہے اور وہ بار بار یہ الفاظ زبان پر لاتا ہے "خیال کرو۔ صرف دو چار دن صاف آکسیجن کے لیے ہم اس کو یہاں تک آ پہنچے ہیں۔ اپنے افسانوی مجموعوں

کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کبھی چمک پیدا نہیں ہوتی۔ میں نے اسے کبھی اپنے افسانے کی تعریف کرتے نہیں سنا۔ دراصل وہ گزشتہ تجربوں سے بہت جلد بیزار ہو جاتا ہے اور نئے نئے تجربوں کی دھن میں اپنا بہت کچھ پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

پہلی ملاقات میں اس کے مداحوں کو اس سے مل کر اکثر مایوسی ہو جاتی ہے۔ میانہ قد گندمی رنگ اور جواں سال وہ اگر کالج کا چھوکرا نہیں تو زیادہ سے زیادہ سول سکریٹریٹ کا کلرک دکھائی دیتا ہے۔ عام ہندوستانیوں کی طرح اسے باتیں بنانے کا شوق نہیں۔ آپ اس سے گھنٹوں باتیں کیے جائیں۔ وہ چپ چاپ، خاموش، مبہوت بنا بیٹھا رہے گا یا آپ کا جی رکھنے کے لیے کبھی کبھی مسکرا دے گا۔ اس کی مسکراہٹ ہمیشہ ہلکی اور نرم ہوتی ہے۔ مونالزا کی طرح مسکراتے مسکراتے تھک جائے گا تو تھوکنا یا ناک صاف کرنا شروع کر دے گا۔ اس کی ناک میں نقص ہے جس کی وجہ سے اُسے اکثر زکام کی شکایت رہتی ہے۔ بدصورت عورتوں کے بعد زکام ہی وہ لعنت ہے، وہ کہا کرتا ہے۔ "جس سے میں عمر بھر پیچھا نہیں چھڑا سکا"۔ مسکراہٹ کے علاوہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کا حزن و ملال ہے۔ ایک قسم کی ازلی و ابدی حسرت جو میں نے کشمیری بچوں کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔

اس سے ملنے کے بعد ——— ہر شخص کو شک گزرتا ہے کہ وہ افسانے خود نہیں لکھتا بلکہ کسی سے لکھواتا ہے۔

دراصل جلوت کا کرشن چندر خلوت کے کرشن چندر سے بالکل مختلف ہے۔ جلوت میں وہ تکلّف اور سنجیدگی کا نقاب اوڑھے رہتا ہے۔ وہ صرف بے تکلف دوستوں کی محفل میں کھلتا ہے اور بخدا جب کھلتا ہے تو امریکن پیراشوٹ کی طرح "بے پناہ" ہو کر کھلتا ہے اور اسی وقت اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ دل چسپ چوٹیں کر سکتا ہے۔ تشا پتن کے جھگڑے چکا سکتا ہے اور دل کے پھپھولوں اور سینہ کے داغوں کی نمائش بھی کر سکتا ہے۔ نفاست پسندی اس کی سرشت میں داخل ہو چکی ہے وہ کبھی معمولی کپڑے نہیں پہنتا۔ رذیل ہوٹل میں قیام نہیں کرتا۔ معمولی درجے میں سفر نہیں کرتا اور گھٹیا قسم کی نثر میں نہیں لکھتا اور اکثر کہتا ہے۔ وہ نثر ہی کیا جس کے ہر فقرے میں مزاح کی چاشنی یا شعریت کی رنگینی نہ ہو۔ اس کی زندگی کا کوئی اصول ہے تو وہ ہے "سمجھوتہ" وہ مہاتما گاندھی کی طرح قدم قدم پر سمجھوتہ کرنے کو تیار رہے۔ وہ ان ادبا سے آنِ واحد میں سمجھوتہ کر لیتا ہے جنھیں ساری عمر کوستا رہا ہے وہ ان رشتہ داروں کے ناز اٹھانے کے لیے فوراً تیار ہو جاتا ہے جو اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ وہ اس ہنسی سے بھی سمجھوتہ کر لیتا ہے جو رونے سے مشابہت رکھتی ہے۔ چند آدمیوں سے اسے ازلی بیر ہے۔ پنڈت، ملا، فلاسفر۔ بدصورت عورتیں۔ اگر اس کا بس چلے تو انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے لیکن اس کا بس نہیں چلتا اور وہ ان سے بھی سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جب وہ سرینگر کے بازاروں میں للائیوں سے دہی کے بڑے اور بیسن کے پکوڑے کھاتے ہوئے دیکھتا ہے تو غصہ سے چیخ اٹھتا ہے۔ "سالیاں چار سو میل کا سفر اس نعمت کے چکھنے کے لیے کرتی ہیں"۔

کرشن چندر طفلِ مکتب اور معمر فلسفی کا دلچسپ مرکب ہے۔ لذیذ کھانا دیکھ کر بچوں کی طرح چٹخارے لینے لگتا ہے۔ ہمسایہ کو ڈرانے کے لیے پہلگام میں آدھی رات کے وقت منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹیاں بجاتا ہے۔ اتنی شہرت حاصل کرنے کے باوجود اپنے نام کے ساتھ "ایم اے" کا دم چھلا لگاتا ہے۔ اس کا فلسفہ لینن اور شیلی کے فلسفہ کا امتزاج ہے وہ پرانے نظام کو دھماکہ سے اڑنے والے بم سے اس طرح اڑا دینا چاہتا ہے کہ "مزہ آ جائے"۔ کائنات کو مٹھی میں اس طرح

بھینچنا چاہتا ہے کہ "چرمر" ہو جائے۔ اسے طبقاتی نظام سے نفرت ہے۔ لاری میں فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہے۔ لیکن سیٹ پر بیٹھے ہی سوچنے لگتا ہے کہ انسان نے ہر جگہ پہلا، دوسرا اور تیسرا درجہ کیوں بنا رکھا ہے۔ جماعت بندی ہمیشہ ان کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ کشمیری ہاتوؤں کو صاحب لوگوں کے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے دیکھ کر اس کا خون ابلنے لگتا ہے اور جب وہ کشمیر سے متعلق رندی اور ہوسناکی کی داستانیں سنتا ہے تو سرد آہ بھر کر کہتا ہے "کتنے افسوس کی بات ہے کہ لوگ اس جنت میں فقط حور و غلمان کی تلاش کرتے آتے ہیں"۔

کشمیر سے اسے والہانہ عشق ہے لیکن وہ کاشمیری نہیں۔ وہ صرف اسی نسبت سے کاشمیری ہے جس نسبت سے لاہوری، دہلوی، لکھنوی، یونوی یا پیسے دی ہو وہ نہ کشمیری بول سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے۔ لیکن کشمیری زبان سن کر اس کا دل مسرت سے اچھلنے لگتا ہے۔ "کتنے شیریں بول ہیں کشمیری زبان کے" وہ حیرت سے ہاتوؤں کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔

کرشن چندر اچھے افسانے تب لکھتا ہے جب پانی برس رہا ہو۔ جب وہ کسی "لالہ رخ" کے شانے میں جلوہ افروز ہو جب اسے پیسوں کی سخت ضرورت ہو۔ وہ عموماً ایک نشست میں افسانہ لکھ لیتا ہے اور لکھتے وقت بہت کم الفاظ کاٹتا ہے۔ بیشتر اس کا نقش اول ہی نقش آخر ثابت ہوتا ہے۔ بسا اوقات اس کے افسانوں کی بنیاد کوئی ذاتی حادثہ یا سانحہ ہوتا ہے۔ اسے زندگی میں کافی حادثوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک دفعہ یرقان میں سخت مبتلا ہوا۔ دو دفعہ باؤلے کتے نے کاٹ کھایا۔ ایک بار کالج سے بھاگ گیا۔ اور ہنگلی کے پل میں پناہ گزیں ہوا۔ ایک دفعہ پولیس کے ڈر سے چھت پر سے چھلانگ لگا دی۔ اور متعدد حسین لڑکیوں سے اس لیے شادی نہ کر سکا کہ اس کے پاس موٹر کار نہ تھی۔ موٹر کار کو وہ نہایت کام کی چیز سمجھتا ہے اس کا عقیدہ ہے کہ کوئی شخص سیاست اور عشق میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کے پاس موٹر کار نہ ہو۔

بہا سوٹ زندگی میں کرشن چندر شمع خاموش ہے۔ جس نے یہ سمجھ کر کہ صرف چیخنے سے اندھیرا دور نہیں ہوتا۔ ہر رنگ میں جلنا منظور کر لیا۔ اپنے افسانوں میں وہ اس فرشتے کی طرح چلاتا ہے جو عرش سے اڑ کر زمین پر اترے اور حضرت انسان کی خباثت کمینگی اور بربریت کو دیکھ کر غم و غصہ سے بلبلا اٹھے۔ انگریزی شاعر شیلی کی طرح وہ ہمیشہ آنے والی حسین دنیا کے خواب دیکھتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جس میں نوجوان لڑکیاں وحشی ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرتی پھریں، مزدور دندناتے اور ہر عورت ہیلن آف ٹرائے اور ہر محبوبہ قلوپترا بنی ہوئی ہو۔ لیکن جب زندگی میں اسے یہ چیزیں نہیں ملتیں تو ان کھلونوں سے دل بہلاتا ہے جو ایام طفلی سے اس کی تسکین کا باعث بنتے رہے ہیں۔ یعنی ایک عدد موٹر کار، چینا حباب۔ ایک درجن اچھی کتابیں اور لذیذ کھانا پکانے والی خدوخال کی بیوی! ۔ (چنگ و رباب)

کنہیا لعل کپور

وزیر ٹیکس

اس دن جب مجھے وزیر ٹیکس کا خط ملا تو میں حیران ہوا۔ وزیر ٹیکس سے میری رسم وراہ تک نہ تھی اور مجھے سان د گمان نہیں تھا کہ وہ مجھے نہ صرف خط لکھے گا بلکہ اپنے یہاں چائے پر مدعو بھی کرے گا۔ وزیر ٹیکس نے لکھا تھا۔

محترمی!
مجھے آپ کی آج بہت ضرورت ہے۔ اگر ہوسکے تو چار بجے میرے یہاں تشریف لائیے اور میرے ساتھ چائے پیجئے۔ آپ سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔

مخلص
وزیر ٹیکس

یہ خیال کرتے ہوئے کہ وزیر ٹیکس جیسے سمجھ دار آدمی سے ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یعنی اس نے یہ دعوت نامہ کسی اور کو بھجوانے کی بجائے مجھے بھجوا دیا ہے۔ پہلے تو میں اس کے ہاں جانے سے جھجکا۔ لیکن جب تین بجے وزیر ٹیکس کے سکریٹری نے فون پر مجھ سے وقت مقررہ پر پہنچ جانے کی درخواست کی تو میں یہ سمجھا کہ وزیر ٹیکس ضرور کسی ناگہانی مصیبت میں پھنس گیا ہے اور اسے میرے مشورے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں ٹھیک چار بجے اس کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔

"بجہ بہد۔ مزاج کیسے ہیں؟ آج موسم خوش گوار ہے۔ تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ!" وغیرہ وغیرہ رسمی باتوں کے بعد وزیر ٹیکس مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے اور ایک پُر تکلف کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بیرا چائے لایا۔ وزیر ٹیکس نے میرے لیے چائے کا پیالہ بناتے ہوئے کہا۔

"آپ حیران ضرور ہوں گے کہ میں نے آپ کو بلوا بھیجا ہے۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ مجھے واقعی آپ کی ضرورت ہے"

"فرمائیے!" میں نے عاجزی سے کہا۔ "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ بڑے ذہین آدمی ہیں"

"صاحب! میں کیا عرض کروں۔ یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

"کسی فیس کی ضرورت نہیں۔ آپ واقعی بڑے ذہین آدمی ہیں اور مجھے اس وقت واقعی ذہین آدمی کی ضرورت ہے۔"

"فرمائیے۔!"

"آپ جانتے ہیں میں خسارے کا بجٹ تیار کرنے میں ماہر ہوں۔"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تین سال ہوئے آپ نے بجٹ میں پچاس کروڑ کا خسارہ دکھایا تھا۔ پچھلے سال ستر کروڑ اور اس سال تو آپ نے تمام پچھلے ریکارڈ مات کر دیئے۔ یعنی نناوے کروڑ!"

"بس اسی کے متعلق آپ سے مشورہ کرنا ہے۔"

"گستاخی معاف مجھے بجٹ تیار کرنے کا کوئی تجربہ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنا ذاتی بجٹ تیار کرنے میں بھی اکثر ناکام رہتا ہوں۔ اسی کو لیجئے آج مہینے کی بیس تاریخ ہے اور میرے بٹوے میں صرف ایک کھوٹی چونی ہے اور ابھی بجلی کا بل۔ درزی کا بل۔ دھوبی کا بل اور اسی قسم کے متعدد اور بل مجھے ادا کرنے ہیں۔ اس حالت میں۔۔۔۔۔!!"

"چھوڑیئے یہ قصہ۔" وزیر ٹیکس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ کے بٹوے میں کم از کم کھوٹی چونی تو ہے یہاں میرے خزانے میں چھوٹی کوڑی تک نہیں۔"

"عجیب بات ہے۔ لیکن آپ اتنے نئے ٹیکس ہر سال لگاتے ہیں۔ وہ روپیہ کہاں جاتا ہے؟"

"آپ بھی عجیب سادہ لوح ہیں۔" وزیر ٹیکس نے ذرا بے تکلف ہوتے ہوئے کہا ——— "یہ بھی نہیں جانتے کہ اگر ادھر میں نئے ٹیکس لگاتا ہوں تو ادھر فوراً اخراجات بڑھا دیتا ہوں۔ اس حالت میں خزانے میں کچھ بچے رہنے کے کیا امکانات ہیں"

"لیکن آپ اخراجات کیوں بڑھاتے ہیں؟" میں نے ذرا چیں بر جبیں ہو کر پوچھا۔

"اخراجات نہ بڑھاؤں تو خسارہ کیسے دکھا سکتا ہوں؟"

"خسارہ نہ دکھایئے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"خسارہ نہ دکھاؤں؟" وزیر ٹیکس نے چمک کر کہا۔ "تو پھر وزیر ٹیکس کیسے رہ سکتا ہوں؟ پھر تو مجھے وہی کام کرنا پڑے جو پیشہ آبائی ہے۔"

"یعنی ——— ؟"

"خیر چھوڑیئے یہ قصہ۔ ہاں تو بات یہ ہے کہ مجھے اخراجات بڑھانا ہی پڑتے ہیں۔ دراصل میں اس معاملہ میں کچھ مجبور ہوں۔ اب اس سال ہی دیکھئے۔۔۔۔۔۔"

"ہاں ہاں اس سال۔۔۔۔۔"

اس سال میں نے نو نئے وزیر مقرر کیے۔ دس نئے سفیر غیر ممالک میں بھیجے۔ پانچسو نئے سکریٹری تعینات کیے۔ ساڑھے سات سو ڈپٹی سکریٹری۔ پندرہ سو اسسٹنٹ ڈپٹی سکریٹری اور اگر سب اسسٹنٹ ڈپٹی سکریٹریوں کی تعداد بتاؤں تو شاید بتا بھی نہ سکوں۔"

"نو وزیر! دس سفیر! یہ تو ناقابل یقین سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

"ناقابل یقین؟ اچھا گن لیجئے۔ وزیر قحط۔ وزیر افلاس، وزیر وعدہ، وزیر تقریر، وزیر جلسہ، وزیر جلوس، وزیر جیل، وزیر غذا

وزیر حادثہ، وزیر اعداد وشمار۔"

"اور سفیر کون سے نئے ممالک میں بھیجے؟"

"ان ممالک کے نام تو مجھے بھی اچھی طرح نہیں آتے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اب دنیا کے کونے کونے میں ہمارے سفیر ہیں مثلاً ایک جزیرہ جگ مگ، مگ جگ ہے بحر الکاہل میں ہے یا شاید بحر اوقیانوس میں اس کا رقبہ صرف ایک مربع میل سے آبادی پچاس ساٹھ کے قریب ہوگی۔ وہاں میں نے ابھی ابھی ایک سفیر کو تعینات کیا ہے۔"

"لیکن یہ نئے وزیر اور سفیر کچھ کام بھی کرتے ہیں یا محض اخراجات بڑھانے کے کام آرہے ہیں؟"

اخراجات بڑھانا ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے لیکن اس کے علاوہ بھی یہ اور بہت کام انجام دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وزیر قحط کو لیجئے۔"

"ہاں ہاں! ان حضرات کا کیا کارنامہ ہے؟"

"ان کا کارنامہ یہ ہے کہ یہ ملک کی ہر چھوٹی بڑی ریاست پر قحط مسلط کر رہے ہیں۔ ابتداء انھوں نے ایک شمال مشرقی ریاست سے کی ہے لیکن انتہا کہاں کریں گے۔ اس کا علم انہی کے سوا کسی کو نہیں۔ یہ حضرت جب چاہیں کسی قسم کے قحط کو معرض وجود میں لا سکتے ہیں۔ خوراک کا قحط، کپڑے کا قحط۔ مٹی کے تیل کا قحط یا محض کا قحط!"

"خوب!" میں نے مسکرا کر کہا ——— اور وزیر مذاق؟"

ہاہا! وزیر مذاق! بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ ان کا کام عوام سے مذاق کرنا ہے۔ جوں ہی کوئی مسئلہ عوام کی پریشانی کا باعث بنتا ہے اور ان کی توجہ اس کی طرف دلائی جاتی ہے یہ اسے ہنسی مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"اگر عوام شکایت کریں کہ چائے حد سے زیادہ مہنگی ہوگئی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ اگر چائے مہنگی ہوگئی ہے تو چائے کی بجائے سوکھی گھاس کا جوشاندہ پیا کیجئے۔"

"واقعی وزیر مذاق بڑے با مذاق واقع ہوئے ہیں۔"

"جی ہاں! یہ بات نہ ہوتی تو میں انہیں پانچ ہزار ماہانہ پر تعینات نہ کرتا۔ خیر چھوڑیئے یہ قصہ۔ ہم اصل موضوع سے بھٹک رہے ہیں۔ دراصل میں نے آپ کو اس لیے نہیں بلوایا کہ نئے وزیروں یا سفیروں کے کارناموں سے آگاہ کروں میرا مطلب کچھ اور تھا۔"

"ارشاد!"

آپ چونکہ ذہین آدمی ہیں اس لیے ذرا اپنے دماغ سے کام لیجئے۔ اور مجھے بتایئے کہ ننانوے کروڑ روپے کے خسارے کو پورا کرنے کے لیے نئے ٹیکس لگائے جائیں ——— ؟"

"نئے ٹیکس! گستاخی معاف!" میں نے ذرا بھنا کر کہا ——— "پہلے ہی آپ نے ٹیکس لگا لگا کر عوام کی کمر توڑ دی ہے۔ خدارا نئے ٹیکس لگانے کے ارادے سے باز آیئے۔"

"عوام پر ٹیکس کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ میں نے عوام پر تو کوئی ٹیکس نہیں لگایا۔ یہ صحیح ہے میں نے تمباکو پر ٹیکس

گایا۔ پان پر لگایا۔ لیکن عوام تمباکو ہیں نہ پان۔"

"ظالم"! میں نے وزیر ٹیکس سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ ٹیکس عوام پر ہی تو ہیں۔ عوام پان یا تمباکو سہی۔ لیکن پان کھاتے اور تمباکو پیتے تو ہیں۔"

"یہ اور بات ہے۔ اچھا چھوڑیئے یہ قصہ۔ اب جلدی جلدی بتایئے کہ کون سے نئے ٹیکس . . . . . ؟

"آپ ٹیکس لگانے پر مصر ہیں؟"

"بالکل ———"

"ضرور لگانا چاہتے ہیں؟"

"ضرور ———"

"اچھا تو سگائی کے متعلق کیا خیال ہے۔"

"سگائی؟ کس کی سگائی؟ میری یا آپ کی۔"

"ہا ہا! واہ وزیر ٹیکس صاحب! آپ ہیں تو وزیر۔ لیکن معاف کیجیے گا۔ ہیں نرے کاٹھ . . . . . ."

"بس بس آگے مت کہیئے۔ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن . . . لیکن سگائی کا ٹیکس سے کیا تعلق ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔"

"میرا مطلب ہے سگائی ٹیکس۔"

"اچھا۔ اچھا سگائی ٹیکس۔ خوب۔ خوب! بہت دور کی سوجھی بھئی۔ واہ کیا بات ہے سگائی ٹیکس۔ واقعی آپ ذہین ترین آدمی ہیں۔"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

"اچھا بھلا اندازاً بتایئے۔ آپ کے ملک میں ہر سال کتنی سگائیاں ہوتی ہیں؟"

"یہ تو کسی پنڈت سے دریافت کیجیے۔"

"نہیں نہیں۔ مذاق چھوڑیئے۔ بتایئے۔"

"کوئی دس بارہ لاکھ"

"ٹھیک! اگر ہر سگائی پر دس روپے ٹیکس لگایا جائے تو ایک کروڑ سے کچھ زیادہ آمدنی ہو سکتی ہے۔ اچھا او کوئی ٹیکس تجویز کیجیے۔"

"پیدائش ٹیکس۔"

"بہت خوب، بہت خوب! میرے خیال سے ملک میں ہر سال پچاس لاکھ نئے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ پانچ ر فی بچہ ٹھیک رہے گا۔"

"زیادہ تر غریب لوگ نہیں دے سکیں گے۔"

"تو پونے پانچ کر دیجیے۔ پچاس لاکھ ضرب پونے پانچ ——— کافی آمدنی ہو سکتی ہے۔ اب آگے چلئے۔"

"ہاں، ہاں کفن ٹیکس! کیوں نہیں۔ اگر پیدائش ٹیکس لگ سکتا ہے تو کفن ٹیکس لگانے میں کیا مضائقہ ہے۔ اس ٹیکس سے بھی پچاس ساٹھ لاکھ کی رقم دستیاب ہوسکتی ہے۔ چلیے یہ بھی نوٹ کرلیا۔ اور۔۔۔۔"

"تیجری ٹیکس۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جو شخص [illegible] اس پر ٹیکس لگایا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کل گائے یا بھینس پالنے کی بہت کم توفیق ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس ٹیکس کا دائرہ وسیع ہونا چاہیے۔ کتنے ہی لوگ مرغیاں، تیتریں، بطخیں، طوطے، کتے، بلیاں اور چوہے بھی تو پالتے ہیں۔"

"تو چلیے بکری ٹیکس کے علاوہ بٹیر ٹیکس، چوہا ٹیکس، مرغی ٹیکس بھی لگا دیجیے۔"

"اچھا اب کوئی ایسی چیز بتایئے جسے ہر شخص استعمال کرتا ہو۔ میری رائے میں اگر اس پر ٹیکس لگایا جائے تو معقول آمدنی ہوسکتی ہے۔"

"ہاں ہاں دو تین منٹ سوچ لیجیے میں اتنے میں سگریٹ پیتا ہوں۔"

دو تین منٹ کے وقفے کے بعد میں نے کہا "میرے خیال میں ایسی صرف دو چیزیں ہیں۔"

"فرمایئے۔"

"شیشہ اور کنگھی"

"شیشہ اور کنگھی" وزیر ٹیکس نے کرسی پر اچھلتے ہوئے کہا ــــ "آپ واقعی ذہین ترین آدمی ہیں۔ شیشہ اور کنگھی! کنگھی اور شیشہ کیا بات ہے واللہ!"

"اگر آپ ان دونوں پر ٹیکس لگادیں، چاہے معمولی سا۔ تو کروڑوں کی آمدنی ہوسکتی ہے۔"

کروڑوں! وارے نیارے ہوجائیں گے۔۔۔۔۔ اچھا اب ایک منٹ کے لیے دماغ کو پھر آزمائش میں ڈالیے۔ اور سوچ کر بتایئے کہ کوئی ایسی چیز رہ تو نہیں گئی جس پر ہم نے ٹیکس نہیں لگایا۔ آپ بھی سوچیے۔ میں بھی سوچتا ہوں۔"

چند ثانیے ہم دونوں خاموش بیٹھے سوچتے رہے۔ معاً وزیر ٹیکس نے کہا ــــ "ایک چیز کا تو مجھے پتہ چل گیا ہے۔ باقی آپ بتادیجیے۔"

"وہ کونسی چیز ہے؟"

"برف"!

"برف؟"

"ہاں ہاں بھئی برف! جانتے نہیں گرمی کے موسم میں ہر آدمی برف استعمال کرتا ہے۔"

"خوب! بہت خوب!" میں نے وزیر ٹیکس کی ذہانت کی داد دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب آپ کہیے۔ آپ نے کیا سوچا ہے؟"

میرے خیال میں تو ابھی بہت سی چیزیں باقی ہیں مثال کے طور پر غرارہ ــــــــ "

"آپ کا مطلب ہے ریشمی غرارہ؟"

"ہاں!"

"اس پر ٹیکس نہیں لگایا جاسکتا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ــــــــ" منسٹر ٹیکس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "شریمتی جی پہنتی ہیں۔"

"تو رہنے دیجئے ــــــــ حنا کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"حنا پر ٹیکس لگایا جاسکتا ہے۔ حنا سے شریمتی جی کو خاص طور پر نفرت ہے۔"

"خضاب؟"

"خضاب پر ٹیکس لگانا ٹھیک نہیں رہے گا۔ والد محترم خضاب لگاتے ہیں۔ ..... خضاب کے علاوہ کوئی اور چیز بتائیے!

"عینک، چھتری، بٹوا، چاقو، چمچہ، دیگچی، لحاف، رضائی، تکیہ، تولیہ، جھومر، نتھ، بازوبند، گھڑی، فونٹین پن، ہلدی، مرچ، دارچینی، گرم مصالحہ ..... "

"بس بس کافی ہیں۔ میرے خیال میں ننانوے کروڑ کا خسارہ پورا ہو جائے گا۔"

"اگر اب بھی پورا نہ ہوا تو پھر دھوپ اور پانی پر بھی ٹیکس لگا دیجئے گا۔"

"نہیں، نہیں ــــــ میرے خیال میں اس سال یہ نوبت نہیں آئے گی۔ اگلے سال دیکھا جائے گا۔"

"اچھا تو اب مجھے اجازت ہے؟"

"بہت بہت شکریہ" وزیر ٹیکس نے مجھ سے بغلگیر ہوتے ہوئے فرمایا۔ آپ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ نہ صرف ذہین ہیں بلکہ ذہین ترین آدمی ہیں۔"

(اقبال دیپ) ○○

کپور نے اپنی کتاب "چنگ و رباب" راجندر سنگھ بیدی کے نام معنون کی اور انتساب کے صفحہ پر لکھا ــــ

[illegible]

ع ہم لئے بیٹھے ہیں الٹی۔ یار [illegible]

کافی ہاؤس

کنھیالال کپور

اس زندگی سے بھاگ کر جو جھوٹ، مکر اور خود فریبی کی زندگی ہے، میں کافی ہاؤس میں پناہ گزیں ہوتا ہوں، خوش باش لوگ کافی پی رہے ہیں۔ فضا قہقہوں سے گونج رہی ہے۔ سفید وردیوں میں ملبوس بیرے، صاحب لوگوں کو کافی، انڈے، پیسٹری بہم پہنچا رہے ہیں۔ کافی ہاؤس میں سوائے ان بیروں کے کوئی اور سنجیدہ نظر نہیں آتا۔ میں بیرے کو کافی لانے کے لئے کہتا ہوں۔ اور خود ن۔ م۔ راشد کے چند اشعار گنگناتے لگتا ہوں ؎

زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ کے چور دروازے سے آکر زندگی
ڈھونڈ لے مجھ کو نشاں پالے مرا
اور جرم عیش کرتے دیکھ لے

کافی کا ذائقہ ضرورت سے زیادہ تلخ ہے۔ میری دائیں طرف چند کافی نوش خوش گپیوں میں مشغول ہیں، میں ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا ہوں۔

"پارٹی کا اخبار اور پمفلٹ فروخت کر کے صرف بارہ آنے وصول ہوئے۔"

"مگر کافی کا بل تو ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔"

"بارہ آنے تم اپنی جیب سے دے دو نا۔"

"میں کیوں دوں بارہ آنے، میں تو بعد میں آیا، کافی تم نے پی ہے۔"

"یار تم اور سب باتوں میں اشتراکی ہو مگر روپے پیسے کے معاملے میں ڈھیٹ قسم کے بورژوا واقع ہوئے ہو۔"

"اچھا لاؤ بارہ آنے۔"
"ہرگز نہیں۔"
"تمہیں مس جانباز کی قسم۔"
"میری کون ہوتی ہے مس جانباز۔"
"واہ تم ہی تو اسے پارٹی میں لائے تھے۔"
"کہتے تھے کہ اشتراکیت خوب سمجھتی ہے۔"
"اگر وہ اشتراکیت سمجھ سکتی ہے تو میرے خیال میں ہر خوبصورت بلی اشتراکی ہے۔"
"کل کہہ رہی تھیں مارکس کا کیپٹیل دو دن میں ختم کیا۔"
"سفید جھوٹ۔"
"مارکس کا کیپٹیل چھ سو صفحے کی کتاب، اس کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے کم از کم تیس سال کا عرصہ چاہیئے۔"
"تیس سال!"
"جی ہاں۔ تیس سال۔ گر میں نے اسے صرف پانچ سال میں سمجھ لیا تھا۔"
"میں پوچھتا ہوں۔ کیا خیال ہے تمہارا گاندھی کے برت کے متعلق؟"
"بے سود برت رکھنے سے ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا۔"
"اور کس طرح آزاد ہوگا؟"
"مارکس اور لینن کے فلسفے پر عمل کرنے سے۔"
"مارکس اور لینن کا فلسفہ جدا جدا ہے۔"
"کون کہتا ہے؟"
"تم نے مارکس پڑھا ہی نہیں۔"
"تم نے کب پڑھا ہے؟"
"اچھا چھوڑو اس بحث کو۔ فرسٹ شو کے لئے دیر ہو رہی ہے۔"
"فرسٹ شو۔ مگر اس کے لئے پیسے کہاں؟"
"پارٹی کے چند پمفلٹ اور بیچ ڈالیں۔"
"اچھا خیال ہے۔ چلو اس میز سے شروع کریں۔ دس بارہ تو بک ہی جائیں گے۔"

چار پانچ نوجوان اُٹھ کر کافی نوشوں کو ایک پمفلٹ دکھانا شروع کرتے ہیں، چند آدمی خرید لیتے ہیں۔ باقی ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب میں دوسری میز کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، دوسروں کی باتوں میں دخل دینا بدتمیزی سہی۔ لیکن اگر کافی حد سے تلخ ہو تو پھر چارہ ہی کیا ہے۔

"کون سی کتاب ہے تمہارے ہاتھ میں؟"

"بڑی دلچسپ ہے۔"
"لاؤ دیکھیں۔"
"ادرہ۔ دلہن کی ڈائری۔"
"کتنے میں خریدی۔"
"تین روپے میں۔"
"مجھے پڑھنے کے لئے دو گے۔"
"نہیں۔ میں اسے اپنے ساتھ پونا لے جا رہا ہوں۔"
"کب جا رہے ہو؟"
"اس اتوار کو۔"
"اچھا کوئی بیوی کی چٹھی آئی؟"
"ہاں۔ اور ایک خوشخبری بھی۔"
"کیا؟"
"لڑکا ہوا ہے۔"
"مگر تمھے تو بیوی کو ملے دو سال ہو گئے!"
"اس سے کیا ہے!"
"کافی پی کر وہاں جائیں۔"
"کہاں؟"
"وہاں!"
"اچھا میں سمجھ گیا۔"
"ہاں یار پونا جانے سے پہلے کچھ عیش کر لو۔"
"کل ہم نے خوب عیش کیا۔"
"کتنے روپے خرچ کئے؟"
"دس۔"
"گھر کتنے بھیجے؟"
"پانچ۔"

وہ اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ میں کافی کا ایک گھونٹ اور بھرتا ہوں۔ مگر اس کا ذائقہ تلخ تر معلوم ہوتا ہے۔ اب اس میز پر چند کھدر پوش آکر بیٹھ جاتے ہیں
"کمال کر دیا مہاتما جی نے۔"
"پورے تین ہفتے کچھ نہیں کھایا۔"

"روحانی طاقت ہے۔"

"اوتار ہیں۔"

"میں نے تو پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ مہاتما جی کبھی مر نہیں سکتے۔"

"ایک دفعہ تو دنیا کو ہلا دیا۔"

"میں کہتا ہوں یہ ہے اصلی شجاعت۔"

"یہی تو میں کہتا ہوں کہ اگر ہندوستان سے تمام بزدلوں کو چن چن کر مار دیا جائے تو ہندوستان آج آزاد ہو سکتا ہے۔"

"تمہارا خیال ہے تمام بزدلوں کو گولی مار دی جائے۔"

"ہاں۔"

"تو پھر ہندوستان میں رہ ہی کون جائے گا۔"

"اچھا یار۔ میرا چرخہ کل ٹوٹ گیا ہے۔ کہاں سے مرمت کراؤں۔"

"نیا خرید یار۔ تمہارا چرخہ تو بہت پرانا ہو چکا۔"

"ہاں بیس سال سے اسی پر کات رہا ہوں۔"

"بیس سال۔"

"کتنا سوت کات لیا ہوگا۔"

"یہی کوئی ایک لاکھ گز۔"

"کمال کر دیا۔"

"میں کہتا ہوں۔ کہ اگر ہر ہندوستانی ایک لاکھ گز سوت کات لے تو ہندوستان آج آزاد ہو سکتا ہے۔"

"مجھے اس سے بھی سہل طریقہ یاد ہے۔"

"کیا؟"

"ہر ایک ہندوستانی پندرہ دن کا برت رکھ لے۔"

وہ چلے جاتے ہیں۔ اب ان کے بجائے چند کریہہ الصورت انسان میز پر قبضہ جماتے ہیں۔ کافی کا آرڈر دینے کے بعد وہ بحثا بحثی شروع کر دیتے ہیں۔

"ادیب کہیں کا۔ اس کے سارے پلاٹ چرائے ہوئے ہیں۔"

"پلاٹ چرانا کوئی عیب نہیں۔"

"ہاں کیونکہ تم نے خود چرائے ہیں۔"

"یہ بھی کیا منحصر ہے۔ خود شیکسپیئر نے پلاٹ چرائے ہیں۔"

"مگر ایسے نہیں، جس طرح تم چرا لیتے ہو۔"

"تم نے اپناش چندر کا ناول پڑھا ہے۔"

"بکواس ہے۔"

"اس سے میرا ناول "تعمیر" بدرجہا بہتر ہوگا۔"
"تعمیر! عجیب نام ہے۔"
"میں بھی ایک ناول لکھ رہا ہوں۔"
"کس کے متعلق۔"
"قیدیوں کے متعلق۔"
"مگر قیدیوں کی زندگی کے متعلق تمہیں کوئی تجربہ نہیں۔"
"اسی لئے تو میں چھ ماہ کے لئے جیل جارہا ہوں۔"
"فرانس کا ایک ادیب بارہ سال پاگل خانے رہا۔ کیونکہ وہ پاگلوں کے متعلق ایک ڈرامہ لکھنا چاہتا تھا۔"
"سنا ہے ابناش چندر کو ناول لکھنے کا صرف چالیس روپیہ معاوضہ ملا۔"
"اور کیا جاگیر مل جاتی!"
"لکھا ہی کیا ہے اس نے۔"
"قاضی علیم دین تو کہہ رہے تھے کہ نہایت اچھا ناول ہے۔"
"دوست جو ٹھہرے اُن کے۔"
"قاضی اچھا آدمی ہے۔"
"نرا چند ہے۔"
"اس لئے کہ تمہارے افسانے اپنے رسالہ میں نہیں چھاپتا۔"
"اسے تو اتنا معلوم نہیں کہ افسانے اور ناول میں کیا فرق ہے۔"
"وہ سمجھتا ہے صرف ابناش چندر افسانے لکھ سکتا ہے۔"
"مگر تم کیوں جلتے ہو۔"
"مجھے جلنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ابناش چندر سے بہتر لکھ سکتا ہوں۔"
"پھر تمہیں ابناش چندر سے کیوں حسد ہے۔"
"مجھے کسی سے حسد نہیں۔"

وہ باہر چلے جاتے ہیں۔ میں کافی پینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اب اس کا ذائقہ کونین سے بھی زیادہ تلخ ہے۔ کافی ہاؤس کی فضا میں میرا سانس گھٹنے لگتا ہے، میں کافی ہاؤس سے بھاگ کر پھر جھوٹ، مکر اور خود فریبی کی دنیا میں سانس لینا چاہتا ہوں۔

★

★ ایک صاحب اتنے کنجوس تھے، اتنے کنجوس تھے کہ شادی کے بعد ہنی مون منانے کے لئے تنہا چلے گئے۔ ★

کنھیا لال کپور

میں ریڈیو کیلئے کس طرح لکھتا ہوں

میں ریڈیو کیلئے کس طرح لکھتا ہوں ؟ اس سوال کا صاف اور سیدھا جواب تو یہ ہے کہ جس طرح آپ لکھتے ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ آپ ریڈیو کے لئے نہ لکھتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے ہی بتانا پڑے گا۔ تو سنیئے۔ میں ریڈیو کے لئے بالکل اسی طرح ہی لکھتا ہوں جس طرح مجھے ریڈیو والے لکھنے کے لئے کہتے ہیں۔ نکتہ اس انکشاف میں یہ ہے کہ جب تک ریڈیو والے آپ سے لکھنے کے لئے نہ کہیں آپ ریڈیو کے لئے لکھ ہی نہیں سکتے۔ اگر آپ ترقی پسند ادیب ہیں چین یا روس کی سیاحت کر چکے ہیں یا چینی اور روسی سفارت خانے میں ملازم ہیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ ریڈیو کے لئے کبھی نہیں لکھ سکتے۔ یعنی آپ کی ادبی حیثیت ریڈیو والوں کی نگاہ میں صفر تسلیم کی جائے گی۔ ہاں اگر اس قسم کی غزلیں کہتے ہیں جن میں بتِ کم سن اور رقیبِ روسیاہ کا ذکر رہتا ہے یا ایسے افسانے لکھتے ہیں جو محبت کی واردات سے شروع ہو کر خودکشی کی واردات پر ختم ہوتے ہیں تو بلاشبہ آپ سے ریڈیو کے لئے لکھنے کی درخواست کی جائے گی۔

ایک اور بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ ریڈیو اسٹیشن تک آپ کی رسائی اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب آپ ریڈیو اسٹیشن کے افسروں سے رسم و راہ پیدا کر لیں۔ یہ کوئی اتنی مشکل بات نہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ اپنے احباب کو ریڈیو کے محکمے میں ملازمت کرنے پر آمادہ کریں۔ اگر آپ کا ایک دوست بھی اس محکمے میں ملازم ہو گیا تو جب تک اس کی ملازمت سلامت ہے آپ ریڈیو کیلئے لکھتے رہیں گے۔ بالفرض آپ کا کوئی دوست ریڈیو کی ملازمت کرنے پر رضامند نہیں ہوتا تو پھر بہرحال آپ کو ان لوگوں کی خدمت میں باریابی حاصل کرنا ہوگی جو ریڈیو اسٹیشن پر خدایا ناخدا کی حیثیت سے قابض ہیں۔ یعنی ڈائرکٹر۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر۔ پروگرام ایگزیکیٹو وغیرہ۔ ڈائرکٹر سے ملاقات کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ کیونکہ خدا کا یہ برگزیدہ انسان ملاقاتیوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ اس کے پاس ملاقات کے لئے وقت نہیں ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو دو چار ضروری کاغذات پر دستخط کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر عموماً دین و دنیا سے اس قدر بیزار رہتا ہے کہ اس سے ملاقات کرنے کے بعد ملاقاتی کچھ لکھنے کی بجائے خودکشی کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہے۔ اس لئے اگر آپ پروگرام ایگزیکیٹو سے ملنے کی کوشش کریں تو بہتر ہوگا۔ پہلے ٹیلیفون پر اس سے ملاقات کا مناسب دن اور وقت دریافت کریں اور پھر دو چار انگریزی یا فرانسیسی ناول بغل میں داب کر اس کے دفتر میں جا دھمکیں۔ گفتگو اس قسم کی ہونی چاہیئے "آداب عرض ہے۔"

"مدت سے خواہش تھی کہ آپ سے شرفِ نیاز حاصل کیا جائے۔"

"آپ تو اردو، ہندی، بنگالی اور گجراتی کے مانے ہوئے ادیب ہیں۔"

"وہ ناول جو آپ پچھلے پندرہ برس سے لکھ رہے تھے، اس کا پہلا باب آپ نے لکھ لیا یا ابھی اس کا پلان بنا رہے ہیں؟"

"جب سے آپ یہاں تشریف لائے ہیں پروگرام یقیناً بہتر ہو گئے ہیں۔ اب تو کبھی کبھی تقریریں سننے کو بھی جی چاہنے لگا ہے۔"

"یہ الماس بیگم تو آپ کی دریافت معلوم ہوتی ہیں۔ آپ کے آنے سے پہلے اسے کوئی منہ نہیں لگاتا تھا۔"

"آپ نے یہ فرانسیسی ناول پڑھا۔ اگر آپ اسے گجراتی میں منتقل کریں تو کیسا رہے گا۔"

ان باتوں کے جواب میں اگر پروگرام ایگزیکیٹیو سمجھدار ہے تو برابر مسکراتا رہے گا۔ اگر نہیں ہے تو شیخی بگھارنے لگے گا۔ آپ اس کی باتوں سے ذرہ بھر بھی مرعوب نہ ہوتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے جائیے۔ اگر وہ کہے کہ فرصت ہی کتنی ملتی ہے کہ کوئی اپنے ناول کا پہلا باب مکمل کر سکے۔ تو آپ کو فوراً کہنا چاہیئے۔ بجا ارشاد ہوا۔ یقیناً اگر آپ کسی اور محکمے میں ہوتے تو اس وقت تک درجنوں ناولوں کے مصنف ہوتے۔ اگر وہ کسی جرمن یا جاپانی مصنف کا حوالہ دے جس کا تازہ ناول وہ پڑھ رہا ہے تو آپ دس بارہ مر ، ڈچ یا چینی مصنفوں کے نام گنوا دیجئے جن کے تمام ناول آپ پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس ملاقات کا آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ آئندہ آپ پروگرام ایگزیکیٹو کی نگاہ میں رہیں گے اور وہ جب کبھی نیا سلسلہ (Series) شروع کرے گا۔ ایک آدھ تقریر آپ کو مل جائے گی۔

دوسری بات جو آپ کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے یہ ہے کہ ریڈیو والے ہمیشہ تقاریر کے 'سلسلے' تجویز کرتے ہیں۔ مثلاً سلسلہ ہوگا "کیسے بیتی ہے" اور اس میں تقاریر کے عنوانات ہوں گے۔

۱۔ کھوائی الخلق۔

۲۔ زنگ خوردہ بند درق۔

۳۔ بات سے بات۔

۴۔ پنڈت جی کی پہلی۔

۵۔ بدمزاج بیوی کی زبان۔

اب آپ اس پر نہ جائیے کہ یہ 'سلسلہ' کتنا مضحکہ خیز ہے یا اس میں تقاریر کے عنوانات کتنے عجیب وغریب ہیں بلکہ 'ہر کس بقدر ہمت اوست' کے مصداق اسے نظر انداز کر دیجئے۔ اور چپکے سے تقریر لکھ ڈالیے۔ اس ضمن میں ایک انکشاف آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ وہ یہ کہ قریب قریب ہر ریڈیو اسٹیشن ایک ہی قسم کے سلسلے نشر کرتا ہے۔ اس لئے آپ غور سے ہر اسٹیشن کا پروگرام سنئے۔ کوئی نہ کوئی وہی تقریر نشر کر رہا ہوگا کہ جو آپ کو کرنا ہے۔ اس لئے آپ وہ سلسلے کی ساری تقریر نوٹ کر لیجئے۔ اور پھر تاریخ مقررہ پر نشر فرما دیجئے۔

بعض اوقات تقاریر کے نئے سلسلے پر کسی مشہور شاعر کا کوئی چلتا ہوا مصرع چسپاں کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر "یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ"

۱۔ ہم خاکعب ہوتے۔

۲۔ ہم چڑی مار ہوتے ۔

۳۔ ہم تھانیدار ہوتے ۔

۴۔ ہم سمجھدار ہوتے ۔

یا ۔ تنگدستی اگر نہ ہو غالبؔ

۱۔ بے حیائی ہزار نعمت ہے ۔

۲۔ روسیاہی ہزار نعمت ہے ۔

۳۔ بد دماغی ہزار نعمت ہے ۔

جب صورتحال یہ ہو تو آپ غالبؔ کی روح سے معذرت کئے بغیر تقریر کا آغاز کر دیں۔ کیونکہ اگر آپ یہ سوچنے لگے کہ غالبؔ مرحوم پر جنت میں کیا گزرے گی تو آپ تقریر نہیں کر سکیں گے ۔

تقاریر کے علاوہ ریڈیو والے آپ سے فیچر اور ڈرامے بھی لکھواتے ہیں۔ فیچر سینڈ یو کی خاص ایجاد ہے۔ اس کو عام طور پر وہ لوگ لکھتے ہیں جو فیچر سے بہتر چیز لکھنے کے اہل نہیں۔ چونکہ معاوضہ کافی ملتا ہے اس لئے فیچر نویسی ہرگز خسارے کا سودا نہیں۔ فیچر موسموں، شہروں، محلوں اور گلیوں پر لکھے جاتے ہیں۔ کسی خاص موسم پر فیچر لکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس موسم سے متعلق جتنے گیت۔ نظمیں یا غزلیں ملیں انھیں اکٹھا کر لیجئے اور پھر پانچ دس سطور خود لکھئے اور ایک آدھ سطر کے بعد دو تین بلکہ چار گیت نقل کرتے جائیے۔ مثلاً آپ کو "بسنت" پر فیچر لکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ آپ کو مندرجہ ذیل طبع زاد فقرے لکھنا ہوں گے۔

"بسنت! آہاہا بسنت! یعنی واہ واہ۔ بسنت کا موسم ہے۔ جدھر دیکھو ادھر بسنت۔ دائیں بائیں آگے پیچھے بسنت ساتویں آسمان کے علاوہ ہر جگہ بسنت۔ ریڈیو اسٹیشن پر بہار ہی بہار نظر آتی ہے۔ ڈائرکٹر صاحب کو شاید یرقان ہو گیا ہے اسی لئے انھیں ہر چیز پیلی پیلی نظر آرہی ہے۔ وہ دیکھئے۔ ارے وہ بسنتی کپڑوں میں ملبوس خوبصورت لڑکیاں بسنت کے گیت گا رہی ہیں۔ اور ادھر بدصورت لڑکے ان کا منہ چڑا رہے ہیں۔ آئیے یہاں سے کہیں دور بھاگ چلیں ورنہ ہمیں یہ گیت سننا پڑیں گے"۔

اگر آپ کو کسی شہر پر فیچر لکھنا مقصود ہے تو یوں لکھئے ۔

"دلی! ہندوستان کا دل ہے۔ ہندوستان ایشیا کا دل ہے ۔ اور ایشیا خدا جانے کس کا دل ہے۔ بہرحال کسی کا ہوگا. دلی کئی بار اُجڑی اور کئی بار بسی اور اب اُجڑنے کا نام نہیں لیتی۔ دلی بہرحال دلی ہے۔ یعنی لکھنؤ یا ٹمبکٹو نہیں۔ دلی میں بڑے بڑے باکمال لوگ رہتے ہیں۔ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ سبھی باکمال۔ دلی کی گلیوں میں خاص کشش ہے کیونکہ یہاں چار مسالے کی چاٹ بکتی ہے۔ اسی لئے تو انھیں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ جائے بھی تو کوئی کہاں جائے۔ چاروں طرف دلی ہی دلی ہے۔ یہاں کا ہر فاقہ مست اپنے کو میرؔ یا غالبؔ سمجھتا ہے۔ اللہ اللہ خود فریبی کی بھی حد ہوتی ہے۔ دلی شہر نہیں بھول بھلیاں ہے۔ نئی دلی میں راستہ بھول جاؤ تو پرانی دلی میں جا پہنچو۔ اور پرانی دلی میں راستے سے بھٹک جاؤ تو نئی دلی پہنچ جاؤ۔ دلی کی اہمیت کی حد تک ہے جب تک چاندنی چوک وجود میں نہیں آتا وغیرہ وغیرہ ۔

اب رہے ریڈیو ڈرامے! ریڈیو ڈرامہ لکھنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ کبھی طبع زاد ڈرامہ لکھنے کی غلطی نہ کی جائے

اول تو پلاٹ ہی مشکل سے ملتا ہے۔ پلاٹ مل جائے تو مناسب کلائمکس نہیں سوجھتا۔ کلائمکس بھی سوجھ جائے تو اختتام کا مسئلہ اچھی خاصی الجھن پیدا کر دیتا ہے۔ ان مشکلوں سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ ہمیشہ کسی انگریزی انتخاب کی طرف رجوع کیجئے جس کا نام ہو "۱۹۵۵ء کے بہترین ناٹک"۔ "انیسویں صدی کے مشہور ایک ایکٹ کے ڈرامے"۔ اس کتاب سے پلاٹ۔ کردار۔ زبان اڑا کر انھیں ہندوستانیت کا رنگ دے دیجئے۔ اگر اصل ڈرامے کا نام ہے "کچے انگور" تو اب اس کا نام رکھ دیجئے "میٹھا آلو بخارا"۔ لیجئے ڈرامہ تیار ہے۔ معمولی ترمیمیں تو ہوں گی ہی۔ مثلاً ہیرو کا نام "ولیم" کی بجائے "ولی علیم" ہوگا اور ہیروئن للی کی بجائے لیلیٰ کے نام سے پکاری جائے گی۔ اگر آپ ایسا ڈرامہ لکھ دیں گے تو نہ صرف ریڈیو والے آپ کی ذہانت کی داد دیں گے بلکہ مبلغ تیس روپے کا چیک بھی آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔

ایک آخری بات اور یاد رکھئے۔ جب کبھی آپ ریڈیو پر تقریر کریں یا آپ کا لکھا ہوا کوئی فیچر یا ڈرامہ نشر کیا جائے اس سے اگلے دن آپ اپنے احباب کو لکھیں کہ وہ آپ کی تقریر، ڈرامے یا فیچر کے بارے میں تعریفی خطوط ریڈیو اسٹیشن ڈائرکٹر کے نام بھجوائیں۔ اگر ہو سکے تو چھ سات خطوط آپ خود لکھ کر فرضی ناموں کے تحت ڈائرکٹر صاحب کو بھجوا دیں۔ مضمون یہ ہونا چاہیئے۔

محترمی،
بڑی مدت کے بعد آپ کے اسٹیشن سے ایک اچھا فیچر سننے کو ملا۔ میری مراد ہے "میر معلوم ہے قلندر تھا" سے ہے۔ ملنگ شسانوی صاحب نے میر کی قلندری کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے وہ بعینہٖ میر کے الفاظ ہی ہیں۔ امید ہے آپ یہی فیچر دوبارہ بلکہ سہ بارہ سنوائیں گے ہاں اگر مناسب سمجھیں تو ملنگ صاحب سے کہیں کہ ایک فیچر "پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں" پر آپ کو لکھ کر دیں۔

تو لیجئے۔ یہ ہے ریڈیو کے لئے لکھنے کی تکنیک۔ اللہ توفیق دے تو آپ بھی ریڈیو کے لئے لکھا کیجئے۔ دلچسپ شغل ہے اور پھر جیسا کہ ملنگ صاحب نے کہا ہے۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔!

(نرم گرم)

✣ ✣ ✣ ✣ ✣

★

"کسی مفکر کا قول ہے کہ ہندوستان کو مزاح کے بجائے طنز کی زیادہ ضرورت ہے، حسنِ اتفاق دیکھئے کہ وہ حسین مفکر میں ہی ہوں۔ کیونکہ یہ قول میرا ہی ہے۔
طنز نگاری ادب کی مشکل ترین صنف ہے۔ نئے طنز نگاروں کی حوصلہ شکنی مطلوب نہیں۔ اپنی بڑائی یا یوں کہیئے حوصلہ افزائی البتہ مقصود ہے۔ اچھی طنز، اچھے شعر کی طرح کمیاب بھی ہے اور نایاب بھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کامیاب طنز نگار اور شاعر انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔"

(پیش لفظ: "شیشہ و تیشہ")

کسانوں کو قرض کی ادائی میں سہولتیں

حکومت آندھرا پردیش نے کاشتکاروں کی مشکلات کو کم کرنے کے لئے کوآپریٹیو اداروں سے حاصل کردہ قرضوں کی اقساط جو ۳۰ جون ۱۹۸۰ء کو واجب الادا ہو گئی ہوں ادائی کی مدت میں توسیع کے ذریعہ آسانی پیدا کرنے کے احکامات جاری کئے ہیں۔

قرض کی اصل رقم :

معمولی قرض :- اس قرض کی ادائی کے لئے مدت کو ۳ سال تک بڑھایا گیا ہے۔

اوسط مدتی قرض :- جملہ قرضے بشمول معمولی قرض کی ادائی کے لئے ۵ سال کی مدت دی گئی ہے۔

(تبدیلی) اقساط میں اقساط کی ادائی والا اوسط مدتی قرض :- تمام قرضے بشمول معمولی قرض و اوسط مدتی قرض کی ادائی کے لئے سات سال کی مدت دی گئی ہے۔

سود :- ایک سال کے واجب الادا سود کی ادائی کے لئے مزید ایک سال کی مدت دی گئی ہے۔
دو سال کے واجب الادا سود کی ادائی کے لئے دو سال سے زیادہ کی مدت دی گئی ہے۔
تین ۳ سال کے واجب الادا سود کی ادائی کے لئے ۳ سال سے زیادہ کی مدت دی گئی ہے۔

طویل مدتی قرض :- طویل مدتی قرض کے ضمن میں واجب الادا اقساط کی تعداد کی حد تک ادائی کے لئے سہولت دی جائے گی جو تین سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ تفصیلات درج ذیل ہیں۔

اگر ایک قسط واجب الادا ہے تو ادائی کے لئے مزید ایک سال کی مدت دی جائے گی۔
اگر واجب الادا اقساط ایک سے زیادہ اور تین سے کم ہوں تو ادائی کے لئے مزید ۲ سال کی مدت دی جائے گی۔
اور اگر واجب الادا اقساط تین سے زیادہ ہوں تو ادائی کے لئے مزید ۳ سال کی مدت دی جائے گی۔

سود پر سود نہیں عائد کیا جائے گا : کوآپریٹیو اداروں کو ہدایت دی گئی ہے کہ قرض کی رقم پر سود مرکب عائد نہ کریں۔

چھوٹے کسانوں کی جانب سے واجب الادا سود کی رقم، قرض کی اصل رقم سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔
کوآپریٹیو بنکوں کے ہاں مکفول زمینات اگر بنک کی ملکیت ہی میں ہوں تو قرض حاصل کرنے والے کو قرض کی ادائی کے لئے دی گئی مذکورہ بالا رعایتوں سے استفادہ کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ بشرطیکہ تمام بقایاجات ۳۱ ر دسمبر ۱۹۸۰ء سے قبل ادا کر دیئے جائیں۔ کاشتکاروں کو زمین واپس کر دی جائے گی۔

چھوٹے کسانوں کو فائدہ :- حکومت نے مزید ہدایت دی ہے کہ ایسے کسانوں کو جو (۵) ایکر یا اس سے کم تری یا (۱۰) ایکر خشکی یا اس سے کم زمین کے مالک ہوں جو چھوٹے کسانوں کی تعریف میں آتے ہیں مذکورہ بالا پیکر رعایتوں سے استفادہ کرنے کا موقع دیا جائے۔

DIPR 43365/80 dt. 17.12.1980.

انتخاب کالم — "میں دیکھتا چلا گیا"

(روزنامہ ہند سماچار)

معیاری ادبی پرچہ

ہمارے ایک جگری دوست نے ایک معیاری ادبی پرچہ نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جہاں ہم اس کی ہمت کی داد دیتے ہیں، وہاں اُسے چند مشورے دینے کی جسارت بھی کرتے ہیں۔

ہمارا پہلا مشورہ ہے اگر وہ سرمایہ جو آپ رسالہ نکالنے پر صرف کرنا چاہتے ہیں، آپ کا اپنا ہے۔ تو خدا کے لیے معیاری ادبی رسالہ مت نکالیے۔ البتہ یہ آپ کے دشمن کا ہے تو ضرور نکالیے تاکہ اس بدبخت کا جلد از جلد دیوالیہ پٹ جائے۔

یاد رکھیے ان دنوں ادبی رسالہ کوئی نہیں خریدتا۔ آج کل تو یہ عالم ہے نوجوان منشی پریم چند کے نام تک سے واقف نہیں۔ اگر کسی مجلس میں اس کا ذکر کیا جائے تو پوچھتے ہیں۔ کیوں جی! منشی پریم چند نے کون کون سے جاسوسی ناول لکھے ہیں؟ سخن فہمی کا یہ حال ہے شعر سُننے کے بعد کہتے ہیں۔ سبحان اللہ! کتنا بے نظیر شعر ہے۔ اب ذرا اس کا مطلب بھی سمجھا دیجیے۔ اور انہیں اگر مطلب نہ سمجھایا جائے تو وہ اس شعر کی ایسی تشریح کرتے ہیں کہ شاعر سُنے تو دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جائے۔ چنانچہ اگر شاعر نے کہا ہے:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے

تو وہ سمجھتے ہیں۔ شاعر کہہ رہا ہے وہ مجھے گدھا سمجھ کر چپ تھا۔ لیکن میری جو شامت آئی ....

رسالہ کے نصف صفحے فلمی خبروں۔ سکینڈلوں اور لطیفوں سے پُر کیا کیجیے۔ باقی صفحوں پر ناقابل علاج بیماریوں کے نسخے درج کیے جاسکتے ہیں۔ قارئین کے راشی پھل پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ یا ایکٹروں اور ایکٹریسوں سے متعلق سنسنی خیز کہانیاں ایجاد کی جاسکتی ہیں۔

ایک کالم فلمی سوال وجواب کا ضرور ہونا چاہیے۔ سوالوں کے دندان شکن قسم کے جوابات دیجیے تاکہ سوال کرنے والے جبرت یا کان پکڑیں۔ مثال کے طور پر:

سوال: اگر میں مس رباب سے شادی کرنے کی درخواست کردوں تو کیا وہ اسے منظور کرے گی؟

جواب: کیوں نہیں صاحب۔ اور وہ انتظار کس بات کا کر رہی ہے۔

سوال: مجھے مس لدھیانوی کی صرف ناک پسند ہے آپ کا میری پسند کے متعلق کیا خیال ہے؟
جواب: نہایت افسوس ناک ہے آپ کی پسند۔
سوال: جب سے میں نے ایک فلم میں مس یاسمین کو دیکھا ہے، مجھے اپنی بیوی اچھی نہیں لگتی بتائیے۔ میں کیا کروں۔؟
جواب: آپ کو ہی کیا کسی شوہر کو بھی یاسمین کو دیکھ کر اپنی بیوی اچھی نہیں لگتی۔ باقی شوہروں کی طرح آپ بھی صبر کریں۔
سوال: میں نے مس الماس کو چار خط لکھے ہیں، اس نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟
جواب: تھانے میں رپٹ لکھانی چاہیئے۔
سوال: میری بیوی کی رائے میں میری شکل ایک مشہور "ولن" سے ملتی ہے۔ بتائیے میری بیوی کو کیا کرنا چاہیئے؟
جواب: آپ سے فوراً طلاق لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔
سوال: میں ایکٹر بننا چاہتا ہوں۔ کیا میری یہ خواہش کبھی پوری ہوگی؟
جواب: قبلہ! بقول شیکسپیئر دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹر ہیں۔ آپ کی ایکٹر بننے کی خواہش تو اسی دن پوری ہو گئی تھی جب آپ پیدا ہوئے تھے۔

بیماریوں، خاص کر ناقابل علاج بیماریوں کے لیے عجیب و غریب نسخے کسی نیم حکیم سے لکھا کر شائع کیجیے۔ مثلاً دمہ کو جڑ سے اکھاڑنے کا نسخہ کچھ اس طرح ہونا چاہیئے: پانچ کلو دھتورے کو دس کلو پانی میں ابالیے۔ جب سارا پانی بھاپ بن کر اڑ جائے۔ تو وہ برتن جس میں دھتورا ابالا گیا تھا دمہ کے مریض کو سونگھنے کے لیے دیجیئے۔ اسے سونگھتے ہی وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ اور جب تک وہ بے ہوش رہے گا، اسے دمہ کا دورہ نہیں پڑے گا۔

پھلبہری دور کرنے کا نسخہ: پھلبہری کے جہاں داغ ہوں وہاں گندھک کا تیزاب لگائیے اگر تیزاب لگانے کے بعد مریض زندہ رہا تو انشاءاللہ پھلبہری نہیں رہے گی۔

دائمی نزلے کا علاج: ادرک اور پیاز کا رس دونوں کانوں میں ڈالیے۔ نزلہ نہیں رہے گا، لیکن کان میں درد ہونے لگے گا۔ کسی حکیم سے پوچھ کر کان کا علاج کیجیے اور نزلے کی طرح اس سے بھی نجات حاصل کیجیے۔

"دانشی کا پھل" کا کالم بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ کسی فرضی راج جیوتشی کی خدمات حاصل کیجیے۔ وہ ہر ماہ اس قسم کے انکشافات کرے تو کالم بہت مقبول ہوگا۔

سنیچر یعنی آپ کا افسر آپ سے ناخوش ہے منگل یعنی آپ کا سپرنٹنڈنٹ بھی ناراض معلوم ہوتا ہے۔ راہو اور کیتو یعنی دفتر میں کام کرنے والے آپ کے دونوں ساتھی ہر کام میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں، سنیچر کی خدمت کیجیے یعنی اس اتوار کو اسے کھانے پر مدعو کیجیے۔ منگل کو منائیے یعنی اسے کوئی تحفہ بھجوائیے۔ راہو اور کیتو کو ہر تیسرے دن چائے پلا کر خوش کر لیجیے۔ آپ کو ہر کام میں کامیابی حاصل ہوگی۔ "برہسپت یعنی آپ کا محبوب آپ سے خوش ہے لیکن چندرماں یعنی آپ کی بیوی آپ سے ناراض ہے۔ بدھ اور شکر آپ کے دونوں بیٹے عنقریب آپ کو دھوکہ دیں گے۔ کیونکہ وہ گھر سے روپیہ چرا کر بھاگ جائیں گے۔ چندرماں کو خوش کرنے کے لیے اسے ایک نئی ساڑھی خرید دیجیے۔ اور راہو اور کیتو کو ابھی سے پولیس کے حوالے کیجیے۔۔۔ ان کے علاوہ اگر ہر ماہ دو چار فحش افسانے اور گھٹیا قسم کی جذباتی غزلیں شائع کر سکیں تو رسالہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور قارئین اس کے پہلے شمارے کا استقبال کرتے ہوئے کہیں گے۔ جس۔۔۔ کے
[illegible]

بالغوں کے لئے تیسری کتاب

(۲)

جانوروں کا بیان

بلّی ۔ !

بلّی چوہے سے بڑی اور کتّے سے چھوٹی ہوتی ہے
لیکن ہر چیز جو چوہے سے بڑی اور کتّے سے چھوٹی ہو بلّی نہیں ہوتی
مثال کے طور پر خرگوش کو کسی حالت میں بھی بلّی نہیں کہا جا سکتا
بلّی نو سو چوہے کھانے کے بعد حج کو جایا کرتی ہے مگر مکے سے آنے کے بعد بھی بلّی ہی رہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے میر نے یہ شعر کسی بلّے کے متعلق کہا تھا ۔

مکّے گیا، مدینے گیا، کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا

بلّی کو خواب میں صرف ایک چیز نظر آیا کرتی ہے
یعنی چھیچھڑے۔ شیر سے مشابہ ہونے کی وجہ سے بلّی شیر کی خالہ کہلاتی ہے۔ مگر بھانجے نے اس رشتہ کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ بلّی کسی کے سامنے سے ہو کر گزر جائے تو یہ لڑائی جھگڑے کا شگون ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آج کل بنگلہ دیش میں بلّی ہر لیڈر کے سامنے سے ہو کر گزر رہی ہے ۔

کتّا ۔!

عجیب و غریب جانور ہے۔ اسے راج بٹھایا جائے تو چکّی چاٹنے آتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسے گھی ہضم نہیں ہوتا۔ اگر اس کی دم کو بارہ برس نلکی میں رکھا جائے پھر بھی وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہتی ہے۔ اس لیے اسے نلکی میں رکھنے کی بجائے اس پر استری کر لینا چاہیے۔ کتّے کی جب موت آتی ہے تو مسجد کی طرف بھاگتا ہے۔ لیکن چونکہ آج کل لوگ مسجدوں میں نہیں جاتے، اس لیے صاف بچ جاتا ہے۔ اس کی مادہ کو کتیا کہتے ہیں۔ اُس عورت کو بھی کتیا کہتے ہیں جو ہر نوجوان کے عشق کا دم بھرتی ہے۔

کتّا آدمی سے زیادہ وفادار ہوتا ہے۔ اسی لیے ایک سمجھدار شخص آدمی کی بہ نسبت کتّے کی زیادہ قدر کرتا ہے۔ کتّے کا واحد کام بھونکنا ہوتا ہے۔ البتہ جب وہ بھونک بھونک کر تھک جاتا ہے تو لوگوں کو کاٹنے بھی لگتا ہے ۔

چُوہا ۔!

خاکی رنگ کا ایک بے وقوف جانور ہے۔ زمین میں بل بنا کر رہتا ہے۔ بل میں سانپ گھس کر اسے چیٹ کر جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جان کے علاوہ گھر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ چوہے دان میں گوشت کے ٹکڑے کی خوشبو سونگھ کر بے قرار ہو جاتا ہے اور بن آئی موت مرنے کے لیے اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کی بے وقوفی کا ایک اور نمایاں ثبوت یہ ہے کہ اگر اس کے ہاتھ ہلدی کی گرہ لگے تو پنساری بن بیٹھتا ہے۔ کچھ چوہے اتنے احمق ہوتے ہیں کہ خود تو بل میں نہیں سماتے لیکن دُم سے چھاج باندھ لیتے ہیں۔ چوہے کے دانت بڑے تیز ہوتے ہیں جن کا یہ ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ کتابوں اور کپڑوں کو کتر ڈالتا ہے۔ آج کل اتنے چوہے گھروں میں نہیں رہتے جتنے کھیتوں میں رہتے ہیں۔ آدمی کے بعد چوہا اناج کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

گدھا ۔!

ایک اور بے وقوف جانور ہے۔ یہ اتنا بے خبر ہوتا ہے کہ زعفران کا بھاؤ تک نہیں جانتا۔ ایک لحاظ سے بڑا خوش قسمت بھی ہے۔ کیونکہ ضرورت پڑنے پر سب اسے باپ بنا لیتے ہیں۔ گدھا ہر جگہ پایا جاتا ہے یہاں تک کہ

ابل میں بھی، بلکہ وہاں تو بڑے قابل گدھے پائے جاتے
ہیں۔ کابل کے علاوہ تقریباً ہر دفتر میں اس سے ملاقات
کی جا سکتی ہے۔ وہاں وہ ڈھینچوں ڈھینچوں نہیں کرتا لیکن
باتیں اور حرکتیں ایسی کرتا ہے کہ اس کو فوراً پہچان لیا جاتا
ہے۔ گدھا کمہاروں اور دھوبیوں کے لیے بڑے کام
کا جانور ہے۔

گیدڑ — !

ایک جانور جسے دور سے دیکھا جائے تو کتا نظر
آتا ہے لیکن نزدیک سے دیکھے جانے پر کتے کا چچا زاد
بھائی لگتا ہے۔ بڑا بزدل جانور ہوتا ہے۔ حملہ کرنے کی بجائے
حیلے سے کام لیتا ہے۔ اس لیے اکثر دوسروں کا شکار
کرنے کی بجائے فوراً ان کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب اس کی
شامت آتی ہے تو شہر کا رُخ کرتا ہے اور اچھی طرح پٹنے کے
بعد پھر جنگل کی راہ لیتا ہے۔ اسے رات کو نیند نہیں آتی
اس لیے دوسرے گیدڑوں کے ساتھ مل کر چلاّتا ہے تاکہ
لوگوں کی نیند حرام کر سکے۔

لومڑی — !

ایک جانور جو قریباً بلی کے برابر ہوتا ہے، لیکن جو
بلی سے اتنا ہی مختلف ہوتا ہے جتنا بلی اس سے ہوتی ہے
اس کی عیاری اور مکاری ضرب المثل ہے۔ یہ دوسرے
جانوروں کو بہکانے میں مشاق ہوتی ہے حتیٰ کہ کئی بار ہاتھی
اور شیر کو بھی اُلّو بنا کر چھوڑتی ہے۔ میٹھی میٹھی باتیں کرنا اور
طرح طرح کے سبز باغ دکھانا اس کا شیوہ ہوتا ہے۔ کسی
شاعر نے اس کے متعلق کہا ہے ؎

وہی لہجہ وہی تیور وہی تبسم ہے جھوٹے وعدوں کی
ذرا بھی شک نہیں ہوتا کہ یہ جھوٹی تسلی ہے

شیر — !

کبھی جنگل کا راجہ کہلاتا تھا آج کل صرف سرکسوں
اور چڑیا گھروں میں دیکھا جاتا ہے۔ تیرنے میں اسے کمال
حاصل ہے۔ تبھی تو استاد ذوق کو کہنا پڑا ؎

شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں

اسے مُنہ دھونے سے بہت نفرت ہے۔ اس لیے عموماً نہ صرف
ناشتہ بلکہ لنچ اور ڈنر بھی منہ دھوئے بغیر کرتا ہے۔ عموماً اس
کا ایک بچہ ہوتا ہے کیونکہ یہ خاندانی منصوبہ بندی میں یقین
رکھتا ہے۔ اس کا بچہ بھی شیر ہی کہلاتا ہے۔ ملاحظہ ہو اقبال
کا مصرع ؎

شیروں کے پسر شیر ہی ہوتے ہیں جہاں میں

انسان بکا اور یہ انسان کا شکار کرتا ہے جو شکاری
اس کا شکار ہونے سے بچ جاتے ہیں وہ شیر کو ایک نہایت
شریف جانور سمجھتے ہیں لیکن جنہیں یہ ایک آدھ ہاتھ دکھاتا
ہے وہ اسے دور سے ہی سلام کرنے میں خیریت سمجھتے ہیں۔

ہاتھی — !

وہ واحد جانور ہے جس کا پاؤں اتنا بڑا ہوتا ہے
کہ اس میں سب کے پاؤں آ جاتے ہیں۔ ایک اور لحاظ سے
یہ بڑا خوش نصیب واقع ہوا ہے۔ اس کے پاس دانتوں کے
دو سیٹ ہوتے ہیں۔ ایک کھانے کے لیے دوسرا دکھانے
کے لیے۔ ہاتھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بھورے اور سفید۔
سفید ہاتھی پالنے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ جو اسے پالتا
ہے اُس کا دیوالہ پٹ جاتا ہے ایک زمانہ تھا کہ ہاتھی امیروں
کے دروازوں پر جھوما کرتے تھے۔ آج کل چونکہ امیر موٹر کار
کو ہاتھی پر ترجیح دیتے ہیں، اس لیے ہاتھی جنگلوں میں
بیکار گھوما کرتے ہیں۔ ہاتھ اور ہاتھی میں زمین آسمان کا فرق
ہے۔ اس لیے جب کبھی کوئی کاتب ہاتھ کی بجائے ہاتھی لکھ
دیتا ہے تو نہایت مضحکہ خیز صورت پیدا ہو جاتی ہے۔
مثال کے طور پر ؎ عشق بتاں میں دستِ دعا کس طرح اٹھائیں
پتھر تلے ہے ہاتھی ہمارا دبا ہوا ۵

بالغوں کیلیے چھٹی کتاب

○

تمہید

حساب کے لیے کس خاص قسم کے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ آپ کے پاس نہیں تو آپ خواہ مخواہ حساب کے جھنجھٹ میں نہ پڑیں۔ کوئی منشی یا منیم رکھ لیں جس کی مالی حالت آپ سے بدتر لیکن دماغ آپ سے بہتر ہو۔ ویسے حساب کوئی مشکل چیز نہیں بہ شرطیکہ آدمی سوال حل کرتے وقت ہوش و حواس قائم رکھے اور انہیں روایتی طریقوں سے حل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ بالغوں کی رہنمائی کے لیے کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

نفع نقصان کا سوال

ایک شخص نے ایک گھوڑا پچھتر روپے میں خریدا اور ایک ماہ کے بعد اُسے پچاس روپے میں فروخت کر دیا۔ بتائیے اسے کتنے فیصد نقصان ہوا۔

جواب: آج کل پچھتر روپے میں گھوڑا تو کیا گدھا بھی نہیں آتا۔ ظاہر ہے جو گھوڑا پچھتر روپے میں خریدا گیا وہ گھوڑا نہیں مریل ٹٹو ہوگا۔ خریدنے والے نے ایک ماہ تک اس سے کام لینے کی کوشش کی۔ شاید وہ اس پر سوار ہوا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ شاید اس نے اس پر وزن لادا جس کی تاب نہ لا کر وہ زمین پر آرہا۔ آخر تنگ آکر اس نے اسے پچاس روپے میں فروخت کر دیا۔ اگر نہ کرتا تو وہ ضرور ایک آدھ ہفتہ کے بعد مر جاتا۔ اس لیے اُسے بیچ دینا ہی مناسب تھا۔ یہ کہنا کہ اسے کچھ نقصان ہوا درست نہیں ہوگا۔ سچ تو یہ ہے اُسے بیچ کر مالک کو پچاس روپے کا منافع ہوا۔

سود کا سوال

ایک شخص نے کسی قرضدار کو پانچ سو روپے دس روپے فی صد سالانہ شرح پر چھ سال کے لیے قرض دیئے۔ بتلایئے اسے چھ سال کے بعد اسے اصل اور سود ملا کر کیا ملے گا؟

جواب: قرضدار تین قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ جو صرف اصل زر ادا کرتے ہیں یا دبا لیتے ہیں جو صرف سود ادا کرتے ہیں۔ اصل زر پی جاتے ہیں۔ اور وہ جو اصل زر اور سود دونوں کو ہضم کر جاتے ہیں۔ سوال میں اس امر کی وضاحت نہیں کی گئی کہ جس شخص کو قرض دیا گیا۔ وہ کس قماش کا قرض دار تھا اس لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ قرض دار کو چھ

سال کے بعد کیا ملے گا۔ ہمارے خیال میں تو اسے یہ سبق ملے گا کہ آئندہ روپیہ قرض نہیں دینا چاہیے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے یہ جواب ملے "بھائی صاحب اگر آپ اتنے جلد باز ہیں کہ ادھر چھ سال ختم ہوئے ادھر آپ نے اصل زر اور سود کا مطالبہ کر دیا تو آپ کو قرض دینا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

کام کرنے کا سوال

اگر دو مرد اور تین عورتیں ایک کام کو پندرہ دن میں کر سکتی ہوں تو بیس مرد اور بیس عورتیں اس کام کو کتنے دنوں میں کر سکیں گے۔؟

جواب: جہاں بیس عورتیں اور بیس مرد اکٹھے ہو جائیں، وہاں کام کا خدا ہی حافظ ہے۔ ظاہر ہے اگر وہ جوان ہیں تو ایک دوسرے کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھائیں گے۔ اگر بوڑھے ہیں تو سارا وقت کھانسنے اور اونگھنے میں ضائع کر دیں گے۔ یہ پوچھنے پر کہ کام ختم کیوں نہیں ہوا مرد عورتوں کو اور عورتیں مردوں کو کوسنے لگیں گی۔ مرد کی ذات تو ازل سے ہی کام چور ہے۔ مرد کہیں گے عورتیں شروع ہی سے آرام طلب واقع ہوئی ہیں۔

وقت کا سوال

ایک قلعہ میں پندرہ سو سپاہیوں کے لیے بیس دن کی خوراک موجود ہے۔ پانچ دن کے بعد اس میں پانچ سو سپاہی اور آ جاتے ہیں۔ بتائیے وہ خوراک کتنے دنوں کے لیے کافی ہوگی؟

جواب: اس سوال کے دو جواب ہو سکتے ہیں۔ اگر آنے والے پانچ سو سپاہی پیٹو ہیں تو ساری خوراک وہ ایک دن میں چٹ کر جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر وہ کم کھانے والے ہیں یا ان کا معدہ خراب رہتا ہے یا وہ اپنے ساتھ ایسے باورچی لے آئے ہیں جو اتنا بدمزہ کھانا تیار کرتے ہیں کہ اسے کوئی بھی کھانا نہیں چاہتا تو خوراک کچھ دنوں کے لیے کافی ہوگی۔

اوسط کا سوال

باپ کی عمر پچاس سال۔ بڑے لڑکے کی پچپن سال، منجھلے لڑکے کی بیس سال اور چھوٹے لڑکے کی پانچ سال ہے۔ ان سب کی اوسط عمر معلوم کیجیے۔

جواب: اوسط عمر معلوم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ جو بھی کسی کی عمر ہے وہ تو وہی رہے گی۔ اگر روایتی طریقہ سے اوسط نکالی جائے تو وہ پچیس سال ہوگی۔ اس صورت میں باپ اور بڑے لڑکے کی عمر برابر ہو جائے گی جو کہ نہ صرف ناممکن ہے بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ اوسط نکالنا بعض اوقات کافی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ ایک حساب داں جسے تیرنا نہیں آتا تھا اس لیے دریا میں ڈوب گیا کیونکہ اس نے دریا کی اوسط گہرائی چار فٹ نکالی تھی جو کہ بالکل صحیح تھی کیونکہ دریا کنارے کے قریب ایک فٹ کنارے سے تھوڑے سے فاصلہ پر دو فٹ اور درمیان میں نو فٹ گہرا تھا۔

گھڑی کے متعلق سوال

رحیم کی گھڑی کالج کے کلاک سے چوبیس گھنٹوں میں اڑتالیس منٹ پیچھے رہتی ہے۔ کالج کا کلاک، کلاک ٹاور کے کلاک سے ایک ہفتہ میں اکیس منٹ آگے رہتا ہے۔ اگر ایک ماہ کے بعد گھنٹہ گھر کا کلاک صبح دس بجائے تو رحیم کی گھڑی اور کالج کے کلاک کے مطابق صبح کے کتنے بجے ہوں گے؟

جواب: ظاہر ہے جو گھڑی چوبیس گھنٹوں میں اڑتالیس منٹ پیچھے رہتی ہے وہ بالکل بے کار ہے اور جو کلاک گھنٹہ گھر کے کلاک سے ایک ہفتہ میں اکیس منٹ آگے رہتا ہے وہ بھی کسی کام کا نہیں اس لیے ایک ماہ کے بعد رحیم کی گھڑی یا کالج کا کلاک جو وقت بھی بتائیں گے وہ بالکل غلط ہوگا ان سے وقت معلوم کرنے کی بجائے انہیں کسی اچھے گھڑی ساز کو دکھایا جائے اور اگر وہ انہیں ٹھیک نہ کر سکے تو انہیں فوراً کسی

ریسرچ سکالر

عظیم الشان عمارتوں کے اجتماع کو یونیورسٹی نہیں کہتے۔ ہمارے میزبان نے آرٹس بلاک اور سائینس بلاک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دراصل ایک یونیورسٹی کی عظمت کا دارومدار اس کے عالموں اور فاضلوں پر ہوتا ہے۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں۔"

"اس یونیورسٹی میں چوبیس اسکالر ہیں جو نہایت اہم موضوعات پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اگر آپ چاہیں ان میں سے دو ایک کے ساتھ آپ کی ملاقات کرائی جا سکتی ہے۔"

"ضرور۔ ضرور۔ ہمیں ان سے مل کر بڑی مسرت ہوگی۔"

ہمارے میزبان سب سے پہلے ہمیں ریاض احمد کے کمرے میں لے گئے۔ رسمی تعارف کے بعد ہم نے ان سے پوچھا۔

"آپ کس موضوع پر ریسرچ کر رہے ہیں؟"

انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "بڑا دلچسپ اور اچھوتا موضوع ہے یعنی منشی پریم چند کی خوراک"۔

"منشی پریم چند کی خوراک؟"

"جی ہاں۔ خوراک! آپ شاید پوشاک سمجھے۔ اس پر تو عبدالغفور صاحب ریسرچ کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔"

"پریم چند کی پوشاک پر؟"

"جی ہاں۔ آپ شاید نہیں جانتے ایک مصنف کی پوشاک کا اس کی تخلیقات پر کتنا گہرا اثر ہوتا ہے۔ اگر رتن ناتھ

سرشار رومی ٹوپی نہ پہنا کرتے تو کیا وہ اتنی خوبصورت اور پختہ نثر لکھ سکتے تھے۔ جس کے نمونے جا بجا "فسانۂ آزاد" میں ملتے ہیں۔ اگر مولانا حسرت موہانی شیروانی کی بجائے کوٹ اور چوڑی دار پاجامہ کی بجائے پتلون پہنا کرتے۔ ان کی غزلوں میں وہ مٹھاس اور گھلاوٹ نہ ہوتی جس پہ وجد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اسی طرح اگر ولیم شیکسپیئر پتلون کی بجائے شلوار پہنا کرتے تو شاید انگریزی کی بجائے پشتو میں اپنے ڈرامے لکھتے۔"

"پوشاک کی طرح خوراک بھی مصنف کی تخلیقات پر اثر انداز ہوتی ہوگی۔؟"

جی ہاں یہی تو میں ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مثال کے طور پر اگر منشی پریم چند کو اتنے فاقے نہ کرنے پڑتے جتنے انھوں نے کیے۔ وہ گیہوں دال سے عظیم تر ناول کی تخلیق کر سکتے تھے۔ اگر انہیں ہر روز ایسی دال نہ کھانا پڑتی، جس میں دال کم پانی زیادہ اور گھی نام کو بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ "کفن" سے کہیں بہتر افسانے لکھ سکتے تھے۔ اگر انہیں ہر صبح ایسی چائے نوش نہ کرنا پڑتی جس میں کھانڈ ہوتی نہ دودھ تو بہت لمبی عمر پاتے اور اردو اور ہندی کی زیادہ خدمت کرتے۔"

"واقعی بڑا دلچسپ موضوع ہے۔"

"دلچسپ تو ہے ہی لیکن دقیق بھی ہے۔ آخر اس بات کا سراغ لگانا خالہ جی کا گھر نہیں۔ فلاں افسانہ لکھنے سے پہلے انھوں نے کھایا تھا۔ آیا وہ آلو کی بھاجی تھی یا مٹر کی۔ اور فلاں ناول لکھتے وقت ان کی خوراک میں کونسے وٹامن کی کمی یا بیشی تھی۔ اور اگر وہ اس خوراک سے پرہیز کرتے تو کیا ان کے ناول کا اختتام وہی ہوتا، جواب ہے۔ ستم یہ ہے اس معاملے میں کوئی شخص میری رہنمائی بھی نہیں کر سکتا۔ اگر منشی پریم چند کو خانساماں رکھنے کی توفیق ہوتی اور وہ آج زندہ ہوتا میری بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتیں۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔"

ریاض احمد صاحب کے بعد ہم نے اقبال چند سے ملاقات کی۔ انھوں نے بتایا۔ "میں غالب کے قرض خواہوں پر ریسرچ کر رہا ہوں۔"

لیکن غالب کے قرض خواہوں کا اس کی شاعری سے کیا تعلق ہے؟"

"تعلق یہ ہے کہ اگر وہ قرض کی مے نہ پیا کرتے انہیں انتظار نہ کرنا پڑتا کہ ان کی فاقہ مستی کونسے دن رنگ لا رہی ہے۔ چنانچہ جو وقت انہیں انتظار کرنے میں ضائع کرنا پڑا۔ اس میں وہ غزلیں کہہ سکتے تھے۔ اور اپنے دیوان میں اضافہ کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں نواب رام پور کی خدمت میں وہ منظوم گزارش نہ بھجوانا پڑتی جس میں انھوں نے شکایت کی ہے ؎

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

اور ساتھ ہی اس امر کا انکشاف کیا ہے:۔ ؎

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار

"تو کیا آپ کو پتہ چلا غالب کے قرض خواہ کون تھے؟"

"ابھی تک صرف ایک کا پتہ چلا ہے اس کا نام دیوراج تھا۔"

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے۔ وہ غالب کا قرض خواہ تھا؟"

"یہ اس کے ایک پڑپوتے نند کمار سے معلوم ہوا۔ وہ آج کل کوچہ بلی ماراں میں بڑی مشکل سے زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔

کہتا ہے اگر غالب نے ہمارے پڑدادا کا قرض ادا کر دیا ہوتا، آج ہم اس حالت کو نہ پہنچتے۔"

اقبال چند کا شکریہ ادا کرنے کے بعد دو اور ریسرچ اسکالروں کے پاس پہنچے جو ایک ہی کمرے میں رہ رہے تھے۔ ان میں سے ایک جس کا نام شرافت علی تھا، اس بات پر ریسرچ کر رہا تھا۔ مٹی سے مٹی کا تیل کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے خیال میں ہند کی مٹی جو سونا چاندی اور ہیرے اُگلتی ہے اگر چاہے تو مٹی کا تیل بھی اگل سکتی ہے۔ اُسے اس موضوع پر ریسرچ کرنے کا خیال اقبال کے اس مصرع سے سوجھا تھا ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

دوسرے سکالر دیدبر کاش ایک جمالیاتی موضوع پر ریسرچ کر رہے تھے، جس کے مطابق "حسن" بذات خود کوئی چیز نہیں۔ کسی چیز کو ایک خاص زاویہ نگاہ سے دیکھنے کا نام ہی "حسن" ہے۔ ان کی رائے میں اگر وہ اس تھیوری کو دلائل کی مدد سے صحیح ثابت کر سکے، تو بدصورت سے بدصورت بیوی بھی ہیلن آف ٹرائے جیسی نظر آیا کرے گی بشرطیکہ اسے ایک خاص زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے۔ کثافت نام کی کوئی چیز دنیا میں نہ رہے گی۔ کیونکہ جب اُسے ایک خاص زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ وہ کثافت کی بجائے لطافت نظر آیا کرے گی۔ کسی شہر میں کوئی گندی آبادی یا گندہ محلہ نہ رہے گا۔ اسی طرح غلیظ لباس۔ غلیظ عادات اور غلیظ گالیوں کا وجود ختم ہو جائے گا۔

ہمیں ان چاروں ریسرچ سکالروں سے مل کر بڑی مسرت ہوئی اور ہمیں اپنے میزبان کے اس قول پر ایمان لانا پڑا کہ دراصل ایک یونیورسٹی کی عظمت کا انحصار اس کے عالموں اور فاضلوں پر ہوتا ہے۔

اعزازی قاری

کنھیا لال کپور ایک بار کسی ادبی اور معیاری قسم کے اُردو ماہنامہ کے ایڈیٹر سے ملنے کے لیے اس کے دفتر میں تشریف لے گئے۔

باتوں باتوں میں انھوں نے اپنے ایڈیٹر دوست سے دریافت کیا۔

آپ کا پرچہ ہر ماہ کتنی تعداد میں شائع ہوتا ہے

"گیارہ سو"

گیارہ سو—— وہ کیوں —— ؟

کپور نے حیران ہو کر سوال کیا۔

ایک ہزار مارکیٹ میں فروخت کرنے کے لیے —— اور ایک سو اعزازی طور پر ادیبوں کو مفت بھیجنے کے لیے۔

کپور نے انتہائی سنجیدگی سے مشورہ دیا۔ "تو جناب آپ صرف ایک سو پرچے ہی شائع کیا کیجئے"

ہم اور آپ
کا
ٹیلی فون

جب سے آپ نے ٹیلیفون لگوایا ہے۔ آپ کو ہم سے طرح طرح کی شکایتیں ہیں۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا، ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ آپ کی پہلی شکایت ہے۔ آپ کا ٹیلیفون اکثر خراب رہتا ہے۔ آپ شاید نہیں جانتے۔ اکثر ٹیلی فون اکثر خراب رہتے ہیں۔ دراصل ٹیلی فونوں کو خراب رہنے کی عادت سی پڑ گئی ہے یا شاید وہ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی خراب ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے وہ آپ کی مستقل صحبت میں رہ کر خراب ہو گئے ہوں۔ بہرحال یہ آپ کے ٹیلیفون کا قصور ہے یا اس کمپنی کا قصور ہے جس نے گھٹیا کوالٹی کے ٹیلیفون سرکار کو مہیا کیے تھے۔ اس میں ہمارا بالکل کوئی قصور نہیں۔ ہم آپ کے سر کی قسم کھا کر کہتے ہیں۔ ہم نے کبھی کسی ٹیلیفون کو ترغیب نہیں دی وہ خراب ہو جائے۔ ویسے اس ضمن میں ہم دو ایک راز کی باتیں آپ کو ضرور بتانا چاہیں گے۔ جب کبھی ٹیلیفون خراب ہو جاتا ہے اسے آرام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور مکمل آرام کرنے کی وجہ سے اس کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ ہم تو یہ بھی کہیں گے، نہ صرف ٹیلیفون کو بلکہ آپ کو بھی آرام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ کوئی شخص آپ کو ٹیلیفون کرکے پریشان نہیں کر سکتا اور آپ بھی کسی شخص کو فون کرکے پریشان نہیں کر سکتے۔ دوسرے الفاظ میں آپ کے علاوہ دوسروں کو بھی آرام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ بلکہ ایک فائدہ جو آپ کو ہوتا ہے وہ یہ کہ مفت خور قسم کے ٹیلیفون کرنے والوں سے نجات مل جاتی ہے۔ جونہی کوئی شخص آپ کی شرافت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہتا ہے "اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی بیوی کو ٹیلی فون کر لوں"۔ آپ فوراً اسے مطلع کرتے ہیں "معاف کیجیے ٹیلی فون خراب ہے۔" وہ اپنا سا منہ لے کر کسی اور کوٹھی کا رخ کرتا ہے یہ کہے بغیر نہیں جاتا کہ وہاں بھی ٹیلیفون خراب ہوگا۔ اتنا تو آپ بھی جانتے ہوں گے، اگر ٹیلیفون خراب نہ ہو آپ کو کبھی چین لینے نہیں دیتا۔ آپ کا کوئی قرض خواہ آپ کو چوتھی بار فون کرکے پوچھتا ہے۔ سچ سچ بتائیے، آپ قرض واپس کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ کسی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ بار بار فون کرکے کہتا ہے۔ اگر آپ نے اپنی زندگی کا بیمہ کرا رکھا ہے تو بیوی کی زندگی کا بھی کرا لیجیے اور کوئی آپ سے فون پر دریافت کرتا ہے کیوں صاحب! آپ سے چوہے مارنے والی دوا مل جائے گی، حالانکہ آپ دوا فروش نہیں کتب فروش ہیں۔

آپ کی دوسری شکایت ہے۔ آپ جب کسی کو فون کرتے ہیں یا جب کوئی آپ کو فون کرتا ہے وہ غلط نمبر ہوتا ہے۔ آپ کو شا

علم نہیں۔ انسان کی طرح ٹیلی فون بھی غلطیوں کا پتلا ہوتا ہے۔ جب بڑے سے بڑے انسان سے غلطی ہوسکتی ہے تو بے چارے ٹیلیفون کی کیا بساط ہے۔ ویسے غلط نمبر کی وجہ سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں وہ کئی بار نہایت دلچسپ ہوتی ہیں۔ آپ نے اس شخص کا قصہ سنا ہوگا جس کی بیوی بہت بددماغ تھی اور خاوند کے رشتہ داروں سے سخت نفرت کرتی تھی۔ ایک بار اس نے دفتر سے بیوی کو فون کیا۔ ماموں جان تشریف لائے ہیں۔ دوپہر کا کھانا ہمارے ہاں کھائیں گے ذرا مزے دار ہونا چاہیے۔ ادھر سے جواب آیا آپ نے بڑی اچھی خبر سنائی۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔ کھانا ہمارے ہاں کھائیں گے۔ میں آج کا کھانا خود تیار کروں گی۔ اس شخص نے گھبرا کر فون بند کر دیا اور فوراً سمجھ گیا یہ غلط نمبر ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جس نے دوسری شادی کرلی تھی، دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ادھر اس کی بیوی اپنا میک اپ کرنے میں خاص دلچسپی لے رہی تھی۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون اٹھایا اور "رانگ نمبر" کہہ کر رکھ دیا۔ بیوی نے پوچھا۔ "کون تھا؟" وہ بولا: کوئی شخص پوچھ رہا تھا کیا راستہ صاف ہوگیا ہے؟ معلوم ہوتا ہے اسے میونسپل کمیٹی کا فون چاہیے تھا۔ اور کئی بار آپ نے فلموں میں دیکھا ہوگا کہ ہیرو اور ہیروئین کی پہلی ملاقات غلط نمبر کی وجہ سے ہوتی ہے یعنی ہیرو کسی جان پہچان کی لڑکی کو فون کرتا ہے مگر اس کی بجائے کوئی اور لڑکی اس سے گفتگو کرنے لگتی ہے جس کی آواز اتنی خوب صورت ہوتی ہے کہ ہیرو کو اس سے فوراً عشق ہوجاتا ہے۔

آپ کی ایک اور شکایت ہے کہ جب آپ کا ٹیلیفون خراب ہوجاتا ہے۔ اور آپ اس امر کی اطلاع دفتر میں دیتے ہیں تو کئی دن کے بعد میکینک اُسے ٹھیک کرنے کے لیے آپ کے ہاں آتا ہے۔ اس میں میکینک کا کوئی قصور نہیں ہے۔ دراصل میکینک اتنے کم اور خراب ٹیلیفون اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ایک انار اور سو بیمار والا معاملہ بن جاتا ہے۔ کئی بار تو ہمارے میکینک اتنے گھبرا جاتے ہیں کہ وہ غالب کا یہ شعر پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ؎

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند　٭　کس کی حاجت روا کرے کوئی!

اس لیے وہ کسی خراب ٹیلیفون کو ٹھیک نہیں کرتے۔ آپ پوچھیں گے۔ آخر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ انہیں کچھ خراب ٹیلیفون کو تو ٹھیک کرنا چاہیے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی شخص سے امتیاز روا رکھنا جمہوریت کے منافی ہے۔ آپ ہی کہیے اگر آپ کے ہمسایہ کا ٹیلی فون ٹھیک کر دیا جائے تو آپ اسے کیسے برداشت کریں گے۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے۔ میکینک یہاں سے آپ کا ٹیلی فون ٹھیک کرنے کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ راستے میں اسے خیال آتا ہے۔ بیوی نے کہا تھا۔ اگر آج مٹی کا تیل نہ لائے تو کھانا نہیں پکے گا۔ چنانچہ وہ مٹی کا تیل حاصل کرنے کے لیے ایک لمبے کیو میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ مسلسل تین گھنٹے کھڑا رہنے کے بعد اسے بتایا جاتا ہے کہ تیل ختم ہو گیا ہے اس لیے وہ پھر کبھی قسمت آزمائی کرے۔ ایسی حالت میں جب اسے یہ ڈر کھائے جا رہا ہے، آج کھانا کیسے پکے گا۔ وہ آپ کا ٹیلی فون کیسے ٹھیک کر سکتا ہے۔ بالفرض اس کے گھر میں مٹی کا تیل موجود ہے۔ اُسے اپنے بچے کی آدھی فیس معاف کرانے کے لیے ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں جانا پڑتا ہے۔ جہاں منت سماجت کے باوجود اُسے فیس میں کوئی رعایت نہیں دی جاتی، اس کا موڈ خراب ہو جاتا ہے اور وہ دل ہی دل میں کہتا ہے: لوگوں کے تو صرف ٹیلی فون خراب ہیں۔ یہاں قسمت ہی خراب ہے، اور وہ واپس دفتر میں آجاتا ہے۔ اصل میں سٹاف کی اتنی کمی ہے کہ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بیچارے میکینک بھی کیا کریں۔ آپ یہ شکایت بھی کرتے ہیں کئی بار جب میکینک ٹیلی فون ٹھیک کر کے رخصت ہوتا ہے، اسی وقت وہ پھر خراب ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میکینک ہمیشہ جلدی میں ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے متعدد ٹیلی فون کو ٹھیک کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ آپ کے ٹیلیفون کو اچھی طرح ٹھیک نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ خراب ٹیلی فون بھی آدمیوں کی طرح

ہوتے ہیں۔ جب ڈاکٹر ان کا معائنہ کرتا ہے یا انہیں تسلی دیتا ہے کہ وہ ٹھیک ہیں، وہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد ان کی طبیعت پھر خراب ہو جاتی ہے۔

آپ اکثر یہ کہتے بھی سنے جاتے ہیں کہ جب کبھی آپ ٹرنک کال کرتے ہیں۔ آپ کو گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ بھی ہے یعنی اسٹاف کی کمی۔ آپ شاید کہنا چاہیں گے "اسٹاف کی کمی نہیں۔ سٹاف کی بے رخی۔" آپ کی بات بھی کافی حد تک صحیح ہے۔ آج کل کال کرنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ لوگ ذرا ذرا سی بات کے لیے ٹرنک کال کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سبق سکھانے کے لیے کئی بار ہمارا اسٹاف انہیں انتظار کی زحمت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وہ تنگ آکر ہر پندرہ منٹ کے بعد یاد دہانی کراتے ہیں۔ ہمارا اسٹاف ان کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے انہیں جھوٹی تسلیاں دیئے جاتا ہے۔ بس اب آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا، بس اب آپ کی ہی باری آنے والی ہے۔ کئی بار کال کرنے والا محسوس کرتا ہے کہ اگر وہ پیدل چل کر اس شہر میں جس کے لیے اس نے ٹرنک کال بک کرائی ہے تو اب تک وہاں پہنچ بھی گیا ہوتا۔ کئی بار وہ جھنجھلا کر ہمارے اسٹاف کو سخت سست کہتا ہے۔ مگر ہمارے سٹاف نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ اس کے پاس بنا بنایا جواب موجود ہوتا ہے: "صاحب آپ کا شکوہ بجا ہے لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ لائن ہی بک لخت خراب ہو گئی ہے۔"

آپ کی آخری شکایت یہ ہے کہ آپ کو جو ٹیلی فون کا بل بھجوایا جاتا ہے اسے دیکھ کر آپ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں کیونکہ وہ ڈیڑھ ہزار یا دو ہزار روپے کا ہوتا ہے اور آپ سوچتے ہیں، ہم نہ وزیر ہیں نہ سفیر۔ ہمارا بل اتنا کس طرح ہو سکتا ہے۔ آپ دماغ پر زور ڈالتے ہوئے سوچتے ہیں۔ ٹیلیفون کو تو تار لگا رہتا ہے پھر لفنڈ ٹرنک کالس کون کرے گا۔ آپ ہمیں لکھتے ہیں کہ کسی اور شخص کا بل غلطی سے آپ کو بھجوا دیا گیا ہے۔ ہم آپ کو مطلع کرتے ہیں "نہیں صاحب، یہ آپ کا ہی بل ہے۔ معلوم ہوتا ہے بیٹھے بیٹھے آپ کی یادداشت کمزور ہو گئی ہے، اس لیے آپ بالکل بھول گئے ہیں کہ آپ نے تین سو پچاسی ٹرنک کالز کی تھیں۔ کیوں کی تھیں اس کا ہمیں علم نہیں لیکن آپ فوراً بل ادا کر دیجیے ورنہ کنکشن کاٹ دیا جائے گا۔ اور بل کی رقم وصول کرنے کے لیے قانونی کارروائی کی جائے گی۔ آپ ہمارا جواب پڑھ کر اپنا سر پیٹ لیں گے اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ جب آپ کے ہوش و حواس ذرا ٹھکانے ہوتے ہیں آپ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں ؎

حد سے گذر گئی ہیں تری بے وفائیاں
اب تک مگر فریب وفا کھا رہا ہوں میں

شریف آدمی۔!

مرسلہ: نجم الحسن انجم ادیب

کنہیا لال کپور نے کسی شخص پر خفا ہوتے ہوئے کہا۔

"میں تو آپ کو شریف آدمی سمجھا تھا۔"

"میں بھی آپ کو شریف آدمی سمجھا تھا۔"

اس شخص نے بھی برہمی میں بلا سوچے سمجھے کہہ دیا۔ "تو پھر آپ ٹھیک ہیں مجھے غلط فہمی ہوئی۔"

کپور نے نہایت سنجیدگی اور کمال عجز سے اعتراف کر لیا۔

مزاحیہ ریڈیو سٹیشن

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے (وہ نہیں جو ساحر لدھیانوی کے دل میں آیا کرتا ہے) بلکہ یہ خیال کہ دنیا میں اتنے ریڈیو سٹیشن ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی مزاحیہ ریڈیو سٹیشن نہیں۔ مطلب یہ کہ کوئی ایسا ریڈیو اسٹیشن نہیں جس میں دن رات صرف مزاحیہ پروگرام نشر ہوا کرے۔ گانے، خبریں، تقریریں، بحث مباحثے سب مزاحیہ رنگ میں رنگے ہوتے ہوں جنہیں سُن کر سامعین ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جائیں۔

پروگرام کا اعلان کرتے وقت صرف آداب عرض کہنا کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اناونسر سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے کہے۔ "کیوں صاحب آپ کھوئے کھوئے سے کیوں نظر آتے ہیں۔ یہ کیا رونی صورت بنا رکھی ہے۔ خدا نہ کرے آپ کے داڑھ میں درد تو نہیں؟ آپ کی انکم ٹیکس کے دفتر میں پیشی تو نہیں؟ آپ کو آپ کی بیوی نے پیٹا تو نہیں؟ اگر ان تینوں میں سے کوئی بات نہیں تو پھر آپ خواہ مخواہ منہ بسور رہے ہیں۔ خوب کھل کر ہنسیے۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو کم از کم زیر لب مسکرا لیجئے۔ اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو ..... تو جہنم میں جائیے۔"

خبریں اس انداز میں سنائی جائیں۔ صبح کے نو بجے ہیں اب خبریں سنئے لیکن کیا کیجئے گا انہیں سُن کر دراصل خبریں وہی ہیں جو آپ نے کل سنی تھیں۔ ان میں صرف ایک خبر کا اضافہ ہوا ہے وہ خبر ہے جانیئے، ہم نہیں بتلاتے۔ ارے ارے آپ ناراض ہو گئے تو صاحب وہ خبر ہے۔ وہ خبر ہے۔ آپ ہمہ تن گوش کیوں ہو گئے۔ ہم تو صرف آپ کو بتا رہے ہیں ورنہ کسی خبر کا اضافہ نہیں ہوا۔

خبروں کی بجائے چند لطیفے سنئے۔ ایک دفعہ واجد علی شاہ نے اپنی ایک بیگم سے پوچھا۔ کیا حال ہے؟ بیگم جو شاعرہ بھی تھیں کہنے لگیں ؎

صاحب ہمارے حال کی تم کو خبر بھی ہے!
کھانسی بھی ہے بخار بھی ہے درد سر بھی ہے

واجد علی شاہ کا جی چاہا شعر کا جواب شعر میں دے۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ کوئی کام کا شعر موزوں نہ کر سکا۔ آخر محل سے یہ کہہ کر رخصت ہوا

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

بیگم کو یہ شعر بالکل پسند نہ آیا۔ لیکن بس والوں اور ٹرک والوں کو اتنا پسند آیا کہ انھوں نے ...... اپنی بسوں اور ٹرکوں کی فرمیوں پر یہ شعر لکھ لیا۔

ایک اور لطیفہ سنئے۔ غالب کے پاس فرش بچھانے کے لیے ایک بوریا تھا۔ ایک دن انھوں نے اسے گروی رکھ کر شراب خریدلی۔ اتفاق سے اسی دن انہیں کسی دوست نے بتایا کہ ان کی محبوبہ ان کے ہاں آنے کا پروگرام بنا رہی ہے۔ غالب گھبرائے کہ اگر وہ آئی تو اسے کہاں بٹھائیں گے۔ ویسے تو سر آنکھوں پر بٹھا سکتے تھے لیکن بد قسمتی سے محبوبہ بھاری بھرکم واقع ہوئی تھیں وزن ایک کونٹل تھا۔ غالب نے حسرت سے فرش کی طرف دیکھا اور بے اختیار اُن کے مُنہ سے نکلا:

تھی خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

باقی لطیفے پھر سنائیں گے۔ اب اجازت دیجیے۔"

بحث و مباحثہ نشر کرنے کے لیے یہ طریقہ اپنایا جائے "سامعین! آج ہم نے بحث کے لیے یہ موضوع منتخب کیا تھا "آیا حکیم زیادہ خطرناک یا جراثیم"۔ لیکن پھر یہ سوچتے ہوئے آپ خواہ مخواہ بور ہوں گے۔ یا یہ کہیں گے دونوں کافی خطرناک ہوتے ہیں۔ ہم نے بحث کی بجائے آپ کو چند مزاحیہ اشعار سنانے کا فیصلہ کیا ہے، تو لیجیے پہلا شعر حاضر ہے ؎

بی بی بیگم کا پیچ کر برقعے ؛ شرم تم کو مگر نہیں آتی

کیوں صاحب پسند آیا یہ شعر؟ خاص پسند نہیں آیا۔ کوئی بات نہیں۔ دوسرا شعر سنئے ؎

بے شک میاں کے ساتھ رہے بیوی رات دن
لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے

کیا یہ شعر بھی اچھا نہیں لگا؟ اچھا اب ایک اینٹی فیملی پلاننگ شعر سماعت فرمائیے ؎

ہم اور ہماری بیگم، تیرہ ہمارے بچے
گاؤں میں سب سے چھوٹا ہے خاندان ہمارا

اور عورتوں کا پروگرام اس طرح پیش کیا جائے:

"سامعین ہمارا تجربہ ہے۔ جب عورتیں کسی موضوع پر اظہار خیال کرتی ہیں وہ عموماً آدھا فقرہ مُنہ سے اور باقی آدھا ناک میں سے ادا کرتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے سننے والا کچھ اس طرح کی آوازیں سنتا ہے۔

بہن ادشا۔ یہ تو تم ٹھیک کہتی ہوں کہ مرد فطرتاً میاؤں میاؤں میاؤں ہوتا ہے۔
بہن بملا۔ نہ صرف مرد بے وفا ہوتا ہے ٹیاؤں ٹیاؤں ٹیاؤں وہ اوّل درجہ کا الّو بھی ہوتا ہے۔
اس لیے ہم آپ کو اس قسم کا پروگرام سننے کی زحمت نہیں دیں گے۔ ہم اس پروگرام میں عورتوں کی مشہور لڑائیاں پیش کریں گے، جیسے ساس اور بہو کی لڑائی، دیورانی اور جیٹھانی کی لڑائی۔ پڑوسن اور پڑوسن کی لڑائی۔ ہماری رائے میں عورتیں اگر کسی فن میں طاق ہوتی ہیں تو وہ لڑنے کا فن ہے، یہ پروگرام عورتوں کے لیے کافی مفید ثابت ہوگا کیونکہ لڑائیوں میں استعمال کیے گئے تیز اور تیکھے فقرے بدن میں آگ لگانے والے طعنے اور نرالی انوکھی گالیاں بُرے وقت میں عورتوں کے آڑے آئیں گے۔!"

اسی طرح باقی پروگرام بھی مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ اور ہر پروگرام کی تان اس شعر پر توڑی جا سکتی ہے۔

رونی صورت ہو کوئی لاکھ ہنسا دیں اس کو
دل پھڑک جائے لطیفہ وہ سنا دیں اس کو

مرتبہ: نجم الحسن انجم ادیب

آلو کا ساگ

ایک بار کنہیا لال کپور اپنے نوجوان افسانہ نگار دوست پرکاش سنگھ سے ملنے لاہور آئے انھیں دیکھ کر سنگھ نے (جنھیں آلو کا ساگ بہت پسند ہے) کہا کہ اب آپ لاہور آ ہی گئے ہیں تو اس خوشی میں آج شام آلو کا ساگ ہی تیار کروانا چاہیے۔ آلو کے ساگ کی بات سنتے ہی کپور کے کان کھڑے ہو گئے۔ اور وہ تنک کر بولے۔

"محض آلو کے ساگ سے بچنے تو میں لاہور بھاگ کر آیا ہوں۔ اور تم پھر یہاں وہی آلو کے ساگ کی بات کر رہے ہو۔"

٥

پیش لفظ

ایک نئے ادیب نے کنہیا لال کپور سے بڑی مودبانہ گذارش کی کہ وہ ان کی کتاب پر پیش لفظ لکھ دیں۔ یہ سن کر کنہیا لال کپور نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔
"جہاں تک پیش لفظ کا تعلق ہے وہ تو میں لکھے دیتا ہوں۔
مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد آپ کے افسانے پڑھے گا کون۔"

کنھیا لال کپور

ایک ہپی شاعر

ایک ہپی اور اس پر شاعر یعنی ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا!! اس کو مراقبے میں دیکھ کر بے اختیار پوچھنے کو جی چاہا۔ کہیے حضرت! کیا سوچ رہے ہیں؟ اس نے ایک خاص ادا کے ساتھ جواب دیا۔

کچھ اپنے متعلق۔ کچھ زندگی کے متعلق —!"

"سوچنے کے بعد کس نتیجے پر پہنچے ہیں؟"

"نتیجے پر تو بعد میں پہنچوں گا۔ ابھی تو یہ سوچ رہا ہوں!

"میں ہومر ہوں۔ ملٹن ہوں یا سورداس"

"بہت خوب!"

"بہت خوب کو رہنے دیجیے۔ "داس" کا قافیہ بتائیے۔

"گھاس کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"بکواس ہے"

"ماس؟"

"خاص اچھا نہیں"

"ناس؟"

"اچھا ہے۔ تو اب مکمل شعر اس طرح ہوگا: ؎

بتائے مجھے کوئی کیسے یہ ناس،
میں ہومر ہوں ملٹن ہوں یا سورداس"

"میرے خیال میں دو قافیے جو آپ نے رد کر دیئے تھے ان کو اس طرح باندھا جا سکتا ہے ؎

مجھے شاعری کس طرح آئے ماس!
گئی ہے میری عقل جب چرنے گھاس

معلوم ہوتا ہے آپ بھی شاعر ہیں۔ آپ کے ملک میں تو ہر پانچواں شخص شاعر ہے"

"شاعر تو دس بارہ ہی ہوں گے باقی سب تک بند ہیں!"

"کوئی حرج نہیں کچھ نہ ہونے سے تک بند ہونا برا نہیں۔ میں نے تک سے تک ملاتے ہوئے اپنے 'بانسے' میں کیا خوب کہا ہے ؎

خدا عقل سے مجھ کو بے بہرہ کر دے
حماقت سے وہ میرے دامن کو بھر دے"

"آمین!.... آپ نے زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"زندگی ایک دم فضول۔ لغو اور بے معنی ہے۔ میں نے اس کے بارے میں کہا ہے:— ؎

زمیں کچھ نہیں آسماں کچھ نہیں
قمر کچھ نہیں کہکشاں کچھ نہیں

خدا کچھ نہیں ، دیوتا کچھ نہیں
جنھیں کہتے ہیں اولیا کچھ نہیں
ارسطو کا گر فلسفہ کچھ نہیں
تو شنکر کا بھی نظریہ کچھ نہیں
نہ ہے امن اچھا نہ اچھی ہے جنگ
فقط ایک اچھی ہے متھرا کی بھنگ

یہ اشعار بھی بھنگ کی ترنگ میں کہے گئے معلوم ہوتے ہیں۔"

بھنگ پیے بغیر شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔ بھلا اس پائے کے اشعار بھنگ پیے بغیر کون کہہ سکتا ہے ؎

نشے میں ہوں اکثر میں یہ سوچتا
میں ہپّی ہوں خبطی ہوں یا سر پھرا"

"گستاخی معاف۔ اس شعر کا دوسرا مصرع اس طرح پڑھیے۔

میں جاہل ہوں پاگل ہوں یا مسخرا!"

"شکریہ! آپ نے واقعی مصرع کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ہاں۔ آگے چل کر عرض کیا ہے۔

جو کہتے ہیں شاعر وہ بکواس ہے
جو لیلیٰ ہے مجنوں کی وہ ساس ہے

ساحر لدھیانوی

ایک بار ادیبوں اور شاعروں کی شخصیات کا ذکر چھڑ گیا۔ جب ساحر لدھیانوی کا ذکر آیا تو کپور نے اچھل کر کہا۔

بھئی ساحر صاحب تو اتنے دبلے ہیں
جب تک وہ اپنا گرم کوٹ پہنے رہتے ہیں ہمیں
نظر آتے ہیں اور جب بھی کوٹ اتار دیتے ہیں
تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی ہوا میں تحلیل ہو گئے

"سبحان اللہ! اس شعر میں شاعروں کے علاوہ آپ نے لیلیٰ اور مجنوں کی بھی خوب خبر لی ہے۔"

"خیر تو خدا جانے میں نے کس کس کی لی ہے اور آئندہ لیتا رہوں گا فی الحال یہ شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

جو کافر ہے جھوٹا تو غازی بھی جھوٹا
جو پنڈت ہے جھوٹا تو قاضی بھی جھوٹا

پنڈت اور قاضی پر خوب چوٹ کی ہے۔"

"ان دونوں نے لوگوں کو خوب گمراہ کیا ہے۔" معلوم ہوتا ہے آپ کو کسی چیز میں اعتقاد نہیں رہا۔

رہ بھی کیسے سکتا تھا جب ہر ایک چیز وہ نہیں جو وہ نظر آتی ہے۔ میں نے اس بارے میں کہا بھی ہے: ؎

لیاقت بھی دھوکا، حماقت بھی دھوکا
شرافت بھی دھوکا، خباثت بھی دھوکا
یہاں جو بھی ہے چیز وہ جھوٹ ہے
وہ کالر ہے، ٹائی ہے یا بوٹ ہے"

"متھرا کی بھنگ کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"وہ تو واقعی بے نظیر ہے ؎

بنائی ہے مولا نے وہ چیز بھنگ
جسے دیکھ کر عقل رہ جائے دنگ

میرے خیال میں اگر تمام لوگ صبح و شام بھنگ پیا کریں تو یہ دنیا بہشت کا نمونہ بن جائے۔"

"ایسا لگتا ہے، خدا نے آپ کی دعا قبول کر لی ہے یعنی آپ کا دامن حماقت سے بھر دیا ہے۔"

اگر واقعی یہ بات ہے پھر تو مجھے شکر گذار ہونا چاہیے کیونکہ حماقت اور بھنگ کے مرکب کو ہی ہپی کہا جاتا ہے۔"

بین الاقوامی مزاحیہ کردار

کچھ کردار ایسے ہیں جنہیں تمام ممالک میں طنز و مزاح کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ہم انہیں بین الاقوامی مزاحیہ کردار کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ساس یا خوشدامن کو بلائے بے درماں سمجھا گیا ہے۔ کسی یونانی نے اپنے داماد کو مطلع کیا۔ تمہاری ساس مرگئی ہے۔ تمہارے خیال میں اس کی نعش کو جلایا جائے یا دفن کیا جائے۔ داماد نے جواب میں یہ تار بھجوایا میری رائے میں نعش کو جلایا بھی جائے اور دفنایا بھی۔ تاکہ اس کے دوبارہ زندہ ہونے کا کوئی امکان نہ رہے۔

ایک انگریز کی ساس کو کسی آوارہ بیل نے جان سے مار ڈالا۔ ہزاروں لوگ اس کے گھر کے نزدیک اکٹھا ہوگئے۔ اس نے سمجھا اس کے ساتھ ہمدردی کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اُسے بتایا گیا وہ اس آوارہ بیل کو دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ اسے بتایا گیا وہ ... جس نے دنیا کی کم از کم ایک ساس کو ختم کیا۔

گھر میں ساس کی آمد کو بہت کم داماد پسند کرتے ہیں۔ اس لیے ایک فرانسیسی شوہر کی ساری خوشی پر اوس پڑ گئی۔ جب اس کی بیوی نے اسے یہ خوش خبری سنانے کے بعد کہ اس کے ہاں ایک نیا مہمان آنے والا ہے اپنی ماں کا وہ خط اس کے ہاتھ میں تھما دیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ "میں اس اتوار کو تمہارے ہاں پہنچ رہی ہوں۔

کڑاکا بیوی بھی حقیقۃً ایک بین الاقوامی مزاحیہ کردار ہے۔ انگریزی شاعر ڈرائی ڈن کو ایسی ہی بیوی سے پالا پڑا تھا۔ چنانچہ اس کے مرجانے پر ڈرائی ڈن نے اس کی قبر پر یہ الفاظ کندہ کرائے۔ اس قبر میں ڈرائی ڈن کی بیوی آرام کر رہی ہے اور اس کی وفات کے بعد ڈرائی ڈن کو پہلی بار آرام نصیب ہوا ہے۔

ایک امریکن کڑاکا بیوی جس کا شوہر کڑھ کڑھ کر مرگیا تھا۔ ایک دن ایک ایسے شخص سے ملی جو روحوں کو بلا سکتا تھا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے شوہر کی روح کو بلا دے۔ جب روح آگئی تو ان دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔

"کیا تم ڈگلس کی روح ہو؟"

"ہاں ۔۔۔!"

"کیا تم مرنے کے بعد خوش ہو؟"

بہت خوش ہے۔"

"کیا تمہاری زندگی اس زندگی سے بہتر ہے جو تم نے میرے ساتھ گذاری؟"

"اس سے کہیں بہتر ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ بہشت کیسی جگہ ہے؟"

"بھاگوان! میں بہشت سے نہیں دوزخ سے بول رہا ہوں۔"

مرزا غالب اپنی بیوی امراؤ بیگم سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انہیں اپنا مکان بدلنا تھا۔ انھوں نے بیگم کو ایک مکان دیکھنے کے لیے بھیجا۔ وہ جب اُسے دیکھ کر آئی تو غالب نے اس کی رائے پوچھی۔ اس نے کہا، مکان تو اچھا ہے۔ لیکن سنا ہے اس میں ایک بلا رہتی ہے۔ غالب مسکرا کر بولے، کیا آپ سے بڑھ کر بھی کوئی بلا ہے!

کنجوس کو کسی ملک میں معاف نہیں کیا گیا۔ اہل سکاٹ لینڈ کی کنجوسی تو ضرب المثل ہو گئی ہے۔ ایک مرتبہ تین دوستوں نے جن میں ایک انگریز، ایک اسکاٹ اور ایک آئرش تھا فیصلہ کیا کہ اتوار کے دن کہیں باہر جا کر پک نک منائی جائے۔ یہ طے پایا ہر دوست اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی چیز لے کر آئے۔ جب اتوار کو وہ اکٹھا ہوئے تو انگریز نے کہا میں کیک، بسکٹ اور بھنا ہوا گوشت لایا ہوں۔ آئرش نے کہا، میں سیب اور کیلے لایا ہوں۔ اسکاٹ آہستہ سے بولا اور میں اپنے ساتھ اپنا چھوٹا بھائی لایا ہوں

ایک اسکاٹ سخت بیمار ہو گیا۔ اس کی بیوی نے اسے مشورہ دیا وہ ایک مشہور نرسنگ ہوم میں داخل ہو جائے اور وہاں کم از کم ایک ماہ رہے۔ اسکاٹ نے پوچھا: "علاج پر کل کتنا خرچ آئے گا ـ ؟" "تین سو پاونڈ" "اور اگر میں مر جاؤں تو مجھے دفنانے اور کفنانے پر کتنا خرچ آئے گا؟ ساٹھ پاونڈ، تو پھر مجھے مر ہی جانے دو۔ اس میں دو سو چالیس پاونڈ کا فائدہ ہے۔

غیر حاضر دماغ پروفیسر ایک بین الاقوامی مزاحیہ کردار ہے۔ ایک فرانسیسی پروفیسر کہیں جا رہا تھا۔ اسٹیشن پر اس کی بیوی اسے الوداع کہنے کے لیے آئی۔ جب گاڑی چلنے لگی تو پروفیسر نے جھٹ سے قلی کا بوسہ لیا اور بخشش اپنی بیوی کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

ایک ہندوستانی پروفیسر اتنا غیر حاضر دماغ واقع ہوا تھا کہ ایک دن اس نے اپنی بیوی کو جو ہمیشہ شلوار قمیص پہنا کرتی تھی، ایک تقریب میں ساڑھی پہنے ہوئے دیکھا اور اس کے قریب جا کر کہا: "بہن جی! آپ کو کہیں دیکھا ضرور ہے لیکن یہ یاد نہیں آرہا کہ کہاں دیکھا تھا۔"

ریل کے ڈبے میں جب ٹکٹ چیکر نے ایک امریکی پروفیسر سے ٹکٹ دکھانے کے لیے کہا تو اس نے اپنی ساری جیبوں میں ٹکٹ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ لیکن کہیں ٹکٹ نہ ملا۔ ٹکٹ چیکر نے پوچھا آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں"

اگر ٹکٹ نہیں مل رہا تو کوئی بات نہیں۔"

"کوئی بات کس طرح نہیں۔ اب مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ مجھے کون سے اسٹیشن پر اترنا ہے۔"

سیدھا سادا کسان بھی ایک عالمی مزاحیہ کردار ہے۔ دو انگریز اپنے ایک دوست پیٹر کے گھر گئے اور کہنے لگے آج ہم نے کھیتوں میں ایک مرد بیزار دیکھا اور ہمیں ایسا لگا جیسے وہ تم ہو۔ پیٹر نے پوچھا: کیا اس نے کالے رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔؟"

"نہیں ——!"

"سبز رنگ کی ٹائی لگا رکھی تھی ؟" —— نہیں —!

خاکی رنگ کی ٹوپی پہن رکھی تھی - ؟"

"نہیں ——"

پیٹر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا !

"تب وہ میں نہیں کوئی اور تھا۔"

ایک ہندوستانی کسان پہلی بار دلی گیا۔ جب اپنے گاؤں میں واپس آیا تو اس کے دوستوں نے پوچھا! "دلی کیسا شہر ہے؟"

شہر تو بہت اچھا ہے اس نے جواب دیا۔ لیکن وہ ایک دن میں خالی ہو جائے گا۔"

"یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا - ؟"

"کیونکہ میں نے دیکھا ہر شخص - بس موٹر یا اسکوٹر میں بیٹھ کر شہر سے بھاگا جا رہا ہے۔"

مرسلہ: نجم الحسن

صفائی !

ایک بار اردو ادب کے مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد (جو اپنی نفاست اور صفائی کی وجہ سے اپنے حلقۂ احباب میں کافی مشہور ہیں)

کنہیا لال کپور سے ملنے ان کے گھر گئے، اور کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دھول سے اٹے ہوئے جوتوں کو ایک کپڑے سے جھاڑ کر صاف کرنے لگے۔ کپور نے انہیں آتے ہوئے پہلے ہی اپنے کمرے میں دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ وہیں سے چیخ کر کہا "جناب اندر آجائیے۔ جس سے آپ ابھی ملنے والے ہیں۔ وہ اس سے بھی زیادہ غلیظ ہے"

بے خون کافر

۱۹۴۷ء کے فسادات کے زمانے میں کنہیا لال کپور لاہور میں تھے۔ جب بہت دن تک گھر میں رہنے کی وجہ سے ان کی طبیعت گھبرائی تو وہ اپنے مخصوص ہوٹل کو چل دیئے جہاں ان کے بہت سارے مسلمان ادیب دوست جمع تھے۔ وہ بہت دن بعد کپور کو دیکھ کر اشتیاق سے ملنے لگے مگر کپور نے فوراً یہ جملہ کہا۔

"بھئی ذرا احتیاط سے گلے مل رہے ہو۔ یہ سچ ہے کہ ایک زمانے کے بعد ایک کافر ہاتھ آیا ہے مگر ذرا اس کافر کی حالت زار بھی تو دیکھو۔ قتل کر کے بھی ایک قطرہ خون بھی نہ نکلے گا۔

آندھرا پردیش تابناک مستقبل کی سمت گامزن ہے



شریمتی اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام اور آنجہانی شری سنجے گاندھی کے ۵ نکاتی پروگرام کی پرزور عمل آوری کے ساتھ ریاست آندھرا پردیش میں سلور جوبلی سال کی تقاریب منائی جارہی ہیں۔ ماہ نومبر کے پہلے ۲۵ دنوں کو مختلف میدانوں میں حاصل کردہ ریاست کی ترقی کو نمایاں کرنے کے لئے مختص کئے گئے ہیں۔

شری ٹی۔ انجیا کی قیادت میں عام آدمی کے فائدے کے لئے کئی اقدامات کئے گئے۔ کسانوں، صنعتی مزدوروں اور کمزور طبقات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

- ۵ ایکڑ تری یا ۱۰ ایکڑ خشکی زمین رکھنے والے کسانوں کو محصولِ اراضی کی ادائی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔
- دھان، جوار اور مونگ پھلی کی فصل کے لئے بیما کا نفاذ کیا گیا۔
- نیشکر کی خریدی کے لئے معقول قیمتیں مقرر کی گئی ہیں۔
- سرکاری اداروں کی جانب سے تصدیق کردہ بیجوں پر تجارتی محصول نہیں لگایا گیا۔
- ۶۵ سال سے اونچی عمر کے کھیت مزدوروں اور معذور افراد کے لئے پنشن اسکیم رائج کی گئی۔

- دیہاتوں میں پینے کے محفوظ پانی کی سربراہی کے لئے ۴۸۰ کروڑ روپے کی لاگت سے ایک ماسٹر پلان تیار کیا گیا۔
- دیہی علاقوں میں روزگار پیدا کرنے کے لئے (غذا برائے کام اسکیمات کے ذریعہ) ۳۵۰ کروڑ روپے کی اسکیم تیار کی گئی۔
- کمزور طبقات کے لئے مکانات مہیا کرنے کی اسکیمات
- سرکاری زمینات پر جھونپڑیاں تعمیر کرکے ایک سال سے زائد عرصے سے رہائش پذیر افراد کا تخلیہ نہ کروانے کا فیصلہ کیا گیا۔
- بدعنوانیوں کے خاتمہ کی کوشش اور صاف ستھرے نظم و نسق نیز لوک ایوکت ادارے کے قیام کے لئے قانون کی تدوین اور بدعنوانیوں کا سراغ لگانے کے لئے فلائینگ اسکوارڈ کا قیام۔

ایک طویل منصوبہ

سلور جوبلی سال کے دوران ۱۲ مہینوں کو مختلف میدانوں میں ترقیاتی پروگراموں کو تیز تر کرنے کے لئے مختص کیا گیا ہے۔

جنوری	زرعی اراضیات
فبروری	قرضہ جات
مارچ	دیہی علاقوں میں بجلی کی سربراہی
اپریل	خاندانی بہبودی
مئی	ورکرز اور کاریگروں کی ترقی
جون	کسانوں کی بہبودی
جولائی	ونا مہوتسوا (شجرکاری)
اگست	بافندوں کی ترقی
ستمبر	خواتین و اطفال کی بہبودی
اکتوبر	نوجوانوں کی بہبودی

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش (حیدرآباد)

اگر سوئمبر کی رسم پھر رائج ہو جائے

لفظ اگر چھوٹا سا ہے۔ مگر اس میں بے شمار امکانات چھپے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں اگر قلوپطرہ کی ناک تھوڑی سی کم تیکھی ہوتی تو دنیا کی تاریخ وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔ اگر نپولین کا ایک جرنیل وقت پر میدان جنگ میں پہنچ جاتا تو اسے واٹرلو کی جنگ میں شکست نہ ہوتی۔ اگر سوہنی چناب میں تیرنے سے پہلے دیکھ لیتی کہ اس کا گھڑا کچا ہے تو سوہنی مہینوال کی کہانی کا اختتام کچھ اور ہوتا۔ ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کا لفظ حالات کا رخ پلٹ کر رکھ دیتا ہے۔

فرض کیجئے اگر سوئمبر کی رسم پھر سے رائج ہو جائے۔ تو بیاہ کا مسئلہ کتنا سنجیدہ اور پیچیدہ ہو جائے گا۔ شاید سو میں سے پچھتر نوجوان تو عمر بھر کنوارے ہی رہیں۔ کیونکہ نہ وہ سوئمبر کی شرط پوری کر سکیں، نہ ان کا بیاہ ہو سکے۔ تیل میں مچھلی کے عکس کو دیکھ کر اس کی آنکھ کو اپنے تیر کا نشانہ بنانا۔ ایک بہت وزنی دھنش کا چلّہ چڑھانا کسی ارجن جیسے تیرانداز یا شری رام چندر جیسے بہادر کا ہی کام ہے۔ آج کل کے نوجوانوں پر تو یہ شرط سن کر ہی لرزہ طاری ہو جائے گا۔

سوئمبر کی رسم دوبارہ رائج ہونے سے کئی فائدے ہوں گے۔ شادیاں بڑی کم تعداد میں ہوں گی اور ظاہر ہے بچے بھی تھوڑی تعداد میں پیدا ہوں گے۔ اس طرح آبادی اور خوراک کے مسائل خود بہ خود حل ہو جائیں گے۔ اب تو یہ حال ہے کہ لڑکا چاہے لنگڑا، کانا، گنجا یا بھینگا ہو اس کی شادی ضرور ہو جاتی ہے۔ اور شادی کے بعد اگر ہر سال نہیں تو ہر دوسرے سال خاندان میں ایک نئے فرد کا اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ جس شخص کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے۔ اسے چاہے کتنا ہی سمجھایا جائے کہ پریوار نیوجن بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ وہ منہ بنا کر کہتا چار یا پانچ بچے ہو جائیں پھر پریوار نیوجن کی طرف بھی توجہ دیں گے۔

جب شادیوں کی تعداد گھٹے گی اس کے ساتھ سونے کا بھاؤ بھی گھٹ جائے گا۔ اور ریشمی کپڑا اتنا سستا ہو جائے گا کہ عام لوگ سوتی کی بجائے ریشمی لباس پہنا کریں گے۔

بیسویں صدی میں سوئمبر کی شرائط وہ نہیں ہوں گی جو پچھلے زمانے میں ہوا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر ایک شرط یہ ہو سکتی ہے کہ جے مالا اس نوجوان کے گلے میں ڈالی جائے گی جو لگاتار تین گھنٹے ٹوئسٹ (TUIST) کر سکے۔ ٹوئسٹ کا مقابلہ کسی ناچ گھر میں کیا جائے گا۔ بہت پتلے یا بہت موٹے نوجوان اس مقابلے میں شریک نہیں ہوں گے۔ لیکن اگر غلطی یا اتفاق سے شامل ہو جائیں گے

تو بہت جلد تھک کر فرش پر منہ کے بل گر پڑیں گے۔

ایک اور شرط یہ ہو سکتی ہے جو نوجوان کرکٹ کے ٹسٹ میچ میں ایک سو رنز بنائے گا وہ جے مالا کا مستحق سمجھا جائے گا۔ بیشتر ناتجربہ کار نوجوان پہلی ہی گیند پر آؤٹ ہو جائیں گے کچھ پانچ یا دس رنز ہی بنا سکیں گے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ کوئی نوجوان سوئمبر کی شرط پوری نہیں کر سکتا سوئمبر منسوخ کر دیا جائے گا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی منچلی یہ شرط مقرر کر دے کہ وہ اس نوجوان سے شادی کرے گی جو چاند کی سطح سے ایک پچاس کلو وزنی پتھر لائے۔ ظاہر ہے کہ کمزور اور بزدل نوجوان اس سوئمبر میں حصہ نہیں لیں گے۔ لیکن کوئی نہ کوئی سخت جان اس شرط کو پورا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ جب اس کی شادی ہو جائیگی اور جوڑے کی فوٹو اخبارات میں چھپے گی تو فوٹو کے نیچے لکھا جائے گا۔ وہ زمانے لد گئے جب یونہی شادی ہو جاتی تھی۔ اب تو شادی کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا چاند سے کسی وزنی پتھر کا لانا۔"

اسی طرح کسی سوئمبر میں یہ شرط رکھی جائے گی۔ جو نوجوان تیز موٹر چلانے کا ریکارڈ قائم کرے گا اسے کامیاب امیدوار سمجھا جائیگا بہت سے امیدوار کسی نہ کسی حادثہ کا شکار ہو جائیں گے۔ اور شاید جے مالا کسی ڈرائیور کے گلے میں ڈالی جائے گی جو تیز موٹر چلانے کے جرم میں کئی بار قید بھگت چکا ہے۔

ہر ملک اور ہر دور میں بیویوں نے زن مرید یا ذلیل قسم کے شوہروں کو پسند کیا ہے؟ اس لیے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نوجوان کے گلے میں جے مالا ڈالی جائے گی جو عمر بھر بیوی کا غلام رہنے کا حلف اٹھائے۔ اور جس میں یہ سات صفات ہوں۔

۱۔ بیوی کے اشارے پر اس طرح ناچے جیسے بندر مداری کی ڈگڈگی پر ناچتا ہے۔

۲۔ بیوی کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ کلب یا سینما ہال میں جانے سے کبھی نہ روکے بلکہ بیوی کی غیر حاضری میں بچوں کو کھلائے یا کھانا تیار کرے۔

۳۔ جب آدھی رات کو بچہ روئے تو خود اٹھ کر دودھ گرم کرے اور بوتل میں ڈال کر بچے کو پلائے۔

۴۔ جب کبھی بیوی کے رشتہ دار اس کے گھر آئیں خاص کر اس کی بیوی کی ماں یا بہن ان کا اس طرح استقبال کرے گویا وہ ان سے ملنے کو ترس گیا ہے۔

۵۔ عورت ذات کو ہمیشہ عقلمند اور مرد ذات کو بے وقوف سمجھے۔

۶۔ ساری تنخواہ مہینے کی پہلی تاریخ کو بیوی کی ہتھیلی پر رکھ دے اور پھر کبھی نہ پوچھے کہ وہ کہاں گئی یا صرف پانچ دنوں میں کیسے ختم ہو گئی۔

۷۔ بیوی کے ساتھ کبھی بحث نہ کرے۔ اور اگر غلطی سے کر بیٹھے تو فوراً اپنی شکست تسلیم کر لے۔

سوئمبر کی رسم کے دوبارہ رائج ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ والدین بر ڈھونڈنے کی زحمت سے بچ جائیں گے اور جہیز کی رسم اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔ نیز بہت سی شادیاں کامیاب ثابت ہوں گی اور دولہا دلہن کبھی یہ شکایت نہ کریں گے کہ وہ گلے پڑا ڈھول بجا رہے ہیں۔ الغرض سوئمبر کی رسم سے سماج میں بہار آئے یا نہ آئے انقلاب ضرور آئے گا۔

وہی ہوتا ہے جو منظورِ ضیا ہوتا ہے

آج کل پاکستان میں وہی ہوتا ہے جو منظورِ ضیا ہوتا ہے (ضیا یعنی جنرل ضیاء الحق) ان کے جب جی میں آتا ہے انتخابات کرانے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اور جب جی چاہتا ہے انتخابات کو غیر معین عرصے کے لیے ملتوی کر دیتے ہیں۔ اگر ایک دفعہ ہمت سے کام لے کر انتخابات کو ہمیشہ کے لیے رد کر دیتے تو تمام لوگ پاکستانی اور غیر پاکستانی اطمینان کا سانس لیتے اور انتخابات کے ہونے یا نہ ہونے کے متعلق تمام قیاس آرائیاں ختم ہو جاتیں۔ مگر ستم یہ ہے کہ وہ آئے دن یہ وعدہ بھی کیا کرتے ہیں کہ انشاءاللہ اس بار انتخابات ضرور ہوں گے۔ اس دفعہ انھوں نے ۱۸ نومبر کی تاریخ بھی مقرر کر دی تھی۔ پھر نہ جانے انھوں نے کس مصلحت کی بنا پر اس تاریخ سے ایک ماہ پہلے انتخابات کو غیر معینہ عرصے کے لیے ملتوی کر دیا۔ اگر اتنا ہی کرتے تو شاید ان کے ہم وطن یہ کہہ کر صبر کر لیتے

وعدہ پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے ؎ کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

مگر انہوں نے تمام سیاسی پارٹیوں کو غیر قانونی قرار دے دیا ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں کو نظر بند کر دیا ہے اخبارات پر سنسر لگا دیا ہے۔ کچھ خاص اخبارات کے دفتروں کو تالے لگا دیئے ہیں۔ اور خاص عدالتیں قائم کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ بقول ان کے انہوں نے سب کچھ اس لیے کیا ہے کہ ملک عدم استحکام کا شکار نہ ہو جائے۔ ان کی اس عجیب و غریب دلیل سے صرف یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں استحکام قائم رکھنے کے لیے فوجی حکومت از حد ضروری ہے۔

ہمیں اپنے پاکستانی بھائیوں سے ہمدردی ہے کہ جب سے پاکستان آزاد ہوا ہے انھیں جمہوریت کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ جنرل ضیاء الحق سے کبھی امید کی جاتی تھی کہ وہ پاکستان کو فوجی حکومت اور مارشل لا سے نجات دلائیں گے مگر ان کا نظریہ بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر چند برس لوگوں کو جمہوریت سے محروم کر دیا جائے تو وہ فوجی حکومت کے اتنے عادی ہو جائیں گے کہ اسے بخوشی برداشت کر لیں گے۔ ان کی منطق ہمیں اس جوتشی کے قول کی یاد دلاتی ہے جس نے کسی شخص کا ہاتھ

دیکھ کر کہا تھا۔ چالیس سال کی عمر تک تم غربت اور تنگ دستی کی زندگی بسر کروگے۔ اس شخص کے پوچھنے پر کہ چالیس سال کے بعد کیا ہوگا۔ اس نے جواب دیا تھا۔ اس کے بعد تم اس قسم کی زندگی سے مانوس ہو جاؤ گے اور تمہیں کبھی افسوس نہیں ہوگا کہ تم کس قسم کی زندگی بسر کر رہے ہو۔

جولائی ۱۹۷۷ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی تو انہوں نے اعلان کیا تھا کہ جونہی ماحول سازگار ہوگا وہ حکومت ان لوگوں کے سپرد کر دیں گے جنہیں عوام نے اپنے نمائندوں کی حیثیت سے منتخب کیا ہے۔ مگر چونکہ اس بات کا فیصلہ انہیں خود کرنا ہے کہ ماحول سازگار ہے یا نہیں۔ اس لیے ماحول کے سازگار ہونے کی کبھی امید نہیں کی جاسکتی۔ ان کے تازہ ترین اقدام کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر پاکستانی لیڈر کہیں نماز بخشوانے گئے تھے روزے گلے پڑے تو وہ بالکل حق بجانب ہوں گے۔ مگر شاید جنرل ضیاء الحق اپنی صفائی میں کہیں گے۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ انتخابات میں کوئی بھی سیاسی پارٹی اکثریت حاصل نہیں کر سکے گی۔ اور اگر کولیشن وزارت بنائی گئی تو وہ زیادہ دیر چل نہیں سکے گی۔ اور ماحول اتنا خراب ہو جائے گا کہ مارشل لا نافذ کرنا پڑے گا۔ اس لیے میں نے پہلے ہی مارشل لا نافذ کر دیا ہے۔ کیونکہ دانش مند شخص وہ ہوتا ہے جو آنے والے وقت کے قدموں کی آہٹ پہلے ہی سن لیتا ہے۔

ریاست آندھرا پردیش نے ہمہ گیر ترقی حاصل کی ہے



وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کی رہبری میں شری ٹی انجیا نے بہ حیثیت چیف منسٹر اپنی حکومت کے ایک سو دن مکمل کرلیے اور ان کی رہنمائی میں ریاست کے عوام کی خوشحالی میں زبردست اضافہ ہوا ہے اور حکومت نے حسب ذیل شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں۔



- وزیراعظم اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام اور سنجے گاندھی کے ۵ نکاتی پروگرام کو روبہ عمل لایا جارہا ہے۔
- ۵ ایکر تری اور ۱۰ ایکر خشکی زمینات کے مالکین کو مالگزاری کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ کسانوں کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے انھیں مختلف قسم کی امداد مثلاً قرض کی ادائیگی کی سہولتیں، مناسب مقدار میں کھاد کی فراہمی، فصلوں کا بیمہ اور امدادی قیمت مہیا کی جا رہی ہے۔ خشک سالی اور قحط کے حالات پر قابو پانے کے لیے کاشتکاری کے متبادل طریقے اور اسکیمیں تیار کی جا رہی ہیں۔
- امداد باہمی اداروں کو ہدایت دی گئی ہے کہ سود پر سود عائد نہ کیا جائے
- زائد از ۶۵ سال عمر پانے والے زرعی مزدوروں اور بے کس افراد کے لیے وظیفہ کی اسکیم مقرر کی گئی ہے
- پانچ ہزار روپیے مالیت کے جو پچاس ہزار مکانات تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ کمزور طبقات کے لیے سال ۸۱-۱۹۸۰ کے دوران مزید ۳٫۵ لاکھ مکانات تعمیر کیے جائیں گے

اور ۸ء۱۰ لاکھ ایکڑ فاضل زمینات تقسیم کیے جائیں گے۔

- خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کیلئے اب تک ۱۱ کروڑ روپیے منظور کیے گیے ہیں اور مزید ۶ کروڑ روپیے عنقریب منظور کیے جائیں گے۔
- بہتر آبپاشی کی سہولتیں مہیا کرنے کیلئے چیف منسٹر نے کرشنا میں ۶۰ کروڑ روپیے سے تعمیر کیے جانے والے جوڑالا پراجکٹ کا سنگ بنیاد رکھا۔ پراجکٹ کے کام کو تیزی سے مکمل کرنے کی غرض سے ایک اعلیٰ اختیاری کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔
- ریاستی حکومت دستی گھڑیاں تیار کرنیوالی آلوین فیکٹری قائم کی اور وزیر اعظم نے اس فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھا۔
- ضلع اننت پور میں ۴۰ کیلوواٹ پیداداری صلاحیت والا ہائیڈرل پراجکٹ قائم کیا جارہا ہے۔
- نان گزیٹیڈ ملازمین کی امداد کے لیے رعایتیں دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔
- بدعنوانیوں کو دور کرنے کے اقدامات کیے جارہے ہیں۔
- زرعی صارفین کے لیے میٹر کے نظام کی بجائے ہارس پاور پر مبنی یکساں برقی شرحوں کا نفاذ

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش حیدرآباد

DIPR 2063/Jan 81

اگر دُلہن دُولہا لینے آتی ــــــــ

ہزاروں سال سے ہندوستان میں یہ دستور چلا آتا ہے کہ دولہا دلہن کو لینے آتا ہے۔ حیرانی کی بات ہے صنفِ نازک نے ۱۹۷۵ء میں بھی کہ یہ سارے عالم میں عورتوں کا سال قرار دیا گیا ہے۔ اس رسم کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔

دلہن سہرا باندھ اور گھوڑی پر سوار ہو کر دولہے کے گھر جاتی۔ اس کی بارات میں زیادہ تر عورتیں ہوتیں جو بھنگڑا ناچ ناچتی یا "ٹوسٹ" کرتی ہوئی گھوڑی کے آگے آگے چلتیں۔ شعرا دلہن کا سہرا لکھتے اور اس کے حسن و جمال کا ذکر کرتے وقت زمین آسمان کے قلابے ملاتے۔ اس کا موازنہ جون آف آرک۔ جھانسی کی رانی، رضیہ بیگم یا چاند بی بی سے کرتے۔ یہ کہتے آج نور جہاں جہانگیر کے غریب خانے پر بہ نفسِ نفیس تشریف لائی ہے۔ سہرے کے اشعار کچھ اس طرح کے ہوتے: ؎

ہے لہراتا جو رخِ نیلما کے زرفشاں سہرا
بھلا دیکھا ہے چشمِ ذوق نے ایسا کہاں سہرا
بنی جب نیلما دُلہن تو حوروں کو رشک آیا!
کہ ہوتا کاش انکے سر پہ یہ عنبر فشاں سہرا

"ملنی" کے موقع پر دولہے کی ماں دلہن کی ماں ...... کا استقبال کرتی۔ اس کے بعد دولہے کے گلے میں جے مالا ڈالنے کی رسم ادا کی جاتی۔ دولہا جس کے چہرے پر گز بھر کا گھونگھٹ ہوتا شرماتا اور لجاتا ہوا دروازے میں کھڑا ہوتا۔ اس کے دوست اس کو تسلی دیتے کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے گلے میں پھانسی کا پھندا نہیں جے مالا ڈالی جائے گی اور جواباً تمہیں دلہن کو جے مالا پہنانے کے بعد اسے نمسکار کرنا ہوگا۔

جب "پھیروں" کی رسم ادا کی جاتی۔ دلہن بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اپنی نشست پر بیٹھتی۔ دولہا شرم اور جھجک کے بوجھ سے دبا ہوا اس کی بائیں طرف بیٹھتا۔ حاضرین کی نگاہیں دولہے کے چہرے پر مرکوز ہوتیں۔ وہ یوں محسوس کرتا جیسے سب

لوگ مل کر اسے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ جب رسم ادا کرنے کا وقت آتا دلہن کی مستی اور سرشاری کا یہ عالم ہوتا کہ اس پر محمد علی تشنہ کا یہ شعر صادق آتا ہے

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

لیکن بے چارا دولہا ایک سہمے ہوئے مجرم کی طرح دلہن کے پیچھے پیچھے پھونک پھونک کر قدم رکھتا آتا۔ جب دلہن دولہے کو لینے آتی۔ جہیز دینے کی ذمہ داری دولہے کے والدین پر عاید ہوتی۔ جب جہیز کی نمائش کی جاتی دلہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ اسے دیکھنے جاتی۔ یہ سہیلیاں جہیز میں دی گئی اشیا کی طرف اشارہ کر کے طرح طرح کی چٹکیاں لیتیں۔ جیسے فرج تو سکنڈ ہینڈ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ابھی اچھی حالت میں ہے۔ زیورات ۱۴ کریٹ کے ہیں۔ لیکن ڈیزائن اچھے ہیں۔ ساڑھیاں سب پرانے فیشن کی ہیں لیکن کوئی مضائقہ نہیں بڑی بوڑھیوں کے کام آجائیں گی۔

دولہے کی رخصتی کا وقت بڑا رقت انگیز ہوتا۔ وہ اپنے رشتہ داروں سے گلے لگ کر زار و قطار روتا۔ اس کے جگری دوست رو رو کر بے حال ہو جاتے۔ اس کا والد اتنا جذباتی ہو جاتا کہ اسے غش آنے لگتا۔ احباب اُسے تسلی دیتے ہوئے کہتے۔ "لالہ جی صبر کیجیے۔ بیٹا تو پرایا دھن ہے۔ اس کے بعد جب دولہے کو ڈولی میں بٹھایا جاتا اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ ادھر بینڈ "بابل مورا نیہر چھوٹا ہی جائے" کی دھن بجاتا ادھر دولہا ماضی کی یادوں میں ڈوب جاتا یا سرد آہ بھر کر کہتا۔ "ہمارے سماج میں لڑکے کی بھی کیا زندگی ہے۔ جوں ہی وہ عالم شباب میں قدم رکھتا ہے اُسے کسی کے پلّے باندھ دیا جاتا ہے۔"

جب ڈولی سسرال پہنچتی، ساس اس کے اوپر سے پانی نثار کر کے پیتی دہلیز پر تیل چھڑکا جاتا جس پر سے دولہا چلتا ہوا گھر میں داخل ہوتا۔ دلہن کی ماں کی سہیلیاں دولہے کو دیکھنے کے لیے آتیں اور دبی زبان میں اس کے خد و خال اور رنگ روپ پر تبصرہ کرتیں۔ ایک کہتی رنگ ذرا سانولا ہے لیکن ناک نقشہ کافی اچھا ہے۔ دوسری بولتی صحت بہت کمزور ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کی ماں نے اسے کھلایا پلایا کچھ نہیں تیسری دولہے کی ناک کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتی۔ ناک بہت موٹی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ناک نہیں چہرے پر مینڈک بیٹھا ہے۔

ہنی مون منانے کے لیے دلہن دولہے کو کسی صحت افزا مقام پر لے جاتی۔ اسے بیش قیمت تحفے پیش کرتی۔ ہنی مون سے واپس آکر دولہا محسوس کرتا، خاطر داری اور ناز برداری کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اب ہر شخص اس سے توقع کرتا ہے کہ وہ سارا دن بن ٹھن کر صوفے پر نہ بیٹھا رہے۔ کچھ کام بھی کیا کرے اور جب وہ کوئی بھی کام کرتا اس میں طرح طرح کے نقائص نکالے جاتے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی اُسے رونے اور ہنسنے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ اکثر اُسے آگاہ کیا جاتا اس کی تربیت غیر مہذب ماحول میں ہوئی ہے اس لیے اس لیے وہ عقل و تمیز سے عاری ہے۔ اُسے کام کرنے کا طریقہ آتا ہے نہ بات کرنے کا سلیقہ۔ اس کے والدین پرلے درجہ کے کنجوس واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے جو جہیز دیا ہے اتنا گھٹیا اور نکما ہے کہ اسے کسی کو دکھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔

نتیجہ یہ ہوتا دولہا فرصت یا فراغت کے لمحوں میں اپنی بدقسمتی پر آنسو بہایا کرتا اور سوچا کرتا اگر وہ کنوارا رہتا تو زندگی کتنی حسین اور خوش گوار ہوتی اور شاید کبھی کبھی دل بہلانے کے لیے یہ شعر گنگنایا کرتا ہے

یہی شادی ہے جس پہ لوگ سو سو ناز کرتے ہیں
خدا جانے وہ اس کی کونسی خوبی پہ مرتے ہیں

□□

دیر سے آنے والے

اُردو کا ایک شاعر کہتا ہے ؎ مری مجبوریاں کیا پوچھتے ہو ٭ کہ جینے کے لیے مجبور ہوں میں
معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب خودکشی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے پاس سنکھیا کھانے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ یہ تو تھی شاعر کی مجبوری
اب ایک رئیس کی مجبوری ملاحظہ فرمایئے۔ شراب پی پی کر اس کا جگر خراب ہوگیا۔ اس نے ایک حکیم سے مشورہ کیا۔ حکیم نے کہا: "آپ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو شراب پینے سے توبہ کرلیں۔" رئیس نے جواب دیا: "شراب نہ پی جائے تو پھر زندہ رہنے کا کیا فائدہ ہے۔" وہ برابر شراب پیتا رہا اور کچھ عرصہ کے بعد شراب اس کو پی گئی۔ لگے ہاتھوں ایک منشی جی کی مجبوری پر بھی غور کیجیے۔ ان کا تکیہ کلام تھا "سالا" ایک دن ان کے ہاں ایک رشتہ دار آیا۔ کسی ہمسائے نے پوچھا: ان کی تعریف؟ منشی جی کہنے لگے: "یہ سالا ہمارا بہنوئی ہے۔" بہنوئی ہنس کر بولا "ویسے میں ان کا سالا نہیں۔ یہ میرے سالے ہیں۔"

ہماری مجبوری یہ ہے ہم ہر جگہ دیر سے پہنچتے ہیں۔ یہ بات تو نہیں کہ ہم وقت پر پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ بے سود ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً جب ہمیں صبح کی گاڑی سے کہیں جانا ہوتا ہے، ہم پانچ بجے کا الارم لگا کر سو جاتے ہیں وقت پر الارم بجتا ہے لیکن خدا جانے کس کے کانوں میں! ہماری تو جب آنکھ کھلتی ہے کلاک آٹھ بجا رہا ہوتا ہے اور گاڑی ہماری منزلِ مقصود پر پہنچ چکی ہوتی ہے۔

دفتر میں ہم عموماً دیر سے پہنچتے ہیں اور ہمیں آئے دن صاحب کے طعنے سننا پڑتے ہیں۔ ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔ ہم اس وقت پہنچے جب لنچ کھانے کا وقفہ ہوچکا تھا۔ صاحب نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے داغ دہلوی کا یہ شعر پڑھا ؎

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

ہم پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ایک اور دن جب ہم دفتر میں وقت پر نہ پہنچ سکے۔ کیونکہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ہمارے صاحب نے ہمارا مذاق اڑاتے ہوئے کہا: "خدانخواستہ! کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھتے آپ نمک کے بنے ہوئے ہیں اور پانی میں گھل جائیں گے۔" لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں، ہم ہر جگہ دیر سے پہنچتے ہیں کیونکہ طبعاً سست الوجود واقع ہوئے ہیں تو آپ غلطی پر ہیں۔ بہت سی تقاریب میں وقت پر پہنچنے کی

ذمہ داری ہماری اہلیہ محترمہ پر عائد ہوتی ہے۔ اگر آپ شادی شدہ ہیں تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ آپ کی شریمتی یا بیگم صاحبہ کپڑے بدلنے چہرے پر کریم اور پاوڈر لگانے اور ہر دو منٹ کے بعد شیشے میں اپنی شکل دیکھنے پر کتنا وقت صرف کرتی ہیں۔

آپ اُن سے ڈرتے ڈرتے کہتے ہیں: "جلدی کیجئے۔ دیر ہو رہی ہے"۔ وہ کڑک کر جواب دیتی ہیں۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اب بال بھی نہ سنواروں۔ پارٹی میں چڑیل بن کر شرکت کروں۔ ایسی ہی جلدی ہے تو اکیلے ہی ہو آئیے۔ اس وقت کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ جب ان کا میک اپ ختم ہوگا۔ خدا خدا کر کے یہ ختم ہوتا ہے لیکن یک لخت انہیں خیال آتا ہے۔ لال رنگ کی ساڑھی انہیں زیب نہیں دے رہی کیونکہ اُن کا اپنا رنگ سانولا ہے۔ وہ پھر سوٹ کیس کھول کر ساڑھی کا انتخاب کرنے لگتی ہیں۔ آپ سوچتے ہیں پارٹی پر اس وقت پہنچیں گے، جب وہ ختم ہو جائے گی۔ آپ کا خیال بالکل صحیح ثابت ہوتا ہے۔ جب آپ اپنے دوست کے ہاں پہنچتے ہیں، وہ مہمانوں کو رخصت کر رہا ہوتا ہے۔

دراصل میک اپ پر ضرورت سے زیادہ وقت صرف کرنا ہر عورت کی فطرت میں داخل ہے۔ امریکہ میں ایک بار ناقابل یقین واقعات سنانے کا مقابلہ ہوا۔ انعام اس شخص کو دیا گیا، جس نے یہ واقعہ سنایا:

"میں اپنے دفتر میں جو عمارت کی پچاسویں منزل میں واقع ہے۔ بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ مجھے اور میری بیوی کو آج ساڑھے پانچ بجے ایک تقریب میں شامل ہونا ہے۔ دفتر سے باہر آیا تو دیکھا "لفٹ" خراب ہے۔ چونکہ وقت بہت تھوڑا تھا اس لیے میں نے پچاسویں منزل سے چھلانگ لگا دی۔ نیچے ایک بس اسّی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی تھی۔ میں اس کی چھت پر گرا۔ مگر چوٹ تو کہاں خراش تک نہ آئی۔ جب بس میرے گھر کے سامنے سے گزری میں نے چھت سے چھلانگ لگائی اور اپنے گھر کے آنگن میں آگرا۔ میں نے بیوی سے کہا: دو منٹ میں تیار ہو جاؤ تاکہ ہم تقریب میں وقت پر پہنچ سکیں اور وہ دو منٹ میں تیار ہو گئی۔"

اس واقعہ کے آخری فقرے کو (اور وہ دو منٹ میں تیار ہو گئی) کو پہلے دو واقعات (پچاسویں منزل سے چھلانگ لگانا اور بس کی چھت سے کودنا) کے مقابلہ میں زیادہ ناقابل یقین سمجھا گیا۔

کئی بار ہمیں کسی جلسے کی صدارت کے لیے کہا جاتا ہے۔ جب ہم جلسہ گاہ میں پہنچتے ہیں، کسی اور شخص کو کرسیٔ صدارت پر بیٹھا ہوا پاتے ہیں۔ وجہ یہ کہ ہمارا کافی دیر انتظار کرنے کے بعد کسی اور سے صدارت کے فرائض انجام دینے کو کہا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ ہم حسب معمول دیر سے پہنچے اور پچھلی نشستوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ کر خطبۂ صدارت سننے لگے۔ صاحب صدر کہہ رہے تھے۔

"خواتین و حضرات! اس جلسہ کی صدارت حضرت کافور دہلوی کو کرنا تھی لیکن وہ کسی وجہ سے تشریف نہیں لا سکے۔ شاید ان کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ ان کی اہلیہ محترمہ بیمار پڑ گئیں یا وہ راستے سے بھٹک گئے، آپ سب کی طرح میں بھی ان کی تقریر سننے آیا تھا۔ یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی بجائے مجھے تقریر کرنا پڑے گی۔ کہاں حضرت کافور دہلوی اور کہاں یہ ہیچمداں۔ کاش وہ اس ہال میں موجود ہوتے اور اپنی تقریر سے ہم سب کو مسحور کرتے۔ خدا جانے وہ اس وقت کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔"

جی میں آیا اٹھ کر کہہ دیں: "حضور! ہم اسی ہال میں ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ صرف ڈیڑھ گھنٹہ دیر سے پہنچے ہیں۔!"

زندگی میں صرف ایک مرتبہ ہم بالکل صحیح وقت پر ایک تقریب میں شرکت کرنے کے لیے پہنچے۔ اور وہاں جا کر حیران ہوئے کہ ابھی تک ہمارے سوا کوئی مہمان نہیں آیا۔ ہم نے میزبان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ دیکھئے صاحب! آپ شکایت کیا کرتے تھے کہ ہم دیر سے پہنچتے ہیں۔ آج ہم سب سے پہلے پہنچے ہیں۔ پچاسویں سالگرہ کی آپ کو اور بیگم صاحبہ کو بہت بہت مبارک۔ جب ہم مبارک باد عرض کر چکے ہمارے دوست کی اہلیہ محترمہ نے فرمایا۔ معاف کیجئے بھائی صاحب آپ صرف ایک ہفتہ لیٹ آئے ہیں سالگرہ کی تقریب تو پچھلے اتوار کو تھی

فرمائش

آل انڈیا ریڈیو سے ہی نہیں اُدبا سے بھی فرمائشیں کی جاتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے آل انڈیا ریڈیو سے کی جانے والی فرمائشوں کو معقول اور اُدبا سے کی جانے والی فضول یا نامعقول کہا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ فرمائش ملاحظہ فرمائیے۔

آپ کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ کل مورخہ ۲۴ جنوری کو ہمارے ہاں چاند سا لڑکا پیدا ہوا ہے۔ ہم نے فی الحال اس کا نام بچھوا رکھا ہے۔ کیونکہ نہ صرف اس کی شکل بچھوے سے ملتی ہے، اس نے ہمارے گھر تک راستہ طے کرنے میں کافی سست روی کا ثبوت دیا ہے (شادی کے چودہ برس بعد پیدا ہوا ہے) ہماری خواہش ہے آپ اُس کا قطعۂ تاریخ پیدائش کہیں۔ اگر قطعہ کہنے کی فرصت نہ ہو تو کوئی شعر ہی لکھ بھیجیں جس سے اس کی تاریخ پیدائش نکلتی ہو۔ ہم آپ کو یہ زحمت اس لیے دے رہے ہیں کیونکہ آپ تاریخ کہنے کے فن میں مشاق ہیں۔"

اس سے بھی عجیب وہ فرمائش ہے جس میں ایک ادیب کو ایک کُتّے کا مرثیہ لکھنے کے لیے کہا گیا ہے۔ "آپ کو یہ سُن کر بہت افسوس ہوگا کہ میرا پیارا "ٹائیگر" کل اللہ کو پیارا ہو گیا۔ بڑا وفادار جانور تھا۔ بڑے بڑے ولایتی کُتّے اس کے آگے پانی بھرتے تھے۔ شرافت کا تو گویا پُتلا تھا۔ میں از حد ممنون ہوں گا اگر آپ اس کا مرثیہ لکھیں جو اتنا رقت انگیز ہو کہ اُسے پڑھنے کے بعد دھاڑیں مار کر رویا کروں تاکہ ٹائیگر کی روح کو (اگر واقعی کتوں کی روح ہوتی ہے) تسکین پہنچے۔ امید ہے آپ مایوس نہیں کریں گے۔"

اب ایک نئے ادیب کی فرمائش پر غور کیجیے۔ "میں نے بیوی کے زیور بیچ کر اپنا مجموعۂ کلام چھپوایا تھا۔ تین ہزار لاگت آئی لیکن افسوس اب اُسے کوئی خریدنے کے لیے تیار نہیں۔ جس کتب فروش کی دکان پر کتاب کی جلدیں فروخت کرنے کے لیے رکھواتا ہوں، وہ ایک ماہ کے بعد یہ کہہ کر لوٹا دیتا ہے۔ اس کتاب کا کوئی گاہک نہیں۔ آپ پُرانے ادیب ہیں۔ آپ کا حلقۂ احباب بھی کافی وسیع ہے۔ کتاب کی سو جلدیں بھجوا رہا ہوں۔ از راہ کرم اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انہیں بکوا دیں تاکہ لاگت کا کچھ حصّہ تو وصول ہو۔ اب آپ سے کیا پردہ۔ جب سے کتاب چھپوائی ہے۔ بیوی یہی طعنہ دیتی ہے کہ ہم شاعر نہیں پرلے درجے کے چغد ہیں۔"

ایک نئے رسالہ کے ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں۔

"ہم نے محض خدمت ادب کے لیے یہ رسالہ جاری کیا تھا۔ ہمیں معلوم نہ تھا ایسا کرنا سراسر حماقت ہے کیونکہ لوگ ادب کی بجائے

سستی فلموں یا سنسنی خیز جرائم میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ہم نے سالانہ چندہ بارہ روپے سے گھٹا کر چھ روپے کر دیا۔ پھر بھی کوئی شخص خریدار بننے پر تیار نہ ہوا۔ اس کے بعد چار روپے کر دیا۔ صرف ایک خریدار کا اضافہ ہوا۔ ہم آپ کو عمر بھر رسالہ مفت بھجواتے رہیں گے۔ اگر آپ کم از کم پانچ نئے خریدار بنا سکیں"۔

عورتوں کے ایک رسالہ کی ایڈیٹر صاحبہ فرمائش کرتی ہیں "اس موضوع پر ایک مضمون لکھئے۔ بیوی کو کبھی کبھی کیوں روٹھ جانا چاہیئے؟ مضمون لکھنے کی بجائے انہیں یہ لکھنے کو جی چاہتا ہے" محترمہ صنف نازک سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے ہم سے بہتر جانتی ہیں کہ بیوی کو کبھی کبھی کیوں روٹھ جانا چاہیے۔ ویسے ہماری رائے میں روٹھنا کوئی خاص اچھی عادت نہیں۔ اس سے بچوں پر بہت اثر پڑتا ہے۔ تیز شوہر خوشامد کر کے روٹھی ہوئی کو منانا پڑتا ہے اور روٹھنے کی طرح خوشامد کرنا بھی کوئی اچھی عادت نہیں۔

رسالہ خوراک کے ایڈیٹر صاحب چاہتے ہیں۔ ہم اپنے مضمون میں اس بات پر روشنی ڈالیں کہ ہم کریلے کیوں کھاتے ہیں۔ اب آپ ہی انصاف سے کہیئے یہ نافہمی بات۔ کوئی بتلائے کہ ہم کیوں کھاتے ہیں۔ بندہ پرور یہ تو ظاہر ہے ایک نہ ایک سبزی تو کھانی ہی پڑتی ہے۔ وہ اگر آپ کا مطلب ہے ہم اپنے مضمون میں ان "وٹامن" کا ذکر کریں جن کی وجہ سے ہم کریلے کھاتے ہیں تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے ہم بھی [illegible] ئی سبزی اس لیے نہیں کھاتے کہ اس میں وٹامن ہوتے ہیں بلکہ اس لیے کہ عموماً وہ گوشت سے سستی ہوتی ہے۔

رسالہ "عجیب و غریب" کا ارشاد ہے ہم ان کے لیے ایک مضمون لکھیں جس کا عنوان ہو "ہمیشہ جوان رہنے کا راز" اگر وہ ہم سے ہمیشہ بوڑھا رہنے کا راز" پر لکھنے کو کہتے تو شاید ہم ان کے ارشاد کی تعمیل کر سکتے۔ کیونکہ ہم پیدا ہی بوڑھے ہوئے تھے اور اگر نہیں ہوئے تھے۔ بچپن میں بوڑھے ہو گئے تھے۔ دراصل یہ مضمون تو دہلی یا لکھنؤ کا کوئی شاہی حکیم ہی لکھ سکتا ہے جو خود تو اکثر بوڑھا ہوتا ہے مگر دوسروں کو ہمیشہ جوان رہنے کے لیے کسی معجون یا کشتے کے کھانے کی سفارش کرتا ہے۔

آئے دن ادبا، کو یہ مژدہ سنایا جاتا ہے۔ فلاں عظیم رہنما فلاں تاریخ کو تشریف لا رہے ہیں۔ انہیں ایک ایڈریس پیش کیا جائے گا جسے آپ لکھیں گے۔ اگر پوچھا جائے اس ایڈریس میں کیا ہونا چاہیئے؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں ایڈریس انشاء پردازی کا ایسا لاجواب نمونہ ہو کہ جو بھی اُسے پڑھے یا سنے پھڑک اٹھے اگر درخواست کی جائے عظیم رہنما کی زندگی کے حالات سے آگاہ کیجئے تو جواب ملے گا۔ اگر ہمیں حالات کا علم ہوتا ہے۔ ہم خود ہی ایڈریس نہ لکھ لیتے آپ کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت تھی۔

اس فرمائش سے ملتی جلتی ایک اور فرمائش ہوا کرتی ہے۔ عزیزہ فلاں ابن فلاں کی شادی فلاں تاریخ کو طے پائی ہے۔ اس کا سہرا لکھ کر بواپسی ڈاک بھجوا دیجئے اب آپ لاکھ کہیں ہم شاعر نہیں اور اگر ہوتے بھی تو سہرا لکھنے کی حماقت کا ارتکاب کبھی نہ کرتے۔ آپ کی مجبوری و بہانہ سازی تصور کیا جائے گا۔ آخر تنگ آ کر آپ کہیں سے گھسا پٹا سہرا لائیں گے اور اس کا حلیہ اس خوبی سے بگاڑیں گے کہ وہ ایک نیا سہرا نظر آنے لگے گا۔ اور پھر کئی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں ہوتی ہیں۔ ہم نے نئی کوٹھی بنائی ہے۔ اس کا کوئی اچھا سا نام تجویز کیجیے۔ مدت ہوئی ہم نے کہیں ایک شعر پڑھا تھا۔ اس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔ دوسرا بھول گیا ہے۔ مہربانی کر کے دوسرا مصرع تحریر فرمایئے۔ فلاں معمہ کا ایک اشارہ ہے جس کے لیے دو الفاظ دیئے گئے ہیں بیوی اور بیوہ۔ آپ کے خیال میں کونسا لفظ موزوں رہے گا؟

ان فرمائشوں سے تنگ آ کر خدا سے یہ دعا کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اے خالق کون و مکان! یا تو لوگوں کو بہتر فرمائشیں کرنے کی توفیق دے یا ہمیں عقل و دانش سے محروم کر دے تاکہ وہ ہمیں معذور سمجھ کر معاف کر دیں۔

ادیبوں سے ملاقات

ہمارے ایک دوست نے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ آپ تو یہاں آکر بالکل گوشہ نشین ہوگئے ہیں۔ نہ گھر سے باہر نکلتے ہیں نہ کسی سے ملتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا آپ ہی بتائیے کس سے ملا جائے۔؟" وہ قہقہہ لگا کر بولے! "یہ بھی خوب رہی! بندہ پرور! جہاں بڑے بڑے ادیب ہیں، اخبار نویس ہیں، شاعر ہیں، پروفیسر، ڈاکٹر اور وکیل ہیں۔ آپ ان میں سے کسی سے بھی مل سکتے ہیں۔ آپ کو اس سے مل کر خوشی ہوگی۔"

مجھے تو اُس سے مل کر خوشی ہوگی؟ لیکن سوال یہ ہے آیا اسے بھی مجھ سے مل کر خوشی ہوگی؟

"کیوں نہیں؟ کیوں نہیں۔ آخر آپ کا بھی تو ادب میں ایک مقام ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کو ڈاکٹر کول کے پاس لیے چلیں۔ ایک کامیاب ڈاکٹر ہونے کے علاوہ آپ بڑے اچھے شاعر ہیں اور "بخار" تخلص رکھتے ہیں۔

"بخار۔؟"

"جی ہاں۔! ڈاکٹر جو ٹھہرے!"

وہ ہمیں ڈاکٹر کول کے کلینک میں لے گئے۔

وہاں بے پناہ بھیڑ تھی۔ آخر ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد ہم نے کہا: "چلتے ہیں پھر کسی دن آئیں گے" ہمارا دوست اصرار کرنے لگا آج ہی ملیں گے۔ چنانچہ تھوڑا سا انتظار کرنے کے بعد اس نے ہمیں ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا: آپ سے ملیے۔ آپ کپور صاحب ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کسی مریض کے لیے نسخہ لکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنا سر اُوپر اٹھائے بغیر کہا: "واقعی!"

"جی ہاں! آپ مشہور مزاح نگار ہیں۔!"

"پھر۔؟"

"مزاح نگاری میں ان کا جواب نہیں۔!"

"کیا باقی مزاح نگاروں نے لکھنا چھوڑ دیا ہے ۔۔؟"

"انہیں ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔"

"مگر کس لیئے ؟"

"یہ آپ سے ملنے کے بہت خواہشمند تھے۔"

"انھیں شکایت کیا ہے؟ قبض۔ بدہضمی بے خوابی یا مالیخولیا ۔؟"

"انہیں پڑھنے لکھنے کے سوا کوئی شکایت نہیں۔"

"یہ بات ہے تو ان کا مرض لاعلاج ہے۔" یہ جاسکتے ہیں۔ ہاں بھئی اگلا مریض۔!

ڈاکٹر کول سے مل کر ہمیں خاصی ندامت ہوئی۔ مگر ہمارے دوست نے ہمیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آج ڈاکٹر صاحب کا موڈ خراب تھا۔ ان سے پھر کبھی ملاقات کریں گے۔ اب آپ کو باٹا صاحب کے ہاں لے چلتے ہیں۔ موصوف چوٹی کے وکیل ہیں اور علم وادب سے شغف رکھتے ہیں۔ وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔

باٹا صاحب اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے کسی مقدمہ کی تیاری کر رہے تھے۔ ہمارے دوست کو مخاطب کرکے کہنے لگے آپ نے یہاں آنے کا ٹھیک وقت نہیں چنا۔ میں ازحد مصروف ہوں۔ ایک نہایت اہم فوجداری مقدمہ کی "بحث" تیار کر رہا ہوں"

ہمارا دوست بولا۔ ہم صرف آپ کے دو ایک منٹ لیں گے۔!"

"دو ایک منٹ کا مطلب دو ایک منٹ ہی ہونا چاہیئے۔!!"

"ایسا ہی ہوگا۔!"

"آیئے آپ کا تعارف مزاح نگار کپور صاحب سے کرائیں ۔!"

"کون کپور صاحب؟"

"وہی جو مزاح نگار ہیں۔!"

"اچھا کوئی کپور مزاح نگار بھی ہے۔ میں سمجھتا تھا سب فلم انڈسٹری میں ہیں۔ !!"

"آپ نے ان کی مزاحیہ تحریریں ملاحظہ فرمائی ہوں گی۔"

"معاف کیجیئے۔ میرے پاس ایسے خرافات کے لیے وقت ہی کہاں ہے؟"

ان کے مضامین اخباروں میں بھی چھپتے ہیں۔

"میں مضامین نہیں۔ خبروں کی صرف سرخیاں ہی پڑھا کرتا ہوں۔!"

"یہ ریڈیو پر بھی کبھی تقریر کیا کرتے ہیں۔!"

ریڈیو تو میں سنتا ہی نہیں کرتا۔

"انہیں آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔!"

"غالباً کسی مقدمہ کے سلسلہ میں ....!"

"نہیں — !"

"کوئی قانونی مشورہ لینا چاہتے ہیں — ؟"

"نہیں — !"

"پھر خواہ مخواہ میرا وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا یہ نہیں جانتے میں مصروف ترین وکیل ہوں ؟

ہم نے اپنے دوست کو اشارہ کیا۔ اب چلنا چاہیئے۔ کہیں باٹا صاحب طیش میں آکر یہ نہ کہہ دیں۔ "نکل جائیے فوراً میرے کمرے سے۔ !!!"

ہمارے دوست نے مایوس نہ ہوتے ہوئے فیصلہ کیا کہ ہمارا تعارف شہر کے مشہور شاعر جناب سپاٹ جالندھری سے کرایا جائے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ کالے کلوٹے اکہرے جسم کے نوجوان تھے۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ لمبے لمبے کان۔ اداس اور بے رونق چہرہ۔ میں نے ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھایا۔ وہ آگے بڑھ کر بغل گیر ہو گئے اور کہا: مجھے آپ جیسے ادیب کی آمد کا ہی انتظار تھا۔ ان دنوں ہاتھ بہت تنگ ہے اور بیوی بیمار ہے، دوا کے لیے پیسے چاہئیں۔ دس روپے عنایت کیجئے دو ایک روز میں واپس کر دوں گا۔ ہمارے دوست نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ ہم انکار کر دیں۔ سپاٹ صاحب بولے "اچھا پانچ روپے ہی نکالیے۔" ہم چپ رہے۔ انھوں نے گڑگڑا کر کہا۔ پانچ روپے نہیں۔ چلئے اڑھائی روپے ہی دیجئے۔" ہم نے انہیں اڑھائی روپے دے دیئے۔ ہمارا شکریہ ادا کرنے کے بعد انھوں نے بیڑی کا کش لگاتے ہوئے کہا! "ابھی آپکے تشریف لانے سے پہلے ایک شعر ہو گیا ہے۔ **ملاحظہ فرمائیے** اور انصاف سے کہیے ایسا شعر کبھی آپ کی نظر سے گزرا ہے۔

عرض کیا ہے۔

آ گیا جی کسی پہ، جی ہی تو ہے ؎ لگ گئی آنکھ آدمی ہی تو ہے

ہم نے چونک کر کہا: "سپاٹ صاحب یہ شعر میر تقی میر کا ہے!" وہ ذرا جھینپ کر بولے۔

معاف کیجئے۔ میر ایسا شعر کبھی موزوں نہیں کر سکتے تھے۔ یہ شعر میرا ہی ہے۔"

"ہم نے یہ شعر دیوان میر میں پڑھا ہے۔"

"کسی کاتب نے غلطی سے وہاں درج کر دیا ہوگا۔

خیر چھوڑیئے۔ ایک اور شعر سنئے :

بخاری صاحب کے بعد کرشن چندر دوسرا ادیب تھا
جس نے مجھے لکھنے کی
ترغیب دی ۔(کپور)

تمنا مظفرپوری

برج بانو کا عاشق

کنہیالال کپور کے انتقال کی خبر جب مجھے ملی تو مجھے یقین ہی نہ آیا کہ آخر ان کا انتقال اس طرح کیسے ہو سکتا ہے۔ سفر کے
بھاگنے والے شخص کی موت موگا کی جگہ پونا میں ہو یہ کیسے ممکن ہے۔ پہلے ان کے پونا پہنچنے کی خبر اخبار میں جلی سرخی کے ساتھ چھپنی چا
اگر اخبار والے توجہ نہ دیتے تو ادبی رسالے والے تو ضرور ہی لکھتے کہ قطب ہل گیا اور موگا سے پونا پہنچ گیا۔ میں نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہ
ل کپور خود پھیلا کر کوئی طنز کرنا چاہتے ہیں، لیکن جب شگوفہ میں مجھے کچھ تفصیل سے پڑھنے کو ملا تو میں سکتے میں آگیا اور "محترمہ برج
ں عاشق کی موت اس طرح خموشی سے ہوئی کہ ادبی دنیا کو بر وقت خبر بھی نہ ہوئی" افسوس ہوا۔ نہ ان کی بیماری کی خبر ملی اور نہ ا
یر علاج رہنے کا ہنگامہ ہوا اور چل بسے۔ ؏

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

کنہیالال جی موگا میں سکون اور خموشی سے رہنے لگے تھے اس کی خبر ان کے قاری کو بہت دنوں سے تھی۔ انھوں نے دھیرے
عنا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ ایڈیٹروں کے بہت ہی تقاضے اور دوستی کے واسطے دینے کے بعد وہ لکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان
اواخر دس برسوں کے اس قدر معیاری اور دلچسپ نہ ہوا کرتے تھے۔ کیوں کہ صرف دوستوں کے دل رکھنے کو وہ لکھ دیا کرتے تھے
لکھتے خط کا جواب مشکل سے دیا کرتے تھے۔ وہ موگا سے پمپری (پونا) چلے آئے اس کی خبر ادبی دنیا کو نہ ہو سکی اس کی وجہ بھی ش
ہے۔ سفر سے بھاگنے والا پتہ نہیں کب اور کیسے یہ شعر پڑھا ہوگا اور پتہ نہیں پڑھا بھی یا نہیں ؎

در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔

اگر مجھے ان کے پمپری (پونا) چلے جانے کی خبر ہوتی تو گذشتہ جولائی ۷۹ء میں ہندوستان انٹی بائیوٹک کے کارخانے دیکھ
سلسلے میں، میں نے پمپری کے اسٹاف کالونی کی بھی سیر کی تھی اگر میں جانتا تو زیارت کر کے اپنی دیرینہ آرزو پوری کر لیتا۔

کنہیالال کپور سے میری ملاقات کبھی کی نہ تھی ہاں ان سے تصنیفی ملاقات ضرور تھی۔ اس بنا پر میں نے ایک مضمون "کنہیالال کپور
اقات" اودھ پنچ لکھنو (تیسرا دور) کے کپور نمبر ۱۹۶۱ء میں لکھا تھا۔ طنز و مزاح کا ذوق رکھنے کی وجہ سے کپور کو میں بہت دنوں سے
یسویں صدی اور دوسرے بہت سے ہندوستانی اور پاکستانی رسالوں میں پڑھ رہا تھا لیکن جب ۱۹۵۸ء میں نقوش لاہور کا ادب عالیہ ن
برج بانو پڑھنے کو ملا "برج بانو" نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ آج تک میں اُردو کو برج بانو لکھتا اور کہتا ہوں ـــــ رادھا کے پجاری
برج بانو سے عشق حقیقت یہ ہے کہ اُردو کے سچے عاشق ہونے کا ثبوت ہے۔ اور اس مضمون کو ادب عالیہ کی حیثیت سے منتخب کرنا بھ

"برج بانو" پڑھنے کے بعد میں نے ان کے مضامین پڑھنے کے لئے ان کی کتاب کی تلاش شروع کر دی۔ سنگ و خشت، شیشہ
و رنگ و رباب بازار سے خرید کر لایا اور پڑھ ڈالا اور اب تک نوک نشتر، بال و پر، نرم گرم، گرد کارواں اور گستاخیاں (پاکٹ
ئزہ)۔ ان کے مضامین کے مجموعے مختلف ذرائع سے پڑھ چکا ہوں۔ لیکن جو بات سنگ و خشت کے مضامین میں ہے وہ دھیرے
دوسرے مجموعے میں کم ہوتی گئی ہے پھر بھی ان کے بہترین مضامین ــ برج بانو، غالب جدید شعراء کی ایک مجلس میں۔ انتساب، صداقت،
ریڈیو خریدا ہے، ایک آرٹسٹ، بڑے آدمی، علامہ ظہور، پیئے اب ایسی جگہ چل کر، اخبار بینی، قومی لباس، نٹ راج، خارستان وغیرہ ان کے مض
مامین میں۔ طنز و مزاح کا شہنشاہ صحت مند ادب کا خالق اب ہم لوگوں کے بیچ نہیں رہا ــ اے برج بانو کے عاشق تجھ کو برج بانو کا سلام
طنز و مزاح نگاروں کا سلام!

دیہی ترقیاتی اسکیمات کی عمل آوری میں شدت و سرعت





■ ریاستی حکومت کے پروگراموں میں مواضعات کو بے ضرر پانی کی سربراہی اولین ترجیح کی حامل ہے۔

■ اس وقت ۵۸۰۰۰ مواضعات اور چھوٹے قریوں میں باولیوں، بورویلس اور محفوظ آبرسانی اسکیمات کی مدد سے ۳۴۱ کروڑ عوام کو پینے کا پانی سربراہ کیا جارہا ہے۔

■ بائیس (۲۲) لاکھ عوام پر محیط ۱۰۶۷ سربراہی آب اسکیمات کے علاوہ ۵۵ر۱ کروڑ روپے لاگت کی ایک بڑی اسکیم روبہ عمل لائی جارہی ہے جس سے فلورائڈ سے متاثرہ ۱۷۱ مقامات کے ۳ر۷ لاکھ عوام کو فائدہ ہوگا۔ صرف دیہی آبرسانی اسکیمات کے لئے جملہ ۸ر۷ کروڑ مختص کئے گئے ہیں۔

■ دیہی آبرسانی اسکیمات کے لئے ۴۸۰ کروڑ روپے لاگت کا ایک ماسٹر پلان تیار کیا گیا ہے۔ چھٹے منصوبے کے دوران میں پینے کے پانی کے مسائل سے دوچار ۸۲۰۰ مواضعات کے عوام کو پانی کی فراہمی کے لئے ۲۳ر۱ کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے۔

■ دیہاتوں کو گندگی سے پاک وصاف رکھنے کے لئے ۵ر۱ کروڑ روپیوں کی گنجائش فراہم کی جائے گی۔

سلسلہ صفحہ ۱۷۷ پر

■ غذا برائے کام پروگرام کے تحت گزشتہ دو برسوں میں ۲۰۰ لاکھ عوام کے لئے روزگار کی گنجائش نکالی گئی۔ علاوہ ازیں ۸۵ کروڑ مالیت کے ۴٫۸۲ لاکھ ٹن غذائی اجناس سے استفادہ کرتے ہوئے ۳۰۰۰۰ کیلومیٹر طویل سڑکوں ۲۵۰۰ اسکول عمارتوں پنچایت گھروں اور کمزور طبقات کے لئے ۱۸۰۰۰ مکانوں کی تعمیر عمل میں لائی گئی۔

■ ۱۸۵۰۰ مواضعات کو ملانے کے لئے اچھے ــــ اور تمام موسموں میں لائق استعمال سڑکیں بچھائی گئیں اور ۱۶۷۰۰ مواضعات کو ملانے کی خاطر ۹۶۵ کروڑ روپے لاگت کا ایک ماسٹر پلان سڑکوں کی تعمیر کے لئے تیار کیا گیا۔

■ طوفان زدہ علاقوں میں سڑکوں کے ۲۹۰۰ کام چھوٹی آبپاشی کے ۲۸۰۰ کام اور عمارات کی تعمیر کے ۴۵۰۰ کام انجام دیئے گئے۔

■ خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں پینے کے پانی کی فراہمی کے لئے ۱۷۰۰۰ بورویلس مہیا کی گئیں۔

■ گزشتہ تین برسوں کے دوران میں ۳۵ کروڑ روپیوں کے خرچ سے کمزور طبقات کے لئے ۳٫۰۵ لاکھ مکانات تعمیر کئے گئے۔

آندھرا پردیش کے مواضعات
ہمہ جہتی ترقی کی سمت
پیش قدمی میں مصروف ہیں

★

جاری کردہ: محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

DIPR 2421/81

کنھیا لال کپور

برج بانو

یہ برج بانو کی داستان ہے۔ برج بانو کون ہے ؟ آجکل کہاں ہے۔ اس کے عجیب وغریب نام کی وجہ کیا ہے ؟ یہ تمام سوال جس آسانی سے کئے جا سکتے ہیں، شاید ان کے جوابات اتنی آسانی سے نہ دیئے جا سکیں۔ تاہم کوشش کروں گا کہ آپ کو برج بانو سے روشناس کرا دوں۔ برج بانو ایک خوبصورت عورت ہے جو پاکستان سے میرے ساتھ ہندوستان آئی ہے۔ کیا میں اسے اغوا کر کے لایا ہوں؟ نہیں صاحب میں تو اتنا شریف واقع ہوا ہوں کہ خوبصورت عورت تو کجا کسی بدصورت بٹوارن کو بھی اغوا کرنا گناہِ عظیم سمجھتا ہوں۔ کیا اسے مجھ سے محبت ہے ؟ یہ ذرا ٹیڑھا سوال ہے۔ اگر آپ یہ پوچھتے ہیں کہ کیا مجھے اس سے محبت ہے تو میں یقیناً اس کا جواب اثبات میں دیتا۔ وہ آجکل کہاں ہے ؟ میرے گھر میں رہ رہی ہے اسے برج بانو کیوں کہتے ہیں۔ یہ سوال مجھ سے کئی اشخاص نے کیا ہے آپ پہلے شخص نہیں ہیں۔ بہرکیف وجہ بیان کئے دیتا ہوں۔ اسے برج بانو کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کی ماں ہندو اور باپ مسلمان تھا۔ آپ کو یقین نہیں آتا۔ بہتر تو یہی ہے کہ آپ مجھ پر اعتبار کریں۔ ورنہ مجھے ایک ایسے شخص کی سند پیش کرنا پڑے گی جو ایک باریش بزرگ ہے۔ جس کو اس عورت کی پیدائش کے سب حالات معلوم ہیں۔ اور جسے میری طرح اس عورت سے عشق ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ عورت لوگوں سے عشق کرتی ہے ؟ آپ نے غلط سمجھا۔ یہ لوگوں سے عشق نہیں کرتی لوگ اس سے عشق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دراصل اس عورت کی زبان میں کچھ ایسی موہنی اور کشش ہے کہ جو شخص بھی اس کی باتوں کو سنتا ہے دل و جان سے اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ آپ میری ہی مثال لیجئے۔ میری عمر تیس برس کی تھی۔ جب میں نے پہلی بار اسے ایک مجلس میں باتیں کرتے ہوئے سنا۔ مجھے فوراً اس سے عشق ہو گیا۔ تیس برس کی عمر ہمارے ملک میں جہاں انسانوں کی اوسط عمر صرف چھبیس سال ہے عشق کرنے کے لئے نہایت غیر موزوں ہے لیکن میں مجبور تھا اور مجھ پر ہی کیا منحصر ہے۔ لکھنؤ میں ایک شخص رتن ناتھ سرشار ہوا کرتا تھا۔ وہ اس عورت کی زبان کے چٹخارے پر کچھ ایسا مرمٹا کہ ساری عمر اس کا نطق اس کی زبان کے بوسے لیتا رہا۔ کہتے ہیں اس شخص نے اس عورت کی شان میں ایک رباعی کہی تھی جس کا ہر مصرعہ پانچسو صفحات پر مشتمل تھا۔ ہاں تو یہ عورت پاکستان سے میرے ہمراہ آئی ہے۔ لیکن چند دنوں سے اُداس سی رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ پچھلے دنوں سے اس سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ نہ صرف اس سے بلکہ مجھ سے بھی۔ کل کا ذکر ہے ایک لمبی چوٹی والے پنڈت جی جو میرے ہمسائے ہیں، مجھ سے کہنے لگے۔

" لالہ جی کیا مجاک ہے۔ آپ کے گھر ایسی عورت رہتی ہے جس کا باپ مسلمان تھا۔" اور میرے کئی لمبے بالوں والے دوست مجھ سے بارہا کہہ چکے ہیں۔ "آپ خواہ مخواہ اسے ساتھ لے آئے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر سرحد پار کرنے سے پہلے آپ اسے ستلج کی لہروں کی نذر کر دیتے۔"

میں جب ایسی باتیں سنتا ہوں تو مجھے سخت رنج ہوتا ہے۔ لیکن برج بانو کے دل پر جو گذرتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ بےچاری ہر روز جلی کٹی سن سن کر تنگ آ گئی ہے۔ آج دوپہر کے وقت جب وہ ڈیوڑھی میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی تو میں نے اس سے کہا۔ "برج بانو! میرا خیال ہے کہ تم پاکستان چلی جاؤ۔ یہاں یہ لوگ تمہیں رہنے نہیں دیں گے۔"

"لیکن کیوں ؟" برج بانو نے چونک کر کہا۔ "میرا قصور ؟"

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تمہارا باپ مسلمان تھا۔"

"لیکن میری ماں تو ہندو تھی۔"

"ولدیت کے معاملے میں ماں کو کوئی نہیں پوچھتا۔"

"یہ عجیب منطق ہے۔"

"جہاں جذبات ہی سب کچھ ہوں وہاں منطق کی دال نہیں گلتی۔"

وہ اور بھی اُداس ہوگئی۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "برج بانو! تمہیں اب یہاں سے اُوشیہ چلے جانا ہوگا۔"

ایک لمحے کے لئے وہ میرے منھ کی طرف دیکھتی رہی جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ پھر کہنے لگی۔

"اُوشیہ کسی شہر کا نام ہے کیا؟"

"شہر کا نام نہیں۔ اوشیہ ہندی زبان میں ضرور کو کہتے ہیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور کہنے لگی۔ "میری نانی بھی ضرور کو اوشیہ کہا کرتی تھی۔"

میں نے پوچھا "تم ضرور کو اوشیہ کیوں نہیں کہتیں؟"

برج بانو نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔ "کہنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔"

"بس اسی لئے تمہیں ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔"

یک لخت برج بانو کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے چلّا کر کہا۔ "ہندوستان میرا گھر ہے۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کس طرح جا سکتی ہوں؟"

"تمہارا گھر پاکستان ہے۔"

"یہ بالکل غلط ہے۔ پاکستان میری فتوحات میں سے ہے۔ میرا اصلی اور قدیمی وطن ہندوستان ہے۔ میں دِلّی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ بچپنا جھونپڑی میں اور شباب لال قلعہ دہلی میں بسر ہوا۔ مجھے ہندوستان کے شہنشاہ نے منھ لگایا۔ دیوان عام میں مجھے سب سے اونچی مسند پر بٹھایا گیا اور جس وقت میرا ستارہ عروج پر تھا کوئی بنگالی، گجراتی، سندھی حسینہ میرے حسن میری بھڑک اور طنطنے کی تاب نہ لا سکی۔ میں ہندوستانی ہوں۔ اور ہندوستان میں رہوں گی۔"

"یہ درست ہے پرنتو۔ ... ..."

"یہ پرنتو کیا بلا ہوتی ہے جی؟" برج بانو نے شرارت سے کہا۔

"پرنتو ہندی میں لیکن کو کہتے ہیں۔"

"ہاں یاد آیا میری نانی بھی لیکن کو پرنتو کہا کرتی تھی۔"

"تمہیں بھی اب لیکن کو پرنتو کہنا ہوگا۔"

"معاف کیجئے۔ میں تو لیکن کو لیکن ہی کہوں گی۔"

"یہی تو تمہاری غلطی ہے۔ اگر لیکن کو پرنتو نہیں کہوگی تو تمہیں یہاں سمجھے گا کون؟"

"ہر وہ شخص ... ..."

معاً ایک قلفی بیچنے والا میری ڈیوڑھی کے آگے ٹھہر گیا برج بانو اپنا آخری فقرہ مکمل کئے بغیر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہاتھ کے اشارے سے قلفی والے کو بلاتی ہے۔

"قلفی کھائیں گے آپ؟" وہ مجھ سے پوچھتی ہے۔

"کیا یہ قلفی کھانے کا وقت ہے۔ میں تم سے نہایت اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آج تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم پاکستان جاؤ گی یا نہیں؟"

"پہلے قلفی کھا لیجئے۔ اس کے بعد ٹھنڈے دل سے آپ کے مشورے پر غور کریں گے۔" اور وہ قلفی والے کو مخاطب کر کے پوچھتی ہے۔

"کیسی ہے یہ قلفی تمہاری۔ میرا مطلب ہے کچھ ٹھکانے کی ہے یا یوں ہی سی ...؟"

قلفی والا کن انکھیوں سے برج بانو کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔ "اجی کیا پوچھتی ہیں آپ۔ میری قلفی! میری قلفی بے نظیر، لاجواب، شاندار!"

برج بانو کے مغموم لبوں پر مسکراہٹ کی لہریں دوڑ جاتی ہیں۔ اور قلفی کھائے بغیر قلفی والے کے ہاتھ پر پانچ روپے کا نوٹ رکھ دیتی ہے اور اس سے چلے جانے کو کہتی ہے۔ قلفی والا چلا جاتا ہے۔ میں اسے بیٹھنے کے لئے کہتا ہوں۔ لیکن وہ بدستور کھڑی ہے

اور مسکرا رہی ہے۔

"کیا فیصلہ کیا تم نے پاکستان جا رہی ہو نا؟"

وہ میری بات اَن سنی کر کے ایک سکھ ڈرائیور کی لاری کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ "وہ دیکھئے۔"

میں لاری کی طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ لاری کے فریم پر چند اشعار اردو میں لکھے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں ؛ خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

لاری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور ایک چھابڑی والا زور سے چلاتا ہوا گلی میں داخل ہوتا ہے۔ وہ "چنا زور گرم" بیچ رہا ہے۔

میرا چنا بنا ہے اعلیٰ
اس میں ڈالا مرچ مصالحہ
چنا لایا میں بابو مزیدار
چنا زور گرم

اب ایک اخبار فروش گلی میں آتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں دس بارہ مختلف اردو روزنامے اور رسائل ہیں۔ برجِ بانو ایک اردو روزنامہ خریدتی ہے۔ لیکن جوں ہی اس کی نظر پہلی سرخی پر پڑتی ہے، اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ جلی حروف میں لکھا ہے :-

"برجِ بانو اب ہندوستان میں نہ رہ سکے گی۔"

ایک لحظہ کے لئے اس پر گویا بجلی سی گر گئی ہے۔ وہ دھم سے گرا چاہتی ہے۔ لیکن میں بڑھ کر اس کا دامن تھام لیتا ہوں۔

دو چار منٹ ہم دونوں خاموش اور مبہوت کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے بعد اس سے کہتا ہوں "ضد نہ کرو بانو تمہیں پاکستان جانا ہی ہوگا۔"

وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کڑک کر کہتی ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ ہرگز نہیں جاؤں گی۔

"لیکن حکومت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم......"

حکومت قانون بنا سکتی ہے لیکن عوام کے فطری رجحانات کو بدل نہیں سکتی۔ جب تک ہندوستان میں قلفی والے سکھ ڈرائیور اور چنا زور گرم بیچنے والے موجود ہیں۔ حکومت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔"

"خدا کی قسم بڑی ضدی ہو تم۔"

برجِ بانو مسکرا رہی ہے اور میں قلفی والے کے الفاظ زیرِ لب دہرا رہا ہوں۔ "لاجواب! شاندار!! بے نظیر!!!

(نوکِ نشتر)

⁂ ⁂ ⁂

(اداریہ)

پھر ملیں گے اگر خدا لایا ……

کنہیا لال کپور اس عہد کے بے مثال طنز و مزاح نگار تھے۔ کلاسیکی ادب کا تسلسل، موضوعات کا تنوع، مزاح کی شیرینی و چاشنی، طنز کا کٹیلاپن، نثر میں شاعری کا رچاؤ کپور کی تحریروں کی چند خصوصیات ہیں۔ کپور نے اپنے مضامین میں جو چند ایک پیروڈیاں لکھی ہیں وہ مزاحیہ شاعری کا بھی بہترین نمونہ ہیں۔ کپور کا سا سخن سنج اور اعلیٰ شعری مذاق رکھنے والا مزاح نگار پیدا ہونا مشکل ہے۔ اس عظیم مزاح نگار کو اس کی زندگی میں تو نظرانداز کیا ہی گیا اور ہمارے ملک کی اس روایت پر بھی عمل نہیں کیا گیا کہ کم از کم موت کے بعد ان کو صحیح خراج عقیدت پیش کیا جاتا۔ "شگوفہ" نے اس خصوصی شمارہ کے ذریعہ اپنا حصہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس نمبر کی ترتیب اور مضامین کے حصول میں مہمان مدیر جناب خواجہ عبدالغفور نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود بڑی دلچسپی لی۔ جس کے لئے ادارہ موصوف کا ممنون ہے۔ زیر نظر خصوصی اشاعت کا تنقیدی حصہ بڑا وقیع ہے۔ ملک کے معتبر تنقید نگاروں نے کپور کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ ہمارا یہ احساس ہے کہ کپور کی شخصیت کے بہت سارے گوشوں کا احاطہ نہ ہو سکا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کنہیا لال کپور نے زندگی کے آخری ۱۵، ۲۰ سال گوشہ نشینی کے سے عالم میں گذارے۔ گو کہ عصری ادب اور رجحانات سے وہ بے خبر نہ تھے۔ کبھی کبھار مضامین لکھنے کے علاوہ روزنامہ "ہند سماچار" میں "میں دیکھتا چلا گیا" کے عنوان سے کالم بھی لکھا کرتے تھے لیکن مجلسی زندگی سے وہ تنگ آ چکے تھے۔ خطوط کے جواب دینا بھی انہیں بار معلوم ہونے لگا تھا۔ انتہا یہ کہ موگا سے پونا منتقل ہوئے تو یہ ہدایت دے گئے کہ ان کی ڈاک ری ڈائرکٹ نہ کی جائے۔ ایک خول میں بند اس شخصیت پر پڑے ہوئے پردوں کو ابھی [illegible] اٹھانا ہے اور یہ کام محقق و ناقد کا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں ایم اے کیلئے کپور پر مقالہ لکھا جا چکا ہے۔ دوسری جامعات میں بھی اسی سطح پر کام ہوا اور ہو رہا ہے۔ لیکن اس موضوع میں اتنی گنجائش موجود ہے کہ اس پر پی ایچ ڈی کا مقالہ [illegible] لکھا جا سکے۔

کپور کے مضامین کے سات مجموعے ہیں۔ جن میں سے آٹھ مضامین (بشمول کرشن چندر اور پطرس پر لکھے گئے دو خاکے) شامل کئے گئے ہیں۔ "ہند سماچار" کے کالم "میں دیکھتا چلا گیا" کی چودہ قسطیں بھی شگوفہ کے قارئین کے لئے منتخب کی گئی ہیں۔ اس کالم میں شائع شدہ کپور کی تحریروں میں بھی بڑی جان ہے۔ اس انتخاب کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ ادبی حلقے ان تحریروں سے زیادہ روشناس نہیں۔

بہر حال ہمیں یقین ہے کہ یہ نمبر پسند کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

شگوفہ نے اس شمارہ کے ساتھ ہی اپنی زندگی کے بارہ سال مکمل کر لئے۔ روایت کے طور پر سالنامہ شائع ہونا تھا۔ لیکن سالانہ خریداروں کو اس کا بہترین بدل "کپور نمبر" کی صورت میں دیا جا رہا ہے۔

▭ شگوفہ کی قیمت میں آئندہ ماہ سے معمولی اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اب عام شمارہ کی قیمت ۲/۵۰ روپے اور سالانہ خریداری ۲۵ روپے ہوگی۔ قارئین شگوفہ سے التماس ہے کہ ہماری مجبوریوں کے پیش نظر قیمت [illegible] اس اضافہ کو گوارا کر لیں۔

BOMBAY MERCANTILE
CO-OPERATIVE BANK LIMITED

BOMBAY MERCANTILE CO-OPERATIVE BANK LTD.

ESTABLISHED · 1939

Mercantile Co-op. Bank Building,
78, Mohmedali Road, Bombay-400 003.

Tel: 32 59 61 (4 Lines)

AUTHORISED CAPITAL	Rs. 2,00,00,000/-
ISSUED AND PAID UP CAPITAL	Rs. 1,10,03,000/-
RESERVES	Rs. 3,51,73,000/-
DEPOSITS	Rs. 61,31,77,000/-
ADVANCES	Rs. 28,01,54,000/-
CASH & INVESTMENT IN GOVERNMENT SECURITIES (Liquid Assets)	Rs. 39,65,05,000/-
WORKING CAPITAL	Rs. 81,21,83,000/-
ANNUAL TURNOVER EXCEEDS	Rs. 16,00,00,00,000/-
LAST DIVIDEND PAID	12 Percent
GOVERNMENT AUDIT CLASSIFICATION	"A"

** First co-operative Bank in India authorised to deal in Foreign Exchange business.

** The Bank encourages savings by offering attractive rates of interest.

** 11% p.a. interest on Fixed Deposits for 63 months.

** 6% p.a. interest on Savings Bank Deposits.

** The Bank also helps you in your living by assisting you in acquiring household utility articals on convenient terms.

THE BANK HAS 26 BRANCHES, 13 IN BOMBAY CITY, 3 AT AURANGABAD 3 AT AHMEDABAD, AND 1 EACH AT BHIWANDI, BARODA, NANDED, PUNE NEW DELHI, SURAT AND SRINAGAR.

ZAIN. G. RANGOONWALA
MANAGING DIRECTOR

FEB. 1981 Rs. 2/-



گڈبڑ حیدرآبادی مرحوم

فبروری ۱۹۸۱ء دو روپے

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

جلد: ۱۴
شمارہ: ۲

فروری ۱۹۸۱ء

سالانہ ۲۵ روپے
بیرونِ ہند سے ۳۵ شلنگ

فی پرچہ ۲ روپے

پبلشنگ، محبوبیہ بک پبلشنگ ورکس پرانی حویلی حیدرآباد ۲۔

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان
حیدرآباد ۲

خط و کتابت کا پتہ: ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔ فون 57716

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

چوُرن

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ۱۴ واں سالانہ اجتماع

۱۰ ر اور ۱۱ ر اپریل ۸۱ء

(بمقام نمائش میدان)

ایک نئے دور کی صبح

یہ یوم جمہوریہ آندھرا پردیش کے عوام کے لئے اہمیت کا حامل ہے اس لئے کہ ریاست اپنے قیام کے سلور جوبلی سال میں داخل ہوگئی ہے

آندھرا پردیش کی حکومت نے شری ٹی۔انجیا کی چیف منسٹری میں ۳ ماہ جیسی قلیل مدت کے اندر عوام کے تمام طبقات، کی تیز رفتار ترقی کے لئے صحیح سمت میں سلسلہ وار اقدامات کئے ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ کمزور طبقات، پر زور دیا گیا ہے۔

فلاحی اقدامات میں سے چند درج ذیل ہیں

★ وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے بیس نکاتی پروگرام اور آنجہانی شری سنجے گاندھی کے پانچ نکاتی پروگرام کی عمل آوری۔

★ کسانوں کی اقتصادی بھلائی کے لئے متعدد ترغیبات اور مراعات جیسے قرضوں کی معیاد ادائی پر نظر ثانی، بر موقع اور معقول مقدار میں کھادوں کی فراہمی، فصلوں کا بیمہ، امدادی قیمتوں میں اضافہ وغیرہ۔ ان مراعات کی مالیت ۹۰ کروڑ روپے ہے۔

★ زرعی صارفین کے لئے میٹر کی بجائے "ہارس پاور" سسٹم پر مبنی برقی قوت کی یکساں شرحیں۔

★ امداد باہمی قرضہ جاتی اداروں کو سود پر سود عائد نہ کرنے کی ہدایت۔ ★ زائد از ۶۵ سال عمر والے زرعی مزدوروں اور بے سہارا افراد کے لئے وظائف کی اسکیم ★ پانچ ایکر تری یا دس ایکر خشکی کی حد تک اراضیات کے مالک کسانوں کو محصول اراضی سے استثنا ★ اجتماعی دیہی ترقی کے مقصد کی حامی اسکیمات ★ مواضعات کو ملانے والی سڑکیں۔ دیہی آبرسانی کمزور طبقات کے لئے مکانات، کمیونٹی آبپاشی، باولیوں کی تعمیر، غذا برائے کام اسکیمات وغیرہ ★ خشک سالی سے متعلق امدادی کاموں کے لئے ۲۷ کروڑ روپیوں کی فراہمی ★ برقی قوت کی تیز رفتار ترقی کے لئے اقدامات۔ اننت پور میں ۴۰ کیلو واٹ کا جدید ہائیڈل پراجکٹ۔ صد فیصد مواضعات کو برقیانے کی اسکیم میں مزید تین اضلاع کی شمولیت۔ ضلع میدک میں صد فی صد مواضعات کو برقیانے کا کام مکمل ہوچکا ہے۔ ★ ملازمین سرکار کی بہتری اور بھلائی کے لئے مراعات۔

★ بدعنوانیوں کی بیخ کنی اور صاف ستھرے نظم و نسق کی فراہمی کے لئے اقدامات ★ اشیائے ضروریہ کی تقسیم کے عوامی نظام میں متعدد اقدامات کے ذریعہ سدھار جن میں تمام سطحوں پر عوامی کمیٹیوں کی تشکیل شامل ہے ★ ریاستی یکجہتی کونسل کا قیام۔ اس قسم کا اقدام کرنے والی یہ پہلی ریاست ہے۔ ★ درج فہرست اقوام و قبائل اور پسماندہ طبقات کے

(سلسلہ صفحہ پر)

شگوفہ کی ایک اور خصوصی اشاعت

کنہیالال کپور نمبر

مہمان مدیر: خواجہ عبدالغفور

تنقید: باقر مہدی، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر یس جے صادق، فضل جاوید، مناظر عاشق، خواجہ عبدالغفور

شخصیت: فکر تونسوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، رام پال، پرویز یداللہ مہدی، بھارت چند کھنہ، رام لال نابھوی، رشید الدین، تمنا مظفر پوری، نریش کمار شاد۔

کنہیالال کپور کے آٹھ منتخب مضامین، کالموں اور خطوط کا انتخاب

قیمت ۵ روپے مجلد لائبریری ایڈیشن ۱۰ روپے

رجسٹرڈ ڈیلیوری پوسٹل چارجس ایک روپیہ پچھتر پیسے علاوہ۔

گڑبڑ ۔ بقلم خود

۔ ساتویں جماعت سے شعر کہتا ہوں اور اب سلور جوبلی منانے کی تیاریاں ہیں۔ طفل میں جناب صبر آفاقی صاحب سے تسلی ملی۔ پاؤں چلنے لگا تو حضرت جلال لکھنوی کا سہارا ملا۔ طفل کے منہ موڑتے ہی حضرت امجد حیدر آبادی نے سر پر ہاتھ رکھا۔ جب شہسواری کا چور دل میں سمایا تو حضرت منشی نظیر احمد ایمان نے سنبھالا دیا۔ غزل بے حد پسند ہے تمام اصناف سخن میں تک بندی کی کوشش کی ہے۔ سنجیدہ شاعری میں ناظم مرزائی ہوں اور رنجیدہ کلام میں خواہ مخواہ کی گڑبڑ مچاتا رہتا ہوں۔ میری سب سے اچھی غزل' نظم یا شعر وہ ہے جس کو میں نے ابھی کہا نہیں ہے۔ جو میں اس میں کہیں مطلع اڑا ہوا ہے اور کہیں مقطع الجھ کر رہ گیا ہے تعلیم کا کوئی سیدھا حساب نہیں ہے۔ البتہ جہالت کا رجسٹر مکمل ہے اور رہا اگر کوئی ڈپلوما تو دیمک چاٹ رہی ہے۔ صحافت پیشہ ہے۔ روزنامہ "انگارے" سے وابستہ ہوں۔

گڑبڑ حیدرآبادی (مرحوم)

شاعری کی دکان

قطعہ چاہتے ہو تو سگریٹ لاؤ
رباعی جو چاہو گلوری منگاؤ
ہو گر نظم درکار، لقمی کھلاؤ
غـزل کی ہے خواہش تو کافی پلاؤ
لگائی ہے میں نے دکاں شاعری کی

مسدس، مثلث، مثمن، مخمس
غرض جو بھی چاہو وہ مجھ سے لکھاؤ
کسی کی ہجو اگر پیش نظر ہے
مجھے چار ہفتوں کا راشن دلاؤ
لگائی ہے میں نے دکان شاعری کی

قصیدہ بھی لکھ دوں گا میں تم کو اچھا
مگر کانپوری چڑھاوا دلاؤ

ضرورت اگر مرثیہ کی ہے لاحق
تو کپڑوں کا بس ایک جوڑا بناؤ
لگائی ہے میں نے دکان شاعری کی

بہ انداز غالب غزل کی ہو خواہش
مجھے آم کا پہلے تحفہ بھجاؤ
اگر آم مہنگا ہو اک بات سن لو
تو بنت العنب کو میرے منہ لگاؤ
لگائی ہے میں نے دکان شاعری کی

اگر فیض و ساحر کے دلدادہ ہو تم
لغت مستند اپنے ہمراہ لاؤ
ترقی پسندوں میں کردوں گا شامل
بلاک اینڈ وائٹ کا شیشہ پلاؤ
لگائی ہے میں نے دکان شاعری کی

شکیل اور حسرت کے عاشق اگر ہو
ستار اور طبلے کو تم ساتھ لاؤ
بنا دوں گا فلموں کا شاعر میں تم کو
دھنیتی کا مجھ کو پڑوسی بناؤ
لگائی ہے میں نے دکان شاعری کی

اگر دل پہ قابض ہیں مخدوم صاحب
بہ انداز مخدوم نظمیں لکھاؤ
نہیں معاوضے کی مجھے کچھ ضرورت
مگر مجھ کو اورنٹ کی پھلی کھلاؤ
لگائی ہے میں نے دکان شاعری کی

دکاں کا اگر تم پتہ پوچھتے ہو
گڑا ہے کی جو ہوٹل ہے تم اس میں آؤ
وہاں بھی اگر میں تمہیں نہ ملوں تو
لطیف اور مدینہ میں تم جھانک جاؤ
لگائی ہے میں نے دکان شاعری کی

ادب کی میں خدمت کئے جا رہا ہوں
بچاؤ میں مرتا ہوں مجھ کو بچاؤ
ادب کے لٹیرو میرا حال دیکھو
میں بھوکا ہوں دو دن کا کھانا کھلاؤ
لگائی ہے میں نے دکان شاعری کی

* * *

قطعہ

اللہ بچائے کہ فقط جیب کی کٹ ہے
چت کا تو پتہ ہی نہیں جو پٹ تھا سو پٹ ہے
ہر سال خسارہ ہی خسارہ ہے جو گڑبڑ
یہ میرا بجٹ ہے، حکومت کا بجٹ ہے

رضا نقوی واہی

غزل اور کثرتِ اولاد

ایک ناقد نے دیا ہے شاعروں کو مشورہ   کم سے کم دس سال تک توڑ دو غزل سے رابطہ
تاکہ اردو شاعری کی جان چھوٹے ضیق سے   ہے مسلط قوم کے اعصاب پر یہ کافرہ
بوجھ آبادی کا بڑھتا جا رہا ہے جس طرح   یوں ہی گردش میں مسلسل ہیں ردیف و قافیہ
حد تو یہ ہے ایک املا بھی نہیں جس کا درست   رات دن غزلوں پہ غزلیں لکھ رہا ہے مسخرہ
کر چکا ہے اپنا مجموعہ مرتب آج وہ   ختم جس نے کل کیا اردو کا پہلا قاعدہ
ایسے مجموعوں کا بالآخر یہی ہوتا ہے حشر   گھر میں بنیوں کے بنا کرتا ہے ان کا مقبرہ

اس لئے اے شاعرانِ تیز گام و بے لگام
اپنے ہاتھوں خود کرو غزلوں کی نس بندی کا کام

جس طرح ہے ناک میں دم صنعتِ اشعار سے   ذہن خائف ہے یونہی بچوں کی پیداوار سے
شاید اس تیزی سے راکٹ بھی نہ پہونچے چاند تک   بڑھ رہی ہے خلقتِ اولاد جس رفتار سے
ماہرِ تخلیق ہے ہر فرد اپنے ملک کا   منسلک ہے نسل سازی کے جو کاروبار سے
ایک ہی راہِ عمل ہے جس پہ سب ہیں گامزن   کوئی پیدل چل رہا ہے کوئی موٹر کار سے
کوئی گھر ایسا نہیں جو مرغی خانے سے ہو کم   روح کیوں لرزے نہ پیدائش کے اس آزار سے
کیا کرے سائیس گھوڑے ہی اگر ہوں بے لگام   کنبہ بندی کی توقع صرف، کیوں سرکار سے؟
فیملی منصوبہ بندی پہ عمل جب تک نہ ہو   قوم کی کشتی نکل سکتی نہیں منجدھار سے

کثرتِ اولاد ہو، یا ہو غزل کا انتشار
قوم کے حق میں ہیں یہ دونوں ہی میعادی بخار

نوٹ: مستند و معتبر نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد نے ایک ادبی سمینار میں فرمایا کہ شاعروں کو کم از کم دس سال تک غزل نویسی ترک کر دینی چاہیئے۔ (واہی)

الحاج برقؔ آشیانوی

امتحاں در امتحاں ہے زندگی

انسان کو زندگی میں ایسے ایسے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ امتحانات در امتحانات سے سابقہ پڑتا ہے جنھیں
امیاب کرنے کے لئے نہ نقل مارنے سے کام چل سکتا ہے نہ چھرا دکھانا کام آتا ہے نہ گھیراؤ سے کچھ نتیجہ برآمد ہوتا ہے
ہڑتال سے کام بنتا ہے اور نہ پرچے آؤٹ کرانے کا کوئی موقع ہاتھ آتا ہے حتیٰ کہ امتحانات دیتے دیتے خود انسانُ
دماغ آؤٹ ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو بہ نفیس نفیس وہ خود آؤٹ ہو جاتا ہے۔ اور زندگی کا میدان چھوڑ کر "بیاک
دی پویلین" روانہ ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہئیے کہ امتحانات دے دے کر فیل ہوتے ہوتے ایک دن اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے

ہم اُن امتحانات کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے جن کو پاس کر کے کوئی میٹریکولیٹ کہلاتا ہے۔ کوئی
۔اے ہو جاتا ہے۔ کوئی ایم۔اے ہو جاتا ہے اور کوئی ڈاکٹر بن جاتا ہے جس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ڈاکٹر جس کو
سند اس بات کی عطا کر دی جاتی ہے کہ جاؤ لقمان تم پاس ہو اور جس کو چاہو قتل کر سکتے ہو اس لئے کہ تم قتل کر کے
قاتل نہیں کہلاؤ گے بلکہ ڈاکٹر ہی رہو گے۔ دوسرا ڈاکٹر وہ ہے جس کو اس بات کی سند عطا فرمائی جاتی ہے کہ
افلاطون اب تم علوم و فنون یا زبان میں جتنی چاہو غلطیاں کر سکتے ہو تمہیں کوئی پوچھ نہیں سکتا اس لئے کہ اب تم
ایچ۔ ڈی ہو۔ اس امتحان کا بھی ہم ذکر نہیں کرتے جس کو پاس کر کے اچھا خاصا آدمی آئی۔ اے۔ ایس ہو جاتا
ہے۔ اس امتحان کا بھی ذکر نہیں کرتے جن کو پاس کر کے آدمی انجینئر بن جاتا ہے اور ایسے پل بناتا ہے جو ایک سرے
ے تیار ہو کر دوسرے سرے تک پہنچنے سے قبل گر جاتے ہیں۔ البتہ ہم ان امتحانات کے بارے میں کچھ کہیں گے جو متذکرہ
ر کسی امتحان پاس کرنے یا کوئی امتحان بھی پاس نہ کرنے کے باوجود انسان کو اپنی عملی زندگی میں قدم قدم پر دینے
تے ہیں۔

چار پانچ سال کی عمر ہونے تک تو خیر و خوبی سے سوائے معمولی قسم کے امتحانوں کے کسی بڑے امتحان کے بغیر
رجاتی ہے لیکن جیسے ہی مدرسہ میں "قید" ہو جانے کے دن آتے ہیں۔ امتحانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے سال

میں ایک بار امتحان ہوتا تو پھر بھی غنیمت تھا لیکن تین ماہ میں ایک امتحان اور چھ ماہ میں ایک امتحان الگ ہوتا ہے پھر جب دیکھا گیا کہ انسان کی زندگی امتحان در امتحان ہے تو ہر ماہ ایک امتحان لیا جانے لگا۔ اس حساب سے سال میں گیارہ امتحانات دینے پڑتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سال میں گیارہ مہینے ہوتے ہیں۔ ہونے کو سال میں بارہ مہینے ہی ہیں لیکن ایک مہینہ بغیر امتحان کے گزر جاتا ہے۔ اس حساب سے تعلیم ختم کرنے تک ان امتحانوں کو ملا کر جن میں کئی مرتبہ فیل بھی ہو جاتے ہیں تقریباً دو سو امتحان دے کر جب اطمینان کا سانس لیا جاتا ہے کہ چلو اب امتحانات سے نجات ملی تو زندگی کے علمی میدان سے نکل کر عملی میدان میں قدم رکھتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ امتحانات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ وہ امتحانات جو زندگی ہم سے لیتی ہے اب شروع ہوئے ہیں۔ یہ ماہانہ یا سہ ماہی یا سالانہ نہیں ہوتے اور نہ ان کی کوئی میقات ہوتی ہے بلکہ یہ ہر سال سے لے کر ہر روز تک بھی ہو سکتے ہیں۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد سب سے پہلے بیروزگاری کا امتحان شروع ہو جاتا ہے اور یہ اس قدر طویل ہوتا ہے کہ اس کا بھی امتحان دیتے دیتے کبھی بال سفید ہو جاتے ہیں اور کبھی منہ کالا ہو جاتا ہے لیکن امتحانات کا سلسلہ ختم نہیں ہونے پاتا۔ بے روزگاری کے امتحان میں بھی سب سے پہلا پرچہ صبر و تحمل کا ہوتا ہے اور اس میں یہ سوال ہوتا ہے کہ آپ بھوکے رہ کر کتنے دنوں تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کی صحت و توانائی کا سوال دیا جاتا ہے کہ آپ دن میں کتنے میل تک پیدل چل کر روزگار کی تلاش کر سکتے ہیں۔ اگر کہیں روزگار کا دروازہ آدھا یا ایک چوتھائی حد تک کھلا ہوا دیکھ کر آپ داخل ہوتے ہیں تو پھر وہاں آپ کو ایک اور امتحان دینا پڑتا ہے جس کو عام طور سے انٹرویو کا نام دیا جاتا ہے۔ انٹرویو میں بعض وقت ایسے سوال کئے جاتے ہیں جن کے جواب میں آپ کو پسینہ آجاتا ہے۔ انٹرویو کے دوران سوالات کے جوابات دینے کے بارے میں ایک صاحب کا کہنا ہے کہ جواب سوچ سمجھ کر صحیح جواب دینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے بلکہ جیسے ہی سوال کیا جائے فوراً ڈٹ کر بلکہ ڈانٹ کر جو جی میں آئے غلط یا صحیح کچھ بھی کہہ دینا چاہیئے تاکہ سوال کرنے والا مرعوب ہو کر اُسی کو جواب تسلیم کر لے کیونکہ اکثر انٹرویو میں خود سوال کرنے والے کو بھی صحیح جواب کا علم نہیں ہوتا۔ اب تو ملازمتوں کے لئے آپ کی تعلیمی قابلیت کا پھر ایک بار امتحان لیا جانے لگا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ پڑھائی میں آپ نے محنت کرکے کامیابی حاصل کی ہے۔ کیونکہ آجکل طلباء پڑھائی میں محنت کرنے کے بجائے کامیابی کے کئی دوسرے طریقوں میں محنت کر کے امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ایسے امتحانات دیتے دیتے جب آپ کے بھاگوں ایک آدھ چھینکا ٹوٹ جاتا ہے اور ذریعہ روزگار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر دوسرے امتحانات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے تو والدہ صاحبہ کی جانب سے شادی کا تقاضہ شروع ہو جاتا ہے کیونکہ اب والد صاحب میں لڑائی جھگڑے کا دم خم باقی نہیں رہا اور وہ صلح جوئی پر اُتر آئے ہیں۔ چنانچہ پھر آجائیے تو یہ سلسلہ از سر نو شروع ہو سکتا ہے۔ والد صاحب شادی کے بارے میں اس لئے نہیں سوچتے کہ جس عذاب میں وہ خود مبتلا ہو گئے ہیں اس عذاب میں آپ کو مبتلا نہیں دیکھنا چاہتے۔ البتہ والدہ صاحبہ کی تائید میں عزیز و اقارب اور دوست احباب تک کو آپ کی شادی کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ ان تمام لوگوں کو اس فکر میں گھلنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شادی کے قابل آپ نہیں ہوئے ہیں بلکہ آپ کی شادی کرنے کے قابل وہ تمام لوگ ہو گئے ہیں جو بغیر صابن کے ہاتھ دھو کر

آپ کے پیچھے پڑ گئے ہیں ۔ اور آپ ہیں کہ اُن کے لئے شادی کا دستر خوان چننے سے گریز کرتے چلے آرہے ہیں ۔ بالآخر آپ کی پسند یا ناپسند کی لڑکی یا اس کے جہیز سے شادی ہوجاتی ہے تو آپ کو پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں ملازمت اور بیوی دو ایسی چیزیں ہیں کہ اُن کا آپ کی فطرت کے مطابق ہونا ضروری نہیں ۔ اس کے بعد پھر جو امتحانات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو یہ دیکھ کر آنکھوں میں پانی آجاتا ہے کہ ممتحنِ ازل آدمی کے پرچے میں تو بہت کم نمبر دیئے ہیں لیکن آل اولاد کے پرچے میں دل کھول کر زیادہ سے زیادہ نمبر دے دیئے ہیں ۔ جس کی وجہ سے آپ کی زندگی میں امتحانات کا سلسلہ ختم ہونے نہیں پاتا ۔ کچھ ہی عرصہ بعد آپ پر یہ حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے کہ آپ نے شادی کر کے بیوی سے گھر نہیں بسایا ہے بلکہ ایک ممتحن کو اپنے سر پر سوار کر لیا ہے ۔ جو سالانہ یا ششماہی یا سہ ماہی یا ماہانہ امتحان لینے کا پابند نہیں ہے ۔ یہ ممتحن مہینے تک تو کیا انتظار کرے گا ۔ دن میں دس وقت آپ کا امتحان لیتا ہے آپ گھر سے نکل کر آفس جاتے ہیں تو اس سے پہلے آپ کو چند سوالات کے صحیح جوابات دینے پڑتے ہیں جن کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہوتی ۔ اور ان میں سے انتخاب کی سہولت بھی نہیں دی جاتی مثلاً جملہ سوالات میں سے صرف چھ سوالات حل کئے جائیں ۔ البتہ چوتھا سوال لازمی ہے جو تنخواہ سے متعلق ہے ۔ صفائی اور خوش خطی کا تو کوئی موقع ہی نہیں ۔ البتہ بہانہ بازی اور چرب زبانی کیلئے پانچ نمبر محفوظ ہو سکتے تھے لیکن اس کی گنجائش بھی نہیں رکھی جاتی ۔ یہاں تو ہر سوال کا جواب ضروری ہے ۔ اگر کسی سوال کو "مثلاً روزانہ شام کو دیر سے کیوں آتے ہیں" مستثنیٰ قرار دینے کی گزارش کی جائے تو اسی سوال پر زیادہ زور دیا جاتا ہے بلکہ اس سوال کے ضمن میں کئی اور سوالات کئے جاتے ہیں جن کی مثال اہم سوال کے تحت ذیلی سوالات یعنی الف ۔ ب ۔ ج ۔ د ۔ کی ہوسکتی ہے ۔ غرض شادی کے بعد سے زندگی میں روزانہ کئی امتحان دینے پڑتے ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ آپ کسی بھی امتحان میں پاس نہیں ہوتے ۔ اس لئے کہ ممتحن آپ کے ہر جواب کو غلط قرار دے کر کاٹ دیتا ہے ۔ خواہ آپ قوی سے قوی دلائل اور شواہد سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کیوں نہ کریں ۔ چنانچہ آپ ہر روز امتحانات دیتے اور فیل ہوتے رہتے ہیں کچھ عرصہ گذرنے کے بعد یہ احساس پیدا ہوجاتا ہے کہ چاہے پاس ہوں یا فیل مگر امتحانات دینے کی تاب و توان تو آپ میں آگئی ہے ۔ ابھی یہ احساس قوی نہیں ہونے پاتا کہ بچے بڑے ہوجاتے ہیں اور آپ کا ایک نہ ایک امتحان لینا شروع کر دیتے ہیں ۔ اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی ۔ اور اتنے بے معنی یا بے بنیاد نہیں ہوتے جتنے اُن کی والدہ کے ہوتے ہیں لیکن جوابات اتنے مشکل ہوتے ہیں کہ ایک سوال کا جواب دینا بھی ممکن نہیں ہوتا ۔ حتیٰ کہ کمرۂ امتحان سے جوابات کے پرچے پر نام اور رول نمبر درج کئے بغیر ہی نکل جانا پڑتا ہے ۔ ایک یہ سوال کرتا ہے کہ اسکی اسکول فیس کب دی جائے گی ۔ دوسرا سوال کرتا ہے کہ اس کا یونیفارم کب سلوایا جائے گا ۔ تیسرا سوال کرتا ہے کہ اس کی کتابیں کب دلوائی جائیں گی ۔ چوتھا سوال کرتا ہے کہ اس کو بس کا پاس کب دلایا جائے گا ۔ پانچواں سوال کرتا ہے کہ ماسٹر صاحب کی ٹیوشن فیس کب دی جائے گی ۔ چھٹا سوال کرتا ہے کہ اس کو بائیسکل کب دلائی جائے گی ۔ ساتواں سوال کرتا ہے کہ سالانہ امتحان کی فیس کب دی جائے گی جس کے ادخال کی آخری تاریخ سر پر آگئی ہے ۔ آٹھواں سوال کرتا ہے کہ اُسے اسکول میں کب شریک کروایا جائے گا ۔ نواں سوال کرتا ہے کہ ......

...... لیکن چھوڑیئے یہ سوال نہایت نامعقول ہے ۔ اور آخر میں سب مل کر ایک مشترکہ سوال کرتے ہیں ۔ آپ نے اُن کا ہوم ورک کیوں نہیں کیا اور ایک ذیلی سوال یہ بھی کرتے ہیں کہ آپ اُن کے ہوم ورک میں غلطیاں کیوں کرتے ہیں جس کی وجہ

سے آپ کے بجائے معصوم بچوں کو ناحق سزا ملتی ہے اور جب سالانہ امتحان کا زمانہ آتا ہے تو تمام بچوں کی جملہ چھ سات جماعتوں کے امتحانات آپ کو دینے پڑتے ہیں اگر کوئی بچہ فیل ہو جاتا ہے تو آپ پر برس پڑتا ہے کہ آپ نے اس کے امتحان کی خاطر خواہ تیاری کیوں نہیں کی۔

یہ تمام امتحانات تو آپ کو درونِ خانہ دینے پڑتے ہیں۔ پھر بیرونِ خانہ آپ کو جن امتحانات سے سابقہ پڑتا ہے اُن کی تفصیل سُنیئے۔ بنیا آپ کو غلے کا پرچہ دے دیتا ہے تو وہ قرض خواہ جس سے آپ نے سودی قرض لیا تھا۔ اپنا سوال لئے کھڑا ہے کہ اصل نہیں تو کم از کم سود ادا کریں۔ وہ دوست جن سے آپ نے سودی قرض لیا تھا فوری جواب مانگ رہے ہیں۔ اس سے آگے بڑھتے ہیں تو زندگی آپ سے اور بھی کئی قسم کے امتحان لیتی ہے۔ شکر کے لئے کیو میں تین چار گھنٹے کھڑے رہ کر اپنی صحت و توانائی کا امتحان دینے کے بعد ایک بھی نمبر لئے بغیر ناکام ہو کر گھر لوٹتے ہیں کیونکہ آپ کا نمبر آنے سے پہلے دوکان کے بند ہونے کا نمبر آجاتا ہے۔ پھر جب بیماریاں امتحان لینے پر آتی ہیں تو آپ سے لے کر آپ کے بیوی بچوں سب کا امتحان لے لیتی ہیں اور جواب تنہا آپ کو دینا پڑتا ہے۔ اُن امتحانوں سے اگر خیر و خوبی سے گذرتے ہیں تو ڈاکٹروں کے بل وصول ہوتے ہیں تب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک نئے امتحان کے پرچے ہاتھ میں آگئے ہیں۔ جن کا فوری بلا استثنٰی جواب دینا ضروری بلکہ اشد ضروری ہے۔ بہر حال جب زندگی کا سفر شروع ہوتا ہے تو بڑی خوش فہمی کے ساتھ یہ مصرعہ گنگنایا جاتا ہے۔ ؏۔

برق صاحب آشیاں ہے زندگی

اور جب زندگی کی ریل اسٹیشن در اسٹیشن گذرتی ہوئی منزل کے قریب پہنچتی ہے تو یہ مصرعہ بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے۔ ؏۔

امتحاں در امتحاں ہے زندگی

طارق بشیر خاں
(جدّہ)

ببّو کا خط، گڈّو کے نام

ہیلو مسٹر گڈّو،

ہاؤ ڈو یو ڈو!

بھائی کہاں ہو، کس حال میں ہو، مدتیں گزریں، عرصہ ہوا ملاقات نہیں، کوئی بات نہیں۔ لگتا ہے کسی پولٹری فارم میں پرورش پا رہے ہو۔ خاص غذائیں کھا رہے ہو۔ عام غذا کھانے والا تو ہر دوسرے دن روتا دھوتا ملتا ہے۔ بھائی ایک بات ہے، رونے دھونے والا آدمی ملتا ضرور ہے۔ ایک تم ہو کہ ملاقات سے بھی گئے۔ ہم ہیں کہ تمہیں خط لکھ کر آدھی ملاقات ہوئی کو غنیمت جانتے ہیں اور تم اس پر بھی نہیں بولتے چالتے۔ خیر میاں جہاں رہو، خوش رہو، ہم تو اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں اور جی ٹھنڈا کرتے ہیں۔ تمہاری مرضی 'جواب دو' نہ دو۔

اِدھر کل سے ہماری آپا بیمار ہے۔ امّی کو مصروفیت کا بخار ہے اور ابّو کا بہت ہی لمبا کاروبار ہے۔ وہ کراچی سے لوٹتے ہیں تو ان کی پنڈی کی سیٹ بک رکھی ہوتی ہے اور وہاں سے پلٹتے ہیں تو پھر دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ دورے سے واپسی پر غیر ملکی مہمانوں کے ڈنر انہیں نہیں چھوڑتے اور اگر چھوڑتے ہیں تو دورہ پھر شروع ہو جاتا ہے۔ ابّو اسے کاروباری دورہ قرار دیتے ہیں مگر امّی اسے دل کا دورہ کہتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ بزرگوں میں سے کسے درست قرار دیں۔ بزرگوں کو ویسے بھی اس عمر میں جرح اور بحث میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ ظاہر ہے ہاضمہ ان کا درست نہیں رہتا، غذائیں انہیں مزہ نہیں دیتیں، دوائیں انہیں راس نہیں آتیں۔ دعائیں ان کے کام نہیں آتیں اور نتیجہ میں دورہ ناگزیر ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ دونوں کی تشخیص مختلف ہوتی ہے۔ اختلاف رائے بھی بزرگوں میں عام دیکھا گیا ہے بلکہ مرا خیال تو یہ ہے کہ بزرگ جب تک اختلافِ رائے نہ کریں، ان کی بزرگی مشکوک

رہتی ہے۔

بزرگی بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں، البتہ بزرگ خود کچھ اب ویسے نہیں رہے۔ بعض تو اتنے سخت دل اور تنک مزاج ہوتے ہیں کہ زندگی بھر ایک ہی لکیر پہ چلتے رہتے ہیں اور پھر مصیبت یہ کہ دوسروں کو بھی اسی لکیر پہ چلائے رکھنے کی ضد کرتے ہیں۔ وجہ تو اس کی نگاہ کی کمزوری اور ضعفِ دماغ ہوا کرتے ہیں مگر وہ اِنہیں آثار قیامت سے تعبیر کر کے سَند لگا دیتے ہیں۔ یہ وہ موڑ ہے جہاں جنریشن گیپ ــــ (GENERATION GAP) کا مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسے بزرگوں کو اپنی نوعمری اور نوجوانی کے سب اچھے بُرے واقعات بھول جاتے ہیں اور اگر کبھی یاد بھی آتے ہیں تو اُن واقعات پر اُنہیں حماقت کا احساس ہوتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بزرگ ان حماقتوں کو بچپن کی نادانیوں پر محمول کرتے ہیں۔ جوں جوں بزرگ، بزرگ تر ہوتے جاتے ہیں' نادانیوں کی فہرست طویل ہوتی جاتی ہے اور ایک وقت آتا ہے جب انہیں اپنی ہر پرانی بات نادانی محسوس ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بزرگ صبح کہی ہوئی بات سے شام کو گریز کرنے پر اُتر آتے ہیں۔ اِس منزل پر وہ اِسے نسیان کے نام نامی موسوم کرتے ہیں جبکہ وہ عمر کا تقاضہ ہوتا ہے یوں وہ مرحلہ وار ناموں میں تبدیل کرتے رہتے ہیں، حالانکہ بات وہی رہتی ہے۔

اختلافِ رائے کا عارضہ بھی بزرگوں کو اختلاجِ قلب کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے۔ فرض کرو چار بزرگ تمہارے گھر مہمان بن کر آتے ہیں تو طے کر لو کہ ان میں سے ایک چائے نہیں پئیں گے کہ انہیں ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف ہے اور ہائی بلڈ پریشر دل کے لئے کسی بھی وقت جھٹکے کا باعث بن سکتا ہے۔ دوسرے بزرگوار کو جوڑوں کے درد کی شکایت ہوگی اور وہ چائے کے علاوہ کسی بھی دوسری چیز کو ہاتھ لگانے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ ایک بزرگوار لسّی کا تقاضہ کریں گے کہ انہیں حکیم فلک سیر نے بے خوابی کا علاج لسّی تجویز کیا ہوگا تو چوتھے محترم و مکرم کو حکیم فلک سیر ہی نے لسّی سے پرہیز کی تاکید کر رکھی ہوگی۔ لہٰذا تم پہ چہار بزرگواران کے لئے بیک وقت چار مختلف اشیاء فراہم کرنے پہ مجبور ہو گئے اور اس طرح کہ ان میں سے ہر ایک، دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے اپنی پسندیدہ غذا نوشِ جاں کرے گا۔ اس میں کسی متعدی مرض میں مبتلا ہو جانے کا ڈر نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ اہتمام صرف دوسروں کی نظرِ بد سے بچنے کی خاطر کیا جائے گا۔

میاں! کیا کیا سُنائیں۔ ایک بات ہو تو جی ہلکا ہو۔ ایک پھوڑا ہو کہ پھوٹے تو جان چھوٹے۔ اپنی تو جان مسلسل مشکل سا شکار ہے۔ تم تو کچھ کہتے ہی نہیں اور ایک ہم ہیں کہ چُپ رہتے ہی نہیں۔ سچ ہے کسی کا کہنا کہ دل کا حال دیوار سے کہو مگر چُپ نہ رہو کیونکہ چپ دہکتی آگ ہے، زہریلا ناگ ہے۔ اب معلوم نہیں تمہاری خاموشی کے پیچھے کیا راز ہے! ممکن ہے تم اس تپش کو محسوس نہ کرتے ہو مگر بھئی سچی بات ہے کہ اپنا تو دل جلتا ہے، دھواں نکلتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ تمہیں دوست جانا تو اپنا سب دکھڑا کھول بیٹھے لیکن یار تم کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ میں کسی "بزرگ دشمن عناصر" تنظیم کا رکن بن گیا ہوں، نہیں، ہرگز نہیں میں تو صرف اپنے تجرباتِ زندگانی کا نچوڑ تمہارے سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ کل کلاں تم ؟ کسی بزرگ کے ہتھے چڑھ جاؤ تو تمہیں معلوم رہے کہ اب زمانہ بہت بدل چکا ہے۔ کل کلاں کے چھوکرے، دِلّی کے روڑے اب بزرگ ہو گئے ہیں۔ توبہ توبہ یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ چالیس پچاس برس میں لونڈوں کے نصیب یوں بدلیں گے اُنھیں اچھے بھلے جوان جہان لوگ نانا ابا، دادا ابا کہیں گے۔

ابھی پرسوں ہی کی بات ہے کہ ایک بزرگوار نے مجھے فلم کا ٹکٹ خریدتے دیکھا تو سیدھے آئے مرے پاس دوڑتے اور کڑک کے بولے "میاں! یہ جو تم نے پتلون پہن رکھی ہے، کبھی تمہارے ابّا نے بھی پہنی تھی"۔ اب تم ہی کہو، میں بھلا کیا کہتا۔ غم اور غصّے کے جذبات کو ضبط کر کے نہایت تحمّل اور بردباری سے عرض کیا "حضور وہ دوسرے زمانے کے لوگ تھے، جو کچھ ان کے زمانے میں مقبول تھا، اُنھوں نے کھایا پہنا ہوگا۔ ہم اپنے زمانے کے رواج سے رہتے ہیں۔" نہایت گونج دار آواز میں بولے "اچھا تو تم لوگوں کے پاس آکر وقت بدل گیا ہے؟ کیا تعلیم ہے تمہاری۔ کتنی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں تم نے۔ کتنا گھمنڈ ہے اپنی تعلیم اور اپنے رواج پر۔ لاؤ تو ذرا تمہاری تعلیم دیکھیں۔ ہاں تو بولو دو روپے فی مرغی کے حساب سے سات مرغیوں اور تین چوزوں کے پیسے جوڑو تو ——" اور جب میں نے ذرا حیل و حجت کر کے انھیں سمجھایا کہ حضور مرے پاس کیلکولیٹر نہیں ہے، ورنہ ابھی سات سو مُرغیوں اور ان کے اکیس سو چوزوں کا حساب جوڑ کے دکھا دیتا۔ تب انھوں نے بڑی گرمی سے کہا "بس یہی ہے تمہارا نیا زمانہ اور نئی تعلیم۔ میاں جب ہم تمہاری عمر کے تھے، فرفر حساب کے بیسیوں سوال نکال لیتے تھے۔" میاں وہ تو خیر ہوئی کہ ٹکٹ کی لائن چل پڑی اور ہم نے بزرگوار سے پہلے ہی ٹکٹ لے لیا۔ (دراصل انھیں غصّہ ہی اِس بات کا تھا کہ ہم نے ان کا ٹکٹ خریدنے سے انکار کر دیا تھا) وگرنہ وہ ہمیں ڈھیر کرنے کے موڈ میں تھے مگر دیکھو تو کتنی عجیب بات ہے کہ جس فلم کے لیئے الگ سے خاص بورڈ لگا ہوا تھا "صرف بالغوں کے لیئے" اُسی فلم کو دیکھنے وہ قبلہ بھی آئے ہوئے تھے۔ حالانکہ یہ بھی بزرگوں سے سُنا ہے کہ ایسی فلمیں صرف نابالغ یا نو بالغ دیکھا کرتے تھے۔ بزرگوں کو ایسے بورڈ دیکھ کر ہی پتہ چل جاتا تھا کہ اُنہیں یہ فلم نہ دیکھنے کی تنبیہہ کی جا رہی ہے۔ واقعی اگلے وقتوں کے بزرگ بہت سمجھدار ہوتے تھے کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ عاقل را اِشارہ کافی است۔

بزرگوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ اکثر بزرگ قبل از وقت بزرگی اوڑھ لیتے ہیں۔ اُنھیں سٹھیانے کی ضرورت پیش ہی نہیں آتی اور وہ چالیس پینتالیس ہی کے پیٹھے میں ایسی ایسی حرکتیں کرنے لگتے ہیں کہ لا محالہ "پوت کے پاؤں پالنے میں" والا محاورہ یاد آنے لگتا ہے۔ گو کچھ اُن سے بھی زیادہ شتابی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور تیس پینتیس ہی کی صغیر سنی سے دادا ابّا قسم کی حرکتوں پر اُتر آتے ہیں۔ یہ بہت خطرناک نوع کے بزرگ ہوتے ہیں۔ اِن کی بھنویں تنی رہتی ہیں۔ تیوری بَل سے مزیّن رہتی ہے اور منہ جھاگ سے لبریز رہتا ہے۔ صحیح معنوں میں ناک پر غصّہ دیکھنا ہو تو ایسے بزرگ اصلاً محاورے کے مترادف ہوا کرتے ہیں۔

بڑے بتایا کرتے تھے کہ بچوں کو صحیح تربیت ماں کی گود میں ملتی ہے اور یہ تربیت زندگی بھر آدمی کے کام آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگ اگر بہت زیادہ بزرگی بھی پا جائیں تو بھی ایسی تربیت کے اثرات برقرار رہتے ہیں۔ مگر یار لوگ آج کل بزرگوں کو بھول جانے کی بیماری میں مبتلا رہنے لگے ہیں۔ مرے ابّو کے اکثر دوست ایسے ہیں جن کے بزرگوں کو صحیح طور پر فریجڈیئر کا دروازہ کھولنا نہیں آتا یا فلش کے طریقے سے بالکل خالی ہوتے ہیں اور اکثر تو وہ ایسی بے پرواہی سے کھانستے ہیں کہ پورے ڈرائینگ روم میں مچھر مار دوائی چھڑکنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن کیا کریں ابّا جان کے اکثر دوست باتوں میں ایسے منہمک ہو جاتے ہیں کہ انھیں اپنے ہمراہ لائے گئے بزرگوں کی بابت یاد ہی نہیں رہتا۔ پہلے ایسی باتیں بچوں کے لئے کہی جاتی تھیں مگر اب زمانہ بدل گیا ہے اور وقت ہمارے تمہارے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔ بچے عقلمند ہو گئے ہیں، نوجوانوں کی عقل

مہنگائی نے مار دی ہے ، باقی جو بچی تھی ، وہ انھوں نے باقی ماندہ بزرگوں پہ وار دی ہے۔ اب بزرگ بچوں کی سی توجہ اور نگرانی کا تقاضہ کرتے ہیں۔ سگریٹ تھامنے تک کی طاقت نہیں مگر وہ اصرار کناں ہیں کہ انہیں سگریٹ سلگا کر دی جائے۔ سگریٹ پی رہے ہوں تو چائے دانی اور راکھ دان میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ ذرا کسی نئے قسم کے گھر میں جانا ہو تو لوٹا ہاتھ میں لیۓ ٹونٹی کے سامنے کھڑے شرمندہ ہو رہے ہوتے ہیں کہ ٹونٹی کھولنی نہیں آتی۔ اور افسوس یہ کہ مہمان بزرگوں کو ساتھ لانا ضروری سمجھتے ہیں مگر آکر بھول جاتے ہیں۔ میزبان کو بار بار یاد دلانا پڑتا ہے کہ بھائی صاحب یہ آپ کے بزرگ ہیں۔

اچھا یار! چھوڑو ان باتوں کو ، تم اپنی کہو۔ بزرگوں کی باتیں تو چلتی ہی رہیں گی اور اگر ہم باتیں بڑھاتے جائیں گے تو بڑھتی جائیں گی مگر بزرگوں پر ان کا اثر نہیں ہونے کا۔ ویسے بھی وہ کسی بات کا اثر کب لیتے ہیں۔ زندگی بھر غلطیاں کرتے ہیں ، ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ سنبھلتے ہیں مگر کسی تجربے کا اثر ان پر کبھی نہیں دیکھا گیا۔

امید ہے تم اپنے بزرگوں سمیت بخیر ہوں گے۔ ویسے بھی بزرگ بخیر ہی رہتے ہیں، مشکل ہمیشہ چھوٹوں کو درپیش رہتی ہے۔ تم خط لکھتے رہا کرو اور بزرگوں کے احوال سے آگاہ کرتے رہا کرو۔ ممکن ہے تمہارے بزرگوں کی کوئی بات، ہمارے بزرگوں کے کام آسکے یا پھر تمہارے بزرگ ہمارے بزرگوں کی کسی خوش عملی سے عبرت پکڑیں۔

تمام ہم عمروں کو سلام کہنا اور سب بزرگوں کو بہت بہت پیار۔ ویسے بھی یہ اللہ کے پیارے ہوتے ہیں اور نہیں تو اللہ کو پیارے ہونے کے قریب ہوتے ہیں۔ سو پیار ہی پیار۔

تمہارا خیر خواہ
پپّو! ۔

مسعود جھانپڑ

ہزل

یہ ان کی ٹیپ ٹاپ ارے میرے باپ رے
لوگوں کے دل میں پاپ ارے میرے باپ رے
غصّے میں جا رہے ہیں مرے باپ کی طرف
وہ اور ان کا باپ ارے میرے باپ رے
درزی بھی اپنے ہاتھ سے لیتے ہی چیخ اٹھا
ان کی کمر کا ناپ ارے میرے باپ رے
دل بر کے ایک دل پہ لگانے کو قتل سے گئے
سب اپنے دل کی چھاپ ارے میرے باپ رے
میں نے تو اس ردیف میں چھیڑی ہے اک ہزل
کیوں کہہ رہے ہیں آپ "ارے میرے باپ رے"

محمد برہان حسین

سو فٹ کا ناگ

بس کی قطار میں کھڑے ہوئے ایک صاحب نے بغیر تعارف اور بغیر میرے سوال کئے ہوئے کہا۔ "سوفٹ کے ناگ سانپ والی خبر درست معلوم ہوتی ہے۔" دل میں آیا اُن صاحب پر حملہ کر دوں مگر آدمی ذرا صحت مند ہی تھا اس لئے ارادہ ترک کردیا اور یہ سوچ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کم ازکم مجھے طیش میں خوف خدا تو رہا۔

دراصل، ایک مقامی اردو اخبار میں کسی طرح یہ خبر چھپی تھی کہ "قلعہ گولکنڈہ کے کھنڈرات میں ایک، ایک سوفٹ لمبا ناگ سانپ پایا گیا جس کے پھن کا قطر ڈھائی گز ہے۔" بس پھر کیا تھا۔ سورج کے ڈھائی تین گز بلند ہونے تک یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ بھئی افواہوں کے لئے، ہندوستان میں زبان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے لوگ کہتے ہیں۔ سرکاری کام مقامی زبان میں ہونا چاہیئے لیکن افواہ اگر مدارس میں بھی اردو میں پھیلائی جائے تو چند گھنٹوں میں سارے صوبہ میں پھیل جائے گی۔

بس اسٹاپ پر مختصر سی قطار تھی۔ اس میں سے ایک صاحب جو صورت اور لباس سے پڑھے لکھے نظر آتے تھے مسکین صورت بنائے میری طرف بڑھے۔ ایک لمحہ کے لئے میری توجہ سانپ سے ہٹ گئی اور میں سوچنے لگا۔

"بے چارہ شاید بھیک مانگنے والا ہے۔" مگر اُس نے میرے قریب آکر جیب سے ایک اردو اخبار نکالا اور دردناک لہجہ میں التجا کرنے لگا کہ میں سانپ والی خبر پڑھ کر سنادوں۔ میں نے پڑھ کر سنادی تو وہ یہ پوچھنے لگا۔ "قلعہ کسے کہتے ہیں؟ ..... گولکنڈہ کا قلعہ کب، کس نے اور کیوں بنایا تھا اور اس وقت وہاں کون رہتا ہے۔" اُس نے سانپوں کی اقسام اور خصوصیت سے ناگ سانپ کی صورت شکل کردار کے متعلق بھی سوالات کئے۔ لیکن اس سلسلہ میں ہمیں صرف ایک ہی بات معلوم تھی کہ اگر ناگ سانپ کاٹ لے تو بس مرجانا چاہیئے۔" اور یہی بات ہم نے اُس کو بھی بتلا دی گویا اس افواہ نے اُس شخص کی معلومات میں زبردست اضافہ کردیا۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کے اچھے اور برے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ چاہے وہ افواہ جیسی بدنام زمانہ چیز کیوں نہ ہو۔ اور حالیہ دور میں، حکومت کی افواہ دشمنی پالیسی کی وجہ سے اس ہندوستانی رسم پر برے اثرات پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے میرے خیال میں افواہ پھیلانے سے منع کرنے کے بجائے کچھ اس قسم کی نصیحت

مناسب رہے گی۔

"نقصان دہ افواہیں مت پھیلا ئیے۔"

"افواہیں معلومات کا ذریعہ ہیں۔ ان کا صحیح استعمال کیجئے۔"

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک صاحب جو صورت سے نہایت غیر ذہین انسان نظر آتے تھے۔ ذہانت کا ثبوت دینے بیٹھ گئے۔ غیر ضروری بے تکلفی سے کہنے لگے۔

"یار! یہ تو گپ لگتی ہے۔"

میں نے لاپرواہی سے کہا۔ "لگنے دیجئے۔"

وہ بولے۔ "ارے! لگنے دیجئے ..... کیا مطلب؟"

ایک اور صاحب بولے۔ "دراصل اخبار والے پبلک کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ اب دیکھئے کتنے بے وقوف اس سانپ کو دیکھنے جائیں گے۔"

اتنے میں ایک لڑکا دوڑا ہوا آیا اور اُن سے بولا "ممی اُدھر ٹیکسی میں بیٹھی ہیں۔ ہم لوگ سانپ دیکھنے جا رہے ہیں آپ بھی چلئے۔" اُن صاحب نے ہم سب سے منہ پھیر کر ٹیکسی کا رخ کیا اور بیٹھ کر چلے گئے۔

آفس پہنچا تو دیکھا سارا اسٹاف داخلے کے ہال میں جمع ہے اور بے حد شور ہو رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ زیر بحث عنوان سو فٹ سانپ ہی کا تھا۔ میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میرے عزیز ساتھی شرفو بھائی دوڑ کر آئے اور پوچھنے لگے۔

"ہم سب سو فٹ کا سانپ دیکھنے جا رہے ہیں تم بھی چلو گے ——؟"

میں نے کہا "شرفو بھائی! اس میں دیکھنا کیا ہے۔ پہلے تو مجھے شک ہے کہ یہ خبر غلط ہے۔ دوسرے اگر درست ہو بھی تو اس کے دیکھنے سے کیا ملے گا۔"

شرفو بھائی نے کہا۔ "یار یہ بات عجیب ہے لوگ شکسپیر کے ڈرامے پڑھتے ہیں اسٹیج پر دیکھ کر واہ واہ کرتے ہیں اس سے ان کو کیا ملتا ہے؟ ارے بھائی! ملتا کچھ نہیں ہے صرف ایک تھرل سی ہوتی ہے جس کا لطف برسوں بلکہ ساری عمر رہتا ہے۔ سمجھے؟"

میری بیوی ٹھیک ہی کہتی تھی یہ شرفو میاں، شیطان کا بھائی ہے کیا بحث کرتا ہے کم بخت، ہماری ساری فلاسفی چوپٹ کر دی اور میں سوچنے لگا۔ واقعی اتنے سارے لوگ بے وقوف تو نہیں ہو سکتے۔ یقیناً مجھ میں کوئی فطری اور قدرتی کمزوری تھی کہ میں کسی عجیب واقعہ کا تصور ہی نہیں کر سکتا اور کوئی چیز کتنی ہی عجیب و غریب ہو مجھے تھرل نہیں کر سکتی۔ ارے صاحب کالج میں ذہانت کے امتحانوں میں انعامات لینے سے کیا ہوتا ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ میں نے جیتا جاگتا ناگ سانپ تو بالشت بھر کا بھی نہیں دیکھا تھا حالانکہ شادی کے بعد ایک بار میں نے بیوی کی لمبی چوٹیوں کو دیکھ کر کہا تھا۔ "واہ! کیا ناگن کی چوٹیاں ہیں۔" تو وہ خفا ہو گئی تھی۔ بعد میں اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے چوٹیوں کو ناگنوں جیسے کہنا چاہیئے تھا تو میں رو پڑا تھا ...... میں نے ناگن کبھی نہیں دیکھی تھی۔

چنانچہ اس وقت بھی میں خود کو اس قدر حقیر، کم تر اور ذہانت سے عاری انسان تصور کر رہا تھا کہ سوفٹ کا ناگ جس کو دیکھ کر کچھ خوش نصیب حیرت و ہیبت میں بے ہوش ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے اور عثمانیہ دواخانہ میں پڑے پریس رپورٹرز سے تصویریں کھنچوا رہے تھے اور لاکھوں انسانوں کی غش غش کی صداؤں سے شہر میں شوں شوں ہوائیں چلنے کی سی آوازیں ہو رہی تھیں، یہ میرے لئے اپنی ساری زندگی میں ناگ دیکھنے کا پہلا اتفاق ہو گا۔

میں نے پہلے تو سوچا کہ شرفو بھائی کے ساتھ جا کر ناگ کو دیکھوں اور زندگی میں بالکل پہلی دفعہ متحرل ہونے کی کوشش کروں۔ پھر سوچا کہ پہلے بیوی کو متحرل کرنا چاہیئے اُس تک یہ خبر ابھی نہیں پہنچی ہو گی۔ میں نے اظہر سے موٹر سائیکل پر لفٹ مانگی۔ اظہر نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تم تو مجھ سے لفٹ لینے کو رِسک کا نام دیتے رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "ارے بھائی نو رسک نو لائف۔"

آخر ہم روانہ ہوئے۔ اظہر نے دوڑ کر موٹر سیکل اسٹارٹ کی اور طوفانی رفتار سے گاڑی چلانے لگا۔ پھر مجھ سے کہنے لگا۔ "اب میں موٹر سیکل تھوڑی آہستہ چلاتا ہوں تم کود جاؤ۔" میں نے وجہ پوچھی تو وہ بولا "ارے بابا! کلچ نہیں ہے اس کا۔ بریک کا تار بھی پتلا ہو گیا ہے۔ اس کو بھی استعمال نہیں کر سکتا۔"

میں نے اُسے گھور کر دیکھا مگر تھوڑی دیر کے لئے۔ کیونکہ خود میرے پاس بھی وقت کم تھا۔

گھر میں، میں دیوانوں کی طرح داخل ہوا۔ لیکن بیوی صاحبہ پڑوس کی پردہ نشین خاتون سے گفتگو میں مصروف تھی اور میں دیوان خانہ میں تیز تیز ٹہل رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ناگ سانپ میرے پیٹ سے حلق میں آ گیا ہے اور مجھے اُسے فوراً اُگلنا ہے۔ پڑوسن کی آواز آئی۔

"ہاں ہاں سنا ہے۔ سوفٹ سے بھی زیادہ لمبا ہے۔ یہ اخبار والے تو ہمیشہ کم ہی لکھتے ہیں۔ جیسے فائرنگ میں سو مریں تو کم بخت دو ہی لکھتے ہیں۔"

میں نے دفعتاً سوچا۔ اب بیوی تو متحرل ہونے سے رہی .... اب کیا کروں۔ ارے واہ ..... ہمارے پڑوسی سدھاکر راؤ کو کیوں نہ یہ اطلاع دی جائے۔ اُس کے یہاں اخبار بھی نہیں آتا۔ مجھے یقین تھا وہ ضرور متحرل ہو جائے گا کیونکہ بے وقت و بے موقع متحرل ہونے کی پاداش ہی میں اُسے پولیس کی نوکری سے معطل کر دیا گیا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں ہی معلوم کر لیا کہ اُس کو ناگ سانپ کی خبر معلوم نہیں تھی۔ اب میں نے اس کو متحرل کرنے کا ایک پورا منصوبہ دل ہی دل میں سوچا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ "سدھاکر بھائی! آپ کے خیال میں سانپ زیادہ سے زیادہ کس قدر لمبا ہو سکتا ہے"۔ وہ جمائی لیتے ہوئے بولا۔ "یہی کوئی دو ڈھائی سو گز۔" میں کرسی سے اُچھل کر گرتے گرتے بچا۔ "دو ڈھائی سو گز کا سانپ کہہ رہے ہیں آپ —؟" وہ بولا۔ "ارے ارے سوری بھئی سانپ" میں شاید کچھ کہہ گیا تھا۔"

میں نے خود کو کرسی پر گرا لیا، اور پیشانی پر کے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے غیر ارادی طور پر دو سسکیاں لیں اور سوچنے لگا۔ "میں زندگی بھر نہ خود متحرل ہو سکوں گا اور نہ کسی اور کو متحرل کر سکوں گا۔"

—— ÷ —— ⁂ —— ÷ ——



آندھرا پردیش میں
کسانوں کے بہتر طرز کا سلوک

کسان ہماری ریاست کی معیشت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کے ماثل ہے۔ حکومت آندھرا پردیش نے شری ٹی انجیا کی قیادت میں کسانوں کی بھلائی کے لئے دوررس تدابیر اختیار کی ہیں۔

۔ قرضوں کی معیاد ادائی پر نظر ثانی

امداد باہمی قرضہ جاتی اداروں کو ۳۰ جون ۱۹۸۰ء تک واجب الادا قرضوں کی معیاد ادائی پر نظر ثانی کی گئی ہے

۔ اصل رقم

نارمل قرض ۔ جملہ نظر ثانی کر کے تیس سالہ قرض میں تبدیل کر دیا گیا۔

اوسط مدتی (کنورشن) قرض ۔ جملہ قرض بشمول نارمل قرض نظر ثانی کے بعد پانچ سالہ کر دیا گیا۔

اوسط مدتی (ریفیز منٹ) قرض ۔ جملہ قرض بشمول نارمل قرض اور اوسط مدتی (کنورشن) قرضہ جات نظر ثانی کے بعد سات سالہ کر دیا گیا۔

۔ سود

ایک سال سے واجب الادا سود ۔ ایک سال کیلئے ملتوی کر دیا گیا

دو سال سے واجب الادا سود ۔ نظر ثانی کے بعد معیاد ادائی دو سال سے زائد کر دی گئی۔

تین سال اور اس سے زیادہ مدت سے واجب الادا سود ۔ نظر ثانی کے بعد معیاد ادائی تین سال سے زائد کر دی گئی۔

طویل مدتی قرض کی معیاد میں عدم وصول شدہ اقساط کی تعداد کے مساوی توسیع کی جائے گی۔ لیکن یہ توسیع تین سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔

۔ فصل کیلئے قرضے

امداد باہمی بینکوں نے ۱۹۸۰ء کے موسم خریف کے دوران میں کسانوں کو فصل کے قرضوں کے طور پر (۸۲) کروڑ روپیوں کی بھاری رقم فراہم کی ہے۔ آنے والے موسم ربیع میں مزید (۲۰) کروڑ روپیوں کی تقسیم کا پروگرام ہے۔

(سلسلہ ص ۲۳ پر)



امداد باہمی بینکوں کے (۷،۵) فی صد قرضے ایسے
کسانوں کو منظور کئے جائیں گے جن کے پاس (۵) ایکڑ
تری یا (۱۰) ایکڑ خشکی سے کم اراضیات ہیں۔ اس
طرح زیادہ تر کمزور طبقات کو فائدہ پہنچے گا۔ اس رقم
کا ایک تہائی حصہ درج فہرست اقوام اور درج فہرست
قبائل کے لئے مختص کیا جائے گا۔

- طویل مدتی قرضے

اسٹیٹ کوآپریٹیو اگریکلچرل ڈیولپمنٹ بینک
کی جانب سے جاریہ سال کے دوران (۶۵) کروڑ روپے ترقیات اراضی۔ باؤلیوں کی کھدائی
باغبانی۔ بھیڑوں اور مرغیوں کی پرورش سے متعلق اسکیمات کے لئے مختص
کئے گئے ہیں۔

- قرضوں کی وصولی معطل کردی گئی

حکومت نے خشک سالی سے متاثر علاقوں میں قرضوں کے بقایہ جات اور مالگزاری بشمول
محصولات کی وصولی معطل کردی ہے۔

- فصلوں کا بیمہ

دھان، جوار اور مونگ پھلی کی فصلوں کے لئے بیمہ اسکیم رائج کی جارہی ہے۔

محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ

آندھرا پردیش

ڈی آئی پی آر نمبر ۱۳/

DIPR. 7887/81. Dt: 24.2.8

نامور افسانہ نگار

عاتق شاہ کے

انڈین کاجو

طنزیہ مضامین کا مجموعہ

صفحات ۱۲۰ قیمت ۸ روپے بتوسط "شگوفہ"

مشاطہ (بہرام کی ماں)

رؤف خیر

کیسے کیسے رشتے ہیں اس نے لگائے
اس کے ہاتھوں میں ہیں جادو کے اُپائے
یعنی ناممکن کو بھی ممکن بنائے
رات دن لیتی ہے سب کی ہائے ہائے

ہائے کیا بڑھی ہے ماں بہرام کی

بات جم جاتی ہے جب حسنین کی
یہ بجا لیتی ہے بنسی چین کی
عین سے نبھتی نہیں جب غین کی
چڑھتی ہے جب آستیں طرفین کی

ہاتھ اور ٹھڈی ہے ماں بہرام کی

آنکھیں کھلواتی نہیں بھینگوں سے یہ
بات کرواتی نہیں ہکلوں سے یہ
ہاتھ اُٹھواتی نہیں لولوں سے یہ
چال چلواتی نہیں لنگڑوں سے یہ

سادہ سی گڑیا ہے ماں بہرام کی

کہتے ہیں سب چین بہر اختلاط
بڑھ گئی ہے ان دنوں کچھ احتیاط
اب "فریدی" بھی بچھاتا ہے بساط
یعنی مشاطہ نہیں اب ہیں مشاط

اور پھٹنڈی ہے ماں بہرام کی

روزی کی تلاش

اعجاز وارثی

مدت ہوئی کہ رہتے تھے میرے محلہ میں — بے فکرے ایک نام تھا جن کا پہاڑ خاں
تھی وضع قطع آپ کی اوروں سے مختلف — بالوں کی باڑھ چہرہ پہ، مونچھیں کھنچی کماں
تہ بند سرخ رنگ کا چمکیلی شرٹ پر — زار و نزار جسم مگر عمر میں جواں
بیڑی کی دُم لبوں کے شکنجہ میں منہ میں پان — کپڑوں پہ ان کے پیک کے تھے جابجا نشاں
پردیسی تھے، کرایہ کے کمرہ میں تھا قیام — اور پیٹ بھرنے کے لئے ہوٹل کی روٹیاں
چہرہ کا فکر و غم سے کوئی واسطہ نہ تھا — فضلِ خدا سے رہتے تھے ہر وقت شادماں
کرتے تھے چائے خانوں میں خاطر ہر ایک کی — بچوں کو صبح و شام کھلاتے تھے ٹافیاں
بیمار ہو کوئی تو یہ تیماردار تھے — سارے پڑوسیوں پہ چھڑکتے تھے اپنی جاں
سب کو مگر کرید تھی پیشہ کے باب میں — خفیہ پولس تھے، سیٹھ تھے یا چارپائیاں
پوچھا کسی نے، کہہ دیا سب ان کا ہے طفیل — اللہ رکھے پاؤں میں حضرت کے جوتیاں

اور واقعی جو بگڑے گئے ایک دن جناب
معلوم یہ ہوا کہ چُراتے تھے جوتیاں

شکیل رضا بنگلور

ہاتھ کی کرامت

نکاح کے بعد جب تک دلہن کا ہاتھ، دولہا کے ہاتھ میں نہیں دیا جاتا شادی کے رسومات مکمل نہیں سمجھے جاتے ویسے یہ اور بات ہے کہ نکاح سے پہلے بعض لڑکیاں اپنے ماں باپ کو ہاتھ دے کر لڑکوں کا ہاتھ تھام لیتی ہیں۔ اور والدین اپنے ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔

اگر کوئی شخص نابینا ہو تو وہ لاٹھی کا سہارا لے کر کام چلا ہی لیتا ہے۔ لیکن لاٹھی پکڑنے اور کام کرنے کے لیے اگر ہاتھ نہ ہوں تو انسان دوسروں کا دستِ نگر بن کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ دنیا کا ہر کام چاہے بڑا ہو یا چھوٹا، اچھا ہو یا بُرا ہاتھوں سے ہی انجام دیا جاتا ہے اور ہاتھ ہلائے بغیر کوئی بھی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ غرض خدا نے انسان کو ہاتھ دے کر اپنی قدرت کے وہ ہاتھ دکھائے ہیں کہ جس کی مثال ملنا محال ہے۔ دنیا کی کوئی شئے حضرت انسان کے ہاتھوں سے دور نہیں۔ وہ جب چاہے عظمت کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے۔ اور جب چاہے ذلت کے عمیق غاروں میں گر سکتا ہے۔ انسان اپنے ہم جنسوں کو ہاتھ دینے سے نہیں گھبراتا۔ یہ دیکھ کر انسان کا ازلی دشمن بہت خوش ہوتا ہے کہ میرا شاگرد آج کل بہت ہوشیار ہو گیا ہے۔ اگر وہ خوش نہ ہو تو اس کے شاگرد کی حوصلہ افزائی کون کرے گا؟ ایسے موقعوں پر خدا بھی تھوڑی دیر کے لیے ڈھیل چھوڑ دیتا ہے۔

اور جب خدا اپنا دستِ رحمت اٹھا لیتا ہے تو انسان چاروں شانے چت ہو جاتا ہے۔

ہاتھ دکھانا، ہاتھ دینا اور ہاتھ صاف کرنا، یہ سب اُردو زبان کے محاورے ہیں لیکن وہ محاورے ہی کیا جس پر کوئی عمل درآمد نہ ہو! شاید اسی لیے آج کل ان محاوروں پر اس قدر عمل درآمد ہو رہا ہے کہ ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم بھی کسی محاورے پر پورے خلوص کے ساتھ عمل درآمد شروع کر دیں۔

انسان کا ہاتھ جوڑنا اور ہاتھ ملانا تو خیر روزمرہ کے معمول بن گئے ہیں۔ کبھی خوشی کے موقعے پر تو کبھی خیریت دریافت کرتے ہوئے ہاتھ ملایا جاتا ہے۔ لیکن ہاتھ دکھانے اور ہاتھ صاف کرنے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ہاتھ دکھانے کا موقعہ تو

اس وقت آتا ہے۔ جب دشمنوں کی مزاج پرسی کی جا رہی ہو یا پھر کسی قرض دار سے قرضہ وصول کیا جا رہا ہو!

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ نجومی فٹ پاتھ پر ہاتھ کی بڑی بڑی تصویریں لگائے بیٹھے رہتے ہیں اور دوسروں کے ہاتھ میں اپنی جنت ڈھونڈنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ بے چارے دوسروں کے ہاتھ نہ دیکھیں تو ان کا ہاتھ خالی کا خالی ہی رہ جائے اور ان کی دال روٹی بند ہو جائے۔

ہاتھ دکھانے کا معاملہ اب صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں رہا ہے۔ آج کل بے جان تصویریں بھی ہاتھ دکھانے لگی ہیں۔ ایک مرتبہ ہم اپنے دوستوں کے ساتھ ویجیٹرین ہوٹل میں بیٹھے ہاتھ کی کرامتوں کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک ہماری نظر دیوار پر لگی ہوئی تصویر پر پڑی۔ جس میں کوئی مہاپرش بیٹھے ہوئے اپنا ہاتھ دکھا رہے تھے۔ ہم چونک پڑے اور ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے خوب کھانے کی تلقین کر رہے ہیں!!

سیاسی اعتبار سے ہاتھ کا نشان بہت اہم مانا جانے لگا ہے۔ گذشتہ عام انتخابات کے دوران ہر طرف ہاتھ ہی ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ اور مخالف گروپ اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے لوگوں سے کہتے پھر رہے تھے:

"لوگو! ان ہاتھوں کا اعتبار مت کرو۔ ان ہاتھوں میں کوئی دم نہیں ہے۔ یہ ہاتھ غریبوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ یہ ہاتھ ڈوبنے ہوئے ہاتھ ہیں۔ ان ہاتھوں کے پیچھے مت جاؤ۔ ورنہ یہ ہاتھ تمہیں بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے"! لیکن جب پولنگ شروع ہوئی تو اس ہاتھ نے وہ۔ وہ ہاتھ دکھائے کہ ہلدار کے پرخچے اڑ کر رہ گئے اور مخالف گروپ ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے ہاتھ صاف رکھیں تاکہ ہر قسم کی بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں! لیکن ہاتھ صاف کرنے کے معاملے میں لوگوں سے زیادہ خود ڈاکٹر صاحبان بہت زیادہ ماہر ثابت ہوئے ہیں۔ وہ اس قدر چالاکی اور ہوشیاری سے اپنے ہاتھ صاف کر جاتے ہیں کہ مریضوں کو اس بات کا رتی برابر بھی احساس نہیں نہ ہوتا تاکہ ان کی جیب کس قدر صاف ہو چکی ہے۔ ڈاکٹروں کے اس طرح ہاتھ صاف کرنے سے کبھی کبھی مرض کے ساتھ ساتھ مریض بھی ہمیشہ کے لیے "صاف" ہو جاتا ہے۔ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔!

شکیل اختر (پٹنہ)

زن مرید

میں اپنے آبائی شہر میں نیا نیا وارد ہوا تھا۔ خیال آیا کہ پرانے، بے تکلف دوستوں سے ملاقات کرنی جائے۔ قدم اور یہ خود بچو میاں کے گھر کی جانب اٹھ گئے۔ گلی کوچے عبور کرتا ہوا جب ان کے گھر کے سامنے پہنچا تو دیکھا کہ ان کے آبائی مکان کا رعب دار دروازہ اپنی وضع داری نبھا رہا تھا ـــــ غرضکہ بند تھا۔ دروازہ پر ایک زنجیر لٹک رہی تھی۔ جس کی کنڈی غائب تھی۔ زنجیر کا کوئی خاص مصرف سمجھ میں نہ آیا۔ البتہ ذہن میں یہ خیال ضرور آیا کہ بچو میاں ابھی تک کند ذہن ہیں۔

پہلے میں نے گلی میں کھڑے ہو کر ان کا نام لے کر پکارا پھر میں نے کواڑ اور زنجیر میں باہمی اتفاق کا رشتہ قائم کیا۔ اس کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ طبیعت جھنجھلا گئی۔ دل میں آیا کہ زنجیر باہر سے لگا کر چل دوں لیکن کنڈی غائب تھی۔

خیر ـــــ ! اتنے میں خدا کا کرم ہوا، کواڑ چرمرائے، کھلے اور ایک بوسیدہ سی صورت سامنے آئی۔ دیکھا ایک دبلے سے پتلے آدمی چار خانے دار لنگی، کرتے میں ملبوس سر پر ٹوپی اوڑھے کھڑے ہیں۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی جس کی وجہ سے ناک اٹھی ہوئی جان پڑتی تھی۔ چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی اور باریک مونچھیں جو شاید داڑھی اور مونچھ کا لغوی فرق بتانے کی غرض سے رکھ لی گئی ہیں۔

انھوں نے کہا، ارے یار تم!!! اور پھر وہ چکر دار راستوں اور گھماؤ والے زینوں سے ہوتے ہوتے بالائی منزل پر مجھے ایک نشست کے کمرے میں لے آئے۔

میں نے پوچھا، آپ کے گھر میں راستے ایسے کیوں ہیں؟

انھوں نے سنجیدگی سے فرمایا۔ بزرگوں نے بنایا ہے، خدا کی مصلحت۔

میں نے کہا، لیکن آپ نے اپنی صورت ایسی کیوں نکالی ہے خاص کر شادی کے بعد؟

وہ جھینپ گئے کہنے لگے، ارے بھئی بات یہ ہے کہ میں اپنی عینک ذرا یہیں بھول گیا تھا۔

ابھی باتوں کی ابتداء ہوئی تھی کہ کہیں سے ایک نسوانی آواز آئی۔ ذرا سنئے گا۔

وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے، ابھی آیا، اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے اور مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے۔

پوچھا خیر تو ہے بہت مسکراہٹ پھوٹ رہی ہے۔

فرمایا، بیگم صاحبہ آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔

میں نے کہا کہ انہیں میرا سلام کہہ دیجئے۔

وہ بدستور مسکراتے رہے اور فرمایا، میں نے آپ کے بارے میں سب کچھ بیگم صاحبہ کو بتا دیا ہے۔ میں نے کہا بہت اچھا کیا، بیک وقت دو غلطیاں کیں۔

انھوں نے حیرت سے سوال کیا، دو غلطیاں ــــ؟

میں نے کہا، جی ہاں! پہلی شادی اور دوسری دوستوں کا حال....

وہ پھر ہنسنے لگے، ہی-ہی-ہی یہ تمہیں بھی پتہ چلے گا۔

میں نے پوچھا، اچھا یہ بتاؤ تمہاری شادی ہوئی کہاں ہے؟

کہنے لگے، محترم جناب رشید احمد صاحب کے یہاں۔

میں نے پوچھا، کیا بزرگ آدمی ہیں؟

انھوں نے کہا، نہیں کوئی خاص نہیں۔ میری اہلیہ کے باپ ہیں۔

دفعتاً اندر سے پھر صدا آئی ــــ ابھی ذرا سنئے گا، اور پھر فوراً آیا کہہ کر اندر چلے گئے۔ چند منٹوں کے بعد آئے اور کہا تم ذرا آرام سے بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔

یہ کہہ کر پھر اندر چلے گئے۔

اس دفعہ نصف گھنٹہ کا نصف وقت گذارنے کے بعد واپس آئے، پسینے میں تر ابور تھے۔ میں نے پوچھا کہاں چلے گئے تھے؟

انھوں نے کہا، یونہی۔ بس ذرا سا.....

میں نے پوچھا، یونہی ــــ کیا مطلب؟

کہنے لگے، سوچا تمہیں چائے پلا دوں۔

میں نے کہا، ارے تکلف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تمہاری بیگم چائے بنا دیتیں۔

ہنسنے لگے، ہی-ہی-ہی تو تم سمجھتے ہو میں چائے بنا رہا تھا۔ وہ بھی بیگم کے ہوتے ہوئے۔

میں نے پوچھا۔ پھر اتنی دیر سے کہاں تھے؟

کہنے لگے، وہ ذرا ماچس لانے چلا گیا تھا۔

میں نے کہا، ماچس لانے میں اتنی دیر۔!

انھوں نے کہا۔ نہیں ذرا نیچے سے پانی بھی لانا پڑا۔

میں نے کہا حد ہوگئی۔ ماچس اور پانی لانے میں اتنی دیر۔

انھوں نے باتوں کا رخ موڑنے کی غرض سے کہا، اچھا چھوڑو، تمہیں بوریت تو محسوس نہیں ہوئی۔

میں نے کہا۔ بوریت کیسی، آپ جو غیر حاضر تھے۔

دفعتاً اندر سے آواز آئی ــــ ابھی ذرا سنئے گا، وہ فوراً آیا کہہ کر اندر چلے گئے۔ واپس آئے تو ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جسے انھوں نے میز پر رکھ دیا۔ پھر میری جانب ایک چائے کی پیالی بڑھائی اور ایک خود سنبھال لی۔

ابھی میں چائے کی پہلی چسکی لینے والا تھا کہ انہوں نے کہا، ارے ارے! یہ کیا کرتے ہو۔ ذرا بسکٹ تو کھاؤ اور ساتھ ساتھ انہوں نے میری توجہ ٹرے میں پڑے ہوئے دو بسکٹوں کی طرف دلائی۔

میں نے کہا رہنے دو خواہش نہیں ہے۔

کہنے لگے، نہیں نہیں کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ بیگم نے بہت اصرار کرکے بھیجا ہے۔

بس دو ہی تو ہیں۔

آخر کار ان کے بارہا اصرار پر میں نے ایک بسکٹ اٹھا لیا۔ اور بہت زور لگایا تاکہ بیچ سے ٹوٹ جائے لیکن بسکٹ نے اپنی سالمیت برقرار رکھی۔ اس کے یہ تیور

دیکھ کر میں نے واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے پوچھا، کیا
اسے تمہاری بیگم صاحبہ نے بنایا ہے؟
انھوں نے حیرت سے پوچھا، لیکن پتہ کیسے
چلا۔؟
میں نے کہا، تبھی تو بسکٹ کچھ زیادہ مضبوط ہیں۔
وہ ہنسنے لگے، ہی ہی ہی اتنے نازک ہوگئے ہو۔ ارے
بیوی مذاق میں ایک دو چانٹے لگا دے گی تو الٹ جاؤ گے۔
میں نے حیرت سے پوچھا، کیا بیوی مذاق
اس طرح کرتی ہے۔
وہ پھر ہنسنے لگے، ہی۔ ہی ہی۔ تمہیں بھی پتہ چلے گا۔
میں نے کہا کیا تمہارے یہاں یہ سب چلتا ہے؟
انہوں نے کہا، لاحول ولا قوۃ میں کیا نازک
ہوں۔ پھر اپنی بات کی تصدیق اور انا کی تسکین کی خاطر
ایک بسکٹ اپنی بائیں ہتھیلی پر رکھا اور داہنے ہاتھ سے
اتنے زور کا مکہ مارا کہ بسکٹ چور چور ہو گیا۔ پھر ایک ٹکڑا
مجھے دیتے ہوئے کہنے لگے ـــــ دیکھا!!!
میں نے عرض کیا۔ ہٹاؤ میں ایسی حرکت نہیں
کر سکتا۔
چائے ختم ہو گئی تھی لہذا وہ فاتحانہ انداز میں
میری طرف دیکھتے ہوئے پیالیاں ٹرے میں رکھنے لگے۔
میں نے کہا، آج رات میرے یہاں کھانے کی
دعوت ہے لہذا تمہیں بھی آنا ہے۔
وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر فوراً آیا کہہ کر اندر چلے
گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے اور کہنے لگے بھئی بیگم کہہ رہی
ہیں کہ تم ہی آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھا لو۔ میں نے
چڑھ کر کہا، بھئی! کیا واقعی تمہاری بیگم ناقص العقل ہیں،
ذرا بھی ....
انھوں نے قطع کلام معاف کہہ کر کہا، ارے
یار! ذرا آہستہ بولو بیگم سن لیں گی۔
میں نے کہا، تو کیا ہوا وہ تو اندر ہیں۔
انھوں نے آہستہ سے کہا۔ ارے نہیں وہ تو اسی
دروازے کے پردے کے پیچھے کھڑی ہیں۔
وہ جھینپ گئے، کہا دوست! مذاق کرتے ہو۔
میں نے کہا، اچھا چھوڑیئے ان باتوں کو آج رات
آپ آ رہے ہیں۔ جواب میں وہ خاموش کھڑے رہے پھر فوراً
آیا کہہ کر اندر گئے اور واپس آئے تو چہرہ خوشی سے چمک رہا
تب آپ آ رہے ہیں نا ـــــ میرا سوال تھا۔
ـــــ "ہاں! لیکن ایک شرط پر۔ کل دوپہر کا کھانا میرے
ساتھ کھانا ہوگا" ـــــ "کس کے یہاں ـــــ ؟" میں نے پوچھا
جواب میں وہ ہنس دیئے۔
رات کوئی نو بجے بجو میاں آ گئے اور ایک زوردار
سلام داغ کر بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا، مولانا! آپ نے
اتنی دیر کیوں لگائی؟ رات تو آٹھ بجے ہی ہو جاتی ہے۔
وہ فخریہ انداز میں بولے۔ سوچا ذرا عشاء پڑھ کر
چلوں۔
میں نے کہا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کو تہجد کا خیال
نہیں آیا۔
کہنے لگے، خدا توفیق دے۔
عمران نے ان کی نقل اتارتے ہوئے کہا، خدا
توفیق دے یا بیوی آرڈر دے ....
وہ بگڑ گئے "تمہیں شرم نہیں آتی ہے۔ محفل میں بیوی
کا REFERENCE دیتے ہوئے" میں نے بات سمجھانے
کی غرض سے کہا، چھوڑیئے مولانا غصہ ترک کیجئے۔ یہ بتایئے
آپ عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف کیوں ہجرت کر گئے ـــــ!
انہوں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا اللہ کا کرم
اور دین داروں کی صحبت ہے۔

عمران نے پھر لقمہ دیا، اور بیوی کی نصیحت۔
وہ مسکرائے اور کہا، یہ آپ کی بیوی کرتی ہوگی
عمران نے تیر مارا، واللہ ابھی احساس بھی نہیں
ہے بیوی کی حکمرانی کا۔
وہ بہت زوردار طریقے سے غصہ میں آگئے۔ میں نے
انہیں شانت کرتے ہوئے کہا، مولانا ہم لوگوں پر ناحق غصہ
ہوتے ہیں۔ بتلائیے۔ آپ نے کبھی اپنی بیوی پر غصہ کیا ہے؟
وہ تاؤ میں کہنے لگے، کیوں نہیں ایک دفعہ میں اپنی
بیگم پر ناراض ہوگیا اور سزا دی کہ آج سے چولہا نہیں جلے گا۔
پہلا دو دن نہ چولہا جلا اور نہ کھانا پکا۔ تیسرے دن میں نے
رحم کھا کر اجازت دے دی۔ لیکن ایک بوجھ میرے دل پر رہ
گیا کہ ......

میں نے کہا، "اچھا چلئے کھانا لگ چکا ہے"۔ وہ کہنے
لگے، ایک بوجھ اور رہ جائے گا۔
میں نے کہا بیوی کے لیے ٹفن کیریر میں لیتے جائیگا۔
وہ جھینپ گئے اور کہا، "دھت! ارے بات ادھوری
رہ جائے گی" میں نے کہا۔ "کھانے کے بعد......"۔
کھانے کے بعد سبھی دوست رخصت ہوگئے صرف
چچا میاں بیٹھے رہ گئے۔ میں نے پوچھا۔ اب کیا قیام کا ارادہ ہے؟
وہ بولے، ارے نہیں دراصل بات ادھوری رہ گئی تھی۔

میں نے کہا، واللہ اب جلد کہہ بھی ڈالیے۔
انھوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، میں نے
کچھ دنوں بعد بیگم سے کہا۔ سنو میرے دل پر ایک بوجھ رہ گیا
ہے۔ میں نے تمہیں تو دو دن بھوکا رکھا اور خود باہر ہوٹلوں میں
کھالیا۔ اس پر بیگم رونے لگیں۔ اور کہا مجھے بھی معاف کر دیجیے
میں بھی آپ کے دفتر جانے کے بعد پکا کر کھا لیتی تھی۔
غرضیکہ دونوں کے دل کا بوجھ اتر گیا۔ میں نے سوال کیا
وہ مسکرانے لگے، پھر انھوں نے اجازت چاہی
میں انہیں رخصت کرنے دروازے تک آیا۔
دروازے پر آکر وہ بولے، کل آنا پھر ملاقات۔
میں نے کہا کوشش کروں گا۔
وہ بولے، ارے نہیں! تمہیں بیگم ناراض ہوں گی۔
میں نے پوچھا، کس پر۔
یہ سن کر وہ مسکرا دیئے۔ پھر خدا حافظ کہہ کر
اندھیرے میں آگے بڑھ گئے۔

رحمت اللہ خاں مالوی
(اکولہ)

انتساب

انتساب کے لغوی اور اصطلاحی معنی کیا ہیں اس چکر میں پڑنا بیکار ہے۔ یوں بھی الفاظ معنی کا چکر اُلٹا ہوتا ہے۔ ایام طالب علمی میں الفاظ و معنی کے اُلٹ پھیر میں پڑ کر ہم کئی مرتبہ مرغا بنے۔ ہم لفظ انتساب کی بس اتنی ہی تشریح کر سکتے ہیں کہ ہر ادیب شاعر۔ فن کار۔ نقاد اپنی کسی بھی تخلیق کے لیے چند نام مختص کر لیتا ہے۔ اور اس کے نام اپنی کتاب منسوب کر کے خوش ہوتا ہے (گویا انتساب ہر قلم کار کا پیدائشی حق ہے) انتساب دراصل انتقام کی ایک شکل ہے کہ میں تو کتاب چھپوا کر رسوا ہوا تم کو لے کر مروں گا!

انتساب کثیر المقاصد منصوبوں کی طرح کثیر المقاصد فعل ہے۔ اس فعل کے طفیل کتنے ایسے ہیں جنھیں درجۂ شہادت نصیب ہو جاتا ہے اور کئی ایک تو صرف انگلی کٹا کر شہدا کے صف میں شریک ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو انتساب در پردہ اشارہ کرتا ہے کہ ؂

ع ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

انتساب۔ انتخاب اور اکتساب علم عروض کے قواعد کے اعتبار سے ہم وزن عملی طور پر ہم پلہ اور سیاست اور تجارت کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ انتساب میں جس ڈپلومیسی کا سہارا لینا پڑتا ہے وہی ڈپلومیسی یہاں بھی نظر آتی ہے۔ انتخاب کے لیے ٹکٹ ملنے منتخب کیے جانے اور منتخب ہو جانے کے جن نازک مگر سنگین مراحل سے گزرنا پڑتا ہے تقریباً وہی نازک مراحل انتساب میں بھی پیش آتے ہیں یا انتخاب سے پہلے اور انتخاب کے بعد جن مسائل سے عوام پریشان ہوتے ہیں وہی مسائل انتساب سے پہلے اور انتساب کے بعد بیچارے مصنف کے سامنے ہوتے ہیں۔ خیر پہلے پیش آنے والے مسائل سے تو آسانی سے نپٹا جا سکتا ہے لیکن بعد کے مسائل نہایت ہی شدید ہوتے ہیں۔ جن کا علاج ممکن نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خود کردہ را علاج نیست کا محاورہ معرض وجود میں آیا۔

بعض دفعہ تو انتساب کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کسی مشاعرہ میں کوئی اپنی غزل سناتے سناتے رک جائے

اور ڈائس پر بیٹھے ہوئے عمائدینِ شہر میں سے کسی کو یا پھر انا ونسر کو مخاطب کرکے یہ کہے یہ شعر توجہ طلب ہے آپ کی توجہ چاہوں گا اور پھر بالکل ہی پھسپھسا شعر سنا دے۔ مشاعروں میں اس قسم کی حرکت عموماً شاعر سے اس وقت سرزد ہوتی ہے جب ڈائس پر بیٹھے ہوئے باذوق سامعین اور ڈائس کے سامنے بیٹھے ہوئے بدذوق تماشائی سگریٹ پھونکتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ بہت بڑا وقفہ دے کر لکھنے والے یا پھسپھسا مواد سپلائی کرنے والوں کی انتسابی شان یہی ہے ایسے انتساب کا کا کمال یہ ہے کہ اس کا ٹارگٹ اپنے زمانے کے بڑے ادیب یا ملک کے مشاہیر ہوتے ہیں۔

انتساب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے کوئی نہیں پڑھتا سوائے اس شخص کے جس کے نام سے کتاب منسوب کی گئی ہے۔ جو مصنفین ادبی چشمک سے بچنا چاہتے ہیں وہ اپنی کتابوں کا انتساب مرے ہوئے ادیبوں کی روحوں سے کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اندھا اپنوں ہی اپنوں میں ریوڑیاں بانٹتا ہے یہ مقولہ انتساب اور قلمکاروں کے تعلق سے بالکل صادق آتا ہے۔ اسی لیے آج کل اس قسم کے انتساب دیکھنے کو ملتے ہیں۔

۱۔ اپنے چھوٹے بھائیوں کے نام (نام بھی بڑے فینسی ہوتے ہیں۔ ان ناموں سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ)

۲۔ اپنی بہن کے نام (شاید اس لیے کہ وہ اپنے ادیب بھائی سے جہیز کے علاوہ کسی چیز کا تقاضہ نہ کرے)

۳۔ اپنے والد کے نام (جن کی شفقت آمیز تربیت نے یہ دن کھائے)

۴۔ اپنے استاد محترم کے نام (جو ــــــ استاد ہونے پر شرم محسوس کرتے ہیں وغیرہ)

۵ فلاں آپا کے نام ــــــ جن کی تحریر کی لذت نے وقت سے پہلے ہی ادیب بنا دیا)

۶۔ حاجی فلاں ابن فلاں کے نام جو بہت بڑے سماجی رہنما ہیں (ایک تھیٹر اور جوے خانے کے مالک بھی ہیں)

۷۔ اپنے ہونہار بیٹے جاوید کے نام"

مذکورہ بالا انتسابات کے نمونے ایسے ادیبوں کی کتابوں پر دیکھنے کو ملیں گے جو اکتساب رزق سے بے پرواہ ہیں۔ بعض انتسابات بڑے دلچسپ ہو سکتے ہیں اور اصل سے بڑھ کر ہو سکتے ہیں۔ اگر اس فیلڈ میں بھی جدیدیت کے متلاشی، انہیں اپنانا چاہیں تو وہ انہیں شوق سے اپنا سکتے ہیں۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

۱۔ ان ادیبوں کے نام جنھوں نے قارئین پر رحم کیا ہے۔

۲۔ ان شاعروں کے نام جنہوں نے قوالیوں کو سر چڑھایا ہے۔

۳۔ ان احباب کے نام جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں دامے، درمے، قدمے کم اور سخنے زیادہ اعانت کی۔

۴۔ ان قارئین کے نام جو کتابیں خرید کر نہیں بلکہ مانگ کر پڑھتے ہیں۔

۵۔ ان پڑھنے والوں کے نام جو کتابیں چرا کر پڑھنا شرعاً جائز سمجھتے ہیں۔

۶۔ ان پڑھنے والوں کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے جو ہر بڑے ادیب کی کتاب اپنی جیب خاص سے کثیر رقم صرف کرکے منگواتے ہیں اور اس کو بغیر پڑھے اپنے دست مبارک میں لیے لیے پھرتے ہیں۔ موقع بے موقع کتاب پر تبصرہ

کرکے خوش ہوتے ہیں۔ اپنی علمیت کا رعب جماتے ہیں (یا پھر اس لیے خریدتے ہیں کہ مانگنے والوں کو معلوم ہوجائے کہ کتاب خریدی گئی ہے) بہ الفاظ دیگر اس گدھے کے نام جو اپنی پیٹھ پر کتابیں لادے پھرتا ہے۔

مروجہ انتسابات اور تجویز کردہ انتسابات کے علاوہ ایک نئی قسم انتساب کی دیکھنے میں آرہی ہے وہ یہ کہ آج کل قلم کار اپنی کتاب کو اپنی اہلیہ کے نام سے منسوب کرنے لگا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ مصنف کی اہلیہ نے اسے مصنف بننے کا اہل بنایا ہے۔ اس لیے میں اپنے اس مضمون کا انتساب ایسے تمام فن کاروں کے نام کرتا ہوں جو اپنی بیویوں کی بدولت فن کار بننے کے اہل ہوئے ہیں۔

●●

علی عباس امید
(بھوپال)

عشقِ پُر آشوب

کھول رہا ہوں آج یہ راز
شاہ جہاں میں، وہ ممتاز

میرا دل معصوم کبوتر
اس کی نگاہیں خونیں باز
پھر بھی عقل نے ٹھوکر کھائی
کہا کہ یہ تو ہے شہناز
اور ستم بالائے ستم پھر
بنالیا اس کو ہم راز

گزر چکا جب پانی سر سے
قلب میں پیدا ہوا گداز
ناک کی راہ محبت نکلی
در کھلا مجھ پہ یہ راز

اس سے عشق گریزاں ہو اسے
مجھ سے جس طرح نماز
سر سے پاؤں تک وہ عالم
اتر گیا ہو جیسے ساز

دوڑ کے لائے رسی گھر سے
کوئی اگر سن لے آواز
چہرے کے میدان میں ناک
جیسے اڑے پر ہو جہاز
شانوں تک پہنچے کس طرح
مشکل میں ہے زلفِ دراز

میرے تو دن رات نشیب
اس کا لمحہ لمحہ فراز
میں ہوں چیونٹی، وہ ہے پہاڑ
کیسے اٹھاؤں اس کے ناز

دلشاد رہے میری شوخیٔ قسمت
دَم پر بھاری ہے دَم ساز
ماہ وشوں کا پیارا شاعر
بھول گیا سب ناز و نیاز

★

اظہر مسعود رضوی

ماتحت ہو
ماتحت کے کام کی باتیں کرو

اگر آپ ملازم ہیں تو بھگت چکے ہوں گے، نہیں تو کسی سے سُن تو رکھا ہی ہوگا اور اگر سُنا بھی نہیں آ
آج سُن لیں تاکہ سند رہے اور بہ وقتِ مصیبت کام آئے۔ میں جو کچھ کہنے جارہا ہوں اس باب میں اسلاف
نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ مصلحتاً اس لئے کہ اگلے وقتوں میں لوگ ایسا کوئی کام کرنے پر
قادر نہیں ہوا کرتے تھے جسے مصلحت سے اللہ واسطے کا بیر ہو۔ اسی لئے ہمیں نصیحت کی گئی کہ ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

یہ تو بعد کی تحقیق سے پتہ چلا کہ حضرت ناصح خود بھی اگلے وقتوں کے تھے۔ نیز یہ مصرع بھی مصلحت سے عاری
نہیں ہے۔

اسلاف کو اپنی تہذیب اور ثقافت پر بڑا ناز تھا، اس کو انتہائے کمال پر پہنچانے کے لئے انھوں نے
اپنا روئے سخن ہمیشہ بالاخانوں کی طرف رکھا اور تہذیب سے زیادہ ثقافت کے ایسے ایسے گوشے بے نقاب بلکہ
بے لباس کئے کہ ہماری فلموں میں خواب کے نام سے نہ پیش کئے جائیں تو سنسر کی بے رحم قینچی ریلوں کے ساتھ فینانسر
کو بھی کتر کر پھینک دے۔ یہی وجہ ہے جو اکثر فلموں میں ہیرو بس ایک جملہ بولتا ہے " اچھا میں تو چلا سونے " اور یہ
کے سوتے ہی ناظرین بانکین کے بھاگ کھلیلیں کرنے لگتے ہیں۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا جو بعض ناگزیر وجوہ سے کچھ زیادہ ہی طولانی ہو گیا۔ آمدم برسرِ مطلب۔ اپنے افسرانِ بالا کے
گھر ہونے والی تقریبوں میں ماتحتوں کو جس ہستی سے بے انتہا چوکتا رہنے کی ضرورت ہے وہ ہوتا ہے صاحبِ خانہ

رنڈوا باپ۔ یا اس کا خسر یا سمدھی۔ زندگی بھر افسری اس نے بھی کر رکھی ہوتی ہے سینکڑوں ماتحتوں کے خلاف تادیبی کارروائیاں کئے ہوئے ہوتا ہے۔ مدّت کی جڑیلی عادتیں ساٹھ سال کے بعد کب ختم ہوتی ہیں۔ اپنے نہیں تو اپنے اخلاف کے ماتحتوں کا قلع قمع کرنے کے لئے زہر کو قند میں لپیٹ لیتا ہے۔ خاص کر نویدِ مسرت، عقیقۂ فرزندِ دلبند یا شادی خانہ بربادی قسم کی تقریبات میں کسی چالاک صیاد کی طرح اپنے شکار کی بو سونگھتا پھرتا ہے۔ اس کا ہتھیار ہوتا ہے شاعری یا اسی طرح کا کوئی اور آزمودہ ادبی حربہ۔

کوئی آدمی (معاف کیجئے، ماتحت) اِدھر اُدھر ڈھیکلی کھاتا نظر آیا اور اس نے تاڑا۔ شاعر ہے تو پہلے "اسی موقع کے لئے چچا غالب نے کہا ہے" کے تمہیدی جملے اور کسی برمحل شعر کی ترازو میں آپ کو تول کر دیکھے گا۔ آپ ہنستے ہیں تو رُک کر داد ضرور دیں گے۔ چچا غالب کا شعر سُنا کر بظاہر وہ آپ کی طرف سے بے نیاز نظر آنے لگے گا۔ اگر آپ نے فضائلِ شعری سے زیادہ خصائلِ ماتحتی سے مجبور ہو کر ایک بار اور تعریف کر دی تو اپنا بیڑا بالکل غرق سمجھئے۔ آپ کے شانے پر دستِ شفقت رکھا جائے گا اور اس جملے سے تو آپ حتمی طور پر ریشۂ خطمی ہو جائیں گے ـــ "جناب آپ کا ذوقِ شعری بڑا اعلیٰ درجہ کا معلوم ہوتا ہے۔ اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے ـــ" اور ادھر آپ نے نو وارد شعر کی داد دی ادھر بڑے میاں نے جھک کر کورنش بجا لاتے ہوئے واضح کر دیا کہ یہ شعر موصوف کے کلامِ معجز نظام کے بحرِ ذخار کا ایک قطرۂ ناچیز اور صحرائے ناپیداکنار کا ایک ذرّۂ بے مقدار وغیرہ ہے اور اب آپ دریائے طبع کی طغیانی میں ڈبکیاں کھانے کے لئے تیار ہو جائیں۔

شروع میں حمد، نعت، قطعے، رباعی وغیرہ چھوٹے چھوٹے داؤں پیچ آپ پر آزمائے جائیں گے اور جب آپ شانِ ماتحتانہ سے وہ سارے کے سارے نہ صرف جھیل جائیں گے بلکہ قاتل کے دست و بازو کی تعریف بھی کرتے رہیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ سب تو محض تمہید تھی اس پونے تین ہزار اشعار کی مثنوی یا ساڑھے بارہ سو بندوں پر مشتمل اس "مختصر" سے مسدس کی جس میں موصوف نے اپنے پردادا کی وصیت پر ان کی اس غیر مطبوعہ معرکہ آرا تصنیف کو نظم کے قالب میں ڈھال دیا تھا جس کا مطالعہ کرنے والوں کے روزِ قیامت، اگر زیادہ نہ ہوئے تو چودھوں طبق مثل سرچ لائٹ کے روشن ہوں گے اور اسی روشنی میں وہ بال سے بھی زیادہ باریک صراط کے پُل کو (محدثین کی مدد کے بغیر) ڈھونڈ نکالیں گے۔ نیز اس کے پڑھنے والوں سے پہلے تو مرحوم پھر موصوف خود بھی گستاخانہ حد تک دعا کی طمع رکھتے تھے۔

اس فلاحِ اخروی کے کام کے علاوہ ضمیمہ کے طور پر چنگیز خانِ اعظم سے لے کر اپنے اخلاف تک کے نام مع سسرالی رشتہ داروں اور ملازمینِ خاص کے مذکورہ مسدس میں نظم کر دیئے تھے۔ اور اس پر اصرار تھا کہ ان کا احسان مانا جائے کہ نظم کی شکل میں ہونے کی وجہ سے ماتحتوں کے لئے ان کے نسبی سلسلہ کو یاد رکھنا بہت آسان ہو گیا تھا۔ کچھ نام البتہ ایسے بھی تھے جن کو نظم کرنے کے لئے مروجہ بحور و اوزان میں قابلِ دست اندازی پولیس قسم کی مجرمانہ قطع برید کو روا رکھا گیا تھا، پھر بھی زائد ارکان کی شکل میں ان کی ٹانگیں بیت کے باہر جھولتی نظر آتی تھیں۔ بعض جگہ "آسمان کے تم جاہ ہوائے دولہ رفیقۂ" جیسے شعری اجتہاد کی بدولت "تعقیدِ اسمی" بھی پیدا ہو گئی تھی۔

وہ نظم جس کی طوالت دیکھ کر شیطان بے چارہ اپنی آنت لپیٹے کونا کھدرا تلاش کرتا پھرے، آپ اس وقت تک سنیں گے جب تک آپ کا سامعہ کام دے گا۔ تھوڑی دیر بعد کسی خودکار آلے کی طرح جماہیوں کے ساتھ آپ کے منہ سے توصیفی کلمات بھی خارج ہوتے رہیں گے اور پھر آپ کے کان یا تو بالکل بند ہو جائیں گے یا ان کے آر پار ایک چوڑی سی سُرنگ کھل جائے گی جس میں سے موصوف بے روک ٹوک آرام پار چہل قدمی کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ آپ گر سکتہ

ہوجائے گا، آنکھیں پتھرا جائیں گی، اور منہ کسی ایسے بھاڑ کی طرح کھلا کا کھلا رہ جائے گا جس میں صدیوں سے ایک کھیل بھی اُڑ کر نہ گئی ہو۔ کھانے کا وقت آئے گا اور گزر بھی جائے گا، پیٹ میں چوہے اتنی دھمال کریں گے کہ آنتیں قل ھو اللہ پڑھنا بھول کر "اپنا میا ڈیکا" گانے لگیں گی۔ آپ دل ہی دل میں اپنے حافظہ میں محفوظ تمام گالیوں کے کاپی رائٹ سے موصوف کے حق میں دست بردار ہونے کے ساتھ نئی نئی مخترعات و مصطلحات وضع کرکے ان سے دادا جان مرحوم کی روح پرفتوح کو بھی شاب کرتے رہیں گے۔ آپ کی بھویں چڑھتے چڑھتے چندھیا پر پہنچ جائیں گی۔ اور تھوڑی لٹک کر سینہ سے جالگے گی ممکن ہے آپ ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر آہیں بھی بھرنے لگیں مگر ان کے کانوں پر جوں نہیں رینگے گی۔ کیونکہ جوؤں کی افزائش نسل کے لئے سر پر بالوں کا ہونا ضروری ہے۔ اور وہاں افسران بالا کے خوف اور ماتحتوں کی نیک خواہشات کے طفیل میدان پہلے ہی صفاچٹ۔

انجام کار فرنیچر والا نیچے سے کرسی گھسیٹ لے گا اور تنبو قنات والا میخیں اُکھاڑ کر شامیانہ سر پر ڈھا دے گا تو انھیں وقت کا ناوقت احساس ہوگا اور وہ اس خونخوار بھیڑیئے کی طرح ہاتھ ملتے بلکہ دانت پیستے ہوئے رخصت ہوں گے جو شکار کی شاہ رگ سے سارا خون تو چوس چکا ہو اور اس کے گرم گرم نمکین گوشت میں دانت پیوست کرنے ہی کو ہو کہ تیندوا سامنے سے شکار جھپٹ لے جائے۔

غوث محی الدین خواہ مخواہ

سوشیل سروس

—— سرکاری ملازمین

عام چھٹیوں میں ویسے بھی گھر کے کام کاج میں بے حد مصروف رہتے ہیں۔ چھٹی ہی کے دن انھیں موقعہ ملتا ہے کہ "وفاداری بشرط استواری" کے مقولے پر حرف بہ حرف عمل پیرا ہوتے ہوئے گھر کی صاف صفائی سے لے کر بازار سے سودا سلف لانے کے سارے کام بسر و چشم اور بحسن و خوبی انجام دے کر اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کریں۔

مہینے کے آخری ہفتے کی چھٹی کا دن تھا۔ میں بینک سے یکے بعد دیگرے دو لائنوں میں کھڑے ہوکر بچی ہوئی پونجی گھر لے آیا کہ آخری ایام چین سے گزریں۔ اتنے میں بیگم نے آواز دی —— " اچھا ہوا آپ آگئے۔ ابھی ابھی شکر سے بھرا ٹرک سرکاری دکان پر آیا ہے۔ آپ اُلٹے پاؤں جایئے اور شکر لے آیئے —— گھر کی چیونٹیاں تک شکر کے دانے دانے کو ترس گئی ہیں :

—— مگر مجھے تو کوئی ٹرک دکھائی نہیں دیا —— میں ابھی بازار ہی سے آرہا ہوں ——"

میں نے ٹالنا چاہا۔ دن کا آدھا حصہ بینک کی لائن کی نذر ہو چکا تھا۔ باقی دن شکر کی لائن میں گزارنے کے خیال ہی سے وحشت ہونے لگی تھی۔ چلچلاتی دھوپ میں شیطان کی آنت جیسی لمبی قطار میں کھڑا رہنا میرے لئے انتہائی صبر آزما کام تھا۔

بیگم نے ایک بڑی سی تھیلی اور راشن کارڈ ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا ـــــ "شریفن بوا ابھی کہہ گئی ہیں کہ انھوں نے شکر کے تھیلوں سے لدے ٹرک کو سرکاری دوکان کی طرف جاتے دیکھا ہے آپ لپک کر جائیں ورنہ شکر نہیں ملے گی۔"

تھیلی واپس کرتے ہوئے میں نے کہا ـــــ "بھلی مانس! پانچ سو گرام شکر کے لئے اتنی بڑی تھیلی کی کیا ضرورت ہے۔ میرے کرتے کا جیب ہی کافی ہے۔ ہاں کچھ دنوں بعد اتنی ہی شکر کے لئے شاید تھیلی میں رقم لے جانی پڑے۔"

کاغذ کی تھیلی دیتے ہوئے انھوں نے کہا ـــــ "آپ بحث ہی کرتے رہیں گے یا جائیں گے بھی ـــــ؟"

کاغذ کی تھیلی اور راشن کارڈ کرتے کی جیب میں ٹھونسے۔ میں جب سرکاری دوکان کے قریب پہنچا تو لائن کافی لمبی ہو چکی تھی۔ میرا نمبر بیسواں تھا۔ اُمید تھی کہ دوکان بند ہوجانے یا شکر کا اسٹاک ختم ہونے سے پہلے میرا نمبر ضرور آجائے گا۔ میں نے لائن کی لمبائی کے حساب سے اندازہ لگایا کہ میرا نمبر آنے تک ایک گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔ لائن میں میرے آگے پڑوس والی بلڈنگ کے ہردیال جی کھڑے تھے جو حال ہی میں سول سروس سے وظیفے پر سبکدوش ہوئے تھے۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں چھوٹی بڑی ملا کر آٹھ دس تھیلیاں تھیں۔ انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ایک چوڑی چکلی مسکراہٹ سے مجھے خوش آمدید کہا۔ وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کے بوجھ کو ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں پر منتقل کر رہے تھے۔

"آپ تھیلی نہیں لے آئے ـــــ؟" انھوں نے مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر پوچھا۔

"جی وہ یہاں ہے ـــــ" میں نے کُرتے کی جیب آگے کردی جس میں کاغذ کی تھیلی ٹھنسی تھی۔

"مجھے دیکھئے! میرے پاس بہت سی ہیں۔ انھیں بھرنے تک دیر ہو ہی جائے گی۔ آپ بُرا تو نہیں منائیں گے؟"

میں نے زبان سے تو جی نہیں کہا، لیکن دل ہی دل میں اپنا نمبر آنے کے وقت میں دس منٹ اور بڑھا دیئے۔

"آج آپ کی چھٹی کا آدھا دن لائن میں نکل جائے گا۔" انھوں نے ہمدردانہ کہا۔

میں نے جواباً کہا ـــــ "جی ہاں! صبح سے تیسری بار لائن میں کھڑا ہوں۔"

ـــــ "جب تک برسرِ ملازمت رہا مجھے کبھی لائن میں کھڑے رہنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ نوکر چاکر یہ کام کرلیا کرتے تھے اور اب ریٹائر ہونے کے بعد یہ عالم ہے کہ ہر روز اپنے آپ کو کسی نہ کسی لائن میں کھڑا پاتا ہوں ـــــ" ان کے چہرے سے بے بسی برس رہی تھی ـــــ

"آپ کافی تھک جاتے ہوں گے ـــــ" میں نے جواباً اظہارِ ہمدردی کیا۔

"جی نہیں" انھوں نے سمجھانے کے انداز میں کہنا شروع کیا۔ "ویسے بھی ریٹائر ہونے کے بعد کافی وقت مل جاتا ہے چہل، قدمی، باغبانی اور مطالعہ کے بعد اپنے لڑکوں کو خطوط لکھتا ہوں۔ پھر بھی کافی وقت رہ جاتا ہے۔ اس لئے اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ اپنے نوکر کی چھٹی کرنے کے بعد اس کا سارا کام کاج میں نے ہی سنبھال لیا ہے ـــــ"

"اچھا ہے اس طرح آپ ہمیشہ کسی نہ کسی طرح مصروف ہی رہتے ہیں۔" میں نے انھیں سراہا۔

"جی ہاں! لیکن یہ مصروفیت کبھی کبھی گراں بھی گزرتی ہے۔ یہی دیکھئے نا! یہ اتنی ساری تھیلیاں آپ جو میرے ہاتھوں میں دیکھ رہے ہیں یہ میرے پڑوسیوں کے ہیں۔ آج انھیں کسی طرح پتہ چل گیا کہ میں سرکاری دکان سے شکر لانے جا رہا ہوں۔ بس، انھوں نے تھیلیاں اور راشن کارڈ میری بیوی کے ہاں یہ کہتے ہوئے جمع کروانے شروع کئے: ـــــ آنٹی! جب انکل شکر لانے جائیں گے نا! تو پلیز! ان سے کہئے ہمارے لئے بھی لیتے آئیں۔" میری بیوی پڑوسیوں سے بہتر تعلقات رکھنے کی کوشش میں مجھے لائن میں کھڑا کر دیتی ہے ـــــ"

"۔ مگر آنٹی ! ـــ میرا مطلب ہے، آپ کی مسز عمدگی سے انکار بھی تو کرسکتی تھیں ـــ" مجھے اُن سے ہمدردی ہونے لگی ۔

" یہی بات میں نے بھی والَف سے کہی تھی کہ تم نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ تمہارا آدمی باہر گیا ہوا ہے ـ آپ جانتے ہیں میری والَف نے کیا جواب دیا ؟ پہلے تو اس نے تعجب سے میری طرف دیکھا ۔ پھر کہنے لگی ـ میں بھلا جھوٹ کیسے کہہ سکتی ہوں تم میرے آدمی ہو اور تم کہیں بھی نہیں گئے ہو، گھر پر ہی ہو ۔ تمہارے بارے میں جھوٹ بولتے مجھے اچھا نہیں لگتا ۔ اور پھر تمہیں اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ کام بھی تو چاہئے نا ! اب آپ ہی بتائیں میں کیا جواب دیتا ۔ راشن کارڈ اور تھیلیوں سے لدا پھندا یہاں کھڑا ہوں اور پتہ نہیں کتنی بار آپ کو یہیں کھڑا ملوں گا "

ان کے اندرونی کرب کو سمجھتے ہوئے میں نے دلاسا دینے کے انداز میں کہا ـــ " ہردیال جی ! یہ آپ جیسے بزرگ کے ساتھ سراسر زیادتی ہے ۔ ان نوجوان پڑوسیوں کو تو یہ چاہئے کہ وہ نہ صرف اپنی شکر آپ لے جائیں بلکہ آپ جیسے ریٹائرڈ شخصیت کا احترام کرتے ہوئے آپ کی صرف شکر ہی نہیں لائیں بلکہ دوسرے چھوٹے موٹے کاموں میں بھی آپ کی مدد کریں "

انھوں نے میری ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ـــ " وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس عمر میں بیوی کو خوش رکھنے کے ساتھ ساتھ پڑوسیوں کی خوشی کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے ـــ وہ دیکھئے ۔ آپ کی مسز بھی شاید لائن میں آپ کا ساتھ دینے آرہی ہیں ـــ "

دیکھا تو واقعی بیگم تیز تیز قدموں سے چلی آرہی تھیں ۔ قریب آکر انھوں نے پہلے تو ہردیال جی کو " ہیلو " کہا اور پھر میرے ہاتھوں میں چار عدد تھیلیاں اور اتنے ہی راشن کارڈ تھماتے ہوئے کہنے لگیں : ـــ " یہ تھیلیاں اور کارڈ بندو کی ماں ، فراست کی امّی ، جوزف کی ممّی اور پپّو کی آنٹی کے ہیں ۔ اور یہ رہے پیسے ۔ پلیز ان کے لئے بھی شکر لیتے آئیے ـــ اور ہاں ! جلدی آئیے میں آپ کے لئے کدّو کا حلوہ تیار کر رہی ہوں ۔ "

ہردیال جی مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے ۔

آنکھ مچولی

کل اندھیرے میں بھی یوں کھانوں پہ ٹوٹے مہماں
دعوتِ جشنِ "ولیمہ" بھی ہو ہولی جیسے
آٹھ دس باریوں "آئی ـ گئی" بجلی کل شب
"واپڈا" کھیلتی ہو آنکھ مچولی جیسے

• سلہ پنجاب ڈشش

کرنل محمد خاں

(بسلسلۂ گزشتہ)

بارہ برس میں کھٹن گیا

شام ہوئی تو جان ہمیں اپنے گاؤں کی پب PUB میں لے گئے، جو باہر سے حجرہ شاہ مقیم معلوم ہوتی تھی۔ ہم نے ادھر اُدھر دیکھا کہ شاید کہیں جٹی صاحبان بھی بہر عرض کھڑی ہو۔ لیکن نظر نہ آئی ہو۔ گر اندر جھانکا تو چوپال دکھائی دی جو مقامی جاٹوں سے بھری پڑی تھی: وہی دھواں، وہی دھکے، وہی قصے اور وہی قہقہے۔ اس انگریزی چوپال کے لوازمات بے شک کسی قدر مختلف تھے لیکن حالات میں کوئی فرق نہ تھا: مثلاً حقّہ نہ تھا لیکن حقّے کے برادرانِ خورد، سگریٹ اور سگار، سینکڑوں کی تعداد میں پھونکے جا رہے تھے۔ لسی نہ تھی لیکن لسی کی ولایتی بہن بیئر BEER پیپوں کے حساب سے پی جا رہی تھی اور حقّے اور لسی کو چھوڑ کر وہی چوپال کا سماں تھا: شہ زوروں کی لن ترانیاں، نوسر بازوں کی ریشہ دوانیاں، مَے نوشوں کی شرطیں، مسخروں کی شرارتیں، مٹیاروں کی باتیں اور عشاق کی گھاتیں۔ یوں لگا جیسے چراغاں کے ایک گوشے میں آنکلے ہوں۔ جان کھینچے کھینچے ہمیں ایک کورس گاتی ہوئی ٹولی کی طرف لے چلا اور دُور ہی سے گلا پھاڑتے ہوئے کورس میں شامل ہو گیا۔ کورس کے الفاظ بہت پاکیزہ نہ تھے اور جان ذالتو گلا پھاڑ کر اُن کی ناپاکی کو مزید جلا بخشنے لگا۔ پھر ہمیں خاموش دیکھ کر ہاتھوں کے اشارے سے ہمیں بھی نغمے پر اکسانے لگا۔ لیکن ہم نے ہاتھوں کے اشارے سے ہی معذوری ظاہر کی اور خاموش رہے۔ اس پر کورس ختم ہوتے ہی جان نے ہم سے بدلہ لیا یعنی ظالم کی تجویز پر اہلِ مجلس نے متفقہ طور پر ہم سے پاکستانی گانا سنانے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں تو ایک دانا کے راز کا قول یاد آیا کہ جس بات سے مفر نہ ہو اُسے اتنا ہی سلیقے اور خوش اسلوبی سے کرنا چاہیئے جیسے اپنے شوق سے کیا جا رہا ہو۔ چنانچہ انگیٹھی کے سامنے سے چمٹا اُٹھایا اور دونوں ہاتھ میں اُسے سر کی بلندی تک لے جاتے اور بجاتے ہوئے معروف لَے میں نغمہ سنج ہوئے:

ص ۱ جھرے شاہ مقیم دے اِک جٹی عرض کرے۔

ادھے بارں برسیں کھٹن گیا تے کھٹ کے لے آیا تاسا
تے ساڈے کولوں گھنڈ کردی ننگا رکھدی گلیاں والا پاسا
تے ساڈے کولوں گھنڈ کردی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور یہاں پہنچ کر ہم نے سامعین کو ساتھ دینے کا اشارہ کیا تو انہوں نے جان و دل سے لبیک کہا۔ اپنی اپنی استعداد کے مطابق پنجابی لفظوں کو انگریزی گلوں میں دھنکنا شروع کیا ــــــ اس کے بعد جن بین الاقوامی سُروں اور سرگموں کا کورس وجود میں آیا اسے سُن کر اہلِ کینٹ کے جملہ آباؤ اجداد اوّل تو اپنی قبروں سے ہڑبڑا اٹھ کھڑے ہوئے ہوں گے ورنہ ہر ایک نے ایک طوفانی کروٹ ضرور لی ہوگی۔

پب سے لوٹے تو ڈنر تیار تھا۔ میز کے گرد بیٹھے تو خلافِ معمول خاموشی تھی۔ جان نے گرما گرم پلیٹوں کی آمد پر کوئی نعرہ بلند نہ کیا بلکہ ابتدائے طعام سے پہلے گریس GRACE پڑھی۔ جیسے انگریزی الحمدللہ کہہ لیں۔ پھر اپنے ہاتھ سے کھانا تقسیم کیا اور بڑی متانت سے اور جنبشِ لب کے بغیر کھانا کھایا۔ کوئی بات کی بھی تو بڑے کو ملا پردوں میں ــــــ جیسا کہ ہم نے کسی دوسری جگہ کہا ہے: ــــــ انگریز عجیب جانور ہے۔ سنجیدگی کے موقع پر کم بخت برف بن جاتا ہے۔ کیا مجال جو رسوم و قیود سے ہٹ کر بات کرے۔ لیکن تفریح کا مقام ہو تو اس سے کوئی بے انتہا کوئی بدپرہیزی اور کوئی بے وقوفی بعید نہیں۔

چنانچہ کھانے کے خاتمے پر کافی آئی اور جان نے اپنا سگار سلگایا تو متانت پھر کسی چور دروازے سے غائب ہو گئی۔ آخر نیم شب کے قریب جان ہمیں ہوٹل میں چھوڑنے چلے تو راہ میں اُن کے لطیفے، ظریفے اور کیٹنے پاکیزگی سے اتنے ہی فاصلے پر تھے جتنی کنٹربری کے گرجے سے سوہو کی نائٹ کلبیں! اور دوسرے روز ہمیں سیر کرائی گئی تو معلوم ہوا کہاں کی کنٹربری کے گرجے کی!

جہاں خُدا ایک جُزوقتی خدمت گار ہے

اقبال کا ارشاد ہے کہ ایسے کور ذوق جہاں میں زندہ رہنا فضول ہے کہ یزداں دارد و شیطاں نہ دارد۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارشاد اہلِ پاکستان ہی کے لئے ہے جہاں زندگی یا کم از کم زندگی کا فرنٹ ویو بفضلِ اللہ ہو بہو رنگ میں یہ مصرع اُلٹ کر پڑھنا چاہیئے کہ وہاں بظاہر شیطان زیادہ اور یزداں کم دستیاب ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسری جب ہمیں مسز جیکب کے سپرد کیا گیا اور موصوفہ نے ہماری سیر کے لئے کنٹربری کے شہر اور مضافات کا انتخاب کیا، معاً ہمارے ذہن میں وہاں کے مشہور گرجے کا نقشہ اُبھرا اور ہم نے ارادہ کر لیا کہ وہاں جا کر یزداں کی کمی پوری کر سکے۔ لیکن گرجے میں پہنچے تو وہاں سب کچھ دیکھا مگر یزداں نظر نہ آیا۔ وہ بلند و بالا عمارت، وہ دیواروں کا سنگ

بارہ برس کے لئے کمانے کو بھیجا اور کما کر لایا۔ تاسا۔ ہم سے گھونگھٹ کرتی ہے اور سر کے بالوں والی وہ طرف جہاں کلپ (CLIP) لگا رہے ہیں، ننگی رکھتی ہے۔
ص۳ جنگ آمد۔ باب ۱۵

وبلوّر، وہ تصویروں کے رنگ وخطوط، وہ مُردہ پروہتوں کے خوابیدہ مجسّمے، وہ زندہ بشپوں کے بیدار خطبے۔ معلوم ہوتا تھا یہ خانۂ خدا نہیں، پادری خانہ ہے جہاں خدا محض جزوقتی خدمت گار ہے۔ جی تو چاہا کہ اس پادریانہ تجاوز پر خدا کی طرف سے احتجاج کریں اور مس جیکب سے جواب مانگیں لیکن سنگ اٹھایا تھا کہ سَر یاد آیا —— پہلے تو ہمیں وطنِ عزیز کے مولانا الف یاد آگئے، پھر امام ب یاد آگئے، پھر مفتی ج یاد آگئے، اور پھر قاضی د یاد آئے اور تصوّر میں دامِ تزویر کے رنگا رنگ تھان کھل گئے۔ ہم نے سنگ نیچے پھینک دیا اور اس لئے پھینکا کہ خدا کے نام پر خلقِ خدا کی حجامت فقط اہلِ مغرب کا اجارہ نہیں۔ اس فن میں کچھ ہمیں بھی دسترس ہے بلکہ اقبال نے تو ان فنکاروں کی باقاعدہ فہرست لکھ دی ہے :

خلقِ خدا کی گھات میں رند وفقیہہ ومیر وپیر

اور پاکستان کی آبادی سے رند وفقیہہ ومیر وپیر اور دیگر حجام نکال دیے جائیں تو پیچھے ماوشما ہی رہ جاتے اور ماوشما کے متعلق خود اقبال کو بھی معلوم نہ تھا کہ بیچارے جائیں تو جائیں کہاں ؟ اسی لئے تو خدا سے پوچھتے رہے کہ

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

بات گرجے کی تھی اور گرجا گھر دیکھ کر ہم پر متوقع معرفت کے دَر وا نہ ہوئے لیکن شہر سے نکل کر جب مسز جیکب ہمیں چھوٹے چھوٹے دیہات میں لے گئی اور اپنی سبزی لائبریری کی کتابیں تقسیم کرنے لگی تو جلد دیہاتیوں خصوصاً دیہاتی بچوں کی آنکھوں میں مسرّت اور ممنونیت دیکھ کر ہمیں مسز جیکب کے سراپے میں یزداں نظر آنے لگا۔ وہی یزداں جو کنٹربری کے گرجے سے بے دخل ہو چکا تھا۔ معاً ہم پر کھلا کہ خدا گرجے میں نہیں، دلِ دردمند میں رہتا ہے۔

سوزن کے سامنے ہمیں انگریزی بھول گئی

اگلے روز ہمارا کینٹ کاؤنٹی کا آخری بیرونی دورہ تھا اور اس روز ہمیں کاؤنٹی کا ایک چھوٹا سا مگر نہایت پیارا سا کتب خانہ دکھایا جانا تھا جو لارک ہل کے قصبے میں واقع تھا۔ ہمارے اس روز کے رہنما خود مسٹر ٹرومین تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ باس کی معیت میں ہم خصوصی توجہ اور تواضع کا مرکز ہوں گے۔ مگر لارک ہل پہنچے تو کتب خانے کے دروازے پر ہمیں خوش آمدید کہنے کو کوئی نہ تھا۔ بلکہ دروازہ خود بھی ہونٹ سے کھڑا تھا۔ اس بے دربان دروازے کا ذہن تو خیر فرینک ٹرومین نے اپنے کھردرے سرپرستانہ ہاتھوں سے وا کر دیا مگر اندر جا کر لائبریرین کے کیبن پر دستک دی تو بڑے خادمانہ انداز میں اور جب تک اندر سے کم اِن (COME IN) کی آواز نہ آئی اُمیدوارانہ کواڑ تھامے باہر کھڑا رہا۔ آخر اندر داخل ہوا تو میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی خاتون نے جو کچھ لکھ رہی تھی، سر اُٹھائے بغیر کہا :

"بیٹھیے —— میں آخری سطر پوری کر لوں"

ایک ماتحت لائبریرین کی جانب سے جو خاتون ہی سہی، یہ ادا ہمارے نزدیک بے ادبی بلکہ گستاخی تھی لیکن ٹرومین ایک مخلص اور بے لوث زن مرید کی طرح خاموش کھڑا رہا۔ ہم حیرت سے کبھی ٹرومین کے مُنہ کو اور کبھی لائبریرین

کے سر کو دیکھتے ——— لائبریرین کا جھکا ہوا چہرہ ابھی تک اوجھل تھا ——— تاآنکہ اس نے آخر کار سر اٹھایا اور ظالم نے جونہی اپنی لمبی، کالی اور بھاری پلکوں کا بوجھ بلند کرتے ہوئے ہماری طرف دیکھا، دُنیا و دین میں ہلچل سی مچ گئی کہ یہ آنکھیں نہ تھیں، مے سے چھلکتے ہوئے پیمانے تھے۔

اگر ہمیں اسی کافرہ سے خصوصی توجہ اور تواضع کی توقع تھی تو بڑی نادر توقع تھی۔ آس پاس اگر مِن و انس کی توجہ اور تحسین کا کوئی واحد مستحق مرجع تھا تو یہ دو آنکھیں تھیں۔ ایک لمحے کے لئے سکوت سا چھا گیا لیکن پھر فرینک ——— ٹروین اچانک بولے :

"سُوزن ملیے ہمارے مہمان مسٹر خان سے"

سوزن نے مصافحہ کے لئے ہماری طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک تبسم میں لپٹا ہوا مزاج پُرسی کا کلمہ کہا۔ ہم نے ہاتھ میں اس کا ہاتھ لیتے ہوئے تبسم کے جواب میں تو تبسم کیا مگر کلمے کے جواب میں زبان گنگ پائی۔ ہمیں انگریزی ہمیشہ دو موقعوں پر بھول جاتی ہے: انگریزوں کے سامنے اور حسینوں کے سامنے اور سوزن تو دو آتشہ تھی کہ انگریز بھی تھی اور حسین بھی دراصل سوزن میں ایک اور قسم کی آتش بھی تھی لیکن ہم اس آگ کو کُرید کر قارئین میں دہشت نہیں پھیلانا چاہتے۔

پھر سوزن نے اپنی توجّہ اپنے باس کی طرف موڑی اور گویا ہوئی :

"گڈ فرینک تم دس منٹ لیٹ ہو"

گویا سوزن صاحبہ اپنے افسر سے نہیں، کسی اخبار فروش لونڈے سے بات کر رہی تھیں۔ لیکن ٹروین کہ سوزن کی بے باکی اور بے تکلفی کا خُوگر تھا، کسی قدر شرارتاً بولا :

"لیٹ کس چیز کے لئے؟ کوئی خیراتِ حُسن کی تقریب تھی؟"

اور ساتھ ہی سُوزن کے شاداب سراپے پر غور سے نظرِ ثانی کرتے ہوئے اس نے اُمیدوارانہ جھولی پھیلا دی۔ سوزن نے کنایہ سمجھتے ہوئے بھی شرمانے کا تکلّف نہ برتا ——— بلکہ بالکل بے پروایانہ بولی :

"حسن کی نہیں، کافی کی خیرات تھی: میرے اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی"

ٹروین کہ اس وقت کافی پینا اپنا حق سمجھتا تھا، کسی قدر حیرانی سے بولا "تمہارا مطلب ہے اب ہم کافی سے بھی محروم رہیں گے؟"

"خیال تو یہی ہے، سوائے اس کے کہ کوئی معجزہ واقع ہو جائے"

"مہمان کا بھی خیال نہ کرو گی؟"

"مہمان کا خیال علیحدہ رکھا جا سکتا ہے لیکن تمہارے نصیب میں مجھے کافی نظر نہیں آتی"

اتنے میں ایک بوڑھا سا ملازم، ایپرن پہنے، کافی کا ایک دخانی پیالہ ٹرے میں رکھے ہمارے سامنے آکھڑا ہوا۔ ہم نے پیالہ اُٹھایا تو ٹروین ملازم کو مخاطب کرتے ہوئے چلّایا :

"BUT WHAT ABOUT ME, GEORGE?"

جارج نے سوزن کی طرف دیکھا سوزن نے ہوا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :

"جارج فقط اپنے باس سے آرڈر لیتا ہے اور وہ باس میں ہوں"

ٹرومین بولے: "اس صورت میں مس سوزن گلبرٹ بھی اپنے باس سے آرڈر لے گی جو کیں ہوکس اور قی الفور کافی کا ایک ایسا ہی دخانی پیالہ اپنے پیارے باس کو پیش کرے گی۔"

سوزن نے ایک لمحے کے لئے ٹرومین کے چہرے کا مطالعہ کیا اور کہنے لگی:

"ماتحت کو صرف قانونی حکم دیا جاسکتا ہے ایک پیالا باس بھی لائبریرین سے کتاب مانگ سکتا ہے، کافی نہیں مانگ سکتا۔ نہ دخانی نہ برفانی۔"

ٹرومین نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا:

"سوزن۔ خدا کے لئے مجھے کافی پلاؤ، ورنہ میں کچن پر چھاپہ ماروں گا۔"

سوزن نے مہرباتا نہ سرہلاتے ہوئے کہا: "خدا کے نام پر مانگتے ہو تو معجزے کا امکان ہے لیکن یہ چھاپے والی دھمکی ایک لمحے کے اندر واپس لینا ہوگی۔"

ٹرومین نے پہلے سانس ہی میں کہہ دیا: "واپس لی۔"

اس پر سوزن نے جارج کو اشارہ کیا۔ جارج مسکراتا ہوا گیا اور کھلکھلاتا ہوا کافی کا دھواں دھار پیالہ اُٹھالایا، سوزن سے آنکھ بچا کر ٹرومین کو آنکھ ماری اور پیالہ اُس کے سامنے رکھ دیا۔

بتائیے، ٹھنڈا حُسن کس کام کا ہے

لیکن یہ سب کچھ ہورہا تھا اور ہم حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ سوچا کہ سوزن لاکھ حسین سہی لیکن سرکاری کاغذات کی رُو سے لائبریرین ہے۔ معشوقہ نہیں کہ دفتر کے اوقات میں بھی مشقِ ناز کرنے لگے اور وہ بھی اپنے اعلیٰ افسر کے ساتھ اور اعلیٰ افسر بھی سرکاری معائنے کے لئے آیا ہے، نازبرداری کے دورے پر نہیں۔ چنانچہ اُس وقت تو ہم یہ سوال نہ اُٹھا سکے لیکن جب کافی کے بعد معائنہ ختم ہوچکا ——— اس کم بخت کا کام بھی اپنا ہی جیسا حسین نکلا جتنی یہ خود تھی ——— اور سوزن سے رخصت ہوکر کار میں بیٹھے تو ہم نے چھوٹتے ہی ٹرومین سے پوچھا:

"یار، ایسی بدتمیزی کیسے برداشت کر سکتے ہو؟"

"کونسی بدتمیزی؟"

"یہی تمہاری لائبریرین کی۔"

ٹرومین بڑے سکون سے بولا: "ایک بات بتاؤ۔ سوزن بیوٹی فُل ہے یا نہیں؟"

اور بیوٹی فُل کا لفظ ظالم نے اِس لذیذ انداز میں ادا کیا جیسے نابوکاف کی زبان سے لولیٹا کا نام نکلا تھا یعنی جیسے اُس میں سے رس چوس رہا ہو۔

کہا: "حسین تو بے شک ہے۔"

بولا: "تو حضرت، بدتمیزی بدشکلوں سے سرزد ہوتی ہے، حسینوں سے نہیں۔ حسین صرف غمزہ کرتے ہیں۔ جانتے ہو غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟"

ہمیں چند پری چہرہ لوگوں کی یاد آئی اور اثبات میں سرہلایا۔ ٹرومین نے سلسلۂ کلام جاری رکھا:

"اور ہاں، کوئی ایسا طریقہ بھی جانتے ہو جس سے حسن کو غمزے سے الگ کیا جا سکے؟"
جب اس سوال پر غور کیا تو ہم پر حقیقتِ حسن واضح ہونے لگی۔ ہمیں اعتراف کرنا پڑا کہ حسن لازم ہے تو غمزہ ملزوم۔ ٹرومین نے اگلا سوال کیا:
"نیز یہ بتاؤ کہ اگر حسن میں غمزہ نہ ہو تو ٹھنڈا حسن کس کام کا ہوتا ہے؟"
ہمیں ایک ٹھنڈی حسینہ کی وحشت ناک یاد آئی اور تسلیم کیا کہ حسن حرارت ہی کا دوسرا نام[1] ہے۔ اس پر ٹرومین مسکراتے ہوئے بولا:
"میرے پیارے کرنل تم آدمی تو اچھے معلوم ہوتے ہو لیکن کبھی کبھی تم پر فوجی ڈسپلن غالب آ جاتا ہے۔ اب ذرا اسٹینڈ ایزی STAND EASY ہو جاؤ اور سوزن کو دُعا دو ——— اور بہرحال تم اس کا بگاڑ بھی کیا سکتے ہو!"
ہمارے فوجی پن کے متعلق ٹرومین کی تشخیص ایسی غلط نہ تھی۔ ایک دفعہ پہلے بھی ہم سے حسن کی سرکار میں بے ادبی ہو گئی تھی جب کارپورل کلونت کور کی ایک ادا پر فدا ہونے کی بجائے اسے اٹین شن ہونے کا حکم دے دیا تھا اور پھر ہماری حسین کارپورل نے ہمارے سامنے اس زور سے نالہ کیا تھا کہ ہماری کپتانی کا پتہ پانی ہو گیا تھا۔ بہرحال ٹرومین کا لمبا لیکچر سننے کے بعد ہمیں یاد آیا کہ یہ سبق تو ہمارے ایک شاعر کب کا دے چکے ہیں اور فقط دو مصرعوں میں:

اپنی مرضی کے لوگ ہیں باقی[2] کون اُلجھے پری جمالوں سے

[1] جنگ آمد۔ باب ۱۹
[2] باقی صدیقی مرحوم۔ خطۂ پوٹھوہار کا درویش طبع شاعر۔

احمد جلیس

رشید الدین ــــ ایک مزاح نگار ــــ

لگ بھگ بیس سال یعنی سنہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ باہر آکر دیکھا تو ایک اجنبی سا چہرہ دکھائی دیا۔ دبلا پتلا، مختصر سا گندمی رنگت کا ایک سیدھا سادہ نوجوان میرے سامنے تھا۔ اجنبی سا چہرہ لیکن مانوس آنکھوں کی چمک۔

آپ ہی غالباً احمد جلیس ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر، ویسے مجھے رشید الدین کہتے ہیں۔ اورنگ آباد سے آیا ہوں ارے بھئی آپ کے دوست رفعت نواز ہیں نا ـــ بشر نواز کے چھوٹے بھائی ـــ وہ میرے بھی بچپن کے بہت اچھے دوست ہیں وہ اکثر اورنگ آباد میں آپ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ویسے شائد آپ مجھے بھول گئے ہیں۔ نامپلی اسکول میں ہم دونوں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے وغیرہ وغیرہ وغیرہ . . . . . .

خوب ـــ میں نے سوچا پہلی ہی ملاقات میں اتنی بڑی چھلانگ ـــ آثار مجھے کچھ اچھے نہیں دکھائی دیئے۔ لیکن اس شخصیت کے پیچھے مجھے جو بے پایاں خلوص موجزن نظر آیا اُس سے متاثر ہوئے بغیر میں نہیں رہ سکا۔ دس منٹ کے اس ابتدائی تعارف کے ذریعے رشید الدین کی بے ریا شخصیت نے دس سال کی مدت کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ میں نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ اچھا رشید صاحب، مجھے عام طور سے اتوار کے دن صبح دس بجے سے مکمل فرصت ہوتی ہے۔ ہو سکے تو اتوار کو ضرور تشریف لائیے۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ دعا کی شرف قبولیت کا کون سا قیمتی لمحہ تھا کہ وہ دن اور آج کی تاریخ۔ رشید الدین پچھلے بیس سال سے مسلسل اپنی بھرپور وضع داری کے ساتھ میری وعدہ خلافیوں کو بھگت رہے ہیں۔

میں اکثر رشید کو وقت دے کر کسی انہونے واقعہ میں ملوث ہو جاتا ہوں، ارضی اور سماوی آفتیں مجھے اتوار کے دن دس بجے صبح گھر پر رہنے سے روک دیتی ہیں۔ رشید اپنے مقررہ وقت پر آتے، ڈرائنگ روم میں بیٹھتے اور میرے

انتظار کے لطف سے محظوظ ہو کر چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شائد مجھ سا بے مروت انسان رشید جیسے مخلص انسان کا دوستی کا اہل ہی نہ تھا۔ لیکن رشید جب دوسری بار مجھ سے ملیں گے تو مقررہ وقت پر میری غیر حاضری کا ردعمل یوں ظاہر کریں گے گویا میں نے نہیں خود انہوں نے میرے ساتھ کوئی دلچسپ شرارت کی ہے۔ دیکھتے ہی ایک معصومانہ بے ساختہ قہقہہ لگائیں گے اور پوچھیں گے۔ ارے اچھا چل دیئے میاں بٹھا کر۔ کہاں غائب تھے اتوار کے دن ۔۔۔ ؟ رشید کو معلوم ہے کہ اب میں معصوم سی صورت بنا کر ایک نہایت عجیب و غریب داستان شروع کرنے والا ہوں۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس واقعہ سے صداقت کتنی تعزیق کرتی ہے اور حقیقت کا فیصد کیا ہے ؟

ہم دونوں جب مل بیٹھتے ہیں تو عموماً میری حیثیت راوی کی اور رشید کی سامع کی ہوتی ہے ورنہ اس پُرآشوب زمانہ میں کون کس کی سنتا ہے ۔ ؟ پھر مزے کی بات یہ ہے کہ رشید سے بات چیت کرتے وقت آپ کو اپنے اوپر سنسر لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ رشید کا دل مجھ جیسے سینکڑوں جلیسوں کے رازہائے دروں کا ایک ایسا گنجینہ ہے جس کی ماسٹر کنجی یا تو رشید کے پاس ہے یا اس کے مالک کے پاس۔ بلکہ مالک اگر اپنی کنجی بھول بھی جائے تو فرق نہیں پڑتا۔ ضرورت کے وقت رشید نہایت سعادت مندی سے اس کی امانت اس کے حوالے کر دے گا۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں رشید اس صدی کی چیز نہیں ہے۔ وہ تو AVM کی فلموں کا ایک ایسا آدرش کیریکٹر ہے جس کی زندگی میں کہیں کوئی جھول نہیں۔ ایک آدرش شوہر ۔۔ جو مشین کی طرح میکانیکل انداز میں اپنے بیوی بچوں کو پرسکون اور قناعت پسند زندگی عطا کرنے کی جد و جہد میں لگا ہوا ہے۔ اپنے آفس میں کام کرنے والا ایک خاموش اور بے ضرر انسان جو اپنی ترقی کیلئے دوسروں کی ٹانگ گھسیٹنے کے فن سے بالکل ناواقف ہے اور چپ چاپ کام کرتے کرتے ہی محض سالانہ تدریجی اضافوں کے باعث اچھے عہدے پر پہونچ گیا۔

رشید الدین ۔۔۔ ایک ایسا آدرش ادیب ہے جو ہر گروپ کے لئے قابل قبول ہے۔ کیونکہ وہ ہر ایک کی سنتا ہے۔ ہر گروپ کو جیو اور جینے دو کی تلقین کرتا ہے۔ بقائے باہمی کا نظریہ اس کی زندگی کا اصل مسلک ہے۔ وہ ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہے جو اردو کے رسالے اور کتابیں اپنی محدود آمدنی کے باوجود خرید کر پڑھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی تحریروں کی وجہ سے ایک عظیم ادیب نہ سمجھا جائے لیکن لکھنا پڑھنا تو اس کا ایک خارجی مشغلہ ہے۔ انسانیت کی بنیادی قدروں کو اس نے اپنی تحریروں سے زیادہ زندگی کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔

مزاح اس کی سرشت میں ہے۔ وہ قہقہے لگانے کے لئے ہر لمحہ منتظر رہتا ہے اور قہقہے لگانے کے لئے وہ ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ اپنی سہولت کے لئے اس نے قریبی دوستوں کو دو خانوں میں بانٹ لیا ہے۔ کچھ ایسے دوست ہیں جو چاہے کسی ہی بات کہیں رشید اس بات میں سے اپنے لئے تفنن کا پہلو ڈھونڈ نکالے گا اور تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے جی کھول کر قہقہہ لگائے گا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ بات کہنے والے کے ذہن میں خود کوئی مزاحیہ نکتہ نہیں تھا لیکن رشید کی تحسین بے موقع کو وہ نہایت انکساری سے قبول کر لیتا ہے۔ دوسرے خانے میں رشید نے ایسے دوستوں کو رکھا ہے جو اس کی دانست میں ہمیشہ بے وقوفی کی بات ہی کہتے ہیں۔ اب ان بے چاروں کی شامت آ جاتی ہے۔ جب وہ کوئی پتے کی بات بھی کہتا

گے. رشید اس بات کا نقطۂ عروج اپنی طرف سے شامل کر لیں گے اور بات مکمل کر کے خود ہی زور زور سے قہقہے لگائیں گے
یں ان دو زمروں میں سے رشید میرا شمار کس خانے میں کرتے ہیں — ؟
رشید کے اور میرے مشترکہ دوستوں میں سے اکثر دوستوں کو رشید کے ان بے موقع قہقہوں سے شکایت ہے۔ لیکن میں
ا ہوں کہ صرف ایک سادہ لوح اور بے ریا ضمیر رکھنے والا ہی زندگی سے بھرپور قہقہہ لگا سکتا ہے۔ اپنی زندگی کی طرح رشید
زاح میں بھی تہذیب کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ نام کی مناسبت کی تاثیر یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی کی طرح
ید الدین کو اپنی تہذیبی قدریں مزاح میں بے حد عزیز ہیں۔ رشید کے مزاح کا لطف بھی صرف مہذب افراد ہی اٹھا سکتے ہیں
تگی اور کھلے دل سے مسکرا سکتے ہیں خود رشید کی طرح بے ساختہ قہقہے نہیں لگا سکتے۔
رشید الدین کے مجموعے خواہ مخواہ میں بھی آپ کو کوئی چٹکلا پھبتی کا یا خواہ مخواہ کا نہیں ملے گا۔ کیونکہ رشید الدین آپ
سے ذوقِ مزاح کے ذریعے خواہ مخواہ بور نہیں کرنا چاہتا، اگر آپ نے اس مجموعے پر خواہ مخواہ کی تنقید بھی کی تو وہ آپ کا
ن نہیں بنے گا۔ کیونکہ وہ خواہ مخواہ کسی کو اپنا دشمن بنانا چاہتا ہی نہیں۔ اُسے تو بس دوستی کرنے اور نبھانے کا گُر آتا
ہے۔ خواہ مخواہ ہی ——

(رشید الدین کی تصنیف "خواہ مخواہ" کی رسمِ اجراء میں پڑھا گیا)

غزل

باض افسوس
(اکولہ)

گھر ہی میں قتل و خون کا امکاں دکھائی دے
کرکی میں جب بھی صورتِ مہماں دکھائی دے

مستقبلِ زباں بھی درخشاں دکھائی دے
شاعر جب ہوٹلوں میں غزل خواں دکھائی دے

فیشن نے وہ بنائی ہے دُرگت لباس کی
دامن دکھائی دے نہ گریباں دکھائی دے

دَورِ جدید کا یہ تقاضہ بھی خوب ہے
انساں حماقتوں پہ بھی نازاں دکھائی دے

ساون کے اندھے جب سے ہوئے رہبرانِ قوم
ہر خار زار اُن کو گلستاں دکھائی دے

جوتے سرہانے رکھ کے اُسے سونا چاہئے
ہر رات جس کو خوابِ پریشاں دکھائی دے

افسوسؔ لاٹری ہوئی جس روز سے شروع
فیوچر ہر اک کو اپنا درخشاں دکھائی دے

○

خرافات

(مراسلے)

عزیزی مصطفیٰ کمال!
خوش رہئے:
چندروز پہلے 'شگوفہ' کا 'کپور نمبر' ملا۔ ڈرامہ نمبر کے بعد
…آپ کا دوسرا قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ اس نمبر کی تیاری میں
…پ کی لگن اور خواجہ صاحب کی خوش سلیقگی ہر ہر زاویہ سے
…ارفرما ہے۔ کپور کی شخصیت اور ان کے فن پر یہ ادبی کیپسول
…لحاظ سے مستند، معتبر، دل چسپ اور بھرپور ہے کم صفحات
…میں اتنا جامع نمبر نکالنا واقعی بڑی اہم بات ہے۔ اس
…رنامہ کے لئے آپ اور خواجہ صاحب' مبارکباد کے مستحق ہیں۔
…مدمیں بڑی دریا دلی سے یہ تحفہ بھیج رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ
…بی برادری کی جانب سے آپ کو اس طرح کے خاص نمبر
…لنے پر ڈی لٹ کی ڈگری دی جائے۔ محض پی۔ ایچ ڈی
…کام نہیں چلے گا۔

دعاگو
رضا نقوی واہی (پٹنہ)

○ "کنہیا لال کپور نمبر تم نے بہت خوب نکالا ہے۔
… قلدکم مدت میں اتنا اچھا نمبر نکلنا ممکن نہ تھا ——
…بہ عبدالغفور صاحب اور تم اس کے لئے قابلِ مبارکباد ہو۔"

تمہارا اپنا
مجتبیٰ حسین (دہلی)

○ "شگوفہ" کے "کنہیا لال کپور نمبر" کے لئے مبارکباد
…نے شایان شان نمبر شائع کیا ہے۔ "شگوفہ" اور
… دونوں کے اعتبار سے۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید (ترو پتی)

○ "شگوفہ" کا کنہیا لال کپور نمبر پڑھا۔ جی خوش ہوا۔ اور خواجہ عبدالغفور نے بڑی محنت و فن شناسی سے اس کی ادارت کی ہے۔ یہ نمبر اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب کا مضمون "کنہیا لال کپور —— ایک تاثر" بہت پسند آیا۔ موصوف نے جس بے باکی اور صاف گوئی سے کنہیا لال کپور کا موازنہ رشید احمد صدیقی اور پطرس کے ساتھ کیا ہے، قابل ستائش ہے۔ میری طرف سے انہیں مبارک باد دیجئے۔

شیخ رحمٰن (اکولوی)

○ کنہیا لال کپور اپنی مثال آپ ہے۔ زیادہ تعریف کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ سوچ رہا ہوں کہ آپ پر ایک خاکہ لکھ ڈالوں

انصاری اصغر جمیل (ناگپور)

○ "شگوفہ" کے خاص کپور نمبر دیکھ کر اس کا معیار حسنِ رعنائی سے آنکھیں چکا چوند ہو گئی۔

عبداللہ خان (امراوتی)

○ "طنزیہ لال کپور نمبر ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ آپ نے جس عرق ریزی اور جانفشانی کے ساتھ مواد اکٹھا کیا ہے اس کے لئے مستقبل میں اردو محققین اور سکالر، مرہونِ منت اور استفادہ کریں گے۔ بالخصوص ایک ایسی شخصیت پر جس نے خود پر خول چڑھا لیا تھا آپ نے کئی گوشوں سے روشناس کرایا۔ مرحبا ——!

رؤف خوشتر، کلبرگہ

○ "شگوفہ" کا کپور نمبر ملا جو میرا ہم سفر رہا۔ پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ دل سے دعائیں نکلیں۔ قابلِ فخر بات یہ ہے کہ پہل آپ نے کی اور ایک بہترین مثال قائم کی۔ کپور کی شخصیت اور فن دونوں اجاگر ہو گئے۔

ا ب ج د، حیدرآباد

اداریہ

مشہور مزاحیہ شاعر اور زندہ دلانِ حیدرآباد کے سینئر رکن گرگ بڑ حیدرآبادی (ناظم مرزائی) قلب پر حملہ کے باعث انتقال کر گئے۔ نمائش سوسائٹی حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ مزاحیہ مشاعرہ ابھی شروع ہوا تھا کہ گرگ بڑ کے دل پر دورہ پڑا اور چند ہی منٹ میں ان کی روح پرواز کر گئی۔ گرگ بڑ صاحب زندہ دلان کے سرگرم رکن تھے۔ نائب معتمد خازن اور رکنِ عاملہ کی حیثیت سے وہ سرگرمیوں میں اہم حصہ لیتے تھے۔ ان کی موت پر کسی کو یقین نہ آیا۔ ان کی زندہ دلی، ہر دلعزیزی، سادگی اور شرافت کا ہر کوئی قائل تھا ــــ نماز جنازہ میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی ــــ زندہ دلان حیدرآباد کا خصوصی تعزیتی اجلاس بھی منعقد ہوا ــــ اسی اجلاس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ مرحوم کی اہلیہ محترمہ کے لئے ماہانہ تقریباً دو سو روپے آمدنی کا انتظام ہو اور مختلف ذرائع سے ۱۲ ہزار روپے جمع کئے جائیں چنانچہ چند ہی دن میں مشاعرہ اور عطائے کے ذریعہ یہ رقم جمع کر لی گئی ــــ جس ادارے سے وہ وابستہ تھے اس کی طرف سے یہ چھوٹا سا نذرانۂ عقیدت ہے، لیکن حق تو یہ ہے کہ ان کی خدمات کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا ــــ

● شگوفہ کے اس شمارہ* کی قیمت دو روپیہ ہی رکھی گئی ہے مارچ کے شمارے سے عام شمارے کی قیمت ڈھائی روپے ہو گی۔ اپریل میں زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقریبات کے موقع پر سوونیر شائع ہو گا۔

آہ گرگ بڑ! تم نے یہ کیا گڑبڑ کر دی۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ تم ہم تمام کو یوں ہی داغِ مفارقت دے دو گے۔ اللہ تمہیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے میں جب بھی حیدرآباد وارد ہوتا، تمہارے دفتر "انگارے" تم سے ملے بغیر یہاں واپس نہ ہوتا اب مجھے کون حیدرآبادی لہجے میں "حضت" کہہ کر پکارے گا۔ تمہارے یہ الفاظ میرے کانوں میں کل سے رس گھول رہے ہیں۔

تمہارا بد نصیب دوست

فیض الرحمٰن

سردار، رائچور

اخباروں کے ذریعہ گرگ بڑ حیدرآبادی کے انتقال کی دل سوز خبر سن کر سیوان کے ادبی حلقوں کو عموماً اور جوہر سیوانی کو خصوصاً زبردست صدمہ پہنچا۔ مرحوم کی فنی خوبیوں اور شخصی اوصاف پر ضیا پاشی کے لئے بزمِ انور سیوان کے زیر اہتمام ایک تعزیتی نشست صدرِ بزم جناب جوہر سیوانی کے دولت کدہ پر منعقد ہوئی ــــ چونکہ مرحوم سے جناب جوہر سیوانی کے گہرے برادرانہ تعلقات تھے اس لئے انھوں نے مرحوم کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کے علاوہ ان کی صحافیانہ عظمتوں پر بھی روشنی ڈالی اور مرحوم کو ایک مخلص انسان اور ہمدردِ ادب قرار دیا۔ بعد ازاں مرحوم کی مغفرت کے لئے بارگاہِ ربّی میں دعائیں کی گئیں۔ بزمِ انور سیوان، مرحوم کے لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

بیکس سیوانی

جوائنٹ سکریٹری بزمِ انور سیوان بہار

SHUGOOFA
31 Bachelor Quarters, M.J. Market, Hyderabad-1 Feb. 1981 Phone: 57716
14 . 2

اے پی ایس آرٹی سی کرایہ میں اضافہ طالب علموں پر اثر انداز نہیں بلکہ سہولتوں میں اضافہ ...

★ اے پی ایس آرٹی سی ایک عوامی ادارہ ہے۔ اس کی بہتری صرف عوام کے تعاون پر منحصر ہے۔
★ غور کیجئے۔ کب تک اس ادارہ کی بقا کرایوں میں اضافہ کے بغیر ممکن ہے جبکہ ڈیزل آئیل، اسپیر پارٹس اور ٹائیروں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ نہ تو حکومت اور نہ کارپوریشن یہ چاہتی ہے کہ عوام ہی موجودہ نقصانات کو برداشت کرے۔ معمولی سا کرایہ میں ½ ا پیسے کا اضافہ فی کیلومیٹر ضروری ہوگیا ہے۔

طلبا کو مزید سہولتیں

★ حالیہ قیمتوں میں اضافہ کا طلبا پر اطلاق نہیں ہوتا۔
★ ۱۲ سال سے زائد عمر کے طالب علموں کو شہری بسوں میں عام کرایہ کے نصف کی حد تک سہولت حاصل ہے۔
۔ ۱۲ سال سے کم عمر طالب علم بچوں کی شرح ٹکٹ کا ¼ کرایہ دیں گے۔ یہ سہولتیں ایک عرصہ سے حاصل ہیں۔
★ ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۴ء میں کئے گئے کرایہ میں اضافوں کے موقع پر ان سہولتوں میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔
★ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں کرایہ میں اضافہ کے موقع پر ۱۹۷۲ء کی سہولتوں کے مطابق عمل کیا گیا جس کے نتیجہ میں ۱۲ سال سے زائد عمر کا طالب علم ۳۸ پیسے اور ۱۲ سال سے کم عمر طالب علم صرف ۲۵ پیسے ادا کرتا ہے۔ بہ مقابل عام پاسنجر کے جو اسی فاصلے کے لئے ایک روپیہ دیتا ہے۔
★ شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈول ٹرائب طلبا کو مزید سہولتیں دی گئی ہیں۔ سابقہ ۵۰٪ کے بجائے اب ۶۰٪ کرایہ میں کمی کے اہل ہیں۔
★ موجودہ کرایہ میں اضافہ کے باوجود اضلاع کے طالب علم ۳۵ فی صد کمی کی سہولت سے استفادہ کرتے رہیں گے۔
★ ریاست میں جملہ ۶۳۰۰۰ طالب علم ان سہولتوں سے استفادہ کرتے ہیں جس سے کارپوریشن پر ½ ۲ کروڑ سالانہ کا بار ہوتا ہے۔
★ کارپوریشن، طالب علموں کو کم سے کم کرایہ میں آمدورفت کی سہولت فراہم کرنے میں کبھی تساہل نہیں کرتی۔

جاری کردہ:

آندھرا پردیش اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن

شگوفہ

MARCH 1981 **RS. 2/50**

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

سب رس

جلد: ۱۴ | مارچ ۱۹۸۱ء | شمارہ: ۳

ایڈیٹر:

سید مصطفیٰ کمال

سالانہ (۲۵) روپے
بیرونِ ہند (۲۵) شلنگ
فی پرچہ ۲ روپے ۵۰ پیسے

طباعت:
نیشنل پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

خط و کتابت کا پتہ:
۳۱ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد فون: 57716

اس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

مالِ مفت (انشائیے)

دخل در نامعقولات (ڈرامہ)

حق تو یہ ہے (ترجمہ)

چُورن

(نظمیں)

(بسلسلہ گزشتہ)

کرنل محمد خان

انگلستان؛ شہر اچھے کہ بَن

ہماری بلوغت تسلیم کرلی گئی

اگلے روز جمعہ تھا یعنی کینٹ کاؤنٹی میں ہفتہ پورا کرنے کے لئے تین دن باقی تھے، لیکن صبح جاگ کر ٹرینن کے دفتر میں گئے تو معلوم ہوا ہمارا ہفتہ ختم ہوچکا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہفتے اور اتوار کو انگلستان میں یوں بھی چھٹی ہوتی ہے باقی رہا جمعہ تو جوں ہی ہم نے دفتر کے اندر قدم رکھا اور کاغذ دیکھ لئے، جمعہ بھی ختم ہوگیا اور سامنے ایک بے فکر و بے گراں ہستی کھیلتی ویک اینڈ (WEEK-END) کے رُخ سے نقاب سرکنے لگا۔ ہم ویک اینڈ منانے کے لئے سیدھے لندن چل پڑے گاڑی لندن پہنچی تو ہمیں حیرانی اور — خوشی — ہوئی کہ پلیٹ فارم پہ ہماری سربراہی کے لئے گولڈہل موجود نہیں تھا۔ اس خوشگوار غیر حاضری کا مطلب یہ تھا کہ بالآخر ہمارا بالغ ہونا تسلیم کرلیا گیا تھا۔ چنانچہ جوش بلوغت میں ہم نے اپنے ہاتھ سے ٹیکسی کو اشارا کیا جو کارگر نکلا اور خود مختارانہ طمطراق سے ہوٹل پہنچے۔ مگر کیا دیکھتے ہیں کہ ہوٹل کے دروازے پر گولڈہل کھڑا ہے۔ وہی بے چین آنکھیں اور وہی مامتا بھری نگاہیں۔ ہماری بلوغت پھر انگوٹھا چوسنے لگی لیکن خوش قسمتی سے گولڈہل تیزی میں تھا۔ ہمیں مس پارسن کا خط دیا، اگلے روز ہمیں اسٹیشن پر لے جانے کا وعدہ کیا اور درازیٔ عمر کی دعا دے کر رخصت ہوگیا۔

ہنی مون کے لئے قربانی درکار ہے

اب ہم ہوٹل کے جانے پہچانے مہمان تھے۔ کاؤنٹر کے قریب پہنچے تو پورٹر ٹامس (۶۰ سالہ) ریسپشن کلرک سے کہہ رہا

(۲۰ سال)، اور اکاؤنٹس کلرک نینسی (۲۱ سال) نے ہمیں مانوسانہ ہیلو کہا جیسے اہل خانہ میں سے کوئی ہفتے کی غیر حاضری کے بعد گھر لوٹا ہو۔ دعا و سلام کے بعد ہم قریب کی لفٹ سے اوپر جانے ہی والے تھے کہ استقبالیہ ڈیسک سے ہماری سمت جولی کی آواز آئی۔

"مسٹر خان"

"جی، جولی" ہم نے جواب دیا

"ایک زحمت دے سکتی ہوں؟"

"ارشاد"

"دو راتوں کے لئے ہمیں آپ کا کمرہ چاہیئے۔ کیا آپ ایک دوسرے کمرے میں جانا پسند کریں گے؟ ذرا چھوٹا ہوگا۔"

"یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ ہم سے یہ قربانی کس شخص کے لئے دلائی جا رہی ہے؟"

"ایک امریکی جوڑے کے لئے جو ہنی مون پر آیا ہے۔ دراصل آج اکٹھے چار جوڑے امریکہ سے ہنی مون منانے آگئے ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "کام تو نیک معلوم ہوتا ہے مگر کوئی جوڑا دکھاؤ تو۔"

جولی بولی۔ "ایک تو یہ رہا، آئیے، ملئے مسٹر اور مسز فرینکلن سے۔"

ملنے سے پہلے ہم نے جوڑے کو دیکھا دولہا کوئی ساٹھ برس کے پیٹے میں تھا اور دلہن اس سے بھی اگلے پیٹے میں۔ ظاہر تھا کہ یہ محترمہ دولہا کی تیسری یا چوتھی دلہن ہیں اور محترم، دلہن کے پانچویں یا چھٹے دولہا ہیں کیونکہ دونوں کے چہروں پر گذشتہ شادیوں اور طلاقوں کے گہرے نقوش موجود تھے۔ ہم نے بڑھ کر دولہا سے مصافحہ کیا اور کہا،

"شادی مبارکباد۔ مسٹر فرینکلن۔"

"شکریہ اور ملئے میری دلہن سے مگر آج یہ بول نہیں سکتیں۔ ان کے دانت میں درد ہے۔"

جواب میں محترمہ نے منہ کھولے بغیر تبسم کیا اور اس خندۂ ناتمام کی کمی آنکھیں مٹکانے سے پوری کی۔ دانت درد کے باوجود دلہن کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی مٹکاہٹ باعث حیرت بھی تھی اور قابل داد بھی۔ چنانچہ جواب میں ہم نے ارادۃً تو کلمۂ تحسین ہی کہا لیکن غیر ارادی طور پر ہم سے بھی کچھ مسکراہٹ اور مٹکاہٹ سرزد ہوگئی۔ ہماری اناڑی ایکٹنگ دیکھ کر دلہن کو بے اختیار ہنسی آگئی، لیکن بے چاری کا منہ کھولنا تھا کہ وہ راز فاش ہوگیا جس کی پردہ داری تھی، دلہن کی لب بندی دانتوں کے درد کی وجہ سے نہ تھی، دانتوں کی کمی کی وجہ سے تھی —— ہم نے سوچا اگر ہمارا کمرہ اس بے دانت ہنی مون کے کام آیا تو سمجھو کہ حرام گیا۔ ہم نے جولی کی طرف ذرا منفی انداز سے دیکھا —— جولی جھٹ بولی۔

"اور اب ذرا پیچھے دیکھیں۔ ایک اور ہنی مون جوڑا آرہا ہے۔"

اور کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مدھ بھری جوانی میں مخمور جوڑا، باہوں میں باہیں اور نگاہوں میں نگاہیں ڈالے، غیروں کے وجود سے بے خبر اور فقط ایک دوسرے کے لمس سے باخبر آہستہ آہستہ کھانے کے کمرے سے نکل کر ہماری طرف

آرہا ہے۔ فرمودۂ اقبال ہے کہ کشتیٔ دل کے لیۓ سیل ہے عہد شباب۔ جس سیلِ دوگانہ سے ان کی کشتیاں دوچار تھیں، وہ تو ان دونوں کے دل ہی جانتے تھے لیکن کشتیوں کے باہمی ٹکراؤ سے بیرونی تھپیڑوں کا یہ عالم تھا کہ ساحل نشین تماشائیوں کی من کشتیاں بھی ڈولنے لگیں۔ ہم نے اپنی ڈولتی کشتی سے جولی کو کہا۔

"جولی۔ اگر کمرہ اس جوڑے کے لئے چاہیئے تو کمرہ تو کیا ہم دنیا بھی خالی کرنے کو تیار ہیں"

جولی بولی، "آپ کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے۔ عاشقوں سے ہر کوئی عشق کرتا ہے"

ہمارے سامنے عشق ہو رہا تھا اور ہم اُسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میچ دیکھ رہے ہوں اور تماشائیوں کی طرح داد بھی دے رہے تھے۔ واہ واہ! لیکن ہمارے کھلاڑی ہماری داد سے بے نیاز اور بے خبر رہے۔ ناچار جولی نے ایک زوردار کی مصنوعی چھینک ماری جو ہمیں لگی، بوڑھے بوڑھی کو لگی لیکن اس عشق باز جوڑے کو نہ چونکا سکی۔ آخر وہ محبت ہی کیا جو چھینک سے منتشر ہو جائے۔ اس پر بوڑھے دولہا نے، جو نوجوان کا ہم عمر نہ سہی، ہم مشرب ضرور تھا، بڑھ کر نئے دولہا کا کندھا تھپتھپایا۔ نوجوان نے ایک لمحے کے لیے اپنی دلہن سے اجازت لی اور بڑے میاں سے مخاطب ہوا۔

"یس سر"

جولی کو موقع مل گیا اور جھٹ بول اُٹھی۔

"آپ کے لئے کمرے کا انتظام ہو گیا ہے۔"

نوجوان کہ اپنے بازو بدستور محبوبہ کی کمر میں حائل کئے ہوئے تھا، مختصراً بولا۔

"فائن"

اور اگلے لمحے میں نو بیاہتا جوڑے کے لب و رخسار کا باہمی فاصلہ بتدریج صفر ہونے لگا۔ اس پر بوڑھے نے اپنی بڑھیا کی آنکھوں میں جھانک کر اُسے بھی جنس وار طیش دلانا چاہا۔ لیکن بڑھیا کے ترکش میں ایک ہی تیر تھا۔ آنکھیں مٹکانا! جو اُس نے بڑی چابکدستی سے مٹکائیں۔ بے شک ان آنکھوں میں ربع صدی پیشتر قیامت کی کشش ہوگی۔ لیکن اس کشش تک پہنچنے کے لئے اب پچیس برس تفریق کرنے کی ضرورت تھی۔ ہماری ریاضی یوں بھی کمزور ہے۔ چنانچہ ہماری نگاہیں بدستور اُدھر ہی جمی رہیں جہاں تفریق کی حاجت نہ تھی۔

کمرے میں پہنچ کر پارس کا خط پڑھا۔

"ڈیر کرنل خان۔ مجھے یقین ہے کہ کینیٹ نے آپ کو سمجھایا ہوگا۔ اب ولٹ شائر آپ کو جادو کرے گا۔ سو اگلے سفر کے لئے تیار رہیں۔ گوڈ ہل سب انتظام کر دے گا۔ مجھے افسوس ہے آپ کو لندن دیکھنے کا موقع نہیں دے رہی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ولٹ شائر سے واپسی پر پورے سات دن لندن کی سیر کے لئے دوں گی۔ ہاں تو ولٹ شائر میں سٹون ہنج (STONE HENGE) دیکھنا مت بھولئے اور واپسی پر مجھے ملنا بھی ہرگز نہ بھولیئے ــــ ملاقات کی منتظر، این پارس"

ہم نے سوچا کہ اگر تو ایسی ہی ملاقات کے لئے بے چین ہے تو آج کا کام کل پر کیوں چھوڑ رہی ہے؟ لیکن یہ فرنگی معشوق بڑے کاروباری لوگ ہوتے ہیں۔ یہ عشق بھی ٹائم ٹیبل بنا کر کرتے ہیں اور دمِ عشق بھی ایک آنکھ گھڑی پر رکھتے ہیں۔ بلکہ الارم لگا رکھتے ہیں۔ بہرحال مس پارس کا نام یوں بھی ہماری فردِ عشق میں نہ تھا۔ چنانچہ ہم نے خط کا کاروباری کوڈا نکال لیا اور شروع کر کچے رنگ کا

چھلکا پھینک دیا۔

اتوار کو گولڈ بل صاحب تشریف لائے اور حسب معمول وقت مقررہ سے کچھ پہلے۔ دل ترس گیا تھا کہ یہ شخص کبھی بعد از وقت بھی آتا ــــــ ہم نے جی کڑا کر کے وقت کی پابندی برداشت کی اور اُس وقت تک جی کڑا کیے رکھا جب تک ریلوے اسٹیشن سے ہماری گاڑی چل نہ دی۔ پھر لوٹتے ہوئے گولڈ بل کی پشت دیکھ کر ایک میل لمبا سانس لیا اور خوشی سے اپنی سیٹ پر ڈھیر ہو گئے۔ ہمارے انگریز ہمسفروں کو ہمارا یوں ڈھیر ہو جانا شائد ناگوار گزرا ہو۔ لیکن اُنھیں کیا معلوم کہ ہم گلے سے سونے کا طوق اُتار کر اور پاؤں سے پہاڑ سی زنجیر کاٹ کر ڈھیر ہوئے تھے۔ کاش ہر تا مہ فرانسیسی مسمّی روسو[۱] کہ ہمارے جذبات کی داد دیتا۔ انگریز آزادی کا قدردان ہے لیکن صرف اپنی آزادی کا۔ دوسروں اور خصوصًا کالوں کی آزادی سے جلتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے انگریز ہمسفروں کے لئے خصوصی تپش کا اہتمام کیا۔

ولٹ شائر کاؤنٹی کا صدر مقام ٹرو برج ہے اور یہی ہماری منزلِ مقصود تھی۔ گاڑی ٹرو برج کے اسٹیشن پر پہنچی۔ تھا تو یہ اسٹیشن ہی لیکن بڑا بے توفیقا، بڑا بے پیدا اور بڑا بے ٹھٹا۔ خدا جانے یہاں گاڑی رک کیسے گئی۔ اُترے تو پلیٹ فارم پر ہم ہی واحد مسافر تھے اور ہمارے جلو میں کچھ تھا تو بے حساب وحشت۔ ہم نے ادھر اُدھر دیکھا کہ شاید قیس بھی اسی ٹرین سے اُترا ہو لیکن نظر نہ آیا۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر ٹیکسی کے لئے ہاتھ اُٹھانا چاہا تو حدِ نگاہ تک ٹیکسی سے ملتی جلتی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ آخر ایک گھڈ آسا انگریز پیچھے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ ہمارے سامنے رُک کر بولا۔

"کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

یہ حضرت ایسے مشکل کُشا تو نظر نہیں آتے تھے۔ لیکن کہا:

"جناب مجھے شہر جانا ہے۔ کیا آپ کسی طرح ایک ٹیکسی پیدا کر سکتے ہیں؟"

"یقینًا۔ مگر ٹیکسی ٹیلی فون کے بغیر نہیں آتی اور فون کرنا میرا کام ہے کہ میں اسٹیشن ماسٹر ہوں۔ آئیے، اتنی دیر میرے دفتر میں بیٹھیے۔"

ہم دفتر میں داخل ہوئے تو کوئلے اور لالٹینوں کی بُو جو ۱۸۲۵ عیسوی میں جارج سٹیونسن نے پہلا انجن چلا کر سونگھی تھی، ہمارے خیر مقدم کو آئی ــ انگلستان کی زندگی میں عجیب ناہمواریاں ہیں۔ اس کے دیہات خوبصورت، شہر دلآویز، مگر کارخانے بے ہنگم اور اسٹیشن بے ہودہ! ــــ اسٹیشن ماسٹر نے ایڑیاں اُٹھا کر دیوار میں نصب شدہ ٹیلی فون کے کان میں کچھ کہا اور تھوڑی دیر بعد ٹیکسی آ گئی۔

---

۱ MAN IS BORN FREE AND EVERYWHERE HE IS IN CHAINS.
(ROUSSEAU)

۲ ۔ پچکال کی زبان کا لفظ: وہ پستہ قد شخص جس کی چال میں ایک قسم کا متھنی پن ہو۔

بعض بوڑھیاں دلچسپ ہوتی ہیں

مس پارس کی تحریری ہدایات کے مطابق ہمیں جارج ہوٹل پہنچنا تھا۔ پہنچے اور صورت حالات دیکھ کر بڑے پر امن ہوئے کیا پیارا ہوٹل تھا؛ ہر طرف خاموشی۔ ویرانے کا سا سکوت۔ بالکل ہنی مون کے قابل اور شاید صرف ہنی مون ہی کے قابل کہ دیگر دنیوی کاروبار کے لئے یہ فضا بہت زیادہ رومان انگیز معلوم ہوتی تھی۔ ریسپشن کاؤنٹر پر بوڑھی کلرک اپنا سفید سر رکھ کر گھوک سو رہی تھی گویا آج سے چالیس برس پیشتر کے ہنی مون کو خواب میں دہرا رہی ہو۔ ہم نے انگلیوں سے کاؤنٹر پر تین تال میں دادرا بجایا۔ آخری گرت پر محترمہ نے آنکھ کھولی تو ہم نے اپنا کارڈ پیش کیا۔ آپ نے ایک عالمگیر جمائی لینے کے بعد ہمارا کارڈ دیکھا۔ معاً آپ نے ذرا ذہنی طور پر انگیخ اور فرمایا۔

" اوہ، مسٹر خان ——— آپ ہی کا انتظار تھا۔"

ہم نے کہا۔ " میڈم۔ آپ سو کر ہی انتظار کیا کرتی ہیں یا ہمارا انتظار خواب آور تھا۔"

میڈم کچھ نہ سمجھیں ——— شاید ہماری انگریزی نے ہمارے مانی الضمیر سے وفا نہ کی تھی۔ ویسے آپ بھی ایسی علامہ نظر نہیں آتی تھیں۔ بہر حال آپ مسکرائیں اور یوں جیسے یہ مسکراہٹ ہمارے لئے خاص طور پر تخلیق کی گئی ہو۔ پھر ہمارے کو اُف کہتے " اور اس کے بعد ہمیں ایک دوسری بوڑھی کے حوالے کر کے آپ نے اگلے گاہک کے انتظار میں اگلی شاہجہاں انگڑائی لی۔

دوسری بوڑھی ہمیں کمرے تک لے گئی۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا جس میں وکٹوریہ کے زمانے کا پلنگ رکھا تھا اور بس۔ لیکن پلنگ کا طول و عرض اتنا شاہانہ تھا کہ کمرے کے اندر کمرہ لگتا تھا۔ اور اس کے رقبے کا عالم یہ تھا کہ ہوٹل جلد ہنی مونرز اس کی وسعت میں ہنی مون منا سکتے تھے۔ بہر حال یہ سہولت ہمارے لئے بے معنی تھی۔ ہم نے میڈم سے کہا،

" آجکل تو کمروں میں ٹیلی فون، ریڈیو بلکہ ٹیلی ویژن بھی ہوتا ہے۔ کیا آپ ایسی چیزیں نہیں رکھتیں ؟"

بولی۔ " رکھ لیں گے، ابھی کل ہی تو ایجاد ہوئی ہیں۔ فی الحال ہم نے ہر کمرے میں کال بل (CALL BELL) لگا دی ہے یہ دیکھیں پلنگ کے قریب گھنٹی کا بٹن !"

اور پھر اس نے آگے بڑھ کر بٹن کو تجربتہً دبایا اور دبا چکنے کے بعد فاتحانہ طور پر مسکرائی۔ ہم نے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بٹن پر انگلی رکھی اور پھر اصلی حیرت سے ملتی جلتی حیرت کے عالم میں مڑ کر دیکھا اور یوں اس کے احساس فتح کو مکمل کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ اگلے سات روز کے لئے ہر چند کہ ہمارے کمرے سے ریڈیو کی آواز نہ آئی لیکن گلاسوں کے کھنکنے کی آواز اور پیالیوں کے چھنکنے کی جھنکار بند نہ ہوئی۔ فقط بٹن دبانے کی دیر ہوتی اور بڑھیا غزالوں کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی نعمتوں کا خوان اٹھائے سامنے آ رکھتی۔ اور جو مزا چائے کے ساتھ گرما گرم اور رنگا رنگ ماکولات میں ہے اور وہ ریڈیو کے پاپ گانے کی ہزلیات میں نہیں۔ پھر بوڑھی فرم چائے ہی نہ لاتی بلکہ ڈھیر ساری ہمدردی بھی۔ بعض بوڑھیاں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔

~~~ ۰:۰ ~~~
~~~

وجاہت علی سندیلوی

چوہے اور ہم

کسی بھوکے سے ایک شخص نے پوچھا "ایک اور ایک کتنے؟" بھوکے نے فوراً بلا تامل جواب دیا۔ "دو روٹیاں اور وہ بھی خوب موٹی۔ اچھی سینکی اور کافی گھی چپڑی ہوئی۔" ہمارے خیال میں بھوکے کا جواب بالکل درست تھا کیونکہ بھوکا انسان اپنے دماغ سے نہیں بلکہ معدے سے سوچتا ہے۔ اسی طرح جب ہم نے اپنے ایک وزیر با تدبیر کی تقریر جو انھوں نے چوہے کھانے کے فائدوں پر اسمبلی میں کی تھی، سُنی — تو اُس کے خوش ذائقہ امکانات سے ہمارے مُنہ میں پانی بھر آیا اور پیٹ میں بے اختیار چوہے کودنے لگے چنانچہ دماغ کو معزول کر کے معدے نے فوراً اعلان کر دیا کہ وہ چوہے کھائے گا اور ضرور کھائے گا۔ ہم نے اپنے آپ کو اپنے عزت مآب وزیر سے اِس مسئلے پر بالکل متفق پایا اور ہم بے ساختہ چیخ اُٹھے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ چوہا وہ بھی میرے دل میں ہے

واقعی ہمارے وزیر صاحب کتنی دُور کی کوڑی لائے تھے بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے پہاڑ کھود چوہا برآمد کر لیا تھا۔ ان کی دریافت تھی کہ چوہے میں دودھ انڈے، مچھلی اور تیتر بٹیر وغیرہ سے بھی زیادہ پروٹین اور دیگر حیاتین پائے جاتے ہیں اور اس کو بطور خوراک استعمال کرنے سے انسانی صحت کو نقصان پہنچنا تو دُور رہا سراسر فائدہ ہی پہونچتا ہے۔ مطلب صاف تھا کہ چوہے کھاؤ اور بہت دن جیو۔ غالباً وہ دن دور نہیں جب ہر سرکاری دفتر اور ریلوے اسٹیشن پر عوام کی عافیت سدھارنے کی خاطر اس قسم کے اشتہار چپکے ہوئے نظر آئیں گے، اوپر کسی ضرورت سے زیادہ تندرست نیتا کی تصویر اور نیچے یہ الفاظ "یہ اور ان کے بچّے، ہمیشہ کھاتے ہیں چوہا"

— چوہے کھانے کے چسکے سے ہمارے وزیر صاحب نے ہم کو نہ صرف ایک بہت

لذیذ، صحت بخش اور بہت افراط سے مل جانے والی غذا سے متعارف کر دیا بلکہ چٹکی بجاتے ملک میں غلّہ کی کمی کی لعنت کو ایک چھومنتر سے ہمیشہ کے لئے ملک بدر کر دیا۔ آپ چوہے کھائیں گے اور ان کو لذیذ، صحت بخش اور پھر بالکل مفت پاکر زیادہ کھائیں گے تو ظاہر ہے کہ پھر غلّہ کم کھائیں گے۔ ایک بچت تو یہ ہوئی اور دوسری یہ کہ جو چوہے آپ کے منہ کا نوالہ بن جائیں گے وہ جو غلّہ زہر مار کر جاتے وہ خود بخود بچ جائے گا۔ اسی کو شاید ہم خرما ہم ثواب کہتے ہیں، البتہ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اگر ہندوستان کی وہ آبادی جو اب تک پروٹین، حیاتین اور اسی قسم کی دوسری عیاشیوں سے محروم تھی اگر چوہوں کی بدولت ان کا استعمال کرنے لگی تو اس کی عمر میں بہت بڑا اضافہ ہو جائے گا اور یقیناً اس کی شرح پیداوار میں بھی۔ اور پھر جب بڈھوں اور بڈھیوں کی زیادہ تعداد گود میں بچے لیئے نظر آنے لگے گی تو کھائے ہوئے چوہے کے خمیازے کی صورت میں غلّہ کی مانگ بھی بڑھ جائے گی لیکن یہ اندیشہ آج کل کا نہیں بلکہ مستقبل بعید کا ہے اور اس وقت نہ ہم آپ ہوں گے اور نہ ہمارے وزیر، چوہے نوش بہادر۔ چوہے ہوں تو ہوا کریں۔ ہوں گے نہیں تو کھائے کیسے جائیں گے؟

زیادہ دن نہیں گذرے جب محکمہ زراعت کے ایک اونچے صوبائی افسر نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ چوہے ہمارے اناج کا نہ صرف کھیتوں، کھلیانوں اور گوداموں میں بلکہ خود ہماری ناک کے نیچے ہمارے گھروں میں بڑا ستیاناس کر دیتے ہیں لہٰذا ہمیں فوراً سے پیشتر ان کا قلع قمع کر دینا چاہیئے۔ اس کے بعد ہمارے ضلع کے افسر نے چوہا مار ہفتہ کے سلسلہ میں ایک باقاعدہ مقابلے کا اشتہار چھپوا کر جس میں چوہے کے ساتھ ایک ایسے وزیر صاحب کی کہ جن کی مونچھیں چوہے کی مونچھوں سے بس کچھ ہی انیس بیس تھیں تصویر بھی تھی، ہر گلی کوچے میں چسپاں کروا دیا تھا۔ ایک وفادار شہری کی حیثیت سے کمر ہمت کس کر ہم نے اس ہفتے کو کامیاب بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ چوہے دان ناکارہ ثابت ہوئے تھے، لہٰذا مجبوراً لاٹھی اٹھا کر ہم تن تنہا اپنے سارے گھر میں چوہوں کی تلاش اور ان کا وناش کرنے کی غرض سے لٹھ بازی کرتے رہے تھے۔ اس مہم میں ہم نے ایک الماری کا شیشہ دو چینی کی طشتریاں اور ایک پانی کا مٹکا توڑ ڈالا تھا لیکن ہماری بدقسمتی سے ہم سے کوئی لیڈر قسم کا چوہا تو کیا ایک سوکھی چوہیا تک اپنے کیفر کردار تک نہ پہونچ سکی تھی۔ پتا یہ چلا کہ ان کی پوری قوم انتہائی چالاک اور پینترے باز واقع ہوئی ہے۔ ہر طرف سے محصور ہو جانے کے بعد بھی وہ ہماری لاٹھی کا وار اس صفائی سے بچا لے جاتے، جیسے اسٹیج پر پھینکے ہوئے گندے انڈوں اور جوتوں کو، کوئی بہت تجربے کار الکشن باز نیتا۔

عاجز آ کر مجبوراً ہم نے ایک مری ہوئی چھپکلی کی دُم کاٹ کر اسے دو حصّوں میں تقسیم کیا اور لفافے میں بند کر کے اپنے ضلع کے محکمۂ زراعت کے افسرِ اعلیٰ کی خدمت میں روانہ کر دیا تھا۔ اس کارگذاری پر ہم کو پہلا انعام ملا اور جب ایک وزیر صاحب بھرے جلسے میں پُرتکلف دعوت کے بعد اور پُرجوش تالیوں کے درمیان ہم کو انعام دے چکے تو انھوں نے چلتے چلاتے ہمارے کان میں یہ بھی پھونک دیا کہ آئندہ چناؤ کے موقع پر ہمیں پارٹی ٹکٹ دیئے جانے کی وہ بھرپور سفارش کریں گے۔

کوشش کے باوجود ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس چوہے مار ہفتے کا کیا نتیجہ نکلا۔ ہو سکتا ہے کہ اتنے چوہے مار ڈالے گئے ہوں کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے ہوں اور اتنی بہت سی غذا کو ضائع ہوتے دیکھ کر ہمارے وزیر صاحب کو اس کے پروٹین اور دیگر حیاتین اور ساتھ ہی ساتھ ہمارے بھوکے پیٹ یاد آ گئے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چوہے جس طرح ہم

فرسٹ پرائز پانے والے کو جل دے گئے تھے دوسروں کو بھی دے گئے ہوں۔ اور ہاتھ نہ لگے ہوں اور ہمارے وزیر صاحب کو مجبوراً یہ سوچنا پڑا ہو کہ اُن کو پکڑنے اور مارنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اُن کو کھا لیا جائے۔ اس سے پیشتر بھی ایک لال بجھکڑ نے کسی اناڑی کو اسی قسم کا مشورہ چڑیا پکڑنے کے سلسلے میں دیا تھا۔ چڑیا کے سر پہ سویرے سویرے تھوڑا سا موم رکھ دو۔ جب سورج نکلے گا تو یہ موم پگھل کر چڑیا کی آنکھوں میں چلا جائے گا اور اُسے کچھ سجھائی نہ دے گا۔ اُس وقت چپکے سے جا کر اُسے پکڑ لو!" چوہے پکڑ کر تو مارے نہیں جا سکتے، اب انھیں کھا لیجئے گا تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ محض چند الفاظ سے ایک جادو کی چھڑی بنا کر ہمارے وزیر صاحب نے ہمارے نیم فاقہ کش ملک کو نمبر ایک قسم کی غذا سے بھرپور دیش بنا دیا اور ہم پلک جھپکاتے غذا کے معاملے میں نہ صرف خود کفیل ہو گئے بلکہ اِس قابل بن گئے کہ اب بہت جلد امریکہ اور روس جیسے خوشحال ملک ہم سے ہماری فاضل غذا مانگنے آئیں گے اور ہم طرح طرح کے نشتر غمزے دکھا کر اُن کو اِس بات پہ مجبور کریں گے کہ پہلے وہ اپنے سکّے کی قیمت گھٹائیں اور پھر ہم سے نقد داموں پر کچھ چوہوں کی دُمیں لے جائیں۔ اِس کے علاوہ چوہوں کی یہ فراوانی اور بڑھتی ہوئی آبادی دیکھ کر خود ملک کے اندر اب کس کے مُنہ میں دانت بھی ہیں جو یہ آواز اُٹھا سکے کہ حکومت غذا کی فراہمی کا انتظام نہیں کر پاتی۔ غذا آپ کے گھر میں موجود ہے۔ اب اگر آپ اُسے خود نہ کھائیے تو اس میں بیچاری حکومت کا کیا قصور؟

کوئی فریادی اگر آ کر گڑگڑائے گا "حضور! گھر میں کھانے کو ایک دانہ بھی نہیں۔ چوہے ڈنڈ پیل رہے ہیں۔" تو ہمارے وزیر صاحب فوراً جواب دیں گے "اجی، اُن کسرتی چوہوں کو کیوں نہیں کھاتے؟ آپ کی غذا خود آپ کے گھر میں پھدک رہی ہے اور آپ میرا وقت خراب کر رہے ہیں۔ جائیے جائیے مجھے فلاں ناری نکیتن کا اُدگھاٹن کرنے کے لیے ابھی جانا ہے وہاں چوہوں کی ایک نئی قسم کی پھلوری پکائے جانے کا بھی تجربہ کیا جائے گا۔

پلنگ پر لیٹے لیٹے ہم نے دو چوہوں کو اپنے سامنے الماری پر دوڑتے دیکھا۔ ایک چوہیا طاق پر رکھے ہوئے ڈبّے پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک قوی ہیکل چوہا ہمارے کھونٹی پر ٹنگے ہوئے کوٹ کی جیب سے نکل کر ایک ہی جست میں نعمت خانے کی چھت پر پھاند گیا۔ لیکن چوہوں کی ان خرمستیوں پر روز کی طرح ہمیں کسی تشویش کا احساس نہیں ہوا بلکہ یہ سوچ کر ایک قسم کی خوشی ہوئی کہ ہمارے گھر میں غذا کی کوئی کمی نہیں ہے اور اب محلے والوں سے بوقت ضرورت سیر بھر آٹا یا پاؤ بھر دال اُدھار مانگنے کے بجائے ہم خود دوسرے ضرورت مندوں کو جن کے گھروں میں چوہے نہ ہوں گے، کبھی کبھار ایک آدھ چوہا اپنی سیر چشمی سے دے دیا کریں گے۔

گھر کی غذائی صورتِ حال سے، جو ہمیشہ اپنے ملک کی غذائی صورتِ حال کی طرح تشویشناک رہتی، کچھ اطمینان ہوا تو ہماری ذرا آنکھ لگ گئی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک فیل پیکر چوہا ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھا بڑے غصّے سے چچیا رہا ہے۔ "تم انسانوں کی پوری قوم انتہائی چالاک اور مکّار ہے۔ پہلے ہم چوہے جس گھر میں بھی پہونچ جاتے نہ صرف طرح طرح کے اناجوں اور کھانے کی چیزوں کی بلکہ گھی دودھ اور بالائی کی ریل پیل دکھائی پڑتی۔ تم نے نہیں معلوم یہ ساری چیزیں کہاں سمیٹ کر رکھ دی ہیں۔ ہر گھر میں جھاڑو پھری دکھائی دیتی ہے۔ بڑے سے بڑے گھر میں غلّہ بڑی بڑی مٹھوروں کے بجائے چھوٹے چھوٹے ٹین کے ڈبّوں میں رکھا جاتا ہے۔ گھی، دودھ اور بالائی کا کہیں پتا اور نشان بھی نہیں مِلتا۔ اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ تم کمبختوں نے ہر چیز میں ملاوٹ

کر رکھی ہے۔ تمہارے دیئے ہوئے زہر کو ہم کھاتے ہیں تو ہمارا کچھ بھی نہیں بگڑتا لیکن جب تمہاری غذا کھاتے ہیں جس میں اینٹ۔ پتھر چونا۔ بُرادہ۔ گھاس۔ مٹی اور کیٹلے کا تیل اور موبل آئیل وغیرہ کا میل خود غذا سے کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے تو ہماری صحت پر بہت خراب اثر پڑتا ہے اور ہم بے موت مرنے لگتے ہیں۔"

چونکہ اس ناشدنی نے ہماری پوری نسلِ انسانی کو بدنام کیا تھا لہٰذا ہمیں صبر کا یارا نہیں رہا اور ہم برس ہی تو پڑے اُس پر، بس! بس! چوہے کے بچے اپنا مُنہ بند کر۔ ناشکری کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ صدیوں سے تیری نسل ہم انسانوں کی پیدا کی ہوئی غذا پر حرام خوری سے پل رہی ہے اور آج تُو آیا ہے ہم کو نام دھرنے! ہمارے محکمۂ اعداد و شمار نے باقاعدہ چوہے شماری کے بعد بتایا ہے کہ ہمارے ملک میں انسانوں سے آٹھ گنا چوہے بستے ہیں اور آٹھ چوہے ایک انسان کے برابر غذا کھا جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تمہاری نسل اِسی قدر غلّہ کھا جاتی ہے جس قدر کہ ہم انسان کھاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں غلّے کا جو کال پڑا ہے اس کا اصل سبب ہمارے غذائی وزیروں کی نااہلیت نہیں بلکہ تم چوہے ہو۔ خیر، اب وقت آگیا ہے کہ تمہاری نسل ہماری نسل کا قرضہ اصل معہ سُود چکا دے۔ تم، ہماری غذا کھاتے ہو ہم خود تمہیں کھا جائیں گے . . . . ."

ہمارے سر کے قریب ایک زور کا جھناکا ہوا اور ہم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے تو دیکھا کہ سرہانے کی الماری پر سے چائے کا ڈبّہ زمین پر گر پڑا ہے اور گرانے والا ایک مسٹنڈا اور مچھندر چوہا وہیں بیٹھا ہم سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہا تھا۔ "کیوں بے کیسی رہی!" ہم قاضی نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے گھر کے چوہے بڑے سیانے ہیں۔ وہ نقصان کرکے اُلٹا ہمیں کو آنکھیں دکھاتے ہیں اور اس وقت تک ہماری موجودگی کو خاطر میں نہیں لاتے جب تک اُن کو بھگانے کی کوئی خاص کوشش نہ کی جائے لیکن اس وقت جب کہ ہم نے اس چوہے کو نفرت اور غصّے سے نہیں بلکہ پُر اشتہا انداز سے دیکھا کہ اس کے سرِیے اور پائے اور کلیجی اور گُردے کیسے ہوں اور اس میں کتنا گوشت نکلے گا تو وہ ہم سے نظریں ملاتے ہی ایسا بھاگا جیسے کسی آوارہ نظرباز سے کوئی پاکباز حسینہ۔ ایک نعرۂ مستانہ لگا کر ہم اس کی طرف جھپٹے اور اگر اس وقت وہ ہمارے ہاتھ آجاتا تو ہم اپنی چوہے کھانے کی مہم کا اُدگھاٹن شاید اُسی کو کچّا چبا کر دیتے۔ الماری سے لڑ جانے کے باعث ہم اپنی ناک سہلاتے ہوئے بیٹھ گئے اور ہمارا شکار الماری کے کسی سوراخ سے نکل کر اللہ کو پیارا نہیں بلکہ نو دو گیارہ ہوگیا۔

ہم نے خود تو پکّا ارادہ کرلیا تھا کہ چوہوں کو کھائیں گے لیکن مصیبت یہ تھی کہ ہمارا یہ ارادہ ہماری نصف بہتر کے تعاون کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکتا تھا۔ ہماری بیگم دُنیا میں صرف دو چیزوں سے ڈرتیں۔ ایک تو چوہے اور دوسرے اپنے چچا سے چچا کے متعلق تو ابھی تک کوئی سرکاری احکام جاری نہیں ہوئے تھے کیونکہ چھپکلی اور چھچھوندر سے لے کر ہاتھی تک ابھی بہت سے جانور وقتِ ضرورت کے لیے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ البتہ چوہے کھانے کے متعلق انھیں اپنا ہم خیال بنانا بلّی کی گردن میں گھنٹی باندھنے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔

ہم اسی اُدھیڑ بن میں تھے کہ ہماری بیگم نے آکر ایک شانِ دلربائی سے کہا "آج ٹھیلے والا ترکاری نہیں لایا۔ منڈی سے جاکر کوئی ترکاری لے آیئے، شام کو پکانے کے لیئے کچھ بھی نہیں ہے۔

"بہت کھا چکے ترکاری ورکاری، ہم اب ہرگز نہیں کھائیں گے۔" ہم ٹھنک کر بولے۔

"تو کیا صرف دال کھایئے گا اِس وقت؟"

دال کھائیں ہمارے دشمن ! ہم تو کھائیں گے انڈے، مچھلی، تیتر اور بٹیر کا مرغ

"کیا مطلب ؟"

مطلب یہ ہے کہ چوہے ! یہ جو مفت کا منوں گوشت ہمارے چاروں طرف پھدک رہا ہے اس کے ہوتے ہوئے ہم پاگل ہیں جو اس گرمی اور دھوپ میں منڈی جا کر دھکّے الگ کھائیں اور اپنی گاڑھی کمائی کے پیسے الگ خرچ کریں !"

"کیا ہوگیا ہے تم کو ! کدھر پھدک رہا ہے یہ منوں گوشت !"

"تمہیں نہیں دکھائی پڑتے یہ چوہے ؟ وہ دیکھو، ایک تو سامنے ہی بیٹھا تمہیں اپنی دُم سے سلام کر رہا ہے"

"کیا مطلب ہے تمہارا ؟ بیگم کی مارے خوف کے گھگھی بندھ بندھنے لگی۔

"مطلب یہ کہ آؤ ہم تم مل کر گھر کے یہ سارے چوہے ہڑپ کر جائیں" ہم نے ابھی اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ ایک چوہیا ہمارے بستر کی تکیے کے نیچے سے نکل کر بھاگی۔ اور ایک چیخ کے ساتھ بیگم سامنے رکھی ہوئی کرسی پر گر پڑیں اور کچھ بے سدھ سی ہوگئیں۔ اسی وقت دخل درمعقولات کرتے ہوئے ایک موٹا سا چوہا نعمت خانہ پر سے "لانگ جمپ" لگا کے بھاگا۔ ہم بے تحاشہ اس کے پیچھے دوڑے اور ایک دوسری چیخ کے ساتھ ہوش میں آتے ہوئے بیگم دوڑ کر چیل پیتے ہمارے بستر پر کھڑی ہوگئیں۔ سامنے دیوار سے ٹکرانے کے بعد ہم خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ چوہا جست لگانے کے ساتھ ہی ساتھ تیز دوڑنے میں بھی بڑا "فروٹ" تھا۔

بیگم قریب روتے ہوئے بولیں، "ایسی گھناؤنی باتیں کر کے مجھے پریشان کرنے سے کیا فائدہ ؟"

ہم نے بڑے لیڈرانہ انداز میں انھیں سمجھانا شروع کیا کہ چوہے کھانے سے کیا روحانی۔ مادی۔ اقتصادی اور سیاسی فائدے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ غلّے اور پیسے، وقت اور زحمت کی بچت کے علاوہ ایک بہت بڑی بچت گھی تیل دال شکر۔ صابن، کاغذ اور کپڑے وغیرہ جو یہ ہضم کر جاتے ہیں، کے بجٹ میں بھی اس موذی جانور سے چھٹکارا پاکر ہو جائے گی اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ کیسے کیسے لذیذ اور چٹ پٹے کھانے اور پکوان، زبان کی رونق اور معدے کی زینت بنیں گے اور پھر اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو ہم دوسرے غیر ضروری جانوروں پر اس سے بھی زیادہ دلچسپ تجربے کر سکتے ہیں وغیرہ۔

ہماری اس بے ربط مگر مدلل تقریر کے دوران بیگم منہ ڈھانپے برابر سسکیاں لے رہی تھیں۔ ٹیپ کے بند پر جب ہم بڑے جوش و خروش کے ساتھ چوہوں کو کھا جانے کی تلقین کی تو انھیں ایک بڑے زور کی ابکائی آئی اور وہ بھاگیں غسل خانے کی۔ کچھ دیر بعد ہم اپنے کمرے سے اس بات کا جائزہ لینے کے لئے گھر میں گئے۔ چوہوں یعنی ہمارے غذائی سرمائے کی موجودگی کا امکان ہے، باہر نکلے تو نوکرانی سے معلوم ہوا کہ بیگم رکشا بلوا کر اپنے میکے جا چکی ہیں۔

دو چوہے مخالف سمتوں سے ہمارے سامنے بھاگے اور ہم ان کو پکڑنے کچھ اس انداز سے دو طرفہ دوڑے کہ چوہے بھاگ نکلے اور ہم نوکرانی کے حیرت سے پھیلے ہوئے بازوؤں کے درمیان کچھ اس والہانہ انداز سے داخل ہوگئے جیسے سعادت مند چوہے دان میں داخل ہوتا ہے۔ وہ ایک چیخ مار کر اور نہیں معلوم کیا بڑبڑاتی ہوئی بھاگی اور نہ صرف گھر سے باہر گئی بلکہ ایک دم داغِ مفارقت دے گئی۔

نوکرانی کم بخت نے باہر نکل کر نہیں معلوم کیا گل کھلایا کہ تھوڑی ہی دیر میں ہمیں اپنے صدر دروازے پر کچھ گڑبڑ اور

شور و غُل سنائی دیا۔ ہم دروازہ کھول کر باہر آئے تو دیکھا کہ ہمارے گھر کے سامنے ناک پر رومال رکھے ہوئے لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہے۔ ہم کو دیکھتے ہی اس ہجوم میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ کسی ناشدنی نے نعرہ بلند کیا "ہمارے محلے میں چوہا خور" اور سارا مجمع ایک زبان ہو کر چیخا "نہیں رہے گا! نہیں رہے گا" ایک اور پاجی نے ہانک لگائی "جو کھائے موس کا ناس" اور غالباً پہلے سے طے شدہ اسکیم کے ماتحت مجمع بھر گرجا "اس کا کردیں ستیاناس" اور پھر یہ اور اسی قبیلے کے دوسرے خطرناک نعرے ایسے دھڑا دھڑ دغنے لگے جیسے کسی میدانِ جنگ میں توپیں۔ مجمعے نے ایک دم سے بڑھنا اور پھیلنا شروع کردیا اور ذرا ہی سی دیر میں نہ صرف سڑک کی ساری ٹریفک بند ہوگئی بلکہ جہاں تک دکھائی پڑتا ناک پر رومال رکھے ہوئے آدمیوں کا دریا موجیں مارتا ہوا نظر آنے لگا۔ ہمارے غریب خانے سے تھوڑے ہی فاصلے پر جو سرکس ہو رہا تھا اس کے سارے تماشائی اس کو چھوڑ کر ہمیں دیکھنے اُمڈ آئے تھے۔ کچھ دھکّے کھا کر ہم آگے بڑھ آئے تھے لہٰذا ہم نے اپنے گھر میں واپس ہونا چاہا لیکن اب ہمارے اور ہمارے دروازے کے درمیان آدمیوں کی قطاروں کی کئی دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں۔

مختلف اقسام کے نعرے برابر لگ رہے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد ہمیں یہ تعجب خیز احساس ہوا کہ ہم پیروں پر کھڑے نہیں بلکہ کچھ لوگوں کے کندھوں پر اُٹھے ہوئے ہیں۔ نعروں کے درمیان اس قسم کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

"آپ ہی چوہے کھاتے ہیں؟"

"شکل بھی تو چوہوں جیسی پائی ہے!"

اِس کا مُنہ کالا کر کے باقاعدہ جلوس نکلنا چاہیئے؟"

"اِس چوہے خور کی بدولت سارے محلہ میں سڑاند اور بدبو پھیلی رہتی ہے۔"

میں نے اس کے دروازے پر ایک آدھی کھائی ہوئی کتے کی لاش بھی دیکھی تھی۔" وغیرہ وغیرہ

ہماری خوش قسمتی سے پولیس کے اڑن دستے نے آنے میں دیر نہیں کی۔ چراغ جلنے سے پیشتر ہم سڑک پر ناجائز مجمع اِکٹھا کرنے اور امن عامہ کو خطرے میں ڈالنے کے سلسلے میں گرفتار کر لیئے گئے اور مجمع کے ہاتھوں تھوڑی سی مار پیٹ کے بعد پُرجوش نعروں کے درمیان بڑی دھوم دھام سے پولیس کی لاری میں بٹھا کر حوالات بھیج دیئے گئے۔

حوالات پہونچ کر ہم نے داروغہ صاحب کی خوشامد درآمد کر کے اپنے ہم مشرب منتری کو فون کرایا لیکن وہ کسی ناری نکیتن کا اُدگھاٹن کرنے جا چکے تھے۔ اپنی بیگم کے چچا کو فون کرنا چاہا تو پتا چلا کہ ان کے ٹیلی فون کا تار کوئی چوہا پہلے ہی کتر چکا تھا ——— ■■

رؤف خوشتر
(گلبرگہ)

چاندنی چوک

ہمارے پڑوسی دوست امیر احمد (جو اپنا تعارف "غریب کو امیر کہتے ہیں" کہہ کر کرواتے ہیں)، گرانی الاؤنس کی قسط ملتے ہی پرانا گراموفون خرید لائے۔ ہم نے لاکھ سے کچھ زیادہ مرتبہ منع کیا کہ بھابی جان کے ہوتے ہوئے آخر آپ کو کِسے پٹے گراموفون کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ اُن کا جواب تھا کہ گراموفون کو جب چاہے اموش تو کرا سکتا ہوں۔ ہم اُن کی اس مضبوط دلیل کے آگے مزید ذلیل ہونے سے بچنے کے لئے اب تک کانوں کو ھانپے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ امیر احمد کے مکان سے مسلسل اُن کے ذاتی گراموفون کے علاوہ ایڈیسن والے گراموفون ں آوازیں ہمارے در و دیوار سے ٹکرا رہی ہیں۔ وہ تو کہئے کہ مکان پختہ ہے۔ اگر گیت اچھے ہوتے تو ہم بھی کچھ دیر کے ئے سہی اپنے وزیر داخلہ کو ان خارجی مدھر آوازوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے چپ کراتے۔ پرانے گیتوں کو سُن کر ل یہی کہتا ہے کہ ریکارڈوں کو توڑ کر ریکارڈ ساز کمپنی کی تاریخ میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا جائے۔ لیکن ایک ریکارڈ دلّی ہے دل ہندوستان کا۔ یہ تو تیرتھ ہے سارے جہان کا" سُن کر یہ خیال ہوا کہ ہندوستان کے دل کو دیکھا ائے۔ فوراً پرانی فائیل سے بنک کی نئی اکاؤنٹ بک نکالی تو معلوم ہوا کہ صرف پانچ روپیہ جمع ہیں۔ بے اختیار ، اُٹھے۔ ہنوز دلّی دور است۔

ہم نے اپنے سیلانی دل کو دلاسا دیا کہ ہندوستان کے دل کا دورہ کرنے کے لئے صرف دلدار ہونا کافی نہیں دار ہونا ضروری ہے۔ اپنے دل کو بہلانے کے لئے مقامی طور پر دلّی کی عمارتوں کا لطف لینا چاہا۔ اپنے ایک لحیم شحیم ست کو قطب مینار سمجھ کر چڑھنے کی کوشش کی۔ صدر شفاخانہ کی سُرخ عمارت کو لال قلعہ کہہ لیا۔ پڑوسی میاں بیوی ہر دم بحث و تکرار، ہاتھا پائی اور گالی گلوج کے پیشِ نظر اُن کے مکان کو پارلیمنٹ ہاؤز کا نام دیا۔ جنتا بازار

کے علاقہ کو کناٹ پیلس کا نام دے کر خوش ہوئے۔ اپنے ایک دوست کے گنجے سر کو دیکھ کر بے اختیار چاندنی چوک کی یاد آئی۔ اگرچہ کہ دونوں میں خاصا تضاد ہے۔ کہاں چاندنی چوک کا گنجان پُر آباد اور ہنگامہ پرور علاقہ اور کہاں صاف وشفاف اور بالوں سے غیر آباد چٹیل میدان۔ پھر بھی لاشعوری طور پر ہمیں چاندنی چوک کی یاد آئی۔

گنجوں کی حالیہ بین الاقوامی کانفرنس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سطح میں اپنا سر بلند دیکھنا چاہتے ہیں۔ مذکورہ کانفرنس کے مندوبین دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک وہ جن کے بال نہیں۔ دوم جن کے بال تھے نہ بچے۔ وہاں انسانی سروں کا سمندر تو تھا لیکن سطح پر زلفوں کی لہروں کے بجائے چکنے سر حباب کے مانند چمک رہے تھے۔

اب ہم نے بے بال والوں سے راہ ورسم بڑھانا شروع کیا۔ یوں بھی ہم بال بچوں سے دور ہو چلے تھے۔ ایک گنجے خان صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اُنہوں نے بتلایا کہ شریعت کے احترام میں یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں۔ اُس وقت وہ صاحب زلف تھے اور جُوئیں پارٹی بدل سیاسی قائدوں کی طرح بیگمات کی زلفوں کو چھوڑ کر اُن کے سر میں پناہ لیتیں۔ اور وہ دن بھر پریشان رہتے۔ آخر خدا نے اُن کی سُن لی۔ اب وہ اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر گنگناتے ہیں ۔ عجب آرام دیا بے پرو بالی نے مجھے

ایک اور گنجے صاحب اپنے سر کے تعلق سے ایسے لاپرواہ نظر آتے ہیں جیسے کوئی کرایہ دار کرایہ کے مکان سے۔ ہم نے جب اس بے توجہی اور لاپرواہی کا سبب پوچھا تو فرمانے لگے۔

" میاں میں اس سر کو لے کر کیا کروں جس پر کوئی بال نہیں۔ میں تو اپنے سر کو بھودان قطعۂ اراضی تصور کرتا ہوں جس طرح بڑے بڑے زمیندار اپنی فالتو، غیر آباد اور بنجر زمین کو بھودان تحریک کے سپرد کرکے لاپرواہ ہو جاتے ہیں۔ ہم بھی اس بنجر سر کو شب وروز بالترتیب بیگم اور سکریٹری کے ہاتھوں سونپ کر بے پرواہ ہو جاتے ہیں۔"

ایک صاحب جو خیر سے بے بال و پر بھی تھے اور زن مرید بھی۔ ہم نے اُن کے سر کے سطح مرتفع پر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ کئی جگہ خون کی گلکاریاں اور زخم نخلستان کا سماں پیش کر رہے تھے۔ اُنہوں نے ڈرتے ڈرتے بتلایا کہ بیگم صاحبہ سر پر تیز ناخن کی انگلیاں ایسے اُتارتی ہیں جیسے عظیم طاقتیں امن پسند ممالک میں فوجیں اُتارتی ہیں۔ دوستوں کے دلاسا دلانے اور بیگم صاحبہ کے ناخن کٹوانے کے باوجود رونے کا سبب پوچھا تو یوں نغمہ سرا ہوئے۔

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا ؟
زخم بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا ؟

ہمارے گنجے اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ بالوں کی افزائش اور سر کی نوآبادکاری پر صرف کرتے ہیں۔ یہی رقومات اگر بنجر اور غیر آباد کھیتوں پر خرچ کی جائیں تو غذائی مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک کے لوگ سر کے بل چل کر یہاں سے غلہ خریدیں گے۔

مغرب کی خوشحالی کا راز شائد اس میں مضمر ہے کہ وہاں بکثرت گنجے ہیں۔ اُن کا آرائشِ زلف کا وقت بچ

جاتا ہے اور یہی وقت وہ تعمیری کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم اکثر آئینہ کے سامنے اپنی زلفیں سنوارنے میں معروف رہتے ہیں کاش کہ اپنی تقدیر سنوارتے۔

اس کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ اس غیر محفوظ دور میں گنجوں کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

ایک نے بڑے فخر سے کہا کہ کوئی میرے شوہر کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔"

ہم نے پوچھا "کیا وہ اتنے بہادر ہیں؟"

خاتون نے جواب دیا۔ "نہیں وہ گنجے ہیں۔"

خواتین کا یہ جنون کہ وہ ہر معاملہ میں مردوں کے شانہ بشانہ رہیں۔ شائد قدرت نے اُن کی سُن لی ہے۔ اب تک شانہ پر لہراتی زلفیں اس مساوات کی دوڑ میں ڈوری ثابت ہو رہی تھیں۔ اب گنجے پن کا مرض بلا ذات و جنس پھیل رہا ہے۔ اس کا پتہ ہمارے ایک عاشق مزاج دوست کے دلچسپ واقعہ سے چلا۔ اُنھوں نے اپنی نئی محبوبہ سے فرطِ جذبات میں مغلوب روایتی انداز میں کہا۔

"اے جانِ من۔ میں ساری زندگی تمہاری اِن ساون کی گھٹاؤں جیسی زلفوں کے سائے میں گذارنا چاہتا ہوں۔"

حسینہ نے کچھ دیر اپنے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیر کر اپنی چوٹی اُن کے حوالے کر دی کہ آپ شوق سے اِن نقلی بالوں کو گھر لے جائیے اور ان کے سائے میں زندگی گذاریئے۔ پھر اُس حسینہ نے اپنے پرس سے دوسرا وِگ نکال کر اپنے گنجے سر کو ڈھانپ لیا۔ ہمارے دوست کا عشق، محبوب کا شفاف سر دیکھ کر سرد ہو گیا۔ اور اُنھوں نے بھاگتے ہوئے گھر کی راہ لی۔ سنا ہے آجکل وہ چھت پر بیٹھ کر دوربین سے اصلی زلف والی محبوبہ کا مشاہدہ کرتے ہوئے یہ شعر گنگناتے ہیں ؎

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

بُرا ہو اِن خارج البالوں کی صحبت اور اُن کے متعلق معلومات اخذ کرنے اور اُن کے بال کی کھال کھینچنے کا۔ اس دوران ہمارا سر جو اب تک مار دھاڑ کی کسی فلم کے شائقین کی طرح گھنے بالوں سے بھرا تھا اب اس سے بال ایسے غائب ہونا شروع ہوئے جیسے آرٹ اور تجرباتی فلم سے تماشائی۔

ہمارا سر کناٹ پیلس سے چاندنی چوک بنتا جا رہا تھا۔ بیگم نے ہمارے سر کے ہالہ سے چاندی کو پگھلتے دیکھ کر ہمیشہ ہمیشہ میکے جانے کی دھمکی دی۔

ہم نے منتیں، سماجتیں کیں۔ اُن کے پیر پکڑے اور کہا کہ "دوائیں، دعائیں اور مقوی غذائیں ہمارے گنجے پن کو دور کر سکیں گی۔"

تو بیگم نے غصہ میں اپنے لمبے لمبے بال لہراتے ہوئے کہا۔

کون جیتا ہے تری زلف کے "سر" ہونے تک

جوہر سیوانی

"اگر بے زار ہو اپنی کرن سے"

نہ بچوں سے نہ گھر کے مرد و زن سے
محبت سیٹھ جی کرتے ہیں دھن سے

فضائے امن کرتے ہیں مکدّر
الگ ہی رہیئے شیخ و برہمن سے

مہا بھارت نہ چھڑ جائے کہ جوکر
لگا پینگیں بڑھانے پھر چرن سے

نہ دیجئے ووٹ ایسے راہبر کو
وچن دے کر جو پھر جائے وچن سے

نحوست کا رہے گا راج کس پر
نکل جائیں اگر الّو چمن سے

ہنسا کرتا ہے وہ اوروں پہ اکثر
جو خود بدنام ہے اپنے چلن سے

عجب ہے خانہ دامادی میں ذلت
میاں کا ناطقہ ہے بند زن سے

بھتیجا بی جمالو کا ہے پھکڑ
نکالا جاتا ہے ہر انجمن سے

ذرا تم دیکھ لو ظلمت کا چہرہ
"اگر بے زار ہو اپنی کرن سے"

یہ اب سمجھیں ہیں بغداد و تہراں
مسائل اور اُلجھ جاتے ہیں گن سے

عراق، ایران، آپس میں جھگڑ کر
ہوئے پسپا سپاہی اہرمن سے

فسادوں سے خوشی ہوتی ہے اس کو
جنھیں ہے دشمنی خیر وطن سے

وطن والے بھی اب گرنے لگے ہیں
وطن میں رہ کے غداری وطن سے

کرم اہلِ کرم کا جھانکتا ہے
فقیر رہ گذر کے پیرہن سے

عمل سے دور ہیں اب عالمِ دیں
فقط تقریر آگلتے ہیں دہن سے

عظیم آباد نے اعزاز بخشا
اُس اردو کو جو آئی تھی دکن سے

ہمیشہ بہتی ہیں کیوں میری آنکھیں
تعلق تو نہیں گنگ و جمن سے

حسد کرتے ہیں کیوں سنجیدہ شاعر
جنابِ جوہر سیواں کے فن سے

○

اقبال شانہ

غزل

راستے پہ آ گیا راہی بھٹک جانے کے بعد
آدمی سیدھا ہوا الٹا لٹک جانے کے بعد

سیکسی کا لطف آتا ہے جھجک جانے کے بعد
لڑکھڑا کر گندی نالی میں لڑھک جانے کے بعد

چیر کر سینہ سمندر کا نکل آئے مگر
ہو گئے اندر وہ مٹکے میں اٹک جانے کے بعد

ہے جوانی کی محبت سوڈا واٹر کی طرح
عاشقی ہوتی ہے پختہ بال پک جانے کے بعد

توڑ کر دل یار مسکہ مارنے سے فائدہ
جُڑ نہیں سکتا کبھی شیشہ تڑک جانے کے بعد

زندگی میں ایک ہی خواہش تھی شادی کی ہمیں
آرزو پوری ہوئی ہے بال پک جانے کے بعد

عابد معز
حیدرآباد

شیطانی چکّر

شیطانی چکّر سے ہماری مراد اُن چکروں سے ہے جو ایک شخص بیمار ہونے کے بعد ڈاکٹروں کے پاس لگاتا ہے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے، ڈاکٹر وہ ماہر شخص ہے جو لوگوں کو زیادہ تعداد میں بیمار دیکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ خوش رہ سکے۔ ڈاکٹر کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ہم نے یہ تقسیم ان کے کسی ایک شعبہ میں اعلیٰ قابلیت کے سہارے کی ہے کوئی آنکھوں کی بیماریوں کا ماہر ہے تو کوئی دانتوں کے امراض کا۔ کوئی دل کا درد مٹانے والا تو کوئی دردِ شکم دور کرنے والا۔ اور جو ڈاکٹر کسی شعبہ میں مہارت حاصل نہیں کر پاتے وہ فیملی ڈاکٹر بن کر مشورہ دیتے ہیں کہ مریض کو کونسے اسپیشلسٹ سے رجوع ہونا چاہیے۔ غرض اس طرح سے ڈاکٹروں نے اپنے آپ کو تقسیم کرکے برسرِ روزگار رکھا ہے اور بھئی بہت خوب رکھا ہے۔ تبھی تو کہتے ہیں پیسہ، شادی بیاہ، یا بیماری میں بے دریغ خرچ ہوتا ہے ــــ ایک بار ہوا یوں کہ ہمارے پیٹ میں درد ہوا، سوڈا واٹر کے استعمال اور گھریلو نسخوں سے مایوسی ہوئی۔ ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑا۔

ہم نے فزیشن (PHYSICIAN) کا انتخاب کیا۔ فزیشن دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے ڈاکٹر کافی مشہور اور چل پہل پریکٹس کرتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر یکمشت تگڑی فیس لے کر ڈھیر ساری دوائیں تجویز کرتے ہیں۔ دوسری قسم اُن

ڈاکٹروں پر شتمل ہوتی ہے جو نسبتاً کم مشہور اور رینیل پریکٹس کرتے ہیں۔ اس قسم کے ڈاکٹر بہت زیادہ ہوتے ہیں' اور اپنے پاس سے دوائیں دیتے اور روز فیس لیتے ہیں۔ ویسے تو ہر ڈاکٹر فیس وصول کرکے دوائیں تجویز کرتا ہے پر صحیح تشخیص کرکے دوائیں دینے والے ڈاکٹر بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ آخری سفر کے لئے چار کاندھوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ڈاکٹر کے مطب کے لئے ایک یا دو بازوؤں کا سہارا کافی ہے۔ قسمت ساتھ رہی تو ڈاکٹر کے مطب سے بغیر سہارے گھر واپس ورنہ ڈاکٹر کے علاج سے بازوؤں کی تعداد میں اضافہ ہوجاتا ہے اور وہ وقت بھی آتا ہے جب زمین ڈاکٹر کی غلطی کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ خیر صاحب ہم نے دو عدد بازوؤں کا سہارا لیا اور ڈاکٹر کے مطب تک جا پہنچے۔ وہاں حالت قابلِ دید تھی' کوئی سر جھکائے بیٹھا ہے تو کوئی کھانستے کھانستے دہرا ہوکر اپنا سر ساتھ والے مریض کے پیٹ میں دے دیتا۔ ایک صاحب' قے کے ذریعہ بازو رکھی کرسی کو ماڈرن آرٹ میں تبدیل کرچکے تھے۔ ایک کے بعد ایک مریض ڈاکٹر کے کمرے میں جاتا' حالِ بیماری سناتا اور پرچہ مسیحائی لکھوالاتا۔ ہماری بھی باری آئی' ہم اندر گئے۔ ڈاکٹر صاحب موٹا چشمہ لگائے گھومنے والی کرسی پر بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ ہم نے آداب عرض کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پلکیں جھپکائیں۔ اپنا حال سُنانا شروع کیا۔ ڈاکٹر صاحب کبھی گردن ہلاتے' کبھی مسکراتے' کبھی ہوں ہاں کرتے تو کبھی کہتے "ہوتا ہے اکثر ہوتا ہے"۔ ہم خاموش ہوئے تو ڈاکٹر صاحب سوالات کرنے لگے۔ ہمارا نام' پیشہ پوچھا۔ شادی کے بارے میں دریافت کیا۔ عادات و اطوار اور چال چلن کے بارے میں چند ایک غیر ضروری سوالات کئے۔ اس کے بعد طبّی معائنہ شروع ہوا۔ تھرمامیٹر سے جسم کی حرارت معلوم کی گئی (مریض کو خاموش کرنے کے لئے بھی تھرمامیٹر کا استعمال ہوتا ہے۔ ایک وقت ہمارے منہ میں تھرمامیٹر ڈاکٹر کی غائب دماغی کی وجہ سے کچھ کم آدھا گھنٹہ موجود رہا)۔ حرارت معلوم کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے آلے سے پیٹ' پیٹھ اور سینہ دیکھا۔ چلئے طبّی معائنہ مکمل ہوا۔

طبّی معائنہ کے مکمل ہونے کے بعد نسخہ لکھنے کی بات آتی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا ڈاکٹر ہوگا جو کسی کو بھی خواہ مریض ہو کہ ملاقاتی بغیر دوا تجویز کئے لوٹا دے۔ ایک یا دو قسم کی دوائیں استعمال کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ مشکل تو سات آٹھ قسم کی دواؤں سے ہوتی ہے۔ تکلیف دوائیں کھانے سے زیادہ یہ یاد رکھنے میں ہوتی ہے کہ کونسی دوا کب اور کیسے استعمال کی جائے۔ اس مرحلے کے طے پانے کے بعد پرہیز کے تعلق سے مریض معلومات حاصل کرتے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ڈاکٹر تنگ آکر کہتا ہے سب کھائیے مگر میرا دماغ مت چاٹئے۔ حکیموں اور ویدوں کے مقابلہ میں ڈاکٹر اس لئے پسند کئے جاتے ہیں وہ زیادہ پرہیز نہیں کرواتے۔ آخری آئیٹم ڈاکٹر کو فیس دینے کا ہوتا ہے۔ پہلے فیس نسخہ کے بعد وصول کی جاتی تھی مگر آج کل ڈاکٹر سے ملنے سے پہلے فیس ادا کردینا پڑتا ہے۔ مشہور ڈاکٹر کی فیس بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وقت سے ڈاکٹر کا تجربہ بڑھتا ہے یا نہیں لیکن اس کی فیس میں ضرور اضافہ ہوتا ہے۔

آج کل دوائیں تکلیف کا ازالہ کم کرتی ہیں اور جسم پر اپنے زہریلے اثرات زیادہ مرتب کرتی ہیں۔ اس وقت ہمیں ایک دوست کی یاد آتی ہے جس نے سر کے درد کے لئے ایک گولی کھائی تھی۔ اس گولی نے بندوق کی گولی کا سا اثر کیا اور اس نے بہت ہمت و محنت سے موت کا مقابلہ کرکے زندگی کی حفاظت کی۔ اس حادثہ کے بعد سے ہم احتیاطاً ہمیشہ نئی دوا شہر کے سب سے بڑے ہسپتال کے سامنے استعمال کرتے ہیں۔ اور یہی نہیں' دوا کے استعمال کے بعد ۴ تا ۶ گھنٹے مصروفِ دعا رہتے ہیں:

خدا ہمیں دوا کے عتاب سے بچائے رکھے :

اُوپر ہم نے عرض کیا ہے کہ ایک بار ہمیں دردِ شکم کا عارضہ لاحق ہوا تھا چنانچہ ہم دوائیں کھاتے رہے کچھ افاقہ نہ ہوا ۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارے قارورہ اور فضلہ کے معائنہ کے لئے لکھا ۔ اس وقت ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ڈاکٹر صاحب صحیح تشخیص نہیں کر پائے اور اب تک وہ اندھیرے میں تیر چلاتے رہے ۔ قارورہ اور فضلہ کے معائنہ کی رپورٹ حاصل کی اور سن کر خوشی ہوئی کہ دونوں میں کوئی خرابی نہیں ہے ۔ رپورٹ کا فیصلہ سننے کے بعد ہم نے ڈاکٹر سے پوچھا " ڈاکٹر صاحب ' رپورٹ میں تو کوئی خرابی نہیں ہے تو پھر ہمیں کونسا مرض ہے ؟ " ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا " تم کیا خاک سمجھو گے " ۔ ہمارے دل نے کہا ڈاکٹر صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں ۔ جب وہ خود سمجھ نہیں پائے تو ہم کس کھیت کی مولی ہیں ۔

علاج بہرحال چلتا رہا ۔ ہماری حالت جوں کی توں برقرار رہی ۔ ڈاکٹر صاحب بیزارگی کا اظہار کرنے لگے ۔ ہم کو دیکھتے ہی جماہیاں آنے لگتیں ۔ اس موقع پر ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ موجودہ ڈاکٹر ہماری مزید کوئی خدمت نہیں کر سکتا کسی دوسرے مسیحا کو ڈھونڈیں ۔ پرانے مرض کو لے کر نئے ڈاکٹر سے رجوع ہونا پڑتا ہے ۔ نئے ڈاکٹر کو ماضی میں کئے گئے معائنوں پر بھروسہ ہوتا ہے اور نہ ہی وہ استعمال شدہ نسخوں کو دیکھنے کی تکلیف گوارا کرتا ہے ۔ البتہ رعب جمانے کے لئے چند دوسرے معائنے کرواتے ہیں ۔ خیر صاحب ہم نے بھی ڈاکٹر بدلا ۔ انھوں نے ہم سے ایکس رے کروانے کو کہا ۔ ہم نے اپنی بیماری کا سیاہ اعمال نامہ حاصل کیا ۔ ڈاکٹر صاحب نے ایکس رے کو ہلکی اور تیز روشنی میں دیکھا ' کچھ دیر سوچا اور نسخہ ہاتھ میں تھما دیا ۔

تبدیلی آب و ہوا سے صحت بہتر ہوتی ہے لیکن ڈاکٹر کے تبدیل کرنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا ۔ جب بھی سنتے کہ فلاں ڈاکٹر اچھا ہے ہم اپنا پرانا مرض لئے وہاں پہنچ جاتے ۔ رقت انگیز لہجہ میں تکلیف بیان کرتے نسخہ تجویز کرواتے اور پیٹ کو دواخانہ بناتے چلے گئے ۔ اس کے باوجود ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اسی دوران ہمارے ایک عزیز نے ہمیں سرجن سے ملنے کے لئے کہا ۔ ہم نے ان کے مشورہ پر عمل کیا ۔ سرجن نے ہمیں خوب ٹھوک بجا کر دیکھا اور کہا ـــــ " آپ میں اُوپر سے تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی میں آپ کو اندر سے دیکھنا چاہتا ہوں " ہم پریشان ہوئے کہ سرجن صاحب ہمارے اندر کیونکر داخل ہوں گے ۔ شاید وہ ہماری پریشانی کو بھانپ گئے اور کہا ـــ " آپریشن کر کے میں کہوں گا کہ آپ کو کیا عارضہ لاحق ہے " ـــ گویا آپریشن بھی مرض کی تشخیص کی ایک کڑی ہے ۔ آپریشن کا نام سنتے ہی ہماری روحِ ناتواں جسم سے پرواز کے لئے پر تولنے لگی ۔ ہم نے سرجن صاحب سے سوچنے کے لئے مہلت مانگی اور سرپٹ دوڑے چلے آئے ۔

مشورے دینا بہت آسان کام ہے ۔ جب بھی کوئی ہم سے ملتا وہ ہمیں کسی ڈاکٹر کا پتہ ضرور دیتا ۔ لیکن ہم نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اب تو کسی ڈاکٹر کو دیکھیں گے اور نہ ہی دکھائیں گے چاہے مرض سے ہم جاں بحق ہی کیوں نہ ہو جائیں ۔ تکالیف برداشت کرتے رہے ۔ ایک دن ہمارے ایک بزرگ نے ہم سے کہا ـــ " بیٹا مایوسی کفر ہے ۔ جہاں اتنے سارے ڈاکٹروں کو ملاقات کا شرف بخشا وہیں نفسیاتی معالج سے بَیر کیوں ؟ چل کر انھیں بھی دکھا لیتے ہیں " ۔ نئے ڈاکٹر کا نام اچھا لگا اور محسوس ہوا کہ یہ حضرت ہمیں دوائی اور انجکشن سے دور رکھیں گے ۔ لہٰذا ہم نفسیاتی معالج کے پاس اپنی صحت کے دام لگانے پہنچ گئے ۔ ان صاحب سے مل کر ہمیں بہت خوشی ہوئی ۔ اس لئے کہ ڈاکٹر معائنہ کرتا ہے

اور نہ ہی کرواتا ہے ۔ وہ مریض کے تعلق سے گھنٹوں باتیں کرتا رہتا ہے ۔ انھوں نے ہماری زندگی کے بارے میں پوچھا کئی ایک چھوٹے اور بڑے واقعات و حادثات پر روشنی ڈالنے کو کہا ۔ ہمارا سر فخر سے اُونچا ہوا ۔ محسوس ہوا کہ ہم بھی ایک تاریخ ساز شخصیت ہیں ۔ یہ بھرم جلد ہی ٹوٹ گیا جب ہم نے ڈاکٹر صاحب کو کہتے سُنا کہ :

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے زیادہ سوچنے کی وجہ سے یہ عارضہ لاحق ہے ۔ آپ سوچنا بالکل ہی بند کر دیں ۔"

ہم خود اپنے بارے میں نہ سوچیں یا ان ڈاکٹروں کے بارے میں جن کے ہم زیرِ علاج رہے ، یہ بات نفسیاتی معالج نے نہیں بتائی ۔

ہم ہر قسم کے ڈاکٹر سے مایوس ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر چکے ۔ اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا ۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے ۔ بہت دن تک تو طبیعت یوں ہی رہی ۔ پھر اپنے آپ بغیر علاج کے سنبھلنے لگی ، اور اب تو ماشاء اللہ کافی سنبھل چکی ہے جس کا ثبوت یہ حاصلِ صحت مضمون "شیطانی چکر" ہے ۔

اب کیا کیجئے

ظفر کمالی (پٹنہ)

ہو گئیں بیگم وبالِ جان اب کیا کیجئے
مجھ کو جھٹ کہہ دیتی ہیں شیطان اب کیا کیجئے

میری امّی اور گڈّو کی مدر کے درمیان
چھڑ گئی ہے جنگ پھر گھمسان اب کیا کیجئے

بچے جاہل ہی رہیں لیکن پڑھیں بالغ سبھی
کر دیا سرکار نے اعلان اب کیا کیجئے

سر جھکا کر میں بجا لاتا ہوں حکمِ والدین
ہے سراسر مجھ پہ یہ بہتان اب کیا کیجئے

ایک دن میں نے یہ سوچا بیچوں کچھ اپنی غزل
چار آنے میں بکا دیوان اب کیا کیجئے

فارسی آئے گی کیسے، یاد ہوتی ہی نہیں
ماضیٔ مطلق کی مجھے گردان اب کیا کیجئے

ہو کے بی۔ اے پاس صاحب کس طرح کھیتی کریں
اس سے گھٹ جائے گی ان کی شان اب کیا کیجئے

ان کی ضد ہے جب کریں گے تو کریں گے نوکری
نوکری ملنا نہیں آسان اب کیا کیجئے

سر پہ یہ بارِ گرانی ہی نہیں کچھ کم ظفر
اور اس پر روز کے مہمان اب کیا کیجئے

ہزل

اُمی :ـ ضمیرالدین ساجد

بابا نے کہا، لغزا نہ کر، کام بنے گا
تو چاہتا ہے جس کو، یہ تعویذ پلا دے

جاؤں گا اگر دیر سے اس طرح سے گھر کو
ڈرتا ہوں کہ بیگم کہیں میسا نہ لگا دے

درزی ہے، مگر عشق میں دیوانہ ہوا ہے
شلوار کا نہ بھول میں پاجامہ بنا دے

بیگم کے اگر پیٹ میں ہے درد تو جا کر
تھوڑی سی اسے پان میں اجوائن کھلا دے

اولاد سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ساجد
بچے کی اگر ضد ہے تو سائیکل بھی دلا دے

٭ ٭ ٭

آندھرا پردیش میں
خشک سالی کے لیے امدادی اقدامات

اس سال ریاست آندھرا پردیش کے بیشتر علاقے قحط اور خشک سالی سے بُری طرح متاثر ہوئے ہیں اور ریاستی حکومت نے متاثرہ علاقوں میں پینے کا پانی، غذا، چارہ اور روزگار کی فراہمی کے مناسب اقدامات کیۓ ہیں۔

چند اہم امدادی اقدامات

★ امدادی کاموں کے لیۓ ۲۸٫۹۵ کروڑ روپے جاری کئے گئے ہیں جن میں سے (۱۸) کروڑ روپے اضلاع رائلسیما کے لیۓ تلنگانہ کے اضلاع کے لئے ۱۰٫۸۰ کروڑ روپے اور آندھرا کے ساحلی اضلاع کیلئے ۳٫۱۵ کروڑ کی رقم جاری کی جارہی ہے۔

★ ختم مارچ ۱۹۸۱ء تک بور ویلس کی سربراہی نئی کھلی باولیات کی کھدوائی کھلی باولیات کی گہرائی محفوظ پینے کے پانی کی اسکیمات اور ٹینکوں کے ذریعہ پانی کی منتقلی کے کاموں پر تقریباً ۶٫۵۰ کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے۔

★ بورویلس کی کھدوائی پر ۲۰۰ سے زیادہ رگس (RIGS) کام کررہے ہیں۔

سلسلہ ۲۹ پر

غزلیں

سراج نرملی

ہُوبہو ٹُون ہے بیگم کا تو سہگل کی طرح
اس پہ خوش فہمی کہ آواز ہے کوئل کی طرح

ہے یہ اکلوتی ہی لیکن ہے نشہ آور سی
مدھ بھری آنکھ تری بیر کی باٹل کی طرح

آج مہنگے ہیں بہت، پیار، محبت اخلاص
دال، گھی، گیاس، شکر، آٹا و چاول کی طرح

عشق چُھپ چُھپ کے کیا، پھر بھی ہوئے ہم رسوا
"بات پھیلی ہے تری آنکھ کے کاجل کی طرح"

ہے پڑوسی بھی بچارا بڑا مظلوم سراج
اُس کی بیگم بھی ہے بالکل مری چڑیل کی طرح

سرکو حیدرآبادی

چاند سورج کو ڈھلتے دیکھوں نا
دناں راتاں کو چلتے دیکھوں نا

دوستاں نیچ تو بگاڑتیں، کاملں
سانپاں آستن میں پلتے دیکھوں نا

دیکھو میں بھی چٹان بن کو کھڑوں
کتے طوفاں ٹلتے دیکھوں نا!

ریتاں رساں ہیں اژدہے یا شاہ
اُنچے محلاں نگلتے دیکھوں نا

سرکو حضرت کے ناسوداں مت پوچھ
خوں ابھی تک اُبلتے دیکھوں نا!

صفدر (امرادتی)

پوسٹ مین

غالبؔ قاصد کے آتے آتے ایک خط اور لکھ رکھتے تھے کہ وہ جانتے تھے جواب میں کیا آنے والا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ غالبؔ کے عہد تک قاصد کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ غالب جیسے عاشقوں کو اس کا انتظار بھی نہیں ہوتا تھا۔ زمانے کا کام ہی تبدیلیاں لانا ہے۔ سو اُس نے قاصد کو بھی بدل دیا ہے۔ اب قاصد، قاصد نہیں رہا پوسٹ مین ہو گیا ہے۔ "مین" (یعنی انسان) ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ غالبؔ کے زمانے میں بھی آدمی کا "مین" ہونا مشکل تھا اور آج بھی آدمی اور انسان (مین) کی بحث تر و تازہ ہے۔ ان حالات میں قاصد کا مین ہو جانا اور پھر اپنی ڈاک سے پوسٹ مین کہلانا تاریخ کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔

پہلے پوسٹ مین محبوب کا قاصد ہوا کرتا تھا، آج خود محبوب بلکہ رشکِ محبوب ہے۔ ہم نہایت والہانہ (یعنی زائد از سو فیصد عاشقانہ) انداز میں پوسٹ مین کا انتظار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پوسٹ مین کی طرف رجوع ہونے کی یہ کیفیت ہماری محبوب کو سخت ناگوار گزرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم پوسٹ مین کو نہ صرف محبوب بلکہ رشکِ محبوب سمجھتے ہیں۔ فجر اور عصر کی نمازوں کے بعد جب کہ اہل اللہ ذکر الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں۔ ہم انتظارِ پوسٹ مین میں مستغرق پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی مقام شکر ہے کہ بہر حال ہم پائے جاتے ہیں۔ ورنہ استغراق کی وہ کیفیت ہم پر طاری ہوتی ہے کہ ہمیں تحلیل ہو جانا چاہیئے۔ دوست جس کے ودعت ہو جائیں، آسمان

اُن کا دشمن نہیں ہوتا۔ ہمارے دوست بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ انتظارِ پوسٹ مین کے رومانی لمحات میں یہ حضرات چھیڑ کرنے چلے آتے ہیں۔

"چلئے چوک تک ہو آئیں" یا "آئیے ٹہل آئیں" ــــ

ایسے سب آفرز کا ہمارے پاس ایک ہی جواب ہوتا ہے۔ "ابھی پوسٹ مین کو آنا ہے۔"

ان اوقات میں بچے ہمارے قریب نہیں آتے اور بیگم شکل دیکھنے تک کی روادار نہیں ہوتی۔

رفتہ رفتہ پوسٹ مین کو بھی ہمارے عشق و شوق کا اندازہ ہو گیا ہے۔ اسی لئے اب "آداب بھائی صاحب!" والی نیازمندی کی جگہ محبوبانہ اداؤں نے لے لی ہے۔ اب پوسٹ مین نے ہماری طرف دیکھنا تک بند کر دیا ہے۔ وہ خطوط کے بنڈل پر نگاہ جمائے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے ہمارے سامنے سے گذر جاتا ہے۔ ہم بے تاب ہو کر از خود پوچھ ہی لیتے ہیں۔

"پوسٹ مین صاحب! کچھ ہے؟"

وہ جواب میں پورے ہاتھ کی بلندی پر نفی کا پنجہ گھما دیتا ہے۔ سچ مانیئے۔ پوسٹ مین کا انکاری پنجہ پہلی محبوبہ کے ٹھینگے سے زیادہ کاری ضرب لگاتا ہے۔

پہلے پوسٹ مین ڈاک ہمارے حوالے کر کے خوش ہوتا تھا کہ اس کا بوجھ ہلکا ہوا۔ مگر جلد ہی اُسے پتہ چل گیا کہ جسے وہ اپنا بوجھ سمجھتا ہے وہ دراصل ہمارے سر (بلکہ روح) کا بوجھ ہوتا ہے۔ ڈاک ہمارے حوالے کر کے وہ اپنا فرض انجام نہیں دیتا ہم پر احسانِ عظیم فرماتا ہے۔ پوسٹ مین میں ایسے جذبات بیدار کرنے میں کچھ قصوروار ہم بھی ہیں مگر زیادہ قصوروار نہیں ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ ہم ڈاک یوں وصول کرتے ہیں گویا ایک ماں اپنے کھوئے ہوئے بچے کو پا کر نہال ہو رہی ہو۔ پوسٹ مین نے اس احسان کی قیمت بھی وصول کرنی شروع کر دی ہے۔ کبھی اٹھنی، کبھی چائے اور کبھی فلم آپ نے کبھی کبھار پوسٹ مین کو DUE دیا ہوگا۔ مگر ہم سے یہ کمبخت ہمیشہ UNDER ADVANTAGE حاصل کرتا رہتا ہے۔ پوسٹ مین ہماری اور ہماری ڈاک کی رگ رگ سے واقف ہوتا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کون سا خط ایڈیٹر کا ہوتا ہے، کون سا ہمارے سالوں کا، اور کون سے خط کاروباری ہوتے ہیں۔ ایڈیٹرس کے خطوط دیتے ہوئے وہ انعام کے سلسلے میں کبھی ہماری معذرت قبول نہیں کرتا حالانکہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم اس وقت ایڈیٹر کی معذرت قبول کر رہے ہیں۔

خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

یہ مصرعہ خطوط کے سلسلے میں بے شمار لوگ پڑھتے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ صلاحیت محض ادیبوں اور شاعروں میں ہی پائی جاتی ہے کہ وہ لفافہ کی صحت و صورت دیکھ کر ہی 'مدیرِ محترم' کا مدعا جان لیتے ہیں۔

پوسٹ مین سے محبت کے جراثیم کم و بیش سب ہی شاعروں، ادیبوں میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ میرا تو نظریہ، یہ ہے کہ جس شخص کا دل پوسٹ مین کی محبت سے خالی ہو وہ شاعر یا ادیب ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے ایک دوست کا ریمارک ہے کہ اگر ہم بجائے مشاعرے کے شاعرہ، ہوتے تو ہماری پہلی اور آخری محبت یقیناً پوسٹ مین سے ہوتی اور ہمارے بچے پوسٹ مین

کے بچے کہلاتے۔ ایک ادیبہ یا شاعرہ کے تعلقات پوسٹ مین سے کس نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں کسی ریسرچ اسکالر کو سراغ رسانی کرنی چاہیئے۔ (واضح رہے کہ ہم 'تحقیق' کی اصطلاح سے متفق نہیں ہیں اور اس فعل کے لئے 'سراغ رسانی' کی اصطلاح کو رواج دینا چاہتے ہیں) اس موضوع پر کوئی سُراغ رسانی کا کام کریں تو ہمیں شگوفہ کا خط ضرور لکھیں کہ ہم نے ایک ایسے موضوع کی طرف متوجہ کیا ہے جس کی طرف یونیورسٹیوں کے نگران کاروں کا ابھی تک دھیان نہیں گیا۔

ہمیں پوسٹ مین سے جتنی محبت ہے، بیگم کو اتنی ہی نفرت ہے۔ اس نفرت کی وجوہات بہت سی ہیں مگر اہم ترین کا تعلق معاشیات سے ہے۔ یعنی پوسٹ مین کو انعام میں دی جاتی اٹھنیوں سے ہے۔ ایک دن بیگم کی چیخ پکار پوسٹ مین کے کان کھڑے کر کے شنی اور تشریح طلب نظروں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ روئے سخن اُسی کی طرف ہے کہ مفت اٹھنیاں بٹور لے جاتا ہے۔ اُس نے ایک شر پلیہ نسخہ ہمارے کان میں پھونک دیا۔ چنانچہ ان دنوں جب ہم بیگم سے کہتے ہیں۔

"تمہارے بھائی کا خط آیا تھا اس لئے پوسٹ مین کو آٹھ آنے انعام دے دیا۔"

تو یہ سن کر بیگم تو خوش ہوتی ہی ہیں، ہم بھی بڑی فرحت محسوس کرتے ہیں۔ بیگم کی خوشی کا سبب تو ظاہر ہے مگر اپنی خوشی کی وضاحت ہم نہیں کر سکتے کہ یہ خطرناک بات ہوگی اور ہمیں ایک بڑا ادیب بننا ہے۔

ہمارے ایک دوست نے پوسٹ مین اور ادیب کی محبت کے سلسلے میں ایک نئی تھیوری پیش کی ہے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ ادیب و شاعر بظاہر پوسٹ مین کے عاشق معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقتاً وہ مدیران رسائل کے عاشق ہوتے ہیں۔ پوسٹ مین، مدیر جریدہ کی 'علامت' ہے۔ پوسٹ مین کا ٹھینگر اصل میں مدیر کا ٹھینگا ہوتا ہے۔ پوسٹ مین کے ہاتھ میں تھما لفافہ مدیر کی تجریدی شکل ہے۔ گویا مدیر لفافہ میں ڈھل کر ہم تک اور ہم لفافہ میں سما کر مدیر تک پہنچتے ہیں۔ بات کچھ کچھ ہماری بھی سمجھ میں آتی ہے۔ مگر اس خوف سے کہ جاہل نہ ٹھہرائے جائیں، ہم اپنے دوست کی تحقیق کو سو فیصد 'صحیح' سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ہمارے دوست نئی شاعری کے نقاد ہیں۔ افتخار جالب سے صلاح الدین پرویز تک اس قبیل کے شعراء پر کوئی نظم بعد میں نازل ہوتی ہے۔ پہلے اُس نظم کی تشریح اور تفسیر ہمارے دوست پر نازل ہوتی ہے۔ موصوف کی یہ بھی رائے ہے کہ ہم اپنے کامپلکس کو ایک خاص انداز میں لکھ دیں تو یہ جدید شاعری کا شاہکار ہوگی۔ ہم یہ شاہکار بہت جلد کسی معتدر ادبی رسالہ میں شائع کرائیں گے ـــــ!!

شکیل اعجاز (اکولہ)

جِنّی بھائی

ان کا اصل نام تو کچھ اور ہے لیکن لوگ انھیں "جی نی یس" (Genius بمعنی ذہین) کہتے ہیں (دراصل انھوں نے ایک نہیں، کئی ذہانت کے کام کئے ہیں۔ جس میں سے ایک یہ ہے کہ کم عمر میں شادی کرلی ہے) لیکن ہم سب دوست ان کو پیار سے جنّی بھائی کہتے ہیں۔ جنّی بھائی موٹے تازے ہونے کے باوجود بہت پھرتیلے اور تیز ہیں۔ پھرتیلے پن کو انھوں نے اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں اس طرح پھیلا رکھا ہے جس طرح ہم نے رشوت خوری ملک میں پھیلا رکھی ہے مڈل اسکول کے زمانے میں ہم لوگ اسٹڈی کرتے تو ایک صفحہ یاد کرنے کے لیے ہمیں مندرجہ ذیل چیزیں درکار ہوتیں۔

ایک گھنٹہ کا عرصہ۔
کم از کم دو کپ چائے۔
۱۰ ، ۱۲ مسکراہٹیں۔
۴ ، ۵ قہقہے۔
اور ایک آدھ چھوٹی موٹی لڑائی۔

لیکن جنّی بھائی ایک صفحہ صرف ۱۰ منٹ میں یاد کرلیتے اور وہ بھی کسی لڑائی کے بغیر! (کمال ہے)
چلتے بہت تیز ہیں۔ کوئی سمجھے کسی کا پاکٹ چرا کر فرار ہو رہے ہوں۔

پطرس بخاری صاحب جب مرزا صاحب کے ساتھ فلم دیکھنے چلے تو راستے میں ان کی جو درگت بنی وہ ایک فطری امر تھا کیونکہ فلم شروع ہو چکی تھی۔ لیکن جنی بھائی کی بات اور ہے۔ اگر ہم لوگ شام میں یوں ہی مٹرگشت چہل قدمی

کر رہے ہوں تو وہ ہم سے کافی دور نکل جائیں گے پھر لوٹ کر ہمارے پاس آجائیں گے یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہیں بیٹھ نہیں جاتے۔ ضروری بات کرتے وقت ان کو بٹھا دینا ضروری ہے۔

پھر تیلے پن کے نام پر کئی دفعہ دوکاندار کو پیسے دے کر چلتے بنے اور وہ سودا لے کر ان کے پیچھے دوڑتا ہے۔ بات چیت کرنے کے معاملہ میں بہت تیز رو ہیں۔ اکثر آپ کا سوال مکمل ہوا نہیں اور ان کا جواب تیار ہو جاتا ہے۔

ایک پاکستانی مہمان سے ان کا تعارف ہوا۔ اس نے کہا۔ "ہمارے چچا میاں کے پاس ایک بلڈنگ ہے جو ——"
یہ بولے "ہمارے بھی چچا میاں ایک بلڈنگ خرید نے والے ہیں!"

اُس نے کہا "ہمارے دادا جان فوج میں بھرتی ہوئے تھے اس وقت ——"

یہ بولے "ہمارے بھی دادا جان فوج میں بھرتی ہونے والے ہیں!"

اس نے کہا "ہمارے ——"

یہ بولے "ہمارے بھی!"

(اس کے بعد پاکستانی کا کوئی پتہ نہیں چلا)

جو الفاظ مفہوم سے زیادہ طویل ہوتے ہیں ان کا استعمال ہی نہیں کرتے اور کرتے ہیں تو اسے "چتی یا" لیتے ہیں۔
مثلاً چھوٹے ماموں کہنا ہو تو کہیں گے "پھٹامو"

ابا جان کو ابی یان۔

امی جان کو امی یان۔

بھائی میاں کو بھاماں۔

باورچی کو باوچی۔

ضیا میاں کو چیا میا (غصہ میں ہوں تو چیاؤں میاؤں تک کہہ ڈالتے ہیں)

ایک دن ہم دونوں خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے سے ایک لڑکی جانے لگی تو بولے۔

"یمیر کو بُجو تھی لگتی۔"

میں نے کہا۔ "سیدھی طرح رک رک کر کہو" بولے۔ "یہ میرے کو بہت اچھی لگتی ہے!" گرمیوں کے موسم میں ایک بلڈنگ کی چھاؤں میں کہنے لگے۔

"میرا دا اورا ئے، کہ، گنجرا لینا" میں غصہ میں پیر پٹک کر گھر جانے لگا تو بولے۔ "میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ گنجہ کرالینا" میں نے کہا "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اسی طرح Inscrutable جملے بولتے رہو سمجھ دار لوگ خود ہی گنجہ کرا دیں گے"

ان کے موٹے تازے ہونے کا ہم لوگ اکثر مذاق بناتے ہیں۔ وہ سب کا غصہ میرے دُبلے پن پر اُتارتے ہیں۔

ایک دفعہ کہنے لگے "مسٹر شکیل! یہ کیا زندہ ہو کر مردوں کی طرح رہتے ہو۔ ذرا ہنسا ہنسایا کرو۔ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔" میں انہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ دنیا کے ساتھ ہنسنے اور ہنسانے والا ہر آدمی موٹا نہیں ہوتا۔ لیکن میں نے کچھ کہنے کی بجائے انہیں فکر تونسوی صاحب کا فوٹو بتا دیا اور انہیں خاموش ہونا پڑا۔

جنی بھائی کو بحث کرنے کی بڑی عادت ہے۔ کبھی کبھی بحث جیتنے کی جدوجہد میں زندگی ہار دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں وہ جس اسکول میں ٹیچر تھے وہاں جب کبھی کسی بات پر اختلاف ہوتا تو کہتے۔
"دیکھو! میں سائنس ٹیچر ہوں۔ مجھے پریشان کروگے تو استعفیٰ دے دوں گا اور سب کام ادھورا رہ جائے گا"
مقابل استعفیٰ کے ڈر سے خاموش ہو جاتے۔
ایک دن کوئی جھگڑا ہوا تو انہوں نے اپنا جملہ دہرایا۔ مقابل کہنے لگا۔
"تم ہمیشہ استعفیٰ کی دھمکی دیتے ہو۔ اگر بات کے دھنی ہو ——— تو دے دو استعفیٰ"
اور دوسرے دن انھوں نے واقعی استعفیٰ دے دیا۔ یہ بات بہت کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتی ہے ورنہ عام طور سے لوگ ایسے موقعوں پر مصلحت پسند بن جاتے ہیں۔
بچپن سے نوجوانی تک ہم نے انھیں کبھی لڑکیوں میں دلچسپی لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لڑکیوں کے بارے میں ایسے ہی لاپرواہ ہیں جیسے کوئی گنجا کنگھیوں کے بارے میں ہوتا ہے لیکن ایک وقت کچھ اس قسم کی باتیں کرنے لگے۔
"کل میں نل پر گیا تو اس نے اپنی بالٹی کا پانی میری بالٹی میں انڈیل دیا"
"آج وہ پوچھ رہی تھی کہ 'الف' سے پہلے اور 'ے' کے بعد حروف کیوں نہیں؟ اور اگر نئے حروف بنائیں تو زبان پر کیا اثرات ہوں گے"
"آج وہ فیثا غورث کا مسئلہ سمجھنے آئی تھی"
"دسویں کلاس کی بجائے چوتھی کلاس کی ایک نظم سمجھنے آئی تھی ——— اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملنے کے بہانے تلاش کرتی ہے، ہی ہی ہی ہی ———"
کبھی بڑی حسرت سے کہتے۔
"اگر کل اس نے میرے موٹاپے کی وجہ پوچھی تو میں کیا کہوں ———
"اف میں اتنا موٹا کیوں ہوں؟" ان باتوں کے باوجود ہمارے کان پر جوں نہ رینگی۔ ایک دن اماں حسب معمول الہٰی کیفیت میں، رک رک کر، اور گمبھیر آواز میں بڑبڑانے لگا۔
"ہونہہ ——— تو یہ بہت دنوں سے صرف ایک ہی لڑکی کا ذکر کر رہے ہیں ——— یعنی ——— ضرور کچھ دال میں کالا ہے ———"
سب چوری پکڑی گئی تو وہ کھلم کھلا باتیں کرنے لگے۔ تقریباً انہی دنوں جب ان کا عشق "زیر تعمیر" تھا، ہم نے ایک جگہ دالی سنی اور دوسری جگہ سننے جا رہے تھے ———

وی۔ پی منگوانے کی صورت میں زائد محصول ڈاک بذمہ خریدار ———

★



وزیر اعظم کا بیس نکاتی معاشی پروگرام

لاکھوں محنت کش عوام کے لیئے ایک نعمت ہے



بھارتی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی طرف سے شروع کردہ ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام بلاشبہ آندھرا پردیش کی ترقی اور بتدریج فروغ کے لیئے ایک نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے پچھڑے ہوئے طبقات کی فلاح وبہبود کے لیئے کی جانے والی کوششوں میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے اور کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے لاکھوں عوام کے لیئے ایک نئی اُمید پیدا کر دی ہے۔

منہ بولتے حقائق

ریکارڈ غذائی پیداوار

غذائی پیداوار سنہ ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۶۷ر۱۱۶ لاکھ ٹن کے ایک ریکارڈ حد تک پہونچ چکی ہے۔ طوفان بادوباراں اور خشک سالی کے باوجود ہنگامی منصوبوں کی عاجلانہ عمل آوری کے نتیجے میں پیداوار سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں کم سے کم ۷۰ لاکھ ٹن ہوئی۔

عوام کے لیئے ارزاں پارچہ

ہینڈلوم کے ساٹھ فیصد بافندوں کو امداد باہمی کی صف میں شامل کر دیا گیا ہے۔ سستے داموں کے پارچہ کی پیداوار جو سال ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۱۸۹ لاکھ مربع میٹر تھی اب بڑھ کر سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۲۱۳ لاکھ ہوگئی اور سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۲۳۰ لاکھ تک پہونچ گئی ہے۔ ارزاں پارچہ اب ۳۸۸ نکاسی کے مراکز کے ذریعہ عوام میں تقسیم کیا جارہا ہے۔

ارزاں فروشی کی دوکانات کے ذریعہ اشیائے مائحتاج

اشیائے مائحتاج اب ۲۲۰۰۰ ارزاں فروشی کی دوکانات کے ذریعہ عوام تک پہنچائی جارہی ہیں۔

زرعی اصلاحات

زرعی اصلاحات کو ریاست میں پوری سرگرمی کے ساتھ روبعمل لایا جارہا ہے جس کے نتیجہ میں زائد از ۷۹ر۳ لاکھ ایکڑ

(سلسلہ ص۳۷ پر)

ڈی فارم

ماہنامہ "شگوفہ" حیدرآباد

۱۔ مقام اشاعت : ۳۱، مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۔ ۱

۲۔ وقفہ اشاعت : ماہنامہ

۳،۴ پرنٹر و پبلشر کا نام : سید مصطفیٰ کمال
شہریت : ہندوستانی
پتہ : ۷۶۸-۶-۱۷ دبیر پورہ حیدرآباد ۲۳

۵۔ ایڈیٹر کا نام : سید مصطفیٰ کمال
شہریت : ہندوستانی
پتہ : ۷۶۸-۶-۱۷ دبیر پورہ حیدرآباد ۲۳

۶۔ ان لوگوں کے نام جو اخبار کے مالک یا حصہ دار ہیں : قیصر کمال
۷۶۸-۶-۱۷ دبیر پورہ حیدرآباد ۲۳

میں سید مصطفیٰ کمال تصدیق کرتا ہوں کہ اوپر دی گئی معلومات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

یکم مارچ ۱۹۸۱ء سید مصطفیٰ کمال

غزل

چوپٹ حیدرآبادی

ہر گھڑی شیخ جھوٹ نکو نا
دھوکے بازی و لوٹ نکو نا

اپنی محنت کی پہنو تم چڈی
یارو پھوکٹ کا سوٹ نکو نا

پاؤں کی چیز پاؤں میں پہنو
سر کے اوپر یہ بوٹ نکو نا!

اپنوں اپنوں میں بٹ رہائے گڑ
نکو نکو یہ لوٹ نکو نا

شہر میں اتحاد کا دو ثبوت
نکو آپس میں پھوٹ نکو نا

○

آذر بارہ بنکوی

ملکِ ادب

افرادِ تمثیل :

جفا غیضی — ملکِ ادب کا حکمران

رمزی دانائی — وزیر

ستم جلالی — سپہ سالارِ فوج

اور بہت سے فوجی افسر اور سپاہی

مُقام — شاہی محل

منظر :

[شاہی دربارِ عام حامیانِ اُردو سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ خوبصورت حریری پردوں سے چھن چھن کر روشنی آرہی ہے جس سے دربار جگمگا گیا ہے۔ بیچ میں کرسیوں پر برگزیدہ اشخاص بیٹھے ہیں۔ کرسیوں کے دائیں بائیں جانب فوجی افسر اور ان کے پیچھے قطار در قطار سپاہی کھڑے ہیں۔ سامنے بلندی پر زرنگار تختِ شاہی خالی ہے۔ ایک منقش کرسی پر رمزی بیٹھا ہوا جفا غیضی کا منتظر ہے۔ اچانک نقیبوں کی ہلکی ہلکی آواز آتی ہے — "باادب باملاحظہ ہوشیار۔ شہنشاہِ ملکِ ادب تشریف لا رہے ہیں —" لمحہ لمحہ یہ آواز تیز ہوتی جاتی ہے اور جفا غیضی دربار میں داخل ہوتا ہے۔ سب سر کو جُھکا کر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ جفا غیضی تخت پر بیٹھ جاتا ہے]

رمزی دانائی: حاضرینِ دربار! ظلِّ الٰہی شہنشاہِ ملکِ ادب مسندِ شاہی پر جلوہ افروز ہو چکے ہیں۔ خدائے برتر و بزرگ ہم فدائیانِ اُردو کے سروں پر ظلِّ سبحانہ کا سایہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھے (مجمع سے آمین آمین کی آوازیں بلند ہوتی ہیں) اب یہ غلام بصد ادب گزارش کرتا ہے کہ ظلِّ الٰہی اپنی زبانِ معجز بیان سے اصلاحِ زبان و ادب کے لئے قائم کی ہوئی اس نئی حکومت کے بارے میں ضروری احکامات صادر فرمائیں —!

جفا غیضی: محبانِ اُردو اور جاں نثارانِ عصریت! زندہ و پائندہ باد۔ ما بدولت اپنے ان تمام رفقائے کار اور بالغ نظر شعراء کو مبارک باد پیش فرماتے ہیں جنھوں نے جدیدیت اور ترقی پسندی کے فروغ کے لئے روایت

قدامت پرستی اور فنی پابندیوں کے مضبوط حصار کو توڑ کر اردو شاعری کو رمزیت، معنویت، قواعد زبان نیز عروضی پابندیوں سے نجات دلائی ــ مقامِ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں منظم باغیوں پر فتح عطا فرمائی اور ملکِ ادب کا تختِ شاہی جس پر باغی اور منظم سازشیوں نے صدیوں سے ناجائز قبضہ جما رکھا تھا، مابدولت کے زیرِ نگیں آیا ۔ اب مابدولت کی خواہش ہے اور کوشش بھی کہ اردو زبان میں صحت مند ادب کا بول بالا ہو موزونیت، معنویت اور شگفتگی کی نحوست دور ہو اور ملکِ ادب میں زیادہ سے زیادہ آزاد اور معریٰ نظمیں نیز جدید غزلیں رواج پائیں ۔ اس نیک اور پرخلوص مقصد کی تکمیل کے لئے حامیانِ جدیدیت کا اولین فرض ہے کہ وہ جدید اقدار کو بروئے کار لاکر عوام کے ذہنوں کو ہموار کریں ــــ مابدولت ملکِ ادب کے نظم و نسق میں اپنے پرخلوص رفقائے کار سے بھرپور تعاون کی امید فرماتے ہیں اور انھیں آگاہ فرماتے ہیں کہ ہر ترقی پسند مجاہدِ اردو کو دشمن کی چالوں سے بہت ہوشیار رہنا چاہئے ۔ کیونکہ فتح حاصل ہو جانے کے باوجود باغیوں کا مکمل قلع قمع اب تک نہیں ہو سکا ہے ۔"

(پردہ)

[جفا غیضی محل کے اندر پائیں باغ میں نرم سبزے پر بچھی ہوئی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہے ۔ رمزی دانائی اور ستم جلالی حاضر ہوتے ہیں]

جفا غیضی : " مابدولت کو اندیشہ ہے کہ ملکِ ادب میں جا بجا بغاوت پھر زور پکڑ رہی ہے اور منظم باغی عصریت کو فنا کرنے کے درپے ہیں لہٰذا خفیہ طور پر باغیوں کی تمام سرگرمیوں کا فوراً پتہ لگایا جائے اور یہ بھی معلوم کیا جائے کہ مابدولت کی حکومت کے قیام کے بعد باغیوں کی صدیوں پرانی سازشوں میں کوئی فرق ہوا یا نہیں ــ ؟

رمزی دانائی : حکم کی تعمیل ہوگی جہاں پناہ ــ !"

جفا غیضی : (ستم جلالی کی طرف دیکھ کر) ملکِ ادب کی سرحدوں کی سخت حفاظت کی جائے اور قدیم روایات کا پابند کوئی شاعر یا ادیب اس ملک کی پاک سرزمین پر اپنے ناپاک قدم نہ رکھ سکے ۔

(پردہ)

[رمزی دانائی اذنِ باریابی حاصل کر کے جفا غیضی کے آرام کمرے میں گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے]

رمزی دانائی : تاجدارِ ملکِ ادب کے اندیشے صحیح ثابت ہوئے ۔ حقیقتاً ملک بھر میں جگہ جگہ قدیم طرز کے مشاعرے مسلسل منعقد ہو رہے ہیں جن میں سلیس، فصیح، موزوں اور با معنی کلام تشویش انگیز حد تک پسند کیا جاتا ہے ــــ جہاں پناہ ! یہ مشاعرے ایک چیلنج ہے کیونکہ ان میں جدید رجحانات اور جدید اسالیب شاعری کی علانیہ ہنسی اُڑائی جاتی ہے ۔

جفا غیضی : (گرج کر) مابدولت یہ گستاخانہ حرکت کبھی نہ برداشت فرمائیں گے اور اس بغاوت کا سر کچل کر ہی سکون پائیں گے ــ رمزی دانائی ! ملک کے گوشے گوشے میں منادی کرادی جائے کہ مابدولت نے محض جدیدیت کی نشوونما کے لئے ملکِ ادب کی یہ نئی حکومت قائم کی ہے ۔ یہاں صرف جدید رجحانات اور جدید اسلوب کی تبلیغ اور حوصلہ افزائی فرمائی جائیگی اور جو شعراء و ادباء پرانے اندازِ فکر کو ترک نہ کریں گے اور جدیدیت کو اپنانے سے گریز کریں گے انھیں اس کا انجام بھگتنا پڑے گا ۔"

(پردہ)

[جفا غیضی اپنے کمرے میں متفکر بیٹھا ہے ۔ رمزی دانائی داخل ہوتا ہے]

جفا غیضی : اس وقت ملکِ ادب ایک خطرناک دور سے گزر رہا ہے ۔ مابدولت مشورہ چاہتے ہیں کہ اس منظم بغاوت کو کس طرح کچلا جائے ؟

رمزی دانائی: اعلیٰ حضرت کا اقبال بلند ہو۔ تمام باغی
شاعروں کی فہرست مکمل کر لی گئی ہے۔ اس فہرست
میں وہ ادیب بھی شامل ہیں جو باغیوں کے ہمخیال ہیں۔"
جفا غیضی: " اور ادبی رسائل کے وہ مدیران جو ان
باغی شعراء و ادباء کا کلام اور مضامین شائع کرتے ہیں؟
رمزی دانائی: ظلِ الٰہی ۔۔! ان کے ساتھ بھی کوئی رعایت
نہیں برتی گئی۔ ان پر بھی حکومت کی کڑی نظر ہے
حکم ملتے ہی سب باغی گرفتار کر کے اعلیٰ حضرت کی
خدمت میں پیش کئے جائیں گے۔
جفا غیضی: (فرطِ مسرت سے قہقہہ لگا کر) " مرحبا
مرحبا ۔ مابدولت آج بہت خوش ہوئے۔ اچھا تو
اس خوشی کے موقع پر محل میں ایک مشاعرہ منعقد کیا
جائے جس میں نامور جدید شعراء کو شرکت کی دعوت
دی جائے۔"
[اس کے بعد ستم جلالی معہ دیگر فوجی افسران کے کمرے میں
داخل ہوتا ہے۔ ستم جلالی کی طرف دیکھ کر]
مابدولت اب زیادہ دنوں تک موزوں ' بامعنی '
سلیس اور شگفتہ کلام سننے کی تاب نہیں لا سکتے
اس ملکِ ادب کی مقدس سرزمین پر صرف وہی بلند
نظر شاعر زندگی کی سانس لے سکے گا جس کے کلام بلاغت
نظام میں ثقیل اور متروک الفاظ کا استعمال پایا جائے
جس کے کلام میں صنعتِ ابہام اور صنعتِ " بیت
و بیاں " بدرجہ اتم موجود ہوں۔ لہٰذا عصرِ حاضر کے
جو شعراء اس جدید معیار پر پورے نہ اتریں انھیں
حکومت کا باغی سمجھ کر جلد از جلد گرفتار کر کے مابدولت
کے حضور پیش کیا جائے۔ مابدولت انھیں عبرتناک
سزائیں دے کر آنے والی نسلوں کو بھی متنبہ کریں گے۔"

(پردہ)

[ستم جلالی جفا غیضی کے کمرے میں حاضر ہوتا ہے]
ستم جلالی: جہاں پناہ غلام نے حقِ نمک ادا کر دیا۔
اب تک کئی نامور باغی شاعر گرفتار کئے جا چکے ہیں
امید ہے کہ بہت جلد باقی باغی شاعر بھی گرفتار
کر لئے جائیں گے۔
جفا غیضی: اور کوئی باغی ادیب بھی گرفتار کیا جا سکا!
ستم جلالی: جہاں پناہ! جہاں کی امان ہو ۔ باغی
شاعروں کی گرفتاری کی خبر پا کر سارے باغی ادیب
چوکنے ہو گئے اور کنھیالال کپور اور فکر تونسوی
انڈر گراؤنڈ ہو گئے ہیں .... (قدرے توقف کے بعد)
اور ان نام نہاد اساتذۂ فن کے بارے میں کیا حکم ہے
جو مر چکے ہیں سرکار ؟
جفا غیضی: " مثلاً ۔۔ ؟
ستم جلالی: مثلاً میر تقی میر ' غالب ' ذوق ' مومن
آتش ' اقبال ' حسرت ' فانی اور جگر وغیرہ۔
جفا غیضی: بے شک ' بے شک ۔ ان نام نہاد
اساتذۂ فن نے اردو ادب کو غیر معمولی نقصان پہنچایا
ہے لیکن چونکہ اب یہ زندہ نہیں ہیں اس لئے ان
کے لوگس کلام کا مطالعہ جرم قرار دیا جائے' اور
ان کے کلام کا ایک ایک نسخہ تلاش کر کے نذرِ آتش
کر دیا جائے تاکہ اردو کے صاف اور شفاف دامن
پر یہ بدنما دھبے زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکیں
ستم جلالی: (جھجکتے ہوئے) " لیکن ظلِ الٰہی!
کسی ترقی پسند اور جدید شاعر کے کلام میں
موزونیت وغیرہ کا سقم پایا جائے ؟
جفا غیضی: تو کم از کم اس میں مہملیت ' کرخت
الفاظ کا بے محل تصرف اور بے ربط علامتوں
حسن ضرور ہونا چاہئے ...... اور ہاں
اگر شعر میں ہزلیہ یا مزاحیہ پہلو نکلتا ہو تو
اور بھی قابلِ قدر سمجھا جائے۔

(پردہ)

[شاہی دربار سامعین سے بھرا ہوا ہے۔ جفا غیضی

مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہے۔ شعرائے کرام باادب
بیٹھے ہوئے ہیں۔ رمزی دانائی کھڑا ہوتا ہے]

رمزی دانائی : شہنشاہِ ملکِ ادب، آسماں لقب، عالیجاہ
اُردو پناہ اور محترم سامعین! آج کی بزمِ سخن میں ملکِ
ادب کے مایہ ناز جدید شعرائے کرام شرکت فرما رہے ہیں
اب صدرِ بزمِ مشاعرہ عالیجاہ کی اجازت سے مشاعرے کا
آغاز ہوتا ہے۔ اُردو کے مقبول و معروف شاعر جناب
غنیم جدیدی مشاعرے کی نظامت کے فرائض انجام دے
رہے ہیں :

(غنیم جدیدی مائک پر آتے ہیں)

غنیم جدیدی : حضرات! اب مشاعرے کی کاروائی شروع
ہو رہی ہے لیکن قبل اس کے کہ میں کسی شاعر کو دعوتِ
سخن دوں شعرائے کرام سے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا
ہوں کہ وہ ملکِ ادب میں ہنگامی حالات کے پیشِ نظر
صرف منتخب کلام پیش فرمائیں۔ مجھے یقین ہے کہ جدید
غزل کا صرف ایک شعر قدماء کی مرصع غزلوں پر بھاری
پڑے گا کیونکہ جدید شاعری زندگی کے سنگین حقائق
کی آئینہ دار ہے۔ اس تمہید کے ساتھ میں جناب
محمد علوی کو زحمتِ سخن دے رہا ہوں۔

محمد علوی : محترم سامعین کی خدمت میں ایک مطلع
عرض کر رہا ہوں ؎

بنا مرغے کے پر پھٹکتی ہیں
مرغیاں در بہ در بھٹکتی ہیں

سبحان اللہ، سبحان اللہ کا شور سامعین کی صفوں سے
بلند ہوتا ہے۔ محمد علوی اپنے مداحوں کو جھک جھک کر
سلام کرتے ہیں۔

غنیم جدیدی : جناب محمد علوی کے بعد جناب ظفر اقبال
سے گزارش ہے کہ اپنا کلام مرحمت فرمائیں۔

ظفر اقبال : عرض کرتا ہوں ؎

ہم بھی گئے تھے گرمیٔ بازار دیکھنے
وہ بھیڑ تھی کہ چوک میں تانگہ اُلٹ گیا

واہ واہ کی صداؤں میں ایک آواز آتی ہے "خوب
فرمایا ہے جناب نے، شعر محاکات کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے"

غنیم جدیدی : اب غزل سرا ہو رہے ہیں جناب
پرکاش فکری ۔۔۔!

پرکاش فکری : توجہ چاہتا ہوں ؎

شیشے کے مرتبان میں مچھلی کو دیکھ کر
بلّی کی سرد آنکھوں میں شہوت کا ڈولنا

جفا غیضی : سبحان اللہ۔ کیا نادر خیال ہے اور
کیا حسین اسلوب بیان ہے۔

غنیم جدیدی : جناب پرکاش فکری کے بعد اب
تشریف لا رہے ہیں حضرت قمر اقبال،

قمر اقبال : حضرات! صرف ایک شعر کی زحمت
دے رہا ہوں ملاحظہ فرمائیں ؎

شیشے میں اپنے باغِ بدن کی بہار دیکھ
تنہائی میں لباس کسی دن اُتار کے

واہ وا۔ واہ وا کا شور بلند ہوتا ہے۔

غنیم جدیدی : اور اب جناب ماجد الباقری اپنا کلام
پیش کر رہے ہیں۔

ماجد الباقری : شعر عرض کر رہا ہوں ؎

چہرے پہ خواہشات کی لٹکی ہیں تختیاں
پہنے ہوئے ہیں جسم کو شلوار کی طرح

"کیا کہنا۔ کیا حسین اور نادر تشبیہ ہے" مجمع سے
ایک آواز آتی ہے۔

غنیم جدیدی : اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ سامعین اپنے
محبوب شاعر جناب کمار پاشی کا کلام سننے کے
مشتاق ہیں اس لیے میں جناب کمار پاشی سے گزارش
کرتا ہوں کہ وہ زحمت فرما کر کلام پیش فرمائیں

کمار پاشی : ارباب نظر کی خدمت میں ایک نازک شعر پیش کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں شعر میں شاید کوئی ندرت ہو ؎

چھ دنوں تک شہر میں گھوما وہ بچوں کی طرح
ساتویں دن جب وہ گھر پہنچا تو بوڑھا ہو گیا

مجمع شعر سن کر سر دھنتا ہے اور مکرر ارشاد، مکرر ارشاد کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔

غنیم جدیدی : حضرات! اس وقت ملک ادب میں ہنگامی حالات ہیں اس لئے وقت کی کمی کے پیش نظر سامعین کرام سے التماس ہے کہ وہ کسی شاعر سے دوبارہ شعر پڑھنے کا اصرار نہ فرمائیں۔ اب آپ حضرات معروف و مقبول شاعر حضرت مظفر حنفی کا کلام سماعت فرمائیں۔

مظفر حنفی : غزل کا ایک حسین مطلع نذر کر رہا ہوں:

؎ گاؤں آیا ہوں تو وہ آفت کی پرکالا نہیں
کیا لگاؤں ٹائی کوئی دیکھنے والا نہیں

رمز دانا : کیا کہنا ہے، بہت اچھا مطلع کہا ہے۔

غنیم جدیدی : جناب مظفر حنفی کے بعد میں جناب بشیر بدر کو زحمت سخن دے رہا ہوں۔ تشریف لائیے بدر صاحب!

بشیر بدر : حضرات! انسانی زندگی میں صنف نازک کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے اس لئے اس پہلو کو مد نظر رکھ کر دو شعر عرض کر رہا ہوں ؎

سنترہ نارنجی، سنہری کھٹی میٹھی لڑکیاں
بھاری جسموں والی ٹپکے آم جیسی عورتیں

سامعین کی صفوں سے فلک شگاف آوازیں بلند ہوتی ہیں "سبحان اللہ۔ جزاک اللہ"

بشیر بدر : حضرات! یہ شعر بھی فخر کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

سڑکوں، بازاروں، مکانوں، دفتروں میں رات دن
لال نیلی سبز پیلی جلتی بجھتی عورتیں

غنیم جدیدی : ابھی ابھی آپ حضرات جناب بشیر بدر کا کلام سماعت فرما رہے تھے۔ اب معروف جدید نظم گو حضرت حسن شہیر اپنی نظم پیش کر رہے ہیں۔

حسن شہیر : محترم سامعین کی خدمت میں ایک جدید نظم عرض کرتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے "شاعر اعظم"۔ ملاحظہ فرمائیں، توجہ چاہتا ہوں ؎

" لنگوٹ باندھے ہوئے آپ ٹہل رہے ہیں
جی ہاں پہلوان ہیں
استاد سخن ہیں
دیکھئے نا — کیسے مسکرا رہے ہیں
گلابی ہونٹوں پر آپ کی مسکراہٹ معنی خیز ہے
اسی طرح ہمیشہ یہ مسکراتے رہتے ہیں "

غنیم جدیدی : آپ حضرات نے جناب شہیر کی خوبصورت نظم سماعت فرمائی۔ اب آخر میں کہنہ مشق شاعر جناب ندا فاضلی کو زحمت سخن دی جا رہی ہے!

ندا فاضلی : — (جفا غیضی کی طرف دیکھ کر) — اجازت ہے جہاں پناہ —؟

جفا غیضی : ارشاد۔ مابدولت سراپا گوش ہیں۔

ندا فاضلی : عرض کرتا ہوں ؎

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے رات ہو گئی

داد و تحسین کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ رفتہ رفتہ آوازیں دبتی ہیں اور خاموشی ہو جاتی ہے۔

جفا غیضی : آج اس بزم سخن میں شرکت فرما کر اور جدید شعراء کا معرکۃ الآرا کلام سن کر مابدولت کو یقین ہو گیا ہے کہ جدید شاعری، افکار کی بلندی اور

نادر اسلوب بیان نیز صداقتِ شعری کے سہارے اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ رہی ہے اور اب وہ وقت دور نہیں جب اُردو شاعری دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کی جاسکے گی۔ مابدولت مشاعرے میں شریک ہونے والے تمام شعرا اور سامعین کا شکریہ ادا فرماتے ہیں اور اب مشاعرہ اختتام پذیر ہوتا ہے۔

[رمزی دانائی اپنی نشست سے کھڑا ہوتا ہے]

رمزی دانائی : رخصت ہونے سے پہلے آپ حضرات ایک اہم اعلان سماعت فرمالیں اور وہ اعلان یہ ہے کہ کل دربار عام میں جہاں پناہ کے حضور باغی شاعروں کے مقدمات پیش ہوں گے اور جدیدیت کی بیخ کنی کرنے والے تمام باغیوں کو عالی جاہ اُردو پناہ عبرتناک سزائیں دیں گے۔

(پردہ)

[دربار میں جفا غیضی تخت شاہی پر بیٹھا ہوا ہے۔ رمزی دانائی اپنی نشست پر موجود ہے۔ دربار عمائدین شہر اور تماشبینوں سے چھلک رہا ہے ستم جلالی، دیگر فوجی افسران اور مسلح سپاہی شاہی حکم کے منتظر ہیں]

جفا غیضی : (ستم جلالی کی طرف دیکھ کر) تمام باغی شاعر ایک ایک کرکے مابدولت کے سامنے پیش کیے جائیں۔

[فوجی افسران اور مسلح سپاہی اپنی اپنی تلواریں کھینچ کر ایک جیبہ بزرگ شاعر کو اپنے حلقے میں لے کر جفا غیضی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ بزرگ کے پُروقار چہرے پر جھریاں نمودار ہیں مونچھ کے بال برف کی طرح سفید، داڑھی کے بال بے ترتیبی سے اُگے ہوئے، بند گلے کا کوٹ، سر پر سفید پگڑی کمال د بزرگی کی دلیل، پرانی عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے پُرنور آنکھیں، علم و ادب کی جگمگاتی ہوئی شمعوں کی طرح روشن اور تابناک]

ستم جلالی : یہ ہیں وہ خطرناک باغی شاعر جنھیں اربابِ فن میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے آپ جسمانی طور پر کمزور اور ضعیف ہوجانے کے باوجود جدیدیت کے خلاف منظم سازش اب بھی کررہے ہیں۔ ملک کے گوشے گوشے میں اُن کے سینکڑوں شاگرد موجود ہیں جو انہی کے نقشِ قدم پر چل کر بغاوت کو مسلسل ہوا دے رہے ہیں۔ جہاں پناہ! ان کا دعویٰ ہے کہ بہت سی فنی پابندیوں کے باوجود اُردو ہر قسم کے مضامین نظم کردینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ دعویٰ بجائے خود جدیدیت کے خلاف ایک چیلنج ہے۔

جفا غیضی : (گرج کر) نام ــــ ؟

ستم جلالی : (طنزیہ لہجہ میں) جانشینِ داغ، ابوالفصاحت جوشش ملسیانی۔

جفا غیضی : (زیرلب دہرا کر) ابوالفصاحت، بغاوت کا مزید ثبوت ــــ ؟

ستم جلالی : اعلیٰ حضرت۔ دیگر اہم تصانیف کے علاوہ تین شعری مجموعے مرتب کرچکے ہیں جن میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جس سے جدید تحریک کو تقویت پہنچے۔ قدیم معیارِ شعر سے کبھی انحراف نہیں کیا اور کلاسیکل شاعری کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔

جفا غیضی : یعنی ــــ ؟

ستم جلالی : یعنی پورے کلام میں نہ تو کوئی شعر مہمل ہے اور نہ کسی شعر میں بے ربط علامت کا حسن موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ پورے کلام میں فن کی پابندی بھی کی گئی ہے اور زبان و بیان کا پورا پورا لحاظ بھی۔

جفا غیضی : (غصہ سے لال پیلا ہوجاتا ہے) جوشش کی ساری تصانیف ضبط کرکے انھیں زنداں میں ڈال دیا جائے .... (توقف کے بعد قدرے

دھیمے لہجہ میں) لیکن ضعیفی کے پیشِ نظر آرام کا پورا
پورا خیال رکھا جائے اور کوئی مشقت بھی نہ لی جائے۔

[مسلح سپاہی تلواریں کھینچے ہوئے اسی طرح پھر ایک
شاعر کو جفاؔ غیضی کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جو
پاجامہ، سفید کُرتا اور اس پر صدری زیبِ تن کئے
ہوئے، کشادہ پیشانی صحیفۂ کمالات کی طرح
روشن، آنکھیں علم و فضل کا خزانہ، چہرے پر متانت
اور غیر معمولی سنجیدگی، اپنے گرد و پیش کھنچی ہوئی
تلواروں سے بالکل بے پروا، اطمینان کے ساتھ
ہاتھوں پر سگریٹ کی ڈبیا اچھالتے ہوئے بڑھتا ہے]

جفاؔ غیضی: (نہایت برہمی کے ساتھ) آپ کون ہیں؟

ستم جلالی: اعلیٰ حضرت! یہ ہیں وہ نامور باغی شاعر جنھیں بغاوت کے صلہ میں گیان پیٹھ کا انعام حاصل ہو چکا ہے۔ ان کی باغیانہ سازشوں کے بارے میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ جوشؔ ملیح آبادی جیسے خطرناک باغی نے انھیں اُردو کی آبرو کہا ہے۔ انتہائی صلاحیت مند ہونے کے باوجود جدید شعری تحریکات کو ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس کے برخلاف میرؔ و غالبؔ، مومنؔ و آتشؔ جیسے لوچ اور بے مقصد شعر کہنے والوں کے رنگِ کلام کو نہ صرف اپنایا ہے بلکہ اس میں نئی روح پھونک دی ہے —

جفاؔ غیضی: تعارف —؟

ستم جلالی: فراقؔ گورکھپوری۔

جفاؔ غیضی: کیا کلام میں معنی و مطالب سے عاری اشعار پائے جاتے ہیں؟

ستم جلالی: ہرگز نہیں جہاں پناہ۔

جفاؔ غیضی: اور کبھی کوئی آزاد اور معرّیٰ نظم کہی؟

ستم جلالی: ظلِ الٰہی، ایک بھی نہیں۔

جفاؔ غیضی: تب تو یہ کسی رعایت کے مستحق نہیں، ان کی تمام تصانیف اور ودیا پیٹھ کا اعزاز ضبط کر کے انھیں عمر قید کی سزا دی جاتی ہے۔

[فراقؔ معنی خیز نظروں سے جفاؔ غیضی کو دیکھ کر
سر جھکا لیتے ہیں۔ مسلح سپاہی اب ایک خوش پوش
باغی کو اپنی حراست میں لے کر آگے بڑھتے ہیں جس
کے پیروں میں سلیم شاہی جوتا ہے، شیروانی کے
بٹن سلیقے سے بند، گھنگھرالے بال کشادہ پیشانی پر
بکھرے ہوئے، پان کی سرخی ہونٹوں تک پھیلی ہوئی
اپنے ارد گرد مسلح سپاہیوں کی مزاج پرسی بھی کر رہا ہے
اور انھیں فراخ دلی سے دعائیں بھی دے رہا ہے]

ستم جلالی: انھوں نے اوائلِ عمری سے بغاوت پر کمر باندھ رکھی ہے۔ جگرؔ جیسے بدنام شاعروں کے ساتھ ان کا نام مشاعروں میں لیا جاتا تھا۔ یہ بھی میرؔ، مومنؔ، فانیؔ اور حسرتؔ جیسے دقیانوسوں کی طرح صنفِ غزل کو سخت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ عالی جاہ یہ کسی رحم کے مستحق نہیں اس لئے کہ اکثر مشاعروں میں ہمارے خوش فکر جدید شعراء اپنے اثر انگیز اور حقیقت آمیز معرکۃ الآراء کلام سے سامعین کے ذہنوں پر جدیدیت کے جو گہرے نقوش چھوڑتے ہیں، یہ اپنی ایک دقیانوسی غزل سے انھیں مٹا کر رکھ دیتے ہیں۔

جفاؔ غیضی: نام بتانے میں تعجیل کی جائے؟

ستم جلالی: خمارؔ بارہ بنکوی —!

جفاؔ غیضی: خمارؔ کی خوش مزاجی ایک طرف مابدولت کو رحم کرنے پر مجبور کرتی ہے تو دوسری طرف مابدولت کی جدیدیت نوازی انھیں سخت سزا دینے پر مُصر ہے۔ ان حالات میں مابدولت حکم صادر فرماتے ہیں کہ انھیں قید کرنے کی بجائے فوراً ملک بدر کیا جائے۔

[شاہی فرمان سن کر غفار دعائے درازیٔ عمر دیتے ہیں۔
ذرا دیر میں سپاہی پھر ایک ایسے شاعر کو اپنے گھیرے میں لے کر آگے بڑھتے ہیں جس کا جسم لاغر۔ اگلے بڑے دانت نکلے ہونٹ پر، چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی، گال پچکے ہوئے، آنکھیں دھنسی ہوئی، بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے، چہرے سے نقاہت عیاں، شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے، داہنے ہاتھ میں ایک پتلی چھڑی اور بائیں ہاتھ پر ایک کمبل ہے]

جفا غیضی: (مسکرا کر) جناب کی تعریف؟

ستم جلالی: دانشور واحدی . . . . جنھیں عہدِ حاضر کا مقبول اور معروف شاعر سمجھا جاتا ہے۔ عالی جاہ! دوسرے باغیوں کی بہ نسبت زیادہ لائقِ عتاب ہیں کیونکہ شروع شروع میں انھوں نے آزاد اور معریٰ نظمیں کہہ کر ترقی پسند جدید تحریک میں عملی حصہ لیا لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد علانیہ طور پر باغیوں کے گروہ میں شامل ہو گئے جس سے ان پر جاسوس (SPY) ہونے کا بھی شک ہوتا ہے۔

جفا غیضی: لیکن خراب تندرستی کے پیشِ نظر جدیدیت کو ان سے نقصان پہنچنے کا امکان زیادہ دنوں تک نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے مابدولت رحم فرما کر انھیں رہا فرماتے ہیں۔

[آخر میں سپاہی اس شاعر کو حاضر کرتے ہیں جو پتلون اور بند گلے کا کوٹ پہنے ہوئے ہے۔ صحت مند جسم، بڑی بڑی آنکھوں میں سرخی دوڑی ہوئی، کشادہ پیشانی، بال الجھے ہوئے، بھرا بھرا چہرہ، چال میں لغزشِ مستانہ]

جفا غیضی: (چونک کر) یہ شکل تو کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہوتی ہے؟

ستم جلالی: بجا ارشاد ظلِ الٰہی۔ یہ ہیں سلام مچھلی شہری۔ انھوں نے اردو شاعری میں نئے نئے تجربات کر کے جدید شعری ادب میں بلاشبہ چار چاند لگائے ہیں لیکن ——

جفا غیضی: (بات کاٹ کر) لیکن کیا؟

ستم جلالی: لیکن جہاں پناہ! ان کا کچھ کلام ایسا بھی سنا اور پڑھا گیا ہے، جدیدیت کی خوش مذاقی جس کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لئے ان کا چال چلن بھی اب مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔

جفا غیضی: شک کا فائدہ دے کر انھیں بری کیا جاتا ہے۔ (سلام کی طرف دیکھ کر)۔ آئندہ را احتیاط۔

شگوفے

شمع زیدی (بمبئی)

▪ ایک مشاعرہ میں ایک بزرگ شاعر شعر سنانے تشریف لائے تو اُن کے کلام سے زیادہ اُن کے مضحکہ خیز حلیے نے حاضرین کو متاثر کیا، چھوٹی سی نوکدار سفید داڑھی، سر پر کھدر کی ڈھلی ہوئی ٹوپی اور جسم پر گہرے سبز رنگ کا لمبا سا چغہ۔ کسی شخص نے پنڈت ہری چند اختر سے پوچھا۔

"یہ بزرگ کون ہیں پنڈت جی ؟"

اختر صاحب پہلے تو آنکھوں پر چشمہ لگا کر ان حضرت کو غور سے دیکھتے رہے، پھر ایک دم چہک کر بولے۔

"شکل وصورت سے تو مولانا نیل کنٹھ دکھائی دیتے ہیں۔"

* * *

▪ بین الاقوامی شہرت یافتہ مصوّر مقبول فدا حسین کی پینٹنگز کی نمائش تھی اور وہیں پہلی بار وہ اپنا کلام سنانے والے تھے۔ اس نشست میں حضرت علی عباس اُمید تاخیر سے پہنچے۔ حسین صاحب اپنی منظومات پیش کر چکے تھے۔ پینٹنگز دیکھتے ہوئے اُمید صاحب نے حسین صاحب سے کہا۔ "حضرت تصویریں تو میری سمجھ میں بہت آتی نہیں۔ آپ کی شاعری سننا چاہتا تھا اُس سے محروم رہا۔"

حسین صاحب ہنستے ہوئے بولے" ارے میری شاعری ہی کیا، میں نے تو ادھر ہی کچھ لکھا ہے۔ آپ تو پہلے سے ہی شاعر ہیں۔"

اُمید صاحب نے فوراً وضاحت کی "جی ہاں! خاکسار پیدائشی شاعر ہے پھر بھی 'درمیانی' لوگوں کی سُن لیا کرتا ہے۔" ۔۔ اور آرٹ گیلری قہقہوں سے گونج اُٹھی۔

* * *

▪ مولانا محمد علی جوہر سیتاپور کی ایک دعوت میں مہاتما گاندھی کے ساتھ شریفہ کھانے لگے تو گاندھی جی نے انھیں ٹوکتے ہوئے کہا "آپ کو شکر کی بیماری ہے۔ شریفے آپ کو تکلیف دینگے" مولانا نے فوراً جواب دیا۔ "سسرال کا مال بھی کبھی تکلیف دیتا ہے گاندھی جی ؟"

"سسرال کا مال ؟" گاندھی جی نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں!" مولانا نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ "یہ شریفے تو سیتاپور کے ہیں اور میرا گھر رامپور ہے۔"

* * *

▪ ایک محفل مشاعرہ میں جوش ملیح آبادی اپنی نظم سنا رہے تھے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر حاضرین سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "دیکھئے کم بخت، پٹھان ہو کر کیسے عمدہ شعر پڑھ رہا ہے!"

جوش صاحب نے فوراً بیدی صاحب پر جملہ چست کیا "اور ظالم سکھ ہو کر کیسی اچھی داد دے رہا ہے۔"

* * *

▪ کسی مشاعرہ میں ایک نو مشق شاعر اپنا غیر موزوں کلام پڑھ رہا تھا۔ اکثر شعراء آدابِ محفل کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموش تھے لیکن جوش ملیح آبادی پورے جوش وخروش سے ہر مصرعہ پر داد دے رہے تھے یہ دیکھ کر گوپی ناتھ امن نے انھیں ٹوکتے ہوئے کہا "قبلہ! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" ۔۔ "منافقت" جوش صاحب نے جواب دیا۔

* * *

لاج ٹھاکر

مترجم کالیکا پرشاد

چندے کا پھندہ

راشن لاتے کے خالی تھیلے لٹکائے، گردن جھکائے، چلچلاتی دھوپ میں ہم گھر کی طرف مڑے۔ کبھی چینی، کبھی آٹا، کبھ ی کبھی مٹی کے تیل کے لیے دکانوں کے سامنے لائنوں میں دھکے کھانا ہمارا پچھلے تین دنوں کا شغل اور خالی ہاتھ گھر لوٹ جانا ہمارے ر میں لکھا تھا۔

آج ہماری بیگم نے الٹی میٹم دیدیا تھا — "آٹا آئے گا تو کھانا بنے گا ورنہ ......" ہم ورنہ کے آگے کچھ سن نہ پائے ے کہ اس نے راشن کارڈ اور خالی تھیلے ہمارے ہاتھ میں تھما دیئے اور انگلی کھلے دروازے کی جانب اٹھا دی۔

راشن ڈپو پہ ہمارا نمبر آتے آتے ہم پسینے میں نہا گئے۔ ہمارے آگے والی لائن میں سے گرمیوں میں تیسری منزل والا ی طرح چار پانچ منٹ بعد ایک قطرہ آدمی ڈپو سے باہر ٹپکتا اور ہمارے پیچھے دھکم پیل کرتی لائن کسی پہاڑی برساتی نالے کی ح ابل پڑتی۔ اچانک راشن ڈپو پر NO STOCK کا بورڈ لگا دیا گیا اور اسے دیکھتے ہی بھیڑ نے گالیوں کا اسٹاک باہر نکال لیا

اپنے گھر کی چوکھٹ پر اپنے خیالوں میں ڈوبے کسی سے ٹکراتے ٹکراتے ہم بمشکل بچے۔ ایک بھرا تھیلا ہاتھ میں، تین تھیلے دھے پر، دوسرے ہاتھ میں گھی سے آدھا بھرا لوٹا لیے، ماتھے پر گلے پر چندن تلک سجائے، لمبی دھوتی، سر پہ پگڑی، یں موٹے منکوں کی مالا پہنے وہ صاحب "ہرے رام ہرے کرشن" رٹتے ہمارے پاس سے نکل گئے۔ ہم نے ایک ت بھری نظر ان کے تھیلوں پر ڈالی اور اپنے گھر میں چلے گئے۔ تھیلے فرش پر پھینک کر ہم کرسی پر لڑھک گئے۔ اوشا بیٹی زی کاٹ رہی تھی۔

"کیا ہوا آج بھی آٹا نہیں ملا؟" اوشا نے سبزی کاٹنا بند کر دیا۔

"اپنا نمبر آتے آتے اسٹاک ختم ہو گیا۔" ہم نے لمبی سانس چھوڑ دی۔ "لوگ جانے کیسے جھٹ راشن لے آتے ہیں۔ یک آپ ہیں جو ہر روز ہاتھ ہلاتے منہ لٹکائے آ جاتے ہیں۔"

"بھئی میں کوئی پکنک منانے چلا نہیں جاتا۔ نہ کسی سینما ہاؤس میں جا بیٹھتا ہوں۔ صبح سے اب تک راشن کی لائن میں ا ہوں۔ اچھا ذرا جلدی کھانا بناؤ۔ بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

"روٹی کیا مٹی سے بناؤں؟ آٹا تو بالکل ختم ہے۔" اوشا نے خالی کنستر ہمارے آگے کر دیا۔

"مگر صبح تو اس میں قریب ڈیڑھ کیلو آٹا تھا۔"

"میں نے کیا بیچ دیا۔" اوشا نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"مگر ایسا بھی تو نہیں ہو سکتا کہ ڈیڑھ دو کیلو آٹا چوہے چٹ کر گئے ہوں۔" ہم نے بے اعتباری سے اُس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے کسی کوڑے کے ڈھیر پر نہیں پھینکا۔ دان کیا ہے۔ پنڈت جی مندر میں ہو رہے یگ کے لئے آٹا لینے آئے تھے میں نے تھوڑا سا آٹا، چاول، شکر، گھی، جو گھر میں تھا دان کر دیا۔ مجھے تو اتنی کم مقدار میں سامان دیتے بھی شرم آتی تھی کے اس جھاڑو پھرے گھر میں تو دان دھرم بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ جنم تو خراب ہوا ہی۔ اگلا جنم بھی نہیں سدھار سکتی۔" سسکنے لگی۔

"دان دیر کرن کی۔ کبھی تم نے یہ نہیں سوچا کہ آج کل آٹے، دال، چینی، گھی کا کیا بھاؤ چل رہا ہے۔ اور ان چیزوں کو لانے کے لئے بے بھاؤ کے دھکے کھانے پڑتے ہیں۔" ہم نے ذرا تیز ہو کر کہا۔

"راشن لا نہیں سکتے تو گئے مجھ پر رعب جمانے اور آپ نے میرے پتا جی کو کیا کہا ہے؟ آگ لگے آپ کے گھر میں۔" اوشا نے سبزی کی ٹوکری میں لات ماری اور پھر گھٹنوں پر (اپنے ہمارے نہیں) سر رکھ کر سسکنے لگی۔

بھوکے پیاسے ہم کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ اوشا رسوئی میں بیٹھی کرموں کو رو رہی تھی۔ ہم کمرہ میں بیٹھے اُس کی ...کو کوس رہے تھے۔ اُس نے پنڈت جی کا تھیلا بھرتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ کتنی مشکل سے اور کتنا مہنگا آج کل راشن آتا ہے اور یہ مانگنے والے بھی کام دھام کچھ کرتے نہیں بس تھیلا اُٹھایا۔ کبھی کسی سادھو منڈلی کے لئے چندہ مانگ رہے ہیں۔ کسی مندر یا گرودوارے کے لنگر کے لئے تھیلے بھر رہے ہیں کسی یتیم خانہ کے نام پر جیب بھر رہے ہیں۔ کتنا آسان طریقہ نکالا ہے ان لوگوں نے۔ دوکان پر لائنوں میں پاؤں کچلوانے کپڑے تار تار کروانے سے یہ کام کتنا اچھا ہے۔ نہ بلیک ... بلیک وائٹ کے دام دو۔ بس تھیلے اُٹھائے، رسید بک پکڑی اور کسی کے در پر یتیم سی شکل بنا کر پہنچ گئے۔ تبھی ...ری نظر سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر پڑی۔ صبح سے راشن کے لئے بھٹکنے اور خالی پیٹ ہونے کے باعث ہماری ...صورت پر یتیمی کا بورڈ لٹکا نظر آ رہا تھا۔

ہم ڈریسنگ ٹیبل کی جانب قریب ہو گئے۔ واقعی ہمارا چہرہ اس چندہ کے کام کے لئے مناسب تھا۔ بس تھوڑا ...آواز میں درد بھر کر ہم بھی چندہ مانگنے کے کام میں اُستاد ہو سکتے تھے۔ "ویری گڈ" ہم نے دل میں کہا اور چٹکی بجائی۔ ...ب ہم بھی چندہ مانگا کریں گے۔ اوشا سے چوری چھپے یہ کام کریں گے۔ اس طرح جہاں راشن مفت ملا کرے گا وہاں دوکا...دسو دھکے کھانے پھرنے کی ضرورت بھی نہ ہوگی۔ مگر ہاں اوشا سے ہم اُس راشن کے دام پورے لیا کریں گے تاکہ اُس کو ...اس نیک کاز و بار کا پتہ نہ چلے اور ہمارا سنیما، تماشے اور ہوٹل میں چائے، سموسوں کا پروگرام دھوم سے چلتا رہے۔

تین چار دن اور خاص کر راتوں کو ہم اپنے منصوبے پر غور و فکر کرتے رہے جب اوشا گھر میں نہ ہوتی تو اپنے چہرہ ...بھٹکا دینا بنا کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آواز میں دکھ درد سمیٹے، یتیموں اور بیواؤں کے لئے چندہ مانگنے کی مشق کرتے۔ کبھی چہرے پر معصومیت کا لیپ چڑھا کسی مندر یا گرودوارے کے لئے چندہ مانگنے کے ڈائیلاگ رٹتے۔ ہم نے ...نئے پاجامے کو پھاڑ کر اُس میں کئی ٹانکے لگا دیے۔ کپڑوں کے بدلے برتن دینے والی سے ایک چیتھڑے چیتھڑے ...کوٹ بھی ہم نے مول لے لیا۔ چندہ دینے والوں کو رسید کاٹنے کی مشکل ایک پرانی خاندانی رسید بک نے حل کر دی۔

اس رسید بک میں دادا جی ہمارے خاندانی مکان کے کرایہ داروں کو رسید کاٹ کر دیا کرتے تھے۔ دادا جی سے ہمارے تک صرف رسید بک ہی پہنچی اور وہ مکان کسی نے خرید لیا تھا۔ صبح جب لاٹ گھر میں نہ تھی تو ہم راشن والے تھیلوں میں پرانا کوٹ اور پیوند لگا پاجامہ ڈال جیب میں رسید بک رکھ کر چپکے سے گھر سے باہر نکل آئے۔ اپنے گھر سے کئی محلے دور ایک انجان سی بستی میں جھاڑیوں کے اوٹ میں ہم نے کپڑے بدلے اور خدا کا نام لے کر کام کو شروع کر دیا۔ ہم نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ گھر کا مالک جس مذہب کا ہوا ہم اسی مذہب کے مطابق مندر، گرودوارے مسجد بنانے کے لئے چندہ مانگیں گے۔

سب سے پہلے مکان کے سامنے دہلیز پر مالک مکان پیشانی پر بڑا سا تلک لگائے مل گئے۔

"جے رادھے شیام، جئے سیتا رام"۔ ہم نے بات شروع کی اور رسید بک ٹٹولی۔ "ورنداون میں رادھا کنج کے پاس ایک مندر کی ......"

"اچھا مولانا دیر ہو رہی ہے۔ میں چلتا ہوں"۔ ...... تلک والے صاحب نے دروازہ کی جانب منہ کر کے کسی سے کہا۔

"ہاں، تھوڑی دیر بیٹھ کر ناشتہ تو کیا ہوتا"۔ دروازہ کی اوٹ سے بنیان تہمد پہنے ایک ادھیڑ میاں جی نکل آئے۔ اُن کے چہرے پر شرعی داڑھی اور ماتھے پر نماز کا گٹھا بہار دکھا رہا تھا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟"۔ مولانا نے تلک والے صاحب جانے کے بعد ہم سے پوچھا۔

گھر کا مالک اُس تلک والے صاحب کی جگہ پر اس مولانا کو پا کر ہمارے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے مگر ہم نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔

"بس آپ سے ہی ملنے آیا سمجھئے۔ آپ کا ...... وہ، کیا کہتے ہیں دیدار کرنے چلا آیا۔ ہم نے دماغ کو تیزی سے کام میں لاتے ہوئے کہا۔

"اندر تشریف لائیے"۔ مولانا پیچھے ہٹ گئے۔

اُن کے پیچھے ہم بیٹھک میں آ گئے۔ دیوار پر کعبہ شریف کی ایک بڑی تصویر تھی۔ ایک کارنس پر بڑے رومال میں لپٹی قرآن شریف تھی۔

"فرمائیے کیوں کر آنا ہوا؟"۔ اس نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد کہا۔

"میں ایک نیک کام میں آپ کی مدد لینے کو حاضر ہوا ہوں"۔

"ہر نیک کام کے لئے بندہ حاضر ہے۔ حکم کیجئے"۔

"ایک مسجد کی تعمیر کے لئے آپ کی نیک کمائی کا کچھ حصہ چاہیئے"۔ ہم نے اُسے راہ پر لانا شروع کیا۔

"کیوں نہیں۔ مگر ابھی باہر تو کسی مندر کی بات چل رہی تھی"۔ مولانا نے کہا۔

"وہ مسجد ایک مندر کو گرا کر بنوائی ہے۔ ہم نے مندر کے حوالہ کا مناسب استعمال کرتے ہوئے کہا۔

"توبہ توبہ یہ تو کفر ہے۔ خدا کا ایک گھر گرا کر دوسرا گھر کھڑا کرنا کس مذہب میں جائز ہے"! مولانا بھڑک اُٹھے۔

"آپ نے میری پوری بات سُنی ہی نہیں۔ میں بتا رہا تھا کہ وہ مسجد ایک مندر کو گرا کر بنائی جانی تھی مگر

مسجد کے امام صاحب اور دوسرے سمجھدار لوگوں نے مذہبی دیوانوں کو سمجھا بجھا کر ایک دوسری اچھی جگہ اس کو بنوانے کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس جامع مسجد کو بنوانے کے لئے ہندو مسلمان دونوں دل کھول کر چندہ دے رہے ہیں۔ آپ مجھے دیکھئے۔ ہندو ہوتے ہوئے بھی اس شہر میں اس جامع مسجد کے لئے چندہ اکٹھا کرتا پھر رہا ہوں۔"

"آپ کا جذبہ قابل تعریف ہے۔ ہاں تو یہ جامع مسجد کہاں ہے۔ جامع مسجد دہلی میں لال قلعہ کے سامنے ہے۔"

ہم جلدی میں کہہ گئے۔

"دہلی میں تو کیا جامع مسجد کو پھر سے بنوانے کے لئے آپ چندہ اکٹھا کر رہے ہیں"۔ مولانا صاحب نے غور سے ہماری طرف دیکھا۔

"آپ نے دہلی سنا؟" میں نے تو ہُگلی ..... نہیں نہیں ہُگلی کہا"۔ ہم گھبرا گئے۔

"آپ وہاں کے امام صاحب کا نام پتہ دیدیں۔ میں چندہ بھجوادوں گا" مولانا صاحب نے تہمد پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ہم نے انٹ شنٹ پتہ لکھوا کر اُس مکان سے باہر آنے میں ہی خیریت سمجھی۔ مولانا صاحب کے گھر سے نکل کر اس محلہ میں تو کیا اگلے دو چار محلوں میں بھی چندہ مانگنے کی جرائت ہم میں نہ ہوئی۔ ایک کوچے کے پہلے مکان کا کواڑ ہم نے کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟ آجاؤ جی کنڈی کھلی ہے"۔ ایک بھاری مردانہ آواز ہمارے کانوں میں پڑی اور دروازہ کھول دیا گیا۔ ہمارے سامنے بھاری بھر کم ڈیل ڈول والے ایک سردار صاحب پاجامے اور بنیان میں کھڑے تھے۔

"ست سری اکال سردار صاحب"۔ ہم نے کہا۔

"ست سری اکال آؤ جی کیسے آنا ہوا؟" سردار جی پیچھے ہٹ کر ہمیں بیٹھک میں لاتے ہوئے بولتے گئے"۔ بیٹھئے آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"سردار جی، میں آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ ایک گرودوارے کی تعمیر میں آپ کی نیک کمائی کا کچھ حصہ بھی شامل کرنا ضروری ہے"۔ ہم نے کہا۔

"ہاں جی کیوں نہیں جی"۔ سردار جی نے ہمارے سامنے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا "یہ گرودوارہ کہاں بن رہا ہے؟"

"یہ گرودوارہ"۔ ہم اس سوال سے گھبرا گئے۔ "ہاں یہ گرودوارہ "گروگڑھ صاحب" میں بن رہا ہے"۔ ہم نے اس شہر کا فرضی حال بتا دیا۔

"گروگڑھ صاحب!" سردار جی ذرا سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ "ہاں جی گوند گڑھ اور رام گڑھ کے پاس ہے"۔ ہم نے مزید ایک جھوٹ کہہ ڈالا۔

"اچھا اچھا گروگڑھ صاحب میں کس مقام پر؟"

"ہاں ...... ہاں ایک تالاب ہے نا۔ اُسی کے کنارے"۔ ہم نے فوراً کہہ ڈالا۔ ہم جانتے تھے کہ عام طور گاؤں قصبوں میں مندر گرودوارے کسی تالاب کے کنارے ہی ہوتے ہیں "یہ کچا سا تالاب ہے"۔

"کسی اور مقام سے بھی چندہ لائے ہوئے؟" سردار جی نے پوچھا۔

اس سوال کے لئے ہم پہلے سے تیار تھے۔ ہم نے جیب میں سے راشن کے لئے اوشا سے لئے

ہوئے پیسے اور فالتو فی رسید بک نکال کر سردار جی کی آنکھوں کے سامنے لہرا دی۔

"یہ دیکھئے بیس پچیس روپے اب تک مل چکے ہیں۔ آپ بھی حسب استطاعت گرو گڑھ صاحب کے گوردوارے کے لئے دل کھول کر چندہ دیں۔"

سردار جی نے زبردست قہقہہ لگایا اور ان کا بھاری بھرکم بدن اس قہقہے کے زور سے ہل گیا۔ ہم تعجب خیز نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"اچھا تو آپ گرو گڑھ صاحب میں تالاب کے کنارے گوردوارہ بنانے کے لئے چندہ اکٹھا کر رہے ہیں؟" وہ اپنی ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

"جی ہاں، مگر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ گرو گڑھ صاحب میں کوئی تالاب نہیں ہے۔"

"جب آپ گرو گڑھ گئے ہوں گے اس وقت نہ رہا ہوگا۔ مگر اب ہے۔" ہم نے دھڑلے سے اپنے جھوٹ کی وکالت کی۔

"جناب والا، اب بھی نہیں ہو سکتا کیوں کہ رام گڑھ اور گوبند گڑھ کے قریب کوئی گرو گڑھ صاحب ہے ہی نہیں۔" سردار جی مسکرا رہے تھے۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"کیوں کہ میں بھی اسی فرضی گرو گڑھ صاحب کے فرضی تالاب کے کنارے بننے والے خیالی گوردوارے کے واسطے چندہ مانگتا ہوں۔ اپنا دھندہ بھی وہی ہے جو تمہارا ہے۔"

"یعنی یعنی ......" ہم گھبرا گئے۔

"یعنی سیدھے ہاتھ سے جو کچھ کمایا ہے ففٹی ففٹی کرو۔" اس نے ہمارے ہاتھ سے نوٹ جھپٹ لئے۔

"مگر میں نے جھوٹ کہا تھا، یہ روپے چندے کے نہیں ہیں۔" "چندے کے ہوں یا نہ ہوں مگر اس میں میرا آدھا حصہ ہے۔" اس نے آدھے نوٹ اپنے پاجامے کے نیفے میں ٹھونستے ہوئے کہا — "اب بولو چائے پیو گے یا لسی منگوا دوں؟"

"جی کچھ نہیں شکریہ۔" ہم اٹھ کر دروازہ کی طرف لپکے۔

جب تک راشن کی رقم پوری نہ ہو گھر جانا مناسب نہ تھا۔ اس لئے ہم نے کسی اور مقام پر قسمت آزمانے کی ٹھانی۔ ایک بڑی کوٹھی کے باہر آٹھ دس بچے نظر آئے۔ ایک عورت ان بچوں کو کھینچ کھینچ کر کوٹھی میں لے جا رہی تھی۔ اگر مال بیچنے والوں کو یتیم بچوں کی دردانگیز داستان سنا کر یتیم بچوں کے لئے چندہ مانگا جائے تو وہ جھٹ پرس کا منہ کھول دیتے ہیں یہی سوچ کر ہم نے اس کوٹھی سے یتیم بچوں کے نام پر چندہ مانگنے کی ٹھانی۔ اگر ایک آدھ بچہ ساتھ ہو تو گھر والوں پر اور بھی رنگ جمایا جا سکتا ہے۔ کچھ فاصلہ پر دو تین بچوں کو کھیلتے ہم نے دیکھا تھا جن کے کپڑے مٹی میں لت پت تھے۔ سوچا اگر ان بچوں کو اگر لالچ دے کر ہم اپنے ساتھ اس کوٹھی پر لے آئیں تو خاصا چندہ مل سکتا تھا۔ ہم فوراً اس مقام پر پہنچ گئے۔ دو بچے اب بھی کھیل رہے تھے۔ ان کی عمر تو لگ بھگ دس سال کے لگ بھگ تھی۔ آپس میں لڑتے کھیلتے انھوں نے اپنے کپڑے بھی کئی جگہ سے پھاڑ لئے تھے۔ مٹی سے لت پت ان پر چیتھڑے لٹکتے، ان معصوم یتیم بچوں کو دیکھ کر کوٹھی والوں کا دل موم ہو جائے گا اور

ہم کافی رقم چندے کے نام پہ ہتھیا سکتے تھے۔

اُن بچوں کو مٹھائی کھانے والی اور کھیلنے والی گولیوں کا لالچ دے کر اُس کوٹھی تک لانے کے تیار کرلیا۔ بڑے لڑکے کو آنکھیں بند رکھنے کو کہا اور چھوٹے کو منہ بند رکھنے کے لیے سمجھا دیا اور ان کو کہا کہ جب تک میں کوٹھی سے باہر نہ آجاؤں وہ دونوں کوٹھی کے دروازے کے سامنے چپ چاپ کھڑے رہیں گے۔ بس ایک لڑکے کو "اندھا" اور دوسرے کو "گونگا" بنا کر انھیں ہم نے اُس کوٹھی کے پھاٹک کے پاس ایک درخت کے سایہ میں کھڑا کردیا خود کوٹھی میں جاکر "کال بیل" پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کون ہو بھئی؟" ایک ادھیڑ شخص نے دروازے میں سے سر نکال کر پوچھا۔

"اولاد والو! یتیموں پر ترس کھاؤ۔ بغیر ماں باپ کے بچے تمہاری طرف پُر اُمید نظروں سے تاک رہے ہیں۔ ماں باپ کے کلیجوں کے ٹکڑے اب یتیم خانہ میں ٹکڑوں کو ترس رہے ہیں۔ اپنی نیک کمائی دے کر ان کی دُعائیں لو"۔ ہم نے پُر درد آواز اور آنکھوں میں آنسو چھلکا کر ایسے کہا جیسے یتیم ہم ہی ہوں۔

"آجاؤ، آجاؤ، اندر آجاؤ"۔ اُس شخص نے کہا۔

اُس کے پیچھے پیچھے ہم ڈرائنگ روم میں آگئے۔

"کتنے بچے ہیں تمہارے یتیم خانہ میں؟ میں ہر ماہ اُن بچوں کے لیے سو پچاس روپے دیتا رہوں گا!"

"ویسے تو وہاں پندرہ بیس یتیم بچے ہیں مگر میں ایک اندھے اور ایک گونگے بچے کو ساتھ لیے رہتا ہوں تاکہ چندہ دینے والوں کو پتہ چلے کہ وہ واقعی یتیموں کو ہی دے رہے ہیں۔ اولاد والے ان معصوم، لاچار، یتیم بچوں کی حالتِ زار کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ آپ بھی دیکھیں کتنے معصوم پھول کس طرح کانٹوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں"۔

"اُن کو اندر ہی لے آؤ۔ کھانا کھایا ہے اُن بچوں نے؟"

"جی نہیں، کھانے کے نام پر ہماری اپنی آنتیں کلبلا اُٹھیں۔ سوچا وہ کھائیں گے تو ہمیں بھی مل جائے گا۔"

"تو ٹھیک ہے اُن کو اندر بلاؤ۔ تم بھی کھالو۔ ان کو بھی کھلا دو۔ بھگوان بچوں کے سر پر سدا ماں باپ کا سایہ رکھے"۔ اُس شخص نے سرد آہ چھوڑی۔

ہم جلدی سے پھاٹک کی طرف چلے۔ ایک ہی آسامی ایسا پھنس گیا تھا جو سو سوا سو اب دے گا اور ماہانہ بھی پچاس ساٹھ کا الگ مقرر کر دے گا۔ ایسی چالیس پچاس مُرغیاں پھنس جائیں تو نوکری سے مستعفی ہو کر چین سے چندے کے پیسوں پر دن کاٹیں گے۔ ان بچوں کو "اندھا" اور "گونگا" بنا رہنے کی تاکید کر کے ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ وہ صاحب سر جھکائے شاید معصوم یتیموں کی تقدیر پر رو رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھے اور میز پر پرس پڑا تھا۔

"دیکھئے صاحب، یہ ہیں ہمارے دو یتیم بچے"۔ ہم نے اُن کی توجہ ان بچوں کی جانب مبذول کرنے کی غرض سے کہا۔

"یہ یتیم بچے ہیں؟" وہ صاحب ایکدم اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

"جی ہاں، ایک اندھا ہے اور دوسرا گونگا۔ بڑے والا لڑکا جب سال بھر کا تھا تو اُس کے ماں باپ

ب ہی دن ہیضہ سے اللہ میاں کو پیارے ہو گئے اس چھوٹے کو جنم دیتے ہی گندی نالی میں پھینکا گیا
ایدکوئی کنواری ماں اس کے بزدل' گناہ گار باپ کو اس کو اپنا بچہ ماننے پر راضی نہ کر پائی ہو گی"
سر جھکائے ہوئے کہا۔
" ابے وہ نالی کے کیڑے' میں تیرا سر توڑ دوں گا۔ تو میرے بچوں کو یتیم کہہ رہا ہے اور اس چھوٹے
و......... " وہ صاحب غصہ میں جملہ پورا نہ کر پا رہے تھے۔
" یہ آپ.......... آپ کے بچے ہیں؟"
" ہاں اور ہم صبح سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ تم ان کی آنکھیں اور زبان بند کروا کر بھیک منگوا رہے ہو۔ ایک کوٹھی والے
ے بچوں سے بھیک!"
" مگر جناب' آپ میری بھی سنئے" ہمیں سوجھ نہیں رہا تھا کہ معاملہ کیسے سنبھالیں۔
" تم بچوں کا اغوا کر کے ان سے بھیک منگوانے والے گروہ سے تعلق رکھتے ہو۔ میں ابھی پولیس کو
ن کر کے تمہیں گرفتار کرواتا ہوں" ارے وہ شیخ جمی اور رحمٰن پکڑو اس بدمعاش کو" وہ ٹیلی فون کے
و اٹھاتے ہوئے چلائے۔
اپنے کو خطرہ میں دیکھ کر ہمارے پیروں کو پر لگ گئے۔ ایک ہی چھلانگ میں ہم ڈرائنگ روم سے
ادھر ہوا کے جھونکے کی طرح کوٹھی کا پھاٹک پار کر سڑک پر پہنچ گئے قسمت سے ایک لوکل بس کوٹھی
منے والے اسٹاپ پر چلی تھی۔ ہم چھلانگ لگا کر بس میں جا گھسے اور بس تیزی سے ہمیں لے کر چل دی۔
بس کے آخری اسٹاپ پر پہنچتے پہنچتے ہم اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکے تھے۔ اسٹاپ ایک نئی کالونی میں تھا اور یہی
ں سے آدھ پون گھنٹہ بعد واپس جاتی ہے سو ہم نے اس نئی کالونی کی سیر کا ارادہ کر لیا۔ ایک سرکاری کوارٹر
سی سے نکلتے ہوئے یکایک ہمارے دل میں خیال آیا کہ اس وقت کوارٹروں کے بابو لوگ اپنے دفتروں
ں گئے۔ اگر ان کی نرم دل بیویوں سے شوہروں کی عدم موجودگی میں بیواؤں کے لیے چندہ مانگا جائے
ا ہے۔ ذرا سی بیواؤں کے نام پر دہائی دی تو سہاگنیں خود کو ان بیواؤں کی جگہ محسوس کرنے لگتی ہیں
نے زندہ شوہر کی یاد میں اس سے حاصل عیش و آرام کو سوچ سوچ کر آنسو بہانے لگیں گی اور کھنا کھن دولت
یں گی۔
ہم نے پہلے دروازے پر دستک دی۔
" کون ہے؟" ایک سریلی زنانی آواز کانوں میں آئی۔
" غریب بیوہ بہنوں کے لیے چندہ اکٹھا کرنے والا ایک ادنیٰ خدمت گار" ہم نے درد میں ڈوبے
ں کہا اور جیب سے رسید بک نکال لی۔
دروازہ کھول کر ایک خوبصورت عورت نے سر باہر نکالا۔ ہم نے جھٹ نظریں جھکا لیں تاکہ وہ ہمیں کوئی
گا نہ سمجھے۔
" بہن جی' ہمارے ودھوا آشرم میں سینکڑوں بیوائیں اور بال ودھوائیں اپنی زندگی کی گاڑی گھسیٹ
ں۔ دنیا کے سکھ سے بھگوان نے ان کا ناطہ توڑ دیا مگر زندگی سے رشتہ جوڑے رکھ کر ان کو زندہ لاشیں

یا ہے ہائے وہ بے چاری جن کے شوہران کے اشارے پر آسمان کے تارے توڑ کر قدموں میں
دیتے تھے، آج ودھوا آشرم کی دیواروں سے سر پٹک کر آنسو بہا رہی ہیں۔ اُن مصیبت زدہ کی مدد
وہین جی۔ آپ کا سہاگ بنا رہے۔" ہم نے اپنے چہرے پر دُکھ درد کے آثار نمایاں کر کے سسکنے لگے۔
"ٹھہریئے، میں ابھی آتی ہوں اور جو کچھ مجھ سے بن پڑے گا اُن دُکھی بہنوں کی مدد کروں گی۔" وہ
ی سے مڑی۔

ہم کھلے دروازے میں فرش پر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

"دیکھو دیدی، بے چارہ بیواؤں کے غم میں کس طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔"

وہ خوب صورت دوشیزہ کسی دوسری عورت کا ہاتھ پکڑے سامنے والے کمرہ سے نکلی۔

ان کے پاؤں میں نظریں گڑائے غم کی تصویر بنے تھے۔ بس دونوں اپنے پرس کھول کر ہماری جیبیں
وں سے بھر نے کو ہی تھیں ہم ان کو اور زیادہ رُلا کر بیواؤں کے نام پر زیادہ سے زیادہ رقم بٹورنے کے
ے دماغ میں ڈائیلاگ تلاش کر رہے تھے۔

"بہنوں۔۔۔۔۔۔۔" ہم نے دردانگیز آواز میں کہنا شروع کیا۔

"آپ یہاں۔۔۔۔۔ اس حال میں؟"

ہم چونک پڑے نظر اُٹھائی تو اس خوبصورت لڑکی کا ہاتھ تھامے اوشا ہمارے سامنے کھڑی تھی۔

"تم۔۔۔۔۔۔ اوشا تم یہاں؟"

ہم اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

"میں تو پہلی نظر میں ہی پہچان گئی تھی کہ یہ بھائی صاحب ہیں"۔ اوشا کی سہیلی بول رہی تھی۔ "مگر اس حالت
ں! دیکھو پاجامہ جگہ جگہ سے پیوند لگا ہے اور کوٹ سے کہنیاں جھانک رہی ہیں۔ کینوس کے بوٹ
شاید کسی کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا لائے گئے ہیں۔ اوشا دیدی تم تو کہتی تھی کہ ان کو کپڑے پہننے کا بے حد
سلیقہ ہے۔ بھئی اگر یہی سلیقہ ہے تو تو یہ بھلی ہے۔"

"میں پوچھتی ہوں آپ نے مجھے بے عزت کرانے کا یہ کون سا طریقہ نکالا ہے؟" اوشا کا خوبصورت
چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میری سہیلی ریتا کے گھر اس پھٹے حال میں چلے آئے
اور وہ بھی ودھوا آشرم کے لئے چندہ مانگنے، شرم نہ آئی آپ کو؟ کون سا ودھوا آشرم آپ نے کھول رکھا
ہے؟ ہے بھگوان! مجھے بھی اس میں پہنچا دو۔"

ہم کبھی اوشا کو اور کبھی اُس کی نئی سہیلی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمیں اوشا پر غصہ بھی آ رہا تھا
۔ نت نئی سہیلیاں بناتی رہتی ہے اور ان کے نام پتے بھی ہمیں نہیں بتاتی ورنہ یہ نوبت کیوں آتی۔ مگر ہم غصہ
نا کر بات کو اور بگاڑنا نہ چاہتے تھے۔

"بولئے چپ کیوں ہیں آپ؟" اوشا نے للکارا۔

اِدھر اُدھر کے کوارٹروں سے بھی کچھ عورتیں اکٹھا ہو گئیں تھیں اور ایک دوسرے سے پوچھ تاچھ کر رہی تھیں
ر جلدی ہی ساری بھیڑ اصلی ماجرہ جان کر اوشا اور ہماری جانب دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

"او شا! یہ تو میں اس کو اپریل فول بنانے چلا آیا تھا" ہم نے جلدی سے بات بنا دی۔ "تم نے کہا تھا کہ میری نئی سہیلی بڑی چالاک ہے سو میں نے ان کو اپریل فول بنانے کے لئے یہ بھیس ڈالا ہے!"

"بھائی صاحب، آج پہلی اپریل تو نہیں ہے۔ ہاں پھول ضرور سامنے ہے۔" اوشا کی سہیلی نے کہا۔

عورتوں کی ساری بھیڑ نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

اوشا سر پکڑ کر ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور ہم اُس کو سمجھانے کے لئے ترکیبیں سوچ رہے تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہماری عقل بھی چندہ مانگنے چلی گئی تھی، دور کہیں۔

یوسف یکتا

کنجم اُنڈو

(ذرا ٹھہرو)

آپا کھانا بنا رَیں کنجم اُنڈو
اماں گانا گا رَیں کنجم اُنڈو

اُنوں نکو بولے بھی تو لوگاں
پھولاں لاتے جارئیں کنجم اُنڈو

بڑے لوگاں بھی اب وٹامن آر(R)
ہلّو ہلّو ہی کھارئیں کنجم اُنڈو

اَنّا بڑے وزیر بنے جب سے
چھوٹے ناچ رہیں گا رئیں کنجم اُنڈو

غزلاں سننے [illegible]
لوگاں بیٹھے [illegible] کنجم اُنڈو

پچّوا

رخ زندگی کا اپنی پیچی میں موڑ دیو نگا
خاطر تمہاری روشن لیو دنیا کو چھوڑ دیو نگا
میں پوچھ روں محبت مجھ سے بھی ہے کی نئیں ہے
تم نئیں بولے تو دل کے دروازے توڑ دیو نگا

کامل حیدرآبادی

○

نظر برنی

چوّے

خطاب

"کچھ نہ کرنے" پہ ملا ان کو حکومت کا خطاب
ہم یہاں نوکِ قلم گھستے رہے مرتے رہے
سچ ہے اس دنیا میں وہ ہی لوگ ہیں کچھ کامیاب
جو سدا اربابِ طاقت کی چلم بھرتے رہے

پردہ

بھنورے نے گل کو پیار کیا مسکرا دیا
گلشن میں اپنے عشق کا سکہ جما دیا
نیلام کر کے چھوڑی محبت کی آبرو
تم نے تو دیکھ کر ہمیں پردہ گرا دیا

تیری رضا کیا ہے

دفاتر کے اناڑی ساتھیو، یہ غور سے سن لو
لیاقت میں رکھا کیا ہے دیانت میں دھرا کیا ہے
خوشامد تم کرو ایسی کہ ہر C.R. سے پہلے
خود افسر تم سے یہ پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

عقدِ ثانی

سنا ہے کریں گے وہ اب عقدِ ثانی
بڑھاپے میں بھی اُن پہ آئی جوانی
ارے شیخ صاحب یہ کیا کر رہے ہیں
ہے وہسکی نئی اور بوتل پُرانی

سوداگری

اس میں نہیں ہے دوستو تخصیص خاص و عام
مہمان کو بٹھاتے ہیں باعز و احترام
تحفے پہ ڈالتے ہیں تکلف سے وہ نظر
ہوتی ہے ان کے پیار میں سوداگری تمام

ڈھیٹ افسر

حالات لاکھ سخت ہوں افسر تو ڈھیٹ ہے
اس دورِ انحطاط کا انداز دیکھئے
رشوت وصول کر کے کہا اس نے کان میں
غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھئے



عمر حنیف
(کھانڈوا)

— "میں چاہتا ہوں کہ یوتھ کانگریس عوام کی آنکھ اور کان بن جائے۔" — یوتھ کانگریس کے صدر غلام نبی آزاد

— — جو لوگ اندھے اور بہرے ہیں وہ اب فکر نہ کریں انہیں اب بہت جلد نئی آنکھیں اور نئے کان لگنے والے ہیں۔

— "ایک چور نے ممبر آف پارلیمنٹ کا بریف کیس غائب کر دیا"

— — بریف کیس میں بے چارے کو سوائے "ادھورے دعووں" کے کیا ملا ہوگا۔

— "ملک میں اپوزیشن پارٹیوں کے متحد ہونے کا کوئی امکان نہیں۔"

— — متحد کر کے اور کرسیاں تڑوانی ہیں؟

— "کسانی تحریک (مہاراشٹرا) کے طویل مارچ کے روح رواں اپنے کارواں کو لے کر ابھی کچھ ہی قدم چلے تھے کہ ان کے پیروں میں چھالے آگئے۔ اب وہ آگے کا سفر جیپ میں بیٹھ کر کریں گے۔"

— — ہمیں تو پہلے ہی معلوم تھا کہ یہی ہوگا۔ اور اگر یہ نہ ہوتا تو دن میں تارے نظر آجاتے۔

— "دلہن سہاگ رات کی رات ہی میں ماں بن گئی۔"

— — کتنا خوش نصیب دلہا ہوگا۔ اس کو کہتے ہیں مقدر کا سکندر۔

— "بیوی کی ناک کاٹنے پر شوہر گرفتار۔"

— — بیویوں نے تو اکثر اپنے شوہروں کی ناکیں کٹوائی ہیں۔ ایک شوہر نے اپنی بیوی کی ناک کاٹ دی تو کیا ہوا۔؟

— "ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر انسانی حقوق سے متعلق پروگرام نشر کئے جائیں گے۔" — پاکستانی فوجی حکومت کا ایک اعلان۔

— — لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ کوئی اپنا حق مانگنے کیلئے سامنے آجائے۔

— "اگر اندرا گاندھی کی حکومت گئی تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ملک بھی گیا۔" — شری وسنت ساٹھے۔

— — ملک تو نہیں جائے گا ہاں آپ ضرور چلے جائیں گے۔

— "بس ریل سے ٹکرا گئی۔"

— — آگے چل کر بس سے ہوائی جہاز ٹکرائیں گے۔

— "میں نہیں بتا سکتا کہ اندرا سرکار کب تک چلے گی۔"
— شری چندر شیکھر

— — تعجب ہے، اتنے بڑے نجومی مرار جی دیسائی کی پیشن گوئی آپ نے نہیں سنی۔

خرافات

(مراسلے)

گرامی قدر۔ واجبات

"شگوفہ" کا "کنہیا لال کپور نمبر" باصرہ نواز ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ نہ معلوم آپ کیا سمجھیں گے کہ مدت کے بعد مجھے ہندوستان میں ایک بہت دلکش صوری، معنوی دونوں لحاظ سے ایک اردو رسالہ دیکھنے میں آیا۔ میں پچھلے دنوں پاکستان گیا تھا۔ وہاں پر البتہ چند نہایت دیدہ زیب جریدے دیکھنے کو ملے۔ لیکن آپ کا رسالہ بھی یقینی طور پر ان سے بہتر نہیں تو ہم پلّہ ضرور ہے اور چند ایک پہلوؤں سے اُن سے آگے۔ کیونکہ اگر کسی اردو کے طالب علم کو — کنہیا لال کپور پر تحقیق کرنا ہے جس کا اشارہ آپ نے اپنے اداریئے میں دیا ہے تو یقینی طور پر اسے زیادہ دور تک فاصلہ طے کرنے کی ضرورت نہیں۔ مبارک۔

رام پال، جالندھر۔

مکرمی کمال صاحب!

سلام مسنون۔ بھئی واقعی آپ کمال کے آدمی ہیں — مستقل مزاجی کو آپ کے ہم معنے پایا ہے۔ کبھی خط کے جواب سے بہرہ اندوز ہونے کا موقعہ نہ دے کر آپ نے اپنی شخصیت کے پَرتو کو خوب سنبھال رکھا ہے۔ اس مستحکم دلی اور مستقیم نفسی کے جس قدر صدقے جایئے، کم ہے۔ اگر اس سب کچھ کے پیچھے "شگوفہ" نکالنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو وقت آپ کو فرعون کہتا مگر "شگوفہ" اور پھر کنہیا لال کپور نمبر، سارے دِلدّر دھو دینے کو کافی ہے۔ کنہیا لال کپور، ہمارے کانوں میں سرگوشیاں کرکے ہمیں بولنا سکھانے والے اور اُنگلی تھام کر رستہ دکھانے والے تھے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ موجودہ نسل کے سرکردہ مزاح نگاروں پر کنہیالال کپور کے فن کا عکس ہے۔ طارق بشیر خاں، ریاض

"کپور نمبر" تمہاری محنت اور تمہارے سلیقے کا آئینہ ہے۔ بہت بہت مبارکباد۔ اتنی مہنگائی میں اتنی کم قیمت پر اتنا ضخیم نمبر!

مہمل، بمبئی۔

محترمی۔ تسلیمات۔

شگوفہ کا کنہیالال کپور نمبر دیکھا۔ چھپا چھپا کر پڑھ رہا ہوں تاکہ زیادہ دن تک پڑھ سکوں اور دوستوں کی نظروں سے محفوظ رکھ سکوں۔ اتنا شاندار ہے کہ یار لوگ نظریں لگائے بیٹھے ہیں اُچک لے جانے کو۔ شاندار نمبر جو واقعی کنہیالال کپور کی ادبی شخصیت کے شایان شان ہے، اچھے ادب کی آن بان ہے۔ اس کارنامے پر جو آپ کو مبارکباد نہ دے وہ بے ایمان ہے۔ اس لیئے مبارکباد قبول فرمایئے۔

رحمت اللہ خاں، اکولہ

شگوفہ جیسے ایک معیاری جریدے کی اشاعت کے لئے آپ کو مبارکباد۔ — نیازمند

وامن راؤ جاگیردار سوناپیٹ

بھائی کمال! آپ نے تو واقعی کمال کر دیا۔ خوبصورت سرورق شاندار طباعت و کتابت بہترین اور معیاری مضامین کا انتخاب اور اس پر قیمت اتنی کم یہ فن تو کوئی آپ سے سیکھے۔ بہرحال ایک بار پھر مبارک باد۔ کپور نمبر دیکھ کر دل "گارڈن گارڈن" ہوگیا۔

یوسف کھتری، بمبئی۔

حیدرآباد سے نکلنے والے جریدوں میں "شگوفہ" لاجواب ہے کنہیالال کپور نمبر کی مثال تو ہندوستان بھر میں نہیں مل سکتی۔ دیدہ زیب ٹائیٹل کور اور بھرپور مواد۔ دعا ہے کہ "شگوفہ" ترقی ہی ترقی کرتا جائے۔

محمد شریف حیدرآباد

منفرد رسالہ ماہنامہ "شگوفہ" کا مطالعہ برسوں سے کر رہا ہوں لیکن کبھی خط نہ لکھ سکا۔ نمبر نکالنے میں تو آپ کا جواب نہیں۔ پئے در پئے خاص نمبر سالنامہ وغیرہ وہ بھی سستے داموں میں — معیاری مضامین اور انوکھے دلچسپ انشایئے پڑھ کر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

عبدالشکور حیدرآباد

R. No. 822/68
SHUGOOFA
Postal Regd. No. H.HD-6
Vol. 14 Copy 3
31 Bachelor Quarters M J. Market, Hyderabad-1
March 1981 Phone : 57716



زندہ دلانِ حیدرآباد، ۱۴ویں سالانہ تقاریب

شگوفہ

جلد: ۱۴
شمارہ: ۴

اپریل ۱۹۸۱ء

سوونیر

ایڈیٹر:
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

کنوینر سوونیر: سمیع جلیل
★ ٹائیٹل:
طالب خوندمیری

مجلسِ مشاورت
راجندر سنگھ بیدی
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
بھارت چند کھنہ
مجتبیٰ حسین

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
بائنڈنگ، محترمہ بک بائنڈنگ ورکس، پرانی حویلی، حیدرآباد

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۲۱-مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد فون: 57716

اس شمارے کی قیمت: تین روپے (Rs. 3/=)

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مجتبیٰ نامہ

بال مفت (انشائیے)

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

نہیں آتی تو یاد ... (یادِ رفتگان)

بال کی کھال (تبصرہ)

★

چوٹ (نظمیں)

زندہ دلانِ حیدرآباد

چودھویں سالانہ تقاریب

صدر استقبالیہ : جناب ایم۔ بالیا صدرنشین حدا

مجلس عاملہ زندہ دلانِ حیدرآباد

- جناب بھارت چند کھنہ صدر
- جناب رشید قریشی نائب صدر
- جناب طالب خوندمیری معتمد عمومی
- جناب مسیح انجم شریک معتمد
- جناب بوگس حیدرآبادی شریک معتمد
- جناب رشید سمیع جلیل خازن
- جناب مصطفےٰ علی بیگ رکن
- محترمہ ڈاکٹر حبیب ضیاء رکن
- جناب سید مصطفےٰ کمال رکن
- جناب اسلم فرشوری رکن
- جناب یوسف شریف رکن

کنوینرس

- محترمہ بشیر جعفری۔ شعبۂ خواتین
- جناب رشید سمیع جلیل۔ سوونیر
- جناب مسیح انجم۔ ادبی اجلاس
- جناب اسلم فرشوری۔ محفل لطیفہ
- جناب طالب خوندمیری۔ مشاعرہ
- جناب سعادت علی خان۔ ڈرامہ

- جناب وہاب قیصر۔ نشرواشاعت
- جناب محمد سلیمان۔ بکنگ
- جناب قمرالدین احمد خان۔ انتظامات
- جناب سید برہان حسین۔ رابطہ
- جناب مرزا لفتی علی بیگ۔ بک اسٹال
- جناب بوگس حیدرآبادی۔ طباعت

رسم اجراء "فکر تونسوی شخصیت اور طنز نگاری"
مصنف :- بوگس حیدرآبادی

۹ اپریل ۱۹۸۱ء ۵½ بجے شام۔ نمائش میدان

صدارت : جناب مجتبیٰ حسین

مہمانِ خصوصی : جناب بی۔ جیاسینا۔ رکن نمائش سوسائٹی

رسم اجرا بدست : جناب بھارت چند کھنہ صدر زندہ دلان

مقررین : • ڈاکٹر حسینی شاہد • جناب ایم۔ راج گوپال • جناب پی گنگا ریڈی

مضمون نگار : • ڈاکٹر مجاور حسین رضوی • ڈاکٹر یوسف سرمست • جناب صلح الدین سعدی • جناب احمد جلیس

نثری خاکہ : • جناب پرویز یداللہ مہدی

منظوم خاکہ : • جناب رشید سمیع جلیل

ادبی اجلاس

۱۰ اپریل ۸۱ء ۔ ۵½ بجے شام ۔ نمائش کلب

افتتاح: جناب ایم۔ باگا ریڈی عزت مآب منسٹر بڑی صنعتیں
صدارت: جناب رشید قریشی
مہمان خصوصی: جناب نریندر لوتھر ۔ آئی۔اے۔ایس
مضمون نگار: ۔ جناب بھارت چند کھنہ ۔ جناب مجتبیٰ حسین
۔ جناب خواجہ عبدالغفور ۔ جناب پرویز یداللہ مہدی
۔ محترمہ ڈاکٹر حبیب ضیاء ۔ جناب سید برہان حسین
۔ جناب احمد جلیس ۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان
کنوینر: ۔ مسیح انجم

محفل لطیفہ

۱۱ اپریل ۸۱ء ۔ ۱۰½ بجے صبح ۔ نمائش کلب

صدارت: جناب پی گنگا ریڈی ایم۔ایل۔اے
مہمان خصوصی: جناب اے رنگاراؤ ۔ رکن نمائش سوسائٹی
لطیفہ گو: ۔ جناب رشید قریشی ۔ جناب مجتبیٰ حسین
۔ جناب نریندر لوتھر ۔ جناب حمایت اللہ ۔ جناب اطہر افسر
۔ جناب طالب خوندمیری ۔ محترمہ شاہدہ جلیل ۔ جناب کلیم صدیقی
۔ جناب دولت رام ۔ جناب مصطفیٰ علی بیگ ۔ جناب بوگس حیدرآبادی ۔ جناب حفیظ خاں مذاق ۔ جناب منصور علی مختصر ۔ جناب خیرات ندیم ۔ جناب مسیح انجم ۔ جناب مرکن پرشاد ۔ جناب بالا پرشاد گوڑ ۔ محترمہ افشاں تہین
کنوینر: ۔ اسلم فرشوری

کل ہند مزاحیہ مشاعرہ:۔

۱۱ اپریل ۸۱ء ۔ ۸½ بجے شب ۔ نمائش میدان

افتتاح: جناب کے۔ پربھاکر ریڈی عزت مآب وزیر داخلہ
صدارت: جناب تجمل حسین تہذیبی سفیر
مہمان خصوصی: جناب ٹی۔ انجیا عزت مآب وزیر اعلیٰ حکومت آندھرا پردیش

مہمان شعراء

۔ جناب نریندر لوتھر ۔ جناب شمسی مینائی (لکھنؤ)
۔ جناب مقرب حسین (بھوپال) ۔ جناب باسط نوشہ (بنگلور)
۔ جناب اسمٰعیل آذر (اڑیسہ) ۔ جناب مختار یوسفی (مالیگاؤں)
۔ جناب خواہ مخواہ (بمبئی) ۔ جناب عظمت بھلاواں (مہاراشٹر)
۔ جناب امام رائچوری (کرناٹک) ۔ جناب پاگل عادل آبادی
۔ جناب انجم فریدی (عادل آباد) ۔ جناب شمشیر کوڑنگلی
۔ جناب فتح ایوت محلی (برار) ۔ جناب بے دھڑک مدراسی

میزبان شعراء

۔ جناب علی صائب میاں ۔ جناب حمایت اللہ
۔ جناب سرپٹ حیدرآبادی ۔ جناب اسمٰعیل ظریف
۔ جناب قادر حیدرآبادی ۔ جناب طالب خوندمیری ۔ جناب کلیم میکا
۔ جناب مصطفیٰ علی بیگ ۔ جناب بوگس حیدرآبادی
۔ جناب رشید شیخ جلیل ۔ جناب صبغت اللہ بھیا ۔
۔ جناب اشرف خوندمیری ۔ جناب حفیظ خاں مذاق ۔
۔ جناب محمود نشتر ۔ جناب اُن پڑھ بھونگیری
۔ جناب منور علی مختصر ۔ جناب احمد سلطان ۔ جناب محمد علی منگلی ۔
کنوینر: ۔ طالب خوندمیری

زندہ دلانِ حیدرآباد

کو

چودھویں سالانہ تقاریب پر

مُبارکباد ـــــ

○ ہندالکٹرانکس ○


آپ بھی
انسانی بادپیما بن سکتے ہیں
STORMY · AV RAIN · RAIN CHANGE · GOOD WHE · FAIR · VERY ORDI
اور اپنے درد و تکلیف کے ذریعہ
آندھی اور طوفان کی پیش قیاسی کر سکتے ہیں!
حالیہ طبی تحقیقات سے اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ فضائی دباؤ
کا تغیر و تبدیل انسانی شریانوں میں موجود پانی کی مقدار پر اثر انداز ہوتا
ہے۔ جب دباؤ میں کمی آجاتی ہے جیسا کہ طوفان سے قبل ہوا کرتا ہے
تو پانی کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً شریانیں سوج جاتی
ہیں جس کی بنا پر جوڑوں میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے
اگر آپ سوزش شرائین میں مبتلا ہو جائیں تو آپ خود اس کا تجربہ
کر سکتے ہیں! چاہے یہ درد کیسا ہی ہو زندہ بام اسکو رفع کرنے
میں مدد دیتا ہے۔ یہ اس لیئے اچھا ہے کہ اسکو سوزش شرائین کے شدید درد
کے ازالہ کے لیئے ہی تیار کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ یہ دردسر، جسمانی درد و اعصابی
درد، نزلہ، زکام، کھانسی اور اسی قبیل کے امراض کے لیے بھی مفید ہے
اور کیا چاہیئے! چونکہ آپ زندہ بام صرف بیرونی طور پر استعمال کرتے ہیں اسلئے
آپ ترشہ کی بنیاد پر قائم آپ کے خون کے توازن میں بگاڑ پیدا کرنے کا خطرہ
نہیں مول سکتے ہیں!
اس پر غور کیجئے!
ZINDA BALM
زندہ بام
درد کا محفوظ و موثر
نجات دہندہ
کارخانہ زندہ طلسمات
منبر پیٹ - حیدرآباد ۵۰۰۰۱۳
JKIT/1129

یہ خاکہ نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے اعزاز میں اُن کی کتا
"آدمی نامہ" کی اشاعت پر زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیر اہتمام منع
تہنیتی تقریب میں پڑھا گیا۔

مسیح انجم

مجتبیٰ حسین کی کہانی

کچھ میری

اور کچھ طالب علم کی زبانی

آج سے کوئی چھ، سات برس پہلے میں نے مجتبیٰ حسین پر خاکہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "کالا بچھو" خاکہ بے حد پسند کیا گیا تھا۔ لیکن مجتبیٰ حسین کو عنوان پسند نہیں آیا تھا۔ میں کئی دن تک منھ چھپاتا پھرتا رہا۔ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ اردو کے کسی ادیب یا شاعر کے بارے میں اس کی زندگی میں اُس کا خاکہ نہیں لکھنا چاہیے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ زندہ شاعر اور ادیب کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھنا چاہیے کیونکہ اُردو کا ہر شاعر اور ادیب اپنے آپ کو "عظیم" سے کم تو سمجھتا ہی نہیں ممتاز مزاح نگار یوسف ناظم نے اپنے ایک مضمون میں کہیں لکھا ہے کہ "اُردو میں آج تک کوئی چھوٹا شاعر پیدا نہیں ہوا۔" جب صورت حال ایسی ہو تو خاکہ نگاری سے بچنا ضروری ہو جاتا ہے مگر مجبوری کیا کچھ نہیں کرواتی۔

یہاں میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ یہ خاکہ مجتبیٰ حسین پر لکھے ہوئے میرے پہلے خاکے کا دوسرا ایڈیشن نہیں ہے کیونکہ مجتبیٰ پر لکھنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا ہے اور قریب سے ہی اتنا کہ میں ان پر آسانی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے مقالہ لکھ سکتا ہوں مگر مجبوری یہ ہے کہ میں ایم۔ اے نہیں ہوں آپ تو جانتے ہی ہیں کہ پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے لیے ایک آدمی کا ایم۔ اے ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگر کوئی صاحب مجتبیٰ حسین پر ریسرچ کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری لینا چاہیں تو ان کے لیے اس ناچیز بندے کی خدمات حاضر ہیں۔ ؏

کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

مجتبیٰ حسین میری سب سے بڑی کمزوری ہیں۔ وہ میرے عزیز ترین دوست ہیں وہ جس محبت سے میرے ساتھ پیش آتے ہیں، اس کی بنیاد پر، میں انھیں اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں۔ حالانکہ عمر میں، میں اُن سے تین سال بڑا ہوں۔ (کم از کم عمر میں تو ان سے بڑا ہوں) میں انھیں عقیدت کی حد تک چاہتا ہوں۔ فن، سادگی اور عجز و انکسار مجھے کسی ادیب شاعر میں یکجا نظر آتے ہیں تو میں اس کی بڑی عزت کرنے لگ جاتا ہوں۔ یہ میری مجبوری نہیں ہے بلکہ میرے بزرگوں نے

مجھے یہی سکھایا ہے اور کتابوں میں یہی پڑھا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی شخصیت میں یہ تینوں چیزیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ چنانچہ مجتبیٰ حسین سے میری محبت کو دیکھ کر میرے دوست مصطفیٰ کمال نے ایک ریمارک کیا تھا "مسیح انجم اپنی بیوی کو چھوڑ سکتے ہیں لیکن مجتبیٰ حسین کی دوستی نہیں چھوڑ سکتے"۔ شکر ہے کہ یہ بات میری بیوی تک نہیں پہنچی۔ ورنہ ازدواجی تعلقات میں بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔

یہ جو مجتبیٰ حسین، شہ نشین پر تشریف فرما ہیں، کئی کمزوریوں کا مجموعہ ہیں۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری شہر حیدرآباد ہے۔ جانے کو تو مجتبیٰ حسین دہلی چلے گئے ہیں۔ لیکن ان کا دل یہیں کہیں اٹکا ہوا ہے۔ وہ اپنے ہر خط میں یہاں کے ادیبوں اور شاعروں اور شہر کے مختلف ہنگاموں کے بارے میں دریافت کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ اپنے دشمنوں کا تک ذکر کچھ ایسے دلنشین انداز میں کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ اُن سے دشمنی مول لینے کو جی چاہتا ہے۔ میں ان کے بعض خطوط کا جواب گول کر جاتا ہوں۔ آخر میں کتنے خطوں کا جواب دوں؟ پیشے کے لحاظ سے ٹیچر ہوں اس لیے بعض خطوں کا جواب دے دیتا ہوں۔ اُردو میں مضامین لکھ کر گزارہ کرنا میرا پیشہ ہوتا تو ان کے ایک خط کا بھی جواب نہ دے پاتا۔ اب کی بار حیدرآباد آنے سے پہلے مجتبیٰ حسین نے اپنی آمد کے بارے میں خط لکھا تھا۔ اس میں ایک جملہ یہ بھی تھا کہ "حیدرآباد میری طاقت ہے!" میں حیران رہ جاتا ہوں کہ آخر وہ طاقت کہاں ہے اور کس طرح ملتی ہے؟ کہیں یہ طاقت وہ دعوتیں تو نہیں جو انھیں دی جاتی ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ان کے دشمن بھی ان کی ضیافتیں کرنے سے باز نہیں آتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے موہنی چہرے پر رقص کرنے والا "کالا جادو" ہی دشمنوں سے یہ تمام چیزیں کرواتا ہے۔

حیدرآباد کے بعض ادیبوں کا خیال ہے کہ دہلی جانے کے بعد مجتبیٰ حسین بڑی اچھی زبان لکھنے لگے ہیں۔ اس بیان سے میرا متفق ہونا کوئی ضروری نہیں۔ میں ابتدا ہی سے ان کے طرزِ نگارش اور شستہ زبان کا معترف رہا ہوں۔ میرے اس بیان کی تصدیق کے لیے اس دور کے معتبر نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کی وہ رائے کافی ہوگی جو انھوں نے مجتبیٰ حسین کی پہلی کتاب "تکلف برطرف" کے بارے میں دی تھی ——

" ایسا لطیف مزاح اور ایسی شستہ زبان اردو میں آج شاذ ہی کسی کو نصیب ہو۔" اب اس سے بڑی سند اور کیا چاہیے۔

اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ مجتبیٰ حسین نے دہلی جا کر کیا کمال حاصل کیا؟ تو میرا جواب ہوگا کہ مجتبیٰ حسین نے صرف مشاعروں میں داد دینے اور مصرعہ اٹھانے کے فن میں کمال حاصل کیا ہے۔ اب تو ان کی داد شاعروں کے لیے "سند" کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جن دنوں مجتبیٰ حسین حیدرآباد میں تھے وہ داد دینے اور مصرعے کو اٹھانے کے رموز سے واقف نہیں تھے۔ واقف تو تھے۔ لیکن مصرعے کو اٹھانے کے بجائے شاعر کو مشاعرے سے اٹھا دیتے اور کہتے "چلو! بہت ہوا! ہوٹل میں کھانا کھلاؤ، اور چائے پلاؤ۔ آخر مصرعہ اٹھانے کے لیے پیٹ میں کچھ ہونا بھی تو چاہیے!"

دہلی جانے کے بعد مجتبیٰ حسین نے "آئینہ" کو "شیشہ" اور "موز" کو "کیلا" کہنا شروع کیا ہے۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ جب تک وہ دہلی میں رہیں ضرور کہیں۔ لیکن حیدرآباد آتے وقت تو کم از کم "شیشہ" اور "کیلا" وہیں چھوڑ آئیں۔ یہ بات

یاد نہیں رہتی۔ جس کے نتیجہ میں وہ عجیب و غریب mutations پیدا کر لیتے ہیں۔ پرسوں ہی کی بات ہے۔ وہ اپنے چچا بھائی کے گھر میں بیٹھے شیو کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انھیں آئینہ کی ضرورت تھی۔ جھٹ اپنی بھتیجی سے پوچھا "شیشہ ہے؟" وہ حیرت سے مجتبیٰ کا منہ تکنے لگی۔ گویا پوچھ رہی ہو "کونسا شیشہ؟" اس سے پہلے کہ میں "شیشہ" کا آسان اردو اردو میں کرتا، مجتبیٰ کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ جھینپ سے گئے کہ میں نے خواہ مخواہ حیدرآباد کی ایک ننھی منی جان پر "دہلی" کو مسلط کر دیا۔ میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ مجتبیٰ نے جب "آئینہ" کہا تو لڑکی کی جان میں جان آئی اور اس نے شیشہ کی نشاندہی کر دی۔

قواعدِ اردو میں علامتِ فاعل "نے" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ "نے" اردو تحریر میں تو بڑی نزاکت پیدا کرتا ہے مگر بول چال میں بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس "نے" کی وجہ سے گفتگو کا سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی "نے" نے "شمالی اردو والے" اور جنوب کے اردو والے جیسی اصطلاحوں کو جنم دیا ہے۔ دہلی جانے کے بعد مجتبیٰ حسین کو اسی "نے" سے نمٹنا پڑا چنانچہ اب وہ بہت زیادہ "نے" بولنے لگے ہیں۔ مجھ سے بات کرتے وقت اسی "نے" سے اپنی دھونس جمانے لگتے ہیں۔

حیدرآباد سے دہلی کو منتقل ہونے کے بعد مجتبیٰ حسین نے پہلا خط مجھے ہی لکھا تھا۔ اس خط میں ایک جملہ یہ تھا "میں ذرا پھیلنا چاہتا ہوں! جب میں ذرا پھیل جاؤں گا تو سکڑ کر اپنے مرکز کی طرف واپس آجاؤں گا۔"

اُدھر مجتبیٰ حسین "پھیلنے" کے لیے دہلی چلے گئے تو ادھر اردو والوں نے ان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر ا ایک مضمون "ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے ڈاکٹروں کے!" انٹرمیڈیٹ کی اردو ٹیکسٹ بک میں شامل کر دیا۔ اگر اردو والوں سے بہت پہلے ہی سرزد ہو جاتی تو مجتبیٰ حسین دہلی جانے کی غلطی کیوں کرتے؟ یہیں مضامین لکھ لکھ کر رائلٹی وصول کرتے۔ اردو وا کسی ادیب کے غیاب میں فائدہ اٹھانے کے ہنر کو خوب جانتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ مجتبیٰ کے مضمون کی شمو پر ہم کو جو خوشی ہونی تھی سو ہوئی۔ لیکن اس خوشی پر گھڑوں پانی اس وقت پڑ گیا، جب ہمارے کالج کے ایک طالب علم نے خواہش کی کہ ہم مجتبیٰ حسین کے اس مضمون کو پڑھیں، سمجھائیں اور پھر سوالات کے جوابات بھی لکھائیں۔ ہم نے طالب کو سمجھانے کی بہت کوشش کی اور یہ عذر بھی پیش کیا کہ "میاں! ہم تو زبانِ دوم تلگو پڑھانے کے لیے مقرر کئے گئے ہیں۔ ا اردو میں ہمارا امتحان لینا کچھ مناسب نہیں۔ اگر ہم اردو سمجھانے بیٹھ جائیں تو کچھ کا کچھ ہو جائے گا۔ اور جوابات میں مزاح کے جراثیم چور دروازے سے در آئیں گے۔ اور تم نہیں جانتے ممتحنوں کو مزاح سے کتنی چڑ ہوتی ہے اور وہ کتنے نک چڑھے ہیں۔ کیونکہ ایک تو وہ گائیڈوں کی مدد سے اسباق پڑھاتے ہیں اور دوسرے، Key کی مدد سے پرچے جانچتے ہیں۔ اگر تمہارا اصرار ہے تو کھولیے کتاب اور بسم اللہ شروع ہو جائیے لیکن یاد رہے کہ کامیابی کی گیارنٹی نہیں دی جائے گی!"

اس معقول عذر پر بھی اس نامعقول طالب علم سے چپ نہ رہا گیا اور فوراً پہلا سوال داغ بیٹھا۔

"آپ مجتبیٰ حسین کو کب سے جانتے ہیں؟"

اس سوال کا جواب دینے کے بجائے جواباً ہم نے خود ایک سوال اس لڑکے سے پوچھا ــــــ "کیا تم مجتبیٰ حسین کا صحیح صحیح لکھ کر بتا سکتے ہو۔ کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ آج کی اردو نسل ان کا نام صحیح نہیں لکھ سکتی!"

وہ اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے جھٹ بولا ــــــ "یہ تو بڑا آسان سوال ہے! میں ابھی ان کے نام کی

spelling کیسے دیتا ہوں ـــــ میم جیم پیش "مُج" تے زبر "تا" "مُجتا" بے زیر "با" "مُج تبا"

ہم نے اردو اور مجتبیٰ حسین کے نام کی مٹی پلید ہوتے دیکھ کر ایک آہ سرد بھری "آہ! مجتبیٰ آپ کا دعویٰ صحیح ہے! ہم بھی مان گئے!"

پھر ہم نے اس لڑکے سے اگلا سوال پوچھنے کے لیے کہا۔ وہ بولا "آپ نے میرے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا!"

ہم نے کہا "پہلا سوال بہت ہی personal قسم کا ہوگیا ہے۔ بچوں کو چاہیے کہ وہ بڑوں کے شخصی معاملات میں دخل نہ دیں!" تب اس نے دوسرا سوال پوچھا "مجتبیٰ حسین کے حالات زندگی کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتائیے کیونکہ امتحان میں حالات زندگی ذرا تفصیل سے پوچھے جاتے ہیں اور اس سوال کے نمبرات بھی زیادہ مقرر کیے جاتے ہیں!"

اس آسان سوال پر خوش ہوتے ہوئے ہم نے کہا "مجتبیٰ حسین کے حالات زندگی کے بارے میں ذرا کیا بہت ہی تفصیل سے بتاؤں گا۔ لیکن تفصیلات جمع کرنے والے کبھی کسی ادیب یا شاعر کے حالات زندگی کو سمجھنے اور حل کرنے کی جانب توجہ نہیں دیتے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اردو کے نصاب میں صرف مردہ ادیبوں اور شاعروں کو جگہ دی جاتی ہے۔

خیر سنو! ـــــ مجتبیٰ حسین کے آبا و اجداد ایران کے رہنے والے تھے اور درہ خیبر کے راستے سے ہندوستان آئے تھے۔ ان دنوں پاسپورٹ اور ویزا کی کوئی قید نہیں تھی۔ جہاں جی چاہا چلے جائیے۔ اور وہیں کے ہو رہیے۔ چنانچہ مجتبیٰ حسین کے آبا و اجداد ہندوستان آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ مجتبیٰ حسین کے پیدا ہونے کے بعد ہندوستان میں راشننگ نافذ ہوگئی۔ چنانچہ انھوں نے اسی درۂ خیبر سے واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن ان کے ارادہ کرنے اور دوستوں سے سامانِ سفر مانگنے تک بہت دیر ہوگئی اور درۂ خیبر کہیں اور چلا گیا۔ لہٰذا وہ انتقاماً مزاح نگار بن گئے۔ قدرت کو یہی منظور تھا کہ اردو کا یہ مقبول اور منفرد مزاح نگار ہندوستان ہی میں رہے۔ چونکہ مجتبیٰ حسین نے ارادہ کرنے میں بڑی دیر کی تھی، اس لیے انھوں نے اس کی تلافی کے لیے "عجلت" کو اپنا شعار بنا لیا۔ اب وہ ہمیشہ عجلت میں رہتے ہیں۔ اسی عجلت میں ان کی شادی ہوئی ـــــ اسی عجلت میں انھوں نے بچے پیدا کیے ـــــ اسی عجلت میں انھوں نے مزاح نگاری کا آغاز کیا۔ اسی عجلت میں انھوں نے دھڑا دھڑ مزاحیہ مضامین لکھے۔ اسی عجلت میں ان کی کتابیں چھپیں۔ اسی عجلت میں وہ مشہور مزاح نگار بن گئے۔ اسی عجلت میں وہ دہلی منتقل ہوگئے اور اسی عجلت میں وہ دہلی جیسے بڑے شہر میں افواہ کی طرح پھیل گئے۔ اب خارجاً مسموع ہوا ہے کہ وہ پھر دہلی سے جاپان کو پرواز کرنے کے ارادے سے اپنے پر تول رہے ہیں۔ اس کے باوجود وہ خطوں میں لکھتے ہیں کہ "عجلت" نے مجھے کچھ نہیں دیا ـــ آخر مبالغہ کی بھی ایک حد ہوتی ہے!"

جب طالب علم نے عجلت کے بارے میں اتنے سارے فائدے سنے تو اس نے بھی عجلت میں ایک اور سوال پوچھا۔ "مجتبیٰ حسین کے حلیہ کے بارے میں تفصیل سے بتائیے۔ کیونکہ حلیہ کی تفصیل کتاب میں درج نہیں ہے!"

لڑکے نے چونکہ ہماری اپنی پسند کا سوال کیا تھا، اس لیے جواب بھی تفصیل سے دینا پڑا۔

"مجتبیٰ حسین کے حلیہ کو بیان کرنا، قلم کو ایک بہت بڑی زحمت دینا ـــــ اور فرہنگ آصفیہ کے جدید ایڈیشنوں کے الفاظ و محاورات کو ضائع کرنا ہے۔ ان کے چہرے کو سمجھنے کے لیے "طوطا پری آم" کو دیکھنا نہایت ضروری ہے ورنہ چہرہ سمجھ میں نہ آئے گا۔ ناک معقول سی ہے۔ ہونٹ پتلے پتلے ـــــ لیکن یہ ہونٹ ـــــ ناک اور ٹھوڑی سے ٹھیک ٹھیک زاویہ قائمہ بناتے ہیں

نوے ڈگری پر تقسیم نہیں ہوتے نچلا ہونٹ، اوپری ہونٹ کو پکڑنے کی علت میں کسی قدر سیدھی جانب ٹیڑھا ہوگیا ہے۔ ان کا چہرہ SCREEN FACE کی تعریف میں آتا ہے۔ تصویر بڑی خوب صورت چھپتی ہے پتہ نہیں فلم انڈسٹری میں کیوں نہیں گئے۔ شاید انھیں اس بات کا اندازہ ہو کہ فلم کی ہیروئن انھیں دیکھتے ہی فلم میں کام کرنا چھوڑ دے گی۔ ان کو ہمارا یہ مشورہ ہے کہ وہ اپنی تصویر چھپوانے سے پرہیز کریں۔ سیدھا پاؤں کسی قدر پھینک کر چلتے ہیں۔ آخر پھینکنے کو بھی تو کوئی چیز چاہیے ناں! بائیں ہاتھ کو کھیکڑے کے پیر کی طرح کسی قدر اکڑائے رکھتے ہیں۔ اور لکھتے وقت کاغذ کو بالکل اسی طرح پکڑتے ہیں جس طرح کھیکڑا اپنی غذا کو پکڑتا ہے۔ چند دن پہلے خبر ملی تھی کہ ان کو اسکوٹر کا حادثہ پیش آیا ہے۔ ہمارے دل نے پکارا "ہائے مجتبیٰ! آپ کا رہا سہا حلیہ بھی بگڑ گیا!" بڑا دکھ ہوا۔ ہم نے ان کی صحت کے لیے دعائیں مانگیں اور کیا ـــــ کیا، یہ نہیں بتائیں گے۔ اس حادثہ کے فوری دو تین دن بعد "سیاست" میں ان کی تصویر چھپی تھی۔ ہم نے بڑے غور سے دیکھا تھا۔ ان کا پچکا ہوا بایاں گال کسی قدر پھولا ہوا نظر آیا۔ ہمیں یوں لگا جیسے کوئی بگل ماسٹر ـــــ بگل بجانے کی تیاری میں اپنا بایاں گال پھلایا ہوا ہو۔ ان کو چاہیے تھا کہ وہ اسکوٹر کو گرا دیتے حیرت ہے کہ اسکوٹر نے ان کو گرا دیا۔ کسی زمانے میں گھوڑے اور گھوڑیاں اپنے سوار کو گرا دیا کرتے تھے۔ اب یہ اسکوٹر بھی اپنے سواروں کو کیوں گرانے لگی ہیں، اسکوٹر سوار ہی جانیں۔ ہم سیکل سواروں کو اسکوٹر سواروں کا حال کیا معلوم؟

حادثے کے بعد جب پہلی بار مجتبیٰ حسین حیدرآباد آئے تو ہم ان سے ملنے گئے۔ گھبرا رہے تھے کہ انھیں دیکھتے ہی ہمارا دل پھٹ پڑے گا۔ لیکن موصوف نے ہنس ہنس کر اسکوٹر کے حادثے کی ساری تفصیلات یوں بیان کیں جیسے وہ اپنے مضمون کی جزئیات نگاری کر رہے ہوں۔ اپنے گرنے کا اسٹائل بتایا اور یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر نے ان کے گرنے کے اسٹائل کی کتنی تعریف کی تھی۔ کیونکہ بقول مجتبیٰ حسین، اس قسم کے اسٹائل میں صرف ایک فیصد آدمی ہی بچتے ہیں اور اس ایک فیصد کی تعریف میں موصوف آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک منفرد اسٹائل ہی تھا جہاں موت کو شرمندگی اٹھانی پڑی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے!

جب طالب علم نے مجتبیٰ حسین کے بارے میں اتنی ساری تفصیلات جان لیں تو ٹکسٹ بک میں دیے گئے "ڈاکٹروں والے مضمون" میں سے ایک جملے کی تشریح چاہی ـــــ "ڈاکٹر صاحب! مجھے بیماری نہیں "باری" ہوگئی ہے!"

چونکہ طالب علم اس جملے کے لطیف طنز کو سمجھ نہیں پا رہا تھا، ہم نے اس کی ذہنی صلاحیت کے مطابق اس کو یوں سمجھایا "برخوردار امتحان میں تم اس جملے کی تشریح اس طرح بھی کر سکتے ہو۔ ممتحن تو جواب پڑھنے سے رہے۔ ان کے لیے صرف صفحات کالے کرنا کافی ہوگا۔ جدید سائنس نے اب تک جتنے امراض دریافت کیے ہیں اس فہرست میں مرض "باری" کا کہیں ذکر نہیں۔ کتابت کی غلطی کی وجہ سے مرض "بادی" کے بجائے "باری" چھپ گیا ہے۔ دراصل مجتبیٰ حسین کو "باری" نہیں ـــــ "بادی" ہوگئی تھی۔ دوسرے ایڈیشن میں اس کی اصلاح کر لی جائے!"

طالب علم نے اس تشریح سے مطمئن ہو کر کتاب کا ایک اور سوال پوچھا ـــــ "مجتبیٰ حسین، ڈاکٹروں سے بہت زیادہ کیوں واقف ہیں؟"

ہم نے سمجھایا "ڈاکٹروں سے مراد یہاں وہ ڈاکٹر نہیں جو علاج کرتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین تو اپنی چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج خود ہی کر لیتے ہیں۔ جب توند بڑھ جاتی ہے تو روزانہ تین چار میل پیدل چلتے ہیں اور وزن کم کر لیتے ہیں۔ وزن بڑھانا ہو تو حیدرآباد کو چلے آتے ہیں۔ ان کی بیماریاں تو ان کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے

اصلی ڈاکٹر تو ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر انور معظم، ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر قمر رئیس ڈاکٹر وحید اختر اور ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید وغیرہ ہیں جو ان کی نبض ٹٹول سکتے ہیں!"

اس کے بعد طالب علم نے ایک آخری سوال پوچھا جو قواعد سے متعلق تھا۔" ماضی کی تعریف کیجئے اور اس کی قسمیں بتائیے۔"

چونکہ قواعد ہماری کمزوری ہے اس لیے ہم نے طالب علم کو مشورہ دیا کہ "میاں! تم اگر قواعد کی چکر میں پڑجاؤ گے تو اردو سیکھ نہ پاؤ گے۔ اسی لیے شاعر نے کہا ہے کہ ع

"کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے"

ایک مزاح نگار ہونے کے ناطے میں اس خطرے کی جانب نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جو مجتبیٰ حسین نے "آدمی نامہ" لکھ کر پیدا کیا ہے۔ اب اردو کے ریسرچ اسکالر نظیر اکبر آبادی کی نظم "آدمی نامہ" اور مجتبیٰ حسین کے "آدمی نامہ" کے چکر میں پڑ جائیں گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ غلط فہمی میں کہیں "موازنۂ انیس و دبیر" کی طرح "موازنۂ نظیر و مجتبیٰ حسین" کی بحث نہ چل پڑے اس میں نظیر اکبر آبادی کا تو کچھ نہ بگڑے گا البتہ مجتبیٰ حسین کے خوب چرچے ہوں گے اور اردو کے گلشن میں ہل چل سی مچ جائے گی۔ میں مجتبیٰ حسین کو اس قسم کی ہلچل پیدا کرنے پر زبردست مبارک باد دیتا ہوں۔ کیونکہ ہلچل کے بغیر اردو کا گلشن بڑا سونا سونا سا لگتا ہے۔ اور مجتبیٰ حسین نے اردو کے گلشن میں ہل چل پیدا کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ ○○

ڈاکٹر مغنی تبسم

آدمی نامہ

مجتبیٰ حسین کے لکھے ہوئے خاکوں کا مجموعہ "آدمی نامہ" میرے سامنے ہے اور مجھے اس مجموعے پر اپنے تاثرات قلم بند کرنے ہیں۔ میرے لئے ایک مسئلہ یہ ہے کہ میں خاکہ نگاری کے فن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کتاب کی قدروقیمت کا جائزہ لوں یا مزاح نگاری کے معیار کے پر جانچوں۔ پھر سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ایک مزاح نگار کا تہنیتی جلسہ کسی بے مزہ خشک تنقید کا کہاں تک متحمل ہو سکتا ہے؟ مزاح نگاری پر سنجیدہ تنقید نہیں بجائے خود ایک مذاق بن کر نہ رہ جائے۔ ویسے خود مجتبیٰ حسین نے راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، باقی، مخمور سعیدی جیسے ادیبوں اور شاعروں کے مزاحیہ خاکے لکھ کر اس کا جواز فراہم کردیا ہے کہ ان کی مزاح نگاری پر سنجیدہ تنقید بھی جائے۔ بات یہ بھی ہے کہ مجتبیٰ حسین نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ مزاح نگاری کی ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ان کی مزاح نگاری کو مذاق میں اڑا دیا جائے۔ بدقسمتی سے اردو میں نام نہاد مزاح نگاروں کی بہتات ہے لیکن ان میں سے کم ہی ایسے ہیں جنہیں ادیب یا شاعر کہا جا سکے۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو سستی شہرت کی خاطر ادب کے نام پر بے ادبی درمزاح کے پردے میں بدمذاقی کو عام کرنے کے مجرم ہیں۔ مجتبیٰ حسین اس دور کے ان گنے چنے ادیبوں میں سے ایک ن جنہوں نے مزاح اور طنز کو ادبی وقار اور اعتبار بخشا۔ اچھا اور سچا مزاح آدمی کو گٹر میں پھینکتا بلکہ اسے مہذب رشائستہ انسان بناتا ہے۔ اسے انسانوں کے دکھ درد میں شریک ہونا اور آدمیت کا احترام کرنا سکھاتا ہے۔ یہی وہ اوصاف ہیں جو مجتبیٰ حسین کو ایک بڑا ادیب اور فنکار بناتی ہیں۔

کسی نے مزاح نگاری کے بارے میں یہ بڑی چبھتی ہوئی بات کہی ہے کہ وہ بنیادی طور پر تنزلی ہوتا ہے۔ سیت جب اپنی حدوں سے آگے نکل جاتی ہے تو مزاح بن جاتی ہے۔ کم از کم مجتبیٰ کی حد تک مجھے یہ خیال بالکل درست لوم ہوتا ہے۔ مجتبیٰ کے اُن حزن انگیز افسانوں کی گونج ابھی تک میرے کانوں میں محفوظ ہے۔ جو انہوں نے طالب علی

کے زمانے میں لکھے تھے اور جنھیں سن کر ان کے احباب اداس اور دل گرفتہ ہوجایا کرتے تھے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جب تک مجتبیٰ اپنی ذاتی محرومیوں اور شکستوں کا شکار رہے۔ اپنے غموں کو حدیث دیگراں بناکر اپنے لئے سامان تسکین فراہم کرتے رہے اور جب انہیں غموں کی راہ سے اُن کی رسائی عالم انسانیت کے دکھ درد تک ہوئی، جب انھیں اپنے عہد میں تہذیبی قدروں کے زوال کا عرفان حاصل ہوا اور بھری پُری دنیا کے شور شرابے کے پیچھے چھپے ہوئے، زندگی کی لاحاصلی اور بے ثباتی کے پھیلے ہوئے سناٹے کا احساس ہوا تو انہیں اپنی ذاتی محرومیاں ہیچ نظر آنے لگیں۔ دوسرے آدمیوں اور عام انسانوں سے ہمدردی نے شخصی غم کی جگہ لے لی۔

مزاح نگار کی حیثیت سے مجتبیٰ حسین اس تیماردار کا رول ادا کرتے ہیں جو بستر مرگ پر پڑے ہوئے مریض کی دلجوئی کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں زندہ رہنے کی نئی امنگ اور حوصلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ اپنی تکلیف کو بھول کر مسکراتا ہنستا اور قہقہے لگاتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے مجتبیٰ کی ذات میں مشہور اسپینی فلسفی، افسانہ نگار اونا مونو کی ایک کہانی کا کردار ڈان مینزیل چھپا ہوا نظر آتا ہے جو لوگوں کے لئے یہ کہتا ہے "سب سے ضروری بات یہ ہے کہ وہ خوش و خرم رہیں۔ زندہ رہنے کی مسرت محسوس کریں۔ زندہ رہنے کی مسرت اور امنگ بنیادی چیز ہے۔ کسی کو بھی خدا کے مقرر کردہ وقت سے پہلے موت کی خواہش نہیں کرنی چاہیئے۔" ڈان مینزیل جس کے نزدیک وہ شخص خدا کا برگزیدہ بندہ اور ولی تھا جو مسخرے کا سوانگ بھر کر بچوں نوجوانوں اور بوڑھوں کو ہنساتا تھا۔ اس پادری کے بارے میں یہ بات بھی سن لیجئے کہ وہ خود تو دہریہ تھا لیکن لوگوں کے دلوں میں خدا کے عقیدے کو اس لئے جاگزیں رکھنا چاہتا تھا کہ ان کی ڈھارس بندھی رہے اور ان میں جینے کا حوصلہ پیدا ہو۔ یہی وجودیت پسندانہ رویّہ مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا بھی ہے۔ چنانچہ رضا نقوی واہی کے خاکے میں وہ لکھتے ہیں
"کسی مزاح نگار نے کہا ہے کہ قہقہہ لگانے سے آدمی کے سفید بال کالے نہیں ہوجاتے۔ بس یہ ہوتا ہے کہ اس کے مزید سفید بال بڑے نہیں لگتے۔ زندگی سے ٹوٹ کر پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کروڑوں سال پرانی دنیا میں یہ آدمی اپنی زندگی کے ساٹھ ستّر سال کس مشکل سے گزارتا ہے یہ اس کا دل ہی جانتا ہے۔ ایسے میں کوئی قہقہوں کی دولت بانٹتا ہے تو ہمیں اس کا احسان مند ہونا چاہیئے۔"

مجتبیٰ حسین اور ڈان مینزیل میں جو گہری مشابہت میں نے دکھائی اس کے ساتھ دونوں میں ایک بڑا اور نمایاں فرق بھی نظر آتا ہے۔ ڈان مینزیل کی طرح لوگوں کو مسلسل فریب کا سہارا دیتے رہنا شائد مجتبیٰ کے بس کی بات نہیں کیونکہ ان کے قارئین میں توہم پرست دیہاتی ہی نہیں بلکہ لزارو جیسے ہوش مند اور بے رحم حقیقت پسند لوگ بھی ہیں۔ ڈان مینزیل کی طرح وہ لزارو سے تنہائی میں اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ کبھی طنز اور کبھی مزاح کا دامن بھی ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اور ان کی تحریر میں ایک حزینہ لَے اُبھرتی ہے۔ مثال کے طور پر بانی پر لکھا ہوا خاکہ ملاحظہ کیجئے۔ اقتباس یہ بس پرلطف لطیفوں اور مزاح کی پھلجھڑیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جب آپ انجام پر پہنچتے ہیں تو یہ عبارت آپ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔

"ایک بار باقیؔ نے چند بے تکلف احباب کی محفل میں بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا۔ یار! اردو کے اس دورِ زوال میں بڑی عظیم شاعری ہو رہی ہے مگر اس دورِ زوال کے بعد کیا ہوگا۔ ہم جو چند احباب آج یہاں بیٹھے ہیں کیا آنے والے کل کی گود میں بھی ایسے ہی احباب بیٹھیں گے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہم سب اپنی اپنی گمنام شہرتوں کی صلیبیں اپنے اپنے ہی کندھوں پر اُٹھائے مقتل کی طرف جا رہے ہیں جہاں ہم خود اپنے آپ کو مصلوب کریں گے۔ اس کے بعد نہ ہمارا کوئی حرفِ معتبر ہوگا اور نہ ہی کوئی رنگوں کا حساب پوچھے گا۔ جو چیز مجتبیٰ حسین کو دوسرے مزاح نگاروں سے مختلف اور ممتاز بناتی ہے وہ یہ ہے کہ مزاح مجتبیٰ کے لئے اوڑھنا بچھونا نہیں بلکہ محض ایک نقاب ہے۔ ان کے مزاح کی تہہ میں چھپی ہوئی، طنز اور حزن کی لہریں باشعور قاری کو غور و فکر پر مائل کرتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں ایسے بھی موڑ آتے ہیں جب ہم ہنستے ہنستے اچانک سنجیدہ اور اور کبھی محزون بھی ہو جاتے ہیں۔

مجھے مجتبیٰ حسین کے فن اور اسلوب کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کرنا ہے۔ لیکن اس کے لئے جو فرصت اور فراغت درکار ہے وہ فی الحال مجھے اور شائد آپ کو بھی میسر نہیں ہے۔ یہ ایک قرض ہے جو کسی روز بہرحال چکانا ہوگا۔ کسی مصنف پر نقاد اُسی وقت قلم اُٹھا سکتا ہے جب وہ اسے پوری طرح اسیرِ دام کر لیتا ہے۔ اور سچ بات یہ ہے کہ میں مجتبیٰ کو پوری طرح اپنی گرفت میں ابھی تک نہیں لا سکا۔ ان کا فن اتنا پر پیچ اور پہلو دار ہے کہ سرسری طور پر اس کا تجزیہ اور محاکمہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب ہم رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری اور مشتاق احمد یوسفی کو پڑھ کر سیراب نہیں ہوتے اور اپنی تشنگی بجھانے کیلئے مجتبیٰ سے رجوع کرتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مجتبیٰ کے فن میں کچھ ایسے اوصاف پائے جاتے ہیں جو اس کو پیش روؤں اور معاصرین سے مختلف بناتے ہیں۔ مجتبیٰ نے مزاح نگاری کے وہ سارے حربے کام میں لائے ہیں جنھیں چیدہ چیدہ طور پر مختلف مزاح نگار استعمال کر چکے ہیں۔ مجتبیٰ نے ان حربوں کو کچھ زیادہ تیز کر دیا ہے اور ان کے برتنے میں بڑے توازن اور احتیاط سے کام لیا ہے۔ مجتبیٰ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا پھر وہ انشائیہ نگاری کی طرف رجوع ہوئے۔ کہانی کی دلچسپی کا انحصار واقعات پر ہوتا ہے اور انشائیہ کی دلکشی میں زبان اور پیرایۂ اظہار کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے مزاح میں ان دونوں اصناف کی خصوصیات کے یکجا ہونے سے وہ بات پیدا ہو گئی ہے جس کے بارے میں غالبؔ نے کہا تھا:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

کہانی اور انشائیے کے فن کے اس امتزاج نے ان کے لکھے ہوئے خاکوں کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ "آدمی نامہ" کے بیشتر خاکے مجتبیٰ نے فرمائش پر لکھے ہیں۔ ان خاکوں کی شخصیتیں گویا مصرعِ طرح ہیں لیکن مجتبیٰ نے ان مصرعوں پر محض قافیہ پیمائی نہیں کی ہے اور قافیہ پیمائی کی بھی ہے تو ناصر کاظمی کی طرح ؎

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصرؔ
یہ قافیہ پیمائی کوئی کر کے تو دیکھے

خاکے میں موضوع کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو غزل کے شعر میں قافیے کی ہوتی ہے۔
غزل گو شاعر کو قافیے سے مفر ممکن نہیں۔ یہی حال خاکہ نگار کا ہوتا ہے۔ معمولی شاعر قافیہ کا غلام بن کر روایتی مضمون دوہرا دیتا ہے۔ ایسا ہی کچھ حال عام خاکہ نگاروں کا ہے۔ اس کے برخلاف ایک خلاق شاعر روندے ہوئے قافیہ سے نہ صرف نیا مضمون پیدا کرتا ہے بلکہ اس کو اپنے منفرد تجربے اور وارداتِ شعر کے اظہار کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے شخصیتوں سے اپنے خاکوں میں کچھ ایسا ہی کام لیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے تحریر کردہ خاکوں کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی سنگ تراش کسی چٹان کے مقابل تیشہ بدست کھڑا ہے۔ وہ چٹان پر جوں جوں تیشے کی ضرب لگاتا ہے کسی مورتی کے خدوخال آہستہ آہستہ ابھرنے لگتے ہیں۔ پہلے پہل ایک بھدی سی مورت سامنے آتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ نظر پھیر لیں لیکن FINISHING TOUCHES کے بعد یہی مورت ایک بے مثال شہکار نظر آنے لگتی ہے۔ مجتبیٰ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے خاکوں کی شخصیتوں کو مسخ کیئے بغیر ان کو زیادہ دلآویز اور معنیٰ خیز بنا کر پیش کیا ہے۔ لیکن اس طرح کہ یہ شخصیتیں بالآخر مقصود بالذات بن کر نہیں رہ جاتیں بلکہ صرف حلیۂ سخن بن جاتی ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے اکثر خاکوں کی تکنیک کو گریز، جذب اور گریز کے مثلث سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ وہ پہلے قاری کو اس خاکے کی شخصیت سے کچھ بدگمان کر دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ بدگمانی دور ہوتی ہے اور جب اس شخصیت کی کشش قاری کو پوری قوت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتی ہے تو خاکہ نگار قاری کا ہاتھ پکڑ کر روک لیتا ہے اور پھر اسے ایسے مقام پر لے جا کر چھوڑ دیتا ہے جہاں شخصیت ایک یاد بن کر رہ جاتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کے ان خاکوں کا موضوع ادیب اور شاعر ہیں۔ وہ اپنے تخلیق کردہ فن پاروں میں تو زندہ رہیں گے ہی لیکن جب تک اردو زبان باقی ہے اردو بولنے والے مجتبیٰ کے خاکوں میں ان شخصیتوں سے ملاقات بھی کر سکیں گے۔ اور یہ ملاقاتیں انھیں زندگی کا نیا عرفان بخشتی رہیں گی۔

مجتبیٰ نامہ

یہ نظم "آدمی نامہ" کی اشاعت کے موقع پر زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام جناب مجتبیٰ حسین کے تہنیتی جلسہ منعقدہ ۲۱ مارچ سنہ ۱۹۸۱ء اردو ہال حمایت نگر حیدرآباد میں پڑھی گئی۔

"تکلف برطرف" صاحب کہ قصہ مجتبیٰ کا ہے
نہ کہیے "مختصر" اس کو قصیدہ مجتبیٰ کا ہے

"بہرحال" اب نہیں چارہ سوائے تہنیت کوئی!
کہ پنگھٹ پر ظرافت کے تماشہ مجتبیٰ کا ہے

چھپا رہتا ہے خالق اپنی ہر تخلیق کے پیچھے
نہ سمجھو "آدمی نامہ" یہ خاکہ مجتبیٰ کا ہے

ہے اردو نثر میں بے شک مسلسل ارتقا لیکن
مزاح و طنز کے احیا میں حصہ مجتبیٰ کا ہے

فنِ خاکہ نگاری کا یہ جو دریا سا بہتا ہے
ذرا نزدیک سے دیکھو پسینہ مجتبیٰ کا ہے

یہ ہندوستان، یہ جاپان، یہ لندن، یہ پاکستان
کہاں تک دیکھئے گا اور، نقشہ مجتبیٰ کا ہے

ہنسی کے رنگ سارے قہقہے، محفل کے ہنگامے
یہ زیر و بم، یہ آوازیں، یہ طبلہ مجتبیٰ کا ہے

سیاست روڈ، عابد شاپ، اردو ہال، اجنتا گیٹ
یہاں تنہا نہ گھومیں، یہ علاقہ مجتبیٰ کا ہے

حمایت اور کمال اپنی عمارت کے ستون ٹھیرے
مگر چھت پر تو پُر اسرار قبضہ مجتبیٰ کا ہے

سبھی زندہ دلانِ شہر کا ہے ترجمان پھر بھی
مسیح انجم کا کہنا ہے، شگوفہ مجتبیٰ کا ہے

ہر اک معصوم دم بھرتا ہے ہر دم ہم نوائی کا
رفیقِ کار اس میں کوئی شوشہ مجتبیٰ کا ہے

ہر اک چہرہ نظر آتا ہے اب خود اشتہار اپنا
کہیں چھوڑا ہوا یہ بھی لطیفہ مجتبیٰ کا ہے

"نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ شمالی" راہ لگ اپنی
گلستانِ دکن آخر خرابہ مجتبیٰ کا ہے

جلیل اس مدح گردانی کا مقصد ایک خاکہ ہے
کرم فرما نہ یہ سوچیں کہ چمچہ مجتبیٰ کا ہے

رشید عبدالسمیع جلیل

مقرب حسین مقرب

چلتی پھرتی تصویریں

اے میرے دیش واسیو کیوں بدحواس ہو   ہڑتالیں کر رہے ہو کہ مہنگائی کیوں بڑھی
پانی کی تیز دھار پہ غصہ سے فائدہ   یہ بھی تو سوچ لو کہ ندی کس لیئے چڑھی
جڑتے نہیں ہیں آئینے اک بار ٹوٹ کر
مہنگائی کم نہ ہوگی دکانوں کو لوٹ کر

بندہ نواز یہ تو ہے تاریکیوں کا دور   کوئی نہیں سنے گا مچا لیجے لاکھ شور
حالت بدل نہ پائے گی کر لیجے لاکھ زور   شاسن بھی کیا کرے جو ہو سارا سماج چور
ویسے تو سب ہی دیش کے خدمت گزار ہیں
پکڑے گئے تو چور نہیں سا ہوکار ہیں

بتلا رہا ہوں سب کو یہ اک ایسا بھید ہے   اس کا نہیں سوال ہے رامو کہ زید ہے
ہر کام ہوگا آپ کا بخشش کی قید ہے   کالا ہے دل تو کیا ہوا ٹوپی سفید ہے
بیٹھے تھے جو کناروں پہ مچھلی نگل گئے
پھر بھی خدا کی شان کہ سب پارسا رہے

افسر بتا رہا ہے کہ بیوپاری چور ہے   بیوپاری کہہ رہا ہے کہ وہ گھونس خور ہے
نیتا یہ کہہ رہے ہیں ترقی کا دور ہے   سچائی کیا ہے بات ابھی زیر غور ہے
توپوں کی گھن گرج میں ملے کس کو شانتی
ڈاکو کی محفلوں میں کہاں نیک آدمی

بنیاد کوئی رکھی تو فنکشن ہوئے تو ہیں   جنتا کو اپنے نیتا کے درشن ہوئے تو ہیں
جمہوریت کی شان، الیکشن ہوئے تو ہیں   راشن نہیں تو کیا ہوا بھاشن ہوئے تو ہیں
سب مل کے اپنے اس طرح دکھ درد بانٹ لو
اخبار پڑھ کے نیتا کی تقریر چاٹ لو

مطلب میں چاہیے کوئی ہو ہوشیار سب تو ہیں   حرص و ہوس کے مرض کے بیمار سب تو ہیں
زیادہ ہوں یا کہ کم ہوں گنہگار سب تو ہیں   چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں خطاوار سب تو ہیں
کیوں ڈھونڈتے ہیں آپ کہ غدار کون ہے
پہلے بتایئے کہ وفادار کون ہے!؟

ایمان داریوں کے ہوئے کاروبار بند   دیکھو جسے وہ کرتا ہے ہر روز دھند پھند
لاکھوں ہیں بے ایمان تو ایماندار چند   افسر کہاں سے آئیں گے راجہ ہریش چند
بنتے نہیں ہیں محل مہربان ریت میں
دانے وہی اگیں گے جو بو دوگے کھیت میں

کل تم نے جن کو راہبر اپنے بنائے تھے   کل تم نے جن کی جیت کے ڈنکے بجائے تھے
کل تم نے جن کی جیت کے نعرے لگائے تھے   فرطِ خوشی سے آسماں سر پہ اٹھائے تھے
ماتھے جہاں جھکے تھے کلیسا وہی تو ہیں
کیوں رو رہے ہو آج مسیحا وہی تو ہیں

○

کنہیا لال کپور

مسرّت کی تلاش

مَیں مسرت کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا تھا کہ میری ملاقات عُمر خیام سے ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا "مسرت کا کیا راز ہے؟" اُس نے جواب میں یہ شعر پڑھ دیا:

غم غلط دونوں جہاں کا ایک پیمانے میں ہے
زندگی کا گو مزہ پُوچھو تو میخانے میں ہے

میں نے سوال کیا: "اس کا ثبوت؟"

"ثبوت!" عُمر خیام نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے اُسے یقین نہ آرہا ہو کہ میں صحیح العقل ہوں۔

"ہر بات کا ثبوت نہیں ہوتا۔ اب اِس بات کا ہی کیا ثبوت ہے کہ مسرت کا واقعی وُجود ہے۔ بہرحال اگر تم ثبُوت چاہتے ہو تو زمانۂ قدیم کے ایک ہندوستانی فلسفی چاروَاک کا یہ قول حاضر ہے:

جب تک جیئو، آرام سے جیئو۔ اگر قرض لے کر بھی شراب پینا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ایک مرتبہ مرنے کے بعد کوئی شخص دوبارہ زندہ نہیں ہُوا۔ اس لیے زندگی میں جس قدر عیش کر سکتے ہو، کر لو۔"

میں نے جی بھر کر شراب پی۔ زہرہ جَبینوں سے عشق کیا، لیکن مجھے مسرت حاصل نہ ہوئی بلکہ اس طرح محسوس ہُوا۔ نرلیش کمار شاد نے یہ رُباعی میرے بارے میں ہی کہی تھی:

سیکڑوں کے بھی آس پاس رہی
گل رخوں سے بھی روشناس رہی
جانے کیا بات ہے کہ اِس پر بھی
زندگی عمر بھر اُداس رہی

ایک دن میں نے چلّا کر کہا "عمر خیام اور چارواک اوّل درجے کے جھوٹے ہیں"۔ میرے قول کی تائید کرتے ہوئے ایک ہپی بولا:

"آپ بجا کہتے ہیں۔ مسرت کا راز شراب پینے یا عشق کرنے میں نہیں بھنگ پینے میں ہے۔"

میں بھنگ پینے لگا۔ مگر بھنگ شراب سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ اِسے پینے کے بعد میں ایسی بے ہودہ حرکتیں اور باتیں کرنے لگا جن کی توقع صرف کسی نیم پاگل سے ہی کی جا سکتی ہے۔

پھر کسی رِند نے مجھے مشورہ دیا۔ جب تک آدمی دِل کھول کر عیاشی نہ کرے، اُسے دائمی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔

مجھے اس کا مشورہ پسند آیا میں اس پر عمل کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ کسی نے پکار کر کہا "خبردار! اس کی باتوں میں مت آنا۔ یہ تمہیں گمراہ کرنا چاہتا ہے۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "تم کون ہو؟"

"میں بیاتی ہوں۔ کسی زمانے میں ہندوستان کا بادشاہ تھا، اور ایک ایسا کڑیل جوان جس کی جوانی کی ساری دنیا میں دھوم تھی۔"

"پھر؟"

"پھر کسی بات پر ناراض ہو کر رِشی شکر اچاریہ نے مجھے بددُعا دی۔ تم فوراً بوڑھے ہو جاؤ اور ایک ہزار برس تک بوڑھے رہو۔ میں اُسی وقت بوڑھا ہو گیا۔ میں نے گڑگڑا کر اس سے درخواست کی "ابھی تو میرے آدھے ارمان بھی نہیں نکلے۔ مجھے کچھ برس اور جوان رہنے دو۔"

شکراچاریہ نے اپنی بددُعا میں ترمیم کرتے ہوئے کہا "اگر کوئی شخص تمہیں اپنی جوانی دے کر تمہارا بڑھاپا لے لے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

میں گھر لوٹا اور اپنے بیٹوں سے کہا کہ اپنی جوانی کے عوض میرا بڑھاپا لے لیں۔ کسی کو یہ خسارے کا سودا پسند نہ آیا تاہم میرا سب سے چھوٹا لڑکا "پرو" میری بات ماننے پر رضامند ہو گیا۔ میں ایک ہزار سال تک جوان رہا اور میں نے ہر قسم کی عیاشی کی۔ ایک ہزار سال کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا اُس سے میں نے اپنے بیٹے "پرو" کو اِن الفاظ میں آگاہ کیا۔

عیش و عشرت کی خواہش عیاشی کی زندگی بسر کرنے سے کبھی مدھم نہیں پڑتی بلکہ پہلے سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ جس طرح ہون کرتے وقت آہوتی ڈالنے سے آگ بجھتی نہیں بلکہ بھڑک اُٹھتی ہے۔۔۔ اِس دنیا میں جتنا سونا اور جتنی خوبصورت عورتیں ہیں وہ تو ایک شخص کے لئے بھی ناکافی ہیں۔ اِس حرص کو چھوڑ دینا چاہیئے۔"

آپ کی داستان بڑی عبرت انگیز ہے۔ یہ صحیح ہے، عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے سے مسرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا وہ کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے؟"

اس راز کو جاننے کے لیئے تمہیں جرمنی کے فلسفی گوئٹے (GOETHE) سے رجوع کرنا ہوگا جس نے برسوں اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد ایک ڈرامہ ("فاوسٹ") لکھا۔

میں گوئٹے کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا سوال دُہرایا۔ اُس نے کہا "عیاشی کا ہر لمحہ غیر دائمی ہے۔ ہر مسکراہٹ کے پیچھے آنسو ہے۔ ہر نغمے کی اوٹ میں نوحہ کھڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دائمی مسرت کا لمحہ صرف اس وقت میسر آتا ہے جب اِنسان اپنے لیئے نہیں، دوسروں کے لیئے جیتا ہے۔

گوئٹے کی بات دلچسپ ضرور تھی لیکن اس پر عمل کرنا آسان نہ تھا۔ گھر لوٹتے وقت میں نے ایک درویش کو دیکھا

جو گا رہا تھا: "راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تری رضا ہے۔"
میں نے کہا "سائیں بابا! کیا تم اس بات پر روشنی ڈال سکتے ہو کہ مسرت کا کیا راز ہے۔"

"مسرت کا راز!" اس نے دیوانہ وار قہقہہ لگا کر کہا۔ "اگر تم واقعی مسرت سے ہمکنار ہونا چاہتے ہو، تو اپنے سینے پر انگریزی کے یہ سات حروف لکھ لو۔"

"کون سے حروف؟"

"ڈبلیو۔ای۔ایل۔سی۔او۔ایم۔ای"

"ان کا فائدہ؟" — "انہیں ملانے سے لفظ "ویل کم" بن جائے گا۔ جس کے معنی "خوش آمدید" ہوتے ہیں۔"

"لیکن اس لفظ سے مسرت کا کیا تعلق ہے؟" — "تعلق یہ ہے، اگر زندگی میں تمہیں غم ملے۔ اس سے بغلگیر ہو کر کہو "ویل کم" اور اگر خوشی ملے، اس سے مصافحہ کر کے کہو "ویل کم" اگر تم اس نکتے کو پا گئے تو سمجھو تم نے مسرت کا راز پا لیا۔"

■■

اسمعیل ادیب

دفتر سے آرہا ہوں، چہرہ ہے وحشیانہ
پھولی ہوئی ہیں سانسیں اکڑا ہوا ہے شانہ
پچکے ہوئے شکم میں آنتوں کا کلبلانا
اس پر تھکن سے اعضا کا ٹوٹ ٹوٹ جانا
چکّر غضب کا آنا، ٹانگوں کا لڑکھڑانا، سینے کا دھڑ دھڑانا
بیٹی کہاں ہو آنا ــــــ دم نکلا جارہا ہے پانی ذرا پلانا

گھر سے جو صبح نکلو، چلتا ہے بس کا چکّر
بس میں بھی بھیڑ ایسی ساری غضا مکدّر
مرتا وہ کیا نہ کرتا جو رہ گیا چپک کر
اس کے بدن کا بھپکا اس کے شکم کے اندر
کھلتا ہے بس میں گویا۔ جنتا کی کوششوں سے بدبو کا کارخانہ
بیٹی کہاں ہو آنا ــــــ تھوڑا فرش تو ہولوں منجن ذرا بڑھانا

دفتر میں اپنے افسر کی ہاں میں ہاں ملاؤ
افسر جو مسکرا دیں تو کھل کے ہنہناؤ
کچھ اہلیت پر اپنی گاہے اکڑ دکھاؤ
گاہے نحیف کتے کی طرح دُم ہلاؤ
سرونٹ بن گئے پر آساں نہیں ہے خود کو جمّن میاں بنانا
بیٹی کہاں ہو آنا ــــــ امّی سے جا کے کہہ دو فوراً نکالیں کھانا

بے حد تھکا ہوا ہوں بیڑی میں اک جلالوں
آرام لازمی ہے کھٹیا ذرا بچھالوں
دروازہ بند کر کے برقی دیا بجھاؤں
آجائے نیند فوراً صورت تو کچھ نکالوں
دم مار کر اٹھوں گا جلدی تو کل سویرے ہونا ہے پھر روانہ
بیٹی کہاں ہو آنا ــــــ خواہ کوئی ملنے آئے ہرگز نہ تم اٹھانا

تکلیف دہ ہے کتنا دفتر کا آنا جانا

مقالہ نویس

خدا
مقالہ نویسوں کو
زندہ وسلامت رکھے انھیں
کے دم قدم سے ادیب اور شاعر زندہ
ہیں۔ گھٹیا سے گھٹیا قسم کا شاعر یا ادیب ہی کیوں
نہ ہو، بس اس پر ایک سیمنار کر دیجیے اور مقالہ نویسوں
کو دعوت نامہ بھیجیے۔ اللہ کے فضل وکرم سے یہ اس مقام پر یوں
حملہ آور ہوں گے۔ جیسے کسی مرمّت طلب مسجد کا امام یا دور افتادہ مندر کا پجاری
کسی ضیافت پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ جس ادیب یا شاعر پر
مقالے پیش کیے جائیں گے۔ اس کی ادبی یا ثقافتی حیثیت کیا تھی انھیں اُس کی نہیں بلکہ اپنی قابلیت
کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ قوم رائی کا پہاڑ بنانے میں اس قدر ماہر ہوتی ہے اور ذرا ذرا سی بات پر
اس قدر طویل مقالے لکھ مارتی ہے کہ سننے والے بور ہو جاتے ہیں اور ایک ایک
کر کے سارا میدان ان کے حوالے کر جاتے ہیں تاکہ یہ دل کھول کر اپنی تحقیق اپنی آوازیں سُن سکیں۔ ذیل میں ایک مقالہ پیش
کیا جاتا ہے۔

حضرات: میرے لیے یہ باعث صد افتخار ہے کہ آپ نے مجھ ہیچمدان کو علامہ ببول صحرائی
مرحوم پر مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی۔ جہاں آپ نے علامہ مرحوم کا انتخاب کر کے اپنی
سخن فہمی اور قدر شناسی کا ثبوت دیا ہے، وہاں آپ نے علامہ کی مفکرانہ شاعری
ادبی عظمت اور ثقافتی برتری کا بھی اعتراف فرمایا ہے۔ علامہ مرحوم
کی قابلیت، جدت، جُرات، لیاقت، ندرت اور فصاحت
سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ علامہ مرحوم پر ایک مقالہ
تو کیا کتابیں بھی لکھی جائیں تو بھی ان کی
شاعری اور علم وفضل کا احاطہ نہیں
کیا جا سکتا۔ ان کا ایک
ایک شعر
کئی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

دیوانوں پر بھاری ہے لیکن وقت کی کوتاہی اور اپنی عدیم الفرصتی
کی وجہ سے میں صرف ایک ہی مقالے میں ان کی شخصیت
اور ادبی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ نہیں کر پاؤں گا۔ اس لئے
ان کا ایک شعر ہی پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ چنانچہ شعر
ملاحظہ ہو۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

میں نہ سمجھا ہوں نہ سمجھوں گا نہ سمجھاؤ مجھے
دُور پہلو سے مرے دُور سرک جاؤ۔ مجھے

حضرات ! اس شعر کے پہلے مصرعہ کو لیجئے اس مختصر مگر
محکم اعلان، بیان، اعتراف، اقرار و اقبال میں ہی شاعر
نے کیا کیا نہیں کہہ دیا۔ اس ایک ہی مصرعے سے اس ذہنی
کشمکش اور جنگ کا بھی شعور ہو سکتا ہے جو روزِ ازل سے
نیکی اور بدی، خلوص اور ریا، برد باری اور ہٹ دھرمی اور
ناصح اور منصوح (اس ترکیب کے لئے معذرت خواہ ہوں
لیکن فاتح اور مفتوح کی تراکیب کو مدنظر رکھتے ہوئے زبان میں
اضافہ کرنے کی سعی کی ہے) میں جاری ہے اور جاری رہے گی
اس ایک ہی مصرعے میں شاعر نے اپنا ماضی، حال اور مستقبل آپ
پر صاف طور پر واضح کر دیا ہے گویا کہ کوزے میں دریا نہیں،
ساتوں سمندر بند کر دیئے ہیں۔ سمجھانے والا لاکھ سر پیٹتا ہے
کہ میاں برخوردار ذرا سوچو اور پھر سمجھو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں
لیکن شاعر ہے کہ اپنی دُھن کا پکا ہے اور بہانگ دُہل کہہ رہا
ہے کہ میں سمجھنے والا نہیں بلکہ میرے آباؤ اجداد نے بھی سمجھنے
کی کوشش نہیں کی آپ اپنا وقت فضول برباد کر رہے ہیں
ادھر "ناصح مشفق" بھی پرلے درجے کا خود بھی خود سر اور
خود پسند ہے۔ وہ بھی باز نہیں آرہا۔ چنانچہ جب یہ تکرار حد سے
بڑھ جاتی ہے تو شاعر کی رگِ حمیت پھڑکتی ہے۔ اور وہ

اس جرأت، ہمت، ایثار، کردار و گفتار کو بروئے کار
لاتا ہے جس نے عاشق کو واقعی عاشق بنایا ہے اور جو اپنے
محبوب کو حاصل کرنے کے لئے ایک تو کیا ہزار جان کی بازی
لگا سکتا ہے۔ اب شاعر کسی حد تک کرخت لہجے میں دوسرے
مصرعے میں ناصح سے دور ہو جانے کو کہتا ہے۔

"دُور پہلو سے مرے دور سرک جاؤ مجھے"

ایک سیدھا سادہ سا مصرعہ نظر آتا ہے لیکن اگر آپ اس
پر ذرا غور فرمائیں گے تو آپ پر یہ بات روشن ہو جائے گی
کہ اس مصرعہ میں علامہ نے اپنے شعوری بلوغ، بے پناہ
حوصلہ لا انتہا محبت اور بے کراں خود اعتمادی کا کس قدر
اچھے اور موزوں الفاظ میں مظاہرہ کیا ہے۔ یہی وہ جذبہ
ہے جس نے فرہاد کو پہاڑ کا جگر چیرنے کا عزم بخشا۔ یہی
وہ اندرونی قوت ہے جس نے مجنوں کو برسوں تپتے صحراؤں
میں دشت نوردی کی توفیق عطا فرمائی۔ یہی وہ احساس ہے
جو اجل کو آنکھیں دکھا سکتا ہے۔

حضرات ! یہ میں جانتا ہوں کہ بعض ناقد حضرات اس
شعر کے دوسرے مصرعے کی ردیف پر اعتراض کریں گے
لیکن انھیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ پہلے مصرعے میں شاعر
نے ان جذبات کا اظہار کیا ہے جو ایک مجاہد میں ہوتے
ہیں اور مجاہد روزِ اول سے ہی اپنی دُھن کا پکا ہوتا ہے۔
شاعر نے بیشک دیدہ دانستہ ردیف کو محکم سے محکم تر
کر دیا ہے اور اس اصول پر عمل کیا ہے کہ ہر شعر میں قافیہ
تو بدلتا رہتا ہے لیکن ردیف اپنی جگہ پر چٹان کی طرح
قائم رہتی ہے۔ چنانچہ :
"سرک جاؤ مجھے" کا جملہ رکھ کے علامہ نے

یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ روائتی ردیف فضول اور بے معنی ہُوا کرتی ہے۔ اس سے علامہ کے شعوری بلوغ، اس کی ندرت، جرأت، فصاحت، زورِ بیان اور قوتِ زبان کا بھی صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ ردیف کے اس استعمال سے علامہ نے اپنی ترقی پسندی اور فرسودہ روایات سے بغاوت کا بھی اعلان فرمایا ہے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ کچھ حضرات اس ردیف کو بے معنیٰ اور غیر ضروری قرار دیں گے لیکن کئی حضرات اسے زبان کی ارتقا کی علامت گردانیں گے، اور ہو سکتا ہے کہ اسی ایک شعر پر آنے والی نسلیں قیامت تک بحث کرتی رہیں۔ اگر ایسا ہوا تو علامہ مرحوم کا نام نامی قیامت تک زندہ و تابندہ رہے گا کہ وہ اہلِ سخن اہلِ قلم حضرات کے لئے ایک ایسا موضوع چھوڑ گئے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تحقیق، تنقید و تجسس کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گا۔

حضرات! میں ابھی اور بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن صاحب صدر نے چوتھی بار مجھ کو اشارہ کیا ہے کہ میں اپنا مقالہ ختم کروں۔ چنانچہ ان کے حکم کی تعمیل میں ختم کرتا ہوں کہ "ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے" اور انشاءاللہ قیامت تک روتی رہے گی لیکن علامہ بقول صحرائی ایسا دیدہ ور دوبارہ چمن میں پیدا نہیں ہوگا۔

دو شعر

بھلا نہیں تو کسی کا بھی تم بُرا نہ کر
چھری بغل میں چھپا کر مگر پھرا نہ کر

جو ہو سکے تو بنو پھول تم کتابوں کے
ورق کتاب کا بن کر مگر رہا نہ

پیروڈی

یہ کیسا آج کل کا تماشہ ہے دوستو
لیڈر کے ٹھاٹھ تو کسی راجہ سے کم
کرسی کی فکر ہے انھیں پرجا کا غم
سرکاری عہدیداروں کا تُمبر نہ پو
ان کے کلرک! شانِ سکندر نہ پو

"پی ون" بھی اپنے وقت کا بادشاہ ہے
یہ کیسا آج کل کا تماشہ ہے۔

★

امام رانچوری

اشرف خوندمیری

"چٹ لگیئے اچار کی"

اُس کی ہراک بات فقط پیار کی مٹار کی   راگنی ہمیشہ اُنے چھیڑ نیئے ملہار کی
شادی کر کو جب سے مَیں بی زُلفوں کا قیدی بنوں   میری اَتڑی سَڑ کو منجے لَت پڑیئے ڈکار کی
مَیں پلنگ کی پٹی بنوں، چاک اُنے نوار کی
پھر بی مری سنولی بی کو چٹ لگیئے اچار کی

اِتی عُمر میں بی ہمیشہ مرے فراغ[1] میں   بتّی بن کو جلتیئے اُنے پیار کے چراغ میں
جب بی دیکھو رہتیئے بھنڈولی فقط بہار پو   اُس کی اُمیدوں کے گجگجاتے ہوئے باغ میں
چار مہینے پہلے کھلئے اک کلی انار کی
پھر بی مری سنولی بی کو چٹ لگیئے اچار کی

سوب کی دھن مڑیاں تو کب کی کٹ کو فراغت ہوئیں   میرے دھن مڈیوں میں اَبی کتّے کی فصلاں کھڑئیں
کتّے کی لوگوں کے آرزوں پو راشن لگائے   نکّو بولے تو بی میرے گھر میں پلٹھناں لگیں
میری چھاؤنی میں بی اک فوج ہے ڈھنگار کی
پھر بی مری سنولی بی کو چٹ لگیئے اچار کی

جھنجھنا بنا کو مری ہڈّی پسلی توڑ کو   گلگلا سمجھ کو منجے ہر طرف جھنجھوڑ کو
پلپلا بنا کو رکھ دی ڈھولویں لیمبو کے نات   جینڈی چینڈی کر دی منجے زندگی نچوڑ کو
میں چپک کو جمیو بنوں، بھینس اُنے برار کی
پھر بی مری سنولی بی کو چٹ لگیئے اچار کی

فاقہ مستی جب سے بڑھیئے تھوبڑا پپیلا ہوائے   مفلسی میں قسماں سے آٹا بی گیلا ہوائے
سارے نٹاں سلیپ ہوئیں، باڈی کھٹارا بنیئے   پیٹ کی لڑائی میں مرا خدکھت ڈھیلا ہوائے
بھوک میرے پیچھے لپیٹئے پتنگ بن کو تار کی
پھر بی مری سنولی بی کو چٹ لگیئے اچار کی

جاں بی ذرا ڈھلکی لگی وانچ ڈھلکنے پو ہوں   کیوں قبر میں ٹانگیں مرے میں لٹکنے پو ہوں
جس سفر پو جا کو لوگاں پھر کبی پلٹتے نئیں   اُس سفر پو آج میں بی نکو سرکنے پو ہوں
میں بی جھوٹی آس پو پلی بنوں دوار کی
پھر بی مری سنولی بی کو چٹ لگیئے اچار کی

★

رشید قریشی
(ایم۔ اے)

فانی صاحب کی ایک غزل

میری فوقانی تعلیم کا ایک سال دارالشفاء ہائی اسکول میں گزرا۔ اس وقت فانی صاحب اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور چونکہ ہیڈ ماسٹر کو بھی کچھ نہ کچھ پڑھانا پڑتا تھا اس لیے وہ فوقانی جماعتوں کو اردو پڑھاتے تھے۔ وہ نہ صرف ہیڈ ماسٹر تھے بلکہ ایک مشہور شاعر بھی تھے اس لیے ان کے گھنٹہ میں ایک مرعوب خاموشی طاری رہتی۔ وہ جب کمرہ میں داخل ہوتے سب کھڑے ہو جاتے اور وہ کرسی پر بیٹھ جاتے، تب ہی اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھتے۔ یہ عمل اس احتیاط اور خضوع و خشوع کے ساتھ ہوتا جیسے نماز کے ارکان ادا ہو رہے ہیں۔ فانی صاحب ہلکے سرخ رنگ کی رومی ٹوپی اور اکثر سیپ کی چمکتی گنڈیاں لگی ستھرے سلک کی شیروانی پہنتے تھے۔ ان کا چہرہ خاص طور پر بہت متاثر کن تھا۔ پیلی پیلی افسردہ رنگت "ستواں ناک" سوچتی ہوئی سوجھی سوجھی آنکھیں، ان سے کبھی آنکھیں چار ہوتیں تو یہ محسوس ہوتا وہ دیکھ تو رہے ہیں لیکن جس کو دیکھ رہے ہیں وہ ان کو نظر نہیں آ رہا۔ وہ پڑھاتے بھی اس طرح تھے جیسے اس کام میں انہیں دلچسپی نہیں۔ بس ایک فرض ہے جو ادا ہو رہا ہے۔

فانی صاحب سنبھل کر پوری جماعت پر ایک اچٹتی نظر ڈالتے اور اسی وقت جماعت کا مانیٹر کھڑے ہو کر کتاب کھولتا اور اس دن کے سبق کی نشاندہی کرتا

یہ مانیٹر لمبا تڑنگا، چوڑا چکلا اور کافی عمر کا طالب علم تھا۔ اسکول میں اس کا کام صرف یہ تھا کہ فٹ بال کے میچوں میں گول کیپر بنا رہے اور بے فکری کے ہر سال امتحان میں فیل ہوتا رہے۔ وہ مسلسل چار سال سے اسی جماعت میں تھا اور اکڑتا تھا کہ اس جماعت کی مانیٹری کی خاطر قصداً فیل کیا جاتا ہے... میں تو ایک ہی شاٹ میں امتحان کا گول کر دوں... ہم دل ہی دل ہنستے کہ ڈینگیں نہ مارو مانیٹر صاحب، امتحان فٹ بال نہیں ہے جو آپ کی شاٹ میں اُڑ جائے... جونہی مانیٹر کھڑا ہو جاتا، فانی صاحب دھیمے خشک لہجہ میں کہتے "افضل الدین تمہیں کھڑے رہنے کی ضرورت نہیں۔ بیٹھے بیٹھے ہی جو کچھ کہنا ہو کہدیا کرو..." ہم فانی صاحب کے مزاح کو سمجھ کر ہنس پڑتے لیکن فانی صاحب ذرہ برابر بھی نہ مسکراتے۔

ایک دن مانیٹر صاحب نے جماعت میں اعلان کیا... کہ کل سب کو حاضر رہنا ہے... فانی صاحب اپنی غزل مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ... بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ... کا مطلب سمجھانے والے ہیں۔

جس زمانے کی یہ بات ہے اس وقت شاعری کو طربیہ محفلوں میں گانے کی چیز سمجھا جاتا تھا اور کسی شاعر کی مقبولیت کا معیار بھی یہی تھا کہ اس کا کلام طوائفیں گاتی ہیں یا نہیں۔ مجھے یاد ہے شادی کی ایک صبح تا نصف النہار دعوت میں طائفہ کا انتظام تھا۔ دُلہا مسند پر بیٹھا تھا اور اس کے خوش مزاج دوست شوخ کلامیوں اور شریر حرکتوں سے دھوم مچا رہے تھے۔

اچانک ایک نوجوان کی نظر گانے والی کے چہرے پر جم گئی اور اس نے فانی صاحب کی اسی غزل کی فرمائش کر دی۔

گانے والی بہت خوش ادا اور بہت زیادہ خوبصورت تھی... اس نے فرمائش کرنے والے نوجوان کی جیب سے دس کی نوٹ کو یہ نکالتے دیکھا اور اپنی حنا بستہ انگلی سے ہونٹوں کی سرخیوں کو دباتی... مسکراہٹ کی کلیاں چٹکاتی... فانی صاحب کی غزل اس طرح چھیڑ دی کہ جیسے آتشبازی کا انار چھوٹ نکلا۔ وہ جب اس شعر پر پہنچی:

اک اٹھا شورِ ماتم آخری دیدار میت پر
اب اٹھا چاہتی ہے لاشِ فانی دیکھتے جاؤ

تو فرمائش کرنے والے نوجوان نے دولہے کی دستار پر دس کا نوٹ پھنسا دیا۔ گانے والی کو اشارہ ہوا تو وہ ایک اندازِ مستی میں بل کھاتی اُٹھ کھڑی ہوئی اور اِٹھلاتی دولہے کی طرف بڑھنے لگی۔ سارنگی نواز بھی اپنی مونچھ کو سارنگی کے تاروں سے چھڑا کر، سارنگی اٹھایا ہوا گانے والی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ گانے والی دہرانے لگی ـــ اب اٹھا چاہتی ہے لاشِ فانی اور دلہا پہ آنکھیں جمائے اس کے مقابل بیٹھ گئی۔ زری کی ساڑی کے پلّو کو اس نے گھونگھٹ بنا لیا... اس اہتمام سے کہ ایک آنکھ باہر لگی رہے۔ اس کھُلی آنکھ نے نہ جانے کیا جادو کیا کہ محفل بھڑک اُٹھی۔ منتظمین جو ادھر ادھر کاموں میں جُتے ہوئے تھے... گانے کی محفل میں آ گئے۔ اپنی موجودگی کے جواز کے لئے وہ گلاسوں اور طشتریوں کو فرش سے اٹھا کر طاقوں میں رکھتے اور طاقوں سے اٹھا کر میزوں پہ جا دیتے.... ان دوران کنکھیوں سے گانے والی کو بھی دیکھتے رہتے کہ اس آشوبِ محفل کے ہر کرشمہ سے ان کی نظر کو بھی حصہ ملتا رہے۔ ساز و آواز کے اس سنگم پہ موتیا کی مہک کو بریانی کی خوشبو لے اڑی تو کچھ عمر رسیدہ لوگ بھی چلے آئے۔ دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر کمر سیدھی کرتے ہیں تو کمر سیدھی کی سیدھی ہی رہ جاتی ہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ جب تک گانے والی گاتی رہے گی... یہ کمر یونہی سیدھا رہے گی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ زنانہ سے نوجوان لڑکیاں روتے ہوئے چھوٹے بچوں کو

گودوں میں اٹھائے آئیں اور ان کے رونے کی آواز کو دبانے کے لئے ان کے منہ پہ ہاتھ رکھ کر، گانا سنتی کھڑی رہیں۔ اب اٹھا چاہتی ہے۔ لاشِ فانی۔۔۔۔ اور گانے والی اٹھ کر دو زانو بیٹھ گئی۔۔ اور دس کا نوٹ دولھے کی دستار سے اچک لینے کے لئے جھکی ہی تھی کہ دولھے کے دوستوں کے سر دولھے کے سر سے بھڑ گئے۔ سروں کے اس جمگھٹ کو اپنے سر سے توڑ کر گانے والی نے آخر دس کا نوٹ اپنے ہونٹوں سے اٹھا ہی لیا۔ اس نوٹ کو سارنگی نواز کی جیب میں ڈالتے ہوئے، وہ شرماتی، بال سنوارتی۔۔۔ اپنی جگہ آ بیٹھی۔۔۔۔ دلہا محفلی ہنسی ہنستا اپنی لال ریشمی دستی سے چہرہ پونچھتا بیٹھا رہا۔

خوشی یا غم کے اثر کو قبول کرنے میں اِنسان کا رویہ کبھی کبھی ناقابلِ فہم ہو جاتا ہے۔ خوش رہے گا تو غم کو بھی خوشی کا رنگ دے لے گا، غم زدہ ہوگا تو خوشی کو بھی غم بنالے گا۔ لیکن فانی صاحب کا معاملہ کچھ مختلف تھا۔ اسکول میں مشہور تھا کہ ان کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ وہ وقت سے پہلے چل بسی تو انھوں نے اس صدمہ کا اتنا اثر لیا کہ ان کے ساتھ ان کی شاعری بھی غم زدہ ہوگئی۔ ایک ہمارے استاد رضا صاحب تھے۔۔۔ وہ کہتے تھے، فانی صاحب کی بیوی کے بجائے فانی صاحب کو موت آجاتی تو اردو شاعری قبرستان میں رونق نہ بیٹھتی لیکن افضل الدین مانیٹر کہتا تھا فانی صاحب اپنے گھر میں خوش بہ خوش رہتے ہیں۔ دوستوں سے گپ شپ ہوتی ہے۔ شعر شاعری چلتی ہے۔ بالکل پتہ نہیں چلتا۔ ان کو بیوی کے مرجانے کا غم ہے۔۔۔ میں خود انھیں ان کے گھر میں دیکھ آیا ہوں۔ وہ کچھ سنجیدہ ہو کر کہنے لگتا ___ یہ غم اپنی شاعری کو ایک خاص رنگ دینے کے لیے ہے اور کچھ نہیں۔۔۔ لیکن ہمارے شعور کی رسائی تو صرف اس حد تک تھی کہ ان بے چاروں کی بیوی مرگئی ہے۔

فانی صاحب کمرہ میں داخل ہوئے۔ سب آرزو مندانہ عقیدت کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ وہ بیٹھ گئے تو مانیٹر نے کتاب کھول کر سامنے رکھ دی اور مسکراتے ہوئے کہا "صاب! آج آپ کی اس غزل کا مطلب آپ سے سنیں گے" مانیٹر اپنے آپ کو استادوں کا بھی مانیٹر سمجھتا تھا اس لیے کبھی کبھی فانی صاحب کے آگے بھی ڈھیٹ ہو جاتا تھا اس نے ہم سبھوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

فانی صاحب گردن جھکا کر اپنی غزل پڑھنے لگے اس کے بعد کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری اور مقابل کی دیوار کو تکنے لگے۔ یکایک وہ کانپ سے گئے لیکن فوری سنبھل بھی گئے اور پہلی بار ان کے ہونٹوں پہ سے مسکراہٹ کا تیز رفتار سایہ گزر گیا۔

انھوں نے کتاب کا ورق الٹ دیا۔ اس کے بعد کون سی غزل ہے ؟۔۔۔ انھوں نے پوچھا اور مانیٹر کھڑا ہو گیا "صاب ہم سب آپ سے آپ کی غزل کا مطلب سننا چاہتے ہیں اور آپ۔۔۔۔ فانی صاب نے ٹوک دیا ___ "بیٹھ جاؤ افضل الدین اور جماعت سے مخاطب ہوئے "میں اپنی غزل کا مطلب نہیں سمجھاؤں گا۔ کیونکہ اگر میں ایسا کروں تو میرے اشعار کے مطالب محدود ہو کر رہ جائیں گے۔ لوگ بعد میں کہیں گے خود فانی نے اس شعر کا یہ مطلب بتایا۔ اب کوئی دوسرا مطلب مستند نہیں ہو سکتا۔" مانیٹر نے بیٹھے بیٹھے سرکش لہجہ میں کہا۔

"تو پھر جانے دیجئے، کچھ بھی نہ پڑھائیے" فانی صاحب کے چہرہ کا رنگ سرخ ہونے لگا۔ انھوں نے

مانیٹر کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔ "افضل الدین کھڑے ہو جاؤ" اور جماعت کو گھورتے ہوئے کہا: "میں ڈرل ماسٹر کو بھیجتا ہوں، وہ میری غزل کا مطلب آپ کو اچھی طرح سمجھا دیں گے۔" انھوں نے اپنی گردن، دو تین دفعہ ادھر اُدھر پھیری اور جماعت چھوڑ کر چلے گئے۔

ادھر فانی صاحب گئے اور ہم نے مانیٹر کو گھیر لیا "کیا بات ہے بچا آج آپ کو کھڑا کیا گیا اور ڈرل ماسٹر صاحب کو مزاج پرسی کے لیئے بھیجا جا رہا ہے؟ مانیٹر ہنسنے لگا "فانی صاحب جب فانی نہیں ہوتے۔ ہیڈ ماسٹر ہوتے ہیں' بہت تیز نظر اور زود رنج ہو جاتے ہیں مجھے ان کی "دیکھتے جاؤ" والی غزل کے بارے میں معلوم ہے کہ اس میں ان کے دل کا درد دفن ہے۔ اس لیئے میں نے اس غزل کو ایک رسالہ سے کاٹ کر، ان کی آج کی غزل، دنیا مری بلا جلنے سستی ہے یا مہنگی ہے، پر چسپاں کر دیا تھا۔ اگر فانی صاحب اس غزل کا مطلب سمجھانے پر آمادہ ہو جاتے تو ہم غزل کے ساتھ شاعر کو بھی روتا ہوا دیکھ لیتے لیکن لاشِ فانی تو پیچ و تاب کھاتی اٹھ کر چلی گئی۔ مانیٹر کے تبصرہ پر ہم چپ رہے تو اس نے غصّہ سے آنکھیں پھاڑ لیں۔ ہم سبھوں کو ہی۔ ہی۔ ہی ہنسنا پڑا۔ اس دکھاوے کی ہنسی کے پیچھے ہمارے دلوں کا وہ گھاؤ تھا جو مانیٹر کے گستاخ طنز سے لگا تھا۔ ہمیں تصور میں بھی فانی صاحب کو لاش کی شکل میں دیکھنا گوارا نہ تھا۔

فانی صاحب کو تو زندگی کے کٹھن سفر میں ابھی بہت سی جاں لیوا منزلیں طے کرنا تھا۔ ان کو ملازمت سے علٰحدہ ہونا تھا۔ گزر بسر کے لیئے شاہی دربار سے وابستہ ہو جانا تھا۔ اپنی وضعداری کو قائم رکھنے کے لئے قرض لیتے رہنا تھا۔۔۔ پھر قرض خواہوں کے ڈر سے گھر میں چھپ بیٹھنا تھا اور آخر اس ناقابل برداشت زندگی سے بے زار ہو کر اپنے فانی جسم کو چھوڑ جانا تھا، اور ان کی لاش کو اس وقت تک سڑتے رہنا تھا جب تک کہ محکمہ آرائش بلدہ کے لاوارث لاشوں کے فنڈ سے تجہیز و تکفین کی رقم منظور نہ ہو جاتی ۔۔۔۔ اور یہ افضل الدین مانیٹر کہہ رہا تھا۔ لاشِ فانی پیچ و تاب کھاتی اُٹھ کر چلی گئی میاں ایڈیٹر کہیں کا ۔۔۔۔۔۔

طالب خوندمیری

بڑے میاں

(نذرِ بھارت چند کھنہ — صدر زندہ دلانِ حیدرآباد)

سن میں ہیں ساٹھ سے بھی زیادہ بڑے میاں
پھر بھی ہیں تندرست و توانا بڑے میاں

بچوں کے ساتھ ہوں تو ہیں بچّہ بڑے میاں
بوڑھوں کے درمیان ہیں "قبلہ" بڑے میاں

ماضی بعید میں بھی بہت دلنواز تھے
دورِ جدید میں بھی ہیں تازہ بڑے میاں

"کب سے ہیں، کیا بتاؤں "جہانِ خراب میں"
برسوں سے کھا رہے ہیں وظیفہ بڑے میاں

رکھتے ہیں آئینہ سے زیادہ سنبھال کر
بوڑھے بدن کو اپنے ہمیشہ بڑے میاں

زندہ دلاں کے صدر تو برسوں سے ہیں مگر
خود اپنی ذات سے ہیں ادارہ بڑے میاں

"نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"
پھر بھی ہیں ریس کورس کے رسیا بڑے میاں

دیکھو تو ایک حرف کی صورت ہیں مختصر
سمجھو تو اک طویل فسانہ بڑے میاں

تیکھی، لطیف، نرم طبیعت کے ساتھ ساتھ
رکھتے ہیں طنز کا بھی سلیقہ بڑے میاں

باہم رقابتوں کی، عداوت کی دھوپ میں
ٹھنڈا، گھنا، خلوص کا سایہ بڑے میاں

نذرِ گڑبڑ حیدرآبادی

دفعتاً اُٹھ گئے جو محفل سے
کس سے ملنا تھا کیسی عجلت تھی
بھائی صاحب! سکون سے مرتے
اتنی گڑبڑ کی کیا ضرورت تھی

٥

غزلیں

سرپٹ حیدرآبادی

خود بخود چمکے وہ، جن کے بھی مقدر چمکے
تھا چمکنا ہمیں، ہم سوچ سمجھ کر چمکے

چمکے جو اوروں کے چمکانے سے کیا اُسکی چمک
قابلِ قدر ہے جو اپنے ہی بَل پر چمکے

جو رہِ راست پہ چمکے نہ کبھی، وہ ہم ہیں
بالمقابل ہیں وہ، جو راہ بھٹک کر چمکے

ساتھ ہا اپنے رہی گمنامی، جہاں بھی رہے ہم
کہیں باہر ہی نہ ہم چمکے، نہ اندر چمکے

مستحق سینکڑوں ہیں مارے گئے موجِ حقوق
نہ چمکنا تھا جنھیں، ایسے بھی اکثر چمکے

اسی تنظیم پہ قائم ہے زمانے کا نظام
بیویاں چمکیں کہیں اور کہیں شوہر چمکے

ہیں حسیں سیکڑوں حاصل نہ ہوا جن کو فروغ
کچھ حسین، عشق کی نظروں میں سما کر چمکے

بے وفا کے لئے جان سے گئے اربابِ وفا
ڈوب کر بحرِ محبت میں شناور چمکے

ڈاروِن ہی کی وہ تھیوری ہے جو ہے پیشِ نظر
بن کے انسان، اُسی دور کے بندر چمکے

ان کے جوڑے میں نظر آتا ہے یوں سرخ گلاب
جس طرح گاڑیوں کی پشت پہ ڈینجر چمکے

سر ہمارے ہی ہمیشہ رہا سرپٹ سہرا
ایک دو بار نہیں، ہم تو برابر چمکے

بوگس حیدرآبادی

میک اَپ کئے اک حُسن ابھی تھا مرے آگے
اے دوست یہ لڑکی تھی کہ لڑکا مرے آگے

بچپن میں یہی کھیل تھا اب بھی ہے یہی کھیل
رہتی ہے ہمیشہ کوئی گڑیا مرے آگے

اک سال بھی شادی کو گزرنے نہیں پایا
آیا میری محنت کا نتیجہ مرے آگے

محبوبہ نے خط میرا عدالت میں کیا پیش
آیا میری تقدیر کا لکھا مرے آگے

غالب کا نبیرہ ہوں مرا نام ہے بوگس
بچے میرے پیچھے ہیں تو دادا مرے آگے

محمد برہان حسین

ہیون سانگ کا دوسرا سفر

میں مسمی ہیون سانگ چین میں پیدا ہوا اور زندگی بھر بے چین رہا ۔ میرا پہلا سفر ہند قبل مسیح میں کبھی ہوا تھا۔ اس وقت شمالی ہند میں ہرش وردھن اور جنوبی ہند میں پلاکیشن کی حکومت تھی ۔ ایک دن ہرش وردھن نے مجھے کہلا بھوایا کہ جنوبی ہند سے ہمیں دعو کیا گیا ہے۔ دریائے نربدا کے کنارے ۔ چنانچہ ہم لوگ فوجوں اور ساز وسامان کے ساتھ نربدا کے کنارے مقیم ہوئے دوسری طرف پلاکیشن بھی ٹھیرا ہوا تھا ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دریائی جنگ کا ارادہ ہے۔ میں نے خشک دریا کو دیکھ کر پوچھا " مگر دریا کہاں ہے ؟" تو جواب ملا " ابھی بارش ہوگی تو دریا میں پانی آئے گا تب کہیں کشتیاں ڈالی جائیں گی ۔" چنانچہ اس دوران دونوں بادشاہ ایک دوسرے کو مزے دار کھانوں کے خوان اور تحفے تحائف بھواتے رہے ۔ تین ماہ کے قیام کے بعد بارش ہوئی اور پانی آیا اور جنگ ہوئی ۔ لیکن دونوں فوجیں خشکی کی جنگ سے واقف تھیں ۔ دریا میں ان کا وہی حال تھا جیسے شیروں کا پانی میں ہوتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ ڈرا ہو گئی ۔ دونوں بادشاہوں نے ایک دوسرے کو فتح وکامرانی کا سونے کا شیلڈ اور سرٹیفیکٹ روانہ کیا ۔ اس کے بعد ہی ہرش وردھن نے مجھ سے خواہش کی کہ وہ مزید ویزا کی توسیع نہیں دے سکتا ۔ لہٰذا میں ہندوستان چھوڑ دوں ۔ چنانچہ میرا گرین کارڈ لے لیا گیا اور میں واپس چین ہو گیا ۔ لیکن چین سے نہ بیٹھ سکا اور پورے سوا دو ہزار سال بعد واپس ہندوستان ہوا ۔

یہاں آکر معلوم ہوا کہ میری پچھلی سیاحت کے وقت کے وادیٔ سندھ کے مشہور شہر ہڑپہ اور موہنجوداڑو کو کھود نکالا گیا ہے لہٰذا قصد کیا کہ وہاں ضرور جاؤں گا ۔ دلی میں ہر طرف پگڑ باندھے اور داڑھیاں بڑھائے لوگ نظر آئے ۔ ایک میدان میں ایسا ہی شخص تیز رفتار موڑ لگا کر گھاس پر لیٹ گیا ۔ میں نے اس سے پوچھا " یو آر Relaxing " تو وہ بولا ۔ " نو ۔ آئی ۔ ایم ۔ ملکھا سنگھ " : آخر کے فقرے میں واقف نہ تھا ۔ گھبرا کر آگے بڑھ گیا ۔ سڑک پر ایک شخص سے پوچھا کہ اسٹیشن کدھر ہے ؟ تو اس نے اس قدر پیچیدہ پتہ بتایا کہ میں سمجھا میرے سفر نامہ کا ترجمہ سنا رہا ہے ۔ آخر میں کہا ۔ " سیدھا سکوٹر لے کر اسٹیشن چلے جاؤ ۔ اسٹیشن پر ویسے ہی داڑھیوں اور پگڑیوں والے انکوائری پر بیٹھے ایک دوسرے کو " رُڈ نے ، ہوئے ہوئے " کہہ کر

باتیں کر رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا۔ "ہڑپہ اور منجو دارو کے لئے کون سی ٹرین جاتی ہے۔"

وہ تینوں بڑی دیر تک ریلوں کی کتابوں کو اُلٹتے پلٹتے رہے۔ آخر ایک نے کہا۔

"او تو نے کڑپہ جانا ہے؟ اُوئے اُدھر آندھرا پردیش ایکسپرس سات بجے شام پلاٹ فارم پانچ سے جائے گا۔"

میں وہاں سے جھٹ گھر پر آیا تو معلوم ہوا کہ ایک ہفتہ تک کے سارے ٹکٹس بک چکے ہیں۔ سوچا کہ کیوں نہ پیدل سفر کروں۔ اتنے میں ایک لال قمیص والا آیا اُس نے کہا۔ "آج شام کے ٹکٹس دوں گا مگر دس روپیہ زیادہ لوں گا۔" ہم نے فوراً لے لئے۔ یہ طریقہ ہمیں بڑا پسند آیا کہ انسان اس طریقہ کی بدولت بلا تکلیف جب چاہے سفر کر سکتا ہے لیکن اس کا باقاعدہ کاؤنٹر قائم کرنا چاہئے

شام ٹرین میں اوپر کی برتھ پر بیٹھا سفر کر رہا تھا کہ نیچے کی برتھ والے نے پوچھا۔

"اوئے تم کدھر جائے گا؟"

میں نے کہا۔ "ہڑپہ اور موہنجو دارو۔"

تو وہ حیرانی سے بولا۔ "وہ تو اُدھر شمال میں ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں!"

وہ میرے اطمینان پر اور حیران ہوا اور بولا۔ "کیا سائنس کا برکت ہے۔ ایک ہی ٹرین کی اوپری برتھ والا شمال کو جاتا اور نیچے والا جنوب کو جاتا ہے۔"

یہ بات مجھے تب سمجھ میں آئی جب میں سکندرآباد پہنچ چکا تھا کہ انکوائری والے نے ہڑپہ اور موہنجو دارو کو کڑپہ اور کرنول سمجھا تھا۔ خیر میں عرصہ سے جنوبی ہند اور جنوبی ہند والوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جب سے میں کو بُھنتور گوپال کرشن سبرامنیم ستیا نارائن نامی شخص سے ملا تھا۔ یہ لوگ بڑے ہوشیار اور کاہل ہوتے ہیں۔ دہلی میں سکریٹریٹ کی پختہ عمارتوں میں ایرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر قلم چلاتے ہیں اور شمالی ہند کے لوگ چلچلاتی دھوپ میں محنت کے کام کرتے ہیں۔ شمالی ہند کے لوگ خوب ورزش کر کے فوج میں بھرتی ہوتے ہیں اور مرکھپ کر فوجی انعامات لیتے ہیں جب کہ جنوبی ہند والے روز اشنان کر کے اُپما کھاتے ہیں اور بھارت ناٹیم ناچتے ہیں اور پدما بھوشن کا انعام مل جاتا ہے۔

میں نے حیدرآباد میں بڑے بڑے آم کھائے جس کو پدّا رسال کہتے ہیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ شمال کے لوگ پچیس (۲۵) آم چوسنے کی ورزش کرتے ہیں تو جتنا رس ملتا ہے اتنا ایک حیدرآبادی ایک پدّا رسال چوس کر بلکہ نچوڑ کر حاصل کر لیتا ہے۔

ہندوستانی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو وطن میں رہتے ہیں دوسرے وہ جو دنیا کے کسی اور ملک میں رہتے ہیں۔ جو ہندوستانی دوسرے ملکوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اُن کی یہاں بڑی قدر ہوتی ہے اور جو یہاں تعلیم پاتے ہیں اُن کی دوسرے ملکوں ہی میں عزت ہوتی ہے۔ جو ہندوستانی عرب، افریقہ اور یورپ میں ہیں وہ بہت خوش ہیں کیونکہ وہاں نہانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دنیا بھر میں اونٹ اور ہندوستانی دو ایسے جاندار ہیں جو بغیر کھائے اور بغیر نہائے بڑے عرصہ تک زندہ

رہتے ہیں۔

وطن میں رہنے والے ہندوستانی، دیسی کہلاتے ہیں۔ ان کو باہر رہنے والے ہندوستانی 'You Indian' کہتے ہیں۔ تمام ہندوستانی مغربی تہذیب اختیار کرتے ہیں اور اپنی تہذیب پر صرف فخر کرتے ہوئے اس کو میوزیموں میں غیر محفوظ کر دیتے ہیں تاکہ شوقین بدیسی اس کو چرا کر لے جا سکیں۔ اسی لئے مشہور ہے کہ اگر ہندوستانی تہذیب دیکھنا ہو تو لندن میوزیم دیکھئے۔

جنوبی ہند میں ہندو مسلمان بستے ہیں لیکن دونوں مل کر رہنے کی وجہ سے سیاسی جمود پیدا ہوگیا ہے۔ افسوس ہے کہ شمال میں ہندو مسلم سکھ فسادوں سے ترقی کر کے اب شیعہ سنی، برہمن اَنا برہمن قسم کے فساد ہونے لگے ہیں اور ابھی جنوب میں لوگ دقیانوسیت کے میل ملاپ میں لگے ہوئے ہیں۔

چنانچہ حیدرآباد شہر کو بسے ہوئے چار سو برس ہوئے اور اس دوران صرف چار اہم واقعات کا ظہور ممکن ہو سکا۔ پہلا فتح گولکنڈہ یعنی دشمنوں نے گولکنڈہ کو فتح کیا۔ دوسرا موسیٰ ندی کی طغیانی۔ تیسرا پولیس ایکشن اور چوتھا ابھی نہیں ہوا۔ یہاں انگور، سیتاپھل اور لڑکیاں اچھی ہوتی ہیں جن کو برآمد کیا جا رہا ہے۔ آب و ہوا کی تو آبادی بڑھنے سے کمی ہوتی جا رہی ہے۔ خدا رحم کرے۔

اَن پڑھ بھونگیری

غزل

فرمائشوں سے بیوی کی ویران ہوگیا
ہر اج گھر کا سب مرے سامان ہوگیا

اکلِ حلال کھایا تو بے جان ہوگیا
مُردار مال کھا کے پہلوان ہوگیا

کھائی تھی اُنکی آنکھوں کی میں نے کبھی قسم
سارے حکیم کہتے ہیں یرقان ہوگیا

دو چار بار دیکھا تھا اب بھونکتا نہیں
کُتّا بھی اُن کے گھر کا مہربان ہوگیا

کڑکی میں میرے پاس نہ پھٹکا کوئی مگر
آتے ہی زر، زمانہ مہربان ہوگیا

آنے سے پہلے سالوں کے، گھر میں سکون تھا
برپا بس اُن کے آتے ہی طوفان ہوگیا

بیگم نے آج گول بنایا ہے بیسواں
لو پورا میری ساس کا ارمان ہوگیا

جب تھا کنوارا موج اُڑاتا تھا رات دن
شادی جو کی تو یارو پریشان ہوگیا

دارے دا ولورے دا درسے دارے
مطلع تیار ہوگیا نارے
آنکھ جوں ہی لگی اندھیروں کی
دن دوا لے نکل گئے تارے
ہوگیا منھ بخار سے پھیکا
چپٹا گوشت تل کے لا تارے
پیتہ مشکوک اور لیٹر بے رنگ
مرگئے پھرتے پھرتے ہرکارے
ہوگئی ہر طرف جو نس بندی
سیل ہوتے نہیں ہیں گھوارے
میں چمن میں بھٹک نہ جاؤں کہیں
مجھ کو انگلی پکڑ کے لے جا رے
ہر کلی کر رہی ہے، ہی ہی ہی
یہ ہے کس زندہ دل کا سہرا رے
دیکھ لو ہیں وہی بھلاویں شاہ
گورے مکھڑوں میں ہے جو کالا رے

عظمت بھلاواں

جتنے جادو بیاں ہے اُنھیں چھوڑ دے
جتنے ہکلے ہیں ان سب کے منھ توڑ دے
ان فضولوں سے اندھے کنویں پاٹ دے
ہاتھ کیا ہو سکے تو زباں کاٹ دے
اتنا کر دے بڑا کام ہو جائے گا
کونے کونے ترا نام ہو جائے گا

...گاہِ خداوندی میں اُردو کی فریاد

...ے مالک ادب کی بھی لے کچھ خبر
...ل دے اک عدد طائرانہ نظر

...بندی شعرا کا استاد

...ہ کھانے کی فکروں سے آزاد ہوں
...ونکہ نو مشق شعرا کا استاد ہوں
...قے کر کر کے مجھ کو کھلاتے ہیں یہ
...نی خود پی کے مجھ کو پلاتے ہیں یہ
...س نحوست میں زیر و زبر ہو گئے
...ار آمد جو تھے بے ضرر ہو گئے
...ہے قیامت سی چاروں طرف ابتری
...نیچروں کی بہت ہو گئی شاعری

اردو کے لکچرر

...یسے اردو کے بھی ہیں کئی لکچرر
...ابلیت ہے جن کی صفر ہی صفر
...نوٹس [illegible] غیرہ کے لاکر لکھاتے ہیں یہ
ایک کاپی سے روزی کماتے ہیں یہ

...عاجزانہ درخواست

...میرے مالک ادیبوں کی لینے خبر
ایک دن کے لئے آسماں سے اُتر

حبیب ضیاء

دسترخوان کی شیرنیاں

(یہ مسیح انجم صاحب کے "دسترخوان کے شیروں" کی بیویاں ہیں)

مردانے دسترخوان پر ٹوٹ پڑ کر، کنگال پن سے کھانے والوں کو "دسترخوان کے بلاوڈر" کا نام دیا جاتا ہے۔ گذشتہ دنوں نبل، مسیح انجم صاحب نے "دسترخوان کے شیر" کہہ کر ان کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔ دسترخوان کے شیروں کی طرح دسترخوان کی شیرنیاں بھی لائق ستائش ہیں۔ آپ نے اکثر دعوتوں میں دیکھا ہوگا کہ مردانے میں کھانا ختم ہونے کے بعد عورتوں کو آواز دی جاتی ہے خواتین جو صبح سے بھوکی رہ کر آتی ہیں صاحب خانہ کی ایک ہی آواز پر بغیر ہاتھ دھوئے دسترخوان کی طرف لپک پڑتی ہیں۔

ان کے کھانے کا ڈھنگ بڑا شریفانہ ہوتا ہے۔ ان ماؤں کو دعا دینے طبیعت چاہتی ہے جنہوں نے ایسوں کو پیدا کیا اور کھانے کا سلیقہ سکھایا۔ آج کل تو چوکیوں کا طریقہ ہے۔ عموماً ایک چوکی پر آٹھ لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ آٹھ خواتین میں گر ایک بھی "شیرنی" ہے تو سمجھئے کہ بقیہ ساتوں کی قسمت پھوٹی۔ دسترخوان پر اگر مرغ ہو تو آٹھ کا حصہ ایک ہی شیرنی انڈیل لیتی ہے ور اطمینان سے دوسروں کی پرواہ کیے بغیر شروع ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ ایسی ہی چوکی پر ہمیں جگہ ملی تھی جس پر شیرنی کے ساتھ اس کی سولہ سالہ بدتہذیب لڑکی بھی تھی۔ سنا کہ شہر کے کسی بڑے کالج میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتی تھی۔ دسترخوان پر بیٹھتے ہی اس نے بریانی کے اوپری حصہ پر جتنی بوٹیاں تھیں، اپنی پلیٹ میں ڈال لیں۔ والدہ صاحبہ نے گرم بریانی کے بہانے کھانے کی ڈش میزبانی کے حوالے کی۔ لڑکی جو کافی تیز رفتار سے کھا رہی تھی، نئی بریانی کو دیکھ کر جلدی جلدی انگلیاں چاٹنے لگی۔ جوں ہی یہ رسم ختم ہوئی اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پورا ہاتھ پنجہ سمیت بریانی کی پلیٹ میں ڈال دیا۔ کافی تلاش کر کے جو بھی ملا اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ اس حرکت کے بعد فاتحانہ انداز سے ہمیں دیکھنے لگی۔ گویا کہہ رہی ہو ہمت ہو تو اب کھا کے بتاؤ ——— ایسے لوگوں کو سبق سکھانے کے لیے بعض مہذب مگر شریر خواتین بطور انتقام میٹھے کی پلیٹیں اپنے قبضہ میں لے لیتی ہیں۔

رجب کے کونڈوں کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ شیرنیاں پوری تیاری کے ساتھ بھوکی رہ کر اپنی ٹیم کو لے کر آتی ہیں۔

ایک صاحبہ خود بھی رکابی بھر کھیر میں پوریاں چور چور کر کھا رہی تھیں اور اپنی بچی کو بھی زبردستی کھلاتی جا رہی تھیں۔ دس پوریاں کھانے کے بعد بچی نے رکابی سے ہاتھ اٹھا لیا۔ رو کر کہنے لگی "اماں! اب نہیں کھایا جاتا، پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔" اس پر وہ بچی کو بھی کوسنے لگیں۔ ہم نے کہا "بچی کو کھانے دیجئے، آپ بلاوجہ اسے روک رہی ہیں، بچے آٹھ دس پوریاں تو کھا ہی لیتے ہیں۔" وہ کہنے لگیں "ہمارے

بچوں کا مزاج بڑا نازک ہے۔ انھیں اس قسم کی چیزیں ہضم نہیں ہوتیں۔ یہ ایک پوری کھا چکی ہے اور کھانے کے لیے ضد کر رہی ہے۔ میں اس کے ہاضمہ کا خیال کر کے دینا نہیں چاہتی۔"

ہمارے پلٹتے ہی انھوں نے پوری طاقت سے بچی کا کان مروڑا اور کہنے لگیں۔ "حرامزادی! تو جب تک اور پانچ پوریاں نہیں کھائے گی میں تجھے اٹھنے نہیں دوں گی۔ رکشے کے کرایہ کا تو خیال کر۔ نہیں کھا سکتی تو اپنے فارمولے پر عمل کیوں نہیں کرتی۔ پلاسٹک بیگ ساتھ رکھتے وقت میں نے تجھ سے کیا کہا تھا یاد نہیں ——— ؟"

اکثر دعوتوں میں عقلمند میزبان کاغذی پلیٹوں میں ایک پیسٹری، ایک گلا ہوا موز، ایک بسکٹ اور کچھ کھارا رکھ کر مہمانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس طریقے میں بے حساب کھانے کی گنجائش کچھ کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن ہوشیار خواتین ایسے موقع پر بھی کوئی صورت نکال ہی لیتی ہیں۔ ایک صاحبہ کے ساتھ چار پانچ مختلف سائز کے بچے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھما دی گئی بچوں نے کچھ کھایا کچھ بچا دیا۔ بچوں کی ماں نے اپنے ہینڈ بیگ نما پرس "میں سے پلاسٹک کی تھیلی نکالی اور یہ کہتے ہوئے تمام پلیٹیں خالی کر دیں۔" چھوٹی نے کچھ کھایا ہی نہیں، یہ منو کا حصہ ہے۔ ساجد کو شاید بخار آ گیا ہے وہ گھر جا کر کھا لے گا ———!"

حاضری ہو یا زیارت، چہلم ہو یا برسی، یہ شیرنیاں اپنا وہی دعوتوں والا انداز برقرار رکھتی ہیں۔ ایک جگہ ایک صاحبہ اپنی قریبی دوست کے انتقال کی خبر سن کر پہنچ گئیں۔ مرحومہ کو ٹھکانے لگا کر لوگ واپس آئے۔ دستر خوان بچھا یہ محترمہ کباب شیرمال کی آس لگائے بڑی دیر سے بیٹھی تھیں۔ آنکھوں پر دستی لگاتے ہوئے دستر خوان پر آ گئیں شہران ہوٹل کے کباب کی خوشبو انھیں مجبور کر رہی تھی کہ اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کھاتے کھاتے کے دوران انھوں نے چار شیرمال اور کباب بیگ میں رکھ لیے۔ اتنے میں مرحومہ کی بیٹی سامنے سے آتی دکھائی دیں۔ انھوں نے جھٹ رکابی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ پرس میں سے دستی نکالی اور ناک، جس میں کچھ نہیں تھا صاف کرتے ہوئے کہنے لگیں۔ "بیگم جانی! تم حاضری کا کھانا چکھنے کے لیے مجبور کر رہی ہو، یہاں شدتِ غم سے میرا یہ حال ہے کہ پہلا نوالہ ہی حلق میں اٹکا ہوا ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے "ہائے گورے جانی! تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں" کا نعرہ لگایا۔ دوسرے لوگ واقعی رونے لگے۔ بیگم جانی کے جاتے ہی انھوں نے مزید دو شیرمال صبح کے ناشتے کے لیے بیگ میں رکھ لیے۔

ہمیں دعوتوں میں شریک ہونے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ مصروفیات کے باوجود سال میں دو چار مرتبہ تو ان شیرنیوں کی ان چالوں سے بچنے کے لیے ہم کچھ دیر ایک گوشے میں کھڑے رہ جاتے ہیں۔ جب ساری شیرنیاں پھرتی سے اپنی نشستیں سنبھال لیتی ہیں تو ہم کسی ایسی جوکی کا انتخاب کرتے ہیں جس پر شیرنیوں کے ساتھ آئی ہوئی مامائیں یا ان کی بچیاں بیٹھی ہوتی ہیں۔ غریب ترسے ہوئے ضرور ہوتے ہیں لیکن ایسے موقعوں پر کنگال پن یا بدتہذیبی کا مظاہرہ نہیں کرتے ——— ان کی تمیز دیکھ کر ہم ہر میزبان کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ایک ماما کے ساتھ بڑے گھرانے کی سات خواتین کو جوکی پر بٹھائیں کہ شاید دستر خوان کے کچھ آداب یہ ان سے سیکھ لیں۔

٥٥

آنے والی غزل کا ٹریلر

دِل بم کی طرح پھٹ پڑا ، اس نے کہا اَنکل ۔۔۔ وِد اِن اے سکنڈ جل گیا خوش فہمی کا جنگل

(WITH IN A SECOND)

غزل

(CARE)

موسم کے تقاضوں پہ کبھی کیئر نہ کرنا ۔۔۔ مِل جائے اگر چانس تو پھر دیر نہ کرنا
تحریرِ محبت ہے یہ رَف رہنے ہی دیجے ۔۔۔ بھولے سے کبھی آپ اسے فیئر نہ کرنا
دال اپنی گلا لیجے چھانسوں کے کُکر پہ ۔۔۔ کس طرح گلی دال یہ ڈکلیئر نہ کرنا
ڈھونڈو کوئی اکلوتی بڑے باپ کی وارث ۔۔۔ سسرال کی دولت کو کبھی شیئر نہ کرنا (SHARE)
جتنی بھی ہو اِنسلٹ اکیلے میں کرو تم ۔۔۔ للّٰہ بھری بزم میں نو وھیئر نہ کرنا (NO-WHERE)

مرزا مصطفیٰ علی بیگ

باسط نوشاہ بنگلوری

بڑھ جاتا ہے جس وقت مرا حد سے جنوں اور ۔۔۔ جی چاہتا ہے جھڑکیاں بیگم کی سنوں اور
عورت کا کہا مان کے میں خلد سے نکلا ۔۔۔ کیوں اس کا کہا مان کے دوزخ میں جلوں اور
بے کار کی باتوں میں تو دن سارا ہے گزرا ۔۔۔ کیا اور بھی سننے کو ہیں راتوں کو جگوں اور
شیروں کو پچھاڑا ترے اسلاف نے بڑھ کر ۔۔۔ ڈرتا ہے تو سائے سے بھی کب تک میں ہنسوں اور

گو ہو نہ سکی آج سرِ شام ملاقات
ہاں کل ہی سہی تم سے میں کس وقت ملوں اور
مدت ہوئی باسط کو بنے آپ کا مہماں
کیا گھر میں تمہارے ابھی کچھ روز رہوں اور

غزل

محبت کی نہ ہو جس نے وہ کیا جانے وفا کیا ہے
جو انساں کو نہ پہچانے وہ کیا سمجھے خدا کیا ہے

خلوص دل سے اک سجدہ ہی کافی ہے عبادت میں
ریاکاری ہو جس میں اس عبادت میں مزا کیا ہے

ہدایت جب تلک پہنچی نہ تھی انساں حیواں تھا
اسے معلوم ہی کب تھا سزا کیا ہے جزا کیا ہے

مگر اب جان کر انجان ہے جیسے نہیں معلوم
سزا کیا ہے گناہوں کی ثوابوں کی جزا کیا ہے

بنا ہے خاک سے لیکن دماغ اب آسماں پر ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ انساں کو ہوا کیا ہے

مزہ ملنے کا چاہو تو کبھی دیکھو جدا ہو کر
مسلسل ساتھ رہنا اک اذیت کے سوا کیا ہے

بس اب زندہ ہوں تھوڑے دن مجھے جی بھر کے جینے دو
نہ جانے کب میں اس دنیا سے اٹھ جاؤں برا کیا ہے

یہ شادی خانہ آبادی بھی قیدِ بامشقت ہے
جہاں بیوی ہو جج بے چارے شوہر کی رضا کیا ہے

یہ مجھ سے پوچھ بیٹھی ایک دن لڑکا نما لڑکی
ق وفا ہے نام کس چڑیا کا اور شرم و حیا کیا ہے

کہا حوا کی بیٹی نے کہ ہم آزاد پنچھی ہیں
ق یہ 'زیور' بوجھ ہوتے ہیں نہ پہنیں تو برا کیا ہے

جواباً یہ کہا زیور تو کیا کپڑے بھی مت پہنو
ق اتارو پھینک دو یہ بوجھ بھی ان میں رہا کیا ہے

ملا ہے علم تو اس سے کرو کچھ استفادہ بھی
کم از کم اتنا پہچانو کہ اچھا کیا برا کیا ہے

ہیں حفظ ما تقدم اور پاپی پیٹ کی خاطر
بس اتنا میزباں سے پوچھ لوں آخر پکا کیا ہے

ادھر آؤ بتاؤں میں، میرے کپڑے کے دستر پر
ق جلی حرفوں کی اس تحریر میں آخر لکھا کیا ہے

شکم کو کر وسیع اتنا کہ ہر پکوان سے پہلے
تجھے خود میزباں پوچھے بتا تیری غذا کیا ہے

کوئی جانے گا کیسے خواہ مخواہ یہ رازِ قدرت ہے
ازل کی ابتدا کیا تھی ابد کی انتہا کیا ہے

غوث محی الدین احمد خواہ مخواہ (بمبئی)

وث محی الدین احمد خواہ مخواہ (بمبئی)

چائے کا خواب

صنف نازک کو کوئی چاہے کتنا ہی ناقص العقل کہے لیکن کسی بھی مسئلہ پر عورتوں سے بحث و مباحثے کا اختتام، انجام کار ان ہی کے حق میں فیصلے کی صورت میں ہوتا ہے۔ گھما پھرا کر اپنی ہی بات کو صحیح منوانے کے فن میں وہ ید طولیٰ رکھتی ہیں اور ہم مرد اپنے آپ کو چاہے کتنا ہی افضل العقل سمجھیں اور ان سے بحث کریں لیکن اتمام حجت کی خاطر ان کے آگے ہتھیار ڈال لینے ہی پڑتے ہیں کچھ اسی مزاج و اطوار کی میری چچی جان ہیں۔

ایک دن صبح چائے دیتے ہوئے کہنے لگیں۔ "احمد میاں! کچھ سنا تم نے؛ حکومت نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور جے پرکاش نارائن کے یادگاری اسٹامپ جاری کیے ہیں۔"

میں نے جواب دیا "ہاں چچی جان! میں نے بھی سنا ہے۔ دراصل یہ مشہور لیڈروں کی خدمات کے اعتراف کرنے کا ایک طریقہ ہے تاکہ لوگ انہیں بھول نہ جائیں۔"

"یادگاری اسٹامپ کے لیے مشہور ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی" چچی کہنے لگیں — "کل ہی میں نے پچیس پیسوں والا اسٹامپ خریدا جس پر انڈوں کے ساتھ ایک چوزے کی تصویر چھپی ہے — تمہارے چچا کہہ رہے تھے کہ کسی پرندے کی تصویر والا اسٹامپ بھی چھپا ہے جس کا انگریزی نام لیتے ہوئے انہیں شرم سی آرہی تھی — بسٹرڈ یا کچھ ایسا ہی نام ہے اس پرندے کا —"

"چچی جان! بسٹرڈ (Bustard) یا چوزے کی تصویر والا اسٹامپ ابھی تک میری نظر سے نہیں گزرا ہے کوئی وجہ ہوگی ورنہ حکومت غیر ضروری اسٹامپ کیوں چھاپنے لگی —؟ لیکن یہ اچانک صبح ہی صبح آپ کو اسٹامپ کا خیال کیسے آگیا —؟" میں نے پوچھا۔

"میں دراصل تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی کہ حکومت تمہارے اعزاز میں کوئی [illegible] اسٹامپ کیوں نہیں جاری

[redacted]

ترقی ـــــــ ؟"

"چچی جان میرے بارے میں اس حد تک سوچ سکتی ہیں اس کا احساس ہوتے ہی میرے دل میں ان کی عظمت اور بڑھ گئی ـــــ لیکن تعجب بھی ہوا کہ آخر میرے سر میں کونسے ایسے سینگ نکل آئے ہیں کہ حکومت کو میرے اسٹامپ کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا جاسکے۔

۔لیکن چچی جان! میں اس اعزاز کے قابل بھی تو نہیں ہوں۔ آخر کیا ہے مجھ میں ؟ میں کوئی وی۔ آئی۔ پی نہیں ہوں۔ ایک معمولی سرکاری ملازم ہی تو ہوں جو اس ترقی پسند سماج میں ایک پرامن زندگی بسر کرنے کی جستجو میں لگا ہے۔ میں نے کوئی ایسا کارنامہ بھی تو انجام نہیں دیا ہے جس پر فخر کیا جاسکے۔۔"

ـــــــ

۔یہی تو تمہاری بھول ہے ـــــ" چچی جان نے بحث شروع کردی ـــــ" انڈے سے باہر آکر چوزے نے کونسا تیر مارا ہے۔ اور اس لنگوڑے انگریزی پرندے میں کونسے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ـــــ اب تم اپنے بارے میں سوچو ـــــ تم یقیناً اس دو کوڑی کے چوزے اور پرندے سے بدرجہا بہتر ہو۔ تمہارے اعزاز میں یادگاری اسٹامپ چھپنے ہی چاہئیں ـــــ"

مجھے سوچتا دیکھ کر وہ پھر شروع ہو گئیں ـــــ" کبھی اپنے آپ پر غور کیا تم نے کہ تم کیا نہیں ہو؟ ! تم ایک عام غیر معروف اور اوسط درجے کے ہندوستانی شہری کا جیتا جاگتا نمونہ ہو جس نے کبھی عام سطح سے اونچا اٹھنے کی کوشش تک نہیں کی یہی نہیں تم ماقبل ماؤنٹ بیٹن اور بعد از ماؤنٹ بیٹن کے ادوار میں زندگی گذار چکے ہو۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں کے عینی شاہد ہو۔ تم نے اپنی آنکھوں سے ملک کا بٹوارہ دیکھا ہے۔ اپنے ملک میں بڑھتی ہوئی آبادی کے خطرناک نتائج دیکھ رہے ہو اور تو اور۔ موجودہ دور کے سیاسی بازی گروں کے کرتب ان کی آپسی مخاصمت اور موقع پرستی کا شکار رہ چکے ہو ـــــ تم! اور کیا ہو؟! لو سنو!

قومی ترقی کے نام پر لگائے جانے والے ٹیکسوں میں اضافے اور کمر توڑ گرانی کو خاموشی سے برداشت کر رہے ہو۔ قومی کردار میں گراوٹ، رشوت خوری اور لاقانونیت کو ایک خاموش تماشائی کی طرح دیکھ رہے اور برداشت بھی کر رہے ہو۔ اتنے طوفانوں اور مدوجزر سے گزرتے ہوئے بھی تم آنے والے خوش آئند اور سنہرے مستقبل کی موہوم امید میں اپنے آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہو ـــــ میں پوچھتی ہوں کیا یہ عظیم کارنامہ نہیں ہے ؟ چپ کیوں ہو ؟ جواب دو ـــــ"

چچی جان مجھے لاجواب کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ اس لیے ان کے خیال سے متفق ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ پھر بھی اس خیال سے کہ مبادا چچی جان یہ نہ سمجھیں کہ میں اس معاملے میں بالکل ہی اناڑی ہوں میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"آپ سمجھتی کیوں نہیں ؟ حکومت نے اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی ہے جس کے ارکان یہاں غور و خوض کے بعد ہی کوئی لیڈر یا کوئی شخص جسے وہ منتخب کرتے ہیں جیسے توبین الاقوامی شہرت یافتہ ہو یا کم از کم اپنے ملک ہی میں مقبول عام ہو۔ اس کے لیے کچھ قواعد و ضوابط ہوتے ہیں جو ہم جیسے عام آدمیوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔"

"ـــــ آخر ایسے کیا قاعدے اور ضابطے ہیں جو میں نہیں سمجھ سکتی۔ ؟ انھوں نے جیسے جرح شروع کردی ـــــ تم نے گا دی ہو۔ پتہ نہیں تم اپنی قدر و قیمت کب پہچانوگے۔ میں پوچھتی ہوں اب تک جن لیڈروں اور نیتاؤں کے اسٹامپ نکل چکے

ہیں کیا اُن میں سے کسی نے بھی تمہاری طرح کا جینا جیا ہے، تمہاری آدھی سے زیادہ زندگی کسی نہ کسی لائن میں کھڑے گزری ہے تم گھر میں اپنی بیوی سے بھی اتنا ہی ڈرتے ہو جتنا دفتر میں اپنے افسر سے ڈرتے ہو۔"

"——لیکن چچی جان یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں دفتر میں بھی اپنے افسر سے——" میں نے احتجاجاً کہا لیکن انھوں نے میری بات کاٹ دی۔

——مجھے سب پتہ ہے۔ تمہاری شادی ہوئے اتنا زمانہ گزر گیا۔ لیکن جھگڑنا تو رہا ایک طرف کسی بات پر بھی تمہیں بہو سے الجھتے یا بحث کرتے ہوئے نہیں دیکھا وہ جو بھی کہتی ہیں تم بے چوں وچرا مان لیتے ہو——خیر! یہ تو تمہارے سعادت مند شوہر ہونے کے لچھن ہیں لیکن ایسا بھی کیا کہ بالکل زن مرید ہو جاؤ۔ تمہارے چچا کو دیکھو۔ آئے دن مجھ سے کسی نہ کسی بہانے بحث و تکرار کرتے ہی رہتے ہیں اور سچ پوچھو تو زندگی کے اتنے لمبے چوڑے دسترخوان پر زبان کا ذائقہ بدلنے کے لیے جھگڑوں کا اچار یا بحث و تکرار کی چٹنی نہ ہو تو طبیعت اوب نہ جائے گی یکسانیت سے۔"

ہاں! تو میں کیا کہہ رہی تھی——"

"جی! وہ یادگار اسٹامپ کے بارے میں——"

ہاں یاد آیا۔ میں تو اب بھی یہی کہوں گی کہ تمہاری امن پسند پالیسی کی بنا پر تمہارا اسٹامپ چھپنے ہی چاہئیں۔

میں نے اپنے ترکش کا آخری تیر پھینکتے ہوئے کہا—— "لیکن چچی جان! ابھی تک جتنے اسٹامپ انسانوں کے جاری ہوئے ہیں وہ ان کے مرنے کے بعد ہی جاری ہوئے ہیں۔ میں تو ابھی زندہ ہوں——"

——کیا خاک زندہ ہو——" انھوں نے جوابی تیر دے مارا—— "یہ بھی کوئی جینا ہے۔ ایک عام ہندوستانی کبھی صحیح معنوں میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ تو بس زندہ رہنے کی کوشش میں جیئے جا رہا ہے۔ کیا سمجھے——؟

چچی جان کی اس مدلل بحث سے میں واقعی بے حد متاثر ہوا۔ مجھے بھی یقین ہونے لگا کہ گو میں ایک عام ہندوستانی ضرور ہوں لیکن چچی جان کے دلائل کی روشنی میں ایک قومی ہیرو سے کم نہیں ہوں۔ بس لیے میں نے آج ہی وزیر مواصلات کے نام ایک درخواست ارسال کر دی ہے کہ میرے اعزاز میں مستقبل قریب میں (یا کم از کم میرے انتقال سے قبل) یادگاری اسٹامپ جاری کیے جائیں کیونکہ میں ایک غیور اور جامعت مند ہندوستانی شہری کا جیتا جاگتا نمونہ ہوں——میں نے درخواست کے ساتھ اپنی پاسپورٹ سائز کی تصویر بھی منسلک کر دی ہے تاکہ ایک عام شہری کی تصویر کو ٹکٹ پر منتقل کرنے میں حکام کو سہولت ہو۔ اب اسی امید پر دن گزر رہے ہیں کہ میرا اور چچی جان کا وہ مشترکہ خواب جو دن کی روشنی اور جاگتے میں دیکھا گیا ہے بہت جلد شرمندۂ تعبیر ہونے والا ہے۔

غزل

مجید شمشیر، کورٹلہ

دھتورے کو دیئے جاتے ہیں پانی دیکھتے جاؤ
ترقی کر رہی ہے باغبانی دیکھتے جاؤ

تمھیں مرنا ہے، مرتے دم گرانی دیکھتے جاؤ
یہ مُردوں سی ہماری زندگانی دیکھتے جاؤ

کفن کا چار گز کپڑا نیا تم کو مبارک ہو
مری بد رنگ میلی شیروانی دیکھتے جاؤ

رہا باقی نہ کچھ سامان ہے ہرّاج کوٹھی کا
بڑوں کی رہ گئی ہے اک نشانی دیکھتے جاؤ

چلی ہے ایک چپراسی سے پہنچی اک منسٹر تک
کہاں تک جائے گی رشوت ستانی دیکھتے جاؤ

جوانی میں جو لکھا خط ملا اُن کو بڑھاپے میں
ہمارے ملک کی ٹپہّ رسانی دیکھتے جاؤ

پچوا

میرے مولیٰ تری کرامت ہے
اچھے اچھوں کی اب حجامت ہے

چھین لیا سب کے شال و دوشالے
اپنا بونا تو اب سلامت ہے

فرید انجم

یہی خواب میں رات بھر دیکھتا ہوں
منسٹر کو اپنا سُسر دیکھتا ہوں

یہ آہوں کا اس کی اثر دیکھتا ہوں
حوالات میں گھر کا گھر دیکھتا ہوں

یہ میک اَپ تو تم نے غضب کا کیا ہے
فقط دُم کی تھوڑی کسر دیکھتا ہوں

نہ دیکھو حقارت سے تم لیڈروں کو
گدھوں میں بھی اہلِ ہنر دیکھتا ہوں

جسے سب سمجھتے ہیں نادان و کم سن
اُسے عشق کا لکچرر دیکھتا ہوں

پرویز یداللہ مہدی

ہینگر پہ ٹنگا غریب الوطن

(خاکہ)

اس رات بھی میں حسبِ معمول باندرہ چکر میں مولانا کے اڈے پر بیٹھا اپنا چکر چلا رہا تھا' بالفاظ دیگر احباب کے ساتھ خوش گپیوں میں خود کو الجھا کر دن بھر کی حوصلہ شکن ہزیمتوں اور مقابلہ آرائیوں کی تلخیوں کو کم کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ اچانک رفیق جعفر "جھومتا جھامتا" کسی کروڑکا پروڈیوسر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہاں چلا آیا۔ پروڈیوسر کو میں کروڑکا اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اگر وہ کروڑکا نہ ہوتا تو کروڑ کے رفیق جعفر کو اس طرح بے تکلفی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں ہاتھ ڈالنے کی گستاخی کبھی نہیں کرنے دیتا اس روز شاید رفیق جعفر نے اس پروڈیوسر کو اپنی کوئی کہانی یا آئیڈیا سنایا تھا۔ جو شاید اُسے پسند بھی آگیا تھا نتیجے میں کروڑ کے پروڈیوسر نے اپنی اور رفیق جعفر' ہر دو کی "حیثیت" کے مطابق کسی فٹ پاتھی' دلرو کے اڈے" میں لے جاکر کہانی کار رفیق جعفر کی خاصی "خاطر تواضع" کی تھی۔ اسی لئے باوجود کوشش کے رفیق جعفر کے پاؤں اور زبان دونوں لڑکھڑا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی لڑکھڑاتی زبان سے بے ربط جملے اگلے۔ "پرویز! میرا البم بہت جلد ـــ تم سمجھ گئے ہوں گے' اردو اکیڈمی کی رقم بھی میں لے آیا اور کچھ بڑے لوگوں نے بھی جو خود کو میرا گاڈفادر سمجھتے ـــ تم سمجھ گئے ہوں گے ـــ مدد کرنے کے وعدے ـــ کل امپورٹیڈ شراب پی کر میرے ایک کرم فرما ـــ مجھے حقارت سے دیکھتے ہوئے بولے ـــ "اب ٹٹ پونجئے ادیبوں کے بھی مجموعے ـــ تم سمجھ گئے ہوں گے ـ کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ رفیق جعفر کو ـــ کیا رفیق جعفر زندہ ادیب نہیں ـ کیا رفیق جعفر ـ تم سمجھ گئے ـ ـ ـ !! اس کی زبان کی لڑکھڑاہٹ قابو سے باہر ہوگئی وہ خاموش ہو کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ـ "رفیق ـــ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہ ایسے بے شمار ناجائز "گاڈفادروں" سے بھری ہوئی ہے۔ ان کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اُڑا دینا چاہئے ـــ خیر ہٹاؤ تمہارے مجموعے کے لئے میرے لائق کوئی خدمت ـــ؟"

"تم میرا خاکہ ـــ سمجھ گئے ہوں گے ـــ" اس کی زبانی لڑکھڑاہٹ دوبارہ شروع ہوگئی ـــ

"تم ـ تم مجھے جتنا سمجھتے ہو' اتنا کوئی اور ـ تم سمجھ گئے ہوں گے ـ ـ ـ"

میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی ـــ "تمہارا حکم سر آنکھوں پر' لیکن ایک بار پھر سوچ لو میرا خاکہ تمہارے ـــ

اولیں مجموعے کی "مارکٹ ویلیو" (MARKET VALUE) بڑھ جائے گا لیکن اس کی "ادبی ویلیو" گھٹ جائے گی۔"
"کیا مطلب ——؟" اس نے بدستور جھومتے ہوئے، اپنی جھپکتی ہوئی آنکھیں مجھ پر مرکوز کرنے کی ناکام کوشش کی۔
مطلب صاف ہے — امیرے مزاحیہ خاکہ کی شمولیت سے عام قاری تمہارا مجموعہ شوق سے پڑھے گا۔ لیکن جدید ادب کے ٹھیکے داروں کی نظر میں تمہارے مجموعے کی ادبی قدر و قیمت کم ہو جائے گی بلکہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو بین الاقوامی مارکیٹ میں امریکی ڈالر کے آگے اپنے ہندوستانی سکے کا ہوتا رہتا ہے۔

میری اس تاویل کو رفیق جعفر نے غالباً اس بات پر محمول کیا کہ میں بزعم خود اپنے آپ کو بہت بڑا طنز و مزاح نگار سمجھنے لگا ہوں۔ اس لئے پہلے تو اس نے مجھے اپنی لڑکھڑاتی نظروں سے گھورا پھر اپنی لڑکھڑاتی زبان سے بولا —— "اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں بہت زیادہ نشہ میں ہوں تو یہ —— تم سمجھ گئے ہوں گے۔ مجھ میں اتنا ہوش اب بھی باقی ہے کہ میں تم سے انگریزی میں بھی "ریکویسٹ" (REQUEST) تم سمجھ گئے —— اتنا کہہ کر اس نے واقعی اپنی درخواست انگریزی میں دہرائی "یس انڈ" ہماری برسوں کی دوستی میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ جب رفیق نے مجھ سے انگریزی زبان میں کوئی مکمل جملہ کہا تھا۔ میں نے سوچا شراب بھی کیا غضب کی چیز ہے۔ آدمی میں وقتی طور پر کیسے کیسے انقلابات لے آتی ہے —— مذہب، دھرم، عقائد اور ایمان بدل دیتی ہے، دھیان گیان بدل دیتی ہے، یہاں تک کہ زبان بدل دیتی ہے۔ لیکن رفیق جعفر کے ہوش و حواس شراب کا معمولی نشہ کیسے چھین سکتا ہے۔ اس کے ہوش و حواس تو پہلے ہی افلاس اور غربت کی زہریلی شراب نے چھین کر اسے کھوکھلا کر دیا ہے۔ دکھ، کرب، غریبی اور افلاس کی یہ شراب جو حرام تو نہیں لیکن آدمی کا جینا ضرور حرام کر دیتی ہے۔ کاش اوپر والے نے اس شراب کے ساتھ، غریبی اور افلاس کی یہ شراب بھی حرام کی ہوتی۔ شراب کے نشے کے ساتھ وہ نشہ بھی حرام کیا ہوتا جو آدمی کو اس قدر اندھا کر دیتا ہے کہ وہ انسانیت کے لاشے پر پاؤں رکھ کر دولت کی سیڑھی کے سہارے اپنے ناپاک ہاتھوں سے آسمان کی پاک چادر کو داغدار کرنے کی کوشش کرتا ہے —— اس روز رفیق جعفر جس طرح لڑکھڑاتا ہوا آیا تھا اسی طرح لڑکھڑاتا ہوا واپس بھی چلا گیا —— لیکن اپنے خاکہ کے سلسلہ میں جس طرح چیلنج کر گیا تھا۔ وہ میرے لئے محض آئی گئی بات نہیں تھی، مجھے بہر صورت اس کا خاکہ لکھنا تھا۔ سو میں نے لکھا۔ بلکہ لکھا بھی کہاں، خود رفیق جعفر نے مجھ سے اپنا خاکہ لکھوا لیا ——

البم کے خالق کو متحرک روپ میں دیکھنے سے بہت پہلے میں نے اُسے لفظوں کے "ہینگر" پر ٹنگا ہوا دیکھا تھا۔ بلکہ پڑھا تھا۔ مگر بہت اٹک اٹک کر، اس لئے نہیں کہ یہ "افسانہ" ناقص کتابت اور گھٹیا طباعت کا اعلیٰ نمونہ تھا، اور نہ ہی اُن دنوں میری اردو اتنی کمزور تھی کہ میں "ہر کالے اکشر" (अक्षर) کو بھینس برابر سمجھ کر اس سے بدکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میری تعلیم اس وقت بھی واجبی تھی اور اب بھی واجبی ہے لیکن جہاں تک نام نہاد جدید رکشش کے افسانوں کا تعلق ہے۔ انھیں پڑھنے کے لئے واجبی تعلیم کافی ہے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے اس سلسلہ میں تعلیم کی کوئی قید نہیں۔ البتہ جہاں تک اس قسم کے افسانوں کو سمجھنے کا تعلق ہے۔ اس کے لئے علم کی "ہمہ دانی" سے زیادہ "سمجھ داری" کی ضرورت ہوتی ہے —— میں نے رفیق جعفر کا جو سب سے پہلا افسانہ پڑھا، اس کا عنوان تھا "ہینگر پر ٹنگا آدمی" عنوان پڑھ کر جو سب سے پہلا تاثر میرے ذہن میں اُبھرا وہ یہ تھا کہ افسانہ نگار ضرور کسی ایسی کمپنی کے شعبۂ اشتہارات سے وابستہ ہے جو ہینگر بناتی ہے۔ چنانچہ اپنی کمپنی کے ہینگروں کے بارے میں جدید افسانے کی آڑ لے کر وہ یہ بات ——

پڑھنے والوں کے ذہن نشین کروانا چاہتا ہے کہ اس کی کمپنی کے ہینگر اس قدر مضبوط ہیں کہ ان پر نہ صرف کپڑے ٹانگے جا سکتے ہیں، بلکہ بوقتِ ضرورت خود بھی ٹنگا جا سکتا ہے ــــ لیکن جب میں نے عنوان سے گزر کر افسانے کی رہ گزر طے کی تو پہلا مضحکہ خیز تاثر خود بخود زائل ہو گیا۔ اور اس کی جگہ رفیق جعفر کے لئے میرے دل میں رحم اور ہمدردی کا جذبہ جاگ اٹھا کہ خواہ مخواہ ایک اچھے خاصے افسانے کو نام نہاد "جدیدیت" کا ٹھپہ لگانے کی غرض سے افسانہ نگار نے اسے "ہینگر" پر ٹانگ دیا۔ رفیق جعفر کے اس افسانے کا تاثر میرے ذہن میں ابھی تازہ ہی تھا کہ معلوم ہوا رفیق جعفر بھی کچھ عرصہ ہوا میری ہی طرح "جلا وطنی" کی سزا بھگتنے کے لئے حیدرآباد سے بمبئی کی طرف "تڑی پار" کر دیا گیا ہے۔

بمبئی میں چونکہ ہر دوسرا آدمی غریب الوطن ہے۔ اس لئے جب کوئی ہم وطن اس "غریب الوطنی" میں ملتا ہے یا کم از کم اس کے ملنے کی آس بندھتی ہے تو یہ لمحات ایک غریب الوطن کے حق میں شادی مرگ سے کم نہیں ہوتے ــــ لیکن میں شادی مرگ ہونے سے پہلے رفیق جعفر سے بہ نفس نفیس ملنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک غریب الوطن نے دوسرے کی تلاش شروع کر دی، جس طرح دو عادی مجرموں کا کسی "جیل" میں اور دو زبردست کھلاڑیوں کا کسی "فائنل کھیل" میں ملنا یقینی ہوتا ہے۔ اسی طرح ادیب و شاعر بے چارے کسی نہ کسی ادبی محفل یا مشاعرہ میں ضرور ٹکراتے ہیں ــ لہٰذا ہم دونوں بھی ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ ادبی محفل کی اس گھنی چھاؤں میں جہاں ایک دوسرے سے گلے مل کر ہم بہت دیر تک خود کو یہی سمجھاتے رہے کہ ــــ ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے ــــ رفیق جعفر کو دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے "ہینگر" پر ٹنگا آدمی کوئی اور نہیں یہ خود ہے بلکہ ہر شخص جو غریب الوطن ہوتا ہے۔ وہ غریب الوطنی کے "ہینگر" پر ٹنگا ہوتا ہے۔

پہلی ملاقات سے قبل میں نے رفیق جعفر کا صرف ایک ہی افسانہ پڑھا تھا۔ لیکن کچھ یاران ادب کی زبانی اردو کے بارے میں سن رکھا تھا کہ یہ غریب الوطن ادیب "ادب" کے معاملہ میں بھی "غریب" ہے۔ اس لئے ہر صنف ادب میں ٹانگ اڑا کر "جیک آف آل ٹریڈ" (JACK OF ALL TRADE) بننے کی حماقت کرتا ہے ــــ میں نے اکثر دیکھا کہ جو ادیب یا شاعر ادب و صحافت دونوں کو ایک ہی قلم سے ہانکتے ہیں۔ ان کی ادبی "حیثیت" زیادہ تر مشکوک ہوتی ہے ــــ میں شاید رفیق جعفر کو بھی ایسے ہی "ڈانوا ڈول" ادیبوں کے زمرے میں شمار کرتا اگر اس سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی ــــ جب ملاقاتوں کا یہ سلسلہ بڑھا پھیلا اور منضبط ہوا تو محسوس ہوا کہ غریب الوطن رفیق جعفر غریب البدان، غریب السخن، غریب الجیب ضرور ہے، لیکن نہ تو غریب الذہن ہے، نہ غریب الفن ہے اور نہ ہی غریب القلم ہے ــــ صحافت کو رفیق جعفر نے اس لئے اپنایا تھا کہ ایک ہفتہ وار اخبار کے ذریعہ اشتہارات حاصل کر کے اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پال سکے۔ لیکن افسانہ نگار رفیق جعفر، صحافی رفیق جعفر کی تھوڑی بہت آمدنی کے نتیجے میں پیٹ میں جانے والی بروقت کی روٹی سے بننے والے خون کی ایک ایک بوند کو کہانیوں اور افسانوں میں ڈھال کر نہ صلہ مانگتا ہے، نہ ستائش کی تمنا کرتا ہے۔ اور میری نظر میں افسانہ نگار رفیق جعفر کی یہی ادا اُسے صحافی رفیق جعفر سے بہت بلند کر دیتی ہے۔

جن دنوں ہماری نئی نئی ملاقات ہوئی تھی۔ رفیق جعفر اردو زبان و ادب کی ترویج و ترسیل کی فکر میں گھل گھل کر دبلا ہوا جا رہا تھا۔ (محاورتاً نہ کہ حقیقتاً) ویسے یہ اب بھی دبلا ہے (لیکن حقیقتاً نہیں محاورتاً) ــ

اتفاق کہئے کہ اُن دنوں میں بھی اپنی نالتو تیر بی سے نجات پانے کے لئے، اُردو ادب میں کسی خونی دیو کی طرح منہ پھاڑے ہوئے ترسیل کے المیئے کی فکر کو خود پر مسلط کئے ہوئے تھا۔ غریب الوطنی کی قدر مشترک کے ساتھ زبان وادب کی اس فکر مشترک نے ہم دونوں کو کچھ زیادہ ہی ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ ہم چوں کہ زبان و ادب کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ اس لئے شہر بمبئی کی گلیوں کوچوں کی خوب خاک چھانی۔ نتیجۃً کئی سستے بھٹیار خانوں کی دریافت کے ساتھ بالآخر ایک دن منٹن اسٹریٹ میں اردو کے ایک شیدائی و فدائی شہزاد احمد صدیقی کے تعاون سے "ادارہٴ ہم قلم" کی بنا ڈالی۔ اور اپنی تھیوریٹکل فکر کو عملی جامہ پہنا دیا۔ اس عملی جامے نے ہم دونوں کے "جاموں" اور "موسم جاموں" کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ یہ ایک طویل داستانِ غریب حمزہ ہے۔ اور غریب ایک نہیں دو' دو ہیں' اس لئے اسے پھر کبھی ——— ان دنوں رفیق جعفر کو اردو نثر کی بڑی فکر رہا کرتی تھی۔ لیکن آج کل تو نثر کے ساتھ ساتھ اُسے شاعری بھی لاحق ہو گئی ہے۔ چنانچہ خوب شعر کہہ رہا ہے (یہاں خوب سے مراد بہتات ہے ویسے ہر شاعر جو خوب شعر کہتا ہے' وہ خوب اور خراب دونوں گریڈ GRADE کے شعر کہتا ہے۔ اگر رفیق جعفر نے کہہ دئے تو اردو شاعری پر کوئی آسمان نہیں ٹوٹنے والا۔) رفیق جعفر کو اُردو شاعری کی ہرجائی محبوبہ کے گھائلوں بلکہ سائلوں کی فہرست میں اپنا نام لکھاتے دیکھ کر اکثر ہم عصر ادیبوں و شاعروں نے تعجب کا اظہار کیا بلکہ کچھ کو تاسف بھی ہوا۔ لیکن مجھے نہ تعجب ہوا نہ تاسف! بلکہ مجھے تعجب اسوقت ہوتا جب رفیق جعفر نے شاعری کے میدان میں دخل در نامعقولات نہ کی ہوتی کیوں کہ ہماری دوستی کے دس بارہ سالہ طویل عرصے میں، میں نے رفیق جعفر میں وہ تمام آثار دیکھے ہیں۔ جو ایک اچھے خاصے آدمی کے جلد یا بدیر خودکشی یا شاعری کی طرف مائل ہونے کا ببانگ دہل اعلان کرتے ہیں۔ یعنی وہی مخصوص لاابالی پن' غیر ذمہ دارانہ روش بال بچوں کے تعلق سے بے تعلقی' بے نیازی بے اعتنائی وغیرہ ——— ان شاعرانہ خصوصیات سے رفیق کوشش کے باوجود پیچھا نہیں چھڑا سکا' اور بالآخر ایک دن ادیب وصحافی' رفیق جعفر کے نام کے ساتھ شاعر کا دُم چھلا بھی لگ گیا ——— میری دُعا ہے کہ اس کی زندگی میں وہ دن ضرور آئے جب شاعری' یا رفیق جعفر دونوں میں سے کسی ایک کا بھلا ضرور ہو ——— !!

صحافی ادیب شاعر رفیق جعفر فل ٹائم فن کار ہے۔ اور ہر فل ٹائم فنکار کسی نہ کسی عادت بلکہ "علت" میں مبتلا ہوتا ہے رفیق بھی علت کا مارا ہے۔ لیکن اس کی یہ علت ابھی تک کسی ذلت کا باعث اس لئے نہیں ہوئی کہ یہ بنیادی طور پر اُردو کا قلم کار ہے جس کی "معاشی سطح" "عام سطح مرتفع" سے کئی درجے نیچے ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ روز پی نہیں سکتا شراب تو دور، سگریٹ نوشی کا شوق بھی اپنی معاشی مجبوریوں کے کارن پورا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اپنی تنگ دستی و تنگ دامانی کو دیکھتے ہوئے اس نے "ناس" لینے کی نہایت ہی کم خرچ بالانشین قسم کی علت پال لی۔ گویا چٹکی بھر ناس براہ ناک' بذریعہ سانس اندر کھینچ کر خود کو عوام الناس کے زمرے میں شامل کر کے خوش ہو لیتا ہے۔ چٹکی بھر ناس کے کمالات بلکہ کرامات مجھ پر رفیق جعفر ہی کے ذریعہ روشن ہوئے۔ ادھر چٹکی بھر ناس ناک کے نتھنوں کے ذریعہ اندر پہنچتی اُدھر جوابا" بڑی ہی رقت آمیز گر زوردار چھینک کے ہمراہ دکھوں تکلیفوں اور ذلتوں کی کثافتیں باہر ——— البتہ چھینک کے مصرع کثیف کے عطا ہوتے وقت رفیق کی پوزیشن بڑی ہی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ جس قدر بلند و بالا چھینک باہر نکلتی ہے ——— رفیق جعفر کا وجود اتنا ہی تہہ و بالا ہو جاتا ہے ——— کچھ عرصہ قبل رفیق جعفر "ناس" کے علاوہ داڑھی کی علت میں بھی گرفتار ہو گیا تھا۔ اور داڑھی بھی کوئی ایسی ویسی معمولی نہیں بالکل اس کی زندگی کی طرح بکھری بکھری پریشان اور بے ترتیب! اور اس "علت بارلیش" کی وجہ سے رفیق جعفر کو بدنامی کا ایک تمغہ بھی ملا ———

ایک دن دوستوں کی محفل میں ایک دوست نے اچانک شوشہ چھوڑا ـــ

"بھائیو! کل رات میں لال باغ سے گذر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں، شیوسینا کے انتخابی جلسے میں جھاڑ جھنکاڑ قسم کی داڑھی والا ایک دبلا پتلا نوجوان اچھی خاصی دھمکی آمیز اردو میں شیوسینا کے امیدوار کی تائید میں دھواں دھار تقریر کر رہا ہے۔ میں بے ساختہ اسٹیج کے قریب پہنچ گیا۔ اب جو نزدیک سے اس نوجوان کو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اپنا رفیق جعفر تھا ـــ"

یہ دھماکو اطلاع بہم پہنچانے کے بعد موصوف نے رفیق جعفر کی شیوسینا جیسی کٹر فرقہ پرست جماعت کے اسٹیج پر موجودگی کا جواز بھی پیش کر دیا ـــ

"بے چارہ غالباً "مالی پریشانیوں" سے تنگ آکر شیوسینا کا ممبر بن گیا ہے بالکل "شاکھا پرمکھ" (शाखा प्रमुख) لگ رہا تھا ـــ !!"

"شاکھا پرمکھ" والے طنز پر بیشتر احباب ہنس پڑے ـ میں نے سنجیدگی سے کہا ـــ

"میں اس اطلاع کو نہ تو سچ جانتا ہوں نہ جھوٹ مانتا ہوں ـ بفرض محال اگر رفیق جعفر واقعی "شیوسینک" بن گیا ہے تو ہمیں خوش ہونا چاہیئے کہ شیوسینا جیسی فرقہ پرست جماعت بھی اب سیکولرزم کی جانب جھک رہی ہے ـــ"

ہندوستانی سیاست کی تاریخ میں ایسی داڑھیاں قال قال ہی ملیں گی جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو بڑھاوا دینے میں اس قدر پیش پیش رہی ہوں ـ لیکن اس سے پہلے کہ میں رفیق جعفر کے چہرے کے جغرافیائی حدود کا خاردار باڑھ کی طرح احاطہ کرنے والی تاریخی داڑھی کی اس خصوصیت پر اسے مبارکباد پیش کرتا اس نے میدان صاف کروا کے اپنی داڑھی کو تاریخ میں محفوظ ہونے سے بچا لیا ـــ !!

ایسے جیالے قلم کار جو اپنے لیے جیتے جی "صلیب" منتخب کر لیتے ہیں، ان کی پہچان بڑی آسان ہے ـ وہ قلم کے ذریعہ دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کی حماقت کرتے نظر آتے ہیں ـ میں ایسے تمام جیالے فن کاروں کو سلام کرتا ہوں اس لیے نہیں کہ انہیں عام "سطح مرتفع" سے بلند سمجھتا ہوں ـ بلکہ اس لئے کہ جواباً ان سے "وعلیکم السلام" سننا چاہتا ہوں ـ جی ہاں میرا بھی تو ایسے ہی جیالے فن کاروں میں شمار ہوتا ہے ـ جو ہر صبح مرزا غالب کے اس مصرع کی تفسیر بن کر گھر سے نکلتے ہیں ـــ ہوتی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے ـــ !

کچھ عرصہ قبل زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقاریب کے ہنگاموں میں پاکستانی سفارت خانے کے ایک اعلیٰ عہدہ دار جناب منیر احمد شیخ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ـ جو خود بھی بہت اچھے انشائیہ نگار ہیں ـ جب انہیں علم ہوا کہ میرا ذریعہ معاش "فری لانسنگ" ہے ـ تو موصوف نے بڑے ہی ہمدردانہ بلکہ "مشفقانہ" لہجے میں سوال کیا ـ "اردو میں "فری لانسنگ" کرکے رزق مل جاتا ہے ـــ؟" میں نے جواباً مسکراتے ہوئے عرض کیا ـــ "اس لائن میں سوائے رزق کے سب کچھ ملتا ہے ـ بلکہ اگر آپ اسے میری گستاخی نہ سمجھیں تو عرض کروں کہ "فری لانسنگ" وہ خطرناک لائن ہے جس میں رزق کم اور "رِسک" (RISK) زیادہ ہے ـــ !"

رفیق جعفر کا شمار بھی ایسے ہی فری لانسر قلم کاروں میں ہوتا ہے، جن کے گھروں میں اناج کے ڈبے تو رزق سے خالی ہوتے ہیں ـ لیکن گھر کے ہر فرد کی آنکھیں RISK سے لبریز ہوتی ہیں ـــ اردو والے کے لئے فری لانسنگ ایک

خطرناک میدان جنگ ہے، جہاں طرح طرح کی گندی سیاستوں، پیشہ ورانہ رقابتوں، ذاتی مخاصمتوں کے بے شمار محاذ ایک فری لانسر کے حوصلوں کو پست کرنے کے لیے، اسے تڑپا تڑپا کر ختم کرنے کے لیے، روزانہ بنتے ہیں، چنانچہ رفیق جعفر بھی میری طرح، روز اپنی صلیب اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھائے۔ اپنے مکمل اور ادھورے افسانوں کا البم بغل میں دبائے۔ ہر اس در پہ ادب سے زانوئے ادب تہہ کرتا ہے، جہاں ادیبوں و شاعروں کا استحصال کر کے ان کے آگے دو وقت کی روٹی پھینک دی جاتی ہے ——— یہی حال ادب کی سنگلاخ گھاٹی میں بھی ہے۔ اپنی ادبی حیثیت کو منوانے کے لیے جدوجہد کے پہیئے لگا کر ہر قلم کار کو جان ہتھیلی پہ لے کر اس "ادبی گھابڑ" میدان میں ایکٹنگ کرنی پڑتی ہے۔ اور رفیق جعفر کو ادب کے میدان میں بھی کچھ زیادہ ہی جدوجہد کرنی پڑی، اس لیے کہ اس کی غریبی مفلسی اور خالی جیب یہاں بھی اس کے بڑھتے قدموں کی بیڑی بنتی رہی لیکن پچھلے دو ایک برسوں میں رفیق جعفر میں بڑی خوشگوار تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ اس کے لیے لاٹری نکل آئی ہے۔ یا اس کی کوئی فلمی کہانی آٹھ دس لاکھ میں بک گئی ہے۔ یا کوئی جادوئی چراغ اچانک اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ جس کی مدد سے دیکھتے ہی دیکھتے مفلس کنگال رفیق جعفر، ترقی پسند مزدوروں کے حمایتی، شاعر کی طرح سرمایہ دار ہو گیا ہے۔ رفیق جعفر تو آج بھی زر و سیم کے سرمائے سے بے نیاز غربت و افلاس کی دار پر اسی طرح ٹنگا ہوا ہے۔ لیکن اب اس نے زندگی کا راز پا لیا ہے۔ اپنی انا کی حماقت دی ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح اپنی غریبی کو اوڑھے نہیں رہتا۔ اسے اپنا کوئی عیب نہیں سمجھتا۔ افلاس کو اپنا مقدر نہیں خیا۔ بلکہ اب اسے غریبی کی کسوٹی پر اپنے فن کو چمکانا آ گیا ہے۔ افلاس کے اندھیرے میں بھی اپنے فن کی جولا سے روشنی پھیلانے کے کمال سے واقف ہو گیا ہے۔ کل مرجھائے ہوئے پژمردہ رفیق جعفر کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اس غریب فن کار کی آنکھ صرف دکھوں کی گود میں کھلی ہے بلکہ یہ دکھوں کی سسکتی گود میں پل کر جوان ہوا ہے۔ لیکن آج کے رفیق جعفر کو دیکھ کر دل لگتا ہے جیسے اب اسے دکھوں کو اپنی "گود" میں پالنے کا ہنر آ گیا ہے ——— ادھر جب سے غریب الوطن، مفلس، قلاش رفیق جعفر اپنے اندر کے فن کار کی کھوج میں کامیاب ہوا ہے، اس نے ہر ایرے غیرے کے آگے ہاتھ جوڑنا بند کر دیا ہے۔ اب تو وہ آگے بڑھ کر "پلیز ٹو میٹ یو (PLEASE TO MEET YOU) کہتے ہوئے مردانگی سے مصافحہ کرتا ہے ——— آج کے رفیق جعفر نے خود کو یوں ڈھال لیا ہے کہ اب کسی بات سے بالکل نہیں گھبراتا۔ نہ اپنی غریبی سے، افلاس سے، نہ دکھوں سے، نہ ناکامیوں سے کیونکہ اب اس کا ایمان اس بات پر پختہ ہو چکا ہے کہ ——

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا ——— !!

کلیم صدیقی

قطعات

★

جب بھی پتہ میرا غصہ سے ! اُلٹ جاتا ہے
دیکھ کر رستم و گاما بھی پلٹ جاتا ہے
کھینچ لوں طیش میں گر بلٹ کمر سے اپنی
گر کے دو پاؤں پہ پتلون لپیٹ جاتا ہے

★

کیا بتاؤں رات جو دل میں کبوتر چھوڑ گئے
مارے ہیبت کے میرے ہاتھوں سے طوطے اُڑ گئے
فائر مجھ پر کیا تھا ان کی پیشانی پہ ہیں
ایک ہی آواز میں دونوں کے دونوں اُڑ گئے

★

غضب میں یوں نہ آؤ مجھ پہ کچھ مجھ کو بھی کہنے دو
تھمے رہنے دو آنکھوں میں مرے دریا نہ بہنے دو
اُتارو آپ اپنے مصنوعی زلفوں پہ خود غصہ
میری تالو پہ اصلی بال ہیں تھوڑے سے رہنے دو

★

کہا آیا نے آکر صاب بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ فوراً کار منگوانا
دلہن سرکار زچگی کے لئے جانا ہے جلدی سے دوا خانہ
وہ رمی کھیلتے بیٹھے تھے ٹیبل پر کہا جھلا کے آیا سے
کہو بیگم سے اب فرصت نہیں ہے، پھر کسی ہفتہ چلے جانا

★

غزل

○

بہ رنگِ شاخِ گُل ہو سُنبلِ شاداب
کم از کم لالہ رو ہو گل بدن یا برگِ نورستہ

بمثلِ کشمش و بادام چلغوزہ ہو یا پستہ
اگر برفی ملے تازہ جلیبی جیسے شیرے دار لب بستہ

تھما کر نوٹ نانا دستِ مشاطہ میں کہتے تھے
اگر ہے تو کہیں ایسا جما دیجے مرا رشتہ

کہا سُن کر یہ مشاطہ نے خود نانا سے برجستہ
کہ میں بھی ہوں خزاں خوردہ مگر ہوں تازہ گلدستہ

میرے دل میں بھی خواہش آپ جیسی ہے زمانے سے
زہے قسمت قبول افتد اگر حضرت مرا رشتہ

★

نوک جھونک

محمد صبغۃ اللہ بمباٹ

سامنے سے اک حسینہ آئی بل کھاتی ہوئی
بیل باٹم اور سینڈل میں غضب ڈھاتی ہوئی
جس کو لڑکے دیکھ کر آپے سے باہر ہوگئے
بھڑکے دل سینوں میں اور لقا کبوتر ہوگئے
ایک بولا ہائے یہ سینڈل ہیں کتنے لاجواب
بولی وہ! سینڈل اتاروں ؟ کیا ارادہ ہے جناب
دوسرے نے ہاتھ جوڑے اور کہا اے مہ جبیں
بیل باٹم آپ کی سینڈل سے بڑھ کر ہے حسیں

تھی سیہ ملبوس میں کالج کی اک زہرہ جمال
دودھیا رنگت تھی جس کی بے نظیر و بے مثال
جس کے آگے چاندنی شب کا فسوں بھی ماند ہو
یوں نظر آتی تھی جیسے بادلوں میں چاند ہو
پھول تھی گلشن کا لیکن اس کی تھی بو باس اور
دیکھنے سے جس کو بڑھتی تھی نظر کی پیاس اور
ایک لڑکا تھام کر دل اس طرح گویا ہوا
کس کا غم ہے کس لیئے یہ چاند بدلی میں گھرا
ہم ابھی زندہ ہیں بتلاؤ تمہیں ہے کیا کمی
پھول سے اس جسم پر کیوں ہے لباس ماتمی
گھور کر دیکھا حسینہ نے ادا سے یوں کہا
آپ کی اتی کے مرجانے کا صدمہ ہے سوا
پھٹ سے بولا جان گلشن یہ نہ تھا مجھ کو پتا
ساس کے مرنے کا تم کو اس قدر صدمہ ہوا

○

امجد باغی

ڈاکٹر ناظم مرزائی
(گربر حیدر آبادی)

حضرت محمد حسن صاحب قبلہ رحؒ کی درگاہ کے باب الداخلہ کے چند قدم کے فاصلہ پر شامیانہ لگا تھا اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں کچھ لوگ آرہے تھے اور کچھ لوگ جارہے تھے۔ ایک آرہا تھا ایک جارہا تھا۔ کچھ لوگ چہروں پر گہرے صدمہ کا بوجھ لئے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

۴ر فبروری اور جمعہ کا دن تھا' ۵ر فبروری کو ۱۰ بجے شب کے قریب قلب پر زبردست حملہ کے باعث ڈاکٹر ناظم مرزائی کا نمائش کلب کے مزاحیہ مشاعرہ میں انتقال ہوگیا تھا۔ ان کے دوست احباب اور عزیز و اقارب آرہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے مکان پر مجمع ہوگیا۔ اس ہجوم میں صحیفہ نگار، ادیب، شاعر غرض زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی شامل تھے جو اپنے دوست، اپنے ساتھی اور اپنے رفیق کو الوداع کرنے اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رخصت کرنے آئے تھے۔

ان میں کا ہر شخص ڈاکٹر ناظم مرزائی کی تعریف و توصیف کررہا تھا۔ ان کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا اور ہر شخص ڈاکٹر ناظم مرزائی سے اپنی دوستی، رفاقت اور بے تکلفی کا دم بھر رہا تھا۔ میں بھی اس بھیڑ میں موجود تھا اور لوگوں کی زبانی ڈاکٹر ناظم مرزائی کی موت پر، ان کی شخصیت، ان کی وضعداری، پاسداری، ملنساری، خلوص و محبت، شرافت و پاکیزگی اور ان کے کردار کی بلندی کے بارے میں تبصرے سن رہا تھا۔ لوگوں کی زبانی ڈاکٹر ناظم مرزائی کی اتنی ساری خوبیوں اور اچھائیوں کا ذکر سن کر مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا کہ لوگ کہیں روایت کے مطابق ناظم مرزائی کی موت پر جھوٹ موٹ کی تعریف تو نہیں کررہے ہیں۔

عموماً مرنے والوں کی برائی نہیں کی جاتی۔ ان کے عیوب کو بھی نعش کے ساتھ کفن سے ڈھانک دیا جاتا ہے۔

میں نے سب سے پہلے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور ناظم مرزائی کی شخصیت میں برائی تلاش کرنے لگا لیکن مجھے کوئی برائی نہ ملی۔ لوگوں نے ناظم مرزائی کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ سچ ہی تو تھا کیونکہ ناظم مرزائی نے اپنی مختصر سی زندگی کے سارے دور میں ایک شاعر اور صحافت کے پیشہ سے وابستہ ہوتے بھی کسی دوسرے شاعر اور صحیفہ نگار کو کبھی برا بھلا نہیں کہا، گالی نہیں دی، غیبت نہیں کی، دوستوں اور سماج کو دھوکہ نہیں دیا۔

ہر کوئی جانتا ہے کہ ڈاکٹر ناظم مرزائی روزنامہ "انگارے" سے وابستہ تھے۔ وہ جس طرح جناب معین فاروقی کو چاہتے اور ان کا احترام کرتے تھے اسی طرح وہ جناب عابد علی خان، جناب محبوب حسین جگر، جناب بدصدویر، جناب سید لطیف الدین قادری اور جناب سید وقارالدین کو بھی چاہتے اور ان کا احترام کرتے تھے حالانکہ آجکل یہ حال ہے بلکہ وطیرہ بن گیا ہے کہ ایک شاعر، دوسرے شاعر سے؛ ایک صحیفہ نگار دوسرے صحیفہ نگار سے خواہ مخواہ نفرت کرنے لگتا ہے۔ ناظم مرزائی اس لعنت سے دور ہی تھے۔ ہاں ناظم مرزائی میں ایک برائی تھی ایک بہت بڑا عیب تھا وہ یہ کہ انہوں نے اپنی غربت، فلکت اور افلاس کو اپنے دوستوں اور سماج پر کبھی ظاہر ہونے نہیں دیا اور نہ ہی انہوں نے اپنا غم اور اپنا دکھ دوستوں میں تقسیم کیا۔

جن لوگوں اور احباب نے ناظم مرزائی کو دوستوں کی محفلوں میں سیاسی ادبی جلسوں میں، مشاعروں میں اور "انگارے" کے دفتر میں خوشنما پوشاکوں میں دیکھا ہے دراصل ان لوگوں نے ان خوشنما پوشاکوں کے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی کہ حیدرآبادی تہذیب کا یہ دلدادہ ان خوشنما پوشاکوں کے اندر کتنی آہوں اور ناآسودگیوں کو چھپا رکھا ہے۔ یہ بھید اس وقت کھلا جب دوست احباب ناظم مرزائی کا آخری دیدار کرنے، جنازہ کو کندھا دینے اور انھیں منوں مٹی کے اندر دفن کرنے ان کے مکان پہونچے تو لوگوں کی آنکھیں ناظم مرزائی کے تنگ و تاریک اور قبر سے ذرا کشادہ مکان نما کمرہ کو دیکھکر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یقین مانئیے اس تنگ و تاریک مکان نما کمرہ میں انسان نہیں صرف چمگادڑیں ہی بسیرا کر سکتی ہیں۔ یہ تنگ و تاریک مکان نما کمرہ کسی اور کا نہیں بلکہ اردو کے ایک شاعر اور اردو ہی کے ایک صحیفہ نگار کا تھا۔ وہ بھی ذاتی نہیں۔ یہ تنگ و تاریک مکان نما کمرہ گویا آزادی اور جمہوریت پر ایک گہرا طنز بھی ہے کہ آزادی کے ۳۳ برس بعد بھی عام آدمی تو لیکن ایک شاعر اور ایک صحیفہ نگار کو سلیقہ کا مکان تک نصیب نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی کرب نے ناظم مرزائی کو سنجیدہ شاعری کے بجائے مزاحیہ اور طنزیہ شاعری پر مجبور کر دیا اور انہوں نے اپنا تخلص گنڈ بک حیدرآبادی رکھا۔

ڈاکٹر ناظم مرزائی سے میری پہلی ملاقات کب، کیسے اور کن حالات میں ہوئی میں نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ مجھے یاد نہیں ہاں اتنا یاد ہے کہ میں انھیں قریب قریب پچیس سال سے جانتا ہوں البتہ ان سے میری آخری ملاقات ۴ جنوری ۱۹۸۱ء کو پریس (نئی دہلی) سفارتی برانڈ کے کنونشن میں ہوئی۔ ناظم مرزائی کے پریس کلب پہونچنے سے قبل میں نے ان کے متعلق ایک گپ اڑائی کہ ناظم مرزائی نے آثار قدیمہ اور حکومت ہند سے باضابطہ اجازت لے کر تاج محل (آگرہ) کے احاطہ میں جوتوں کی ایک دوکان کھول لی ہے۔ ناظم مرزائی دسمبر میں ایک مشاعرہ میں شرکت کے لئے آگرہ گئے تھے۔ اس لئے میری اس گپ کو یقین کر لینے

یرنہیں لگی ۔ چند منٹوں بعد ہی جب ناظم مرزائی پریس کلب میں داخل ہوئے تو ساتھیوں نے اُنہیں تاج محل کے احاطہ میں جوتی
وہاں ٹھو لنے پر مبارکباد دی، میں بھی بڑی معصومیت کے ساتھ مبارکباد دینے والوں میں شامل ہوگیا تھا لیکن ناظم مرزائی نے
یا اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور خوب لطف اندوز ہوئے ۔ دن بھر یہ مذاق چلتا رہا اور میں رات دیر گئے تک انہیں ستاتا
تنگ کرتا رہا ۔ یہاں میں نے جوتوں کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ اس کے ذکر کے بغیر ناظم مرزائی کی شخصیت پر روشنی نہیں پڑ سکتی،
مرزائی کو جوتے خریدنے کا شوق جنون کی حد تک تھا ۔ مشاعرہ پڑھنے کیلئے ہندوستان کے کسی بھی شہر کو جاتے تو دوسرے شعراء
ری جیسیں خرید کر لاتے اور ناظم مرزائی کوئی اچھا سا جوتا خرید کر لاتے غرض وہ اپنی تنخواہ اور مشاعرہ کے معاوضہ کا زیادہ حصہ جوتوں
ریدی پر خرچ کر دیتے تھے ۔ میں اور جہاندار افسر جب بھی ناظم مرزائی کے پاؤں میں کوئی نیا جوتا دیکھتے تو بڑی معصومیت سے پوچھتے
ت اُر ڈاکٹر آج آپ نے کون سی مسجد میں نماز پڑھی ہے تو وہ ایک زوردار قہقہہ لگا دیتے اور یہی ہمارے سارے مذاق کا جواب
۔ اگر ان کے گھر کی تلاشی لی جائے تو روپیہ، پیسہ، سونا، چاندی اور دوسری کوئی چیز نہیں ملے گی صرف ڈھیر سارے جوتے
بد برآمد ہوں گے ۔

جہاندار افسر اور شاہ نوری ۔ ناظم مرزائی کو دن بھر تنگ کرتے، دوسرا کوئی ہوتا تو بات چیت بند کر دیتا، پیٹ میں چاقو بھونک
۔ اس مذاق میں فاضل بھائی بھی بڑی مستعدی سے شامل ہو جاتے ۔ میں جب بھی "انگارے" کے دفتر کو جاتا اور جتنی دیر وہاں بیٹھتا
ن دیر انہیں دق کرتا ۔ ایک اور واقعہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ ناظم مرزائی پہلے پہل سال میں صرف ایک بار اُدبی ٹرسٹ
مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا حال روزنامہ "سیاست" کیلئے لکھتے ۔ زندہ دلان حیدرآباد کے مشاعروں سے یہ تعداد دو ہوگئی ۔ نعتیہ مشاعروں
یہ تعداد تین اور شنکرجی مشاعرہ سے یہ تعداد چار ہوگئی تو میں مذاق کہتا کہ ڈاکٹر آپ کے رزق میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے ۔ کیا
کھوں دیکھا حال کا معاوضہ تنہا ہضم کر جاؤ گے ؟ تو اس کے جواب میں بھی ایک زوردار قہقہہ بلند ہوتا اور کہتے ۔ یہ اللہ کا کرم
ہے صاحب !

شہر میں جب بھی فرقہ وارانہ گڑبڑ ہوتی اور فسادات پھوٹ پڑتے تو ہم سے کہتے افسر صاحب کچھ کرو، امجد صاحب کچھ کرو
ونکہ وہ سمجھتے تھے کہ فسادات کو روکنے میں کمیونسٹ پارٹی موثر رول ادا کر سکتی ہے ۔ ہم کہتے کہ ڈاکٹر تمہیں کچھ نہیں ہوگا کیونکہ تم
نئے شہر میں رہتے ہو اور نئے شہر میں تنگ نظری اور فرقہ واریت کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے ہمیں دیکھو ہم ہر روز لہراتے ہوئے
چاقوؤں، لاٹھیوں اور سنگباریوں سے گذرتے ہوئے نئے شہر کو آتے ہیں، پرانے اور نئے شہر میں بھی ایک تو فرق ہے مگر ناظم مرزائی
مارے ہراس سے مطمئن نہیں ہوتے ۔ بہت جلد گھبرا جاتے اور پریشان ہو جاتے ۔ ظاہر ہے ہر شریف، اچھا اور سچا شہری فسادات سے
پریشان ہی ہوگا ۔

ڈاکٹر ناظم مرزائی کو اولیاء اللہ سے بڑی عقیدت تھی وہ شہر کی تمام درگاہوں پر ہفتہ میں دو تین بار حاضری ضرور دیتے
وہ مشاعرہ کے لئے ہندوستان کے کسی بھی شہر کو جاتے تو اسٹیشن پر اُترتے ہی منتظمین سے درخواست کرتے کہ جناب پہلے ہمیں
فلاں درگاہ کی زیارت کروائیے یا درگاہ کا راستہ ہی بتلائیے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھیں بزرگانِ دین سے کس قدر والہانہ عشق تھا

آج ڈاکٹر ناظم مرزائیؒ ہم میں موجود نہیں ہیں۔ نہ جانے کیوں ان کے اور میرے درمیان کس اندرونی احساس کے تحت پچھلے تین برسوں سے موت کے بارے میں باتیں ہوتیں۔ میں کہتا ڈاکٹر میں جلد مرنے والا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے نہیں صاحب میں پہلے چلا جاؤں گا۔ آپ کے جانے سے میرا نقصان ہے، آپ کے رہنے سے میرا فائدہ ہے۔ کم سے کم آپ کے ہاتھوں میرا ایک آدھ تعزیتی جلسہ تو ضرور ہوگا۔ موت کی اسی تکرار میں ناظم مرزائی نے جلد بازی کی اور مجھے اس راستے پر شکست دے دی۔

ناظم مرزائی کی خواہش کے مطابق مجھ پر تعزیتی جلسہ کا ایک قرض ہے اور میں اس مضمون کی شکل میں ناظم مرزائی کا قرض چکا رہا ہوں۔ جہاں تک تعزیتی جلسہ کا سوال ہے زندہ دلان حیدرآباد کے عہدیداروں محمد حمایت اللہؒ، ممتاز بھائی، مصطفیٰ علی بیگ مصطفیٰ کمال، نرگس حیدرآبادی، اشرف خوندمیری، طالب خوندمیری اور دوسرے ساتھیوں نے دس ہزار روپے اکٹھا کر کے صحیح معنوں میں جو تعزیت کی ہے اور اپنی دوستی اور شاعر برادری کا جو حق ادا کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی طرح زندہ دلان حیدرآباد نے دوسروں کو ایک راستہ بھی دکھایا ہے کہ ہم چاہیں تو ہم خود ایک دوسرے کا غم اور ایک دوسرے کا دُکھ بانٹ لے سکتے ہیں اور کسی بھی شاعر اور جرنلسٹ کی موت کے بعد ان کی بیوی، بچوں کو زمانے کی ٹھوکریں کھانے کیلئے تنہا نہیں چھوڑ سکتے، اس کیلئے دوسروں پر تکیہ کرنے اور انحصار کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف عزم اور حوصلہ کی بات ہے۔ اس مثالی اقدام اور کامیاب کوشش پر میں زندہ دلان حیدرآباد کو مبارکباد دیتا ہوں

ایک بات جس کو میں نے خاص طور پر نوٹ کیا ہے وہ یہ کہ گھر سے قبرستان تک اڑوس پڑوس کی ہندو خواتین اور مرد بھی جنازے کے جلوس میں شامل تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے جیسے ناظم مرزائی ان ہی کے خاندان کے تھے۔

کون کہتا ہے کہ ڈاکٹر ناظم مرزائیؒ، تمر بھابی سے اپنی ضعیف ماں سے اپنے لڑکے عاصم سے، اپنے بھائی رزاق سے، اپنے صحیفہ نگار اور شاعر دوستوں سے اور دنیا سے روٹھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے ہیں۔ وہ تو حضرت محمد حسن صاحب قبلہؒ کی عیدگاہ سے چند گز کے فاصلے پر حضرت سردار بیگ صاحب قبلہ کی درگاہ کے احاطہ میں منتقل ہو گئے ہیں اور گہری نیند سو گئے ہیں۔ کیونکہ یہ پچھلے پچاس برسوں سے مسلسل جاگتے آ رہے تھے ۔۔ انھیں نہ جگاؤ، انھیں نہ ستاؤ کیونکہ زمانہ انھیں پہلے ہی خوب ستا چکا ہے

تبصرہ

از :- نعیم زبیری

نام : "دانتے"

مصنف : فریدہ اے عثمانی

پبلشر : ترقی اردو بیورو

صفحات : 191

قیمت : 8/25

⁂

پتہ نہیں کیا بات ہے کہ میں بچپن ہی سے "غ" سے نہایت خوفزدہ سا رہا ہوں۔ پتہ نہیں کون سی وہ نفسیاتی گرہ ہے جسے میں آج تک کھول نہیں پایا ہوں۔ اردو کے سارے حروف تہجی میں "غ" مجھے کچھ فلمی ولین جیسا لگتا ہے۔ ب۔ پ۔ ص۔ ض۔ ث س۔ ط۔ ظ۔ کس قدر معصوم اور شریف قسم کے حروف ہیں۔ اور ان کے برخلاف "غ":

غلغلہ۔ غلیظ۔ غلط۔ غوغا۔ غرض۔ یرغمالی۔ نابغہ غاصب ۔ کسی لفظ میں لے لیجئے۔ 'غ' نہایت جارحانہ رول ادا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

(غزلیہ۔ غالب۔ اور غفران احمد انصاری کی بات اور ہے)

اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ اگر آپ کو فلسفہ۔ یا یونانی دیومالا یا اطالوی اور لاطینی کلاسیکس وغیرہ سے اردو میں مڈبھیڑ ہو جائے تو پھر "غ" آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے ۔ اور "شِی" کی طرح چپٹتا ہے۔ ویسے یہ بھی ٹھیک ہی ہے کہ اگر میں نابغہ نہیں ہوں تو پھر کلاسیکس اور فلسفہ کے جنگل میں گھسنے پر مجبور کس نے کیا ہے لیکن کبھی کبھی عورت دکھانے کیلئے ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔

'غ' سے وحشت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بالکل کم عمری میں جبکہ کمزور دماغوں کو ڈراؤنی چیزوں سے محفوظ رکھا جانا چاہیئے۔ میرا عنایت اللہ دہلوی کے کلاسیکل ترجموں سے پالا پڑ گیا تھا۔ ترجمے تو ظاہر ہے کہ نہایت اعلیٰ پایہ کے ہوتے ہوں گے۔ لیکن قدم قدم پر لاطینی یونانی ناموں کے خاردار تاروں سے اُلجھتی ہوئی عقل بار بار گرتی پڑتی آگے بڑھتی تھی اور بُری طرح زخمی ہو جاتی تھی ــــ مشکل یہ تھی کہ ماہنامہ ساقی کو پڑھنے کیلئے جب آپ صفحات اُلٹتے تھے ــ تو قطب مینار کے بعد سب سے پہلے عنایت اللہ دہلوی ہی ملتے تھے ــ جو ایک ضخیم ترجمہ ہاتھ میں لئے حملے کے لئے تیار ہوتے تھے۔

بہرحال ــــ "دانتے" جیسی شگفتہ اور خوبصورت کتاب بھی جب میرے ہاتھوں میں آئی تو بچپن کا سویا ہوا خوف پھر سے جاگ اُٹھا ــ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کتاب کھولی۔ لیکن جب اس بات کا اچھی طرح یقین ہو گیا کہ دور دور تک نہ انگور کے خوشے ہیں۔ نہ قطب مینار ــــ نہ عنایت اللہ دہلوی ــ تو ڈرتے ڈرتے میں نے پڑھنا شروع کیا۔ اور حیرت ــ کہ اسے ــ پڑھ گیا۔

بہرحال ــــ میں مشکور ہوں عثمانی صاحب کا کہ ان کی وجہ سے ایک بڑی پرانی نفسیاتی گرہ کھل گئی ہے ــ اور اب میں خفیہ طور پر خود کو مبارکباد دینے کے موقف میں ہوں کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اردو میں بھی کلاسیکس کو جھٹکے بغیر پڑھ لیا جائے ــ اور دماغ کو اس بات کا احساس نہ ہو کہ اسے گرم ریت پر چلنا پڑا ہے ــ ورنہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اردو کے معدے میں کلاسیکس کو ہضم کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے ــ اور اس احساس کی ذمہ داری ان

عالمانہ فاضل معذرت پر ہے جو قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کردیتے ہیں کہ شائد عالمانہ بات کرتے ہوئے اردو ایسی بے تکلفی کی جسارت نہیں کرسکتی۔ جیسی مثال کے طور پر T. K. Abbot نے عمانوئیل کانٹ کے انگریزی ترجمے ۔

'Fundamental Principles of the metaphysic of ethics.'

میں اختیار کی تھی ۔ !

"— but then gifts of nature may also become extremely bad and mischievous if the will which is to make use of them and which therefore constitutes what is called character is not good —"

ایک اور اہم بات ۔ جس کے تذکرے کے بغیر یہ تبصرہ نامکمل رہ جائے گا ۔ وہ اس خوبصورت کتاب کی قیمت ہے — ہم جیسے قارئین کے لئے جو کسی بڑے ہوٹل کے 'Menu' کو بائیں طرف سے پڑھنے کی بجائے سیدھی طرف سے پڑھتے ہیں جہاں قیمتیں لکھی ہوتی ہیں ۔ (یہ اور بات ہے کہ قیمت کی اساس پر منگوائی ہوئی حسین فرانسیسی نام والی کوئی ڈش صرف اُبلی ہوئی ترکاری نکل آئے تو) — یہ بات نہایت خوش آئند ہے کہ اس کتاب کی قیمت صرف آٹھ روپیے پچیس پیسے ہے ۔ ورنہ "نیشنل بک ٹرسٹ" کی چھاپی ہوئی کتابوں کی قیمتوں کو پڑھنے کے بعد تو کمزور دانتوں کو اکھڑوانے کے لئے ڈنٹسٹ کے ہاں جانے کی ضرورت نہیں رہ جاتی ۔

* * *

وزیر اعظم کا بیس نکاتی معاشی پروگرام



ہماری وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی طرف سے شروع کردہ بیس نکاتی معاشی پروگرام بلاشبہ آندھرا پردیش کی ترقی اور بتدریج فروغ کے لئے ایک نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے اس نے پچھڑے ہوئے طبقات کی فلاح و بہبود کے لئے کی جانے والی کوششوں میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے اور کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے لاکھوں عوام کے لئے ایک نئی امید پیدا کردی ہے۔



منہ بولتے حقائق

ریکارڈ غذائی پیداوار:

غذائی پیداوار ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۱۰۶٫۶۷ لاکھ ٹن کے ایک ریکارڈ حد تک پہونچ چکی ہے۔ طوفان باد و باراں اور خشک سالی کے باوجود ہنگامی منصوبوں کی عاجلانہ عمل آوری کے نتیجہ میں پیداوار سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں کم سے کم ۷۰ لاکھ ٹن ہوگئی ہے۔

عوام کے لئے ارزاں پارچہ:

ہینڈ لوم کے ساٹھ فیصد بافندوں کو امداد باہمی کی صف میں شامل کیا گیا ہے۔ سستے داموں کے پارچہ کی پیداوار جو سال ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۱۸۹ لاکھ مربع میٹر تھی، سے بڑھ کر سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۲۱۳ لاکھ ہوگئی اور سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۳۲۰ لاکھ تک پہونچ گئی ہے۔ ارزاں پارچہ اب ۳۸۸ نکاسی کے مراکز کے ذریعہ عوام میں تقسیم کیا جارہا ہے۔

ارزاں فروشی کی دوکانات کے ذریعہ اشیائے مایحتاج کی تقسیم

اشیاء مایحتاج اب ۲۲۰۰۰ ارزاں فروشی کی دوکانات کے ذریعہ عوام تک پہونچائی جارہی ہیں

سلسلہ صفحہ ۱۶۷ پر

شگوفے

(لطیفے)

مرسلہ: اقبال فرید (میسور) و شمع زیدی (بمبئی)

۱۔ "معقول جواب"

مشہور افسانہ نگار اقبال متین (حیدرآبادی) کی عمر ۱۹۴۷ء میں ۲۱ برس کی تھی اور وہ پنجاب یونیورسٹی، میٹرک کا امتحان دینے گئے ہوئے تھے۔ ان دنوں احمد ندیم قاسمی (پنجابی) "ادبِ لطیف" کے مدیر تھے۔ (اقبال متین کی پہلی کہانی "چوڑیاں" اسی رسالہ میں شائع ہوئی تھی)۔ احمد ندیم قاسمی سے پہلی ملاقات پر اقبال متین نہایت ادب سے سلام کرکے کھڑے رہے۔ قاسمی صاحب نے بڑی شفقت سے پوچھا۔

"آپ نے اپنا کیا نام بتلایا؟"

"اقبال متین"۔ جواب دیا گیا۔

اس پر مسکراتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔ "آپ حیدرآبادی 'ق'، کو 'خ'، کیوں بولتے ہیں؟"

اقبال متین کو ایک دم سوجھی۔ "جس طرح آپ پنجابی 'ق'، کو 'ک'، بولتے ہیں۔"

اس پر احمد ندیم قاسمی محظوظ ہوئے، کھل کر ہنسے اور فرمایا۔ "جواب معقول ہے ۔!"

۲۔ "پھر کب کریں"

علامہ انور صابری ذہین آدمی ہیں، فقرہ بازی اور حاضر جوابی میں کمال حاصل ہے۔ ۱۹۵۱ء میں راجستھان کے شہر منگلور کے آل انڈیا مشاعرہ میں جب انور صابری غزل سنانے کھڑے ہوئے تو غیر شعوری طور پر ان کا رُخ گوشۂ خواتین کی طرف ہوگیا۔ فوراً مجمع سے کسی منچلے کی آواز آئی۔

"چچا — یہ ذوق کب سے —؟"

انور صابری نے فوراً غزل روک دی، گردن کو خاص انداز سے جھٹکا دیا، ابروؤں کو سمیٹا اور مجمع پر بڑی گمبھیر اور پُراسرار خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد انور صاحب نے شرارت سے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"بھتیجے! جب سے تم روٹھ گئے ہو —!"

مرسلہ: اقبال فرید ایم۔اے۔ (میسور)

۔ معروف ڈرامہ نگار ابراہیم یوسف صاحب نے علی عباس اُمید صاحب سے سوئیوں کی فرمائش کی۔ اُمید صاحب نے کہا "کل سہ پہر کو تشریف لائیے اور اعلیٰ درجہ کی سوئیاں نوش فرمائیے۔"

اتفاقاً ابراہیم صاحب وقت پر نہ پہنچ سکے۔ ملاقات پر اُمید صاحب نے کہا۔ "حضرت آپ نے اپنا نقصان کرلیا۔ بیوی نے بعد عمدہ سوئیاں پکائی تھیں، کچھ نامعقول کھا کر چلے گئے۔"

ابراہیم صاحب نے کہا "یار، کیوں جھوٹ بولتے ہو۔"

اُمید صاحب نے کہا "اچھا بیوی سے پوچھ لیجئے۔"

ابراہیم صاحب کے دریافت کرنے پر بیگم ممتاز اُمید نے آہستہ سے "ہوں" کہا۔ ابراہیم صاحب بولے "کچھ دال میں کالا ہے ورنہ یہ اتنی آہستگی سے، وہ بھی صرف 'ہوں'، نہ کہتیں۔" اُمید صاحب نے فوراً کہا "بندہ پرور اس سے پہلے تو نکاح قبول ہوگیا تھا اور آپ کو اتنی معمولی سی بات پر شک ہے۔" — مرسلہ: شمع زیدی (بمبئی)

عمر حنیف
(کھانڈوہ)

نشتر

• "ملک آج بھی بھکاریوں کے کلب کا مستقل ممبر بنا ہوا ہے"
—— شری ایچ این بہوگنا
— تو کیا کسی انٹرنیشنل بنک کے ممبر ہوں ؟

• "ہمیں ایسے دیش میں رہنے کا کوئی ادھیکار نہیں جہاں لوگوں کو اندھا بنایا جاتا ہے۔" — آچاریہ کرپلانی
— ہاں ایسے دیش میں رہ سکتے ہیں جہاں مراد آباد جیسے فسادات ہوتے رہتے ہیں۔

• "افغانستان کے نائب وزیر اعظم ملک چھوڑ کر بھاگ گئے۔"
— یہ کام ہمارے ملک میں لڑکیاں کرتی ہیں۔

• "کالے پیسے سے بانڈ خریدنے والوں سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ کالا پیسہ ان کے پاس کہاں سے آیا ہے۔"
— کیونکہ حکومت تو جانتی ہے کہ یہ پیسہ آپ کے پاس کہاں سے آیا ہے۔

• "کانگریس میں مکمل اتفاق ہے اور تمام مسز گاندھی کے وفادار ہیں۔" — مرکزی وزیر شری ذیل سنگھ
— اور اگر اتفاق نہ بھی ہو تو کیسے کہیں۔

• "مسز گاندھی کی رہائش گاہ کے سامنے ستر نابینا افراد گرفتار۔"
— اندھوں کی کیا بات ہے۔ اگر موقع پڑے تو مُردوں کو بھی گرفتار کر کے دکھایا جائے گا۔

• "آسام تحریک سے ایک ہزار کروڑ روپے کا عظیم نقصان۔"
—— 'وزیر مالیات کا اعلان'
— نقصان کی ہمیں پرواہ نہیں۔ صرف تحریک بند نہیں ہونی چاہیئے۔

• "اسقاطِ حمل گناہ ہے۔" — مدر ٹریسا
— اسی لئے تو رجنیش کہتے ہیں کہ نوبل پرائز آپ کو نہیں دیا جانا چاہیئے تھا۔

• "۱۹۸۱ء ملک کی آزمائش کا سال ہے۔"
— ملک کی آزمائش کا تو نہیں، ہاں! حکومت کی آزمائش کا سال ضرور ہے۔

• "پاکستان نے اپنی تین ڈویژن فوج سعودی عرب کو اُدھار دی۔"
— کمال ہے ہمیں تو کوئی تین روپے بھی اُدھار نہیں دیتا۔

مضمون نگار حضرات اپنے مضامین صاف، خوش خط اور صفحہ کی ایک ہی جانب لکھ کر روانہ کریں۔



پُر مسرت موقع پر ہم کیلئے آرزو مند ہیں

* تلگو عوام قدیم زمانوں ہی سے فنون لطیفہ اور اُدب کے میدانوں میں سبقت لے جانے کیلئے سرگرم عمل رہے ہیں ۔ فنون مجسمہ سازی اور تعمیر میں انہیں برتری حاصل ہے اور ان میں ہر ایک تلگو تہذیب کا شاہکار ہے جو خود اپنی منفرد جاذبیت رکھتے ہیں۔

* **آیئے** ـــــــ آج کے اِس شُبھ موقع پر اس عہد کی تجدید کریں کہ ھم آندھرا پردیش کے عوام کی ہمہ جہتی ترقی اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے سرگرم ساعی انجام دیں ۔

ـــــــ : جاری کردہ : ـــــــ

محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش

DIPR. 13071/C1 - Dated. 7-4-81.



نئے تلگو سال اور اگادی کے
آپ کی خوشیوں اور خوشحالی

اُگادی تلگو بولنے والے عوام کے لئے نئی کامیابیوں سے بھرپور سال کی پیامبر ہوتی ہے

* قابلِ فخر ورثہ اور درخشاں ماضی کے ساتھ تلگو تہذیب ایک رواں سرچشمہ ہے جو اتحاد اور یکجہتی کی بنیادوں پر بنایا گیا ہے۔
* آندھرا پردیش ایک روایتی سرزمین ہے۔ یہ تریلینگا ۔ وکتا راما۔ سری سیلم اور کالشورم کی بھومی ہے جو ان کے نقش قدم پر خوشحالی اور ترقی کی جانب گامزن ہے۔
* اس سرزمین پر صنعت کو سرگرمی کے ساتھ ریاست کے عوام کے لئے مزید روزگار فراہم کرنے کیلئے شروع کیا گیا ہے۔
* اس بھومی کے کسانوں کو اب خریدی کی موزوں قیمتوں کے حصول کی طمانیت حاصل ہے۔
* کراپ انشورنس اسکیم انہیں آفاتِ سماوی سے ہونے والے نقصانات کی پابجائی کیلئے رائج کی گئی ہے۔

خرافات

مراسلے

▲ "کنہیا لال کپور نمبر" سب نمبروں میں نمبر لے گیا۔ یہ جملہ اپنی ساخت میں بہت ہی رسمی اور عام سا ہے مگر یقین مانیئے میرے دل کو بہت کم چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ آپ نے بہت بھرپور نمبر نکالے ہوں گے جن میں سے ایک تو "ڈرامہ نمبر" تھا جو مجھے مل چکا ہے اور میں اُس پر کی جانے والی محنت بلکہ مشقّت کا بھی معترف رہا ہوں مگر کنہیا پر چھپنے والے نمبر پہ کاغذ اچھا نہیں لگا۔ ٹائٹل بھی شاید کسی کارٹون میں پہلے آچکا ہے، طباعت بھی کوئی زیادہ ارفع قسم کی نہیں مگر مضامین اور انتخابِ مضامین کا جواب نہیں۔ زندگی میں کنہیّا محروم رہا ہو تو الگ بات ہے مر کر تو اس کی محرومی کی تلافی ہو چکی، ہونی چاہیئے۔ آپ کے ادارے کا یہ طریق جداگانہ ہے کہ کسی مہمان مدیر کے تعاون سے آپ اِس طرز کے نمبر نکالتے ہیں۔ خواجہ عبد الغفور کی جانفشانی اور آپ کی عرق ریزی اِس نمبر کے ہر صفحے پر بولتی دکھائی دیتی ہے۔ دیر آید درست۔ آید کا صحیح مفہوم اِسی نمبر کا دوسرا نام ہے۔ میری اس تحریر سے مدلل مداحی کے آثار چمٹی سے پکڑ پکڑ کر نکالے جا سکتے ہیں مگر مرا خیال ہے کہ یہ مداحی تحسین محض نہیں میرا دل مجھے یہ سب کچھ کہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ کنہیا بہت بڑا آدمی تھا۔ یہ نمبر نہ چھپتا تب بھی اُس کی شخصیت پر کوئی بہت بڑا اثر نہیں پڑنے والا تھا مگر اس کے باوجود "شگوفہ" نے اس بڑے آدمی کی تصویر اور تحریر لوگوں کو جس رنگ میں دکھائی ہے اس پہ کنہیا ضرور فخر کرتا اگر زندہ ہوتا۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ پاکستان کے کسی ادیب نے اس پر کچھ نہیں لکھا یا کم از کم میری نظروں سے نہیں گزرا۔ اگر کوئی پاکستانی تحریر "شگوفہ" میں شامل ہوتی تو مجھے دوگنی مسرت ہوتی۔ اب سُنا ہے ڈاکٹر وزیر آغا "اوراق" کے زیرِ طبع شمارے میں ایک حصّہ کنہیّا کیلئے وقف کر رہے ہیں۔ دیگر ادبی جرائد نے تو یک سطری حاشئے سے بھی مبرّا خبر کے علاوہ کنہیا کو کوئی جگہ ہی نہیں دی۔

طارق بشیر
جدّہ (سعودی عرب)

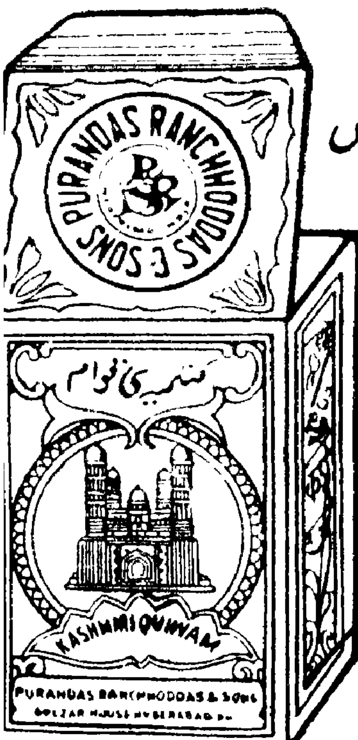
▲ مکرمی! السلام علیکم:
فروری ۸۱ء کا "شگوفہ" جس میں جناب رحمت اللہ خان مالوی کا مضمون "انتساب" کافی پسند آیا۔

عبدالحکیم (مالیگاؤں)

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف ولذّت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جُلتے مال سے بچئے اور اصلی کشمیری قوام
خریدنے کے لیئے اس کے ڈبّے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے۔



تیارکنندگان :

پُورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس

گلزار حوض حیدرآباد ۵۰۰۰۲

ور شعاعوں پہ اپنی لے خورشید
زُلف سے کہہ دوں تو شام ہو جائے

، لانبی لانبی گھنیری کالی گھٹاؤں جیسی زُلفیں

زُلف کشمیر ہیر آئیل

ستعمال کے بغیر ایک بے تعبیر خواب ، ایک سراب
سے زیادہ کچھ نہیں ـــ

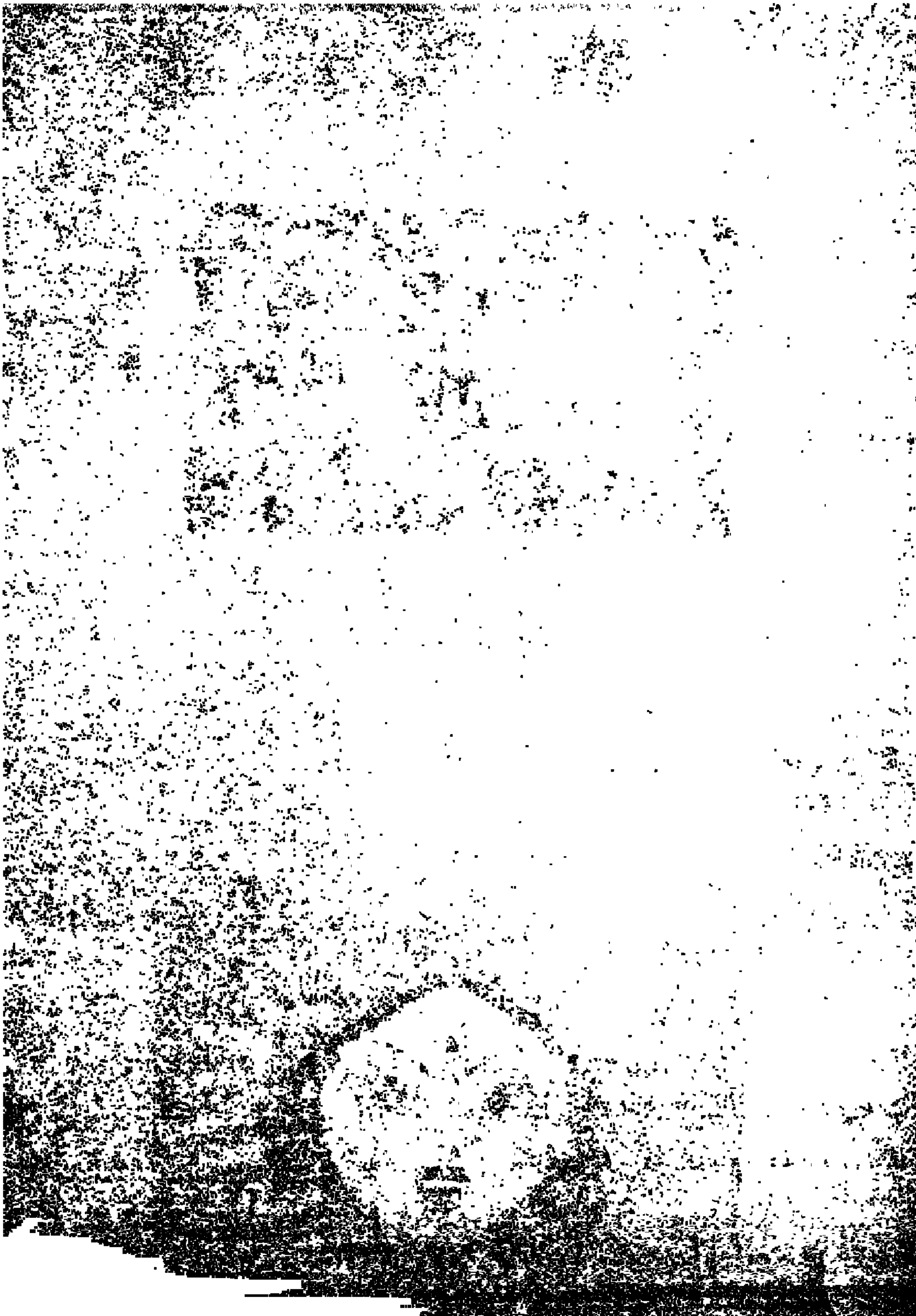
ن داس رنچھوڑ داس کا تیار کردہ زُلفِ کشمیر ہیر آئیل

15822/ ... Hyderabad's 14th Annual Function ... Postal Regd No.

SHUGOOGA SOUVENIR

Copy 4 | 31 Bachelor Quarters, M.J Market Hyderabad-1 | April 1981 | Phone: 57





زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہ نامہ

شگوفہ

جلد ۱۴ — مئی ۱۹۸۱ء — شمارہ ۵

سالانہ (۲۵) روپے
بیرونِ ہند سے (۲۵) شلنگ
فی پرچہ ۲ روپے ۵۰ پیسے

طباعت:
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ۲
بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس پرانی حویلی

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱-مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: 57716

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

زندہ دلانِ حیدرآباد

۱۴ واں سالانہ اجتماع

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

مالِ مفت (انشائیے)

رشید قریشی

زندہ دلانِ حیدرآباد کے
چودھویں سالانہ ادبی اجلاس کے

خواتین و حضرات!

سُنو صدر کیا بولے!!

شاداب چہروں پر سنگیں سنجیدگی کا پلاسٹر چڑھائے زندہ دلانِ حیدرآباد آئے۔ یہ حکم لائے ـــــ "اِس سال ادبی اجلاس کی صدارت آپ کو کرنا ہے"۔

میرے کمزور کاندھے پنگوئن کے بازوؤں کی طرح ڈھلک گئے۔ میں نے رحم طلب نظریں اُن کی طرف اُٹھائیں۔ میری ڈھارس بندھائی گئی کہ آپ کرسیٔ صدارت میں ڈھیر نہیں ہوجائیں گے۔ آپ کا ایک ـــــ بازو افتتاحی صدر اور دوسرا بازو مہمانِ خصوصی پکڑے رہیں گے۔ میں گڑگڑایا "بھائیو افتتاحی صدر (جناب ایم۔ باگاریڈی) کے دونوں ہاتھ اردو کی مخدوش چھت کو اُٹھائے ہوئے ہیں اور مہمانِ خصوصی (جناب نریندر لوتھر) کے ہاتھوں کی نفیس نزاکت صرف پھولوں کو تھام سکتی ہے۔ میری مدد کے لئے، کسی کا ہاتھ نہیں بڑھے گا۔ میری جان بخشی ہو"۔ کچھ دیر سوچا گیا.... پھر پوچھا گیا... "آپ کی آخری خواہش کیا ہے؟" ان کے اس سوال پر میں کانپ گیا اور کہا "بھائیو! میرا جواب اس ملزم کا جواب ہے جسے پھانسی کی سزا ہوئی تھی"۔ پوچھا گیا "اس ملزم کا کیا جواب تھا؟" میں نے کہا تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک ملزم کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ پھانسی کا حکم دینے سے پہلے جیل کے مہتمم نے پوچھا "تمہاری کوئی خواہش ہو تو بتاؤ تاکہ اُسے پورا کیا جائے"۔

ملزم نے جواب دیا "اس رسمی مذاق سے کچھ فائدہ نہیں۔ پھانسی کا پھندہ میری گردن میں ڈال

دیجئے اور قصہ ختم کر دیجئے۔"

مہتمم نے کہا "میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، تم اپنی خواہش کا اظہار کرو۔ میں ضرور اُسے پورا کروں گا۔"

ملزم نے پوچھا "آپ وعدہ کرتے ہیں کہ آپ میری خواہش کو پورا کریں گے؟"

مہتمم نے کہا "میں وعدہ کرتا ہوں۔" اس یقین دہانی پر ملزم نے کہا "میری آخری خواہش یہ ہے کہ ـــــ آپ یہ پھانسی کا پھندہ پہن لیں۔"

زندہ دلان حیدرآباد کے چہروں سے سنگین سنجیدگی کا پلاسٹر ٹوٹ پھوٹ کر گر گیا اور وہ اپنے شاداب چہروں سے ہنسی کے فوارے اڑانے لگے "آپ کی آخری خواہش کو ۔۔۔۔ ہم نہیں ۔۔۔۔ آپ خود پورا کریں گے۔"

. . . .

اب کتنی پھانسیوں کا سوانگ کیا جاتا رہے ۔۔۔ ایک کے پیچھے ایک یہ پھندے مسلسل اترتے رہتے ہیں۔ صدارت کی شہرت گلی کی موڑ تک بھی نہ پہنچی تھی کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ آتے ہی بغلگیر ہوگئے "صدر صاحب! اب آپ ہیں، ہم میں خیریت نہیں رہی" میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے ۔۔۔ لیکن میں نے آپ کو پہچانا نہیں" حیرت کی ایک چیخ کے ساتھ وہ دوبارہ بغلگیر ہونے کے لئے اُٹھے تو میں نے ان کو صوفہ پر بٹھاتے ہوئے اپنی بھول کا اعتراف کرلیا ــ "آپ کو کون نہیں پہچانتا۔ آپ گلی کے اس مکان میں رہتے ہیں نا! جس پر ہر ماہ بھانامتی کا نزول ہوتا رہتا ہے۔" وہ اطمینان سے صوفہ پر دراز ہوگئے اور دونوں ہاتھوں کو چہرہ پر رکھ کر اس طرح ہنسنے لگے جیسے جمناسٹک کا کرتب دکھا رہے ہوں ۔۔۔ ایک ہاتھ کو اپنے چہرہ سے ہٹا کر کہنے لگے "اب آپ سے چھپانا کیا ۔۔۔۔ وہ بھانامتی دراصل میں ہوں ۔۔۔ ہر ماہ جب مالک مکان کرایہ وصول کرنے آتا ہے میں قبرستان کے پیپل پر سے پتھر برسایا کرتا ہوں ۔۔۔۔ خیر اب یہ کہئے کہ صدر کی حیثیت سے آپ کو تنخواہ کیا ملے گی؟"

میں نے کہا "وہی جو صدر کو ملتی ہے۔" وہ صوفہ پر اُچھل گئے ۔۔۔۔ "یعنی دس ہزار ماہانہ" میں نے کوئی جواب نہیں دیا بس ایک منکسر قناعت کا مظاہرہ کرتا رہا۔ "اور دہلی کب منتقل ہونگے آپ؟" ان کی غلط فہمی اب میری سمجھ میں آنے لگی۔ "بہت جا چکے دہلی، اب دہلی کو ہمارے پاس آنا چاہیئے۔" میں نے مسکراتے ہوتے کہا "کیوں نہیں کیوں نہیں۔" وہ بھی مسکرانے لگے ــ "اور پھر آپ جہاں ہوں وہیں مقام دہلی ہوجائے ۔۔۔۔ تو صدر صاحب! اب اس بات کو طے کیجئے" وہ مطلب کی بات زبان پر لے آئے۔

میں نے پوچھا "کون سی بات؟"

کہنے لگے "آپ کی چھوٹی صاحبزادی اب میری ہوگئی۔" ۔۔۔ میں نے وضاحت چاہی تو کہا گیا "میں نے اپنے بڑے لڑکے کی شادی آپ کی چھوٹی صاحبزادی سے طے کر دی ہے ۔۔۔ اِسی وقت"

میں نے سوال کیا "آپ کا لڑکا کیا کرتا ہے؟"

جواب ملا۔ "یونیورسٹی میں جونیئر لکچرار ہے ۔۔۔ لیکن بڑا ناخلف ہے ۔۔۔ ایک لڑکی اس کی شاگرد ہے اور وہ اس کو پڑھانا نہیں چاہتا، اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں سمجھاتا ہوں بیٹا تم اپنی پسند کی لڑکی سے محبت

کرو اور میری پسند کے عصر سے شادی کرو ..... نہیں مانتا ... کہتا ہے ... جس سے محبت بس اُسی سے شادی۔"

"تو میں کیا کروں ... ؟" میں نے پریشان لہجہ میں دریافت کیا۔ "آپ کچھ مت کیجئے" وہ رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگے "میں لڑکی کا فوٹو اور اس کے گھر کا پتہ لا دیتا ہوں ... آپ اس سے محبت شروع کر دیجئے ...."

"میں .... میں .... میں ... ایں ..." میں اس طرح چیخنے لگا جیسے کوئی مجھے پچھاڑ کر، مجھ پر ذبح کرنے بیٹھ گیا۔

"جی ہاں آپ" انھوں نے وثوق سے کہا "یہ شادی پلان کی شادی ہوگی۔ دکھاوا سب کچھ ... عمل کچھ بھی نہیں۔ لڑکی کو آپ اپنی محبت میں پھانس لیں تو وہ میرے لڑکے کو چھوڑ دے گی اور آپ دھوم دھڑاکے سے اس کی شادی اپنی صاحبزادی سے کر سکیں گے۔ میں نے وحشت ظاہر کی تو سمجھانے لگے "اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ منہ تو آپ کا کالا ہے ہی .... بالوں پہ خضاب لگا لیجئے اور اخبار میں اس مضمون کا اشتہار چھپوا دیجئے .... عقد ثانی کے لئے ایک لڑکی کی ضرورت ہے۔ جیسی ہے .... جس حال میں ہے۔ جہاں ہے ... کی اساس پر لڑکی اُٹھائی جائے گی۔ البتہ محبت شدہ لڑکی قابل ترجیح ہوگی۔ شادی کے تین مہینے دس دن بعد لڑکی کو معمّر اور متمول شیخ کے ساتھ کسی بھی خلیجی ملک کو بھیجنے کی ذمہ داری لی جاتی ہے ..." میں نے گردن ہلائی "میں کچھ سمجھا نہیں ..." انھوں نے غصیلے لہجے میں کہا ... "کس نے آپ کو صدر بنایا ... ابھی حضرت اتنا نہیں سمجھے آپ۔ لڑکی کو آپ سے چھڑا کر کسی شیخ کے حوالے کر دیا جائیگا۔ کمیشن ! کمیشن !!" میں مطمئن ہوگیا ... "نوبت اب کہاں تک پہنچی ہے" بتایا گیا چھٹیوں میں حمایت ساگر کی سیر ہوتی ہے۔ میں نے ان کی سرزنش کی "آپ نے اپنے لڑکے کو روکا ہوتا ... دیکھئے بات، حمایت اللہ سے ... حمایت ساگر تک چلی گئی ہے ... ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے "میں نے روکا تو اس نے کہا۔ اس لڑکی میں اپنی اَنا ڈھونڈنے کے لئے مجھے ایسی ہی دور افتادہ اور پُرسکون جگہ درکار ہے۔"

میں نے پوچھا "حضرت آج کل ہر نوجوان اَنا کو ڈھونڈ رہا ہے ... یہ ہے کیا بلا ؟ وہ بولے "بن ملن کے بچوں کو جو عورت سنبھالتی ہے اُسے شاید اَنا کہتے ہیں" میں ہنس پڑا۔ "یہ اَنا آنا نہیں، یہ کوئی چھٹی انگلی ہے .. ... اور اتفاق سے میری چھوٹی بیٹی چھ انگلیوں والی ہے" لپک کر مجھ سے بغلگیر ہوگئے اور لہجے میں رومانی خرخراہٹ لاتے ہوئے کہنے لگے :

"صدر! میں شادی بیاہ کے معاملہ میں لین دین کی بات چیت کا قائل نہیں ہوں لیکن کیا کروں تمہاری بھابی کا تقاضا ہے کہ سمدھی بھائی سے کم از کم بیس ہزار روپے لیتے آنا، کہنا مجھے حج کو جانا ہے" میں نے اپنے آپ کو چھڑا لیا اور سنجیدہ لہجہ میں پھٹ پڑا "آپ کی بیگم صاحبہ کے مقدس مطالبہ کو پورا کرنا آپ کا کام ہے۔ آپ اس کا کسی نہ کسی طرح بند و بست کر دیجئے .... آپ سے نہ ہو سکے تو آپ کے انتقال کے بعد .... انشاء اللہ ... میں حاضر رہوں گا ..." ایک دم اچھل گئے۔ ناراض لہجے میں چنگھاڑنے لگے .... "مجھے آپ سے اس جواب کی توقع نہ تھی ... میں آپ کی لڑکی سے اپنے لڑکے کی شادی منسوخ کرتا ہوں، اسی وقت اور آپ کو متنبّہ کرتا ہوں کہ اگر آپ کرسئ صدارت پر جم کر نہ بیٹھے تو بھانامتی کے زور سے آپ کا اغوا ہو جائے گا ... اور آپ کو اس وقت

تک چھوڑا نہیں جائے گا جب تک کہ آپ کے لوگ میری بیوی کو حج سے فارغ کرا کے اس کی تجہیز و تکفین کا بھی انتظام نہ کردیں۔ "تجہیز و تکفین کا انتظام تو آج بھی ہوسکتا ہے۔" میں نے زیرِ لب کہا اور وہ دروازے سے ٹکراتے باہر نکل گئے۔

. . . .

میں نے تہیہ کرلیا۔ یہ میری آخری صدارت ہوگی ... اور اس کے بعد مزاح نگاری سے تائب ہوجاؤں گا ... اور یہ کہ ... آئندہ ... ادبی اجلاسوں میں باب الداخلہ پر صرف "شگوفہ" کا سووینیر بیچا کروں گا ... اس فیصلہ کا آخری جزو بالکلیہ فلاحِ نسواں کے زیرِ اثر ہے کیونکہ آج ہی میری چشم تماشہ پسند نے یہ منظر دیکھا کہ "شگوفہ" کا سووینیر نہ ملنے کی بنا پر مستورات ملکی ایک دوسرے کا میک اپ، زیور اور لباس دیکھتے خاموش، بالکل خاموش رُکی کھڑی تھیں۔

. . . .

دروازہ کی دھڑ دھڑ بیگم صاحبہ کو لے آئی ... انھوں نے مجھے لکھتا ... سوچتا ... بال نوچتا .. دیکھا تو اعلان کردیا۔ "اب یہ لکھنے پڑھنے کا دھندہ آپ ختم کردیجئے ... ورنہ آپ کا تو کچھ نہیں جائے گا ... میں بیوہ ہوجاؤں گی۔" میں نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا "ارے، یہ ساڑی آپ نے کب خریدی؟ کتنی خوبصورت ہے، آپ کے موڈ کے ساتھ اس کا رنگ بدلتا، نکھرتا رہتا ہے" بیگم نے اس خوشامدی تبصرہ کو سُنا ان سُنا کردیا۔ "یہ جو اپنے پانچویں داماد کا ایک دوست ہے نا کاجو .... میں نے پوچھا "کاجو .. نمکیں یا مرچیں ... بیگم نے چڑتے ہوئے کہا "نہ نمکیں نہ مرچیں خواجہ کریم الدین ..." "اچھا ... تو ..." میں بیگم کا حکم سننے کے لئے تیار ہوگیا۔ "وہ مزاح نگار بن گیا ہے ... کیا کرے گا بے چارہ کہیں کوئی نوکری ملتی ہی نہیں۔" میں نے پوچھا "میں کیا کرسکتا ہوں .. میری جو نوکری ہے، وہ بھی مزاح نگار کے بس کی نہیں .." کہا گیا "آپ اس سے ادبی اجلاس میں مضمون تو پڑھوا سکتے ہیں۔" . .

میں نے فخریہ انداز میں کہا "کیوں نہیں ضرور ...." بیگم نے پکارا "کاجو .." اور ایک موٹا تازہ کاجو سامنے آکھڑا ہوا۔ میں نے پوچھا "کب سے مزاح نگاری کرتے ہو؟"

کاجو نے جواب دیا "آج ہی سے۔"

میں نے پوچھا "کس عنوان پر لکھا ہے۔؟"

کاجو نے جواب دیا "مضمون کا عنوان ہے "مچھر" .... "

میں نے نصیحت کی "کاجو ... میرے بچے ... آج ہی سے مزاح نگاری چھوڑ دو اور مچھر مارنا شروع کردو میں اپنے ہی گھر سے تمہیں ماہانہ سو روپے دیا کروں گا۔ کام ... دام ... نام ... تینوں تمہارے ... اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کارنامے سے متاثر ہوکر حکومت تمہیں کمشنر بلدیہ بھی بنا دے۔"

میری نصیحت کاجو کے پلے نہ پڑی اور وہ جلتا بھنتا چلا گیا۔

کاجو کا بھی کوئی قصور نہیں ... دراصل مزاح نگاری کو بچوں کی ہنسی سمجھا جارہا ہے۔

ادبی محاسن یا فنی نکات پر دھیان دیتے ہوئے مزاح پاروں کی تخلیق کی طرف کوئی مائل ہی نہیں ہوتا۔ دوسری طرف مزاح نوازوں کی رواروی کا یہ عالم ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک لطیفہ کے لئے وقت دے سکتے ہیں اور اس ایک لطیفہ کی قسمت میں بھی جو قہقہہ ہوتا ہے وہ خیراتی ہوتا ہے۔۔۔ لطیفہ کو سمجھے بغیر نمائش کی خاطر پھینکا ہوا قہقہہ!

میرے ایک دوست عابد روڈ پر ملے۔۔ پان کھانے کا خیال ہوا تو پان کے ڈبہ پر چلے گئے۔۔۔۔ میں نے کہا پان کا ایک لطیفہ سنو! ۔۔۔ ایک صاحب نے پان والے کو چونّی دی اور کہا میاں ایک پان بنا دو۔۔۔ پان والے نے پوچھا "حضور کیسا پان چاہیئے؟" انھوں نے کہا "تھوڑا سا آسام، تھوڑا سا گجرات، تھوڑی سی سبزی منڈی گھنی ہوئی، تھوڑا سا گلزار حوض اور بہت زیادہ سن سٹی۔۔۔" پان والا خوش مزاج تھا پوچھ بیٹھا "حضور وہ آپکی چونّی بھی ڈال دوں؟"۔۔۔ میرے دوست نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور ہم اپنے اپنے راستوں پر بڑھ گئے۔ چند دن بعد پھر اس دوست سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگا "ارے یار میں بھی پان میں چونّی ڈالکر کھایا۔۔۔ ذائقہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ البتہ چونّی کو نگلنے میں بڑی دقت ہوئی۔" اس مزاح فہمی پر میرے بھی آنسو بڑی مشکل سے رک سکے۔

مزاح کی ناقدری کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب مزاح کو مزاح کے رنگ میں نہیں دیکھا جاتا جذباتیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ مشتعل ہونے کی ایک ذرا سی چھیڑ بھی کافی ہوتی ہے۔۔۔ ایک صاحب جن کا خاکہ مجتبیٰ حسین نے لکھا، فریاد کناں آئے "خدا مزاح نگار سے پناہ میں رکھے۔"

میں نے کہا "بھائی میرے آپ کا خاکہ بھی کھینچا جائے اور آپ کی خفگی بھی جھیلی جائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟" تیز لہجہ میں کہا "یہ بھی کہاں کا انصاف ہے کہ اچھائیوں کے ساتھ برائیوں کو بھی اچھالا جائے۔۔۔ یہ دُنیا ہے جناب، یہاں اچھائیاں ڈوب جاتی ہیں، بُرائیاں تیرتی رہتی ہیں۔"

میں نے ان کو سمجھایا "لیکن یہی تو ایک اچھے اور سچّے مزاح نگار کا کمال ہے؟" بھڑک اُٹھے "میں پوچھتا ہوں کپڑے اُتار کر پھولوں کے ہار پہنانا، کیا یہی مزاح نگار کا کمال ہے۔" میں نے کہا "آپ پوری روداد ہی کو غلط سمجھ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ اب تک اپنی کمزوریوں کی طرف سے آنکھیں بند کئے رہے، یا انہیں خوبیوں کے روپ میں دیکھتے رہے اور جب مزاح نگار نے پردہ ہٹایا۔۔۔۔ آپ کی آنکھیں کھُلیں۔۔۔ لیکن آپ احسان مند ہونے کے بجائے مزاح نگار کے پیچھے لٹھ لیئے نکل گئے۔" انھوں نے کچھ مدھم لہجے میں پوچھا "کیا اس میں کمزوریاں نہیں ہیں؟"

میں نے کہا "ضرور ہیں۔ لیکن وہ کمزوریاں اس میں قطعی نہیں ہیں جو آپ میں ہیں۔۔ اور یہ بات آپ اچھی طرح ذہن نشیں رکھئے کہ جو ہر دار مزاح نگار دوسروں کی بُرائیوں کو بے نقاب کرنے سے پہلے اپنا جائزہ لیتا ہے، کیونکہ آئینہ دکھانے والے کو لازماً اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں ایک حکایت بھی سن لیجئے، ایک صاحب اپنے بچہ کو ایک عامل صاحب کے پاس لے گئے اور کہا "حضرت قبلہ اس بچہ کو چوری کی بُری عادت ہے، کوئی تعویذ دیجئے کہ اس کی یہ عادت ترک ہو جائے۔" عامل صاحب آبدیدہ ہو گئے اور بچہ کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ پھر انھوں نے اپنی جیب سے فونٹین پن نکالا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اس کے بعد انھوں نے کاغذ کے دو ٹکڑے لیے،

اور بچہ کے والد سے فونٹین پن لے کر ... دو تعویذ لکھ دیئے۔ ان صاحب نے پوچھا "حضرت قبلہ دو تعویذ کیوں!"
عامل صاحب نے کہا " ایک آپ کے بچّہ کے لئے اور ایک میرے لیئے۔"

"آپ کے لیئے ؟!" وہ صاحب حیرت زدہ پوچھ بیٹھے۔

"جی ہاں، میرے لیئے ... " عامل صاحب کہنے لگے "میں بھی چور ہوں، فونٹین پن جو میں نے ابھی کھڑکی سے باہر پھینک دیا، عیدگاہ میں ایک بغلگیری کے دوران جیب بدلی میں میرے ہاتھ لگا اور مجھے مناسب نہیں معلوم ہوا کہ چوری کے قلم سے چوری سے باز رکھنے کا تعویذ لکھوں۔" ......

... تو میرا مطلب ہے مزاح نگار پہلے اپنے کردار کو سنوارتا ہے پھر دوسروں کی اصلاح کی فکر کرتا ہے۔ اور میں یہ بات دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مزاح نگار ہی ایک اچھا انسان اور ایک موثر مصلح ہوتا ہے ...

اب شکایت آپ ہی کی طرف پلٹتی ہے :

مزاح نگار کے مقصد کا ادراک نہیں
اس کے ہنر کا اعتراف نہیں

اس درخواست ... گزارش ... التجا ... کے ساتھ :

مزاح زندگی ہے اِسے ہنسی میں نہ اُڑایئے
مزاح نگار آپ کا بہی خواہ ہے اُسے مسخرہ نہ سمجھئے

■

بھارت چند کھنہ

بیمہ کمپنی کا ایجنٹ اور میری زندگی

[یہ مضمون زندہ دلانِ حیدرآباد کے ۱۴ ویں ادبی اجلاس میں پڑھا گیا]

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرضِ عشق یا دق، شراب کا چسکا، بیکاری (ہندوستان کی حد تک)، نفاق (اردو کے طرفداروں کی حد تک)، رشوت خوری (ہندوستان میں چپراسی سے لے کر ہر اونچی سطح تک) یا پھر گھوڑ دوڑ میں جانے کی بیماری کسی کو لگ جائے تو پھر کبھی نہیں چھوڑتی۔ مگر دنیا میں جس چیز کی گرفت ان سب سے زیادہ قوی ہے، اور جو انسانوں کا پیچھا کرنے میں یکتا ہے، وہ بیمہ کمپنی کا ایجنٹ ہے! یہ بھی عام طور پر انسان ہی سمجھا جاتا ہے، اور کہتے ہیں کہ اس کے بھی سینہ میں دل، سر میں دماغ اور دماغ میں عقل ہوتی ہے مگر حیرت اس بات کی ہے کہ ایسا انسان جب کسی کے پیچھے پڑ جاتا ہے، یعنی جسے اپنا شکار سمجھ لیتا ہے تو پھر نہ اُس کی آہ و زاری اور مجبوریاں اس کے دل پر کچھ اثر کرتی ہے اور نہ ہی گھرکیاں، گالیاں یا دھمکیاں — حد یہ کہ پولیس کی مدد حاصل کرنے کا اظہار بھی بالکل بے اثر ثابت ہوتا ہے۔

میں اپنے متعلقین اور غیر متعلقین میں عام طور پر بدقسمت سمجھا جاتا ہوں، مگر میرا اپنا خیال یہ ہے کہ درحقیقت خالص بدقسمتی ایک منحوس شام کو بیمہ کمپنی کے نمائندہ کا روپ دھار کر میری معصوم زندگی میں اُسی تیزی اور تشدد سے داخل ہوگئی جس کا اظہار تیسرے درجہ کے مسافر ریل گاڑی کے اسٹیشن پر ٹھہرتے ہی کرنے لگتے ہیں یا پھر کسی کھانے کی دعوت میں بوفے ڈنر کے میز پر جاوے تے ہی ہوتا ہے۔

اس واقعہ کی ابتداء یوں ہوئی۔ مذکورہ بالا منحوس شام میں گھر میں بیٹھا معمولی انسانوں کی طرح دل ہی دل میں ہوائی قلعے تعمیر کر رہا تھا۔ اتنے میں گھر کے سامنے ایک موٹر رکی۔ نوکر کارڈ لایا جس پر خوبصورت حروف میں لکھا تھا۔

"ایس۔ آر۔ بھٹ۔ انسپکٹر مشرقی بیمہ کمپنی"

میں نے موصوف کو اندر بلایا۔ ایک موٹے سے انسان، جسم پر انگریزی لباس، سر پر فرجی طرز کا ٹوپ اور چہرہ مجسم مسکراہٹ!

یہ شاید قانونِ فطرت ہے کہ جب دو انسان ملتے ہیں تو ان کے چہروں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔ کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے

ہوئے مسکراتے رہے۔ آخر میں سکوت اور مسکراہٹ توڑتے ہوئے کام پوچھا۔

انہوں نے اپنے کارڈ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے کہا کارڈ نہایت خوبصورت چھپا ہوا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ آیا میں نے زندگی کا بیمہ کرایا ہے یا نہیں۔

میں نے جواب نفی میں دیا۔

کہنے لگے ؎

من خوب می شناسم مردانِ نارسا را

حد ہو گئی۔ ایک پڑھا لکھا انسان اور زندگی کا بیمہ کرائے بغیر زندگی بسر کر رہا ہے۔ اپنے خاندان کا کچھ خیال نہیں، اہل و عیال کی پرورش، فضول خرچیوں سے بچنے کی ترکیب، پسماندگان کی زیست کا ذمہ دار۔ پیری کا عصا —— اور پھر اپنی موٹی اُنگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے حقیرانہ انداز میں کہا — "اگر ایک ہفتہ کے اندر اندر آپ رحلت فرما جائیں تو آپ کے عزیز و اقارب کا کیا ہوگا!"

میں نے کہا کہ میرے اس جہاں سے گذر جانے پر میرے اعزاء ایک بارِ گراں سے خلاصی پاکر اطمینان کا سانس لیں گے۔ بیمہ کی اقساط دینے کے لئے روپے کی ضرورت ہے جو میرے پاس نہیں۔ یہاں تو ننگی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا کا مسئلہ درپیش ہے۔

مہتہ صاحب ٹلنے والے انسان نہیں تھے۔ اُنہوں نے اپنی پہلی تقریر کو اُلٹ پھیر کر پھر بیان کرنا شروع کیا۔ اُنہوں نے چند فقرے رٹے ہوئے تھے جن کو وہ بار بار میری طرف پھینک رہے تھے۔ میں طرح طرح سے اپنی مجبوریوں کا اظہار کر رہا تھا۔ کئی مرتبہ ان کو خدا کا خوف بھی دلایا۔ عدالتی کارروائی کرنے کی دھمکیاں دیں، مگر وہ چکنے گھڑے تھے۔ تین گھنٹے تک مسلسل یہ چپقلش جاری رہی بالآخر مہتہ صاحب پھر حاضر ہونے کا یقین دلاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ میں سربسجدہ ہو گیا۔ خدا کا شکر بجالایا کہ ؎

رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت

پندرہ دن بعد مہتہ صاحب پھر نمودار ہوئے۔ اب کے بہت تُو تُو میں میں ہوئی۔ میں نے اُنہیں شائستہ الفاظ میں بہت گالیاں سنائیں۔ اُنہوں نے نہایت غیر شائستہ لہجے میں مجھے بدقسمت، بے وقوف، کم عقل، کوتاہ اندیش اور نہ معلوم اور کیا کیا کہا۔ غرض دو گھنٹے تک یہ مکالمہ بازی ہوتی رہی اور مہتہ صاحب پھر حاضر ہونے کا اظہار فرما کر بادلِ ناخواستہ جلد ہی چلے گئے۔

اس کے بعد وہ ہر ماہ وارد ہوتے رہے۔ وہی پُرانے فقرے، وہی رٹ۔ سال بھر یہی ہوتا رہا۔ میری حالت ایسی ہو گئی کہ خواب میں بھی مہتہ صاحب سے بحث کرتا سنا گیا۔ کبھی بیٹھے بیٹھے کُرسی پر چونک جاتا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہتا کہ "خدا کے لئے مہتہ صاحب۔ اس وقت یہاں سے تشریف لے جائیے، میں بیمار ہوں، مرجاؤں گا اور اگر میں مر گیا تو آپ میری زندگی کا بیمہ نہیں کر سکیں گے"۔ گھر والے ہراساں تھے۔ والدین کو فکر ہو گئی کہ مجھ میں دیوانگی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ میرے رگ و ریشہ میں مہتہ صاحب کی تقریر سرایت کر گئی تھی۔ آخر ایک مرتبہ جو وہ اپنی راؤنڈ پر آئے تو میں نے درخواست کی کہ وہ فارم میرے پاس چھوڑ جائیں، میں پھر کر اُن کے مکان پر پہنچا دوں گا۔ اُنہوں نے فوراً اپنی جیب میں سے چند فارم نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے، اور اپنا نہایت موٹا قلم (جو عام قلموں کا والد بزرگوار معلوم ہوتا تھا)، نکال کر فارم بھرنے لگے تھے کہ میں نے استدعا کی کہ فارم پُر کرنے کا اعزاز مجھے ہی حاصل کرنے کا مو

نشیں۔ یہ سنتے ہی بیمہ صاحب رخصت ہو گئے

ایک دو دن کے غور و فکر کے بعد میں نے فارم کے سوالات کا جواب جس طرح دیا وہ پیش خدمت ہے۔

سوال : تمہاری عمر کیا ہے؟

جواب : "تیس برس، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اسّی کے پیٹے میں ہوں۔"

سوال : "تمہاری چھاتی کا ناپ کیا ہے؟"

جواب : "چھاتی تو صرف بیس اِنچ ہے مگر پیٹ پینتالیس اِنچ سے ہرگز کم نہیں۔"

سوال : "تمہاری چھاتی پھلانے سے کتنی بڑھتی ہے؟"

جواب : "ایک ملی میٹر مگر پیٹ کا اُبھار کھانے کے بعد چھ اِنچ تک بڑھ جاتا ہے۔"

سوال : "تمہارا قد کتنا ہے؟"

جواب : "ایک میٹر سے کچھ نکلتا ہوا۔"

سوال : "کیا تمہارے دادا جان زندہ ہیں؟"

جواب : "شائد ہوں۔ مجھے کوئی علم نہیں۔"

سوال : "تمہارے دادا اگر زندہ نہیں تو کس بیماری سے مرے؟"

جواب : "کھاتے پیتے کے روگ سے۔ اگر وہ زندہ نہیں۔"

سوال : "کیا تمہیں کسی وقت کسی مرض کی شکایت رہی؟"

جواب : "بچپن میں دردِ گردہ، تلی، موتیا بند، ضعفِ دماغ، پھنسیاں، چیچک، ہیضہ اور پلیگ باری باری سے فیضیاب کرتے رہے۔ لڑکپن مرضِ عشق سے شروع ہوا اور یہ روگ ابھی چھوٹا نہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ دردِ کمر، چکر، قبض، بواسیر، پیچش، دمہ، شکر کی بیماری، جوڑوں میں درد، جنوں کے آثار، کوڑھ کی علامات اور چند ایک ایسی بیماریوں کا بھی حامل ہوں جن کا بیان کرنا اس لئے مناسب نہیں سمجھتا کہ کہیں میری زندگی کا بیمہ کرنے سے کمپنی گریز نہ کرے۔"

سوال : "تمہارے کوئی بھائی بہن ہیں؟"

جواب : "پچیس بہنیں تیس مگر سب کی سب تقریباً مرکھپ چکی ہیں، جو باقی ہیں وہ بسترِ مرگ پر ایڑیاں رگڑ رہی ہیں۔"

سوال : "کیا تمہاری کوئی عادتیں ایسی بھی ہیں جن سے تمہاری عمر کم ہوجانے کا اندیشہ ہو؟"

جواب : "کوئی خاص عادتیں نہیں۔ مگر میں عام طور پر نشہ کرتا ہوں۔ صبح تمباکو نوشی سے ہوتی ہے۔ ناشتہ کے وقت جن پیتا ہوں، دوپہر کے کھانے کے ساتھ بیئر، سہ پہر کی چائے کے ساتھ رَم، شام کے وقت گانجہ کا دم، رات کے کھانے کے ساتھ بھنگ، پان کے ساتھ کوکین گھلاتا ہوں اور سونے سے پہلے مارفیا کا انجکشن لے لیتا ہوں۔"

سوال : "کیا تمہیں کبھی کسی ایسی بیماری نے آدبوچا تھا جس سے تم مرتے مرتے بچے ہو؟"

جواب : "صرف ایک مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔ میں بغیر کوئی نوٹس دیئے بے ہوش ہوگیا تھا۔ کہتے ہیں کہ میری حرکت قلب بالکل ختم ہو چکی تھی، اور میرے عزیز و اقارب خوش تھے کہ منحوس راہی ملک عدم ہوگیا، اسی خوشی میں ماتم دھوم سے رچایا گیا اور جب مرگھٹ میں میری چتا کو آگ لگائی گئی تو گرمیٔ آتش میری موت پر غالب آگئی۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ دیکھنے والوں کو حیرت اور میرے گھر والوں کو افسوس ہوا۔ اس دن سے آج تک پھر کبھی عارضی طور پر نہیں مرا۔"

سوال : "کیا تم ورزش وغیرہ کے عادی ہو؟ کیا تم کسی کھیل، کود وغیرہ میں دلچسپی لیتے ہو؟"

جواب : "ہر دوائی کی بوتل پر لکھا ہوتا ہے کہ ہلا کر پی جائے، چنانچہ میں دن رات میں کم از کم تیس مرتبہ دوائی پیتے وقت بوتلوں کو زور زور سے ہلا کر داہنے ہاتھ کی ورزش کر لیتا ہوں۔ تھرما میٹر کا پارہ میں بائیں ہاتھ سے اُتارتا ہوں جس سے بایاں ہاتھ بھی کسرتی ہو گیا ہے۔ گانجے کی چلم کا دم کھینچنے سے چھاتی اور پھیپھڑوں کو کسرت کرانے کا کام انجام پاتا ہے۔ ٹانگیں میری کسی خاص ورزش کی رہین منت نہیں اسی لئے تو کمبخت سوکھی ہیں۔

میں تاش کے سب کھیلوں سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ شطرنج، پچیسی اور کیرم میں کافی مہارت رکھتا ہوں کودنے کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ جب مجھے جنون کا دورہ پڑتا ہے تو میں بیس بیس منٹ تک چھ چھ فٹ اونچا کودا کرتا ہوں"

میں نے فارم بھر کر راست کمپنی کے دفتر روانہ کر دیا۔ ساتھ ہی بیمہ کی پہلی قسط کی رقم بھی روانہ کر دی۔ خیال تھا کہ فارم پہنچنے پر بہتا صاحب کی خوب گت بنے گی اور غرور اُن کا تنزل ہو جائے گا۔ مگر آپ میری حیرت کا اندازہ بیمہ کمپنی کے اس جواب سے کر سکتے ہیں۔

"جناب من۔ آپ کا فارم اور قسط کی رقم وصول ہوئی۔ شکریہ قبول فرمائیے۔ آپ کی خاندانی صحت اور خود آپ کی تندرستی کچھ ایسی حوصلہ افزا نہیں۔ دیگر بیمہ شدہ حضرات کی صحت اور آپ کے صحت نامہ کا مقابلہ کمپنی کے ماہروں نے بڑے غور و خوض سے کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ آپ کی پالیسی کو "اول درجہ کا خطرہ" باور کرتے ہوئے قبول کر لیا جائے۔ اس زمرہ کے پالیسی برداروں میں آپ کا نمبر سب سے پہلا ہے۔ اس لئے آپ کا پالیسی نمبر بھی نمبر ۱ قرار پایا ہے۔ آئندہ ماہ قسط کی رقم روانہ کرتے وقت اپنے پالیسی نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں۔"

"منجانب مشرقی بیمہ کمپنی"

--

کرنل محمد خان

انگلستان: شہر اچھے کہ بن؟ - ۹

یہ سپیرا نہیں، لائبریرین ہے

دوسرے دن ولٹ شائر کی لائبریری دیکھنے گئے۔ صحنِ چمن میں داخل ہوئے تو دو چاک گریبانوں اور بے باک بٹنوں والی نوجوان لڑکیاں، گلے میں رنگ برنگے منکوں کے ہار ڈالے اور شانوں پر بال پریشان کئے، نظر آئیں۔ ہم سمجھے لا بیرے کی فیلی پھر رہی ہے۔ قریب پہنچے تو انہوں نے ہمیں اجنبی پاکر استفساراز دیکھا۔ ہم نے پوچھا۔

"یہ لائبریری ہے؟"

بولیں۔ "وہ صاف لکھا ہوا ہے، کاؤنٹی لائبریری، ولٹ شائر۔ آپ کو شک کیوں ہو رہا ہے؟"

کہا: "سچ پوچھیں تو آپ کو دیکھ کر شک ہوا۔ میں سمجھا یہ کوئی کیمپنگ سائٹ ہے یا یہاں کوئی جپسی قبیلہ آباد ہے"

دونوں ہنس کر بولیں۔ "یقین کریں، نہ یہ کیمپنگ ہے اور نہ ہم جپسی ہیں۔ ہم دونوں اسسٹنٹ لائبریرین ہیں۔"

اس حلیہ کی لائبریرین دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کہا

"اگر آپ سچ مچ لائبریرین ہیں تو کیا مجھے چیف لائبریرین مسٹر آرنلڈ کا کمرہ دکھا سکیں گی؟"

"یقیناً۔ وہ دیکھیں، دائیں ہاتھ کو آخری دروازہ۔"

ہم دائیں ہاتھ کو چل پڑے اور آخری دروازے پر جاکر دستک دی۔ ہم دل میں سوچ رہے تھے کہ اگر محترمات اسسٹنٹ لائبریرین کا حلیہ یہ ہے تو دروازہ کھلنے پر محترم چیف لائبریرین صاحب سر پر لال رومال باندھے، کانوں میں بالے لے، میز پر سانپ نکالے، بین بجاتے نظر آئیں گے۔ لیکن دروازہ کھلا تو ہمارے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے

۱۔ خانہ بدوش

لائبریرین سپیرانہ تھا بلکہ ایک عام فہم انگریز جیسے کبھی ہوا کرتے تھے۔ بال کٹے ہوئے، بٹن لگے ہوئے اور منہ دھلا ہوا۔ ہم سے کچھ فالتو تپاک سے ملا وہ اس لیے کہ کبھی میجر تھا اور پنڈی میں رہ چکا تھا۔ چنانچہ جہاں ہماری ذاتی خیریت کے متعلق پوچھا، وہاں چکلالہ، ویسٹرج اور لال کرتی کی غائبانہ مزاج پرسی بھی کی۔ آپ نے پچھلے چند سالوں سے سن رکھا تھا کہ ہم ایک نئی بستی بنام ازلیہ بیڈ بھی بسا رہے ہیں اور یہ کہ وہ بڑی حسین و جمیل بستی ہے۔ "کیا یہ سچ ہے؟" ہم نے انہیں تسلی دی کہ بے شک اس نئی بستی کا حسن انتہائی قیامت خیز ہے جیسی اُن کی شنید ہے۔ صرف نام وہ نہیں جو انہوں نے سُن رکھا ہے بلکہ اسلام آباد ہے۔ پھر آپ نے ہمیں لائبریری کی سیر کرائی اور اسٹاف سے تعارف کرایا۔

ٹام کالسن۔ ایڈم افسر، موٹا اور خوش طبع۔ پاکستانی ہونے کا دعویدار کہ آج سے پچاس برس قبل کراچی میں پیدا ہوا تھا۔ پلا تھا اور پڑھا تھا۔ ہم سے اردو میں علیک سلیک کی اور ہمیں دیکھ کر اسکی کراچی کی گلی کوچوں کی یادیں تازہ ہونے لگیں۔ گویا پوچھتا ہو کہ اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر پنہاریاں پانی بھرتی ہیں؟ او دیس سے آنے والے بتا۔ ہرچند کہ ان پنگھٹوں کے موجودہ استعمال کا ہمیں علم نہ تھا تاہم ہم نے کسی قدر وثوق سے کہہ دیا کہ اب وہاں بچوں کے ریڈی میڈ کپڑوں کی منڈی ہے اور دل میں سوچا کہ منڈی نہیں تو رکشوں کا اڈا ہوگا اور دونوں صورتوں میں مسٹر کالسن کو ایک جیسی ٹھیس لگے گی۔

پھر مسز بالم سے تعارف ہوا۔ جوانی سے کچھ آگے نکل چکی تھیں مگر اب بھی لالہ رخ اور سمن بر تھیں۔ پیشے کے لحاظ سے انتخابِ کتب کی ماہرہ لیکن تاثیر کے اعتبار سے تالیفِ قلوب کی ساحرہ تھیں۔ ہم سے دو باتیں کیں اور دل کے قریب جا پہنچیں۔ قلمی شاعر نے کہا ہے۔ "کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے؟" لیکن شاعر نے یہ نہیں بتایا کہ یہ لوگ اگر مان جائیں یا سرے سے روٹھیں ہی نہیں تو کتنے دُلارے لگتے ہیں۔ مسز بالم اس دوسرے گروہ میں سے تھیں۔ اس قدر سویٹ اور متواضع کہ اگر بیٹھنے کے لئے کرسی نہ ہوتی تو گود خالی کر دیتیں۔ ایسے لوگ پیارے نہ لگیں تو کیا لگیں؟

اگلے کمرے میں گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی دو سُندر سپیرنیاں جنھیں اسسٹنٹ لائبریرین ہونے کا مشکوک سا دعویٰ تھا، کرسیوں پر براجمان ہیں۔ لیکن تعارف پر معلوم ہوا کہ یہ سچ مچ وہی شئے ہیں اور بڑی معتبر قسم کی۔ یعنی اپنے کھلے سرکش سینوں پر مٹکوں کی مالائیں اور زلفوں کی گھٹاؤں کے باوجود! آرنلڈ نے ان سے تعارف کرایا تو اس احترام کے ساتھ اور واضح جسمانی حقیقتوں سے اسطرح قطع نظر کرتے ہوئے جیسے پردہ نشینوں سے تعارف کرا رہا ہو۔ اور جیسے ہمارا مشاہدہ محض واہمہ ہو ورنہ خواتین نے گویا بند گلے کے چینی کوٹ پہن رکھے ہوں۔ بہرحال آرنلڈ کو ضبط کا یارا ہو تو ہو، ہمیں نہ تھا۔ چنانچہ مس نینا ہیمنڈ اور مس پیگی کنگ سے ہاتھ ملاتے ہوئے یکے بعد دیگرے ہمیں تربوز جتنے بڑے ہوا کے گولے نگلنے پڑے ___ معلوم ہوا کہ برطانیہ کے قدیم وضعداروں کا گزارہ جدید وضع شکلوں کو محض تبدیل کرنے پر نہیں بلکہ ان کی خوشامد پر ہے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم برطانوی مظلوموں پر اپنی ہمدردی ضائع کر دیتے۔ ہمیں وطنِ عزیز یاد آیا جس کا ہماری ہمدردیوں پر پہلا حق تھا کہ عریاں سینوں اور کوتاہ آستینوں کی اس ارضِ نگارزار میں بھی کمی نہیں۔ یہاں بھی جسمانی جیومیٹری قمیصوں اور چولیوں پر اسی قسم کا اشتعال انگیز دباؤ ڈال رہی ہے جیسے برطانوی بلاؤزوں پر پڑ رہا ہے۔ لیکن خیر، یہ جملۂ معترضہ تھا۔ کہنا یہ تھا کہ آرنلڈ نے اپنے ماتحتوں سے تعارف کرایا جنہیں مل کر ہمیں بخت

قسم کی خوشیاں ہوئیں۔ کچھ فوری طور پر اور باقی بعد میں۔ ہمیں وہاں چار پانچ روز رہنا تھا۔ آرنلڈ نے ہمیں ایک ایک روز کے لئے کالسن، مسز بالم، نینا اور پیگی کو الاٹ کردیا اور پہلے دن کی میزبانی کا شرف اپنے لئے محفوظ رکھا۔ چنانچہ دوپہر تک تو اپنی کاؤنٹی کی لائبریریوں کے اسرار و رموز بیان کرتا رہا۔ جنھیں سُن کر ہم کچھ زیادہ بور نہ ہوئے کہ اس موضوع پر ہم مزید بور نہیں کئے جاسکتے تھے۔ کینٹ ہی سے تربتر لوٹے تھے، البتہ پچھلے پہر کار میں کاؤنٹی کے دیہات اور دیہاتی لائبریریوں کی سیر کو نکلے تو ہمیں خاص سرور آنے لگا۔ برطانیہ کے سبزہ زاروں میں وہ سحر ہے جو اُس کے شہروں میں نہیں اور ہو بھی کیسے؟ بن[1] خدا نے بنائے ہیں اور شہر انسان نے اور ظاہر ہے کہ بحیثیت خالق خدا سے ہمسری عبث ہے، بلکہ یوں لگتا ہے جیسے کہ وہ دمن کے جمال سے مسحور ہونا بجائے خود عبادت ہے کہ خالق کی شان میں سب سے بڑی تسبیح اس کی تخلیق کو چاہنا اور سراہنا ہے۔ چنانچہ اس شام ہم نے جی بھر کر عبادت کی اور بے حساب دولتِ سوز و سرور جمع کی۔

بالم آؤ بسو میرے من میں اور سٹون ہنج دیکھو

دوسرے روز ہمیں مسز بالم کے سپرد کیا گیا یعنی اس خاتون کے سپرد جس کے دہن میں قدرت نے شہد و شکر کی سلسبیل رکھ دی تھی۔ مسز بالم نے بھی قبل دوپہر تک ہمیں انتخابِ کُتب کے رموز پر درس دیا۔ ان رموز سے تو ہم پہلے ہی آشنا تھے۔ سو یہ سبق ہمارے لئے آسان ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اس جادوگر بالم کی تقریر کی لذت کا یہ عالم تھا کہ کُتب شناسی سے پہلے خود فراموشی کی منزل تک پہنچ گئے اور خبر اس وقت ہوئی جب مسز بالم نے درس ختم کرکے ہمیں دعوتِ طعام دی۔ لنچ سے فارغ ہوئے تو مسز بالم نے بھی آرنلڈ کی طرح ہمیں سیرِ مضافات کو لے جانا چاہا اور ہمارے لیئے بھی مسز بالم کی صحبت کے بعد ولیٹ شائر کے باغ و راغ کی صحبت سے گوارا تر کوئی چیز نہ تھی۔ آج ہمیں دونوں صحبتیں میسّر ہو رہی تھیں۔ چنانچہ جب مسز بالم ہمیں اپنی کار کے پہلو میں بٹھا کر شہر سے نکلیں تو یوں محسوس ہوا جیسے دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں۔ کار سبزہ و گل کے ہجوم کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی تو یوں لگا جیسے فطرت نے ہمیں کار سے نکال کر اپنی آغوش میں لے لیا ہے اور ہمارے ہاتھ میں شرابِ بیخودی کا ساغر تھما دیا ہے لیکن پیشتر اس کے کہ سر اُٹھا کر ساغر لبوں تک لاتے، اچانک آواز آئی۔

"مسٹر خان، دیکھو ہم سٹون ہنج[2] (STONE HENGE) پہنچ گئے ہیں۔"

---

[1] GOD MADE THE COUNTRY AND MAN MADE THE TOWN

(WILLIAM COWPER)

[2] جنوبی برطانیہ میں پندرھویں صدی قبل مسیح کی ایک قربان گاہ کے کھنڈر جو گنتی کے چند پتھروں کی شکل میں ملتے ہیں

ہم چونک کر جہانِ بے خودی سے کار کی دنیا میں لوٹ آئے۔ یہ آواز مسز بالم کی تھی جو آہستہ آہستہ کار روک رہی تھی سامنے کوئی سَو دو سَو موٹے موٹے بھدّے کالے کالے پتھر نظر آئے جو سبزے کے مخملیں فرش پر اس بے ترتیبی بے ادبی سے بکھرے پڑے تھے جیسے گینڈوں کی لاشیں پڑی ہوں۔ یہ غیر مہذب پتھر کہاں سے آئے تھے؟ یہ اس زمین کا حصہ تو نہ لگتے تھے۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ اُڑتی ہوئی ارواحِ خبیثہ کی گٹھڑی کھل گئی ہو اور یہ بے ڈول دیو پیکر کنکر گر کر بکھر گئے ہوں۔ ہم نے دل میں کہا۔

"کیا یہی سٹون ہنج ہے جس کے دیکھنے کی مس پارس تاکید کر رہی تھی اور جس کا ہر انگریزی گائیڈ بک میں قصیدہ لکھا ہے! ہمیں انگریزوں کی بدمذاقی پر رحم اور رونا آیا۔ کیا انہیں سالسبری کے وہ شاداب سبزہ زار نظر نہیں آتے جو ان بے روح پتھروں، ان بدوضع عنصریتوں کے اردگرد حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے ہیں؟ کیا وہ بجھے بجھے جامد پتھر دیکھ سکتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھ سکتے کہ دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام؟ —— ہم نے مسز بالم سے کہا

"اگر یہی سٹون ہنج ہے تو براہِ کرم اس کی صرف ایک خوبی بتائیں جس کے لئے آپ ٹھہر گئی ہیں؟"

مسز بالم نے ذرا چونک کر ہمیں دیکھا اور لاپروائی سے کہا،

"کیا یہ کافی نہیں کہ یہ سٹون ہنج ہے۔"

"میری پیاری مسز بالم۔ یہ بہت ناکافی ہے۔" ہم نے فی البدیہہ جواب دیا۔

اب کے مسز بالم نے اپنی شرابی آنکھوں کے علاوہ اپنے گلابی سینے کا بھرپور رُخ بھی ہماری طرف موڑا اور اپنے لہجے کی شیرینی میں حُسن کا رعب شامل کرتے ہوئے بولی۔

"تو پھر کیا چاہیئے آپ کو؟"

"بس، کچھ سبزۂ بیگانہ، کچھ گل ہائے تر، لیکن پتھر نہیں چاہئیں کہ میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سِلوں سے۔"

"میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔"

ہمارے پاس اس کے سوا کچھ جواب نہ تھا کہ چچا غالب کا مشہور شعر الاپنا شروع کر دیتے اور الاپنے لگے:—

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مسز بالم کو انگریزی شاعری کی رسیا تھی، شعر کے ترجمے کا مطالبہ کرنے لگی۔ ہم نے بخوشی لیکن بمشکل اس کی انگریزی بنائی، لیکن جوں ہی چچا کا مطلب مسز بالم پر کھلا ہمیں چھوڑ کر چچا پر فدا ہونے لگی اور مزید اشعار کا مطالبہ کیا۔ ہمیں اس غزل کے چند شعر یاد تھے پڑھنے لگے۔ لیکن ہمیں معلوم نہ تھا کہ اسی غزل میں چچا نے ایک شعر سٹون ہنج پر بھی کہا ہے جو بالکل ہمارے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ جونہی یہ شعر لاشعور سے اُبھر کر ہماری زبان سے نکلا، ہم دم بخود رہ گئے۔ شعر تھا ——

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

مسز بالم نے مقطع سنتے ہی کار چلا کر سٹون اسٹیج سے بھاگ نکلی اور کہنے لگی

"ہم سے شاید یہ سنگ ہائے راہ تو نہ ہٹ سکیں لیکن ہم تو اس راہ سے ہٹ سکتے ہیں۔"

ہم نے مسز بالم کو سخن شناسی اور ہنر آئی پر مبارکباد دی اور جب دیکھا کہ چچا کے غائبانہ ہاتھ پر پوری طرح بیعت ہو گئی ہے تو اُسے مرشد غالب کے کلام کا چغتائی ایڈیشن بھیجنے کا وعدہ کیا۔

میمیں سید ضمیر جعفری سے تعویذ لیتی ہیں

ہمارے اگلے دو دن نینا اور پیگی کے ساتھ گزرے۔ جی ہاں، یہ وہی دراز مو اور تنگ قبا ملنگنیاں تھیں جن کے ساتھ آرنلڈ نے ہمارا بصد احترام ایک سطحی تعارف کرایا تھا۔ اب گہرے تعارف کی باری تھی۔ اور گہرائی میں گئے تو معلوم ہوا آرنلڈ سچا تھا۔ یہ باہر سے بے پرواہ اور قلندر مزاج فقیرنیاں اندر سے بڑی کاریگر اور محتاط دُنیا دارنیاں تھیں اور یہ کہ بیرالڈولسن کو اپنی وزارتِ عظمیٰ کا اتنا علم یا فکر نہ ہو گا جتنا انہیں اپنی لائبریری کا تھا۔ ان لڑکیوں کی فرض شناسی دیکھ کر ہمیں اپنے پاکستان کے مزید ہپی یاد آئے اور ساتھ ہی سید ضمیر جعفری کا شعر:

کچھ ہنر، کچھ سعی و کاوش، اے مرے نورِ نظر
صرف ایک پتلون کس لینے سے کام آتا نہیں

اِن لڑکیوں کے ساتھ ہماری سرکاری اٹیچمنٹ ATTACHMENT ختم ہوئی تو ایک پرائیوٹ اٹیچمنٹ کا احساس ہونے لگا جس کی وجہ اُن کی جسمانی نمائش نہ تھی بلکہ ذہنی آرائش جس میں بلاشبہ کچھ سعی و کاوش سے کام لیا گیا تھا۔ نینا اور پیگی نے یقیناً سید ضمیر جعفری سے تعویذ لیا تھا۔

موٹی محبوبہ ایک طرح کا بونس ہے

اگلے اور آخری دن کے لیے ہمیں کراچی نژاد ٹام کالسن آفیسر انتظامیہ کے ساتھ نتھی کیا گیا۔ ٹام خلافِ توقع نینا اور پیگی کی ضد تھا۔ نہ صرف جنس کے لحاظ سے بلکہ مزاج کے اعتبار سے بھی۔ جہاں تک جنس کا تعلق ہے اگر وہ ہلکی پھلکی لڑکیاں جنسِ لطیف کا

نمونہ تھیں تو یہ ٹوٹ بٹوٹ بھینسا صنفِ کثیف کا بڑا دلخراش نمائندہ تھا۔ یعنی مرد اور موٹا ہونے کے علاوہ اور موٹا تھا۔ گردن تو اصلی تھی لیکن معلوم ہوتا تھا گلے میں ٹائر پہن رکھا ہے۔ اگر یہ شخص وزن کرنے کی مشین پر ایک پاؤں رکھتا تو یقیناً دوسرا پاؤں رکھنے سے پہلے مشین کا دم ہمیشہ کے لئے گھٹ جاتا۔ باتیں کرتے ہوئے بازو بلند کرتا تو معلوم ہوتا دونوں ہاتھوں سے کیلے کے گچھے لہرا رہا ہے۔ شکل و صورت کے اس برتنے پر آپ کی عاشق مزاجی کے تتے پانی کا یہ عالم تھا کہ ہمیں حسنِ انتظام کے رموز سمجھاتے سمجھاتے حسنِ خوباں کی بال سلجھانے پر اتر آیا۔ حالانکہ خوباں اور ٹام کے درمیان وہی رشتہ تھا جو گلاب کی کلی اور کیلے کی پھلی میں رہتا ہے۔ بے شک اس کی پیدائش اور پرورش میں کراچی کا ہاتھ تھا تاہم اس تن و توش کے ساتھ اس بات کا امکان نہ تھا کہ ٹام کو کسی ذاتی رومان میں حصہ لینے کا اتفاق ہوا۔ چنانچہ کچھ دیر تو اس کی عاشقانہ موشگافیاں سنتے رہے لیکن ایک جگہ روک کر کہا۔

"مسٹر کالسن۔ آپ کا مزاج بڑا عاشقانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بتائیں کہ آپ کی بناوٹ آپ کو عملِ عشق کی اجازت بھی دیتی ہے؟"

ٹھٹھک کر بولا، "عملِ عشق سے آپ کی کیا مراد ہے؟ شادی؟"

"شادی تو عشق کا خاتمہ ہے۔ عملِ عشق سے مراد وہ مرحلے ہیں جو شادی پر جا ختم ہوتے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً حسینوں کے پیچھے بھاگنا۔ ان کے آگے ہاتھ جوڑنا، ان کے ستم سہنا حتیٰ کہ ایک دن کہہ دیں، منظور ہے!"

"ہاتھ تو میں جوڑ سکتا ہوں۔ بیٹھے بیٹھے ستم بھی سہہ سکتا ہوں لیکن اٹھ کر پیچھے بھاگنا ذرا پرابلم ہے۔"

"گویا آپ صرف اسی صورت میں عشق کر سکتے ہیں کہ کوئی عشق کرانے کو حاضرِ خدمت ہو۔"

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟ بڑا باوقار طریقہ ہے۔"

"تو بتائیں اس باوقار طریقے سے آج تک آپ کے کان میں کبھی "منظور" کی آواز بھی آئی ہے؟"

"ایک دفعہ آئی تو تھی مگر میں نے ارادہ بدل لیا۔"

"کیوں؟"

"وہ مجھ سے بھی موٹی تھی۔"

جو خاتون ٹام کو بھی موٹی نظر آ سکتی ہو اس کے حجم میں ضرور کوئی بات ہو گی۔ بہرحال ہم نے دل میں محترمہ کی ہم تجرٹی کی داد دی کہ ایک تو اس نے راہِ عشق میں بھاگنے پر ابلم نہ سمجھا اور دوسرے ٹام کو دیکھ لینے کے بعد اسے قبول کرنے کا حوصلہ بھی دکھایا۔

ٹام سے یہ گفتگو جاری تھی۔ پوچھا، اس کے بعد کیا ہوا؟

"اس کے بعد آج تک کچھ نہیں ہوا لیکن دنیا بر امید قائم۔"

ہمیں ٹام سے ہمدردی پیدا ہونے لگی کہ اس متلاطم چربی کی تہ میں ایک محروم الفضا انسان بھی تھا اور جس امید پر غریب کی دنیا قائم تھی اس کے بر آنے سے آشنا رہنا پسند سمجھ کہ اسے پتلی میسر نہ تھی اور موٹی موافق نہ تھی۔ اب خدا جانے قارئین کا اس ضمن میں کیا خیال ہے لیکن ہمارا یہ آفاقی فلاسفی یہ ہے کہ بہت موٹے آدمی کے لئے بہت موٹی محبوبہ بھی ایک برنس ہے بلکہ ایک خدائی عطیہ ہے جسے

زن کئے بغیر قبول کرلینا چاہیئے۔ لیکن افسوس کہ رحمتِ خداوندی کا اشارہ نہ پہچان سکا اور نتیجہ یہ کہ اب اسے ایک مستقل ازدواجی فاقے کا سامنا تھا جس کی ناکام تلافی کبھی ذکرِ دلبراں سے کرتا اور کبھی اُمیدِ مرزُخاں سے۔ خدا جانے اُس کی سمجھ میں یہ بنیادی بات کیوں نہیں آتی کہ پتلی کی اُمید کی نسبت موٹی کی موجودگی کہیں زیادہ نفع بخش ہے ورنہ اس چار دن کی زندگی کا وہی حشر ہوتا ہے کہ دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں۔

شام سے ملاقات کے بعد ہماری ولٹ شائر کی آخری مصروفیت آرنلڈ اور اس کی خوبصورت بیوی کے ساتھ لنچ تھا۔ اس کھانے پر آرنلڈ نے اپنے بانکے اور کنوارے ہمسایے جیک کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ کھانا لذیذ تھا جس کا جیک نے ہر لقمے پر اقرار کیا۔ ہم نے اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ یہ سب آرنلڈ کی ہمسائیگی کا فیض تھا، جیک سے کہا۔

"جیک۔ داناؤں کا قول ہے کہ اچھا ہمسایہ بہت بڑی نعمت ہے۔"

جیک بولا "بے شک — اور ہمسایے کی بیوی بھی۔"

اور ساتھ ہی کم بخت نے مسز آرنلڈ کی طرف کانی آنکھ سے دیکھا — اگر آرنلڈ کی جگہ لالہ مراب گل خان ہوتا تو جیک کی آنکھ نکال لیتا لیکن مہذب آرنلڈ فقط یہ کہہ کر رہ گیا۔

"شریر کہیں کا!"

زندہ دلانِ حیدرآباد کا چودھواں سالانہ

کُل ہند مزاحیہ مشاعرہ

زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام ۱۱ اپریل ۸۱ء بمقام نمائش میدان ایک شب منعقدہ مشاعرے کی ٹیپ کردہ رپورٹ کی پہلی قسط نذرِ قارئین کی جارہی ہے۔ اس مشاعرے کی صدارت حیدرآباد کے تہذیبی سفیر جناب تجمل حسین نے فرمائی۔ سرزمینِ حیدرآباد پر منعقد ہونیوالے پچھلے کئی مشاعروں میں اس مشاعرے کو اس اعتبار سے خصوصی اہمیت حاصل ہے کہ پہلی بار اس میں ۳۲ مہمان اور میزبان شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ دوسری قسط 'شگوفہ' کے اگلے شمارہ میں پیش کی جائے گی

※ ※ ※ ※ ※

معین امر بمبو

کیسے دھگے کے اور میری ہمت بڑھا رہی ہے
سہلا رہی ہے سر کو، پاؤں دبا رہی ہے
انصاف کا ترازو، دیکھی ہے جب سے بیوی
رشتے کی سالیوں سے مجھ کو چھپا رہی ہے

— غزل —

چلے ہیں میکدے کو مقتدی شام آہستہ آہستہ
محلے کے ہمارے پیش امام آہستہ آہستہ
اضافہ کرنا ہے تنخواہوں میں تو کچھ ذرا پہلے
حکومت خود بڑھا دیتی ہے دام آہستہ آہستہ
میری بیوی کو یہ اندیشہ ہے ملا کے میک اپ سے
مرا درجہ نہ لے صورت حرام آہستہ آہستہ
زبردستی کی شادی رنگ لائی سال کو بچہ
وہ مجھ سے لے رہی ہے انتقام آہستہ آہستہ
مجھے مقطع بھی پڑھنے کی ملی مہلت نہ اے بمبو
وہ اُن کا طنز یہ طرز کلام آہستہ آہستہ
میں بیوہ کو سہاگن کر رہا ہوں اس لئے بمبو
کروں گا حاشیہ ادب اپنے نام آہستہ آہستہ

سرپٹ حیدرآبادی

ہانپتے ہیں نہ لڑکھڑاتے ہیں
آؤ ہم کیا ہیں ہم بتاتے ہیں
ناز ہے، اپنے ظرف پر ہم کو
جوتیاں کھا کے مسکراتے ہیں

مجبور دل ہوں اوروں کے میں دسترس میں ہوں
زرخیز، نوجوان حسینوں کے بس میں ہوں
گر عمر بڑھ گئی ہے تو کوئی الم نہیں
دل تو جوان ہے گو کہ میں ستر برس میں ہوں

نہ جانے ساقی نے کیوں سٹ پٹا دیا ہے مجھے
شراب کہہ کر گھڑمبا پلا دیا ہے مجھے
گذر رہی ہے خوشامد میں زندگی میری
ضعیفات نے چمچہ بنا دیا ہے مجھے
نگاہِ لطف تھی کل مجھ پر، آج ہوں معتوب
چڑھا کے جھاڑ پہ گویا گرا دیا ہے مجھے
پہنچ گیا ہوں میں گر پڑ کے اپنی منزل پر
ادھڑی چال نے چلنا سکھا دیا ہے مجھے
میں سر پھرا تھا لڑکپن سے میرے مالک نے
رفیقِ زیست بھی اک سر پھرا دیا ہے مجھے
بنانے والا بنانے پہ جب ہوا مائل
بنا نہ کچھ بھی تو شاعر بنا دیا ہے مجھے
جہاں بھی عشق کے گھوڑوں کی گھوڑ دوڑ ہوئی
وہاں حسینوں نے سرپٹ بھگا دیا ہے مجھے

نہ غیر نے نہ کسی اجنبی نے لوٹ لیا
مجھے پڑوسی کی گھر والی ہی نے لوٹ لیا
اسیر ہو گیا میں اس کے نقلی چٹلے میں
فریب دے کے مجھے بوڑکی نے لوٹ لیا
کسی کی فہم و فراست مجھے نہ لوٹ سکی
میں سر پھرا تھا مجھے سرپھری نے لوٹ لیا
مقابلہ مرا کرنے مجال تھی کس کی
اکیلا پا کے مجھے کمپنی نے لوٹ لیا
کسی طرح نہ چلا مجھ پہ موت کا جادو
کھلا کے زہر مجھے خودکشی نے لوٹ لیا
میں کھٹی دال تھا سرپٹ تو کیا برائی تھی
نہ جانے کیوں مجھے باسی کڑھی نے لوٹ لیا

اَن پڑھ بھونگیری

:- چوتے -:

ہم نئے میاں بیوی گھر سے جب نکلتے ہیں
دیکھ کر پڑوسی سب اپنے ہاتھ ملتے ہیں
بیوی لاکھ اچھی ہو مرد کی یہ فطرت ہے
دیکھ کر پڑوسن کو دل پہ آرے چلتے ہیں
بھرتے ہیں ٹھنڈی آہیں پہلو بدل رہے ہیں
لنگڑے ہیں پھر بھی دیکھو مدگر اُچھل رہے ہیں
اَن پڑھ کوئی حسینہ گذرے ہے جب سڑک سے
بیٹے تو خیر بیٹے باوا اچھل رہے ہیں

:- غزل -:

اپنا آنچل گرا دیجیے
دِن میں تارے دکھا دیجیے
جلنے والا ہو کیوں درمیاں
آپ قندیل بجھا دیجیے

بعد میں بیشی دینا مگر
پہلے ویزا منگا دیجئے
لکھنا پڑھنا نہ آئے جسے
اُس کو لیڈر بنا دیجئے
پھر جوانی تقاضہ کرے
"من کا آنگن" دکھا دیجئے
پدمنی کو لھاپوری کے ساتھ
میری شادی کرا دیجئے
چندہ جو بھی دے زیادہ اُسے
صدرِ محفل بنا دیجئے
کچھ نہیں گھر میں کھانے مگر
لائین لمبی لگا دیجئے
شیخ صاحب کی ہیں مرغیاں
موقع پا کر دبا دیجئے
شیخ پہلی دفعہ آئے ہیں
صرف آدھا گھڑا دیجئے
شعر اَن پڑھ سے سننا ہو گر
اُس کو گانجہ پلا دیجئے

بے دھڑک مدراسی

نہ میں کوئی فوڈ منسٹر، گورنر ہوں نہ لیڈر
رشوت کھا کو جینے والا افسر ہوں نہ لائر
صورت دیکھ کو جان مجھے، میں اک مفلس شاعر
جا بابا کو تو میرے گھر میں چوری کرنے آیا نا رے
میری گھڑسی میں ہیں کیا کچھ غزلیں کچھ افسانے
کھٹی امباڑے کی چٹنی، موٹے چاول کے دانے
ٹوٹا صندوق، پھٹے کپڑے، جیب میں کھوٹے آنے
چکن آملیٹ چھوڑ کے باوا ایسے برتن کھایا نا رے
ڈال کمند اُن مرغوں پر جو جھوٹے بانگاں دیتے ہیں
میٹھے میٹھے کر کو باتاں سر پہ ٹھونگاں دیتے ہیں
راشن والے خواب دکھا کو سوکھے واعظاں دیتے ہیں
ایسے نکڑے مرغے چھوڑ کو چوزے پہ منڈلایا نا رے
ڈاکہ ڈال اُن بنگلوں میں جہاں لوٹ کی کالی دولت ہے
ایک ایک رات میں بسنے والی شدادوں کی جنت ہے
اُجلے اُجلے تن کے اندر کالی جن کی چاہت ہے
ایسے ایسوں کو تو چھوڑ کو تڑخے کو ترڑ خایا نا رے
مال جھپٹ اُن چوروں کا ہے جن کی شہروں میں عزت
دن دھاڑے جو لوٹ رہے ہیں لیکے جیبوں میں عزت
شہرت جن کی بڑے بڑوں میں پولیس والوں میں عزت
ایسے کمتاں والے چھوڑ کو بونتے پہ منڈلایا نا رے
محنت کی یاں فصل ہری ہے رشوت کا نئیں چھلّہ
کام ملا تو سوکھی روٹی، نئیں تو اللہ ہی اللہ
ہے تو ہنڈی بھر کو کھچڑی نئیں تو ٹھنڈا چولّا
گرتی سو دیوار گرانے سبل ہتوڑا لایا نا رے
رحمت بن کو آیا ہے تو کر کو میرا رستہ جا
دھندا تیرا اور بڑھینگا چندہ کچھ تو دیتا جا
چندے سے بھی معذور ہے تو بیڑی اک چلاتا جا
بیڑی بھی نئیں دے سکتا تو شعراں میرے سنتا جا
اچھے مرغ پہ تو باشاہ شعراں سننے آیا نا رے
معاف کرو بھی چور میاں کچھ نئیں ہے میرے کرنے میں
سوتی سو جھگڑالو جورو وہ بھی پھٹے بورنے میں
مدعن سب ہیں جاہل پوٹے میری بجٹ کے کھاتے میں

ہونا تو بے دھڑک لئے جا ہیچ ہر اسرمایہ نارے
کھایا نارے کھایا نا تو ہونڈی ٹھوکر کھایا نارے

شمشیر کوڑنگلی

باپ کی وصیت :

میں دنیا چھوڑ کو جارہوں مرے نزدیک آبیٹا
مرا تو میں تیرے ہاتھاں سے مٹی ، میں ملا بیٹا
کھڑی ہے موت سر پو بس اِتّا دم گڈگڈی میں ہے
میں پینے والا بلاکا ، ذری سیندھی پلا بیٹا
خوشی سے شوق سب کرکو میں مرئوں تو نکو رو با
پھر پھولاں کی اگربتیاں کی منجے باس نکو با
اگر تو اپنے سچّے باپ کی اولاد ہے بیٹا
قبر پو میری لاکو رکھ دے سیندھی کا ایک گوبا

٭ ٭ ٭

میرا سیندھی میں پڑا دم ، دولہے بھائی سلام علیکم
دھوپ کیا دھوپ برس رہی ہے
اچھی صورت بھی جھلس رہی ہے
سانس حلق سے نکل رہی ہے
پیئے سو جان ترس رہی ہے
اُس پہ دھوپ کالے کا موسم ، دولہے بھائی سلام علیکم
پانی میں زہر مِلا رہا ہے
سیندھی پانی سے بنا رہا ہے
ساری خلقت کو پلا رہا ہے
اُس کی چلتی ہے چلا رہا ہے
گوڑ کے گھر پو گرو ہم ، دولہے بھائی سلام علیکم
آبکاری کے ہیں افسر
گوڑ کے جیب کے اندر
اُن کو معمول ہے مقرر
چُپ کے رہو سب کے برابر
بول کو بدنام ہیں تم ہم ، دولہے بھائی سلام علیکم
مُنہ ہمیں کھولنا کئیکو
دشمنی مولنا کئیکو
جان کو پوچھنا کئیکو
کس کی کچھ بولنا کئیکو
جدھر ڈم ڈم اُدھر ہم ہم ، دولہے بھائی سلام علیکم
مل کو سب گاڑوں کے جھٹیاں
کَس کو کمر کو لنگوٹیاں
جن کو رہے سو اُن کو دے پٹیاں
کھول کو لائے ہیں لوٹیاں
کیسی بو آرہی ہے گم گم ، دولہے بھائی سلام علیکم
روز جینے کی ہے کھٹ کھٹ
کب تلک جان کو جھنجھٹ
مر بھی نئیں جاتا چٹ پٹ
آج پی لیں گے غٹ غٹ
دور کرلیں گے چلو غم ، دولہے بھائی سلام علیکم
بن میں چوری سے کلالاں
بیچتیں سیندھی ترابیاں
اصلی ملتی ہے چلو واں
تاس رہیں سیندھی کے جھاڑاں
کھولتیں لٹیاں جھم جھم ، دولہے بھائی سلام علیکم
سیندھی پھول باغ کی نکو
کومٹ کھنٹے کی نکو

پرانے پُل کی سبھی نکو
سفید شہر کی نکو
دھوم ہے گڑتی انا رم، دولہے بھائی سلام علیکم
بکرا منڈے سے اُڑاؤ
گوشت کے ٹنٹیاں لگاؤ
آگ پو بھو سنتے جاؤ
کھاؤ خود اور کھلاؤ
دے تڑی دم پو دما دم، دولہے بھائی سلام علیکم
دیکھو کمپونڈ میں لوگاں
کیسے کیسے ہیں شریفاں
نوجواں ساتھ ہیں چھوریاں
نشہ میں بول ریش بولیاں
ناچ رئیں پی کو چھما چھم، دولہے بھائی سلام علیکم
سیندھی کیا سیندھی لی ہے
چڑھے تو سر پو چڑھی ہے
آنچ سینے میں لگی ہے
جان پو آکو پڑی ہے
موت دے رہی ہے الارم، دولہے بھائی سلام علیکم
لڑکھڑانے لگیں پاواں
اور ڈھیلے پڑیں ہاتھاں
سن کو سب تھو کیں گے لوگاں
عشرتاں جانے کے باتاں
پڑ رہی ہے ناڑی بھی مدھم، دولہے بھائی سلام علیکم
شیشے پو شیشہ لگا رہا
لوگاں کے آنگ پو جارہا
چپ کا چپ آنکھیاں دکھارہا
پی کو شمشیر چڑھا رہا
یہیچ کیا شیخ بن سالم، دولہے بھائی سلام علیکم

باسط نوشہ

شوق سے دیکھو مجھے پیدائشی نوشہ ہوں میں
ہاں شریکِ زندگی کا اک حسیں توشہ ہوں میں
طوطئ بنگلور ہوں کہتے ہیں سب باسطؔ مجھے
قہقہوں کے باغ کا ہنستا ہوا گوشہ ہوں میں

جانے پہچانے نظر آتے ہیں چہرے کتنے
یہ نہ پوچھو وہ مرے دوست ہیں گہرے کتنے
میں وہ نوشہ ہوں بتاؤں گا نہ گن کر باسطؔ
میرے سر باندھے گئے شادی کے سہرے کتنے

کس منہ سے کہہ سکیں گے وہ اختر گنے گئے
جن سے نہ جب زمین کے مچھر گنے گئے
باسطؔ کی شادیوں کا نہ کچھ مل سکا حساب
اک ایک کر کے سینکڑوں دفتر گنے گئے

مرض رشک کا جسے ہو وہ کبھی اچھا نہیں ہوتا
مصفا دل ہے جس کا وہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا
ہزاروں لوگ آکر بھی ہزاروں شمعیں جل کر بھی
وہاں رونق نہیں ہوتی جہاں نوشہ نہیں ہوتا

سبق جب مرد کو دیتی ہے عورت رانگ دیتی ہے
نہیں ہے مختصر وہ بھی بہت ہی لانگ دیتی ہے
عجب ہے بیسویں صدی کا باسطؔ دیکھتے جاؤ
گھڑک بیٹھا ہے مرغا اور مرغی بانگ دیتی ہے

ہپیوں کے بال ایسے لگ رہے ہیں دھوپ میں
جھاڑ کر رکھا ہو جیسے گھر کا کچرا سوپ میں

مرد و زن میں خاک باقی رکھا کرے کوئی تمیز
بیٹی پوتے پھر رہے ہیں پوتیوں کے روپ میں

غزل

جوڑا لے کو شادی رچا رہا تو ہے تیری عقل پر
جورو کے ہاں سے جہیز منگا رہا تو ہے تیری عقل پر
باوا دادا رہنے رکھے تو جھونپڑی کی گھر کی
وہ بھی بکا کو شادی رچا رہا تو ہے تیری عقل پر
گھنٹے دیکھنے آیا نیش تو چیپ کے دکھانے لوگاں کو
سسرے کے ہاں سے گھڑی منگا رہا تو ہے تیری عقل پر
دعوتی کرتا اُردو کا دعوت دینے آدمیاں کو
انگریزی میں رقعے چھپا رہا تو ہے تیری عقل پر
سادی سیدھی شادی کرنا سنت کئے تو مسجد میں
منڈوا سجا کو پونگا بجا رہا تو ہے تیری عقل پر
پلنگ بھی وہ دیا سو دنیا دیکھندے کرکو
گلی گلی جہیز پھرا رہا تو ہے تیری عقل پر
ہنسی خوشی سے موٹر بھیج کو بلا کو فرشتہ کو
مؤکل لاکو آپڑا اکھڑا رہا تو ہے تیری عقل پر
ولیمے کی دعوت دیکو گھر میں کھلانے ہوتا نئیں
نکاح کا کھانا مانگ کو کھلا رہا تو ہے تیری عقل پر
شادی ہو کو دو دن بھی نیش نئی نویلی دلہن کو
برقعہ نیش سو ساتھ پھرا رہا تو ہے تیری عقل پر
مرد جنم میں پیدا ہو کو مرد کے سرکار ہورے کتو
بانکا لاکے تیوں بالاں بڑھا رہا تو ہے تیری عقل پر
قوم سدھرنے کی باتیں لکھ کو سنا رہے سب کو کتو
بلبل و گل کے قصے سنا رہا تو ہے تیری عقل پر
قوم کی اصلاح کرنے نکلا باسکا سہرے باندھ کو کفن
راہ میں اس کی کانٹے بچھا رہا تو ہے تیری عقل پر

امام رائچوری

منسٹر

وقت کرتا جو وفا ہم بھی منسٹر ہوتے
ہم بھی اوروں کی طرح کاش کہ لیڈر ہوتے
ہر بڑے شہر میں اک اپنی بھی کوٹھی ہوتی
دستخط لینے کو اک لیڈی سکریٹری ہوتی
گھومنے پھرنے کو اک کار بھی چھوٹی ہوتی
اپنے کھیتوں میں بھی دو چار ٹریکٹر ہوتے
بھائیوں کی نہیں تعلیم ادھوری ہوتی
چھوٹی بہنوں کی بڑی دھوم سے شادی ہوتی
رشتہ داروں کے بھی تقدیر میں چاندی ہوتی
اور سالے کئی اضلاع میں کلکٹر ہوتے
تاکنے گھر کو مرے روز سپاہی آتے
لوگ نذرانے میں کچھ میوے مٹھائی لاتے
غرض کتے بھی میرے دودھ ملائی کھاتے
گھر کے چھوٹے بڑے سب پھول کے کُپّا ہوتے
کیسے جیتوں میں الیکشن گھر میں دمڑی بھی نہیں
پارٹی کوئی میرے ساتھ میں لنگڑی بھی نہیں
گلی گلی میں میرے نام کی پٹری بھی نہیں
وقت کرتا جو وفا ہم بھی منسٹر ہوتے

کلیم مسیدکی

قطعات

غضب اتنا نہ فرماؤ مجھے بھی کچھ تو کہنے دو
تھمے رہنے دو آنکھوں میں مرے دریا نہ بہنے دو
اُتارو آپ اپنی مصنوعی زلفوں پہ خود غصہ
میری تالو پہ اصلی بال ہیں تھوڑے سے رہنے دو

کیا بتاؤں رات جو دل میں کبوتر چھوڑ گئے
مارے ہیبت کے میرے ہاتھوں سے طوطے اُڑ گئے
فیر پھر پہ کب تھا اُن کی پیشانی پہ میں
ایک ہی آواز میں دونوں کے دونوں اُڑ گئے

اتفاقاً میں کسی مہینے اگر گھر لاؤں پیپلے (۳۴۷)
رات بھر ٹھیرائے رکھتی ہے مجھے اِک پاؤں پے
کم نہیں ہوں میں بھی یارو لینے اپنا انتقام
جم کے جوتے مارتا ہوں چھپ کے اس کی چپلوں کا

پاگل عادل آبادی

پھاڑ کر میرا کفن آدھا اِدھر آدھا اُدھر
رکھ دیا اُس نے رہن آدھا اِدھر آدھا اُدھر
معتمد نے گھر خریدا صدر نے لی دھنمڑی
ہوگیا چندہ غبن آدھا اِدھر آدھا اُدھر
شیخ اور مُلّا کا قبضہ ہوگیا مشتاعرے پر
لُٹ گیا سارا مشن آدھا اِدھر آدھا اُدھر
جوڑ کر دو کرسیوں کو نیم کے سائے تلے
سو رہا ہے گلبدن آدھا اِدھر آدھا اُدھر
لیڈروں کا بس چلے تو بول کر گاندھی کی جے
بانٹ لیں گاندھی بھون آدھا اِدھر آدھا اُدھر
بیچ میں سے مانگ دلبر نے نکالی اس طرح
لگ گیا جیسے گہن آدھا اِدھر آدھا اُدھر
بیٹھتے ہی توڑ دی میرا پلنگ اُس شوخ نے
ڈال کر اپنا وزن آدھا اِدھر آدھا اُدھر
دوغلا چمچہ تھا واعظ بعد مرنے کے اسے
قبر میں کر دو دفن آدھا اِدھر آدھا اُدھر
سن غزل اُستاد کی چیلے نے محفل لوٹ لی
اعتبارِ فکر و فن آدھا اِدھر آدھا اُدھر
نام پر مذہب کے پاگل دھرم کی بنیاد پر
بٹ گیا میرا وطن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

عظمت بھلاوال

:- بھلاویے کی شادی :-

لگائی گئی آٹھ دس روز ہلدی
مری کالی صورت کی رنگت بدل دی
اندھیرے کے منہ پر شفق لا کے مَل دی
دھتورے کے پھولاں کا سہرا بندھایا
بھلاویں کی شادی میں بھوت مزہ آیا

ٹوٹے ہوئے ٹانگے کا ٹٹو بھی لائے
چرخ چوں کو جو بیس گھنٹے سجائے
مجھے ہر سڑک، گلی گلی گھمائے
تماشہ بنا کر ہر ایک کو بتایا
بھلاویں کی شادی میں بھوت مزہ آیا

مرے رُخ پہ پھولاں کی چلمن گرا کر
مجھے لوٹا سالوں نے مشکل بتا کر
پریشان کیا میرا جوتا چرا کر
پپیتا لگا کر ہر اک نے کھلایا
بھلاویں کی شادی میں بھوت مزہ آیا

ملی نقلی نوٹوں کی مجھ کو سلامی
عزیزوں نے پئی کھا کے کی بدکلامی
چرا لے گئے اچھے جوتے حرامی

بچائے ایسی آفت سے سب کو خدایا
بھلاویں کی شادی میں بہوت مزہ آیا
اُدھر ڈھول پر جھومتا تھا نشانہ
ہے دیکھو گا تا تھا تندا نہ تانہ
اُچکتا تھا اک پاؤں پر کیا زمانہ
دنا دن پٹاخہ ہر اک نے بجایا
بھلاویں کی شادی میں بہوت مزہ آیا
ہتھیلی میں کیا مجھ کو جنت بتائے
گدھے گلگلے کھا کے کیا گل کھلائے
شکنجے میں قرضوں کی ایسا دبائے
برس ہا برس میں سنبھلنے نہ پایا
بھلاویں کی شادی میں بہوت مزہ آیا

حفیظ خاں مذاق

میری دولت کو منیجے سب کو مٹھی میں ملا ڈالے
محبت کرتے کرتے بیچ ادھر جھنڈی ہلا ڈالے
بس اتا پوچھنا تھا کیا ہوا میری محبت کا
نوے عاشق سے ہوٹل میں مجھے جوتے کھلا ڈالے
ہونٹ سے میک اپ پو چڑخ چہرہ سہانا لگ رہا
کسی معشوق کا بھولا سا بہانہ لگ رہا
صبح جب غور سے دیکھا تو نکل گئے دیدے
نئے پوڑے سے مگر ڈھول پرانا لگ رہا
خوشیاں منارئیں لی تم کو کرسی
پھر بھی غریبوں کو ہے سوکھی روٹی
ٹی انجیا جی، ٹی انجیا جی
جاڑوں میں بزدھن کے بچے اکڑ رہیں
دھوپوں میں پاپڑ کے جیسا سکڑ رہیں
بارش میں پھر پھر کو ٹھڈے پکڑ رہیں
لکھو رہیں نہ پڑھ رہیں لڑ رہیں جھگڑ رہیں
ان کے جسم پو نہ لنگی نہ دھوتی
ٹی انجیا جی، ٹی انجیا جی
گھر بھر کے بچوں سے ہے ناک میں دم
جورو کا رونا کیا دس پو بیچ ختم
منجے نوکری دیو یا دیو کچھ رقم
نئیں تو ڈال دیو بیوی بچوں پو بم
تیج کھولو اب میری قسمت کی پوتی
ٹی انجیا جی، ٹی انجیا جی
ہاتھوں میں رعشہ ہے پاؤں میں لنگ
پھر ایک شادی کی اُس پو اُمنگ
بہنوں کا پینسٹھ سے یہ کیسا سنگ
ہے ہر ایک محلے میں جس کا پلنگ
باہر کے بڈھوں پو کرویو پابندی
ٹی انجیا جی، ٹی انجیا جی
پوتیاں میں پوتوں سے دو ہاتھ آگے
فیشن پو ان کے انگریزاں بھاگے
اُس پو مٹکنا چلنا یوں لاگے
جیسے کو ڈھنے کو ہے کچے تاگے
ان کو دلادیو دو بیبیوں کی کرسی
ٹی انجیا جی، ٹی انجیا جی
پیچھے سب آکو یتی پڑائیں گے
نئیں نئیں سو شطرنج کے چال چلائیں گے
تیرہیں گے خود ہور تم کو ڈبائیں گے

سعب ل کو کمر کو مدلا بنائیں گے
خشکی کی تم بن کور ہو شاک مجھی
ٹی انجیا جی ، ٹی انجیا جی

رشید عبدالسمیع جلیل

:- حمد :-

نام بے شک طویل ہے میرا
رب سمیعؔ جلیل ہے میرا
ساری دنیا ہے دید کی طالب
وہ حسین و جمیل ہے میرا

:- سائنسی دوشیزہ :-

ٹیوب زادی ہو گئی ہے آج دنیا میں جواں
سائنسی جنت سے اُتری ہے ہمارے درمیاں
ناز نخروں میں پلی ہے ایٹمی گلزار میں
جوہری رعنائیاں ہیں قامت و رخسار میں
زلف لہرا دے تو بکھرے ہر طرف یورینیم
سانس چھوڑے، تو پرندے راہیٔ ملکِ عدم
اُس کی آنکھوں میں اُمڈتا ہے الکٹرانک خمار
ریڈیم ہے مثلِ غازہ اُس کے چہرے کا نکھار
سائنسی میک اَپ میں وہ تو نیوکلیر پارہ لگے
چودھویں کا چاند بھی اب ہیچ و ناکارہ لگے
چاند اور مریخ کی مٹی ہے بس اُس کی غذا
منجمد آنگن میں اُس کے دھوپ ، پانی اور ہوا
بولتی گڑیا ہے لیکن بات ایٹم کی مکسر
زن مریدوں کی سیاسی اور اخلاقی مشیر
رسمِ دنیا کو سکھلاتی ہے تہذیب و تمیز
بحث اُس کا مشغلہ بکواس اُس کو ہے عزیز
اُس کے ہنسنے اور رونے میں نہیں ہے کوئی فرق
سارے عاشق ہو چکے ہیں بحرِ پیسفک میں غرق
ایٹمی فانوس کی مانند روشن ہے مدام
گردشِ ایام کیا ہے اُس کا اندازِ خرام
جس طرف جاتی ہے دنیا کا بگڑتا ہے نظام
ریڈیو، راڈار، ٹیلیفون ہو جاتے ہیں جام
ہائیڈروجن کے دھماکے اُس کی چھینکوں کی صدا
طالبانِ عشق کا ہے مختصر عہد و فا
جنگ کی خوگر ہے لیکن امن کا رکھتی ہے پاس
دوڑ جاتی ہے گلے میں ڈال کر وہ ریڈ کراس
زلزلے ، طوفان اور سیلاب سے ڈرتی نہیں
عالمی بحران پیدا ہو تو کچھ کرتی نہیں
دورِ قمری اُس کا بچپن ، دورِ شمسی ہے شباب
اُس نے چھوٹی عمر میں دیکھے ہیں لاکھوں انقلاب
کس کے پلّو بندھ سکے وہ ، کوئی ہم پلّہ نہیں
اُس کے لائق کنگ کوٹھی یا کوئی بنگلہ نہیں
مانگ سونی رہ گئی تو جانے کب ٹوٹے وبال
عمر بڑھتی جائے تو انسانیت کو ہے زوال
آہ سے اُس کی اُفق پر کھنچ گئی ہے رین بو[1]
یعنی اب ماں باپ کو روتی ہے بنتِ یو۔ این۔ او[2]

۱ : Rainbow

۲ : U.N.O

—— :: ——

(دوسری قسط آئندہ شمارہ میں)

انجم نجمی
بمبئی

دوپٹہ یا پٹہ

اس وقت ہم بس میں سفر کر رہے ہیں، اور ہمارے ذہن میں گردش کر رہا ہے۔ دوپٹہ یا پٹہ۔ آپ چونکیں گے ضرور کہ بس کا دوپٹہ کا اور پٹہ کا ہمارے ذہن سے کیا تعلق ہے یا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو ہمارے صحیح الدماغ ہونے پر بھی شبہ ہو رہا ہو۔ مگر ہمارا ذہن و دماغ اور آپ کا شبہ کس حد تک درست ہے اس کا اندازہ آپ کو ہمارا انشائیہ پڑھنے کے بعد ہی ہوگا۔

اگر آپ استادوں کی شاعری کا مطالعہ کریں تو اس میں رنگین دوپٹے نے بڑے خوب صورت اور نازک احساسات شاعروں کے تخیل میں جگائے ہیں۔ (یہ اور بات ہے کہ ان حسین خیالوں نے گھر میں شاعروں کا حقہ پانی بند کروا دیا ہو) دوپٹہ جو چنری، چنریا، اوڑھنی، آنچل اور گاج کے ناموں سے جانا پہچانا اور پرکھا جاتا تھا۔ آج کہاں ہے تو ہمارے ذہن میں گونجنے لگتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کے یہ مصرعے۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

ہم مردوں کو کچھ کہہ کر اپنی عاقبت بگاڑنا نہیں چاہتے۔ اب یہ تو مرد جانیں کہ اکبر الہ آبادی جو کہہ گئے ہیں۔ وہ کس حد تک درست ہے۔

کونسی بات کس حد تک درست ہے۔ اسے اگر آپ نے یا میں نے زیادہ سوچنے کی کوشش کی تو اس کا بار رات تندرستی کی درستی کو چکانا پڑے گا۔ اور ہمارا عقیدہ ہے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ اس لیے آیئے نئی پیڑھی کے نوجوانوں کو یہ بتا دیں کہ دوپٹہ کیا ہوا کرتا تھا۔ حسب سابق دوپٹہ ایک بڑا سا دو یا ڈھائی گز کا ہلکا پھلکا، مہین، رنگین، نازک سا کپڑا ہوتا تھا۔ جو آٹھ یا دس سال کی عمر سے مشرقی لڑکیاں باقاعدہ اوڑھنا شروع کر دیتی تھیں۔ دوپٹہ سر، سینہ

اور جسم ڈھانکنے کے کام آتا تھا۔ سر پر اوڑھ کر تلاوت قرآن شریف یا گیتا یا رامائن کا پاٹ کیا جاتا تھا۔ سر کے علاوہ چہرے کے اطراف لپیٹ کر نماز اور پوجا کے استعمال میں آتا تھا۔ غیر محرم مرد سے چہرہ چھپاتے وقت نقاب کا نعم البدل بن جاتا تھا۔ شیر خوار کو دودھ پلاتے وقت وہ اسے نظر بد سے بچاتا تھا۔ دلہن اس بہین اور رنگین دوپٹے سے گھونگھٹ نکال کر نوشہ کے خرمن دل پر بجلیاں گرایا کرتی تھی۔ اور نوشہ زندگی بھر کہتا رہتا تھا۔

کون ہے دیکھنے والا اب

الٹ دو نقاب حد کردی

دوپٹے کے ساتھ صیغہ ماضی استعمال کرتے دیکھ کر ایسی خواتین یقیناً چونکیں گی جو آج بھی دوپٹے کے استعمال اور اس کے مصرف سے واقف ہیں۔ ہماری ان سے دست بستہ گذارش ہے کہ وہ ہمیں بھی اپنا شامل حال سمجھیں۔ یہ تو ہم ان مرد نما عورتوں کی طرف اشارہ کررہے ہیں جن سے ہمارا سامنا روزانہ دن میں کئی بار ہوتا ہے اور اس سامنے نے ہمیں کئی دنوں تک بہت بھگتایا ہے۔ ہوا یوں کہ ہماری عادت ہے، دوپٹہ کو اچھی طرح سے دونوں شانوں پر پھیلا کر شانوں پر ہی قمیص اور دوپٹے کو ملا کر سیفٹی پن لگا لینے کی تاکہ کام کے اوقات میں بار بار ہمیں دوپٹہ ٹھیک نہ کرنا پڑے چونکہ ہم جس دفتر میں کام کرتے ہیں۔ خدا کے فضل سے اور ہماری بدقسمتی یا خوش نصیبی کے ہاتھوں ہم اس دفتر کے کرتا دھرتا ہیں۔ ایک محترمہ جو آواز کی دنیا میں قدم جمانے کی سعی کررہی ہیں۔ (ہماری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں) انھیں دوپٹے کے نام سے کوفت ہوتی ہے اس لیے یہ دوپٹے سے بے نیاز ہوگئی ہیں اور ذمہ دار ٹھہراتی ہیں ظالم زمانے کو، سماج کو، یہ کہتے ہوئے کہ "انھیں لوگوں نے لے لی نا دوپٹہ میرا"

ہم سے بڑا پیار کرتی ہیں۔ (چاہے یہ پیار کاروباری قسم ہی کا ہو) ہمارے چہرے کی سادگی اور پاکیزگی انھیں بہت بھاتی ہے۔ (شاید انھوں نے ہمارے کمرے میں جانماز دیکھ لی ہے یا پھر انہیں یہ نہیں معلوم کہ ہم بھی دن میں دو ایک بار تو آئینہ ضرور دیکھتے ہیں) بہرحال وہ کہتی ہیں اس لیے ہم بھی سر جھکا کر مان لیتے ہیں۔ ایک دن بڑے پیار سے انھوں نے ہمارا دھانی گز لمبا دوپٹہ کھینچا۔ پہلے تو ہم چکرائے کہ صاحب یہ کس قسم کا پیار کرنے جارہی ہیں۔ ہم نے سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھا تو بڑے فلمی انداز میں چہکیں۔

"چنری سنبھال گوری، اڑی چلی جائے رے"

اور اس سے پہلے کہ ہم اس گیت کو کسی بڑے شاعر کا مصرعہ سمجھ کر اپنی عقل کا ماتم کرتے۔ ہماری ایک سہیلی نے جو ہمیں باجی کہتی ہیں ایک فلمی مصرعہ کی گرہ لگا دی۔

"چھوڑ دو آنچل زمانہ کیا کہے گا"

اور بعد ازاں ہمیں دوپٹے کے پھٹ جانے کی اطلاع دی۔ ہم نے دیکھا کہ ان محترمہ کے پیار نے ہمارے دوپٹے میں لگے سیفٹی پن کو آلہ کار بنا کر ہمارے دوپٹے کا ناس مار دیا تھا۔ اور ایسا ایک بار نہیں ہوا۔ جب جب وہ آفس میں قدم رنجہ فرماتی ہیں ہمارے دوپٹے کو اس طرح تاکتی ہیں کہ ان کا بس چلے تو ایک ہی لمحے میں اسے چندی چندی کردیں۔ جب پہلے تین دوپٹے بکے بعد دیگرے ان کے کاروباری پیار کا نشانہ بن چکے تب باقی دوپٹوں کی خیریت منانے کے لیے ہم اپنے

[illegible]

دفتر کے کسی کمرے میں پناہ گزینوں کی طرح پناہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ وہ ہمیں پناہ لینے دیتی ہیں یا نہیں) البتہ اب چونکہ وہ کچھ کچھ ہماری نظر کے ملتجیانہ انداز کو سمجھ چکی ہیں اس لیے جوابًا ہم سے ان کی نظروں نے کئی بار شکایت کی ہے۔

پردہ ہم سے کرتے ہو جب آتے ہو محفل میں
آنکھیں سب سے ملاتے ہو کچھ ہم سے شرماتے ہو

چونکہ ہمارا شعری اثاثہ بہت کم ہے۔ سو ہم نے اس شعری چوٹ کے جواب میں چپ سادھ رکھی ہے۔ مگر ہم آج تک یہ نہیں سمجھ پائے کہ دوپٹے سے مبرا ہو کر حسینوں نے کون سا کرم سوسائٹی پر کیا ہے۔ نوجوان پیڑھی کے اس اقدام کے بعد ایک فلمی گیت نے ان کو بڑھاوا اس طرح دیا۔

"ریشمی شلوار کرتہ جالی کا"

(غور طلب ہے۔ دوپٹے سے مبرّا) جالی کا کرتہ پہنا کر محبوبہ کو دوپٹے سے بے نیاز کر دینے کے فوائد تو محبوب حضرات ہی جان سکتے ہیں۔ ہمارا ناقص خیال یہ تھا کہ جالی کا کرتہ پہننے کے بعد تو ڈھائی گز کا دوپٹہ قطعی کافی نہیں۔ ایسے کرتے کے لیے کم سے کم ساڑی کی ضرورت ہونی چاہیے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ساری لپیٹنی ہی ہے تو جالی کے کرتے سے کیا حاصل۔ پھر بھی یہ ان حسیناؤں کی حسین کرم فرمائی ہے کہ یہ کرم ایک ساتھ نہیں قسطوں میں ہوا ہے۔ پہلے فل ڈوپٹہ ہاف ڈوپٹہ میں تبدیل ہوا (پھر سالم ڈوپٹہ ہوا میں تحلیل ہو گیا) اس حسین سانحہ کا علم ہمیں اس وقت ہوا جب ہم نے ایک بزاز کی دوکان سے زنانہ سوٹ کا کپڑا خرید لینے کے بعد اس سے ملتے ہوئے رنگ کا ڈوپٹہ مانگا۔ بزاز بڑے تاجرانہ انداز میں مسکرایا اور پھر ہم سے پوچھا۔ "بی بی جی! فل ڈوپٹہ لیں گی کہ ہاف؟ ہم نے پوچھا۔ "بھیا! یہ فل اور ہاف کا کیا چکر ہے۔ کیا بالغوں کے لیے فل اور نابالغوں کے لیے ہاف ہے۔ وہ بڑے گھاگ انداز میں مسکرائے۔ ہمیں بے وقوف سمجھ کر بڑے رازدارانہ انداز میں بولے۔" بی بی جی۔ نابالغ تو آج کل اوڑھنی ہی نہیں ہیں۔ بالغ جو ہیں پورے ڈھائی گز کا بار اٹھا نہیں سکتیں اس لیے انھوں نے اسے ہاف یعنی آدھا بنا دیا ہے۔ پورے ڈوپٹے کی قیمت 26 روپیہ اور آدھے کی قیمت 13 روپیے۔" وئیے کون سا لیں گی آپ؟

"پٹہ یا دوپٹہ"۔ پٹہ! پٹہ تو کتے، کتیوں کے گلے میں باندھا جاتا ہے پھر بھلا کتے جیسے جانور کا ہمارے گھر میں کیا کام۔ جس کی رال ویسے بھی نجس ٹھیرائی گئی ہے۔ پٹے سے ہمیں کچھ لینا دینا نہیں بھیا۔ ہمیں تو آپ چھبیس روپیوں والا فل دوپٹہ ہی دے دیجئے۔

دوکان سے تو ہم نکل آئے۔ مگر ہمارے دماغ میں دھماکے ہوتے رہے کہ اگر دوپٹہ پٹہ بنا ہے تو پٹے کا استعمال کیا ہونا ہوگا۔ کیسے ہوتا ہوگا۔ ہمارا یہ ارمان زیادہ دنوں تک کنوارا نہیں رہ پایا اور جلد ہی سر نکول۔ گلی کوچوں اور بازاروں میں حوا کی بیٹیاں پٹہ گلے میں لٹکائے نکل آئیں۔ پٹہ گلے میں مفلر کی طرح لٹکا ہوتا ہے۔ اب مفلر کیا ہوتا ہے؟ آپ نہ پوچھیں ہم سے اس کی تشریح اس انشائیے میں نہیں پھر کبھی۔

نماز پوجا پاٹ۔ ان سب باتوں سے بھی آج کی پیڑھی بالکل بالجد ہے۔ گیتا کے اشلوک ... کے پاٹھ اور قرآن پاک کی آیتیں و حکایات کیا ہیں ان سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔

پھر کچھ مہینوں بعد ہی پٹہ بھی گلے سے غائب ہوگیا۔
یہ جھٹکا ہمارے ذہن، دل و دماغ اور روح تک کو ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ لیکن چونکہ ہم بمبئی جیسے ماڈرن اور
دانس شہر میں رہتے ہیں اس لیے سخت جانی کے کچھ جراثیم ہمارے جسم میں سرایت کر چکے ہیں ۔ نہ تو ہم مرے اور نہ ہی پاگل
ہے۔ البتہ جب ہم بس میں سفر کرتے ہیں، تو کئی حادثے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمارے معطل دماغ کو تھوڑی سی فرحت بھی دے
دیتے ہیں۔

ماہم سے قلابہ کی طرف جاتے ہوئے بس میں علی الصبح ایک دیہاتی جوڑا ہم سے اگلی سیٹ پر آکے براجمان ہوا۔ غالباً
بمبئی کی سیر کے لیے آیا ہوا تھا۔ میاں جی نے بڑے چاؤ سے اپنی زوجہ کو کھڑکی کے نزدیک بٹھا دیا تھا تاکہ اسے بمبئی کی سیر کرا سکیں
ہماری توجہ کا مرکز اس دیہاتن کا گھونگھٹ تھا۔ جو وہ نکالے ہوئے تھی۔ ہم سوچ رہے تھے، گھونگھٹ سے تو یہ بمبئی دیکھ
سکیں۔ (غالباً یہ بمبئی دیکھنے نہیں بلکہ بمبئی کو اپنا گھونگھٹ دکھانے آئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ہم نے سنا۔

"کا ہے گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہو۔ تنِک (कालिहा) اوپر کو سرکا لو"

جوابًا تھوڑی سی کسمساہٹ ہوئی اور بس۔

"ارے۔ ہم کہت ہیں، تمھار گھونگھٹ تو ہٹائی لو۔ یہاں کونو تمہار جیٹھ یا سسر تھوڑے ہی بیٹھے ہیں۔

"نہ بابا۔ ہم نا ہٹائی ہے۔ ہم کا شرم لگت ہے۔ جہنمیا جائے تمہار بمبئی۔ ہم بمبئی ناہیں دیکھیں"

یہ چونچیں قریب قریب بائیکلہ تک چلتی رہیں۔ وکٹوریہ گارڈن کے آتے آتے انھوں نے ذرا سا گھونگھٹ اوپر کر لیا۔
ہم سکاکر مطالعہ میں محو ہوا ہی چاہتے تھے کہ ایک محترمہ گلے میں دوپٹہ نہیں پٹہ لٹکائے بالکل ہم سے سٹ کر بیٹھ گئیں۔ ہم نے
محترمہ کا جو بغور مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ کل کپڑا ان کے نازک جسم پر قریباً دو گز یا ڈھائی گز ہوگا۔ (جبکہ ہمارا دوپٹہ ہی ڈھائی گز کا
تھا جس کے ایک طرفہ دامن پر محترمہ براجمان تھیں) دماغ کی چولیں ہلنے لگیں۔ خیالوں میں بھنور سے آنے لگے ۔ اور ذہن گردلنے لگا۔
دوپٹہ یا پٹہ "پٹہ یا دوپٹہ"۔ اور ان دونوں کے گتھم گتھا ہوتے ہی ہمارا اسٹاپ آگیا۔ ہم اُتر کر اپنے دفتر پہنچ گئے۔ چین تب بھی
میسر نہیں آیا۔ ہم نے دفتر کے چار پانچ کاغذ مفت حاصل کر کے اپنے دماغ میں پکنے والے لاوے کو کاغذی گود دے دی۔ اس
طرح خود کو دوپٹہ اور پٹہ کی پھانسی سے آزاد کر لیا۔

۵۵

اب دیکھنا یہ ہے کہ "پٹہ" یا دوپٹہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔

انصاری اصغر جمیل (ناگپور)

"میں کہاں کہاں سے گذر گیا مکان کی تلاش میں"

خدا کو جب کسی بندے کا امتحان لینا مقصود ہوتا ہے تو وہ اسے تلاشِ مکان پر معمور کر دیتا ہے۔ فی زمانہ ایک عدد خوبصورت اور وفا شعار بیوی تلاش کر لینا آسان کام ہے لیکن شہر میں ایک کشادہ، جاذبِ نظر اور سستا مکان تلاش کرنا جُوئے شیر لانے سے کم نہیں جس کا تجربہ ہمیں حال ہی میں اچھی طرح ہو چکا ہے۔

ہم اپنے والدین سے دور شہر میں اپنے دوست کے ساتھ مختصر اور مشترکہ کمرہ پر قبضہ جمائے حقانی کالج میں زیرِ تعلیم ہیں گذشتہ مہینے اچانک والد صاحب کا حکم نامہ نازل ہوا کہ گھر کے لوگ گاؤں کی زندگی سے اکتا چکے ہیں اور شہر آنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا فوراً ایک عدد مکان کی تلاش کی جائے۔ مکان شہر کے قلب میں ہو، اس کے علاوہ کشادہ، عالیشان اور جاذبِ نظر ہونے کے ساتھ ہی ساتھ سستا بھی ہو۔ والد صاحب سے ہمیں اس حکم کی قطعی امید نہیں تھی۔ ہماری عمر کو مدنظر رکھتے ہوئے والد صاحب کو حکم دینا چاہیئے تھا کہ بیٹا! اپنے لئے شہر میں ایک عدد شریکِ حیات (صرف) تلاش کر لو۔ باقی کام ہم انجام دے دینگے۔ لیکن جو کام ہمیں انجام دینا تھا وہ والد صاحب نے اپنے ذمہ لے لیا اور جو کام انہیں کرنا تھا وہ ہمیں سونپ دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مکان صرف خوش قسمت لوگوں ہی کو دستیاب ہو سکتا ہے اور ہم اس زمرے میں نہیں آتے لیکن چونکہ والد صاحب کا حکم تھا اس لئے بجا لانا ہمارا فرضِ اولین تھا۔ وہ خط ہم نے سلطان کو دکھایا جسے پڑھ کر وہ چند لمحے ساکت کھڑا ایسا ماتم ہمیں شروع کیا گویا بجلی اٹیک کر رہا ہو اور پھر اچانک ہم سے بغلگیر ہو کر رونے لگا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مکان تلاش کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ اخباروں میں "ضرورت ہے" کا اشتہار دے دیجئے مکان خود بخود آپ کے قدموں میں آجائے گا۔ لیکن جناب "ضرورت ہے" کے اشتہاروں سے شادی کے لئے مناسب جوڑے تو ل

سکتے ہیں لیکن خالی مکان نہیں اور وہ بھی ایسا مکان جو شہر کے قلب میں ہو، جاذبِ نظر ہو آس پاس کا ماحول شریفانہ ہو، سینما نزدیک ہو اور بازار بھی دور ہو۔

ہم اپنی روزانہ کی تفریحات کو تلاشِ مکان کی بھینٹ چڑھا کر گلی گلی مارے مارے پھرنے لگے۔ ہماری نظریں ہر عمارت پر "کرایہ کے لئے" یا "مکان بیچنا ہے" کی تختیاں تلاش کرتیں۔ ہر عمارت کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے بعض جگہ ان کی بالکنیوں پر موجود حسیناؤں سے ہماری نظریں ملتیں جو ہمیں دیکھتے ہی نفرت سے منہ سکوڑ لیا کرتیں۔ کئی جگہ ہمیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا گیا بعض جگہ ہم سے باز پرس بھی کی گئی کیونکہ ان محلوں کے مکیں ہمیں ڈاکوؤں کی ٹولی کے رُکن سمجھ رہے تھے اور کچھ دنوں قبل وہاں ڈاکے بھی پڑے تھے۔ اُلجھے ہوئے بال، بڑھا ہوا شیو، کپڑے دھول میں اَٹے ہوئے یعنی ایک نامراد عاشق سے بھی زیادہ ہماری حالت خستہ ہو چکی تھی۔ اس دوران بہت سے واقعات رونما ہوئے، ہمیں رُسوا بھی کیا گیا لیکن ہائے رے مکان . . . !

ایک رات تقریباً ڈیڑھ بجے جب ہم خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے اچانک ہمارے کمرہ پر دھاوا بول دیا گیا، ہم نے گھبرا کر دروازہ کھولا، دھاوا بولنے والے ہمارے ایک بچپا ہمارے دوست نعمان صاحب تھے جو ایک مکان کا پتہ لائے تھے۔ دوسرے دن ان کے ہمراہ مکان دیکھنے کے لئے گئے۔ جو گڑی گودام کے علاقہ میں تھا۔ مکان دو مختصر کمروں، ایک چھوٹے سے دالان اور ایک ویران خانہ پر مشتمل تھا۔ مکان کے باب الداخلہ کا چوکھٹا نہایت چھوٹا تھا تاکہ کوئی بھی کرایہ دار مالکِ مکان کے سامنے سر نہ اُٹھا سکے۔ رفع حاجات کے لئے مشترکہ پاخانہ تھا جس پر اہل محلہ کا مساوی حق تھا۔ کمروں کی چھتیں " ۷ " یعنی وکڑی کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ دونوں کمرے اس قدر مختصر تھے کہ ان میں سجدۂ شکر تو بآسانی بجالایا جاسکتا تھا لیکن پیر پسار کر غفلت کی نیند نہیں سو سکتے تھے۔ ہاں بارش کے موسم میں ضرور کسی پیڑ کے نیچے کھڑے ہونے کا مزہ لیا جاسکتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ وقتی طور پر وہی مکان حاصل کرلیں۔ کرایہ دریافت کیا گیا تو جواب ملا کہ تین سو روپے ماہانہ۔ حالانکہ تین سو روپے ہمارے لئے ناقابل قبول تھے لیکن "نہیں ماموں سے نکٹے ماموں بہتر" سوچ کر ہم نے اسے چند مہینوں کے لئے حاصل کرنا چاہا لیکن جب مالکِ مکان نے ۲۵ ہزار روپے پیشگی مانگے تو ہم نے سیدھے گھر لوٹنے ہی میں عافیت سمجھی۔

افروز نے خبر دی کہ اس کی سہیلی آشا کی عمارت میں اوپر کی منزل کرایہ کے لئے خالی ہے۔ آشا جو ہم پر اپنے دانت گاڑے بیٹھی تھی۔ لیکن ہم نے اس کی دال نہ گلنے دی۔ حالانکہ ہم آشا سے بات بھی کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن آج کے دور میں انسان اپنے مفاد کیلئے سب کچھ کر گذرتا ہے اسی لئے ہم نے مکان دیکھنے کی حامی بھر لی۔ آشا کے قدموں کے تعاقب میں ہم مکان دیکھنے چل پڑے اس کے قدم ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے جا کر رُکے۔ ہم نے مکان کا جو تصور اپنے دل میں کیا تھا۔ ہو بہو اس شکل کی عمارت ہمارے سامنے موجود تھی۔ کال بیل بجائی گئی۔ کسی محترمہ نے دروازہ کھولا، ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ آشا ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کرکے اندر چلی گئی۔ ہم رشک بھری نگاہوں سے یا یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح بلی للچائی ہوئی نظروں سے چوہے کی جانب دیکھتی ہے اُس حسین عمارت کو تک رہے تھے کہ اچانک ایک صاحب جو صورت سے کوئی پیشہ ور غنڈے نظر آرہے تھے اندر داخل ہوئے اور ہمیں مکان دکھانے چل پڑے، ان کی صورت دیکھتے ہی ہمارے اوسان خطا ہوگئے۔ ہمیں اپنی جان کی خیر نظر نہیں

آئی۔ دوسری منزل پوری خالی تھی۔ مکان ہمیں پسند ہی نہیں بلکہ بے حد پسند آیا۔ ان حضرت سے تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ جنھیں ہم پیشہ ور غنڈے سے مجبور رہے تھے دراصل آشا کے والدِ ماجد تھے۔ چند لمحے ہمیں تنقیدی نگاہوں سے دیکھنے کے بعد اپنی "جسیم" آواز میں وہ ہم سے مخاطب ہوئے۔

"آشا سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" ہم نے جواب دیا "کہ کچھ بھی نہیں، ہم دونوں ایک ہی کالج میں زیرِ تعلیم ہیں"۔ ایک گرجدار آواز گونجی۔ "کیا تم دونوں ایک ہی کلاس میں ہو؟" ہم نے نہایت ادب سے جواب دیا کہ "جی نہیں آشا ہم سے دو سال جونیئر ہے۔"۔ "تم سے جونیئر ہے تو تم دونوں کی ملاقات کیوں کر ہوئی؟ کالج میں اور بھی تو لڑکیاں ہیں؟ تم آشا ہی سے کیوں ملے؟" (ان حضرت کو کون سمجھاتا کہ ہمیں لڑکی کی نہیں بلکہ مکان کی ضرورت تھی۔) ہم نے جواب دیا کہ حضرت افروز آشا کی سہیلی ہے، افروز جانتی تھی کہ ہمیں مکان کی تلاش ہے اس نے آشا سے جو اس کی سہیلی ہے تذکرہ کیا تو آشا نے کہا کہ آپ کا مکان خالی ہے۔ اُنھوں نے حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے فرمایا کہ "مجھے تمہاری نیت پر شک ہے اور صورت سے بھی تم فراڈ لگتے ہو" (فلمی مکالمہ) اس لئے میں مکان تمہیں نہیں دے سکتا آئندہ آشا کی طرف نظر بھی ڈالی تو۔ ہم نے لاکھ صفائی پیش کی لیکن اُنھوں نے ایک نہ سُنی، شاید خدا کو یہی منظور تھا اس طرح ہماری عزت جسے ہم نے ۲۴ سال سے سنبھال کر رکھا تھا مکان حاصل کرنے کے سلسلے میں بغیر کسی اُجرت کے اتار لی گئی۔

رتن نہ جانے کہاں سے خبر لائی کہ ایک مکان خالی ہے۔ محل کے علاقہ میں کام چلاؤ مکان ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ مالکِ مکان صورت سے شریف انسان نظر آرہے تھے جن کے رعب دار چہرہ پر تقریباً دو فٹ لمبی داڑھی ان کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔ اُنھوں نے ہمارے پورے کیلئے کا بغور معائنہ کیا، ہم نے جھٹ سے سلام ٹھونک دیا اور اپنا مدعا بیان کیا، اُنھوں نے گھوم پھر کر ٹٹول کر ہمیں دیکھا۔ پھر اپنی نحیف آواز میں دریافت کیا "کیا آپ گوشت کھاتے ہیں؟" ہم نے اثبات میں سر ہی نہیں ہلایا بلکہ گوشت کے ذائقہ اور فوائد پر اچھا خاصا لکچر بھی دے ڈالا کہ شاید ہمارے لکچر سے متاثر ہو کر ہی مکان ہمارے قبضہ میں دیدیں اتنا سنتے ہی ان حضرت میں نہ جانے کہاں سے توانائی آگئی اور ان کی نحیف آواز گرجدار آواز میں تبدیل ہو کر ہمارے خاندان کو بہترین گالیوں سے نوازنے لگی۔ ہم وہاں سے جان بچاکر بھاگے۔

ہماری صحت دن بدن مکان کی تلاش میں گرنے لگی تھی۔ ہم اس سلسلے میں تقریباً مایوس ہو چکے تھے کہ خبر ملی سیتا باڑی میں ایک تین کمروں والا مکان کرایہ کے لئے خالی ہے۔ ہم نے علی الصبح بغیر غسل کئے مالکِ مکان کے دولت کدہ پر حاضری دی۔ تھوڑی دیر بعد مالک مکان اندر سے نمودار ہوئے۔ یقین جانئے ہم اس وقت کسی بھک منگے سے کم نظر نہیں آرہے تھے۔ بالکل پریشان حال۔ مالکِ مکان نے ہماری طرف اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور اپنے خادم کے ذریعے ہمیں شام میں آنے کا حکم دیا۔ ہم شام کو پھر پہنچے ان کے خادم نے اندر جاکر اطلاع دی۔ تھوڑی دیر بعد خادم پانچ روپے کا کرارا نوٹ لئے نمودار ہوا اور کہا کہ صاحب نے کہا ہے کہ آج اتنا ہی ہے۔ ہم حیرت سے کبھی خادم کو اور کبھی کرارے نوٹ کو دیکھ رہے ہے، ہماری آنکھوں میں آنسو رواں دیکھ کر خادم بھی ہمارے غم میں برابر کا شریک ہو گیا اور مشورہ دینے لگا کہ جوان ہو، اچھے خاصے ہو، کہیں کوئی نوکری کیوں

نہیں کر لیتے ۔ ہم نے جب آنسو پونچھتے ہوئے اس کی غلط فہمی دور کی اور مدعا بیان کیا تو وہ ہمیں یوں تکنے لگا مانو ہم کوئی عجوبہ ہوں اور بہت نادم ہوا ۔ ہم نامراد عاشق کی طرح وہاں سے لوٹ آئے۔

گزشتہ ہفتہ مومن پورہ میں ایک مکان کے سلسلے میں پہنچے۔ صاحبِ خانہ کے ماتھے پر کالا نشان اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ حضرت صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ صوم و صلوٰۃ کے پابند بھی ہیں ہم نے اپنا مدعا بیان کیا۔ انہوں نے ہماری بیگم صاحبہ کے متعلق دریافت کیا ۔ ہم نے کہا کہ حضرت ہمارے تو ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تو شادی کی بات کیا۔

کہنے لگے ، پھر تو آپ کو مکان نہیں مل سکتا ، یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ ہم نے کہا مکان ہمارے والدین کو چاہئے اور وہ عرصہ سے شادی شدہ ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ مشکل ہے کیونکہ آپ بھی ان کے ساتھ رہیں گے اور آپ ابھی تک کنوارے ہیں۔ میرے ساتھ میری کنواری لڑکی بھی رہتی ہے۔ خدانخواستہ ......

ایک محترمہ نے ہمیں مکان دینے سے صرف اس لئے انکار کر دیا کہ ہم ایک ایسے کالج میں زیر تعلیم ہیں جہاں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں کی نسبت زیادہ ہے اور بقول ان کے ہم میں شرم و حیا قطعی باقی نہیں رہی۔

اس تلاشِ مکان نے ہمیں اس قدر اذیتیں دی ہیں ، اتنی بے عزتی کی ہے ہماری کہ جی چاہتا ہے زندگی سے فرار حاصل کر لیں۔ لیکن پھر سوچتے ہیں کہ اگر ہم نہ رہے تو ملک کا کیا ہوگا ۔ ہم جوان ہیں ، ہمارے حوصلے بلند ہیں ۔ ہم اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک ہمیں مکان دستیاب نہیں ہو جاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم نے والد صاحب کو لکھ بھیجا ہے کہ ہم اس ذمہ داری یعنی تلاشِ مکان کو نہیں نبھا سکتے جس کے جواب میں انہوں نے ہمیں عاق کر دیا ہے ۔ کیونکہ بقول ان کے آج ہم ایک عدد مکان تلاش نہیں کر سکتے تو بڑھاپے میں ان کی خدمت کیا کر سکتے ہیں ؟

ہاشم عظیم آبادی

بوڑھوں کی کانفرنس

دفتر سے واپس آرہا تھا کہ راستہ میں رکشہ، ٹم ٹم اور فٹ پر عجیب عجیب طور سات میں بوڑھے حضرات کو جوق در جوق جاتے دیکھ کر میں نے ایک بزرگ سے پوچھا۔ "جناب عالی، غالباً آپ صاحبان کسی جنازے میں شرکت کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں۔"

انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "جی نہیں۔ ہم لوگ بوڑھوں کی کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اس تیزی سے آگے بڑھ گئے کہ میں مزید تحقیق نہ کر سکا۔ میں نے قیاس کر لیا کہ کوئی مذہبی قسم کا جلسہ ہونے جا رہا ہوگا۔ اس لئے میں بھی اسی طرف چل پڑا۔ ابھی دور ہی تھا کہ انجمن اسلامیہ ہال کے پھاٹک پر جلی حروف میں لکھا نظر آیا۔ "بوڑھوں کی کانفرنس" — میں نے کہا۔ "الٰہی توبہ! — اب یہ بوڑھے بھی اپنی کانفرنس بلانے لگے۔"

پھاٹک پر چند بوڑھے کھڑے تھے اور کچھ عصائے پیری لئے اِدھر اُدھر چہل قدمی میں مشغول تھے۔ میں نے بہ اطمینان تمام شیروانی کے جیب میں ہاتھ ڈالے پھاٹک کے اندر قدم رکھنا چاہا تو ایک بزرگ نے میری گردن ناپی اور دوسرے بڑے میاں نے اس بیدردی سے میری شیروانی کا دامن پکڑ کر کھینچا کہ "چر" سے آواز آئی۔ میں تڑپ اُٹھا۔ "اجی حضرت! یہ کون سا مذاق ہے آپ کا۔ دیکھئے تو میری شیروانی کی کیا درگت بنی؟"

بوڑھے میاں آنکھوں سے شعلے برساتے ہوئے گرجے۔ "اندھے تو نہیں ہو تم؟"

"جی کیا ارشاد ہوا؟"

"اندھا!"

میں نے جواباً عرض کیا۔ "مگر حضور میری دونوں آنکھیں بفضلہ سلامت ہیں۔ جبھی میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔"

بوڑھے میاں غرّائے۔ "جب اندھے نہیں ہو تو ہماری اس کانفرنس میں دھنسے کیوں پڑتے ہو۔ جب یہ معلوم ہے کہ اس

کانفرنس میں نوجوانوں کی شرکت پر پابندی ہے۔ انہیں کسی حال میں اندر جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ورنہ مجھے اس طرح پھاٹک پر پہرہ دینے کی کیا ضرورت تھی ۔ ۔ ۔ اچھا یہ آپ اُلٹا مجھے آنکھیں دکھلا رہے ہیں۔ خوب ! بلواؤں کیا سکریٹری صاحب کو۔"

میں نے عرض کیا: "خدا شاہد ہے حضور کہ مجھے قطعی اس کی اطلاع نہ تھی کہ بوڑھوں کی کانفرنس میں نوجوان شریک نہیں ہو سکتے ورنہ میں کبھی ایسی جرأت سے کام نہ لیتا۔ لہٰذا میں یقین دلاتا ہوں کہ کانفرنس میں شرکت کا خیال تو درکنار، میں اس طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا۔"

میں ان بوڑھوں کی جماعت سے اپنی جان سلامت لے کر نکل تو آیا لیکن دل میں ایک طرح کی بے چینی تھی کہ کسی طرح بوڑھوں کی کانفرنس کی کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہیئے کیونکہ بوڑھوں کی کانفرنس اپنی نوعیت کی ایک انوکھی کانفرنس تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ نوجوانوں کی شرکت پر پابندی عائد تھی۔

سوچتے سوچتے ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ میں نے بازار جاکر مصنوعی داڑھی اور مونچھ خریدی اور اسے لگائے ہوئے شیروانی تبدیل کرنے کے لئے گھر آیا۔ صحن کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ بہنیں چیخ مار کر بھاگنے لگیں۔ اور لطف یہ کہ میں بھی ان کے پیچھے دوڑ رہا ہوں۔ صرف اس خیال کے تحت کہ بیٹھے بٹھائے یکایک انہیں یہ کیا ہو گیا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ان کی چیخ و پکار اور بھاگ دوڑ میں اور اضافہ ہو گیا۔ تب کہیں مجھے اپنی مصنوعی داڑھی اور مونچھ کا خیال آیا اور میں نے جلدی سے انہیں الگ کیا۔

اس واقعہ سے کم از کم اتنی تسلی ضرور ہوئی کہ میں اپنی صورت بدلنے میں کامیاب رہا۔ لہٰذا میں نے ایک عصا لیا اور تسبیح ہزار دانہ ہاتھوں میں لٹکائے رکشہ پر سوار انجمن اسلامیہ ہال کے پھاٹک پر پہنچا۔ اور اسی عصا کے سہارے بہ مشکل رکشہ سے اُتر کر اس انداز سے آہستہ آہستہ چلنے لگا جیسے میں واقعی کسی خانقاہ کا سجادہ نشین ہوں۔ لیجیئے ! ـــ وہی جلاد قسم کے بڑے میاں جنہوں نے میری شیروانی کی درگت بنائی تھی مجھے دیکھتے ہی بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کرتے ہوئے بولے۔

" جزاک اللہ ! تشریف لایئے شاہ صاحب ۔" مجھے ہنسی تو ضرور آئی لیکن تسبیح کے دانوں پر جلدی جلدی ہاتھ پھیرتا ہوا ہال کے اندر داخل ہو گیا ۔ اندر پہنچ کر نگاہ جو دوڑائی تو اللہ کی پناہ ! بوڑھوں کا ایک سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایک سے ایک سن رسیدہ۔ ریشِ دراز۔ ریشِ مخضب اور ریشِ حنائی وغیرہ وغیرہ ۔

کانفرنس کے مقررہ وقت کے ایک گھنٹہ بعد کانفرنس کے افتتاح کیلئے ایک بوڑھے میاں بہ مشکل لاٹھی ٹیک کر اٹھے ہوئے ہی تھے کہ لڑکھڑا کر گر پڑے ۔ بارے دو آدمیوں نے سہارا دیا۔ تب کہیں اُنہوں نے کلام مجید کی ایک سورۃ تلاوت فرما کر کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اس کے بعد ایک جوشیلے بوڑھے میاں نے ایک نظم پڑھی مگر ایسی آواز سے کہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ فشارِ قبر کی تکلیف سے کوئی مُردہ چیخ رہا ہے۔ نظم کا ایک شعر مجھے یاد ہے ؎

اُٹھ اور خدا ہمت مردانہ دکھا دے
بوڑھے نہیں ڈرتے ہیں کسی سے یہ بتا دے

بعدہٗ صدر کا انتخاب عمل میں آیا اور حضرت "بلائے بے درماں" بہ اتفاق آراء صدر منتخب ہوئے۔ کرسیٔ صدارت

پر جلوہ فگن ہوتے ہی انہوں نے کہا۔

"بھائیو! مجھ ذرۂ ناچیز اور ہیچمداں کو جو شرف امتیاز بخشا گیا ہے۔ اس کا میں کسی طرح اہل نہیں۔ لیکن مشکل یہ درپیش ہے کہ مجھ میں جرأتِ انکار نہیں اور نہ مجھے یہ گوارا ہے کہ میری ذات سے کسی فردِ بشر کی دل شکنی ہو۔ لہٰذا صدارت کا یہ بارِ گراں مجھے اپنے دوشِ ناتواں پر اٹھانا ہی پڑے گا ..... لیکن گستاخی معاف فرمائیں۔ میں بہت دیر سے اجابت محسوس کر رہا ہوں اور پیٹ میں کچھ مروڑ بھی .... تو اگر آپ حضرات میری تھوڑی دیر کی غیر حاضری معاف فرمائیں تو میں بیت الخلاء سے ہو آؤں .... جی ہاں، حاجتِ ضروری سے فارغ ہوتے ہی جلسہ کی کارروائی زور و شور سے شروع کر دوں گا ... ہاں، میری ایک دست بستہ گزارش یہ ہے کہ آپ حضرات تکلیف فرما کر تھوڑا تھوڑا اور آگے بڑھ آئیں۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ سمٹ آئیں تو بڑا اچھا ہو تاکہ پیچھے والے معزز حاضرین اور ڈیلیگیٹس کو بھی بیٹھنے کا موقع ملے۔"

جنابِ صدر بیت الخلاء سے فارغ ہو کر اور وضو بنا کر آدھ گھنٹے کے بعد تشریف لائے لیکن مائک کے سامنے کھڑا ہونا تھا کہ ان کو کھانسی آ گئی۔ لیجئے جنابِ صدر کا بے وقت کھانسنا تھا کہ دوسرے بوڑھوں کو بھی اپنی کھانسی یاد آ گئی۔ اب کیا تھا، پورے پنڈال کے بوڑھے کھانستے کھانستے بے دم ہو گئے۔ جب قدرے سکون ہوا تو جنابِ صدر کے بار بار پکارنے پر ایک بڑے میاں "حضرت ستارۂ آسمانی" جو دری کا کونہ الٹ کر تھوک اور بلغم جمع کرنے میں منہمک تھے۔ رومال سے منہ پونچھتے ہوئے تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور بولے۔

"جنابِ صدر، میرے بوڑھے ساتھیو، یعنی معزز حاضرین۔ معاف کیجئے گا۔ میں ذرا شکی طبیعت کا انسان واقع ہوا ہوں لہٰذا صرف رفعِ شک کے لئے یہ درخواست کروں گا کہ اس کانفرنس کی اہمیت کے پیش نظر آپ صاحبان ایک بار پورے پنڈال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر اطمینان کر لیں کہ آیا ہماری اس کانفرنس کی کارروائی سننے یا دیکھنے کے لئے کوئی نوجوان تو ہم میں نہیں آملا ہے۔ کیونکہ یہ نوجوان طبقہ ہم بوڑھوں کو جل دینے میں اس قدر ماہر ہے کہ کم از کم میں ان سے پناہ مانگتا ہوں ممکن ہے میرے دوسرے بھائیوں کو بھی اس سے اتفاق ہو۔ (آواز: بے شک بے شک) .... تو حضرات جب کہ یہ یقین ہو گیا کہ اس کانفرنس میں ہماری ہی قوم کے معصوم لوگ ہیں تو اب اپنی تقریر شروع کرتا ہوں۔

امّا بعد۔ اس کانفرنس کے بلانے کی اشد ضرورت تھی۔ اس وجہ سے اور بھی ضروری و لابدی سمجھی گئی کہ اب ہماری قومِ ضعیف کو ان نوجوانوں کے ہاتھوں پامال ہونا اب گوارا نہیں۔ اور نہ ہم میں اس کی مزید برداشت کی صلاحیت رہی ہے۔

میرے دوستو ....! نہ جانے ہم بوڑھوں کو کیا ہو گیا تھا کہ اب تک نوجوانوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے رہے ان کی جلی کٹی باتیں سنتے رہے۔ اور اپنی زندگی کی ساری خوشیاں ان سے وابستہ کر کے ان کے دستِ نگر بنے رہے۔ لیکن اب جبکہ ہم بوڑھے خوابِ غفلت سے بیدار ہو چکے ہیں۔ ہم میں یکجہتی اور بھائی چارہ پیدا ہو گیا ہے اور ہم دوسروں کی حمایت کرانے کے بجائے خود تصدیق کرنے لگے ہیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم نوجوانوں سے دب کر رہیں۔ (تالیاں)

بس اب جلد ہی میں کہتا ہوں کہ یہ نوجوان بہت بھول رہے ہیں کہ ہم کیا ہیں۔ ہم کون ہیں؟ اجی، ہم وہی ہیں

کہ آج سے کچھ دن پہلے اِن ہی کی طرح جوان تھے۔ جی ہاں، جوان بھی ایسے کہ جس کی مثال آج بخدا نہیں مل سکتی (آوازیں.. ..دریں چہ شک ہے)..... لیکن یہ ہماری کمزوری اور دب کر رہنے کا نتیجہ ہے کہ نوجوان ہمیں آنکھ نہیں لگاتے۔ خدا کی قسم یہ چار چار دن کے چھوکرے اسکول اور کالج میں پڑھ کر نہ جانے خود کو کیا سمجھتے ہیں کہ ہماری تجربہ آلود باتوں پر دھیان دینا تو درکنار اُلٹا ہمارا مذاق اُڑاتے ہیں۔ وہ اِسی پر اکتفا کرتے تو ہم صبر کر لیتے۔ لیکن یہ نوجوان بار بار ہمیں جولانیٔ طبع دکھلاتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ بڑھا سٹھیا گیا ہے۔ دماغ چل گیا ہے۔ موت بھی نہیں آتی۔ خواہ مخواہ بڑھا بڑبڑائے جاتا ہے وغیرہ، وغیرہ، (آواز، شیم شیم)..... تو کیا آپ نے کبھی غور فرمایا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اِن کے اندر یہ جرأت و ہمت کیوں کر پیدا ہوئی بات بالکل صاف اور واضح ہے۔ کیونکہ ہماری کوئی تنظیم نہیں۔ ہم میں یکجہتی اور اتفاق نہیں۔ ہم کو ہڑتال اور مرن برت کی توفیق نہیں۔ ہاں، آج بھی اگر ہمارا سنگٹھن ہو جائے اور ہم سب ایک پلیٹ فارم پر آجائیں تو پھر دیکھئے ہماری عزت و وقعت۔ میں کہتا ہوں کہ ہمیں آنکھیں دکھلانا تو ایک طرف، بغیر ہماری خوشنودی اور اجازت کے ان نوجوانوں کو اپنے سسرال ایسے عزیز گھر میں قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑے۔ بلکہ بغیر ہمارا تحریری حکم حاصل کئے سینما یا تھیٹر چلے جائیں یا چھپ چھپ کر سگریٹ پی لیں تو میرا نام ستارۂ آسمانی نہیں..... لیکن افسوس صد افسوس ہماری موجودہ حالت پر۔ (ہر طرف سے سسکنے کی آوازیں)

تو میں ایک مرتبہ پھر اپنے انہیں الفاظ کو دہراؤں گا کہ یہ نوجوان بھول رہے ہیں کہ ہم کیا ہیں؟ کوئی ان سرپھروں کو سمجھائے کہ ہم میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو ان کے اندر ہے۔ ہم میں بھی غیرت و حمیت ہے۔ ہم میں بھی ان کی طرح باتوں کا جواب دو بدو دینے کی صلاحیت ہے۔ ہم بھی ان کی طرح دل رکھتے ہیں اور دل کے اندر حسرت و تمنا۔ لیکن فی الحال ہم میں اور ان میں فرق بس اسی قدر ہے کہ وہ نوجوان ہیں۔ ہم بوڑھے ہیں۔ وہ تن کر چلتے ہیں۔ ہماری کمر جھک گئی ہے۔ اِن کی آنکھوں میں کافی بینائی ہے اور ہماری آنکھوں میں پچھتر فی صدی موتیا بند۔ ان کے منہ میں دانت ہیں اور ہم پوپلے ہیں۔ (پوپلے کے لفظ پر وہ بوڑھے جو مصنوعی دانت لگائے ہوئے تھے، ٹٹول کر دیکھنے لگے)..... تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ ہم گئے گذرے ہیں ہمیں باعزت رہنے اور نوجوانوں کو اپنے قبضہ میں رکھنے کا حق ہی حاصل نہیں..... ضرور حق حاصل ہے۔ خصوصاً اب جبکہ ہم بوڑھے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ سمجھئے کہ انشاء اللہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے سارے پامال شدہ حقوق ان سرپھرے نوجوانوں سے ڈنڈے کے زور سے منوا کر دم لیں (آواز، نعرۂ تکبیر اللہ اکبر)

دوسرے صاحب یعنی "کوکب زمینی" تشریف لاتے ہیں لیکن عجیب اتفاق کہ مائک کے سامنے آتے ہی ضرر بد قسم کی سرسری اُٹھی۔ بہت دیر تک بیچارے تلملاتے رہے۔ آخر کش دو گلاس پانی پینے کے بعد ان کی طبیعت سنبھلی تو تقریر کی طرف متوجہ ہوئے۔ بولے "بھائیو! میں کوئی مقرر تو ہوں نہیں کہ حضرت "ستارۂ آسمانی" کی طرح فصاحت و بلاغت کے دریا بہاؤں میرا عجز اور انکسار میرے نام ہی سے ظاہر ہے۔ یعنی کوکب زمینی"۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کچھ خیالات کا اظہار کر لیتا ہوں۔ اسی پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے..... تو اس کانفرنس کے انعقاد سے خصوصاً مجھے اس قدر مسرت ہوئی ہے کہ، اگرچہ میں دمہ، کھانسی، موتیا بند، بواسیر، نواسیر، درد گردہ اور ضعف معدہ کا مستقل مریض ہوں، پھر بھی میں نے اپنا فرض سمجھا کہ بڑھوں

کی اس کانفرنس میں شریک ہو کر اپنے حقوق منوانے میں ، اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کا ہاتھ بٹاؤں۔ ممکن ہے یہی خدمت اس گنہ گار ازلی کی بخشائش کا ذریعہ ثابت ہو۔ (آوازیں ۔ انشاءاللہ ، انشاءاللہ)

تو آمدم برسر مطلب کے تحت میں یہ عرض کروں گا کہ ہماری پلی اور ہم ہی سے بیاؤں۔ یعنی یہ نوجوان جو ہماری ہی گود میں پل کر پروان چڑھتے ہیں وہی ہمیں آنکھیں دکھائیں۔ وہی ہمارے کہنے میں نہ رہیں۔ وہی ہمارے سامنے اکڑ اکڑ کر ہمیں جوانی کے عہد رفتہ کی یاد دلا دلا کر آٹھ آٹھ آنسو رلائیں۔ وہی ہمارے مقابلے میں اپنی بیوی کی پاسداری کریں۔ وہی ہماری موجودگی میں من مانی کرتے پھریں۔ اور وہی ہمیں گھر کے ایک کونے میں کوٹھری دے کر کھانسنے اور مرنے کیلئے تنہا چھوڑ دیں ۔ ۔ ۔ ۔ حیف پیری و صد عیب ایک جوانی کیا گئی کہ ہم زندہ درگور ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ معاف کیجئے گا ایک شعر یاد آگیا۔ نہایت ہی پھڑکتا ہوا ہے۔ آپ لوگ بے حد لطف اندوز ہوں گے۔ جی ہاں عرض کر رہا ہوں ؎

مل جائے اگر شباب رفتہ

ٹھہرا کے میرا سلام کہنا

تو میرے بھائیو ۔ ! ان نوجوانوں کی بے راہ روی کا کوئی کہاں تک رونا روئے۔ مختصر یہ کہ ہم ان کے ہاتھوں اس قدر نالاں ہیں کہ مارے صدمہ کے ضعیفی کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے ۔ کاش ! یہ سرپھرے آج سنبھل جائیں۔ ہماری خدمت خدا اور رسول کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق کریں اور ہمارے قبضہ میں رہ کر ہمارا دل خوش رکھیں تو پھر دیکھیے کوئی ہماری ضعیفی کا شباب ۔ مگر بھائیو ، یہاں یہ کم قوت ہی کچھ ایسے ہیں کہ ہمارا دل ایک گھڑی کے لئے بھی خوش نہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ زیادہ تعداد ہم معصوموں کی دمہ اور کھانسی ایسے مہلک اور جان لیوا امراض میں مبتلا ہے ۔ ۔ ۔

لیجئے ! ان بزرگوں کو پھر اپنی کھانسی یاد آگئی ۔ ایک بڑے میاں نے بڑھ کر کھانسی کا مصرعہ طرح دیدیا اور کچھ مشق بزرگ شاعروں نے گرہ پر گرہ لگانی شروع کی ۔ اس گرہ بازی نے اس قدر طوالت اختیار کی کہ پندرہ منٹ کے بعد کہیں مقطع سننے میں آیا۔

اب حضرت "دمڑی مَدھک" کی باری آئی ۔ وضع قطع ملاحظہ ہو ۔ داڑھی دو حصوں میں مساوی تقسیم ہو کر دونوں کندھوں پر جلوہ فرما تھی ۔ ٹوپی غالب نما پہنے ہوئے تھے اور جسمانی لحاظ سے کچھ پہلے سر سید احمد ۔ منہ میں ایک بھی دانت نہ رہنے کے باعث دونوں گالوں میں اتنے عمیق غار تھے کہ دو مینڈک ان میں بآسانی سما سکیں ۔ انہوں نے مائیک کے سامنے آتے ہی اعلان کیا کہ میں زیادہ دیر تک تقریر نہیں کر سکتا ۔ بات یہ ہے کہ ہر پانچ منٹ پر مجھے استنجے کی حاجت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس مجبوری اور وقت کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے ۔ صرف اسی قدر عرض کروں گا کہ حضرت "ستارۂ آسمانی" اور "مولانا کوکب زمینی" کی عالمانہ تقریروں کے بعد کچھ کہنے کی جرأت گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے ۔ پھر بھی مجبوراً مجھے صرف اس لئے کھڑا ہونا پڑا ہے کہ ہمارے دوستوں میں سے کسی نے ابھی تک جناب صدر مولائی اور آقائی "حضرت بالشت بے مدھل" کی توجہ ایک نہایت اہم اور تکلیف دہ شئے کی طرف مبذول کرانے کی کوشش نہیں کی ہے اور وہ ہے نوجوانوں کی حد سے بڑھی ہوئی شرارت آمیز

حرکتِ ناشائستہ یعنی ان نالائقوں کو ہمارے سامنے بلکہ ہمیں دکھلا کر ایسی چیزیں کھانا جسے ہم بوڑھے نہ تو چبا سکتے ہیں اور نہ انہیں ہضم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہائے ہائے! ایک وہ بھی دن تھے کہ ہم ابا جیا اللہ تعالیٰ کو یہ دن ہے کہ فالودہ کھانے کو ترستے ہیں.... تو میرے پیارے بھائیو۔ اس روز روز کے صدمہ سے کوئی کب تک دوچار ہوتا رہے۔ لہٰذا میں درخواست کروں گا کہ ہماری یہ کانفرنس جو کہ ان دنوں بلدیہ پر غور فرمارہی ہے۔ وہاں ان باتوں کو بھی مدِنظر رکھ کر نوجوانوں پر سخت پابندی عائد کردے تاکہ آئندہ سے وہ ہمارے سامنے صرف ایسی ہی ملائم چیزیں کھایا کریں جنھیں ہم لوگ پوپلے مُنہ سے چبا کر ہضم کر سکتے ہوں...... لیجئے میں نے قبل ہی عرض کیا تھا نا .... اب میں استنجا کی ضرورت محسوس کرنے لگا ہوں۔ زیادہ دیر ہو جانے پر نماز ہی قضا کرنی پڑتی ہے۔ اچھا سلام علیکم

اسی طرح کی تقاریر کا سلسلہ بہت دیر تک قائم رہا۔ بیسیوں بوڑھے مقرروں نے نوجوانوں کے خلاف خوب خوب دل کھول کر زہر افشانی کی۔ اس کے بعد جنابِ صدر نے اُٹھ کر اعلان کیا "چونکہ رات زیادہ ہوچکی ہے اور سردی کے باعث ہمارے احباب جلد جلد اُٹھ کر استنجا کو جارہے ہیں اس لئے مناسب سمجھتا ہوں کہ ریزولیوشن پیش کرنے کے بعد جلسہ کی کارروائی جلد ہی ختم کردی جائے۔ باہر سے آئے ہوئے حضرات مجھے معاف فرمائیں جنھیں وقت کی کمی کے باعث اظہارِ خیال کا موقع نہ مل سکا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ عرض کرنے میں بے پناہ مسرت محسوس کررہا ہوں کہ ہمارے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ہماری یہ کانفرنس اس قدر کامیاب ہوگی اور ہماری کوششیں بار آور ہو کر ہمیں ایک پلیٹ فارم پر لے آئیں گی۔ (آواز: انقلاب زندہ باد، نعرۂ تکبیر اللہ اکبر)

تو صاحبو! وقت کی تنگی کے پیشِ نظر میری یہ تجویز ہے کہ اگر کوئی صاحب نہایت ہی اہم اور ضروری بات کہنا چاہیں یا کوئی مفید مشورہ دینے کے خواہاں ہوں تو جلد مائک پر تشریف لا کر اپنے خیالات سے مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمائیں۔

میری شامتِ اعمال یا شرارت جو بھی کہیئے کہ اس اعلان سے فائدہ اُٹھا کر مائک کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ میری دیڑھ گز کی داڑھی دیکھ کر لوگ اس قدر مرعوب ہوئے کہ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اور میں نے آواز میں تبدیلی پیدا کر کے کہنا شروع کیا۔

"میرے ضعیف و ناتواں اور نوجوانوں کے ہاتھوں زندہ درگور بھائیو۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اب ہمارے اندر بھی بیداری پیدا ہو گئی ہے کہ ہم اپنے حقوق کی خاطر سینہ سپر ہو سکیں۔ میں اس طویل بحث میں نہ پڑ کر صرف یہ کہنے کھڑا ہوا ہوں کہ جب ہم اپنے حقوق منوانے کیلئے ریزولیوشن پاس کر رہے ہیں تو ایک ایسا ریزولیوشن بھی پاس کیا جائے جس کے تحت کوئی بڈھا بوڑھا کسی نوجوان لڑکی کو اپنے عقدِ نکاح میں لانے کی جرأت نہ کرسکے۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ہمارے بوڑھے دوست اس چکر میں ایسا مبتلا ہوتے ہیں کہ اپنے مال و دولت کے بل پر بے جوڑ شادی رچا کر دم لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی کی تمنائیں اور آرزوئیں کانوں کو سکے بہت جلد راہیٔ ملکِ عدم ہوتے ہیں۔ مگر کب ۔ دوسرے بے قصور بوڑھوں پر کلنک کا ٹیکہ لگانے کے بعد.... تو کیا یہ نوجوانوں کے جذبات سے کھیلنا نہیں۔ کیا ان حرکاتِ ناشائستہ سے جذبۂ نفرت پیدا نہیں ہوتا۔ چُپ کیوں ہیں۔ بولئے۔ جواب دیجئے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ہم بوڑھے نوجوانوں سے اپنے حقوق منوانے جارہے ہیں۔"

میں ابھی قدر کہنے پایا تھا کہ ایک بوڑھے میاں جو قریب ہی ڈائس پر بیٹھے تھے۔ ہڑبڑا کر اُٹھے اور میری داڑھی پر یہ کہتے ہوئے ہاتھ ملا — "یہ کیا حرکت ہے شاہ صاحب۔ مزاج درست کروں گا ابھی" الٰہی توبہ! بوڑھے

میاں نے ایسا جھپٹا مارا کہ میری مصنوعی داڑھی اِن کے ہاتھ میں آ رہی ۔ ایک بزرگ جو مجھے جانتے تھے چلا اُٹھے ۔

"ارے یہ تو ہاشم عظیم آبادی ہیں ۔"

راز کا فاش ہونا تھا کہ ہر طرف سے شور اُٹھا ۔ "مارو ۔ مارو ۔ پکڑو ۔ پکڑو" —— یہ رنگ دیکھ کر میں نے اسی میں اپنی خیریت دیکھی کہ جوتا چھوڑ کر نکل بھاگوں —— اور یہی میں نے کیا بھی ۔ لیکن بھاگتے بھاگتے ایک [illegible] پر پڑ ہی گیا

— —

اِدارۂ شگوفہ

کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵/- روپے
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	”	۵/۵۰
تیرِ نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰
چھیڑ چھاڑ	پرویز ید اللہ مہدی	”	۶/-
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	”	۶/-
فقط	” ”	”	۶/-
ٹوٹو سٹی میں	پرویز ید اللہ مہدی	ڈرامے	۱۰/-
چوٹی کے غلام	” ”	مضامین	۷/-
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	”	۸/-
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	”	۸/-
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعۂ کلام	۸/-
بہر حال	مجتبیٰ حسین	مضامین	۷/-
الہ دین کا جو	عاتق شاہ	”	۸/-
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹/-
مزاج شریف	رشید قریشی	مضامین	۵/-

آندھرا پردیش زبردست خشک سالی امدادی پروگرام کو روبہ عمل لا رہا ہے



خشک سالی سے متاثرہ عوام کے مصائب کو دور کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر روزگار کی فراہمی کے کام

● شدید خشک سالی حالات نے آندھرا پردیش کے ۱۴ اضلاع کے ۱۶۱ تعلقوں کو متاثر کیا ہے جس سے عوام کی بھاری تعداد اپنے روزگار کے معمول کے وسائل سے محروم ہوگئی ہے۔ پینے کے پانی اور مویشیوں کے لیے چارے کی قلت دیگر سنگین مسائل ہیں۔ ● حکومت آندھرا پردیش خشک سالی سے متاثرہ عوام کی اس آڑے وقت پر مدد کرنے کا تہیہ کر چکی ہے ● اوسط اور چھوٹی آبپاشی کے کاموں کی عمل آوری میں سرعت۔



● روزگار پیدا کرنے والے کاموں، پینے کے پانی کی سربراہی کی اسکیموں اور چارے کی فراہمی کو اولیت حاصل ہے۔

● مستقل مخالف خشک سالی اقدامات کے طور پر بڑی آبپاشی کے جو کام شروع کیے گئے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں۔

۱۔ اننت پور ضلع میں پلیبار، اناپلم کے توازن قائم رکھنے والے آبی ذخائر کی تعمیر ۲۔ ضلع کڑپہ میں چترا وتی کا توازن قائم رکھنے والا ذخیرہ آب اور ملے پلی وینڈلا نہر کی تعمیر ۳۔ ضلع محبوب نگر میں جرالا آبپاشی پراجیکٹ کی تعمیر

● زیر زمین پانی کو دوبارہ بھرنے میں بہتری پیدا کرنے کے لیے پانی چھاننے والے تالابوں کی تعمیر اور چھوٹی آبپاشی کے وسائل کی بحالی کے کام شروع کیے گئے ہیں۔ ● قومی دیہی روزگار پروگرام کے تحت خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کو ...۴۲ د ٹن اناج الاٹ کیا گیا ہے۔

نظامت اطلاعات و تعلقات

حکومت آندھرا

DIPR (IOS) DIPR 15486/81

پینے کے پانی کی سربراہی

- بورویلوں کے بیے برما لگانے کھلی باولیوں کی کھدائی اور موجودہ باولیوں کو گہرا کرنے کے لیے ۱۱،۶۰۰ اسکیموں کی منظوری ٹینکروں کے ذریعہ جہاں کہیں بھی ضروری ہو پانی کی منتقلی کی فراہمی

چارہ

- کسانوں کو قیمت کے ۵۰ فیصد پر چارہ سربراہ کیا جا رہا ہے
- اب تک تقریباً ۲۲،۰۰۰ ہزار ٹن سے زائد چارہ سربراہ کیا جا سکا ہے۔
- ۲۸ خصوصی ریل گاڑیاں چارہ لے کر روانہ ہو چکی ہیں۔
- ریاستی حکومت عوام کے سرگرم تعاون کے ساتھ قدرتی مصیبت، خشک سالی سے پیدا شدہ مسائل سے نمٹنے کا تہیہ کر چکی ہے

عامہ

پرورش

لطیفے

○ لڑکے نے کہا گھر میں کوئی ہوگا تو نہیں ہے — لڑکی نے کہا میں پہلے دیکھ لوں اگر کوئی نہیں ہوا تو میں نیچے ایک سکہ پھینک دوں گی۔ آواز سن کر اوپر آجانا لڑکی نے سکہ پھینکا اور جب کافی دیر کے بعد نوجوان اوپر نہیں آیا تو پریشان ہو کے نیچے پہنچی۔ دیکھا تو نوجوان بڑی تن دہی سے فٹ پاتھ پر سکہ ڈھونڈ رہا ہے۔

"وہ تو میں نے دھاگے سے باندھ کے پھینکا تھا اور پھر واپس کھینچ بھی لیا!!" لڑکی نے کہا۔

○ کنجوس کی بیوی کو مسلسل دلوا رہی پرچونا ڈالتے رہنے کا خبط تھا۔ — "بس کرو" ایک دن کنجوس نے جھنجھلا کے کہا "دن بدن کمرے چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں"

○ دو ڈرائیوروں کا آمنا سامنا ایک کنگ پل پر ہو گیا۔ دونوں میں سے کوئی بھی واپس ہٹ کر پیٹرول کی فضول خرچی کرنے پر تیار نہیں تھا۔ ایک شخص نے اخبار نکال کر اس خیال سے پڑھنا شروع کر دیا کہ دوسرا اکتا کے ہٹ جائے گا۔ دوسرا کار میں سے نکلا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے بانیٹ پر بیٹھ گیا۔

"بھیا اخبار پڑھ چکو تو مجھے دینا۔ ذرا دیکھوں تو کیا خبریں ہیں؟"

جج: بیوی کو بیلٹ سے مار کر افسوس نہیں ہوا تمہیں

ملزم: یقیناً ہوا جناب۔ بیلٹ بالکل نئی تھی۔

- ایک شخص اتنا کنجوس اور اتنا کنجوس تھا کہ اکیلا ہی ہنی مون منانے چلا گیا۔

ایاز ورود
امراوتی

ناگپور
ایک اڑتا خاکہ

دلی کو ہندوستان کا دل کہا جاتا ہے تو ناگپور کو پھیپھڑا سمجھ لیجیے، ہر پل یہاں ٹرینیں ہیں کہ آتی جاتی سانسوں کی طرح آتی جاتی رہتی ہیں۔ ناگپور کا تحفہ سنگتروں کے سوا اور کچھ نہیں۔

میرے کاروباری سلسلے مجھے یہاں بار بار کھینچ لاتے ہیں۔ اور ناگپور ــــ

ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

کہہ کر ہر بار اپنا ایک گوشہ بے نقاب کر دیتا ہے۔ میں ہر بار ناگپور کے جغرافیہ کا کوئی نہ کوئی گوشہ دریافت کر لیتا ہوں۔ ناگپور کے لوگ بظاہر بہت مہذب اور سیدھے ہیں۔ گاندھی باغ سے آپ کسی سے صدر کا راستہ پوچھیے تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے پہلے آپ کا اعتماد حاصل کریگا ابلا پھر آپ کو سیدھے پاگل خانے بھجوا دے گا اور اگر آپ اس ٹھوکر پر بھی نہیں سنبھلے اور وہیں کسی سے دوبارہ پتہ پوچھ بیٹھے تو وہ شخص پھر آپ کو گاندھی باغ واپس پہنچا کر انا لنڈوا کا لیہ راجون کا مطلب مع تشریح و تفسیر سمجھا دے گا۔ یہاں کے رکشہ والے کچھ اونچا ضرور سنتے ہیں مگر بولتے سب ایک ہی زبان سے ہیں مثلاً۔ پہلو بہ پہلو کھڑے ایک قالب و جان معلوم ہوں ایسے رکشہ والوں کو پتہ سمجھا کر کرایہ پوچھیے۔ دام پسند نہ آئیں تو دوسرے سے رجوع کیجیے کہ بھئی تم کیا لوگے ؟ تو وہ کان پر ہاتھ رکھے گا اور دونوں جہانوں کی اجنبیت اور بے صبری آنکھ میں جمع کرکے کہے گا۔ "سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر" اور پھر ساری سچویشن اور پتہ دوبارہ معلوم کرے گا۔ دام وہی بتائیگا جو پہلے رکشہ والے نے بتایا تھا مان ہیں "یونٹی" اور واحد کلام والی بات ہو تو سمجھ میں آ رہی گی۔ مگر یہ مطلق لاعلمی کا اظہار سمجھ سے باہر ہے۔

یہاں پائے جانے والے عاشق بہت لینڈ لارڈ اور تن آسان قسم کے ہیں۔ یقین نہ آئے تو ان ہی کی زبانی سن لیجیے۔

ہم آتے صبح و شام صنم تیرے شہر میں
ہوتا جو کوئی ایر و ڈرم تیرے شہر میں

ناگپور میں مومن پورہ ایک محلہ ہے اس کے دل کی دھڑکنیں سننا ہو تو گلی کوچوں میں اتر جائیے کرگھوں کی آوازیں مسلسل فضا میں گونجتی رہتی ہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہمارے سواگت میں ہیں یا ہمیں بھگانے کے لیے ناگپور کے اطراف واکناف سے لوگ ناگپور میں ضروریات زندگی اور سامان عشرت خریدنے یہاں آتے ہیں وہیں علاقوں کی دولت یہاں سمٹتی ہے۔ یہاں کی مصنوعات دور دور تک بکھرتی ہیں۔ یہ کرگھا زدہ مقامات اور کپڑا مل اس علاقے کا دل ہے۔ جہاں کپاس تازہ خون کی طرح آتی ہے اور یہ دل اس خون کو صاف کرکے کپڑوں کی صورت میں واپس کر دیتا ہے۔

ناگپور میں میڈیکل کالج بھی ہے لہذا دور دور سے لوگ حکیم اور نیم حکیموں سے عاجز ہو کر اس طرف کا رخ کرتے ہیں۔ اس سارے منظر میں مومن پورہ کی ایک دوکان پر آویزاں بورڈ "یہاں کفن ملتا ہے" بڑا معنی خیز ہے۔ مزید براں دکان میں جھانکیے تو ایک بڑی سی شیلڈ بھی رکھی نظر آئے گی گویا قدرت نے ناگپور کو جلانے مارنے کے جملہ حقوق دے رکھے ہیں۔ جلانے کے معاملے میں اس نے کچھ کیا ہو یا نہ ہو البتہ کفن تاپنے میں تو یقیناً "تمغہ یافتہ" ہے۔ یہیں قریب ہی محمد علی سرائے، حنیف بک ڈپو، بڑی مسجد وغیرہ ہیں۔ اور اسی مقام پر لائبریری اور لائبریری کمیٹی بھی واقع ہے دونوں کا فاصلہ ہونٹوں سے آنکھوں تک کی دوری جیسا ہے۔ مگر تجربہ شاہد ہے کہ اول الذکر مقام کی ویرانی اور موخرالذکر ہوٹل پر پروانوں کا ہجوم ایک عجیب حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ کام ودہن کی لذتیں اچھے اچھوں کو یہاں کھینچ لاتی ہیں۔ وجہ شاید یہ ہو کہ یہاں کی بریانی ابن صفی کے ناولوں سے زیادہ لذیذ ہے یہاں کے سالن کا ذائقہ منٹو، کرشن چندر اور عصمت چغتائی کے افسانوں سے زیادہ چٹپٹا ہے۔ یہاں کے شامی کبابوں میں کلام میر کا سا سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ نیز یہاں کی چپاتیاں اردو کی تنقید سے زیادہ گول ہوتی ہیں اور چائے داغ و امیر مینائی کی غزلوں کی طرح ٹیسٹ فل اور گرم۔

آگرے اور ناگپور میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں جگہ پاگل خانہ ہے۔ آگرہ میں تو خیر تاج محل بھی ہے جو شاہجہاں اور ممتاز محل کے عشق کی یادگار ہے۔ عشق کے متعلق کسی نے کہا ہے ؎

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

لہٰذا اس متعدی مرض کی روک تھام کے لیے پاگل خانے کا قیام اشد ضروری تھا مگر ناگپور میں اس کے قیام کی وجہ تسمیہ ہماری سمجھ میں بہت دنوں تک نہ آئی۔ پھر بھی جب غور سے دیکھا تو ناگپور کے فٹ پاتھوں اور دیگر مقامات پر پاگلوں کی کثرت نظر آئی تو عقدہ کھلا البتہ یہ راز راز ہی رہا کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے یا ایجاد ضرورت کی، کیونکہ آج کل دوا خانے مرض کی دوا نہیں بلکہ بذات خود ایک لاعلاج مرض ہیں۔ پچھلے دنوں ناگپور میں ہمیں جب سڑک پر ایک شخص خود ہی بڑھ کر مصافحہ کیا اور ہمارے نام گاؤں، پیشہ، بال بچے وغیرہ وغیرہ امور کی اکھاڑی کرنے لگا اس کے مہذب طرز گفتگو سے ہم مرعوب سے ہو گئے اور اس کا امکان تھا کہ ہم اس کے شہری طور طریقوں سے کچھ استفادہ کرتے کہ وہ باتوں ہی باتوں میں لاشعوری طور پر چونکا اور بولا۔ ماسٹر صاحب! آپ بھی کس سے بات کر رہے ہیں۔ میں تو پاگل ہوں۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا اور پھر اس کی یہ ہاہا ایک فلک شگاف

قہقہے میں تبدیل ہوگئی جسے دیکھ کر ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور قریب تھا کہ ان میں بھی دو چار شگاف پڑ جاتے کہ ہم نے فوراً خود پر قابو پالیا اور اپنا راستہ لیا۔

پچھلے دنوں ہم نے بمبئی کیلئے رختِ سفر باندھا تو چند احباب نے سامانِ سفر میں بصد اصرار یہ مشورہ بھی باندھ دیا کہ بمبئی میں کوئی ٹھکانہ سے متعلق کوئی بات نہ کرنا کیونکہ وہاں بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ ہم نے پوچھا کیوں؟ تو بتایا گیا کہ بمبئی کے لوگ ناگپور کے غنڈوں سے ڈرتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ مگر ہر ناگپوری تو غنڈہ نہیں ہوتا۔ جواب ملا کہ جس طرح نئی نئی شادی کے بعد سسرال میں میکے کے ہر خورد و کلاں کی آؤبھگت ہوتی ہے اسی طرح لوگ غنڈوں کے شہر میں رہنے والوں سے بھی ڈرتے ہیں۔ ہمیں اس وقت نہایت افسوس ہوا کہ اتنی بار ناگپور گئے مگر کسی غنڈے کا شرف دیدار حاصل نہ ہوا۔ چنانچہ بمبئی سے واپس آکر ناگپور میں مذکورہ بالا نسخے کی جستجو ہوئی مگر سخت مایوسی ہوئی کہ غنڈہ گردی کا کوئی مظاہرہ ہمیں نظر نہ آیا۔ بسوں میں لوگ بڑے سلیقے سے چڑھ رہے ہیں۔ تھیٹر کی کیو میں چیونٹیوں کا سا ڈسپلین ہے۔ راستوں پر راہگیروں میں عجیب سا رکھ رکھاؤ ہے وغیرہ وغیرہ، البتہ ناگپور کے تھیٹروں میں چلنے والی فلموں کا باوا آدم کچھ نرالا تھا۔ ساری دھوم دھڑکے والی فلمیں تھیں چنانچہ ہم نے قیاس باندھا کہ ناگپور کے تمام غنڈے ناگپور میں ریلیز فلموں میں بھرتی ہوگئے ہیں۔ ہمارا یہ گمان آپ کو عجیب سا ضرور لگے گا کیونکہ غنڈے ہمارے آپ کے درمیان سے اٹھ کر پردہ سیمیں پر نہیں جاتے بلکہ پردہ سیمیں سے بصد ناز اتر کر جناتوں کی طرح معصوم تماشائیوں پر سوار ہوجاتے ہیں۔ ناگپوری غنڈوں کی امیج سے ناگپور واسیوں پر قیاس باندھنا سراسر ناانصافی ہے کیونکہ دیگ کے چاولوں میں سے کسی چاول ہی کو چکھ کر دیگ پر حکم لگایا جائے گا نہ کہ کالی مرچ کو چبا کر۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ناگپور کے لوگ ملنسار، ہمدرد اور مہمان نواز ہیں۔ ایک مرتبہ ہم مہمان نوازیوں کی مسلسل بوچھاروں سے گرانبار کچھ بظاہر کچھ بباطن ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ مہمان نوازی کا کچھ بوجھ جس میں ناگپوری سنگترے کے ٹوکرے بھی تھے میزبان نے اٹھا رکھے تھے لیکن چونکہ ریلوے اسٹیشن پر میدانِ حشر بپا تھا اور ہمیں اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا تھا اس لیے سوٹ کیس بیگ تھیلے، سنگتروں کے پٹارے وغیرہ وغیرہ کے بوجھ سے ہماری حالت دگرگوں تھی ایک مہمان نواز جیب کترے نے ہمارا یہ ناگفتہ بہ حلیہ دیکھا تو بڑے خلوص اور رازداری سے ہاتھ بڑھایا اور ہمیں سوٹ کیس اور منی بیگ سے سبک سار کر دیا اور اس طرح ہم ناگپور کی مہمان نوازی کے قائل ہوگئے۔

میں اتنی بار ناگپور آیا لیکن ہر بار واپسی میں یہی محسوس ہوا کہ ہم دونوں اجنبی ہیں نہ تو ناگپور مجھ پر کھلا نہ میں اس پر۔ ہم میں پراسرار قسم کی دلکشی باقی ہے۔ ناگپور کے دامن میں ابھی بہت سی رنگینیاں بھری ہیں جسے وہ ہر بار چاکلیٹ کی طرح مجھے تھماتا ہے اور مجھ میں بھی بہت سا تجسس باقی ہے۔ ناگپور اور ناگپور کے لوگوں کو سمجھنے کا۔ یہی اجنبیت شاید تجسس اور دلکشی کی بنیاد بھی ہے۔ اکثر واپسی میں ناگپور ہی کے شاعر شاہد کبیر کا یہ شعر میرے ذہن میں گونجتا رہتا ہے ؎

ہمیں نہیں، ہے یہاں تو بھی اجنبی شاہدؔ
بڑا عجیب سا پیارا سے ترا نگر نکلا

مناظر عاشق ہرگانوی

صدر شعبۂ اردو، مارکم کالج، ہزاری باغ (بہار)

"پیکراتِ بے سخن"

رکیک القلب

ڈاکٹر ممتاز احمد، ڈاکٹر یوسف خورشیدی، ڈاکٹر قدوس جاوید، محمد اسرائیل راہی، مناظر عاشق ہرگانوی اور کئی لوگ شعبۂ اردو، پٹنہ کالج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے پڑھے لکھے جاہلوں پر بات آئی تو پروفیسر ممتاز احمد نے کہا "ایک شخص کی پی ایچ ڈی کی تھیسس میں غلطی تھی "رکیک القلب"

انٹرویو (وائیوا) کے وقت جب پوچھا گیا کہ کیا لکھا ہوا ہے تو انہوں نے غلطی کی گرفت نہ کرتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔" رکیک القلب۔"

مشاعرہ، نماز اور شیطان

بہار اردو اکیڈیمی پٹنہ کی طرف سے مشاعرہ تھا۔ اناؤنسر کے فرائض ملک زادہ منظور احمد انجام دے رہے تھے۔ تقریباً پچاس شاعر مدعو تھے۔ شاعروں کی تعداد دیکھتے ہوئے ملک زادہ نے شعراء سے کہا کہ اپنے بہترین اشعار ہی سنائیں تاکہ سامعین بدمزہ ہوں۔ ساتھ ہی بشیر بدر کا نام پکارا۔

بشیر بدر مائک پر آکر بولے "شاید ملک زادہ ہم شاعروں کو ادبی نماز پڑھانا چاہتے ہیں۔" ملک زادہ نے چوٹ کی "نماز کی جہاں بات ہوگی شیطان کا آجانا لازمی ہے۔"

چندے کے پیچھے

مناظر عاشق ہرگانوی، علی منیر، محمود انور (ایڈوکیٹ گیا کورٹ) بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شعر و شاعری کی باتیں ہو رہی تھیں۔ محمود انور نے کہا "میرے پڑوس میں ایک شاعر رہتے ہیں، نام نہیں لوں گا۔ ان کے پاس یتیم خانہ سے کچھ لوگ چندہ مانگنے آئے۔ شاعر صاحب نے دو منٹ رکنے کیلئے کہا اور گھر کے اندر چلے گئے۔ پھر جب وہ لوٹے تو ان کے ساتھ دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ انہوں نے کہا "چندے میں آپ ان دونوں کو لیتے جائیں۔"

رشتہ

اکیڈیمی کے ہی مشاعرے میں جب شہود عالم آفاقی مائک پر تشریف لائے تو سامعین میں سے کسی نے بڑے زور سے پکار کر کہا۔ "چچا شعر سنائیے۔"

شہود عالم نے برہمی سے اس طرف تاکا تو ملک زادہ منظور احمد فوراً بول پڑے "شہود صاحب کو خوش ہونا چاہیئے کہ اس دور میں جب رشتے ٹوٹ بکھر رہے ہیں تو عظیم آباد والے رشتہ استوار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

آندھرا پردیش کے بافندوں کو دست تعاون



وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے بیس نکاتی معاشی پروگرام کے تحت حکومت آندھرا پردیش ہینڈ لوم شعبہ کے لیے ہر قسم کی اعانت کر رہی ہے۔



اہم حقائق

● سال ۷۶-۱۹۷۵ء میں دستی پارچہ بافندوں کی امداد باہمی انجمنوں اور ان کے اراکین کی تعداد علی الترتیب ۱۰۲۴ اور ۲۰۲۵ لاکھ تھی جو سال ۸۱-۱۹۸۰ء میں بڑھ کر ۱۸۳۳ اور ۳.۴۰ لاکھ تک ہوگئی۔

● ادا شدہ سرمایہ ۲۶ء ۱ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۵.۵۹ کروڑ تک پہونچ گیا۔ کاروباری سرمایہ دستیابی کے اعتبار سے ۵.۰ کروڑ سے ۸۶ء ۷ کروڑ روپے ہوگیا۔

● کپڑے کی پیداوار میں ۳۰۰ فیصد یعنی ۳۰ء ۱۱ کروڑ روپے سے ۰۰ء ۳۶ کروڑ روپے کا اضافہ ہوا۔

● جنتا کلاتھ (جو ایک نئے نمونے کا کپڑا ہے) کی پیداوار ۰۰ء ۲۶ کروڑ روپے پہنچ گئی۔

● اپیکس ویورس سوسائٹی کا سرمایہ حصص ۱.۵ لاکھ سے بڑھ کر ۴۰ لاکھ روپے اور کاروباری سرمایہ ۹۵ء ۱ کروڑ روپے سے ۵۰ء ۳ کروڑ روپے ہوگیا ہے۔

حکومت کی فروخت، ۷۶-۱۹۷۵ء میں صرف ۷۵ء ۵ کروڑ روپے تھی اور ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۰۰ء ۳۰ کروڑ روپے کی سطح تک پہنچ گئی۔

● کپڑا فروخت کرنے کے ۱۱۹ نئے مراکز، تین ہینڈ لوم ہاؤس، دو کپڑا برآمد کرنے کے مراکز قائم کیے گئے ہیں جس سے کپڑے کی دوکانوں کی تعداد ۳۷۴ ہوگئی۔ بیشتر مراکز سرکاری اعانت سے قائم کیے گئے۔

● پارچہ کی تیاری سے ماقبل اور مابعد کی انفراسٹرکچرل سہولتیں بھی فراہم کی گئی ہیں۔ ۲۱ لاکھ روپے کی لاگت سے جدید طرز کی رنگریزی [illegible] قائم کی گئی ہیں۔ [illegible] ہزار میٹر سوتی کپڑا اور تقریباً ۲۰ ہزار میٹر [illegible] کا مخلوط قسم کا کپڑا یا کتانیہ تیار کیا ہوا کپڑا صاف کرنے کے لیے ریاستی حکومت نے ۳۴۵ لاکھ روپے کے سرمایہ سے کپڑا صاف کرنے کی یونٹیں قائم کی ہیں، یہ مرسیرائزنگ یونٹوں ۱۶ اسکرین چھپائی کی یونٹوں اور رنگ کپڑے کی صفائی کی چھوٹی یونٹوں کے

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ ۔ حکومت آندھرا پردیش

قیام کے لیے نیا پروگرام تیار کیا گیا ہے۔ سرکاری شعبہ میں ریاستی ہنیڈلوم صنعت کے تحت کام کرنے والے کوآپریٹیو بافندوں کی جانب سے ۷۵ لاکھ مالیت کے تیار ملبوسات اور کپڑا بیرونی ملکوں کو برآمد کیا گیا۔ ● کوآپریٹیو اسپننگ ملوں کی جانب سے دھاگے کی پیداوار کو ۲۵ ہزار کلو سے ۴۵ ہزار کلو تک سالانہ بڑھا دیا گیا ہے۔ دھاگے کی پیداوار میں دوگنا اضافہ کرنے کے لیے مزید چھ کوآپریٹیو اسپننگ ملوں کے قیام کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ ریاست میں ستیہ ویڈو ضلع چتور میں کوآپریٹیو شعبہ کے تحت کیمیائی دھاگا تیار کرنے کی یونٹ قائم کی جا رہی ہے جو اپنی نوعیت کی پہلی یونٹ ہے ● ۱۰۲۸۰۰ لاکھ روپے کی سرکاری امداد سے لوموں کو جدید طرز پر لانے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ جس کا مقصد پیداوار میں تنوع پیدا کرنا اور بافندوں کو صنعت بخش معاوضہ فراہم کرنے کی ضمانت حاصل کرنا ہے۔ ● گزشتہ ۵ یا ۶ سال کے اندر حکومت کی طرف سے اس صنعت کو دی جانے والی امداد میں ۱۲ گنا اضافہ ہوا۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں ایک کروڑ روپیے سے بھی کم امداد دی جاتی تھی۔ لیکن ۸۱-۱۹۸۰ء کے دوران ہینڈلوم صنعت کو فروغ دینے کے لیے ۱۲ کروڑ روپیے سے زیادہ رقم مختص کی گئی ہے۔

اس طرح آندھرا پردیش کی ہینڈلوم صنعت میں کام کرنے والے حکومت کی جانب سے زیادہ سے زیادہ امداد حاصل کر رہے ہیں اور اپنے حالات کو بہتر بنا رہے ہیں۔

21-P.R.-(20) 174 20/81

ملّا نصیر الدین کے لطیفے

○ گرمیوں کے موسم میں ملّا ایک دن تربوز کے کھیت میں کنارے سے لگے ایک اخروٹ کے درخت کے نیچے تھک کر لیٹے ہوئے تھے۔ لیٹے لیٹے سوچنے لگے کہ اللہ کی حکمت میں تو کسی کو کیا دخل مگر ایک بات عقل میں نہیں آتی۔ اخروٹ کا درخت اتنا بڑا اس کی شاخیں مضبوط مگر اس کا پھل اتنا چھوٹا۔ ادھر تربوز کو دیکھو نازک سی بیل اس کے اتنے بڑے بڑے پھل۔ اگر تربوز درخت کو لگتے اور اخروٹ بیل سے تو زیادہ مناسب نہ ہوتا۔ یہی سوچتے تھے کہ اوپر سے ایک اخروٹ ہوا سے ٹوٹ کر اس کے سر پر گرا۔ فوراً چونک اٹھے اور کہا کہ اے اللہ توبہ قبول کر تو سب مصلحت جانتا ہے۔ تیری حکمت میں کبھی دخل نہ دوں گا۔

اگر اس وقت میرے سر پر اخروٹ کی بجائے تربوز کی جسامت کا پھل گرتا تو میرا کیا حشر ہوتا۔

○ ملا ایک کنجوس آدمی کے قرضدار تھے۔ ایک دن وہ آکر مصر ہو گیا کہ اب پیسے لیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ وعدوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ ملا کو ترکیب سوجھی۔ اس کو بٹھا کر سمجھانے لگے کہ دیکھو لڑکا جنگل میں لکڑیاں جمع کرنے گیا ہے اب آنے ہی والا ہوگا۔ جیسے ہی آئے گا ان لکڑیوں کو راستہ میں جگہ جگہ گاڑ دوں گا۔ آنے جانے والی بھیڑیں دنبے جب ادھر سے گزریں گے تو ان کی اُون انمیں پھنس جائے گی۔ میری بیوی ان کو جمع کر کے ان کو بانٹ دے گی اور اس اُون سے قالین بنائے گی۔ میں اس قالین کو بیچ کر فوراً تمہارا قرض ادا کر دوں گا۔

وہ قالین کا نام سن کر ہنسنے لگا تو ملّا نے فوراً کہا نقد پیسے کا نام سن کر کیسے ہنس رہے ہو؟

○ محلہ میں ایک لڑکی کی شادی ہوئی تو اس کے ہاں تین ماہ بعد ہی بچہ ہو گیا۔ اس کے رشتہ دار ملا کے پاس آئے کہ لڑکے کا نام تجویز کرو۔ ملّا نے سوچ کر کہا کہ اس کا نام "ایکسپریس" رکھا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ کیسا نام تو انھوں نے کہا کہ جو بچہ ۹ ماہ کا راستہ ۳ ماہ میں طے کرے وہ ایکسپریس نہیں تو اور کیا ہوگا؟

دوسری عالمی تلگو کانفرنس

۱۴/اپریل ——— تا ——— ۱۸/اپریل ۱۹۸۱ء

کوالالمپور ملائیشیا



شریمتی اندرا گاندھی

• ۱۴/اپریل کا دن تلگو عوام کی تاریخ میں سنہرے الفاظ سے لکھا جائیگا. جو ہر تلگو فرد کے لیے باعث فخر ہے۔

• تلگو تہذیب کی عظمت اور اس کی روایات آج بھی درخشاں ہیں جو تلگو کی شان اور برتری کو دنیا کے دور دراز گوشہ تک اس کی عظمت کو پھیلاتے ہوئے تلگو زبان کی شان کو دوبالا کر رہے ہیں۔

• تلگو عوام نے اپنی شجاعت اور حوصلہ کے لیے مشہور ہیں ماضی میں سمندروں کو عبور کرتے ہوئے تلگو ذہانت اور دانش مندی کا دور دراز مقامات تک یہ چار اور تلگو کی شہرت کو عام کیا۔ تلگو عوام ان کارناموں کو فخر کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔

• پہلی عالمی تلگو کانفرنس انتہائی کامیابی کے ساتھ حیدرآباد میں ۱۹۷۵ء میں منعقد ہوئی تھی جس نے ستواہنا اور کاکتیہ دور کی شان اور عظمت کو تازہ کر دیا تھا۔

• یہ بات ہر تلگو شہری کے لیے مسرت کا باعث ہے کہ دوسری عالمی تلگو کانفرنس ایک بیرونی ملک میں تلگو تہذیب کی شان اور عظمت کے احیاء کے نیک مقصد کے ساتھ منعقد ہو رہی ہے اور پہلی عالمی تلگو کانفرنس کے جوش و خروش کو سمیٹ رہی ہے۔



شری ٹی انجیا وزیر اعلیٰ آندھرا پردیش

• یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس کانفرنس کے لیے ہماری محبوب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی نیک تمنائیں اور آشیرواد حاصل ہے جو ہماری ریاست سے لوک سبھا کے لیے منتخب ہوئی ہیں۔

کانفرنس میں شری ایم جی۔ رامچندرن چیف منسٹر ٹامل ناڈو اور شری ڈی راماچندرن چیف منسٹر پانڈیچری کی شرکت ہندوستانیوں کے مابین برادرانہ تعلقات اور قومی یک جہتی کی مظہر ہے۔

• تلگو عوام کارگزار وزیر اعظم ملائیشیا ڈاکٹر داتو سری مہاتیر محمد کی کانفرنس

تلگو برادری زندہ باد ——— تلگو تہذیب پائندہ باد

جاری کردہ (محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش



وزیر اعظم ملایشیا ڈاکٹر داتو سری مہاتیر محمد

گہری دلچسپی اور اس میں انکی شرکت کیلئے شکر گزار ہیں ان کا یہ اقدام عالمی برادری کے نظریہ کا ایک مثالی ثبوت ہے۔

● دوسری عالمی تلگو کانفرنس جو کوالالمپور میں منعقد ہوئی ہے یقین ہے کہ وہ ہر مقام پر موجود تلگو عوام کو قریب لانے اور ان کے باہمی رشتوں کو مضبوط کرنے میں ممد معاون ثابت ہوگی۔



شری ... سری رام مورتی وزیر تہذیبی امور آندھرا

نشتر

عمر حنیف

○ اندرا کانگریس باغیانہ سرگرمیوں کو برداشت نہیں کرے گی۔
پارٹی ہائی کمان کی کڑی وارننگ ——— صرف باغیوں کو برداشت کر سکتی ہے۔

ooo

○ "نیوٹران بم سے کانکریٹ کے مکانوں میں رہنے والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا ——— غریبی دور کرنے کا ایک اور نیا نسخہ ہاتھ آ گیا۔

ooo

○ "پارلیمنٹ میں ہنگامہ، ہاتھا پائی اور مکہ بازی شروع ——— جن پہلوانوں کو ان فری اسٹائل کشتیوں میں حصہ لینا ہو وہ جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش کریں!

ooo

○ کسان ریالی ایک سرکاری تماشے کے علاوہ کچھ نہیں تھی ——— ایسے تماشے منورنجن کے لیے بہت ضروری ہیں۔ یہ کیوں آپ بھول رہے ہیں۔

ooo

○ محبت میں ناکام ہونے پر محبوب نے خودکشی کرلی ——— بے چارے کو محبوبہ نے محبت کے صحیح معنی ہی نہیں بتائے ہوں گے!

ooo

○ "موجودہ سرکار دو چار مہینے اور چل جائے تو بہت ہے" شری مرارجی دیسائی ——— جی ہاں اس کے آگے کا سبق انہیں کچھ یاد نہیں۔

ooo

○ "خانہ دار عورتوں کو نجی کاروبار کے لیے قرض دیا جائے گا" ——— تاکہ جو مرد بچے ہیں وہ بھی چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ جائیں۔

ooo

خرافات

(مراسلے)

■ مکرمی !

شگوفہ' بابت فروری ۸۱ء کے صفحہ ۳۹ پر شائع شدہ ایک جملہ میں لفظ "واپڈا" استعمال ہوا ہے۔ 'واپڈا' آپ کی نگاہ میں ایک پنجابی ڈش ہے۔ شگوفہ مزاحیہ ادب پیش کرتا ہے مگر اس کی ہر بات کو مزاح پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا میں یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ اس لفظ کے معنی بتانے میں آپ سے چوک ہوئی ہے۔ واپڈا' پاکستان کے "واٹر اینڈ پاور ڈیولپمنٹ اتھارٹی" کا مخفف ہے۔ پنجابی ڈش نہیں۔

پرکاش فکری، رانچی

⁂ ⁂ ⁂

■ "شگوفہ" پابندی سے مل رہا ہے۔ آپ کا کرم ہے۔ 'کنھیا لال کپور نمبر' کی رسید بھیج چکا ہوں۔ اتنا بھرپور نمبر ہے کہ آپ کو ہر حلقے سے داد ملی ہوگی۔ مجھے حیرت ہے کہ "شگوفہ" اتنی پابندی سے آپ کیسے نکال لیتے ہیں۔ پھر وقتاً فوقتاً آپ ضخیم و عظیم نمبر بھی نکال دیتے ہیں۔ یہ گُر مجھے بھی بتائیے نا !

مناظر عاشق ہرگانوی ہزاری باغ (بہار)

⁂ ⁂ ⁂

■ شگوفہ کا مارچ ۸۱ء کا شمارہ پڑھنے کو ملا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ صاف ستھرا طنز و مزاح سے بھرپور پرچہ ہے۔

نعیم زاہد، بیدر

■ مارچ کا شگوفہ نظر نواز ہوا۔ آپ اسے واقعی اپنے "خونِ جگر" سے سینچ رہے ہیں۔ وجاہت علی سندیلوی کا مضمون "چھپے اوہنم" مزہ دے گیا۔ میری طرف سے انھیں مبارکباد۔ کرنل محمد خان کا سلسلہ بھی خوب ہے۔

ظفر کمالی پٹنہ سٹی

⁂ ⁂ ⁂

■ "شگوفہ" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس میں شمیم زیدی مرتبہ بعنوان "شگوفے" بہت خوب تھے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ "شگوفے" کو مستقل کر دیں ؟

اقبال فرید، میسور

⁂ ⁂ ⁂

■ شگوفہ کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ ! گھر میں اس کے دو ردِ عمل ہوئے۔ ایک یہ کہ تین دن تک قہقہوں کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہیں اور ہم بہت سے جھگڑوں سے چھوٹے رہے۔ چوتھے دن ایک جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ یعنی چوتھے دن ہمارا مضمون پوسٹ مین پڑھ گیا اور ہم نے صاف انکار کر دیا کہ یہ کوئی اور صفدر ہوگا۔ ہمارا پرسنل ایڈریس 'امراوتی' نہیں 'ورود' ہے (اس غلط فہمی کے جملہ حقوق بحق اہلیہ محفوظ ہیں لہٰذا کوئی اور قاری اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں)

صفدر، ورود (امراوتی)

⁂ ⁂ ⁂

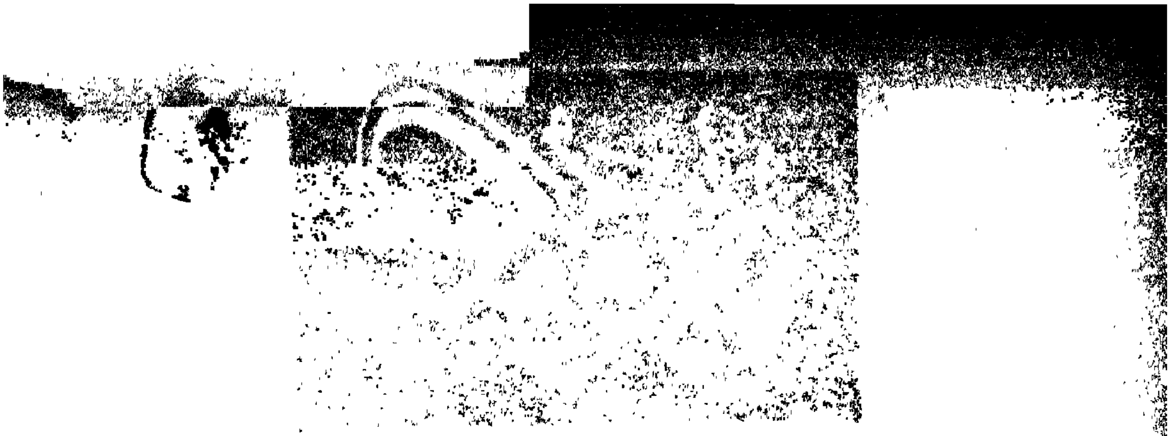
■ اپریل ۸۱ء کا شگوفہ نظروں سے گذرا۔ تمام مضامین اور غزلیں ہر ایک جداگانہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں جناب ڈاکٹر ناظم مرزائی صاحب مرحوم کی زندگی اور عالم فنا سے عالم بقا کو وداع کرنے کے سماں کو جناب امجد باغی نے بہت حسن و خوبی سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔

ایم۔ اے۔ احمد، انوار العلوم ایوننگ کالج حیدرآباد

شگوفہ



JUNE 1981 **Rs. 2-50**



ماہ نامہ

شگوفہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۱۴ شمارہ ۶

جون ۱۹۸۱ء

سالانہ (۲۵) روپے
بیرونِ ہند سے (۴۵) شلنگ
فی پرچہ (۲) روپے (۵۰) پیسے

طباعت:
اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس پرانی حویلی حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ: - شگوفہ، ۳۱۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: 57716

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

مالِ مفت (انشائیے)

رپورٹ ۱۴واں کل ہند مزاحیہ مشاعرہ





پیدائشی پناہ کے سائے میں ۔

کرنل محمد خان

جھولتا لندن

ٹھنگنے آدمی کیلئے مصروفیت کیوں ضروری ہے؟

ٹروبرج سے لندن کا سفر مختصر اور بے رنگ سا تھا سوائے اُس رنگ کے جو ہمارے پرانے یار، ٹروبرج کے ٹھنگنے اسٹیشن ماسٹر نے بھرنے کی کوشش کی اور اسے ذرا پیازی کر دیا۔ اسٹیشن کے گیٹ سے داخل ہوئے تو سامنے سے آ رہے تھے اور پچھلی دفعہ سے زیادہ پھدکتے اور پیارے لگ رہے تھے۔ ہم نے تو انہیں پہچاننا ہی تھا کہ لاکھوں اسٹیشن ماسٹروں میں ایک تھے۔ حیرت ہوئی کہ وہ بھی ہمیں پہچان گئے۔ شائد اس لیئے کہ ہم بھی اُن کے دو چار مسافر فی ہفتہ میں سے ایک تھے۔ بڑی خندہ پیشانی سے چند قدم آگے بڑھ کر ملے لیکن جب پُوچھا:

"مزاج شریف؟" تو چھوٹتے ہی پھوٹ پڑے اور بولے:

"AWFUL"

اور ویسا ہی منہ بھی بنایا۔ برہمی کی وجہ پوچھی تو کسی محکمانہ زیادتی کے خلاف جو یقیناً طور پر اسی صبح واقع ہوئی تھی، بڑبڑانے لگے۔ ایک دفعہ تو خیال آیا کہ انہیں ذرا اپرچائیں لیکن پھر سوچا کہ ٹھنگنے آدمی کو معمولی سی پریشانی لگی رہے تو ایسا ضرر بھی نہیں۔ اس طرح مصروف سا رہتا ہے۔ اگر بالکل فارغ ہو تو دن بھر یہی سوچ سوچ کر نڈھال ہوتا رہے کہ ٹھنگنا ہوں۔

کیا ہیون سانگ اور ابن بطوطہ ٹھگو تھے

شام لندن پہنچے اور اپنے پرانے ہوٹل میں اُترے تو یوں محسوس ہوا جیسے گھر آ گئے ہوں۔ دروازے کے اندر قدم رکھا تو پورٹر ٹامس نے ہاتھ ملایا۔ استقبالیہ کلرک جولی نے آنکھیں ملائیں اور منیجر بل حسب معمول گلے ملے۔ جولی نے بے صبری سے نوید دی کہ ہمارا پانچویں منزل کا پسندیدہ کمرہ جو ایک مدت تک ہنی مونروں کا تختۂ مشق رہا تھا، اب رُدبکون تھا یعنی آج صبح ہی خالی ہوا تھا

اور ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ کمرے میں گئے اور جنوبی کھڑکی کھولی تو یکبارگی ہائڈ پارک کے وسیع سبزہ زار سے پردہ اٹھ گیا۔ اس کے مخمور جھومتے درختوں، مغرور جھولتے پھولوں، مشکور چومتے جوڑوں اور مسرور گھومتے بچوں کو دیکھنا تھا کہ ہمارے دیدہ و دل کی گرہ کھل گئی۔ پھر ایک مدت تک شاور (SHOWER) کے نیچے دم بخود کھڑے رہے تو ہمارے جسم و جاں کی کدورت دھل گئی۔ پھر شلوار اور کرتا پہن کر آرام کرسی کی گود میں بیٹھے ہی تھے کہ ہوٹل کی کوئی دلآرام چائے لے آئی جسے جرعہ جرعہ پینے لگے اور پینے لگے۔ اور جب خاطر مکمل طور پر جمع ہو چکی تو لندن میں رہنے والے دوستوں کی فہرست بنانا شروع کی اور وہ اس نیت سے کہ قیام لندن کے دوران اس جنس نایاب سے ایک دوست روزآنہ کے حساب سے لطفِ رفاقت اٹھایا جائے۔ ساتھی کے بغیر سیاحت ایسی ہی پھیکی ہے جیسے شریک زندگی کے بغیر زندگی۔ تنہا سفر کرتے ہوئے ایک قسم کی بیوگی کا احساس ہوتا ہے ـــــ خدا جانے ہیون سانگ اور ابنِ بطوطہ کا کیا گزارا تھا؟ غالبؔ، سیاح تو وہ اچھے تھے مگر آدمی گھگو ہی تھے ـــــ یہ درست ہے کہ اب تک کے سفر میں ہمیں ہر جگہ غیب سے مسیحا و خضر ملتے رہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا ان دونوں بزرگوں کی ملاقات سے بہتر ہے۔ چنانچہ ہم نے یہ شام کرنل علی نوابؔ کے ساتھ گذارنے کا فیصلہ کیا۔ کرنل علی نواب کو فون کیا تو بولے،

اگر لندن میں ہو تو تنہا بیٹھے کیوں وقت ضائع کر رہے ہو؟ فی الفور آؤ۔ اگر کھانے سے پہلے پہنچ سکو تو پلاؤ یقینی ہے، کوفتے اور پراٹھے اغلب ہیں اور سیخ کباب ممکنات میں سے ہیں۔"

جنّت اور جہنّم خانہ ساز چیزیں ہیں

بے شک کرنل علی نواب سے فقط مل لینا بھی بڑی خوشگوار تقریب تھی لیکن جس چیز نے شوقِ ملاقات کو سان پر چڑھا دیا، اس میں ان خانہ ساز کوفتوں اور پراٹھوں کی پُر اسرار کشش کا شائبہ بھی تھا۔ چنانچہ کرنل صاحب کا ہدایت نامۂ سفر لے کر جو انہوں نے فون پر لکھوایا تھا، ان کے گھر واقع ہینگر لین کا رُخ کیا اور اس ہدایت نامے پر چلتے، گاڑیاں بدلتے، قدم گنتے اور سڑکیں عبور کرتے کوئی پون گھنٹے میں ایک گھر کے دروازے کی گھنٹی پر جا انگلی رکھی۔ لاریب یہ کرنل صاحب ہی کا گھر تھا کہ جواب میں خود کرنل صاحب باہر نکلے۔

ہر گھر کا ایک ماحول ہوتا ہے جو سلیقے اور پھوہڑپن یا یوں کہیں کہ جنّت اور جہنّم کی مختلف مقداروں سے ترکیب پاتا ہے۔ مبارک ہیں وہ گھر جن میں جنّت کا عنصر غالب ہوتا ہے لیکن خرابی یہ ہے کہ ایسے مبارک گھر ہوتے کم کم ہی ہیں۔ اکثر گھر کیمیائی تجزیے پر جہنّم کے جراثیم کا بڑا مثبت ری ایکشن دیتے ہیں۔ ایسے گھروں میں مہمان کے آنے پر کچھ اس قسم کی افراتفری مچ جاتی ہے جیسے ہوائی حملہ ہو گیا ہو ـــ (جہنّم + +) اور کئی گھروں میں مہمان کی آمد پر بے حسی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ مہمان خواہ گھنٹہ بھر بیٹھا یا کھڑا رہے، گھر والے یہی سمجھتے ہیں جیسے مہمان نہیں، کوئی راہرو گذر جائے گا :- (جہنّم + +)۔ کئی گھروں میں میزبان کے تکلف سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ پچ پچ کچن سے جُوئے شیر کھود کر ڈرائنگ روم میں لائی جا رہی ہے اور اسی رستے کھانے کے کمرے تک لے جائی جائے

گی :۔ (جہنم + + +) اور کئی میزبان ہزار تواضع اور نیک نیتی کے باوجود جب بھی قدم رکھتے ہیں، پاؤں مہمان کے پاؤں ہی پر پڑتا ہے :۔ (جہنم + + + + +)۔ آخر میں خالص، فائیو اسٹار جہنم وہ گھر ہوتا ہے جہاں میزبان جوڑے کی خانہ جنگی میں مہمان بھی ثالث بالخیر بنتے بنتے منفی دو چار دانت گھر لوٹتا ہے۔ اس کے برعکس بہشتی گھروں کا ماحول خاصا مختلف ہوتا ہے۔ مہمان آجائے تو یوں سماتا ہے جیسے پھولوں کی ٹوکری میں ایک اور پھول رکھ دیا جائے۔ باہر آندھی ہو یا برسات، درون خانہ سدا بہار کا موسم رہتا ہے شگفتہ، شاداب اور شہوار ـــــ رہی تواضع تو وہ بے حساب اور بے پایاں مگر تکلف کا بھاری اور بھدا لحاف اوڑھے بغیر لہٰذا سبک سہل اور سلیس ـــــ کرنل علی نواب کے گھر کا ماحول کچھ ایسا ہی بلکہ ذرا زیادہ صحت مند تھا، شائد اس لئے کہ گھر میں ڈاکٹر کا وجود بھی تھا یعنی بیگم علی نواب کا۔ اور میاں بیوی مل کر کیا خوش مزاج، خوش اوقات اور خوش ادا میزبان تھے ! ڈرائنگ روم میں بیٹھے اور باتیں چلیں تو اس قدر دل نشیں کہ معلوم ہوا یہ باتیں ہی حاصل ملاقات ہیں۔ کھانے کے کمرے میں گئے اور کھانا چلا تو محسوس ہوا یہ کھانا ہی اس شام کا معنیٔ دیر یاب ہے۔ بالآخر اس بے عیب تقریب میں ایک ستم نکلا تو وہ صاحب خانہ کی میزبانی میں نہ تھا بلکہ ہماری اپنی مہمانی میں۔ یعنی دسترخوان پر جملہ یقینی، اغلب اور ممکن نعمتوں کو موجود پاکر ہمارے ہاتھ سے اعتدال کا دامن چھوٹ گیا۔ کھانے کے باب میں تو ہم وطن میں بھی ایسے پرہیز گار نہ تھے۔ لہٰذا لندن جیسی بد خوراک جگہ میں حسن اتفاق سے گھر کا شیرازن میسّر ہو تو بخدا پرہیز حرام ہو جاتا ہے۔ مارک ٹوین کا کہنا ہے کہ زندگی کی کامیابی کا آدھا راز اس بات میں ہے کہ جو چاہو کھاؤ اور ہاضمے کے لئے خدا پر بھروسہ رکھو۔ میاں محمد صاحب کا ارشاد بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔

مالی دا کم پانی دینا بھر بھر مشکاں پاوے
خالق دا کم میوہ لاؤنا، لاوے یا نہ لاوے

چنانچہ ہمارا کام پلیٹیں بھر بھر کھانا تھا اور کھاتے رہے۔ آخری لقمے کے بعد ہاضمے کے میوے کے لئے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور کھڑکی سے جھانک کر خالق سے خاموش التجا کردی ـــــ لیکن رخصت کا وقت آیا تو شکم نے بجال جنبش دینے سے انکار کردیا۔ ہمیں جامد دیکھ کر محترم میزبان فرمانے لگے۔

"ہمارا دستور ہے کہ اپنے مہمانوں کو ٹرین سے آنے کی زحمت تو دیتے ہیں لیکن واپسی پر انہیں اپنی کار میں گھر چھوڑنے جاتے ہیں"

ہماری دعا کے جواب میں پہلا میوہ لگ چکا تھا۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور کار میں بیٹھ گئے۔ ورنہ شکم بھر کوفتے اور پراٹھے کھانے کے بعد اس شام گاڑیاں بدلنا اور سڑکیں عبور کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی ـــ نیم شب کے قریب جب ہوٹل کے دروازے پر اتر کر کرنل اور بیگم علی نواب کو شب بخیر کہا تو اس شب کے بیشتر لمحے زندگی کی خوشگوار اور پائیدار یادوں میں دھل چکے تھے۔

ٹ : اب بریگیڈیئر علی نواب۔ اُن دنوں لندن میں پاکستان آرمی کی طرف سے ٹیکنیکل لی ایزان آفیسر یعنی PATLO تھے۔

لندن میں آوارہ گردی آکسفورڈ اسٹریٹ سے شروع ہوتی ہے

دوستوں کی فہرست پر اگلا نام نیاز مجید کا تھا۔ انہیں فون کیا اور معلوم ہوا کہ وہ چند دوستوں کے ساتھ پہلے ہی پروگرام بنا چکے ہیں ہمیں بھی شامل ہونے کی دعوت دی جو ہم نے قبول کرلی۔ پروگرام یہ تھا کہ پہلے لندن کی آوارہ گردی کی جائے اور پھر اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھایا جائے۔ لندن میں آوارہ گردی کی ابتدا ء آکسفورڈ اسٹریٹ ہی سے شروع ہوتی ہے ـــــ قارئین میں سے جنھوں نے آکسفورڈ اسٹریٹ نہیں دیکھی وہ انارکلی کی لمبائی کو دو، چوڑائی کو تین اور اونچائی کو چار سے ضرب دے لیں تو اس کے جسم کا اندازہ ہو سکے گا اور انارکلی کے جملہ سیلز مینوں کو نکال کر اُن کی جگہ مرلقاؤ کا فرادا دوشیزائیں بھرتی کرلیں تو اس کی جان کا اندازہ ہوجائے گا آکسفورڈ اسٹریٹ کے ہجوم کے لئے آپ کو دو تین انارکلیوں کے گاہک یک جا کرنا پڑیں گے۔ رہی اس ہجوم کی ترکیبِ نسلی تو [illegible] قریب گورے، ایک چوتھائی کالے یعنی پاکستانی اور بھارتی اور ایک چوتھائی کالے بھجنگ یعنی غرب الہند کے حبشی۔ دس سال پہلے لندن کے بازاروں میں ایک پاکستانی کے بعد دوسرا ایک مدت کے بعد ملتا تھا اور اپنے ہموطن کو دیکھ کر گلے لگانے کو جی چاہتا تھا۔ گزشتہ دس سالوں میں ہمارے میرپوریوں نے اپنے استنے فرزند برطانیہ کو برآمد کئے ہیں کہ اگر آکسفورڈ اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے ہر ہم وطن سے گلے ملنے لگیں تو آخری ہم وطن کی ملاقات کے بعد نئے گلے کا آرڈر دینا پڑے۔ اور اگر حبشیوں کے ساتھ بھی اسی اخوت کا مظاہرہ کریں ـــ یعنی اُن سرکش سینوں والی حبشنوں کو بادل نخواستہ حذف بھی کردیں ـــــ تو معانقے کے لیے ایک گنجان اور تاریک کیمو لگ جائے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نیا گلا ہی نہیں، چیتے کا جگر بھی چاہیئے اور شاہیں کا تجسس بھی۔ چنانچہ ہم ازراہِ مجبوری، جذبۂ اخوت کو سینے میں دبائے آکسفورڈ اسٹریٹ سے گذرنے لگے۔ اگر بندہ بشر ہے تو اس بازار کی دکانوں کے پاس سے گذرتے ہوئے ونڈو شاپنگ سے مفر نہیں اور ہم مشرق کے مسکینوں کا دل تو ہر اُس چمکیلی چیز میں جا اٹکتا تھا جو انگریزوں نے بنا سنوار کر ہماری راہ میں رکھ دی یا رواں کر دی تھی۔ باوا آدم باغ عدن میں دانۂ گندم دیکھ کر ہم سے زیادہ نہ للچائے ہوں گے۔ بہرحال ہم اپنے باوا جی سے زیادہ ثابت قدم نکلے۔ یعنی ہر چیز کو دیکھ کر منہ میں پانی بے شک بھر آیا۔ لیکن کسی چیز کو دو باہوں میں سمیٹ کر بغل میں لینے کی کوشش نہ کی۔ فقط دل ہی دل میں فہرستِ خواہشات بناتے گزر گئے اور انہیں پورا کرنے کی حسرت پر کم از کم عارضی قابو پالیا۔

عشاقِ لندن کا قبلہ

ہماری اگلی منزل پکاڈلی سرکس تھا۔ پکاڈلی سرکس کے جواب میں لاہور اور کراچی کے پاس کچھ نہیں۔ اور یہاں سرکس سے مراد محض گول سڑک یا چوک ہے۔ وہاں کوئی ہاتھی، چیتا، مسخرہ یا قلاباز نظر نہیں آتا۔ لیکن پکاڈلی سرکس دوسرے معنوں میں بھی

مسخروں اور قلابازوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ ایک تو یہ چوک عشاقِ لندن کا قبلہ ہے، لندن کے اکثر چاہنے والوں کی شدید ملاقاتوں کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ ہر شام محبوب یا محبوبہ، جو بھی زیادہ بے تاب ہو، اپنے شریکِ محبت کے انتظار میں مقررہ دکان کے سامنے آ کھڑا ہوتا یا ہوتی ہے۔ اس مبارک کام کے لئے پکاڈلی ہی کیوں منتخب کی جاتی ہے، ہم نامحرمانِ راز کے لئے کچھ کہنا مشکل ہے۔ قیاسِ غالب یہ ہے کہ طرفین محبت آتی رات کی کامیابی کے لئے اس دیوتا کے محبت سے بالمشافہ آشیرباد لینا چاہتے ہیں جو سرکس کے عین مرکز میں پر پھیلائے کمان تانے کھڑا ہے۔ اور جس کا تیر ہر جوڑا اپنے دھڑکتے دلوں میں ترازو پاتا ہے لیکن اس روز کہ فورسٹ موسم اپنے عروج پر تھا، یورپ بھر کے ہپی لڑکے اور لڑکیاں پکاڈلی کی سڑکوں، سیڑھیوں اور سیٹوں پر کلبل کلبل کر رہے تھے اور وائے حسرتا کہ اس گندی گھناؤنی مخلوق کی یلغار کے آگے لندن کے نازک طبع عشاق اپنا دیرینہ آستان چھوڑ کر چل دیئے تھے۔ خدا جانے ہمارے یار محمد خالد اختر نے ان ہپیوں کو کس حال میں دیکھا ہے کہ ان کے گن گائے جاتے ہیں فرماتے ہیں۔

"یہ بظاہر، بھونڈی نسل ایک انقلابِ عظیم کی علمبردار ہے۔ یہ نسل غرب و شرق، شمال و جنوب کے خطے کے ہر انسان کو ایک رشتے میں پرو دے گی۔ دروغ بافی و ریاکاری، قوم پرستی و پلاد شاہی، آدمی اور آدمی میں منافرت پر تعمیر کردہ یہ زنداں کہ جس میں ہم تم رہتے ہیں، ڈھے جائے گا۔ دیکھو، خضر کی پیشگوئی پوری ہو کے رہے گی [2]۔"

منافرت کا زنداں ڈھانے کی ترکیب

میرے پیارے پیش گو، خالد اختر، عرف خضر۔ اللہ کرے، ایسا ہی ہو لیکن ایسا ہونے تک آپ ایک زحمت تو کریں۔ کبھی اصلی ہپی اور ہپن کے ایک جوڑے سے ایک گز کے فاصلے پر کھڑے ہو کر صرف ایک لمحے کے لئے اُن کی پیرہن کی رنگینی کا تماشا تو کریں۔ اُن کے جسم کی خوشبو تو سونگھیں اور ان کے دماغ کی روشنی سے کسبِ نور تو کریں۔ اس کے بعد اگر آپ (اگلے ہی) لمحے جھاگ کھڑے نہ ہوئے اور بحرِ ظلمات میں گھوڑے نہ ڈال دیئے تو آپ سچے اور ہم جھوٹے۔ اور ہم آپ تو خیر کچے انقلابی ہیں، میرا خیال نہیں کہ خود چے گویرا بھی اس پارچاتی زینت، جسمانی طہارت اور ذہنی لطافت کے سامنے ٹھہر سکتا۔ وہ آپ سے بھی تیز بھاگتا ——— سو براہِ کرم ہپیوں اور ہپنوں کو مشورہ دیں کہ اگر ہو سکے تو اپنی بنیانیں دھو کر اور مہینے میں ایک آدھ مرتبہ نہا کر انقلابِ عظیم برپا کرنے کی کوشش کریں۔ پھر ہم بڑی خوشی سے ان کے ساتھ ایک ہی رشتے میں پروئے جانے کو تیار ہیں۔ لیکن یار خالد، پرو کے ...

۱۔ پکاڈلی چوک کے وسط میں EROS یا CUPID کا مجسمہ نصب ہے۔
۲۔ عودِ پاک کے زیرِ عنوان خط۔ رسالہ فنون۔ اپریل مئی ۱۹۷۲ء
۳۔ کیوبا کا مشہور انقلابی جو بولیویا میں بغاوت کی قیادت کرتا ہوا مارا گیا۔

کو ہدایت کیوں کر لڑی میں ہمیں اور آپ کو ساتھ ساتھ پرو دیا جائے یا زیادہ سے زیادہ درمیان میں ایک صاف ستھری، تنگ لباس اور امور خانہ داری کی ماہر ہیتی پرو دیں اور بس۔ سینڈوچ وہی اچھی جس میں خالص شہد کی دبیز اور لذیذ تہہ ہو — پھر لاریب یہ باہمی منافرت پر تعمیر کردہ زنداں ڈھے جائے گا۔

وِنڈمِل کب اور کیوں مری ؟

ہمیں اچانک یاد آیا کہ پکاڈلی کی دلکشیوں میں سے ایک وِنڈمِل نائٹ کلب بھی تھی جہاں ہمیں دس سال پہلے اس قدر غیر مستور حُسن دکھایا گیا تھا کہ اگر ٹکٹ کی گرانی کا غم دیرپا نہ ہوتا تو حُسنِ بتاں سے سیر ہو کر بعد کی تمام عمر یادِ خدا میں بسر کر سکتے تھے۔ بہرحال اب قریب سے گذرے تو ایک پرانی یاد تازہ کرنے کے لئے نیاز سے التجا کی کہ چلو ایک لمحے کے لئے وِنڈمِل کے اندر جھانک تو لیں۔ نیاز نے ہمیں استفہامیہ نظروں سے دیکھا تو ہم نے کہا

"بدگمانی مت کیجو۔ ہماری نیت نیک ہے، فقط یہ کہ کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو۔"

نیاز بولے، "جناب راہی صاحب۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی منزل کا اب نشان باقی نہیں کیونکہ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔"

"یعنی وِنڈمِل بند ہو چکی؟" ہم نے کسی قدر حیرت سے پوچھا

بولے: "انا للہ . . . ."

"یہ ظلم کب اور کیسے ہوا؟" ہمارے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ اس لئے کہ دنیا میں ہر در بند ہو سکتا تھا لیکن وِنڈمِل کا بند ہونا ممکن نہ تھا کیونکہ دوسری جنگ کے دوران برستے بموں کے نیچے بھی وِنڈمِل نے اپنے دروازے اپنی حسیناؤں کے گریبانوں کی طرح کھول رکھے تھے۔ بلکہ اسی لئے وِنڈمِل نے اپنا تمام ترفخر تین انگریزی لفظوں میں جمع کر کے بجلی کی روشنی سے اپنی پیشانی پر لکھ چھوڑا تھا۔ WE NEVER CLOSED [۱]

— نیاز کو خاموش اور غیر متوجہ پا کر ہم نے سوال دہرایا۔

"ہاں بھئی، بتاؤ یہ عظیم تفریح گاہ کب اور کیوں کر بند ہوئی۔"

بولا: "صحیح تاریخِ وفات تو وارثوں سے پوچھ کر ہی بتا سکتا ہوں لیکن مدت سے اللہ کو پیاری ہو چکی ہے اور پیاری غالباً کمی استعمال کی وجہ سے ہوئی کیونکہ وہ دائرے اور زاویے جو وِنڈمِل کی ایکٹریسیں ٹکٹ کے بدلے بے حجاب کیا کرتی تھیں، آج کل کی دوشیزائیں ہتھیلی پر رکھ کر بازاروں میں لئے پھرتی ہیں اور اکثر اس صلائے عام کے ساتھ کہ جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ

۱؎ یہ نائٹ کلب کبھی بند نہیں ہوئی۔

میں یہ نا اسی کا ہے ۔"

اس مقام پر ہماری ٹولی کے ایک ریشن بردار اور متشرع رکن نے کہ انگلستان میں تازہ وارد تھے، نیاز سے سوال کیا۔

"یہ لڑکیاں ایسی حرکت کیوں کرتی ہیں ؟"

نیاز نے ہمیں آنکھ مارتے ہوئے مولوی صاحب سے کہا۔

"مولانا، حقوق العباد کے احترام میں ۔"

اور مولوی صاحب بقیہ سیر کے دوران اپنے منہ میں ڈوب کر یہ فیصلہ کرتے رہے کہ مرحبا کہیں یا لاحول پڑھیں۔

وجاہت علی سندیلوی

جمود میں نمود

مجھ پر نازل ہونے والی مصیبتوں اور پریشانیوں کی پیدائش کا دن عموماً اتوار ہوتا ہے۔ اس دن کچہری میں اتوار اور گھر پر میں بند ہوتا ہوں۔ اور کسی تیز فتنے کو اپنی ہنگامہ آرائی کا شکار بنانے کے لئے کھونٹے سے بندھے ہوئے جانور سے زیادہ اور کون موزوں ہو سکتا ہے۔ وہ نہ بھاگ سکتا ہے نہ اپنا کوئی بچاؤ کر سکتا ہے۔

اس روز بھی اتوار ہی تھا اور میں اپنے چند ایسے دوستوں، عزیزوں اور خصوصیت کے ساتھ دشمنوں کے خطوں کے جواب لکھنے کی کوشش کر رہا تھا، جو ایک مدت گذر جانے کے بعد بھی اب تک یہ نہیں بھولے تھے کہ انھوں نے مجھے کبھی کوئی خط لکھا تھا چنانچہ یاددہانی کے تازیانے مجھ پر برابر برسا رہے تھے۔ جن خطوں کا جواب نہ دینے سے محض آخرت خراب ہونے کا اندیشہ تھا ان کے مختصر جواب دے دینا مقابلتاً آسان تھا مثلاً۔

"آپ کی انجمن اصلاح بیوگان کے لئے پچاس روپیہ دینے کا وعدہ ضرور کیا گیا تھا لیکن کیا عرض کیا جائے کہ پچھلے ماہ ایک بزرگ کے انتقال سے خود اپنے محلہ میں چار بیواؤں کا ظہور ہو گیا ہے۔ آپ کی انجمن کو جو روپے دینے والا تھا وہ میں نے ان بے چاریوں کے حوالے کر دیئے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ہمسائیوں کا کتنا بڑا حق ہوتا ہے۔ ان قلیل رقموں سے وہ اپنے مرحوم شوہر کا ٹھیک سے سیوم بھی نہیں کر پائیں۔ چالیسویں کے لئے وہ آپ کی انجمن کی توجہ امداد کی مستحق ہیں۔ فقط بس یہاں ہوں"

البتہ جن خطوں کا جواب نہ دینے سے اپنی دنیا میں بھونچال آجانے کا قوی امکان تھا ان کے ایسے مصلحت آمیز جواب دینا کہ وہ مخاطب کو محبت آمیز معلوم ہوں ذرا ٹیڑھی کھیر تھا۔ مثلاً۔

"آپ کے بہر ماہ حال کو تشریف لانے کی خبر سے بڑی خوشی ہوئی اور خصوصاً اس وجہ سے اور بھی کہ بھابی صاحبہ اور میرے آٹھوں بھتیجے اور بھتیجیاں سبھی آپ کے ساتھ ہوں گی۔ مدت کے بعد میزبانی کی سعادت نصیب ہوتی لیکن میری بد قسمتی کہ پرسوں سے میرے محلہ اور خصوصاً میری گلی میں ہیضے کی وبا بڑے

بھیانک طور سے پھوٹ پڑی ہے۔ ۴۸ گھنٹوں میں ۴۸ ہی موتیں ہو چکی ہیں اور نہیں معلوم کتنے مریض لبِ دم ہیں۔ میونسپلٹی والے کوئی توجہ نہیں کر رہے ہیں۔ میں بھی ترکِ سکونت کر کے اپنی سسرال جانے والا ہوں۔ بشرطِ زندگی پھر کبھی آپ سے شرف نیاز حاصل کروں گا۔ تھوڑے لکھے کو بہت جانئے گا۔ یار زندہ صحبت باقی۔"

میں اسی طرح بہرخط کے مصرعِ طرح پر جوابی غزلیں تصنیف کر رہا تھا کہ دفعتاً میری نشست گاہ کے دروازے کے پردے کے پیچھے سے کسی مرغِ بادر کی ایک انتہائی بھیانک اور بے ہنگم بانگ سنائی دی۔ "کیا میں آسکتا ہوں؟" اور قبل اس کے کہ میں اپنے ہوش و حواس کو جو اس دہشت فزا، پٹاخے نما، سوال کو سنتے ہی بھاگ چکے تھے واپس بلانے کی کوشش بھی کر سکتا، اس کے جواب دینے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ سوال کا پٹاخہ داغنے والے صاحب پردے کو اس کی سُستی سے توڑ کر اس کے سمیت کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ پردے میں لپٹے ہوئے صاحب تو نقاب کشائی سے قبل کسی مجسمے کی طرح نہ صرف جامد اور ساکت بلکہ پوشیدہ تھے لیکن ان کا مولا بخش یعنی موٹا بل کھایا ہوا ڈنڈا، بی پی کے تیل اور بھی ڈنڈا اُٹھا ہوا، کی تعبیر بنا ہوا تھا۔

ایک دفعہ تو جی کڑا کر کے سوچا کر آنکھ اوٹ پہاڑ اوٹ کے مصداق پچھلے سے دوسرے دروازے سے نکل بھاگوں لیکن پھر میری جو شامت آئے، میں نے آگے بڑھ کر پردے کے پیچ و خم دور کر کے نقاب کشائی کر دی اور چڑھی ہوئی تیوری اور بکھری ہوئی داڑھی کے ساتھ حضرت بیباک برآمد ہو گئے۔ وہ بھناتے ہوئے ایک قریبی کرسی پر بیٹھ گئے اور اپنے ڈنڈے کو سامنے کی میز کے سہارے اس انداز سے کھڑا کر دیا کہ اگر سند نہ بھی رہے تو بھی بوقت ضرورت کام آئے۔

حضرت بیباک شہر کے ایک ادبی اور فلمی رسالے کے غالباً خود ساختہ خصوصی نمائندہ تھے اور ان کے متعلق مشہور تھا کہ انہوں نے مختلف حضرات کے مختلف موضوعات پر انٹرویو شائع کر کے شہر بھر میں ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا اور ان کی کارگذاری کی وجہ سے ان کے رسالے کی اشاعت ہی کے تناسب سے لپاڈگی اور مار پیٹ کی وارداتیں بتدریج بڑھ رہی تھیں۔ مجھ سے جب انھوں نے اپنی شان نزول کی یہ وضاحت کی کہ وہ ایک ادبی تنازعے کے سلسلے میں جو ان کے رسالے میں آج کل زیر بحث ہے میرا انٹرویو لینا چاہتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں میری روح قبض کرنا چاہتے ہیں تو میں بہت بڑکا اور بپھرا لیکن مرغ زیر دام کی پرواز ہی کیا؟ ہر طرح سے اپنی حماقت اور جہالت کی بابت انہیں یقین دلانے کی کوشش کی اور اگر ان کا مولا بخش ان کے ساتھ نہ ہوتا تو شاید اپنی خباثت کا کوئی عملی ثبوت بھی پیش کرنے سے نہ چوکتا۔ لیکن وائے مجبوری! انھوں نے ایک بپھرے ہوئے طوفان کی طرح مجھے گھیر لیا اور جب میں انکار کرتے کرتے قریب قریب بے جان ہو چکا تو انہوں نے میرا جبریہ پوسٹ مارٹم یا انٹرویو شروع کر دیا۔

وہ:- اس وقت ہمارے ادب پر جو جمود طاری ہے اُس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ کب تک اور کیسے رفع ہو جائے گا۔؟

میں:- میں جمود کے وجود ہی کا قائل نہیں ہوں۔

وہ:- تو آپ جمود کے کوئی منفی اثرات اپنے ادب پر نہیں محسوس کر رہے ہیں۔ لہٰذا موجودہ جمود کو آپ ادب کیلئے کوئی

مستقل رکاوٹ نہیں سمجھتے بلکہ اس کو محض ایک عارضی اور ہنگامی بحران سمجھتے ہیں۔

میں تعجب سے منہ پھاڑ کر حضرت بیباک کرگھور نے لگتا ہوں اور وہ اپنی جیب سے ایک بوسیدہ نوٹ بک نکال کر کچھ لکھنے لگتے ہیں۔

وہ :۔ "آپ کے خیال میں موجودہ جمود بھی ہمارے ادب کے ارتقاء کی زنجیر میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ ایک وقفہ ہے جس میں ہم اپنے ماضی کا جائزہ لے کر اس کی کوتاہیوں اور کامیابیوں کی روشنی میں اپنے مستقبل کا ایک شاندار منصوبہ بنا رہے ہیں۔"

میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ اپنی نوٹ بک میں تیزی سے لکھنے لگتے ہیں۔ میرے پیچ و تاب ہی کے تناسب سے ان کے چہرے پر ایک طمانیت بخش مسکراہٹ ہے۔

وہ :۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ہمارے ادب کے لئے اس کے موجودہ جمود کو ایک لعنت نہیں بلکہ نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہیں۔"

میں :۔ (اپنے بال نوچتے ہوئے) "میں عرض کر چکا ہوں کہ میں جمود کو جانتا بھی نہیں کہ وہ کس کھیت کی مولی ہے اور آپ ادب پر جمود طاری کرنے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ میں جمود کا نہیں نمود کا قائل ہوں۔"

وہ :۔ (ہنستے ہوئے) "واہ! واہ! آپ نے کیا باون تولے پاؤ رتی کی بات کہہ دی ہے۔ واقعی انٹرویو لینا بچہ جنانے سے کم مشکل کام نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے ذہن میں شور و شر پیدا۔ اب آپ سے میں کس مصیبت سے قبولوا پایا ہوں کہ آپ جمود میں نمود دیکھتے ہیں۔ یعنی جمود میں منجمد ہونے کے باوجود آپ ادب کے پیڑ میں نئی کونپلیں، پتیاں اور شاخیں پھوٹتی دیکھ رہے ہیں (ہا ہا ہا قہقہہ لگاتے ہوئے)، گویا آپ پتھر کی سپاٹ سل میں رقص بتاں آذری ملاحظہ فرما رہے ہیں۔"

میں روہانسا ہو کر اپنی مٹھیاں کھولنے اور بند کرنے لگتا ہوں اور وہ مجھ سے بے نیاز اپنی نوٹ بک پر بے تحاشا اپنی پنسل سے لکھتے ہی چلے گئے۔

وہ :۔ "آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے اس نازک متنازعہ مسئلے کے بعض تاریک پہلوؤں پر بڑی ہی بصیرت افروز روشنی ڈال دی ہے۔ بس اتنا اور پوچھنا رہ گیا ہے کہ آپ جمود میں نمود دیکھ رہے ہیں اس کی آپ کیا شاہراہ اور منزل متعین کرنا چاہتے ہیں۔"

میں :۔ "جو آپ کا جی چاہے تعین کر لیجئے۔ مجھے تو سب کچھ غتربود نظر آتا ہے۔"

وہ :۔ "بالکل صحیح خیال ہے آپ کا یعنی آپ کے ذہن میں ادب کے مستقبل کے متعلق کوئی واضح نشان راہ نہیں بلکہ کافی اُلجھاؤ اور انتشار یعنی دوسرے الفاظ میں غتربود ہے۔"

میں اپنے غصے کو مشکل سے ضبط کئے خاموش رہتا ہوں اور وہ اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھ کر اسے بند کر دیتے ہیں اور اپنا مولا بخش اٹھا کر رخصت ہوتے ہوئے میرے سر پر یہ آخری پتھر پھینکتے ہیں ۔۔ "واقعی آپ تک بندی میں بڑی مہارت رکھتے

ہیں۔ ادب پر جمود ہے۔ جمود میں نمود ہے۔ اور نمود میں ہست و بود ہے۔ یعنی آم کے پیڑ میں لگنے والا امرود ہے۔"

پھر درویش بجانِ درویش کے طور پر میں نے خطوں کے جواب لکھے تھے انہیں چاک کر دیا۔ اب انہیں حضرت بیباک ہی سے لکھانے کا ارادہ ہے۔ ؎

دیکھنا بے باک کی جدت کہ میرا بے کہا!
اُس نے یہ جانا کہ گویا وہ ہی میرے دل میں ہے

عاتق شاہ

گھر میں گھونسا

۔ وہ تو گھونس ہے گھونس ـــ !

جب کوئی لڑکی یا عورت اپنی سہیلی کی کمر میں چٹکی لے کر یوں اظہارِ خیال کرتی ہے تو دونوں اپنی جوانی اور حسن کے نشے میں سرشار ایک لمحے کیلئے زمین سے اُٹھ کر آسمان کی طرف پرواز کرنے لگتی ہیں - اور یہ بھول جاتی ہیں کہ کوئی دوسری عورت بھی ان کے بارے میں یہی ریمارک پاس کرسکتی ہے ـــ !

اصل میں گھونس بدصورتی کی ایک علامت ہے !

اور خود بدصورتی کیا ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کی نگاہ بدصورتی میں ہی کوئی پہلو نکال لے۔ اس طرح دنیا کی کسی بھی عورت یا لڑکی کے بارے میں کوئی حکم لگانا بہت مشکل کام ہے۔ عورت کے بارے میں عورت کی رائے قطعی سند نہیں ہوتی۔ !

اس کا فیصلہ تو کوئی مرد ہی کر سکتا ہے۔ لیکن اب مرد کو کون ڈھونڈتا پھرے۔ سُنا کہ آج کل مرد کی شناخت بہت مشکل ہو گئی ہے !

ویسے گھونس کا کردار انسانی سماج میں بڑا اٹل ہے۔ !

گھونس کبھی کسی سے کچھ کہتی نہیں۔ نہ اپنوں سے نہ پرائیوں سے۔ بلکہ خاموش انداز میں انسانی سماج کی بنیادوں کو کھوکھلا کرکے گذر جاتی ہے۔ اور اس کے چلے جانے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ جس گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اُس گھر کی دیواریں لرز رہی ہیں!

گھونس گھر کو بناتی نہیں بلکہ گھر کو اُجاڑتی ہے۔ گھر کو تقسیم کرتی ہے۔ وہ جس گھر میں قدم رکھتی ہے اس کی اینٹ سے اینٹ کو آپس میں جدا کر دیتی ہے۔ اور اس خوبی اور احتیاط سے کرتی ہے کہ بڑی بڑی دراڑیں پڑنے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ سب کچھ تہس نہس ہو چکا۔ اور ملبے کے سوا کچھ باقی نہیں بچا ہے۔

وہ ایک گھر کی دیوار کو کھود کر دوسرے گھر میں داخل ہونے کے لئے بڑی آسانی سے اپنا راستہ بنا لیتی ہے۔ زیرِ زمین والوں کو بنانے کا فن دنیا جہاں کے انجینئروں نے گھونس ہی سے سیکھا ہے!

گھونس صرف زمین کو کھودتی ہی نہیں بلکہ سرنگیں بھی بچھاتی ہے۔ ان سرنگوں میں بارود نام کی کوئی شئے نہیں ہوتی بلکہ چلتے پھرتے انسانوں کے لئے وہ بند قبریں ہوتی ہیں جس میں جانے کے بعد وہ زندہ دفن ہو جاتے ہیں۔ نماز جنازہ اور فاتحہ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی!

ہر کھنڈر، تباہ شدہ حویلی اور خستہ حال عمارت کے پیچھے کوئی نہ کوئی گھونس چھپی رہتی ہے۔ اور اس کا کوئی نہ کوئی نام ہوتا ہے!

لیکن گھونس کے نام سے اس کی ذات پات اور مذہب کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ گھونس صرف گھونس ہی ہوتی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ جغرافیائی ماحول اور آب و ہوا کے زیرِ اثر یہی گھونس گرم ممالک میں کالی ہوتی ہے اور سرد ملکوں میں گوری۔

اس بات کو اگر اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو کوئی یہ سوال ہی نہیں کرے گا کہ رادھا کیوں گوری؟ اور میں کیوں کالا؟

رنگ اور نسل کے اس فرق پر اگر غور کیا جائے تو ذیل میں دئیے ہوئے چند اہم نکتے سامنے آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

۱۔ بدیسی گھونس بہت کھرّڈ اور پالشڈ ہوتی ہے

۲۔ دیسی گھونس ابھی پتھر کے دور سے آگے نہیں بڑھی۔

۳۔ بدیسی گھونس کبھی عوام کے گھروں کا رخ نہیں کرتی۔ اس لئے کہ ان کے گھر بلور کی طرح صاف اور شفاف ہوتے ہیں

۴۔ اور دیسی گھونس ہمیشہ ویرانوں سے نکل کر آبادیوں کا رخ کرتی ہے۔ اور محلہ محلہ، گلی گلی اور گھر گھر کا دورہ کرتی ہے۔

۵۔ بدیسی گھونس میں اخلاقی جرأت ہوتی ہے۔ اور کبھی وہ کسی سے ڈر کر نہیں بھاگتی۔ بلکہ ڈرانے والے کو بھگا دیتی ہے

۶۔ اس کے برخلاف دیسی گھونس بات ہی نہیں کرتی اور نظروں کے سامنے سے غائب ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ بلکہ غائب ہو جاتی ہے۔ اور غائب ہونے میں اسے بڑا کمال ہے۔

لیکن ایک دن میں نے اسے اپنے ایک دوست کے گھر پر گرفتار کر لیا۔

چھٹی کا دن تھا۔ دوست کی بیگم اپنے بچوں کے ہمراہ میکے گئی ہوئی تھیں۔ اور دوست گھر پر تنہا بیٹھا ہوا اپنے ہر دوست کو آواز دے رہا تھا کہ آؤ فرصت کے دن ہیں۔ کچھ ہنس بول لیں۔

لیکن اس دن دو تین بار دستک دینے پر بھی کوئی آواز نہیں آئی۔ شائد وہ گھر پر نہیں تھا۔ میں نے دیکھا، کوئی دروازہ کی اوٹ میں چھپا ہوا جھانک رہا ہے۔ چہرے پر پاؤڈر، ہونٹوں پر لپ اسٹک کی کئی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اس میک اپ کو دیکھتے ہی میں نے کہا۔ میڈم! گھبرائیے نہیں۔ میں آپ کے دوست کا قریبی آدمی ہوں۔ اور اس کے ہر راز سے واقف

ہوں۔ لہٰذا دروازہ کھولیئے۔ تاکہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر میں اس کا انتظار کرسکوں!

آہستہ سے دروازہ کھلا اور میں نے بھرپور میک اپ کی جیتی جاگتی اور منہ بولتی تصویر دیکھی۔ میں نے کہا۔

ہلو —

ہلو —

اُس نے جواب دیا۔ اور پھر بولی، میں آپ کے لئے چائے بناتی ہوں۔

اتنے میں میرا دوست آگیا جو سگریٹ لانے کے لئے باہر گیا تھا۔ تینوں نے ساتھ چائے پی۔

یہ میرے دوست سے آخری ملاقات تھی! اس کے بعد وہ اپنی بے کفن و سیدھی سادی معصوم بیوی اور چھ چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر اس کے ساتھ کہیں چلا گیا۔ زیرِ زمین راستوں سے، اور پھر دور دراز تک پہنچانے والی سرنگوں سے ہوتا ہوا بیرونی ممالک کے شہروں میں گھوم پھر رہا ہے۔ سنا کہ بڑے مزے میں ہے اور ٹھاٹ کر رہا ہے۔

ارے وہ تو گھونس تھی گھونس! گھونس کی آواز میرے کانوں اور روح میں گونجتی ہے۔ اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ اب کس گھر کی دیواریں اور چھت گرنے والی ہے۔ اور کس معصوم بے گناہ عورت کی مانگ اُجڑنے والی ہے۔

گھونس خواہ وہ دیسی ہو یا بدیسی تھوڑے سے بہت فرق کے ساتھ اس کا ایک ہی رول ہے اور ایک ہی کردار ہے۔ چھچھوندر کی طرح چک چک کرتی ہوئی اپنی آمد کی وہ اطلاع دیتی ہے۔ اور نہ روانگی کا اعلان کرتی ہے۔ دُبلے پتلے اور چھوٹے چھوٹے چوہوں کو وہ خاطر میں نہیں لاتی۔ لفٹ دینے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اور موٹا تازہ چوہا مقابل میں آجائے تو دوسری بات ہے ورنہ وہ خاموشی کے ساتھ اپنے پروجکٹ کی تکمیل میں مصروف ہو جاتی ہے۔! — سُنا ہے کہ وہ کُتّے سے ڈرتی ہے اور کُتا بھی اپنا حساب کتاب چکتا کرنے کے لئے اس کی تاک میں بیٹھا رہتا ہے۔ لیکن وہ اس پھرتی اور خاموشی کے ساتھ اُس کی پیٹھ پیچھے سے اور مجبوری کی صورت میں کبھی سامنے سے اس طرح گذر جاتی ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں چلتا۔ اگر اتفاق سے کتے کی نظر پڑ جائے اور اسے گذرتا ہوا دیکھ کر جھپٹنا پڑے تو اسی لمحے وہ انڈر گراؤنڈ ہو جاتی ہے۔ انڈر گراؤنڈ جانے سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ کوئی کسی کو پکڑ نہیں سکتا۔ انڈر گراؤنڈ زندگی گذارنے والے دنیا جہاں کے جاندار دن کے اجالے میں اس خطۂ زمین کے اُوپر چہل قدمی نہیں کرتے۔ جیسے ہی شام ہوتی ہے اور رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلنے لگتا ہے وہ آہستہ آہستہ اپنے اپنے ٹھکانوں سے باہر آتے ہیں۔ گھونس بھی ان میں سے ایک ہے۔ چنانچہ گھونس کا سفر اندھیرے سے شروع ہو کر اندھیرے پر ختم ہوتا ہے۔ اور سحر کے دودھیائی اُجالے سے پہلے ہی وہ دنیا کی نظروں سے غائب ہو جاتی ہے!

رات کے مختصر سفر میں گھونس بڑے بڑے کارنامے انجام دیتی ہے۔ کبھی کھیتوں کا رُخ کرتی ہے تو لہلہاتی ہوئی فصلوں کو جڑ سے کاٹ دیتی ہے۔ اناج کے بڑے بڑے گوداموں میں جاتی ہے تو منوں اور ٹنوں اناج اپنے زیرِ زمین گھر میں منتقل کر دیتی ہے کتب خانوں اور ماڈرن لائبریریوں میں جاتی ہے تو انسان کی دانشمندی پر ہنستی ہے اور اپنے نکیلے پاؤں اور دانتوں سے زمین کھود کر اس میں کتابیں دفن کرنے لگتی ہے۔ غرض جہاں کہیں بھی گھونس جاتی ہے اپنے پیچھے تباہی اور بربادی کی ایک

نہ ختم ہونے والی کہانی چھوڑ جاتی ہے!

دیکھئے گھونس آرہی ہے ــــ گھونس آرہی ہے ــــ

کھنڈروں اور ویران بستیوں کو چھوڑ کر، کھیتوں اور بازاروں سے ہوتی ہوئی گھونس آرہی ہے۔ اپنے دونوں پاؤں اور منہ سے زمین کو کھود کر، سرنگیں بچھاتی ہوئی وہ آرہی ہے۔ آبادیوں کی طرف۔ گھروں کی طرف۔ معلوم نہیں اب کس کے گھر میں قدم رکھنے والی ہے۔ اور کس کی انشاں بھری مانگ میں خاک پڑنے والی ہے۔!!

میں سوچنے لگتا ہوں۔ اور کوئی میرے کانوں میں آہستہ آہستہ بولنے لگتا ہے ــــ

دیکھو تو ــــ وہاں گھونس کھڑی ہے!!



وزیر اعظم کا بیس نکاتی معاشی پروگرام



ہماری وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی طرف سے شروع کردہ بیس نکاتی معاشی پروگرام بلاشبہ آندھرا پردیش کی ترقی اور بتدریج فروغ کیلئے ایک نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے پسماندہ طبقات کی فلاح و بہبود کیلئے کی جانے والی کوششوں میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے اور کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے لاکھوں عوام کیلئے ایک نئی اُمید پیدا کردی ہے

- (منھ بولتے حقائق) -

ریکارڈ غذائی پیداوار

غذائی پیداوار ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۱۲۹،۷ و ۱۰۶ لاکھ ٹن کے ایک ریکارڈ حد تک پہونچ چکی ہے۔ طوفان باد و باراں اور خشک سالی کے باوجود ہنگامی منصوبوں کی عاجلانہ عمل آوری کے نتیجہ میں پیداوار سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں گھٹ کر ۷۰ لاکھ ٹن تک ہوگئی۔

عوام کیلئے ارزاں پارچہ

ہینڈلوم کے ساتھ فیصد بافندوں کو امداد باہمی کی صف میں شامل کیا گیا ہے۔ سستے داموں کے پارچہ کی پیداوار جو سال ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۱۸۹ لاکھ مربع میٹر سے تھی، سے بڑھ کر سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۲۱۳ لاکھ ہوگئی اور سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۲۲۰ لاکھ تک پہونچ گئی ہے۔ ارزاں پارچہ اب ۲۸۸ نکاسی کے مراکز کے ذریعہ عوام میں تقسیم کیا جارہا ہے۔

ارزاں فروشی کی دوکانات کے ذریعہ اشیائے مائحتاج کی تقسیم

اشیائے مائحتاج اب (۲۲۰۰۰) ارزاں فروشی

کی دوکانات کے ذریعہ عوام تک پہونچائی جارہی ہیں۔

زرعی اصلاحات زرعی اصلاحات کو ریاست میں پوری سرگرمی کے ساتھ روبعمل لایا جارہا ہے جس کے نتیجے میں زائد از ۹۷ر۳ لاکھ اراضی کو سرکار تحویل میں لے لیا گیا ہے۔ یہ اراضی (۵۱۲۵۴۷ر۱) خاندانوں کو الاٹ کی گئی جن میں سے بیشتر کا تعلق درج فہرست طبقات، درج فہرست قبائل اور پسماندہ طبقات سے ہے۔

کمزور طبقات کیلئے اکنہ کی تعمیر اس اسکیم پر پورے جوش و خروش کے ساتھ عمل کیا جارہا ہے۔ ۱۲ لاکھ خاندانوں کیلئے تعمیر اکنہ کیلئے قطعات اراضی مختص کی گئی ہیں۔

جاری کردہ :- محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

DIPR-18656/81 (D.I.P.R.22)

عابد معز

پیسہ پیسے

سکۂ ہند ۔ روپیہ کو سو حصوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر حصہ پیسہ کہلانے لگا ۔ بالفاظِ دیگر پیسہ ، روپیہ کا ایک صد حصہ ہے لیکن حقیقتاً آج کل پیسہ ، روپیہ کا وہ حصہ ہے جو نظر ہی نہیں آتا ۔ چند دن قبل ہمیں ایک پیسہ کا سکہ پرانے سامان میں نظر آیا ۔ آنکھوں سے لگایا ۔ ہونٹوں سے چوما اور ہتھیلی کے بیچ رکھ کر پیسہ کی حالت پر غور کرنے لگے ۔ سکہ اور ہتھیلی کے تناسب سے ہمیں مسئلہ افراطِ زر کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی ۔

ہمیں پیسہ کے رنگ ہی اور نظر آئے کہاں اس کی پہلے جیسی شاہانہ ٹھاٹ (جب وہ جیب میں بیٹھا کھنکا کرتا تھا اور نیچے گرتے ہی اسے اٹھا کر چوما جاتا تھا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے) اور کہاں اب غریبی اور چھوت چھات کا برتاؤ (جب کبھی پیسہ کا سکہ دوسرے سکوں کے درمیان آتا ہے تو اسے الگ کہیں کونے میں نظروں سے دور ڈال دیا جاتا ہے) آج کی اس حالت کو دیکھ کر ہمارا دل بھر آیا ۔ سنتے ہیں ایک زمانہ تھا جب پیسہ آج جیسا تنہا، کھارا اور مفلوک الحال نہ تھا ۔ پیسہ کا اپنا خاندان ہوا کرتا تھا ۔ ایک پیسہ کے آٹھ کوڑی ہوتے ۔ جب ہم نے آٹھ کوڑی والے پیسہ کی شان و شوکت اور دبدبہ کے بارے میں سنا تو ہمارا دل بے اختیار آج کے پیسہ کی حالتِ زار پر آٹھ آٹھ آنسو بہانا چاہا ۔ خیر صاحب یہ تو سنی سنائی بات تھی ۔ آج بھی ہمارے درمیان ایسے بزرگ موجود ہیں جو دو دھیلے والے پیسہ کے فضائل و برکات بڑی عقیدت سے بیان کرتے ہیں ہماری دادی اماں کہتی ہیں جب کبھی انھیں ایک دھیلا ملتا وہ سر اونچا کئے میلہ جاتیں ، ڈھیر ساری مٹھائیاں اور کھلونے خرید لاتیں ۔ زمانہ ترقی کرتا گیا ۔ چھوٹی قدریں مٹتی گئیں ۔ کوڑیوں اور دھیلوں کو مہنگائی کھا گئی ۔ پیسہ صرف پیسہ ہوا ۔ پھر بھی اس پیسہ میں مرغی کا انڈا خریدا جا سکتا تھا ۔ یہ بات جب ہمارے ایک بزرگ نے کہی تو لگا وہ ہم اور ہمارے زمانہ پر طنز کر رہے ہیں ۔ ہم نے ان کے طنز کا یوں جواب دیا جناب والا وہ انڈا مرغی کا نہیں چڑیا کا ہوتا ہوگا ۔ یہ سن کر ان بزرگ نے فضا میں ماضی کو دیکھتے ہوئے کہا میاں ایک پیسہ والا انڈا بغیر مشین کے پیدا ہونے والی مرغیوں کا

دیتا جو مہینہ میں صرف بارہ یا پندرہ انڈے دیتی تھیں اور معلوم نہیں اس وقت مرغی ... معیاتین آنے میں ملا کرتی تھی۔ یہ سُن کر ہم نے حیرت اور تعجب سے ٹھنڈی سانس لی اور دل نے کہا جانے وہ کیسی مرغیاں تھیں اور وہ کیسا پیسہ تھا۔؟

وقت کے ساتھ تن تنہا پیسہ اپنی حقیقت کھونے لگا۔ پیسہ نے تب اتحاد کی اہمیت جانی۔ چھ پیسوں نے مل کر "آنہ" بنایا۔ چند دنوں تک یوں توں کر کے بیچارہ پیسہ اپنی برادری کے دوسرے سکوں کے ساتھ اپنی اہمیت جتاتا رہا۔ لیکن زمانہ کمزور کا ساتھ جلد چھوڑ دیتا ہے۔ یہ بات پیسہ کے ساتھ بھی ہوئی۔ گردشِ ایام کے دوران وہ وقت بھی آیا جب حساب کتاب میں آنوں کا چلن ختم ہوا۔ ایک روپیہ میں سولہ آنے کے بجائے ایک سو پیسے ہونے لگے۔ بس یہیں سے پیسہ کا زوال شروع ہوا اور وہ اپنی رہی سہی حقیقت بھی کھونے لگا۔

انسان بخوشی اِن چیزوں سے اُدوں کی مدد کرتا ہے جو اس کے لئے بیکار ہوں۔ پیسہ کا سکّہ بکثرت خیرات کے لئے استعمال ہونے لگا اور اسے "فقیریہ سکّہ" کا خطاب عطا ہوا۔ پیسہ میں کچھ نہ آتا تھا نہ سہی، ڈھیر ساری دعائیں ضرور مل جاتی تھیں لیکن خوبئ قسمت دیکھئے کہ غریب پیسہ "فقیریہ سکّہ" کا خطاب بھی زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رکھ سکا۔ سخی خیال کرتے قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے جبکہ فقراء کا ایمان ہوتا ہے

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

نتیجتاً پیسہ کے ساتھ سخی بھی ذلیل و خوار ہونے لگے۔ فقراء خیراتی پیسہ وصول کرنے کے بعد دعائیں نہیں دیتے بلکہ سخی کو پھٹکارنے لگے۔ جب ہم نے ایک پیسہ کا سکہ خیرات کیا تو فقیر نے متانت و سنجیدگی کے ساتھ سکّہ کو واپس کرتے ہوئے کہا آپ اس دولت کو اپنے پاس ہی رکھئے کبھی تا وقت کام آئے گی۔

آہستہ آہستہ ایک پیسہ کا چلن ختم ہوا۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ ایک پیسہ کے ساتھ ساتھ دو اور تین پیسے کے سکے بھی غائب ہونے لگے اور اب تو "راؤنڈ فیگر" کا دور دورہ ہے۔ راؤنڈ فیگر میں صفر کا چلن ہوتا ہے۔ ہر ہندسہ کو صفر پر ختم کیا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ قربان کیا جاتا ہے۔ ایک تو ہندسوں کی بذات خود کوئی قدر نہیں۔ راؤنڈ فیگر کے دور نے ان ہندسوں کو گول کر دیا ہے۔ گول کرنے کا چکر کچھ زیادہ ہی چل چکا ہے اور آج کل تو پیسوں کو ہی گول کرنے کی فکر دامن گیر ہے۔

پیسہ کے انحطاط کا اثر اردو ادب پر بھی پڑا۔ کوڑیوں اور پیسے والے محاورے صرف اور صرف ماضی کے واقعات بیان کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک عزیز نے اپنے زمانے کو یاد کرتے ہوئے کہا اس زمانے کی کیا بات کرتے ہو میاں! کوڑی کے تین تین بکتے تھے، پیسہ پیسہ کر کے جمع کیا جاتا تھا پھر بھی اکثر کے پاس کوڑی نہ ہوتی اور آج روپیہ پیسہ ہزاروں میں ہے لیکن روپیہ چار آنے

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ ہم اس مقولہ کی بنیاد پر پیشین گوئی کرتے ہیں کہ وہ دن ضرور آئے گا جب روپیہ کی حقیقت ایک پیسہ کے برابر ہوگی۔ بچے پیسے کے بجائے روپیے کر مبدل جائیں گے۔ روپیہ میں مرغی کا انڈا آئے گا۔ ہماری یہ پیشین گوئی یقیناً سچ ثابت ہوگی۔ اس لئے کہ ایک ماہر معاشیات کا بیان ہے کہ آج ایک روپیہ کی قیمت تیس سال پہلے کے سترہ پیسوں کے برابر ہے۔

بازار میں اشیاء کی قیمتیں کبھی پیسہ کے حساب سے بڑھتی تھیں۔ پیسہ کی بھی اپنی ساکھ تھی۔ پائی پائی کا حساب ہوا کرتا تھا۔ قرضدار پائی پائی وصول کیا کرتے تھے۔ پائی پائی کھیلئے ہاتھا پائی ہوتی تھی۔ لیکن آج کل "گرانی" کے زیر سایہ قیمتیں ایک پیسے کے بجائے

دس بارہ پندرہ کے قریب ہے بڑھتی ہیں ایک پیسے کا حساب بھی نہیں ہوتا۔ پیسہ کا حساب بھی نہیں رکھا جاتا۔ پیسہ کے لئے ہاتھا پائی بھی نہیں ہوتی۔ دولت کی گرتی ہوئی قدریں اور بڑھتی ہوئی مہنگائی سے جیں بجیں ہو کر ہم نے آج کے زمانے کو برا بھلا کہا اور گزرے ہوئے زمانے کی تعریف کی تو ایک جہاندیدہ بزرگ نے ہمیں سمجھایا مہنگائی کا دارومدار گرتی ہوئی دولت کی قدریں یا بڑھتی ہوئی مہنگائی پر نہیں ہوتا۔ تمہارے پاس اگر ضرورت سے زیادہ دولت ہے تو سمجھو زمانہ سستا ہے اور اگر تمہاری قوت خرید کم ہے تو سمجھو کہ زمانہ مہنگا ہے۔ ان بزرگ کی یہ بات ہماری سمجھ میں آئی۔ یقیناً ارزانی اور مہنگائی کا دارومدار دولت کی افراط پر ہے تبھی تو چھوٹے سکے اس تیزی سے اپنی حقیقت کھو رہے ہیں کہ عنقریب ان کا چلن ختم ہو جائے گا۔ اسی لئے ہم دور بینی سے کام لیتے ہوئے تاجروں کو مشورہ دیں گے کہ وہ چھوٹے سکوں کو محفوظ کرلیں تاکہ بعد میں اپنے بچوں کے سامنے سینہ تان کر کہہ سکیں کہ ہمارے پاس ماضی کی سستی یادیں موجود ہیں۔

شکیل اعجاز

جنی بھائی

(دکھلا)

(خوشا اس طویل مضمون کا ایک حصہ مارچ ۱۹۸۱ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے ۔ 'مدیر')

جنی بھائی کو اچھے اچھے کھانے، پکانے اور کھانے اور کھلانے کا بہت شوق ہے ان کے دم سے ہمیشہ دوستو میں پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں۔ عموماً خود ہی سارا پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ ان کے پاس نہ ہوں تب بات اور ہے۔ ایک دن ۵،۵ روپے طلب کیے۔

"۵ روپے کیوں؟" ایک نے پوچھا۔

"رس گلے بنائیں گے۔"

پیسے جمع ہو گئے تو سب کو ادھر اُدھر دوڑانے لگے۔

تم گھی لے آؤ۔

تم شکر لے آؤ۔

تم چولہا سلگا دو۔

تم باہر سے تالا لگا کر کھڑکی سے اندر آجاؤ۔ کسی کو پتہ نہ چلے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

ہم لوگ رس گلوں کی آرزو میں دوڑتے رہے۔ کبھی وہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے تو کبھی حلق ان کا رس ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا۔ سب سامان جمع ہوا تو بولے

تم لوگ بازو کے کمرے میں چلے جاؤ۔ تیار ہو جائیں گے تو بلاؤں گا۔ ہم لوگ بازو والے کمرے میں پہلے ایک دوسرے کی نقلیں اتارتے رہے پھر اپنے اسکول کے زمانے کے لڑکوں اور اساتذہ کی۔ اس کے بعد شہر کے مختلف لوگوں اور لیڈروں کی جب ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے اور جبڑے درد کرنے لگے تو واپس ہوئے۔ دیکھا کہ چولہا بجھا ہوا ہے۔ جنی بھائی سر پکڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں اور برتن میں ہریلا رکھا ہوا ہے۔

مسرور بولا۔

کیوں یار تم تو رس گلے بنانے والے تھے۔ یہ ہریلا کیوں بنا ڈالا؟"

کہنے لگے "میں خود بھی رس گلے بنانے ہی بیٹھا تھا۔ پتہ نہیں یہ ہریلا کہاں سے بن گیا۔"

امان کٹورا منہ سے لگاتے ہوئے بولا ۔ "شاید ہماری قسمت میں ـــــ آج ہریلا ہی ـــــ لکھا ہے ۔"

دوسرے دن جنی بھائی کہیں سے ۲۰ روپے ادھار لائے اور رس گلے کھلائے بغیر پیچھا نہ چھوڑا۔

• • •

قسمت سے ہمیشہ خوف زدہ رہتے ہیں۔ سائیکل اس لیے نہیں چلاتے کہ کہیں قسمت میں سائیکل ایکسیڈنٹ نہ

لکھا ہو۔ پوچھو تو کہتے ہیں۔

"میں کار خریدوں گا۔ کار چلاؤں گا۔ سائیکل تو بہت حقیر ہے۔" ایک دوست نے خوب مذاق بنایا تو دوسرے دن سائیکل پر سوار سارا شہر گھومتے رہے۔ (باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ اپنے کمرے سے حمام جانے کے لیے بھی سائیکل کا استعمال کرنے لگے تھے)

ایک بچہ اسکول جاتے وقت فٹ پاتھ چھوڑ کر ان کی سائیکل کے نیچے آگیا اور رونے لگا۔ بھیڑ بڑھنے لگی تو انھوں نے دو روپے دے کر چپ کرایا۔

"آج معلوم ہوا کہ ——— جیب میں پیسے نہ ہوں اس وقت ——— سائیکل کیوں نہیں چلاتے۔"

ایک دفعہ مجھے پیسوں کی ضرورت پڑی (مجھے ہمیشہ پیسوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ دوستوں میں مسرور اور جنی بھائی بے روزگار تھے۔ یہی حال اقبال بھائی کا بھی تھا لیکن ان کے والد کی وافر دولت دیکھ کر کسی کو ان کی بے روزگاری کا احساس نہ ہوتا تھا۔

یعنی بے روزگار ہونے میں لڑکے کا اتنا قصور نہیں ہوتا جتنا اس کے غریب والد کا ہوتا) تاہم اقبال بھائی سے پیسہ حاصل کرنا، ببول کے درخت سے امرود حاصل کرنے کے برابر ہے۔ کیونکہ وہ ہر بات میں اپنے والد سے مشورہ کرتے ہیں اور والد، فیصلہ سنانے میں کافی دیر لگا دیتے ہیں۔ ایک دفعہ انھوں نے اپنے بیٹے کو برساتی دلانا منظور کیا تو برسات ختم ہو چکی تھی وہ بیچارہ صاف مطلع میں برساتی پہن کر گھومتا اور ہنسنے والے ہم جماعتوں سے کہتا کہ نئے ٹائپ کا سوئٹر نکلا ہے۔ اقبال بھائی بھی آخر اپنے والد کے نقش قدم پر ہیں۔ گھر کی سائیکل کہیں لے جاتے تو جہاں تک ہو سکے بریک نہیں لگاتے کہ ٹائر گھسنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کئی دفعہ راہ گیروں سے دیواروں سے حتیٰ کہ بھینسوں سے ٹکرائے لیکن بد احتیاطی کے مرتکب نہ ہوئے۔ کبھی کبھار کرائے کی سائیکل لے جاتے ہیں تو زیادہ تر وقت اصل کام کرنے کی بجائے گھڑی دیکھتے رہتے ہیں۔

ان سب باتوں سے قطع نظر پیسے لے بھی لیے جائیں تو ان کے تمام چھوٹے بڑے بھائی اس رفتار سے سلام کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ آدمی پریشان ہو جاتا ہے اور جواب دینے کی بجائے رقم دینے میں عافیت سمجھتا ہے۔ شائستگی سے پیسہ واپس لینے کیلئے یہ طریقہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ دس پندرہ آدمی بطور سلام مامور کر دیئے جائیں۔ مختصر یہ کہ میں ان سے طلب نہ کر سکتا تھا۔

اب صرف امان ہی رہ گیا تھا جو شہر کے مضافات میں ڈاکٹری کر رہا ہے۔ جو لوگ اس کے زیر علاج ہوتے ہیں وہ "مائل پرواز" بھی ہوتے ہیں۔ لوگ جان بخشی کے لیے بے حساب پیسہ دیتے ہیں۔ اس لیے میں امان سے پیسہ لے آیا۔ شام میں جنی بھائی ملے تو بری طرح ڈانٹنے لگے کہ میرے ہوتے ہوئے اِدھر اُدھر بھٹکنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور میں اپنی خوش نصیبی پہ رشک کرتا رہ گیا کہ اس دور میں بھی میرے آس پاس ایسے جاں نثار لوگ موجود ہیں جو سچے دل سے پیار کرتے ہیں۔

(ویسے جس انداز سے جنی بھائی مجھے ڈانٹ رہے تھے، راہ گیروں نے یہی سمجھا ہوگا کہ میں پیسے چرا کر فرار ہو گیا تھا اور اس وقت اچانک "سپڑ" گیا ہوں)

• • •

ان کے مزاج میں ہمیشہ حیرت انگیز تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ کبھی زندگی سے بہت پیار کریں گے۔ کبھی بالکل بیزار

ہو جائیں گے۔ کبھی دولت کمانے کی دھن میں لگ جائیں گے۔ کبھی یہ کہیں گے غریبوں کو جو سکون ملتا ہے وہ دولت مندوں کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔

ایک زمانے میں مذہب کی طرف جھکاؤ ہوا تو سرتا پا مولانا بن گئے ہم لوگوں نے گھر پر آواز دی تو معلوم ہوا کہ مسجد میں ہیں وہاں موذن صاحب نے کہا کہ پیش امام صاحب کے ساتھ اعتکاف میں ہیں ملاقات ہوئی تو داڑھی رکھ لی تھی، دوستوں کو ایسے دیکھنے لگے جیسے سب اجنبی ہوں۔ ہم کو ترس کھانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"تم لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ دنیا میں دل لگا کر کتنا وقت برباد کر رہے ہو۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ قارون کی دولت سکندر کی شہرت، رستم کی طاقت کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ پھر کس لیے ان کے پیچھے بھاگتے ہو۔ جد وجہد کرو، اپنی آخرت کے لیے دنیا دی جد وجہد تو بے مقصد ہے it is a point less struggle"

چونکہ یہ سب باتیں ہمارے بھی دل کی آواز تھیں اس لیے سعادت مندوں کی طرح سنتے رہے۔ بعد میں کچھ اس قسم کی خبریں ملنے لگیں۔

- پانچ پارے تو پہلے حفظ تھے اب اس میں اضافہ ہوا ہے۔
- ان دنوں فلاں عالم کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔
- کل جمعہ کا خطبہ انھوں نے دیا ہے وغیرہ وغیرہ

ہم کو جہاں اپنے ایک اچھے دوست سے محرومی کا رنج تھا۔ وہیں یہ خوشی بھی تھی کہ چلو ہم پانچ میں سے ایک آدمی تو سیدھے راستہ پر لگا۔

"ہو سکتا ہے ان کی وجہ سے ہماری مغفرت ہو جائے"۔ اماں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

پھر کئی دنوں تک جنتی بھائی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں بھی اس دوران گنجے پن سے پریشان رہا۔ انتقال یافتہ بالوں کے افسوس اور انتقال پذیر بالوں کی حفاظت میں مصروف رہا۔ تقریباً تین ماہ بعد جب میں اپنے سر کے باقی ماندہ پندرہ بیس بالوں کو بڑی احتیاط سے سنوار رہا تھا تو بازو کے کمرے سے امی کی آواز آئی۔

بابو! وہ جنتی میاں آئے تھے۔ ایک گھنٹہ میں دو چکر لگا چکے ہیں۔ کہتے تھے کوئی ضروری کام ہے!!

میں سیدھے مسرور کے گھر پہونچا۔ پھر ہم دونوں ان کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں مسرور بولا۔

"کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں؟ تین ماہ بعد اچانک ....!"

"میرے تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا ـــــــ تمہارا دل کیا کہتا ہے؟"

"میرے خیال میں کہیں اجتماع ہے یا پھر بھوپال سے جماعت آئی ہوگی شاید وہ ہمیں لے جانا چاہتے ہوں گے ـــــ اگر ایسا ہوا تو چلے چلیں گے ـــــ تم تیار ہو نا؟"

"تیار تو ہوں ـــــ لیکن ـــــ اس سے پہلے کبھی جماعت میں نہیں گیا"۔ میں نے کہا۔ "تم فکر مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں"۔

"تم جا چکے ہو؟"

"ہاں! پچھلے دنوں ہی دس دن کے لیے ناگپور گیا تھا۔"

"لیکن تم تو یہیں تھے ۔" "دراصل"______مسرور نے وضاحت کی "ہماری جماعت جس دن ناگپور پہونچی اس دن دو آدمی یہاں واپس آرہے تھے ۔ میں انھیں چھوڑنے کے لیے چلا آیا۔"

باتوں باتوں میں ان کا گھر آ گیا۔ ہم نے آواز دی تو آدمی سے ملتا جلتا ایک شخص، پینٹ، بش شرٹ زدہ ٹرانسسٹر سے آراستہ نمودار ہوا۔ صورت جنّی بھائی سے ملتی جلتی تھی

ہم نے کہا "چلو جلدی سے کھسکو یہاں سے ______ اور اندر سے جنّی بھائی کو بھیجو۔"

وہ بولا "کیوں مذاق کرتے ہو یار؟ اپنے جنّی کو نہیں پہچانتے؟"

ہم دونوں ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ گھر میں گھسیٹتے ہوئے بولے۔

"دراصل ______ میں یکسانیت سے اُکتا گیا تھا یار! ____ اور پھر تین چار ماہ میں جو نیک کام کیے ہیں وہ بے کار تھوڑے ہی جائیں گے ____ اب کچھ دن ذرا موڈ بدلنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن ہم تو بہت خوش تھے ____ کہ چلو ایک تو آدمی سُدھرا۔"

"سدھرا ہوا تو اب بھی ہوں یار ____ اب کوئی ڈاکے تھوڑا ہی ڈالوں گا ____ خیر اس کے بارے میں پھر کبھی بات کریں گے ۔ فی الحال میرے ساتھ جانی واکر کی فلم شری مان فنٹوش میں چلو۔ میں نے تمہارے ٹکٹ لے رکھے ہیں۔" اس کے بعد [illegible] کی باتیں کرنے لگے۔

- جانی واکر کا نام جھینگ لیٹر کیوں نہیں ہے۔
- دلیپ کمار اپنے خاصے نام یوسف کو بدلنے پر کیوں مجبور ہوا۔
- ٹن ٹن دراصل پہلے دُبلی تھی۔ ایک دن چند لڑکیوں نے اس کا مذاق بنایا۔ تب سے وہ اپنی صحت کا بہت دھیان رکھتی ہے ____ الغرض یہ کہ اب جنّی بھائی کا مذہبی جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ چند ہفتوں بعد ماہ رمضان المبارک کی ابتدا ہوئی اور رمضان المبارک میں تو جیب کترے بھی اتنی احتیاط ضرور کرتے ہیں کہ روزہ داروں کی جیب نہیں کاٹتے (اس امید پر کہ خدا اسی ادا پہ خوش ہو جائے گا)۔

چور حضرات ____ ("حضرات" کہنا ضروری ہے کیونکہ جمہوریت میں بغیر ثبوت کے کسی پر کیچڑ نہیں اچھالا جا سکتا۔ پھر مذہب میں بھی کسی کا دل توڑنے کی اجازت نہیں ہے اور آخری لیکن اہم بات یہ ہے کہ چور حضرات بھی "حسب استطاعت ناراضگی کا بدلہ لے سکتے ہیں) تو میں عرض کر رہا تھا کہ چور حضرات بھی رمضان المبارک میں اپنی ساری مصروفیات تراویح سے فجر کے درمیان نپٹا لیتے ہیں۔ وہ لوگ جو عام دنوں نماز نہیں پڑھتے، اس ماہ میں نہ صرف یہ کہ خود نماز پڑھتے ہیں بلکہ نہ پڑھنے والوں سے جھگڑے تک کر ڈالتے ہیں۔ جنّی بھائی تو ان سب لوگوں سے لاکھ درجہ بہتر ہیں۔ چند پاروں کے حافظ ہیں مسئلہ مسائل میں بھی دخل رکھتے ہیں۔ بے شمار احادیث ان کو ازبر ہیں۔ اس لیے ہم سب کے ساتھ وہ بھی روزے رکھنے لگے۔ لیکن اکثر تراویح گول کر جاتے یا مسجد تک آتے تو عشا پڑھ کر حجرے میں سو جاتے۔ ۲۶ ویں روزہ کی صبح فجر میں سب دوست ملے تو جنّی بھائی کہنے لگے۔

"آج شب قدر ہے عشا، پر سب لوگ "ماضی دلا" (دوستوں کا پرائیوٹ روم) پر جمع ہو جاؤ۔ وہاں سے ایک ساتھ مسجد چلیں گے

ایک دوسرے کی ہمت سے نیند بھی نہیں آئے گی۔ رکعتیں بھی زیادہ ہوسکیں گی ــــ اور ذرا لطف رہے گا۔"

میں عشاء سے ذرا پہلے روم پر پہونچا تو سب موجود تھے۔ کچھ باتیں ہورہی تھیں۔ مجھ سے بولے یہ "تم چلو۔ ہم تمہارے پیچھے ہی آرہے ہیں۔"

(میں پیچھے، پیچھے دیکھتا ہوا مسجد تک پہونچا)

فجر کے بعد واپس ہوا تو کمرے سے لڑائی کی دھیمی آوازیں آرہی تھیں۔ میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچنے لگا۔ شاید اس بات پر جھگڑا ہورہا ہوگا کہ ــــ

- تم جلدی کیوں چلے آئے
- تم نماز میں اِدھر اُدھر کیوں دیکھ رہے تھے۔
- تم اتنی زور سے وضو کیوں کرتے ہو کہ آس پاس کے لوگ بھیگ جائیں۔
- تم حوض پر اپنی ٹوپی بھول گئے اور ویسے ہی نماز پڑھتے رہے۔
- تمہارا سر توڑ دوں گا ــــ گھامڑ کہیں کے! ــــ میں تم سے پچھلی صف میں سجدہ کر رہا تھا۔ اس وقت تم میرے سر پر کیوں بیٹھ گئے تھے؟
- آئندہ سے تم میرے بازو مت بیٹھا کرو۔ قاعدہ میں اتنی زور سے التحیات پڑھتے ہو کہ مجھے اپنا التحیات تین مرتبہ پڑھنا پڑا۔ ابھی شک ہے کہ تیسری مرتبہ بھی صحیح نہیں تھا۔

لیکن اوپر جاکر معلوم ہوا کہ رات بھر تاش کھیلنے کا پروگرام چلتا رہا اور اس وقت بھی پتّوں پر لڑائی ہورہی ہے۔ مجھے دیکھ کر سب کو خیال آیا کہ صبح ہوگئی ہے۔ لڑائی ختم ہوئی۔ مسرور نے اپنے صاف ستھرے عطر زدہ کپڑے اتار کر ہینگر پر لٹکا دیئے جیسے رات بھر عبادت کی ہو) امان نے بستر تہ کرکے ایک طرف رکھ دیا۔ اقبال بھائی نے کمرے میں جھاڑو لگادی۔ جنّی بھائی ٹوپی سنبھال کر کمرے سے باہر نکلے تو بڑبڑاتے جارہے تھے۔

"تم لوگوں کی وجہ سے میری نماز بھی جاتی رہی اور کھیل میں بےایمانیاں کرکے تم نے دماغ بھی خراب کردیا ــــ بیکار کہیں کے ــــ

تازہ ترین خبر یہ ہے کہ پچھلے ایک ماہ میں ان کو دو مرتبہ کتّے نے کاٹ لیا ہے اس لیے کھادی کا کرتا پاجامہ پہنے ہاتھ میں ڈائری کان میں قلم لیے گھوم رہے ہیں اور جلد سے جلد میونسپل کاونسلر بن جانا چاہتے ہیں تاکہ شہر کے سارے کتّوں کو زہر دے سکیں۔



کمزور طبقات کیلئے دست تعاون



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کی عمل آوری میں آندھرا پردیش بہت پیش پیش ہے۔ اس پروگرام کے جز کے طور پر حالیہ برسوں میں کمزور طبقات کے لئے کئی فلاحی اسکیمات کو روبہ عمل لایا گیا ہے۔

فلاحی اقدامات کے سلسلہ میں کئے گئے کچھ نمایاں اہم کارنامے یہ ہیں۔

* فاضل زمینات کی تقسیم :-

۷۴,۰۶۲	درج فہرست اقوام	۱۰٫۵ لاکھ ایکر
۲۴,۳۷۱	درج فہرست قبائل	۳۹٫۰۹ ہزار ایکر
۴۰,۸۷۱	پسماندہ طبقات	۵۸٫۷ ہزار ایکر

۴,۶۳,۷۶۲ کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں ۱۱٫۸ لاکھ ایکر

* کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے ۱۲ لاکھ افراد میں مکانات کی اراضی کی تقسیم

۱۲۷۰۱ مکفول مزدوروں کو آزاد کر دیا گیا جن میں سے ۵۸۰۰ مزدوروں کی باز آبادکاری عمل میں لائی گئی۔

* ملکیت مزدوروں کیلئے اقل ترین اجرتوں پر عمل آوری کرائی گئی اور ایسے مزدوروں کا تعلق کمزور طبقات سے ہے
* سرکاری ملازمتوں میں پسماندہ طبقات کے لئے تحفظات کی معیاد کو مزید دس سال کی توسیع دی گئی۔
* بین فرقہ جاتی شادیوں کے لئے ترغیبات دی جارہی ہیں۔

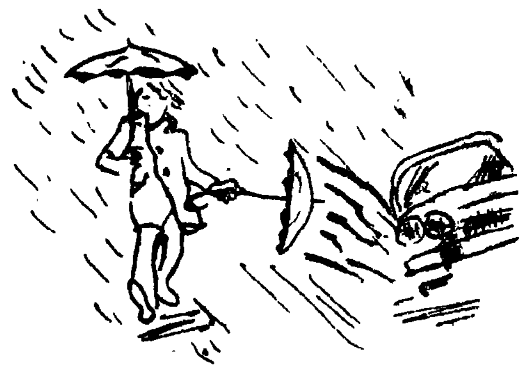
آندھرا پردیش کے کمزور طبقات آج اشتیاق کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور ایک بہتر اور درخشاں مستقبل کی امید کئے ہوئے ہیں

جاری کردہ :- نظامت اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

NO 21 - D.P.R - 18 300/81.



ہنسنے کی کوئی بات نہیں
ایسا بھی ہوتا ہے۔



چھتری بڑی اچھی چیز ہے
اور دو ہوں تو کیا کہنا !

چودھویں سالانہ کل ہند مزاحیہ مشاعرے کی رپورٹ

دوسری قسط

وعدہ کے مطابق زندہ دلانِ حیدرآباد کے چودھویں سالانہ کل ہند مزاحیہ مشاعرے کی ٹیپ کردہ رپورٹ کی دوسری اور آخری قسط پیش قارئین ہے۔ بعض وجوہات کی بنا پر پچھلے شمارے میں مکمل رپورٹ شامل نہ کی جا سکی تھی۔ جس کا ادارہ کو بے حد افسوس ہے ـــــ پہلی قسط کی اشاعت پر قارئین نے مکمل رپورٹ کیلئے استفسارات کئے۔ اور دلچسپی اور اشتیاق کا اظہار کیا جس کیلئے ادارہ اُن کا ممنون ہے

محمود نشتر

غزل

دل میں لڑائی جھگڑے کے اور مار دھاڑ کے
نکلا کرو گھروں میں شرافت کو گاڑ کے

کشمیریوں کے حسن کا چرچا تو ہے مگر
ہم کو تو ہیں پسند حسیں مارواڑ کے

حملہ اگر کرے کوئی مجھ پہ لبِ سڑک
سر توڑ دوں گا لائٹ کا کھمبا اکھاڑ کے

باندھا ہے یوں عمامہ کہ داڑھی بھی چھپ گئی
آیا ہے شیخ میکدہ، حلیہ بگاڑ کے

میخانہ اور باغ سبھی بھول جاؤ گے
پی کر تو دیکھو سائے میں سیندھی کے جھاڑ کے

غسال اگر چناؤ لڑے گا تو آئیں گے
مُردے بھی ووٹ دینے کفن اپنا پھاڑ کے

چند احمقوں نے آگ لگائی ہے پھوٹ کی
کر دیں گے ٹکڑے ٹکڑے وہ نوبت پہاڑ کے

نشتر مرے لبوں پہ تبسم یوں ہی رہیں
میں آ رہا ہوں رستمِ غم کو پچھاڑ کے

اشرف خوندمیری

"جنور کی چھوں پڑیئے"

صورت کی باسی اڈلی ہو سانبر کی چھوں پڑیئے   قسمت ہو مقدر کے سکندر کی چھوں پڑیئے
اماں بی ہم رئیں مجے بس پان کا ٹکڑا   جب سے کلر ہو ذرّی سی ڈانبر کی چھوں پڑیئے
قسمت پہ اپنی ہستا ہے سوبندر کی چھوں پڑیئے
آدمی ہوں پن کی منجے بی جنور کی چھوں پڑیئے

آکو مرے نصیب سے لڑگئی بڑی چڑی   کیٹکو کی میرے پیچھے بی پڑگئی بڑی چڑی
جب میں بی تیرا تیزی کو پیدا ہروں سکتے   آکو پتنگ کٹنے بی اُبڑ گئی بڑی چڑی
غلطی سے میری چھوں پو دلندر کی چھوں پڑیئے
آدمی ہوں پن کی منجے بی جنور کی چھوں پڑیئے

ڈر ڈر کو زندگی کی یوں بنڈی بکال رؤں   گھر بھر کو بھربی بچوں کے منڈے کو پال لؤں
کیا کیا کی کر کو لوگاں تو آنے سے روک رئیں   میں آنے والے منتے کے رکنے کو ٹال رؤں
منجے مرے پڑوس کے دھنگر کی چھوں پڑیئے
آدمی ہوں پن کی منجے بی جنور کی چھوں پڑیئے

بندوں کو دکھا توں زرست شکل کو میں   کھوٹے کو بولتوں کھٹکھٹا کو ٹکل کو میں
جب بی نہ نہ تو نزلے کا جھٹکے عقل پو دیمنی   کرتوں تہ شاعری بی ذندا مکل کو میں
منجے بہ بہ بھکتے وسے شاعر کی چھوں پڑیئے
آدمی ہوں پن کی منجے بی جنور کی چھوں پڑیئے

میں روز روز رنگ بدل رؤں ہوا کے نات   موں اپنا موڑ موڑ کو چل رؤں ہوا کے نات
میں بی اُتانا پڑ کو یوں آپے سے بھار ہوں   پھٹے پھٹے کو روز بھار نکل رؤں ہوا کے نات
جب سے میرے بی ٹیوب کو پنچر کی چھوں پڑیئے
آدمی ہوں پن کی منجے بی جنور کی چھوں پڑیئے

چپٹی چڑا کو باتاں بی کرتوں میں کوڈ میں   ہمیرا اشتہار ہونے لگا ہے دقف بورڈ میں
ہر روز موں بھیرے سے لیکو یوں شام تک   سارے غموں کو بھگی کو جور ہتوں میں لوڈ میں

میرے یوپی ایکسائز منسٹر کی جھوں پڑ جیئے
آدمی ہوں بَن کی منجے بی جنور کی جھوں پڑ جیئے

میں ڈنک مار مار کو لھو سوب کا چوس رؤں
اک لت پڑ ییٔے منجے بی تو لھو سوب کا چوس رؤں
چاؤل کے، تیل کے کبی شکر کے، گوڑ کے
بھاواں بڑا بڑا کو جو لھو سوب کا چوس رؤں
کھٹمل کی جھوں پڑیئے کبی مچھر کی جھوں پڑ یئے
آدمی ہوں بَن کی منجے بی جنور کی جھوں پڑیئے

میرے مُلک میں سوب کا یوں بونتہ اُداس ہے
ارماں لھو لھوان، بلکتی وی آس ہے
یہ کیسی بھال مارئیے مرے خاندان کو
پانی کی نیئں ہے بھائیوں کو لھو کی پیاس ہے
گھنیٹ پو میرے پیا سے سمندر کی جھوں پڑیئے
آدمی ہوں بَن کی منجے بی جنور کی جھوں پڑ یئے

بھر بھر کو پیالے میٹھے زہر کے میں بانٹ رؤں
دِک کے نات اپنے مُلک کو میں چاٹ رؤں ں
ہنسا کا راگ گاکو اہنسا کے نام پو
کٹوں لے سروں کے مو لکے نفرت سے کاٹ رؤں
اشرف منجے بی مجلسے لیڈر کی جھوں پڑ یئے
آدمی ہوں بَن کی منجے بی جنور کی جھوں پڑ یئے

قادر حیدر آبادی

قطعات

طنز و مزاح کھیل نہیں ہے خدا گواہ
تلوار کی بھی دھار سے ہے تیز تر یہ راہ
جو پھول اور کانٹے کی پہچان لے
وہ آہ کو بھی واہ کہیں واہ کو بھی آہ

بات کڑوی سہی اک بار تو کہنے دیجئے
اشک آنکھوں سے جو بہتے ہیں تو بہنے دیجئے
اک گزارش ہے ادب پر ہو عنایت اتنی
فرق جو بھانڈ میں شاعر میں ہے رہنے دیجئے

کس کو ہوتی ہے ندامت وہ غلط ہو کر صحیح
شعر کہنے کی ہے عادت وہ غلط ہو کر صحیح
ہم تو فطرت سے ہیں مجبور کریں کیا قادر
کرتے رہتے ہیں حماقت وہ غلط ہو کر صحیح

خواہ مخواہ

سو محفلوں پہ بھاری یہ قہقہوں کی محفل
یہ زندہ دل ادیبوں اور شاعروں کی محفل
اللہ بچائے اس کو دشمن کی نظر بد سے
چودہ برس کی ہوگئی زندہ دلوں کی محفل

غزل

دیکھو کتا بھاڑوں میں نئیں بولے تو سنتے نئیں
اپنی من مالی تم کر رئیں نئیں بولے تو سنتے نئیں

میرے گھر میں رہ کو باتاں آتاں یاد آ کے کر رئیں
یاں کا کھا کو واں لگا رئیں نئیں، بولے تو سنتے نئیں

دو بی نئیں تو جدہ جاؤ کیسا بی یاں سے نکلو
اٹھتے بیٹھتے بھیجہ کھا رئیں نئیں بولے تو سنتے نئیں

اتی عمر میں باہر جا کو خاک کما کو لاؤں گا
باتاں دھو کو پیچھے پڑ گئیں نئیں بولے تو سنتے نئیں

دن بھر کام سے تھک کو آیوں چھٹیاں مت لیو، سو دیو
اب میں کچھ بی کر سکتا نئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

مُوں پو میک اپ تھوپ کو جاتی عمر کے پیچھے مت بھاگو
گئی سو جوانی پھر آتی نئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

بالوں میں چٹلا جوڑے تو بنتا ہے سر کا جوڑا
لیکن بالاں سٹ کر وا رئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

اُن کے بالاں سٹ ہونے تک میرے سر میں گنتی کے
ہے سو بالاں جھڑ کو جا رئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

چربی چھپٹ کو دُبلے دِکھنے ایک ہفتہ سے ڈائٹ پو ہیں
چلتے چلتے ڈھکلیاں کھا رئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

کھائے تو گھی سے کھائینگے نئیں تو بھوکے رہیں گے کئے
جھوٹی شان میں سڑ کو مر رئیں نئیں بولے تو سنتے نئیں

پھوڑے پو جم گئی سو کھیلی ناخن سے نکو نوچو
چھل گئے سو غم تازہ ہو رئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

سمدھی سے جب پوچھا میں، کیا سمدھن پھر اُمید سے ہیں
شرما کو بس اتا بولئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

سینگ کٹا کو بچھڑوں میں تم کیکو مل رئیں خواہ مخواہ
لوگاں دیکھ کو ہنستے جا رئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

÷ ÷ ÷

شمسی مینائی

قطعات

دھرتی پہ رہ کر چاند پہ قبضہ کریں گے ہم
راکٹ کی شرط ہے نہ ضرورت ویمان کی
ہم کیوں اُڑیں فضا میں، مصیبت اُٹھائیں کیوں
مہنگائی لا رہی ہے خبر آسمان کی

÷ ÷ ÷

اہلِ وطن کا شوق یہاں تک بدل گیا
چوری چھپے کی بات بھی محفل میں آ گئی
کیا حوصلے کے لوگ ہیں ہندوستان میں
رشوت بھی اختیار کی منزل میں آ گئی

یہ کلیجہ ہے اپنے بھارت کا
جسم پیلا ہے دل بسنتی ہے
ظلم ہی ظلم ہر طرف لیکن
پیار ہی پیار فلم بنتی ہے

٭ ٭ ٭

نعروں پہ عمل کوئی ضروری تو نہیں ہے
ہر چیز کو سرکار کی جاگیر بنا دو
اب تم سے غریبی تو ہٹائی نہیں جاتی
بہتر تو یہی ہے کہ غریبوں کو ہٹا دو

٭ ٭ ٭

گاندھی کا قتل :-

گاندھی بدن کا نام نہیں ہے اصول کا
گاندھی کے ہر اصول کو ٹھکرا دیا گیا
گاندھی کا قتل عام سبھا میں نہیں ہوا
گاندھی کا قتل لوک سبھا میں کیا گیا

٭ ٭ ٭

کھانے پینے کی گرانی بڑھ گئی ہے اس قدر
بھوک سے کیا فائدے ہیں کھوج کرنی چاہیئے
کیجئے جینے کی صورت اور ہی کچھ اختیار
پیٹ گر بھرتا نہیں ہے، آہ بھرنی چاہیئے

٭

گنّے سے گر بنے تو نہ مہنگی ہو اس قدر
شائد جواہرات سے بنتی ہے اب شکر

٭

کم غذا بہتر ہے، انساں میں چستی کے لئے
ریل کا مہنگا سفر ہے تندرستی کے لئے

نظم

سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا
وعدہ لپیٹ لو جو لنگوٹی نہیں تو کیا
عالم بڑے بڑے ہیں تو رہبر گلی گلی
بارش ہے افسروں کی تو دفتر گلی گلی
شاعر ادیب اور قلندر گلی گلی
سقراط در بدر ہیں سکندر گلی گلی
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا
وعدہ لپیٹ لو جو لنگوٹی نہیں تو کیا
ہر دھرم اور دین کا جمگھٹ یہاں پہ ہے
دنیا کی ہر مشین کا جمگھٹ یہاں پہ ہے
ہر فن کے ماہرین کا جمگھٹ یہاں پہ ہے
اُتر میں فوجِ چین کا جمگھٹ یہاں پہ ہے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا
وعدہ لپیٹ لو جو لنگوٹی نہیں تو کیا
ہر شوق، ہر اُمنگ ترقی پہ ہے یہاں
سنگیت، ناچ، رنگ ترقی پہ ہے یہاں
گانجا، شراب، بھنگ ترقی پہ ہے یہاں
آپس میں پھر بھی جنگ ترقی پہ ہے یہاں
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا
وعدہ لپیٹ لو جو لنگوٹی نہیں تو کیا
ہر راستے میں فلمی نگینہ جڑا ہوا
ہر موڑ پہ جوان سپاہی کھڑا ہوا
ہر شئے پہ انتظام کا پردہ پڑا ہوا
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

بولی میں وہ مٹھاس کہ بجتے ہیں ساز بھی
ہر سر میں ہے غرور تو ہر دل میں ناز بھی
بنتے ہیں اپنے گھر میں ہوائی جہاز بھی
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

ہر در پہ ہر مقام پہ آثارِ حُسن بھی
حاصل قدم قدم پہ ہے دیدارِ حُسن بھی
انکارِ عشق ہے کہیں اقرارِ حسن بھی
اپنے نگر نگر میں ہے بازارِ حُسن بھی
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

رنگینیٔ مزاج ہے، رنگین شب تو ہے
ہر شہر کی یہ شان کہ انگلش کلب تو ہے
حُبِ وطن نہیں ہے مگر اور سب تو ہے
خوفِ خدا نہیں ہے خدا کا غضب تو ہے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

ہر قسم کی جدید مہارت ہمارے پاس
ہر ایک پردہ دار تجارت ہمارے پاس
اپنوں کو لوٹنے کی بھی ہمت ہمارے پاس
کھیلوں میں ہارنے کی مہارت ہمارے پاس
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

حاکم ہیں ایسے دیس کا قانون توڑ دیں
رشوت ملے تو قتل کے مجرم بھی چھوڑ دیں
ایسے وکیل اپنے موکل کو نچوڑ دیں
سرجن ہیں ایسے پیٹ میں اوزار چھوڑ دیں
نگراں جو ملزموں کی آنکھیں بھی پھوڑ دیں
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

وعدہ لپیٹ لو جو . . . .

سرحد پہ اپنی چین کا قبضہ بھی ہو گیا
کشمیر اپنے دیس کا حصہ بھی ہو گیا
ڈھاکہ سے ظالموں کا صفایا بھی ہو گیا
ایٹم کا زوردار دھماکہ بھی ہو گیا
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

ہر کام چل رہا ہے یہاں پر بیان سے
سرکار کے ستون تو رہتے ہیں شان سے
قرضہ تو مل رہا ہے ہمیں ہر دکان سے
خیرات آ رہی ہے بڑی آن بان سے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

یہ نور کا نہیں تو سیاہی کا طور ہے
ہر جھوٹ، ہر گناہ کا ہم کو شعور ہے
دنیا کے اور دیسوں کو دھن پہ غرور ہے
فنِ گداگری پہ ہمیں بھی عبور ہے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

ذہنوں میں کشمکش ہے بدیسی کے واسطے
سڑکوں پہ کتنا رش ہے بدیسی کے واسطے
بھارت میں سارا عیش ہے بدیسی کے واسطے
بوسوں کی کشش ہے بدیسی کے واسطے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

بھارت میں آج کون وفادارِ قوم ہے
ڈالی جگہ جگہ سے جو دیوارِ قوم ہے
ہر ملک کا سفیر خریدارِ قوم ہے
ہر دل کہیں بکا ہے، اداکارِ قوم ہے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

وعدہ لپیٹ لو . . . .

نفرت کی دھوم، نانک و چشتی کا دیس ہے
ہر ظلم آس پاس، یہ تلسی کا دیس ہے
ہر سمت مار کاٹ، یہ گاندھی کا دیس ہے
غلّہ نہیں تو کیا یہ کھیتی کا دیس ہے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

ٹھاکر ہیں، برہمن ہیں، مغل ہیں، پٹھان ہیں
میدانِ جنگ کے لئے کڑیل جوان ہیں
اہلِ زبان، اہلِ ادب، اہلِ شان ہیں
ہل، بیل ہیں، زمین ہے، بڑھیا کسان ہیں
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

دنیا کے اعتبار سے بلراج تو نہیں
مانا کہ ہم زمانے میں سرتاج تو نہیں
قبضے میں اپنے دھن تو نہیں ناج تو نہیں
دکھ درد میں کسی کے بھی محتاج تو نہیں
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

چیونٹی کا ذکر کرتے ہو ہاتھی کے سامنے
وردھا کا نام لیتے ہو دلّی کے سامنے
مٹی کی بات کرتے ہو چاندی کے سامنے
روٹی بھی کوئی شئے ہے ترقی کے سامنے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی ہیں تو کیا

جنتا سے کہہ دو شور مچانا فضول ہے
تکلیف کا بیان سنانا فضول ہے
شاہانِ قوم کو ستانا فضول ہے
سوتے ہیں صبح نیند جگانا فضول ہے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا
وعدہ لپیٹ لو جو لنگوٹی نہیں تو کیا

دعوتِ شراب

جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیو
نہیں ہے غم کا بدل اک ذرا خوشی کا سرور
جوابِ گردشِ دوراں ہے زندگی کا سرور
سرورِ مئے سے بھی بڑھ کر ہے تشنگی کا سرور
جو یہ شعور گوارا نہ ہو تو خوب پیو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیو

وہ سر جھکائے ہوئے گھر کی لاج بیٹھی ہے
پہاڑ دل پہ ہے نازک مزاج بیٹھی ہے
نگاہ در پہ، نظر میں سماج بیٹھی ہے
یہ انتظار تمہارا نہ ہو تو خوب پیو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیو

اُجاڑ گھر ہے تو سونی ہر ایک راہ گذر
اندھیری رات کا عالم کہاں ہے نورِ سحر
تڑپ رہا ہے دوا کے لئے جو لختِ جگر
تمہاری آنکھ کا تارا نہ ہو تو خوب پیو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیو

اُجاڑ گھر کا ہر اک در سجاؤ تو مئے سے
اور اپنے بچوں کی قسمت بناؤ تو مئے سے
یہ صرف پینا ہی کیا ہے نہاؤ تو مئے سے
اگر حیا نے سنوارا نہ ہو تو خوب پیو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیو

گلی گلی پہ جو چھایا ہے بے بسی کا غبار
روش روش پہ چمن کی ہے رہزنی کا غبار
چمن کے گرد بھی چھایا ہے دشمنی کا غبار

تمہیں وفا نے پکارا نہ ہو تو خوب پیئو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیئو

تمام رات ہو وعدۂ شراب کیا کہنا
خوشی کی بات ہو وعدۂ شراب کیا کہنا
غمِ وفات ہو دورِ شراب کیا کہنا
حقیقتوں کا نظارا نہ ہو تو خوب پیئو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیئو

حسین و شوخ نظارے ہیں آدمی کے لئے
یہ مہر و ماہ یہ تارے ہیں آدمی کے لئے
قدم قدم پہ اشارے ہیں آدمی کے لئے
کہیں سے کوئی اشارہ نہ ہو تو خوب پیئو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیئو

خوشی کی فکر میں جادوگری غلط ہوگی
شکستِ غم کے لئے میکشی غلط ہوگی
جو غم غلط نہ ہوا تو زندگی غلط ہوگی
یہ مشورہ بھی گوارا نہ ہو تو خوب پیئو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیئو

انجم فریدی

سسرال کا جغرافیہ

کتنے کو میوں کو تو کھنگالی گئے
کیسے لوگاں میں بنھے ڈالی گئے

بھوت ارمان تھا میری شادی کا
کتنے ارمان تو نکالی گئے

کیسی مصیبت میں ڈال دی اماں
جان آفت میں ڈال دی اماں

چال اُن کی ہر اک نرالی ہے
ایک سے ایک منھ پو ننگی گالی ہے
سُسر کے ناد منھ پو مُچھیاں ہیں
چال دیکھو تو نخرے والی ہے

کھانے حاضر ہے کام کو نیئں ہے
سر میں بھیجہ بھی نام کو نیئں ہے

جب بھی پی لے کے گھر کو آتے ہیں
اماں باوا بھی کانپ جاتے ہیں
جو بھی آتا ہے سامنے اس کے
اُن کا باجا اِنوں بجاتے ہیں

کِتّا اُنچا مقام ہے اُن کا
سارے تھانوں میں نام ہے اُن کا

گھر کی مختار دیورانی ہے
بھوت بکی ہے بھوت سیانی ہے
گھر کے لوگاں پو راج کرتی ہے
اُس پہ سُسرے کی مہربانی ہے

چغلیاں کھانے میں ایک نمبر ہے
آنگ پو پورا نقلی زیور ہے

گھر کے کاماں سے دور ہے بڑی
ڈب کو فیشن میں چُور ہے بڑی
بیل باٹم میں اور میکسی میں
جیسے فلموں کی حور ہے بڑی

اس بڑھاپے میں بھی اُنانی ہے
اُن ایتا بہ کی دیوانی ہے

جیب تو ایک کٹار ہے خالہ
تیز خنجر کی دھار ہے خالہ
غصہ بجلی کا تار ہے گویا
اُف طبیعت ابھار ہے خالہ

توپ کا باپ ہے ایٹم بم ہے
ساری بستی کا ناک میں دم ہے

گھر میں سب سے ضعیف ہے سسرا
مبتلا پا پڑ، نحیف ہے سسرا
ذرّہ گا سمجھے کی اُس کو عادت ہے
ورنہ بالکل شریف ہے سسرا

کیسا مصیبت میں ڈال دی اماّں
جان آفت میں ڈال دی اماّں
میں تو پتلی تھی تیرے آنکھوں کی
مجھکو آنکھیں نکال دی اماّں

مجھے شادی کی کیا ضرورت تھی
جان کو تیری کیا مصیبت تھی
تیری خدمت نماز روزہ تھے
تیرے قدموں کے نیچے جنت تھی

میں تو گھر میں ہی بجوّت اچھی تھی
ایسی شادی سے موت اچھی تھی

نریندر لوتھر

اندھے پن کی وجوہات

ہندوستان میں ایک کروڑ سے بھی اوپر اندھے لوگ ہیں
اندھے پن کی کئی وجہ بتاتے ہیں
خوراک کی کمی
مٹی اور آندھی
چیچک جیسی مہلک بیماریاں
اور پھر گاؤں کے نیم حکیم
اور ضلع پولیس کی ٹیم

پولیس سمینار

پولیس کے نیشنل سمینار میں
ہر ریاست کے نمائندے شامل ہوئے
ہر ایک نے اپنے خاص کارنامے بتلائے
اور جرم اور دنگوں کو روکنے کے نئے تجربے بتائے
دہلی پولیس نے ڈینگ ماری
ہم نے تماشاؤں پر بھی لاٹھی چارج کیا
تاکہ بینائی والوں کو عبرت ہو
اس پر بہار کے نمائندے نے للکارا
واہ بھئی آپ وہ کریڈٹ لے رہے ہیں
جو ہمیں ملنا چاہیئے
بھلا سوچیئے آپ کو لاٹھی چارج کے لئے اندھے کہاں سے ملتے
اگر ہم بھلے چنگے لوگوں کو اندھا نہ کرتے

* * *

صبغت اللہ بمباٹ

نسخۂ کیمیا

ہاتھ جوڑے لیڈروں کے سامنے پھرتے رہو
شاعری بےکار ہے، تک بندیاں کرتے رہو
تہنیت اُن کی، قصیدے اُن کے، تذکرہ اُن کا مدام
اُن کی تسبیح اللہ کو سجدہ، اُن کی خفتہ کو سلام

لوانسٹی ٹیوٹ

موڑ پر بازار کے تھا ایک چھوٹا سا مکان
لوانسٹی ٹیوٹ کا تھا بورڈ آویزاں جہاں
جسم کے پوشیدہ اعضاء تھے عیاں دیوار پر
ہر طرف چسپاں تھے طبالی فلم کے پوسٹر
تھی ہر ایک تصویر کچھ اسطرح لہرائی ہوئی
جیسے ہو کافر جوانی جوش پہ آئی ہوئی
مجھ کو حیراں دیکھ کر پہلے تو وہ ہنسنے لگا
ٹھیک کرکے اپنی عینک پرنسپل کہنے لگا
ویسے یہ مکتب ہے لیکن اس کو کالج جانیے
اور مجھے الفت کے ماروں کا معالج جانیے
نوجواں دل تھام کر پھر اسطرح گویا ہوا
عشق میں [illegible] مگر یہ سوار ہوا
جب بلاتا ہوں، میں اُس کو [illegible] شام میں
مجھ سے ملنے آتی ہے اسکول یونیفارم میں
[illegible] سے ڈرتی ہے اور لو سے کتراتی ہے
جب کہ اُن کی خالہ یہہ گاتی ہیں جھولا ڈال کے
میں ہوں اب سولہ برس کی، وہ ہیں سترہ سال کے
اور نانی اُن کی گلی سے گلستاں ہونے کو ہیں
کان کا جھمکا بریلی میں کہیں کھونے کو ہیں
پہلے دن نوواردں سبق پڑھنا تمہیں زیبا نہ تھا
وہ جو ابا نافسیاں کہتے تو کچھ بے جا نہ تھا
عشق بھی اک آرٹ ہے شعر اور نغمے کی طرح
دل کی وادی میں کھٹک اٹھتا ہے جھرنے کی طرح
ٹاپنے کا صبر کرنے کا رہے جاری ریاض
جلد بازی سے ہے لازم عاشقوں کو احتراز
پھر بقول جوش ایک دن یہ تو ہوتا ہے ضرور
مہترانی ہو کر رانی گنگنائے گی ضرور
آئی ایک دن نازنیں جب پرنسپل کے سامنے
جیسے تتلی کوئی اخلاق ہے گل کے سامنے
میں نہیں ہے مرا بنگلہ ان کے حق میں عشق میز
ان کے ابا مانگتے ہیں میرے ڈیڈی سے جہیز
پرنسپل چیخ اٹھا ہے سب سے بڑی لعنت جہیز
چاہے بنگلہ ہو کہ موٹر، چاہے کرسی ہو کہ میز
لڑکی:۔ اے میرے پیارے پرنسپل میں رہونگی تیرے ساتھ
بست بست لالچی عاشق نہ تھامے میرا ہاتھ

مصطفیٰ علی بیگ

آنیوالے گیت کا ٹریلر

شیم شیم شیم شیم۔ شیم شیم

صورت سے امریکہ والی ہے
پردہ کوڑنگل کی پالی ہے

جس بش شرٹ میں پھرتی ہے
پوچھتی ہے کہ کیا ہے شیم
شیم شیم ....

دو ہی منٹ میں لڑا دیا
اور پانچ منٹ میں ملا دیا

کٹھ پتلی کا ناچ نچائیں
نیتاؤں کا ہے یہ گیم
گیم گیم ....

÷ ÷ ÷

اسمٰعیل آذر

ژا ژا راستہ تیرے پیار میں
ذرا دیکھ کیا جا جا جال ہے
ہَ جا جسم ہے ذرا نا تواں
کھ کھو کھوپڑی ٹاٹا ٹال ہے

ژرا رنگ ڈھنگ تیرا دیکھ کر
ہَ ہَا میں اِدھر دُوا ڈنگ ہوں
دَ دَا دل لگی میں کہوں اسے
یَیا یا تیری چا چا چال ہے

پَپا پچھلے خط میں یہ کیا لکھا
کہ میں شکل سے ڈھ ڈھ ڈھول ہوں
ہَہا میرا قد، تیرا ڈیڑھ فٹ
سُد نعا بھینس کی یہ چا چا چال ہے

÷ ÷ ÷

طالب خوندمیری

منت نہ خوشامد نہ ادب سے مانگو
انداز بدل کر نئے ڈھب سے مانگو
یہ بھیک نہیں ووٹ ہیں لیڈر صاحب
وعدوں سے، فسادوں سے، غضب سے مانگو

کھٹملوں کی فریاد

ایک دن اک جونک سے کچھ کھٹملوں نے یہ کہا
دیجئے خالہ ہمیں بھی کوئی ایسا مشورہ
اب بجائے خون کوئی اور ہی شئے پی سکیں
آدمی سے دور رہ کر ہم خوشی سے جی سکیں
کیونکہ اس میں خون اب کم کم ہی پایا جائے ہے
اب نہ چوسا جائے ہے اس کو نہ چاٹا جائے ہے
اس کی شریانوں میں یوں تو خون ملتا ہی نہیں
مل بھی جاتا ہے تو اس میں ذائقہ کچھ بھی نہیں
اس میں سرخی سے زیادہ ہے سفیدی آج کل
خون کی صورت ہو گئی ہے دودھ کی سی آج کل
کون جانے کیا بلا کھانے لگا ہے آدمی
کس ملاوٹ کی غذا کھانے لگا ہے آدمی
اک زمانہ تھا کہ ہم نے خون کے دریا بھی پیئے
آج گھنٹوں چوستے ہیں ایک قطرے کے لئے
کیا کہیں خالہ! ہماری پیاس بجھتی ہی نہیں
اس سے پہلے یہ گرانی خون کی تھی ہی نہیں

اب حسینوں کی رگوں میں بھی لہو، باقی نہیں
اُن کی محفل میں بھی کوئی، خوں بھرا ساقی نہیں
پہلے اِن کا خون ہوا کرتا تھا مانندِ شراب
یوں جھلکتا تھا رگوں میں جیسے گلشن میں گلاب
چوستے ہی اُن کو، اپنا بھی نکھرتا تھا شباب
اک نئی کروٹ بدلتا تھا بدن میں اضطراب
بوئے خوں سے مست ہو کر جھومنے لگتے تھے ہم
اپنی اپنی "کھٹمل" کو چومنے لگتے تھے ہم

ہو گئے ہیں آج کل وہ نوجواں بھی بد مزہ
جن کی شریانوں میں بہتی تھی کبھی جوئے طِلا
جن کا خون پیتے ہی الکشر موج میں آتے تھے ہم
منہ لگاتے ہی جنہیں سرشار ہو جاتے تھے ہم
اب انھیں کو چوس کر بیمار پڑ جاتے ہیں ہم
سوکھ جاتے ہیں، سکڑ جاتے ہیں، سڑ جاتے ہیں ہم
اب کہاں تک ہم کریں اپنے غموں کا تذکرہ
کچھ دنوں پہلے ہمارے ساتھ ایسا بھی ہوا
پھوٹ نکلی تھی ہمارے جسم سے گانجے کی بو
پی لیا تھا بھول کر ہم نے جو ہپی کا لہو
کیا کہیں کیا کیا بلا، کیا زہر اُن کے خوں میں ہے
"ایک ٹوٹی" سے زیادہ زہر اُن کے خون میں ہے
جس میں ہوتا تھا کبھی خالص غذاؤں کا مزہ
آج ملتا ہے اُسی خوں میں دواؤں کا مزہ
اپنی ساری چاشنی کھو...

آپ ہی کہیئے کہ ہم خالص لہو پائیں گے کیا
آدمی کے ساتھ رہ کر ہم نہ مر جائیں گے کیا

سُن چکی جب کھٹملوں کی داستانِ تشنگی
اِک ادائے خوں چکاں سے جونک یہ کہنے لگی
آج تک تم نے پیا ہے صرف جنتا کا لہو
اب ذرا پی کر تو دیکھو ایک نیتا کا لہو
اب تو میرا بھی گزارا ہے انھیں کے خون پر
مئے کشی ہے شغل اُن کا "خوں کشی" میرا ہُنر
سیر ہو کر روز پیتی ہوں کسی نیتا کا خوں
کیا مزے ہیں آج کل کام و دہن کے کیا کہوں
اُن کی ہر شریان ہوتی ہے خزانہ خون کا
ایک اک نیتا ہے گویا کارخانہ خون کا
ایک بھی قطرہ کسی نیتا کا جو پا جائے گا
اس کو جنتا کے لہو کا بھی مزہ آ جائے گا

* * *

علی صائب میاں

بھیک کے خرمے سے دال اپنی بگھاری اچھی
غیر کی گاڑی سے پیدل کی سواری اچھی
عزت، ایمان گنوا کے اگر ملتی ہے
ایسی ہریالی سے تو پیلی جواری اچھی

گمی ترقی، املی کے بوٹاں لگ گئے انجیر کو
ایک گلہری بن لئے ہیں بھینس کی زنجیر کو
شاعراں اب بول رہیں نوے قسم کی شاعری
ایک مصرعہ تیسر کو تو ایک مصرعہ میر کو

ڈھل بازی، ظلم کو کاں چلے گئے روکنے والے
کدھر چھپ گئے مصیبت کے وقت خم ٹھونکنے والے
فقط تقریراں جھاڑیں گے، کریں گے جھوٹے وعدے سب
یہ مسئلہ ہے پرانا کاٹتے نیئں سبو نکلنے والے

ہڈیاں ٹوٹنے تک کتو ایٹیاں کراتے رہے
تنخواہ کی بات آئی کی بھرکیاں پھراتے رہے
عمر تمام یوُنیچ کٹی علی صائب کی
اماں کا کھاٹے ماموں کے بکریاں چراتے رہے

سیاست میں گھس کر حماقت کرے نا
ہمیں زندگی اپنی غارت کرے نا
الیکشن میں جن جن کو کھاندا دئے تھے
اُنوں خود ہماری حجامت کرے نا

مجنوں عشق کی لاج تک نیئں بچا سکا
لیلیٰ کو اپنے دل میں اُنے نیئں رچا سکا
کُتّے کے سرکا بھوکتا جنگلے جنگل پھرا
عشق کی کھیر پی گیا پَن، نیئں بچا سکا

اسمٰعیل ظریف

انگلینڈ میں اُگتے تھے املی کے شجر پہلے
انگریز بھی کھاتے تھے لندن میں جگر پہلے
وہ ڈارون ہو لا تھا بندر سے جو دی تشبیہ
حلیہ یہ بتاتا ہے انسان تھا بندر پہلے

اک نیم حکیم ایسا بھی مشہور ہے جس کی
اخباروں میں تشہیر ہے اور نام بہت ہے
بیمار نے اک جبکہ دوا کھائی تھی اس کی
سنتے ہیں کہ مرحوم کو آرام بہت ہے

گدھا دکھلا کے شوہر نے کہا بیگم ادھر دیکھو
تمہارا کوئی رشتے دار آیا ہے یہاں چل کر
کہا بیگم نے پہلے تو نہ تھا اس سے کوئی رشتہ
مگر اس دوسرے رشتے سے ہوتا ہے برادیور

کبھی تم رہے مرے ہمسفر تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
گئے ساتھ ساتھ سرینگر تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہاں جاکے ساتھ رہے مگر گئے ہم سے پہلے ہی لوٹ کر
نئی شال لے گئے مار کر تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ریل کے اک حادثے میں اک مسافر مرگیا
دیکھئے انسانیت بھی کس قدر پستی میں ہے
اُس کی بیوہ کو ملی نقدی رقم لیکن ظریف
ہے ابھی مرحوم زندہ اور اسی بستی میں ہے

مختار یوسفی

کسی صاحب کو چسکا لگ گیا تھا شعر گوئی کا
اُنھوں نے سوچ کر اپنا تخلص رکھ لیا ابّا
ہوئے مشہور پبلک میں مگر مشکل یہ آ پہونچی
انہیں کہتی ہیں سب کے ساتھ اُن کی اہلیہ ابّا

میری بیوی غائب ہے پچھلے جمعہ سے
خبر اُس کے ملنے کی جو کوئی دے گا
قسم کھاکے کہتا ہوں میں اپنے رب کی
اُسے جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا

چمپتن میں چار ہو گئے باون میں کچھ نہ تھا
پھر بھی وہ کہہ رہے ہیں قمیص میں کچھ نہ تھا
روٹی پکائی دونوں نے پھر کیسے مان لیں
چوکی میں سب کمال تھا بیلن میں کچھ نہ تھا

غزل

دکھایا اُس نے کھڑکی سے جمالِ بے مثال آدھا
نظر پوری ہوئی تھی دل ہوا لیکن حلال آدھا
سپروائزر نے پرچۂ عشق کا چھینا تھا جب مجھ سے
پڑھا اُس وقت تک میں نے نہ تھا پہلا سوال آدھا
ابھی سے اس کے بچے ڈر رہے ہیں اپنے سائے سے
ابھی اس قوم نے دیکھا نہیں اپنا زوال آدھا
مریضوں نے دوا کھانے کے بدلے چھوڑ دی دنیا
دکھایا ڈاکٹر صاحب نے یوں اپنا کمال آدھا
نئی بیوی کو دے کر سات بچے یوں کہا اُس نے
مرے بچوں کا کوٹہ آج سے تو بھی سنبھال آدھا
بڑھاپے میں سفور نے کا تماشہ کر گیا ثابت
یقیناً آتا ہے باسی کڑی میں بھی اُبال آدھا
بخار آیا کسی کو کوئی بھاگا خوف کے مارے
مریدوں کو دکھایا پیر جی نے جب جلال آدھا
مزہ اُس وقت آئے گا تجھے مرغِ مسلّم کا
پکا آدھا، گلا آدھا، بچا آدھا، نکال آدھا
دیئے پرمٹ کی خاطر رشوتاً مختار نے پیسے
کہا افسر سے چپراسی نے رکھ آدھا نکال آدھا

محمد علی منگلی

جاگو ہندوستانی جاگو

جب میں چھوٹا تھا تو اکثر
گاتے تھے کچھ لوگ ترانہ — جاگو ہندوستانی جاگو
عقل تھی چھوٹی حیراں تھا
بات سمجھ میں نہ آتی تھی
کیسے جگاتے ہیں یہ لوگ
جاگ رہا ہے ہندوستاں
ساری دنیا جاگ رہی ہے
بڑھ کر جوان ہوا تو دیکھا
جاگ چکی ہے ساری دنیا
سارا بھارت جاگا ہے۔
یہ کیا خواب خرابہ ہے
اب سمجھا میں نیند کا مطلب
کاش کوئی دنیا کو پھر سے
نیند کی گولی دے کے سُلا دے

دیکھیئے یورپ کی یہ ہنگامہ آرائی جناب
ہو گئی حوّا کی بیٹی ہر طرح سے بے حجاب
حسن کو طرار کا دے کر کر سامانِ حریم
کھا رہا آدم کا بیٹا اب شکستِ بے حساب

دوستی تلخ تجربات سے آگے نہ بڑھی
زندگی گردشِ دن رات سے آگے نہ بڑھی

حمایت اللہ

غزل

سہرے پہ سہرے کہتے بندھینگے بڑے حضرت
بچوں کے غول کہتے بڑھینگے بڑے حضرت
تم بے فکر رہو جی تمہاری مزار پو
سہرے کے بیچ پھول چڑھینگے بڑے حضرت
تسبیح پو گن کو نام تو لے رہیں خدا کا تم
اپنے گنا ہ کس پو گنیں گے بڑے حضرت
اپنے سفید بالوں کو کالا تو کر دئے
لاکھ بھی دل کی دور کرینگے بڑے حضرت
اب بھی وقت ہے عاقبت اپنی سنوار لیو
نئیں تو حشر میں ہاتھ ملیں گے بڑے حضرت

●

رہتے رہتے چپ جھگڑنا آتی رے
دل میرا ہلکے دم اُکھڑنا آتی رے
کھیل چھپنے کا کبھی کھیلے تو ہم
چپ کا چپ اُکو سپڑنا آتی رے
میں تڑپ کو جاگ کو آتوں لکو!
ڈھونگ کا کرنا لنگڑنا آتی رے
رُس کو گئے تو میں بلاتوں سر پیچ کر
جاتے جاتے اُن کا مڑنا آتی رے
منتاں کر کو بلایا آ گئے!
اس پہ اترا کو اکڑنا آتی رے

غصہ کرتے کرتے جب، آتی ہنسی
ہونٹ دانتوں میں مڑنا آتی رے
سہیلیوں کے بیچ میں چھیڑا تو میں
منہ مرا، مڑ ہیں اُن کا تڑنا آتی رے
میں تو تھا، اب تو ہوا بھی چھیڑ رئی
جھلک کو ساڑی کو پکڑنا آتی رے
قسمتوں سے ہیں اُنوں ایک وقت ملے
اُن کی اماں کا اجڑنا آتی رے
کیا مزا لینگا، دکھادے رے خدا
اُن کی اماں جی کا بگڑنا آتی رے
چھت پو جب آتئیں کی جب آتی لکو
نا پتے گلی میں گھسڑنا آتی رے
نائٹ شٹ پو سیر کو اکھوائی لئے
گنڈیوں کا ٹٹ کو جھڑنا آتی رے
بات شادی کی کبھی چھیڑا تو میں
اُن کا شرمانا سکڑنا آتی رے
اُن کی ہاں سننے کو زندہ ہوں مگر
اُن کا نئیں نئیں نئیں پو اڑنا آتی رے
رُس کو میں جانے اُٹھا تو روکنے
بیچ دروازے میں اڑنا آتی رے

ثنی ایوب محلی

یوں عاشقی کا فرض ادا کر رہا ہوں میں
وہ کھا رہے ہیں اور ہوا کر رہا ہوں میں
میں گھر جنوائی بن کے مصیبت میں پھنس گیا
دنیا سمجھ رہی ہے [illegible] رہا ہوں میں

پیار کرتا ہوں تو کہتی ہے کہ بس رہنے دو
پیار بیگم سے جتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
مجھ میں دارا سے نپٹنے کی تو ہمت ہے مگر
ہاتھ بیگم پہ اُٹھاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

ہم ترقی میں کسی بھی دیس سے پیچھے نہیں
جب سے پوشیدہ ہوئی سچائی اپنے دیس کی
کیا ہوا اگر چاند پہ راکٹ جو پہونچا روس کا
آسماں کو چھو رہی مہنگائی اپنے دیس کی

جاتی نہیں تھی بابِ اثر تک مری صدا
اس واسطے یہ کام نیا کر رہا ہوں میں
اب دیکھتا ہوں کس طرح ہوتی نہیں قبول
لاؤڈ اسپیکر لگا کے دُعا کر رہا ہوں میں

مجھ سے اُن بڑھو کا ذکر کیا یارو
آپ جسے عقیل کہتے ہیں
قتل کرتا ہے جو حقیقت کا
لوگ اس کو وکیل کہتے ہیں

مرغ چھرے کتوں کو اکثر ہڈیوں کی ذات سے
آپ نے دیکھا ہوگا شوق فرماتے ہوئے
یہ تماشہ آپ نے دیکھا نہ ہوگا دوستو
میں نے دیکھا ہے گدھوں کو گلگلے کھاتے ہوئے

غزل

کچھ نہیں ہے شمس و قمر باپ کی قسم
اتنا حسیں ہے میرا لڈ باپ کی قسم
خیرات بانٹتا تھا فقیروں کو کل لڈ کی
ہوتا جو میں بھی اسمگلر باپ کی قسم
یاروں پہ یوں ہی باپ کی دولت لٹائے جا
ہوگا ترا بھی نام امر باپ کی قسم
یاروں میں اسی طرح سے کھڑا سوکھتا نہیں
مجھ کو لگی ہے اُن کی نظر باپ کی قسم
ٹرخا رہا ہوں پان کھلا کر سبھی کو میں
مہنگی ہوئی ہے جب سے شکر باپ کی قسم
شعر و سخن کی کوئی بھی محفل ہو جہاں
جم کے رہے گا میرا اکلر باپ کی قسم
فی الحال تو کھول دوں میں پول آپ کی
رکھتا ہوں میں جہاں کی خبر باپ کی قسم

(دوسرا دور)

شمسی مینائی

قطعات

کیوں ظلم سے ڈرتے ہیں وفا سے نہیں ڈرتے
تلوار سے لرزاں ہیں ادا سے نہیں ڈرتے
ہیں کتنے مزے دار یہ بندے بھی خدا کے
انسان سے ڈرتے ہیں خدا سے نہیں ڈرتے

گزرے ہوئے حالات کا صدمہ تو بہت ہے
ہمراہ زمانے کے کوئی غم نہیں ہوتا
پیسہ بھی جو تانبے کا چلا جائے تو غم ہے
ایمان کے جانے کا کوئی غم نہیں ہوتا

[illegible] چشمِ تر سے کیا ہوگا
صرف دردِ جگر سے کیا ہوگا
دل کی حالت اگر نہیں بدلی
احتیاطِ نظر سے کیا ہوگا

دل و دماغ کسی کا بدل گیا ہوتا
کسی نے عیش کی زنجیر توڑ دی ہوتی
غریب لوگوں سے قربانیوں کی مانگ تو ہے
کسی وزیر نے تنخواہ چھوڑ دی ہوتی

غریب لوگوں کے حصے میں راج پاٹ بھی ہو
کسی امیر کے گھر سے کوئی شہید ہوا!
غریب لوگوں کے بیٹے قدم قدم پہ مرے
کسی وزیر کا بیٹا کہیں شہید ہوا؟

ہر حکم چل رہا ہے یہاں کتنی شان سے
اپنے وطن کا آج تو نقشہ بدل گیا
یہ کشتی تو پوری طرح اپنے بس میں ہے
قسمت کے ہاتھ سے یہ مگر نکل گیا

تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں کا آئے گا خیال
راہ کی شعلہ مزاجی کا اثر کیا ہوگا
وقتِ رخصت جو مجھے پیار سے دیکھا تو نے
اس سے بڑھ کر مرا سامانِ سفر کیا ہوگا

تاج محل

نگاہِ عشق نے پتھر کو جاندار کیا
وفا کی راہ میں جو کچھ تھا سب نثار کیا
زمیں پہ رسمِ وفا مجسمہ زن ہوئی جس سے
یہ بات مجسم و تکمیلِ فن ہوئی جس سے
وہ بادشاہ نہیں تھا غریب قیدی تھا
نظر سے فن کو سنوارا عجیب قیدی تھا
یہ رنگ تاج سے آخر حسین ہوتا ہے
غمِ جدائی بھی کتنا حسین ہوتا ہے
اگر یہ دولت و شاہی کا معجزہ ہوتا
کسی کی تیز نگاہی کا معجزہ ہوتا
تو آج دنیا میں کتنے ہی تاج بن جاتے
زمانے بھر سے کہاں لوگ دیکھنے آتے
تمام دن کہ عقیدت کا ایک ریلا ہے
تمام سال یہاں دیکھئے تو میلہ ہے
کسی مزار پہ زر جا کے نذر کرتے ہیں
یہاں تو قلب و جگر آ کے نذر کرتے ہیں
یہ سنگِ زار عجیب دلکشی کا مسکن ہے
یہ مقبرہ ہے مگر زندگی کا مسکن ہے
نہ جانے کتنوں کی عزت بچائی ہے اس نے
نہ جانے کتنوں کو روزی دلائی ہے اس نے
نہ جانے کتنے گھرانوں کی آبیاری ہے
دیارِ عشق سے ہر وقت فیض جاری ہے
نگاہِ عشق اٹھی کائنات لے کے چلی
تمیاتِ بزمِ گمِ ممکنات لے کے چلی

عجیب شان سے قائم ہے دلکشی اب تک
گزر گئی ہیں جو صدیاں، ہے تازگی اب تک
ملی ہے فن کو زمانے میں برتری بے شک
بہت سی اور ہیں تخلیق آج بھی بے شک
مگر یہ حسن کسی میں یہ تازگی نہ رہی
گزر گیا جو زمانہ تو دلکشی نہ رہی
گدازِ عشق نے پتھر کو زندگی دی ہے
وفا نے بڑھ کے اندھیرے کو روشنی دی ہے
یہ رنگ روپ، یہ فن یہ نکھار دیکھو تو
ہے آدمی کو بھی کیا اختیار دیکھو تو
یہ ہے عزیز تو فطرت نے ہاتھ میں رکھا
دلہن بنا کے اسے کائنات میں رکھا
دلہن ہے تاج تو فطرت سنگھار کرتی ہے
مچل مچل کے شبِ ماہ پیار کرتی ہے
گہرِ جال بنایا گیا ہے خشکی پر
کنول کا پھول کھلایا گیا ہے خشکی پر
ندی کے پار سجی پی سے لو لگائے ہوئے
کھڑی ہے کوئی نویلی نظر جمائے ہوئے
رہِ وفا کی کہانی کو مستقل دیکھو
جو دیکھنا ہو جوانی کو مستقل دیکھو
یہیں تو ظلمتِ غم کا جواب پنہاں ہے
کہ پتھروں میں شبِ ماہتاب پنہاں ہے
یہ مختصر بھی، مکمل بھی، لاجواب بھی ہے
وفا قبول بھی ہے، عشق کامیاب بھی ہے
شرارِ دل، گراں بزمِ کائنات نہیں
یہ فن بشر کا، فرشتوں کے بس کی بات نہیں

غلط کہ تاج حکومت کا کارنامہ ہے
یہ صرف حسن و محبت کا کارنامہ ہے
وفا کی راہ میں ہیروں کی جستجو کیا ہے
دیارِ عشق میں دولت کی آرزو کیا ہے
یہ حکمِ شاہ سے سخت کشی کا کام نہیں
یہ صرف ایک عمارت گری کا کام نہیں
یہ کام خونِ جگر کا ہے کچھ ہوس کا نہیں
یہ فن کا آخری پہلو کسی کے بس کا نہیں
جو رہ کے قید میں خالی تھی جیبِ مضطر کی
دل و دماغ کی ہر کیفیت نچھاور کی
وہی اثر تو ابھی تاج میں مچلتا ہے
رخِ بشر کی طرح کیفیت بدلتا ہے
ہے کون موجدِ فن یہ سوال آتا ہے
وہ جس کے ذہن میں پہلے خیال آتا ہے
خیال ذہن میں آیا زمیں تو سالم ہے
یہ رُخ بھی تاج محل کا بہت ہی ظالم ہے
ایک اور تاج کی تعمیر ہو نہیں سکتی
یہ خواب وہ ہے کہ تعبیر ہو نہیں سکتی
فہیمِ تاج کبھی عقل ہو نہیں سکتی
کمالِ تاج یہ ہے نقل ہو نہیں سکتی
بڑے بڑوں کو بناتا مرید ہے ظالم
قدیم ہو کے بھی کتنا جدید ہے ظالم
یہاں پہ ہوش گنواتے ہیں آ کے فرزانے
وہ جس نے تاج کو دیکھا نہیں ہے کیا جانے
کسی کو چاہ کا ارمان ہو تو سکتا ہے
کہ بادشاہ بھی انسان ہو تو سکتا ہے

وہ بادشاہ بھی قیدی بھی بے مثال رہا
کسی بھی دور میں وہ صاحبِ کمال رہا
جنونِ شوق میں ساری حیات صرف ہوئی
چراغِ فن ہی جلانے میں رات صرف ہوئی
چک وہ بھول گیا تھا سراج کی خاطر
کہ تخت و تاج بھی کھوئے تھے تاج کی خاطر
وگرنہ شاہ بھی بیٹے کا صید ہو جاتا
غیور وقت بھی اس طرح قید ہو جاتا
چھپی تھی دولتِ تعمیر بھی تباہی میں
بھرا تھا نور کا دریا بھی کم نگاہی میں
دلِ تباہ میں فن کا چراغ روشن تھا
شعورِ کوہ کنی سے دماغ روشن تھا
وفا کا زہر غمِ نامراد سے بھی آشنہ تھا
یہ بادشاہ [illegible] سے بھی آشنا تھا
اگرچہ ہنر کے فن میں [illegible] کا ہاتھ رہا
تصورِ لبِ شیریں تو ساتھ ساتھ رہا
امیدِ وصل میں تیشہ زنی دکھائی تھی
یہاں تو صرف غمِ ہجر کی دہائی تھی
غمِ جدائی نہ سنبھلا تو خودکشی کرلی
خود اس نے اپنی محبت سے دشمنی کرلی

یہاں تو غم کے اندھیرے کو روشنی دی ہے
شگفتگی کے محبت کو زندگی دی ہے
ہوس کا شور محبت کے آس پاس نہ تھا
تڑپ تڑپ کے رہا پھر بھی بدحواس نہ تھا
وفا کی دھن میں کبھی کوئی برہمی نہ ہوئی
کہ مدت سے بھی محبت میں کچھ کمی نہ ہوئی
غمِ جدائی کا یہ رنج وصالِ دوست کے بعد
کوئی خیال نہیں تھا خیالِ دوست کے بعد
زمیں کو بھول گیا، آسماں کو بھول گیا
غمِ حبیب میں سارے جہاں کو بھول گیا
تمام عمر مگر تاج پر نگاہ رہی
غمِ حبیب سے ہر وقت رسم و راہ رہی
یہی تو چرخِ محبت کا آفتاب ہوا
کہ ایسا رنگ بھی خلوت میں باریاب ہوا
[illegible] نازک مزاج ختم ہوئی
حیات ختم تو قصۂ تاج ختم ہوئی
رقم فسانۂ فن میں یہ بات ہوتی ہے
کہ شاہکار کی قیمت حیات ہوتی ہے
پیامِ عشق سے بے زار زندگی کیا ہے؟
جسے ہو تاج سے نفرت وہ آدمی کیا ہے؟

ڈاکٹر وزیر آغا

کپور کا فن

[illegible]

بنا گئی ہے۔ مثلاً غالب جدید شعراء کے درمیان [illegible] دیکھئے۔

م۔ ن۔ ارشد۔ [illegible] صاحب میرے خیال میں ایک گیت آپ نے کبوتر پر بھی لکھا تھا وہ بھی مرزا غالب کو سنا دیجئے۔

بکرما جیت۔ [illegible]

اڑ اڑ کبوتر بول
دیکھو [illegible]
[illegible]
کیا تجھ کو [illegible]
[illegible]
بول [illegible]

باقی شعراء۔ (ایک زبان ہو کر) بول کبوتر [illegible] غالب نہایت گھبراہٹ اور پراگندگی کی حالت میں [illegible] دیکھتے ہیں۔

بکرما جیت۔ اب دوسرا بند سنئے —

بول کبوتر بول
کیا میرا ساجن کہتا ہے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
بول کبوتر بول

باقی شعراء۔ (ایک زبان ہو کر) بول کبوتر بول [illegible] مرزا غالب بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں)

اور یہ دیکھئے ریڈیو پروگرام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"پکا گانا سناتے وقت وہ [illegible] بات کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح سننے والے کا دم ناک میں آجائے چنانچہ ایک چھوٹا سا مصرعہ جیسے "میں نہ بولوں گی" یا "ہشو سیاں" تقریباً پچاس ساٹھ دفعہ اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ سننے والے پر وحشت کا عالم طاری ہو جائے اگر "میں نہ بولوں گی" کی رٹ لگائی جائے تو [illegible] تک سننے والا اس طرح کی آوازیں سنے گا :

میں نہ [illegible]
[illegible]
[illegible]

حتیٰ کہ وہ تنگ آکر چیخ اٹھتا ہے کہ اگر تو واقعی نہ بولے تو تیری بڑی عنایت ہو۔ اسی طرح "ہشو سیاں" کے دو الفاظ اس طرح دہرائے جاتے ہیں کہ سننے والا یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یا تو سیاں "بہت ڈھیٹ

ہیں جو اتنی بار کہنے پر نہیں ہٹتے یا بالکل بہرے ہیں جنھیں کچھ سنائی نہیں دیتا"

ـدید شاعری اور ریڈیو پروگرام کے بعد انتساب کا یوں مذاق اڑاتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک ادیب نے افسانوں کے مجموعے کا انتساب اس طرح کیا ہے:

"والدہ ماجدہ کی خدمت میں ہدیہ عقیدت تو ہماری مایوسی غم اور غصے کی انتہا تک جا پہنچتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ والدہ ماجدہ کی خدمت میں عشقیہ افسانوں کو پیش کرنا نا قابل تلافی گناہ ہے بلکہ اس لئے کہ ہم اس ادیب سے اس سے بہتر انتساب کی امید رکھتے تھے ہمیں اس شخص کی سادہ لوحی پر بے حد ہنسی آتی ہے کہ اپنے افسانوں میں اس نے اظہار عشق تو زہرہ، بلقیس اور بتول سے کیا اور جب انتساب کرنے کا وقت آیا تو وہ ان سب کو فراموش کر کے والدہ ماجدہ کا دم بھرنے لگا چنانچہ ہم خیال کرتے ہیں کہ اس نے والدہ ماجدہ کی مسرت پر ہماری امیدوں کو قربان کر دیا"

ـ مثالوں میں آپ دیکھیں گے کہ کپور نے جہاں ایک طرف جدید شاعری کے بعض رجحانات کو ہدف طنز بنایا ہے ـل دوسری طرف ریڈیو پروگرام اور ریکے رنگ اور انتساب کے مرض کا مذاق اڑایا ہے۔ یہ نہیں کہ یہ چیزیں بنیادی طور ـلط ہیں۔ بلکہ صرف یہ کہ ان چیزوں میں بعض کے کناسے کپور کو ضرورت سے زیادہ ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور ـ کے دل میں ان پر پتھر برسانے کی ایک غیر شعوری خواہش کروٹیں لینے لگی ہے۔ ان مضامین میں یہ صاف محسوس ہوتا ہے ـصنف سچ کو جھوٹ اور روشنی کو تاریکی سے جدا کر کے جھوٹ اور تاریکی کو ہدف طنز نہیں بناتا بلکہ محض اپنی جبلت پر بھروسہ کر کے ـچی اور جھوٹ کا ادراک کرتا اور بغیر سوچے اور بغیر کسی نتیجے کی پرواہ کئے اس کو کنکر کا نشانہ بنا دیتا ہے۔ عافیت کوشی سماجی تقاضوں ـحترام یا اصلاح کا جذبہ ــــــ ان میں سے کسی نے بھی کپور کے فن کو راستہ نہیں دکھایا بلکہ وہ ایک اندرونی تموج اور ایک ـی تحریک کے زیر اثر ایک عاقبت نا اندیش نوجوان کی طرح بڑھتا چلا گیا ہے۔ فن کی تخلیق بھی دراصل جذبے کی بے محابا آمد اور ـاس کی بے پناہ یورش کی رہین منت ہوتی ہے۔ لیکن جب مصنف پڑھنے والے عوام اور دیکھنے والی مخلوق کے ردعمل ـبھی ملحوظ رکھنا شروع کرے اور ان کے مزاج ان کی مرضی اور ان کی اخلاقی قدروں کے تابع ہو کر ادب تخلیق کرنے کی ـشش کرنے لگے تو معاملہ یقیناً بگڑ جاتا ہے۔

تیسری جیب میں۔ نے کپور سے ملاقات کی تو معاملہ کچھ کچھ بگڑ رہا تھا "شیشہ و تیشہ" کا عنوان ہی صاف بتا رہا ہے کہ اب جوانی کے منہ ـ جذبے نے گرم بہت آتش کے توازن رکھ رکھاؤ اور شعور کے سامنے ہتھیار ڈال دئیے ہیں۔ بے شک اب بھی مصنف کے ہاتھ میں ـہ موجود ہے جس سے وہ ہر ابھری ہوئی شئے کو ہموار کر دینے کے عزم میں سرشار ہے تاہم ساتھ ہی اس کو شیشے کے وجود کا احساس ـ ہے۔ اب حالات بتا رہے ہیں کہ کپور سماجی ماحول سے اس قدر آشنا ہے کہ تیشہ چلاتے وقت شیشہ کو ضرور نہیں پہونچنے دیگا گویا ـی کے منہ زور جذبے کو اب سماجی شعور اور اخلاقی قدروں سے ایک بڑی حد تک کمزور کر دیا ہے۔ مصنف اب بھی تیز قدم اٹھاتا ہے لیکن پھونک پھونک کر چنانچہ شعوری کاوش نے فن پر اپنے مخصوص اثرات مرتسم کرنے شروع کر دئیے ہیں۔ "سنگ و خشت" میں "غالب ـید شعرا کے دربار میں" کا تصور کیجیے وہاں کپور اپنے عروج پر ہے۔ وہ چاروں طرف اینٹیں پھینکتا ہے۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتا ـ سماجی سرزنش یا اخلاقی تقاضے سے متاثر نہیں ہوتا۔ بس ایک دریا ہے خس و خاشاک کو اپنے ساتھ لئے بہا چلا جاتا ہے۔ لیکن شیشہ ـہ میں یہی موضوع مصنف کے ایک مختلف ردعمل کو وجود میں لاتا ہے۔ اب کی بار غالب کے بجائے حالی کو جنت سے لایا گیا ہے ـرقی پسند شعرا سے کلام سنتے ہیں۔ اس کلام پر طنز کرتے ہیں اور بات چلتی رہتی ہے۔ آخر میں مصنف محسوس کرتا ہے کہ اس ـ حالی کی زبان سے شاید ترقی پسندوں پر کچھ زیادہ ہی طنز کر دی ہے چنانچہ [illegible] لکھتا ہے دیکھیے

"حالی ــــ گریہ مایوسی کے لمحے دیر پا نہیں ہوتے تجھے ترقی پسند شعرا [illegible]

سی جدتوں سے اتفاق ہے۔ مگر چونکہ طبعاً واعظ اور خطیب واقع ہوا ہوں۔ اس لئے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ترقی پسند شعراء نظمیں لکھتے وقت اچھے شعر کی تعریف مدنظر رکھیں۔"

اس کے بعد اچھے شعر کی تعریف درج ہے۔ حالی طبعاً واعظ اور خطیب ہیں۔ خود کپور نے اس کتاب میں یہی رنگ کچھ کچھ اپنانا شروع کیا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ "سنگ و خشت" اور "شیشہ و تیشہ" میں وہی فرق ہے جو غالب کے کلام میں ہے۔ ایک طرف جذبے کی برہنہ صورت ہے۔ جو کسی اشارے کسی سبز جھنڈی کی پروا نہیں کرتی دوسری طرف سوچ سمجھ کر دریا سے نہریں نکالی گئی ہیں۔ اور دریا کا رُخ بدلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بڑا فرق ہے ان دونوں میں کنہیالال کپور سے میری آخری ملاقات ان کی کتاب "نرم گرم" میں ہوئی۔ سعادت یار خاں رنگین نے دیکھا کہ سید انشاء زمین پر بیٹھے ہیں اور دونوں زانوؤں پر سر دھرا ہے۔ میں نے آبدیدہ ہو کر ... ... کہا کہ شکر ہے۔ پھر اس طرح سر کو گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اُٹھایا۔

آزاد کا قول ہے کہ ہر شخص جس قدر سانس یا جتنا رزق اپنا حصہ لایا ہے اسی طرح ہر شخص ... خوشی ... اور ہنسی کا اندازہ بھی داخل ہے، وہ لکھوا کر لایا ہے۔ کپور نے "سنگ و خشت" میں اور اس کے بعد ... ہر کسی پر اینٹوں کی بارش کی خود بھی بے اختیار ہو کر ہنسا اور دوسروں کو بھی کچوکے دے دے کے ہنسایا۔ لیکن ہنسی کا یہ ... جلد ختم ہو گیا اور "نرم گرم" تک پہنچتے پہنچتے نٹ کھٹ لڑکے اور منہ زور نوجوان نے ایک بوڑھے آدمی کا عمامہ سر پر رکھ لیا اور چبا چبا کر باتیں کرنے لگا۔ نہ جانے ان ظریفوں کا انجام اتنا عبرت ناک کیوں ہوتا ہے؟ انشاء نے آخری عمر میں آنسو بہائے اکبر نے آخر آخر میں نصیحتیں کرنا شروع کر دیں۔ اور کپور نے عہد پیری میں "نرم گرم" کا سہارا لے لیا۔ اس کتاب کا عنوان بتا رہا ہے کہ وہ آپ بڑی حد تک بدل چکے ہیں جو "سنگ و خشت" کی صبح میں جل رہی تھی۔ اور پھر اس کتاب میں کپور کا لہجہ بھی تو بدل گیا ہے۔ شاید اب اسے یہ احساس بری طرح ستانے لگا ہے کہ اس کے سر پر ایک وزنی عمامہ ہے۔ جسے اس کو بہر حال آندھی اور جھکڑوں سے محفوظ رکھنا ہے چنانچہ اب وہ ایک ہاتھ سے چٹکی لیتا ہے ("وہ بھی بے دلی سے") اور دوسرے ہاتھ سے اپنے عمامے کو سنبھالے رکھتا ہے۔ پنجاب میں ایک مثل ہے۔ ——— پگڑی سنبھال او جٹا اسے جاٹ تو اپنی پگڑی سنبھال۔ یہ مثال "نرم گرم" کے مصنف پر پوری طرح صادق آتی ہے پھر جب جاٹ ہونے کا معاملہ اس خوش اسلوبی سے طے پا گیا تو یہ بھی یقین جانئے کہ پاشا سے اس کا تنازعہ بھی زمین ہی کے سلسلے میں ہو گا۔ مکان کے الاٹمنٹ والی بات بالکل غلط ہے اور یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہے۔

کسانوں کیلئے اور ہم سب کیلئے بہتر افادیت کے اقدامات

ہماری ریاست میں بڑے بڑے دریا بہتے ہیں۔ زمین زرخیز ہے۔ کسان سخت محنت کرنے والے ہیں لیکن ان سب کو اگر ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تو کوئی فائدہ مند نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

آندھرا پردیش نے آبپاشی کے تحت کے علاقوں کی ترقی کے لئے اقدامات کا آغاز کر کے زراعت و کاشتکاری کے تصور کو عصری بنا دیا ہے۔ ناگ ارجنا ساگر رائٹ کنال، ناگ ارجنا ساگر لفٹ کنال، سری راما ساگر اور تنگبھدرا پراجکٹ کامپلکس کے تحت چار آبپاشی علاقوں میں ترقیاتی کام انجام دیئے جا رہے ہیں۔ ترقیاتی پروگرام درج ذیل اقدامات پر مشتمل ہے۔

- سربراہیٔ آب کا مشترکہ انتظام۔ جس کے تحت واڑہ بندی کا طریقہ یعنی باری باری سے پانی کی سربراہی کا انتظام کسانوں میں تیزی کے ساتھ مقبول اور پسندیدہ ہوتا جا رہا ہے۔
- کھیتوں میں پانی کی سربراہی کیلئے نالیوں کی تعمیر۔
- باقاعدگی کے ساتھ آزمائشات کی ترقی اور بہتری۔
- کسانوں کے لئے قرضوں کی سہولیات
- پرزور زرعی اور توسیعی پروگرام

مذکورہ بالا پروگرام کی عمل آوری پر سال ۸۱-۱۹۸۰ء کے [illegible] سے زائد رقم خرچ کی جائے گی۔



"یوں لگے مانتے ہی نہیں کہ ہم نے

SHUGOOFA

Vol 14 Copy 6 31 Bachelor Quarters, M.J. Market, Hyderabad 1 June 1981 Phone : 5771

OWNERSHIP FLATS FOR SALE

On successful completion of BANJARA CASTLE, a building of two-bedroom luxury flats, Banjara Construction Company Private Limited announces the final sale of remaining flats in



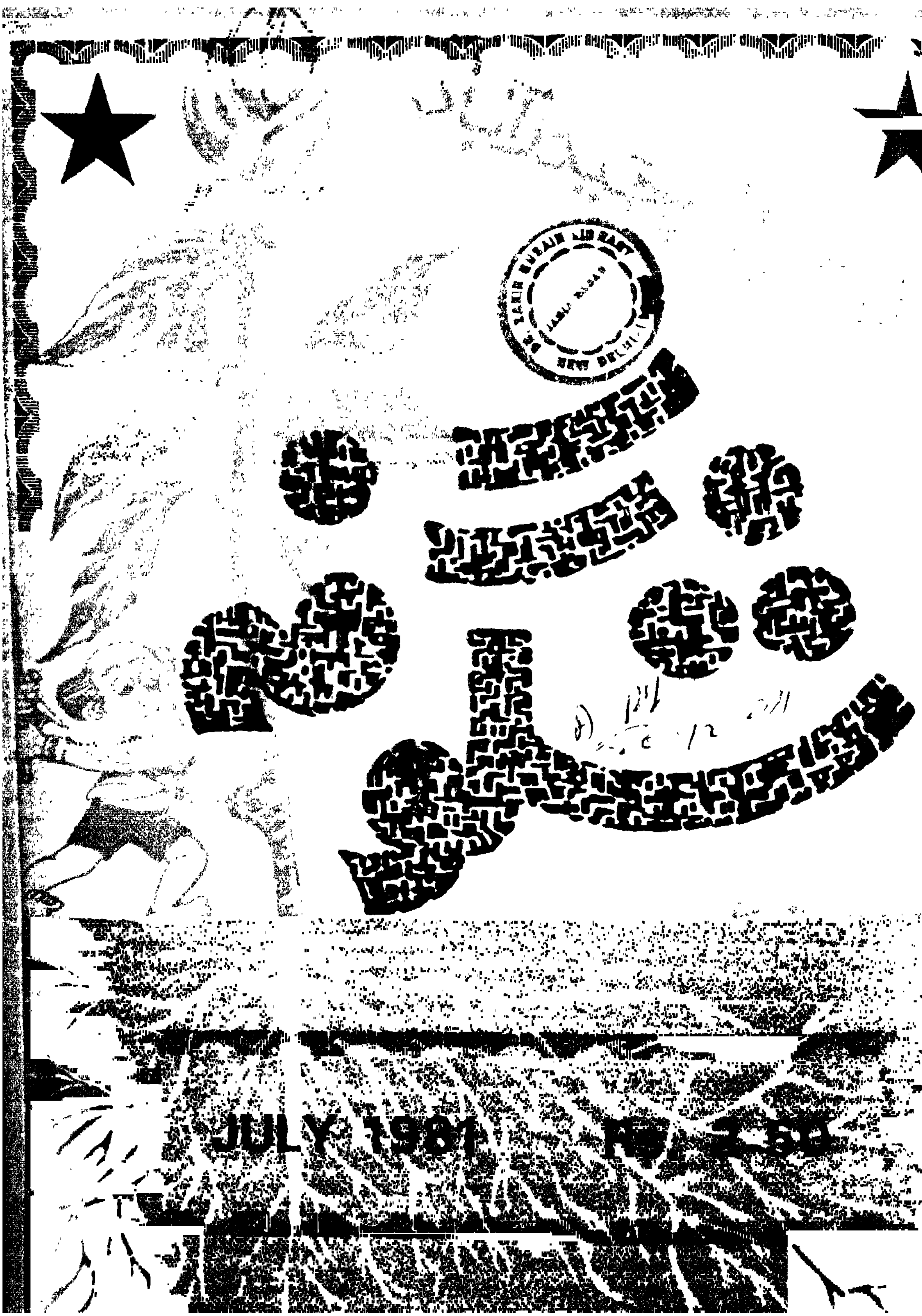
BANJARA GARDENS

A few minutes walk from Masab Tank, on top of the hill, you enter your exclusive home. A home which combines the comfort of a bunglow and the amenities of flat life. A lawn to sit out in the evening, a playground elevated and safe from vehicle movement, covered garages in the basement, large terrace and hall for parties—we have tried to look after all your requirements. The construction is in full swing, professionally designed, and executed by a team of architects and engineers. The most reputed firms in their respective lines, have been booked for flooring, tiling, hollow blocks sanitary fittings etc. Possession is expected to be handed over in a year. The last few one—bedroom and three — bedroom flats are offered for sale on instalment basis.

FOR DETAILS CONTACT

BANJARA CONSTRUCTION COMPANY PRIVATE LIMITED

11-4 650/15/3 Above Ganga Jamuna Hotel,
Lakdi-ka Pul Hyderabad 500 004
PHONE : 33094


JULY 1981

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہ نامہ

شگوفہ

جلد ۱۴ | جولائی ۱۹۸۱ء | شمارہ ۷

ایڈیٹر
سید مصطفیٰ کمال

مجلس مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

مجلس ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

منیجر: سمیع جلیل

سالانہ (۲۵) روپے
بیرون ہند سے (۴۵) شلنگ
فی پرچہ (۲) روپے (۵۰) پیسے

طباعت:
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ۲
بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، پرانی حویلی حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ، ۳۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: 57716

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے
(فہرست)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

ادب کا جغرافیہ

مالِ مفت (انشائیے)

بال کی کھال (تبصرہ)

★

پھُوَن

ڈاکٹر انعام احسن حریف
(پاکستان)

عید مُبارک بی مہنگائی

بازاروں میں خوب چلایا ہر پھیکا پکوان
اونچی ہو کر اور بھی اونچی کر دی ہر دوکان
روزوں میں یوں کھینچ کے رکھ دی رمضانی کی جان
روکھے سوکھے دل میں گھٹ کر رہ گئے سب ارمان

عید مبارک بی مہنگائی، عید ہے تیری عید

ہم کیا، عید ہماری کیا ہے، پژمردہ اِک پھول
جس کے رُخ پر جمی ہوئی ہے، مجبوری کی دھول
عید کا مژدہ اپنے لئے ہے جیسے اپریل فول
اے مہنگائی چھیڑ نہ ہم کو جا سکھیوں میں جھول

عید مبارک بی مہنگائی، عید ہے تیری عید

عید تو ظالم عید ہے تیری، تیرا دل ہے شاد
کیسے کیسے دکھیاروں پر ہے تیری بیداد
تو قانون کی زد میں بھی قانون سے ہے آزاد
ہم سب تیرے صید ہیں اور تو ہم سب کی صیاد

عید مبارک بی مہنگائی، عید ہے تیری عید

تیرے دَور میں کیسی عیدی، کہاں سے تحفے لائیں
کیسے کسی سے ملنے جائیں، کیسے کسی کو بلائیں
دودھ سوئیاں کیسے کھلائیں، کس مُنہ سے خود کھائیں
اب تو یہی ٹھانی ہے جی میں، چیخیں اور چلّائیں

عید مُبارک بی مہنگائی، عید ہے تیری عید

تیرے سارے چیلے چانٹے، پکّے چکّر باز
وہ تیرے ہم راز ہیں گویا، تو ان کی دم ساز
کپڑا لتّا پھل ترکاری، ادرک لہسن پیاز
جس کی قیمت جا کر پوچھو، اونچی ہے پرواز

عید مبارک بی مہنگائی، عید ہے تیری عید

ممتاز مفتی

غبارہ، قہقہہ، پھپھڑہ

پتہ نہیں میرے دوستوں کو کیا سوجھی ہے کہ وہ لوگوں کو ہنسانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں ۔ پنڈی سے ایک مزاحیہ جریدہ نکالنے کا ارادہ کر رہے ہیں اور نام بھی پنج ۔ جس سے حضرتِ نوح کی کشتی کی بو آتی ہے ۔ پچھلی دفعہ جب مجھ سے ملے تھے تو اچھے خاصے صاحب العقل تھے ۔ پتہ نہیں پھر کیا ہوا۔

یارو وقت وقت کی بات ہوتی ہے ۔ پرانے زمانے میں ہنسنا بہت بڑا وصف سمجھا جاتا تھا ۔ سیانے کہتے تھے جو ٹھٹھا کر کے ہنسے اور پیٹ بھر کر بے تکلف کھائے سمجھ لو کہ خوب آدمی ہے ۔ اسی وجہ سے محفلیں لگتی تھیں حقے چلتے تھے، دیگیں کھڑکتی تھیں دستر خوان بچھتے تھے قہقہوں کے پٹاخے چھوٹتے تھے لیکن آج کل ــــ مجھ سے پوچھو تو میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ خبردار ہنسنا نہیں ۔ ہنسو گے تو سارا سٹیٹس چو جائے گا ۔ غبارے سے ہوا نکل جائے گی پھپھڑا بن کر رہ جاؤ گے ۔ جی آج کل سٹیٹس کا دور دورہ ہے ۔ اور سٹیٹس کیا ہے ۔ غبارے کی ہوا سٹیٹس ہے تو سمجھو سبھی کچھ ہے ۔ غبارے میں رنگ ہے اڑان ہے اور اگر سٹیٹس نہیں تو کچھ بھی نہیں، پھپھڑا ــــ جبھی تو معزز لوگ کبھی قہقہہ مار کر نہیں ہنستے ۔ اگر اپریسیشن (Appreciation) کا اظہار ناگزیر ہو جائے تو ہونٹوں کے بٹوے کے بند ذرا ڈھیلے کر دیتے ہیں ۔ اور اگر شدید قسم کی ایمرجنسی آ جائے تو زیادہ سے زیادہ دانت نکال دیتے ہیں ۔ لیکن احتیاط لازم ہے یہ عمل ساؤنڈلیس رہے

سچی بات یہ ہے کہ جب کوئی قہقہہ مار کر ہنستا ہے تو گویا اس لمحے وہ کپڑے اتار کر ننگا ہو جاتا ہے ۔ یعنی اس کے اندر کا انسان باہر نکل آتا ہے ۔ اندر انسان ہو تب ہی یہ عمل باعثِ خوشی ہوگا نا ۔ اگر دورِ حاضر کی طرح انسان صرف کپڑے ہی کپڑے ہو تو وہ کیسے ہنسے ۔ بھید کھل جائے راز فاش ہو جائے ۔ آج کی مہذب دنیا اسے کیسے گوارہ کر سکتی ہے ۔

جب تک آپ میں تین خصوصیات نہ ہوں آپ قہقہہ مار کر ہنس نہیں سکتے ۔ پہلی معصومیت ! دوسری حیرت، مجذوبوں والی حیرت نہیں بچوں والی حیرت اور تیسرے احمقانہ بے ساختگی ! ایسی بے ساختگی جس کے تحت آپ کو گرد و پیش موقع محل اور صورت حالات کا احساس نہیں رہتا ۔ مطلب یہ کہ آپ کو یاد نہ رہے کہ ارد گرد لوگ موجود ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں ۔ پرواہ نہ رہے کہ وہ کیا سمجھیں گے کیا کہیں گے ۔ جو شخص گرد و پیش سے بے نیاز نہیں ہو سکتا وہ کبھی قہقہہ مار کر ہنس نہیں سکتا ۔

دِقت یہ ہے کہ یہ تینوں خصوصیات دورِ حاضر میں منفی حیثیت اختیار کر چکی ہیں ۔ آج کی زبان میں معصوم وہ ہے جو احمق ہو ۔ حیرت

اسے ہوتی ہے جو جاہل ہو ان پڑھ ہو۔ ان جان ہو۔ اور بے ساختگی رکھ رکھاؤ کی بیری ہے۔ مہذب و معزز لوگ چاہے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں پڑھے لکھے ہوں یا ان پڑھ ہوں لیکن وہ یہ گوارا نہیں کرتے کہ انہیں ان پڑھ یا ان جان سمجھا جائے۔ نہ جاننا اور بات ہے۔ انجان سمجھے جانا اور بات۔

جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا ان دنوں ہمارے محلے میں چاچا صوبہ رہا کرتا تھا۔ وہ محلے کا فرد نہ تھا۔ پتہ نہیں کون تھا کہاں سے آیا تھا۔ دفعتاً ایک روز وہ محلے کی مسجد کے ملحقہ حجرے میں آ بیٹھا اور پھر زندگی بھر وہیں ٹکا رہا۔ اتنا مانوس ہوگیا کہ محلے کے سارے بچے اسے چاچا صوبہ کہہ کر پکارنے لگے۔ چاچا صوبہ بات بات پر قہقہہ مار کر ہنستا تھا۔ اس کے قہقہے میں اس قدر بے ساختگی تھی کہ مسرت کی ایک پھوار برسنے لگتی۔ آنکھیں غروب ہو جاتیں۔ گال ابھر آتے۔ اتنا ہنستا کہ ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتا۔

ایک دن چاچا صوبہ نے میری بانہہ پکڑ لی بولا۔ لڑکے تو ہنستا کیوں نہیں؟ میں نے تجھے کبھی ہنستے نہیں دیکھا۔

میں نے کہا چاچا خواہ مخواہ ہنسوں؟

بولا ہاں خواہ مخواہ ہنسو۔ آنے بہانے ہنسو۔ ہنسنے کا موقع ملے نہ ملے تم ہنستے رہو۔ دیکھو پتر پتہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ کیوں اشرف المخلوقات ہے؟ اس لئے کہ انسان ہنس سکتا ہے۔ اس میں قہقہہ لگانے کی اہلیت ہے۔ دوسرے جانور چرند پرند ہنسنے کے وصف سے محروم ہیں۔ یہی انسان کا شرف ہے سمجھے؟ اس لئے بیٹا ہنسو۔ دل سے ہنسو، پھیپھڑوں سے ہنسو صرف دانتوں سے نہیں یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں جب بادشاہ راج کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بادشاہ خود قہقہے لگا کر ہنسا کرتے تھے۔ حالانکہ امیر وزیر موجود ہوتے لیکن انہیں شعور ہی نہیں رہتا کہ وہ ظلِ الٰہی ہیں دربار میں ایک سرکاری مسخرا حاضر رہتا تاکہ اگر بادشاہ سلامت کا موڈ بگڑ جائے تو وہ اپنی حاضر جوابی سے شاہ کو ہنسا کر طبیعت بحال کر دے۔ گاؤں گاؤں بھانڈوں کے ٹولے ہوتے جن کا کام لوگوں کو ہنسانا تھا۔ پھر میراثی تھے جو اپنی جگتوں سے مہمانوں کا دل خوش کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں بادشاہ تھے امیر تھے وزیر تھے چودھری تھے زمیندار تھے مہمان تھے سبھی تھے لیکن نہ سٹیٹس تھا نہ سٹیٹس کا احساس۔ ان دنوں ہنسنا حماقت کی دلیل نہ تھا بڑے بڑے عالم فاضل لوگ ہنسنے ہنسانے کا ذوق رکھتے تھے۔ مثلاً اکبر کے نورتن ملا دوپیازہ تھے راجہ بیربل تھے۔

آج کی ساری مشکل یہ ہے کہ یہ ایک ترقی یافتہ دور ہے اور ہم نے کچھ زیادہ ہی ترقی کر لی ہے۔ لہٰذا آج کا دور کچھ زیادہ ہی عقلیہ ہو گیا ہے۔ اور لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے کا قائل نہیں رہا۔" پتہ نہیں کیوں عقل اور ہنسی دونوں کا آپس میں بیر ہے۔ جیسے ہو اور ساس کا ہوتا ہے۔ ادھر عقل کا شعور ابھرا ادھر قہقہہ غروب ہوا۔ دقت یہ ہے کہ ہنسنے ہنسانے کے شغل میں تھوڑی سی حماقت از بس ضروری ہے۔ کوئی احمقانہ بات کر دیکھئے۔ سبھی ہنس پڑیں گے۔ عقل کی بات پر کوئی نہیں ہنستا۔ اسی وجہ سے آج کے دانشور ہنسنے سے گریز کرتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ دانشور ہو کر ہنستا ہے۔

لطیفوں کے متعلق میرا نقطۂ نظر کچھ ایسا ہی ہے جیسے غالب کا آموں کے متعلق تھا کہ میٹھے ہوں اور بہت ہوں۔ لطیفے چاہے زیادہ نہ ہوں۔ ایک ہی ہو۔ لیکن وہ ایک "پیٹ بھر" قسم کا ہو۔ لطیف اشاروں سے بات نہیں بنتی۔ جب تک اس میں "مور اوور" — Moreover قسم کی وضاحت نہ ہو تسلی نہیں ہوتی۔

نوجوانی میں جب میں نے پہلا انگریزی لطیفہ پڑھا تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ بات کیا بنی۔ ہنسنا تو بالکل پس پشت پڑ گیا۔ لطیفہ کچھ یوں تھا۔ سکاٹ لینڈ کے ایک صاحب نے گاؤں جانے کے لیے پندرہ دن کی چھٹی لی۔ جب وہ گاؤں جانے لگا تو اس نے اپنی دیوار کی گھڑی کے پنڈولم کو روک دیا۔ پڑھ کر میں سوچ میں پڑ گیا یا اللہ یہ کیسا لطیفہ ہے۔ اب مجھے کیا پتہ تھا کہ سکاچ اپنی خست کے لئے مشہور زمانہ ہیں گھڑی کو اس لئے روکا کہ پندرہ دن بے کار چلتے چلتے گھس نہ جائے۔ نہ جناب ہم لطیف اشاروں کے قائل نہیں ہمیں تو لطیفے میں ٹھوس مواد چاہیئے۔ مثلاً ہمارے ہاں کا خست کا لطیفہ آپ نے سنا ہی ہوگا۔ میاں مسجد میں نماز پڑھنے گیا تو دفعتاً اسے یاد آیا کہ حجرے کا دیا تو جلتا چھوڑ آیا ہے خواہ مخواہ کا اسراف۔ وہ بھاگا بھاگا گھر لوٹا دروازہ بجایا بولا بیگم دروازہ مت کھولو۔ بیگم نے پوچھا کیوں۔؟ کہنے لگا دروازے کی چول بے کار میں گھسے گی۔ میں تو صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ حجرے کا دیا جلتا چھوڑ گیا تھا۔ بیوی بولی دیا تو میں نے بجھا دیا تھا۔ تو یہ بتا کہ دروازے کی چول کے گھسنے کا تجھے خیال آیا لیکن بے وقوف تونے یہ نہ سوچا کہ بھاگا بھاگا جاؤں گا تو خواہ مخواہ جوتے کا تلا گھسے گا۔ میاں بولا نیک بخت میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ بھاگنے سے پہلے ہی میں نے جوتا اتار کر بغل میں دبا لیا تھا۔ بات ہوئی نا خست کی بات کی تو پیٹ بھر کر کی۔ اور نیچے اوپر تین وار کئے۔ اب بولو کیسے نہیں ہنسو گے۔ انگریز یہ سمجھتا ہے کہ ہنسانے کے لئے گھڑی کا روک دینا ہی کافی ہے۔ اونہوں۔ ہنسانا اتنا آسان کام نہیں۔ ہمارے کئی ایک لطیفہ گوؤں نے مغربی سر تال پر لطیفے فٹ کئے ہیں مثلاً انہوں نے سردار صاحب پر لطیفہ یوں فٹ کیا کہ ایک سردار صاحب ایک دس منزلہ عمارت پر کسی کام سے گئے۔ کام ختم کرنے کے بعد جب وہ واپس آرہے تھے تو سیڑھیاں اترتے ہوئے معاً انہیں خیال آیا کہ وہ غلط راستے پر تو نہیں جا رہا۔ ایک راہ گیر سے پوچھنے لگے بھئی یہ سیڑھیاں نیچے جاتی ہیں کیا ؟ جب میں نے یہ لطیفہ پہلی بار سنا تو سوچ میں پڑ گیا۔ پتہ نہیں کیوں۔ انسان بیک وقت یا سوچ سکتا ہے یا ہنس سکتا ہے۔ ایک وقت میں دونوں کام نہیں ہو سکتے۔

ویسے تو ہم طنز پر بھی ہنستے ہیں جگت پر بھی ہنستے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ معصومیت بھری احمقانہ بات کا جواب نہیں۔ وہ خالص مزاح کا منبع ہے۔

تقسیم سے کچھ دیر بعد سردار صاحبی لطیفوں کا ایک ریلا آگیا۔ یہ لطیفے اس قدر اعلیٰ تھے کہ میں نے اس سے پہلے اتنے بلند پایہ لطیفے کبھی نہیں سُنے تھے۔ پتہ نہیں ان لطیفوں کو سردار صاحب سے کیوں منسوب کیا گیا۔ یہ بھی علم نہیں کہ یہ ریلا پاکستان سے چلا یا بھارت سے گمان غالب ہے کہ اس تحریک کا مقصد سیاسی تھا۔ سکھوں کا مذاق اڑانا تھا لیکن ان لطیفوں میں سردار جی کا کردار عظیم بن کر ابھرا۔ معصومیت خلوص، انسانیت، جذبات، سادگی۔ دو ٹوک منہ پھٹ بات۔ سبحان اللہ۔ سکھ بنیادی طور پر پنجابی ہیں اور پنجاب کے بنیادی اوصاف سادگی، بے تکلفی، خلوص اور جذباتیت ہے۔ یہ لوگ سیانے نہیں ہوتے۔ ہیرا پھیری سے واقف نہیں ہوتے۔ اتنی معصومیت اور سادگی کہ حماقت کی جھلک پڑنے لگتی۔ بہر حال سردار جی کے لطیفے معصومیت اور سادگی سے بھیگے ہوتے تھے لہٰذا ان میں جگت نہیں طنز نہیں۔ حاضر جوابی کی شرارت بھی نہیں۔ مثلاً ان لطیفوں میں مجھے سب سے اچھا لطیفہ یہ لگا کہ سردار جی نے ایک پاؤں میں ایک رنگ کی اور دوسرے میں دوسرے رنگ کی جراب پہن رکھی تھی کسی نے کہا یہ دو رنگی جرابیں کیوں ؟

سردار جی بولے مہاراج گل اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتی چھیتی میں تھے دکان پر جا کر یہ جوڑا خرید لیا۔ پھر بولے مہاراج یہ اک جوڑا

ہی نہیں گھر میں ایک ایسا جوڑا اور بھی پڑا ہے۔

پھر سردار جی کا وہ مشہور زمانہ لطیفہ ہے۔

سردار جی ایہہ فوجاں امبرسروں آیاں نے ؟

نہ مہاراج آیاں تے امبرسروں آئے ایں۔

بھلا۔ اساں سمجھیا تسی امبرسروں آئے او۔

یہ لطیفہ CONFUSIONS کا لطیفہ نہیں۔ یہ عظیم لطیفہ سکھوں کا نہیں بگ باورز کا ہے۔ دور حاضرہ کے سیاستیوں کا ہے۔ انگریزی میں اس قسم کے معصومیت بھرے لطیفے نہیں ملتے دراصل دور حاضرہ کے انسان میں وہ معصومیت نہیں رہی۔

سیانے کہتے ہیں حشر کے دن جب حساب کتاب شروع ہوگا تو اللہ تعالےٰ بندے سے پہلا سوال یہ پوچھیں گے کہ بتا وہ معصومیت کہاں ہے۔ جو ہم نے تجھے دے کر دنیا میں بھیجا تھا۔ بہرصورت انگریزی میں مجھے صرف ایک لطیفہ ملا۔ جس میں حیرت تھی۔ معصومیت بھی تھی خلوص تھا بیچارگی تھی۔

صبح کا وقت تھا لندن کے ایک مضاف میں ایک سپاہی گشت کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک کاٹیج کی کھڑکی تلے لان میں ایک آدمی چادر لپیٹے بیٹھا ہے۔ سپاہی کو شک گذرا قریب جاکر پوچھا۔ کون ہو تم اور یہاں کیوں پڑے ہو۔ چادر میں لپٹا ہوا آدمی بولا۔ یہی میں سوچ رہا ہوں کہ میں کون ہوں اور یہاں کیوں پڑا ہوں۔ کوائف یہ ہیں کہ رات میں اس کھڑکی والے کمرے میں خاتون کے ساتھ سویا ہوا تھا آدھی رات کو دروازہ بجا۔ خاتون نے مجھے جگایا۔ گھبرا کر بولی میرا خاوند آگیا ہے۔ میں نے گھبرا کر بن سوچے سمجھے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اور یہاں آگرا لیکن اب صبح کی روشنی میں میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ گھر تو میرا ہے اور وہ خاتون میری بیوی تھی۔ پھر خاوند کہاں سے آگیا۔ اور اگر آنے والا خاوند تھا تو میں کون ہوں۔

اس معصومیت بھرے لطیفے نے ساری تہذیب خاوند اور بیوی دونوں کے جائز تعلقات کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ شکر ہے لطیفہ سن کر ہمیں ہنس دینے کی عادت ہے ورنہ کئی ایک لطیفے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کے مفہوم میں ڈوب جائیں تو رو دیں۔ میری دانست میں مزاح کا یہی معراج ہے کہ جس ہنسی کی اوٹ میں آنسو چھپے بیٹھے ہوں وہ خالص مزاح ہے۔ دقت یہ ہے کہ اگر آپ سے کوئی کہے کہ میں آپ کو ہنسانے لگا ہوں۔ تیار ہو جائیے تو آپ کو ہنسی نہیں آئے گی۔ باقی باتوں میں کوشش ثمر بار ہوتی ہیں۔ ہنسانے کے عمل میں کوشش بے کار ہو کر رہ جاتی ہے۔ مزاح زبردستی کا متحمل نہیں ہوتا۔ فلم والوں نے ہاتھ میں چابک اٹھالی اور لگے شوں شوں لہرانے لگے ہنسو۔ کیسے نہیں ہنسو گے۔ تمہاری ایسی کی تیسی۔ ان کی والہانہ کوششوں کی وجہ سے مزاح فارس بن کر رہ گیا۔ اگرچہ ٹیلی ویژن نے فلم کو بڑی حد تک سنوارا ہے لیکن کہیں کہیں فلم کا اثر قبول بھی کر لیا ہے۔ ٹیلی ویژن کے مزاحیہ پروگراموں میں فلم کا اثر نمایاں ہے۔

کلاسیکی ادب میں مزاح زیادہ تر لفظوں کی ہیرا پھیری تک محدود رہا۔ جدید ادب میں ہمارے ہاں مزاح نگاروں نے شعور سخن کو اپنایا ہے۔ نثر نگاروں میں انشاء اور یوسفی پیش پیش ہیں۔ یوسفی میں گہری سوچ بچار ہے انشا میں معصومیت بے ساختگی۔ اور حماقت۔ انشار بھی عجیب آدمی تھا۔ شاعری میں بیراگ نثر میں احمقانہ سادگی وہ ہنستا زیادہ تھا ہنساتا کم۔ غالباً اسے شعور ہی نہیں

تھا کہ وہ ہنسانے کے لئے لکھتا ہے۔ اس کے مزاج میں بلا کا خلوص تھا۔ ضمیر بڑی حد تک انشا سے ملتا جلتا ہے۔ ضمیر میں سادگی ہے خلوص ہے ~~سے اپنے احمقانہ پن پر~~ جمہود ~~فخر~~ کرتا ہے نہ شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ خود زیادہ ہنستا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بات پر ہنستا ہے۔ اس کے بیشتر شعروں میں قہقہوں کی اوٹ میں آنسوؤں کی نمی ہے۔ محمد خان کے مزاج میں حماقت کا فقدان ہے۔ عقل کے زور پر بات کرتا ہے۔ ذہانت کی پھلجھڑی چلانے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ حال ہی میں زاہد ملک نے ایک مقالے میں حماقت کا انار چھوڑا تھا۔ اللہ کرے زاہد حماقت کو ہمیشہ کے لئے اپنالے۔ مزاح نویس کے لئے حماقت سے بہتر کوئی زمین نہیں۔ حماقت، خلوص اور معصومیت

غالباً ایک مہینے کی بات ہے کہ منصور قیصر نے مجھ سے کہا مفتی جی جب آپ مزاحیہ مضمون لکھ نہیں سکتے تو مزاحیہ پروگرام کیوں لکھتے ہیں۔ منصور کی بات سولہ آنے درست تھی۔ مجھ میں مزاح کی حس کا فقدان ہے۔ آج ضمیر کہہ رہا ہے مفتی جی پنچ کے لئے لکھو ضمیر کی بات میں موڑ نہیں سکتا۔ لیکن منصور قیصر سے خائف ہوں وہ اچھا دوست ہو کر بھی زبان دراز ہے۔ دورِ جدید میں سبھی زبان دراز ہیں کوئی کہتا ہے جب تم افسانہ لکھ نہیں سکتے تو کیوں لکھتے ہو۔ کوئی کہتا ہے جب تم دنیا کے واحد مسئلے روٹی کپڑا مکان کا شعور نہیں رکھتے تو تمہیں لکھنے کا کوئی حق نہیں۔ کوئی کہتا ہے اگر تم مروجہ نظام کے خلاف قلم نہیں اٹھاتے تو تمہیں قلم اٹھانے کا کوئی حق نہیں۔ عجب تماشا ہے حیرت ہے کہ لوگ حقوق دلانے کا مسلک لے کر اٹھتے ہیں۔ حقوق سلب کرنے تک کیسے آپہنچتے ہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ یہ تحریر مزاحیہ تحریر نہیں ہے۔ اس میں مزاح کے متعلق جتنی باتیں لکھی ہیں وہ قابلِ غور نہیں کیونکہ وہ سب اسپیس فلر Space Filler ہیں۔ یہ مضمون ایک فرمائشی مضمون ہے جس کا موضوع مزاح ہے۔ خود مزاحیہ نہیں۔ اداریہ میں نے ضمیر کے کہنے پر لکھا ہے۔ آخر میں اپنے دوستوں سے ہاتھ باندھ کر عرض کروں گا کہ یارو یہ ہنسنے ہنسانے کا منصوبہ نہیں چلے گا۔ ہم دانشور تو جلے کٹے بیٹھے ہیں۔ ہم صرف ایک دوسرے پر ہنس سکتے ہیں۔ صورتِ حال یہ نہیں۔ اور دورِ حاضرہ سٹیٹس کا دور ہے۔ ہنسنے سے سٹیٹس کا غبارہ پھوٹ جاتا ہے چھچھڑا رہ جاتا ہے۔ اب بھی وقت ہے چھوڑو اس بات کو۔ ہاں اگر ادارہ انتظامیہ میں سے کسی صاحب کا باپ تازہ تازہ مرا ہے اور پیچھے جائیداد چھوڑ گیا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ مزاح نگاروں کو کون عقل سکھا سکتا ہے۔ سو دوستو گڈ لک۔ ــ ــ

[بشکریہ سہ ماہی "اُردو پنچ"]

کرنل محمد خان

جھولتا لندن

او فلودہ لے آ اوئے منڈیا

چنانچہ بے فکر ہو کر ٹیوب ٹرین میں بیٹھ گئے اور کوئینز وے QUEENSWAY کے اسٹیشن پر برآمد ہوئے۔ اسٹیشن سے چند قدم چل کر نیاز ایک دکان کے سامنے رکا جس کی پیشانی پر ایک غیر معروف سا لفظ DELICATASSEN (ڈیلی کیٹسن) لکھا تھا۔ سوچا، خدا جانے یہ کیا بلا ہوتی ہے؟ لیکن دیکھا تو نیچے ایک اردو سطر بھی درج تھی۔

"رنگا رنگ پاکستانی کھانے۔ بیٹھ کر کھائیے یا ساتھ لے جائیے۔"

اس ایک اردو سطر نے ہمارے دو معمے حل کر دیئے۔ ایک تو لفظ ڈیلی کیٹسن کا حسب نسب معلوم ہوگیا۔ یہ غالب DELICACY (ڈیلی کیسی)، کے بطن سے پیدا ہوا تھا جس کے ایک معنی چیدہ اور نفیس پکوان بھی ہیں۔ دوسرے نیاز کے "اپنے ہاتھ" کے پکے ہوئے کھانے کی اصلی جائے ولادت کا پتہ بھی چل گیا کیونکہ نیاز کے اشارے پر بھاری بھرکم مگر سبک دست دکاندار مختلف دیگچوں سے کاغذی ڈبوں میں کھانے بند کرنے لگا۔ ہم نے نیاز کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ہمارا سوال پی کر دکاندار سے ہمارا تعارف کرانے لگا۔

"پہلوان جی، یہ ہیں ہمارے دوست کرنل صاحب۔ ابھی ابھی وطن سے آئے ہیں۔"

پہلوان جی نے چمچہ اُدھر رکھ دیا اور ہم سے معانقہ کرتے ہوئے بولے۔

"جی آیاں نوں۔ کی خاطر کریئے بادشاہو؟ اَج گرمی اے، فلودہ پیو گے؟ او منڈیا ...."

ہم پاکستان بلکہ گوجرانوالہ پہنچ چکے تھے اور پوچھا تو معلوم ہوا کہ پہلوان جی سچ مچ گوجرانوالہ ہی کے ایک اکھاڑے سے اٹھ کر لندن آئے تھے۔ پہلوان کے پیار بھرے پنجابی لفظوں نے ہمارا دل لوٹ لیا۔ خیر، ہمارے دل میں تو یوں بھی پنجاب کا درد بھرا تھا۔ ہم نے سوچا، مقامی اہل درد کو بھی یہ پنجابی اسی روانی سے لوٹتا ہے؟ اور کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اسی وقت دو میمیں دکان میں داخل ہوئیں اور پنجابی بولنے والا اکھڑ پہلوان انگریزی بولتا ہوا ریشم کا گول مول گدگداتا گولا بن گیا۔ بلکہ سچی بات ہے میموں کی انگریزی تو ہماری سمجھ میں آگئی لیکن پہلوان کی بلاغت ہمارے ادراک سے دامن بچا کر نکل گئی مگر ٹھیک نشانے پر جا بیٹھی یعنی میموں کے دلوں میں۔ اور

مارے پہلوان نے ہمارے مہکتے دیکتے میوں سے دل ہی نہیں جیبیں بھی لوٹ لیں۔

پہلوان کو خدا حافظ کہا اور خوراک کے تھیلے اٹھا کر نیاز کے فلیٹ پر گئے، یوں جیسے شکار گاہ سے — پکا ہوا شکار مار لائے ہوں۔ پھر نیاز نے جملہ حاضرین کو فرائض قبل طعام تقسیم کیے۔ کسی نے چولہا جلایا، کسی نے ہنڈیا چڑھائی، کسی نے ہاتھ دھوئے، کسی نے پتیلیں دھوئیں۔ ہمیں مہمان سمجھ کر کوئی کام نہ دیا گیا۔ لہٰذا ہم گوشت اور پلاؤ کی حقیقت منتظر کو سونگھ سونگھ کر دندانِ آز تیز کرتے رہے۔ آخر کھانا چنا گیا اور کھانے والے میز کے گرد اس طرح کھڑے ہو گئے، اہل ایمان جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل۔ لیکن جوں ہی پہلے مومن نے بعد از بسم اللہ پلاؤ پر ہاتھ ڈالا۔ باقی مومنین کلمے کی گونج میں اس طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے گویا ایک لمحے میں کنارِ سلسبیل سے ہٹ کر میدانِ وغا میں مالِ غنیمت لوٹ رہے ہوں لیکن جب لوٹ تھمی تو ہم پر پہلی مرتبہ ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا یعنی جو مزہ چھین جھپٹ کر کھانے میں ہے وہ پیش کیے ہوئے کھانے میں نہیں۔ یہ سات مومنین کا ذاتی تجربہ تھا لہٰذا اب ہمیں اقبال سے اتفاق کیے بغیر چارہ نہ تھا کہ شکارِ مُردہ سزاوارِ شاہباز نہیں۔

آخر اس شاہبازی سے فارغ ہو کر اپنے ہوٹل کو لوٹے تو ایک بجے رات کا عمل تھا۔ اگلی صبح اتوار تھا۔ چنانچہ ایک لمبی نیند کی نیت سے سو گئے۔ لیکن ابھی چار ہی بجے تھے کہ ہماری آنکھ کھل گئی۔ اس لیے نہیں کہ اقبال سے اتفاق کے جوش میں ہم نے بھی لندن میں آدابِ سحر خیزی نہیں چھوڑے تھے بلکہ اس لئے کہ ہمارے ہاضمے کی نزاکت نے ہمیں منزلِ اقبال بخش دی تھی۔ گوجرانوالے کا مرغ ہمارے پیٹ میں پہنچ کر فارغ نہ بیٹھا تھا! ——— بہرحال ہم نے اپنی بے خوابی کا دینی فائدہ اٹھایا اور چار بجے ہی اٹھ کر نماز کی تیاری کی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو شکوے کی بجائے شکر ادا کیا کہ قدرت ہمیں ہاضمے سے بدتر عطیہ بھی دے سکتی تھی۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ کھانسی ہو تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ تپ دق نہیں۔ سو دعا مانگتے ہوئے ہم نے اپنے ہاضمے کی طرف کوئی اشارہ نہ کیا۔ یوں بھی وہ کہا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے اور شاید ہماری یہی ادا قاضی الحاجات کو بھا گئی کہ ہمارا ہاضمہ مصلے پر بیٹھے بیٹھے ہی سنبھلنے لگا۔ مصلے سے اٹھ کھڑکی سے جھانکا تو لندن ابھی سو رہا تھا۔

ہم دوبارہ بستر پر دراز ہو گئے اور ہمیں نیند آ گئی۔ جاگے تو حسبِ معمول دس بج رہے تھے۔ یعنی شریفوں کے جاگنے کا صحیح وقت تھا۔ باہر لندن بقعۂ نور بن چکا تھا اور ہمارا دل و دماغ پھر اسی طرح تازہ تھا جیسا اس صبح کا اخبار جسے دلآرام چائے کے ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہو رہی تھی ——— اور لیجئے، پھر ہمارے مرغوب مضامین آ گئے۔ چائے نوشی اور اخبار بینی۔ لیکن یہ ہمارے ہی نہیں جملہ اہلِ دل کے محبوب مشاغل ہیں۔ اگر یہ دونوں مشغلے ساتھ ساتھ عمل میں آئیں تو ان کی محبوبیت باہم ضرب کھا جاتی ہے۔ اور اگر بستر میں لیٹے لیٹے ہی عمل میں آئیں جیسے کہ ہمارے عمل میں آ رہے تھے تو حاصلِ ضرب ناپنے کے لیے آئن سٹائن[1] کا فارمولا استعمال ہوتا ہے یعنی اسے روشنی کی رفتار سے دو دفعہ مزید ضرب دی جاتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ لطف و سرور کا ایٹم بم پھٹ پڑتا ہے۔

ھ۱ : آئن سٹائن کا مشہور فارمولا : $E = mc^2$ یعنی طاقت = مقدار × روشنی کی رفتار کا مربع۔ اسی فارمولے سے ایٹم بم کی طاقت ناپی جاتی ہے۔

لندن میں چھوٹا سا بل کسر

آج اتوار تھا ــــ دوستوں کی فہرست میں اگلا نام ایک ایسے دوست کا تھا جو وطن میں ہمارے قریب ہی کے رہنے والے تھے لیکن انہیں آج تک دیکھا نہ تھا۔ فقط ایک دوسرے کے متعلق سن رکھا تھا۔ یہ تھے محمد نواز۔ پنڈی سے چلتے ہوئے کیپٹن انور خان نے اُن کا پتہ، فون نمبر بھی دیا تھا اور انہیں خط بھی لکھ دیا تھا۔ اب فون کیا تو جواب میں کوئی محمد اقبال بولے۔ ہم نے اپنا نام بتایا اور عرض کیا۔

"مجھے محمد نواز سے کام ہے۔"

جواب آیا۔ "وہ تو اس وقت موجود نہیں۔"

کہا۔ "آئیں تو انہیں میرا نام بتا دیں اور یہ بھی کہ اُن کا گاؤں میرے گاؤں سے صرف تین میل کے فاصلے پر ہے۔ وہ پہچان جائیں گے۔"

بولے۔ "اور آپ ہی کے گاؤں میں میرا گھر آپ کے گھر سے صرف تین قدم کے فاصلے پر ہے ــــ کیا مجھے کسی خدمت کے قابل سمجھا جائے گا؟"

معاً ہمیں حاجی محمد اشرف خان کا لمبا پتلا اور شرمیلا سا لڑکا یاد آیا جو آج سے سات سال قبل اچانک گاؤں سے ولایت بھاگ آیا تھا۔ پوچھا تو بولا۔

"آپ کا اندازہ ایک سو فیصد درست ہے۔"

الغرض آدھ گھنٹہ بعد دو نوجوان، دو نہایت ہی خوش طبع دوست ــــ جو انگلستان کے بقیہ قیام میں ہمارے نہایت ہی پیارے رفیق ثابت ہوئے ــــ ہمارے کمرے میں داخل ہوئے۔ محمد نواز، توقع سے کم عمر دکھائی دیئے یعنی پینتیس کی بجائے کوئی بیس بائیس سال کے لگے اور اقبال توقع سے کچھ زیادہ اونچے یعنی چھ فٹ کی بجائے سوا چھ فٹ اور دونوں سراپا محبت، سراپا تواضع، بلکہ اظہارِ تواضع کے بیتاب، بے قرار

ان کی بے تابی کو بمشکل روکا۔ انہیں وطن اور گاؤں کی باتیں سنائیں کہ ہمارے پاس یہی بڑا تحفہ تھا۔ اس سال گاؤں میں کبڈی کون جیتا؟ بیل کس کا اوّل آیا؟ شادی کس کی ہوئی؟ لڑائی میں کون پٹا؟ میلہ کیسا رہا؟ اور لندن کی باتیں اُن سے سنیں کہ وہی اس کے راز داں تھے۔ تھیئٹر کون سا دیکھیں؟ کلب کون سی جائیں؟ ریستوران کون سا اچھا ہے۔ سُوٹ کہاں سے سلوائیں؟ سیر کہاں کی کریں؟ اتوار کہاں گزاریں؟ باتیں کرتے کرتے دوپہر ہو گئی۔ کھانا کھایا اور پھر لندن کے ان دیرینہ مزاج شناسوں کی رہنمائی اور اقبال کی کار میں لندن گردی کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ تھیئٹر ہے یا شہادت گاہ؟

اتوار کے دن لندن کی رونق بازاروں سے اُٹھ کر پارکوں، سینماؤں، کلبوں اور کھیل کے میدانوں میں بکھر جاتی ہے، چنانچہ اس سہ پہر کو رُخ لندن کو ہر ممکن زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے کیلئے کئی سبزہ زاروں میں پھرے، کئی تفریح کدوں میں جھانکا اور کئی تاریخ گاہوں میں گھومے اور آخر حسن و ہیجان سے مغلوب و مجبور ہوکر ہے مارکیٹ کے ایک تھیٹر میں داخل ہو گئے کہ شاید اس جھولتے لندن SWINGING LONDON کی ہوش رُبا گردش کے بعد اعصاب و اعضا کو کچھ سکون میسر ہو۔ لیکن یہاں بھی پردہ اُٹھا تو وہی آسماں پیدا تھا بلکہ ذرا اور تجلی خیز اور اشتعال انگیز ستاروں کے ساتھ۔ معلوم ہوتا تھا ہر شہاب ثاقب اسٹیج سے ٹوٹ کر دل ناصبور سے آٹکرائے گا۔ یعنی اعصاب و اعضا تو پہلے ہی تماشوں کی نذر ہو چکے تھے۔ اب ایمان پر بھی دباؤ پڑنے لگا۔ نہ باہر امان تھی نہ اندر عافیت۔ دل میں کہا، الٰہی، اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے۔؟ بشارت ہوئی کہ کہیں نہ جائے۔ یہیں ٹھہرے اور اس کھلے کفر کے مقابلے میں ڈٹ کر ایمان کی حفاظت کرے کہ یہی مومن کی شان ہے۔ بے شک ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ مسلمانی آسان کام نہیں۔ یہ شہادت گاہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے۔ لیکن یہ خبر نہ تھی کہ آج ٹکٹ لے کر براہ راست شہادت گاہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ چنانچہ پردہ اُٹھا اور پہلے سین کے ستاروں سے ہی آنکھیں چار ہوئیں تو سر چکرانے لگا۔ پتہ چلا کہ ابھی پانچ سین اور باقی ہیں۔ یعنی ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ قصہ کوتاہ، متواتر تین گھنٹے ہم امتحاں دیتے رہے۔ جب بھی نیا سوال سامنے آتا، سر کے ساتھ ایمان کو بھی چکر آنے لگتا کیونکہ اکثر سوال ہمارے تہذیبی اور دینی سلیبس سے سراسر باہر تھے۔ چنانچہ پرچہ ختم ہوا اور ہم نے اپنے نمبروں کا اندازہ لگایا تو معلوم ہوا کہ شاید بالکل فیل تو نہیں ہوئے لیکن بمشکل تھرڈ ڈویژن ہی ملا ہے۔ گویا شہادت گاہ سے شہید نکلے نہ غازی بلکہ WALKING WOUNDED[1] —— آپ کسی تازہ تھرڈ ڈویژن لینے والے کو چلتا دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ غریب کو سر کے علاوہ دونوں ٹانگوں پر بھی چوٹیں آئی ہیں —— ہم تو خیر نو آموز تھے، ہمارے لندن شناس دوستوں کی رفتار میں بھی واضح ہزیمت تھی۔ بلکہ کچھ یہی حال دیگر تماشائیوں کا بھی تھا جو دل پر ہاتھ رکھے باقی شب گزارنے جا رہے تھے۔ اس رنگ و روشنی کے ہنگامے میں کئی تاریکیاں اور گہری ہو گئی تھیں۔

پردے میں گُل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

کوئی ڈیڑھ بجے رات کا عمل تھا۔ ہم بھی ہوٹل پہنچ کر بستر کو گلے لگا کر سو گئے۔

---

۱ —— ان زخمیوں کیلئے فوجی اصطلاح جو میدانِ جنگ سے خود چل کر واپس آسکتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

خواجہ عبدالغفور

کامکس

(تصویری کہانیاں)

--- [اردو میں تصویری کہانیوں (کامکس) کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے جب کہ اردو کی ترویج کے لئے یہ ایک بہترین ذریعہ ثابت ہوسکتے ہیں آج جب کہ اردو طباعت کے معیار میں بھی کافی بہتری آتی ہے اور ہر بڑے شہر میں اردو کی خوب صورت کتابیں چھپ رہی ہیں ۔ کامکس کے میڈیم کو بھی استعمال کرنے کی ضرورت ہے ۔ سکریٹری مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکیڈیمی محترم خواجہ عبدالغفور صاحب نے ذیل کے مضمون میں کامکس کی اہمیت کو بخوبی واضح کیا ہے ۔ بڑے پبلشرز اردو میں ایسی کتابوں کی اشاعت کو خسارہ کا دھندہ سمجھتے ہیں لیکن انڈیا بک ہاؤس نے محترم غفور صاحب کی تحریک مدد اور اعانت سے اردو میں ایسی سیریز شروع کی ہے اور مغل بادشاہ اکبر پر ایک خوب صورت کتاب شائع کی جا چکی ہے ہم اسے اردو کی اشاعتی دنیا کے لئے ایک فال نیک سمجھتے ہیں امید ہے کہ یہ سلسلہ دراز ہوگا اور اردو والے ایسی کتابوں کی خریدی میں روایتی بخل سے کام نہیں لیں گے (مدیر)] ---

تعلیم و تدریس کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے ماہران تعلیم اور اساتذہ نت نئے طریقے اختیار کر رہے ہیں لیکن ہمیں لگتا ہے کہ اردو کی تعلیم تبلیغ ترویج اور فروغ کے لئے عام سطح پر ہم کچھ زیادہ نہیں کر پائے یہ ضرور ہے کہ کالج اور یونیورسٹی کی سطح اور ریسرچ اور اعلیٰ تعلیم میں ہم زیادہ منہمک ہیں مذاکرے سمپوزیم، سمینار، مباحثے تحقیق و تنقید میں ہم بہت آگے ہیں ۔ اور آج کل تو ہمارے سامنے ۔۔ اساتذہ ادیب اور شعراء کے صد سالہ جشن منانے اور ان کی زندگی فن اور شخصیت سے متعلق رازہائے سربستہ نہاں کرنے کی جستجو سعی اور کاوش میں مصروف ہیں لیکن اردو کو ان لوگوں تک پہونچانے کے لئے کہ جو بولتے سمجھتے ہیں اور اس حد تک قدرت کاملہ رکھتے ہیں کہ پڑھے لکھے سند یافتہ لوگوں سے بھی ان کی سوجھ بوجھ زیادہ ہے ہم نے کچھ نہیں کیا ۔ حالانکہ ان کے لئے تو ہمیں صرف اتنا کرنا ہے کہ اردو کا رسم الخط سکھا دیا جائے تاکہ وہ بولنے سمجھنے کے علاوہ لکھ پڑھ سکیں آج بھی تک ایک ایسی نسل زندہ ہے جس نے اردو رسم الخط سیکھا لکھا اور پڑھا ہے لیکن نئی پود اس سے نابلد ہے اور وہ یقیناً اردو لکھنے پڑھنے سے دور ہے لیکن ان کے من میں اردو رچی بسی ہے ۔

چونکہ اردو سے ان کا رشتہ زندگی منسلک اور وابستہ ہے ایسے ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بگڑے نہیں اس کے لئے ہمیں نئے طریقے نئے ڈھنگ نئی آسانیاں ایجاد و اختراع کرنا ہوگا ۔

موجودہ دور بصارتی اور سماعتی audio visual سہولتوں کا ہے اور اس تکنک میں دنیا بہت دور نکل چکی ہے جس سے استفادہ نہ کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا ۔

اس تکنک میں ریڈیو، موویز، ٹی وی، فلم اسٹرپ، اسٹرپ کارٹون، لنگوافون images مرقعے، مصور اسباق کامکس چیز کتھا یہ سب ہیں ۔ ہمیں یہاں پر کامکس سے متعلق غور کرنا ہے کہ یہ ایک ایسا میڈیم ہے جو بہت ہی زیادہ پراثر کارآموز اور کارانداز ہے اس میڈیا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کہانی کے تسلسل اور اس کی روانی کو بڑی خوبی اور دلچسپی سے آگے کی طرف لے چلتا ہے اور یہ یقیناً مصور اور مرقع مضامین یا اسباق سے زیادہ مسحورکن اور موثر ہے اس میں ایک اور ندرت ہوتی ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو سلائیڈ اور موویز میں ہوتا ہے کامکس پڑھنے میں کم سن لڑکے بلکہ بسا اوقات بالغ بھی ہمہ تن گوش نہیں بلکہ ہمہ تن بصارت ہو جاتے ہیں لنگوافون ایک زائد سہارا ہے لیکن اس پر کلیتاً انحصار نہیں کیا جاسکتا کامکس سے کسی زبان کے سیکھنے میں آنکھوں کے ذریعہ دل و دماغ پر وہ سارا ماحول اور تمام کی تمام فضا چھا جاتی ہے کہ جو نظروں کے سامنے ہے ۔ اس سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے ۔ اور تصور ہی تصور میں ہر چیز قابل قبول ہو جاتی ہے ۔

طول طویل بیانات جملے اور تفصیلات کے بجائے مختصر سے الفاظ اور ان کو بیانیہ انداز میں پیش کرنے والی تصویریں زیادہ موثر طریقہ پر دل و دماغ پر چھا جاتی ہیں ۔

آج کا کمسن لڑکا بصارت کے لحاظ سے اتنا ہی پختہ اور سمجھ دار ہے جتنا کہ بالغ اس کی تعلیم کا سلسلہ چھٹپن سے ہی جاری ہو جاتا ہے تجسس کی وجہ سے مشاہدہ تیز ہوتا ہے اور ہر چیز کو اپنی نظروں نظروں میں ہی سمو لیتا ہے اسی لئے ضروری ہے کہ چھپے ہوئے الفاظ اور مرقعے ایک ساتھ ہوں اور یہی کامکس کا وہ روپ ہے جو کسی طالب علموں کے دماغ اور حافظہ کو تیز کر دیتا ہے ۔

تاریخ اور جغرافیہ یہ دو ایسے مضامین ہیں جن کے لئے کامکس سے زیادہ موزوں میڈیم نہیں ۔ درحالانکہ موویز فلم اور ٹی وی کامکس سے زیادہ موثر ہیں ۔ مگر سماعت کا سہارا نہ ہونے پر یہ نظر سے کام لینے والا میڈیم ہی ہمارے لئے سودمند اور کارآمد ہے اس لئے بھی کہ یہاں پر سوجھ بوجھ کے کسی خاص معیار اور سطح کی خاص ضرورت نہیں تو عمر لڑکے لڑکیاں بالغ اور ادھیڑ عمر کے لوگ سب ہی اس سے نہ صرف محظوظ ہوتے ہیں بلکہ معلومات کا ذخیرہ بھی حاصل کر لیتے ہیں جو دیرپا ہوتا ہے بے شک یہ بھی صحیح ہے کہ کامکس معیاری ادب کی جگہ نہیں لے سکتا لیکن عقل و دانش کو ضرور چمکاتے ہیں ۔

نئے رجحانات سے بغاوت کرنے والے بسا اوقات کامکس پر یہ الزام ضرور لگاتے ہیں کہ دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے اس طریقہ کار پر عمل کرنے والے علم و ماہیت کو سکیڑ دیتے ہیں اور کبھی اس کو محدود دائرہ میں بند کر دیتے ہیں ۔ یہ بات تو ہر ایک کی اپنی صلاحیت پر مبنی ہے کہ وہ اچھی چیز سے استفادہ نہ کرکے اس کے برے نتائج میں الجھ جائے یا بری چیز کو برا سمجھ کر اچھا راستہ خود ہی نکال لے ۔

el correco do la unesco مرتبہ لسیان ماری کلے منٹ کا مکس کی زبان میں ۴۴ صفحوں پر یونیسکو کی ایسی رپورٹ ہے کہ جو اختصار کی حدود میں سب کچھ واضح کر دیتی ہے اس رپورٹ میں کامکس کے زیادہ سے زیادہ استعمال کی سفارش کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ لڑکے لڑکیاں سیدھی سادھی زبان میں لکھی کتابوں سے نوگنا زیادہ کامکس کو پسند کرتی ہیں اور ان سے سوگنا زیادہ استفادہ کرتی ہیں ۔

خود ہمارے دیس میں اس امر کی مضبوط اور ان مٹ شہادت ہے کہ ہمارے آباو اجداد نے کامکس کے محدود سے میڈیم کو صدیوں پہلے اپنا لیا ہے اور بڑی فراخدلی سے جا بجا استعمال کیا ہے مہاتما گوتم بدھ کی زندگی کو سانچی کے قریب بھارت میں امراوتی میں اور اجنتہ کے ایلورہ کی پہاڑیوں کے کٹے ہوئے غاروں کے اندر کی تصاویر اس بات کی شہادت ہیں ۔

ادارۂ شگوفہ

کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں

کوئٹے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵/- روپے
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	"	۵/۵۰
تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰
چھیڑ چھاڑ	پرویز یداللہ مہدی	"	۶/-
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	"	۶/-
فقط	"	"	۶/-
تو تو میں میں	پرویز یداللہ مہدی	ڈرامے	۱۰/-
چوڑی کے غلام	"	مضامین	۷/-
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	"	۸/-
سمن زار	خواجہ عبدالغفور		۸/-
دھر گھسیٹ	سربیٹ حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸/-
بہرحال	مجتبیٰ حسین	مضامین	۷/-
آدمی نامہ	"	خاکے	۹/-
انڈین کاجو	حاتق شاہ	مضامین	۸/-

"محبّت نے کیا رُسوا اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو"

لگا جب عشق کا چسکا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو
پکڑ جانے کا تھا کھٹکا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو

محلے والوں نے پیٹا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو
"محبّت نے کیا رسوا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو"

بتا دیکھے ہی ہم اک دوسرے پر جان دیتے تھے
دیا قاصد نے یہ دھوکا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو

لگائی دونوں جانب آگ کچھ ایسی رقیبوں نے
کہیں کا بھی نہیں رکھا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو

وہ کھڑکی ہوگئی بند اور چکر بھی میرا چھوٹا
میرے ابّا نے جب ڈانٹا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو

وفا کے راستے میں والدین ایسے ہوئے حائل
کہ مشکل ہوگیا مِلنا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو

محلے والوں نے دونوں کو کیا سے کیا بنا ڈالا
میاں قربان کا بکرا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو

ہمارے عشق کی شہرت ہوئی ایسی، ارے توبہ
گلے میں پڑ گیا پھندا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو

الگ جس روز دونوں کو کیا ظالم زمانے نے
جُدائی کا لگا جھٹکا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو

گلی میں چھپ کے ملتے تھے مگر پکڑے گئے اِک دن
میری بیوی نے دوڑایا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو

میری بے روزگاری سے ہے گھر میں رات دن کھٹ پٹ
ہے اک اک بات پر شکوا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو

پرو فٹ کی بھلا کیا سوچے کوئی پونجی جب ڈوبی
محبت میں لگا گھاٹا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو

حقیقت کے خزانے پر تھی دونوں کی نظر لیکن
مِلا خوابوں کا سرمایہ، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو

نہ محبوبہ بنی بیوی نہ میں جوہرؔ بنا شوہر
محبت نے دیا دھوکا، اِدھر مجھ کو اُدھر اُس کو

جوہرؔ سیوانی

○

"میکدہ گر ہوا بدنام کہو کیا ہوگا"

غنڈہ گردی جو ہوئی عام، کہو کیا ہوگا
اِس مہا دیش کا انجام، کہو کیا ہوگا

نقل بازی کے لئے جبکہ چھڑے بازی ہو
کالج، اسکول میں اگزام، کہو کیا ہوگا

پڑھنے لکھنے کے سوا خون خرابہ جو کرے
اس نئی نسل کا انجام، کہو کیا ہوگا

اب تو آگے نہ بڑھو حد سے سیاست والو
ہاتھ سے نکلا جو آسام، کہو کیا ہوگا

اے مرے بھائی جیرنؔ اب تو یہ "ترکوں کی زباں"
اس ریاست میں ہوئی عام، کہو کیا ہوگا

میکشو جھگڑو نہ تم اہلِ سیاست کی طرح
"میکدہ گر ہوا بدنام، کہو کیا ہوگا

تم نے بھیجا تو ہے بازار نئے نوکر کو
اُڑ گیا لے کے اگر دام، کہو کیا ہوگا

رونے والوں کے لئے ہنسنے ہنسانے کے سوا
اور جوہرؔ مرا پیغام، کہو کیا ہوگا

ڈاکٹر حبیب ضیاء

جلسے

{ یہ مضمون زندہ دلان حیدرآباد کے ادبی اجلاس منعقدہ ۱۱/اپریل ۸۱ء میں پڑھا گیا اور بے حد پسند کیا گیا (ادارہ) }

جلسے مختلف قسم کے ہوتے ہیں ۔ با ادب جلسے ، بے ادب جلسے ، تعزیتی جلسے ، تہنیتی جلسے وغیرہ ۔ یہ کبھی بھی وقت پر شروع نہیں ہوتے ۔ سامعین ہر دفعہ دھوکا کھاتے ہیں اور وقت پر آکر سیٹ سنبھال لیتے ہیں ۔ پندرہ منٹ آدھا گھنٹہ ، پون گھنٹہ پھر پورا ایک گھنٹہ اتنی تاخیر کے بعد مختلف لوگ مختلف طریقے سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں سگریٹ پینے والے سگریٹ کے دھوئیں کا رخ اپنے بازو والے کی طرف موڑ دیتے ہیں جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جو پانچ منٹ قبل بھلا چنگا بیٹھا سیاست پر بحث کرنے کے عارضے میں مبتلا تھا اب اُسے کھانسی کا عارضہ لاحق ہو جاتا۔

ایک جلسے میں مہمان خصوصی وقت مقررہ پر نہیں آئے سامعین بھی بہت کم تھے دور تک خالی کرسیاں ہی کرسیاں تھیں کو بہلانے کیلئے کنوینر نے غائبانہ کامنٹری کچھ اس انداز سے دینی شروع کی ۔

" حاضرین جلسہ اور خالی کرسیو" ابھی کچھ ہی دیر میں مہمان خصوصی آنے والے ہیں حیدرآباد کے پست قد ادیب بلند قامت شاعر، چوٹی کے نقاد ، بے چوٹی کے دانشور سب ہی جلسہ گاہ میں آ رہے ہیں ۔ وہ دیکھئے اسلامنے میز پر پانی رکھا ہے ۔ بے حد صفائی سے بھرا گیا ہے ۔ ٹھنڈا بھی ہے ۔ رنگ برنگی لباس پہنے شوخ و طرار لڑکیاں اس ناز و انداز سے پانی پی رہی ہیں کہ پانی کے بہانے بہت سے معزز سامعین وہاں جمع ہو گئے ہیں مہمان خصوصی کچھ ہی دیر میں آنے والے ہیں وہ دیکھئے گیٹ میں ایک لاری داخل ہوئی ہے جو لوگ کھڑے ہوئے ہیں جلدی سے اپنی نشستیں سنبھال لیں ورنہ لاری سے جو لوگ آئے ہیں اُن کے کارن آپ لوگوں کو جگہ نہ ملے گی ۔

اکتاہٹ دور کرنے کے لئے جو حضرات اِدھر اُدھر ٹہل کر سگریٹ یا پانی پی رہے تھے جلدی سے نشستوں پر بیٹھ گئے ۔ لاری قریب آئی تو پتہ چلا کہ مزید خالی کرسیاں آئی ہیں جلسہ گاہ میں جمانے کے لئے ۔

ادھر کنوینر نے پھر کہنا شروع کیا " ابھی ابھی ٹیلی فون آیا ہے کہ مہمان خصوصی کچھ منٹ قبل نکل چکے ہیں بس اب

آنے ہی والے ہیں کچھ منٹ کچھ گھنٹوں میں تبدیل ہو گئے۔ مہمان خصوصی کا دور تک پتہ نہ تھا سارے مقررین اپنی بھڑاس جو مہمان خصوصی پر نکالنے والے تھے معصوم اور بے قصور سامعین پر نکال کر چلتے بنے۔ مہمان خصوصی تین گھنٹے بعد آئے پتہ چلا کہ وہ دس منٹ قبل نکل تو چکے تھے لیکن حیدرآباد یا سکندرآباد سے نہیں بلکہ نلگنڈے سے نکلے تھے۔ خفیہ طور سے معلوم ہوا کہ انھوں نے مصلحتاً آنے میں دیر کی تھی اس جلسے کے تقریباً نصف مقررین ایسے تھے جو مہمان خصوصی سے اپنے مطالبات منوانے پر تل کر آئے تھے مسئلہ اردو کی روٹی کا تھا جسے بعض لوگ بے سوچے سمجھے حرام کی روٹی کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی زندگی بھر اسی روٹی پر پلتے ہیں بہرحال ایسے جلسوں میں صدر یا مہمان خصوصی کے دیر سے آنے یا سرے سے نہ آنے میں اس کا اپنا مفاد پوشیدہ رہتا ہے۔

ہر جلسے کے مقرر الگ الگ ہوتے ہیں ایک صاحب جو عام طور پر محنت کش طبقے کے لوگوں سے خطاب کیا کرتے تھے، پہلی بار ادبی جلسے میں مدعو کئے گئے وہ انتہائی جوش و خروش سے تقریر کر رہے ہیں۔ ادبی جلسہ تھا با ادب لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ دوران تقریر انھوں نے سیدھی جانب بیٹھے ہوئے سامعین کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ مثال کے طور پر یہ رکشے والے! انھیں دو وقت کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نصیب نہیں ہوتی نہ رہنے کا مناسب ٹھکانہ۔ یہ روکھا سوکھا کھا کر رکشے ہی میں سو جاتے ہیں" یہ سنتے ہی سامنے کی نشستوں سے ایک صاحب جو پھولدار شرٹ پہنے پر اپنا کوٹ ہاتھ پر ڈالے بیٹھے تھے، غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔

" اے چپ"! کون بولتا میں بھکارہ کے رکشے میں سوتوں، پہلے چادر گھاٹ کی نیاگرا میں کھا کے رکشے میں سوتا تھا اب ایرکنڈیشنڈ.. نیاگرا میں کھا کے فٹ پاتھ پہ سوتوں، اُو میرے باپ کا نئیں ہے۔ اس خیال سے کہ مزید بات نہ بڑھے منتظم جلسہ نے آگے بڑھ کر مقرر کا سیدھا ہاتھ مائیک سے باندھ دیا۔ تقریر میں روانی تھی۔ اسی روانی میں موضوع بحث بھی تیزی سے بدل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے بائیں طرف بیٹھے ہوئے سامعین کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

مثال کے طور پر دیکھیے یہ لڑکیاں ان کا لباس ان کی چال ڈھال اتنا سننا تھا کہ ایک برقع پوش بے نقاب خاتون جو پورے میک اپ میں تھیں۔ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ غصے سے بولیں "شرم نہیں آتی! میری عمر کا ہے میرے کو دیکھ —— منتظم جلسہ نے جھٹ سے مقرر کا دوسرا ہاتھ بھی مائیک سے باندھ دیا دور بیٹھنے والے تو یہی سمجھ رہے تھے کہ جذبات سے بے قابو ہو کر انھوں نے خود کو سنبھالنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے مائیک تھام لیا ہے۔

بعض لوگ جلسے تو منعقد کرتے ہیں انتہائی اہتمام سے لیکن مقررین کی اتنی طویل فہرست بناتے ہیں کہ اکثر شائقین تو اخبار میں فہرست پر نظر ڈالتے ہی گھر بیٹھ جاتے ہیں۔ پندرہ سولہ ناموں کا اعلان وہ محض ڈھاک ڈالنے کے لئے کرتے ہیں اُن میں سے آنے والے صرف چھ سات ہی ہوتے ہیں۔ جلسہ حسبِ روایت دیر سے شروع ہوتا ہے ہر مقرر چاہتا ہے کہ وہ اپنی ساری علمیت اسی جلسے میں بانٹ دے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مہمان خصوصی کی باری آنے تک منتظمین کا پیمانہ صبر چھلک جاتا ہے ایک ایسے ہی جلسے کا ذکر ہے ایک خاتون اپنا ایم فل کا مقالہ لے کر آگئی تھیں۔ سامعین کی طرف سے خطرے کی گھنٹیاں بجنے کے باوجود وہ بغیر ہڈی مارے پورا مقالہ سنا کر ہی مائیک سے ہٹنا چاہتی تھیں منتظم جلسہ نے ایک مرتبہ اشارتاً اُن سے درخواست کی اس پر انھوں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ دوسری مرتبہ پھر وہ مائیک کے قریب آئے اس دفعہ تو منتظم اور مقرر دونوں کے د تار

کا مسئلہ بن گیا۔ منتظم کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی انھوں نے آنکھوں سے ایسے جھڑکی دی گویا کہہ رہی ہوں "ہٹ پاگل کس پر رعب جما رہے ہو"۔ منتظم انتہائی درجہ شریف آدمی تھے بعد میں انھوں نے صرف یہ کہہ کر خود کو سنبھال لیا۔

"سالی عورت تھی، نہیں تو ہاتھ پکڑ کے ہٹا دیتا تھا" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرد لوگ سالی اور عورت کا کتنا زبردست احترام کرتے ہیں۔

تعزیتی جلسوں کے مقرر بالکل الگ نوعیت کے ہوتے ہیں مائیک پر آنے کے بعد وہ عموماً بھول جاتے ہیں کہ جلسہ مرحوم سے متعلق ہے۔ ایک بہت بڑے مورخ اور نقاد کا تعزیتی جلسہ تھا ایک صاحب تقریر کے لئے بلائے گئے تھے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا۔

"مرحوم مجھے بہت اچھی طرح جانتے تھے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ تو بہت بڑا آدمی بنے گا۔ میں نے مرحوم سے پڑھا بھی تھا۔ بی اے میں ان کی کلاس میں ایک دن بیٹھا تھا وہ میری علمی صلاحیتوں کا لوہا مانتے تھے انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تو ہی وہ واحد انسان ہے جو تاریخ پر کتاب لکھ سکتا ہے" ——— ؟

یہ صاحب مسلسل "میں میں" کیے جا رہے تھے کسی منچلے نے پیچھے سے پکارا" یہ ڈونیگیں لکھ کے دے دو تمارے جلسے میں میں سنا توں"۔

بعض جلسوں میں تقاریر ختم ہونے کے بعد اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ایسے ہی ایک جلسے میں ایک مقرر کے مائیک سے ہٹتے ہی سامعین میں سے ایک صاحب نمودار ہوئے، شیروانی کے کالر پر ڈیڑھ انچ میل کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ مائیک کی طرف بڑھتے ہوئے بولے "میں صرف دو منٹ لینا چاہتا ہوں"۔

سامعین ایسے لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوتے ہیں جنھیں کچھ کہنا نہیں ہوتا صرف مائیک پر آنے کا شوق ہوتا ہے اُن کے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک شریر لڑکے نے ان کی شیروانی کا دامن پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا "چچا یہیں سے بولو"

اب رہے جلسے کے منتظمین۔ ان کا زیادہ وقت چونکہ اسٹیج پر گزرتا ہے اس لئے ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جلسہ شروع ہونے سے دو گھنٹے قبل، دوران جلسہ اور پھر جلسہ ختم ہونے کے بہت بعد تک یہ اسٹیج پر چلتے پھرتے بلکہ دوڑتے نظر آتے ہیں ہر پانچ دس منٹ بعد وہ مہمان خصوصی یا صدر جلسہ کے پاس آ کر آہستہ سے کچھ کہہ جاتے ہیں ایک منتظم اسٹیج پر ضرورت سے زیادہ آ کر مہمان خصوصی کے کان میں کچھ کہہ رہے تھے ہم نے اپنے قلم کو بھیجا کہ جلدی سے بھید لے آئے۔ سنا کہ وہ کہہ رہے تھے۔

"میں کچھ نہیں بول رہا ہوں۔ آپ زور سے منڈی ہلائیے۔"

کرگس سہسوانی

"خدا خیر کرے"

ان کے ہونٹوں پہ ہے مسکان خدا خیر کرے ۔۔۔ لٹ نہ جائے مرا ایمان خدا خیر کرے
وہ ہیں کچھ کمسن و نادان خدا خیر کرے ۔۔۔ ہو نہ جائے کوئی نقصان خدا خیر کرے
بیل باٹم پہ یہ رنگین سی شرٹ اور یہ بال ۔۔۔ مرد و زن کی نہیں پہچان خدا خیر کرے
وصل کی بات تو مشکل ہی نظر آتی ہے ۔۔۔ ان کا نوکر ہے پہلوان خدا خیر کرے
ایک فرلانگ سے زیادہ ہی ہے لوگوں کی قطار ۔۔۔ یہ ہے اک تیل کی دوکان خدا خیر کرے
دِل تو میرا گیا ، پکڑا گیا چالان ہوا ۔۔۔ اور تم بن گئے انجان خدا خیر کرے
دیکھ کر مجھ کو وہ آہستہ سے بولے کرگس
ہے وطن اس کا سہسوان خدا خیر کرے

○

مال دن رات میرا کھاتے ہو ۔۔۔ ہاں میں ہاں غیر کی ملاتے ہو
کیوں مجھے تشنہ لب اٹھاتے ہو ۔۔۔ شیخ کو خوب "رم" پلاتے ہو
میرے دِل میں تو کوئی پاپ نہیں ۔۔۔ تم تو ناحق ہی سہم جاتے ہو
حورِ جنت کے وہ بھی طالب ہیں ۔۔۔ شیخ کو پارسا بتاتے ہو
مے سی انمول چیز چھوڑوں میں ۔۔۔ شیخ جی! مجھ کو ورغلاتے ہو
وصل کی بات کوئی بات بھی تھی ۔۔۔ تم تو بس یونہی روٹھ جاتے ہو
تم نے کرگس کو پارسا سمجھا
نعتِ حالی کبھی سناتے ہو

رؤف رحیم

شاعری کی بزم سے آگے نہ جانا ہے مجھے ۔۔۔ ہاتھ رکھنا کان پر اور شعر گانا ہے مجھے
اُلٹے سیدھے شعر کہنا داد پانا ہے مجھے ۔۔۔ آئینے سے پھوڑ کر پتھر بتانا ہے مجھے
شاعری میں کچھ نہ کچھ جدت دکھانا ہے مجھے ۔۔۔ چاند دن میں، رات میں سورج اگانا ہے مجھے
اک نئے انداز سے چکر چلانا ہے مجھے ۔۔۔ "انجمن" کے نام سے چندہ کمانا ہے مجھے
شاعری میں سر کھپانا ، دِل جلانا ہے مجھے ۔۔۔ یہ مرض لے ڈاکٹر صاحب چھپانا ہے مجھے
داد کے بدلے میں ہوٹنگ پاکے آنا ہے مجھے
کیا رحیم اس شاعری میں سر کھپانا ہے مجھے

ڈاکٹر عابد معز

انگلش میڈیم اسکول

آبادی میں بے روک ٹوک اضافہ سے جہاں کئی مسائل پیدا ہوئے ہیں وہیں اشیاء کی زیادہ کھپت سے چند ایک صنعتوں کو فائدہ بھی ہوا ہے۔ آبادی کے اضافہ سے تدریس کی "گھریلو صنعت" کو کافی بڑھاوا ملا۔ بدقسمتی سے یہ ترقی صرف انگلش میڈیم کے حصے میں آئی۔ دوسری زبانوں بالخصوص اردو کی "صنعتوں" پر جمود طاری ہے۔ جیسا کہ دوسری دیسی گھریلو صنعتوں کا حال ہے

تعلیمی سال شروع ہو چکا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ نے اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکول میں داخل کروانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوگا۔ آج کل انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانا ایک فیشن ہے، خبط ہے، جنون ہے وبا ہے۔ اس جنون کا فائدہ انگریز صدیوں سے اٹھا رہے ہیں اور اب ہمارے دیسی انگریز نما بھائی بند بھی اس میں شامل ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ شہر میں قدم قدم پر انگلش میڈیم اسکول ملیں گے۔ ہم اپنے ایک دوست کا آپ سے تعارف کرواتے ہیں جو ایک انگلش میڈیم اسکول کے مالک ہیں۔ صاحب موصوف نے بی اے کی ڈگری کئی قسطوں میں حاصل کی۔ نوکری کی تلاش اور باہر جانے کا چکر عرصہ دراز تک چلتا رہا۔ مایوس ہو کر شادی کی۔ بچے پیدا کئے۔ پھر بیوی بچوں اور بے روزگاری سے تنگ آکر ایک انگلش میڈیم اسکول قائم کرنے کی ٹھانی۔ اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں تختی نما بلیک بورڈ، دو عدد قلم، چار ورقی رجسٹر اور اپنے ہی چھ عدد بچوں سے انگلش میڈیم اسکول کی بنیاد ڈالی۔ جس کے وہ خود صدر مدرس یعنی ہیڈ ماسٹر اور ان کی بیوی نائب صدر مدرس تھیں۔ آبادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے ساتھ اس اسکول کے طالب علموں کی تعداد چھ سات سو تک پہنچ گئی ہے۔ چلتے چلتے ہم ایک اور بات بتلا دیں۔ آج کل جب کوئی کچھ کر نہیں پاتا تو وہ ٹیچر بن جاتا ہے۔

مقامی زبان کے مدرسوں کے عموماً کوئی نام نہیں ہوتے وہ اپنے جائے مقام سے پہچانے جاتے ہیں یا پھر کسی قومی قائد کے نام سے منسوب ہوتے ہیں انگلش میڈیم اسکول اکثر مقدس ہستیوں کے نام پر ہوتے ہیں یا پھر ان اسکولوں کے نام میں جدت ہوتی ہے کسی اسکول کا نام الٹرا ماڈرن انگلش میڈیم اسکول ہے تو کوئی نیو الٹرا ماڈرن اسکول بھی۔

انگلش میڈیم اسکول میں داخلے کے لئے بڑے جوکھم اٹھانے پڑتے ہیں۔ ماں باپ کا امتحان اور بچہ کا معائنہ ہوتا ہے۔ پہلی جماعت سے قبل جونیر اور سینیر نرسری لوور اور اپر کنڈر گارٹن سے گزرنا پڑتا ہے ان جماعتوں میں بچوں کو پڑھایا نہیں جاتا بلکہ انھیں رلایا اور

در سمجھایا کھلایا اور سلایا جاتا ہے بیچے خود سوتے کم اور ٹیچر کو سلاتے زیادہ ہیں ایک ٹیچر کی نیند بچوں کے شور سے خراب ہوئی جو اس بات پر لٹ پڑے تھے کہ بات تک ٹیچر نے چھپن خراٹے لئے ہیں کہ ستاون بہر حال روکر، کھیل کرا ور سو کر ان جماعتوں میں تین یا چار سال گذارنے کے بعد بچوں کو پہلی جماعت میں ترقی دی جاتی ہے شاید اسی لئے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے والے طالب علموں کی عمریں زیادہ ہوتی ہیں۔ والدین اس نکتہ پر غور کرنا اس لئے مناسب نہیں سمجھتے کہ ان کا نورچشم انگلش میڈیم اسکول میں زیر تعلیم ہے ۔

ہم نے پہلے ہی کہا ہے کہ انگلش میڈیم اسکول ایک منفعت بخش صنعت ہے اس کا اندازہ آپ کو ان اسکولوں کی فیس دیکھ کر ہوگا اب آپ کو کیا بتلائیں ہم اپنے اکلوتے لڑکے کی انگلش میڈیم اسکول کی فیس ادا کرنے کے لئے اتنا اوور ٹائم کرتے ہیں کہ وقت سے پہلے بوڑھے ہو چلے ہیں ۔ ایک اور خوبی ان مدرسوں کی یہ بھی ہے کہ انھیں وقتاً فوقتاً چندہ یعنی DONATION کی ضرورت ہوتی ہے پڑھائی کی فیس اور چندوں کے علاوہ ان انگلش میڈیم اسکولوں کی آمدنی کے لئے اور بھی ذرائع ہیں جیسے اسکول کے یونیفارم اور کتابوں کی دکان آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انگلش میڈیم اسکول اور یونیفارم لازم و ملزوم ہیں ۔ بعض یونیفارم پر فینسی ڈریس FANCY DRESS کا شبہ ہوتا ہے تو بعض پر بینڈ پارٹی والوں کا گمان ہوتا ہے یونیفارم چاہے جیسے بھی ہوں ان میں ٹائی اور اسکول کے نام کی تختی ہونا اشد ضروری ہے ہم نے بچوں کو ٹائی سے ناک منہ صاف کرتے ہوئے دیکھا ہے یونیفارم ایسے رنگوں اور کپڑے کے ہوتے ہیں جو بازار میں کہیں بھی دستیاب نہیں ہوتے آپ کو اسی اسکول سے خریدنا پڑتا ہے کتابوں کا بھی یہی حال ہے ہر اسکول کی کتابیں الگ ہوتی ہیں۔ جو صرف اور صرف اُسی اسکول کے اسٹور سے منہ مانگے دام ادا کرکے خریدنا پڑتا ہے ۔

ہونا تو یہ چاہیئے کہ انگلش میڈیم اسکول کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہو لیکن ان اسکولوں میں انگریزی بذریعہ مادری زبان سکھائی جاتی ہے جماعت میں ٹیچر کے داخل ہونے پر طالب علم کھڑے ہو کر GOOD MORNING TEACHER کا نعرہ بلند کرتے ہیں چاہے وہ دن کا کوئی بھی پہر ہو ہمیشہ MORNING گڈ ہی رہتی ہے عموماً ٹیچر صاحبہ یا ٹیچر صاحب بچوں کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی کرسی پر براجمان ہو کر چند ایک جمائیاں لینے اور سستی توڑنے کے بعد کہتے ہیں بچو! BOOKS کھولو اور آج کا LESSON پڑھو ———

A سے APPLE ، B سے BAT ، C سے CAT ..... بچے حتی المکان حلق پھاڑ کر پڑھتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ایک طالب علم علم کی پیاس بجھا کر پوچھتا ہے ٹیچر WATER پی کر آؤں ۔ جواب ملتا ہے GO کچھ ہی دیر میں دوسرا لڑکا ایک ہاتھ سے نیکر سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ کی مٹھی بنا کر آخری دو انگلیوں کو ہلاتے ہوئے کہتا ہے ٹیچر! زور سے آ رہا ہے جواب ملتا ہے WATER والے کو آنے دو پھر YOU GO

A سے APPLE ، B سے BAT .... والا وظیفہ ایک عرصہ تک رٹایا جاتا ہے نتیجتاً تعلیم میں اتنی پختگی آتی ہے کہ یہ بچہ ایمان لے آتا ہے کہ A سے صرف APRLE ، B سے BAT اور C سے CAT ہوتی ہے بچہ کے دماغ پر یہ بھی نقش ہو جاتا ہے کہ انگریزی زبان یہی A TO Z ہے ۔ اس حقیقت کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک دوست نے ہماری جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنے لڑکے سے پوچھا بیٹا یہ کون ہیں جواب ملا یہ UNCLE ہیں ہم نے لڑکے سے کہا بیٹا تمہارے ڈیڈی کے سبھی دوست تمہارے انکل ہوئے ہمارا نام بتلاؤ تو جانیں ۔ لڑکا اپنے حافظہ پر زور

دینے لگا۔ ہم نے لڑکے کی مدد کے لئے کہا۔ ہمارا نام O سے شروع ہوتا ہے۔ لڑکا فوراً کہہ اٹھا O سے OWL آپ کا نام ہے
انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے والے بچوں کے لئے TUITION لینے کی سخت ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ وہ ایک نان لینگویج
میں تعلیم پاتے ہیں چنانچہ وہ پہلے انگریزی کو اپنی مادری زبان کی مدد سے سیکھتے ہیں ہم نے ایک طالب علم کو انگریزی الفاظ کے معنی ہجے
کرکے سیکھتے ہوئے دیکھا ہے انھوں نے SELFISH کے ہجے SELL اور FISH کئے اور اس طرح سے SELFISH
کے معنی مچھلی بیچنے والا بتلائے۔ بچہ مادری زبان کی مدد سے سیکھی ہوئی انگریزی زبان میں دوسرے مضامین پڑھتا ہے۔

بچے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتے ہوئے اپنی والدہ ماجدہ کو اماں امی اور والد محترم کو ابا، بابا کہنا پسند نہیں کرتے
وہ انھیں PAPPA، DADDY، MUMMY یا پھر POP، DAD، MOM کہہ کر مخاطب کرتے ہیں سلام یا
آداب عرض کرنے کے بجائے ہلتے ہلاتے یا پھر ہاے ہاے کرتے ہیں۔ ح، ق، غ کو صحیح ادا کرنے سے جھجکتے ہیں۔ بچے نہ
انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں اور نہ اپنی مادری زبان میں بلکہ ان دونوں زبانوں کی آمیزش سے ایک نئی دوغلی زبان کو جنم
دیتے ہیں ہم نے ایک لڑکی کو کہتے سنا۔
”الادے پکنک میں بہت ENJOYMENT ہوا GREEN TAMARIND چٹنی کے ساتھ
دال کے پراٹھے SO TASTY کہ DON'T ASK“ انگلش میڈیم اسکول میں زیر تعلیم بچوں کے پاس ان کی مادری زبان کی
کوئی وقعت نہیں رہتی انھیں مادری زبان بہت مشکل نظر آتی ہے ایک لڑکے نے اپنے دوست سے کہا BOSS ہمارے گھر میں
MOM AND DA بہت HIGH URDU کہتے ہیں مجھے تو کچھ UNDERSTAND ہی نہیں ہوتا اور تو اور
بچے اپنی مادری زبان کا رسم الخط انگریزی بنا لیتے ہیں۔ انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم پاتے ہوئے بچے کبڈی، لٹو یا گلی ڈنڈا کھیلنا
پسند نہیں کرتے بلکہ گلی کوچوں میں کرکٹ کھیلنے کو ترجیح دیتے ہیں برف کے بجائے سمنٹ کی سڑکوں پر اسکیٹنگ کرتے ہیں بانسری
ہونٹوں سے لگانے کے بجائے الکٹرک گٹار بجانا پسند کرتے ہیں۔ نت نئے فیشن کرکے عورت اور مرد کے فرق کو دور کرتے ہوئے
دونوں کو ایک ذات میں ضم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی مادری زبان یقیناً کوئی دیسی زبان ہوتی ہے۔ اکثر لوگوں کی مادری
زبان اردو بھی ہے لیکن حقیقتاً اب اردو خانساماں کی زبان بنتی جا رہی ہے جو دھوبی کا حساب کتاب لکھنے اور سودا سلف کی
فہرست تیار کرنے کے لئے استعمال ہو رہی ہے یا پھر ادیب یا شاعر اس کی بقا کے لئے مضامین، افسانے، ناول، غزلیں اور نظمیں لکھتے
ہیں۔ انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم اردو سے اس کا یہ حق بھی چھیننا چاہتے ہیں۔ ہم شرمندگی کے ساتھ
تحریر کرتے ہیں کہ ہمارے گھر میں دھوبی کا حساب کی جگہ MATHEMATICS OF WASHERMAN لکھا ہوا پایا۔
والدین اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانا قابل فخر کارنامہ سمجھتے ہیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ والدین مہمانوں کے
سامنے اپنے بچوں سے ون ٹو ہنڈرڈ گنتی کرنے کے لئے ٹیبل پڑھنے کے لئے یا کم سے کم POEM سنانے کے لئے ضرور کہتے ہیں۔
بچے پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے آنکھیں بند کئے مٹھیوں کو پیچھے اور گردن کی رگیں پھلائے۔ BABA BLACK
SHEEP والا راگ الاپنے لگتا ہے۔ ماں باپ اس بے سرے راگ پر سر دھننے لگتے ہیں۔
اگر اتفاق سے بچہ کہیں بیچ میں رک گیا تو اسے پیچھے لوٹ کر پھر BABA کے ساتھ آگے بڑھنا پڑتا ہے ہم نے
ایسے بھی والدین دیکھے ہیں جنھیں مادری زبان کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں آتی لیکن ان کے بچے انگلش میڈیم اسکول

میں تعلیم پاتے ہیں ایک ایسے ہی گھر کے ولی عہد نے ڈیڈی کی آمد پر کہا ۔

MUMMY OFFICE COME FROM DADDY

اور ڈیڈی نے خوش ہو کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ممی سے کہا ماشاءاللہ ہمارا نورِ چشم انگریزی میں بات کرنے کے قابل ہوگیا ہے ۔

انگلش میڈیم اسکول اور ان کے طالب علموں کی شان میں اور گستاخیاں کرتے لیکن ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہم پر قدامت پسند کا لیبل نہ چسپاں ہو جائے ہم انگریزی زبان کی اہمیت سے خوب واقف ہیں ہماری صرف اتنی التجا ہے کہ انگریزی کو اردو یا کسی اور زبان کا محتاج نہ بنایا جائے اور نہ ہی کسی اور زبان کو انگریزی پہ قربان کیا جائے اس لئے کہ ہر زبان کی اپنی ایک تہذیب ہے مٹھاس ہے اپنا ایک منفرد رنگ ہے ۔ مزاج ہے اور اپنا ایک الگ انداز ہے ۔

از ذکیہ انجم (نئی دہلی)

بہروپیا

دنیا میں شاید کوئی بھی شخص کھری شخصیت نہیں رکھتا۔ کتنے ہی پردے ڈال کر آتا ہے۔ صنفِ نازک کے لیے تو پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ سادہ لوح ہوتی ہے۔ ناقص العقل ہوتی ہے! اس میں تریا چرتر ہو تو ہو، لیکن وہ پیاز کی پوتھی نہیں ہوتی۔ پیاز کی پوتھی پر چونکیے نہیں، مرد کی شخصیت کی تشبیہ اس سے زیادہ برمحل ممکن نہیں! — آپ نے پیاز کی پوتھی دیکھی ہے نا! —— کچھ لوگ اسے گٹھی بھی کہتے ہیں، تہہ در تہہ ——! ایک تہہ اتاریئے، دوسری موجود، دوسری اتاریئے تیسری سامنے آتی ہے۔ اس طرح کتنے ہی چھلکے اتارنے کے بعد وہ بنیادی حصہ ہاتھ میں آتا ہے، جسے پیاز کا دل کہہ سکتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ مرد کی شخصیت کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے کچھ اتنی ہی تگ و دو کرنی پڑتی ہوگی اور اتنا ہی وقت درکار ہوتا ہوگا ——!!

پیاز کی پوتھی اور ایک بہروپیے میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ بہروپیا مختلف موقعوں اور مختلف اوقات میں بھیس بدل بدل کر سامنے آتا ہے، اس کے باطن اور ظاہر میں اتنا فرق ہوتا ہے ———— اتنا فاصلہ ہوتا ہے کہ آپ لاکھ تہہ رس نگاہوں کے مالک ہوں۔ آپ کی نظر دور رس بھی ہوسکتی ہے، لیکن تو یہ کیجیے، جو آپ اس کی اصلیت سے واقف ہوسکیں ——!

اس حقیقت سے آپ بھی متفق ہوں گے کہ آدمی جتنا بڑا ہوتا ہے، جتنے بڑے عہدے پر فائز ہوتا ہے، اتنا ہی بڑا وہ بہروپیا ہوتا ہے —— یا یوں کہیے، اونچی کرسی اُسے اسی حساب سے بہروپیا بننے پر مجبور کرتی ہے۔

یوں تو ہر شخص اپنی زندگی میں، زندگی کے ہر موڑ پر بہروپیا ہوتا ہے بس فرق یہ ہوتا ہے کہ کسی کے "بہر" روپ ہوتے ہیں اور کوئی کم روپ بدلتا ہے۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے بہروپیے کو تو آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ جس کا انتخاب، شاید مخصوص چہرہ دیکھ کر کیا جاتا ہے، جو ہر فریم میں فٹ ہوسکے —— بے ہنگم سا جسم، بے تکا چہرہ اور اس پر لباس کی بے ترتیبی۔ یہی نہیں، موقع محل کے لحاظ سے اس میں بھی تبدیلی۔ جیسا کیس ہوا، اسی طرح کا اس نے بہروپ بھرا۔ کبھی سوٹ بوٹ میں ملبوس یہ بڑی بڑی محفلوں میں نظر آتے ہیں، کبھی سادھو سنیاسی کا روپ دھارن کرکے مندر کی گھنٹی بجاتے ہیں اور کبھی ٹخنوں سے اونچا پاجامہ، ڈھیلی لمبی قمیص، اس پر پھندنے والی ترکی ٹوپی پہنے، داڑھی چپکائے ہوئے آنکھیں سرمے سے مزین، کسی مسجد کی مقدس سرزمین پر سجدہ ریز نظر آتے ہیں —— کبھی یہ سی۔ آئی۔ ڈی۔ بہروپیا ڈھیلی سی پتلون اور اس پتلون

راس پتلون پر کئی رنگ برنگے پیوند۔ پتلون سے متضاد رنگ کی بش شرٹ، جو آگے سے پتلون کے اندر اور پیچھے جھولتی ہوئی۔
ر صاحب بہروپیا کوٹ زیب تن نہ کیے ہوئے، تو موقع بے موقع بشرٹ کا پیچھے کا دامن ہوا کے ساتھ رقصاں ——
تلون سالم نہ ہو...... تو...... بے چارے کی مشکل ہو جاتی۔ ہنسیے نہیں۔ اگر موقع کے لحاظ سے آگے کے دامن
کو بھی، ہوا میں لہرانا پڑے، تو وہ بھی کر دکھائے گا —— پتلون خاصی ٹائٹ رہتی ہے اور نہ بھی ہو، تو کوئی مضائقہ
نہیں بھئی۔ آئی۔ ڈی۔ سر یا گل کا بھیس بھی تو بدل لیتے ہیں۔ ننگ دھڑنگ، پاگل کا سا! لیکن وہ بے چارہ تو اپنی روزی
کے لیے، بچوں کی روٹی کے لیے طرح طرح کے بہروپ بھرتا ہے، لیکن قابلِ عبرت تو وہ مقام ہوتا ہے، جب کوئی اپنی
لیعنت سے مجبور ہو کر، یا کسی بھولے بھالے انسان کو اپنے جنگل میں پھنسانے کے لیے یا اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے شرمناک
ہتک روپ بدلتا ہے۔ —— ایسے بہروپیے قدم قدم پہ ملتے ہیں، زندگی کے ہر شعبے اور ہر موڑ پر ——!

آئیے، اس وقت میں آپ کی ملاقات ایک عظیم بہروپیے سے کراؤں۔ فی الوقت ایک مقرر کی حیثیت سے یہ آپ
کے سامنے ہیں ——

”ہاں، تو بھائیو! اور بہنو! میں کہہ رہا تھا کہ کوئی بھی زبان اپنی قوم کی سرمایہ ہوتی ہے اور یہ زبان، جسے ہم اُردو
کہتے ہیں، کتنی ہی قوموں کا سرمایہ ہے۔ اسے میں نے کتنی ہی قوموں کا سرمایہ اس لیے کہا کہ کتنے ہی ملکوں میں یہ بولی اور سمجھی جاتی
ہے۔ کسی مخصوص مذہب، قوم اور ملک سے بالاتر ہو کر —— ! آپ بتائیے، میں جو زبان بول رہا ہوں، آپ سمجھ رہے ہیں نا۔ میرا
مطلب —— ؟ یہ زبان عالمگیر زبان ہے، جسے لیڈر ووٹ حاصل کرنے کے لیے، فقیر بھیک مانگنے کے لیے مصنف
انعام پانے کے لیے اور قیس لیلیٰ کے قصیدے پڑھنے کے لیے استعمال کرتا ہے —— یہ زبان کب پیدا ہوئی؟ کہاں پیدا
ہوئی؟ یقیناً یہ اس علاقے کی کھیتی میں درج ہوگا۔ آپ اس کا نام لے کر اس کے جائے پیدائش کا پتہ چلا سکتے ہیں اور اگر آپ
چاہیں، تو اس کی مدد سے برتھ سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن صاحب! اس جوکھم میں، ہمیں، آپ کو یا کسی اور صاحب
کو پڑنے کی کیا ضرورت —— اُردو کو نہ تو کسی اسکول میں داخلہ لینا ہے اور نہ بیرونِ ملک جانا ہے کہ جہاں جائے پیدائش
اور تاریخ پیدائش کی ضرورت پیش آئے۔ ہاں یہ سنتے آئے ہیں کہ اس نے مغلوں کے دورِ حکومت میں آنکھیں کھولیں اور
انہیں سے پیروں چلنا سیکھا۔ لیکن صاحب! اب پھر مشکل آن پڑی۔ ہم جیسے ادب کے دلدادہ کے لیے حساب کا مسئلہ حل
کرنا ذرا مشکل ہے۔ خیر چھوڑیے اس قضیہ کو۔ ہمیں حساب کتاب سے کیا مطلب۔ اور پھر آپ جانیے، ہم تو قوم کے خادم ہیں،
سود و زیاں کا پیمانہ ویسے بھی ہاتھ میں لے کر نہیں چلتے —— ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں آزاد ہوئے لگ بھگ بتیس سال
ہوئے۔ بتیس سال پہلے ہم پر انگریزوں کی حکومت تھی اور اس سے قبل، جیسا کہ آپ سب ہی جانتے ہیں، یہاں مغل حکمران
تھے، جن کی ایک طویل فہرست ہے —— ایک بادشاہ گزرا ہو، تو کوئی نام یاد رکھے —— اتنے شہنشاہوں کے
نام اور کارنامے کوئی مورخ یا محقق ہی یاد رکھ سکتا ہے!! مجھے اتنا تو یاد ہے کہ پہلا بادشاہ بابر تھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب
تختِ نشین ہوا یا جہاں گیر، میں وثوق سے نہیں سکتا۔ ہاں، یہ ضرور معلوم ہے کہ سب سے سنہرا دور محمد شاہ رنگیلے کا تھا۔
—— ارے صاحب! کیا رنگینی تھی اس کے دور میں روڑے بھی اچھل رہے تھے۔ بہرحال، اس وقت اس قضیہ کو

نہیں چھوڑیئے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اس سے بڑھ کر دوسری کوئی زبان نہیں، لیکن افسوس ہے کہ یہ موٹا سا لفظ آج کل لوگ سمجھ نہیں پاتے۔ اسی لیے اب آپ نہ کسی مجنوں کو دیکھ سکیں گے اور نہ کسی رانجھے کو —— اور نہ اب سودا پیدا ہوں گے اور نہ انیس اور نہ کوئی دلیش کا ترانہ لکھ سکے گا، نہ کوئی اس کی قدر کرنے والا ہوگا —— میں سمجھتا ہوں، میں نے آپ کا خاصا وقت لے لیا۔ اب اور کیا کہوں۔ آج کے لیے اتنا ہی سوچا تھا —— "

سامعین میں سے ایک آواز آئی "اپنے نام سے کتابیں ٹھیکے پر لکھواتے ہو کیا ——؟"

"کمیٹی سے معلوم کر کے اردو کی Date of birth بتا دیجیے گا۔" دوسری آواز آئی۔

بہت پیچھے سے ایک سرگوشی ابھری "سالا رٹ کے آیا تھا، ورنہ اسے اردو میں تقریر کرنے کا کیا سلیقہ ——"

لاپروا لے نے کہا "اماں نہیں، بہت بڑا شاعر ہے یہ —— مانا ہوا اردو کا نقاد ہے۔ سماج میں، ادب میں اس کا بڑا بڑا اونچا مقام ہے —— تمہیں یاد نہیں، جس سال غالب صدی منائی جا رہی تھی، کتنے جلسوں کی صدارت کی ہے اس نے —— کتنی ہی سوسائٹیوں کا ممبر ہے یہ شخص ——!"

"اماں، تم بھی عجیب گھامڑ ہو" پہلے نے کہا "یہ جو رہنمائے قوم وادب اور لیڈر بنتے ہیں نا، وہ جنتا کو موہنے کے لیے ایسا ہی بہروپ بھرتے ہیں۔"

"کیوں دل کا پھپھولا پھوڑ رہے ہو یار!" دوسرے نے احتجاج کیا —— "عقل کے ناخن لو، عقل کے —— خود تو کبھی اسٹیج پر آتے ہیں، دوسرے کو تقریر کرتے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ —— جل مت میرے بھائی ——"

"جلیں میرے دشمن، استاد!" پہلے نے اصرار کیا۔

"میں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ یہ جو اردو زبان کی بات کرتے ہیں اور یہ جتاتے ہیں کہ اردو ان کی زبان، ان کی تہذیب کی امین اور ان کا اوڑھنا بچھونا ہے، وہ خود اپنے گھر میں، اپنی میری سے انگریزی میں گٹ پٹ کرتے رہتے ہیں —— ہلو ڈارلنگ، سے کم بات نہیں کرتے اور اپنے بچوں کو انگریزی اسکول میں پڑھانا فرض سمجھتے ہیں —— اور دوست! تمہیں شاید نہیں معلوم کہ یہ اعلیٰ شان ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مصیبت زدہ کسانوں اور مزدوروں پر دل سوز نظمیں لکھتے ہیں ——"

"اماں، کیوں اڑا رہے ہو، خواہ مخواہ ——" دوسرے نے کہا —— "ہائے کیسی پرتاثیر تقریر کی ہے ——"

"جناب! جو زیادہ پڑھا لکھا ہوتا ہے، اسے بہروپ بھرنے میں اتنی ہی آسانی ہوتی ہے ——" پہلے نے زور دیا۔ "اس کے ظاہر اور باطن میں بہت بُعد ہوتا ہے —— یقین نہ ہو تو انہیں ان کے گھر چل کر دیکھ لو —— بیڈ روم تک جانے کا موقع تو نہ مل سکے گا، ڈرائنگ روم کی شان دیکھ لینا —— کس نقشہ سے رہتے ہوں گے بھائی!"

"میں اس کی تصدیق چاہتا ہوں ——" دوسرے نے کہا۔

دونوں بہروپیئے کی اصلیت دیکھنے اس کے عشرت کدہ تک پہنچے، جہاں وہ اپنے چند بے تکلف دوستوں کے درمیان بیٹھا، خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ کمرہ ۵۵۵ اور چند دوسری مخصوص خوشبوؤں سے معطر تھا۔ اور سب ہی

داد عیش دے رہے تھے۔

"ٹرن ٹرن" گھنٹی کی آواز نے صاحب خانہ کو چونکا دیا۔

"کون مر آیا اس وقت ——— لوگ وقت دیکھیں نہ موقع چلے آتے ہیں سر اٹھائے ———"

نوکر کو حکم دیا گیا۔ "جو بھی ہو، کہہ دو، صاحب گھر پر نہیں ہیں ———"

"وہ لوگ ملنے پر مصر ہیں صاحب!" نوکر کا جواب تھا۔

"لاحول ولا قوۃ ——— کوئی ضرورت لے کر آئے ہوں گے یا چندہ مانگنے ——— کیا ڈھونگ رچاتے ہیں لوگ ——— ملک کا غم ہے، قوم کی فلاح کے لیے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ میٹنگ کر رہے ہیں ——— کیا حیلہ نکالا ہے۔ فالتو لوگوں نے ——— زندگی میں جیسے کچھ اور کرنے کو رہ ہی نہیں گیا ——— کہہ دو، کل آنا ———"

فوراً ہی دوسری بار گھنٹی بجی، معلوم تھا، کون ہوگا۔ صاحب خانہ خود تشریف لائے۔

"ارے آپ آگئیں، سو تھینکس! سچ میں تو انتظار ہی کر رہا تھا۔ آپ وقت پر ہی آئیں گی۔ میں آپ کی اس صفت کی خاص طور سے قدر کرتا ہوں، یہ آپ کے کیرکٹر کی مضبوطی ہے ———" اور کریہہ ہنسی کی آواز فضا میں گونج گئی۔

"جی" آپ دیوتا سمان ہیں! میں آپ کا حکم کیسے ٹال سکتی تھی ———" ہی، ہی، محترمہ کی ہنسی باہر نکلی پڑ رہی تھی ——— "آپ نے میرا کام تو کر ہی دیا ہوگا ———؟"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں ——— میں تو خادم ہو چکا ہوں آپ کا اور پھر وہ کام تو ایسا ٹیڑھا بھی نہیں تھا۔ منسٹر کو ایک فون کرتے ہی ہو گیا ——— آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ منسٹر صاحب وغیرہ میری بڑی قدر کرتے ہیں ——— اچھی جان پہچان ہے ان بڑے لوگوں سے ——— پھر جناب! آپ کے کام کے لیے تو ما بدولت حاکم وقت کی چوکھٹ پر سجدہ ریزی بھی کر سکتے ہیں" ———

"جی اندازہ ہے"۔ مصنوعی ہنسی نے فضا کو مکدر کر دیا۔

"کیا اندازہ ہے ——— کہہ کر دیکھئے، آپ کے ادنیٰ سے اشارے پر آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہوں بیا"

"ہی ہی ہی" تارے توڑ کر لانے کی اب آپ کی عمر کہاں ——— اتنے اونچے نہ اڑئیے قبلہ!"

"دل جوان ہونا چاہیئے محترمہ! ارے بیٹھئے، آپ اندر تو آئیے۔ برابر کے کمرہ میں بیٹھئے، میں ابھی حاضر ہوا۔ کچھ ایسے فالتو لوگ آکر جم گئے ہیں، ذرا انہیں چلتا کر دوں، آپ سے تو اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ آپ جلدی میں تو نہیں ہیں ———؟ دیکھئے، میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آج آپ میرے Disposal پر رہیں گی"۔

"کوئی بات نہیں، آپ اپنے دوستوں سے باتیں کیجیے، میں زنان خانہ میں چلی جاتی ہوں ———"

ارے، ہیں ہیں ——— ادھر آپ کیا بیٹھیں گی ——— مسز ہیں نہیں، بچیاں فلم گئی ہوئی ہیں ——— اور پھر آپ میرے پاس آتی ہیں یا ان کے پاس ——— (کریہہ ہنسی) میں بس دو منٹ میں آیا ——— آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ آپ سے باتیں کر کے میں ذہنی آسودگی محسوس کرتا ہوں، اس کا اندازہ ہے نا آپ کو ———!!"

"ہو ـــــــ ں !" محترمہ کی پیشانی پر گہری شکنیں ابھر آئیں۔

کبھی یہ بزرگوار لینن کی شان میں قصیدہ خواں ہیں مارکس کو اپنا خدا مانتے ہیں اور اس طرح روس کا سفر کرتے ہیں اس طرح گویا روس ان کے لئے۔ گھر آنگن کی بات ہو ـــ دیکھا امریکہ کا پلہ بھاری ہے تو فوراً اشتراکیت کا دامن چھوڑ بورژوا طبقے کے سرپرست بن جاتے ہیں۔

یہ اپنی حکومت کے تو خیر خواہ ہیں ہی کہیں سیلاب آئے تو ان کی آنکھیں بھیگ جائیں گی۔ گورنمنٹ کے بھروسہ کے آدمی ہیں لہذا انھیں ہیلی کوپٹر پر بیٹھ کر سیلاب زدہ علاقے کا دورہ کرنا لازمی ہوتا ہے ہندوستان تو ایسا ملک ہے کہ یہاں جس طرح موسم میں رنگا رنگی ہے اسی طرح اس کے دکھ بھی انیک ہیں ـــــ کہیں دھرتی پانی میں ڈوب رہی ہے لوگ بے گھر ہو رہے ہیں تو کہیں زمین ایک بوند پانی کو ترس رہی ہے کھیت کھلیان سوکھے پڑے ہیں اور جب انسان کو کھانے کو میسر نہ ہو۔ ایسی حالت میں دوسری جگہ دوسرے شہر جانے کے لئے پیسے کہاں سے آئیں ـــــ آخر ریل کا بھاڑا تو چاہیے ہی ـــــ ضروری تو نہیں کہ جب کسی حصہ میں قحط پڑے یا سیلاب آئے تو اسی وقت دارالحکومت میں کوئی بڑا جلسہ ہو کوئی ایسی تقریب جس میں امیر و غریب سب کی شرکت ضروری ہوتی تو آپ کے لیے یہ سنہرا موقع ہوگا، آپ بیوی بچے اور بوڑھے باپ دادا سمیت اپنے شہر اپنے گاؤں اور اپنے قریے سے دارالسلطنت آنے کے بہانے بغیر ٹکٹ ریل یا بس کا سفر کر سکتے ہیں اور جی چاہے تو دارالسلطنت تشریف لے تشریف لے آیئے جہاں کم سے کم تین دن تک سرکار آپ کے قیام و طعام کا انتظام کرے گی۔ کیا زمانہ آگیا ہے پہلے مفلس جیل اس لیے جانا چاہتا تھا کہ جیل میں کم از کم رہنے اور کھانے کا انتظام ہو جاتا تھا اور انسان چند دنوں کے لئے دال روٹی کی فکر سے آزاد ہو جاتا تھا ـــــ اور اب آپ حکومت وقت کے ساتھ ہو جایئے سال میں ایسے کئی موقع آتے ہیں جب آپ فری سفر کر سکتے ہیں۔ چند دنوں تک حکومت کے مہمان رہ سکتے ہیں۔ کھانا پینا سیر کرنا سب فری۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی الو بہروپیے صاحب کی کہ ہندوستان کے کسی حصہ میں قحط پڑے سیلاب آئے۔ زلزلہ آئے یا کوئی بیماری پھیلے، تو ان کا دل پہلے دھڑکتا ہے ـــــ بے چارے ان دکھیاروں پر دلسوز نظمیں لکھتے ہیں، لوگوں سے ان کی مدد کے لیے پرزور سفارش کرتے ہیں اور خود حکومت وقت کے ساتھ بیٹھ کر دعوت کھاتے ہیں ـــــ ٹی۔ وی ان کی جاگیر، ریڈیو پر ان کی حکومت ـــــ سرکار کی 'گڈ بک' میں آنے کی دیر تھی، تو کتنے کنٹریکٹ حاصل کر لیے، گھر میں دو فون سے کام نہیں چل رہا تھا تو تیسرا فون بھی لگ گیا۔ کسی بڑے ادارے کے چیرمین بن گئے اور کسی کے صدر اور بہروپیے صاحب، جنرل سکریٹری تو بے شمار انجمنوں کے ہیں ـــــ اتنے بڑے ادیب، عظیم شاعر اور اتنے بڑے مقرر کی سرپرستی کے بغیر کوئی ادارہ چل بھی تو نہیں سکتا ـــــ پھر آپ جانئے حکومت کی نگاہوں میں آنے کے لیے یہ سب جتن تو کرنے ہی پڑتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہیں۔ دکھانے کے اور ـــــ !! یہ بھی فن ہے۔ جناب استاد سے کہئے جاگتا رہ اور چور سے کہئے چوری کر اور دونوں کی نظروں

میں خود بھلے بنے رہیے۔ پیٹھ پیچھے کوئی گالی دیتا ہے، انسان تو خدا کو بھی نہیں بخشتا ــــ !!

ان بہروپیے صاحب کی صفات نیک اور ایار ہیں، اتنے روپ ہیں کہ جن سے پردہ اٹھانا میرے بس کی بات نہیں ہے اور شاید ایسے اشخاص کی شخصیتوں کی نقاب کشائی ممکن بھی نہیں ــــ سفید لباس اور اس کے نیچے اتنا سیاہ اور مکروہ دل ــــ شاید ہی کسی ملک میں نیشنل ڈریس کا اتنا غلط استعمال ہوتا ہو، جتنا ہمارے ملک ہندوستان میں ــــ گاندھی کیپ اور اندر گوڈسے جیسا دل، زبان سے "جن من گن" کا ترانہ الاپ رہے ہوں گے اور ذہن کسی خطرناک پلان کی سازش کر رہا ہوگا ــــ کسی عمل میں sincere نہیں۔

اُف اخدا را! یہ ہے ہمارا ہندوستان اور اس کے باسی!!

بہروپیا صاحب کی شخصیت کے چند گوشے آپ کے سامنے ہیں، ان کے حلیے سے بھی متعارف ہو لیجیے:

چھ فٹ سے زیادہ لمبا اونٹ کا قد، اس کی مناسبت سے لمبی ٹانگیں، جن میں چوڑے پائجاموں کا لٹھے یا کھدر کا سفید پائجامہ ــــ لمبا چوڑا کرتہ، اس پر لیڈر نما جیکٹ ــــ کوتاہی تک پہنچی ہوئی گردن، مچھلی کے منہ سا دہانہ، بندر جیسی ناک، شکرے جیسی تیز آنکھیں اور شکن آلود پیشانی۔ سر پر حسن نظامی کے پٹھے۔ جس پر ہمیشہ لمبی لمبی سوکھی انگلیوں والا ہاتھ، جن کے ناخن، کسی بھی مردہ خور حیوان سے کم نہیں، بار بار اس طرح پھیرا جاتا ہے، گویا بالوں کے وجود کا یقین کیا جا رہا ہو ــــ یا شاید اس لیے کہ تحت الشعور میں چاند صاف ہو جانے کا خدشہ رہتا ہو ــــ !!

لیجیے، وہ مخصوص شاطرانہ چال کے ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ آپ چلنا چاہیں یا آپ کو ان سے کوئی کام ہو کسی منسٹر کو فون کرانا ہو، آپ کو کسی انٹرویو کے لیے سفارش چاہیے ہو یا آپ کسی بڑے مشاعرہ میں شرکت کے متمنی ہوں، تو بڑھ کر خود ہی روک لیجیے۔

اتحاد اور یک جہتی وقت کی اہم ضرورت ہے

ہمارا ملک مختلف مذاہب رنگ و نسل اور زبان
کا گہوارہ ہے۔ اس کی رنگا رنگی اور دل کشی
نے اسے ایک گلستان کا روپ دیا اور اپنے گلشن کی
حفاظت کے لیے اتحاد و یک جہتی کی شدید ضرورت
ہے۔ اشوک و اکبر، نانک و چشتی، گاندھی اور
نہرو کے ہندوستان میں مذہب زبان اور صوبے
کے نام پر پُر تشدد واقعات اور امنِ عامہ میں معمولی خلل
ہم سب کے لیے معاشی تباہی لاتا ہے۔ ہماری ریاست
آندھرا پردیش فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور اتحاد کے لیے سارے
میں مثالی رہی ہے۔

- تمام مذاہب اور مقدس عبادت گاہوں کا احترام کیجیے۔
- تمام تہواروں اور عیدوں کو مل جل کر منائیے۔
- سماجی مساوات اور ترقی کے لیے متحد ہو کر آگے بڑھیے۔
- جمہوریت، آزادی اور سیکیولرزم کی حفاظت کے لیے

آئیے ہم سب مل کر عہد کریں ہم سب بھائی ہیں اور بھائی بھائی کی طرح رہیں گے۔

جاری کردہ : ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

D.I.P.R.24 20492/81



نادر کامٹوی

ہندستان میں نقادوں کا ارتقا

انیسویں صدی کے اوائل تک تنقید اور نقاد نام کی کوئی چیز ہندوستان کے کسی گوشے میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اہل قلم ان کرخت ادبی اصطلاحات سے قطعاً نا آشنا تھے۔ اور اردو ادب ان لغویات سے قطعی مبرا و منزہ تھا۔ البتہ ان دونوں کے مجموعے سے مشابہ ایک چیز ضرور پائی جاتی تھی جو فی الحقیقت ادب کے سالخوردہ استادوں کی مشفقانہ ڈانٹ پھٹکار ہوا کرتی تھی جس میں ایک روح پرور اور حوصلہ افزا لطف پنہاں ہوتا تھا۔ اور جو دل شکنی کی بجائے نومشقوں کی ہمت افزائی کا باعث ہوا کرتی تھی۔

اس مبارک دور میں تنقید اور نقادوں کے ناپید ہونے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ فن کاروں کو فن کی عظمت اور تقدس کا بخوبی احساس تھا۔ اس کے علاوہ ان کے دلوں میں آخرت کی بازپرس کا خوف بھی لاشعوری طور پہ جاگزیں تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ انہیں آئندہ نسل کی خیر و عافیت بھی مطلوب تھی اس لیے وہ تخلیقی عمل کے ساتھ ساتھ خود احتسابی کا فرض بھی خود ہی انجام دے لیا کرتے تھے۔ اس لیے کسی خود ساختہ خدائی فوجدار کی مداخلت بیجا اور اس کی غیر ضروری ڈانٹ ڈپٹ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس بدعت کی تخم ریزی کا سہرا تو بعد کے فن کاروں کے سر ہے جو اپنی تخلیقات کو وحی و الہام سے کسی طرح کم نہ سمجھتے تھے۔ اور اس پر نظر ثانی کرنا یا کسی سے مشورہ لینا کسر شان سمجھتے تھے۔ حالانکہ متاخرین اپنی تخلیقات کو سر کھجاتے ہوئے بے تکلف اپنے استادوں کے سامنے پیش پیش کر دیا کرتے تھے۔ اور تھوڑی دیر بعد کان اور گدی سہلاتے ہوئے واپس لے آتے تھے۔ مگر بعد کے فن کار خود کو استاذ الاساتذہ سے بھی کچھ اعلیٰ درجہ کی چیز سمجھتے تھے۔ اور اپنے لکھے ہوئے کو مستند حرف آخر اور قول فیصل گردانتے

تھے۔ یہی وہ فرعونی رعونت تھی جس نے خود رو دخل اندازوں کو دخل درمعقولات کا جواز فراہم کیا اور خواہ مخواہ ایسے افراد کو سینے پر چڑھ بیٹھنے کا موقعہ فراہم کیا۔ جن کی ادبی حیثیت کچھ بھی نہ تھی مگر ان موقعہ شناسوں نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر قلیل عرصہ ہی میں دانشوروں کے حلقہ میں اپنے لیے ایک اہم مقام بنالیا اور اپنی اہمیت و افادیت کو منوانے اور دانش وروں کو نفسیاتی طور سے مرعوب کرنے کے لیے لفظ "نقاد" تراش کر حق خود محفوظ کرلیا اور تنقید نگاری شروع کردی تاکہ بقول خود دنیائے ادب کو تباہ ہونے سے بچایا جاسکے۔

نقادوں کو شعر و ادب کی تنقید کے لیے کسی خارجی ترغیب و تحریص کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چونکہ سارے جہان ادب کا درد ان کے نرم و نازک جگر میں سمایا رہتا ہے۔ اور وہ فطرتاً بڑے رقیق القلب ہوا کرتے ہیں اس لیے اس فرض کو رضا کارانہ طور پر انجام دیتے ہیں۔ اور اس کارِ خیر کا کوئی معاوضہ لینا قطعی حرام تصور کرتے ہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں فی سبیل اللہ کرتے ہیں۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کا اجر ضائع نہیں فرماتا اس لیے ان کو بھی جلد ہی اپنی پرخلوص اور خاموش خدمت کا صلہ مل گیا۔ آج ان کے پاس عزت و شہرت کا خزانہ تنقیدوں کے مجموعے، بینک بیلنس، غرضیکہ اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے اور فن کاروں کے دلوں پر جو دھاک بیٹھی ہوئی ہے وہ ان سب پر مستزاد۔

یہ خادمانِ زبان و ادب کون تھے؟ کس لیے مشہور تھے اور اس منصب جلیلہ پر کس طرح فائز ہوئے؟ یہ ایک طویل داستان ہے۔ مگر چونکہ بہت کم لوگ ان کی اصلیت سے واقف ہیں اس لیے محض رفاہ عام کے خیال سے ان کے ماضی کا حال اور ان کے تدریجی ارتقا کی داستان ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ماضی بعید میں تنقید اور نقادوں کے ظہور سے قبل ہندوستانی سماج میں نیم تعلیم یافتہ مگر ذہین افراد تین چار طبقوں میں منقسم تھے۔ ان طبقوں میں ممتاز ترین طبقہ وہ تھا جس سے تعلق رکھنے والے افراد محض اپنی ذہانت اور موقعہ شناسی کی خصوصیت کے بل بوتہ پر اپنے حریفوں سے اپنا لوہا منوانے کے درپے رہتے تھے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے جو طریقہ اختیار کرتے تھے۔ اس وقت عرف عام میں ایسے نہلے پہ دہلا پھینکنے کا عمل کہا جاتا تھا اور اس فن کو قدرے تعلیم یافتہ مگر انتہائی ذہین افراد کے لیے مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ اس فن میں مہارتِ تامہ حاصل کرنے کے لیے مشاقی اور برجستگی کو لازمی تصور کیا جاتا تھا۔ ہر ایرا غیرا نہلا نہیں پھینک سکتا تھا۔ اور دہلا پھینکنے کے فن میں ید طولیٰ حاصل کرنے کے لیے تو بڑی چابک دستی، سلیقہ شعاری اور بے ساختگی کی ضرورت تھی تاکہ مدمقابل کو دفعتاً کاری ضرب لگاکر ساکت و جامد اور مبہوت و مفلوج کردیا جائے۔

ان افراد کی سرشت میں خودسری، خود پسندی اور خودستائی کا مادہ وافر مقدار میں پایا جاتا تھا۔ غلبہ پسندی کی علت چونکہ جزو ضمیر تھی اس لیے یہ لوگ جب تک اپنے حریف کو ناک آوٹ کرکے مکمل طور سے ساکت نہ کردیتے ان کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ یہ طبقہ تفوق پسندی کے جذبہ سے ہمیشہ سرشار رہتا تھا۔ اس لیے اپنے درمیان ابھرنے والے ذہین افراد کو اولین فرصت میں انتہائی بے دردی سے دبانے، کچلنے اور مسل کر خاک میں ملا دینے میں انہیں کوئی تامل نہ ہوتا تھا۔

پہلے یہ دہلا پھینکنے والوں کے علاوہ اس دور میں ایک دوسرا منفرد طبقہ پایا جاتا تھا۔ اس سے تعلق رکھنے والے افراد کچھ زیادہ تعلیم یافتہ تو نہیں تھے مگر ان کی ذہانت اور موقع شناسی کے جوہر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس خصوصیت کے علاوہ ان کے پاس ذاتی تخلیقی قوت یا فکری سرمایہ کچھ بھی نہ تھا۔ ان کی کل کائنات ایک عدد خوش رنگ لیمو پر مشتمل تھی۔ جو وہ کسی سبزی فروش سے بطور نمونہ حاصل کر کے جیب میں ڈال لیا کرتے تھے۔ اور کسی سادہ لوح یتیم العقل کے دسترخوان پر پہنچ کر اپنی چرب زبانی اور عرق لیمو کے طفیل اپنے پیٹ کے جہنمی دوزخ کے لیے ایندھن فراہم کر لیا کرتے تھے۔

تیسرا طبقہ قلندر صفت، دنیا سے بے نیاز اور دنیا داروں سے بیزار لوگوں پر مشتمل تھا۔ ان کا تکیہ کلام تھا "پدرم سلطان بود"۔ یہ افراد خود کو اسلاف الصالحین سابقہ اور کج کلاہان گذشتہ دونوں کے بیک وقت حقیقی جانشین اور ان کے نظریات و افکار کے واحد ڈسٹری بیوٹر اور ان کے اوضاع و اطوار کے تنہا علمبردار سمجھے جاتے تھے۔ سہل پرستی کے دلدادہ یہ افراد ہمیشہ ماضی کے دل خوش کن تذکروں میں مستغرق رہتے تھے۔ انہیں اپنے آبا و اجداد کے ربع مسکوں پر غلبہ و استیصال کی داستان پارینہ ازبر تھی اور اس کی تفصیلات معہ جزئیات نوک زبان۔ عہد کہن کی اسی داستان سرائی میں انھیں ایک خاص لذت اور کیف و سرور حاصل ہوتا تھا۔

چوتھا طبقہ ان پیدائشی مظلومین پر مشتمل تھا جو عرف عام میں عوام الناس کہلاتے ہیں۔ یہ طبقہ مذکورہ بالا تینوں طبقوں کے افراد کی مشق ستم کا خاص ٹارگٹ تھا۔ ان پر دوہری مار پڑتی تھی۔ کیونکہ انہیں ماد کے علاوہ چندہ بھی دینا پڑتا تھا۔

القصہ مذکورہ تینوں طبقے سماج میں سرگرم عمل تھے۔ اور چوتھا طبقہ حسب معمول اپنی شرافت، کسر نفسی اور سادہ لوحی کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ خوش حالی اور امن و امان کا دورہ دورہ تھا۔ راوی نقطہ چین کے علاوہ بقیہ الفاظ کے ہجے بھول چکا تھا۔ بلکہ اس ستم ظریف نے تو جدت طرازی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔ ہوا یوں کہ اس نے اس دور کی تاریخ کے سرورق پر جلی حرفوں میں صرف ایک دفعہ لفظ چین لکھا اور پھر اس کے نیچے نہایت اطمینان سے ایضاً کی علامت بناتا چلا گیا۔ بہرحال زندگی یوں ہی رواں دواں تھی کہ اچانک فلک کج رفتار ستم شعار کو اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کا خیال آ گیا۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ اس دفعہ کچھ غیر معمولی تاخیر ہو گئی ہے چنانچہ اس نے بوکھلاہٹ میں پے در پے کئی کروٹیں لے ڈالیں۔ نتیجہ تغیر و تبدل، انقلاب و انتشار اور اقدار کہن کی پامالی کی صورت میں نمودار ہوا۔ چرخ نیلوفری کی جنبش نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی ریڑھ مار کر رکھ دی اور انقلابات زمانہ کے طفیل " ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے"۔

زمانے نے کروٹ بدلی اور ابن الوقتوں نے کینچلی۔ طرز زندگی بدلا۔ افکار و نظریات بدلے۔ فکر و نظر کے اقلیدسی زاویے وجود میں آئے۔ زندگی کی قدریں بدل گئیں۔ نقد و احتساب کے نئے پیمانے ڈھالے گئے۔ اور خوب و زشت کے معیار تبدیل ہوئے۔ قدیم الفاظ کو حسب دلخواہ نئے معنی کے جوڑے پہنائے گئے۔

یہ تبدیلیاں بعض اہم واقعات اور انقلابات کی رہین منت ہیں۔ جن میں کچھ کو مقامی ہونے کا شرف حاصل ہے اور بقیہ کو بین الاقوامی۔

سات سمندر پار، بیرونی ممالک میں جو واقعات اور انقلابات رونما ہوئے ان کے گنگا جمنی اثرات اس وادی گنگ و جمن میں پہنچے اور جنگل کی آگ کی طرح سرعت سے پھیل کر ہندوستانیوں کے نیم پختہ، نیم بالیدہ ذہنوں کو

اپنے نرغے میں لے کر وہ زوردار جھٹکے اور جھکولے دیئے کہ صدیوں سے چمٹے ہوئے دیرینہ مسلمات واعتقادات اور تصورات و افکار کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ پے درپے ہونے والے تغیرات اور حادثات نے ہندوستانی دانش وروں اور مفکروں کی ناریل نما کھوپڑی پر وہ تابڑتوڑ سنگ باری کی کہ شعور تو کجا لاشعور تک تلملا اٹھا۔

بعد از خرابی بسیار ہندوستانیوں کی سمجھ میں بہرحال یہ بات آگئی کہ اک حشر برپا ہوچکا ہے اور زمانہ قیامت کی چال چل چکا ہے اور وقت اور حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ اپنی کشتیٔ حیات کو زمانے کی ہوا کے رخ پر چلایا جائے ورنہ بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکے بیڑہ غرق کر دیں گے۔ چنانچہ ہر سمجھدار شخص نے اپنے اپنے ذوق و ظرف، فہم و استعداد اور مزاج و افتادِ طبع کے مطابق اپنے آپ کو وقت کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔

سماج کے وہ افراد جو دوسروں کے نہلے پہ دہلا پھینک کر انھیں مرعوب و مغلوب کر لیا کرتے تھے۔ اب انھیں بھی وقت کی نزاکت کا احساس ہوا۔ نیرنگیٔ عالم نے جب ناگفتہ بہ حالت کو پہنچا دیا تو انہوں نے سوچا کہ تکلف برطرف نہلے پہ دہلا والا کھیل بند کر کے کچھ روزی، روٹی کی فکر کرنی چاہیے۔ مگر چونکہ عادت راسخ ہوچکی تھی اور ذہن ایک خاص سانچے میں ڈھل کر پختہ ہوچکا تھا۔ اس لیے فریقِ مخالف کو جوتے کی نوک پر مارنے کی عادت انھیں آسانی سے نہیں جا سکتی تھی۔ یعنی وہ اپنی سابقہ حرکات سے کسی طرح باز نہیں آ سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے یہ طے کیا کہ ٹیکنک تو وہی استعمال کی جائے مگر اس کا انداز اور طریقہ بدل دیا جائے تاکہ ایک طرف اپنی سرکش انا کی تسکین و تشفی بھی ہوتی رہی اور دوسری طرف روٹی دیوٹی کا بھی بند و بست ہو جائے۔ سرسید اور حالی کے طفیل جدید تعلیم اور تنقید کا آغاز ہو ہی چکا تھا۔ اور مغرب کے ترقی یافتہ متنوع ادب کے شہ پارے دھڑا دھڑ ہندوستان پہنچ رہے تھے۔ اسی لیے انھوں نے کافی غور و خوض کے بعد اپنے مزاج، سرشت اور سابقہ طرزِ عمل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسی پیشہ کا انتخاب کیا جس میں ہینگ اور پھٹکری بہت قلیل مقدار میں درکار ہوتی ہے مگر رنگ چوکھا آتا ہے۔ یعنی انھوں نے قلم اٹھایا اور اللہ کا نام لے کر تنقید نگاری شروع کر دی۔ اس پیشہ کو اختیار کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ تنقید ہی وہ فنِ شریف ہے جس میں ذاتی لیاقت اور نجی استعداد کو چنداں دخل نہیں۔ اس فن میں ید طولیٰ حاصل کرنے کے لیے کچھ واجبی قسم کا مطالعہ کچھ مشق اور معمولی سمجھ بوجھ کافی ہے فی زمانہ نقاد کو ذاتی اصول و ضوابط وضع کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ اب اصول و ضوابط کھلے بازار میں، عام طور پر دستیاب ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انہیں حاصل کر کے ہوشیاری کے ساتھ بہ تبدیلیٔ الفاظ کچھ اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ نقاد کی اپنی دیدہ ریزی کا ثمرہ معلوم ہوں۔ لیکن وہ تاڑنے والے جو قیامت کی نظر رکھتے ہیں، بخوبی جانتے ہیں کہ یہ خرمن کس طرح کی خوشہ چینی کا نتیجہ ہے اور اردو تنقید اور نقاد کتنے پانی میں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے (بقلم خود) نقادوں نے اپنی بے دست و پائی، علمی بے چارگی اور تخلیقی قوت کے فقدان کے باعث پیدا ہونے والی کمزوری و لاچاری کو دفع کرنے کے لیے بیرونی ملکوں سے نقد و احتساب کی ریڈی میڈ بیساکھیاں فراہم کر لی ہیں اور اس کے سہارے تن کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ بعض نقاد حضرات نے انتہائی جدید قسم کے پیمائشی ٹیپ خرید لیے ہیں اور ان کی مدد سے پرانے پرانے شاعروں کی گردن ناپتے رہتے ہیں اور اپنے اس کارنامہ پر پھولے نہیں سماتے۔ کچھ دن ہوئے ایک کرم فرمانے جدید عینک بھی منگوالی ہے جس کی ادنیٰ ترین خوبی یہ ہے کہ اسے لگا کر اردو تنقید پر ایک نظر ڈالی جائے یا اردو غزل پر، سب میں کیڑے ہی کیڑے نظر آتے ہیں۔ حسن و خوبی کی چھینٹ تک نظر نہیں آتی۔

چونکہ شمالی اور مغربی ملکوں میں اس طرح کی بیساکھیوں، پیمائشی ٹیپوں اور عینکوں کی افراط ہے اور وہ سہل الحصول بھی ہیں، اس لیے ہر وہ شخص جو کسی خلقی نقص یا کسی بزرگ کی بددعا سے تخلیقی جوہر سے یکسر عاری ہے، مذکورہ آلات سے مسلح ہو کر میدان ادب میں کود پڑا ہے۔

ان (بخیال خویش) نقادوں کی افراط و تفریط نے حریفانہ کش مکش کو جنم دیا ہے۔ تازہ ترین پوزیشن یہ ہے کہ چند گرانڈیل، قد آور، دبنگ اور جغادری طائپ کے ادبی محتسب اچانک ابھر آئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ہم پیشہ افراد کے جم غفیر کے درمیان گرو یا استاد یا دستار بند خلیفہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر خلیفہ کی پشت پر اس کی اپنی امت کی فوج ظفر موج خدمت کے لیے مستعد رہتی ہے اور خلیفہ کے ایک اشارے پر پوری امت مخالف خلیفہ اور اس کی امت پر ٹوٹ پڑتی ہے اور پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ البتہ اس طرح کے بڑے معرکے روزانہ کا معمول نہیں۔ کبھی کبھار ہی ہوتے ہیں۔ مگر سرد جنگ ہر محاذ پر جاری رہتی ہے۔

یہ نقاد اس شہرہ آفاق طبقہ کے مایہ ناز افراد ہیں جو ماضی بعید میں نہلے پہ دہلا پھینکا کرتے تھے اب یہ طبقہ پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ایک اعتدال پسند کہلاتا ہے اور دوسرا انتہا پسند۔ اول الذکر کا نظریہ ہے "تنقید برائے پرورش اطفال" اور ثانی الذکر کا "تنقید برائے شہرت دوام" یہ لوگ خواہ کچھ کہیں لیکن ان کا منتہائے مقصود اب یہی رہ گیا ہے۔

ہندوستانی سماج کا وہ طبقہ بھی جو عہد سابق میں لیموں پر دار یا عرق انداز کہلاتا تھا۔ انقلابات زمانہ سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ سماجی تبدیلیوں نے انھیں بالآخر ان پیشہ سے بھی محروم کر دیا۔ انھیں گانٹھ کے پورے تو اب بھی ہر قدم پر مل جاتے تھے، مگر وقت یہ تھی کہ "عقل کے اندھے" عنقا کا حکم رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ہوش ربا گرانی اور اشیائے خورد و نوش کی عدم دستیابی کے باعث وہ فرشتہ خصلت سخی حاتم بھی ناپید ہو چکے تھے جو اپنے دسترخوان پر طعام حضر سجاتے اور ان جیسے ناخواندہ مہمانوں کی راہ تکا کرتے تھے۔ تاکہ ان کی شکم سیری کا وسیلہ بن کر ثواب دارین حاصل کریں۔ جب نوبت فقر و فاقہ تک پہنچ گئی تو انھوں نے سنجیدگی سے روزی روٹی کے مسئلہ پر غور کرنا شروع کر دیا۔ کافی غور و خوض کے بعد بالآخر دور کی کوڑی لانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ اپنی فطری استعداد کے پیش نظر انہیں اسی میں عافیت نظر آئی کہ ٹھوس تعمیری کام کرنے کے بجائے سہل الحصول نسخہ یہ ہے کہ غیر ملکی نظریات و افکار کی تشہیر و تبلیغ کی ایجنسی لے لی جائے اور معقول کمیشن پر مقامی ماحول میں ان کے فروغ و نفوذ کے لیے اپنی لیاقت اور توانائی صرف کی جائے۔ ان پیشہ کے انتخاب کے علاوہ غالباً کوئی دوسرا چارۂ کار بھی نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ ان کے پاس ذاتی تخلیقی و فکری سرمایہ سرے سے تھا ہی نہیں اور اس کام میں یہ آسانی ہے کہ نقد و احتساب کے ریڈی میڈ پیمانے باہر سے فراہم کیے جاتے ہیں۔ جن کی مدد سے مقامی ادب کو جانچا جاتا ہے۔ اگر وہ اس معیار پر پورا اترے تو یہ لوگ اس کی تعریف و توصیف اور نشر و اشاعت کے لیے اپنی تمام ہمت اور سلیقہ صرف کر دیتے ہیں، اور جو اس سے مطابقت نہ رکھتا ہو اس پر بے دردی سے خط تنسیخ کھینچ دیتے ہیں۔ زہریلے تبصرے کرتے ہیں اور ایسے اشک آور ریمارکس دیتے ہیں کہ اچھے اچھوں کی پیشانیاں عرق آلود ہو جاتی ہیں۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والے متوازی حریفوں کے نظریات و افکار پر بھی آڑ ے تبصرے اور

مقالے مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔ اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے بعض افراد فحش اور مخرب الاخلاق شہ پاروں پر بصیرت افروز تبصرے بھی لکھتے ہیں۔ کچھ لوگ کھلی سے تیل نکالتے ہیں اور اسے تحقیق کہتے ہیں۔ یہ لوگ غلاظت سے عطر کشید کرنے کے مدعی ہیں۔ اسی طبقہ کے افراد کی عرق ریز کاوشوں سے اردو ادب میں جو تنقیدی سرمایہ جمع ہوا ہے اہل نظر اسے فرمائشی تنقید کا نام دیتے ہیں۔ کیونکہ اسی میں ان کی ذاتی پسند ناپسند کو کوئی دخل نہیں ہے جو کچھ ہے بس تعمیلِ ارشاد کے طور پر سپرد قلم کیا گیا ہے۔

اگر ہندوستانی نقادوں کی روش و رجحان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت ہندوستان میں دو طرح کی بیساکھیاں مروج و مقبول ہیں۔ ایک مغربی تراشش کی اور دوسری شمالی وضع کی۔ انہیں بیساکھیوں کے بل پر حریف گروہ اچھل اچھل کر حملے کر رہے ہیں۔ جب ان دو گروہوں کو اپنی باہمی آویزش سے فرصت ملتی ہے تو دورِ فراغت میں نو مشقوں پر ہاتھ صرف کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان نو واردانِ بساطِ ادب پر دوہری مار پڑ رہی ہے اور ادبی فضا ان کی الامان الحفیظ کی دلخراش چیخوں سے گونج رہی ہے۔

اک طوفان بدتمیزی سے گھبرا کر اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ زمانہ نازک ہے بعض قدما دونوں ہاتھوں سے اپنی اپنی دستار سنبھال کر اور بآوازِ بلند لاحول پڑھتے ہوئے سمٹ کر چند دور افتادہ گوشوں میں پناہ گزیں ہو چکے ہیں اور اپنی علیحدہ کالونیاں بنالی ہیں۔ یہ اسی طبقہ کے افراد ہیں جن کا تکیہ کلام تھا "پدرم سلطان بود"۔ انھوں نے بدلے ہوئے حالات اور عصری رجحانات کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور ابھی تک اپنی سابقہ روش پر سختی سے قائم ہیں اور یہ منطقی استدلال پیش کرتے ہیں کہ ہم بفضلہ ابن الوقت نہیں بلکہ ماشاءاللہ ابوالوقت ہیں۔ ایام کے مرکب نہیں راکب ہیں۔ ہم وقت کے ساتھ نہیں بدلیں گے بلکہ وقت کے دھارے کو اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق موڑ دیں گے۔ چنانچہ وہ اب تک اسی مسلک پر قائم ہیں اور حالات کی نامساعدت کے باوجود اپنی اسی تاریخی لنگوٹ پر پھاگ کھیل رہے ہیں اب رہ گیا چوتھا طبقہ تو جھیلنا اور بھگتنا اس کا مقدر بن چکا ہے۔

مفلس قارونی

لیڈر کی دعا

مجھے بھی پرائم منسٹر بنا دے — خدایا مرا بھی مقدر بنا دے
وزیر و سفیر و گورنر بنا دے — لگے جو تجھے سب سے بہتر بنا دے
گھٹائیں سیاست کی برسا کے مجھ پر — میں قطرہ ہوں مجھ کو سمندر بنا دے
وزارت میں ایسا محکمہ عطا کر — بھکاری کو بھی جو تونگر بنا دے
بہن، بھائی، داماد، بیٹے، بھتیجے — مرے ہاتھوں سب کا مقدر بنا دے
خسر کو بنا دے کمشنر کہیں کا — تو سالے کو ڈپٹی کمشنر بنا دے
اگر چانس میرے لئے ہو نہ کوئی — کسی بھی ضلع کا کلکٹر بنا دے
اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو خدایا — کسی میونسپلٹی کا ممبر بنا دے
سیاست کے ہوتے ہیں جس پر ڈرامے — اس اسٹیج کا مجھ کو ایکٹر بنا دے
نچاؤں مداری کی مانند سب کو — تو بھارت کی جنتا کو بندر بنا دے
کسی کو بنا دوں کسی کو مٹا دوں — مجھے بھاگیہ کا کنٹریکٹر بنا دے
اثر میری تقریر میں وہ عطا کر — ہر اک لفظ کو تیر و نشتر بنا دے
اثر کچھ نہ ہو مجھ پہ آہ و بکا کا — میرے دل کو اک سخت پتھر بنا دے
جہاں بھر کی دولت مرے گھر میں بھر دے — مرے سب حریفوں کو پھکڑ بنا دے
میں محتاج ہوں تاج مجھ کو عطا کر — میں بے گھر ہوں یارب مرا گھر بنا دے
جہاں بھر کی قسمت مرے ہاتھ میں ہو — مقدر کا مجھ کو سکندر بنا دے
بنا کر سیاست کا خورشید مجھ کو — مری زندگی کو منور بنا دے
پھریں ہر گھڑی سب مرے آگے پیچھے — مجھے افسروں کا بھی افسر بنا دے
الیکشن کے سبجکٹ پہ میرا بھاشن — ہر ووٹر کو لوٹن کبوتر بنا دے
سکھا دے مجھے کوئی گر ایسا یارب — جو چھ سات کو ساٹھ ستر بنا دے
بنا لوں گا پھر جیسے چاہوں گا سب کچھ — تو پہلے مجھے صرف لیڈر بنا دے
پھریں رات دن سب مرے آگے پیچھے — مجھے سارے چمچوں کا رہبر بنا دے

بنا کچھ تو مفلس کو اپنے خدایا
نہ کچھ بن سکے تو سخنور بنا دے

دیہی ترقیاتی اسکیمات کی عمل آوری میں شدّت وسعت



■ ریاستی حکومت کے پروگراموں میں مواضعات کو بے ضرر پانی کی سربراہی اولین ترجیح کی حامل ہے

■ اس وقت ۵۱۹۰۰۰ مواضعات اور چھوٹے قریوں میں باولیوں بورولیں اور محفوظ آبرسانی اسکیمات کی مدد سے ۴۳ء۱ کروڑ عوام کو پینے کا پانی سربراہ کیا جارہا ہے۔



■ ۲۲ لاکھ عوام پر محیط ۶۷۔۱ سربراہیٔ آب اسکیمات کے علاوہ ۵۵ء۱ کروڑ روپے لاگت کی ایک بڑی اسکیم روبہ عمل لائی جارہی ہے جس سے فلورائڈ سے متاثرہ ۱۷۱ مقامات کے ۳ء۷ لاکھ عوام کو فائدہ ہوگا۔ صرف دیہی آب رسانی اسکیمات کے لئے جملہ ۸۷ کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں ۔

■ دیہی آبرسانی اسکیمات کے لئے ۴۸۰ کروڑ روپے لاگت کا ایک ماسٹر پلان تیار کیا گیا ہے۔ چھٹے منصوبے کے دوران' پینے کے پانی کے مسائل سے دوچار ۲۰۰ مواضعات کے عوام کو پانی کی فراہمی کے لئے (۱۷۳) کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے ۔

■ دیہاتوں کو گندگی سے پاک وصاف رکھنے کے لئے ۱۷۵ کروڑ روپیوں کی گنجائش فراہم کی جائے گی۔

■ غذا برائے کام پروگرام کے تحت گزشتہ دو برسوں میں ۲۰۰ لاکھ عوام کے لئے روزگار کی گنجائش نکالی گئی ۔ علاوہ ازیں ۸۵ کروڑ مالیت کے ۴۶۸۲ لاکھ ٹن غذائی اجناس سے استفادہ کرتے ہوئے ۳۰۰۰ کیلومیٹر طویل سڑکوں' ۲۵۰۰ اسکول عمارتوں پنچایت گھروں اور کمزور طبقات کے لئے ۹۸۰۰۰ مکانوں کی تعمیر عمل میں لائی گئی ۔

■ ۱۸۵۰۰ مواضعات کو ملانے کے لئے اچھے موسم اور تمام موسموں میں استعمال کے لئے سڑکیں بچھائی گیئں اور ۱۶۷۰۰ مواضعات کو ملانے کی خاطر ۹۶۵ کروڑ روپے لاگت کا ایک ماسٹر پلان سڑکوں کی تعمیر کے لئے تیار کیا گیا۔

■ طوفان زدہ علاقوں میں سڑکوں کے ۲۹۰۰ کام چھوٹی آبپاشی کے ۲۸۰۰ کام اور عمارات کا تعمیر کے

(سلسلہ ۴۵ پر)

عبدالکریم ماہر

قطعات

(۱)

قدرعنا کی زیبائش نئی ہے　　مکاں بوسیدہ آرائش نئی ہے
چمک سی آگئی ہے جھرّیوں میں　　پرانا شوز ہے پالش نئی ہے

(۲)

مور سے بھی خوبصورت نوجواں　　جب ہوئی منگنی تو شیرِ نر بنا
حال اس کا کیا کہوں شادی کے بعد　　رفتہ رفتہ خر بنا ، خچّر بنا

(۳)

میرے کاندھے سے وہ بت جب آلگا　　چھا گیا نس نس پہ میری نشّہ سا
ہوش گم تھے اور جب آیا ہوش میں　　وہ نہ تھا اور میرا بٹوہ بھی نہ تھا

(۴)

شادی میں اک عزیز کی سب کچھ بجا ہوا　　تاخیر رونمائی میں ہونا بُرا ہوا
آئندہ دلہنوں کا ریڈی میڈ ہو نقاب　　مُنہ دیکھنے دکھانے کو زِپ ہو لگا ہوا

(۵)

اوصاف کیا بیاں ہوں دندانِ یار کے　　ہنسنے میں گر نہ جائیں یہ دانے انار کے
برفی کلی اس نے کھائی تو سب دانت ہِل گئے　　انگور کیوں نہ کھائے وہ چھلکا اتار کے

دو شعر

سراج نرملی

دفتر میں مجھ کو ڈھیر سی رشوت مِلا کرے
گھر میں ہمیشہ مرغ پلاؤ پکا کرے

NEIGHBOUR

نیبر کا مرغ گھر میں ہمارے پکا ہے آج
اس کو نہ علم ہو کبھی اس کا خدا کرے

ایم صلاح الدین ایم اے
(ہزاری باغ)

ایک مسئلہ، دو حل!

رات کے ٹھیک تین بجے میری آنکھ کھل گئی۔ کھلی کیا یوں سمجھئے کھلی ہوئی تھی۔ آنکھ کھلتی تو جب وہ بند بھی ہوتی۔ اگر صرف زبردستی آنکھ موندے رہنے کا نام آنکھ بند ہونا ہے تو بے شک میری آنکھ بند تھی۔ اب آپ آنکھ بند ہونے سے یہ مطلب نہ اخذ کرلیں کہ میں خدانخواستہ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ہو گیا تھا۔ ایسا ہونے کی صورت میں پھر میری آنکھ میدانِ حشر میں ہی کھلتی اور ایسی کھلتی کہ پھر بند ہونے کا نام نہیں لیتی ـــــ ہاں تو خیر! میں آنکھ موندے پڑا تھا اور بار بار کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا کہ کہیں تین نہ بج جائے اور میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو۔ خیر فرشتوں کو خبر ہوتی یا نہ ہوتی مجھے ضرور خبر ہونی چاہیئے تھی۔ آپ سوال کریں گے، آخر یہ تین بجنے کی کیا تک تھی جو آپ اُس وقت سے ایک ہی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ تک یہ تھی کہ ہم میں یعنی مجھ میں اور میری نصف بہتر میں یہ شرط لگی تھی کہ کون تین بجے، پہلے بیدار ہوتا ہے۔ جو ٹھیک تین بجے بیدار ہوگا وہ اصلی روزہ دار ہوگا۔ چونکہ ایک روزہ دار کیلئے سحری کھانا ایک مسنون بات تھی اس لئے اُس کے لئے جاگنا بھی ضروری تھا۔ موسم گرما میں دیر سے سونے کی وجہ سے سحری کھانے کے لئے وقت پر یعنی زیادہ سے زیادہ تین بجے تک بیدار ہو جانا بہت ضروری تھا۔ بیگم اس ضمن میں مجھ سے بدظن تھیں۔ یعنی اُن کا نیک خیال یہ تھا کہ میں وقت پر کبھی بیدار نہیں ہو سکوں گا۔ کیونکہ میں تو پہلے ہی سے باوجود اس کے کہ میرا نام لطیف نہیں تھا میں لیٹ لطیف واقع ہوا تھا۔ اس لئے تین بجے سحری کھانے کیلئے بیدار ہونا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ ایک ظاہر ہے کہ اس چیلنج کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرلینا نہ صرف میرے لئے بلکہ سارے مردوں کیلئے باعثِ ننگ تھا۔ چنانچہ اس الف لیلائی سوتے جاگتے کی کیفیت میں ایک عرصہ تک مبتلا رہنے کے بعد گھڑی پر جو نگاہ پڑی تو میں ایک دم سے اُٹھ کھڑا ہوا اور یہ میں کچھ استعارہ کی زبان میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ فی الحقیقت میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ بس یوں سمجھئے میں کسی اسپرنگ دار گدے پر لیٹا تھا کہ ذرا سی پریس سے فرش پر مثل گیند پھینک دیا گیا۔

میں نے فوراً لپک کر بیگم کو جھنجھوڑا اور چلّا کر کہا۔ "بیگم، بیگم آپ ہار گئیں۔"

"کون کیا ہوا؟"۔ بیگم نیند سے لبریز آنکھوں کو آہستہ آہستہ کھولتی ہوئی بولیں۔

"کون کیا ہوا نہیں"۔ میں نے کہا۔ "میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ ہار......"

"کیا کہا؟ آپ ہار گئے؟"

"جی نہیں غزالہ صاحبہ، میں نہیں آپ ہار گئیں۔" میں نے تصحیح کی۔

"اچھا بابا میں ہی ہار گئی۔ مگر میں کیا میچ کھیل رہی تھی جو ہار گئی؟"

"آپ میچ نہیں کھیل رہی تھیں ....."

"تو پھر میں کیسے ہار گئی؟ کیا میں نے شرط لگائی تھی؟"

"لگائی تھی۔"

"کیا؟"

"ارے واہ ری بیگم، ہارنے پر ایسی ہی اداکاری کی جاتی ہے۔"

"کیا آپ نے کہا نہیں تھا کہ جو تین بجے سحری کے لئے پہلے بیدار ہوگا وہ اصلی روزہ دار ہوگا؟"

"مگر کیا ابھی تین بج گئے؟ ابھی تو میں سوئی ہی تھی...."

"آپ ابھی سوئیں یا کبھی سوئیں۔ مجھے مطلب نہیں۔ آپ ہار گئیں کیونکہ تین بج گئے۔ وہ دیکھئے گھڑی ــ تین بج گئے یا نہیں؟"

"آپ ہوش میں ہیں یا آپ نے کچھ پی لی ہے؟"

"سونے سے پیشتر پانی پیا تھا۔"

"پانی نہیں وہ جس کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے۔ ؎

رات پھر خوب پی صبح توبہ کر لی   رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔"

"توبہ کیجئے بیگم۔"

"خوب۔ پیئیں آپ اور توبہ میں کروں؟"

"بیگم آپ تو سمجھتی ہی نہیں۔ میں ایک پرہیزگار مسلمان ہوں...."

"..... کیونکہ پینے کے بعد توبہ کر لیتا ہوں..." انہوں نے گویا میرا جملہ مکمل کیا۔

"نہیں بلکہ اس لئے کہ میں نے کبھی پی ہی نہیں۔"

"ایسا دعویٰ سبھی مے خوار کرتے ہیں.... خیر یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ چاہے جتنا پئیں مجھے اس سے کیا۔ عاقبت آپ کی خراب ہوگی۔"

"آپ تو بس اپنی ہی ہانکے جا رہی ہیں.... میں حلفاً کہنے کو..."

"ــ بس بس، اپنے کو زیادہ پرہیزگار ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"آپ یہ بتائیے کہ کہاں پر تین بجے ہیں، جو آپ نے مجھے کچی نیند سے جگا دیا۔"

"وہ دیکھئے گھڑی۔" میں نے دیوار گھڑی پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں۔ دیکھئے سوا بارہ بجا ہے یا تین بجے ہیں؟"

ارے ... ارے .. لاحول ولا قوۃ ۔ واقعی سوا بارہ بجا تھا ۔ کیونکہ تین پر بڑا کانٹا تھا نہ کہ چھوٹا کانٹا، جیسا کہ میں سمجھ رہا تھا۔ شرط جیتنے کی عجلت میں مجھ سے یہ حماقت سرزد ہوگئی تھی۔

خفت کی ہنسی ہنس کر سر کھجاتے ہوئے بولا ۔ "اسی لئے میں کہتا ہوں بیگم آپ ٹائم پیس اپنے بھائی کی واچ کمپنی سے اُڑا لائیے اب' الارم دے گی وہ ٹھیک ٹائم پر۔ ہم لوگوں کو خواہ مخواہ نیند خراب کرنے کی ضرورت پڑے گی اور ... اور (کچھ رُک کر، مسکرا کر) نہ ہی شرط لگانے کی ۔"

"واہ جی ! میرے چھوٹے بھیا کے دولہا بھیا۔ کیا اُس نے واچ کمپنی اس لئے کھولی ہے کہ اپنے دولہا بھائیوں کو واچ فری سپلائی کرے؟ صرف سوا سو، ڈیڑھ سو میں تو ایک ٹائم پیس .... ۔"

"صرف ایک ماہ کے لئے اتنے روپے صرف کردوں ۔ باقی گیارہ مہینے تو بیکار ہی رہے گی ۔ اس سے تو بہتر ہے ایک آدھ مرغ لے لوں جو ٹھیک سحری کے وقت بانگ دے کر ہمیں جگا دیا کرے ... اور پھر عید کے دن بھی وہ کام آئے گا ۔"

"عید کے دن ؟ وہ کیسے ؟ ۔ بھلے ہی عید کے اگلے دن کام آسکتا ہے ۔"

"عید کے اگلے دن ؟ کیا مطلب ؟"

"شش عید کے جو چھ نفل روزے ....."

"بس بیگم آپ بھی کمال کرتی ہیں ۔ عید کے بعد وہ زندہ بھی بچے گا تب نا ۔"

"عید کے دن زندہ نہیں بچے گا ؟ وہ کیسے ؟ اُس کی قربانی دینے کا ارادہ ہے کیا ؟ مگر آپ کو معلوم نہیں کہ رمضان کے بعد عید الفطر ہوتی ہے نا کہ عید الضحیٰ ۔ اور عید الضحیٰ میں قربانی مرغ کی نہیں ہوتی ۔"

"مت ہو ۔ اس سے کیا ۔ اُس روز میرے چند احباب آئیں گے ۔ سمجھیں ؟"

"ہاں ٹھیک ہی تو ہے ۔ اُس دن میرے میکے سے بھی کچھ لوگ آئیں گے ۔ ایک بڑا سا مرغ لے لیجئے گا جو کم از کم دو تین کیلو کا ہو کیونکہ میرے میکے سے کم لوگ نہیں آئیں گے اور میں اُنہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی ۔"

خدا خیر کرے ۔ ابھی رمضان ہی سے اُس مرغ کے سلسلے میں اُن کی نیت اچھی نہیں تھی ۔ اب عید کے روز ہوگا یہ کہ اُس کے خاص خاص حصے اپنے میکے والوں کے لئے محفوظ رکھے جائیں گے اور میرے دوستوں کے لئے ہوں گے بیکار اور چھٹے ہوئے ٹکڑے چنانچہ میں نے پینترا بدلتے ہوئے کہا ۔ "پتہ نہیں مُرغ سے مسئلہ حل بھی ہوگا یا نہیں ۔ مان لیجئے مُرغ اذان ہی نہ دے ۔"

"بھلا کون سا مرغ ایسا ہوگا جو سرے سے اذان ہی نہ دے گا ۔" اظہارِ تعجب کرتی ہوئی بیگم بولیں ۔

"کوئی تعجب نہیں ۔ ہماری نیت اُس کے سلسلے میں بخیر نہیں ۔ اس لئے عین ممکن ہے کافی تاخیر سے اذان دے ۔"

"کوئی حرج نہیں ۔ سحری میں تاخیر اور افطار میں جلدی کرنے کا حکم ہے ۔"

"ہاں بھئی مگر اب اتنی بھی تاخیر اذان میں نہ کرے کہ سحری کے بجائے صبح کا ناشتہ ہوجائے ۔"

"مُرغ کبھی ایسا نہیں کرتے وہ انسانوں سے زیادہ خدا کا خوف رکھتے ہیں اور گھڑی سے بھی زیادہ اپنے وقت کے پابند

ہوتے ہیں ۔"

"کیا پتہ ؟ ہوسکتا ہے کبھی وہ اذان کے وقت بھی سوتا رہے۔ اس لئے بیگم صاحبہ آپ اپنے بھائی کی دکان سے ایک گھڑی اُڑالیں ہر سال مرغ پر روپے صرف کرنے سے بہتر ہے۔ ایک گھڑی ہی اپنی ہوجائے ۔"

"۔ خواہ چوری ہی کی کیوں نہ ہو ؟ " بیگم نے طنزاً کہا ۔

" دیکھئے بیگم اوّل تو اپنے بھائی کی دوکان سے اُڑائی ہوئی چیز چوری نہیں ہوتی کیونکہ بھائیوں کی چیزوں پر بہنوں کا سوفی صد حق ہوتا ہے۔ دوئماً آپ یہ چوری ایک نیک کام کیلئے کریں گی یعنی صحیح وقت پر سحری کھانے کیلئے اس لئے اللہ تعالےٰ آپ سے بیحد خوش ہوں گے اور آپ کو دوہرا ثواب لکھیں گے ۔"

" دوہرا ثواب ؟ وہ کس طرح ؟"

" وہ اس طرح کہ آپ آبائی جائیداد سے قائم شدہ اپنے چھوٹے بھیا کی واچ کمپنی سے اپنا دُختری حصّہ وصول کریں گی . . . ."

بس ایکدم سے بیگم کا پارۂ حرارت سوسنٹی گریڈ سے تجاوز کرگیا اور قریب تھا کہ اُن کے ایٹم بم کا نشانہ میں بنتا کہ میں جھٹ بول اُٹھا۔ "بیگم غصّہ مت کیجئے ۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ غصّہ کرنا حرام ہے بالخصوص رمضان میں ۔ کہئے آپ نے کہا تھا یا نہیں ؟"

" ہاں وہ تو کہا تھا مگر . . . . مگر . . . . مُرغ کا کیا ہوگا ؟ " (غصّہ کی جگہ تفکّر نے لے لی)

" مُرغ ؟ مُرغ ایک نہیں دو آئیں گے ۔"

" دو ؟ دو کیوں ؟ " حیرت ومسرّت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بیگم نے پوچھا ۔

"اوّل تو اس لئے کہ اگر سحری کے وقت اذان دینا ایک بھول جائے تو دوسرا اُسے یاد دلادے ۔"

ہنس کر بیگم نے پوچھا۔ "اور دوئماً ؟"

" دوئماً اس لئے کہ عید کے دن ایک مرغ میرے احباب کے لئے . . . . "

" اور دوسرا ؟ " اُمید وبیم کے لہجے میں بیگم نے دریافت کیا ۔

" اور دوسرا ؟ ۔ دوسرا آپ کے میکے والوں کی شکایت رفع کرنے کیلئے ۔"

" آپ کتنے اچھے ہیں ۔" وفورِ مسرت سے بیتاب ہوکر بیگم نے کہا ۔

" میں یا مرغ ؟ " ۔ جذبات سے یکسر عاری ہوکر میں نے پوچھا ۔

کچھ دیر بیگم خاموش رہیں اور پھر آہستہ سے بولیں ۔ " دونوں ۔"

اور پھر اپنی دونوں آنکھیں میچ لیں ۔

شیخ محمد نیاز ایم۔ اے
(اکولہ)

سُبحان اللہ

مسٹر تکتو اپنی عادت کی وجہ سے کافی مشہور تھے ۔ اپنے دوستوں میں تو نام کی وجہ سے کم ہی جانے پہچانے جاتے تھے لیکن مسٹر تکتو کے لقب سے کافی مقبول ہو چکے تھے ۔ اور ہوتے بھی کیوں نہ ۔ جب کہ عادت ہی ایسی پائی تھی ۔ جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو تکتا۔ اپنی اس عادت سے کبھی باز نہ آتا ۔ حالانکہ گھر میں ایک قبول صورت بیوی بھی تھی ۔ جو اکثر ان کی اس عادت پر انھیں ٹوکتی رہتی تھی۔ مگر مسٹر تکتو کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ یہ ان کی خوبی ہے یا کمزوری لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی عادت نے انھیں کئی مرتبہ خطرات میں مبتلا کر دیا تھا۔

ایک دن مسٹر تکتو بن سنور کر اپنی سائیکل کو ٹوٹا سمجھ کر سیر کے لئے نکلے۔ سائیکل اُتار پر تھی۔ ظاہر ہے رفتار بھی تیز ہی ہوگی ۔ اچانک ان کی نظر اُس جانب اُٹھ گئی جس عمارت پر ایک حسین دوشیزہ کھڑی اپنے دراز گیسو سنوار رہی تھی۔ مسٹر تکتو نے جو دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ اُنھیں ہوش تب آیا جب انہوں نے خود کو زمین پر محسوس کیا۔ معلوم ہوا حضرت کی سائیکل کسی رکشا سے ٹکرا گئی ۔ نتیجے میں سائیکل ایک طرف اور یہ صاحب دس قدم دور — دل ہی دل میں مسٹر تکتو نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سائیکل کسی کار سے نہ ٹکرائی ورنہ جہنم پہنچ گئے ہوتے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مسٹر تکتو کو ہسپتال میں داخل ہونا پڑا بڑے کام میں ہاتھ پاؤں تو ٹوٹتے ہی ہیں ۔

ہسپتال میں بھی اپنی عادت سے باز نہ آئے ۔ چاہے لیڈی ڈاکٹر ہو یا سسٹر، مسٹر تکتو نے سسٹر جیسے پاکیزہ لفظ کو بھی تکنے کی وجہ سے ناپاک کر دیا۔ خیر کسی طرح تندرستی نصیب ہوئی ۔ مگر پھر وہی عادت سر پر سوار ۔ بیچارے عادت سے مجبور جو تھے۔ ابھی پچھلا حادثہ بھول بھی نہ پائے تھے کہ ایک دن باغ کی سیر کو نکلے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ چند پری چہرہ دوشیزائیں مزے لے لے کر آئسکریم کھا رہی ہیں ۔ بس ہوا عادت کا شیطان سر پر سوار اور لگے ان کو تکنے ۵ منٹ ، ۱۰ منٹ ، ۳۰ منٹ ، اُن کا تکنا بھی وہ تکنا کہ پلک بھی نہ جھپکے ۔ اچانک چند نوجوان اُن پر ٹوٹ پڑے اور لگے میاں تکتو کو ڈھول سمجھ کر پیٹنے ۔ پٹائی کے دوران تکتو نے معلوم کر لیا کہ وہ دوشیزائیں اُن نوجوانوں کی بہنیں

تھیں۔ پچھلی بار تو خیر سے ہسپتال تک پہنچنے کیلئے رکشا مفت ہاتھ آگیا تھا مگر اب کی بار تو وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اور تندرست ہونے میں ایک ماہ لگا۔

مسٹر تکتو کی بیوی روز روز کی شکایتوں سے تنگ آگئی تھی۔ لیکن پھر بھی صبر سے کام لیتی تھی۔ لیکن اُس روز تو بیگم کا پارہ خوب چڑھا۔ جب کہ وہ میاں تکتو کے ساتھ ایک شادی کی محفل میں گئی اور اُس نے اتفاقاً دیکھ لیا کہ اُن کے میاں مسٹر تکتو چوری چھپے پردہ نشینوں کے دیدار کرنے میں مصروف ہیں۔ گھر لوٹ کر شوہر پر خوب برسیں اور آخر میں فرمایا۔

"آخر آپ لڑکیوں کو تکتے کیوں ہیں۔ تکنے کا اتنا ہی شوق ہے تو مجھے چوبیس گھنٹے تک لیا کرو۔"

مسٹر تکتو نے پہلے تو بڑے غور سے سُنا پھر اطمینان سے جواب دیا۔

"ارے بیگم میں جب بھی کوئی خوبصورت چہرہ دیکھتا ہوں تو خود بخود منہ سے نکلتا ہے "سبحان اللہ" یعنی تعریف اُس خدا کی جس نے یہ چہرہ بنایا۔ اب تم ہی بتاؤ میں دن بھر میں کتنی مرتبہ خدا کی تعریف کر لیتا ہوں۔"

اچانک بیگم کی آنکھوں میں چند قطرے تیرنے لگے۔ مسٹر تکتو نے دیکھا اور کہا۔

"ارے بیگم تم تو رو رہی ہو! کیوں! کیوں بھلا؟"

بیگم نے آنسو صاف کئے اور کہا۔

"مجھے معاف کر دو میں نے آپ کو غلط سمجھا۔ اس طرح تو میں تمہیں خدا کی تعریف کرنے سے روک رہی تھی۔"

"ہاں! یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ تم کاہے کو لوگوں کی باتوں پر دھیان دیتی ہو۔ میری اچھی بیگم۔ آنسو پوچھ لو۔ تم تو غلط فہمی کا شکار تھیں؟"

"خیر میں نے تمہیں معاف کر دیا۔" اور مسٹر تکتو جانے لگے۔

"سُنیے" بیگم نے انہیں ٹوکتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ خدا نخواستہ آپ کی نظر خوبصورت چہرہ کی بجائے بدصورت چہرہ پر پڑتی ہے تب آپ کیا کہتے ہیں۔"

"تب" مسٹر تکتو بیگم کی جانب گھومے۔ بیگم کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیا۔ بیگم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چہرہ کو تکتے ہوئے یوں کہا۔

"تب میں کہتا ہوں لاحول ولاقوۃ ...... اور ایک جھٹکے کے ساتھ گھومے اور رفو چکر ہو گئے۔ بیگم حیرت زدہ سوچتی رہیں کہ مسٹر تکتو نے لاحول کس کے لئے پڑھی ......؟

کسانوں کیلئے اور ہم سب کے لیے برترافادیت کے اقدامات

ہماری ریاست میں بڑے بڑے دریا بہتے ہیں۔ زمین زرخیز ہے۔ کسان سخت محنت کرنے والے ہیں۔ لیکن ان سب کو اگر ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تو کوئی فائدہ مند نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

آندھرا پردیش نے آبپاشی کے تحت کے علاقوں کی ترقی کے لیئے اقدامات کا آغاز کرکے زراعت و کاشت کاری کے تصور کو عصری بنا دیا ہے۔

ناگر جنا ساگر رائٹ کنال، ناگ ارجنا ساگر لیفٹ کنال، سری راما ساگر اور تنگبھدرا پراجکٹ کامپلکس کے تحت چار آب پاشی علاقوں میں ترقیاتی کام انجام دیئے جارہے ہیں۔ ترقیاتی پروگرام درج ذیل اقدامات پر مشتمل ہے۔

- سربراہی آب کا مشترکہ انتظام۔ جس کے تحت داڑہ بندی کا طریقہ یعنی باری باری سے پانی کی سربراہی کا انتظام، کسانوں میں تیزی کے ساتھ مقبول اور پسندیدہ ہوتا جارہا ہے۔
- کھیتوں میں پانی کی سربراہی کے لیے نالیوں کی تعمیر
- باقاعدگی کے ساتھ اراضیات کی ترقی اور بہتری۔
- کسانوں کے لیے قرض کی سہولیات۔

● پیرزدر زرعی اور توسیعی پروگرام۔

مذکورہ بالا پروگرام کی تکمیل آوری پر سال ۸۲-۱۹۸۱ء کے دوران میں

۸ ۹۷ لاکھ روپیوں سے زائد رقم خرچ کی جائے گی۔

آج غذائی اجناس اور تجارتی اجناس زیادہ مقدار میں اگائی جارہی ہیں۔"

کسان خوش ہے — آپ خوش ہیں

جاری کردہ:

ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش

(DIPR 29) 25576/81



رفعت نواز (اورنگ آباد)

تبصرہ

خواہ مخواہ

رشید الدین کی تازہ تصنیف

اردو کے رسائل اور اخبارات پڑھنے والے رشید الدین کے نام اور ان کے کام سے بخوبی واقف ہیں۔ رشید الدین پچھلے ۲۵ سال سے لکھ رہے ہیں۔ نثر کی ہر صنف میں انھوں نے لکھا ہے (ناول کو چھوڑ کر) اپنی ادبی زندگی کا آغاز رشید الدین نے مزاح نگاری سے کیا۔

رشید الدین کا وطن اورنگ آباد ہے۔ یہیں انھوں نے اپنے طنزیہ، مزاحیہ مضامین لکھے اور داد پائی۔ انہوں نے اپنا پہلا مزاحیہ مضمون "اردو ادب مے خانے سے چائے خانے تک" "بزم مطلع ادب اورنگ آباد" میں سنایا تو اورنگ آباد کے ادیبوں اور شاعروں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مزاح کی حس لڑکپن سے پائی جاتی ہے۔ اور یہ عطیہ خداوندی ہے۔ خود لکھتے ہیں۔

" مزاح کی حس مجھ میں بچپن سے موجود ہے۔ میں نے کبھی لطیفہ ختم ہونے کے بعد اس کے راوی سے یہ نہیں پوچھا کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ مزاح کو برتنے اور سمجھنے کا مادہ میری طبیعت میں شروع سے رہا ہے۔ اپنے دوستوں میں ہمیشہ دلچسپ چٹکلے بولنے والا اور دلچسپ فقرے چست کرنے والا مشہور ہوں۔"

" خواہ مخواہ" رشید الدین کے ۱۳ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین روزمرہ زندگی کی وارداتوں کا بیان ہیں۔ رشید الدین کی تحریر میں سادگی ہے۔ رنگین الفاظ کی سحرکاری اور الفاظ کا بے جا استعمال ان مضامین میں نہیں ہے۔ ان کے سادہ بیانیہ میں بڑی دلکشی ہے کہ ان کا مضمون شروع سے آخر تک دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ مضامین مختصر لیکن بھرپور ہیں۔ رشید الدین الفاظ کے برمحل استعمال سے خوب واقف ہیں اور طنز اور مزاح کے مزاج شناس ہیں۔ اس وجہ سے ان کا مزاح پھکڑپن اور طنز جھلاہٹ نہیں بنتا۔ بڑی حد تک یہ مضامین روایتی طنزیہ مزاحیہ مضامین سے مختلف ہیں۔ جس کا احساس مصنف کو بھی ہے۔ پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"میں مزاح میں روایتی طرز کو پسند نہیں کرتا۔ میرے مزاحیہ مضامین میں آپ کو بیوی سے چھیڑ چھاڑ نہیں ملے گی۔ مخصوص دوستوں کا تذکرہ نہیں ملے گا۔ جا و بے جا اشعار کی بھرمار نہیں ملے گی۔ میرے مضامین میں آپ کو الفاظ کی جادوگری اور زبان کی قلابازیاں بھی نہیں ملیں گی۔"

ان مضامین کی بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں لکھنے والے نے دوسروں میں پائی جانے والی مضحک باتوں اور حرکات کا ذکر کر کے ہنسایا ہے وہاں خود کو بھی دوسروں سے الگ نہیں کیا ہے۔ خود پر بھی ہنسا اور ہنسایا ہے۔ رشید الدین کے مزاحیے پڑھ کر آپ بے ساختہ قہقہے نہیں لگا سکتے۔ ہاں زیرلب مسکرا دیتے ہیں اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ان مضامین میں بڑی گہرائی اور گیرائی ہے۔ مختصر جملوں میں سادگی سے وہ بڑی بات کہہ جاتے ہیں اور قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ انھوں نے پامال موضوعات پر لکھا ہے لیکن اتنے دلچسپ انداز میں لکھا ہے کہ پڑھنے والے کو مضمون پڑھتے ہوئے موضوع کی پامالی کا احساس نہیں ہوتا ویسے بھی موضوعات نہیں بدلتے۔ مسائل نہیں ملتے۔ مثلاً نوکروں کی مغروریاں مکان کے حصول کی دقتیں۔ دوستوں (بلکہ ملنے والے کہنا زیادہ مناسب ہے) کی ستم ظریفیاں

ں کی ہوشیاریاں ، بزرگوں کی زیادتیاں اور علیک کی
بیاں ایسے موضوعات ہیں جو ہمیشہ تازہ رہیں گے ان
ں سے ہر ایک کا واسطہ پڑتا ہے لیکن ان مسائل کے
ے پہلوؤں پر بہت کم نظر جاتی ہے رشید
ی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے ان ہی مسائل پر لکھا جن
ہ بخوبی واقف ہیں اس لئے ان مضامین کو پڑھتے ہوئے
ساس نہیں ہوتا کہ دیکھنے والا بے پر کی اڑا رہا ہے یا معنی
ی باتوں کو رنگین الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کر رہا ہے
پاس کی چیزوں اور روزمرہ کے مسائل پر لکھنے کا ایک
ہ یہ ہوا کہ قاری بڑی دلچسپی سے ان کے مضامین پڑھ
تا ہے ۔ اور مصنف سے قریب ہو جاتا ہے ۔ ان
ں جب کشاکش حیات سے سب ہی ہراساں ہیں اور
ائل نت نئے روپ بدل کر سکون بحال کئے دے رہے
، الجھنوں کی کڑی دھوپ میں انسان جھلس رہا ہے
رشید الدین کے مضامین ان کڑے حالات میں صحت افزا ہوا کا ایک جھونکا ثابت ہوں گے ۔ اور چند لمحوں کے لئے ہی سہی انسان کو ہنسنے کا موقع فراہم کریں گے اور یہ بڑی بات ہے ۔

" خواہ مخواہ " یوسف ناظم ، جیلانی بانو ، خواجہ عبدالغفور اور بھارت چند کھنہ کی آرا سے سجی ہوئی ہے ۔ جو رشید الدین کے مضامین کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہیں اور ان مضامین کو بار بار پڑھنے پر اکساتی ہیں ۔

انجمن زندہ دلان حیدرآباد نے کتاب بڑے اہتمام سے شائع کی ہے ۔ کتابت واجبی ہے ۔ طباعت عمدہ ہے ۔ شعیب کا سرورق بڑا معنی خیز ہے ۔ کتاب کی قیمت دس روپیہ ہے ..... اور زندہ دلان حیدرآباد ۲۷ . مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد سے خریدی جا سکتی ہے ۔

• بعض اوقات مواقع دروازوں پر دستک دیتے ہیں ۔ اور بعض اوقات دروازوں پر دستک موقعوں کو تباہ کر دیتی ہے

•

• شہر پر لگی ایک سائن بورڈ " ہم کباڑ کرکٹ خریدتے ہیں اور نوادرات فروخت کرتے ہیں ۔"

•

• ایک کسان کام کرتے ہوئے کھیت میں گر پڑا اور اس کے ران کی ہڈی ٹوٹ گئی ۔ اس کے بیل نے پانچ میل کی مسافت دوڑتے ہوئے طے کی اور اپنی پیٹھ پر بٹھا کر ڈاکٹر کو مالک کے پاس لے آیا ۔ یہ واقعہ سن کر دوست نے کہا " بھئی واقعی بہت ذہین بیل ہے تمہارا ! "

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ذہین ہے لیکن اتنا بھی نہیں " کسان نے جواب دیا ۔ " کیونکہ جس ڈاکٹر کو وہ بلا لایا وہ جانوروں کا ڈاکٹر نکلا ۔"

شگوفے

تعطیل کے دن ہاسٹل میں سب طلبہ لنچ کھانے میں معروف تھے۔ یکایک چمچے کی تیز آواز نے سب کی توجہ ہاسٹل کے باغبان کی کی طرف مبذول کردی جو چمچہ میز پہ مار مار کر اعلان کر رہا تھا کہ "حضرات! میں آج شام اپنے دوستوں کے ساتھ باغ کی صفائی شروع کر رہا ہوں" پھر کچھ لمحے توقف کے بعد اس نے کہا "میں اس بات کی وضاحت بھی کرتا چلوں کہ آپ سب کو میں اپنے دوستوں میں شامل سمجھتا ہوں۔"

★

ریاضی کے ایک استاد سے طلباء نے پوچھا کہ "آپ اپنی اصطلاحوں میں آج خدا کی تعریف کریں۔" استاد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا کہ "خدا ایک دائرہ جس کا مرکز تو ہر جگہ موجود ہے مگر محیط کہیں نہیں۔"

★

ایک مئے کدہ کے باب الداخلہ پر یہ تحریر آویزاں تھی کہ "اگر آپ بھولنے کے لئے شراب پیتے ہیں تو ہماری گزارش ہے کہ آپ بل پیشگی ادا کریں۔"

★

ایک شخص ڈینگ مارتے ہوئے اپنے دوست سے کہہ رہا تھا کہ "میرا کھیت اتنا وسیع ہے کہ اگر میں اپنی کار لیکر صبح مشرقی کنارے سے نکلوں تو شام تک بھی اس کے مغربی کنارے تک نہیں پہونچ پاتا۔" فوراً دوست نے جواب دیا کہ — "بہت دن ہوئے میں بھی اتنی ہی بڑی کار کا مالک تھا۔"

★

بوڑھے ڈاکٹر باپ نے اپنے نوجوان ڈاکٹر بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے کہا "بیٹا نسخہ جتنا بدخط ہو سکے لکھو البتہ بل ہمیشہ خوش خط تیار کرنا۔"

★

ڈاکٹر کی بیوی : آج کا آپریشن کامیاب رہا؟

ڈاکٹر : ہاں! آپریشن بروقت ہوگیا۔ میرے پہونچنے میں ذرا سی بھی تاخیر ہو جاتی تو مریض آپریشن کے بغیر ہی صحت یاب ہو جاتا۔

★

ایک صحافی نے شہر کے ۱۰۰ سالہ بوڑھے آدمی سے سوال کیا "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کی اتنی طویل زندگی کے کیا اسباب ہیں؟" بوڑھے نے دیر تک سوچنے کے بعد جواب دیا "اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ میں ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوا تھا۔"

★

لڑکیوں کے ہاسٹل سے فون کرتے ہوئے ایک نسوانی آواز نے اطلاع دی "جناب یہاں تین نوجوان لڑکے کھڑکی توڑ کر میرے کمرے میں آنے کے درپے ہیں، آپ ذرا مدد فرمائیں۔"

"محترمہ معاف فرمائیں، آپ کو غلط فہمی ہوئی — یہ پولیس اسٹیشن نہیں بلکہ فائر اسٹیشن ہے۔" فون کی دوسری طرف سے آواز آئی — لڑکی نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ "ہاں! میں جانتی ہوں کہ آپ فائر اسٹیشن سے ہی بول رہے ہیں۔ دراصل میرا کمرہ تیسری منزل پر ہے اور ان نوجوانوں کو ایک لمبی سیڑھی درکار ہے۔"

(اداریہ)

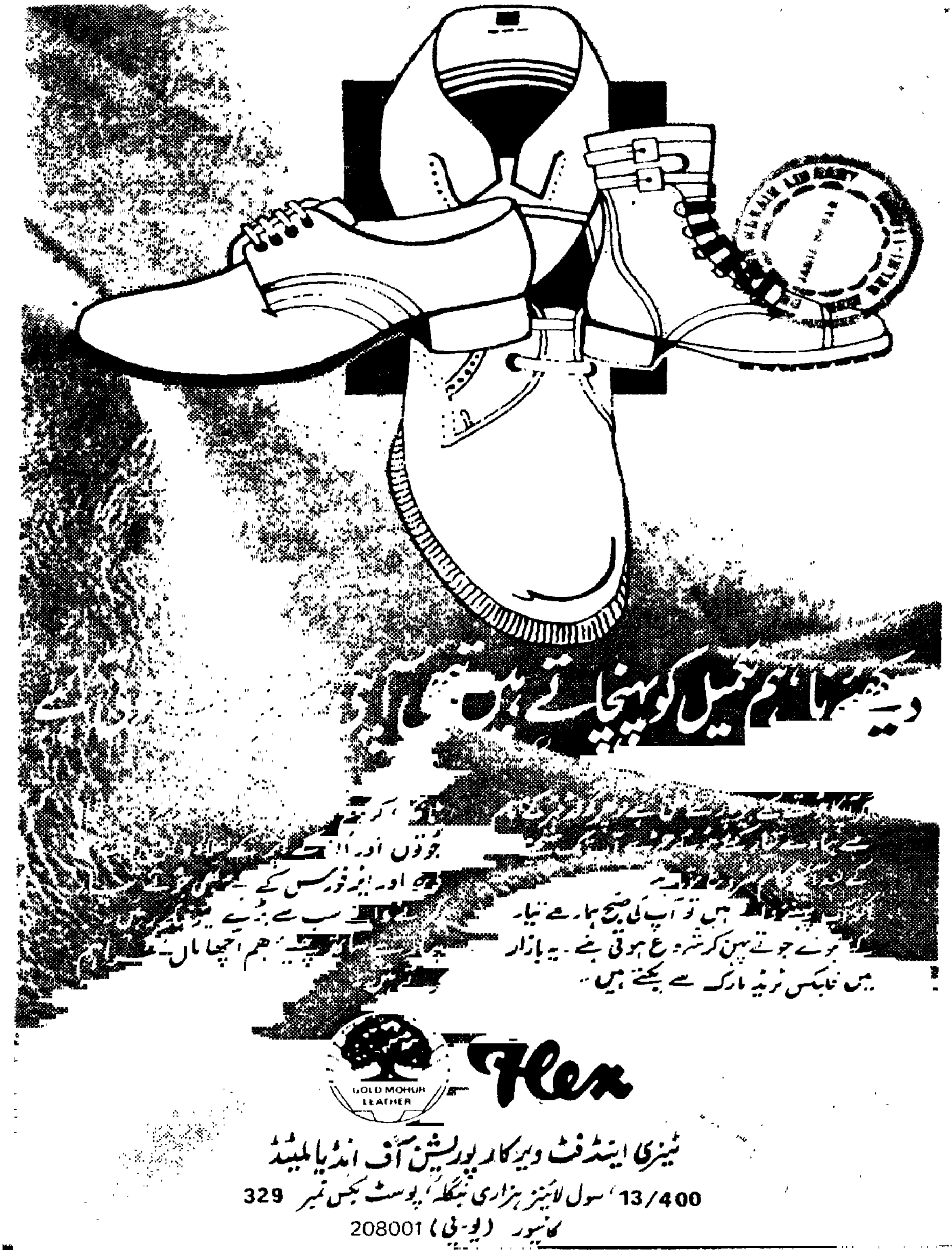
پھر ملیں گے اگر خدا لایا ....

شہر حیدرآباد کا ایک تہائی سے زائد حصہ پھر ایک بار فرقہ وارانہ فساد کی لپیٹ میں آگیا۔ ایک ہفتہ تک شہر کے ایک بڑے علاقہ میں چاقو زنی کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ جس کے نتیجہ میں کئی معصوم جانیں تلف ہوگئیں۔ حیدرآباد میں اب تک کسی بھی فساد میں اتنی ہلاکتیں نہیں ہوئی تھیں۔ کرفیو کی وجہ سے چھ دن تک لوگوں کو اپنے گھروں میں دہشت و خوف کے عالم میں محبوس رہنا پڑا۔ کرفیو زدہ علاقوں میں کبھی ضروری کام سے اکا دکا گذرنے والوں کے نام پوچھ پوچھ کر چاقو چلایا جاتا رہا۔ بڑی مشکل سے حالات قابو میں آئے۔ اس سلسلہ میں ہمارے چیف منسٹر جناب ٹی انجیا اور نئے وزیر داخلہ جناب جگناتھ راؤ نے پوری مستعدی و چوکسی دکھائی۔ بار بار متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا۔ مشاورت کی۔ معقول نمائندگیوں پر فوری احکامات جاری کئے جاتے رہے۔ پولیس کا خفیہ ڈپارٹمنٹ بھی اگر اخلاص، چوکسی اور مستعدی کا مظاہرہ کرتا تو شہر میں فساد کبھی نہ پھوٹتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ماضی کا درخشاں ریکارڈ رکھنے والے شہر حیدرآباد کو فرقہ پرستی کے زہر سے بچایا جائے۔ اس بات کا پتہ چلایا جانا چاہیئے کہ گذشتہ دو تین سال سے اس شہر کو فساد کے لئے نشانہ بنانے والے افراد کون ہیں۔ شہر کے اس فساد میں ہندو اور مسلمان صف آرا نہیں ہوئے بلکہ معصوم اور بے گناہ افراد کو چند افراد چاقو کی نوک پر اپنے ظلم کا نشانہ بناتے رہے۔ فرقہ پرستی کے اس زہر کو خاص طور سے نوجوان نسل کے ذہن سے نکالنے کی تدابیر اختیار کی جانی چاہیئے۔ فسادات کی اس لہر نے عیدوں اور تہواروں کی خوشیوں کو ملیا میٹ کر دیا ہے۔ لیکن بہر حال عید منائی جائیگی، گلے ملیں گے۔ مبارکباد دیں گے۔ دعا ہے کہ اب جو گلے ملیں تو صرف جسم نہ ملیں، دل بھی ملیں۔ کدورتیں دور ہوں اور عیدوں و تہواروں میں وہی یکجہتی کے نظارے دیکھنے میں آئیں جو ہمارے ماضی کا خاصہ تھیں۔!

Postal Regd. No. H-HD

SHUGOOFA

Vol 14 Copy 7 | 31 Bachelor Quarters, M.J. Market, Hyderabad 1 | July 1981 Phone 5771





UGOOFA
August 1981

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

جلد ۱۴ | اگسٹ ۱۹۸۱ء | شمارہ ۸

ایڈیٹر

سید مصطفیٰ کمال

سالانہ (۲۵) روپے

بیرونِ ہند سے (۴۵) شلنگ

فی پرچہ (۲) روپے (۵۰) پیسے

طباعت:

نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ۔۲

بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، پرانی حویلی حیدرآباد

خط وکتابت کا پتہ: شگوفہ، ۳۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون 57716

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

مالِ مفت (انشائیے)

دو تیر ایک شکار

پچوڑن (نظمیں)

رضا نقوی واہی

آشوبِ چشم

ہر چشم لالہ زار ہے آشوبِ چشم سے
بے فصل کی بہار ہے آشوبِ چشم سے

شاید سماج واد کا سمبل ہے یہ وبا
چھوٹا بڑا دوچار ہے آشوبِ چشم سے

میزائلوں سے تیز ہے رفتار و رینج میں
راکٹ بھی کم عیار ہے آشوبِ چشم سے

میدانِ کارزار کا نقشہ ہے ہر طرف
ہر سمت خلفشار ہے آشوبِ چشم سے

جیسے فسادی ٹوٹ پڑیں قتلِ عام کو
ویسی ہی کچھ بہار ہے آشوبِ چشم سے

ہر خاندان ایک ایمرجنسی وارڈ ہے
ہر سُو اک انتشار ہے آشوبِ چشم سے

جیسے بطوں کا جُھنڈ ہو چھپڑوں کی باڑھ پر
ہر گھر یونہی دوچار ہے آشوبِ چشم سے

کابل پہ سُرخ فوج کی یورش ہو جس طرح
پسپا یونہی بہار ہے آشوبِ چشم سے

فاقہ زدوں کی آنکھ لہو رنگ تو ہے کچھ
چہروں پہ کچھ نکھار ہے آشوبِ چشم سے

اک گونہ بےخودی کا مزہ لے رہے ہیں لوگ
دو آتشہ خمار ہے آشوبِ چشم سے

مئے سے غرض نشاط ہے جس روسیاہ کو
اس پر خدا کی مار ہے آشوبِ چشم سے

اک نوجوان دوست کا دھندا تھا تاک جھانک
مندا وہ کاروبار ہے آشوبِ چشم سے

دو نمبری دوائیں بھی بکنے لگیں بلیک
بزنس وہ زوردار ہے آشوبِ چشم سے

واؔہی کی آنکھ رشکِ عقیقِ یمن بنی
حاصل یہ افتخار ہے آشوبِ چشم سے

فیاض افسوس (اکولہ)

دو قطعات

کمی رہ گئی ہو تو اے رہنماؤ
کچھ اندازِ جور و جفا مانگ لیجے
نہ آتی ہو اپنے کئے پہ جو تم کو
حسینوں سے شرم و حیا مانگ لیجے

بُغض، کینہ، کپٹ، عداوت ہے
جس طرف دیکھئے خباثت ہے
تیری دھرتی کو آسماں والے
زلزلوں کی اشد ضرورت ہے

خودکشی

رضا نقوی واہی

نئے شاعروں کے درمیان، میرے دوست عبدالرحیم نشتر (کامٹی، ناگپور) کا نمایاں اور معتبر مقام ہے۔ حال ہی میں جب انھوں نے "اردو ادب میں پیروڈی" کے موضوع پر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تو ایک خط کے ذریعہ اس کامیابی کی خبر دیتے ہوئے، اپنی ایک غزل کا مقطع بھی مجھے لکھ بھیجا۔

تھے خیرخواہ تو نشتر کی تعزیت کو چلو ؛ سُنا ہے کرلی ہے کل رات خودکشی اُس نے

مقطع کے دوسرے مصرعہ نے میری طبیعت موزوں کردی اور درج ذیل اشعار تولد ہوگئے۔ ان اشعار کا نشتر نے ان الفاظ میں خیر مقدم کیا۔

آپ کی مسرت افزا تحریر موصول ہوئی، طبیعت کِھل اُٹھی۔ آپ نے میرے مقطع کے مصرعۂ ثانی پر بڑی ہی دلکش گوٹ لگائی ہے۔ اس تخلیق کو "شگوفہ" میں شائع کروالیں تو بہت سے ہونٹوں کو مسکراہٹ مل جائے گی۔"

★

بیاہ گرچہ کیا تھا خوشی خوشی اُس نے ادا کیا نہ مگر حقِ شوہری اُس نے
وہ چاہتا تھا کہ خود ہی بنا رہے محبوب طبیعت اپنی جو پائی تھی نرگسی اُس نے
اُدھر یہ زور تھا، ہر رات ہو زفاف کی رات مگر بجھائی نہ بیگم کی تشنگی اُس نے
وہ اپنی گرم مزاجی سے شیرنی نکلی شروع میں جسے سمجھا تھا کامنی اُس نے
بچارہ سخت مشقت سے بجھ گیا آخر ہزار کھائیں دوائیں حکیم کی اُس نے
دیا سلائی کی تیلی، تھی زد میں آندھی کی مقابلے میں سدا ہار مان لی اُس نے
یہی سبب ہے کہ گھر سے فرار رہتا تھا بجائے شوہری کی جم کے شاعری اُس نے
مشاعروں میں بھی دن رات مارا مارا پھرا بڑھا کے مدحت الاختر سے دوستی اُس نے
گراں گزرنے لگی تھی جو اپنی کمزوری تو مارے شرم کے چھوڑا تھا کامٹی اُس نے
پناہ جب کسی صورت ملی نہ نشتر کو دکھائی درجۂ اوّل کی بزدلی اُس نے

ہے تازیانۂ عبرت یہ شاعروں کے لئے
"سُنا ہے کرلی ہے کل رات خودکشی اُس نے"

○

کرنل محمد خان (بسلسلۂ گذشتہ)

چھوٹا لندن

رالف رسل غالب کو آگرے سے دلی پھسلا لائے تھے

ہم نے پاکستان میں ایک مرتبہ پروفیسر رالف رسل کی ٹیلی ویژن پر تقریر سنی تھی اور کچھ چونک پڑے تھے۔ اگر کوئی روسی، چینی یا حبشی یہ تقریر کرتا تو ہمیں تعجب نہ ہوتا لیکن ایک انگریز کا معقول ہے۔ یہ روان ' خانساموں کی زبان بولنا بھی باعثِ حیرت ہوتا اور یہ انگریز تو براہِ راست کوثر میں دُھلی ہوئی قلعہ معلیٰ کی اُردو بول رہا تھا اور فقط اُردو ہی نہیں، غالب پر بول رہا تھا! یعنی بیان کی تاثیر تو تھی ہی، ذکر بھی اس پری وش کا تھا جو آسان کام نہ تھا۔ اس سے پہلے ہزاروں انگریزوں سے ملنے اور بولنے کے بعد ہمارا ایمان تھا کہ ایک سالم چونچ اور صحت مند حلق والا طوطا تو اُردو تلفظ اور صرف و نحو پر عبور حاصل کر سکتا ہے، مگر ایک انگریز "کرنے سکٹا" سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ لیکن ہمارا اندازہ غلط نکلا۔ پروفیسر رسل کا شین قاف تو خیر تھا ہی درست۔ اور "ٹ" اور "ڈ" بھی ان کی خانہ زاد تھیں۔ حیرت ان کی "ت" اور "د" کی آوازیں سُن کر ہوئی جو کوائے گندل کی طرح ملائم اور کومل تھیں ـــــ گمان ہوتا تھا کہ اگر آپ نے خود نہیں، تو آپ کی زبان نے یقیناً دلی میں پرورش پائی ہے یا کم از کم آپ نے نوکِ زبان دلی سے بنوائی ہے۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو آپ کا حلق بلاشبہ جامعِ ازہر کی ساخت تھی کیونکہ آپ کا "غ" اور "ق" بھی گلے کی گہرائی سے اس قدر پالش ہو کر برآمد ہوتا تھا کہ اگر کوئی عرب سُن پاتا تو جوشِ غیرت سے اپنے گلے پر چھری پھیر لیتا ـــــ اس قسم کے انگریز سے ہمیں ملنے کا شوق تھا اور یہ شخص بذاتِ خود لندن میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کا نام ہم نے پاکستان سے چلتے وقت ہی اپنی فہرست میں لکھ لیا تھا۔

اب لندن میں ملکہ برطانیہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے شخص سے ملنا ہمارے لئے مشکل نہ تھا۔ یہ ہمارا نہیں، ہماری پروگرام ساز مس پارس کا دعویٰ تھا ـــــ چنانچہ ہم نے چند اور ناموں کے علاوہ پروفیسر رسل کا نام بھی لیا تو بولی!

"اگر یہ شخص زندہ ہے اور لندن میں ہے تو مناسب وقت پر ملاقات کرانا میرا ذمہ رہا۔ یہی تو میرا کام ہے۔"

اور پروگرام کے مطابق پروفیسر صاحب کو ملنے کے لئے آج صبح دس بجے وہ مناسب وقت تھا۔ جائے ملاقات لندن یونیورسٹی

کا اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز تھا جہاں پروفیسر صاحب شعبۂ اُردو کے اُستاد تھے۔ پہنچا تو انتظار کرتے پائے۔ ہم نے اکثر انگریزوں کے چہروں اور انداز گفتگو میں ان کی ظاہری خوش خلقی کے باوجود، نسلی رعونت کا شائبہ محسوس کیا ہے، رالف رسل کے چہرے یا زبان پر کوئی ایسا داغ یا دھبّہ نہ تھا۔ بچوّں کی طرح بے گناہ سا چہرہ، اور بچوّں ہی کی طرح مسکراتی، متجسّس آنکھیں۔ زبان میں مروّت اور خاکساری اور دماغ تفاخر سے یکسر عاری۔ اور یہی حقیقی اُستادوں کا حُسنِ عالمگیر ہے — تعارف کے ابتدائی مراحل ہی سے پتہ چل گیا کہ آپ بھی دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہندوستان اور برما کے محاذ پر لفٹنی کر چکے تھے۔ ساتھیوں کا ذکر آیا تو آپ نے کس قدر عقیدت سے ایک برما کے رفیق اور اپنے اُردو کے استاد لفٹنٹ[۱] محمد نواز کا نام لیا اور نام سُنتے ہی ہم حیرت سے سکتے میں آگئے کہ آپ کے اُستاد لفٹنٹ محمد نواز[۱] — جو ہمارے بھی رفیق تھے — مردان کے رہنے والے ایک ڈبل پٹھان تھے جن کی اپنی اُردو اُس وقت تک منہ سے نہیں نکلتی تھی جب تک اس کا ہر لفظ پشتو سے صحت کا سرٹیفکیٹ نہ لے لیتا — لیکن حیرت ایک طرف، ایسے پرانے رشتے کی ناگہانی دریافت پر اکثر اجنبی بھی پگھل کر باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ اِدھر پروفیسر صاحب تو پہلے ہی ایک رواں دواں جُوئے شیر تھے۔ بقدرِ توفیق تھوڑی سی شکر ہم نے بھی بہم پہنچائی اور یہ مختصر سی صحبت ایک نہایت ہی خوش ذائقہ اور خوشگوار محلول میں ڈھل گئی۔ لیکن جب غالبؔ کا ذکر چھڑا — اور اس کا چھڑنا ناگزیر تھا ——— تو ہمیں پہلی مشکل پیش آئی۔ عام حالات میں ہم غیر ملکی اُردو دانوں سے بڑی غریب نوازی سے ملتے ہیں کہ ہماری اُردو دانی کے مقابلے میں بہرحال معلّیٰ ہوتی ہے۔ پروفیسر رسل نے جب اردو میں گفتگو کا آغاز کیا تو ہم نے موقع پا کر اپنی اُردو دانی کا ذرا عالمانہ سا مظاہرہ کرنا چاہا اور یکے بعد دیگرے پہلے سے یاد کئے ہوئے چند بلیغ اور بامحاورہ چٹکلے چھوڑے جن میں اِلّا۔ البتّہ، چہ جائیکہ وغیرہ کا استادانہ چھڑکاؤ تھا مگر جب جواب میں اُدھر سے "شمارِ سبحہ، مرغوب بتِ مشکل پسند" کا زوردار چھینٹا آیا تو ہماری بلاغت کے پَر بھیگ گئے۔ غالبؔ کے چند شعر سمجھ لینا ایک بات ہے اور خود غالبؔ کو سمجھنا دوسری بات ہے۔ پروفیسر صاحب سالم غالبؔ سے آشنا تھے۔ ہمیں غالبؔ کے قریب ہونے کا کچھ زعم تھا لیکن پروفیسر صاحب ہم سے کہیں زیادہ میرزا کے قریب نکلے۔ انہیں غالبؔ کے کلام کے علاوہ اُس کا شجرۂ نسب بھی یاد تھا۔ وہ تورانِ فریدوں سے لے کر قوقان بیگ سے ہوتے ہوئے اسداللہ خان غالبؔ تک تمام ترکانِ سمرقند سے آشنا تھے اور نہ صرف غالبؔ بلکہ غالبؔ کے جملہ دوست اور دشمن ان کی گرفت میں تھے۔ میرزا کے بچپن کے قصّے یوں بیان کرتے تھے جیسے آگرہ میں ننھے اسد کا پنگھوڑا اپنے ہاتھوں سے ہلاتے رہے ہوں اور بعد میں آپ ہی اسے بہلا پھسلا کر دلّی میں ننھیال کے یہاں لے آئے ہوں جہاں پال پوس کر اسے جوان کیا ہو۔ کوچہ بلّی ماراں سے تعلّق کا یہ عالم تھا کہ آج بھی انہیں آنکھوں پر پٹی باندھ کر کوچے کے ایک سرے پر چھوڑ دیا جاتا تو دیواریں چھوئے بغیر دوسرے سرے پر جا نکلتے۔ اگر غالبؔ زندہ ہوتے تو راہ پر چپکے سے ان کی بیٹھک میں داخل ہو کر مرزا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہتے "بوجھو، کون؟" پروفیسر صاحب کے پاس غالبؔ کے معاشقوں اور معرکوں، قرضوں اور جرمانوں، حسرتوں اور ارمانوں کا مکمل حساب تھا۔ وہ ستم پیشہ ڈومنی کے غمزوں اور میرزا کی آہوں کا بھی صحیح ریکارڈ رکھتے تھے اور چُنّا جان اور مُنّا جان کے چال چلن اور میرزا کی نیت

۱؎ بعد میں کرنل محمد نواز۔ ممبر انتظامیہ سی ڈی اے۔ اسلام آباد

سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔

قصہ مختصر ہم غالب کے محاذ پر مغلوب ہو گئے۔ اگرچہ ہمیں اعتراف ہے کہ گھر سے ہم پروفیسر کو مرعوب کرنے نکلے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ آخر ہم بھی ایک مصنف قسم کے آدمی ہیں۔ بلکہ اپنی کتاب کی ایک جلد بھی ساتھ رکھ لی تھی کہ جب اپنی ہوشربا خطابت سے پروفیسر کو عارضی طور پر بے ہوش کر چکیں گے تو اُٹھتے وقت آخری وار کے طور پر اسے کتاب بخش کر ہمیشہ کے لئے اپنا حلقہ بگوش کر لیں گے لیکن تدبیر کند بندہ والی بات ہے۔ پروفیسر صاحب نے زبان کھولتے ہی وہ قاطع برہان اولے برسائے کہ ہم باقی عمر کے لئے نائی سے بے نیاز ہو گئے۔ سر کے بعد کانوں کو ہاتھ لگایا تو ان میں چھوٹے چھوٹے حلقے لٹکتے محسوس ہوئے۔ چنانچہ کتاب بغل میں داب کر اُٹھنے لگے تو پروفیسر صاحب کی نگاہ اتفاقاً کتاب پر جا پڑی۔ بولے۔

"یہ کون سی کتاب ہے؟"

ہم نے تقریباً اعترافِ جرم کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میں نے لکھی ہے۔"

"تو ماشاءاللہ آپ مصنف بھی ہیں۔ میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔"

"دراصل آپ ہی کے لئے لایا تھا لیکن ....."

"تو لائیے۔"

کتاب لیتے ہوئے پروفیسر صاحب نے شکریہ ادا کیا اور اسے دو تین جگہ سے کھولا۔ کچھ دیکھا، کچھ پڑھا اور ہم اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ شاید اب آخری وقت ہی ہماری قدر و قیمت پہچانتے اور ہدیۂ تحسین پیش کرتے ہیں۔ پاکستان میں تو کئی مہربانوں نے کتاب پڑھے بغیر ہمیں مبارک باد کے خط لکھے تھے۔ آخر پروفیسر صاحب بولے۔

"آپ کی کتاب کی چھپائی اچھی ہے۔"

ہم خاموش رہے کہ اس تحسین کا رُخ ہماری طرف نہ تھا، چھاپہ خانہ کی سمت میں تھا۔

"آپ کی تصویر بھی خوب ہے۔"

یہ بھی سراسر فوٹوگرافر کے ہاتھ کی صفائی تھی۔ ہم نے محض اخلاقاً سر خم کیا اور انتظار کرنے لگے کہ اب ہمارے زورِ قلم کی شدت محسوس کرتے ہیں لیکن کیا دیکھتے ہیں کہ پروفیسر صاحب کتاب اور موضوع بند کر کے ہماری طرف الوداعی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔

ہم نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"مجھے کتاب کے متعلق آپ کی رائے سن کر خوشی ہوگی۔"

"وہ تو کتاب پڑھ کر ہی دی جا سکتی ہے، یعنی کوئی ایک سال بعد۔ میں مصروف آدمی ہوں۔"

اور پھر آنکھ مارتے ہوئے ازراہِ شرارت کہنے لگے۔

"لیکن داناؤں کا قول ہے کہ اگر ہر آدمی اپنی رائے شکر میں لپیٹے بغیر بیان کر دے تو دنیا میں دوستیاں

ختم ہو جائیں ۔"

اس عارفانہ حکمت کے سائے میں کچھ ہنستے کچھ کانپتے پروفیسر صاحب سے رخصت ہوئے ۔

——— اس بات کو پانچ سال ہونے کو آئے ہیں ۔ اور ابھی تک پروفیسر صاحب کی رائے آنا باقی ہے ۔ شاید اسی لئے ہماری اُن کی دوستی بھی باقی ہے ۔

کیو گارڈن باغوں کا باغ ہے

ہوٹل میں پہنچے اور کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی ۔ ہم نے فون اُٹھا کر ہیلو کہا تو اُدھر سے آواز آئی ۔

"کیا یہ کرنل خان بول رہے ہیں ؟"

مدت ہوئی تھی یار کو مہماں کئے ہوئے مگر یہ آواز بلاشبہ مس این پارسن کی تھی ۔ ہمیں دل لگی سوجھی اور ایک مقابلے کا سوال پوچھا ۔

"کیا یہ کوئی بلبل بول رہی ہے ؟"

"دیکھیں ، میں این ہوں ۔ آپ کی شاعری کی داد تو بعد میں دوں گی ۔ اس وقت یہ بتائیں کہ آپ کو پھولوں میں دلچسپی ہے ؟"

"دلچسپی نہیں ، عشق ہے لیکن این پارسن کے بعد !"

"تو اگر آج آپ صرف پھولوں ہی پر قناعت کریں تو ایک پارٹی سرکاری کار میں کیو گارڈن KEW GARDENS کی سیر کو جا رہی ہے ۔ میں چاہتی ہوں آپ بھی شامل ہوں ۔"

"پارٹی میں اور کون ہوگا ؟"

"ایک جرمن جوڑا اور ایک انگریز لڑکی ۔"

"اگر اس انگریز لڑکی کا نام این پارسن ہے تو ہم بھی جائیں گے ۔"

"پھر پانچ بجے اپنے ہوٹل کے دروازے پر آکر کھڑے ہو جائیں اور اگر ہمیں اپنا انتظار کرتا نہ پائیں تو ہمارا انتظار کریں ۔"

اور پانچ بجے شام ہم مس پارسن کے قرب میں کیو گارڈن روانہ ہوئے ۔

یوں تو ایک امریکی نے جب پہلی مرتبہ انگلستان کے لامتناہی قدرتی سبزہ زاروں کو دیکھا تھا تو چلّا اُٹھا تھا ۔ "ارے ، یہ تو بہت بڑا پارک ہے !" لیکن کیو گارڈن باغوں کا باغ ہے ۔ یعنی اس میں قدرت کے علاوہ انگریزوں نے بھی کچھ کام ہے ۔ انگریزوں میں لاکھ خرابیاں سہی ——— اور ان کا بین الاقوامی چال چلن بلاشبہ مشکوک ہے ، تاہم اپنے وطن کے اندر یہ لوگ ایسے بدچلن نہیں ۔ ان کے بہت سے ادارے مثلاً برٹش میوزیم ، رائل گیلری ، کیو گارڈن وغیرہ دیکھ کر تو ان کی شرافت بلکہ عظمت کا احساس ہوتا ہے ۔ ہمیں شالامار باغ جناح ، اور گلستانِ فاطمہ پر بجا طور پر فخر ہے لیکن یہ صرف باغ ہیں ۔ کیو گارڈن محض باغ ہی نہیں ، برگ وگل کی ایک وسیع اور خود مختار سی دنیا ہے ۔ جس کے اپنے عجائب گھر ہیں ، اپنی تجربہ گاہیں ہیں ، اپنے کتب خانے ہیں ——— الغرض یہ گلستان نہیں

دبستان بھی ہے — سیرگاہ ہی نہیں، درس گاہ بھی ہے۔ دنیا جہان کا کوئی پھل پھول یا پودا ایسا نہیں جو اس کی پہنائی میں نہ پایا جاتا ہو۔ پھر بھی پھل، پھول اور پودے اپنے اپنے خاندانوں کے لحاظ سے اپنے اپنے تختوں میں بستے ہیں — رنگ و نسل کے مغالطے انساد کا کوئی اندیشہ نہیں۔ باغ میں سب سے اجنبی عمارت ایک چینی پگوڈا ہے جس میں ہر چند کہ خدا کی پرستش نہیں ہوتی۔ تاہم رہتے یہاں خدا اور پھول ہی ہیں۔ اور شاید پھول کسی اور جگہ اتنے خوش نہ ہوں گے جتنے اس پگوڈے میں کہ انہیں کسی دوسری جگہ اس سے بہتر صحبت میسر نہ ہوگی۔ ہمیں خوش قسمت پھولوں پر بہت رشک آیا اور اگر ہمارے ساتھ این پارس نہ ہوتی تو اور زیادہ رشک آتا۔ جرمن ہوٹا کہ ایک سائنسداں قسم کی مخلوق تھی ہنستے کھیلتے پھولوں سے دامن بچا کر لیباریٹری میں داخل ہو گیا۔ لیکن ہمیں ان تجربہ گاہوں میں جھانکنا گوارا نہ ہوا کہ وہاں پھولوں کو تجزیہ کے نام پر چیرا جاتا ہے۔ مس پارس نے بھی ہماری تائید کی۔ بلکہ ورڈز ورتھ سے مزید تائید لی کہ جہاں تک پھول پتوں کے چیرنے پھاڑنے کے عمل کا تعلق ہے۔ " WE MURDER TO DISSECT "ؔلہ۔ چنانچہ ہم این کے ہم خیال اور ہمکنار ہو کر علیحدہ سیر گل کو چل پڑے اور پھولوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کے رنگ و بو کا تماشا کرنے لگے۔ جرمنوں کی آنکھوں سے نہیں، بھونروں کی آنکھوں سے۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان آنکھوں سے دیکھا جانے کے بعد پھول خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔ بلکہ یوں بھی کہ جیسے ان کے ننھے منے لبوں سے قہقہوں کی صدائیں ابھر رہی ہوں ورنہ بخدا ہم بھی انہیں جرمن قصابوں کی نیت سے دیکھتے تو کل کبھی نہ مناتے رنگ و بو کرتے۔

الغرض ہم بھونروں کی طرح چنپا کے تختوں سے چنبیلی کو جاتے — ، چنبیلی سے موتیا کو اور موتیا سے گلاب کو لیکن گلاب کے تختوں میں گئے تو ان کے رنگارنگ پھولوں نے ہمارا دامن تھام لیا۔ اودے، نیلے، پیلے، کالے لیکن سب سے پیارے لال مہکتے پھول جیسے ہزاروں دلہنوں نے یکبارگی اپنے نقاب الٹ دیئے ہوں۔ جس پھول پر نگاہ پڑتی، اسی پر قربان ہو جاتی اور وہ نگاہیں جو بچ نکلتیں، اُن ننھے منے معصوم بچوں پر نچھاور ہو گئیں جنہیں انگریز مائیں سیر باغ کو لے آئی تھیں اور جو اس وقت ماؤں سے بے خبر گلاب کی ایک پھلواڑی میں پھولوں سے کھیل رہے تھے۔ بلکہ یہ کہنا مشکل ہے کہ بچے پھولوں سے کھیل رہے تھے یا پھول بچوں سے کہ بچے بہت چھوٹے تھے بمشکل ایک پھول سے دوسرے پھول تک پہنچ سکتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پھول بڑھ کر لڑکھڑاتے بچوں کی انگلی تھام لیتے ہوں۔ بلکہ بعض اوقات تو بچوں اور پھولوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا۔ خصوصاً بہت چھوٹے بچوں اور بہت بڑے پھولوں میں ایک سی رنگت۔ ایک سی قامت اور ایک سی نزاکت — جمال سے ہم ہمیشہ اور ہر جگہ متاثر ہوئے ہیں کہ ہم طبعاً جمال پرست ہیں۔ جمال کا سب سے محبوب مظہر تو ست اندام عورت ہی ہے اور ہر اہل دل کی طرح ہمارے من مندر میں بھی کوئی مورت ہے تو اسی کی ہے لیکن جمال کے دوسرے مظہر بھی کچھ کم دلفریب نہیں، خصوصاً بچے۔ بلکہ کوئی بچہ، انسان کا، اونٹ کا، بکری کا، جتنا کم سن اتنا ہی دلربا کسی پنجابی نے کیا پیاری بات کہی ہے — " بچے جیہا پھل نہ ڈٹھا۔ جتنا کچا اُتنا مٹھا "ؔ

لہ ۔ ہم پھول پتے چیرتے نہیں قتل کرتے ہیں — ورڈز ورتھ

ؔ ۔ بچے جیسا پھل نہ دیکھا۔ جتنا کچا اتنا میٹھا۔

کنور دھیندر سنگھ بیدی سحرؔ

اخبار نویس

اخبار نویسی شروع شروع میں اخبار کے ذریعہ صرف اخبار رسانی کے پیشہ کا نام تھا۔ جو واقعہ کہیں ظہور پذیر ہوا ہے کم وکاست اُسے عوام تک پہنچا دیا۔ لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ اس پیشہ نے نیا روپ دھارن کیا اور اب تو خدا کے فضل وکرم سے ایک سود مند دھندا ہے۔ آیئے آپ کو افسانہ نویسوں کی مختلف اقسام سے روشناس کرائیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔

۱۔ پہلی قسم ان اخبار نویسوں اور اخباروں کی ہے جن کی اشاعت ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ہے۔ لوگ ہر صبح اٹھ کر اپنے پسندیدہ اخبار کا انتظار کرتے ہیں بلکہ بعض اصحاب تو بیت الخلا میں بھی نہیں جاتے۔ جب تک کہ اخبار ان کا ساتھ نہ دے۔ یعنی یوں کہیے کہ خبر رسانی کے علاوہ یہ اخبار قبض کشائی کا بھی کام کرتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں کی اشاعت والے اخبار اپنے آپ کو صرف خبر رسانی تک ہی محدود رکھتے تو کوئی بات نہ تھی۔ لیکن اس سرمایہ دار نے ان اخباروں کو بھی اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا ہے اور اب یہ اخبار عام طور پر سیاسی جماعتوں کے لاؤڈ اسپیکر بن کر رہ گئے ہیں۔ ایڈیٹروں اور خصوصی نمائندگان کو ہزاروں روپیہ ماہانہ تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ ان اخباروں کی وساطت سے کروڑوں روپے کے اشتہارات وصول کیے جاتے ہیں۔ حکومتِ وقت بھی ان اخبار نویسوں اور اخباروں سے خوف کھاتی ہے۔ ان کے ایڈیٹروں، مدیروں اور خصوصی نمائندوں کو خوش کرنے کی سعی کرتی ہے۔ جس سے یہ لوگ اس قدر تنگ مزاج ہو جاتے ہیں کہ بات بات پر بگڑ جاتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کے قدموں پر گر کر انہیں منایا جائے۔

۲۔ دوسری قسم ان اخبار نویسوں کی ہے جن کے اخباروں کی اشاعت اتنی نہیں ہوتی۔ لیکن اپنی اہمیت وہ کسی سے کم نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ہوتا وہی ہے جو کسی ایسے شخص کے ساتھ ہو جس کے جسم میں طاقت کم ہو مگر غصہ زیادہ۔ یہ بات بات پر بگڑنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ اور پھر اس انتظار میں رہتے ہیں کہ انہیں منایا جائے۔ دراصل ان کا یہ رویہ احساسِ کمتری کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہر دورِ حکومت میں یہ خدائی فوجدار صفِ مخالف میں ہی رہتے ہیں۔ کچھ دیر تک یہ عالم طاری رہتا ہے اور پھر ان میں سے کچھ تو

کچھ تو دم توڑ دیتے ہیں اور کچھ اس ٹھکرائے ہوئے عاشق کی طرح کرخت رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس قسم کے اخبار نویس آخری مرحلہ پر پہنچ کر اکثر یہ فرماتے سنے جاتے ہیں کہ حکومت نے لاکھ چاہا کہ ہمیں خرید لیا جائے اور ہم ان کی پالیسی کو سراہیں! ان کے گن گائیں۔ لیکن ہم ہر پیش کش کو ٹھکرا کر حق گوئی اور حق پرستی پر قائم رہے۔

(۳) تیسری قسم کے اخبار نویس وہ ہیں جن کے اخبار کی اشاعت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ یہ لوگ صبح سے شام تک دفتر میں کم اور سڑکوں پر زیادہ نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ اول تو ہر ہفتہ ورنہ ہر مہینے "اسپیشل نمبر" نکالنے کا اعلان کرتے ہیں اور پھر لوگوں کے دفتروں پر ذاتی طور پر چکر لگا کر انہیں اپنے اخبار کی "لاتعداد" اشاعت" کی اہمیت" اور ہمہ گیر مقبولیت سے آگاہ فرماتے ہیں اور ان پر ظاہر کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے اس خاص نمبر میں پورے صفحہ کا اشتہار نہ دیا تو وہ عمر بھر پچھتائیں گے۔ جب خدا خدا کر کے دس پانچ اشتہار انہیں مل جاتے ہیں، تو سو پچاس اخبار کسی گھٹیا پریس سے چھپوا کر اشتہار دہندگان اور ان کے دوستوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور فوراً ہی اگلے "اسپیشل نمبر" کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔

(۴) چوتھی قسم کے اخبار نویس وہ ہیں جن کا پرچہ کبھی چھپتا ہے، کبھی نہیں چھپتا۔ لیکن جب کبھی ان کا پرچہ چھپے تو کسی نہ کسی مقامی افسر یا شہری کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھا جاتا ہے۔ اور آئندہ شمارے میں پوری تفصیل شائع کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ کچھ آدمیوں کو درمیان میں ڈال کر "مصالحت" کی سعی کی جاتی ہے۔ اگر افسر متعلقہ یا شہری میں کوئی ذاتی کمزوری ہو یا وہ ناموافق تشہیر سے ڈرتے ہوں تو سودا ہو جاتا ہے لیکن یہ اخبار نویس بڑے دور اندیش ہوتے ہیں اور پولیس والوں کے خلاف لکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کو اکھڑ آدمیوں سے بھی پالا پڑ جاتا ہے۔ ایک بار دلی کے ابھرتے ہوئے تاجر کے خلاف اسی طرح کے ایک اخبار نویس نے شوشہ چھوڑا اور پھر "مصالحت" کے لیے لوگ اس تاجر کے ہاں پہنچے۔ تاجر نے کہا کہ میں اس معاملہ کو زیادہ طوالت نہیں دینا چاہتا۔ آپ اخبار نویس صاحب کو میرے پاس بھیج دیجیے۔ کسی کو ساتھ آنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ یہ اطلاع پا کر وہ ان کے ہاں پہنچے کہ اب اچھا خاصہ مال ہاتھ آئے گا۔ تاجر نے انہیں اپنے خاص کمرے میں بلوا لیا اور جب وہ وہاں پہنچے تو دو تین پہلوان وہاں موجود تھے۔ جنہوں نے تاجر صاحب کے ارشاد پر اخبار نویس کی وہ گت بنائی کہ عمر بھر یاد رکھے الٹی تحریری معافی مانگی اور ساتھ ہی اقرار کیا کہ آئندہ اس تاجر تو کیا کسی کے خلاف بھی نہیں لکھیں گے۔

(۵) پانچویں قسم کے اخبار نویس وہ ہیں جن کے پرچے کی حیات کا دارومدار سنسنی خیز خبروں پر ہوتا ہے اور اشاعت میں وہ کوئی نہ کوئی ایسی خبر چھوڑتے ہیں کہ لوگ ہاتھوں ہاتھ ان کا پرچہ خرید لیتے ہیں۔ ان اخباروں میں بڑے چٹخارے دار خبریں شائع ہوتی ہیں۔ چند سرخیاں ملاحظہ ہوں:

"ایک چالیس سالہ عورت نے اپنے بیس سالہ عاشق کی خاطر اپنے شوہر اور تین جوان بچوں کو زہر دے دیا" "ایک کنواری ماں کی کہانی خود اس کی زبانی" "ایک حسینہ نے بیک وقت پانچ مردوں سے شادی کی اور ایک دوسرے کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔" "کل شب موپلے مارکیٹ میں زبردست دھماکے سے آگ لگ گئی۔ کئی جانور اور لاکھوں کی مالیت کا نقصان۔" "ایک کروڑپتی کے گھر پر انکم ٹیکس والوں کا چھاپہ۔ کئی من سونا اور چاندی برآمد ہوا۔ ابھی تلاش جاری ہے۔" بڑے بڑے جلی حروف میں یہ خبریں سرورق پر شائع کر کے اسی پرچے کے کسی کونے میں بڑی چابکدستی سے ان کی تردید یہ کہہ کر کر دی جاتی ہے کہ ہمارے خصوصی نمائندہ کی تازہ اطلاع کے مطابق یہ خبر غلط ثابت ہوئی۔

(۶) چھٹی قسم ان اخباروں کی ہے جو بلیک میل کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ ان کی من گھڑت سرخیاں بھی شاب آور ہوتی ہیں۔ مثلاً "شہر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل پر چھاپہ۔ ایک حسینہ گرفتار۔ سرکردہ شہریوں سے جنسی تعلقات کا انکشاف"۔ اب یہاں چور کی داڑھی میں تنکا" عجب رنگ لاتا ہے۔ کئی سرکردہ شہری جو سنتا ہے اُسی کی داستان معلوم ہوتی ہے" کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ اس اخبار کے سارے پرچے خرید لیے جائیں تاکہ بہت ہی کم لوگوں تک یہ خبر پہنچے۔ ایک اور سرخی ملاحظہ ہو۔ "کروڑ پتی بوڑھے سیٹھ کی نوجوان بیوی کے سیٹھ جی کے ڈرائیور کے ساتھ ناجائز تعلقات۔ تفصیل آئندہ پرچے میں دی جائے گی"۔ اس خبر کے فوٹو ہی بعد کئی بوڑھے سیٹھوں کو اس پرچے کی ایک کاپی بھیج دی جاتی ہے اور پھر انتظار کیا جاتا ہے کہ کچھ مال ملے۔

(۷) ساتویں، ور آخری قسم ان اخبار نویسوں کی ہے جو محض شوقیہ اخبار نکالتے ہیں۔ ان کے پاس کافی اثاثہ ہوتا ہے۔ یہ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور صحیح معنوں میں اخبار اور اخبار نویسی کے فن کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اس دور میں یہ جنس اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ آخر میں اپنا ایک قطعہ اخبار نویس حضرات سے متعلق پیش کرکے اس تذکرہ کو ختم کرتا ہوں۔

سرِ بازار کل یہ کہہ رہے تھے گل محمد سے　　　مرے ایک دوست جن کو پیار سے کہتے ہیں سب بھی
خدا اخبار والوں سے بچائے ہر بھلے گھر کو　　　نہ ان کی دشمنی اچھی نہ ان کی دوستی اچھی

□□

فیاض افسوس ۔ اکولہ

O

جتنے اندھے ہیں وہ سب دیدار کی باتیں کریں
اور لنگڑے شوخیٔ رفتار کی باتیں کریں
گونگے عاشق تیزیٔ گفتار کی باتیں کریں
سارے گنجے گیسوئے خمدار کی باتیں کریں
چار علیمی مل کے حسنِ یار کی باتیں کریں

چل پڑے اکبار تو رکتی نہیں اُن کی زباں
ہم ہیں ایسے ہم ہیں ویسے ہم فلاں ابنِ فلاں
ڈالدیں چکر میں اس کو ہوں یہ جس پہ مہرباں
پان کلّے میں دبائے آج کل کے نوجواں
جیب میں دھیلا نہیں کلدار کی باتیں کریں

ہیں پریشاں پھول غنچے کھا رہے ہیں پیچ و تاب
شرم سے اب ہو رہی ہیں بلبلیں بھی آب آب
یوں تو آئے ہیں جہاں میں سینکڑوں ہی انقلاب
ہاں مگر اس دورِ حاضر کا نہیں ملتا جواب
آج اُلّو بھی گل و گلزار کی باتیں کریں

کل تھا نظروں میں فقط اب ٹھیٹھ اُنکے دل میں ہے
خوف و دہشت بے طرح کیوں مجمعِ باطل میں ہے
عشق کا ٹٹو ابھی تو پہلی ہی منزل میں ہے
ذکر یوں افسوس کا اغیار کی محفل میں ہے
چور اُچکے جیسے تھانیدار کی باتیں کریں

ظفر کمالی بی۔ اے
(پٹنہ)

گالیاں کھا کے......

بڑی جادوگری پوشیدہ ہے اس لفظ میں۔ کون ہے وہ شخص جو اس "دولتِ عظیم" سے محروم ہو۔ بچے، جوان، اَدھیڑ، بوڑھے لڑکے، لڑکیاں، امیر غریب، شریف، رذیل، غرضکہ کوئی ایسا نہیں جو اس سے گاہے بگاہے فیض نہ حاصل کرتا ہو۔ کچھ لوگ اس پونجی کا ہمیشہ بے دریغ استعمال کرتے ہیں اور کچھ لوگ "خاص خاص" موقعوں کے لئے بچا کر رکھتے ہیں۔ اوّل الذکر عقل مند لوگ ہیں جو اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ وہ دولت ہے جو علم کی طرح۔ ؎

خرچ کیجئے تو اور بڑھتی ہے

اور آخر الذکر وہ ہیں جو پیدائشی بخیل ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں کبھی فراخ دلی سے کام لے کر اپنی عزت پر کوئی آنچ آنے دینا نہیں چاہتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بیش بہا دولت یعنی گالی کا استعمال دنیا میں کب سے شروع ہوا۔ میری ذاتی تحقیق کے مطابق حضرتِ آدم کی تخلیق کے ساتھ ہی گالی کی بھی ابتدا ہوئی۔ کیونکہ سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے جب شیطانِ لعین دربارِ خداوندی سے نکالا گیا ہوگا تو اس نے دل ہی دل میں حضرتِ آدم کو ضرور بُرا بھلا کہا ہوگا۔ بلکہ صلواتیں بھی سنائی ہوں گی۔ لیکن میرے خیال میں اس کی باضابطہ بنیاد ہابیل اور قابیل کی جنگ سے ہوئی جو ایک "عورت" کے لئے لڑی گئی۔ پھر زمانے اور ماحول کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کا ارتقاء ہوا۔ بہرحال! یہ موضوع بڑا پیچیدہ اور تفصیل طلب ہے۔ اُمید ہے محقق حضرات اس کی جانب پہلی فرصت میں توجہ دینگے۔

گالی دینے یا بکنے کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں۔ اگر ایک سن رسیدہ اور بالغ نظر شخص گالیاں دے سکتا ہے تو ایک چھوٹا سا بچہ بھی بڑے اطمینان کے ساتھ اس کام کو پورا کر سکتا ہے۔ کچھ بچے تو ہوش سنبھالتے ہی اس کام میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ بہت سے والدین کو میں نے دوسروں سے فخریہ کہتے سنا ہے کہ ماشاء اللہ ان کا گڈّو بڑا "ہونہار" ہے۔ اتنی سی عمر میں ہی فرفر سے گالیاں بکتا ہے۔ کیا مجال جو ذرا بھی زبان میں لکنت آجائے۔

گالیاں بکنے کے لئے ویسے سبھی بک سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اس میں سلیقے کا سوال ہے۔ یہ سب کے بس کا روگ نہیں۔ دورِ جدید میں جہاں اور شعبوں میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ ہیں وہاں اس میدان میں اُنھوں نے مردوں کو کافی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ بہت سی عورتیں تو سلیقے کے ساتھ ایسی "لچھے دار" گالیاں بکتی ہیں کہ ایک سماں بندھ جاتا ہے اور سینکڑوں اور بعض اوقات ہزاروں کا مجمع ہمہ تن گوش ہوکر اس سے لطف اُٹھاتا اور اپنا غم غلط کرتا ہے۔ بہت سے لوگ تو حسرت کے ساتھ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ مصرعہ

اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی

چند دنوں کی بات ہے ایک صاحبہ جو اس میدان کی شہسوار ہیں اور جو بلاناغہ صبح وشام ہزار ہزار گالیاں ایک ہی سانس میں بکا کرتی ہیں، ایک شریف سی صاحبہ کے پاس گئیں اور جاتے ہی بولیں۔ "بھئی! آپ تو کبھی بھول کر بھی جھگڑا نہیں کرتی ہیں۔ چلئے نا آج اپنی قسم توڑ لیجئے۔ میرا دل بھی ہلکا ہو جائے گا۔"

وہ شریف قسم کی صاحبہ بولیں۔ "اے بہن! دیوانی ہوئی ہو۔ میں کیوں لڑوں۔ لڑے میری بلا"

پہلی صاحبہ جھٹ بولیں۔ "ارے تیری بلا تیری آل اولاد کو لگے۔"

اولاد کا نام سنتے ہی دوسری صاحبہ غصہ سے آگ بگولا ہو گئیں اور لگیں ان کی سات پُشت کو صلواتیں سنانے۔ پھر تو گالیوں کے تبادلے سے وہ ہنگامہ برپا ہوا اور دورانِ ہنگامہ وہ "گل افشانیاں" ہوئیں کہ کچھ نہ پوچھئے۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اگر روزآنہ گالیاں نہیں سنیں تو اُن کا کھانا ہضم نہ ہو۔ ان میں اور گالیاں دینے والوں میں بالکل وہی تعلق ہوتا ہے جو فرد اور سماج میں۔ یعنی گالیاں دینے والے اور سننے والے ایک دوسرے کے لئے لازم اور ملزوم کا درجہ رکھتے ہیں۔ شعراء حضرات تو اپنے محبوب کے "شیریں لبوں" کی گالیاں سننے کو ترستے رہتے ہیں اور بعضے تو اسی ہوک میں یہ کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو تے ہیں کہ ؂

کسی کے ہونٹ کے ہلتے ہی یہ تمام ہوئے
مزا ملا نہ ہمیں گالیاں بھی کھانے کا

گالی کے معاملے میں شوہر حضرات کی حالت بڑی عجیب سی ہوتی ہے۔ بیچارے جب تک کنوارے رہتے ہیں گالی سننے کی حسرت دل میں چھپائے رکھتے ہیں۔ خدا خدا کرکے جب شادی کا وقت آتا ہے تو سسرال میں قدم رکھتے ہی گالیوں سے استقبال ہوتا ہے۔ اس وقت ڈھولک کی تھاپ پر کھنکتی ہوئی گالیاں کانوں میں رس گھول دیتی ہیں۔ (قسمت والوں کو ہی ایسا موقع بار بار ملتا ہے)۔ سسرال میں مجموعی طور پر گالیاں سننے کو ملتی ہیں۔ لیکن شادی کے بعد جب بیگم کی جانب سے انفرادی گالیوں کا نمبر آتا ہے تو بیچارے شوہر کی حالت بڑی ناگفتہ بہ ہوجاتی ہے۔ اس کا مزا تو وہی بتا سکتے ہیں جنھوں نے اس شہریں پھل کا مزا چکھا ہوگا یا جو مستقل چکھ رہے ہیں۔

گالیاں کھانے یا سننے کے لئے کسی خاص محنت کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی روپے پیسے کی حاجت ہوتی ہے۔ اگر آپ واقعی

ناوک" میں تو کسی تنگ مزاج خاتون کو منھ چڑا دیجئے یا ان کے گھر میں ڈھیلے پھینک دیجئے۔ پھر تیسری جنگ عظیم کا منظر دیکھنے کے لئے تیار ہو جائیے۔ میرے پڑوس میں ایک ایسی ہی خاتون ہیں جو خدا جھوٹ نہ بلوائے سراپا گالی ہیں۔ انھیں دیکھ کر آپ ذرا سا کھانس دیں یا گہری سانس لے لیں، پھر تو آپ کے سر پر دھڑا دھڑ گالیوں کے وہ "ہائیڈروجن بم" گریں گے کہ اگر آپ بروقت "جائے حادثہ" سے فرار نہیں ہوئے تو پھر کوئی معجزہ ہی آپ کو زندہ وسلامت رکھ سکتا ہے۔

روزمرہ کی زندگی میں گالیوں سے بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً کوئی شناسا آپ کا کام نہیں کرتا تو ہنستے ہوئے اسے صرف سالا کہہ دیجئے۔ دیکھئے آپ کا کام جھٹ پٹ ہو جاتا ہے یا نہیں۔ اپنے سے طاقتور کو چیخ چیخ کر اور اُچھل اُچھل کر گالیاں دیجئے اس پر فوراً رعب طاری ہو جائے گا۔ کسی دانشور نے (دانش ور سے مراد میں بھی ہو سکتا ہوں) کیا خوب کہا ہے کہ "دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو گالیوں میں ماہر ہوتا ہے"۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ گالیوں کی خوب پبلسٹی کی جائے۔ جس طرح ایک سیاست داں دوسرے سیاست داں کو گالیاں دیا کرتا ہے اسی طرح ایک ملک کے حکمراں دوسرے ملک کے حکمرانوں کو دل کھول کر گالیاں دیں۔ چھوٹے بچے اپنے بزرگوں کو خوب تنگ کریں تا کہ انھیں بھی گالیاں بکنے کا موقع دستیاب ہو۔ زمانۂ قدیم سے چلی آرہی گالیوں میں مناسب ترمیم کی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ نئی نئی گالیاں ایجاد کی جائیں۔ اور گالیاں ایجاد کرنے والوں کو بڑے بڑے خطابات اور انعامات سے نوازا جائے۔ اس موضوع پر موٹی موٹی کتابیں اور چھوٹے چھوٹے مقالے لکھے جائیں اور سمینار کا اہتمام کیا جائے۔ گالیوں کی ترقی کے لئے "انتہا پسندانہ" رویہ اختیار کیا جائے اور اسے مقبولِ عام بنانے کے لئے جگہ جگہ جلسے کئے جائیں اور بڑے بڑے جلوس نکالے جائیں۔ جن میں فحش گالیاں بکنے سے بھی گریز نہ کیا جائے۔ ساتھ ہی موجودہ سال کو "گالیوں کا سال" قرار دیا جائے۔ یقین مانئے گالیوں کی ترقی میں ہی ہماری اور آپ کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

سوالات :

(۱) گالی کسے کہتے ہیں؟ اس کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟ ہر ایک کی تعریف مع مثال لکھئے۔

(۲) "گالی ہماری زندگی کا لازمی جُز ہے" اس قول کی روشنی میں گالی کی سماجی اہمیت کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

(۳) گالی کس نے ایجاد کی؟ اس کی شان میں دس گالیاں لکھئے۔

شاعر جو ہے اداس تجھے دیکھنے کے بعد
وہ کھو چکا حواس تجھے دیکھنے کے بعد

تجھے دیکھنے کے بعد

دیکھا ہے میں نے حضرت واعظ کی میز پر
لسی کے دو گلاس تجھے دیکھنے کے بعد

سو سال پہلے دیکھا تھا شاید کہیں تجھے
کہتا ہے یہ قیاس تجھے دیکھنے کے بعد

کرتے تھے شوق چپکے مگر اب علانیہ
ہے ہاتھ میں گلاس تجھے دیکھنے کے بعد

پکچر میں دیکھ کر تجھے ہیرو نکل گیا
اب چر رہا ہے گھاس تجھے دیکھنے کے بعد

مرنے کو جا رہا تھا وہ پنجرے میں شیر کے
شوٹنگ میں زو کے پاس تجھے دیکھنے کے بعد

آوارہ پھر رہا ہوں کبوتر بنا ہوا
کالج کے آس پاس تجھے دیکھنے کے بعد

وہ امتحان دے کے بھی مایوس تھا مگر
ہو جائے کیوں نہ پاس تجھے دیکھنے کے بعد

جلسے میں تعزیت کے صدارت ملی انہیں
غم آگیا ہے راس تجھے دیکھنے کے بعد

دس روٹیوں پہ اکتفا کرتے ہیں آج کل
نہ بھوک ہے نہ پیاس تجھے دیکھنے کے بعد

تیری گلی میں جانے کی ہمت نہیں مگر
پھرتے ہیں آس پاس تجھے دیکھنے کے بعد

لگتا ہے اب ظریف بھی شاید نکل گیا
ہے وہ بھی بدحواس تجھے دیکھنے کے بعد

اسماعیل ظریف

مرزا مقبول بیگ (حیدرآباد)

آسیب وانی

ہزاروں کیلوہرٹز پر یہ آسیب وانی ہے۔ آج کے اُردو پروگرام میں صرف خطوں کے جواب سنوائے جائیں گے۔ سامعین میں جن کو یہ پروگرام پسند نہ آئے وہ دوسرے میٹروں پر نشر ہونے والے پروگرام سُن سکتے ہیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ویسے بھی یہاں ہم دونوں ہی مجبور ہیں — نہ آپ ہم پر پابندی لگا سکتے ہیں اور نہ ہم آپ پر۔

تو آئیے پروگرام کا آغاز کرنے کیلئے کریم صاحب اور جمن صاحب تیار بیٹھے ہیں۔

کریم —— بیرنگ سننے والوں کو کریم کا آداب۔

جمن —— اور میری جانب سے سُننے والوں کے علاوہ ان کے رشتہ داروں کی خدمت میں آداب

کریم —— جمن بھائی' یہ پہلا خط آیا ہے علیگڈھ سے تجوری مل تالے والے صاحب کا:

جُمن —— کیا لکھا ہے انہوں نے۔؟

کریم —— "انہوں نے لکھا ہے ڈرامہ "لنگور کی واپسی" "آدھی قبر میں ڈاکر" کے مصنف جناب مان سنگھ صاحب تک ہماری مبارکباد پہونچا دیجئے۔" آگے چل کر لکھتے ہیں "ڈرامے کے صداکار تعریف کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ڈرامہ میں حقیقت کا رنگ بھر دیا تھا۔ کئی بار ہم خود کپکپا کر رہ گئے۔ ماحول کی اتنی صحیح عکاسی کرنے پر میری جانب سے صداکاروں کی خدمت میں مبارکباد پیش کر دیجئے۔"

"علیگڈھ کے تجوری مل تالے والے صاحب آپ کا خط ملا۔ پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کو ڈرامہ "لنگور کی واپسی" ڈرامہ "آدھی قبر میں ڈاکر" پسند آیا جس کے لئے ہم آپ کے بے حد مشکور ہیں۔ ڈرامہ "آدھی قبر میں ڈاکر" کے مصنف ریٹائرڈ ڈاکو مان سنگھ تک آپ کی مبارکباد پہنچا دی جائے گی بلکہ یوں سمجھئے کہ پہونچا دی گئی۔"

"دوسرا خط آیا ہے یادگیر گٹہ کے جناب لکھ پتی مل ولد کروڑ پتی مل صاحب کا — وہ لکھتے ہیں "فقیروں کی کانفرنس" کی ریڈیو رپورٹ بے حد پسند آئی۔ ڈرامہ "لنگور کی واپسی" بھی خوب تھا۔ محترمہ لیلیٰ کی ترتیب دی ہوئی گیتوں بھری کہانی نے تو جادو جگایا اور ہم پر اس بات کا پہلی مرتبہ انکشاف ہوا کہ "مجنوں" بھی ایک سوشیل ورکر تھا۔ اور جناب محمد علی جرّاح کا افسانہ "کتا

لنگڑا ہوگیا" بھی بے حد پسند آیا۔ ایسے دلچسپ پروگرام پیش کرنے پر میں اور میرے والد محترم اور چھوٹے بھائی ہزاری مل، والدہ کنجوس رانی کی جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے۔!"

"یادگیر گنج کے جناب لکھ پتی مل ولد کروڑ پتی مل صاحب، ہزاری مل اور ان کی والدہ کنجوس رانی صاحبہ۔ آپ کا خط ملا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ آپ لوگوں کو ڈرامہ "لنگور کی واپسی" اور "آدمی قبر میں ڈاکہ" محترمہ لیلیٰ کی ترتیب دی ہوئی گیتوں بھری کہانی" جناب محمد علی جراح کا افسانہ "کتا لنگڑا ہوگیا" "فقیروں کی کانفرنس" کی ریڈیو رپورٹ پسند آئی۔ ہم ایک بار پھر آپ کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ بھائی لکھ پتی مل فنکار "واہ واہ" کھا کر ہی زندہ رہتا ہے۔ سامعین پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ہر حال میں انہیں ہفتہ عشرہ میں ایک بار "واہ! واہ" کا ڈونز دیا کریں ــــ ہمیں خوشی ہے کہ آپ ہر ہفتہ عشرہ پابندی سے اپنا فرض انجام دیتے ہیں ــــ آگے بھی اپنی پسند سے سرفراز فرماتے رہیئے گا۔"

"جمن بھائی! یہ خط آیا ہے رکشا اسٹانڈ کوٹھی دواخانے سے اسے لکھا ہے جناب پاشو میاں تین پہیئے نے ــــ یہ لکھتے ہیں کہ "مجھے معلوم ہے تم لوگاں میرا خط پڑ کو نئیں سنائیں گے۔ پھر بھی میں یہ خط تمہارے کو بھیج لکھ رؤں اس سے پہلے تین خطاں لکھا تھا مگر ایک بی خط کا جواب نئیں دئیے۔ اُردو کے پروگرام بیرنگ میں خطوں کے جواب میں خالی تعریفی خطاچ سنائے جاتیں اس واسطے اپنے کو پسند نئیں آتا سو پروگرام کے بارے میں بتانے سے پہلے تھوڑی تعریف کرنا ضروری سمجھ رؤں۔ بیرنگ کتا اچھا پروگرام ہے۔ کیا بولوں اس سے آگے چلنے کی بہوت اُمید ہے چھوٹے جلدی گھس جاتیں مگر بیرنگ بھوت اچھی چیز ہے یہ گھستیچ نئیں ــ اب کیا بولوں یہ بھوت بھوت اچھا پروگرام ہے۔ جب رات کو یہ پروگرام آتا سے تو اپن سواری کو بھی نئیں جاتے۔ سچی بول رؤں۔ اب جمن بھائی میں اصلی بات بتاتوں۔ تھوڑے دن پہلے آپ لوگاں ایک فیچر بول کو سنائے تھے "آٹو رکشا ترقی کی راہ پر" سنے تو بھوت بُرا دکھا۔ آپ لوگاں ہمارے پیٹ پولات مارے نئیں ہم کو اچھا نئیں دکھا۔ اب اس کے بدلے میں "رکشا ترقی کی بلندی پر" بول کر ایک فیچر جتنا جلدی ہوتا سناؤ، میں یہ فیچر لکھ کر بھی رکھ لیوں۔ سنانے کے واسطے کب آؤں بولو۔ ہمارے دوستاں ایلیا کا ٹرپن شیخ محبوب ڈینجر، جگن سٹ پاتا" اور حنیف چھرّا" بہرحال سب لوگاں جواب سُننے کے واسطے بے چین ہیں۔"

جناب پاشو میاں تین پہیئے" ایلیا کا ٹرپن" شیخ محبوب ڈینجر، جگن سٹ پانا اور حنیف چھرّا صاحب۔ آپ کا عنایت نامہ ملا۔ بھائی صاحب آپ کے تین خطوط کے نہ سنانے کا ہمیں افسوس ہے۔ آپ نے لکھا تھا کہ ہم اس خط کا بھی جواب نہیں دیں گے۔ لیجئے جواب حاضر ہے ــ ہوسکتا ہے آپ نے اس خط کی تمہید سے ہی ہمارے خلاف لکھا ہو اور آگے چل کر تعریف کی ہو لیکن ہماری نظر صرف تمہید پر ہی پڑی ہو اور اس طرح آپ کا خط اور دوسرے خطوط کے ساتھ ردی کی ٹوکری میں چلا گیا ہو۔ بہرحال ہمیں یقین ہے کہ آپ نے ہمیں معاف کر دیا ہوگا ــــ بھائی صاحب! ہم کس کس کی پسند کا خیال رکھیں۔ اس شہر میں قسم قسم کے لوگ رہتے ہیں اس لئے ہم نے صرف اپنی پسند کو ملحوظِ خاطر رکھنا شروع کر دیا ہے ــــ اب رہی بات آپ کے فیچر کی۔ کسی دن اچھے کاتب سے لکھوا کر لائیے ہم آپ کا نام لے کر کسی اور سے پڑھوا لیں گے ــــ

"اچھا تو کریم بھائی! ابھی کتنے خطوط باقی ہیں۔"

بس یہ آخری خط ہے جو میں پڑھنے والا ہوں ۔ "گھمڑو صاحب ، پاشو میاں ، فقیر پاشاہ ، غفور خان ، محراب خان ، گنڈو صاحب رستم بی ، چھایا بیگم ، بک بک النساء اگر ہمارا پروگرام سُن رہے ہیں تو کہنا ہے کہ کئی دن سے ان کے تعریفی خطوں کی آمد میں قدرے کمی ہو گئی ہے ۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ لوگ ہمارا خیال رکھیں گے ۔ ہاں تو کریم بھائی ! ۔ آخری خط بھی سنا دیجئے "

یہ خط آیا ہے طبلہ پیٹ سے سارنگ جیسی صاحبہ کا ۔ یہ لکھتی ہیں ۔ یوں تو "بیرنگ" کے سبھی پروگرام ہمیں پسند ہیں ۔ انہوں نے خصوصیت سے مشرف امیدی کے لکھے ڈرامے "تان سین کا الکٹرک گٹار" کی تعریف کی ہے اور انہوں نے لکھا ہے کہ اکبر اعظم کا سلیم کی نافرمانی اور گستاخی سے دل ٹوٹ جانے کے بعد تان سین کو طلب کرنا اور کچھ سنانے کا حکم دینا ۔ تان سین کا اپنی نئی ایجاد الکٹرک گٹار کا کمال پیش کرنے کی "مہابلی" سے اجازت لینا ۔ گٹار کی موسیقی سے بادشاہ کا سلیم کا غم بھول جانا ۔ ہر طرف سے داد و تحسین کا غلغلہ بلند ہونا ۔ ٹھیک ایسے وقت کرنٹ فیل ہو جانے پر گٹار کا خاموش اور تان سین کا مجبور ہو جانا ۔ تب بادشاہ سلامت کا غصہ میں گٹار کا کچومر نکال دینا واقعی بہت ہی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے ۔ مطلق العنان بادشاہ سے اس کے سوا اور کیا توقع کی جا سکتی تھی ۔ اور انہوں نے اس ڈرامے کو پھر سے سنانے کی فرمائش کی ہے ۔ آگے چل کر یہ لکھتی ہیں ڈاکٹر چورن داس خطرۂ جاں کا افسانہ "۱۶۰ سال کا بوڑھا" بہت پسند آیا ۔ فاضل مصنف نے جس اچھوتے اور نرالے ڈھنگ سے کہانی کے ہیرو کو زہر کی جگہ ایک چٹکی چورن سے مروا ڈالا ہے یہ ان ہی کا خاصہ ہے ۔ ان تک ہماری مبارکباد پہنچا دیجئے ۔"

بہن سارنگ جیسی صاحبہ ! ۔ آپ کو بیرنگ کے سب ہی پروگرام پسند آتے ہیں ۔ یہ ہمارے لئے "عرقِ زندگی" کا ایک ڈوز ہے ۔ آپ نے مشرف امیدی کے ڈرامے "تان سین کا الکٹرک گٹار" کو جس زاویے سے دیکھا ہے شاید کسی نے دیکھا ہو ۔ آپ کی خواہش سر آنکھوں پر ۔ ہم نے آج ہی اس کی تکمیل کر دی ہے ۔ اگر آپ نے ہمارا پروگرام "پھر سے چھینئے" سنا ہو تو محظوظ ہوئی ہوں گی ۔ افسانہ "۱۶۰ سال کا بوڑھا" کے مصنف ڈاکٹر چورن داس خطرۂ جاں تک بھی آپ کی مبارکباد پہنچا دی جائے گی ۔ میں یہاں پھر ایک بار کہوں گا بہن ! کہ آپ نے بیشک اس افسانہ کا صحیح تجزیہ کیا ہے ۔ یہ افسانہ ادبی دنیا میں ایک نیا تجربہ ہے ۔ اس زمانے میں جبکہ ہر چیز پر مہنگائی کی چھاپ پڑی ہوئی ہے ۔ ایسے میں "زہر خریدنا" ہر ایک کے بس کی بات نہیں ۔ ہمیں اُمید ہے کہ فاضل مصنف کی اس اچھوتی تکنیک پر غور کرتے ہوئے لوگ خودکشی کرنے کے لئے ان کا چورن "ہاضمہ" استعمال کریں گے ۔"

"جمن صاحب ! گھڑی پر نظر دوڑائیے ۔ پروگرام ختم ہونے میں ابھی پانچ منٹ باقی ہیں اور ہمارے پاس کوئی خط نہیں ۔"

"ٹھیک ہے ! کوئی فلمی گانا بجوا دیجئے ۔"

"میں اجازت چاہوں گا ۔ خدا حافظ ۔"

"خدا حافظ ۔"

مضامین صاف اور خوشخط ، صفحہ کی ایک ہی جانب لکھے جائیں



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی

اتحاد اور یک جہتی وقت کی اہم ضرورت ہے

ہمارا ملک مختلف مذاہب، رنگ و نسل اور زبانوں کا گہوارہ ہے۔
اس کی رنگا رنگی اور دل کشی نے اسے ایک گلستان کا روپ دیا ہے۔
اپنے گلشن کی حفاظت کے لئے اتحاد و یک جہتی کی شدید ضرورت ہے۔

اشوک و اکبر، نانک و گاندھی اور نہرو کے ہندوستان میں مذہب، زبان اور صوبے کے نام پر پُرتشدد واقعات اور امن عامہ میں معمولی خلل ہم سب کے لئے معاشی تباہی لاتا ہے۔ ہماری ریاست آندھرا پردیش، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور اتحاد کے لئے سارے ملک میں مثالی رہی ہے۔

- تمام مذاہب اور مقدس عبادت گاہوں کا احترام کیجئے۔
- تمام تہواروں اور عیدوں کو مل جل کر منایئے۔
- سماجی مساوات اور ترقی کے لئے متحد ہو کر آگے بڑھئے۔



چیف منسٹر شری ٹی انجیا

وائف اپ ٹو ڈیٹ

سکندر عرفان ایم۔اے
(کھنڈوہ)

(نظم "ہائے میری قسمت" کے خالق سے معذرت کے ساتھ)

ہائے میری قسمت میں تھی وائف اپ ٹو ڈیٹ
پھول سے نازک سمجھے جس کا ہنڈرڈ کے جی ویٹ

کرتی بل باٹم پہن کر بنتی ہے اسمارٹ — چلتی ہے تو لگتی جیسے ٹو وھیلر کارٹ
میرا دل ہے موم کی ٹکیہ وہ ہے لیڈن ہارٹ — بات بات پر چلا کر وہ کر دیگی رونا اسٹارٹ
مجھ کو ہے افسوس کہ پائی ایسی لائف میٹ
ہائے میری قسمت میں تھی وائف اپ ٹو ڈیٹ

یارو میں تعریف کروں کیا وہ ہے میری لاٹ — آئینہ کو کیمرہ سمجھے ہر حرکت کو شاٹ
محلہ بھر میں خوب دکھائے بھونڈے حسن کے ٹھاٹ — میں ہوں جتنا کول ہے نیچر اتنا اس کا ہاٹ
ہیوی ڈش کھا کر بھی یارو بھرے نہ اس کا پیٹ
ہائے میری قسمت میں تھی وائف اپ ٹو ڈیٹ

مطلب ہو تو خوب دکھائے جیسے پریم اٹوٹ — مانگوں میں جو ساکس تو فوراً حاضر کردے بوٹ
پھول کے کپّہ ہو جائے گی کردوں میں گر سیلوٹ — ہنسی اڑائے جب میں پہنوں ہنا پریس کا سوٹ
جب بھی اس سے پیار کروں تو کریگی مجھ کو ہیٹ
ہائے میری قسمت میں تھی وائف اپ ٹو ڈیٹ

چہرہ ہے جذبات سے عاری جیسے خشک ببول — پوت کے اسنو پاؤڈر سمجھے خود کو سندر فول
گھر کی ہر تصویر پہ جب جب جم جائے گی دھول — کہے گی ایسے گندے گھر میں رہنا اب ہے فضول
ان مسئلوں میں الجھ الجھ کر پہنچوں آفس لیٹ
ہائے میری قسمت میں تھی وائف اپ ٹو ڈیٹ

بشرٹ ہاف آستین کا پہنے سر پر باندھے ٹائی — بال کٹا کے مردوں میں وہ شامل ہونے آئی
اس سے شادی کر کے میں نے کیسی سزا ہے پائی — میں ہوں اسکی بیوی جیسے وہ شوہر ہرجائی
میں ہوں دُبلا پتلا لیکن وہ ہے بھینس کی مانند فیٹ
ہائے میری قسمت میں تھی وائف اپ ٹو ڈیٹ

ست رنگی تصویر کہوں یا قدرت کی تعمیر کہوں — اس کے حسن کو ان دیکھے خوابوں کی تعبیر کہوں
ہنسی کو اس کی پت جھڑ کے موسم کی تقدیر کہوں — اس کی کالی زلفوں کو اپنے پیروں کی زنجیر کہوں
وی آئی پی میں کہوں اسے یا ویری ویری گریٹ
ہائے میری قسمت میں تھی وائف اپ ٹو ڈیٹ

شکیل اعجاز
اکولہ

سوم ہوٹنگ

ٹرین میں بے پناہ رش تھا۔ جگہ ملنی جتنی ضروری تھی اتنی ہی مشکل بھی تھی۔ ہمارے ساتھ ایک پہلوان تھے جو ابھی ابھی شاعر ہوئے تھے اس لئے نزاکتوں اور شرافتوں سے مستثنیٰ تھے۔ انھوں نے اندر جھانک کر دیکھا کہ موٹی توند والے پانچ آدمی ٹرانسسٹر۔ تھرماس۔ چھاگل۔ تکیہ بستر اور دوسری چیزوں سے لیس ایک برتھ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پہلوان کسی طرح ان کے پاس پہونچے اور ان کے لیڈر کے (جو سب سے زیادہ موٹا تھا) کان میں کہا "اس گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہونے والا ہے۔ آگے اس کی پٹریاں اُکھاڑ دی گئی ہیں۔" موٹے نے اپنی شطرنجی کو دھیرے دھیرے سمیٹنا شروع کیا۔ اِدھر پہلوان نے اپنی چادر پھیلانی شروع کی۔ آخر وہ سب شطرنجی اٹھا کر کھڑے ہو گئے اور یہ چادر بچھا کر لیٹ گئے۔ بعد میں ہم لوگوں کو آواز دے دی۔ جب ٹرین چلنے لگی تو ہم نے دیکھا کہ وہ پانچوں موٹے سر پکڑے ہوئے پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سفر طویل تھا۔ وقت گزاری کے لئے باتیں کرنا ضروری تھا۔ سیاسی باتیں کرتے تو پتہ نہیں کس طرف سے کونسی پارٹی کا آدمی چپّل عنایت کر دیتا۔ داداگری کی باتوں سے شاعروں کو دلچسپی نہیں ہوتی (داداگری نہیں کر سکتے تھے تبھی تو مجبوراً شاعر بنے ہیں) فلموں کے بارے میں آدمی اپنے دوستوں میں خوب بولتا ہے لیکن اجنبی لوگوں کے سامنے اس کے ذکر سے وقار کم ہوتا ہے۔ آخر یہ طے پایا کہ کچھ پتہ اپنے دوستوں اور شاعروں کا تذکرہ ہو۔ تذکرہ شروع ہوا۔ نامور شعراء کو نالائق قرار دیا گیا کہ انھوں نے خود کو چھپوا چھپوا کر خواہ مخواہ مشہور کر لیا۔ گمناموں کو اس لئے بے وقوف کہا گیا کہ وہ بھی ذرا کوشش کرتے تو نامور ہو سکتے تھے۔ شروع کے دو تین گھنٹوں میں بات چیت

کے دوران کبھی کبھی چاء بھی پی لیا کرتے تھے ۔ بعد میں صرف چاء پیتے رہے درمیان میں کبھی کبھی بات کر لیتے ۔

ہرن پور اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہی شاعروں کے مزاج بہت نازک ہو گئے ۔ شاعروں کی ایک خاص بات ہے ۔ ان کے محلہ کا دوکاندار انھیں کتنی ہی بار جھڑکیاں دے ، بُرا نہیں مانیں گے ۔ کسی نو وارد کے سامنے بچے ان کی پول کھول دیں ، کچھ نہیں کہیں گے ۔ شاعر کے محلہ اور گھر میں سب سے بے ضرر چیز جو ہوتی ہے وہ خود شاعر ہے ۔ لیکن یہی شاعر جب کسی مشاعرہ میں شریک ہوتا ہے تو اپنے آپ کو وزیر اعظم سے اہم سمجھنے لگتا ہے (ویسے مشاعرہ کمیٹی کو شاعروں کے ناز اُٹھانے میں فیاضی سے کام لینا چاہیئے کیونکہ یہی تو واحد موقع ہوتا ہے جب چند لوگ ان کے آس پاس منڈلاتے اور انھیں اہمیت دیتے ہیں) پلیٹ فارم پر اُتر کر شعراء نے اپنے چہروں پر سنجیدگی کے تاثرات پیدا کر لئے اور غصہ طاری کر لیا ۔ اب انتظار کر رہے ہیں کہ کوئی آئے اور معذرت کر کے ان کے ہاتھوں سے عمدہ سوٹ کیس (پڑوسیوں اور دوستوں سے کسی طرح ہتھیائے ہوئے) لے کر قیام گاہ لیجائے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا ۔ تمام لوگ جا چکے تو ٹکٹ چیکر ہماری طرف بڑھا ہم لوگوں نے واقعی اُسے ٹکٹ دے دیئے تو وہ حیرت زدہ ہو کر دور تک ہمیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا ۔ باہر نکل کر سب سے مہنگی ٹیکسی کرائے پر لی ۔ (نجی کام سے آئے ہوتے تو پیدل ہی جاتے) اور قیام گاہ پہونچے ۔ پھاٹک پر ایک آدمی ہم سے سوٹ کیس لینے لگا ۔ موقع دیکھ کر تمام شعراء اس پر برس پڑے

" حد ہوتی ہے لاپرواہی کی ۔ اسٹیشن پر کوئی ریسیو کرنے بھی نہیں آیا ۔۔۔
چلئے اس ٹیکسی کے پیسے دیجئے "

وہ نہ جانے کیا کہنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اُسے ٹیکسی ڈرائیور کے حوالے کر اپنے اپنے کمروں میں آ گئے ۔۔

قیام گاہ ایک سرکاری گیسٹ ہاؤس تھا ۔ اس لئے سب خوش تھے ۔ باتوں میں لگے تھے کہ ایک صاحب نمودار ہوئے بڑی خوش اخلاقی سے انھیں بٹھایا گیا ۔ ہر شاعر یہ سمجھ رہا تھا کہ نو وارد میرا فین (مدّاح) ہے ۔ باتوں باتوں میں جیسے ہی معلوم ہوا کہ وہ مشاعرہ کمیٹی کا صدر ہے تو اچانک رویئے بدل گئے ۔ وہ بیچارہ اپنا گنجہ سر سہلاتا ہوا چلا گیا ۔ خوش گپیاں دوبارہ شروع ہوئیں لیکن اب ان کا رُخ دھیرے دھیرے منتظمین کی " نااہلی " اور خود کی " ہاں اہلی " کی طرف ہو گیا ۔ کیونکہ شام کے سات بجنے کو آئے تھے اور ابھی تک کھانے کا کوئی بندوبست نہیں ہوا تھا ۔ ایک میزبان نے پوچھا " آپ لوگ چاء پیئں گے " شاعروں نے جواب دیا کہ صبح سے چاء ہی تو پی رہے ہیں ۔ شام میں ۸ بجے یہ معلوم ہوا کہ شعراء حضرات اپنے اپنے پیسوں سے کھانا کھالیں بعد میں یکمشت رقم دے دی جائے گی ۔ اس خبر سے فوج میں بھگدڑ مچ گئی ۔

" ایسا تو زندگی بھر میں نہیں ہوا کہ مشاعرے میں شرکت کریں اور خود کے پیسوں سے کھانا کھائیں "
" اور خود کے پیسے بھی کہاں ہیں ۔ بس ایک طرف کا کرایہ لے کر چلے تھے "
" آج ہم مشاعرہ نہیں پڑھیں گے "
" آج ہم کھانا نہیں کھائیں گے "
" آج ہم سب سو جائیں گے "
" آج ہم سب جاگتے رہیں گے "

سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے ۔ ایسے موقع پر کسی ایک بھی آدمی کا کھانا کھا لینا ۔ اپنی فوج سے غداری کرنے

کے مترادف تھا۔ لیکن ہمارے ساتھ جو پہلوان تھے ان سے کسی طرح برداشت نہ ہوا۔ انھوں نے ہمیں اپنے ساتھ لیا۔ چپلیں ہاتھوں میں لیں اور دبے پاؤں گیسٹ ہاؤس کے کینٹین کی طرف چلے۔ اندر قدم رکھتے ہی اُلٹے پاؤں واپس بھاگے اور ہم سے ٹکرا گئے۔ دراصل شعراء پہلے ہی کینٹین میں موجود تھے۔ پہلوان نے ہم سے کہا " یہ تو بہت بُرا ہوا۔ انھوں نے مجھے دیکھ لیا"

ہم نے کہا " اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ کہئے کہ ان ہی کو دیکھنے آئے ہیں "

انھوں نے خوش ہو کر ہماری گردن پر ایک ہاتھ مارا (گردن کا ایکس رے کروانا ہے) پھر چہک کر بولے " زندگی میں تمہارا کسی آدمی سے جھگڑا ہو تو ہمیں بتانا "

" کیوں ؟ " آپ اس پر ہزل لکھیں گے۔

" نہیں ! سالے کو اٹھا کر پٹک دوں گا "

اُٹھا کر پٹکنے کی بات سُن کر ہم تو سیدھے کینٹین کے اندر بھاگے اور پہلوان باورچی خانہ میں۔

کھا چکنے کے بعد ایک بڑے ہال میں جمع ہوئے اور ایک دوسرے کو غزلیں سُنانے لگے۔

ہم کسی کام سے باہر نکلے تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ اچانک ایک پولیس انسپکٹر ہاتھ میں رول اور بیلٹ میں پستول لگائے اسی طرف آتا دکھائی دیا۔ قریب آکر پوچھا " اے۔ وہ آج رات میں جو لوگ گجل (غزل) گایئں گا، ان کا آرکسٹرا کدھر ہے ؟ " ہم نے ہال کی طرف اشارہ کر دیا اور کھسکنے ہی کو تھے کہ وہ ہماری کالر پکڑ کر بولا " تم بھی گجل گاتا ہے "

عرض کیا " نہیں صاحب! جس کی چاہو قسم کھلا لو۔ زندگی میں آج تک ہم نے ایک بھی غزل نہیں گائی (اس کی صورت پر غصّہ دیکھ کر) آپ ہمارا کیرکٹر سرٹیفکیٹ دیکھ سکتے ہیں ؟ "

وہ ہمیں چھوڑ کر ہال میں پہونچا اور کڑک کر بولا " اے۔ چلو "

دلدار خاں بےؔ دل جو شاعروں کی اس عارضی اسوسی ایشن کے صدر بنے ہوئے تھے ہکلاتے ہوئے بولے " ک۔ ک ۔ک کہاں ؟ "

" بڑا صاب بلاتا ہے "

" ک۔ ک۔ کیوں ؟ "

کیوں کا جواب وہیں ملے گا۔ چلتے ہو یا .... (پستول نکال لی)

چند منٹ میں سب تیار ہوئے۔ آگے آگے پولیس، پیچھے پیچھے شعراء درمیان میں کہیں ہم۔ گیسٹ ہاؤس کی گیٹ پر ایک پولیس وین اور دس پندرہ مسلح پولیس جوان موجود تھے۔ انسپکٹر نے وین میں بیٹھنے کو کہا۔ بات اس حد تک بڑھ جائے گی، یہ امید نہ تھی۔ چنانچہ ایک صاحب ہمّت کر کے آگے بڑھے ۔۔۔ اا خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہنس ہنس کر کہنے لگے " انسپکٹر صاحب اس کی کیا ضرورت تھی ۔۔۔ آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیا ۔۔۔ آپ اسے لے جائیے ہم پہونچتے ہیں "

جواب میں ایک ہوائی فائر ہوا اور سب لوگ وین میں بیٹھ گئے۔ دروازہ بند کرتے ہوئے انسپکٹر نے کہا " تم لوگ کا حفاظت کے واسطے اپن گاڑی لایا۔ باہر سینکڑوں آدمی کھڑا ہے۔ ادھر جائیں گا تو چٹنی بنائیں گے

اب شاعروں کی صورت پر اطمینان جھلکنے لگا۔ ایک نوجوان شاعر زیادہ بے چین نظر آرہے تھے۔ انھوں نے ایک تجویز رکھی کہ مشاعرہ گاہ پہونچنے تک کیوں نہ ایک نشست اسی وین میں ہوجائے۔ تجویز منظور ہوئی۔ سب نے واہ واہ کی (انسپکٹر نے غصہ سے پلٹ کر دیکھا) ایک بزرگ شاعر نے اپنی غزل کا مطلع عنایت کیا اور واہ واہ کا شور بلند ہوا۔ انسپکٹر نے دھاڑ کر کہا۔

"اے، خاموش، چپ چاپ بیٹھنا منگتا"

"کیا منگتا ؟"

"سائیلنٹ بیٹھو۔ نہیں تو آنسو گیس پھینکے گا۔ لاٹھی چارج کرے گا"

اب کی دفعہ سب ایسے خاموش ہوئے کہ ڈر کے مارے دَم کھینچ کر بیٹھ گئے۔ سانس لینے کی بھی آواز نہیں آرہی تھی۔ پولیس ہی کی نگرانی میں ڈائس پر پہونچے تو اصل معاملہ سمجھ میں آیا کہ دراصل آج "یوم ہوٹنگ" منایا جارہا ہے۔ ہرن پور کی ایک مخالف مشاعرہ کمیٹی نے منظم طریقے سے ہوٹنگ کا بندوبست کیا ہے (مشاعرہ کمیٹی آخر ہوئی کس لئے ہے؟) ڈائس کے سامنے تین طرف ان کے آدمی بکھرے ہوئے تھے۔ جو نمک میں آٹے کے برابر تھے۔ مختلف مقامات پر ٹوکریاں بھی نظر آئیں۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ان میں ٹماٹر انڈے ہے۔ چپلیں اور ہوٹنگ کی دوسری "ضروریات" رکھی ہیں۔ شاعروں کے امتحان کا وقت تھا۔ صدر مشاعرہ نے اپنی تقریر میں شاعروں سے مخاطب ہوکر کہا کہ "یہی وقت ہے۔ آپ لوگوں کی آزمائش اور امتحان کا۔ آج جو شاعر اس میں سے کامیاب نکل گیا سمجھو کہ وہ زندگی بھر کسی مشاعرے میں شکست کا منہ نہیں دیکھے گا"

"اور جو ڈر گیا ـــ سمجھو مرگیا" سامعین میں سے ایک نے کہا۔

شروع میں دو تین شاعر تو خوش نصیبی سے اچھی طرح گزر گئے۔

(اس دن کامیابی یہی تھی کہ کوئی داد نہ دے۔ کوئی واہ واہ نہ ہو)

لیکن چوتھے صاحب کی باری آئی تو گڑبڑ شروع ہوگئی۔ اس کے بعد سے شاعروں اور سامعین میں جو "گفتگو" ہوئی۔ وہ ملاحظہ کیجئے:

شاعر : عرض کیا ہے کہ ع تیری دنیا سے میں اک روز چلا جاؤں گا۔

سامعین : اک روز نہیں۔ ابھی جائیے۔

: آپ کو آنے کے لئے کس نے کہا تھا ؟

ایک بزرگ شاعر شیروانی سمیت تشریف لائے۔

شاعر : ع رات ، مئے کشی اور وہ

سامعین : آپ کو شرم آنی چاہیئے۔ اس عمر میں بھی لفنگا پن کرتے ہیں۔

: مئے کشی کا پرمٹ کہاں ہے ؟

: 'وہ' کون ہے ؟

پھر ایک صاحب جو اپنے آپ کو ماہر نفسیات سمجھتے تھے مائک پر تشریف لائے اور لوگوں کو حد درجہ ناراض دیکھ کر دھیمے لہجے میں فرمایا :

شاعر : عزیزو اور دوستو!
سامعین : یہاں ہم آپ کے دوست نہیں ہیں۔
شاعر : آپ میری ایک بات سُنیئے۔
سامعین : پہلے آپ ہماری ایک بات سنئے۔
شاعر : سُنایئے۔
سامعین : آپ اُتر کر چلے جایئے۔
شاعر : دیکھئے آپ ہمارے مہمان ہیں۔ میرا مطلب ہے ہم آپ کے مہمان ہیں اور ....
سامعین : آپ بن بُلائے مہمان ہیں۔
جانتے ہیں یا مہمان نوازی کریں۔
(پھر کہیں سے دو تین ٹماٹر اور انڈے حملہ آور ہوئے)
وہ مائک چھوڑ کر واپس آئے اور بولے۔
"بہت ہی واہیات شہر ہے جی یہ تو"

اس دوران اناؤنسر نے ایک کاغذ پہ تمام شعراء کے نام اور ایک جملہ تحریر کیا کہ وہ جراءت مند حضرات جو اس حوصلہ شکن ماحول میں بھی پڑھنے کی جسارت کر سکتے ہوں اپنے نام کے سامنے صحیح (✓) کا نشان لگا دیں۔ ہماری بغل میں بیٹھے ہوئے ایک شاعر کہنے لگے، "قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں مشاعرے میں شرکت کروں اور غزل نہ پڑھوں تو مجھے ٹائیفائیڈ ہو جاتا ہے۔"

—— "اجی ہمارا معاملہ تو اس سے بھی بدتر ہے۔ مشاعرے کی دعوت ملے اور ہم شرکت نہ کریں تو انفلوائنزا ہو جاتا ہے۔"

(کسی شاعر کے محلہ میں مشاعرہ ہو اور اس کو دعوت ہی نہ ملے تو خدا جانے اس کا کیا حشر ہوتا ہوگا)

"جناب آپ تو مشاعرہ گاہ تشریف لا چکے ہیں اس لئے انفلوائنزا کا خطرہ ٹل گیا۔
"لیکن ہمارے ٹائیفائیڈ کے بارے میں تو سوچیئے؟"
"دیکھئے قبلہ! میری رائے میں تو ٹائیفائیڈ کے سامنے دو تین ٹماٹر اور انڈوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس لئے آپ صحیح (✓) کا نشان لگا دیجئے۔"

انھوں نے ایسا ہی کیا۔ غزل پڑھی اور کچھ سرخ رو (ٹماٹر کی وجہ سے) اور کچھ رُوسیاہ (انڈوں اور چپلوں کی وجہ سے) واپس چلے آئے۔ بالآخر صرف ڈیڑھ گھنٹوں میں یہ "عظیم الشان آل انڈیا مشاعرہ" اختتام کو پہونچا۔ شاعروں کو پولیس کی نگرانی میں گیسٹ ہاؤس پہونچا دیا گیا۔ اول تو سب اپنے اپنے کمروں میں جا کر لیٹ گئے لیکن تھوڑی دیر بعد ایک ایک کر کے اُسی طرح اُٹھنے لگے جس طرح بچّے رات میں ڈر ڈر کے اُٹھتے ہیں۔ رات کے تین بجے ہال میں جمگھٹا ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ غزلیں نہ سنا سکنے کی وجہ سے سب کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ ایک نے دوسرے سے کہا
"میری ایک غزل سُنو!"

اس نے جواب دیا : " اجی میں خود آدھ گھنٹے سے اپنی غزل سنانے کے لئے مارا مارا پھر رہا ہوں ۔
اور آپ کہتے ہیں میری (میری پر جھٹکا) غزل سنو ــــ واہ !

دھیرے دھیرے بھنبھناہٹ بڑھنے لگی اور شور کی شکل اختیار کر گئی ۔ سب کے ہاتھوں میں ایک ایک ڈائری تھی اچانک ایک بیوپاری قسم کے شاعر نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور بولا " ایک غزل سننے کے پانچ روپے دونگا ــــ پانچ روپے ــــ "

پھر ہر شاعر نے پانچ کی نوٹ نکال لی ۔ پہلے شاعر نے اب کی دفعہ دس کی نوٹ نکالی ۔ تمام شعراء کے ہاتھوں میں بھی دس کی نوٹیں نظر آنے لگیں ۔ کوئی کسی کے دس روپے لینے کو تیار نہ تھا ۔ شاعروں کو اتنا آسودہ حال اور فراخ دل ہم نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا ۔ پھر ہوا کہ اس کمبخت چالاک بیوپاری شاعر نے محسوس کیا کہ اس جمگھٹ میں ایک شخص ایسا بھی ہے جس کے ہاتھ میں نہ ڈائری ہے نہ دس کی نوٹ ہے ۔ معلوم ہوا کہ وہ ہم ہیں ۔ سب کی نظریں ہم پر پڑیں ۔ ہم سمجھ گئے کہ اب یہ غزلیں سُنا سُنا کر ادھ مُوا کر دیں گے ۔ ہم فوراً ہال سے باہر نکلے اور جدھر جی میں آیا بھاگنا شروع کر دیا ۔ ہمارے پیچھے تمام لوگ ہاتھوں میں ڈائری اور دس کی نوٹ لئے دوڑے آرہے تھے ۔ اس دن بھاگتے بھاگتے ہم نے سارے گیسٹ ہاؤس کے کئی چکر لگا ڈالے ۔ کبھی پہلے منزلہ پر کبھی آخری منزل پر ۔ دس پندرہ منٹ بعد اندازہ ہوا کہ آدھے لوگ تو کہیں ادھر ادھر گر کر ، تھک کر پڑے ہوئے ہیں ۔ (گرے ہوؤں کا بھی ایک ہاتھ اونچا تھا جس میں دس کی نوٹ تھی) بہرحال ہم بھی بُری طرح تھک گئے تھے ۔ دوڑتے دوڑتے ایک بار جو پاؤں پھسلا تو سیڑھیوں سے لڑھکتے ہوئے نیچے چلے گئے ۔ پھر ایسا لگا کہ بے ہوشی طاری ہو رہی ہے ۔

جب ہوش آیا تو کوئی کہہ رہا تھا " اُٹھو وہ بُلا رہے ہیں ! "
ہم نے ہاتھوں سے اپنا مُنہ چھپایا اور گھبرا کر کہا :
" کوئی شاعر ہوں تو کہہ دینا نہیں ہیں ! "

اٹھانے والے نے زوردار طمانچہ رسید کر دیا ۔ آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہم اپنے گھر میں اور امی ہمیں جگا رہی ہیں ۔ بولیں " پاگل ہوئے ہو ، تمہارے ابا جان بلا رہے ہیں ۔
اب مشکل یہ تھی کہ ہمارے ابا جان بھی شاعر ہیں ۔

●●

مختار یونس (مالیگاؤں)

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

شاعرِ مشرق نے کہا ہے "نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے" تو ہوا کریں۔ مگر ہمیں تو بے حد مرغوب ہیں۔ بے حد لذیذ ہیں۔ ہم انھیں اپنی گلی سے باہر کیوں پھینکیں۔ ترقی کے وٹامن ضائع کیوں کریں۔ یورپ و امریکہ کے پولٹری فارم کے ممتاز کا انڈے ہیں۔ ایشیاء و افریقہ کے گرم ممالک کی طرف جب پھینکے گئے تو کچھ ہم نے کیچ کر لئے اور جو چھوٹ کر پھوٹ گئے آملیٹ بن گئے۔ کتنے کار آمد انڈے ہم نے درآمد کئے ہیں۔ ہم اپنا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہماری مشرقی تہذیب تو باجی پالا ہے۔ بے لذت، بدذائقہ اور دیر ہضم۔ انسان میں جراثیم پیدا کرتی ہے۔ مذہب و اخلاق سے محروم کرتی ہے۔ گناہِ صغیرہ و کبیرہ سے جکڑ دیتی ہے۔ شرم و حیا میں اور اسی لئے اہلِ مشرق صدیوں سے دردِ انسانیت میں گرفتار رہیں۔ مریضِ مشرق کا واحد علاج ہے انڈے۔ گندے انڈے۔ یورو پین مرغی کے ٹیکنی کلر انڈے۔

ہم نے نئی تہذیب کو امپورٹ کیا ہے۔ کون کہتا ہے ہم عقل سے کورے ہیں۔ ہم عقل سے گورے ہیں اور اہلِ مغرب شکل سے گورے ہیں۔ مغربی تہذیب میں حسن ہے بے باکی ہے۔ آزادی ہے۔ مشرق کے ماہرینِ آثار قدیمہ کہتے ہیں۔ مغربی تمدن میں خاندان تباہ ہوگیا۔ گھر کا سکون برباد ہوگیا۔ نائٹ کلب آباد ہوگیا۔ تو اس میں ناک بھوں چڑھانے کی کیا بات ہے۔ ان کی شاہانہ زندگی سے تم جلتے ہو۔ وہ لوگ کار میں ہیں اور تم بے کار ہو۔ وہ لوگ آسمان میں طیارے اڑاتے ہیں۔ اور تم زمین پر بے پر کی اڑاتے ہو۔ وہ لوگ کپڑے سے آزاد ہیں۔ کیونکہ کپڑے سے آزادی اُن کا پیدائشی حق ہے۔ چھری کانٹے سے کھانے والے اتنے نفاست پسند ہیں کہ منہ دھوئے بغیر بیڈ ٹی نوش کرتے ہیں۔ اسنو، غازہ، لپ اسٹک سے حسین بننے کا فن وہ لوگ جانتے ہیں۔ پلاسٹک سرجری سے جھریاں غائب کر کے بڑھاپے کو بھگانے کا ہنر انھیں آتا ہے۔

مشرق کے رہنے والے اگر چاٹے پان اور بیڑی کے رسیا ہیں تو وہ شراب و شباب و کباب میں ابرکہ ہیں۔ کتنا اعلیٰ معیارِ زندگی ہے ان کا! وہاں مائیں بچوں کو بوتلوں اور ڈبوں کے حیوانی دودھ سے ہیلتھی بناتی ہیں۔ وہاں بچوں کو شہد چٹانا قدامت پرستی ہے اور ولایتی شراب میں نہلانا فیشن پرستی۔ مشرقی باشندے ٹیوشن فیس بچانے کے لئے ماں کی گود کو مدرسہ قرار دیتے ہیں۔ وہاں نرسری کے جی اور مونٹیسری کی لالچ کو ٹریننگ اسکول سمجھا جاتا ہے۔ کتنے گریٹ لوگ ہیں وہ!

اس نئی تہذیب کا ضابطہ ہے۔ آدم برابر حوّا۔ male = female یعنی مرد اور عورت دونوں آزادی

اور مساوات کے سوئمنگ پول میں ڈبکیاں لگا رہے ہیں۔ وہ دن ہوا ہوئے جب عورت کو وزیر داخلہ کہہ کر گھر میں قید کر دیا جاتا تھا۔ پردے کے حوالات میں بند کر دیا جاتا تھا اب تو نئی تہذیب نے دُختر کو دفتر میں ٹائپ رائٹر پر بٹھا دیا ہے وہ شوہر کے علاوہ دوسروں کی آنکھ کا بھی تارہ ہے وہ شاپنگ کرتی ہے۔ کیونکہ دوکاندار مردوں کو ٹھگ لیا کرتے ہیں۔ وہ ملکۂ حُسن ہے۔ فلم ایکٹریس ہے۔ سیلز گرل ہے۔ ماڈل گرل ہے تاکہ دنیا اس کے حُسن کی قائل ہو جائے۔

یہ نئی تہذیب جوانی کی ساتھی ہے۔ بچوں اور بوڑھوں کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ بچے ماں باپ کے ہوتے ہوئے یتیم و یسیر ہوتے ہیں اور بوڑھے سائبیریا کے برفستان میں اسیر ہوتے ہیں۔ یورپ و امریکہ کا بڑھاپا تنہائی کا شکار ہے۔ بیٹے گرل فرینڈ کے ساتھ گھوم رہے ہیں۔ اور بیٹیاں بوائے فرینڈ بدل رہی ہیں۔ دونوں ماں باپ کو یہ سبق دے رہے ہیں کہ تم نے بھی تو ہمیں بچپن میں آیاؤں کے حوالے کر دیا تھا۔

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ مغربی تمدن ایشیا و افریقہ پر قدم جما رہا ہے۔ ہپی ازم اور فیشن فلموں کی معرفت دیار مشرق میں داخل ہو چکے ہیں۔ قتل و گناہ، بے حیائی و عریانی، چوری اور ڈکیتی کی نئی ٹیکنک ہمارے معاشرے میں وارد ہو چکی ہے ہمارے دیش سے انگریز چلے گئے کوٹ پتلون چھوڑ گئے۔ ہماری دولت لے گئے اپنی زبان چھوڑ گئے۔ ہمارا علم لے گئے اپنی فلم چھوڑ گئے۔ نئی تہذیب کے کارناموں کو دیکھ کر آج شیطان ریٹائرڈ ہو گیا ہے۔ بائیں کاندھے پر سوار فرشتہ گناہوں کے خاص نمبر نکال رہا ہے۔ اور دائیں ہاتھ کا فرشتہ بے روزگاری کے دن گذار رہا ہے۔ نیکیاں گوشہ نشین ہو گئی ہیں۔ بُرائیاں کبڈی کھیل رہی ہیں۔ نئی تہذیب کے گندے انڈے گول پر گول کئے جا رہے ہیں اور ہم امپائر بنے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔

--

ویریندر پٹواری (جموں)

طاقت

طاقت ! ــــ صاحب لگتا ہے آپ ہندوستان میں نہیں رہتے ہیں ۔ ورنہ ! ــــ خیر، سُنیئے صاحب یہ وہ طاقت ہے جو دانشمندوں کو بھی اُلّو بنا دیتی ہے ۔ ہمارے ملک کے ۸۰ فیصدی لوگ تو اُلّو ہیں ہی ــــ کمال ہے آپ پبلسٹی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ! آج کل کے زمانے میں ہر چیز پبلسٹی کے بل بوتے پر ہی تو چلتی ہے ــــ ! صاحب یہ وہ میڈیم ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے ہی نہیں ۔ بس جیسے کہا گیا ہے ویسا کرو ــــ ! یعنی ــــ رُکو ــــ دیکھو اور پھر ناک کی سیدھ میں چلو ــــ جی ہاں ــ جی ہاں ! یہ کون سی نئی بات کی آپ نے ــــ واقعی پبلسٹی نام کی ہوتی ہے ــــ ظاہر ہے معذور ٹانگیں نام کی قوت سے دوڑتی نظر آتی ہیں ۔ جی ہاں نظر ہی تو آنی چاہیئے ورنہ اگر مٹی کا تیل بند بوتلوں میں سفید سفید کریم نہیں نظر آئے تو بھلا کون استعمال کرے گا ــــ آئیے میں آپ کو اپنے اسٹوڈیو لیے چلتا ہوں ۔ جی ہاں، پبلسٹی کے چند نمونے دِکھانے کے لئے ــــ !

'یہ دیکھئے فلمی ستاروں کی من پسند صابن' ــــ سوچئے ذرا اگر ان کی جلد ملائم ہے تو آپ کی چمڑی بھی تر و تازہ رہ سکتی ہے ۔

یہ تیل لگا کر اگر ٹیسٹ میچ جیتا جا سکتا ہے تو بھلا آپ کا لڑکا کرکٹ کھیلنا تو سیکھے گا ــــ !

یہ بلیڈ استعمال کر کے آپ کو بھی ہوائی جہاز کا ٹکٹ مل سکتا ہے ــــ دیکھئے اس میں مسکرانے والی کوئی بات نہیں ہے ۔

یہ بچہ ــ جی ہاں ہے نا خوبصورت ــ ! یہ آپ کا بچہ بھی ہو سکتا ہے ــ چھوڑیئے صاحب دام نہیں پوچھتے ہیں ــــ ــــ وہ بھلا ہم کیسے جانیں ــــ ارے، ارے ! ذرا بچ کے ــ یہ تصویر گیلی ہے ــ جی ہاں ! رنگ سوکھ جائے گا تو پرانی تحریر نظر نہیں آئے گی ــ ۱۹۷۷ء کی تصویر تھی ــ اب نئے رنگوں سے رنگ دیا ہے اس تصویر کو ــــ ہے نا سحر انگیز تصویر ــــ اب آپ بتائیے کیا یہ رنگ دیکھ کر سیاست کا نیا رنگ نہیں دیکھا جا سکتا ــ ؟ لیکن سمجھا نہیں جائے گا ہے نا ــ ! ــ یہ تصویر ــ جی ہاں خوب پہچانا آپ نے ــ ان ایکٹر لوگوں کو کون نہیں پہچان لیتا ۔ صاحب پبلسٹی نہ ہو تو کون کس کو پہچانے ــــ ہا ۔ ہا ۔ ہا ــ فلم کا نام ڈھونڈ رہے ہیں آپ ــ وہ دیکھیں ــ اُس کونے میں لکھا ہے ۔ اجی صاحب فلم کا نام کون دیکھتا ہے ۔ سبھی اسٹار کو دیکھتے ہیں ۔ بس اسٹار کو لے کر تو فلم بن گئی ہے اور اب دیکھئے چلے گی بھی ــ یہ تو آپ مان لیتے ہیں نا ــ ! بس یہی پبلسٹی کا کرشمہ ہے ــ اور

یہ کرشمہ ایک طاقت ہے — طاقت - بہت بڑی طاقت — !

ارے کس سوچ میں پڑ گئے آپ قبلہ — یہ کوئی ایکٹر نہیں - نہیں جناب ماڈل بھی نہیں - صاحب انسان مت کہیئے - انسان تو غلطیاں کرتا ہے۔ ڈکٹیٹر بن سکتا ہے۔ لیکن یہ صاحب انسان نہیں انسانیت ہیں۔ دیکھیے اچھے بُرے کی تمیز! — چلو آپ ٹوکتے ہیں تو خاموش ہو جاتا ہوں۔ لیکن اتنا تو مان لیجئے کہ اچھے بُرے کی پہچان عام آدمی تو نہیں کر سکتے ہیں۔ ارے صاحب! دھند میں کیا کسی کے چہرے کو پہچانا جاسکتا ہے ؟ خیر آپ کو میری باتیں اچھی نہیں لگتی ہیں تو چلئے نہ سہی۔ نہیں نہیں۔ یہ رنگ پُرانا نہیں۔ رنگ کا کیا ہے جناب لباس ہی تو بدلنا ہے۔ دل بدلنا اور کپڑے بدلنا ہی تو آج کل سب سے آسان کام ہے — لیکن پبلسٹی کے بغیر یہ بھی ممکن نہیں — جی ہاں، تصویر گیلی ہے۔ شائد رنگ بدلنا پڑے۔ کمال ہے صاحب - رنگ تو برش کے اسٹروک سے بدلا جاسکتا ہے۔ صاحب آپ نے درست فرمایا۔ یہ بھی ایکٹر ہیں۔ لیکن فلم کے نہیں، سیاست کے۔ بس اب کی بار اپنے جمال سے ایک نئی سیاسی گیم کا کمال دکھانا چاہتے ہیں۔ کیسے پٹ جائے گی صاحب۔ صاحب مینی فیسٹو کیا ہوتا ہے ؟ — دیکھئے میں عرض کر چکا ہوں کہ ہم لوگ زیادہ عبارت لکھنے یا کہنے میں یقین نہیں رکھتے — لوگ اب اِن نقالی پروگراموں سے اُوب گئے ہیں — خیر آپ اپنی بات کیجئے۔ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت — دشمن طاقتور ہے اور آپ بہت کمزور — لیکن آپ چاہیں تو ہماری طاقت آزمائیے ٹھیک ہے — آپ سمجھدار ہیں۔ اچھا یہ بتائیے کہ کس کا نام لیکر آپ پبلسٹی کروانا چاہتے ہیں۔ کسی دلکش آبشار کے نیچے نہاتی ہوئی مرمری شانوں والی حسینہ کو دکھاکر — کسی پُرکشش یونانی دیوتا مانند "ہی مین" (HE MAN) کو دکھاکر — کسی ایکٹرس کے سینے کا اُبھار دکھاکر — کسی غریب کو درد سے پیختے ہوئے دکھاکر — سیلاب دکھاکر — کسی ایکٹر کی تصویر بناکر یا ذات پات دین دھرم کا پرچار کرنے والے لیڈر کی شخصیت کا پروپگنڈہ کر کے — اچھا۔ اچھا — ٹھیک ہے۔ تصویر دیجئے۔ ارے صاحب کمال ہے۔ ایسی پبلسٹی ہوگی کہ لوگ اُلو بن جائیں گے۔ نہیں! نہیں! — زیادہ عبارت لوگوں کو کنفیوز (CONFUSE) کر دے گی۔ اتنا کافی ہے — ہاں — ہاں! — اس سے بھی بڑی تصویر بن جائے گی۔ اور نیچے فقط اتنا لکھیں گے۔ — آپ کے دُکھ درد کا شریک! آپ کا ہمشکل !! — بس دیکھتے رہیئے گا — ووٹ آپ کو ہی ملیں گے — اجی صاحب بعد کی باتیں بعد میں — دیکھئے وقت کم ہے اور مقابلہ سخت — یہی وہ طاقت ہے جسے لوگ کنولسنگ کہتے ہیں — جی ہاں جب موضوع بدل جائیں — پارٹی بدل جائے تو حالات بھی تو بدل جاتے ہیں — پھر چہروں کے جنگل میں کون کس کو پہچان لے گا وہ بھی جب چہروں پر نقاب ہوں - ہاہاہا -- - دیکھئے مان گئے نا آپ میری بات . . . ہا-ہا-ہا-ہا —

یو آر جینیس — گریٹ — !

— —

آندھرا پردیش میں کسانوں کے ساتھ بہتر سلوک



کسان ہماری ریاست کی معیشت کیلئے ریڑھ کی ہڈی کے مماثل ہیں حکومت آندھرا پردیش نے شری ٹی۔ انجیا کی قیادت میں کسانوں کی بھلائی کیلئے دوررس نتائج کی حامل تدابیر اختیار کی ہیں



قرضوں کی معیادِ ادائی پر نظر ثانی

امداد باہمی قرضہ جات اداروں کو ۳۰ جون ۱۹۸۰ء تک واجب الادا قرضوں کی معیادِ ادائی پر نظر ثانی کی گئی ہے۔

اصل رقم

نارمل قرض نظر ثانی کر کے تین سالہ قرض میں تبدیل کر دیا گیا۔

اوسط مدتی کنورشن قرض

جملہ قرض بشمول نارمل قرض نظر ثانی کے بعد پانچ سالہ کر دیا گیا۔

اوسط مدتی ویلفیئر منٹ قرض

جملہ قرض بشمول نارمل قرض اور اوسط مدتی کنورشن قرضہ جات نظر ثانی کے بعد سات سالہ کر دیا گیا۔

سود:۔ ایک سال سے واجب الادا سود ایک سال کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ دو سال سے واجب الادا سود نظر ثانی کے بعد معیادِ ادائی دو سال سے زائد کر دی گئی۔

(سلسلہ صفحہ ۴۷ پر)

- تین سال اور اس سے زیادہ مدت سے واجب الادا سود نظر ثانی کے بعد معیادِ ادائی تین سال سے زائد کردی گئی۔
- طویل مدتی قرض کی معیاد میں عدم وصول شدہ اقساط کی تعداد کے مساوی توسیع کی جائے گی۔ یہ توسیع ۳ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔

صنعتوں کیلئے قرضے

- اِمدادِ باہمی بنکوں نے ۱۹۸۰ء کے موسم خریف کے دوران میں کسانوں کو فصل کے قرضوں کے طور پر ۸۲ کروڑ روپیوں کی بھاری رقم فراہم کی ہے اور موسم ربیع میں مزید ۲۰ کروڑ روپیوں کی تقسیم کا پروگرام ہے
- امداد باہمی بنکوں کے ۵۰ فیصد قرضے ایسے کسانوں کو منظور کئے جائیں گے جن کے پاس ۵ ایکڑ تری یا دس ایکڑ خشکی سے کم اراضیات ہیں۔ اس طرح زیادہ تر کمزور طبقات کو فائدہ پہونچے گا۔ اس رقم کا ایک تہائی حصہ درج فہرست اقوام اور درج فہرست قبائیل کے لئے مختص کیا جائے گا۔

طویل مدتی قرضے

- اسٹیٹ کوآپریٹو اگریکلچرل ڈیولپمنٹ بنک کی جانب سے جاریہ سال کے دوران ۶۵ کروڑ روپے ترقیاتِ اراضی، باؤلیوں کی کھدائی۔ باغبانی، بھیڑوں اور مرغیوں کی پرورش سے متعلق اسکیمات کیلئے مختص کئے گئے ہیں۔

قرضوں کی وصولی معطل کردی گئی

- حکومت نے خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں قرضوں کے بقایا جات اور مالگزاری بشمول محصولات کی وصولی معطل کردی ہے۔

فصلوں کا بیمہ

- دھان، جوار، اور مونگ پھلی کی فصلوں کے لئے بیمہ اسکیم رائج کی جارہی ہے۔

:- جاری کردہ :-

محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش

(DIPR - 37) 1002/81 - 9-11 - 8 - 81.

شکیل رضا بنگلوری

یہ وہ سودا ہے ....!

کہتے ہیں کہ ستاروں کی گردش کا اثر انسانی زندگیوں پر کہیں نہ کہیں ضرور پڑتا ہے اور انسانوں کی زندگی میں اُتار چڑھاؤ، نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ ستاروں کا اثر انسانی زندگیوں پر پڑے یا نہ پڑے، مگر موسموں کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ اور موسموں کی طرح انسان بھی بدلتے ہیں۔ انسانوں کے دل بدلتے ہیں۔ دماغ بدلتا ہے اور دماغ کے ساتھ جب سوچنے سمجھنے کا انداز بدلتا ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے۔ سیرت بدل جاتی ہے اصول بدل جاتے ہیں۔ نظریات بدل جاتے ہیں۔ کبھی دولت کی پوجا ہوتی ہے تو کبھی حُسن کی غلامی کی جاتی ہے۔ کیونکہ سوچنے سمجھنے کا تعلق تو دماغ سے ہوتا ہے۔ اور انسان کا دماغ کبھی ایک ٹھکانے پر نہیں ہوتا۔ کبھی آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر رہا ہے۔ تو کبھی زمین کی گہرائیوں میں ڈوب رہا ہے۔ کبھی عظمت کی بلندیوں پر ہوتا ہے۔ کبھی ذلت کی کھائیوں میں گر جاتا ہے۔ کبھی انسانیت، خلوص اور شائستگی کا مظاہرہ ہوتا ہے تو کبھی ذلالت کا تماشہ ہوتا ہے۔ کبھی گلے لگایا جاتا ہے تو کبھی گلا کاٹا جاتا ہے۔ کبھی سر پہ بٹھایا جاتا ہے تو کبھی ٹھوکر لگائی جاتی ہے۔ کبھی اجنتا، ایلورا، اور تاج محل ڈھالے جاتے ہیں تو کبھی ہیروشیما کو کھنڈر بنا دیا جاتا ہے۔

حضرتِ انسان کی کھوپڑی میں جو چھوٹا سا دماغ ہے اور اس دماغ کے اندر جتنے باریک ریشے ہیں، اتنی ہی اس کی کرامات ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اور یہی دماغ یکسانیت سے اُکت جاتا ہے۔ نہ صرف یکسانیت سے بلکہ کبھی کبھی انسانیت سے بھی اُکت جاتا ہے۔ دفتر سے، دُکان سے اُکتا جاتا ہے تو دیوانہ وار پارکوں اور سبزہ زاروں کی طرف نکل جاتا ہے۔ اور اچھی طرح سبزہ نوش فرمانے کے بعد جی کچھ گھبرانے لگتا ہے تو مسجدوں اور مندروں میں پناہ لیتا ہے اور جب یہاں بھی طبیعت میں کھلی ہونے لگتی ہے تو سنیماؤں اور کلبوں کی طرف دوڑ جاتا ہے۔ دن کے ہر پہر، صبح و شام جب ایک بیوی سے اُکتاہٹ شروع ہوتی ہے تو اکثر لوگ دوسری بیوی کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی بیوی کا دوسرا نام ہی اُکتاہٹ اور بوریت ہے۔ مگر حضرت انسان ایک بوریت سے اُکت کر دوسری بوریت کی جستجو کرتا تو جی چاہتا ہے کہ ہم اپنی ڈائری سے لفظ بیوی کو خارج کر دیں۔ کیونکہ زندگی سے خارج کرنا تو ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ ادھر ہماری زبان سے کچھ نکلا اُدھر ابّو میاں کی بندوق سے ہم خود خارج ہو جائیں گے۔ کیونکہ بقول ابّو،

ہو تو گھر کی بیٹی ہوتی ہے۔ واہ ری بیٹی ۔ اسی بیٹی سے تو ہمارا بیڑہ غرق ہوا ۔ ہائے وہ بھی کیا دن تھے۔ جب ہر طرف ہرا ہی ہرا ہوتا تھا
ہم ہوتے تھے اور ہماری راتیں ہوتی تھیں اور ان راتوں کی باہوں میں ہم جھولا جھولتے تھے ۔ خیر صاحب جانے دیجئے۔ بیتی یادوں کی
کھٹک ہم سے سہی نہیں جاتی ۔ بہرحال بہت کم لوگوں کو دوسری بیوی کی تلاش میں کامیابی نصیب ہوتی ہے، کیونکہ آج کل
تو بہت سے لوگوں کو پہلی بیوی کی جھلک تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتا تو دوسری بیوی کا ملنا ایک معجزہ سے کم نہ ہوگا۔ خوش نصیب
ہیں وہ لوگ جو چار چار شادیاں رچا کر مزے سے زندگی گذارتے ہیں۔ ایک بیوی سے دل بھر گیا تو، دوسری کے پاس چلے گئے۔
دوسری سے اوب گئے تو تیسری اور تیسری سے چوتھی ۔ یہ محاورہ تو شاید ایسے ہی کسی موقعہ پر تیار کیا گیا ہوگا۔ " تو نہیں اور سہی
اور نہیں، اور سہی " اور جو لوگ دوسری بیوی کی تلاش میں ناکام ہوتے ہیں، وہ کسی اور کی بیوی تلاش کر لیتے ہیں ۔ یا پھر" یہ وہ
سودا ہے غالب ، جس کی دکان لگائے نہ لگے، اٹھائے نہ بنے ۔ یعنی کہ دوسری بیوی کی تلاش کرتے کرتے سر پر
عشق کا سودا اگنے لگتا ہے ۔ اور پھر وہ ہائے کہ ہائے ہائے ہائے —!! صبح گھر سے نکلتے ہیں تو پھر کئی کئی مہینے بلکہ سالوں کے
بعد گھر لوٹنا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو "خیر سے گھر کے بدھو لوٹ آئے۔" کہا جاتا ہے ۔ اور یہ گھر لوٹ آنے والی بات تو زیادہ تر
سیاست دانوں میں پائی جاتی ہے ۔ یہاں بھی وہی بات ہوتی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے، یعنی کہ اکتاہٹ۔ جو دماغ کی پیداوار
ہے۔ برسوں ایک پارٹی اور جماعت کے کھونٹے سے بندھے رہ کر کام کیا جاتا ہے ۔ اور کبھی کبھی ساری زندگی ، پوری دلجمعی اور
محنت و لگن سے کام کرنے کے بعد بھی کوئی کرسی نصیب نہیں ہوتی ہے تو اس پارٹی سے ضرور اکتا جانا چاہیئے ۔ اور وہی پارٹی
با اُصول سمجھی جانی چاہیئے جہاں کرسی نظر آتی ہے ۔ ورنہ کیا ایک ہی پارٹی رہ گئی ہے خدمت کرنے کو ۔ ایک چھوڑ ہزاروں پارٹیاں
روز آنہ بنتی اور بگڑتی ہیں ۔ جہاں کرسی نظر آئی نظر کا پھسلنا تو یقینی بات ہوگی۔ تھالی کے بینگن کی طرح کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر،
کسی پہلو قرار نہیں ملتا ۔ جب تک کہ کرسی نہ مل جائے ۔ اگر کرسی نہ ملے تو پھر ضرورت ہی کیا ہے لیڈر بننے کی۔ لیڈر کی نشانی
تو کرسی ہوتی ہے۔ جہاں لیڈر نہیں وہاں کرسی نہیں ۔ اور جہاں کرسی نہیں وہاں لیڈر نہیں ۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ
اگلے الیکشن میں ہمارا نشان "کرسی" ہوگا ۔ کیونکہ اگر آپ کے پاس کرسی ہے تو آپ کم از کم آرام سے بیٹھ تو سکتے ہیں۔ اسی لئے
لیڈر اور سیاست دان اپنے گھروں میں آرام دہ کرسیاں اور صوفے سجائے رکھتے ہیں ۔ تاکہ الیکشن سے ہار کر گھر لوٹیں گے تو
آرام سے بیٹھنا نصیب تو ہوگا ورنہ کون جانے زندگی میں کبھی کرسی ملے بھی یا نہیں ۔۔۔۔!!

رحمت اللہ خاں مالوی (اکولہ)

کاغذیِ پیراہن

[یہ مضمون اس وقت لکھا گیا تھا جب اعلان کیا گیا کہ ۱۹۸۱ء کو بطور اپاہجوں اور معذوروں کا سال منایا جائے۔]

یوں تو سننے میں بہت کچھ آتا ہے مگر یہ کوئی کلیہ نہیں ہے کہ سنا ہوا دیکھا بھی جاسکے۔ اور جو کچھ بھی سنا جاتا ہے دیکھے ہوئے کی مانند نہیں ہوتا اور دیکھا ہوا سُنے ہوئے کا نعم البدل نہیں بن سکتا۔ عکس آخر عکس ہے اور چہرہ، آخر چہرہ۔ اس لئے بے چہرگی کے دور میں سُننے اور دیکھنے کے مابین، اختلاف کو پس پُشت ڈال کر صرف قوتِ سماعت کو چاہے ٹھیک ہو یا نہ ہو)۔ قوتِ بصارت پر فوقیت و ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا ہے نہیں۔ اور کان جو کچھ نہیں سُنتے اس کی کانوں کان خبر ہو جاتی ہے۔ ایسا شاید اس لئے ہے کہ زندگی خود شور و ہنگامے کی عادی ہوگئی ہے۔

ہنگامۂ شادی اور نوحۂ ماتم سے پرے ایک جہاں اور بھی ہے جہاں صرف نوحۂ ماتم کے پردے میں ہنگامہ آرائی جلوہ افروز ہے یوں تو ہنگامہ برپا کرنے کا کوئی ایک طریقہ مختص نہیں، بلکہ کئی ایک طریقے ہیں کسی ایک طریقے سے ہنگامہ برپا کر دیجئے۔ دنیا کی رونق سمٹ کر اس کے گرد جمع ہو جائے گی۔ تالیاں بجیں گی۔ واہ واہ ہوگی۔ ایک اُسے سُنے گا، دوسرا اُسے تیسرے کو سُنائے گا اور یہ تواتر اس سلسلے سے اُس سلسلے تک پھیلتا ہی چلا جائے گا۔ آخر چند لمحات کا توقف اور ..... سنّاٹا ...... پھر ایک نیا ہنگامہ یہ تسلسل زندگی کا دستور ہے اور اسی تسلسل کو قائم رکھنے کیلئے شاید زندگی بھی اپنی گاڑی کھینچ رہی ہے۔ اسی کھینچا تانی کی تان کو تو کہیں ٹوٹنا ہے ہی۔ تاکہ ٹوٹی ہوئی ڈور کا نیا سرا ہاتھ آسکے۔ اور اس کھینچا تانی کی تان اب کے ٹوٹی اپاہج اور معذوروں پر۔ یعنی اپاہجوں اور معذوروں کا بین الاقوامی برس منانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ گویا یہ سوغات ہے ۱۹۸۱ء کی۔

اخباروں کے ذریعہ پتہ چلا کہ International Year of the Handicapped and Disabled کا اہتمام ہو رہا ہے

اس کا مفہوم انگریزی میں تو سمجھ میں آگیا لیکن اردو میں ہم سمجھ نہیں پائے۔ حکماء کا قول ہے کہ جب کسی چیز کا مطلب سمجھ میں نہ آئے اور اگر وہ آرٹ ہے تو اُسے تجریدی آرٹ سمجھو اور ادبیات میں سے کچھ ہے تو کوئی جدید چیز سمجھ کر اُس کا پیچھا چھوڑ دو اور مذہب کی کوئی چیز ہو تو اُسے اجتہاد گردانو۔ اگر اس کا تعلق لفظوں سے ہو تو ڈکشنریاں کھنگالو کر صحت کیلئے یہی مفید ہے۔ اس مقولے پر عمل کرتے ہوئے ہم نے بھی ڈکشنری جسے کم پڑھے لکھے لوگ لُغت کہتے ہیں۔ اُٹھا کر دیکھ لی۔ تو معلوم ہوا کہ handicapped اور disabled کے اردو مترادفات بالترتیب اپاہج اور معذور ہیں۔ پہلے تو ہم ملول ہوئے اپنی ناقص معلومات پر جو ہماری ڈگریوں کی ممنونِ احسان ہے۔ پھر افسوس کیا اپنی اردو دانی پر کہ یہ ہماری مادری زبان ہے اور آخر میں ہم نے ماتم کیا اردو زبان کے معذور اور اپاہج ہونے پر کہ اللہ کیا یہ دن بھی دکھانے تھے۔ کہ اردو اَب الفاظ و معنی کے لئے ڈکشنریوں اور وہ بھی انگریزی ڈکشنریوں کی بیساکھیوں پر گھسیٹ رہی ہے۔ یوں تو اس سے قبل کئی مرتبہ اردو کے محتاج اور معذور ہونے پر اُسی انداز میں کفِ افسوس ملتے رہے جیسا کہ ہر الفاء کے ہاتھوں سے کبوتر اُڑ جانے پر جہانگیر نے ملے تھے۔ یوں تو اردو زبان کو اپاہج و معذور ہوئے تیس سال یا اس سے کچھ اُوپر۔ بتیس سال ہوئے ہوں گے۔ مگر ستم بالائے ستم ایک وزیر با تدبیر نے ایک دن ایک حیرت انگیز انکشاف کیا کہ اردو ایک غیر ملکی زبان ہے۔ اس اعلان پر یاروں کو سکتہ ہوا۔ غیروں کو حیرت ہوئی اور دشمنوں کو بصیرت ملی۔ وزیر با تدبیر کی گرج تھی۔ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کی آواز نہ تھی۔

اس لئے ہم اور ہمارے جیسے بہت سے ڈر اور سہم گئے۔ کچھ لاغر و نحیف آوازیں اُردو کو ملکی زبان قرار دینے کے ثبوت میں بڑی شد و مد کے ساتھ اُبھریں۔ یہ آوازیں اتنی طاقت اور اتنا زور دے کر نکالی گئیں کہ نحیف و لاغر جسم سرتاپیر لرز لرز گئے۔ وزیر با تدبیر کی گرج تو چلتے چلاتے ہم نے بھی سُنی تھی اور سُننے کے بعد تبصرہ اور تنقید سے یہ ہیر کیا کہ مسئلہ روٹی روزی کا تھا۔ ہرچند کہ نحیف و لاغر آوازوں کو کان لگا کر سُنا اور دل ہی دل میں بغلیں بجالیں۔ مبادا کوئی دیکھ نہ لے۔ لیکن عمل کرنے سے گریز کیا۔ بلکہ اکڑ کر شانِ بے نیازی سے چلے گئے۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک فقیر بھوک کے مارے فٹ پاتھ پر دم توڑ رہا تھا۔ یہ فقیر تین چار دن پہلے ہی اس جگہ آکر نیا نیا آباد ہوا تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ ہمارے سامنے بھی دستِ سوال دراز کیا تھا مگر ہم نے اپنے پاس پیسے ہوتے ہوئے بھی اُسے جھڑک دیا تھا اور جب اُسے مرتے ہوئے دیکھا تو افسوس ہوا اور ساری انسانیت کا درد ہمارے اندر سمٹ آیا۔ اظہارِ ہمدردی کے طور پر ہم نے بس اتنا ہی کہا کہ اُف! کس بیچارگی میں بیچارہ نے دم توڑا ہے خدا ایسی موت دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ اسی دوران چند نفوس پر مشتمل ایک جلوس اُردو زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا وہاں سے گذرا۔ ایک اپاہج مر چکا تھا اور دوسرا معذور سسک رہا تھا۔ ہم بجز ہمدردی اور کیا کر سکتے تھے اور شاید یہ بھی اس لئے کہ انسان کی فطرت ہمدردی کا اظہار ضروری سمجھتی ہے۔ پھر ہم تو خود اپاہج اور معذور تھے۔ ہماری مجبوری، ہمارا لنگڑا پن ہے جو ہمیں آگے بڑھ کر کچھ کرنے سے روک دیتی ہے کہ مسئلہ پیٹ کا ہے۔ ہماری بے بسی وہ اندھاپن ہے جو آگے دیکھنے نہیں دیتی کہ ملازمت کا چشمہ آنکھوں پر چڑھا ہوا ہے۔

ہمارے کان اردو زندہ باد تو سُن سکتے ہیں مگر زبان اُردو زندہ باد نہیں کہہ سکتی کہ یہاں اس کی قوت گویائی سلب ہو جاتی ہے کہ معاملہ اولاد کی ترقی کا ہے۔ یہ سب سُننے اور دیکھنے کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ شائد بین الاقوامی سال برائے اپاہج و معذوراں، مژدۂ جانفزا لائے۔ چاروں طرف نظر دوڑائی۔ آج پانچ چھ ماہ گذر جانے کے بعد بھی فٹ پاتھ پر بھک منگوں کی تعداد اتنی ہی ہے بلکہ اس تعداد میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگئی ہے۔ یہ اپاہج اور معذور تو وہ ہیں جو ننگی آنکھوں سے بھی نظر آجاتے ہیں۔ کچھ اپاہج اور معذور ایسے بھی ہیں جو بظاہر لحیم شحیم اور

جسیم ہیں ۔ مگر خوردبین کی مدد کے بغیر نظر نہیں آ سکتے ۔ آخرالذکر قبیل کے اپاہجوں اور معذوروں میں سندیافتہ، ڈگری یافتہ، تعلیم یافتہ اور نہ جانے کیا کیا یافتہ شامل ہیں جو بے روزگاری اور بے کاری کو ڈگریوں کی شکل میں سینے سے لگائے پھر رہے ہیں ۔ یہ معذور وہ ہیں جو نہ کوئی ملازمت حاصل کر سکتے ہیں اور نہ خود سے ہی کوئی کام کرنے کے قابل ہیں ۔ کیونکہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کی ڈگریوں نے انھیں طفیلی (dependent) بنا دیا ہے ۔ ایسے اپاہج، مفلسی، غریبی اور بے روزگاری کے بدن پر کوڑھ کا نشان ہیں جس کا علاج ہنوز دریافت نہیں ہوا ۔

ان ہی میں سے کچھ ایسے معذور ہیں جو قابل تو ہیں لیکن ان کی قابلیت اور اہلیت کسی سفارش کی محتاج ہے ۔ اور سفارش نہ ہونا ہی ان کا معذور پن ہے ۔ ان کے معذور ہونے کا پتہ اس وقت لگتا ہے جب یہ کسی انٹرویو میں شریک ہو کر صرف اس لئے واپس آجاتے ہیں کہ ان کے پاس سفارشی خط نہیں ہوتا یا کسی "بڑے" سے رشتہ ناطہ جوڑنا انہیں نہیں آتا یا "لین دین" کے اصولوں سے واقف نہیں ہوتے ۔ ان کی یہی کم مائیگی ان کی "اہلیت" پر نااہلیت کی مہر ثبت کر دیتی ہے ۔ اور قابلیت کی تمام اسناد اور دستاویزات بلا عذر شرعی اور غیر شرعی REJECT کر دی جاتی ہیں ۔ یہ بیچارے معذور، عذر گناہ بدتر از گناہ کی گردان کرتے ہوئے واپس لوٹ جاتے ہیں اور امید و یاس کے مابین اس طرح جھو لتے ہیں جس طرح کوئی بین الاقوامی مسئلہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ۔ آخرکار متنازعہ فیہ مسئلہ کا حل یہ نکلتا ہے کہ کوئی "بڑا" (POWER) اسے ویٹو (VETO) کر دیتا ہے اور بات جہاں کی تہاں رہ جاتی ہے ۔ ان تمام حالات کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد ذہن نے قلابازی کھائی کہ کاش ہمارے ملک میں بھی ایسے اپاہج اور معذوروں کی مدد کے لئے ان کی تعداد کے برابر نہ سہی لیکن اس کا عشر عشیر ہی منسٹر یا حکام ہوتے تاکہ اپاہجوں کا سال اچھے طریقے سے منایا جا سکتا ۔ ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے ہم نے اپاہج اور معذوروں کی DEFINATION یوں کی ہے ۔

اپاہج :- وہ شخص جو ڈگریاں اور تمام تعلیمی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود دکھی کھانے، کمانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو ۔ اور معیارِ زندگی (Standard of living) گرانے کا ذمہ دار ہو ۔

معذور ۔ ایسا نالائق جو تعلیمی اور علمی اعتبار سے تو تمام صلاحیتیں رکھتا ہو مگر کسی منسٹر کی سفارشی چھٹی حاصل کرنے میں ناکام رہے اور کسی حاکم کا منظورِ نظر بننے میں تکلف کرے یا کسی "بڑے" سے رشتہ ناطہ جوڑنے کا ماہر نہ ہو ۔ اور محض ان ہی وجوہات کی بنا پر ہر انٹرویو میں شریک ہونے کے بعد کامیابی کے ساتھ منہ لٹکائے واپس آنے میں مہارت رکھتا ہو ۔

سقراط اور بقراط کی نقل کرتے ہوئے دینے کو تو اپاہج اور معذوروں کا definatian دے دیا لیکن بعد میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اُوپر دیا ہوا definition قطعی غلط ہے ۔ صحیح معنوں میں معذور اور اپاہج تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو نااہل، نالائق اور کم تعلیم یافتہ ہیں ۔ اگر یہ سفارش کے ذریعہ ملازمت حاصل کر چکے ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور بلکہ ایسے لوگوں کو ملازمت دلوانا زیادہ ضروری تھا ۔ سند یافتہ اور قابلیت رکھنے والے تو کسی طور تو کما کھائے مچھندر، کے اصول پر عمل کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے مگر ان قلیل تعداد نا اہلوں کو منسٹر یا حکام بالا نہ پوچھیں تو کون پوچھے گا پھر ۔ Standard of living سے کیا لینا دینا ۔ اور شائد اسلئے وہ نااہل اور نالائق آسانی سے ملازمت حاصل کر لیتے ہیں جن کا پیشہ آبائی چاپلوسی اور اقربا پروری رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ سال بھی اس لئے منایا جا رہا ہو کہ اس قسم کی تحریک کو کسی ایک خطۂ زمین تک ہی کیوں محدود رکھا جائے ۔

--

شاعری

شاعری کرنے کی جس دن سے حماقت کی ہے
ہائے سر اپنے اسی روز سے آفت لی ہے

آج خود ذکردہ گناہوں کی سزا پاتا ہوں
پوچھتا ہے، کوئی، کیا سمجھے تو شرماتا ہوں

دوش پہ اپنے تفکر کا ہے سر ایسا پڑا
جیسے رکھا ہو تپائی پہ کوئی اُلٹا گھڑا

میری بیگم نے جو دیکھا تو یہ گھبرا کے کہا
"شاعری نے تمہیں ثابت کیا مجنوں کا چچا"

ان کے ڈیڈی ہیں خفا دیکھ کے صورت میری
خاک میں مل گئی برسوں کی ریاضت میری

دیکھ کر مجھ کو کوئی احمق دوراں سمجھا
میرے پاجامہ کو مجنوں کا گریباں سمجھا

عقل نے بات قمرؔ آج مری مانی ہے
شاعری وائرس اس دور میں نادانی ہے

قمر الزماں قمرؔ (رانچی)

چاؤش دُولہا

برس میرا لگا پرسوں ہی تھا پندرہ سے سولہا
کدھر سے آگیا رے بن کے تو چاؤش دولہا
نہ مُنہ میں دانت ہے تیرے نہ آنکھوں میں اُجالا
تیرے رُخ پر بُنی ہے عمر کی مکڑی نے جالا
نہ گیا رنٹی تیری ہے کب تیرا مٹکہ ڈھلے گا
میرا پھر کیوں نہ اپنی بیوگی پر دل چلے گا
جہیزی لعنتوں میں نوجواں جکڑے ہیں دیسی
تو شوہر مل رہے ہیں لڑکیوں کو اب بدیسی
ہماری لڑکیاں اور ان کا یہ انجام دیکھو
مسلسل آرہا ہے بوڑھوں کا پیغام دیکھو

افسر جمالی

غزل

دنیا میں انقلاب کبھی ہے کبھی نہیں
ہر دَور کامیاب کبھی ہے کبھی نہیں
وہ حسن بے نقاب کبھی ہے کبھی نہیں
ذوقِ نظر خراب کبھی ہے کبھی نہیں
عالم عجب ہے میری شب انتظار کا
ہر سانس اِک عذاب کبھی ہے کبھی نہیں
اے حسن دلنواز تری بارگاہ میں
پروانہ باریاب کبھی ہے کبھی نہیں
اِترانے والے حسن پہ سمجھے نہیں ابھی
یہ گرمیٔ شباب کبھی ہے کبھی نہیں

خلیل بسمل

منظور وقار (گلبرگہ)

معذوروں کا سال

معذوروں کا عالمی سال شروع ہوا ہے۔ ہمیں اس کی باقاعدہ خبر نہیں تھی اور نہ شاید کبھی ہوتی اگر ہم کو ایک دن جمن نامی ایک لنگڑے فقیر نے یہ بات بتائی نہ ہوتی۔

اُس دن صبح جب اس نے خیرات کے لئے نعرہ لگایا تو اُس کی آواز میں التجا کم اور حکم زیادہ تھا۔ ہم نے حسب معمول پاؤ روٹی خیرات کرنا چاہا تو وہ روٹی کو دیکھ کر کہنے لگا۔ "صاحب! اب پاؤ روٹی سے کام نہیں چلے گا۔ کیونکہ یہ جو نیا سال شروع ہوا ہے، ہمارا ہے!"

ہم حیرت میں پڑ گئے کہ خدایا کیا اب سال بھی فرداً فرداً کسی نہ کسی کا ہوا کرے گا۔ ہم نے کہا۔ "یہ سال اگر تمہارا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

لنگڑا کہنے لگا۔ "صاحب ہمارے لیڈر کے کہنے کے مطابق آپ کو کم سے کم دو روٹی یا نہیں تو ایک کیلو چاول خیرات کرنا ہوگا۔ ہمارے لیڈر کا کہنا ہے، اس سال خیرات میں اضافہ ضروری ہے۔ اس لئے کہ ہر دفتر اور کارخانے کے ملازمین کی تنخواہوں میں نان اسٹاپ (NON - STOP) اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔"

اب ہمیں یاد آیا کہ 1981 معذوروں کا سال ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے ہم نے معذوروں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے شائع کردہ اشتہارات ہی پڑھے تھے۔ کبھی کسی فقیر سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ مگر اُس دن لنگڑے کے کہنے پر ہمیں اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ 1981 صرف معذوروں اور فقیروں کا سال ہے۔ ہم نے لنگڑے سے کہا۔ "اگر تمہیں کوئی دو روٹی یا ایک کیلو چاول سے کم خیرات دے تو تم کیا کرو گے؟"

لنگڑا بولا۔ "صاحب! ہمارے لیڈر کا کہنا ہے۔ اگر ہمارے مطالبات نہیں تسلیم کئے گئے تو وہ ملک گیر ہڑتال کرا دے گا!"

یہ سن کر ہم تھوڑی دیر کیلئے سہم گئے۔ پوچھا۔ "ارے جمن! تم لیڈر، لیڈر کی کیا رٹ لگا رہے ہو، کیا تمہارا بھی کوئی لیڈر ہے؟"

کیا تمہاری بھی کوئی انجمن ہے ؟

لنگڑے نے جواب دیا ۔ " صاحب ! ملک میں رکشا چلانے والوں کی انجمن ہے۔ پتھر پھوڑنے، ہوٹل میں کام کرنے والوں کی انجمن ہے۔ بیکاروں کی، پوسٹر لگانے والوں کی انجمن ہے ۔ جب اتنی ساری انجمنیں ہوں تو ہم معذوروں اور فقیروں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم بھی ایک انجمن بنالیں۔ کیونکہ ہماری اکثریت میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے ۔ پھر یہ سال بھی تو ہمارا ہے۔ چنانچہ تمام فقیروں نے مل کر ایک انجمن کی بنیا د رکھی اور پتلے شاہ چکر کو اپنا لیڈر تسلیم کرلیا ۔ کیونکہ پتلے شاہ چکر دُبلا ہے۔ اس لئے چُست و چالاک ہے۔ وہ کانا بھی ہے اس لئے کسی بھی چیز کو پرکھنے میں بہت ماہر ہے۔ وہ ایک ٹانگ کا لنگڑا ہے ۔ اس لئے دوڑنے میں بہت تیز ہے۔ "

ہم لنگڑے سے اسکے لیڈر اور انجمن کے بارے میں مستند جوابات سُن کر سمجھ گئے کہ یہ لنگڑا ضرور تعلیم یافتہ ہے۔ ہم نے لنگڑے سے پوچھا ۔ " تم اتنی اچھی معیاری گفتگو کرسکتے ہو تو تم تعلیم یافتہ بھی ہو گے ! "

لنگڑے نے فخر سے گردن تنا کر جواب دیا ۔ " صاحب میں بی ۔ اے سال اول فیل انڈر گرایجویٹ ہوں ۔ نوکری ڈھونڈ ڈھونڈ کر تنگ آنے کے بعد ریل گاڑی کے پنیچے مرنے کی کوشش میں بدقسمتی سے بچ گیا اور میری ایک ٹانگ مجھ کو مستقل روزی کا طریقہ بتاکر مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی ۔ "

چونکہ ہم لنگڑے کے ساتھ مزید گفتگو کرنا نہیں چاہتے تھے، اس لئے دو روٹی کی جگہ ایک روٹی دے کر لنگڑے سے چھٹکارا پا ہی لیا ۔ اتنے میں کانے رحمو نے آواز لگائی ۔ " خدا کے نام پر ایک کیلو چاول خیرات کرو ۔ "

ہم آواز سن کر سمجھ گئے کہ معذوروں کی انجمن تندرستوں کی انجمن سے زیادہ مستعد اور کارکرد ہے۔ ہمیں خطرہ محسوس ہوا اگر معذوروں کی انجمن اسی رفتار سے کام کرنے لگے تو وہ دن دور نہیں جب یہ معذور اور فقیر دولت مند بن جائیں گے اور آج کے خوشحال لوگ کل اُن کے گھر بھیک مانگنے جایا کریں گے ۔ ہم رحمو سے کچھ کہنے ہی والے تھے کہ وہ اپنی اکلوتی آنکھ سے ہم کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگا " صاحب ! آپ کو تو لنگڑے حسن نے سب کچھ بتایا ہو گا ۔ "

ہم نے جل کر کہا ۔ " لنگڑے حسن نے صرف تمہارے لیڈر اور تمہاری انجمن کے بارے میں بتایا ہے ۔ اگر تمہیں تکلیف نہ ہو تو تم اپنی انجمن کی شرائط بھی بتادو تاکہ ہماری معلومات میں کچھ اور اضافہ ہو ۔ "

رحمو نے فرفر ساری شرائط سُنا دیں ۔۔۔

(۱) کوئی بھی معذور یا فقیر خیرات میں کم سے کم دو روٹی لے گا ۔ اگر خیرات اجناس کی شکل میں ہو تو مقدار کم سے کم ایک کیلو ہو۔

(۲) کوئی بھی معذور یا فقیر سکّوں کی شکل میں خیرات ایک روپیہ سے کم قبول نہ کرے گا ۔ کھوٹے سکّے ، پھٹے نوٹ قبول نہیں کئے جائیں گے ۔

(۳) معذور اور فقیروں کا مطالبہ ہے کہ حکومت اُنہیں مستقل وظیفہ مقرر کرے ۔

(۴) معذور اور فقیر حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ حکومت اندھوں کو آنکھ ، لنگڑوں کو ٹانگ ، ہاتھ کٹوں کو ہاتھ ، ناک کٹوں کو ناک دینے کا مناسب انتظام کرے ۔

(۵) خیرات دینے والے کا اخلاقی فرض ہوگا کہ وہ کسی معذور کو جھڑکی نہ دے اور نہ ڈانٹے۔ ورنہ اُس کے مکان کے سامنے ہڑتال کر کے اس کو گھر سے بے گھر بنا دیں گے۔

(۶) تمام معذور اور فقیروں کا فرض ہے کہ وہ انجمن کی فیس ہر ماہ باقاعدہ ادا کریں۔

ہم رحمو سے شرائط سُن کر کانپ گئے۔ وہ اس لئے کہ ہمارے انکار پر وہ کہیں ہمارے مکان کے سامنے ہڑتال نہ کر دے۔ ہم نے دل کڑا کر کے ایک کیلو چاول دے کر رحمو سے چھٹکارا پایا۔ اور اسی دن اپنے مکان پر یہ بورڈ لگا دیا " مالکِ مکان خستہ حالی کی وجہ سے کچھ خیرات کرنے کے قابل نہیں ہے۔ لہٰذا فقراء معاف کریں ! "

اَب ہماری عادت سی ہوگئی ہے کہ جب کبھی گلی کوچوں اور بازاروں میں کوئی معذور یا فقیر نظر آتا ہے تو ہم فوراً اپنا راستہ بدل دیتے ہیں۔ وہ اس لئے کہ ہمارے پاس بس کا کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے ہم آفس پیدل جایا کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم خیرات کہاں سے دیں گے — ؟ "

— —

ادارۂ شگوفہ

کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵/- روپے
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	"	۵/- "
تیر نیم کش	بھارت چند کھنّہ	مضامین	۷/۵۰ "
ہمسائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	"	۹/- "
نقطہ	"	"	۶/- "
تُو تُو، مَیں مَیں	پرویز یداللہ مہدی	ڈرامے	۱۰/- "
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنّہ	مضامین	۸/- "
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸/- "
بہرحال	مجتبیٰ حسین	"	۷/- "
آدمی نامہ (خاکے)	"	"	۹/- "
انڈین کاجو	عاتق شاہ	"	۸/- "
خواہ مخواہ	رشید الدین	"	۸/- "
جوہر ظرافت	جوہر سیوانی	مجموعۂ کلام	۱۵/- "

تظر برنی

کالج

مرزا غالبؔ کی تضمین کے طور پر ایک مزاحیہ پیروڈی

کالجوں کی دنیا کا رنگ ہی جُدا پایا
عاشقی کے پھندے کو ہر طرف پڑا پایا
لڑکیوں کو لڑکوں سے کتنا آشنا پایا
"عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

یہ کہا حسینہ نے ہم سے قصۂ منظوم
جب سے ہم ہوئے داخل دھڑکنیں ہوئیں معدوم
میرا چاہنے والا صورتاً بڑا معصوم
"دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا"

جمگھٹا ہے یاروں کا، جم گئی ہے اک محفل
جس سے کر لیا وعدہ کر رہے ہیں ہم فُل فِل
کھایا ہم نے جی بھر کر آیا سینکڑوں کا بل
"غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا"

لیکچرر کی یہ جرأت گھور کر ہمیں دیکھا
عشق کا لیا ٹوپک لیکچر رہلا ڈالا TOPIC
اور یہ بھلا بیٹھا عشق کا ہے منصب کیا
"شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

سپاسنامہ

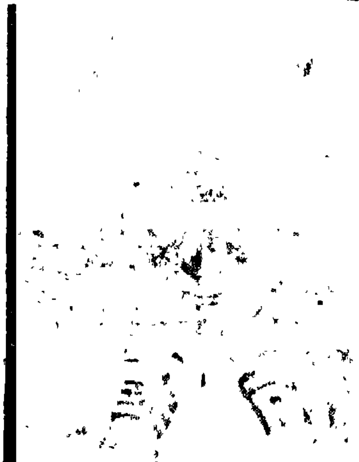
(ایک منسٹر کے حضور میں)

عالی جناب میرا تعارف ہے مختصر
ہوں ملک بھر کے جیب تراشوں کا میں صدر
کرتے تھے پہلے آپ جو دھندا بلیک کا
روحِ رواں ہیں ہم اُسی دھندے کے سربسر
آئے تھے آپ جس گھڑی بھاشن کے واسطے
لائے تھے ہم کرایہ سے پبلک سمیٹ کر
ووٹر تو سیدھے سادھے تھے جھانسے میں آگئے
بوگس بھی ووٹ دینے پڑے جان بوجھ کر
عہدہ منسٹری کا مبارک ہو آپ کو
رکھئے گا دوستوں پہ کرم کی بھی کچھ نظر
شکوہ نہیں ہے کوئی حقیقت ہے یہ جناب
پولیس کی ہم پہ رہتی ہے ہر دم کڑی نظر
ہم دن کو جیل میں رہیں اور رات کو سدا
بھجوایئے بس ایسا ہی تھانوں میں سرکولر
ملنے نہ دیں گے ووٹ مخالف کے باپ کو
لائیں گے بار بار فقط چن کے آپ کو

نزاکت فیضی
(ملکاپور)



دیہی ترقیاتی اسکیمات کی عمل آوری میں شدت و سرعت



- ریاستی حکومت کے پروگراموں میں مواضعات کو بے ضرر پانی کی سربراہی اولین ترجیح کی حامل ہے۔
- اس وقت ۵۱۹,۰۰۰ مواضعات اور چھوٹے قصبوں میں باؤلیوں، بورویلس اور محفوظ آبرسانی اسکیمات کی مدد سے ۱٫۴۳ کروڑ عوام کو پینے کا پانی سربراہ کیا جارہا ہے۔
- ۲۲ لاکھ عوام پر محیط ۱۰۶۷ سربراہی آب اسکیمات کے علاوہ ۱٫۵۵ کروڑ روپے لاگت کی ایک بڑی اسکیم روبہ عمل لائی جارہی ہے جس سے فلورائڈ سے متاثرہ ۱۷۱ مقامات کے ۳٫۷ لاکھ عوام کو فائدہ ہوگا۔ صرف دیہی آبرسانی اسکیمات کے لئے جملہ ۸۷ کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں
- دیہی آبرسانی اسکیمات کے لئے ۴۸۰ کروڑ روپے لاگت کا ایک ماسٹر پلان تیار کیا گیا ہے۔ چھٹے منصوبے کے دوران میں پینے کے پانی کے مسائل سے دوچار ۲۰۰۰ مواضعات کے عوام کو پانی کی فراہمی کے لئے ۱۷٫۳ کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے۔
- دیہاتوں کو گندگی سے پاک و صاف رکھنے کے لئے ۱۷۵ کروڑ روپیوں کی گنجائش فراہم کی جائے گی۔
- غذا برائے کام پروگرام کے تحت گذشتہ دو برسوں میں ۲۰۰ لاکھ عوام کے لئے روزگار کی گنجائش نکالی گئی ۔۔۔ علاوہ ازیں ۸۵ کروڑ مالیت کے ۴٫۸۲ لاکھ ٹن غذائی اجناس سے استفادہ کرتے ہوئے ۳۰,۰۰۰ کیلومیٹر طویل سڑکوں ۲,۵۰۰ اسکول عمارتوں، پنچایت گھروں اور کمزور طبقات کے لئے ۹۸,۰۰۰ مکانوں کی تعمیر عمل میں لائی گئی۔
- ۱۸,۵۰۰ مواضعات کو ملانے کے لئے اچھے موسم اور تمام موسموں میں استعمال کے لئے سڑکیں بچھائی گئیں اور ۱۶,۷۰۰ مواضعات کو ملانے کی خاطر ۹۶۵ کروڑ روپے لاگت کا ایک

(سلسلہ صفحہ ۵۲ پر)

ماسٹر پلان سڑکوں کی تعمیر کے لئے تیار کیا گیا۔

- طوفان زدہ علاقوں میں سڑکوں کے ۲۹۰۰ کام، چھوٹی آبپاشی کے ۲۸۰۰ کام، اور عمارات کی تعمیر کے ۴۵۰۰ کام انجام دیئے گئے۔ خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں پینے کے پانی کی فراہمی کے لئے ۱۲۰۰۰ بور ویلس مہیا کی گئیں۔
- گزشتہ تین برسوں کے دوران میں ۳۵ کروڑ روپیوں کے خرچ سے کمزور طبقات کے لئے ۳ء۵ لاکھ مکانات تعمیر کئے گئے۔

آندھرا پردیش کے مواضعات ہمہ جہتی ترقی کی سمت پیش قدمی میں مصروف ہیں

جاری کردہ :- محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

DIPR - 713 /81 - No: 3D.

انجم مانپوری

اینٹی فادر کانفرنس

محترمی تسلیم۔

جناب ہاشم عظیم آبادی کا طنزیہ و مزاحیہ مضمون "بوڑھوں کی کانفرنس" آپ کے رسالہ کے حوالہ سے "آج کل" میں پڑھا۔ تو فوراً گیا کے ایک پرانے، منفرد انشائیہ و مزاح نگار جناب انجم مانپوری مرحوم کا انشائیہ "اینٹی فادر کانفرنس" حافظہ میں گھوم گیا۔ یہ انشائیہ ان کے مجموعہ "طنزیات مانپوری حصہ دوم" میں شامل ہے۔ جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا۔ "بوڑھوں کی کانفرنس" کی اشاعت کے بعد "اینٹی فادر کانفرنس" کی اشاعت یقیناً قارئین شگوفہ کے ذوق کام و دہن کے لیے ایک نئی لذت کا سامان فراہم کرے گی۔ میخانۂ ادب کی ایک شراب کہنہ کی حیثیت سے بھی اس کی اشاعت آج کے طالب علم کے لیے سود مند ثابت ہوگی۔"

والسلام
سین شاہد ایڈیٹر "آدرش" گیا

نان کوآپریشن کا ہنگامہ خیز دور، جلسوں اور مظاہروں کی چہل پہل کے علاوہ چندہ داں کی بھرمار کی بدولت لیڈروں کے لیے تو عہد زریں تھا ہی، لیکن آزاد منش اور منچلے لوگوں کے لیے بھی کم دلچسپ نہ تھا۔ اس ہڑبونگ نے ہندوستان کو تو خیر آزادی دلائی یا نہیں یہ ایک علیحدہ سوال ہے۔ لیکن ملک کے اکثر آزادی پسند نوجوانوں کو ملازمت کی غلامانہ زندگی سے اور اسکول، کالج کے جوشیلے طلبا، کو تعلیمی مصیبت سے چھٹکارا پانے کا بہترین موقع بہم پہونچا دیا۔ آپ جانیے کہ ایسے موقع پر میں بھلا کب چوکنے والا تھا۔ والد صاحب قبلہ لاکھ چیختے رہے کہ کم از کم میٹرک کا امتحان تو دیدو، لیکن جس کا نتیجہ پہلے ہی سے معلوم ہو اس کام میں وقت کیوں ضائع کرتا اور پھر ایک مہاتما کے حکم کے سامنے بزرگوں کی بھی کوئی حقیقت ہے۔

بہرکیف، والد صاحب کے سعادت مند فرزند کی بجائے جماعت ما کے سپوتوں میں داخل ہو گیا۔ اسکولوں اور کالجوں کے بکھیڑے میں الجھا رہتا تو پانچ سات سال کے بعد خوش قسمتی کہیں زور کرتی تو کسی کلرکی کی غلامانہ زندگی کو معراج ترقی سمجھنے کا موقع ملتا۔ اور یہاں خدا کے فضل سے چند ہی ماہ والنٹیر سے ورکر، ورکر سے جتھا کا کپتان اور پھر لیڈری کے بام عروج پر جا پہنچنے کو تھا ہی مگر خدا سمجھے ان پولیس والوں سے، عین اس موقع پر جبکہ ایک مجمع میں اپنی دھواں دھار تقریر سے لوگوں کو بدحواس کیے ہوئے تھا کہ پولیس کے ایک جتھے نے پہنچ کر خود میرے حواس میں گڑبڑ پیدا کر دی۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ پولیس کا خوف دماغ پر مسلط ہونے کے ساتھ خود پولیس کا بھوت جب آنکھوں کے سامنے ہو تو لیکچر اور اسپیچ کا تسلسل تو بڑی چیز ہے معمولی باتوں میں ربط قائم رکھنا بھی آسان نہیں اور خاص کر ایسی

حالت میں جبکہ حاضرین جلسہ غائبین کے زمرہ میں جا ملے ہوں۔ لیکن میں چونکہ ذرا فطرتاً موقع شناس واقع ہوا ہوں فوراً تقریر کا پہلو بدل کر کہنا شروع کردیا۔

"صاحبو! سرکار کی یہ غربا پروری ہے کہ صرف ملک کی آزادی کو چھوڑ کر بقیہ ہر قسم کی آزادی دے رکھی ہے آپ نہایت آزادی کے ساتھ آپس میں دنگا فساد کرسکتے ہیں کوئی روکنے والا نہیں۔ اپنے مال و دولت کو جس طرح چاہیے، لٹائیے۔ سرکار دولت مدار کے عہد زریں میں کوئی ٹوکنے والا نہیں۔ ملک و مذہب کے خلاف جو جی چاہے، کیجئے۔ کسی کی مجال نہیں کہ آپ سے کوئی بازپرس کرے۔ باقی رہی زبان۔ تو ایک زبان ہی کیا ہاتھ کے سوا کل اعضاء کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ اس لیے ہم پر صرف واجب نہیں بلکہ ہمارا فرض ہے کہ سرکار کا شکریہ ادر شکرانہ ادا کریں۔"

یہ خوشامدانہ تقریر بطور حفظ ماتقدم محض داروغہ جی کو سنانے کے لیے کی گئی ہے۔ لیکن پولیس والوں کے سر میں سیاسی لیکچر سمجھنے کا گودا ہوتا نہیں میری اس وفادارانہ تقریر کے باوجود پولیس کا ایک وفد بہ سرکردگی داروغہ جی میری خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوا کہ "جناب کلکٹر صاحب کی دلی تمنا ہے کہ اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرکاری مہمان خانہ کی عزت افزائی فرمائیں۔" میں نے ازراہ انکسار لاکھ منت و خوشامد سے کہا کہ نہ میں لیڈر نہ ڈکٹیٹر، نہ مہاتما۔ یہ خاکسار اتنی بڑی عزت کا مستحق نہیں۔ مگر ضدی پولیس نے میری ایک نہ سنی۔ مجبوراً داروغہ جی کی استدعا کو شرف قبولیت بخشنا ہی پڑا۔ اور جلسہ کے باقی ماندہ ساتھیوں کے ہمراہ لاری میں بیٹھ کر نہایت ہی شان کے ساتھ پولیس کے جلو میں شاہی مہمان خانہ میں جا پہنچا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے بہ حیثیت میزبان نہایت عزت و آبرو کے ساتھ ایک شاندار عمارت کے ایک حصہ میں جگہ دی۔

وہاں پہنچ کر میں نے سوچا کہ جس طرح آئی۔سی۔ایس کے لیے انگلینڈ ریٹرن ہونا ضروری ہے اسی طرح لیڈر بننے کے لیے جیل ریٹرن ہونا بھی لازمی ہے۔ پھر کیوں نہیں اس امتحان میں شریک ہو کر ڈکٹیٹر یا مہاتما نہیں تو کم از کم لیڈر کی سرٹیفکیٹ تو حاصل کرلوں۔ اس خیال نے ارادہ میں پختگی پیدا کردی۔ لیکن دو ہی چار روز میں افسران جیل کی نامعقول حرکتوں نے مجھے رائے بدلنے پر مجبور کردیا۔ جس امیدوار لیڈری کو یہ توقع ہو کہ جیل کی میعاد ختم ہونے پر لوگ اس کی گاری کھینچیں گے، خود اسے بیل کی جگہ جوت کر رہٹ کھنچوانا کس قدر غیر شریفانہ حرکت ہے۔ ایک لیڈر کی اس طرح توہین پر غصہ میں جی تو چاہا کہ افسران جیل پر ڈیفیمیشن کیس چلا کر ہمیشہ کے لیے جیل بھجوا دوں لیکن نان کوآپریشن کے اس اصول کو (ظلم کو جاری رکھنے کے لیے انصاف کا دروازہ نہیں کھٹکھٹانا چاہیے) کسی طرح نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ سوچا کہ بطور احتجاج بھوک ہڑتال شروع کردوں لیکن یہ بھی خوف تھا کہ اگر مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تو [illegible] آخر نہایت ہی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ ملک کے سب سے بڑے لیڈر کی ہدایت پر عمل کردوں کہ انسان کو اپنی غلطی کے اعتراف میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیے چنانچہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کے بعد لیڈرانہ حرکتوں سے توبہ و استغفار کر کے ایک تحریری معافی نامہ لکھ دیا اور جیل بابو اور کلکٹر صاحب کی جے کا نعرہ لگاتا ہوا خیر و خوبی کے ساتھ گھر واپس آگیا کانگریس والوں کو لازم تھا کہ جس شان سے پولس مجھے جیل لے گئی تھی اسی طرح شاندار مظاہرہ کے ساتھ والنٹیروں کا جلوس میرے نام کی جے کا نعرہ لگاتا ہوا مجھے گھر پہونچا جاتا لیکن بجائے عزت افزائی کے ڈرپوک، پست ہمت وغیرہ کی طعن آمیز آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں اب آپ ہی انصاف کریں کہ کسی کی ملامت کا خوف کئے بغیر جس شخص نے دلیری کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اور تلافی مافات کے لئے تحریری معافی نامہ لکھ کر اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا ہو اس کو بزدل

کہنا کس قدر غصہ آور بات ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایثار و قربانی کے بغیر کوئی لیڈر ہو نہیں سکتا انہیں اتنی تو سمجھ نہیں کہ جو شخص ملک کے اتحاد پر بقرعید کی قربانی تک کو بھینٹ چڑھانے پر تیار ہو اس کی ذات سے قربانی کی امید کرنا عقل کو کند چھری سے ذبح کرنا نہیں تو اور کیا ہے لیڈر کوئی بکرا تھوڑا ہی ہے جو قربانی کے لئے ہر وقت تیار رہے میں نے اس موقع پر لوگوں کو بہترا سمجھایا کہ بھائیو اس وقت داخلہ کانسل کا اہم سوال [illegible] میں چھڑا ہوا ہے اور کانگریس نے اس کی اجازت بھی دے دی ہے۔ ایسے نازک موقع پر مجھ خادم قوم سے کب ہو سکتا ہے کہ ملک تو کانسل کے الکشن کی جنگ میں شریک ہو اور میں آرام سے چپ چاپ بیٹھ کر جیل کے معمولی کاموں میں وقت ضائع کر دوں کیوں کہ ملک کی موجودہ اقتصادی تنزلی نے فاقہ زدوں کی تعداد بڑھا دی ہے اور یہ روٹی کا مسئلہ جیل میں چکی پیسنے سے تو حل ہو نہیں سکتا۔ کانسل میں روٹی کا سوال کرنے سے بھتے کے علاوہ ممکن ہے کہ دہن سگ بہ لقمہ سے کوئی فائدہ بھی پہنچ جائے ان معقول علائق کے رہتے ہوئے عوام کی جب یہ ذہنیت ہے کہ جیل کے سزا یافتوں کے علاوہ کسی بھلے آدمی کو لیڈر ماننے کے لئے تیار ہی نہیں اور سرکار کی یہ حالت کہ جہاں کسی نے ترک موالات کا نام لیا اور داخل در حوالات —— ایسی کشمکش کے اور نازک موقع پر میرے لئے سوائے اس کے اور کیا صورت تھی کہ ہوا کا رخ دیکھ کر تھوڑے دنوں کے لئے بجائے سرکار کے کانگریس سے ترک موالات کر لوں۔

لارڈ اردن کا زمانہ ہوتا تو لیڈری کا پیشہ خیر اتنا خطرناک نہیں تھا بے چارے سختی بھی کرتے تھے تو نہایت نرمی کے ساتھ اتنے خلیق با مروت کہ جب جب صلح کے لئے ہاتھ بڑھایا گیا مصافحہ کیا معانقہ تک کے لئے تیار ہو گئے یہ انھیں کے سیاسی اخلاق و مروت کا نتیجہ تھا کہ اپنے بعض مطالبات کانگریس نے ان سے منوا لئے گو سیکڑوں مطالبات

میں ایک آدھ یعنی دال میں نمک کے برابر سہی مگر مان تو لیا لیکن جب سے یہ پیانے چھوٹے لاٹ صاحب نئے بڑے لاٹ ہو کر آئے ہیں ان کے یہاں تو نمک سازوں یا نمک خوار کسی کی دال نہیں گلتی مغربی مدبر ہو کر مشرقی سیاست دانوں کی طرح بغیر لگی لپٹی رکھے صاف صاف کھری کھری دو ٹوک کہہ دینا نہ معلوم کیسی سیاست دانی ہے ان کا یہ فرمانا کہ جب تک گمراہ کن خیالات سے دل کو پاک و صاف اور سابق گناہوں سے توبہ و استغفار کر کے خشوع و خضوع کے ساتھ سر عبودیت نہ جھکاؤ گے اس وقت تک سلام لو لینے کے عوض میرا دور ہی سے سلام ہو گا ایسی دل شکن باتوں کے بعد آدمی ترک موالات کو ترک نہ کرے تو کیا کرے بہر کیف اکثر مدبروں کا خیال ہے کہ موجودہ لاٹ صاحب کی اس سخت گیر پالیسی نے ملکی تحریک کا گلا گھونٹ دیا لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ سابق لاٹ صاحب نے اپنی مصلح جویانہ حکمت عملی اور شیریں کلامی سے گڑ سے زہر کا کام لے کر پہلے ہی اس تحریک کو زندہ درگور بنا دیا تھا خیر نان کو آپریشن مرحوم کی موت میں زبردست ہاتھ کس کا تھا۔ اس کو تو صحیح طور سے آئندہ کوئی مورخ ہی ہندوستان کے سیاسی مدو جزر کے باب میں لکھے گا، بالفعل اس کا ڈائرکٹ اثر جو میری لیڈری پر پڑا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس خطرناک کام سے کچھ دنوں کے لئے دست بردار ہو جانا پڑا لیکن وہ جو کسی نے کہا کہ چوری چھٹ گئی پر ہیرا پھیری سے بھی جہاں کسی میٹنگ یا جلسہ یا پروسیشن کی خبر سن پائی اس میں اگر شریک نہ ہوا تو اس سے کچھ دور علیحدہ کھڑے ہو کر لیڈروں کی امتیازی تشان ان کا [illegible] مصنوعی تبسم ان کا متکبرانہ انکسار اور لوگوں کا اظہار عقیدت دیکھ کر دل ہی دل میں پولیس کو برا بھلا کہتا کہ ان موذیوں نے خواہ مخواہ جیل بھیج کر ایسے باعزت مشغلہ سے علیحدہ رہنے کا خیال پیدا کر دیا جیل میں پتھر توڑنے کا خوف اگر میری لیڈری میں روڑا نہیں اٹکاتا تو ڈکٹیٹر رہا تھا اور نہیں تو کم از کم کسی جلسہ کا صدر تو ضرور ہو جاتا توبہ و استغفار [illegible]

بعد بھی جو جلسوں میں پھیرے لگاتا پھرتا تھا تو محض اس امید
پر کہ شاید کوئی میری صدارت کی تحریک پیش کردے مگر
جہاں بھی پہنچا دیکھا کہ کوئی نہ کوئی صاحب پہلے ہی سے
کرسی صدارت پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ رشک کے
مارے بعض وقت غصہ میں جی تو چاہتا تھا کہ معافی نامہ کی
ایسی تیسی اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں جب تک کسی
جلسہ کا پریسیڈنٹ بن کر صدر کی حیثیت سے ایک موٹا سا
گجرا گلے میں نہ ڈال لوں لیکن پھر سوچتا کہ اس کے بعد اگر
پولیس گلے کا ہار بن گئی تو لیڈری کا گجرا الٹی آنتیں گلے پڑنے
کی شکل نہ بن جائے اسی ادھیڑ بن میں بیٹھا حصول مقصد کے
ذرائع پر غور کر رہا تھا بے شان و گمان اسکول اور کالج
کے طلبا کی ایک جماعت نے آکر نہایت منت و سماجت سے
کہا کہ ہمارے جلسہ کی صدارت قبول فرما کر ہمیں سرفراز کریں خلاف
توقع یہ مژدہ روح افزا سن کر یاد آیا ؎

اسے تغافل کرتے نہیں لگتی بار
نہ ہو اس سے مایوس امیدوار

اندھا چاہے بصارت اور لیڈر چاہے صدارت۔
مارے خوشی کے جلدی میں میری زبان سے قبول و منظور
نکلا ہی چاہتا تھا کہ یکایک بعض ایسی باتیں ذہن میں آئیں
جن کے متعلق تشفی کر لینا ضروری تھا جلسہ کے اغراض و مقاصد
کو دریافت کرتے ہوئے مزید اطمینان کے لئے یہ بھی پوچھ
لیا کہ کہیں اس قسم کی میٹنگ تو نہیں جس کی کارروائیوں کو پریسیڈنٹ
سمیت ضبط کرنے کا اختیار پولیس کو ہو سب نے مل کر
اطمینان دلایا کہ اس جلسہ کی غرض حصول آزادی تو ضرور
ہے۔ لیکن سلطنت سے نہیں بلکہ والدین کی حکومت سے
اسی لئے اس کا نام اینٹی فادر کانفرنس رکھا گیا ہے میں نے
کہا بے شک اس آزادی کے زمانہ میں ہر شخص آزاد ہے دور
آزادی میں اینٹی مُلا، اینٹی مذہب، اینٹی ملک، اینٹی قوم،
اینٹی فادر، بجز اینٹی گورنمنٹ جتنی قسم کی اینٹی تحریک

ہو اس میں حصہ لے، باقی رہا میری صدارت کا سوال تو میں
ملک و قوم کی خدمت کے لئے ہر وقت حاضر ہوں اور خاص
کر اسکول اور کالج کے طلبا کے لئے تو گویا وقف علی الاولاد
سمجھئے شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہونے کے وقت طلبا
نے کہا کہ چونکہ وقت کم ہے۔ اس لئے ایک دو روز کے اندر
خطبہ صدارت لکھ کر عنایت فرمایئے تاکہ جلسہ کی تاریخ تک
چھپ کر تیار ہو جائے۔ میں نے کہا اس کے لئے آپ تردد
نہ کریں کیوں کہ لیڈر کے واسطے جمعہ و عیدین یا نکاح کا خطبہ
چاہے جس قدر وقت طلب ہو لیکن خطبہ صدارت تو داہنے
ہاتھ کیا بلکہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے میں اگر چاہوں تو خدا
کے فضل سے بغیر لکھے ہوئے خطبہ صدارت زبانی پڑھ
سکتا ہوں۔ لیکن عموماً دوسروں کا لکھا ہوا خطبہ صاف
اور چھپا ہوا ہونے کی وجہ سے صدر کو پڑھنے میں آسانی
ہوتی ہے مطبوعہ خطبہ کا چونکہ عام رواج ہو گیا ہے اس
لئے مجھے اپنا خطبہ صدارت چھپانے میں عذر نہیں چنانچہ
حسب وعدہ تاریخ جلسہ سے دو روز قبل ایک عدد خطبہ
صدارت لکھ کر دے دیا اور تاریخ معینہ پر جلسہ کے مقررہ
وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہو گیا
گھر سے روانہ ہوتے وقت بعض مشیروں نے کہا کہ وقت
کے پہلے جا کر ٹھیک وقت پر کسی جلسہ میں صدر کا پہنچنا شان
صدارت کے ایک دم خلاف ہے صدر جلسہ میں جس قدر زیادہ
تاخیر کر کے پہنچتا ہے اسی قدر وہ زیادہ قابل عزت سمجھا جاتا
ہے۔ یہ سن کر میں نے کہا کہ بھائی صاحب بات تو ٹھیک ہے
لیکن یہ شان ان جغادری لیڈروں کی ہے جنھوں نے اپنی
لیڈری کی دھاک پہلے سے جما رکھی ہے یہاں معاملہ میری
صدارت کا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ آج کل صدارت کے
کمیشنوں میں بڑی بڑی رقموں کے وعدے کے علاوہ اور کیا
کچھ ریشہ دوانیاں نہیں ہوتیں ایسی حالت میں یہ جو خدا
داد موقع ہاتھ آ گیا ہے اس میں چوکنے سے سارا بنا بنایا

کھیل بگڑ جائے گا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے پہنچنے پر زیادہ سے زیادہ لوگ یہی نہ کہیں گے کہ صدر صاحب پروگرام کے مطابق نہیں آئے تو یہ اعتراض چنداں قابل توجہ نہیں اس لئے کہ بقول آپ کے کوئی صدر وقت پر جلسہ میں پہنچتا ہی نہیں تو آپ چاہے بہت پہلے ہو یا بہت بعد وقت کی عدم پابندی میں اور دوسرے صدر برابر ہوئے۔

مختصر یہ کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ چھڑی گھماتا منہ سے سگار کا دھواں نکالتا جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہو گیا جلسہ کا وقت ٹھیک چار بجے تھا لیکن میں تین ہی بجے یعنی ایک گھنٹہ پہلے پہنچ کر اپنی کرسی صدارت پر براجمان ہو گیا اس وقت جلسہ گاہ میں گنتی کے صرف پندرہ یا بیس آدمی بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر میں لوگوں کی آمد شروع ہو گئی مگر جو شخص آتا مجھے دیکھ کر مسکراتا لوگوں کے لبوں پر تبسم دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ میری صدارت سے ہر شخص خوش ہے چار بجتے بجتے اسکول اور کالج کے طلبار اور شہر کے نوجوانوں سے پورا شامیانہ بھر گیا اینٹی نادر کانفرنس کے سکریٹری صاحب نے چپکے سے کان میں آکر کہا کہ اب باضابطہ کارروائی شروع ہونی چاہیئے۔ چوں کہ آپ کا نام صدارت کے لئے پیش ہوگا۔ اس لئے تھوڑی دیر کے لئے قریب کی کسی کرسی پر تشریف رکھئے باقاعدہ تحریک و تائید کے بعد پھر اپنی جگہ پر باضابطہ صدر کی حیثیت سے تشریف لے آئیے گا میں نے ارادہ ہی کیا تھا کہ اپنی چھڑی اور ٹوپی کرسی صدارت پر رکھ کر تھوڑی دیر کے لئے ہٹ جاؤں تاکہ دوسرا کوئی آکر اس ریزروسیٹ پر قبضہ نہ جمائے۔ لیکن معاً انتخاب میئر کے موقع پر کلکتہ کارپوریشن کی صدارت کا واقعہ یاد آگیا کہ کرسی پر ڈٹے رہنے کے باوجود دوسرا صدر زبردستی دھنس کر شریک صدارت ہو ہی گیا میں نے دل ہی دل میں کہا کہ نہ بھائی اب جو کچھ ہو مغربی سیاست کا اصول یہ ہے جس مقام پر جائز

یا ناجائز ایک بار قبضہ ہو جائے تو اس سے ہٹنا کسی طرح مناسب نہیں اور خاص کر صدارت کے معاملہ میں کیوں کر دو بادشاہ اور اقلیمے نہ گنجند تو لوگوں نے کہا ہے لیکن دو صدر در یک کرسی نہ انٹینڈ کسی نے نہیں لکھا ان باتوں پر غور کرنے کے بعد قبل اس کے کہ میرا نام صدارت کے لئے باضابطہ پیش ہو کر تائید ہو جھٹ کرسی صدارت پر کھڑے ہو کر میں نے اپنا مطبوعہ خطبہ پڑھنا شروع کر دیا۔

حضرات! حاضرین و ناظرین و سامعین جلسہ! قبل اس کے کہ میں جلسہ کے اغراض و مقاصد پر اظہار خیال کروں آپ کی اس ذرہ نوازی و غریب پروری کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ ناچیز کمترین، ہیچمداں کو بلا اختلاف صدر منتخب کر کے اپنی شرافت کا بین ثبوت دیا ہے گو میں اس لائق نہیں کہ صدارت کے بھاری بوجھ کو اپنے کمزور دوش پر اٹھا سکوں۔ لیکن جب باربرداری کے لئے آپ کی نظر انتخاب مجھ ہی پر پڑی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس بوجھ کو پھینک کر بھاگ جاؤں اس لئے "ھل جزاء الاحسان الا الاحسان" کے اصول پر آپ کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر فرض ہے۔

ابا بعد! آپ حضرات کی خدمت میں ——— ؟...

یہ جملہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ایک طرف سے آواز آئی "جناب صدر صاحب! یہ اَبا بعد کا مطلب نہیں سمجھا" چونکہ کہ میں نے کہا "معاف کیجئے" اس میں میرا کوئی قصور نہیں کاتب نے غلطی سے نقطہ بڑھا کر "اما" کو "ابا" بنا دیا اور اس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے سمجھا کہ اینٹی فادر کانفرنس میں "اما" کے بدلے "ابا" کا رہنا زیادہ مناسب ہے مہربانی فرما کر آپ لوگ اس کی تصحیح کر لیں۔ بہرکیف خاکسار صدر اصل خطبہ شروع کرتا ہے۔

(باقی آئندہ شمارہ میں)

شگوفے

▬ ایک آرٹسٹ نے اپنے دوست سے کہا کہ "مجھے بہت دیر کے بعد معلوم ہوا کہ مجھ میں مصوری کی صلاحیت بالکل مفقود ہے۔"

"تو پھر کیا تم نے مصوری ترک کر دی؟" دوست نے سوال کیا۔

"نہیں۔ کیونکہ اُس وقت تک میں بہت مشہور ہو چکا تھا۔" آرٹسٹ نے جواب دیا۔

* * *

▬ ایک کاروباری فرم کے منیجر نے اپنے منیجر دوست سے شکایت کی کہ "یار تم نے جس سکریٹری کی میرے پاس سفارش کی وہ تو بڑی غیر شائستہ نکلی۔"

"کیوں کیا ہوا؟" دوست نے پوچھا۔

"آج میں جب اُسے خط لکھانے کے لئے اپنے اجلاس پر بلایا تو وہ کمرے میں کرسی تلاش کرنے لگی!" منیجر نے شکایت کی۔

* * *

▬ ایک مسلسل دُبلی ہوتی ہوئی خاتون سے ان کی سہیلی نے پوچھا۔ "نصیبِ دشمناں، کیا بات ہے تم بہت دُبلی نظر آ رہی ہو؟"

"نہیں کوئی خاص نہیں۔ صحت تو اچھی ہے۔ البتہ کم بخت خادمہ بہت ستاتی ہے۔ اس کی وجہ سے دن رات تکلیف میں مبتلا ہوں" خاتون نے جواب دیا۔

"تو پھر اس کو ملازمت سے برخواست کر دو" سہیلی نے مشورہ دیا۔

"نہیں ابھی نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا وزن اور دس پونڈ کم ہو جائے۔ تب اس کی چھٹی کر دوں گی۔" خاتون نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

* * *

▬ حامد: "بہت دن سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے ملاقات ہو۔ اور میں اس چھاتے کے بارے میں آپ کو یاد دلاؤں جو آپ نے مجھ سے گذشتہ ہفتہ حاصل کیا تھا۔"

محمود: "مجھے افسوس ہے کہ میں وہ چھاتا آپ کو واپس نہیں کر سکتا، کیونکہ میں نے اسے اپنے ایک دوست کو دے رکھا ہے۔ لیکن، کیا آپ کو اب اس کی ضرورت ہے؟"

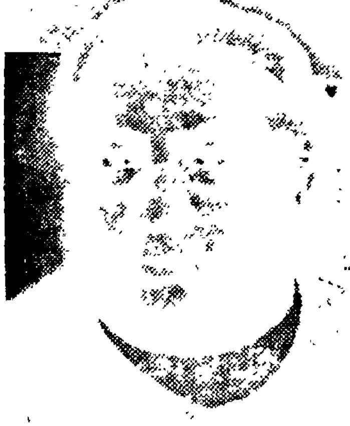
حامد: "ویسے مجھے تو اس کی ضرورت نہیں لیکن میں نے جس سے وہ چھاتا مستعار لیا تھا وہ کہہ رہا ہے کہ اب چھاتے کے مالک کو تقاضہ شدید ہے کہ وہ اس کو لوٹا دے۔"

* * *

▬ سنا کہ ایک صاحب روز ۶۴ دن تک ایک حسینہ کو بذریعۂ ڈاک محبت نامے بھیجتے رہے۔ ۶۵ ویں دن نتیجہ سامنے آیا۔ اس حسینہ نے ڈاکیہ سے شادی رچالی!

* * *

▬ میاں بیوی ناشتے پر دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ اس سکوت کو توڑنے کے لئے شوہر نے بہت سی اوٹ پٹانگ باتیں بھی کیں۔ لیکن برف پگھلتی ہی نہ تھی۔ آخرکار بیوی نے خود کہا کہ "میں اس بار تو تم کو معاف کرتی ہوں، لیکن آئندہ پھر کبھی خواب میں تم کسی خاتون کے ساتھ نظر آئے تو میں تم سے زندگی بھر نہیں بولوں گی!"



وزیراعظم کا بیس نکاتی معاشی پروگرام



ہماری وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کی جانب سے شروع کردہ بیس نکاتی معاشی پروگرام بلاشبہ آندھراپردیش کی ترقی اور بتدریج فروغ کے لئے ایک نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے پچھڑے ہوئے طبقات کی فلاح وبہبود کے لئے کی جانے والی کوششوں میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اور کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے لاکھوں عوام کے لئے ایک نئی اُمید پیدا کردی ہے

منھ بولتے حقائق

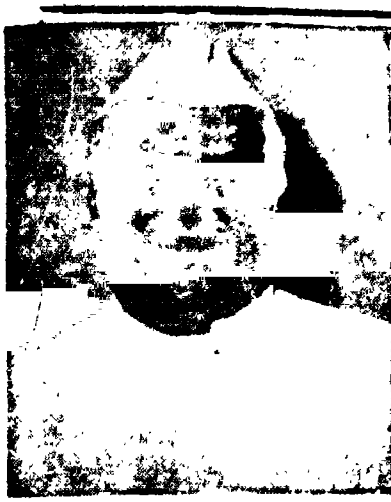
ریکارڈ غذائی پیداوار

غذائی پیداوار ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۶۷ر۱۰۶۰ لاکھ ٹن کے ایک ریکارڈ حد تک پہونچ چکی ہے۔ طوفان بادباراں اور خشک سالی کے باوجود ہنگامی منصوبوں کی عاجلانہ عمل آوری کے نتیجے میں پیداوار سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں کم سے کم ۷۰ لاکھ ٹن ہوگئی۔

عوام کے لئے ارزاں پارچہ

ہینڈلوم کے ساٹھ فیصد بافندوں کو امداد باہمی کی صف میں شامل کیا گیا ہے۔ سستے داموں کے پارچہ کی پیداوار جو سال ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۱۸۹ لاکھ مربع میٹر تھی، سے بڑھ کر سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۲۱۳ لاکھ ہوگئی اور سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۳۲۰ لاکھ تک پہونچ گئی ہے۔ ارزاں پارچہ اب ۳۸۸ نکاسی کے مراکز کے ذریعہ عوام میں تقسیم کیا جارہا ہے۔

(سلسلہ صفحہ ۶۱ پر)



کمزور طبقات کیلئے دست تعاون



وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے (۲۰) بیس نکاتی معاشی پروگرام کی عمل آوری میں آندھرا پردیش پیش پیش ہے۔ اس پروگرام کے جز کے طور پر حالیہ برسوں میں کمزور طبقات کے لئے کئی فلاحی اسکیمات روبہ عمل لائی گئی ہیں۔

فلاحی اقدامات کے سلسلے میں کئے گئے کچھ نمایاں واہم کارنامے یہ ہیں۔

فاضل زمینات کی تقسیم

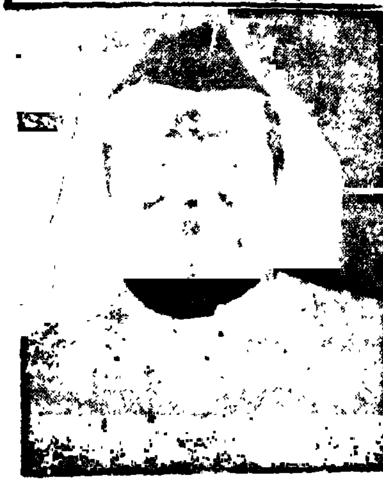
۷۴۰۶۲	درج فہرست اقوام میں	۱،۰۵ لاکھ ایکڑ
۲۴۳۷۱	درج فہرست قبائل میں	۳۹،۹ ہزار ایکڑ
۴۰۸۷۱	پسماندہ طبقات میں	۵۸،۷ ہزار ایکڑ

سرکاری زمینات کی تقسیم

- ۴۶۳۶۷۲۰ کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں ۱۱،۸ لاکھ ایکڑ زمین تقسیم کی گئی۔
- کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے ۱۲ لاکھ افراد میں مکانات کے لئے بھی اراضی کی تقسیم عمل میں لائی گئی ۱۲۷۰۱ بندھوا مزدوروں کو آزاد کرایا گیا جن میں سے ۵۸۰۰ مزدوروں کی باز آبادکاری عمل میں لائی گئی۔
- * کھیت مزدوروں کے لئے اقل ترین اُجرتوں پر عمل آوری کرائی گئی ہے۔ اور ایسے مزدوروں کا تعلق کمزور طبقات سے ہے۔

(سلسلہ ص ۶۳ پر)

کسانوں کیلئے اور ہم سب کیلئے بہتر افادیت کے اقدامات





ہماری ریاست میں بڑے بڑے دریا بہتے ہیں۔ زمین زرخیز ہے۔ کسان سخت محنت کرنے والے ہیں لیکن ان سب کو اگر اُن کے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تو کوئی فائدہ مند نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

آندھراپردیش نے آبپاشی کے تحت کے علاقوں کی ترقی کے لئے اقدامات کا آغاز کرکے زراعت و کاشتکاری کے تصور کو عصری بنادیا ہے۔ ناگ ارجنا ساگر رائٹ کنال ناگ ارجنا ساگر لفٹ کنال، سری راما ساگر اور تنگبھدرا پراجیکٹ کامپلکس کے تحت چار آبپاشی علاقوں میں ترقیاتی کام انجام دئیے جارہے ہیں۔

ترقیاتی پروگرام درج ذیل اقدامات پر مشتمل ہے

- سربراہی آب کا مشترکہ انتظام جس کے تحت واڑہ بندی کا طریقہ یعنی باری باری سے پانی کی سربراہی کا انتظام کسانوں میں تیزی کے ساتھ مقبول اور پسندیدہ ہوتا جارہا ہے۔
- کھیتوں میں پانی کی سربراہی کے لئے نالیوں کی تعمیر۔
- باقاعدگی کے ساتھ آراضیات کی ترقی اور بہتری۔

(سلسلہ ۶۵ پر)

- کسانوں کے لئے قرض کی سہولیات۔
- پرزور زرعی اور توسیعی پروگرام۔

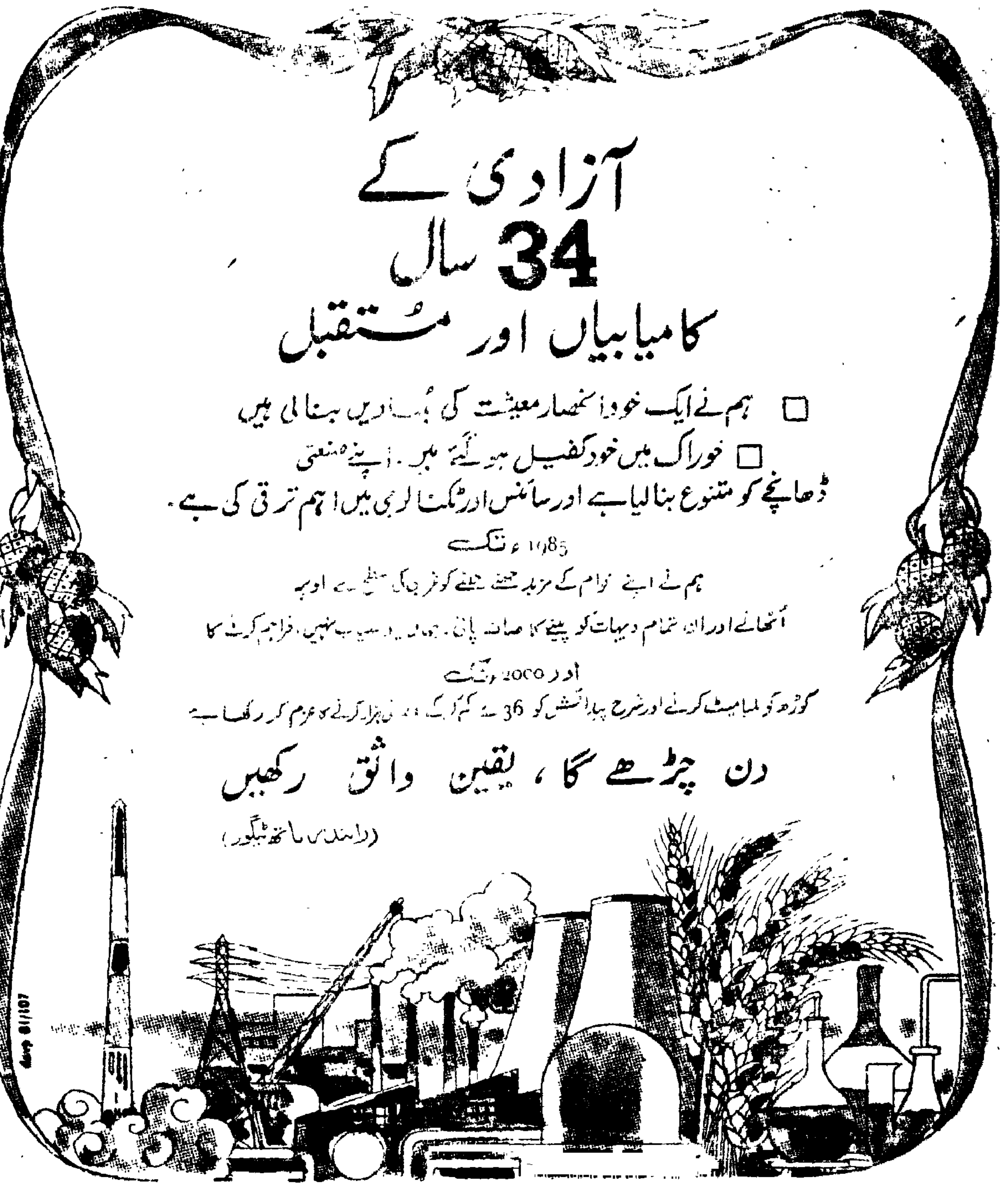
مذکورہ بالا پروگرام کی عمل آوری پر سال ۱۹۸۱-۸۲ء کے دوران ۸۹۷ لاکھ روپیوں سے زائد رقم خرچ کی جائے گی۔

=(آج غذائی اجناس اور تجارتی اجناس زیادہ مقدار میں اُگائی جارہی ہیں)=

کسان خوش ہے — آپ خوش ہیں

جاری کردہ :- ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

DIPR - 38 39701/81


آزادی کے
34 سال
کامیابیاں اور مستقبل
□ ہم نے ایک خود انحصار معیشت کی بنیادیں بنا لی ہیں
□ خوراک میں خودکفیل ہو گئے ہیں۔ اپنے صنعتی ڈھانچے کو متنوع بنا لیا ہے اور سائنس اور ٹکنالوجی میں اہم ترقی کی ہے۔
1985ء تک
ہم نے اپنے عوام کے مزید حصے کو غریبی کی سطح سے اوپر
اٹھانے اور ان تمام دیہات کو پینے کا صاف پانی
اور 2000ء تک
کوڑھ کو ملیامیٹ کرنے اور شرح پیدائش کو 36 سے کم کر کے
دن چڑھے گا، یقین واثق رکھیں
(رابندر ناتھ ٹیگور)



زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

ماہنامہ حیدرآباد

ایڈیٹر:
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

منیجر:
سمیع جلیل

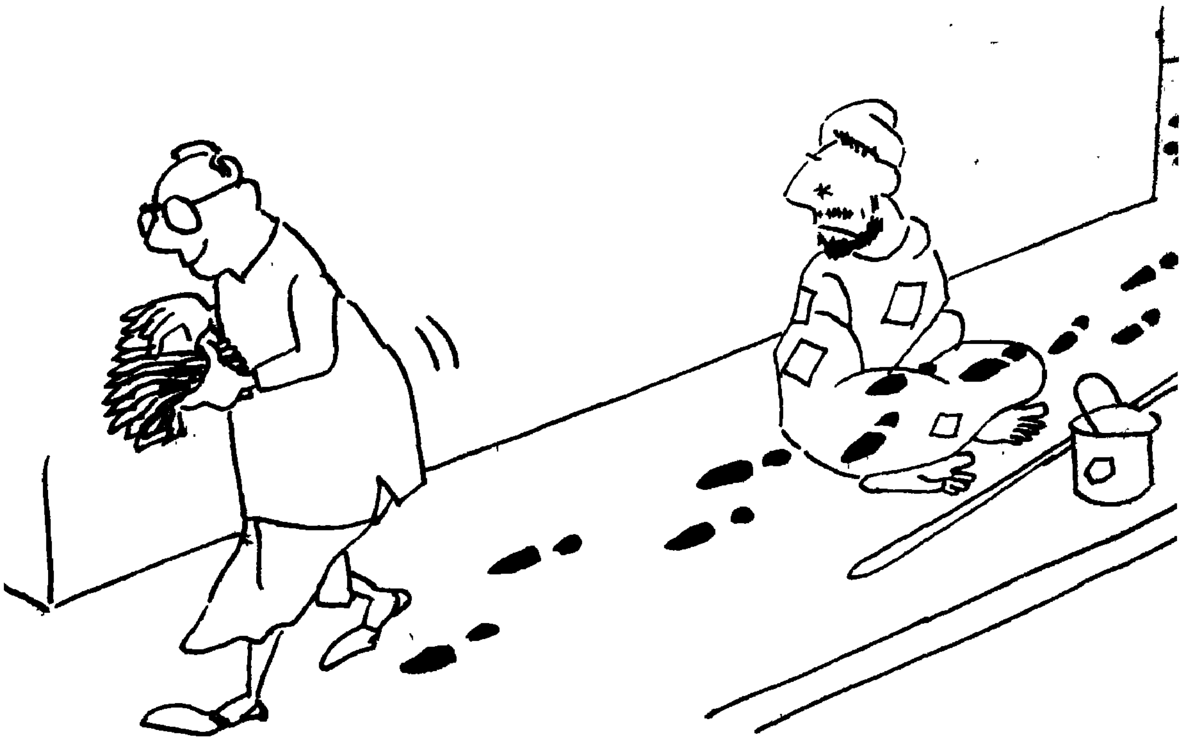
مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

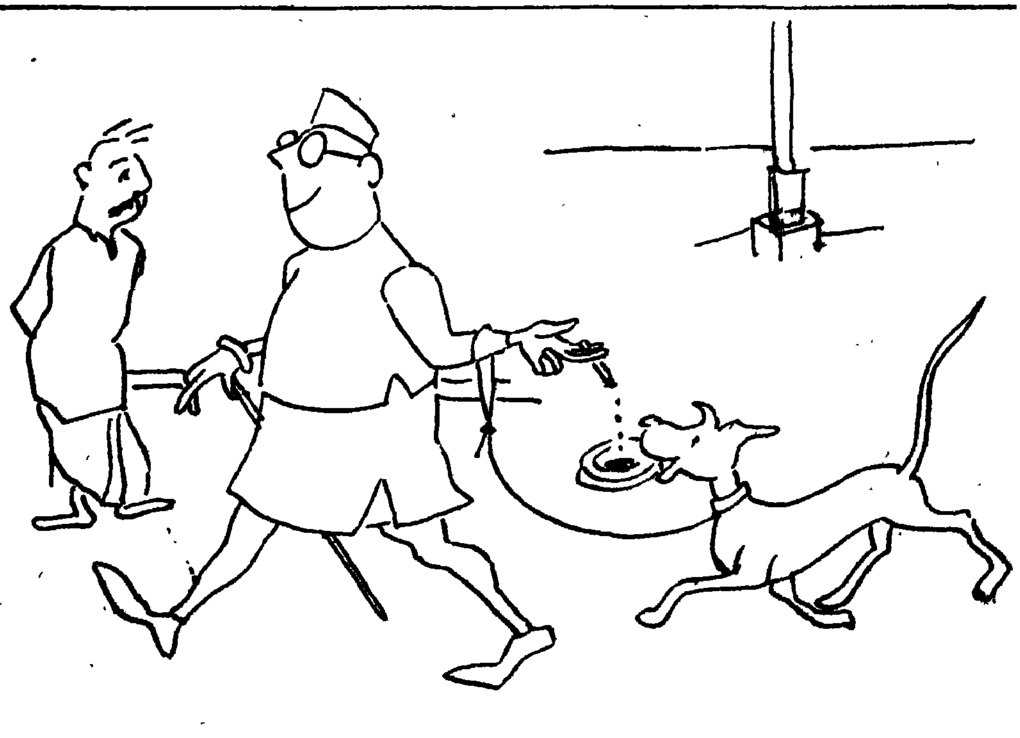
سالانہ: ۲۵ روپے
بیرونِ ہند سے: ۴۵ شلنگ
فی پرچہ: ۲ روپے ۵۰ پیسے

طباعت:
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ۲
بائنڈنگ: عظیمیہ بک بائنڈنگ ورکس پرانی حویلی حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ:
شگوفہ ۳۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد-۱، فون: 57716

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے فہرست





یوسف ناظم

جیبِ خاص

جس طرح مہمانوں میں ایک قسم ہوتی ہے مہمانِ خصوصی۔ اُسی طرح جیبوں کی قسموں میں بھی ایک خصوصی قسم ہوتی ہے لیکن اسے جیبِ خصوصی نہیں جیبِ خاص کہا جاتا ہے۔ یہ جیب، خاص خاص موقعوں پر بروئے عمل لائی جاتی ہے۔ یہ جیب آسانی سے نظر نہیں آتی بلکہ نظر ہی نہیں آتی۔ دوسری جیبیں صرف خوبصورتی کی علامت ہوتی ہیں اور اگر انہیں استعمال نہ کیا جائے تو ان کی خوبصورتی دیر تک برقرار رہتی ہے۔ یہ جیبیں پہننے کے کپڑوں میں جگہ جگہ لگائی جاتی ہیں۔ لباس میں جہاں بھی جگہ خالی نظر آتی ہے ایک جیب لگا دی جاتی ہے۔ اِن جیبوں کا خالی رہنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ ...نفوبی جیبیں ہوتی ہیں۔ ان سے آدمی کی ہمت بندھی رہتی ہے۔ اتفاق سے اِن جیبوں میں سے کسی ایک جیب میں کچھ ہوتا بھی ہے تو بہت جلد کسی ہنرمند کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ ہنرمند وہ لوگ ہوتے ہیں جو ساقی کی نظرِ کرم کے محتاج نہیں ہوتے۔ خود ہاتھ بڑھا کر جام اُٹھا لیتے ہیں۔ ان ہنرمندوں کو این و آں سے بحث نہیں ہوتی۔ ان کا فیض بلا تخصیص جنس و عمر ہر کسی کو پہنچتا ہے اور ہر جیب کسی نہ کسی وقت فرورکشتی ہے۔ کہا جاتا ہے جس شخص کی جیب نہیں کٹتی اُسے ملک و قوم کا وفادار نہیں سمجھا جاتا۔ جب بھی کوئی مظلوم کسی بڑے شہر میں ٹرین یا بس سے نمودار ہوتا ہے تو زمین پر اُس کا پہلا قدم پڑتے ہی اُس کی جیب کٹتی ہے۔ یہ عروسِ شہر کی خدمت میں پہلی سلامی ہوتی ہے جو رونمائی کی خوشی میں ادا کرنی پڑتی ہے ایک مرتبہ جیب کٹ جائے تو آدمی شہری زندگی کی راحتوں کا عادی ہو جاتا ہے۔

شہروں میں، اجنبیوں کے استقبال کے لئے ماہرینِ فن کی ایک جماعت اہم اور معروف مقامات پر ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ یہ استقبالیہ کمیٹی ہوتی ہے جس کے ممبر سارے شہر میں پھیلے ہوتے ہیں۔ ان کا جذبۂ خدمت گذاری انہیں ہر گھڑی ہر پَل مستعد رکھتا ہے اور کبھی کبھی وفورِ جذبات میں یہ اپنے ہی کسی رفیق کی جیب پر اپنا ہنر آزما بیٹھتے ہیں۔ صرف ایک چھوٹا سا کنگھا ہاتھ آتا ہے ـــ لیکن ایسے معاملوں میں اہمیت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ فن کے ساتھ انصاف ہوا یا نہیں۔ دھن ضمنی چیز ہوتی ہے۔

عام جیبوں کی تراش خراش، وضع قطع اور اُن کے حُسن و جمال پر اب زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے۔ ایسی خوبصورت، خوبصورت جیبیں نظر آنے لگی ہیں کہ جو بھی دیکھے بے ساختہ کہہ اُٹھے ۔ ع

رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

لیکن ان جیبوں کی ریسرچ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ۔ ؎

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

ان نمائشی اور آزمائشی جیبوں میں گلدان جیبیں بھی ہوتی ہیں اور قلمدان جیبیں بھی۔ گلدان جیبوں پر ایک پھول کڑھا ہوا ہوتا ہے جس سے صاحبِ جیب کے جمالیاتی ذوق پر روشنی پڑتی ہے اور مصوری سے ان کی بے پناہ دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ قلمدان نما جیبوں میں فاؤنٹین پن رکھنے کا الگ خانہ اور بال پن رکھنے کا الگ خانہ بنا ہوتا ہے۔ (روشنائی کے دھبوں والا خانہ، فاؤنٹین پن کا خانہ ہوتا ہے)۔ یہ جیبیں خاص طور پر اہلِ قلم حضرات کے لئے تیار کی جاتی ہیں اور ان سے شعر و ادب کی ترقی کے راستے کھلتے ہیں۔ اہلِ قلم لوگوں کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ انہیں کہیں بھی اور کسی وقت بھی قلم کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ جب بھی کوئی خیال یا شعر انہیں ورغلاتا ہے یہ بروقت اپنے خیالات قلمبند کر سکتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب بھی کسی اہلِ قلم کی جیب کٹی ہے دستکار کو صرف خیالات اور حوالات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ خیالات زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب عورتیں زنانہ لباس پہنتی تھیں اور صاف پہچانی جاتی تھیں کہ یہ عورتیں ہیں۔ اس لباس میں انہیں جیبوں کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ مردوں کی جیبیں اُن کے لئے کافی و شافی تھیں۔ لیکن اب مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ عورتیں مردانہ لباس زیبِ تن و تن پوش کریں۔ عورتوں میں جو لباس مقبول ہوا ہے وہ جینز ہے ـــــ جینز بھی پتلون ہی کی ایک شاخ ہے یہ بھی دو شاخہ ہوتی ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ جینز کا بے حد بدرنگ ہونا ضروری ہے۔ (جینز کو بدرنگ کہنا بھی ایک لحاظ سے مروت ہی ہے۔ اتنی نفیس اور دیدہ زیب کپڑے کی بھی جینز ہوتی ہیں لیکن یہ کم پہنی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ مشکل یہ ہوتی ہے کہ لوگ صرف جینز ہی کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ہر جینز کی پچھلی جیب پر ایک کتبہ ضرور لگا رہتا ہے۔ اس کتبے پر مختلف قسم کے اندراجات ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں آٹو رکشاؤں پر بھی پیچھے کی طرف کچھ نہ کچھ لکھا ضرور ہوتا ہے۔ جیسے نگاہِ کرم، بجلی، صبا رفتار وغیرہ۔ لیکن جینز کو آٹو رکشا سے تشبیہ دینا مناسب نہیں ہے ـــ یوں ایک جینز پر ہم نے لکھا دیکھا تھا "چیز" (CHASE)۔ ہم سمجھے یہ ناول نگار ہیڈلے چیز کا آٹو گراف ہے لیکن پوچھنے پر معلوم ہوا یہ دعوت نامہ ہے۔ اُس دن سے ہم جینز کی افادیت اور اہمیت کے قائل ہو گئے ـــــ ہم جیسے کتنے لوگ جینز پہننے والوں کی جیب میں پڑے ہوتے ہیں۔

پتلون تو اپنی جگہ برقرار ہے لیکن اس کی جیبوں کے مقامات البتہ بدل گئے ہیں۔ یہ پہلے پتلون کی مشرقی اور مغربی جانب میں ہوا کرتی تھیں اور آدمی جب بھی چلتا یا بیٹھتا یہ اپنی باچھیں کھول دیتی تھیں۔ اب یہ جیبیں کھسک کر سامنے کی طرف آگئی ہیں اور بالکل انصاف کا ترازو معلوم ہوتی ہیں۔ ان جیبوں میں سے جب بھی کچھ نکالنا ہوتا ہے بیٹھے ہوئے شخص کو ادب سے کھڑے ہونا پڑتا ہے۔ معلوم یہ چیز ہل تو جاتی ہے لیکن اس میں کم سے کم پانچ منٹ لگتے ہیں۔

کچھ شرفاء اپنی جیبوں سے ہولڈال کا کام لیتے ہیں۔ ان جیبوں میں گنجائش ہی گنجائش ہوتی ہے۔ کچھ گنجائش یہ خود پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کی ایک جیب میں ایک کتاب، ایک منی پرس، ایک نیپکن اور سگریٹ کیس کی گنجائش ہوتی ہے۔ (دیا سلائی کی ڈبیا کوئی

یکتا ہی نہیں)۔ دوسری جیب میں بچوں کے یونیفارم کا کپڑا اور کچھ اسٹیشنری رکھی جاسکتی ہے۔ جب کبھی کوئی شخص ایسی دو جیبوں کے ساتھ سڑک پر آنکلتا ہے تو دوسرے راہگیروں کو ذرا ہٹ کر چلنا پڑتا ہے۔

ماہرینِ فن کی دزدیدہ اور مشتاق نگاہوں سے محفوظ جیبیں بھی ایجاد کی گئی ہیں جو کچھ کچھ پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اس جیب کو پتلون میں نصب کیا جاتا ہے لیکن یہ بیلٹ کے نیچے اندر کی طرف ہوا کرتی ہے۔ یہ اینٹی چیمبر کی طرح ہوتی ہے۔ اس جیب سے پیسے نکالنے کے لئے آدمی کو عام طور پر باتھ روم جانا پڑتا ہے۔ کسی پبلک مقام پر پیسے نکالنے کی ضرورت پیش آجائے تو شخصِ مذکور عوام کی طرف سے لیڈر کی طرح مُنہ پھیر کر دستِ شوق دراز کرتا ہے اور منزلِ مقصود پہ پہنچتا ہے۔ اس جیب کو بھی سر کرنے کے طریقے فن کار جانتے ہیں۔

یہ تو وہ جیبیں ہیں جو ہم جیسے عوام استعمال کرتے ہیں لیکن کچھ ایسے خوش قسمت لوگ بھی ہوتے ہیں جو جیبِ خاص کے مالک ہوتے ہیں۔ پہلے زمانے میں یہ جیب صرف بادشاہوں اور شاہزادوں کا حق ہوا کرتی تھی۔ یوں تو شاہی خزانہ بھی اُنہیں کے زیرِ تصرف ہوا کرتا تھا لیکن جب بھی بادشاہ سلامت شخصی طور پر کسی کی طرف راغب ہو جاتے یعنی انہیں کسی کا رقص، نغمہ یا شعر پسند آجاتا تو موصوف اپنی جیبِ خاص کو حرکت میں لایا کرتے تھے۔ اس جیبِ خاص سے سچے موتیوں کا ہار، یا کچھ اشرفیاں برآمد ہوتی تھیں۔ شاعروں کا منہ کبھی کبھی اشرفیوں سے بھر دیا جاتا تھا۔ مُنہ بھر دینے کا اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ شاعر آئندہ بھی اپنا منہ کھُلا ہی رکھے۔ ایک شاعر کا منہ بھرنے کے لئے ۴ یا زیادہ سے زیادہ ۵ اشرفیاں کافی ہو جاتی تھیں۔ جیبِ خاص پر بھی کوئی خاص بار نہیں پڑتا تھا اور اسطرح کئی قصیدے سُنے جاسکتے تھے۔ جس کسی کو سچے موتیوں کا ہار عنایت کیا جاتا وہ ہار اُس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا تھا۔

شہزادوں کی جیبِ خاص اس لئے متعین ہوتی تھی کہ آگے چل کر انہیں بھی بادشاہ بننا ہوتا تھا۔ شہزادے عنفوانِ شباب ہی سے جیبِ خاص کی ماہیت اور اس کے استعمال کے طریقوں سے واقف ہو جاتے تھے (رموزِ مملکت سے آگاہی ہونی ضروری تھی)۔ شہزادوں کی جیبِ خاص سے ہیرے یا زمرد کی انگوٹھی جسے بھی عطا ہوتی اُس کا شہنائی سے ضرور استقبال ہوتا۔ (یہ طریقے ابھی بدلے نہیں ہیں صرف چہرے بدلے ہیں)۔

اُن دنوں اُمراء اور عائدینِ سلطنت کو بھی جیبِ خاص استعمال کرنے کی اجازت تھی اور اس کا استعمال اُن کی اپنی سمجھ اور عادتوں کے مطابق ہوا کرتا تھا۔ بعض اُمراء کو اپنی سمجھ اور عادتوں کے مطابق ہوا کرتا تھا۔ بعض اُمراء کو اپنی جیبِ خاص سے ہاتھی عطا کرنے کی بھی عادت تھی بلکہ کہا یہ جاتا ہے کہ جب بھی کوئی رئیس کسی غریب مُصاحب کے درپئے آزار ہو جاتا اُسے ایک ہاتھی کی سزا دیتا۔ اُن دنوں اِسے انعام و اکرام کہا جاتا تھا۔ ہاتھی عطا کئے جانے کی صورت میں خود ہاتھی یا اُس مصاحب کی جاجلا نہ وفات تقریباً یقینی ہو جاتی۔ ہاتھی کے بچ رہنے کے امکانات زیادہ ہوتے۔

جیبِ خاص کا رواج آج بھی ہے اور اب یہ زیادہ کارآمد ہوگئی ہے۔ جیبِ خاص کی مدد سے اپنے قدموں پر کھڑے رہنا ممکن ہے یا نہیں، ٹھیک سے نہیں کہا جاسکتا لیکن اس کے بل بوتے الیکشن میں کھڑے رہنا ضرور آسان ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اب تو ہر قدم پر جیبِ خاص کی ضرورت پیش آنے لگی ہے۔ دواخانے میں مریض کا داخلہ ہو یا مدرسے میں بچے کا داخلہ۔ یہ جیبِ خاص کے بغیر ممکن نہیں۔

ان دنوں جیبِ خاص کو وطن سے باہر بھی منتقل کیا جاسکتا ہے۔ یہ جیب، جیبِ خاص نہیں، جیبِ خاص الخاص ہوتی ہے۔

رضا نقوی واہی

یہ صنفِ ادب کوئی ہریجن تو نہیں ہے

منظوم خط بنام خواجہ عبدالغفور صاحب ۔ آئی ۔ اے ۔ ایس (ریٹائرڈ) سکریٹری مہاراشٹرا اردو اکادمی

اے خواجہ دوالیٔ "چمن زارِ ظرافت"
کل مجھ کو میسر ہوئی امکاں کی زیارت

ممنونِ کرم ہوں کہ یہ خوش رنگ مجلّہ
بھجوایا ہے ناچیز کو ازراہِ عنایت

رعنائی و زیبائی میں نورس کا یہ ہمزاد
واللہ کہ ہے اک "گل و گلزارِ" صحافت

قامت بھی وہی ہے، قدِ موزوں بھی وہی ہے
آہنگ وہی ہے، وہی صورت وہی سیرت

ہے اہلِ نظر کے لئے جلووں کی گذرگاہ
الفاظ و معانی کا یہ دریائے لطافت

ہمراہ مضامیں کے، پڑھی اس کی بھی روداد
کی آپ کی نگرانی میں دفتر نے جو خدمت

اک شئے کی کمی اس میں نظر آتی ہے لیکن
جی چاہتا ہے، عرض کروں، ہو جو اجازت

جاتی نہیں کیوں اس پہ نظر، اہلِ نظر کی
اک شعبۂ تنقید ہے جب طنز و ظرافت

اصنافِ ادب میں یہ کسی سے نہیں کم تر
اوروں سے کچھ اونچے ہی ہیں اسکے قد و قامت

افسانہ و تنقید و غزل، سب کا ہو چرچا
اس صنف پہ اُٹھے نہ مگر چشمِ عنایت

جب غالبؔ و اقبالؔ پہ ہوتے ہیں سمینار
کیوں حضرتِ اکبرؔ نظر انداز ہوں حضرت؟

یہ صنفِ ادب کوئی ہریجن تو نہیں ہے
سر جس کے منڈھی جائے چھوا چھوت کی لعنت

میں یہ نہیں کہتا کہ وہ سب چیز نہ ہو ۔۔۔ ہو
لیکن نہ ہو حق تلفیٔ اربابِ ظرافت

امکاں میں اک گوشے میں "کیوڑے کا بھی بن" ہو
دربار میں خواجہ کے ہو اپنوں کی بھی شرکت

مُردوں ہی پہ کیوں داد کی بارش ہو ہمیشہ
زندوں پہ بھی بیداد کی قائم ہو روایت

ہوں "پیاز کے چھلکے" بھی کبھی بحث کا مرکز
ہو "آدمی نامہ" پہ بھی کچھ وعظ و نصیحت

گُل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

* * *

طارق بشیر (الریاض)

توند

توند شخصی آزادی کا بے ساختہ اعلان ہے۔ بعض لوگ اسے ناجائز تجاوزات کے ضمن میں لاتے ہیں۔ لیکن یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو دنیا کی ہر چیز پر نظر ڈالنے سے پہلے تشکیک کی عینک لگانا ضروری سمجھتے ہیں اور نتیجے کو اپنے حق میں رکھنے کے لئے زندگی بھر منفی دلائل جمع کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ جبکہ توند کا شمار دنیا کا کوئی بھی شخص غیر قانونی جائیداد میں کرنا پسند نہیں کرے گا۔ کیونکہ صحت و زندگی کے اس سرچشمے کے فیضان ہی سے دنیا کی اَن گنت بوقلمونیاں وابستہ ہیں۔

والد مرحوم کہا کرتے تھے۔ "موٹے آدمی سے ڈرو نہیں، پتلے آدمی سے لڑو نہیں۔" مفہوم اُن کا بھی یہی تھا کہ اگر موٹے آدمی کو تم گدگدا کر بھاگ جاؤ گے تو نہ صرف تم محفوظ ہو گے بلکہ تمہارے یوں بھاگ نکلنے پر وہ موٹا آدمی خود بھی خوش ہو اُٹھے گا کہ کوئی تو ہے جو مجھ سے ڈرتا ہے۔ لیکن دُبلے آدمی کے ساتھ ایسی کوئی حرکت کرنا تو کجا، کوئی تیکھی بات بھی کرلی جائے تو اُس کے جواب میں بھاگنے کی مہلت بھی ہرگز نہیں ملے گی۔ پتلا آدمی زندگی میں کبھی نہ کبھی اپنے باریک وجود کے سرکنڈوں میں جکڑ کے ایسی پٹخنی دے گا کہ زندگی کی شاہراہ پر ہمیشہ کے لئے قدم پیچھے کی جانب مُڑ جائیں گے۔

عام طور پر موٹے آدمی سے خواہ مخواہ کا خوف وابستہ کرلیا جاتا ہے اور اگر اُس کی ناک کے نیچے چند مونچھوں کا گچھا بھی موجود ہو تو خوف میں دو دولت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ صرف چند لمحوں بعد جب اُس شخص سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے تو محسوس ہوتا ہے، واہ۔ یہ تو انتہائی بے خطر و بے ضرر شخص ہے۔ ایسے آدمی کا گریبان کھلا رہتا ہے۔ جو اُس کی وسیع المشربی اور فراخ دلی کا مستند ثبوت ہے۔ بار بار کھلکھلا اور زوردار قہقہے لگانا اُس کی پہلی خصوصیت ہوتی ہے۔ اور چند ہی ثانیوں میں اُس کی توند کا طلسم، اُس کی مونچھوں کی ہیبت اور اُس کے بھاری بھرکم وجود کا دہشتناک دباؤ پھُر کرکے اُڑ جاتا ہے اور ہم اُسے اپنے برابر کی چیز سمجھنے لگتے ہیں۔ توند کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ انسان کو برابری اور ہم سری کے معیار پر لاکھڑا کرتی ہے۔

توند کے بغیر انسان ایسے ہی ہے جیسے کوئی ٹنڈ منڈ درخت، جس کے پتے، اُس سے جان چھڑا کر بھاگ گئے ہوں۔ شادابی جس کی خشکی

کے سبب الوداع کہہ کر جا چکی ہو ۔ سرسبزی جس سے پناہ مانگتی ہو اور سرسراہٹ جس سے کوسوں دور ہو کر گزرتی ہو۔ ٹنڈ منڈ درخت کی طرح بغیر توند کا آدمی ، انتہائی تنہائی پسند ہوتا ہے۔ اُسے مردم بیزاری نرگسیت کا شکار کئے رکھتی ہے اور وہ دوسروں کو کڑی نظروں سے دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اُردو ادب کے بیشتر نقادوں اور طنز نگاروں کی شخصیت اسی بنا پر نہایت روکھی پھیکی ہے کہ انہوں نے توند کی فضیلت کو نہیں سمجھا۔ جبکہ اِن کے مقابلے میں مزاح نگاروں اور موٹے موٹے شاعروں کی شخصیت کو اُن کی توند سمیت دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دودھ، دہی اور لسی کا استعمال کتنی بصیرت افروز مشق ہے ۔

انسان جتنا دُبلا ہوتا ہے ، اُتنا ہی خشکی اور بے رنگی کا شکار ہوتا ہے۔ لیکن جوں ہی اُس پر موٹاپے کی پہلی تہہ بیٹھتی ہے، اُس کی طبیعت میں شگفتگی اور طراری جنم لینے لگتی ہے۔ آہستہ آہستہ تہہ بر تہہ موٹاپے کی طرف مائل رہنے سے اُس کی طبع رواں ہونے لگتی ہے۔ مزاج کھلنے لگتا ہے اور وہ زندگی کے رموز سمجھنے لگتا ہے ۔ توند کا آغاز اسی زمانے میں ہوا کرتا ہے ۔ جب دل ترنگ میں رہنے لگے ۔ آنکھیں رنگین مناظر میں کھوئی رہیں ، کان شائیں شائیں کرنے لگیں اور بے طرح سے ناچنے گانے کو جی چاہے ۔ ایسے موقع پر توند کی پہلی قسط آدمی کو اسمارٹ بننے میں مدد دیتی ہے اور جب توند اپنی پوری گولائی سمیت واضح ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ اس آدمی کے اندر دُبلے پن کے زمانے کا مردِ نحیف اور تنگ ذہن دفن ہو گیا ہے۔ اُس کے جسم پر چربی کی ہر تہہ اُس کے اندر کے سخت مزاج محتسب کو زمین دوز کرتی چلی جاتی ہے ۔ یوں ایک وقت آتا ہے کہ توند ہر طرف راج کرنے لگتی ہے اور کمر، پیٹ، پسلیاں ، کندھے، بازو اور لاتیں اپنی انفرادیت کھو دیتی ہیں۔ توند کے اس عروجِ لازوال میں انسان نروان حاصل کرنے کی کیفیت سے گزرتا ہے ۔

توند بردار شخصیتیں زندگی کے ہر پہلو سے لطف اندوزی کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ نجومی اِن کے موٹے موٹے پھولے ہوئے ہاتھ دیکھ کر بے خطر دنیا جہاں کی رنگینیاں اِن کے نام سے منسوب کر دیتے ہیں اور یہ بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔ جبکہ توند دشمن لوگوں میں ہر بات پر "اوں ہوں" کرتے رہنے کا خطرناک رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ لوگ اگر بیمار پڑ جائیں تو ڈاکٹر سے دوا لینے کی بجائے مختلف اَدویات کی کمپوزیشن پر بحث کرنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر کے اسٹیتھیسکوپ لگانے سے پہلے اُس کی نبض دیکھنے بیٹھ جاتے ہیں ۔ اِن کے نام تو دنیا کی کوئی چھوٹی خوشی بھی نہیں لگائی جا سکتی کیونکہ بغیر ثبوت کے یہ دوسروں کا نام بھی ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

توند ایک عطیۂ خداوندی ہے۔ جنھیں یہ میسّر نہیں آتا وہ اِس کی برائیوں پر لیکچر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ خزانوں پر سانپ بن کر بیٹھنے کی صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں کیشیئر اور خزانچی کے تقرر کے وقت اُس کی صحت پر بھی نظر رکھی جاتی ہے۔ اگر آپ نے کوئی توند گیر شخص اس عہدے پر فائز دیکھا ہے تو مان لیجئے کہ وہ کسی چور دروازے سے آیا ہے۔ کیشیر اور خزانچی کے لئے ہر بات کا پہلا جواب "نہیں نہیں" دینا بہت ضروری ہے۔

توند دار لوگوں کے مزاج میں کھلے ڈلے پن اور بے تکلفی کی وافر مقدار شامل ہوتی ہے۔ یہ آپ کو توند سے محروم لوگوں کی طرح گھر سے باہر انتظار ہی میں نہیں گھلائے رکھتے ، نہ ہی اُن کی طرح پہلے نام پوچھتے ہیں ، نہ ہی کام کی بابت معلوم کراتے ہیں ۔ بلکہ اگر گھر پر موجود ہیں تو سیدھے سبھاؤ بلوا بھیجتے ہیں ۔ اب وہ بھلے سے نل کے نیچے بیٹھے اشنان ہی کر رہے ہوں ، وہیں سے آپ کا اُن سے رابطۂ کلام ہو سکتا ہے اور عین ممکن ہے کہ دورانِ اشنان ہی آپ کو مطمئن کر دیں۔ جبکہ توند دشمن لوگ شُوم کی طرح ٹرخاتے رہنے کو عقل مندی سے تعبیر کرتے ہیں۔

بعض لوگوں کو توند بڑھاتے چلے جانے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی لیکن جانے کیا بات ہے کہ اچانک ایک صبح اُن پر انکشاف ہوتا ہے کہ توند کم ہونی چاہیئے۔ یہ دراصل اُس اندر کے مدفون شخص کا جی اُٹھنا ہے جو چربی کی تہہ دار منزلوں کے نیچے پڑا آرام کی نیند سو رہا ہوتا ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ انسان اپنی معصومیت اور شرافت کی منزلوں سے گزرتے ہوئے جب عیار طبع دانشمندوں کی اچانک ترقیوں کو دیکھتا ہے تو عیاری کی لگام اُس کے ہاتھ بھی آجاتی ہے اور اُس کے اندر سے وہ دُبلا آدمی باہر نکلنے کو سرکش ہوجاتا ہے۔ اسے دیومالا میں بوتل کے جن سے موسوم کیا گیا ہے جو سفلی خواہشات کی ایماء پر باہر آنے کی مکارانہ کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جب انسان رنگینیوں کو اپنے لئے تہمت گردانتا ہے اور کفرانِ نعمت پر اُتر آتا ہے اور دُبلے پن کو اسمارٹ نیس (SMARTNESS) تصور کرکے اپنے آپ کو چمکانے لگتا ہے۔ توند کے خلاف اُس کی مہم دراصل اُس کے اپنے خلاف محاذ آرائی کا دوسرا نام ہے۔ وہ اپنے جسم و جاں سے بے وفائی پر اُتر آتا ہے اور اپنا ہی پیٹ کاٹنا شروع کردیتا ہے اور جب وہ اس منزل کو مار لیتا ہے تو کمر دوہری ہوچکی ہوتی ہے اور "فارغ البالی" کے سبب اُس کا منہ چڑانے لگتا ہے۔ ایسے موقعے پر اُس کے پاس سوائے ایڈیٹری، تنقید نگاری، طنز نویسی اور خزانہ کیسری کے کچھ نہیں رہتا یعنی وہ کہیں کا نہیں رہتا ـــ!



ضرورتِ رشتہ

[illegible]

ایک لڑکی جو کہ اَن میرڈ ہے اَب تک بالیقیں
عمر از روئے رجسٹریوں تو ہے چالیس سال
اس کے ڈیفرنس کو قطعِ نظر کر دیجئے
اس کی برہم زلف میں باقی ہے ابتک دلکشی
لڑکی قابل ہے، پڑھی لکھی ہے ایم۔اے پاس ہے
ایک بھائی رام پور میں اس کا تحصیل دار ہے
اس کی پیدائش مسلّم ہے عظیم آباد سے
اک رقیبانہ تعلق بمبئی سے اس کو تھا
رات کو اک مرتبہ لڑکی نے جب چھیڑا تھا راگ
خوبیاں کچھ اور بھی ہیں اس حسیں دلدار میں
چاہتی یہ ہے کہ بیگم پیار سے کہہ دے کوئی
اس کو شوہر چاہیئے ایسا کہ جو شاعر نہ ہو
وہ سناتا ہی رہے گا غیر مطبوعہ غزل
وقت سارا ختم ہو جائے گا لکی چانس کا
قبلِ شادی اس کو یہ تحریر دینی ہے ضرور

چاہتی یہ ہے کہ شادی اس کی ہو جائے کہیں
بیوٹی میں ہے مگر خود آج بھی اپنی مثال
دل ابھی تک نوجواں ہے امتحاں کر لیجئے
پوز کرتی ہے ہمیشہ اک عدد وِگ جرمنی
ڈپلوماحقِ تزوج کا بھی اس کے پاس ہے
ایک ڈپٹی اک کلکٹر ایک تھانیدار ہے
سلسلہ ملتا ہے اس کا آنجہانی شاد سے
ساز اور آواز میں مانند آشاؔ و لتاؔ
اس محلے کے کسی گھر میں بھڑک اٹھی تھی آگ
کالعدم ہیں جو یقیناً حسن کے بازار میں
یعنی اک سگنل دلِ بیمار کو دیدے کوئی
اس کا کوئی کام نظم و ضبط سے باہر نہ ہو
شبِ عروسی میں قصیدہ لائے گا لکھ کر ڈبل
ستیہ ہیٹ جائے گا اس رات کے رومانس کا
یعنی دو بچوں سے آگے بڑھ نہیں سکتے حضور

چونکہ سرکاری سطح پر ایک لعنت ہے جہیز
اس لئے لڑکا ہی لائے کرسی، ٹیبل اور میز

غزل

پاگلؔ عادل آبادی

نقشوں میں ایک ایسا بھی نقشہ دکھائی دے
گھر میں جنابِ شیخ کے یہ کیا دکھائی دے
ہے بالغوں کی فلم مگر جا کے دیکھئے !
نمبر ہمارے چشمے کا جب سے بدل گیا
باوا کی جب نمازِ جنازہ پڑھی گئی
عینک آپ کے اس کمال پہ قربان جائیے

گنجوں کے ہاتھ میں مجھے کنگھا دکھائی دے
گڑ کا پرہیزی گلگلے کھاتا دکھائی دے
نابالغوں کا ہال پہ قبضہ دکھائی دے
کدّو کو دیکھئے تو کریلا دکھائی دے
بیٹا صفوں سے دور ٹہلتا دکھائی دے
ہر عیب اُس کی آڑ میں چھپتا دکھائی دے

جب سے دیا گیا ہے زنانے کا خون اسے
پاگلؔ بھی چال اپنی بدلتا دکھائی دے

وجاہت علی سندیلوی

(ریڈیائی ڈرامہ)

غالب کے پرستار

بیوی : اجی یہ اتنے سویرے سوٹ بوٹ ڈاٹ کر کہاں جانے کی تیاری کر رہے ہو۔ میں تو ابھی ناشتے کا بھی انتظام نہیں کر پائی

شاکر : جلدی سے اِس کٹوری میں داڑھی بنانے کے لئے گرم پانی دے دو۔ ورنہ آکر سر پر سوار ہو جائے گا۔ وہ چچا غالب کا ہونہار بھتیجا۔

بیوی : لیجئے یہ پانی! مگر میں کہتی ہوں کہ آج پندرہ دن سے جب سے ہم اس مکان میں آئے ہیں کیا بن کر رہ گئی ہے آپ کی زندگی؟۔ روز کی طرح کل رات کو بھی بیٹھک سے بارہ بجے کے بعد آئے تھے۔

شاکر : اب کچھ نہ پوچھو بیوی! یہ مالکِ مکان خان صاحب زبردستی مجھے مرزا غالب کا کلام پڑھانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور کسی صورت جان ہی نہیں چھوڑتے۔

بیوی : کل رات سارا کھانا ٹھنڈا ہو کر ستیا ناس ہو گیا۔ میں نے ڈیوڑھی تک جا کر کئی دفعہ دروازہ تھپتھپایا لیکن خانصاحب برابر "غالب نے یہ کہا اور غالب نے وہ کہا" اڑاتے چلے جا رہے تھے۔ کیا کرتی جا کر لیٹ رہی۔

شاکر : بیگم اس وقت بس میں کسی طرح گھر سے نکل بھاگتا۔ ورنہ خان صاحب دھمکی دے کر گئے ہیں کہ چونکہ آج اتوار ہے اور مجھے دفتر نہیں جانا ہے۔ لہٰذا وہ سویرے ہی سویرے مرزا غالب کا نیا دریافت کیا ہوا دیوان لے کر آجائیں گے

بیوی : یہ کون ہیں "مرزا غالب"۔ وہ تو مرزا تھے پھر وہ ان خانصاحب کے کیسے سگے لگتے ہیں جو اُن کا ذکر کرتے کرتے زبان ہی نہیں تھکتی ان کی۔

شاکر : اجی وہ مرزا بھی تھے اور خانصاحب بھی۔ اور پھر ستم انہوں نے یہ ڈھایا کہ شاعر بھی بن بیٹھے۔ اب وہ ساری دنیا کے سگے لگتے ہیں۔

بیوی : لیکن میں کہتی ہوں، کہ ایسی ان میں کیا بات تھی جو ان کا ذکر ختم ہی ہونے کو نہیں آتا، شاعر تو میرے خالو جان بھی ہیں۔ بڑے بڑے مشاعروں میں غزلیں پڑھی ہیں اُنہوں نے۔ لیکن یہ مرزا غالب تو کچھ عجیب ہی قسم کے چپکو شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

[دروازے کی گھنٹی بجتی ہے]

شاکر : لو وہ آگئے اور یہاں ابھی چہرے پر حجامت کے لئے صابن ہی لگایا ہے۔ ؏

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

بیوی : ابھی ٹھیک سے مرغے بھی نہیں بولے کہ آپہنچے بانگ دینے کے لئے غالب کے چہیتے۔ سحری والوں کی طرح آدھی رات کو آنا تھا تو گئے ہی کیوں تھے گھر اپنے ؟

شاکر : یہ رات کو اپنی خوشی سے کہاں گئے تھے۔ تین دفعہ ان کا لڑکا ان کو بلانے آچکا تھا لیکن اُن کی زبان کی چرخی چلتی ہی رہی۔ پھر جب میں آنکھیں بند کرکے خراٹے لینے لگا تو خفا ہوکر یہ کہتے ہوئے اُٹھ گئے کہ سویرے منہ اندھیرے ہی آجائیں گے۔

بیوی : ہر بات کی کوئی حد ہوتی ہے۔ البتہ بکواس کی حد نہیں۔ یہ تو کسی آسیب کی طرح چمٹ گئے ہیں آپ سے۔

شاکر : ان کے آنے کے خوف سے رات گھنٹوں نیند نہیں آئی۔ اور اگر کبھی آنکھ جھپک بھی گئی تو خواب میں یہی دیکھتا کہ میرے یہ مالک مکان میرے گلے میں رسی ڈالے ہوئے یہ کہتے ہوئے گھسیٹ رہے ہیں۔ "چل غالب کے پاس ، چل غالب کے پاس !" اور میں ہڑبڑا کر جاگ اُٹھتا۔

[دروازے کی گھنٹی پھر بجتی ہے ! پھر بجتی ہے]

بیوی : توبہ ہے میری ! چھوڑیئے اس مکان کو اور اس مالک مکان کو اور چلئے کسی دوسری جگہ۔ جان ہے تو جہان ہے۔ مکان کرائے پر لیا ہے۔ اپنا سونا جاگنا اور اُٹھنا بیٹھنا نہیں بیچا ہے ان کے ساتھ جو ہر وقت بھوت بنے سوار رہتے ہیں سر پر۔

شاکر : ان کی بکواس کی وجہ سے کوئی کرایہ دار چند دنوں سے زیادہ ٹھہرتا ہی نہیں۔ اس مکان میں ایک کرایہ دار سے تو ان سے فوجداری بھی ہوگئی تھی۔ اُس نے ان کے ہاتھ سے دیوانِ غالب چھین کر پھاڑ ڈالا تھا۔

بیوی : حد ہوگئی آپ کو قسم ہے کہ آپ ان سے جاکر صاف صاف کہہ دیجئے کہ ہمیں نہیں سننے ہم مرزا غالب کا نام آپ کے منہ سے ہم کو مرزا غالب سیکھنا ہوگا تو اپنے خالو ابا سے سیکھ لیں گے

[گھر کے اندرونی دروازے پر دستک ہوتی ہے]

بیوی : لو — وہ تو سر پر ہی آگئے کہیں آپ کے ساتھ وہ مجھے بھی مرزا غالب نہ پڑھانے لگیں۔

شاکر : اب تو جانا ہی پڑے گا ورنہ وہ گھر ہی میں گھس آئیں گے

[پھر دستک]

خان صاحب : شاکر صاحب — شاکر صاحب !

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

شاکر : حاضر ہوا۔

خانصاحب : چراغ میں بتی ابھی نہیں پڑتی کہ خراٹے لینے لگتے ہیں آپ۔ اب سویرا ہوا ہے تو ذرا باہر بھی نکلئے۔

قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے۔

شاکر : آپ بیٹھک میں تشریف رکھئے میں آتا ہوں۔

خانصاحب : اب ابھی جائیے۔ مدت سے فراق کی گھڑیاں گن رہا ہوں

آ کہ میری جان کو قرار نہیں
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں

شاکر : دھیمے لہجے میں بیوی سے "اب تو جانا ہی پڑے گا۔"

بیوی : لیکن اس حلیے میں کہ چہرے پر صابن لگا اور ہاتھ میں اُسترا۔

شاکر : شاید یہ ہیئت کذائی ہی ذریعہ رہائی بن جائے۔ مزید احتیاط کے طور پر تھوڑی دیر کے بعد آپ اپنی دعا لانے

کے بہانے بلوا بھی لیجئے گا۔

بیوی : خیر آپ جائیے۔ میں ابھی جمن کو بلواتی ہوں وہ خبر لے گا خان صاحب کی۔

[اندر مکان سے باہر بیٹھکے میں جانے اور کرسیاں کھسکائے جانے کی آوازیں۔]

شاکر : آداب بجا لاتا ہوں۔ خانصاحب

خانصاحب : آداب عرض یا وحشت ۔ یہ کیا بہروپ بنا رکھا ہے آپ نے بہرحال ہم نے تو آپ کو پہچان لیا ؎

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

شاکر : داڑھی بنانے جا رہا تھا آپ کی آواز پر دوڑتا ہوا آیا ہوں

خانصاحب : ابھی حضرت نہیں معلوم کب سے گھنٹی پر گھنٹی بجا رہا اور دستک پر دستک دے رہا ہوں۔ چہرے پر صابن تو آپ نے ابھی پوتا ہے ؎

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے

شاکر : گھنٹی خراب ہے وہ اندر بجنے کے بجائے بجانے والے ہی کو سنائی دیتی ہے۔ آپ کی آواز سنتے ہی میں جیسے بیٹھا تھا ویسے ہی باہر نکل آیا۔

خانصاحب : بھئی میں آپ کے لئے رات ہی کو مولانا قمر صاحب کے گھر گیا اور ان کی خوشامد درآمد کرکے ان کی دوکان کھلوائی اور غالب کے تازہ ترین کلام کا یہ نسخہ خرید کر دوڑتا ہوا آپ کے پاس آیا ہوں اور آپ ہیں کہ گھر سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے ؎

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

شاکر : خیر شکریہ! لیکن میرا داڑھی بنانا بہت ضروری ہے اور ڈاکٹر کے یہاں بھی جانا ہے۔

خانصاحب : مرزا غالب کو بھی داڑھی بنانے کا بڑا شوق تھا۔ لیکن جب سارے چہرے پر چیونٹی کے انڈے جیسے سفید بال نکلنا شروع ہو گئے تو انہوں نے داڑھی چھوڑ دی تھی اور پھر ایک روز جب مع اپنی داڑھی کے آئینہ دیکھ رہے تھے تو خود اپنے اوپر چوٹ کر بیٹھے ؎

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

شاکر : شکر ہے کہ انھوں نے کچھ تو چھوڑ دیا۔ اب اجازت دیجئے تو داڑھی بنا کر ڈاکٹر کے یہاں سے بیگم کی دوا لے آؤں۔

خانصاحب : ابھی اس مصیبت سے تو کسی مالِ مسروقہ کی طرح آپ گھر سے باہر برآمد کرائے گئے ہیں اور آپ فوراً ہی واپس بھی جانا چاہتے ہیں ؎

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

شاکر : اب اس طرح آپ کے سامنے چہرے پر صابن تھوپے جو خشک ہو کر خارشت بن چکا ہے، تولیا کاندھے پر ڈالے اور استرا ہاتھ میں لئے کیا بیٹھوں۔

خانصاحب : واللہ۔ آپ تو اس وقت غالب کے ایک شعر کا مرقع بنے ہوئے ہیں بس استرے کو تیغ اور تولیہ کو کفن سمجھ لیجئے۔ کیا شعر کہا ہے ظالم نے جیسے کڑی کمان کا تیر ؎

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

شاکر : تو آپ کا کیا خیال ہے کہ میں اس وقت آپ کی خدمت میں ذبح اور دفن ہونے حاضر ہوا ہوں۔

خانصاحب : ہے، ہے غالب کے کلام کی ناقدری شہنشاہ اقلیم سخن کی
بارگاہ میں یہ بے ادبی۔

ہے، ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

برادر عزیز از جان پہلے اس شعر کا مطلب تو سمجھ لیجئے۔
معشوق کے ہاتھوں عاشق کا قتل ہو جانا عشق کی معراج سمجھی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے دونوں کا وصل ہو جانا عشق کی سب سے توہین آمیز رسوائی۔

شاکر : میری حجامت اور ڈاکٹر کے یہاں جانا!

خانصاحب : مرزا برابر اپنے معشوق سے فرمائش کیا کرتے کہ براہ سعادتمندی ذرا میرا سر تو اُتار دیجئے۔ ایک روز نہیں معلوم معشوق کس ترنگ میں تھا کہ وعدہ کر بیٹھا کہ ہاں اُتار دوں گا۔ مرزا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ بہرے بن کر وعدے کی پختگی کے لئے اس کی تکرار چاہی ہے

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

شاکر : حضور والا ابھی تو میری سُنیں اور مجھے اب اجازت دیں۔
بڑی مجبوری میں ہوں اس وقت میں!

خانصاحب : ابھی بات نہ کاٹیے تو جی ہاں مرزا صاحب کی فرمائش پر ان کا معشوق ستم پیشہ جو حرفوں کا بنا ہوا تھا فوراً بیترا بدل گیا اور بات کا رُخ پلٹ دیا اب مرزا ، ہی کی زبان سے سنیے

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

[جمن داخل ہوتے ہیں]

جمن : آداب عرض ہے۔ آداب عرض۔

شاکر : جیتے رہو۔ آؤ آؤ آج اِدھر کیسے نکل پڑے۔

خانصاحب : اب اس انوکھی قسم پر بیچارے مرزا کیا کرتے۔ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے لیکن ۔۔

جمن : باجی کے سر میں درد تیز ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اپنے شاکر بھائی کو ڈاکٹر کے یہاں بھیج دو وہ پورا حال بتا کر فوراً دوا لے آئیں۔

خانصاحب : بھائی مرزا غالب تو سرے سے دوا کے قائل ہی نہ تھے ان کے جب کسی قسم کا درد اُٹھتا تو وہ یہ شعر پڑھ لیا کرتے ہے

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

جی ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ ضدی مرزا صاحب بھی تھے حد بھر۔ وعدے کے دوسرے ہی روز سے وہ اپنا سر اتروانے کے لئے معشوق کی ڈیوڑھی پر حاضری دینے لگے لیکن وہ کسی نہ کسی بہانے ان کو چٹکیوں میں اُڑاتا رہا۔

جمن : تبھی تو شاید معشوق کی ڈیوڑھی پر یہ حادثہ پیش آیا تھا ہے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، میری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

خانصاحب : یہ کیا دخل در معقولات؟

مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

اور شاکر صاحب یہ آپ کھڑے کیسے ہو گئے؟

شاکر : خدارا! اب مجھے نہ روکئے، مجھے حجامت بنا کر فوراً ڈاکٹر کے یہاں جانا ہے۔ بیگم کے ساتھ مجھے بھی دردِ سر لاحق ہو چکا ہے۔
اچھا تو میں چلا!

[کرسیوں سے ٹکراتے ہوئے بڑی عجلت سے بھاگتے ہیں]

خانصاحب : (پکار کر) آپ کی حجامت تو یہاں بھی بن سکتی ہے اور پھر درد کے لئے دوا کی کیا ضرورت ہے۔ ہے

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا   میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

جمن : اجی تھا کر بھائی کو جانے دیجئے۔ آپ کو تو کوئی سننے والا چاہیئے تو میں موجود ہی ہوں۔ مجھے غالبؔ سے دلچسپی بھی ہے اور میں نے آٹھویں درجے میں ان کی تین غزلیں بھی پڑھی تھیں۔ جی ہاں! تو غالبؔ کا معشوق ان کا سر نہ اڑانے کی غرض سے کیا بہانے تراشا کرتا تھا۔

خانصاحب : جی ہاں معشوق کبھی کہتا کہ عاشقوں کے سر کاٹتے کاٹتے اُس کی تیغ زنگ آلود ہو چکی ہے۔ لہٰذا جب کوئی نئی تیغ خریدے گا تو اس کا اُدگھاٹن غالبؔ کا سر کاٹ کر کرے گا۔ جلدی کیا ہے۔ کبھی کہتا کہ تمہاری لاش تو خیر دھا پالکا والے مُردہ جانور اُٹھانے والی گاڑی پر لاد لے جائیں گے۔ مگر کفن کا انتظام کون کرے گا۔ لہٰذا جب تک تمہارا تن ڈھانپنے کا معقول انتظام نہ ہو جائے میں تم پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا ورنہ تمہارا حشر بھی قیس جیسا ہوگا۔ ؎

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

جمن : غلط بالکل غلط۔ سراسر غلط۔ غالبؔ کے معشوق نے تو ان کا سر چٹکی بجاتے کاٹ دیا تھا جس کا اُسے بعد میں افسوس بھی رہا ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اور پھر اس نے لاش کو ایسا کفن دیا کہ اس کے متعلق اُس کو بعد میں سوکن کا جلاپا بھی برداشت کرنا پڑا۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

خانصاحب : معاف کیجئے گا۔ عجب بے پر کی اُڑا رہے ہیں آپ اور آم کی قلم، نیم کے پیڑ میں باندھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ غالبؔ لاجواب کے اشعار بالکل بے محل پڑھ پڑھ کر آپ نے تو مجھے حواس باختہ کر کے رکھ دیا ہے۔ غالباً آپ ہی کے لئے مرزا نے فرمایا تھا ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

جمن : نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ۔ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی۔ جی ہاں! تو میں عرض کر رہا تھا کہ آپ غالبؔ کو غلط سمجھ رہے ہیں۔ غالبؔ کے معشوق نے غالبؔ کا سر اُتارنے کے متعلق کوئی ٹال مٹول نہیں کی۔ البتہ جب کسی قرض خواہ کی طرح مرزا صاحب روز روز اس کے گھر کی کنڈی کھٹکھٹانے لگے تو تھوڑی سی ضد وہ بھی پکڑ گیا تھا ؎

ضد کی ہے اور بات مگر خُو بُری نہیں
بھُولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے

خانصاحب : آپ کی اول فول باتوں سے تو میرے ہوش و حواس گم ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ غالبؔ کو غلط سمجھے ہیں۔ میں شعر کا جو مطلب بیان کر رہا تھا اُسے پورا بھی نہیں کرنے دیتے اور آپ اپنی ہانکے چلے جا رہے ہیں۔ ؎

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

جمن : آپ غالبؔ کو غلط سمجھے ہیں۔ آپ شعر کا مطلب بیان کر کے انھیں مظلوم ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن دراصل ہر معاملے میں زیادتی انھیں کی ہوتی اور پہل وہی کرتے۔ غالب کا خود اقبالی بیان اس کا شاہد ہے۔ ؎

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

خان صاحب : آپ غالبؔ کو غلط سمجھے ہیں اور اُس پر طرّہ یہ کہ اپنے آگے کسی کو بولنے بھی نہیں دیتے ؎

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلا

جی ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ غالب نے جھوٹے کو گھر پہنچانے کے لئے اپنے گھر کے کوڑے کباڑ سے اپنی تیغ افراسیابی نکالی اور کفن کے لئے ایک ٹکڑا بھی فراہم کیا اور پھر اکڑتے ہوئے اور پاس پڑوس کے لوگوں کو سناتے ہوئے اپنے معشوق کے پاس چلے۔ ع

عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا۔

اور بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ یعنی معشوق کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔

جمن ۔ آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں وہ اپنے گھر کو اس کے کوڑے کباڑ سمیت پہلے ہی لٹا چکے تھے۔ اور اسی لئے بے ننگ و نام کہہ کر اُن کے معشوق نے اُن کی شریکِ حیات بننے سے انکار کر دیا تھا ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اسد اللہ خان غالب کی لاش شناخت کرنے والوں نے بے کفن ہی دیکھی۔ اس سلسلے میں پولیس کے سامنے اُنھوں نے حلفیہ بیان دیا تھا ؎

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

خانصاحب ۔ آپ کی بے سروپا باتوں نے تو دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں۔ نہیں معلوم ان کے اشعار سے آپ کیسی اوٹ پٹانگ تاویلیں پیش کر کے ہر بات میں خلط مبحث پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ع

دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

غالب کفن لے کر گئے تھے پہن کر نہیں۔ کیا تعجب اگر معشوق نے اسے کھسکا دیا ہو۔

جمن ۔ کمال کر دیا ہے آپ نے بھی۔ میں کہتا ہوں کہ آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں۔ غالب کا معشوق اور کفن کھسوٹ۔ جس نے غالب کا جنازہ اس دھوم دھام سے اٹھایا جیسے کسی الکشن کا جلوس۔ وہ صرف تین گز مارکین پر بھلا اپنی نیت خراب کر بیٹھتا۔؟ ؎

اس رنگ سے اُٹھائی کل اس نے اسد کی لاش
دشمن بھی جس کو دیکھ کر غمناک ہو گئے

خانصاحب ۔ آپ غالب کو غلط سمجھتے ہیں اور مشکل یہ ہے کہ کسی دوسرے کی سنتے بھی نہیں اور اپنی بے سروپا باتیں ہانکتے چلے جاتے ہیں۔ آخر آپ کی عبرت انگیز غلط فہمیاں میں کیسے دور کروں۔ ؟ ؎

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اور اب میں اجازت چاہتا ہوں۔

جمن ۔ آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں اور دیکھئے اگر میں کوئی بے سروپا بات کہوں تو میرا سر اور پیر دونوں کاٹ ڈالئے۔ جو بھی کہوں گا سند سے کہوں گا۔ غالب کے معشوق نے نہ صرف ان کا جنازہ بہت شان و شوکت سے اُٹھایا بلکہ وہ بڑے تزک و احتشام سے خاص اپنی گلی میں دفن کر کے اس پر ان کے نام والا احترام کا پتھر بھی لگوانا چاہتا۔ وہ تو کہئے خود مرزا صاحب کی خوشامد پر وہ نیک بخت اس نیک ارادے سے باز آیا ؎

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

عجیب شگفتہ تھے ہمارے مرزا بھی۔

خانصاحب ۔ (زور زور سے) ۔ آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں۔

جمن : (چیخ) ۔ آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں ۔

خانصاحب : آپ کا یہ رویہ میرے لئے انتہائی اہانت آمیز ہے ۔
مذاق سمجھ رکھا ہے آپ نے غالب کو ۔ اور پھر آپ جیسے
مبتدی مجھ سے کہتے ہیں کہ میں غالب کو غلط سمجھتا ہوں ۔ ع
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ مینا نہ ہوا
میرے لئے آپ کی سمع خراشی ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے
میں جاتا ہوں ۔

[خان صاحب جاتے ہیں]

جمن : ابھی خانصاحب ایک خوش خبری تو آپ کو سنانا باقی ہی رہ گئی ۔ میری اور آپ کی مشترک کوششوں کے باوجود حضرت غالب قتل ہی نہیں ہوئے تھے ۔ ع

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

خیر اس پر شام کو فرصت سے تبادلۂ خیال ہوگا ۔

خانصاحب : (پکار کر ۔ دور سے) ۔ بس آچکے ہم ع
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

[بیوی ۔ شاکر اور جمن کے قہقہے]

٭ ٭٭ ٭

اردو ادب

میخانے سے چائے خانے تک

رشید الدین
(حیدرآباد)

اگر آپ آج کے کسی ادب کے طالب علم سے پوچھیں کہ بھئی اردو ادب نے کہاں تک ترقی کی ہے تو اگر وہ واقعی ادب کا طالب علم ہوگا تو یہی جواب دے گا کہ "میخانے سے چائے خانے تک"۔ ہوسکتا ہے آپ اس جواب پر خفا ہو جائیں حالانکہ اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو اس میں خفگی کی کوئی بات نہیں ملے گی۔ یہ تو بڑا ہی فاضلانہ جواب ہے۔ ویسے اگر آپ کو اس جواب پر بہت غصہ آ رہا ہو تو ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی لیجیے مگر خدارا اس کی توضیح بھی سن لیجیے۔

میخانہ اور چائے خانہ ہم قافیہ ہونے کے ساتھ ساتھ تقریباً ایک ہی مقصد کو پورا کرتے ہیں یعنی تفریح۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ انسان کے لیے تفریح بہت ضروری چیز ہے۔ پرانے زمانے میں تفریح کا ذریعہ میخانے ہوا کرتے تھے۔ لیکن آج کل یہ خدمت چائے خانے انجام دے رہے ہیں۔ انسان کے لیے تفریح بہت ضروری ہے لیکن تفریح سے بھی زیادہ جو چیز ضروری ہے وہ ہے چائے۔ یوں سمجھ لیجیے' اکسیر ہے۔ اگر آپ کے کسی دوست کا موڈ آف ہوگیا ہے میرا مطلب ہے اگر اس نے چپ سادھ لی ہے تو اسے آپ کسی سادھو کے پاس لے جائیے نہ کسی پیر کے مزار پر بلکہ سیدھے چائے خانے لے جائیے اور ایک پیالی گرم گرم چائے پلا دیجیے۔ آپ نہ بھی پئیں تو کوئی حرج نہیں۔ اللہ نے چاہا تو بہت جلد فائدہ ہوگا۔ اور آپ کا دوست اتنی باتیں کرے گا کہ موڈ میں آنے کے لیے آپ کو بھی مجبوراً ایک پیالی چائے پینی ہوگی۔ یہ تو تھی چائے کی بات لیکن قدیم زمانے میں اس کی قائم مقام مئے تھی۔ جس کے بارے میں غالب علیہ الرحمہ کہہ گئے ہیں۔

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

ویسے بھی مئے کا درجہ چائے سے بہرحال بڑھا ہوا تھا اور آج بھی۔ اس لحاظ سے آپ چائے خانے اور میخانے کا تقابل کر سکتے ہیں۔

میخانے کی معمولی خاک کے تعلق سے ہی ایک صاحب کہہ گئے ہیں۔ خدا مغفرت کرے۔

خاکِ میخانے کی رفعت کچھ نہ پوچھ
آسماں سے آسماں کی بات ہے

یہ تو یہ اردو کے ایک شاعر بادشاہ نے جس کی سلطنت دلی سے پالم تک قائم تھی کسی میخانے کا چراغ بننا پسند کیا تھا۔

تھا جلانا ہی اگر دوری ساقی سے مجھے
تو چراغ درِ میخانہ بنایا ہوتا

قصہ مختصر یہ کہ میخانے اپنے زمانہ میں چائے خانوں سے زیادہ ہی اہمیت کے حامل تھے۔

تو بات یہ چل رہی تھی کہ اردو ادب میخانے سے چائے خانے تک کی ایک طویل داستان ہے۔ **ایک ایسی** داستان جس کا سر تو ہے لیکن پیر نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس کی ابتدا تو میخانے سے ہوئی لیکن انتہا کہاں ہوگی۔ اس کا کسی کو علم نہیں۔ اب رہا چائے خانے کا سوال تو یہ ایک درمیان کی چیز ہے جس سے آج کل ہمارا ادب گزر رہا ہے۔

پرانے زمانے میں میخانے کے بڑے چرچے تھے۔ بڑے بڑے امیر و امراء اور باعزت شہری میخانے میں جانا فخر سمجھتے تھے۔ ویسے تو اب ہر جگہ مئے پر امتناع عاید کرنے کی بات کہی جا رہی ہے۔ لیکن یہ اس زمانے کی بات ہے جب خلیل خاں فاختے اڑایا کرتے تھے۔ آج کل تو خلیل خاں صاحب کا حال بھی کچھ پتلا ہے۔ برسوں کے بعد اگر انہیں کوئی فاختہ نظر آئے تو وہ ان کے اڑانے سے پہلے ہی اڑ جاتی ہے۔

چنانچہ جب سب ہی شرفاً و امراء میخانے جاتے ہوں تو یہ ناممکن تھا کہ ہمارے شاعر و ادیب حضرات ہی اس سے بے بہرہ رہیں۔ بلکہ جہاں اور لوگ میخانے میں خالی ہاتھ جاتے تھے تو یہ شاعر اور ادیب اپنی نوٹ بکس اور قلم بھی ساتھ لے جاتے تھے اور دور پر دور چلنے کے بعد جب میخانے کی محفل رنگ پر آجاتی اور ہو حق شروع ہو جاتی تو یہ شاعر اور ادیب آہستہ سے اپنی نوٹ بکس سنبھالے کونوں میں کھسک جاتے اور پھر سفید کاغذ کالے ہونے شروع ہوتے۔ محاورے اور استعارے ڈھونڈے جاتے اور تخلیقات وجود میں آتیں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ یہی ہمارا کلاسیکی ادب ہے۔ اب تو آپ یہ مان جائیں گے کہ ہمارا ادب میخانے سے شروع ہوا ہے۔

چونکہ ہمارا ادب میخانے سے شروع ہوا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں میخانے کا عکس نظر آئے کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ اس لیے جب آپ ہمارے کلاسیکی ادب خصوصاً شاعری کا مطالعہ کریں تو اس میں آپ کو جا بجا جام و مینا، ساقی و صہبا اور جام و سبو کا ذکر ملے گا۔

اک جام پلا دے ساقی مدہوش بنا دے ساقی

یہ ایک شعر تو مثالاً عرض کیا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ہمارے ادب کے کسی بھی پرانے شاعر یا ادیب کو لے لیجیے اس کے پاس میخانے کا ایک آدھ قصیدہ ضرور ملے گا اس لیے ہمارے نئے نقادوں کا یہ کہنا کہ ہمارا کلاسیکی ادب محض ادب برائے ادب ہے غلط ہے۔ کیونکہ ہمارے پرانے ادب میں میخانے کی پوری عکاسی ملتی ہے۔ ویسے یہ دوسری بات ہے کہ اس زمانے میں میخانے کے علاوہ اور بھی دنیا آباد تھی۔ لیکن ہمارے فن کاروں کو اس سے کیا واسطہ۔ وہ جہاں بیٹھتے اور جو دیکھتے اس کی تصویر پیش کرتے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ انھیں میخانے کے علاوہ کہیں اور بیٹھنے کی توفیق ہی نہ ہوتی یا اگر ہوتی تو بھی وہ اس جگہ کو جہاں ان کے بیٹھنے کا شرف حاصل ہوتا میخانہ ہی سمجھتے ۔

رند جو ظرف اٹھا لیں وہ ساغر بن جائے		جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

یہ تو تھی ہمارے ادب کی ابتدا۔ لیکن چونکہ زندگی میں ہمیشہ انقلابات آتے رہتے ہیں اور تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ ہمارا ادب بھی تبدیلی سے دوچار ہو۔ اس لیے زمانے کے نشیب و فراز کے ساتھ ہمارا ادب بھی میخانے سے باہر آیا۔ میخانے کے باہر کی دنیا بڑی عجیب تھی۔ کیونکہ وہاں نہ کوئی ناصح تھا اور نہ کوئی محتسب۔ اس لیے ہمارے شاعر و ادیب حضرات بڑے پریشان رہے۔ اس پریشانی کے دور کو ہمارے سرپھرے نقاد "جمود" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو کوئی ٹھکانا نہ مل سکا تھا۔ اس لیے انھوں نے لکھنے کی طرف ڈھیل دے رکھی تھی۔ ورنہ کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ ان کے دنیا میں موجود ہوتے ہوئے ادب بھی جمود میں آجائے۔ بہرحال ہمارے ادیب عموماً اور شاعر خصوصاً پریشان تھے۔ لیکن بھلا ہو ان انگریزوں کا جنھوں نے ہندوستان جیسے گرم ملک میں چائے نوشی کا رواج ڈالا اور جگہ جگہ چائے خانے قائم کیے گئے۔ پھر کیا تھا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ ہمارے سارے بے ٹھکانا شاعر اور ادیب چائے خانوں میں گھس گئے اور جب لکھنا شروع کیا تو ہمارے وہی نقاد جو ادب میں جمود کا نعرہ لگا رہے تھے، ادب کی بہتات سے گھبرا گئے۔ جا بجا جلسے کر کے اور قرار دادیں منظور کر کے ادب کی بہتات کو روکنے کی کوشش کی جانے لگی۔ لیکن صاحب کون سنتا ہے۔ جب تک چائے خانے موجود ہیں کون لکھنے سے باز آسکتا ہے۔ بھلا کیا کوئی فنکار ان نام نہاد نقادوں کے لیے فن کا خون کرے گا۔ اپنی تخلیق کا گلا گھونٹ دے گا۔

جس طرح میخانے میں لکھنے کا ایک خاص طریقہ تھا اسی طرح چائے خانے میں لکھنے کا بھی ایک خاص طریقہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میخانوں میں جانا ذرا مہنگا تھا۔ اس لیے لوگ کم لکھتے تھے اور چائے خانوں میں جانا بہت سستا ہے۔ اس لیے اب بہت لکھا جا رہا ہے۔ ہوٹلوں میں اخبار اور رسائل بھی آتے ہیں جو فن کاروں کی قوت تخلیق کو مزید تحریک دیتے ہیں۔ لیکن یہاں کا سب سے پسندیدہ کردار ہوٹل میں وہ چھوکرا ہوتا ہے جو چائے سپلائی کرتا ہے۔ ان کی دوستی اس سے ہوتی ہے جہاں دن بھر بیٹھے رہنے اور متعدد کپ چائے پینے کے بعد جب یہ فن کار باہر نکلتے ہیں تو وہ پیچھے سے "آٹھ آنے" کا نعرہ لگاتا ہے اور ادارہ کے شاعر و ادیب بڑے اطمینان سے جیب سے ایک چائے کا دام نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیتے ہیں اور بڑی شان سے ہجوم میں داخل ہو جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

لکھنا تو خیر آرٹ ہے ہی لیکن چائے خانوں میں لکھنا تو بہت بڑا آرٹ ہے۔ سب سے پہلے تو ہمارے فن کار

ہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے خاص ادیبانہ اسٹائل میں چائے خانے میں داخل ہوتے ہیں۔ کچھ دیر شہر کے سارے چائے خانے کا نظارہ کرتے ہیں۔ سامنے کے آئینہ میں اپنی شکل دیکھتے ہیں۔ اور پھر چپکے سے ایک کونے میں جہاں ان کے دوست کی ڈیوٹی ہوتی ہے بیٹھ جاتے ہیں۔ پہلے ایک کپ چائے پیتے ہیں پھر موڈ میں آنے کے لیے دو تین ریکارڈ سنتے ہیں۔ پھر اپنی نوٹ بک کھول کر لکھنا شروع کرتے ہیں اور پھر آس پاس کے ماحول سے بے نیاز ہو کر صرف لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے لکھنے کی ایک خاص بات جو کافی قابل غور ہے یہ ہوتی ہے کہ ان کی تحریروں میں میخانے کی طرح چائے خانے کا عکس نہیں ہوتا بلکہ یہ چائے خانے میں بیٹھ کر آسام کے مسئلہ پر لکھتے ہیں۔ بنگال کے قحط پر لکھتے ہیں۔ بہار کے سیلاب پر لکھتے ہیں۔ اور افغان پناہ گزینوں کے مسئلہ پر لکھتے ہیں۔ بغرض دنیا کے ہر مسئلہ پر لکھتے ہیں۔ اور جب ان کا قلم بہت تیز چلنے لگتا ہے تو ادھر سے سیٹھ آہستہ سے ایک ریکارڈ بجاتا ہے ——— میرے الگنا میں تمہارا کیا کام ہے۔ اور یہ صاحب لکھنا لکھانا چھوڑ چھاڑ کر ریکارڈ سننا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن اچانک ان کی نظر سامنے دیوار پر لگی تختی "حرکت میں برکت ہے" پر پڑتی ہے اور وہ پھر لکھنے لگتے ہیں۔

تو یہ تھا اردو ادب کا ایک نامکمل خاکہ "میخانے سے چائے خانے تک"۔ لیکن زمانے کی رفتار کے ساتھ ہمارا ادب جو نیا موڑ اختیار کرے گا اس وقت کا ہمیں انتظار کرنا چاہیئے۔

٥٥

عابد معز

مظلوم کو مشورے

دنیا میں شوہر کی شخصیت بہت مظلوم ہے۔ یہ خیال صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ کئی اور شوہر بھی اس خیال سے متفق ہیں لیکن یہ اور بات ہے کہ وہ کہنے سے جھجکتے ہوں گے۔ آج کل جس تیزی اور عجلت میں شادیاں ہو رہی ہیں انھیں دیکھتے ہوئے ہم تجربہ اور مشاہدے کی مدد سے مظلوم شوہر کو چند مفید مشورے دینا چاہتے ہیں تاکہ حق برادری ادا ہو سکے۔ ہمارے مشوروں پر نیک نیتی سے عمل پیرا ہونے والے شوہر کو خواہ جوان ہو کہ بوڑھا، پہلا ہو کہ چوتھا۔ کافی فائدہ ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ وقت شوہر کو ایسی تمام باتیں سکھا دے گا جو ہم آگے لکھنے والے ہیں۔ لیکن اس کی اجرت گراں بار ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ چند ایک شوہر اس بوجھ تلے دب جائیں۔ غیر شادی شدہ اصحاب کے لیے ہمارے مشورے "نعمت غیر مترقبہ" ہیں انھیں چاہیے کہ شادی سے پہلے ہی ان کا استعمال شروع کر دیں۔

کسی کا کہنا ہے کہ زندگی کا سب سے بڑا غم شادی ہے اور سب سے بڑی پریشانی بیوی اگر ہمارا بس چلتا تو ہم دنیا کے تمام مردوں کو شادی نہ کرنے کا مشورہ دیتے۔ لیکن یہ مشورہ دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ سقراط کا زہر پینا۔ ویسے بھی ہر مرد کو سیب کا مزہ چکھنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ مشورہ کبھی نہیں دیں گے کہ آپ شادی نہ کریں۔ شادی ضرور اور دھوم دھام سے کریں۔ صنف نازک خوشامد پسند ہوتی ہے۔ وہ اپنے میاں مٹھو بنتے ہوئے اور دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سنتے ہوئے پھولے نہیں سماتی۔ خوشامد بڑی کارآمد شئے ہے۔ اس فن کے ذریعہ "ناممکن" کو بآسانی "ممکن" بنایا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کی فطرت میں خوشامد کا عنصر موجود نہ ہو تو ایک شوہر ہونے یا بننے کے ناطے اس عنصر کو خندہ پیشانی سے شامل کر لیں تو خوشامدی کے معنی ہیں مبالغہ کا سہارا لے کر تعریف کرنا۔ کہتے ہیں عورت میں خوب صورتی اور عقل مندی کو ایک ساتھ تلاش کرنا وقت گنوانا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر شوہر کی بیوی حسین و جمیل ہوتی ہے۔ لہٰذا شوہر جب مبالغہ آمیزی سے تعریف کرے گا تو بیوی اس میں چھپی مصلحت کو پہچان نہ پائے گی۔ پس شوہر کو چاہیے کہ ہر وقت اپنی بیوی کی تعریف کرتا رہے۔ ہو سکے تو بیوی کے حسن کا کسی مشہور اور جوان فلمی ستارے سے رشتہ بھی جوڑ دیں۔ ہمیشہ اپنی محبت کا دم بھریں

رہیں ۔ ہم نے اپنے ایک دوست کو کہتے سنا " بیگم تم وہی سنگ مرمر کی مورتی ہو جسے میں نے لڑکپن کے ایک خواب میں دیکھا تھا اور تبھی سے میں تمہاری پوجا کر رہا ہوں ۔ دن بدن میری محبت سے تمہارے حسن میں نکھار آ جاتا ہے ۔" اس مشورے پر عمل کرنے سے فائدہ یہ ہوگا ، جو بھی کام شوہر چاہے گا وہ بآسانی ، بلا حیلے و حوالے اور بخوشی و راضی ہو جایا کریں گے ۔ اس ضمن میں بس اس بات کا خیال رکھیں کہ کمزور یادداشت کے لیے زیادہ جھوٹ خطرناک ہوتا ہے ۔

محبت اندھی ہوتی ہے ۔ لیکن شادی سے پہلے ۔ شادی کے بعد جب خوش قسمت محبوب ، بدقسمت شوہر بن جاتا ہے تو محبت کو عقل کی روشنی سے منور کرنا چاہیئے ۔ شوہر کے حرکات و سکنات بیوی کے پیش نظر ہوں ۔ اس سلسلے میں ہو سکتا ہے کہ شوہر کو آنسوؤں میں بہانے کی کوشش کی جائے ۔ لیکن یقین مانئے عورت اور مگرمچھ کے آنسوؤں میں کوئی فرق نہیں ہوتا ۔ عورت ، آنسو بہت جلد ، موقع و محل سے بے نیاز اور زائد مقدار میں بہاتی ہے ۔ ہمیں تو لگتا ہے خدا نے آنسوؤں کے تصور سے عورت کی تخلیق فرمائی ہے ۔ یہ تمام باتیں ایک شوہر کو تبھی حقیقت معلوم ہوں گی جب وہ عورت کے آنسوؤں کا مطالعہ عقل کی مدد سے کرتا ہے ۔ اگر ایسا نہ ہوا تو عورت کے آنسو دنیا کی سب سے بڑی آبی طاقت ثابت ہوں گے ۔ جس کا استعمال ہمیشہ غلط سمت میں ہوا ہے ۔ پہلا حربہ یعنی آبی طاقت کے ناکام ہونے پر بیوی میکے جانے کی دھمکی دیتی ہے ۔ شوہر کو اس دھمکی سے چنداں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے ۔ اکثر بیوی اپنے شوہر کے ساتھ میکے ہی میں رہتی ہیں یا پھر وہ میکہ سمیت شوہر کے گھر میں آ جاتی ہیں ۔ خوش قسمت وہ شوہر ہے جو ان دونوں حالتوں میں جکڑا نہ جاتا ہو ۔ وہ اپنی بیوی کو میکے بھیج کر چند دن ہی سہی سکون کا سانس لے سکتا ہے ۔ لیکن بہت کم بیویاں اس دھمکی کو عملی جامہ پہناتی ہیں ۔ اس مشورہ پر عمل کرنے سے ایک شوہر کی حالت ہمارے اس عزیز سے مختلف ہوگی ۔ جنہوں نے ہماری شادی کے موقع پر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا تھا " برادر ! موت کی طرح شادی سے بھی نہیں گھبرانا چاہیئے ۔

کہتے ہیں شادی وہ ناول ہے جس کے پہلے باب میں ہیرو کی موت ہو جاتی ہے ۔ ہم اس خیال سے متفق نہیں ہیں بہانہ سازی کے فن میں مہارت حاصل کر کے ایک شوہر شادی کے بعد اپنی انفرادیت باقی و برقرار رکھ سکتا ہے ۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے ۔" اس مقولہ کی رُو سے ہم سمجھتے ہیں کہ بہانہ بنانا یا جھوٹ بولنا بری عادت نہیں بلکہ کردارکشی کے خلاف یہ ایک طرح کا حفظ ماتقدم ہے ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ عورت بہانہ سازی کے فن میں مرد پر سبقت لے جا چکی ہے شوہر کی اس کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارا مشورہ ہے کہ جہاں حیلے ، حوالوں سے کام نہ بنے وہاں رشوت دی جانی چاہیے ۔ آپ رات کے دو بجے گھر شوق سے جائیے مگر ساتھ میں ایک حسین تحفہ رکھیں ۔ گھر کا دروازہ کھلتے ہی اور قبل اس کے کہ آپ کی خاطر مدارات ہو تحفہ کو پیش کر دیجیئے ۔ پھر دیکھیئے ، آپ کی بیوی دیر میں آنے کی وجہ دریافت کرنا بھول کر تحفہ کی تعریف میں لگ جائے گی ۔ اور اگر ضرورت ہو تو وہ آپ کے پیر یا سر بھی دابے گی ۔ ایک راز کی بات ہم آپ کے گوش گزار کرتے ہیں تحفے ، محبت کی دیرپا پائیداری کے لیے وٹامن کا کام دیتے ہیں ۔

لڑکی شادی سے پہلے صرف اور صرف ایک عدد اچھے شوہر کی تمنائی ہوتی ہے لیکن شوہر کے مل جانے پر اس کی تمنائیں وسعت پانے لگتی ہیں ۔ انھیں تمناؤں کو پورا کرنے کی کوشش میں بیوی فضول خرچ بن جاتی ہے ۔ اگر انھیں

ایک بلوز پسند آجائے تو اس سے ملتی ہوئی چند ساڑیاں، چپلیں، بٹوہ وغیرہ خریدتی ہیں۔ اس خوبی کو وہ صرف اپنی ذات ہی تک محدود رکھتی ہیں۔ اس پر بالائے ستم یہ کہ وہ ہمیں یعنی شوہر کو فضول خرچ سمجھتی ہیں اور الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مطابق شوہر کو بنیان پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ ضرورت شرٹ کی ہوتی ہے۔ جوتوں کی تمنا پر صرف موزے ہاتھ لگتے ہیں۔ ویسے خدا سکون چھین کر صبر کرنے کی قوت عطا کرتا ہے۔ پھر بھی بیوی کی فضول خرچی سے بچ رہنے کے لیے آپ اپنی آمدنی آدھی بتلائیں۔ جس طرح کہ بیوی اپنی عمر بتلاتی ہے۔ آدھی آمدنی والی تدبیر کے ناکام ہونے یا کامیاب ہونے کے باوجود بھی آپ کو ایک شوہر ہونے کے ناطے اکثر بیوی کو شاپنگ کے لیے لے جانا پڑتا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ بیوی شاپنگ کے لیے آپ کو لیجاتی ہے۔ کچھ نہ کچھ بہانہ کر کے شاپنگ کی بلا کو ٹالا کیجیے۔ لیکن جب تمام تدابیر آزمانے کے باوجود بھی آپ کو شاپنگ کے لیے جانا ہی پڑا تو آخری کوشش یہ ہو کر پرس گھر پر رہ جائے۔ جیب پر غیر ضروری بار سے بچے رہنے کے علاوہ آپ جسمانی تھکن سے بھی محفوظ رہیں گے۔ ہم نے چند دن قبل ایک میاں بیوی کو شاپنگ کے دوران دیکھا اور دیکھتے رہ گئے۔ شوہر کے اطراف پاکٹوں کا ہجوم تھا۔ بال الجھے ہوئے اور پتلون بار بار نیچے ہوا جاتا جسے راہ گیر اوپر کر دیتے۔

شوہر اور بیوی کی فطرت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ شوہر اپنی ان چیزوں کا ماتم کرتا ہے جو اسے مل کر کھو جاتی ہیں۔ شادی کے بعد شوہر اپنی کنواری زندگی کو یاد کر کے تڑپتا ہے، آہیں بھرتا ہے۔ اس کے برخلاف بیوی ان چیزوں کا ماتم کرتی ہے جو اسے حاصل نہ ہو سکیں۔ اسی لیے بیوی کی خواہشیں شوہر کی دسترس سے باہر رہتی ہیں۔ بیوی وقتاً فوقتاً بے جا فرمائش کر کے شوہر کو پریشان کیا کرتی ہے۔ آپ ان فرمائشوں پر کان نہ دھریں۔ اکثر ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ آپ نے وہ مشہور واقعہ سنا ہوگا۔ ایک صاحب جوتے کی دکان پر بھاگے آئے اور ہانپتے ہوئے کہنے لگے "بھائی میری بیوی کے لیے چپل چاہیئے ـــــــــ ناپ لانا بھول گیا ہوں۔ شاید وہ میرے پیچھے آرہی ہوگی۔" تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد انھیں کچھ یاد آنے پر چونک کر کہا "خوب یاد آیا میری پیٹھ پر اس کے جوتے کا نشان موجود ہوگا۔"

آپ اپنی بیوی کی تاریخ پیدائش یاد رکھیے اور عمر بھول جائیے۔ بیوی کی سالگرہ پر اکثر زبانی مبارک باد سے کام چل جاتا ہے اس لیے کہ عورتیں اپنی سالگرہ پابندی کے ساتھ منانے کے حق میں نہیں ہیں۔ انھیں خدشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں لوگ ان کی صحیح عمر کا پتہ نہ لگالیں۔ وقت شوہر کو بوڑھا کرتا ہے پر بیوی کو جوان رکھتا ہے۔ پھر بھی سالگرہ کے دن آپ اپنی بیوی کے موڈ کو دیکھ کر صرف مبارک باد پیش کیجیے۔ تحفہ دیجیے یا پھر انجان ہو جائیے۔ ازدواجی زندگی میں شادی کی سالگرہ بھی منائی جاتی ہے۔ یہ دن شوہر کے لیے سال کا سب سے منحوس دن ہوتا ہے۔ کہتے ہیں عورت کسی بہترین مرد کا انتظار کرتی ہے۔ اور اسی دوران اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے شاید بیوی شادی کی سالگرہ کے دن خوشی نہیں مناتی بلکہ ماتم کرتی ہے کہ اس نے آپ سے شادی کر کے ڈھیر سارے نقصان برداشت کر رہی ہے۔ اس کی کئی ایک خواہشات پوری نہ ہو سکیں۔ اسی دن آپ کو پتہ چلتا ہے کہ آپ کی بیوی کس قسم کا شوہر چاہتی تھی۔ آپ اس حسرتی شوہر کو اپنے سے موازنہ کرتے ہیں۔ اور غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے ہم آپ کو مشورہ دیں گے کہ آپ اس دن اپنا غم غلط کرنے کے لیے گھر سے باہر رہیں۔ اور جذبہ خیر سگالی کے تحت ڈھیر سارے تحفے گھر بھیجیں۔

شادی کے بعد مرد کی مادری زبان "خاموشی" ہوتی ہے۔ عورتیں بہت باتونی ہوتی ہیں۔ شادی سے پہلے اور اور نیند میں بھی۔ شادی کے بعد ان کی اس خوبی میں اور زیادہ نکھار پیدا ہوتا ہے۔ اس لیئے کہ انھیں "شوہر" جیسا موضوع مل جاتا ہے۔ اکثر انھیں خیال نہیں رہتا بلکہ وہ اس کی پرواہ بھی نہیں کرتیں کہ سامنے والا انھیں سن بھی رہا ہے یا نہیں۔ آپ شوہر ہونے کے ناطے اپنی یہ عادت بنا ڈالیے کہ بیوی سے باتیں کرتے وقت صرف ہوں، ہاں اور اچھا کرتے رہیئے۔ اس ضمن میں بس اتنی احتیاط برتی جائے، جب کسی بات کا جواب دینا چاہتے ہیں تو ذرا جلد دے ڈالیے ورنہ خدشہ رہتا ہے کہ کہیں بیوی مضمون نہ بدل دے۔ بات چیت کے تعلق سے ہی ہم ایک اہم بات بتلاتے ہیں۔ اگر آپ کسی بات کو راز میں رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی خبر بیوی کو کسی بھی صورت میں نہ ہونے دیں۔ راز اور عورت کبھی ایک ساتھ اس لیے نہیں رہ سکتے کہ عورت بذاتِ خود ایک راز ہے۔

عورت میں جذبۂ رقابت کا ہونا ضروری ہے۔ ہم تو یہاں تک سمجھتے ہیں کہ جذبۂ رقابت ہی کا دوسرا نام عورت ہے۔ جذبۂ رقابت عورت کی سب سے بڑی کمزوری اور مرد کا عورت کے خلاف واحد اخلاقی ہتھیار ہے۔ بیوی شوہر کی بڑی سے بڑی دھمکی سے متاثر نہیں ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر آپ اسے سوت لانے کی دھمکی دیں تو اس کا وجود لرز جائے گا۔ ہمارے ایک دوست اس افواہ پر گھر میں شیر بنے پھرتے ہیں کہ وہ دفتر میں عشق لڑا رہے ہیں اور کسی وقت بھی اسے گھر لا سکتے ہیں۔ آپ اس اخلاقی ہتھیار کو بار بار استعمال نہیں کر سکتے۔ اس کے بار بار استعمال سے یہ اپنی اہمیت کھو دے گا اور ہو سکتا ہے کہ بیوی سوت کا وجود گوارا کرے۔ لیکن وہ کون بے وقوف مرد ہوگا جو ایک اور ملک الموت کو سر پر مسلط کرنا پسند کرے۔ ویسے دو بیویاں رکھنے کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ وہ دونوں لڑتے رہیں گے۔ اور آپ خاموش تماشائی بنے لطف اٹھا سکتے ہیں۔

عورت خدا کی ایک ایسی مخلوق ہے جو اس کے دیئے ہوئے حسن سے کبھی مطمئن نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو خوب صورت اور خوب صورت بنانے کے لیے اپنی عمر اور شوہر کی دولت کا ایک صمیم حصہ صرف کر دیتی ہے۔ اس تعلق سے ہم کچھ نہیں کہیں گے اس کے لیے عورت سب کچھ چھوڑ سکتی ہے۔ پر خود نمائی سے باز نہیں آسکتی۔ اس خیال سے شاید شوہر کو تسلی ہو کہ جس طرح چاند سورج سے مانگی ہوئی روشنی لے کر چمکتا ہے اسی طرح بیوی شوہر کے سہارے خود نمائی کر کے شوہر کی عزت بڑھاتی ہے۔

عورت شروع سے شاکی رہی ہے کہ مرد اسے برابر کا درجہ نہیں دیتے۔ اس بہتان کو غلط ثابت کرنے کے لیے دنیا کے تمام مردوں نے فراخدلی سے عورتوں کا پورے ۳۶۵ دن کا ایک سال منا ڈالا۔ ہمیں خوشی ہے کہ عورتیں مردوں پر بوجھ بننے کے بجائے ان کا سہارا بنیں گی۔ شوہر امید کر سکتا ہے کہ بیوی ان سے وہ پیسے طلب نہ کریں گی جو وہ اپنی ذاتیات پر خرچ کرتی ہیں۔ لیکن۔ ان کی ضرورتیں تو شیطان کی آنت ہوتی ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ کولڈ کریم کے بعد ہاٹ کریم چاہیئے۔ مختلف رنگوں کی لپ اسٹک چاہیئے۔ بالوں کو گھنے اور لانبے کرنے کے لیے ٹانک چاہیے تو کبھی مہاسوں کو مٹانے کے لیے لوشن۔ غرض یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ عورتوں کا سال منانے کے سلسلے میں مرد کی فراخدلی پر خوشی کے ساتھ افسوس اس بات کا ہے کہ اب ہمیں گھر کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹانا ہوگا۔ اگر شوہر ہوم سائینس کی شُد بُد سے واقفیت حاصل کرلے تو

اسے شرمندگی اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔ اس سلسلے میں ہم اپنے ہی گھر کا ایک واقعہ سناتے ہیں۔ ہمارے گھر ایک بے تکلف دوست کے سامنے چائے پیش کی گئی۔ چائے پینے کے بعد انھوں نے کہا "یار یہ چائے کسی گھٹیا ہوٹل کی ہے یا پھر بھابی نے تکلیف فرمائی ہے۔ ہم نے دوست سے جھوٹ کہا کہ چائے ہوٹل کی تھی۔ بھلا کون شریف شوہر اپنی بیوی کی ہتک برداشت کر سکتا ہے۔

ہمیشہ عورت خود کو صحیح سمجھتی ہے اور اپنی کمزوریوں کو قبول کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ مضمون اگر آپ کی بیوی کی نظر سے گذرے اور ہمیں یقین ہے کہ ایسا ضرور ہوگا۔ تو وہ کہیں گی کہ لکھنے والا غلط لکھ گیا۔ وہ ہمیں پرانے خیالات کا حامی بھی بتلائے گی اور ہوسکتا ہے کہ وہ ہمیں پاگل یا جنونی بھی کہے! خیر صاحب آپ کی بیوی کچھ بھی کہے۔ ہمارے نزدیک وہ خوش قسمت ہے۔ جسے اس کے اپنے گھر سکون نصیب ہو۔ ہم آخری اور سب سے اہم مشورہ آپ کو اپنے گھر میں قائم رکھنے کے لیے یہ دیتے ہیں کہ آپ اپنی بیوی کا ہر حکم بجا لائیں۔ ان کی ہر بات مانیں۔ وہ جب روٹھیں انھیں منالیں ورنہ نتیجہ کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے۔ اس لیے کہ ؎

شوہر لاکھ اچھا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور زوجہ ہوتا ہے

۵۵

غزل

عمید الظفر رفیق

* * *

سڑکوں پہ یہ جو ننگا فیشن نظر آتا ہے
بھارت بھی مجھے اب تو فارن نظر آتا ہے

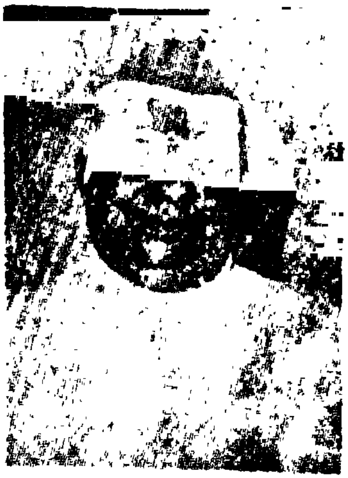
لیلیٰ نہ رہی لیلیٰ، مجنوں نہ رہا مجنوں
بدلا ہوا الفت کا سیزن نظر آتا ہے

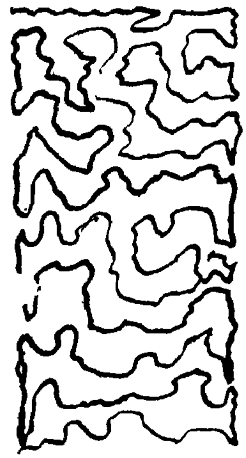
جب سینٹ لگا کر وہ آتا ہے مرے آگے
مہکا ہوا اس دل کا گارڈن نظر آتا ہے

ڈیولپ ہوا کچھ ایسا ہر ایک گلی کوچہ
اس دیس کا ہر قصبہ لندن نظر آتا ہے

جب بزم میں آتا ہوں، ساقی یہی کہتا ہے
یہ رند معمہ کا ٹوکن نظر آتا ہے

اتحاد اور یکجہتی وقت کی اہم ضرورت ہے







ہمارا ملک مختلف مذاہب رنگ و نسل اور زبانوں کا گہوارہ ہے۔ اس کی رنگا رنگی اور دلکشی نے اسے ایک گلستاں کا روپ دیا ہے۔ اپنے گلشن کی حفاظت کے لئے اتحاد و یکجہتی کی شدید ضرورت ہے۔

اشوک و اکبر، نانک و گاندھی اور نہرو کے ہندوستان میں مذہب، زبان اور صوبے کے نام پر پُرتشدد واقعات اور امن عامہ میں معمولی خلل ہم سب کے لئے معاشی تباہی لاتا ہے۔ ہماری ریاست آندھرا پردیش فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور اتحاد کے لئے سارے ملک میں مثالی رہی ہے۔

- تمام مذاہب اور مقدس عبادت گاہوں کا احترام کیجئے۔
- تمام تہواروں اور عیدوں کو مل جل کر منائیے۔
- سماجی مساوات اور ترقی کے لئے متحد ہو کر آگے بڑھیئے
- جمہوریت، آزادی اور سیکولرازم کی حفاظت کے لئے

برطرف منتریوں کا کنوینشن

ابراہیم یوسف

ایک کمرہ جس میں تیس چالیس لوگ کھادی کے کپڑے پہنے بیٹھے ہیں ہر شخص اپنے چہرے پر سنجیدگی اور وقار پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ سب کے سب منتری رہ چکے ہیں۔ کچھ دیر ایک شخص کھڑا ہو کر۔

منتری ۱: منترو! اب ہمیں جلسے کی کارروائی شروع کرنا چاہیے۔ کچھ دن پہلے ہم منتری تھے۔ ہماری کچھ کیا بلکہ بہت بڑی حیثیت تھی اور اب کوئی دو کوڑی کو نہیں پوچھتا۔

منتری ۲۔ منتری مہودے نے بھاشن شروع کر دیا۔ اصولی طور پر پہلے ایک صدر کا چناؤ ہونا چاہیے۔

منتری ۱، اس کنوینشن کا انتظام میں نے کیا ہے اس لیے میں خود ہی اس کا صدر ہوں۔

منتری ۲: جی نہیں۔ ہم جمہوری، اشتراکی اور سکولر نقطۂ نظر کے جمع ہوئے ہیں یہ تاناشاہی برداشت نہیں کی جا سکتی۔

منتری ۳: آپ چونکہ حزب اختلاف کی طرف سے چند دن کے لیے منتری ہوئے تھے اس لیے آپ کی اسٹینڈنگ بھی اتنی نہیں کہ آپ صدارت کر سکیں۔

منتری ۱: اس وقت سوال رولنگ پارٹی یا حزب اختلاف کا نہیں ہے بلکہ اب ہم سب ایک ہی پارٹی ہیں۔

منتری ۳: جی نہیں۔ ابھی ہم ریٹائرڈ منتریوں کی ایک نئی جماعت بنانے پر غور کرنے کیلئے جمع ہوئے ہیں۔

منتری ۲: میں ریٹائرڈ کے لفظ پر سخت احتجاج کرتا ہوں۔

منتری ۴: ہم برطرف کیے ہوئے منتری ہیں ریٹائرڈ نہیں۔ سیاست داں کبھی ریٹائرڈ نہیں۔ ریٹائرڈ تو سرکاری نوکر چاکر ہوتے ہیں۔

منتری ۵: (سو سال کے قریب عمر) منترو! مجھے کم دکھائی دیتا اور سنائی دیتا ہے۔ آلۂ سماعت کی بیٹری بھی ختم

ہو چکی ہے۔ میرے پانچوں بیٹوں نے میری منتری شپ کے زمانے میں ادھر ادھر سے خاصا کما لیا تھا۔ اب اپنے کاروبار میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک بیٹری تک لانے کی فرصت نہیں۔ میں ٹھیک کھڑا ہوں نا۔ مجھے کم سجھائی دیتا ہے۔

منتری: جی ہاں۔ آپ ٹھیک اپنی جگہ پر کھڑے ہیں۔

منتری ۵: دھن واد۔ ہاں تو منترو۔ میں کہہ رہا تھا کہ مجھے کم سنائی دیتا ہے۔ جو کچھ ادھر ادھر سے سن پایا ہوں اس سے یہہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاید آپ صدارت کے لیے جھگڑا کر رہے ہیں۔ منتری: (چیخ کر)۔ جی ہاں

منتری ۶: میں عمر میں تم سب سے بڑا ہوں۔ ہمارے دیش کی روایت ہے کہ جب تک باقاعدہ کوئی صدر نہ چن لیا جائے سب سے زیادہ عمر والا صدارت کرتا ہے۔ اصولی طور پر میں صدر ہوں (سب لوگ خاموش رہتے ہیں۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے آواز)

آواز: دادا منتری ٹھیک کہہ رہے ہیں اور ہمیں بھی ایسے ہی کم سننے اور کم دیکھنے والے صدر کی ضرورت ہے۔

منتری ۱: (کچھ سوچ کر) خیر میں نے جو اپنا نام صدارت کے لیے پیش کیا تھا اسے واپس لیتے ہوئے دادا منتری کا نام پیش کرتا ہوں۔

آواز: جی نہیں دادا منتری اپنا نام خود پیش کر چکے ہیں اور میں اس کی تائید کر چکا ہوں۔ آپ یہ کریڈٹ نہیں لے سکتے۔

منتری ۲: اس جھگڑے کو چھوڑیئے۔ دادا منتری آج کے صدر ہیں ــ دادا منتری زندہ باد۔

(سب چلاتے ہیں دادا منتری زندہ باد)

دادا منتری: (اپنے کان آواز کی طرف لگاتے ہوئے) شاید آپ میری جے جے کار کر رہے ہیں۔

منتری: (چیخ کر) جی ہاں

دادا منتری: دھن واد۔ مجھے صدر کے سنگھاسن تک پہنچا دو۔ کم سجھائی دیتا ہے۔

(منتری ان کا ہاتھ پکڑ کر صدر کی جگہ پہلے جا کر بٹھا دیتا ہے)

دادا منتری: میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے صدر چنا اور میری جے جے کار چلائے۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) جب میں منتری تھا تو ہر روز ایسے نعرے سنا کرتا تھا اب تو کان ترس گئے ان نعروں کے سننے کے لیے۔ جلسے کی کارروائی شروع کرنے سے پہلے میری ایک تجویز ہے۔

کچھ آوازیں: ضرور۔ ضرور۔ آپ کی تجویز کیا ہے۔

دادا منتری: نئی پارٹی بنانے سے پہلے ہمیں اپنی پارٹی کا جھنڈا منظور کر لینا چاہیئے۔

منتری ۱: پہلے ہی جھنڈا کیوں۔

دادا منتری: جے جے کار کے نعرے سنکر میرا دل خوشی سے اچھل رہا ہے۔ کہیں فیل نہ ہو جائے۔ اگر فیل ہو گیا تو انو جھنڈے میں لپیٹ کر انتم سنسکار کرنے میں آسانی ہوگی۔

آواز : ہاں ۔ پہلے جھنڈا طے کر لیجیے ۔
منتری ۱ : ٹھیک ہے ٹھیک ہے ۔ پہلے ہم جھنڈا تجویز کیے لیتے ہیں ۔
منتری ۲ : میری تجویز ہے کہ جھنڈے کا رنگ سیاہ ہونا چاہیے ۔ ماتمی رنگ جس سے ہمارے جذبات کا اظہار ہوسکے کہ ہم دکھی ہیں ۔
منتری ۳ : میں بھی اس سے متفق ہوں ۔ اس پر نشان کے طور پر دو ہڈیاں اور ایک کھوپڑی بھی ہونا چاہیے ۔
منتری ۱ : میں اس کا ورودھ کرتا ہوں ۔ یہ سمندری لٹیروں کا جھنڈا بن جائے گا ۔
آواز : کیا آپ خشکی کے لٹیروں کا جھنڈا چاہتے ہیں ۔
(زوردار قہقہہ)
منتری ۳ : اس سے ہمارا مقصد حکمران جماعت پر اثر ڈالنا ہوگا کہ وہ ہم سے خوف زدہ رہے اور ہم مظلوموں پر بھی دھیان دے ۔
آواز : اور یہ اس بات کا بھی سمبل ہوگا کہ ہم نے صرف کھال اتاری ہے ۔ ہڈیاں چھوڑ دی ہیں ۔
منتری ۱ : فی الحال ہم یہ مان لیتے ہیں کہ دادا منتری اگر ابھی سرگباش ہوگئے تو اس جھنڈے میں لپیٹ کر ان کا انتم سنسکار کر دیا جائے گا ۔
[سب لوگ تالیاں بجاتے ہیں ۔ دادا منتری سب کو تالیاں بجاتے دیکھ کر خود بھی تالی بجاتے ہیں]
منتری ۱ : ہاں تو مترو ۔ ہم اس لیے یہاں جمع ہوئے ہیں کہ ہم منتری رہ چکے ہیں ۔ اور پورے ملک میں ہماری تعداد ہزاروں ہے ۔ لیکن نہ تو اب حکومت کو ہماری پرواہ ہے اور نہ پبلک کو ۔
منتری ۳ : بلکہ وہ لوگ جو ہماری چمچہ گری کرتے تھے اب دوسروں کے چمچے بنے ہوئے ہیں ۔
منتری ۲ : میرے دو چمچے تو منتری بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں ۔
آواز : اب آپ کو ان کی چمچہ گری کرنا پڑے گی ۔
(زوردار قہقہہ)
منتری ۱ : مترو! میرا ارادہ تو سارے پرطرف منتریوں کو بلانے کا تھا ۔ لیکن اس کے لیے بہت روپیہ کی ضرورت تھی اور آپ سب جانتے ہیں کہ ہم جیسے پہلے مفلس اور قلاش تھے اب بھی ہیں ۔
آواز : ہاں کم از کم پبلک کے سامنے تو ایسا ہی کہنا چاہیے ۔
منتری ۲ : پبلک ہماری حالت کو اچھی طرح سمجھتی ہے ۔
آواز : جی ہاں ۔ کیوں نہیں ۔ کیوں نہیں ۔
منتری ۱ : مترو! جب تک ہم متحد نہ ہوں گے کوئی ہماری طرف دھیان نہ دے گا ۔ اب وقت ہے کہ ہم متحد ہو کر آواز بلند کریں ۔
منتری ۲ : اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے ہمیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا ہی پڑے گا ۔

منتری ۴ : ایک پلیٹ فارم پر۔ ہم الگ الگ پارٹیوں سے تعلق رکھتے تھے۔

منتری ۱ : مگر اب ایک پارٹی ہیں۔ ہر طرف منتری۔ اب یہ پارٹی کا بھید بھاؤ ختم ہو چکا ہے۔

آواز : بھید بھاؤ تو پہلے بھی نہ تھا۔ سب منتری تھے۔ منتری قوم۔ ایک الگ کلاس۔

منتری ۱ : گویا ہم اس پر متفق ہیں کہ ہمیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اپنی الگ پارٹی بنانا چاہیئے۔

آوازیں : بالکل ــــ بالکل۔

منتری ۱ : اور کسی پارٹی کو چلانے کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔

منتری ۲ : لیکن پبلک کے سامنے ہم کونسا منہ لے کر پیسہ مانگنے جائیں۔

منتری ۱ : یہی عرض کر رہا تھا۔ ابتدائی مصارف کے لیے ہمیں پیسہ اپنے ہی ذرائع سے حاصل کرنا ہوگا۔

منتری ۳ : یہ ذرا ٹیڑھا مسئلہ ہے اس کی کیا گیارنٹی ہے کہ روپیہ محفوظ رہے گا۔

منتری ۱ : یہ تو بزنس ہے۔ تھوڑا بہت رسک تو لینا ہی پڑے گا۔

منتری ۲ : اگر مجھے کوش اور ھیکشن بنا دیا گیا تو میں ایسے ذرائع پیدا کروں گا کہ نہ صرف فنڈ محفوظ رہے بلکہ اس میں اضافہ بھی ہو۔

منتری ۳ : جی نہیں۔ آپ کو یہ کام نہیں سونپا جا سکتا۔ جب آپ وزیر مالیات تھے تو آپ نے ایسے ٹیکس لگائے تھے جو منتریوں کو بھی ادا کرنا پڑے تھے۔

منتری ۲ : منتری مہودے اس بات کو بھول رہے ہیں کہ میں نے ہی منتریوں کی تنخواہوں میں اضافہ کرایا تھا۔ ڈی۔ اے دگنا کر دیا تھا۔ ٹیلی فون اور دیگر مصارف سرکار کے ذمہ کر دیئے تھے۔ تمام بلیک مارکٹ کرنے والوں سے منتریوں کے یہاں راشن تک مفت پہنچوایا تھا۔ (ایک منتری کی طرف اشارہ کر کے) سب سے زیادہ ٹیکس ہمارے ان منتری کے زمانے میں لگائے گئے تھے۔

منتری ۲ : غلط ہے۔ میں نے تو صرف ٹافیوں، بسکٹوں، اسکول کی کاپیوں، چھوٹے موٹے کھلونوں اور کھیل کود کے سامان پر ٹیکس لگایا تھا۔ گود سے لیکر گور تک ملک کے لیے سب کچھ تیاگ کرنا چاہیے۔

منتری ۲ : آپ کے ٹیکسوں سے اکتا کر پبلک نے آپ کے خلاف تحریک چلائی تھی اور آپ کو منتری منڈل سے نکال دیا گیا تھا۔

منتری ۴ : میں نکالا نہیں گیا تھا خود استعفیٰ دیا تھا۔

منتری ۳ : اس کنونشن میں آپ کی موجودگی پر سخت احتجاج کرتا ہوں۔

منتری ۴ : کیوں ؟

منتری ۳ : یہ برطرف کیے ہوئے منتریوں کا کنونشن ہے استعفیٰ دینے والوں کا نہیں۔

منتری ۴ : آپ میرے منتری ہونے کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ میں منتری رہا ہوں۔ اس کنونشن میں حزب اختلاف

کے لیڈر اور اسپیکر بھی موجود ہیں۔

لیڈر : میری پوزیشن منتری ہی کی تھی۔

اسپیکر : اور کیا میں منتری سے کم تھا۔

منتری ۲ : لیکن آپ منتری نہیں تھے آپ کو فوراً ہال سے چلا جانا چاہیئے۔

منتری ۳ ، اور آپ کو بھی۔

منتری ۲ : نہیں میں منتری رہا ہوں۔

(ہاں اور نہیں کا شور ہونے لگتا ہے)

منتری ۱ : منترو۔ منترو۔ ذرا شانت رہیئے (شور و غل ہوتا رہتا ہے) ذرا شانت ہو جائیے۔

منتری ۳ : آپ نے ہمارا اپمان کیا ہے۔ مستعفی منتریوں، حزب اختلاف کے لیڈر اور اسپیکر کو بلا کر نکالے ہوئے منتریوں کا اپمان ہے۔

منتری ۲ : میٹنگ کی کارروائی تھوڑی دیر کے لیے روک دی جائے کہ منتری آپس میں صلاح و مشورہ کر لیں۔

منتری ۱ : (دادا منتری سے) میٹنگ کی کارروائی تھوڑی دیر کے لیے روک دیجیے۔

دادا منتری : کیا جھگڑے کا مسئلہ ہو گیا؟

منتری ۱ : (چیخ کر) تھوڑی دیر کے لیے کارروائی روک دیجیے۔ منتری آپس میں صلاح و مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔

دادا منتری : دس منٹ کے لیے کارروائی روکی جاتی ہے۔ مجھے بھی پیشاب کی حاجت ہو رہی ہے۔

(لوگ دو تین گروپ میں بٹ کر ادھر ادھر کھڑے ہو جاتے ہیں)

لیڈر : (منتری ۲ سے) آپ نے سارا کباڑا کر دیا۔

منتری ۲ : میں نے کیا کباڑا کر دیا۔ میں کوئی برطرف کیا ہوا منتری ہوں۔ مکھیہ منتری کے استعفیٰ مانگنے پر استعفیٰ دیا تھا۔

اسپیکر : آپ نے اپنا مسئلہ حل کر لیا ہوتا بلا وجہ ہم کو بیچ میں لے آئے۔

منتری ۲ : کیوں نہ لاتے۔ میں حق بات کہنے سے نہیں چوکتا۔

اسپیکر : اور آپ نے شاید زندگی میں حق بات نہ کہی ہوگی۔

منتری ۲ : آپ اس وقت اسپیکر نہیں ہیں کہ اس قسم کی رولنگ دیں۔

لیڈر : پھوٹ ڈالنا آپ کا طریقہ رہا ہے۔ سرکار آپ کی انھیں حرکتوں سے گری تھی۔

منتری ۲ : مہودے۔ آپ اس وقت یہ بات کہہ رہے ہیں جب میں نے آپ کی بیوی کے نام پلاٹ الاٹ کرائے تھے اور آپ کے لڑکوں کے نام امپورٹ لائیسنس جاری کیے تھے۔ اس وقت آپ کے نزدیک میں سب سے اچھا منتری تھا۔

لیڈر : آپ کا یہ کون سا احسان تھا۔ آپ جانتے تھے کہ اگر آپ نے یہ نہیں کیا تو بہ حیثیت حزب اختلاف کے لیڈر

میں آپ کے کالے کرتوتوں کو ہاوس کے سامنے رکھ دوں گا۔

(مڑکر دوسرے گروپ میں جاکر شامل ہو جاتا ہے)

منتری ۲: اس طرح ممبر شپ کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔

لیڈر: برطرف منتری ان کے ساتھ زیادہ ہیں۔ وہ پارٹی پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

منتری ۱: پارٹی ٹوٹ جانے دیجیے۔ میں نے اس پر بھی غور کرلیا ہے۔

لیڈر: لیکن وہ تو ہمیں برداشت کرنے کو ہی تیار نہیں۔

منتری ۱: اور آپ گھبرائے جارہے ہیں۔ ذرا صبر سے تو کام لیجیے۔ دادا منتری بیٹھا ب کرائیے (دادا منتری کا ہاتھ پکڑ کر بٹھلاتا ہے) منترو! کارروائی شروع ہو رہی ہے۔

(سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں) ہاں تو منترو! سوال یہ تھا کہ ہماری اس پارٹی کی ممبر شپ کن کن لوگوں کے لیے ہو۔

منتری ۳: صرف برطرف منتریوں کے لیے۔

منتری ۱۔ اس طرح پارٹی کی ممبر شپ محدود کر دینے سے ہماری آواز کمزور ہو جائے گی۔

منتری ۳: ہم مستعفی منتریوں کو برداشت نہیں کرسکتے۔

منتری ۲: کیوں نہیں کرسکتے۔ ہم باعزت طور پر استعفیٰ دے کر آئے تھے۔

منتری ۳: باعزت طور پر ! جی نہیں۔ آپ کے بھرشٹاچاروں کی وجہ سے آپ سے استعفیٰ مانگا گیا تھا۔ اور آپ نے بزدلوں کی طرح استعفیٰ دیا تھا۔

منتری ۲: اور آپ کو تو ٹھوکر مار کر نکال دیا گیا تھا۔

منتری ۳: میں آخر وقت تک اڑا رہا تھا۔ منتری شپ کوئی استعفیٰ دینے کی چیز نہیں ہے۔ میں تو کمھیہ منتری بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

منتری ۱: منترو۔ ہمیں ایک دوسرے پر ذاتی حملے نہیں کرنا چاہیئے۔

منتری ۲: اگر ہم مستعفی منتریوں کو بھی ممبر شپ دے دیں تو ــــــ

منتری ۳۔ کیسے دے دیں۔

منتری ۲: پہلے میری بات سن لیجیے۔ ابھی ہم نے فرض کیا ہے ممبر شپ دی نہیں ہے۔ سوال حزب اختلاف کے لیڈر اور اسپیکر کا بھی ہے یہ بھی ہماری طرح قسمت کے مارے ہوئے ہیں۔ ان کی کیا پوزیشن ہوگی۔

منتری ۳: ان کی بھی کوئی پوزیشن میں پوزیشن ہے جس پر غور کیا جائے۔

لیڈر: منتری بیہودے۔ ہم یہ اپمان برداشت نہیں کرسکتے۔ اپنے الفاظ واپس لیجیے۔

منتری ۱: اس قدر جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اپنی پوزیشن کا خیال رکھنا چاہیئے۔ ہم برطرف کیے ہوئے منتری

منتری ۱: اس قدر جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اپنی پوزیشن کا خیال رکھنا چاہیئے۔ ہم برطرف کیے ہوئے منتری ہیں۔

اسپیکر: کیسی پوزیشن۔ منتری مہودے نے ہماری توہین کی ہے اور انہیں معافی مانگنا ہوگا۔

منتری ۳: ہرگز نہیں۔ (منتری نمبر ۱ کی طرف دیکھ کر) آپ گدھے، گھوڑے ایک ساتھ باندھنا چاہتے ہیں ضرور باندھیے۔ ہم اپنی پارٹی الگ بنالیں گے۔

منتری ۲: (کھڑا ہوکر) آپ مجھے گھوڑا کہہ رہے ہیں۔

منتری ۳: جی نہیں بلکہ گدھا بھی۔

[منتری ۲ آستین چڑھا کر آگے بڑھتا ہے۔ کچھ لوگ اسے روکتے ہیں]

منتری ۱: آپ برطرف منتری ہیں آپ کو اپنی عزت اور پوزیشن کا خیال رکھنا چاہیے۔

منتری ۳: آپ کو پہلے ہی خیال رکھنا چاہیئے تھا کہ یہاں کن لوگوں کو مدعو کرنا چاہیئے۔

منتری ۱: اگر آپ اس پر بضد ہیں کہ صرف برطرف منتری ہی ممبر بنائے جائیں تو یونہی سہی۔ ان حضرات کو آبزرور کا درجہ دینے پر تو آپ کو اعتراض نہیں۔

منتری ۳: اس کی کیا گارنٹی ہے کہ بعد میں انہیں ممبرشپ نہیں دی جائے گی۔

منتری ۱: فی الحال اس پر بحث ملتوی کردی جائے۔ جب تمام برطرف منتریوں کا اجلاس بلایا جائے گا اس وقت اس پر غور کرلیا جائے گا۔ اس وقت اہم سوال یہ ہے کہ حکومت سے ہمارے مطالبات کیا ہوں۔

منتری ۲: آپ نے کوئی میمورنڈم تیار کیا ہے؟

منتری ۱: وہ تو سب کے صلاح مشورے سے ہوگا۔ کچھ موٹے موٹے مطالبات اس طرح ہوں گے۔

۱۔ ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ آرڈیننس کے ذریعہ بھرشٹاچار کا لفظ لغت سے خارج کردے کہ یہ لفظ اس ترقی کے دور میں پرانا اور فرسودہ ہوچکا ہے۔

۲۔ ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ آرڈیننس جاری کرے کہ جو منتری کے نام پر جو کچھ کمائیں منتری کے برطرف ہونے پر اس کا جائز حق اسے ادا کریں۔

۳۔ ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہمیں منتری بناکر موقع دے کہ

آواز: ہم پبلک کا تھوڑا بہت خون اور چوس سکیں اور اپنے مفادات کے لیے آرڈیننس جاری کراسکیں۔

منتری ۱: ہم برطرف منتری ہیں۔ ہمارا اصول ہمیشہ مفاد پرستی رہا ہے۔ اپنا مفاد اپنے بھائی بھتیجوں کا مفاد اپنے بچوں کا مفاد، تھوڑا بہت اپنی پارٹی کا مفاد اور سب کے آخر میں اپنے ملک کا مفاد کہ یہ ہمارا دیش ہے۔ (منتری ۳ کی طرف دیکھ کر) کیا منتری مہودے اس سے انکار کرسکتے ہیں۔

منتری ۳: اس میں تھوڑی بہت سچائی ضرور ہے۔

منتری ۱: تھوڑی بہت نہیں بڑی حد تک۔ ہم سب ایک حمام میں رہ چکے ہیں۔ اس لیے ایک دوسرے کے جسم کے پیچ و خم سے بخوبی واقف ہیں۔

آواز: پیچ و خم آپ کے جسم میں ہوں گے۔ ہمارے جسم میں تو مسلز ہیں مسلز

(ایک زوردار قہقہہ)

منتری ۱: (کسی قدر بیزاری سے) شاید منتری مہودے کو ریمارک پاس کرنے میں بہت دلچسپی ہے۔

آواز: میں منتری نہیں ہوں۔

آوازیں: منتری نہیں ہیں۔

منتری ۱: پھر آپ یہاں آئے کیسے اندر کیسے داخل ہوئے۔

(ایک شخص کھڑا ہو کر)

شخص: جہاں ہوا داخل ہو سکتی ہے وہاں میں بھی داخل ہو جاتا ہوں۔

منتری ۲: گویا آپ کوئی بھوت یا۔

شخص: بھوت سے بڑھ کر۔ میں اخبار کا رپورٹر ہوں۔ اور اس جلسے کی کارروائی کور کرنے آیا تھا۔ کل کے اخبار میں آپ کے جلسے کی کارروائی کو ہائی لائٹ کیا جائے گا۔ سچ مچ آپ لوگ بہت مظلوم لوگ ہیں۔

(جلسے میں ایک دم گڑبڑ مچ جاتی ہے۔ لوگ کھڑے ہو کر چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ وہ شخص خاموشی سے جلسہ گاہ سے باہر جاتا ہوا نظر آتا ہے۔)

وزیر اعظم
کا
بیس ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام

ہماری وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی طرف سے شروع کردہ بیس نکاتی معاشی پروگرام بلاشبہ آندھرا پردیش کی ترقی اور بتدریج فروغ کے لئے ایک نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے پچھڑے ہوئے طبقات کی فلاح و بہبود کے لئے کی جانے والی کوششوں میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اور کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے لاکھوں عوام کے لئے ایک نئی اُمید پیدا کردی ہے

مُنہ بولتے حقائق

ریکارڈ غذائی پیداوار

غذائی پیداوار ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۶۷ء۱۰۲ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی جو ایک ریکارڈ کے مماثل ہے۔ طوفان بادباراں اور خشک سالی کے باوجود دہنگامی منصوبوں کی حاجلانہ عمل آوری کے نتیجہ میں پیداوار سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں کم سے کم (۷۰) لاکھ ٹن ہوگئی۔

عوام کیلئے ارزاں پارچہ

ہینڈلوم کے ساٹھ فیصد بافندوں کو امداد باہمی کے زمرہ میں شامل کیا گیا ہے۔ سستے داموں کے پارچہ کی پیداوار جو سال ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۱۸۹ لاکھ مربع میٹر تھی، سے بڑھ کر سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۲۱۳ لاکھ مربع میٹر اور سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۳۲ لاکھ مربع میٹر تک پہنچ گئی ہے۔ ارزاں پارچہ اب ۳۵۰ نکاسی مراکز کے ذریعہ عوام میں تقسیم کیا جارہا ہے

سلسلہ صفحہ ۴۳ پر

انجم عثمانی

کرنل محمد خاں کا فن

ایک مختصر مطالعہ

پاکستان کے نامور مزاح نگار کرنل محمد خاں کا سفرنامہ "بسلامت روی" پچھلے کئی ماہ سے بالاقساط 'شگوفہ' میں 'مالِ مسروقہ' کے تحت شائع ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ کی آخری قسط اس بار شائع کی جارہی ہے۔ اس موقع پر ہم نے مناسب سمجھا کہ ان پر "ہماری زبان" میں شائع شدہ تنقیدی مضمون بھی شریک اشاعت کرلیں ——

قارئینِ شگوفہ کو یاد ہوگا کہ کرنل کی پہلی کتاب "بجنگ آمد" بھی شگوفہ میں مکمل شائع ہو چکی ہے

—————— مدیر

انسان کو حیوان ضاحک کہا گیا ہے۔ اپنی نصف حقیقت کے باوصف یہ مقولہ ایک مسلم انسانی خصوصیت اور ادبی ہمہ گیری کا عکاس ہے۔ چنانچہ ادب میں انسان کے تمام دماغی اوصاف اور اس کے سارے حواس بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ مزاح بھی انسانی خصوصیت ہے اور زندگی کا ترجمان ہے اس لئے ادب میں اس کا وجود بھی ناگزیر ہے اور سچا مزاح نگار اپنے منفرد اسلوب کے ذریعے یہ ترجمانی اس طرح کرتا ہے کہ اس کا رنگ اور چوکھا ہو جاتا ہے۔ کرنل محمد خان بھی ان صاحب طرز ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے فطرت اور سماج کی ناہمواریوں اور تلخیوں کو مزاح کے شیریں اسلوب میں اس طرح بیان کیا ہے کہ بیک وقت سیکڑوں سنجیدہ مسکراہٹوں کے پھولوں سے قاری کا دامن بھر جاتا ہے۔

کرنل محمد خان مزاح نگار ادیبوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس کے توسط سے مزاح نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جو عہد جدید سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور جس نسل میں شفیق الرحمٰن، مشتاق احمد یوسفی، مشفق خواجہ اور ابن انشا وغیرہ پاکستان میں۔ رشید احمد صدیقی

پطرس، کنہیالال کپور، فکر تونسوی اور ذرا آگے چل کر مجتبیٰ حسین وغیرہ شامل ہیں۔

کرنل محمد خان اپنی نسل کے مزاح نگاروں میں اس لحاظ سے بھی ممتاز ہیں کہ انہوں نے اپنی مزاح نگاری کا موضوع سماج کے ایک ایسے طبقے کو چنا جس سے بظاہر مسکراہٹیں کم اور دھماکے زیادہ منسوب ہیں۔ یعنی فوجی زندگی جس سے وہ خود وابستہ ہیں۔ اور اپنے برجی بھر کر ہنستے ہنساتے "بجنگ آمد" کا گلزار سجاتے ہوئے "بسلامت روی" تک آپہنچے ہیں۔ خان صاحب اپنی پہلی کتاب "بجنگ آمد" کے ذریعے ۱۹۶۶ء میں قارئین کے سامنے آئے اور بہ اذن ہی قارئین کے دلوں پر چھا گئے۔ "بجنگ آمد" گو کہ ان کی فوجی زندگی کے آغاز کی داستان ہے مگر یہ ذاتی داستان ان کے انداز بیان کے معجزے اور انداز نظر کی بوقلمونی کی وجہ سے حکایت لطیف تر و شیریں ترین ہو گئی ہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں ان کی دوسری کتاب "بسلامت روی" شائع ہوئی۔ یہ کتاب گرچہ ان کا سفرنامہ ہے لیکن اپنے مخصوص "محمد خانی انداز بیان" کی وجہ سے ایسی مزاح نگاری کے ضمن میں آتی ہے جسے فن لطیف کی اعلیٰ قسم کہا جا سکے۔

آئیے۔ دیکھیں کہ خان صاحب اپنے سفر کا آغاز کن لفظوں میں کرتے ہیں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ساڑھے تین بجے سہ پہر ہمارا جہاز کراچی روانہ ہونا تھا۔ ہم پورے تین بجے چک لالہ ایرپورٹ پر پہونچ گئے۔ پنڈی سے ہمیں پیار ہے۔ ایک تو اس لئے کہ اس کے نام میں نسائیت ہے۔ لاہور اور پشاور بہت مذکر کا ٹھ کے شہر ہیں۔ لیکن پنڈی کی ادائے دلبری صرف تانیث تک ہی محدود نہیں، نام کے لحاظ سے کراچی بھی اتنی ہی مونث ہے، بلکہ ایک شادی شدہ کنیت بھی رکھتی ہے لیکن عروس البلاد کہلاتی ہے۔ لیکن جو شیرہ ترکانہ دوشیزہ پنڈی کا ہے وہ اس عروس ہزار داماد کا نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (بسلامت روی۔ صلا)

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہوسٹس دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ارضی و سماوی۔ ارضی یعنی گراؤنڈ ہوسٹسیں نمازی شکل و صورت کی ہوتی ہیں۔ یعنی نماز پڑھیں نہ پڑھیں پرہیزگار لگتی ہیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے دل نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ دنیا فانی معلوم ہوتی ہے۔ اور ان کی صحبت میں ہوائی جہاز کے بجائے نزدیک ترین مسجد کو بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ سماوی ہوسٹسیں ہوائی جہاز پر پائی جاتی ہیں اور ان کی تاثیر بالکل مختلف ہے۔ ان کی ہمسفری سے یاد الٰہی میں تو نمایاں کمی آجاتی ہے۔ البتہ ان کے قرب سے تولید خون میں معتد بہ اضافہ ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

("بسلامت روی" ۔ صسا۳)

اس سے پہلے کہ خان صاحب ہمیں اپنے سفر پر لے اڑیں یا ارضی ہوسٹسیں "تنگ آمد بجنگ آمد" پر عمل پیرا ہونا شروع کر دیں آئیے اس پہلو پر بھی غور کریں کہ ضلع جہلم کی سنگلاخ اور "محمد خانوں سے پُر" سرزمین پر پیدا ہونے والے کرنل محمد خان اپنی تمام ترکرنیلی اور خانیت کے باوصف مسکراہٹوں کے چمن کھلانے میں کیوں اور کس طرح کامیاب ہوئے۔ اس پہلو پر "بجنگ آمد" کے دیباچے میں "حنا سر ناخن" کے عنوان سے سید ضمیر جعفری صاحب نے اچھی روشنی ڈالی ہے۔ جعفری صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ماحول یا ورثہ کے اعتبار سے محمد خان کے ادیب بننے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، مگر وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے کہ فطرت خود کرتی ہے لالے کی حنا بندی۔ تو ہمارے دوست محمد خان کی شخصیت کی تشکیل کو فطرت کی حنا بندی کا معجزہ سمجھنا چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔"

(مقدمہ "بجنگ آمد")

جعفری صاحب ان کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں۔

"..... چنانچہ ان کی ذات میں دو الگ الگ لیکن اپنی جگہ بھرپور شخصیتیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہی ہل اور تلوار والا محمد خاں، کم سخن ... کم آمیز ..... نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آذرانہ ... کھیت میں جُت جائے تو چٹانوں سے جوئے شیر کھینچ لائے .... تلوار اٹھا لے تو دشمنوں کے نشیمن تہہ و بالا کر دے۔ وطن کا مان، ملت کی آبرو ..... دوسرا محمد خاں وہ ہے جو نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، چمن مشرب، بہار ایجاد ہے مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں محمد خاں ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے تائید کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو کمک پہنچاتے ہیں، کیونکہ دونوں جڑیں ایک ہی مٹی میں پیوست ہیں ..... دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو علاقہ چکوال کا یہ نیم لیفٹن اپنی روایات کے مطابق فوج کی صفوں میں شامل ہو گیا لیکن یونیورسٹی کی اپنی تمام تر تعلیم کے باوجود وہ ہنوز ہل اور تلوار والا محمد خاں ہی تھا ..... ایک مدت تک بصرہ، شام، بغداد اور قاہرہ وغیرہ گھومنے کے بعد جب وہ اپنے وطن واپس آیا تو محمد خاں کے جسم پر تمغوں کی قطار سجی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر سپاہیانہ صلابت کا وقار اور بانکپن روشن تھا۔ یہ وہ محمد خاں تھا جو اب کرنیلی کی وردی میں نظر آتا ہے لیکن اس عرصہ میں اس کے اندر ادیب محمد خاں بیدار ہو کر بالغ ہو چکا تھا۔ ادیب محمد خاں الف لیلیٰ کی گلیوں اور مصر کے بازاروں اور شام کے کنارہ صحراؤں سے ایک بھرپور [illegible] کے موتی رول لایا تھا۔ خواب، رنگ، روشنیاں، ستارے، [illegible] مسکراہٹیں، ایک سیلابِ بہار جس میں ؎

> رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
>
> جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے"

(مقدمہ "بجنگ آمد")

اس میں کوئی شک نہیں کہ کرنل محمد خاں کے قلم نے اردو ادب کو مزاح کے ایک بالکل نئے اُفق کی کشادہ فضا اور تازہ ہوا سے روشناس کیا ہے۔ کرنل محمد خاں کو [illegible] کسی تمہید کا کوئی نہیں باندھنا پڑتا۔ اور نہ وہ قہقہوں کے جزیرے آباد کرتے ہیں اور نہ واقعات کی گردن میں لطیفوں کی گھنٹیاں آویزاں کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا لطیف اور لچکیلا مزاج ان کے اسلوبِ تحریر کا جزو لاینفک ہے۔ ان کے نقطۂ نظر کی پیداوار ہے۔ ان کی ظرافت کی دلآویزی کہانیاں میں [illegible] ہوئی ندی کی طرح بہتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اور آپ بے بہاؤ کے طلسم میں کتا [illegible] بہا لے جاتی ہے۔ خان صاحب کے اسلوب نگارش میں بہاؤ کا طلسم لفظی بازی گری سے عبارت نہیں بلکہ ایک ایسا ہی دلنشین [illegible] ہے جو [illegible] تجربے اور احساس کی شدت [illegible] وجود میں آتا ہے۔ [illegible] ایک مخصوص قوم کے مزاج اور عادتوں [illegible]

"[illegible] اگر [illegible] جائزہ فرمائیں تو [illegible] مر سکتا تھا۔ انگریز [illegible] کے نام [illegible]

[illegible]

خاں صاحب [illegible] اور جب کسی [illegible] کا مشاہدہ سماجی زندگی کے سمندر میں [illegible] ہے تو دیکھئے کیسے [illegible] لاتا ہے۔ [illegible] صاحب کا [illegible] آپ بھی پڑھیے۔ [illegible]

"[illegible] ہر گھر کا ایک ماحول ہوتا ہے۔ [illegible] یا یوں کہیے کہ جنت اور جہنم کی مختلف مقداروں سے ترکیب پاتا ہے۔ مبارک ہیں وہ گھر جن میں جنت کا عنصر غالب ہوتا ہے لیکن خرابی یہ ہے کہ ایسے مبارک گھر ہوتے کم ہی ہیں۔ اکثر گھر کیمیائی تجزیے پر جہنم کے جراثیم کا برا [illegible]

[illegible]

[illegible]

ری ایکشن دیتے ہیں۔ ایسے گھروں میں مہمان کے آنے پر کچھ اس قسم کی افراتفری مچتی ہے جیسے ہوائی حملہ ہوگیا ہو۔ کئی گھروں میں میزبان کو سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سچ مچ کچن سے جوئے شیر کھود کر ڈرائنگ روم میں لائی جارہی ہے اور اسی راستے سے کھانے کے کمرے تک جائے ۔۔۔۔"

(بسلامت روی صفحہ ۲۰۵)

لذتِ بیان کے ساتھ اگر فکر کی گہرائی اور سوچ کی بلند سطح بھی موجود ہو تو لذت برائے لذت نہیں رہ جاتی۔ بلکہ حکمت کے اِن موتیوں میں زیادہ قیمتی ہو جاتی ہے۔ جو ہر ایرے غیرے کی گردن میں آویزاں نہیں کئے جاسکتے۔ کرنل محمد خاں کی تحریروں میں سلاست اور شگفتگی کے فکر کی وہ حکیمانہ گہرائی پائی جاتی ہے جو بوجھل دانشورانہ نہ ہو کر فرحت افزا اور معلومات بخش کہی جاسکے۔ ایک مثال دیکھئے۔ کہتے ہیں:۔

"۔۔۔۔ ہمارا تجربہ ہے کہ زندگی کا لطف تماشا بن کر نہیں تماشائی بن کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مرکزِ توجہ بننے کے لئے یا تو بڑے مداری پن کی ۔۔۔۔"

(صفحہ ۱۱۳)

ایک مختصر سی مثال اور ہے

"۔۔۔۔ جنگ میں زخمیوں اور مزدوروں کی تعداد کا بڑی احتیاط سے ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ لیکن ان دلوں کا شمار نہیں کیا جاتا جو بھائیوں اور ازلی مثلث کے کرشموں کی وجہ سے ٹوٹتے ہیں ۔۔۔۔"

(صفحہ ۱۹)

اصلی اور سچے فنکار کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ آشوبِ آگہی میں مبتلا نہ ہو کر خود شناس اور اسلوبیاتی تہداری کا حامل ہوتا ہے اور لی سے معمولی بات یا واقعہ اس کے قلم سے نکل کر فن پارے میں ڈھل جاتا ہے۔ کرنل محمد خاں کے ہاں یہ سارے عناصر اپنی اصلی حالت میں موجود ں۔ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک فوجی کرنیل کے بنگلے کا بیان اور پیرایہ بیان ہے :۔

"۔۔۔۔ الغرض ہمارے بنگلے کا مزاج ہزار ڈیسے سے میرانہ تھا۔ مقابلہ میں ہمارے اثاثہ کے تیور ہر چند کہ خاکسارانہ تھے تاہم اپنے ن کی نشان کے پیش نظر ہم نے جوں توں کر کے ہر کمرے کے لئے ایک قالین یا دری پیدا کرلی۔ ہر چند کہ اس کار خیر کا بیشتر اجر مقامی کباڑے کو ۔ علاوہ بریں مناسب فرنیچر بھی حاصل کرلیا۔ کھانے کے کمرے میں کرایہ کا ریفریجریٹر بھی رکھ دیا۔ جو خرید سے ہوئے ریفری جیٹروں سے کسی طرح لف نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ ضعف پیری سے اس کا ذوق بردرت کسی قدر سست ہو گیا تھا اور شائد اسی لئے حدی کو ذرا تیز لے میں پڑھتا تھا رحال یہ ہمارا اور ریفریجریٹر کا اندرونی معاملہ تھا۔ شہر میں ٹیلی ویژن آیا تو ہم ایک ٹیلی ویژن سیٹ بھی لے آئے جسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ طول پر خرید اگیا ہے۔ الغرض ہمیں تو نہیں ہمارے ملنے والوں کو ہماری فارغ البالی کا رشک اور احساس ہوتا تھا ۔۔۔۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ اس احساس کے پیچھے بقول ڈاکٹر محمد حسن کسی خود شناس کیا کرب آمیز مزاج اور کیسی اسلوباتی تہداری پوشیدہ ہے اور تحریر کی یہ اسلوبیاتی تہداری اور اندازِ نظر کی یہی بوقلمونی، احساس کی یہی رنگارنگی، فکر کی یہی گہرائی اور بیان کی یہی لطافت اور شائستگی ل محمد خاں کو اچھا، بڑا، قابلِ توجہ فنکار بناتی ہے اور ان کی تحریروں کے پیش نظر بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنے ہم عصر مزاح نگاروں ں کرنل محمد خاں بہتوں سے آگے ہیں۔

--

کرنل محمد خان

[illegible]

کرنل بلمپ اینڈ کمپنی

شام ہمیں کرنل کولسن نے رائل اور سینر لیگ کلب میں ڈنر پر مدعو کر رکھا تھا۔ جان کولسن ہمارے یار تھے۔ لہٰذا ان کی دعوت کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لیکن یہ سوال کہ دعوت میں پہنچ کر کچھ سرور بھی آئے گا یا نہیں، ضرور پیدا ہوتا تھا کیونکہ رائل اور سینر دقیانوسی بلمپوں[1] اور سامراجی لاٹوں کی کلب تھی جو سرِ شام کپڑوں، مونچھوں اور دماغ کو کلف لگا کر اپنی مخصوص نشستوں پر آ بیٹھتے تھے اور بہ اس مغالطے کے تحت کہ سلطنتِ برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا، وسکی سوڈے کے گلاس خالی کرتے رہتے تھے۔ ان امپیریل غافلوں کے لئے نے ۱۹۴۷ء کے بعد مزید منادی بند کر دی تھی چنانچہ ان سول اور ملٹری آثارِ قدیمہ کی صحبت کوئی بہت سرور آور تقریب دکھائی نہ دیتی تھی۔

کلب میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ جان کولسن نے پیج پر مع دو تین سخت جان خبطی مدعو کر رکھے ہیں۔ تعارف پر ایک تو ہرج پرج ریٹائرڈ کرنل ہی نکلے۔ (ساتھی انہیں بل کے نام سے پکارتے تھے) دوسرے ایک ریٹائرڈ آئی سی ایس تھے جنھوں نے ایک عمر متحدہ ہندوستان میں گزار تھی اور تیسرے ایک بوڑھے سے اخبار نویس تھے۔ تینوں لاعلاج قسم کے امپیریلسٹ تھے اور تینوں ہماری خواہشوں اور دعاؤں کی ضد اور وہ جنسِ لطیف جس سے تصویرِ کائنات میں رنگ بھرتا ہے، بالکل ناپید تھی۔ گویا خالص بارہ سنگھا پارٹی[2] تھی۔ ہم نے جان کولسن

---

[1] COLONEL BLIMP کا کردار مشہور کارٹونسٹ ڈیوڈ لو کی تخلیق ہے۔ بے لچک، قدامت پسند اور خود فہم احمق جو قومی فخر کے معاملے میں انتہائی غلو کا قائل ہے۔

[2] انگریز خالص مردانہ پارٹی کو STAG PARTY کہتے ہیں۔

اس کا اپنا قول یاد کرایا کہ "قیدِ تنہائی سے بدتر ایک ہی چیز ہے۔ بے زن پارٹی" ـــــ تو معافی مانگتے ہوئے بولا۔

"قول تو اپنی جگہ درست ہے لیکن آج میری بیوی پارٹی میں شمولیت سے معذور تھی اور میزبانہ کی عدم موجودگی میں دوسری والی کو یہاں لانے کی دعوت دینا خالی از خلل نہ تھا۔"

وجہ معقول تھی ہم نے جان کو معاف کر دیا۔

تعارف کے بعد جان کے ایما پر ویٹر نے مہمانوں سے مشروبات کا آرڈر لیا۔ کرنل بلمپ نے مشین کی طرح "وسکی۔ اینڈ سوڈا" ہانکا۔ دوسروں نے بھی ایضاً کہا۔ ہر طرف سے شراب کی مانگ دیکھ کر ہم نے ذرا جان بوجھ کر کہا۔

"لائم جوس، پلیز۔"

کرنل بلمپ جھٹ بولے

"اگر آپ مذاق نہیں کر رہے ہیں تو یہ اس شام کی پہلی ٹریجڈی ہے۔"

کہا۔ "جناب لائم جوس نے کیا قصور کیا ہے؟ اور شراب کی کیا فضیلت ہے؟"

بلمپ ہم سے مخاطب ہو کر ایک بلندی سے بولے۔

"مائی ڈیئر کرنل، ہر مشروب کا اپنا اپنا مقام اور استعمال ہوتا ہے۔ شراب دیوتاؤں کا مشروب ہے، دودھ بچوں کا۔ لائم جوس عورتوں کا اور پانی چڑیوں کا۔"

بلمپ کی بات پر قہقہہ بلند ہونے کو تھا کہ ہم نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر "شی" کی آواز نکالتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"آہستہ بولیں کرنل صاحب۔ اگر بارمین نے آپ کی بات سن لی تو آپ کو پانی کے سوا کچھ نہ دے گا۔"

اس پر ایک بلند قہقہہ گونجا۔ دراصل بلمپ کا جگر اُن بیسیوں ٹوٹکوں میں سے ایک تھا جو انہوں نے مختلف خرابات میں مواقع کے پیش نظر لمبی مستقل زندگی میں رٹ لئے تھے ورنہ بلمپ کے عتق اور غنودہ چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ کوئی بات سوچ کر کہنے کا اہل نہیں۔ چنانچہ لاجواب ہو کر جواب میں کوئی موتیز ٹوٹکا یاد نہ کر سکا تو ہاتھ بلند کرتے ہوئے بولا۔

"آل رائٹ۔ تم ایک پلس ONE PLUS ہو گئے۔ تم لائم جوس پی سکتے ہو۔"

اس ابتدائی جھڑپ کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ صاحب بہادروں نے ہمیں بھی اسی سطح پر جگہ دے دی جس سے ہمیں ایک لمحے پہلے ایک عام آدم کم سمجھے تھے اور اب باتیں گفتگو میں کچھ جھجک اور چمک آ گئی۔ بلکہ ایک لمحہ کے لئے جلد حاضرین کا رویہ مسخر غریب بلمپ کی طرف ہی ہو گیا۔ ہماری طرح ایسی سن بولا۔

"مسٹر ہدیل۔ مختلف مشروبات کے متعلق تمہارا فلسفہ تمہاری ذہانت سے ذرا بالا معلوم ہوتا ہے۔ بتاؤ کہاں سے چرایا ہے؟"

جواب میں بلمپ نے ہنسی میں کھانسی ملا کر ایک عجیب سی طبلہ نما آواز میں کہا

؎ تمہارا ایک نمبر زیادہ ہوگیا۔

"ٹاپ سیکرٹ اولڈ بوائے ۔ ٹاپ سیکرٹ[1] ۔"

اور وسکی کا ایک بے پناہ گھونٹ پی کر دوسرے جام کے لئے پکارا اور ساتھ ہی مضمون بدلتے ہوئے بولا۔

"بائی دی وے، نارمن۔ سُنا تم نے یہ آئرش لونڈے پھر شرارتیں کرنے لگے ہیں؟ کل پھر دو کانسٹبلوں کو پیٹ ڈالا۔"

جن حضرت کو نارمن کے خطاب کیا گیا تھا وہ اخبار نویس تھے۔ وہ نیا موضوع موافق پاکر بولے۔

"اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے؟ تمہیں معلوم نہیں کہ ملک پر لیبر حکومت کا سایہ ہے۔"

پُرانا آئی سی ایس کہ لیبر پارٹی کا دشمن تھا، بولا

"اور وزیر اعظم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کے پاس ایک شئے ہے جسے فوج کہتے ہیں۔ تم ولسن[2] کو اپنے اخبار کے ذریعہ یاد نہیں دلا سکتے؟"

اخبار نویس بولا "یاد کرا بھی دیا تو کیا ہوگا؟ ولسن ولسن ہے، پھر چل نہیں۔"

یہ ان کی جماعتی سیاست تھی اور ہمیں اس میں دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ خاموش بیٹھے تھے کہ اچانک بلمپ نے پلٹا لیا اور بولا۔

"اور اس باب میں ہمارے پاکستانی دوست کا بھلا کیا خیال ہے؟"

ہم نے کہا۔ "حضور، یہ آپ کا گھریلو معاملہ ہے لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر پولیس کے سپاہیوں کو چند لونڈوں نے مارا پیٹا ہے تو ان کے خلاف پوری برٹش آرمی کا استعمال ذرا فضول خرچی نہ ہوگی؟ مکھی سے نبٹنے کے لئے مکھی مار کا استعمال تو درست ہے لیکن انفنٹری بریگیڈ طلب کر لینا ذرا زیادتی ہے۔"

اس پر ایمپائر کے تینوں فدائیوں نے ہمیں متفقہ غضب سے دیکھا اور ان میں سے ایک نے ہمارے دوست کرنل کولسن سے طنزاً کہا۔

"جان تمہارے پاکستانی مہمان تو ماشاءاللہ سوشلسٹ معلوم ہوتے ہیں ۔ مبارک باد۔"

جان فوراً ہماری مدد کو پہنچا اور بولا۔ "خیر مبارک۔ اگر آپ مکھی کے مقابلے پر بریگیڈ ہی لانا چاہتے ہیں تو خاکسار بھی سوشلسٹ ہے۔"

جان کی تائید ہمیں تو بہت موافق آئی لیکن اس شام کے لئے حقیقی ٹریجیڈی ثابت ہوئی۔ ایک لمحے میں پارٹی کی چہک اور چمک ماند پڑ گئی۔ گلاس خالی ہونے کے بعد خالی ہی رہے اور حیلہ شیر کا رخاموشی سے کھانے کے کمرے کو چل پڑے۔ میز پر بیٹھے تو یوں لگے جیسے کھانا کھانے کی بجائے پوکر کھیل رہے ہوں ۔۔۔ پارٹی کا حشر کسی قدر حسرت ناک تھا لیکن ہمارے خدشات سے زیادہ حسرتناک نہ تھا۔ سو برداشت کر لیا

محمد نواز اور محمد اقبال کچن میں خود کفیل نکلے

دوسرے روز مسٹر پارسنز نے ہمیں وار آفس اور پارلیمنٹ کی طویل مگر غیر دلچسپ سیر کرائی۔ فارغ ہوئے تو ایک بجے کا عمل تھا

---

[1] میرے دوست، یہ خفیہ بات ہے۔

[2] ہیرلڈ ولسن جو اُن دنوں مزدور پارٹی کی طرف سے وزیر اعظم تھے۔

ہمارے اندر بھوک نے کروٹ لی۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، لندن میں کھانا ایک پرابلم ہے، خصوصاً ہم جیسے حساس معدہ اور ـــــ اجازت دیں تو ـــــ نفیس طبع خاکساروں کے لئے۔ کیا خوش قسمت ہیں وہ روڈ رولر مزاج لوگ جن کے سامنے کھانے سے ملتی جلتی جو چیز بھی رکھ دی جائے اس اُصول کے تحت چٹ کر جاتے ہیں کہ "ہر چہ آید پیشِ مرداں نام آں بھاگاں بھریست"! لیکن ہمارے مسلک میں بھاگاں بھری صرف وہ جنسِ لطیف ہے جو رنگ میں عناب ہو، بُو میں گلاب ہو، ذائقے میں کباب ہو اور نشے میں شراب ہو۔ لندن کے انگریزی ریستورانوں میں یہ جنس ناپید تھی ـــــ لندن میں اچھے کھانے کی ایک ہی ترکیب ہے کہ کسی ایسے پاکستانی دوست کے گھر کا سُراغ لگایا جائے جو ساتھ دیسی بیوی ـــــ یا بیوی سے مشابہ شئے ـــ رکھتا ہو مگر ایسی بیوی یا شئے جو مینٹل پیس قسم کی بیگم نہ ہو۔ یعنی آئینے کے علاوہ چولہے کے سامنے بھی کھڑی ہو سکتی ہو اور شینل فائیو کے علاوہ پیاز اور لہسن کا سامنا بھی کر سکتی ہو۔ ویسے لندن میں بیگموں کو بھی آخر کار بیوی بننا ہی پڑتا ہے کہ وہاں خاوند کے علاوہ نوکر بھی رکھا جائے تو تنخواہ اور نخرے کے لحاظ سے دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جو صاحب اور بیگمیں وطن سے دیسی نوکر ساتھ لے جاتے ہیں وہ بھی بہت زیادہ عرصہ اُن کی خدمات سے مستفید نہیں ہو سکتے کہ پاکستانی نوکر بھی زود یا بدیر انگریزی خربوزوں کو دیکھ کر انگریزی رنگ پکڑ لیتے ہیں۔ اور کیوں نہ پکڑیں؟ خود صاحب اور بیگم کہاں کا پیدائشی رنگ رکھتے ہیں؟ چند سال پہلے یہ بھی بے رنگ ہی تھے۔ انہوں نے بھی دوسرے خربوزوں ہی سے رنگ اخذ کیا ہے ـــــ خیر یہ ایک اور جملۂ معترضہ ہے ـــــ سوال ہمارے سامنے کسی بیوی دار دوست کا تھا۔ ایک دوست ذہن میں آئے لیکن اگر دوست موافق تھا تو بھابی ناموافق تھی اور وائس ورسا[1]۔ آخر قرعہ دو ایسے یکجا رہنے والے دوستوں کے نام نکلا۔ جن کے پاس دوستی تو بے حساب تھی، بیوی ایک بھی نہ تھی۔ ہر چند کہ بوجوہ وہ بیویوں کی کمی کے بجا طور پر حسرت سنج تھے تاہم چھ سال کی چھپہ رانی نے انہیں کچن میں خود کفیل کر دیا تھا۔ یہ تھے محمد نواز اور محمد اقبال۔ ہم نے انہیں فون پر اپنی آمد اور نیت سے خبردار کیا اور بیکر لو کی گاڑی میں ولسڈن گرین کا ٹکٹ لے کر بیٹھ گئے۔ جب بالآخر اُن کے فلیٹ پر پہنچے تو ناگہاں دیارِ غیر میں وطنِ عزیز کے طعام خانوں کی مانوس خوشبوؤں کا جھونکا آیا۔ محمد نواز ایپرن پہنے مُرغ بھون رہے تھے اور محمد اقبال نہایت چابکدستی سے پلاؤ دم کر رہے تھے اور کبابوں کی پلیٹ پہلے ہی سے سج کر ایک شیشے کے ڈھکنے کے نیچے بیٹھی تھی، جیسے دلہن کی کوئی سہیلی پیش از وقت ہی بن ٹھن کر نکل آئی ہو۔ اب اس تفصیل میں جانا لاحاصل ہے کہ کس مزے سے ہم نے اِس مغلئی مرغ، اس بادشاہی پلاؤ اور ان کوکلتاش کبابوں کو ٹھکانے لگایا۔ پھر کس نشے میں چُور ہو کر بے سُدھ لیٹ گئے اور آخر کس سکون سے ایک مدت کے بعد جاگ کر کھڑکی سے باہر جھانکا تو دیکھا کہ "تاروں بھری رات ہے پر تُو نہیں۔" چنانچہ اُٹھے اور "تُو" کی تلاش میں نکل پڑے۔

پاکستان ہائی کمیشن : ایک پُرانی یاد

مسافروں کو ممالکِ غیر میں اپنا سفارت خانہ اپنے وطن کا ٹکڑا محسوس ہوتا ہے اور سفیر اور دیگر اہلکار جگر کے ٹکڑے لگتے ہیں۔ گویا

---

[1]: VICE VERSA لاطینی کی معروف ترکیب جس کے معنی ہیں۔ "اس کا اُلٹ بھی درست ہے۔"

سفارتخانے کی دہلیز کے اندر قدم رکھا اور اپنے گھر میں داخل ہوگئے اور لخت ہائے جگر سے مل کر اپنے جگر کو ٹھنڈک پہنچائی۔ لیکن بدقسمتی سے لندن کے پاکستانی سفارتخانے کی تاثیر ذرا مختلف رہی ہے۔ پاکستانیوں کے لئے اس غیر ملک میں اگر کوئی غیر تر مقام ہے تو وہ پاکستانی ہائی کمیشن ہے۔ ذاتی طور پر ہمیں اس دورے میں ابھی تک اپنے ہائی کمیشن سے کام نہ پڑا تھا۔ لیکن دس برس پیشتر جب ہمیں کام پڑا تھا تو ہمارا تجربہ دوسرے ہم وطنوں سے مختلف نہ تھا۔ اُن دنوں پہلی دفعہ اپنے ہائی کمیشن کے دروازے پر پہنچے تو دو پاکستانی فٹ پاتھ پر بیٹھے روتے پائے۔ معلوم ہوا کہ کسی کام کے سلسلے میں آئے تھے اور اب سڑک پر بیٹھے دربان کے حسن سلوک اور کسی اندرونی صاحب بہادر کی فرض شناسی کو دعادے رہے ہیں ہماری فوجی یونیفارم کے احترام میں ہمیں دہلیز عبور کرنے کی اجازت تو مل گئی لیکن جب اندر جاکر ایک چھوٹے صاحب سے عرض مدعا کیا تو موصوف اس طرح پیش آئے جیسے ہم کسی بلوے میں پکڑے ہوئے آئے ہوں ـــــ دراصل ہمارا مدعا صرف یہ تھا کہ اگر ہمارے نام کی جی ایچ کیو پاکستان سے کوئی چٹھی آئی ہو تو ہمیں عنایت کردی جائے یا ہمارے ہوٹل کے پتے پر ہمیں بھیج دی جایا کرے ـــــ بہرحال چھوٹے صاحب کے دفتر سے جاں بخشی کے بعد نکلے تو اتفاقاً بڑے صاحب کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے باہم نظریں لڑگئیں۔ پرانی فوجی روشناسی تھی۔ مروت میں آکر رُک گئے اور سلام کی خاطر ان کے کمرے کے اندر قدم رکھ دیا لیکن قدم رکھنا تھا کہ صاحب بہادر کے چہرے پر آناً فاناً قبض طاری ہوگئی اور پیشتر اس کے کہ ہم سلام عرض کرسکتے، ارشاد ہوا۔

"تمہارے آنے کی سرکاری اطلاع ہمیں نہیں ملی۔ لہٰذا ہم تمہیں انگلستان میں لُک آفٹر[2] نہیں کرسکتے۔"

سُبحان اللہ۔ حسنِ اخلاق کا کیا برجستہ اور ایمان افروز مظاہرہ تھا! ہم دہلیز کے پاس ہی رُک گئے۔ انہیں علم نہ تھا کہ ہم کسی اور کے مہمان ہوکر لندن میں آئے ہوئے ہیں اور صاحب بہادر کی دستگیری کے محتاج نہیں بلکہ پورے تین ماہ سے کچھ ایسے دلربا قسم کے میزبانوں کے ہاتھوں لُک آفٹر ہورہے ہیں کہ صاحب بہادر جیسے کرم فرماؤں کی نظر سے ہمیں خسرہ نکلنے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ بڑے صاحب کی بدتمیزی معاف کرتے ہوئے اور اپنا سلام دعا میں بدلتے ہوئے دروازے سے ہی کھڑے کھڑے کہا۔

"حضور کا اقبال سلامت۔ دو پاکستانی آپ کی عنایت سے باہر فٹ پاتھ پر لُک آفٹر کئے جارہے ہیں۔ بندہ محروم بھی رہا تو کوئی بات نہیں۔"

الغرض یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی پاکستانی کا لندن کی فضا میں سانس لینا بھی خداوندانِ ہائی کمیشن پر گراں ہے جیسے ہر پاکستانی سانس لیتے وقت اُن کے حصے کی آکسیجن کھینچ رہا ہو۔

پاکستان ہائی کمیشن : ایک نیا تجربہ

اس پس منظر کے ساتھ آج دس سال بعد ہمارا پھر ہائی کمیشن جانا ہُوں تو خارج از بحث تھا لیکن سخن گسترانہ بات اس مقطع میں آپڑی

---

[1] : اُن دنوں ہائی کمیشن کہلاتا تھا۔

[2] : LOOK AFTER : خبر گیری کرنا، خیال رکھنا۔

ہم لندن سے چند اشیاء خرید کر پاکستان لے جانے کے لئے ہائی کمیشن کی اجازت لازم تھی۔ چنانچہ انتہائی ہچکچاہٹ کے بعد فیصلہ کیا کہ چلو، ملٹری ایڈوائزر سے بات کرتے ہیں۔ ممکن ہے اس دفعہ کوئی معقول آدمی ہو۔ فون کیا تو اُدھر سے جواب آیا۔

"بریگیڈیر حسن ہیئر۔"

نام سنا تو خیال آیا کہ ان سے پنڈی میں مختصر سی ملاقات ہو چکی ہے اور یہ کہ آدمی شریف ہیں لیکن کیا معلوم ہائی کمیشن کی کرسی نے ان پر کیا اثر کیا ہو۔ عام حالات میں یہ بڑی قابض شئے ہے۔ بہرحال عرض کیا۔

"السلام علیکم جناب۔ میرا نام محمد خان ہے۔ کرنل محمد خان۔"

اور جواب میں یہ سننے کے لئے تیار ہو بیٹھا کہ یہاں ٹیلی فون پہ ٹیک پڑنے والوں کو ہم لفٹ نہیں کیا کرتے لیکن حیرتوں کی حیرت! جواب آیا اور اشتیاق میں ڈوبا ہوا جواب۔

"وعلیکم السلام کرنل صاحب۔ کیا خوشگوار سرپرائز ہے! کہاں سے بول رہے ہیں؟"

پتہ چلا کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ عرض کیا۔

"جناب میں لندن ہی سے بول رہا ہوں اور آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اس سے بڑی نیکی کوئی نہ ہوگی۔ لہٰذا دیر نہ کیجئے۔"

ہم نے دیر نہ کی ـــــ بریگیڈیر حسن سے مل کر ہماری خوشی میں ایک نئی خوشی شامل ہو گئی کہ یہ پُرلطف ملاقات ہائی کمیشن کے اُسی کمرے میں ہو رہی تھی جہاں سے دس سال قبل ہم دہلیز ہی سے لوٹ آئے تھے۔ کہاں وہ سبب دلآزاری اور کہاں یہ بے حساب دلنوازی! ـــــ

ـــــ خواتین و حضرات، اس مقام پر آپ کے لئے بھی ایک پیغام ہے اور وہ یہ کہ خوش رہئیے اور خوش کلامی کیا کیجئے کہ یہی اسم اعظم ہے۔ خواجہ صاحب نے آسائشِ دوگیتی کے لئے یہی مشورہ دیا ہے۔ اور وہ جو ایک جگہ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ "جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا" تو وہ محض معشوقوں کے لئے شاعرانہ رعایت ہے اور ایسے شیریں لب حسین خال خال ہی پائے جاتے ہیں۔ اگر ان چیدہ شیریں لبوں میں سے کوئی پڑھ رہے ہوں تو اُن سے بھی التماس ہے کہ ذرا میٹھا جواب دے کر دیکھیں تو انہیں اور زیب دے گا ـــــ باتوں باتوں میں ہم بریگیڈیر حسن سے دور آنکلے ہیں۔ بہرحال بریگیڈیر صاحب سے باتیں شروع ہوئیں تو ہم اپنے ہی قریب آ گئے کیونکہ اُن کی ہر ادا میں کشش تھی اور جہاں کشش ہو وہاں فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ اس پُرلطف ملاقات کے انجام پر رخصت ہونے لگے تو بریگیڈیر صاحب بولے۔

"ہمارے ہائی کمیشن کے بڑے صاحب وطن لوٹ رہے ہیں۔ اگلے ہفتے اُن کے اعزاز میں دعوت دے رہا ہوں۔ شامل ہو سکو گے؟"

عرض کیا: "اگر مس پارس سدِ راہ نہ ہوئی تو یقیناً۔"

اور مس پارس کے سدِ راہ ہونے کا ڈر اس لئے تھا کہ اگلے ہفتے وہ ہمیں اسکاٹ لینڈ بھیجنے کے منصوبے بنا رہی تھی یا ایک پرانے منصوبے کی تجدید کر رہی تھی۔ لیکن تاریخ کا تعین ابھی نہیں ہوا تھا۔ وہیں سے مس پارس سے بذریعہ فون رجوع کیا تو بولی۔

اسکاٹ لینڈ اس ہفتے بھی اُتنا ہی دلکش ہے جتنا اگلے ہفتے ہوگا۔ آپ ابھی ہفتے ہو آئیں یعنی کل نہیں تو پرسوں اور اگلے ہفتے چھٹی منائیں۔ لیکن واپسی پر یہ بتانا نہ بھولیں کہ اسکاٹ لینڈ کے ہاتھوں آپ کے دل پر کیا گزری۔"

ہم نے مس پارس سے ... کیا اور دُعا دی اور بریگیڈیر صاحب کی دعوت قبول کر لی۔

(ختم شد)

(نوٹ: بسلامت روی کی اس آخری قسط کا تسلسل برقرار رکھنے کے لئے کتاب کا حصہ شگوفہ میں قبل ازیں شائع ہو چکا ہے)

من آنم

چند روز ہوئے ایک پروفیسر صاحب کا خط آیا۔ لکھا تھا۔

"محترمی! کسی نے آپ کی بجنگ آمد کو بھی مدرسہ میں پہنچا دیا ہے۔ یعنی اس کا ایک باب انٹرمیڈیٹ کے نصابِ اردو میں شامل کر دیا ہے۔ لیکن مرتبین نے آپ کا تعارف صرف دو سطروں میں کرایا ہے۔ جو طلباء کے لئے ناکافی ہے۔ پچھلے امتحان میں ایک سوال پوچھا گیا تھا: "بجنگ آمد کے مصنف کے حالاتِ زندگی دس سطروں میں بیان کرو۔" ایک اُمیدوار کا جواب ملاحظہ ہو۔

"محمد خاں کے بچپن کے حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جب جوان ہوا تو دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی اور یہ اسکول سے بھاگ کر فوج میں بھرتی ہو گیا اور لفٹیننٹ ہو کر محاذ پر جا پہنچا۔ وہاں اس نے دشمنوں کے پشتے لگا دیئے۔ پھر جنگ ختم ہو گئی تو اسے فوج سے نکال کر گھر بھیج دیا گیا۔ اس نے غصے میں آ کر ڈاکے ڈالنے شروع کر دیئے۔ مگر ڈاکو شریف نکلا یعنی امیروں کو لوٹتا اور غریبوں میں بانٹ دیتا۔ حکومت کو یہ بات اچھی نہ لگی اور اس کے پیچھے پولیس لگا دی گئی لیکن یہ اس کے ساتھ کئی سال آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ آخر ایک بھیدی نے اسے پکڑوا دیا اور صدر ایوب نے اسے جیل میں ڈال دیا۔ جب اس نے دیکھا کہ جیل سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تو تنگ آ کر بجنگ آمد لکھ ڈالی۔ مصنف تو جیسا ہے سو ہے مگر ڈاکو بارعب ہے۔ چہرے پہ لمبی مونچھیں ہیں۔"

خط ختم کرنے سے پہلے پروفیسر صاحب نے لکھا: "مجھے شبہ ہے کہ آپ کے سوانحِ حیات میں کسی مقام پر آپ کا کوئی ہمنام شریک ہو گیا ہے۔ (اشارہ ہے مشہور ڈاکو محمد خاں کی طرف جس نے ۶۹-۱۹۶۸ء میں کیمبل پور اور سرگودھا کے اضلاع میں راہزنی کی یاد تازہ کر دی)۔ براہِ کرم صحیح حالاتِ زندگی سے مطلع فرمائیں ورنہ طلباء کو ۱۵ نمبروں کا گھاٹا رہے گا۔"

پروفیسر صاحب کو تو ہم نے ایک مناسب جواب دے دیا۔ لیکن یہ حسرت دل ہی میں رہے گی کہ کاش یہ افسانوی حالاتِ زندگی سچ مچ ہمارے ہی ہوتے۔ اور اگر کبھی ہماری ملاقات اپنے ہمنام سے جیل کے اندر یا باہر ہو گئی تو وہ ہماری بے رنگ اور بے ثمر زندگی کو دیکھ کر ہنسیں۔ بجا طور پر طعنہ دے سکتے کہ

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے جنگ باز
اے روسیاہ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

کرنل محمد خان

دعوتِ چہلم

شاداب بے دھڑک

پی کھا کے مغفرت کی دعا دیجئے جلئیے چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے
جینے کی آرزو میں مرا ہوں میں بے دھڑک
مرحوم آج ہو کے جیا ہوں میں بے دھڑک
یہ جشنِ انتقال ہے خوشیاں منائیے چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے
چہلم کا یہ پُلاؤ نہایت لذیذ ہے
جو سیر ہو کے کھائے وہ میرا عزیز ہے
گر ہو سکے تو ساتھ میں چُورن بھی لائیے چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے
جیتے جی ایسی دعوت وعزّت کہاں ملی
حسرت ہی رہ گئی یہ عنایت کہاں ملی
اب مر گیا ہوں شوق سے جلسے منائیے چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے
شاعر مَرا ہے اُردو کا ماتم کناں ہے شہر
مُردوں کے سلسلہ میں بڑا مہرباں ہے شہر
چھپوا دیئے کتابیں، خطابات دلائیے چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے
بیگم یہ داد خواہوں کی ہے داد لیجئے
اُردو اکیڈمی کی یہ امداد لیجئے
اس روپیہ سے گروی کا بُرقع چھڑائیے چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے
جلسے بھی تعزیت کے کئی نام کے ہو گئے
مرنے کے بعد ہم تو بڑے کام کے ہو گئے
اب بے دھڑک کی نیکیاں ساری گِنائیے چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے

مٹکے کی دُھن میں ہے

ساغر شولاپوری

اِس دَور کا انسان مٹکے کی دُھن میں ہے بچہ بوڑھا جوان مٹکے کی دُھن میں ہے
اٹکا ہے دم حلق میں حضرت کا اس لئے مُردے کی آدھی جان مٹکے کی دُھن میں ہے
اِک دن لگا تھا نمبر اُس کا دو آنے کا اُس دن سے شیر خان مٹکے کی دُھن میں ہے
زرخیز کالے کھیت اں جنگل بنا کو چھوڑیں
انڈیا کا ہر کسان مٹکے کی دُھن میں ہے

شگوفے

رات میں ایک تاریک اور تنگ گلی سے تنہا راہرو گذر
ہ دو سیاہ سائے اس کی طرف بڑھتے ہوئے قریب آگئے
نہایت شریفانہ لہجے میں راہرو سے پوچھا۔ "جناب معاف
آپ کو زحمت تو ہوگی، لیکن کیا آپ ہمیں ایک پانچ پیسے
بطور قرض دے سکتے ہیں۔"
راہرو نے جواب دیا۔ "ضرور۔ کیوں نہیں۔ لیکن کیا
ں سکتا ہوں کہ رات کے اس وقت کو آپ کو پانچ پیسے
ی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔"
دوسرے سائے نے فوراً جواب دیا۔ "ضرور، ہم آپ کو
گے۔ دراصل میں اور میرا ساتھی سکّہ اچھال کر یہ فیصلہ کرنا
ہیں کہ آپ کی دستی گھڑی اور آپ کی پرس پر فرداً فرداً
سے کس کا حق ہے۔"

٭ ٭ ٭

ایک شخص بار میں بیٹھا ہوا بڑے تاسف اور بیزاری سے
لے شراب نوش کر رہا تھا۔ اس کے دوست نے پوچھا "یار آج
تنا خاموش نظر آرہے ہو۔ آخر کیا بات ہے۔"
شرابی دوست نے کہا۔ "بیوی سے جھگڑا ہوگیا اور اس نے ایک
لک بات نہ کرنے کی قسم کھائی ہے"

اس پر دوست نے کہا۔ "اس میں رنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو ایک خوشی کی بات ہے اور تم کو چاہیئے کہ اس کا جشن منائیں۔"

اس پر شرابی نے کہا۔ "افسوس تو اسی کا ہے کہ جھگڑا گذشتہ ہفتہ ہوا تھا اور آج اُس ہفتہ کا آخری دن ہے۔"

٭ ٭ ٭

✽ ایک صاحب کی موٹے موٹے عدسوں والی عینک گم ہوگئی۔ اُنہوں نے اخبار میں اشتہار دیا کہ جن صاحب کو بھی یہ عینک ملی ہو، ان سے گذارش ہے کہ وہ اس کی اطلاع اخبار میں جلی حرفوں میں دیں۔

٭ ٭ ٭

✽ عدالت میں عریاں رقص کے خلاف ایک مقدمہ زیر سماعت تھا۔ اتفاق سے ایک خاتون وکیل، رقاصاؤں کی طرف سے وکالت کر رہی تھیں۔ بحث اس پر ہو رہی تھی کہ عریانیت کیا ہے۔؟ خاتون وکیل نے جج سے مخاطب ہوکر کہا۔ "می لارڈ۔ اس سلسلے میں میں تین نکات آپ کی خدمت میں پیش کروں گی۔"

خوش مذاق جج نے بے ساختہ کہا۔ "مجھے درمیانی نکتے سے دلچسپی ہے، پہلے وہ پیش کیا جائے۔"

٭ ٭ ٭

✽ مشہور امریکی مزاح نگار مارک ٹوین کے پاس ایک نووارد پڑوسی پہونچا۔ اور اس نے شکایت کی کہ "جناب آپ کی بستی بھی عجیب و غریب ہے۔ مجھے ایک گھاس کاٹنے والی مشین کی ضرورت ہے مگر کوئی بھی میری مدد کیلئے یہاں آمادہ نہیں۔"

مارک ٹوین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ضرور۔ میں آپ کی مدد کروں گا۔ مگر ایک شرط ہے۔" ضرورت مند پڑوسی نے جواب دیا۔ "میں آپ کی کسی بھی شرط کو قبول کرتا ہوں۔" اس پر مارک ٹوین نے کہا۔ "آپ ضرور مشین لے جائیں مگر پہلے آپ کو میرے باغ میں استعمال کرنا ہوگا۔"

(مرسلہ: ڈاکٹر ی ک)

خرافات

(مراسلے)

■ محترم ایڈیٹر صاحب

خلوص محبت! خدا سے قوی اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے [illegible] اتنا ہی سلسلہ ماہنامہ شگوفہ کی شکل میں نکال رہے ہیں۔ یقیناً قابل تحسین وستائش ہے آپ کا یہ اقدام۔

صغیر احمد۔ [illegible]

■ مکرمی و محترمی کمال صاحب

تسلیم! زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ "شگوفہ" کا مطالعہ ایک عرصہ سے میری کمزوری رہا ہے۔ پاک صاف طنز و مزاح سے بھرپور پرچہ کی اشاعت پر آپ یقیناً قابلِ مبارکباد ہیں۔

لٹھ نلگنڈوی

رین بازار حیدرآباد

■ محترمی مصطفےٰ کمال صاحب!

اسلام علیکم!

"شگوفہ" کہاں کہاں نہیں کھِل رہا ہے۔ دو ہفتہ قبل اکولہ سے [illegible] گذاریں تو ہر جگہ شگوفہ نے مسرور کیا۔

شکیل اعجاز۔ اکولہ

■ جناب سید کمال صاحب۔ سلام مسنون۔

واقعی حیدرآباد کو خود یہ فخر ہے کہ ایک اُردو کا ایسا رسالہ بڑی پابندی سے ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔ یہ سب آپ لوگوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ آپ کے شگوفہ نے روتے ہوئے دلوں کو ہنسا دیا ہے۔

افتخار محمود انصاری

مومن پورہ۔ ناگپور

■ مکرمی آداب!

آج کے اس انتشار کے دور میں لوگوں کے چہروں پر حقیقی مسرت اور سکون کی ایک ہلکی سی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ آج اقلیم انسانی تفکرات کے صحرا میں بھٹک رہی ہے۔ جہاں در حجاب مشکلات اور پریشانیاں ہیں، ایسے انتشار اور گھٹن کے دور میں اگر کوئی چند لمحوں کے لئے بھی ہنسی اور مزاح کا سامان مہیا کرے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ اور یہ کام آپ "شگوفہ" کے ذریعہ بڑی کامیابی سے انجام دے رہے ہیں۔ "شگوفہ" یقیناً مایوس اور پریشان لوگوں کا مسیحا اور ذہنی اُلجھنوں کے شکار لوگوں کے لئے مجرب نسخہ ہے۔

منظور وقار۔ گلبرگہ

■ محترم! تسلیم

"شگوفہ" پابندی سے مل رہا ہے۔ آپکی کاوشوں سے اس کے حُسن میں دن بدن نکھار پیدا ہوتا جارہا ہے۔ اس ضمن میں میرا ایک حقیر مشورہ ہے کہ آپ ہر ماہ مزاحیہ ادب پر ایک تنقیدی مضمون ضرور شامل کیجئے۔ اس سے پرچے کی افادیت میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

ظفر کمالی۔ پٹنہ

■ مکرمی مصطفےٰ کمال صاحب!

شگوفہ آپکی بے لوث اُردو خدمت کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔

افسر جمالی۔ کریم نگر

کسانوں کیلئے اور ہم سب کیلئے برتر اقدامات

ہماری ریاست میں بڑے بڑے دریا بہتے ہیں۔ زمین زرخیز ہے۔ کسان سخت محنت کرنے والے ہیں لیکن ان سب کو اگر ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تو کوئی فائدہ مند نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

آندھرا پردیش نے آبپاشی کے تحت کے علاقوں کی ترقی کے لئے اقدامات کا آغاز کرکے زراعت کا شتکاری کے تصور کو عصری بنا دیا ہے۔

ناگ ارجنا ساگر رائٹ کنال، ناگ ارجنا ساگر لفٹ کنال، سری رام ساگر اور تنگبھدرا پراجیکٹس کے کامپلکس کے تحت چار آبپاشی علاقوں میں ترقیاتی کام انجام دیئے جا رہے ہیں۔

ان ترقیاتی پروگرام حسب ذیل اقدامات پر مشتمل ہیں:

- بلند براہی آب کا مشترکہ انتظام جس کے تحت دائرہ بندی کا طریقہ یعنی باری باری سے پانی کی سربراہی کا انتظام کسانوں میں تیزی کے ساتھ مقبول اور پسندیدہ ہوتا جا رہا ہے۔
- کھیتوں میں پانی کی سربراہی کے لئے نالیوں کی تعمیر۔
- باقاعدگی کے ساتھ آراضیات کی ترقی اور بہتری۔
- کسانوں کے لئے قرض کی سہولتیں
- پرزور زرعی اور توسیعی پروگرام

(بقیہ صفحہ ۵۸ پر)





زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد: ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۱ء شمارہ: ۱۰

طباعت:
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس پرانی حویلی حیدرآباد ۲

سالانہ (۲۵) روپے
بیرونِ ہند (۴۵) شلنگ
فی پرچہ ۲ روپے ۵۰ پیسے

خط و کتابت کا پتہ: ۳۱ بیچلرس کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد فون: 57716

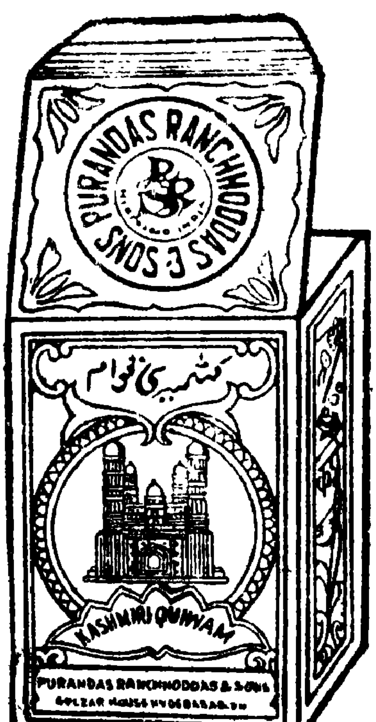
سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

ڈسٹری بیوٹرس برائے :

۱۔ موہن میکن بریوریز ۲۔ انڈین یسیٹ کمپنی لمیٹڈ ۳۔ پیپری سوئنٹس اینڈ ٹا فیس
۴۔ اجنٹہ ڈیری، آگرہ ۵۔ کیکو کیسنگ انڈسٹریز ٹریچور ۶۔ ڈرک بھوٹان فوڈ پراڈکٹس
۷۔ پارکو، سری نگر ۸۔ مسیڈونا کیسنگ کمپنی ۹۔ چیمپئن وہائٹ روٹس
۱۰۔ سِل SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ



سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی اِنتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچنے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لئے اس کے ڈبّے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے۔

تیار کنندگان :

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس گلزار حوض حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

دخل در نامعقولات (ڈرامہ)

حق تو یہ ہے ... (ترجمہ)

نہیں آتی تو یاد ان ... (یادِ رفتگاں)

اڑ گئے پُرزے (تعارف)

چورن (نظمیں)

ہم نے بیگم کے ساتھ شاپنگ کی

مجتبیٰ حسین

ایک دن ہم دفتر سے تھکے ماندے گھر پہونچے تو بیگم نے کسی تمہید کے بغیر گرج کر کہا "تمہیں دفتر جانے اور دفتر سے واپس آنے کے سوا کوئی اور کام بھی آتا ہے؟"

ہم بیگم کے اس اچانک اور غیر متوقع حملہ سے پریشان سے ہوگئے کیونکہ محترمہ کا ہمیشہ یہ وطیرہ رہا ہے کہ پہلے حملے کی تمہید باندھتی ہیں اور تب کہیں جاکر حملہ کرتی ہیں۔ انھیں شاید کسی نے شرافت کا یہ گُر بتلادیا ہے کہ کبھی دشمن پر غفلت میں وار نہ کرو۔ اس غیر متوقع حملہ سے سنبھلنے کے بعد ہم نے پوچھا:

"آخر بات کیا ہے؟ آج بہت ناراض دکھائی دیتی ہو!"

بولیں: "ہماری شادی ہوئے پورے دس برس بیت گئے مگر آج تک آپ ایک بار بھی میرے ساتھ شاپنگ کے لئے نہیں چلے!"

ہم نے کہا "محترمہ! شاپنگ سے ہمارا کیا واسطہ؟ ہم تو خود ایک بکاؤ چیز ہیں جبھی تو آپ کے والدِ محترم نے ہمیں دس ہزار روپیے سکۂ رائج الوقت میں خریدا تھا۔"

بولیں: "آپ کس کی مثال دے رہے ہیں۔ میرے والد بھی شاپنگ کے معاملے میں بڑے اناڑی واقع ہوئے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہیں کیوں خریدتے؟ کوئی اچھی چیز نہ لے آتے۔ امّی جان کو ابا جان سے ہمیشہ شکایت رہی کہ وہ شاپنگ کے گُر سے بالکل ناواقف ہیں۔"

ہم نے کہا: "بیگم! دس سال پہلے جو سودا ہوا تھا اس پر اب بحث کرنا بیکار ہے۔ یوں بھی تجارت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ایک بار بکی ہوئی چیز دوبارہ واپس نہیں لی جاتی مگر یہ تو بتاؤ کہ آج تمہیں اچانک یہ شاپنگ کا خیال کیوں آگیا؟"

بولیں "وہ جو ہمارے برابر نئی پڑوسن آئی ہے نا وہ آج اپنے شوہر کے ساتھ شاپنگ کے لئے گئی تھی۔ پورے آٹھ گھنٹے تک شاپنگ کرنے کے بعد شام میں گھر واپس ہوئی تو اس کا شوہر سامان سے یوں لدا پھندا تھا کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سامان کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور شوہر کہاں ختم ہو رہا ہے؟ ایسے سعادت مند شوہر اب [illegible]

نہیں ملتے۔ مگر میں تمہیں اس نئے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا تم شاپنگ میں میری مدد نہیں کرو گے ؟ "

ہم نے کہا " بیگم ! یہ جو ہم مہینہ بھر دفتر میں محنت کرتے ہیں تو یہ اصل میں تمہاری " شاپنگ " کے لئے ہی محنت کرتے ہیں۔ اگر ہم محنت نہ کریں تو تم " شاپنگ " کس طرح کرسکتی ہو ؟ ذرا سوچو تو ! "

بولیں " دفتر میں فائیلوں پر قلم گھسنے کو محنت کرنا نہیں کہتے۔ میرے ساتھ شاپنگ کے لئے بازار چلو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ محنت کسے کہتے ہیں ؟ یوں بھی اِدھر چند دنوں سے تمہارا وزن لگاتار بڑھتا جارہا ہے اگر تم میرے ساتھ شاپنگ کے لئے چلا کرو تو دیکھنا چند دنوں میں تمہاری صحت کتنی بہتر ہو جائے گی۔ چہل قدمی اور وہ بھی شاپنگ کے لئے چہل قدمی ہمیشہ صحت کے لئے فائدہ مند ہوتی ہے "

معاملہ چونکہ یہاں صرف شاپنگ کا نہیں بلکہ پڑوسن سے مسابقت کا بھی تھا اسی لئے ہمیں بیگم کی تجویز کو چپ چاپ قبول کرنا پڑا۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری بیگم اپنی پڑوسنوں کو نیچا دکھانے کے لئے سب کچھ کرسکتی ہیں۔

ہم دوسرے دن بیگم کے ساتھ " شاپنگ " کے لئے گئے اور اس شان سے گئے کہ سارے محلہ کو اس کی خبر ہوگئی۔ حالانکہ ہم چاہتے ہوئے اس معاملہ کو پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔ واپسی میں اس معاملہ کو پوشیدہ رکھنے کی ہمیں فکر نہیں تھی کیونکہ ایسی مہم سے جب شوہر واپس آتا ہے تو وہ خود سامان میں " پوشیدہ " رہتا ہے بلکہ سامان کا ہی حصہ بن جاتا ہے۔

جب ہم " شاپنگ " کو جانے لگے تو دیکھا کہ ہماری پڑوسن کا شوہر اپنے کمرے کی کھڑکی سے ہمیں یوں دیکھ رہا تھا ، جیسے ایک مظلوم دوسرے مظلوم کو دیکھتا ہے۔ پھر ہم سوئے مقتل روانہ ہوئے یعنی بازار کی طرف روانہ ہوئے۔ ہمیں پتہ تھا کہ چونکہ ہماری پڑوسن نے اپنے شوہر کے ساتھ آٹھ گھنٹوں تک شاپنگ کی تھی۔ اسی لئے ہماری بیگم کی شاپنگ کا " عرصہ " اس سے یقیناً زیادہ ہوگا۔ مسابقت میں آدمی کیا نہیں کرتا۔

اس دن شاپنگ میں ہم پر جو گزری اس کا حال اب ہم کیا بیان کریں مگر اس کے بعد ہم نے تہیہ کرلیا کہ چاہے کچھ بھی ہو ، ہم کبھی بیگم کے ساتھ شاپنگ کے لئے نہیں جائیں گے۔ اپنی محنت کی کمائی کو جس بے دردی کے ساتھ ہم نے اپنی آنکھوں کے سامنے خرچ ہوتے دیکھا اُسے دیکھنے کی تاب اب ہم میں نہیں رہی۔ اس دن ہمیں پہلی بار اس لطیفے کا مطلب سمجھ میں آیا جس کے مطابق ایک صاحب نے پولیس تھانہ میں یہ رپورٹ درج کرائی کہ " میری بیوی پچھلے چھتّے گھنٹوں سے غائب ہے یا تو یہ کسی ٹریفک حادثے میں ہلاک ہوگئی ہے یا کسی نے اس کا اغوا کرلیا ہے یا پھر ہوسکتا ہے کہ وہ شاپنگ کررہی ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ خدانخواستہ کہیں وہ شاپنگ ہی نہ کررہی ہو "

خواتین سے ہمیں شکایت یہ ہے کہ وہ " شاپنگ " کو شاپنگ " نہیں سمجھتیں بلکہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ بازار کی ساری چیزوں کو دیکھنا اور ان کی قیمتوں کو جاننا ضروری سمجھتی ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض خواتین بازار سے دو گز کپڑا خریدنے کے ارادے سے نکلتی ہیں ، جب واپس ہوتی ہیں تو انھیں فرنیچر اور کراکری تک کی رائج الوقت قیمتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ معلومات میں اضافہ کرنا ایک اچھی بات ہے لیکن اس کے لئے سارے بازار کو الٹ پلٹ کر رکھ دینا بھی مناسب نہیں ہے۔ ہمارے ایک تاجر دوست بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ایک خاتون ان کی دکان میں ایک ساڑی کے دام پوچھتی ہوئی آئیں۔ ہمارے دوست ایک سچے تاجر ہیں۔ وہ اپنے گاہک کو ہر طرح خوش اور مطمئن رکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے خاتون کو ایک ساڑی دکھائی مگر انھیں پسند نہ آئی۔ اس پر انھوں نے یکے بعد دیگرے دکان کی ساری ساڑیاں محترمہ کے سامنے رکھ دیں۔ محترمہ ہر ساڑی

کی قیمت پوچھتیں اور پھر دوسری ساڑی کی جانب متوجہ ہوجاتیں ۔ دو گھنٹوں میں انھوں نے دکان کی ساری ساڑیوں کا دیدار کرلیا۔ ہمارے تاجر دوست نے کہا " محترمہ ! شاید آپ کو ہماری دکان کی ساڑیاں پسند نہیں آئیں اگر آپ کہیں تو برابر والی دکان سے آپ کے لئے کچھ ساڑیاں منگوا دوں۔ مجھے تو اپنے گاہکوں کی خوشنودی منظور ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ کوئی میری دکان سے یوں خالی ہاتھ جائے ۔ جیسے آدمی اس دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہے "

ہمارے تاجر دوست کی اس پیشکش کو سن کر خاتون نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور کہا " معاف کیجئے میں آپ کی دکان میں ساڑی خریدنے کے ارادے سے نہیں آئی تھی بلکہ میں نے اپنے شوہر سے کہا تھا کہ وہ دفتر سے سیدھے آپ کی دکان پر آجائیں۔ ہم لوگوں کو آج رات اپنے عزیز کے یہاں کھانے پر جانا ہے مگر شوہر کی غیر ذمہ داری دیکھئے کہ آپ کی دکان کی ساری ساڑیوں کا میں نے دیدار کرلیا مگر وہ اب تک نہیں آئے ہیں " سنا ہے کہ اسی اثنا میں خاتون کے شوہر نامدار اچانک نمودار ہو گئے اور خاتون ہمارے دوست کا شکریہ ادا کئے بغیر دکان سے نکل گئیں۔

ہمارے ایک دوست لکھ پتی آدمی ہیں۔ پہلے ہماری ہی طرح اوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے پھر اچانک لکھ پتی بن گئے ایک دن ہم نے ان سے پوچھا " بھئی ! تمہارے لکھ پتی بننے کا کیا راز ہے ؟ بولے " بھئی ! میں نے شادی کے بعد تہیہ کرلیا تھا کہ میری آمدنی کم از کم اتنی ضرور ہونی چاہیئے کہ میری بیوی کی شاپنگ میں کوئی رکاوٹ نہ ہونے پائے اور وہ میری آمدنی سے بالآخر مطمئن ہوجائے " وہ دن ہے اور آج کا دن ۔ میں اپنی آمدنی میں لگاتار اضافہ کرتا چلا آرہا ہوں۔ میں تو اپنی آمدنی سے خاصا مطمئن ہوگیا ہوں مگر جس دن میری بیوی میری آمدنی سے مطمئن ہوجائے گی اس دن میں پیسہ کمانے کے چکّر سے نکل آؤں گا ۔

ہم جانتے ہیں کہ بیویاں اپنے شوہروں کی آمدنی سے کبھی مطمئن نہیں ہوتیں ۔ جس دن ہم بیگم کے ساتھ شاپنگ کے لئے گئے تھے اس دن ایک شئے کے دام چکانے میں ہماری بیگم نے دکاندار سے پورے ایک گھنٹے تک بحث کی تھی۔ ہم نے بعد میں دبی زبان میں بیگم سے شکایت کی " پانچ روپے کی چیز کے دام چکانے کے لئے تم نے پورے ایک گھنٹے تک بحث کیوں کی تھی " اس پر تنک کر بولیں ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھئے۔ آپ کی آمدنی ہی کتنی ہے۔ مجھے خود چیزوں کے دام چکانا اچھا نہیں لگتا مگر تم پہ ترس آجاتا ہے ۔ اگر تمہاری آمدنی معقول ہوتی تو مجھے اتنی ذلت کیوں اٹھانی پڑتی ۔۔ پھر شاپنگ بھی ایک فن ہے ۔ تم کیا جانو کہ شاپنگ کیا ہوتی ہے ۔ سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس خریدنے کو شاپنگ نہیں کہتے سمجھے !"

ہمارے ایک دوست کو اُن کی بیوی ہمیشہ شاپنگ کے لئے اپنے ساتھ لے جاتی تھیں۔ بے چارے آئے دن کی خریداری سے تنگ آگئے تھے ۔ چاہتے تھے کہ کسی طرح اس جھنجھٹ سے نجات ملے ۔ ایک دن ان کی بیوی نے اپنے لئے بہت ساری چیزیں خریدنے کے بعد سوچا کہ اپنے شوہر کے لئے بھی ایک ٹائی خرید لی جائے ۔ محترمہ نے ایک ٹائی کو پسند کر کے اپنے شوہر سے پوچھا " یہ بتاؤ یہ ٹائی کیسی رہے گی ؟ " اس پر ہمارے دوست نے کہا " ڈارلنگ ! آپ یہ ٹائی اپنے شوہر کے لئے خرید رہی ہیں ۔ میں کیا جانوں کہ آپ کے شوہر کی پسند کیا ہے ؟ " دوکاندار خاتون کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگا اور محترمہ اپنے شوہر کو لے کر دکان سے فوراً باہر آگئیں ۔ سنا ہے کہ اس کے بعد پھر وہ کبھی اپنے شوہر کو شاپنگ کے لئے ساتھ نہیں لے گئیں۔

جو سعادت مند شوہر اپنی بیویوں کے ساتھ شاپنگ کے لئے جاتے ہیں۔ ان پر بڑا ترس آتا ہے جس دن ہم اپنی بیگم کے ساتھ شاپنگ کو گئے تھے اس دن ہماری بیگم کی ایک سہیلی بھی اپنے شوہر کے ساتھ شاپنگ کو آئی تھیں۔ دونوں سہیلیاں بڑی دیر تک یادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں اور ہم اور ہماری بیگم کی سہیلی کے شوہرِ نامدار ہاتھوں اور کندھوں میں انواع و اقسام کا سامان لٹکائے یوں کھڑے رہے جیسے عدالت کے کٹہرے میں ایک نادم اور شرمسار ملزم کھڑا رہتا ہے جب دونوں سہیلیوں کو احساس ہوا کہ ان کے شوہروں کا بھی آپس میں تعارف ہونا چاہیئے تو ان دونوں نے ہمیں ایک دوسرے سے ملانے کی کوشش کی۔ مگر یہ ملاقات بڑی عجیب و غریب تھی کیونکہ ہم دونوں نہ تو سلام کر سکتے تھے اور نہ ہی مصافحہ کر سکتے تھے کیونکہ ہم دونوں کے ہاتھوں میں سامان لدا ہوا تھا اور سانس پھول رہی تھی۔ اصل میں اسی بے بسی نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم کبھی اپنی بیگم کے ساتھ شاپنگ کو نہ جائیں۔ ــــ اور خدا کے فضل سے ہم آج تک اپنے ارادے پر قائم ہیں۔ ■

قمر الزماں قمر
(رانچی)

آشوبِ چشم

آشوبِ چشم کی جو چلی دفعتاً وبا　　میں بھی نہ اُس کے وار سے محفوظ رہ سکا
اپنے پرائے سب ہی تھے اس کی لپیٹ میں　　گھر میرا ایک وارڈ بنا اسپتال کا
میدانِ پانی پت کا تھا منظر گلی گلی　　جو حال میرے گھر کا، وہی شہر کا بھی تھا
عاشق مزاجوں کو تھیں مگر دہری اُلجھنیں　　چشمِ نظارہ باز پہ تھی دُھند کی رِدا
رہتے تھے جو اشاروں کنایوں کے منتظر　　مشکل تھا ان کے واسطے رستہ ٹٹولنا
"دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی"　　دونوں طرف دریچۂ نظارہ بند تھا
آنکھیں بنائے پھرتے تھے جو سرمہ دانیاں　　ان کو بھی دیکھ پاتا نہ تھا کوئی مردوا

القصہ سارے لوگ پریشان حال تھے
لیکن کچھ ایسے بھی تھے جنہیں فائدہ ہوا

جس فرد پر کچن کی تھیں کل ذمہ داریاں　　کچھ روز اپنے فرض سے آزاد ہوگیا
پھٹکارتی تھی بیوی جسے روز صبح میں　　وہ مطمئن تھا بند ہوا حملہ ڈانٹ کا
سڑکوں پہ جن کی آنکھیں قیامت مچاتی تھیں　　آشوبِ چشم سے ہوا وہ ختم سلسلہ
آنکھیں دکھاتی پھرتی تھیں جو گھور گھور کر　　ملتا نہیں تھا، دور تک ان کا کہیں پتا
باہر تھے کنٹرول سے جو لڑکے لڑکیاں　　ماں باپ ان کے دیتے تھے اس روگ کو دعا

میں بھی قمر بغل میں دبائے ہوئے بیاض
دو روز ایک کمرے میں اوندھا پڑا رہا

○

اعجاز وارثی

احساسِ کمتری

ہیروِ رہِ حیات میں جب لٹ لٹا چکے — ایک ایک کر کے چھوڑ گئے ساتھ ہمسفر
خواب و خیال ہو گئے رنگینیوں کے دن — اب ماہوش تھی کوئی نہ نامہ نہ نامہ بر
زر کی کمی نے عشق کو ٹیں ٹیں بنا دیا — کیسی شبِ وصال، گراں تھی گذر بسر
بیچارگی نے کردیئے غم کے دریچے وا — خالی مکاں میں ساتھ اگر تھی تو چشمِ تر
آداب کر کے عقل نے اک دن بصد خلوص — کی عرض دست بستہ کوئی سیکھئے ہنر
کچھ کیجئے کہ کام خور و نوش کا چلے — کیا پائیے گا گریہ و زاری سے عمر بھر
چھوڑا تھا جو بزرگوں نے برباد ہو چکا — رہنے کے جھونپڑے پہ بھی ہے لوگوں کی نظر
دن اچھے تھے کہ بات سمجھ میں کچھ آ گئی — ماضی کو خیرباد کہا، کس ہی لی کمر
قسمت سے سعیِ شام و سحر ثمر ور ہوئی — نغمے پھر ابھرے گردشِ دوراں کے ساز پر
حالات کچھ جو سنبھلے تو یہ فیصلہ کیا — تنہائی کو شکست دو شادی کے داؤ پر
لیکن یہ ذوقِ حسن پرستی کی شرط تھی — لڑکی ہو گلعذار و طرحدار و سیم بر
قائم تھے اپنی بات پہ ہر مرد کی طرح — حالانکہ اس حساب سے خود آپ تھے صفر
پھوٹا شگوفہ نخلِ پیام و سلام سے — ہاتھ آئی رشکِ ماہ دلہن، قصہ مختصر
شیطان کو جو سوجھی شرارت تو ایک دن — حضرت کے کان میں کہا، ہشیار بے خبر
اپنا سمجھ کے صرف یہی کہنے آیا ہوں — پڑنے لگی ہے شمع پہ پروانوں کی نظر
سمجھا ہے کس نے طائرِ خوش رنگ کا مزاج — اور ایک تو کہ عاجز و محروم بال و پر
شیطان تو فوراً آگ لگا کر چلا گیا — اور آپ پہنچے غصہ میں سیدھے مکان پر
احساسِ کمتری نے رقابت کو دی ہوا — خفت کی شہ پہ وہم و گماں نے اٹھایا سر
ہر کمرہ، باتھ روم، کچن دیکھنے کے بعد — تیزی سے چھت پہ چڑھ گئے، جھانکا ادھر ادھر
لیکن دلِ سیاہ کی تسکیں نہ ہو سکی — حالانکہ پارسائی کے شاہد تھے بام و در
دیواریں اور اونچی کرادیں مکان کی — شیشے کے ٹکڑے بکھر گئے ساری منڈیروں پر
دروازہ کی ہر ایک جھری بند ہو گئی — دستِ ستم دراز ہوا "کال بیل" پر

جاری ہے آج تک وہ حماقت کا سلسلہ
تالا لگا کے جاتے ہیں روز اپنے کام پر

غزل

سرپٹ حیدرآبادی

خود ہی غرق ہوتے ہیں گر کے وہ سفینے سے
آس جو شرافت کی رکھتے ہیں کمینے سے

لوگ قدر کرتے ہیں بعدِ مرگ شاعر کی
مستقل خسارے میں ہوں میں اپنے جینے سے

منتظر رہوں کب تک، کب وہ آئے گا آخر
انتظار میں جس کے ہوں کئی مہینے سے

ختم کر تو سکتا ہوں میکشی دھڑلے کی
باز آنہیں سکتا میں تو چھپ کے پینے سے

گر نہ ہو شرافت تو ہر بشر ہے اک ڈھانچہ
قدر ہر انگوٹھی کی ہوتی ہے نگینے سے

اعتراف اُن کو بھی ہے میری وفاؤں کا
گالیاں مجھے بھی وہ دیتے ہیں قرینے سے

دُم دبا کے دونوں بھی ہو گئے رفو چکّر
بھوک کھانا کھانے سے، پیاس پانی پینے سے

جھولیاں وہ شب بھر میں اپنی بھر ہی لیتے ہیں
ربط جو تے چوروں کا ہوتا ہے شبینے سے

ناک کٹ گئی جڑ سے ہر پلانے والے کی
میکدے میں سرپٹ کے آج مئے نہ پینے سے

حاصلِ کلام

دل ہے میرا کسی کی تمنّا لئے ہوئے
یوسف کو گود میں ہے زلیخا لئے ہوئے

سرپٹ کسی کے آنے کا کب سے ہوں منتظر
دِلکم کا اپنی آنکھوں میں جھنڈا لئے ہوئے

٭

نہ بحر و بر میں نہ برگ و ثمر میں رہتا ہے
نہ جسم و جان میں نہ قلب و نظر میں رہتا ہے

بھٹک رہا ہوں میں سرپٹ تلاش میں جسکی
پتہ چلا ہے وہ صنعت نگر میں رہتا ہے

٭

ہر اک سے جھک کے ملنے پر بھی لٹ معلوم ہوتا ہوں
سلیم الطبع ہوں لیکن بکٹ معلوم ہوتا ہوں

ٹکٹ کے واسطے ہوتا ہے جھگڑا ہر جگہ ناحق
میں صورت سے ہمیشہ بے ٹکٹ معلوم ہوتا ہوں

اشرف مالوی

لکھنؤ میرا وطن ......

لکھنؤ میرا وطن، میرا وطن، میرا وطن
نوابوں کا رئیسوں کا سنوارا ہے چمن
ور کے زور پہ سیٹھوں نے نکھارا ہے چمن
ن چلے فخر سے کہتے ہیں ہمارا ہے چمن
سچ تو یہ ہے کہ ہر اک دل کی ہے اس میں دھڑکن
لکھنؤ میرا وطن، میرا وطن، میرا وطن

یچنے کو یہاں ملتی ہے نزاکت بھرپور
ونکہ یہ شہر نزاکت میں رہا ہے مشہور
ردیوں میں نہیں ململ کے سوا کچھ منظور
یہ ادا اُس پہ ہیں کرتے کے کھلے سارے بٹن
لکھنؤ میرا وطن

ب بھی کوٹھے سے سرنگی کی صدا آتی ہے
ھاپ طبلے کی نہ جانے سینوں کو گرماتی ہے
ور گھنگرو کی جھنک دل میں اُتر جاتی ہے
بول مجرے کے ابھی چھوڑ کے جاؤ نہ سجن
لکھنؤ میرا وطن

وئی کنکوے لڑاتا ہے تو کوئی تیتر
یکھتا ہے کوئی پالی میں بٹیروں کے ہنر
وئی اوروں کے پکڑتا ہے کبوتر چھت پر
کوئی اڈے پہ بٹھائے ہوئے بلبل ہے مگن

لکھنؤ میرا وطن
سخت جاڑوں میں ہوا کھانے کو آتے ہیں عوام
گرمیوں میں جنھیں ہوتا ہے نہانے سے زکام
ایسے جوڑے نظر آتے ہیں یہاں صبح و شام
اپنی بے باکی میں جو پارک کو سمجھیں آنگن
لکھنؤ میرا وطن

سر دوپٹے سے، بلاؤز سے بدن ہے آزاد
بیل باٹم سے کیا کرتی ہے دھوتی فریاد
ساری دنیا کے کسی کونے میں ہوگا ایجاد
سب سے پہلے یہیں آئے گا مگر وہ فیشن
لکھنؤ میرا وطن

اب بھی اس شہر میں ہوتی نہیں بانکوں کی کمی
اینڈتے وہ بھی ہیں جن کی نہیں کچھ آمدنی
ٹھاٹھ باہر ہیں فقط گھر میں ہے تیلی اور ندی
جل گئی رسی مگر باقی ہے اب تک اینٹھن
لکھنؤ میرا وطن

رات و دن چلتے ہیں شعراء کی بدولت ہوٹل
کیونکہ وہ بیٹھ کے لکھتے ہیں وہاں نظم و غزل
ہے یقیں مجھ کو کبھی ختم نہ ہوگا یہ عمل
گھر میں ممکن نہیں بیوی کے سبب فکرِ سخن

لکھنؤ میرا وطن

میرؔ آئے تھے یہاں قطعہ سنانے کے لئے
غالبؔ آئے تھے یہاں شکل دکھانے کے لئے
سوداؔ آئے تھے یہاں قبر میں جانے کے لئے
کیونکہ دِلّی میں تو ممکن بھی نہ تھا گور و کفن
لکھنؤ میرا وطن

کونسل ہے یہاں قانون بنانے کے لئے
بحث کرنے کے لئے شور مچانے کے لئے
اور ہر سال نئے ٹیکس لگانے کے لئے
لیکن اَب ہونے لگا تھوڑا بہت پریورتن
لکھنؤ میرا وطن

عمر یاں ہے ابھی کارپوریشن کی مگر
اِس کو اس عمر میں آتے ہیں کئی خاص ہُنر
جانے کیا کیا یہ ستم ڈھائے گی بالغ ہوکر
نقد کے ساتھ ابھی ہوتی ہے فائل بھی غبن
لکھنؤ میرا وطن

جس نے پایا ہے اسی شہرِ نگاراں میں جنم
یاد ہے گاتا تھا تتلا کے یہ گانا ہر دم
بڑے ارمانوں سے رکھا ہے صنم تیری قسم
یعنی اِس شہر میں گذرا ہے مِرا بھی بچپن
لکھنؤ میرا وطن

قطعہ

ٹھاکر بھدرکی

مجھ کو ظالم بھوک سے تڑپا گیا
میں رہا باہر وہ اندر آگیا
شاعری کرنے میں، میں مشغول تھا
گھر میں کتّا گھس کے کھانا کھا گیا

رؤف رحیم

گستاخی معاف!

بدنظر، بدنما، گنجہ سر، شیخ جی
کیوں ہیں نظروں میں پھر معتبر شیخ جی
ٹانگیں معذور ہیں، آنکھیں بے نور ہیں
پھر بھی رکھتے ہیں قلب و جگر شیخ جی
حُسنِ معصوم کی فکر میں رات دن
پھر رہے ہیں فقط در بہ در شیخ جی
اَب حسینوں کا اس شہر میں کال ہے
بن گئے ہیں مرا دردِ سر شیخ جی
حُسن سترہ برس، عشق ستّر برس
کیا نباہیں گے اَب عمر بھر شیخ جی
کچھ تفاوت رہے عمرِ مابین میں
اَب تو جھکنے لگی ہے کمر شیخ جی
حُسن واقف ہوا آپ کے ظلم سے
اَب یہ اُڑنے لگی ہے خبر شیخ جی
اَب یہی آس ہے دل کی تسکین کو
لے کے جائیں گے اک دن قمر شیخ جی
کیا بھروسہ ہے اَب بہو ولیمہ کے بعد
جانے آئیں گے کب لوٹ کر شیخ جی
پھول پھل کیسے آئیں گے اُن کو رحیمؔ
اَب تو لگتے ہیں سوکھا شجر شیخ جی

غوث محی الدین خواہ مخواہ

دورہ پڑنا گھر میں باورچی کا

کسی گھر میں باورچی کا ہونا امارت کی نشانی سمجھا جاتا ہے اور جو لوگ اس نعمت سے محروم ہیں وہ اس کو فضول خرچی کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

شادی ہونے کے پانچ برسوں ہی کے اندر جب ہمارے ہاں سرکار کے مقرر کردہ کوٹے کے مطابق ۳ بچے پیدا ہوگئے تو خاتونِ خانہ اُن کا سنبھالنا ہی مشکل تھا باورچی خانے کی طرف کہاں سے دھیان دیتیں۔ مجبوراً یہ ذمہ داری ہمیں اپنے بینگر نما کندھوں پر لینی پڑی بعتاً ہم نے اپنے آپ کو دیوان خانے سے زیادہ باورچی خانے میں ہی پایا۔

دوست احباب آجاتے تو فوراً چولھے کی آگ دھیمی کر، ہاتھ منہ صاف کر کے اُن سے یوں ملتے جیسے باورچی خانے سے ہمارا دور کا تعلق بھی نہ ہو۔ بظاہر آواز لگاتے کہ ـــ "بیگم! چائے تیار ہے؟ ـ" اور تھوڑی دیر بعد خود ہی اپنے ہاتھوں تیار کر لے آتے۔ کچھ تاڑنے والے جو قیامت کی نظر رکھتے تھے، کپڑوں اور ہاتھوں پر لگی چولھے کی کالک سے اندر کی بات تاڑ لیتے اور رازدارانہ انداز میں پوچھتے ـ "لگتا ہے بھابی صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ـ" ہم جواب دینے سے پہلے کھسیانے ہوکر ہنستے ہی رہتے کہ نومولود رو رو کر اپنے بھوکے ہونے کا ببانگِ دہل اعلان کر دیتا اور ہم ملاقاتی کو سوچتا ہوا چھوڑ کر باورچی خانے میں دودھ کی بوتل تیار کرنے میں مصروف ہو جاتے۔

کچن میں مصروف رہتے ہوئے ہم اکثر سوچتے کہ واقعی یہ عورتوں ہی کا حق ہے کہ کس خوش اسلوبی سے پکوان جیسی مشقت سے برد آزما ہوتی ہیں اور ہم مرد ہیں کہ پہلے ہی نوالے کے بعد اپنی پسند کا بہت کم لیکن ناپسندیدگی کا فوراً مظاہرہ کر دیتے ہیں۔

بیگم بسترِ استراحت پر دراز ہمیں ٹرینڈ کر رہی تھیں اور ہم انتہائی سعادت مندی سے اس ہُنر میں یکتا ہو رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ہم میں خود اعتمادی پیدا ہونے لگی تھی۔ بیگم کی ہدایات کے بغیر بھی کچھ نئے پکوان تیار کر کے ہم نے اُنہیں سرپرائز

(Surprise) بھی دیا۔

ایک دن دودھ ہلکی آنچ پر رکھے ہم شیو کر رہے تھے کہ دودھ اُبل گیا اور اس کے ساتھ ہی بیگم بھی اُبل پڑیں۔ تبھی ہم دل کے پاس سے پاسبانِ عقل کو علٰحدہ کرکے سوچا تو یہ عقدہ کھلا کہ اس طرح تو ہم ہمیشہ کے لئے چولھے چکی کے ہو جائیں گے — اس سے الگ وہ جو ہماری اپنی دنیا ہے، مصروفیات ہیں۔ دوست احباب ہیں۔ اُن کا کیا ہوگا۔؟

تب ہم نے جی کڑا کرکے بیگم سے کہہ کہ باورچی خانے کی خدمات سے ہمارا استعفیٰ باحسرت ویاس قبول کیا جائے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہم بغاوت پر آمادہ ہیں تو سیاسی چال چل بیٹھیں۔

کہنے لگیں — "آپ کسی باورچی کا بندوبست کرلیں تو ٹھیک رہے گا۔"

یہ بات ہماری سمجھ میں بھی آئی (افسوس بھی ہوا کہ اتنی دیر سے کیوں آئی) اور جناب، یہیں سے ہمارے مصائب کی ابتدا ہوئی۔ پانچ مہینوں کی مدت میں سات باورچیوں کا تقرر بھی ہوا اور برطرفی بھی — وہ جس شان سے آتے اور جس رعونت سے جاتے انہیں دیکھ دیکھ کر ہمارے اندر احساسِ کمتری تو پیدا ہو ہی گیا تھا۔ بیگم بھی کافی مرعوب رہنے لگیں۔ پھر یوں ہونے لگا کہ ہر باورچی شایانِ شان خیر مقدم ہونے لگا کہ وہ جلد بھاگنے نہ پائے۔

جب آٹھویں باورچی کی آمد آمد کا اعلان ہوا تو کہنے لگیں — "دیکھیے! بیگم خان نے جس باورچی کی سفارش کی ہے وہ ٹھیک بارہ بجے آنے والا ہے۔ آج اتوار ہے۔ بازار جاکر سبزی، ترکاری، مسکہ، پنیر، جام جیلی، شربت اور میوہ وغیرہ لے آئیے۔ نیا باورچی فرج خالی دیکھے گا تو پتہ نہیں کیا سوچے گا۔ میں تب تک سارے برتن صاف دھولوں گی اور ہاں —! بازار سے نئے کپ ساسر کا سیٹ لیتے آئیے۔ موجودہ سیٹ کافی پرانا ہوچکا ہے اور ٹوٹ پھوٹ گیا ہے نیا باورچی دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔"

دس بجے ہم بازار سے لدے پھندے لوٹے تو گھر کی رونق ہی بدلی ہوئی تھی۔ ہر چیز صاف ستھری اور سلیقے سے سجی ہوئی تھی۔ باورچی خانہ، پلنگ اور پھولوں کے بغیر بھی حجلۂ عروسی سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ میز پر میرے نئے کپڑے استری کئے ہوئے رکھے تھے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا۔

"نئے باورچی کے لئے میں نے آپ کے 'پرانے' کپڑوں کا ایک جوڑا تیار کر رکھا ہے۔" ہم خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اس لئے کہ کپڑوں کا وہ واحد جوڑا تھا جو ہمارے نحیف ولاغر جسم پر ٹھیک سے بیٹھتا تھا۔

"— اوہ! ساڑھے گیارہ بج گئے۔ وہ اب آتا ہی ہوگا۔ میں اس کے لئے لیمو کا شربت تیار کرتی ہوں۔ پیاسا جو ہوگا؟ اور ہاں! آپ بھی بچوں کے کپڑے بدل کر اپنا حلیہ بھی ٹھیک کر لیجئے۔"

گیارہ بج کر ۵۵ منٹ پر ہم سب نئے باورچی کو خوش آمدید کہنے چشم براہ تھے۔ بالآخر ۱۲ بج کر ۵ منٹ پر گھنٹی بجی — در کھولا تو — جی ہاں! نیا باورچی ایک شانِ استغنا کے ساتھ کھڑا تھا۔ جذبات سے عاری چہرہ۔ بقول سلیمان خطیب مرحوم سے کسی قدر کھلتا رنگ۔ تیل میں چپڑے ہوئے سر کے بال، کان پر ادھ جلا ادبجھا سگریٹ۔ ہونٹوں کے شگافوں میں پان کی پیک جھرنے —

ہم نے اندر جا کر اپنا تعارف کروایا ۔ اس نے بے اعتنائی سے 'ہوں' کہا۔
بیگم نروس ہو کر کہنے لگیں ۔ " دیکھو ! ہم بہت سیدھے سادے لوگ ہیں ۔ سیدھا سادہ کھاتے ہیں اس لئے ہمارے ہاں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی ۔"
اس نے سُنی اَن سُنی کر کے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا ۔ ہم نے گھبراہٹ میں دیوار پر اس جگہ ہتھیلی رکھ دی جہاں کا پلاسٹر اُکھڑا ہوا تھا ۔
"آپ کے ہاں چولہا کیسا ہے ؟"
"گیس اور اسٹو ہے ۔"
"میں بازار نہیں جاؤں گا ، گوشت نہیں کھاؤں گا اور ہفتہ میں ایک بار چھٹی لوں گا۔"
"وہ تو تمہیں ملے گی ہی ۔"
"طبیعت چاہے گی تو چھٹی کے دن بھی کام کروں گا ۔ لیکن اس دن کی تنخواہ نقد لوں گا ۔"
میں نے کہا ۔ "تم ہماری بھی کچھ سنوگے ۔ میں یہ کہنا ۔ چاہتا ——"
بیگم نے بات کاٹ دی ۔ "ہاں ! ہاں ! ہمیں تمہاری یہ شرط منظور ہے ۔"
"میں دن میں ۳ بار چائے پیتا ہوں ۔ تمباکو کا پان کھاتا ہوں اور پیلا ہاتھی ، سگریٹ پیتا ہوں ۔"
"کیوں نہیں ضرور پی سکتے ہو ۔"
"کیا میں باورچی خانہ دیکھ سکتا ہوں ؟"
وہ آگے آگے اور ہم پیچھے پیچھے باورچی خانہ پہنچے ۔
باورچی ۔ "یہاں پنکھا نہیں ہے ۔"
بیگم ۔ "لگوا دیا جائے گا ۔"
ہم نے کہا ۔ "سنو باورچی ! ۔"
باورچی ۔ "میرا نام خدا بخش ہے ۔"
ہم ۔ "ٹھیک ہے خدا بخش ! یہ تو بتاؤ کہ تم کیا کیا پکانا جانتے ہو ۔"
خدا بخش ۔ "ہر قسم کی دال کے بھی سالن پکا لیتا ہوں ۔"
ہم ۔ "مثلاً :"
خدا بخش ۔ "بگھاری دال ، میٹھی دال ، پھیکی دال ، مرچوں کی دال ، کیری کی دال ، کھٹی دال ، گاڑھی دال ، پتلی دال ۔"
ہم ۔ "اس کے علاوہ اور کیا پکا سکتے ہو ؟"
خدا بخش ۔ "دال کے پسندے ، دال کا قیمہ ، دال کے کوفتے ، دال کا ماہی قلیہ ، دال کے بیگن ۔"

"بہت اچھا۔ تم کوئی ایسا پکوان بھی جانتے ہو جس میں دال نہ ہوتی ہو"۔

خدا بخش نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں؟ بیسن کی روٹی پکا سکتا ہوں۔"

"تنخواہ کیا لوگے ۔۔ ؟"

اور اس نے جو رقم بتائی اسے سن کر دوپہر کے وقت بھی ہماری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ پھر کہا ۔ "ایک مہینہ کام کروں گا اگر آپ لوگ مجھے پسند آگئے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ نوکری چھوڑ دوں گا۔"

کہاں تو ہم یہ سوچ رہے تھے کہ آج رات نئے باورچی کے ہاتھوں پکا کھانا کھائیں گے کہ بیگم نے کہا ۔

"چلئے! نئے باورچی کی آمد کی خوشی میں ہم سب آج رات کا کھانا باہر کھائیں گے ۔" وہ دن اور آج کا دن ہے۔ ہم کسی نہ کسی خوشی میں گھر پر کم اور باہر زیادہ کھانے لگے ہیں۔

کچھ دنوں بعد ہم پر یہ راز کھلا کہ ہم نے باورچی کو نہیں باورچی نے ہمیں اپنے اسسٹنٹ کے طور پر نوکر رکھا ہوا ہے۔ بازار جانے کا کام اس نے پہلے ہی دن سے ہمارے ذمہ سونپ دیا تھا۔ آئے دن کی پان، تمباکو، چھالیہ، کتھا، چونا اور چائے کی فرمائشیں پوری کرتے کرتے ہم پندرہ تاریخ ہی کو پھکڑ ہو گئے۔ دال کی ڈشیں کھا کھا کر سبھوں کے معدے خراب رہنے لگے۔ خود خدا بخش کی خوراک دیکھ کر ہماری بھوک ہمیشہ کے لئے مر گئی۔ جوں توں کر کے ہم نے ایک ماہ خدا بخش کو برداشت کیا اور ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہم ایک ماہ کے لئے وطن جا رہے ہیں اس لئے اب تم دوسری نوکری ڈھونڈ لو۔"

"اس طرح تو آپ کو ایک ماہ کی تنخواہ اڈوانس دینی پڑے گی۔"

مرتے کیا نہ کرتے ۔۔ بالآخر اڈوانس تنخواہ دے کر ہی ہماری گلو خلاصی ہوئی۔ اور ہم نے دوبارہ باورچی خانے کا چارج سنبھال لیا ہے۔

--

صفدر

مُلّا کی حمایت میں

اُردو شاعری اور اردو تنقید میں اِن دنوں جلال اور جمال کا ذکر بہت ہو رہا ہے۔ بُلبُل کا گلاب ہو یا اقبالؔ کا شاہین یا لالہ۔ سب تصویر کا ایک رُخ ہیں۔ یعنی جمالِ محض یا جلالِ محض۔ جلال و جمال کا بہترین امتزاج ہمیں کہیں نظر آتا ہے تو وہ مرغ کی ذات ہے (مرغیاں نہیں کہ وہ جلال اور جمال دونوں سے عاری ہوتی ہیں)۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج تک کسی اللہ کے بندے کو مُرغے کی طرف غور سے دیکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ ہمارے کُل ادبی سرمائے میں ایک مصرع یا ایک فقرہ (نیک نیتی کے ساتھ) مُرغے کی شان میں لکھا نہیں ملتا۔ جس زبان میں شُتر و چشمی اور طوطا چشمی جیسے محاورے مروج اور عام ہوں وہاں ایسی نگاہ کا پایا جانا بعید از امکان ہے جو مُرغے کے جلال و جمال کا مشاہدہ کرسکے۔

ایک عالم نے مرغ کو نظر بھر دیکھا ہے اور اس دیکھنے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ یعنی اُن مشکلات میں پھنس گئے ہیں جو چار آنکھوں میں ایک آنکھوں والے کو پیش آتی ہیں۔ مُرغا پالنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ حمام کی نالی سے کھانے کی تھالی تک مُرغ کی خورد و نوش کا مفت انتظام اپنے اور پڑوسیوں کے یہاں ہمیشہ میسّر ہوتا ہے۔ مگر مرغ کو جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ (ویسے ہمارے ملک میں پیدا ہونے والی ہر چیز کو آج مسئلہ ہی کہتے ہیں۔ مسائل ہی ہمارے ملک کی خاص پیداوار ہے۔) یہاں ہمیں انہیں مسائل کا ذکر کرنا ہے۔

مُرغ میں اور ہم میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ مثلاً مرغا اذان پڑھتا ہے، ہم بھی۔ وہ بھی بیگم کو صبح ہونے کی خبر دیتا ہے اور ہم بھی۔ وہ صبح میں سورج سے پہلے بیگم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور ہم چائے کی پیالی۔ وہ بھی بیگم کی پکار پر دیوانہ وار دوڑتا ہے اور ہم بھی۔ یہ مشترکہ صفات اور پھر مرغے کا جمال و جلال دیکھ کر ہم بے ساختہ پکار اُٹھتے ہیں کہ مُرغا ہمیں اپنے ہی جسم و جان کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے ؎

مُرغا اپنا ہو یا پرایا ہو جسمِ آدم کا جزو ہے آخر

کیسا شاعرانہ (بلکہ عالمانہ) خیال ہے! ہائے افسوس کہ اس خیال کی داد تو کجا بیگم یہ سُن کر کلغی کی طرح سُرخ (یعنی آگ بگولہ) ہو جاتی ہیں اور زبان لو دینے لگتی ہے۔ پھر ہم پر یہ الزام عائد کر دیا جاتا ہے کہ ہماری نیت میں فتور ہے۔ یعنی مسئلہ پھر ایک پیدا ہو جاتا ہے اب اس ایک مسئلہ کے ساتھ کئی ضمنی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً ہماری نماز سوانگ ہے۔ ہمارا ایمان محض دکھاوا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہماری پڑوسن اور ہماری بیگم دونوں ہر مسئلہ پر ایک دوسرے سے اختلاف کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ مگر اس ایک مسئلہ پر دونوں متفق ہیں کہ مُرغ کے معاملے میں ہم پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ موقع دیا گیا تو ہم اُسے جیتا ہی ڈکار جائیں گے۔

ہمارے اور ہمارے پڑوسی کے تعلقات نہایت کشیدہ ہیں اور کشیدہ تر ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر ہمارے مُرغے مُرغیاں ان فضول باتوں کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں اور دونوں گھرانوں میں ان کی بے تکلف آمد و رفت اور جائز (مُرغوں میں کوئی کام ناجائز تصور نہیں ہوتا) تعلقات قائم ہیں۔ چنانچہ جب میں عالمِ شوق میں لے ٓآ! آ! آآ! آآ! پکارتا ہوں تو ہمارے مرغ کے ساتھ پڑوس کے مُرغے مُرغیاں بھی دوڑی چلی آتی ہیں۔ ہماری آآآ پر پڑوسی کی مُرغی اور مُرغی کی کاخ کاخ پر پڑوسن 'ہُوش ہُوش' کرتی چلی آتی ہیں۔ یہاں بیگم پر ہماری نیت کے دوسرے فتور کا انکشاف ہوتا ہے۔ یعنی مسئلہ نمبر ۲ پیدا ہوجاتا ہے۔ بیگم کے برابر بولنے والی زبان چونکہ میسر نہیں ہے اس لئے چُپ کے سوا چارہ نہیں ہوتا۔ اس چُپ کی داد یہ ملتی ہے کہ محلے والے بھی ہمیں رنگین مزاج سمجھنے لگے ہیں۔

ایک اور مسئلہ سنیئے۔ مجھے اپنے مُرغ سے عشق ہے۔ میں اپنے مرغ کو "ابے او مُرغ" کہہ کر پکارتا ہوں۔ پڑوسی جو دروازے میں کھڑے ہوکر یا گلی میں ٹہل کر کھانا ہضم کرتا ہے۔ اس جملہ پر معترض ہے۔ میں اپنے مرغ کو ہانک لگاتا ہوں۔ گردن اس کی ٹیڑھی ہوتی ہے۔ ان محترم کا دروازے میں لٹکے رہنا دیگر اہلِ محلہ کی طرح ہمیں بھی سخت ناپسند ہے مگر کبھی اعتراض نہیں کرتے۔ ہاں اِن ہی اوقات میں اپنے مرغ کے لئے بے قرار ہوکر "ابے او مُرغ" کا نعرۂ مستانہ لگانے باہر نکل پڑتے ہیں۔ اب میں پوچھتا ہوں، میں مرغ کو مرغا نہیں تو اور کیا کہوں؟۔ اس سوال پر پڑوسی صاحب کی گردن کا ٹیڑھ کچھ اور زیادہ ہوجاتا ہے۔ انہیں اپنے ہی ہیں غالبؔ کے لفظوں میں سمجھایا۔ ؎

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اس کے باوجود اُن کی ناراضی اور مُرغ اور میرے تعلقِ خاطر میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں!

مجھے اُس گھڑی کا انتظار ہے کہ محلے کے بچوں کو اس جھگڑے کا علم ہو جائے اور وہ بھی مُرغے کے عشق میں گرفتار ہوکر "ابے او مرغ" کا نعرہ لگاتے ہوئے ہماری گلی کے پھیرے کرنے لگیں اور ہمارے پڑوسی محترم ہاضمہ کی درستی کے لئے گلی میں ٹہلنے کی بجائے دوائی کی دوکان کا رُخ کریں۔ اُن کے رُخ کے ساتھ ہمارا رُخ بھی بدل سکتا ہے۔

اس دنیا میں اکثر باتیں ہماری توقع کے خلاف ہوتی ہیں۔ بچوں کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ بچے ہمارے مُرغا کی بجائے ہماری خیریت دریافت کرنے لگے ہیں۔ اب اکثر گلی میں بچوں کا کورس گیت گونجتا رہتا ہے۔

"مُلّا کی حفاظت میں مُرغے کی جوانی ہے۔"

پڑوسی بدستور گلی میں ٹہل رہا ہے اور ہمارے اور مرغ کے مابین فراق کے لمحات بڑھ رہے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ہمارے عشق میں کمی واقع ہورہی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مُرغا جہاں کہیں ہو۔ جس کسی کا ہو ہمیں آج بھی اپنے جسم و جان کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔

جوہر سیوانی

مشاعرے کا اناؤنسر

بصد ناز و ادا ڈائس پہ آتا ہے اناؤنسر
حسیں الفاظ کا دریا بہاتا ہے اناؤنسر

جب آکر بزم میں آسن جماتا ہے اناؤنسر
بہ اندازِ غبارہ پھول جاتا ہے اناؤنسر

کبھی تعریف کا درپن دکھاتا ہے اناؤنسر
کبھی تضحیک کا پتھر چلاتا ہے اناؤنسر

رٹے اور بار بار اگلے ہوئے فقروں کو دہرا کر
ہمہ دانی کا خود ہی منہ چڑھاتا ہے اناؤنسر

سیاسی مسخرہ بھی اُس کے آگے مات کھا جائے
وہ مسخرگیٔ و لفاظی دکھاتا ہے اناؤنسر

کبھی حسنِ سخن کے بانکپن کی بات کرتا ہے
کبھی تخئیل کا جادو جگاتا ہے اناؤنسر

کبھی محفل میں تاریخِ ادب کا ذکر کرتا ہے
کبھی جغرافیہ فن کا بتاتا ہے اناؤنسر

کبھی رُتبہ بڑھا کر میر کا ثانی بناتا ہے
سرِ محفل کبھی ہوٹنگ کراتا ہے اناؤنسر

وہ شاعر جو نہیں ہوا اُسکی خاص الخاص ٹولی کا
تعارف ہی میں اُسکو کاٹ کھاتا ہے اناؤنسر

اشاروں میں حسیں انداز سے اُکسا کے مجمع کو
ہدف ہوٹنگ کا اُس کو بناتا ہے اناؤنسر

چلا جاتا ہے جب اسٹیج سے بڑھ کر کوئی شاعر
حسیں شعروں کا گن اُس پر چلاتا ہے اناؤنسر

کسی کو فکر و فن کے تاڑ پر لا کر بٹھاتا ہے
کسی کو تاڑ سے نیچے گراتا ہے اناؤنسر

کوئی تک بند جو رشوت میں دے ٹھرّے کی ایک بوتل
اُسے غالب سے بھی دو گز بڑھاتا ہے اناؤنسر

کبھی اسٹیج پر ہی مانگ لیتا ہے دوا دارو
کبھی سگریٹ سے اپنا دل جلاتا ہے اناؤنسر

کبھی ہے چائے کی خواہش کبھی خواہش ہے ساغر کی
کبھی تو پان بکری سا چباتا ہے اناؤنسر

جو دو گھنٹوں کی کوئی بزم ہوتی ہے تو ایک گھنٹہ
لطیفے اہلِ محفل کو سناتا ہے اناؤنسر

جو مل جاتی ہے دو گھنٹوں کی اُسکو بجۂ سقائی
تو سارے شاعروں کو دھونپتا ہے اناؤنسر

سرِ محفل کبھی تعریف کی بنسی بجاتا ہے
کبھی تنقید کی قینچی چلاتا ہے اناؤنسر

پلٹ کر جب کوئی شاعر اُسی پر چوٹ کرتا ہے
تو ساری لن ترانی بھول جاتا ہے اناؤنسر

کوئی بھی شاعرہ موجود جب ہوتی ہے ڈائس پر اُسے غالبؔ کا حُسنِ فن بتاتا ہے اناؤنسر
اگر کر دے کوئی اُس سے بھی فرمائش سنانے کی تو مائک پر چھلانگیں بھر کے آتا ہے اناؤنسر
سنہ ۶۲ء میں جو اکلوتی غزل سرزد ہوئی اُس سے اُسی کو سنہ ۸۱ء میں سناتا ہے اناؤنسر
خود اُس کو ہُوٹ کرنے پر جو تُل جاتے ہیں دل والے تو ہنس ہنس کر خجالت کو چھپاتا ہے اناؤنسر
پرانی دشمنی جب بانیٔ محفل سے ہوتی ہے اسی موقع پہ تو بدلہ چکاتا ہے اناؤنسر

یہی ہے تجربہ جوہرؔ، کہ اربابِ ظرافت سے
اُلجھنے کے عوض نظریں چُراتا ہے اناؤنسر
کسی شاعر سے جب محفل نہیں آتی ہے قبضے میں
ادب کے ساتھ جوہرؔ کو بلاتا ہے اناؤنسر

جھوٹا پانی

صغیر احمد سحرؔ سندیلوی

مثلِ برسات کے آنکھوں سے برستا پانی
میری بیگم کے جو دیدوں کا نہ مرتا پانی
عشق ناصح کو بھی ہو جائے تو پھر پوچھوں گا
چار ہی روز میں مانگے جو نہ بیٹا پانی
والیٔ ملک ہوں لیڈر ہوں کہ وہ جنرل ہوں
ان حسینوں کا تو بھرتا ہے زمانا پانی
اپنے وعدوں سے منسٹر جو مُکر جاتے ہیں
پی لیا ہوگا کسی شوخ کا جھوٹا پانی
میکشی بند تھی ساون میں گھٹا کیا اُٹھتی
مئے سے پابندی ہٹی، ٹوٹ کے برسا پانی
شیخ نے مانگیں دعائیں تو نہ پانی برسا
ہم نے ساغر جو اُٹھایا ہے تو اُٹھا پانی
ہو گیا ہے تجھے آزارِ محبت جو سحرؔ
چار ہی روز میں اُٹھ جائے گا دانا پانی

رحمت اللہ خاں (اکولہ)

مہمانِ خصوصی

مہمان کا نام سنتے ہی گھبراہٹ طاری ہوجاتی ہے۔ دانتوں پسینہ آجاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ پسینے کا آنا صحت کے لئے مفید ہوتا ہے مگر کس کے لئے میزبان کے لئے یا مہمان کے لئے ؟ یہ بات اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب آپ مہمان بننے کا شرف حاصل کرچکے ہوں یا میزبانی کی مصیبتیں برداشت کرچکے ہوں۔

مہمان کے اچانک نازل ہونے سے شریف قسم کے میزبان کی وہی حالت ہوتی ہے جو کسی تیز رفتار بس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کی اچانک بریک لگ جانے پر ہوتی ہے۔ شائد غالبؔ بھی اسی قسم کی حالت سے دوچار ہوئے ہوں گے تب ہی تو ان سے یہ مصرعہ سرزد ہوگیا ۔ ع

کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

کہتے ہیں کسی زمانہ میں مہمان کی آمد وجۂ رحمت اور باعثِ خیر و برکت ہوا کرتی تھی۔ مگر دورِ جدید میں عذابِ جاں ' اور بلائے بے درماں ' ہے۔

موجودہ دور نے اپنی ارتقائی چھلانگ یہاں بھی لگا ہی لی۔ یعنی مہمان کی ایک نئی قسم ڈھونڈلی گئی ہے۔ وہ ہے مہمانِ خصوصی ـــــــــ !

مہمانِ خصوصی ، مہمان اور بن بلائے مہمان کا نعم البدل تو نہیں لیکن کوششیں جاری رہیں تو ہوسکتا ہے کہ خاص خاص تقریبات میں جہاں مہمانوں کی موجودگی آج بھی ضروری سمجھی جاتی ہے ، مہمانانِ خصوصی ہی سے کام چل جائے۔ مہمانِ خصوصی کی دریافت کا سہرا ہماری سیاست کے سر ہے۔ اس نوع کے مہمان ادبی جلسوں ، مشاعروں ، دنگلوں (ادبی دنگل بھی اس میں شامل ہیں) تقریری مقابلوں ، سیرت کے جلسوں حتیٰ کہ ختنہ کی تقریبات (پتہ نہیں یہاں ان کے ذمہ کیا ہوتا ہوگا ؟) میں نظر آتے ہیں۔ نہ صرف نظر آتے ہیں بلکہ اپنی موجودگی کا ثبوت دینے کے لئے دیر سے آتے ہیں تاکہ محفل میں آنے والے ہر شخص کو پتہ چل جائے کہ

"ہم کمیلاں پانچوں سواروں میں ہے"

اوّل اوّل جب مہمان کی یہ نوع دریافت ہوئی تو ہر جلسہ میں ایک سے زیادہ مہمانِ خصوصی نہیں ہوا کرتے تھے مگر ادھر جب سے ان کی پود بڑھی (اللہ اس میں مزید اضافہ کرے تاکہ کرسی کے جھگڑے اور کم ہوجائیں) ایک پوری بٹالین کی بٹالین مہمانانِ خصوصی کی مشاعروں اور ادبی جلسوں میں نظر آتی ہے۔ مختصراً یہ کہ مہمانِ خصوصی نے امر بیل کی طرح اپنے ارتقاء کی منزلیں طے کیں، اور ادبی جلسوں پر چھا گئے۔ مہمان کے ارتقاء کی تھیوری کو کیمیائی مساوات کی صورت میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

مہمان ——— بن بلائے مہمان ——— مہمانِ خصوصی ——— مہمانانِ خصوصی

مہمانانِ خصوصی، مہمانانِ خصوصی ہی ہوتے ہیں۔ محققین اس لفظ کی کوئی جامع تعریف ابھی تک نہیں کر سکے۔ کیونکہ ......
.... تیری کون سی کل سیدھی والا معاملہ ہے۔ مگر اس کے بعد بھی ادبی جلسوں اور خصوصاً مشاعروں کا جزوِ لازم مہمانانِ خصوصی ہی ہوتے ہیں۔ کوئی آئے نہ آئے یہ ضرور آتے ہیں۔ دیر سے ہی سہی۔ اس قبیل کے لوگ جب نئے نئے وارد ہوئے تھے تو مورخین بتاتے ہیں کہ ان کی حیثیت سالن میں نمک کی سی تھی مگر ہم اسے ماننے کو تیار نہیں۔ آج ہم نمک میں سالن پڑا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ پھر شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ۔

پہلے مشاعرے سننے کی چیز ہوا کرتے تھے لیکن اب دیکھنے کی چیز ہیں۔ ایسا ہی ایک مشاعرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے صرف سترہ شاعر تھے۔ اور اٹھارہ مہمانانِ خصوصی۔ ظاہر ہے کہ سامعین کی ضرورت باقی نہ تھی۔ ہم تنہا "سامعین" تھے۔ وہ بھی سامع کی حیثیت سے نہیں بلکہ تماشائی کی حیثیت سے۔ وہاں کیا دیکھا یہ بتانے کی بات نہیں۔ لیکن ایک بات ضرور سمجھ میں آئی کہ شاعر کا درد اب منت کش سامعین نہیں رہا۔ بلکہ ریڈی میڈ سامعین میسر آگئے۔ اور اب داد کی بے داد علی الاعلان اسٹیج سے ہوتی ہے اور اس بے داد پر شاعر بہت خوش ہوتے ہیں کیونکہ مہمانانِ خصوصی سے ملی ہوئی داد ——— "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کے مصداق ہوتی ہے۔

مہمانانِ خصوصی کی لسٹ میں شامل ہونے کے لئے خاص جتن نہیں کرنے پڑتے۔ سخن فہمی اور سخن سنجی کو لات ماریئے۔ انشاءاللہ ایک، چار آنے والا ہار اسٹیج پر سب کے سامنے آپ کے گلے کی زینت بن جائے گا۔ اور اس کے بعد سے اسٹیج کی زینت آپ رہا کریں گے۔

مہمانِ خصوصی بننا آسان بھی ہے اور فائدہ مند بھی۔ وہ یوں کہ تقریر کرنا نہیں پڑتی۔ اس لئے گونگے، بہرے بھی اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

■ ■

مفلس قارونی

شوہر مبارک

(پہلا رُخ)

نئے کپڑے، نئے برتن، نئے زیور مبارک   نئی میزیں، نیا صوفہ، نیا بستر مبارک
خُسر اور ساس، نندیں، جیٹھ اور دیور مبارک   نئے رشتے، نیا آنگن، نیا اک گھر مبارک
اری وہ جو ہے اس بازی کا بازی گر مبارک
مبارک میری ہمجولی تجھے شوہر مبارک

مری بنّو، مری پیاری سہیلی میری مونا   مزے سے بیٹھ کر باتوں کی تو مالا پرونا
ترا شوہر ترے ہاتھوں میں ہوگا اِک کھلونا   تو بارِ خانہ داری اس کے سر پہ رکھ کے ڈھونا
تجھے ہو بار برداری کا یہ خچر مبارک
مبارک میری ہمجولی تجھے شوہر مبارک

نصیحت پر خُسر کے کان تو ہرگز نہ دھرنا   نہ دبنا ساس سے اپنی نہ تو نندوں سے ڈرنا
کبھی پرواہ اپنے جیٹھ، دیور کی نہ کرنا   اداؤں سے تو اپنی دل میں ساجن کے اُترنا
ترے دل کے لئے آئے دلربا، دلبر مبارک
مبارک میری ہمجولی تجھے شوہر مبارک

خبر رکھنا ہر اک پہلی کو تو ہر ماہ اس کی   مسلسل دیکھنا اس روز گھر میں راہ اس کی
بڑھانا خوب دل میں پیار اس کا چاہ اس کی   سرک آئے نہ جب تک سب کی سب تنخواہ اسکی
کھنچے جو خود بخود ایسا تجھے لاکر مبارک
مبارک میری ہمجولی تجھے شوہر مبارک

رہے مدہوش جو آٹھوں پہر چاہت میں تیری   جو تڑپے ماہیٔ بے آب سا فُرقت میں تیری
نظر آئیں جسے دونوں جہاں صورت میں تیری   رہے معروف جو شام و سحر خدمت میں تیری
بحوالہِ دگر اک باوفا نوکر مبارک
مبارک میری ہمجولی تجھے شوہر مبارک

تو اپنے روپ کا اس پر سدا جادو چلانا کبھی بھولے سے جھانسے میں نہ ہرگز اس کے آنا
وہ بدھو ہے اسے تو اور بھی بدھو بنانا تو اپنی انگلیوں پر ہر گھڑی اس کو نچانا
مری پیاری مارن تجھ کو یہ بندہ مبارک
مبارک میری ہمجولی تجھے شوہر مبارک
کبھی پھٹکار کو تیری نہ جو پھٹکار سمجھے ترے نفرت بھرے برتاؤ کو جو پیار سمجھے
ترے انکار کو بھی جو ترا اقرار سمجھے تری خود غرضیوں کو جو ترا ایثار سمجھے
تجھے احساس کی دہلیز کا پتھر مبارک
مبارک میری ہمجولی تجھے شوہر مبارک
صبح ہو شام ہو یا رات ہو یا دوپہر ہو ہر اک پل نت نئی تفریح میں تیری بسر ہو
تری حرکات کی مطلق نہ کچھ اس کو خبر ہو ترا ہر عیب بھی اس کی نگاہوں میں ہنر ہو
فدا ہو جان و مال و زر سے جو تجھ پر مبارک
مبارک میری ہمجولی تجھے شوہر مبارک

شادی مُبارک

(دوسرا رُخ)

مبارک ہو تجھے گھوڑے پہ چڑھنا مبارک عقد کے دو بول پڑھنا
مبارک درد کی منزل پہ بڑھنا مبارک کرب کی سولی پہ چڑھنا
تری نیندوں کی بربادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک
خدا رکھے تری بانکی جوانی نیا اب موڑ لیتی ہے کہانی
جلائے گی تجھے دن رات پانی کرے گی اب جو تجھ پر حکمرانی
تجھے اک ایسی شہزادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک

نواسوں کو مبارک تیرے نانی   مبارک بھانجوں کو اک ممانی
بہن اور بھائیوں کو بھابی جانی   بھتیجوں کے لئے چچی سہانی
ترے پوتوں کو ہو دادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک
اکڑ تیری نہ اب ہرگز چلے گی   نہ کوئی بات بیگم کی ٹلے گی
نہ گھر میں دال اب تیری گلے گی   تری ہر شام رو رو کر ڈھلے گی
تجھے ہر صبح فریادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک
تو اب فرمائشوں سے تنگ ہوگا   دکھوں سے زرد تیرا رنگ ہوگا
جو تجھ کو دیکھ لے گا دنگ ہوگا   جو اب ہے وہ نہ تیرا ڈھنگ ہوگا
گیبرڈین کی جگہ کھادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک
کہاں پہلی سی اب وہ تیز گامی   کہاں ہوگا یہ طرز خوش کلامی
بنے گا ہر ہنر اب تیرا خامی   مبارک ساس کی تجھ کو غلامی
خسر کی تجھ کو دامادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک
بہن اور بھائی اور ماں باپ چھوٹے   جو رشتے تھے پرانے سب وہ ٹوٹے
مقدر ہائے پیارے تیرے پھوٹے   تو اب روئے کہ سینہ اپنا کوٹے
تجھے ہر لمحہ فریادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک
بھریں گے خوب تیرے گھر میں بچے   ہر اک محراب ہر اک در میں بچے
ہر اک صندوق، ہر بستر میں بچے   کبھی گھر میں، کبھی دفتر میں بچے
مبارک ایسی آبادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک

آج کی تازہ خبر

عالم تاجپوری

ایک پاکستانی مزدور آگیا ہے رات میں
ہپّی جیسے بال اُس کے لوچ اُس کی بات میں
قوم نے اسے دھتکارا تو وہ لگا ہے گھات میں
بس یا میسا میں ہوگا یا وہ اکسو سات میں
کس طرح سے لوگ سمجھیں چور مادہ ہے کہ نر
آج کی تازہ خبر ہے آج کی تازہ خبر

عاشقی کی پل گئی ڈگری ہمیں جب سے حضور
والدِ معشوق برہم ہوگئے ہیں بے قصور
ہوگئی نیلام عزت، ہوگیا نروس غرور
ہم پولس کے ڈر سے رہتے ہیں ہمیشہ گھر سے دور
عاشقی نے کر دیا چوپٹ ہمارا گھر کا گھر
آج کی تازہ خبر ہے، آج کی تازہ خبر

قبر میں اک دن ہماری آگئے منکر نکیر
طیش میں کہنے لگے لگتے ہو تم پکّے سفیر
بیچ کر ایمان چوپٹ کرلیا اپنا ضمیر
کھالیا چندہ مدرسہ کردیا تو نے فقیر
خلد میں جانے نہ پائے گا کبھی تو پھاند کر
آج کی تازہ خبر ہے آج کی تازہ خبر

اسکول ایکزامینیشن کا نہیں ہے ہم کو غم
نقل بازی روک دے ایسا ہے کس سینے میں دم
رکھ کے جاتے ہیں سدا پاکٹ میں ریڈی میڈ بم
ایجوکیشن کا یہ رہبر ہے نہ سلطانہ سے کم
ممتحن ڈرتے ہیں ہم سے اور سارے ماسٹر
آج کی تازہ خبر ہے آج کی تازہ خبر

کچھ نہ پوچھو خون سستا اور مہنگا تیل ہے
مغربی فیشن سے ہر انجن کا پہیہ فیل ہے
فرقہ بندی سے کہاں قائم کسی میں میل ہے
چار سو بیسی کا جاری ہر جگہ پر کھیل ہے
آج کل بھارت میں ہیں ایسے بھی کچھ لختِ جگر
آج کی تازہ خبر ہے آج کی تازہ خبر

نازنینوں کے ہے سر پہ بھوت فیشن کا سوار
پردہ داری رکھتے ہیں دانست میں اُنکی گنوار
مذہبی باتوں سے اُن کو آتا ہے فوراً بخار
سنیما کو جارہی ہیں لوٹنے شب کی بہار
باندھ لی شرم و حیا نے خود ہی اب رختِ سفر
آج کی تازہ خبر ہے آج کی تازہ خبر

لاکھ کوشش پر بھی عالم میں نے کی شادی نہیں
ذمہ داری میرے سر آبا نے خود لادی نہیں
خاندان کو کیوں پڑھائیں جس میں آزادی نہیں
بچے پیدا کرنا کیا سامانِ بربادی نہیں
شادی جب کرنا پڑی تو پہلے منڈوائیں گے سر
آج کی تازہ خبر ہے آج کی تازہ خبر

کرنل محمد خاں

یہ نہ تھی ہماری قسمت....

یہ کالج کے دنوں کا واقعہ ہے

ایک دن یکایک ہماری کلاس یعنی ایم اے فائنل کے لڑکوں میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ ہمارے ایک منحنی سے ہم جماعت مولوی عبدالرحمٰن کو ایف اے کی طالبہ کی ٹیوشن مل گئی ہے۔ یہ چرچا ٹیوشن کی وجہ سے نہ تھا بلکہ لڑکی کی وجہ سے۔ کیونکہ افواہ کی رو سے لڑکی حسین ہی نہ تھی، نفلین بھی تھی۔ پانچ سال اپنے بیرسٹر باپ کے ساتھ ولایت رہ کر آئی تھی۔ فیشن کی کوئی ایسی ادا نہ تھی جو اُسے یاد نہ ہو۔ انگریزی فر فر بولتی تھی اور کلاس میں پروفیسروں کے کان بھی کترتی تھی۔ صرف اُردو میں کمزور تھی۔ یہ کمزوری بھی اُس نے حسن اور انگریزی کے زور سے کسی قدر پوری کرلی تھی اور باقی کی پورا کرنے کے لئے ٹیوشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔

لڑکی کے کوائف سن کر مولوی عبدالرحمٰن کے ہم جماعت رشک اور حسد سے حسبِ توفیق لال پیلے اور نیلے ہونے لگے۔ کئی ایک نے مولوی صاحب کی داڑھی کے متعلق ناروا سی باتیں بھی کیں اور درمیان میں اِن جانوروں کا ذکر لے آئے جن کی ٹھوڑی کے نیچے بال ہوتے ہیں، لیکن اس تمام غیبت سے مولوی عبدالرحمٰن کی داڑھی کا ایک بال تک بیکا نہ ہوا۔ کیونکہ ہر روز کی دست بُرد سے آپ کے جو بال بیکا ہونے تھے، ہو چکے تھے اور جو باقی رہ گئے تھے، بظاہر پکے تھے۔ چنانچہ اکثر حاسدوں نے مولوی عبدالرحمٰن پر ڈاڑھی سمیت ہی رالیں بہائیں۔ ہم نے رال پر تو قابو رکھا لیکن اندر خانے ہم بھی خدا حاسد ہی تھے ———— ہمیں قسمت سے اصل شکایت تو یہ تھی کہ اس ٹیوشن کے لئے ہم کیوں نہ چُنے گئے۔ یعنی ہم کہ سُرخ و سپید بانکے، بے فکرے چھ فٹ قد کے جوانِ رعنا تھے۔ اور بیرسٹر صاحب کے گھر میں یوں لگتے جیسے رابرٹ ٹیلر کو ٹیوٹر رکھ لیا ہو۔ لیکن قرعہ پڑا تو مولوی صاحب کے نام جو اپنی موٹی چادر کی عینک میں یُوں نظر آتے تھے جیسے شیشوں کے پیچھے سے اُود بلاؤ جھانک رہا ہو۔ ہمیں لڑکی کے ٹیوٹر چننوں کی بدمذاقی پر بہت غصہ آیا۔ مولوی عبدالرحمٰن کو کسی لڑکے یا بھینگی سی لڑکی کا ٹیوٹر چن لیا جاتا تو ہمیں شکایت نہ ہوتی۔ لیکن ایک آہو چشم قتالہ کے لئے ان کا انتخاب قسمت کی سخت غلط بخشی تھی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ قسمت قد ناپ کر نعمتیں تقسیم نہیں کرتی ہاں کبھی کبھی بی اے کے نمبر دیکھ لیتی ہے اور اس میں مولوی صاحب ہمیں کوئی دو سو نمبر پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ بہرحال نمبر کم سہی، ہمارے دل کے ارمان اتنے کم نہ تھے۔ اگر ہمارے نمبروں کے ساتھ ہماری حسرتوں کا شمار بھی کیا جاتا تو ایگریگیٹ میں ہم بڑی اونچی پوزیشن حاصل کرتے

اور ٹیوشن بھی، کیونکہ ہمارا ایک ارمان ایک ایسی ہی پیاری سی ٹیوشن کا تھا۔ لیکن دل کے ارمانوں کا قدردان قیس کو نہ ملا، فرہاد کو نہ ملا، رانجھے کو نہ ملا ——— اور شاید یہی لئے کہ ان لوگوں نے میٹرک بھی پاس نہ کیا ——— ہمیں کہاں ملتا؟ بلکہ ہم رشک اور حسد کو بھی ہضم کر گئے اور ایک دن سامنے سے آتے ہوئے مولوی عبدالرحمٰن ملے تو انہیں مبارک باد پیش کر دی۔

مولوی صاحب نے حسد کے طوفان میں مبارک باد کی آواز سنی تو ہمیں سینے سے لگا لیا۔ بولے

"ساری کلاس میں ایک تم شریف لڑکے ہو۔"

میں نے جلد ہی سینے بلکہ داڑھی سے الگ ہو کر کہا۔

"اور آپ شریف ہی نہیں، قابل بھی ہیں۔ یہ ٹیوشن آپ ہی کو ملنا چاہیئے تھی۔"

مولوی عبدالرحمٰن نے اپنی زندگی میں تحسین کے پھول یوں برستے نہ دیکھے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مجھے سینے سے لگانے کی ناکام کوشش کی۔ ادھر میں لڑکی کے متعلق کچھ جاننے کو بے تاب تھا۔ سہمے سہمے پوچھا۔

"مولوی صاحب لڑکی کیسی ہے؟"

"بڑے دولت مند باپ کی بیٹی ہے۔ اُن کا ایک بنگلہ ہے۔ دو کاریں ہیں۔ تین نوکر ...."

مجھے باپ کے اعداد و شمار میں دلچسپی نہ تھی۔ لہٰذا بات کاٹتے ہوئے بولا

"مولانا، باپ نہیں، لڑکی کیسی ہے؟"

اور لفظ لڑکی پر زور دے کر اُسے خوب انڈر لائن کیا۔ مولانا کسی قدر حیرانی سے بولے۔

"تمہارا مطلب کیا ہے۔"

"مطلب یہ کہ کیا لڑکی خوبصورت ہے۔"؟

یوں دن دہاڑے لڑکی کی خوبصورتی کے متعلق سوال سُن کر مولانا کے کان سُرخ ہونے لگے۔ بولے۔

"بھئی مجھے تو معلوم نہیں۔ میں نے تو اُسے کبھی آنکھ بھر کر نہیں دیکھا۔"

"آنکھ بھر کر دیکھا نہیں؟ پڑھاتے وقت آپ اپنی شاگرد کے روبرو بیٹھتے ہیں یا پُشت بہ پُشت؟"

"بیٹھتا تو سامنے ہوں مگر میں نے کبھی آنکھ نہیں اُٹھائی۔"

"کیوں نہیں اُٹھائی؟"

"بُری بات ہے!"

"لیکن آنکھ جھکا کر اُس کے پاؤں تو دیکھتے رہتے ہوں گے۔ یہ کیسی بات ہے؟"

"پاؤں میں تو وہ چپل پہنتی ہے!"

یہ کہہ کر مولوی صاحب ہماری سادگی پر مسکرا دیئے۔ گویا کہتے ہوں، کیا مسکت جواب دیا ہے۔ اس پر ہم نے مزید خراج ادا کرتے ہوئے کہا

"مولوی صاحب، آپ بے شک نیک آدمی ہیں۔"

"آپ بھی تو ہیں۔"

"یہ چار لفظوں کا جملہ مولوی صاحب نے اُسی انداز میں ادا کیا جیسے حبیب بنک کے ٹی وی کے اشتہار میں ایک بچّہ کہتا ہے۔ "میلا بھی تو ہے"
پھر رخصت ہونے سے پہلے آپ نے بالکل بچگانہ طور پر تیسری ناکام کوشش کی۔ جی ہاں، ہمیں سینے اور داڑھی سے لگانے کی۔
لیکن اب مولوی صاحب کی اور ہماری دوستی پکّی ہو چکی تھی۔ ہر صبح مولوی صاحب سے گذشتہ شام کے سبق کی نہایت تشریح روداد سُنتے
لڑکی بیچاری کی قسمت پر آنسو بہاتے لیکن جی کڑا کر کے مولوی صاحب کو داد دیتے اور وہ ہمیں دُعا دیتے رخصت ہو جاتے۔
ایک روز مولوی صاحب ذرا خلافِ معمول پریشاں حال نظر آئے۔ وجہ پوچھی تو بولے۔
"گاؤں سے اطلاع آئی ہے کہ ماں بیمار ہے۔ ماں کی عیادت بھی لازم ہے اور ٹیوشن میں ناغہ ہوا تو بیرسٹر صاحب کے ناراض ہونے کا بھی خوف ہے۔"
میں نے کہا۔ "ناراض کیوں ہوں گے؟ آخر مجبوری ہے۔ آپ بیرسٹر صاحب سے بات تو کریں۔"
"بکرلی ہے۔ کہتے ہیں، سالانہ امتحان میں صرف دس دن باقی ہیں اور رضیہ اُردو میں بدستور کمزور ہے۔"
"تو اُن کا کیا خیال ہے کہ اگر رضیہ کی اُردو کی کمزوری رفع نہ ہوئی تو دشمن ملک پر حملہ کر دے گا۔؟"
مولوی صاحب میرا سوال ٹال گئے۔ شائد سمجھ ہی نہ سکے اور بولے۔
"بیرسٹر صاحب کہتے ہیں کہ اگر جانا لازم ہے تو اپنی جگہ کوئی موزوں آدمی دے کر جاؤ۔ اب میں موزوں آدمی کہاں سے لاؤں؟"
ہم نے خیال کیا کہ ہم آدمی تو یقیناً ہیں۔ باقی رہی موزونیت، تو چند اور خوبیوں کے علاوہ ہم اُردو بھی لکھ پڑھ بلکہ پڑھا سکتے ہیں ——
مگر یہ ہمارا خیال تھا۔ سوال یہ تھا کہ یہی خوبصورت خیال مولوی صاحب اور بیرسٹر صاحب کو بھی آ سکتا تھا؟ بلا دعوت اپنی خدمات پیش کرنا تو شان کے خلاف تھا۔ چنانچہ اُمید کے دامن کا ایک تار تھام کر ہم نے کہا۔
"بے شک، موزوں آدمی ملنا مشکل ہے اگرچہ، البتہ، یہ بات ہے کہ ناممکن نہیں۔"
مولانا بولے: "بس ایک ہی صورت ہے۔"
"مثلاً؟"
"مثلاً یہ کہ اگر آپ زحمت نہ سمجھیں تو دو روز میری جگہ پڑھا آئیں۔"
یہ تو وہی بات ہوئی کہ دُعا منہ سے نکلی نہیں اور اجابت نے دروازہ آ کھٹکھٹایا۔ لیکن ہماری مسرت سے کہیں زیادہ ہماری حیرت تھی۔ ہمارے مُنہ سے کسی قدر اضطرار میں نکلا۔
"میں، یعنی میں خود پڑھا آؤں؟"
"جی ہاں، آپ خود۔"
"مولانا۔ آپ کی ذرہ نوازی ہے اور مجھے انکار بھی نہیں، لیکن یہ بتائیں کہ کیا بیرسٹر صاحب بھی اتنے ذرہ نواز ہیں؟"
"میں نے بیرسٹر صاحب سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ آج شام میرے ساتھ چلئے گا۔"

یہ وہی پرانی کہانیوں والا قصہ تھا۔ شہزادی سامنے قلعے میں بیٹھی انتظار کر رہی ہے لیکن اس تک پہنچنے کے لئے شہزادے کو فقط ایک اژدر اور دو شیر ہلاک کرنے کی ضرورت ہے بلکہ شاید ان دونوں مہموں کی نسبت ایک بیرسٹر راضی کرنا دشوار تھا۔ پھر مولوی عبدالرحمٰن رخصت ہونے لگے تو جیسے کچھ اچانک یاد آگیا ہو، بولے۔

"ہاں، ایک بات اگر آپ بُرا نہ مانیں۔"

"ارشاد۔"

"کیا ہی اچھا ہو اگر آپ سوٹ کی جگہ اچکن پہن کر آئیں۔"

"لیکن میرے پاس تو اچکن ہے نہیں۔"

"کہیں سے مانگ نہیں سکتے؟"

"مولانا، مانگ تو سکتا ہوں، پھر آپ کہیں گے ایک داڑھی بھی مانگ لاؤ۔"

"داڑھی نہیں، ٹوپی۔"

"قبلہ میں بیرسٹر صاحب کے گھر لڑکی پڑھانے جاؤں گا یا جمعہ پڑھنے؟"

"بات یہ ہے کہ ننگا سر ٹھیک نہیں ہوتا اور اچکن اور ٹوپی میں آدمی شریف لگتا ہے۔"

اب مولوی عبدالرحمٰن سے کیا بحث کرتے۔ ہم نے بڑے بڑے انگلروں کو اچکن اور ٹوپی پہنے دیکھا تھا۔ بہرحال انہیں یقین دلایا کہ اُن کی خاطر ـــــ جو دراصل اپنی ہی خاطر تھی ـــــ اچکن اور ٹوپی کا انتظام بھی کریں گے اور آخر شام سے پہلے ایک ڈھیلی سی بدرنگ سی اچکن اور پیلی سی تنگ سی ٹوپی پیدا کرلی۔

شام بیرسٹر صاحب کے دولت کدے پر پہنچے۔ مولوی صاحب کی نگاہیں دولت کدے سے سوگز اِدھر ہی جھک گئیں اور ایسی کہ پھر اُٹھنے کا نام نہ لیا۔ مولوی صاحب نے ہمیں بھی تلقین کی کہ نظریں اُٹھانے سے پرہیز کرنا لیکن ہم سے کوشش کے باوجود بد پرہیزی ہوتی رہی۔ بیرسٹر صاحب کے روبرو ہوئے تو مولوی صاحب نے ہمارا تعارف کرایا۔ جواب میں بیرسٹر صاحب نے بظاہر تو مزاج پرسی کی، لیکن حقیقت میں ہمارا معائنہ کرنے لگے جو طبّی معائنے سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ یعنی ہمیں تو بہت اُلٹ پلٹ کر نہ دیکھا لیکن خود بہت اُلٹے پلٹے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہر زاویے سے فرضی ٹونٹی لگا کر ہماری نیت کی رفتار ناپ رہے ہوں۔ آخر، غالباً ہماری اچکن اور ٹوپی سے متاثر ہو کر فرمایا۔

"لڑکا شریف ہی لگتا ہے۔"

پھر مولوی صاحب کو رخصت دے دی اور ہمیں رضیہ تک پہنچا آئے۔

رضیہ ہماری توقع سے بھی زیادہ حسین نکلی اور حسین ہی نہیں، کیا فتنہ گر قد و گیسو تھی۔ پہلی نگاہ پر ہی محسوس ہوا کہ INITIATIVE ہمارے ہاتھ سے نکل کر فریقِ مخالف کے پاس چلا گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پہلا سوال بھی اُدھر سے ہی آیا۔

"تو آپ ہیں ہمارے نئے نویلے ٹیوٹر؟"

اب اس شوخ سوال کا صحیح جواب تو یہ تھا کہ "تو آپ ہیں ہماری نئی نویلی شاگرد؟" ـــ لیکن سچی بات ہے کہ محسن کی [illegible]ر میں

ہماری شوخی ایک لمحے کے لئے ماند پڑ گئی اور ہمارے منہ سے ایک بے جان سا جواب نکلا۔

"جی ہاں، نیا تو ہوں، ٹیوٹر نہیں ہوں۔ مولوی صاحب کی جگہ آیا ہوں۔"

"اس سے آپ کی ٹیوٹری میں کیا فرق پڑتا ہے؟"

"یہی کہ عارضی ہوں۔"

"تو عارضی ٹیوٹر صاحب۔ ہمیں ذرا اس مصیبت سے نجات دلا دیں۔"

رضیہ کا اشارہ دیوانِ غالب کی طرف تھا۔ میں نے کسی قدر متعجب ہو کر پوچھا۔ "آپ دیوانِ غالب کو مصیبت کہتی ہیں۔؟"

"جی ہاں، اور خود غالب کو بھی۔"

"میں پوچھ سکتا ہوں کہ غالب پر یہ عتاب کیوں؟"

"آپ ذرا آسان اُردو بولئے۔ عتاب کسے کہتے ہیں؟"

"عتاب غصّے کو کہتے ہیں۔"

"غصہ؟ ہاں غصہ اس لئے کہ غالب صاحب کا لکھا تو شائد وہ خود بھی نہیں سمجھ سکتے۔ پھر خدا جانے پورا دیوان کیوں لکھ مارا؟"

"اس لئے کہ لوگ پڑھ کر لذت اور سرور حاصل کریں۔"

"نہیں جناب۔ اس لئے کہ ہر سال سینکڑوں لڑکیاں اُردو میں فیل ہوں۔"

"محترمہ، میری دلچسپی فقط ایک لڑکی میں ہے۔ فرمائیں، آپ کا سبق کس غزل پر ہے؟"

جواب میں رضیہ نے ایک غزل کے پہلے مصرع پر اُنگلی رکھ دی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں نے دیکھا تو غالب کی مشہور غزل تھی

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا۔ میں نے کہا۔ "یہ تو بڑی لاجواب غزل ہے۔ ذرا پڑھیئے تو۔"

"میرا خیال ہے آپ ہی پڑھیں۔ میرے پڑھنے سے اس کی لاجوابی پر کوئی ناگوار اثر نہ پڑے۔"

مجھے محسوس ہوا کہ ولایت کی پڑھی ہوئی رضیہ صاحبہ باتونی بھی ہیں اور ذہین بھی، لیکن اُردو پڑھنے میں غالباً اناڑی ہی ہیں۔ میں نے کہا۔ "میرے پڑھنے سے آپ کا بھلا نہ ہوگا۔ آپ ہی پڑھیں کہ تلفظ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

رضیہ نے پڑھنا شروع کیا اور سچ مچ جیسے پہلی جماعت کا بچہ پڑھتا ہے۔"

"یہ نہ تھی ہماری قس مت کہ وِصل ...."

"یہ وِصل نہیں، وصال ہے۔ وِصل تو سیٹی کو کہتے ہیں۔"

رضیہ نے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ہم ذرا مسکرائے اور ہمارا اعتماد بحال ہونے لگا۔

رضیہ بولی۔ "اچھا وصال سہی۔ وصال کے معنی کیا ہوتے ہیں۔"

"وصال کے معنی ہوتے ہیں، ملاقات، محبوب سے ملاقات۔ آپ پھر مصرع پڑھیں۔"

رضیہ نے دوبارہ مصرع پڑھا۔ پہلے سے ذرا بہتر تھا لیکن وصال اور یار کو اضافت کئے بغیر الگ الگ پڑھا۔ اس پر ہم نے ٹوکا

" یہ وصال یار نہیں ، وصالِ یار ہے۔ درمیان میں اضافت ہے۔"
" اضافت کیا ہوتی ہے ؟ کہاں ہوتی ہے ؟ "
" یہ جو چھوٹی سی زیر نظر آرہی ہے نا آپ کو، اسی کو اضافت کہتے ہیں۔"
" تو سیدھا سادا وصالِ یار کیوں نہیں لکھ دیتے ؟ "
" اس لئے کہ وہ علماء کے نزدیک غلط ہے" — یہ ہم نے کسی قدر رُعب سے کہا۔
" علماء کا وصال سے کیا تعلق ہے ؟" ——— " علماء کا تعلق وصال سے نہیں، زیر سے ہے۔"
" اچھا جانے دیں علماء کو۔ مطلب کیا ہوا ؟" ——— " شاعر کہتا ہے کہ یہ میری قسمت ہی میں نہ تھا کہ یار سے وصال ہوتا۔"
" قسمت کو تو غالب صاحب درمیان میں یوں ہی گھسیٹ لائے ہیں۔ مطلب یہ کہ بیچارے کو وصال نصیب نہ ہوا۔"
"جی ہاں، کچھ ایسی ہی بات تھی۔" ——— " کیا وجہ ؟"
" میں کیا کہہ سکتا ہوں ؟" ——— " کیوں نہیں کہہ سکتے ؟ آپ ٹیوٹر جو ہیں۔"
" شاعر خود خاموش ہے۔"
" تو شاعر نے وجہ نہیں بتائی، مگر یہ خوش خبری سُنادی کہ وصال میں فیل ہو گئے ؟"
"جی ہاں، فی الحال تو یہی ہے۔ آگے پڑھیں۔" رضیہ نے اگلا مصرع پڑھا۔ ذرا اٹک اٹک کر مگر ٹھیک پڑھا۔
" اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا۔"
میں نے رضیہ کی دلجوئی کے لئے ذرا سرپرستانہ انداز میں کہا۔ " شاباش، آپ نے بہت اچھا پڑھا ہے۔"
" اس شاباش کو تو میں ذرا بعد میں فریم کراؤں گی۔ اِس وقت ذرا شعر کے پورے معنی بتادیں۔"
ہم نے رضیہ کا طنز برداشت کرتے ہوئے کہا۔ " مطلب صاف ہے۔ غالب کہتا ہے۔ قسمت میں محبوبہ سے وصال لکھا ہی نہ تھا چنانچہ اب موت قریب ہے، مگر جیتا بھی رہتا تو وصال کے انتظار میں ہی عمر کٹ جاتی۔"
" توبہ اللہ، اتنا LACK OF CONFIDENCE یہ غالب اتنے ہی گئے گذرے تھے ؟"
" گئے گذرے ؟ نہیں تو۔ غالب ایک عظیم شاعر تھے۔"
" شاعر تو جیسے تھے، سو تھے، لیکن محبت کے معاملے میں گھسیارے ہی نکلے۔"
" لاحول ولا قوۃ۔ آپ غالب کو گھسیارہ کہتی ہیں ؟ وہ نجم الدولہ تھے۔"
" شاہ دولہ[1] ہوں گے۔ بے چارے عمر بھر وصال کو ترستے رہے۔"
" محترمہ شاعری میں تو فرضی باتیں ہوتی ہیں۔ غالب نے شعر لکھا ہے۔ عدالت میں حلفیہ بیان نہیں دیا۔"

---

[1] چھوٹے سر اور چھوٹے قد کی ناقص العقل مخلوق جسے ایک بزرگ کی نسبت سے شاہ دولہ یا شاہ دولہ کے چوہے کہتے ہیں ۔

"وکیل صفائی صاحب۔ آپ ملزم سے بھی زیادہ چُست نظر آتے ہیں۔ یہ فرمائیں، آپ کے نجم الدولہ صاحب کی شادی کبھی ہوئی یا نہ؟"

"یقیناً ہوئی۔" ———— "کسی بوڑھی کزن سے ہوئی ہوگی۔"

"نواب زادی تھی اور بوڑھی بھی نہ تھی، مگر خود لونڈے ہی تھے۔"

"میں نہ کہتی تھی کچھ MALADJUSTMENT ضرور تھی۔"

"لیکن محترمہ آپ کا پرچہ غالب کی شادی پر نہیں، غالب کی شاعری پر ہوگا۔"

"شاعر کو شاعری سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔"

"لیکن اگر آپ نے امتحان سے پہلے دیوان ختم کرنا ہے تو جُدا کرنا پڑے گا۔"

"مجھے امتحان کی فکر نہیں۔ پہلے غالب کا فیصلہ ہونا چاہیئے۔"

"بہت اچھا، تو فرمائیں، غالب نے کیا قصور کیا ہے؟"

"غالب نے محبت میں مار کھا کر بے معنی شعر لکھے ہیں اور لوگوں کو اُلّو بنایا ہے۔"

"محترمہ، اُلّو بڑا غیر پارلیمانی پرندہ ہے اور غالب کے چاہنے والوں میں تو اچھے اچھے لوگ ہیں۔ مثلاً ۔ ۔ ۔"

"آپ اچھے لوگوں کی فکر نہ کریں۔ ویسے میں نے آپ کو اِن پرندوں میں شامل نہیں کیا۔"

"مجھ پر یہ نظرِ عنایت کیوں؟ میں بھی تو غالب پرست ہوں۔"

"آپ کی جگہ اصلی ٹیوٹر نے رکھی ہے۔" ———— "تو آپ مولوی عبدالرحمٰن کو اُلّو سمجھتی ہیں؟"

"غالباً اُن کا اپنا بھی یہی خیال ہے۔" ———— "محترمہ۔ ٹیوٹر اور اُلّو؟"

"جی ہاں، وہ تہ دل سے چغد ہیں۔" ———— "اور ہم!"

"آپ کی بات اور ہے۔" ———— "ہماری کیا بات ہے!"

"بس آپ چغد نہیں۔" ———— "بڑی رعایت کی آپ نے ہیں۔"

"تو آپ شاہین بننا چاہتے ہیں کیا؟" ———— "ہم ہیں ہی شاہین۔!"

"تو بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں۔" ———— "اور اگر یہاں آنا چاہیں تو؟"

"تو براہِ مہربانی یہ خوبصورت اچکن بدل کر آئیں۔" ساتھ ہی رضیہ نے ہماری ٹوپی سے لے کر اچکن کے نچلے سرے تک دیکھا اور بے اختیار ہنس دی۔ اتنے میں ساتھ کے کمرے سے بیرسٹر صاحب کی آواز آئی۔

"بیٹا رضیہ۔ آپ کی پڑھائی کا وقت ختم ہوا۔ اب آؤ، چلیں باہر۔"

رضیہ نے کتاب بند کر دی اور بولی۔ "تو عارضی ٹیوٹر صاحب، خدا حافظ۔"

"گویا آپ کا مطلب ہے کل نہ آؤں۔؟"

"اتنے عارضی بھی نہ بنیں۔ کل آئیے۔ پرسوں آئیے اور آتے رہیئے۔"

"پرسوں تو مولوی صاحب آجائیں گے ۔" ——— " اللہ تعالیٰ ان کی والدہ کو دو دن ٹھہر کر شفا دے گا ۔" اتنے میں بیرسٹر صاحب کی آواز کی بجائے ان کا چہرہ نمودار ہوا اور میں نے آہستہ سے خدا حافظ کہہ کر رخصت لی ۔

ہم دوسرے روز کپڑے بدل کر پڑھانے گئے ۔ سبق تو دوسرے شعر سے بہت آگے نہ بڑھا لیکن باہمی مفاہمت میں خاصی پیش رفت ہوئی تیسرے روز مولوی صاحب آگئے اور ہمیں دوستوں نے آگھیرا کہ دو روزہ ٹیوشن کی روداد سناؤ ۔ ہم نے روداد سنائی تو دوست ہماری خوبیٔ قسمت پر خوشی سے جھوم اُٹھے ۔ ہم کہانی سنا چکے تو ہماری کلاس کے ذہین مسخرے' لطیف نے باقی لڑکوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ۔

" دوستو ۔ خاموش اور ذرا توجہ سے سنیئے ۔" ساری کلاس خاموش ہوگئی ۔ لطیف نے بولنا جاری رکھا ۔

" ستاروں کا علم کہتا ہے کہ اگلے سال ہمارے اس خوش نصیب ہم جماعت کی شادی ہو جائے گی ۔ ذرا بتاؤ تو سہی ' اس کی دلہن کا کیا نام ہوگا ۔؟"

ساری جماعت نے یک زبان ہو کر کہا ——— " رضیہ "

اس پر بے پناہ تالیاں بجیں ۔ لڑکوں نے مجھے کندھوں پر اُٹھالیا اور اودھم مچایا ۔

قارئین ۔ کیا آپ کو بھی میرے ہم جماعتوں سے اتفاق ہے ؟ ۔ سنیئے ۔ اگلے سال رضیہ سچ مچ دلہن تو بنی' لیکن ہماری نہیں' مولوی عبدالرحمٰن کی ! ۔ حادثہ یہ ہوا کہ ٹیوشن کے بعد مولوی عبدالرحمٰن اور ہم سی ایس پی کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے اور مولوی صاحب ہمیں یہاں بھی دو سو نمبر پیچھے چھوڑ گئے ۔ اس کامیابی کے بعد ان کے لئے رضیہ سے شادی میں ایک ہی رکاوٹ تھی اور مولانا نے یہ رکاوٹ برضا و رغبت' پہلے نائی کے ہاتھوں دور کرادی ۔ برضا و رغبت اس لئے کہ بقول مولوی صاحب ' ایک دن اُنہوں نے کانی آنکھ سے رضیہ کو دیکھ لیا تھا اور پھر دل میں عہد کرلیا تھا کہ داڑھی کیا چیز ہے یہ لوح و قلم تیرے ہیں ۔ ادھر بیرسٹر صاحب تو مولوی عبدالرحمٰن کے نام کے ساتھ سی ایس پی دیکھ کر داڑھی کی قربانی پر بھی مُصر نہ تھے ۔ رہے ہم تو جوں ہی مولوی صاحب اپنی دلہن کو لے کر ہنی مون پر روانہ ہوئے ' ہم دیوانِ غالب کھول کر ایک لاجواب غزل الاپنے لگے ———

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

(کتاب "ہنوز آہ ایاں" سے انتخاب) ٭٭



آندھرا پردیش
ترقی کی راہ پر



وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے زیر قیادت چیف منسٹر ٹی۔ انجیا نے آندھرا پردیش کے عوام کی خدمت کا ایک سالہ دور مکمل کر لیا ہے۔ اُن کی قیادت میں ریاست ہمہ جہتی ترقی کی سمت بڑھ رہی ہے

۲۵ نکاتی پروگرام — خوش حالی کی جانب رہنمائی

شریمتی اندرا گاندھی کے بیس نکاتی اور آنجہانی سنجے گاندھی کے پانچ نکاتی پروگرام کو پورے خلوص کے ساتھ عمل آوری کے جذبے کے تحت آندھرا پردیش افادیت بخش اسکیموں کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے تاکہ اپنے عوام کی معاشی خوش حالی کے حصول میں مدد کی جائے۔

کسانوں کے لئے امداد

گذشتہ ایک سال کے دوران کسانوں کے لئے فائدہ بخش اقدامات کا ایک سلسلہ جاری رہا جس میں سے بعض اہم اقدامات حسب ذیل ہیں۔

- فصلوں کی بیمہ اسکیم
- پانچ ایکڑ تری اور دس ایکڑ خشکی اراضی کے مالکین کو مالگزاری کی ادائیگی سے استثناء
- رعایتی قیمتوں پر مستند بیجوں، اور کیڑے مار ادویہ کی سربراہی
- دھان اور گنے کی امدادی قیمتوں میں اضافہ
- خشک سالی اور سیلاب سے متاثرہ علاقوں میں مالگزاری میں کمی
- امداد باہمی اداروں کی جانب سے کاشتکاروں کو ریکارڈ قرضوں کی اجرائی۔ قلیل مدتی اور اوسط مدتی شرائط پر قرضہ جات کی اجرائی۔ ۹۰،۹ کروڑ روپے اور طویل قرضہ جات ۶۸ کروڑ روپے
- ۶۶۷۳ افراد کو اسپیشل لائیو اسٹاک پروڈکشن پروگرام کے تحت دودھ دینے والے مویشی بکریوں، مرغیوں اور سوروں کے یونٹس فراہم کئے گئے۔

ریکارڈ فصلیں

- ناموافق موسمی حالات کے باوجود غذائی اجناس کی پیداوار ۹۵،۳۰ لاکھ ٹن کے نشانے کے بالمقابل ۱۰۰ لاکھ ٹن تک پہونچ گئی
- تجارتی فصلوں مثلاً نئی تمباکو، روئی اور مونگ پھلی کی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ

نچلی سطحوں پر جمہوریت سرگرم عمل

ساری ریاست میں کئی سالوں کے وقفے کے بعد گرام پنچایتوں، پنچایت سمیتیوں، ضلع پریشدوں اور میونسپلٹیوں کے انتخابات منعقد کرائے گئے۔ اور ان انتخا

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

کی نمایاں خصوصیات حسبِ ذیل ہیں۔

* ۶۰۷۴ گرام پنچایتوں اور ۲۱۴ سمیتیوں کے صدور کا متفقہ انتخاب۔ * مجالس مقامی میں درج فہرست جاتیوں، درج فہرست قبائل اور پسماندہ طبقات کیلئے عہدوں کے تحفظات * رائے دہی کی عمر ۱۸ سال کر دی گئی۔

کمزور طبقات کے لئے نئی سہولتیں — فاضل آراضی کی تقسیم میں تیزی — گریجنوں کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے نشانے کے تعین کے علاوہ کمزور طبقات کے لئے چار لاکھ مکانات کی فراہمی کا منصوبہ — شہری گندہ بستیوں میں رہنے والوں اور دیہی جھونپڑپٹی کے مالکین کے لئے جھونپڑیوں کے بیمہ کی سہولت

ہریجنوں کی بھلائی کیلئے کئے گئے اقدامات ○ ہریجنوں پر مظالم کے انسداد کے لئے قانون تحفظ شہری حقوق کی عمل آوری ○ ہریجنوں کی بھلائی کیلئے ۸۲-۱۹۸۱ء میں موازنہ کی گنجائش کو بڑھاکر ۱۷،۶۴ کروڑ روپے کر دیا گیا تاکہ تعلیمی اسکیمات، کمیونٹی سرویسس، معاشی ترقیاتی پروگراموں اور دیگر سماجی بھلائی اور تحفظ کی اسکیمات کو روبہ عمل لایا جائے۔ ○ تقریباً ۱،۵ لاکھ ہریجن خاندانوں کو غریبی کی سطح سے اونچا اُٹھانے میں مدد دینے کی خاطر اسپیشل کامپونینٹ پلان کے تحت ۵،۲ کروڑ روپے کی رقم صرف کی جائے گی۔ ○ ہریجنوں کو "ارچکاس" پجاری کی حیثیت سے تربیت دینے اور جہاں کہیں جگہ خالی ہو مندروں میں اُن کا تقرر عمل میں لانے کی ایک اسکیم مرتب کی جا رہی ہے۔

ہمہ مقصدی پراجیکٹس پانی کی بہتر سربراہی، کشتی رانی کی سہولتیں اور ریاست میں آبپاشی کی صلاحیت میں اضافے کے مقاصد اب حقیقت کا روپ اختیار کر رہے ہیں جبکہ مرکز سے پولاورم بیارج اور سری سیلم رائٹ لنک کنال پراجیکٹس کی عمل آوری کا اشارہ مل چکا ہے۔

صنعتی ترقی — پسماندہ اضلاع میں صنعتی ترقی کو فروغ دینے کے لئے میدک، اننت پور، سریکاکولم اضلاع میں نیوکلیس پلانٹس کا قیام۔ — جاریہ سال کے دوران ...۴ نئے اسمال اسکیل انڈسٹریل یونٹس کے قیام کا منصوبہ بنایا گیا ہے اور ایک خصوصی سل بیمار یونٹس کے احیاء کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ — سنگارینی کالریز نے جولائی ۱۹۸۱ء میں ایک ملین ٹن کوئلے کی ریکارڈ پیداوار حاصل کی جس سے صنعتی ترقی کو مزید بڑھاوا ملا ہے۔

مربوط دیہی ترقی دیہی عوام کو فائدہ پہونچانے کے پرزور اقدامات حسب ذیل ہیں۔ — سوشیل فارسٹری اسکیمات میں تیزی پیدا کی گئی۔ — ایندھن اور تعمیری اشیاء کی بہتر سربراہی — ناموافق حالات اور خالی وقتوں میں زرعی مزدوروں کیلئے روزگار کی ضمانت — ویلیج لنک روڈس، دیہی سربراہی آب، ہاؤزنگ کمیونٹی، اریگیشن ویلس اور بور ویلس وغیرہ کی فراہمی کے لئے اسکیمات پر عمل آوری — عوام کی خدمت کیلئے تیز رسانی — اشیائے مایحتاج کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ صارفین کو مناسب مقدار میں اور بر وقت غذائی اور ضروری اشیاء کی سربراہی کی طمانیت حاصل ہو سکے۔

منسوب روپے کی بھلائی ترجیحی اساس پر :- ○ محنت کے وقار کیساتھ مزدوروں کی خوشحالی ○ محنت کش طبقے کے لئے منظم نورم کی تشکیل کی مساعی پاک وصاف نظم ونسق :- پاک وصاف اور کارکرد نظم ونسق شری ٹی انجیا کے دور کی نمایاں خصوصیت ہے۔ حکومت ریاست کی ہمہ جہتی ترقی و فروغ کے ان مقاصد کے حصول کیلئے کوشاں ہے۔

(ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش)

D.I.P.R. NO: 1605/81

رؤف خوشتر
لکچرر، گلبرگہ

کُل ہند مچھّر کانفرنس

معتمد مچھر: (مچھروں سے مخاطب ہوکر) مجھے خوشی ہے کہ آپ ہماری دعوت پر بھنبھناتے ہوئے ملک کے گوشے گوشے سے اڑ کر یہاں آگئے ہیں۔ ہم نے اپنی کانفرنس کے لیے اس ہال کو اس لیے منتخب کیا ہے کہ ابھی کچھ دیر بعد یہاں ایک وزیر کا جلسہ منعقد ہونے والا ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ ہمارے لیے خون کی بڑی بڑی بوتلیں آ رہی ہیں۔ دل کھول کر خون چوس لیجیے

دعوتِ عام ہے یارانِ مچھراں کے لیے

(شکریہ شکریہ کی پیہم بھنبھناہٹ ہال میں گونجتی ہے)

معتمد مچھر: حاضرین کرام۔ میں آج اس تاریک ہال و تاریخ ساز کانفرنس کی صدارت کے لیے ہمارے معمرِ معزز مچھر کو زحمت دوں گا۔ موصوف کے جدِ امجد وہ ممتاز مچھر تھے جنہوں نے مغرور نمرود کے سر میں گھس کر اسے مارا۔ کہتے ہیں جب نمرود درد سے چلا رہا تھا۔ تب بیگم نمرود اپنے بالوں کو کھولے رو رہی تھی اور فریاد کر رہی تھی کہ

کوئی مچھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

اور ہمارے صدر کے کارنامے بھی کچھ کم نہیں۔ آپ نے جرمنی کا سفر کر کے وہاں اس شخص کا خون چوس لیا جس نے ہزاروں کا خون چوسا تھا۔ جسے یوں تو اس کے والدین ہٹلر کہتے تھے۔ لیکن مورخ

"اس کا لیتے نہ کوئی نام بھی مچھر کہے بغیر"

(معمر مچھر اڑ کر مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہوتا ہے)

ایک مچھر: مجھے ان کی صدارت پر اس لیے اعتراض ہے کہ یہ محترم طبقاتی سماج میں یقین رکھتے ہیں۔ نسلی تعصب ان کے پر پر میں بھرا ہوا ہے۔ یہ صرف اپنے قبیلے کو ہی خالص نسل بتلاتے ہیں ان کا نعرہ ہے کہ کمزور مچھروں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ایسے گمراہ کن خیالات ان میں کہاں سے آگئے۔

ایک آواز: ان کی رگوں میں ہٹلر کا خون جو دوڑ رہا ہے۔

صدر مچھر: (بلند آواز میں۔ رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل۔

معتمد مچھر: خاموش رہیے۔ اس کانفرنس میں سماج، طبقہ

تعصب، نسل اور قبیلہ جیسی اصطلاحیں گھسیٹ
کر اس کانفرنس کو انسانی کانفرنس نہ بنائیے۔

مچھر و۔ اس دور میں ہماری بقا کو زبردست
خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ انسان اب پہلے سے
زیادہ ہوشیار اور مکار ہوگیا ہے۔ اس کی
پالیسی یک طرفہ ہے یعنی وہ چاہتا ہے یعنی
وہ چاہتا ہے کہ وہ کسی کا بھی خون چوس لے
لیکن یہ گوارا نہیں کرتا کہ کوئی اور اس کا خون
چوسے۔ اپنی یک طرفہ پالیسی کو موثر انداز میں
نافذ العمل بنانے کے لیے صاف رہنے کے
علاوہ مچھر دانیاں اور دوائیاں استعمال کر رہا
ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کرۂ ارض سے ہماری نسل
ہی نہ ختم ہو جائے۔ آپ مندوبین سے درخواست
ہے کہ اپنے مسائل و مشکلات پیش کریں تاکہ ان
کا حل نکل آئے۔

دیہی مچھر: یہ امر باعث مسرت ہے کہ اب دیہی باشندے
بھی شہری باشندوں کی طرح ہوتے جا رہے
ہیں۔ نہ اب وہ روز نہاتے ہیں نہ پورا لباس
پہن رہے ہیں۔ شکر ہے کہ اب دیہاتوں میں
بھی سینما اور ہوٹل کھل رہے ہیں جو ہمارے
لیے بہترین پناہ گاہیں ہیں۔

بوڑھا مچھر: (سرد آہ بھر کر) لباس پر یاد آیا کہ نوجوانو! تم
خوش قسمت ہو کہ اب حسین عورتوں اور مہ جبینوں
کو من پسند طریقہ سے چوم سکتے ہو۔ ہمارے
دور میں خواتین سخت پردے میں رہتی تھیں یا
پھر ان کے جسموں پر اتنا کپڑا ہوتا تھا کہ
ہم صرف ہتھیلیوں کو چومنے پر اکتفا کرتے

اب تو خیر معاملہ ہی الٹا ہے۔ سارا جسم آپ کا
مشروب گاہ ہے۔

(چند سفید مچھر داخل ہوتے ہیں)

صدر مچھر: کیا آپ کشمیر، شملہ، دارجلنگ یا صحت افزا
مقام سے تشریف لا رہے ہیں؟

سفید مچھر: جی نہیں ہمارا تعلق کسی صحت افزا مقام سے
نہیں۔ بمبئی، مدراس، کلکتہ اور دہلی سے آئے
ہیں۔ اب بڑے بڑے شہروں ہی کے لوگوں کا
خون سفید ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ آئندہ
چند سالوں میں ہماری اولادیں بھی سفید نہ ہو
جائیں۔ سرد مہری اب قومی اخلاق بنتا
جا رہا ہے۔

ہپی مچھر: ہماری حالت زار کا یہی راز ہے کہ ہمارا طریقہ
وار احمقانہ ہے۔ اب ہمیں انسانوں پر خاموشی
سے حملہ کرنا ہوگا۔ کلاسیکی انداز میں گنگنانے سے
وہ ہمیں مارنے کے لیے ہاتھوں ہاتھ لیتا ہے۔

صدر مچھر: نہیں نہیں ہم مکاری سے حملہ نہیں کریں گے۔ آخر
ہم میں اور انسان کے طریقہ وار میں کچھ تو فرق
ہونا چاہیئے۔ ہم اپنا رزمیہ نغمہ سناتے ہوئے
انسان پر حملہ کریں گے چاہے اس میں ہم شہید
ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

(چند موٹے تازے مچھر داخل ہوتے ہیں)
تمام مچھر ان کے صحت مند جسموں پر حسد بھری
نظروں سے دیکھتے ہیں۔

صدر مچھر: آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟

صحت مند مچھر: جناب صدر ہم کسی صحت افزا مقام سے
نہیں آئے، بلکہ راجدھانی سے آرہے ہیں۔

حلقۂ پارلیمنٹ ہاؤس ہے اور یہی حلقہ ہماری صحت کا ضامن ہے۔ وہاں بڑی آسانی سے تازہ سرخ اور صحت مند خون ملتا ہے۔ وہاں کا عالم ہی نرالا ہے۔ اراکین ہماری بھنبھناہٹ اور اسپیکر کے گھنٹی بجانے سے بھی بیدار نہیں ہوتے۔ ہمارا پل پل بدلتا ہوا رنگ سیاست دانوں کی سیمابی فطرت کا مرہون منت ہے۔ کبھی کوئی ممبر جو ایک کرسی سے دوسری کرسی پر لپکتا ہے تو اس جماعت و کرسی بدلی کا سبب یوں بتلاتا ہے کہ

ایک مچھر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

چھاپہ مار مچھر: صدر محترم! ہمیں دوسری خون چوسنی قوم کھٹمل سے سخت شکایت ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ہماری چھاپہ مار ٹولی ایک ہوسٹل کے کمرے سے سوتے ہوئے بچے کو اغوا کرنا چاہتی تھی۔ ہم بچے کو اپنے شانوں پر لینے والے تھے کہ عین وقت پر کھٹملوں نے پلنگ پر گھیراؤ کرکے بچے کو بری طرح جکڑ لیا۔ ہماری اور کھٹملوں کی رسہ کشی میں بچے کی آنکھ کھل گئی اور اغوا کا منصوبہ کھٹملوں کی وجہ سے ناکام ہوا۔

معتمد مچھر: میں آپ کی اس شکایت کو کھٹمل انجمن کو بھیجتا ہوں۔ آخر خون چوسنے والوں کو بھی کچھ اصولوں پر عمل کرنا چاہیئے۔ ہم نے عالمی خون چوس کانفرنس (جس کا ہیڈ کوارٹر اب برلن سے تل ابیب منتقل ہو چکا ہے) میں اپنے غیر جانب دارانہ موقف کی توثیق کر دی تھی۔ یہ واضح طور پر بتلا دیا گیا تھا کہ کسی ایک رکن کے شکار کے دوران دوسرے خون چوس رکن مداخلت نہیں کریں گے۔ کھٹملوں نے بھی ہماری اس پالیسی کی تائید کی تھی۔ آدم خور شیر بھی دوسرے شیر کے شکار کو سونگھتا نہیں۔ ہاں انسان کی بات اور ہے اس لیے ہماری لغت میں سب سے مکار اور کمینہ جانور انسان ہے۔

صدر مچھر: (کمزور و ناتواں مچھروں سے مخاطب ہو کر) شاید آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

کمزور مچھر: تہی نصیب۔ کھڑو نا خدا خدا کرکے جناب والا ہمیں خشک سالی کا حلقہ دیا گیا ہے۔ ایک ایسا علاقہ جہاں اردو شاعر و ادیب بستے ہیں۔ شاعر اور وہ بھی اردو کے یعنی بدحال مخلوق ان کی حالت زار دیکھ کر دل کہتا ہے کہ اپنے جسم کے دو بوند خون کا عطیہ دیا جائے۔ ان کی حیثیت سماج میں ہم مچھروں سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ خدا سے یہی پوچھتے ہیں۔

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے!
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

یہ بیچارے ہر روز ڈاکیہ کا انتظار کرتے ہیں اور ڈاکیہ جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے کی طرح آکر منی آرڈر دے جاتا ہے جو کسی مدیر نے بھیجا ہو۔ وہ قلیل رقم لے کر گنگناتے ہیں۔

اور تو کچھ نہ ملا یاں مری محنت کا صلہ
چند سکے ہیں مرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح

صدر مچھر: گویا آپ بھی شاعروں اور ادیبوں کے حلقہ

میں رہ کر شعر فہم اور شعر گو ہو گئے ہیں ۔ اچھا وہاں خون کی قلت ہے تو پھر آپ بلڈ بینک کا رخ کیوں نہیں کرتے ؟

کمزور مچھر: جناب اردو شاعروں اور ادیبوں سے قریب رہنے کا یہ اثر ہوا ہے کہ ہمیں اب انسان دوستی کا مفہوم سمجھ میں آگیا ہے ۔ آپ خفا نہ ہوں تو عرض کروں کہ بلڈ بینک ہی صرف تانگہ والوں رکشہ رانوں، مزدوروں اور مجبوروں کا خون بوتلوں میں بند رہتا ہے ۔ ایسا ہوتا رہا ہے کہ سیاست داں روپیوں کے لیے ضمیر اور روح بیچتے ہیں اور غریب روپیوں کے لیے خون بیچتے ہیں ۔ ہم مچھروں کا خون اتنا سفید نہیں ہوا کہ صاف اور میلے خون میں تمیز نہ کر سکیں ۔ ہم ہرگز بلڈ بینک میں نہیں جائیں گے ۔

صدر مچھر: (خون کا گھونٹ پیتے ہوئے) یوں تو انسان دوستی ہماری فطرت کے عین خلاف ہے ۔ لیکن میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں مجھے فخر ہے کہ ہم انسان سے زیادہ شریف ہیں ۔ میں آج اس کانفرنس میں اعلان کرتا ہوں کہ آج سے غریبوں مزدوروں رکشہ رانوں کا خون ہم پر حرام اس فہرست میں آپ اردو شعرا اور ادبا کو بھی شامل کر سکتے ہیں ۔ اس لیے کہ وہ اپنا رہا سہا خون اردو زبان کی بقا اور اس کی ترقی پر صرف کر رہے ہیں ۔
کاش خدا ہمیں خون چوسنے کے ساتھ خون داخل کرنے کی صلاحیت بھی عطا فرماتا تو یقیناً ہم انسانوں میں جسمانی طور پر بھی مساوات لاتے ۔ طاقت ور، امیر اور مغرور انسانوں کا خون، غریبوں، مزدوروں اور کمزوروں کے جسم میں داخل کر کے صحت مند سماج کی تشکیل کرتے ۔
بہرکیف معتمد مچھر کا یہ خدشہ بے بنیاد ہے کہ کرۂ ارض پر ہماری نسل کی بقا کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے ۔ کیونکہ جب تک انسان میں لوٹ کھسوٹ، مار پیٹ، تن پروری، ذخیرہ اندوزی اور رشوت ستانی رہے گی دنیا میں اندھیرا رہے گا اور اندھیرا ہمارے لیے بہترین ماحول ہے ۔ انسان کو روشنی سے نفرت ہو چکی ہے وہ خود اپنے اوپر مایوسی، تشکیک اور بے یقینی کا اندھیرا مسلط کر رہا ہے ۔ ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ اس کا یہ تاریک اور منفی رجحان ہمارے حق میں افزائش نسل کی ضمانت ہے ۔ دیکھیے اب کھوکھلے اور جھوٹے نعروں کی آوازیں گونج رہی اور شاید ان کا وزیر آگیا ہے ۔ آپ تمام ایک ایک کرسی پر بیٹھ جائیے ۔ اور دل کھول کر خون چوسیے ۔
بہ حیثیت صدر میں وزیر کی کرسی پر بیٹھتا ہوں ۔
اگلی کانفرنس کے متعلق یہی کہوں گا

کہ

پھر ملیں گے اگر وزیر آیا

○ ○



مہاتما گاندھی کو خراجِ عقیدت

آندھرا پردیش میں گاندھی جی کے یوم پیدائش ۲ اکتوبر
کو "ہریجن ویلفیر ڈے" منایا ہے اور مختلف اسکیمات
کو جو ہریجنوں کی بھلائی کیلئے ہیں ساری ریاست
میں روبہ عمل لا رہا ہے

مہاتما گاندھی نے زندگی بھر ہندوستان کو تعمیر کرنے کی کوشش کی جس میں غریب سے غریب آدمی بھی یہ محسوس کرے کہ یہ اُس کا اپنا ملک ہے جس کو بنانے میں وہ ایک موثر کردار ادا کرتا ہے اور اُس کی آواز بھی سُنی جاتی ہے اور بھارت کے عوام اونچ نیچ کے فرقہ کا شکار نہ ہوں اور تمام برادریوں سے تعلق رکھنے والے مکمل ہم آہنگی کے ساتھ رہیں۔"

ہریجنوں کو ترقی دینے کا کام گاندھی جی کو بے حد عزیز تھا جنہیں وہ خدا کے بچے کہا کرتے تھے۔ چھوت چھات کو وہ ملک کی نیک نامی پر ایک بدنما داغ سمجھتے تھے۔

شریمتی اندرا گاندھی کی عنایتوں کے زیر سایہ ریاستی حکومت جناب ٹی۔ انجیا چیف منسٹر کی باصلاحیت قیادت کے تحت ہریجنوں پر کی جانے والی زیادتیوں اور مظالم کی روک تھام کرنے کیلئے قانون تحفظ شہری حقوق کی خوش اسلوبی کے ساتھ عمل آوری کر رہی ہے۔

اذیت اور پریشانی کے شکار لوگوں کو فوری طور پر انصاف رسانی کی سہولت فراہم کرنے کے لئے پانچ متحرک عدالتیں کام کر رہی ہیں۔

سال ۸۲ - ۱۹۸۱ء میں ہریجنوں کی فلاح و بہبود کے لئے موازنے کی رقم میں ۱۷ر۴۱ کروڑ روپے تک اضافہ کردیا گیا ہے اس متاثر کن موازنے کی رقم سے ۵۷ر۲۵ کروڑ روپے تعلیمی اسکیمات پر ۵۵ر۸ کروڑ روپے کمیونٹی خدمات پر ۰۳ر۵ کروڑ روپے معاشی ترقیاتی پروگرام ۶۵ر۲ کروڑ روپے دوسری سماجی بھلائی کی اسکیمات کے لئے مختص کئے گئے ہیں تاکہ ہریجنوں کو اس سے فائدہ پہونچے۔ سماجی تحفظات اسکیمات کے لئے ۷۲ر۴ کروڑ روپے فراہم کئے گئے ہیں۔

خصوصی جزوی منصوبے کے تحت ۵۲ کروڑ روپے خرچ کرتے ہوئے خطِ غربت سے اوپر لانے کے لئے تقریباً ۵ر۱ لاکھ ہریجن خاندانوں کی مدد کی جائے گی۔

ماہ اکتوبر ۱۹۸۰ء سے اب تک ۷۹ر۱۵ کروڑ روپے کے خرچ سے معاشی سدھار اسکیمات کے ذریعہ ۴۶۶۳۲ درج فہرست اقوام کے افراد کو فائدہ پہونچایا گیا۔

حال ہی میں منعقدہ پنچایت راج انتخابات میں ۲۵۰۰ سے زیادہ ہریجن بحیثیت سرپنچ منتخب کئے گئے۔

مندروں میں جب کبھی جائیدادیں خالی ہوں ہریجنوں کو ٹریننگ دے کر بحیثیت آرچک (پجاری) مامور کرنے کی اسکیم تیار کی جارہی ہے۔

آندھراپردیش زبانی الفاظ میں نہیں بلکہ پچھڑے ہوئے عوام اور ہریجنوں کی ترقیاتی اسکیمات کے ذریعہ مہاتما جی کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے جو ہریجنوں کو محبوب رکھتے تھے

جاری کردہ :- محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھراپردیش

(DIPR. NO: 46)

م۔ پ۔ آٹھولے

مترجم:- محمد اسد اللہ (ودود)

"شیکسپیئر ردّی ڈپو"

(افتتاحیہ)

دوستو ۔! قدرت کے اس کارخانے میں کوئی چیز بے کار نہیں اور جو بیکار ہے۔ ہم اسے "ردّی" کہتے ہیں۔ عجیب بات یہ کہ اس بیکار چیز یعنی ردّی کی فروخت کی بھی دوکانیں ہوتی ہیں۔ پچھلے دنوں ہمارے شہر میں ردّی کی نئی نئی دوکانیں کھلیں۔ ردّی کے اس عروج کے اسباب لوگوں سے یوں سُنے کہ قیمتوں کے بڑھنے سے ردّی کے دام بڑھ گئے۔ ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ جس چیز کے کوئی دام ہی نہیں یعنی بے قیمت چیزوں کو ہم ردّی کہتے ہیں۔ تب ردّی کی قیمت چہ معنی وارد ہے اور وہ بھی بڑھے ہوئے دام؟! دوسری بات یہ سُنی کہ ردّی کی بھرمار سے دوکانیں بڑھیں۔ تو یہ بات معاشیات کو کسی طرح بھی قبول نہیں کیونکہ مارکیٹ میں اشیاء کی کثرت سے قیمتوں کا زوال لازمی امر ہے۔

معزز سامعین ۔! اسباب کچھ بھی ہوں، یہ حقیقت ہے کہ ردّی کی دوکانیں حشرات الارض کی طرح بڑھتی جارہی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔

دوستو! ۔ آج ہم اسی قبیل کی ایک حقیقت کا افتتاح کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے ہیں اور ابھی کچھ دیر قبل میں نے کچھ اس قسم کے فقرے سنے کہ ردّی کی دوکان کے افتتاح پر مجھ جیسے بسیار نویس ادیب اور مقرر کو بلوانا دوکاندار کی عقلمندی کا عملی ثبوت ہے۔ سامعین پر نظر ڈالی تو یہ باتیں مجھے ناگوار بھی نہ لگیں بلکہ خوشی ہوئی کہ میری تقریر کے موضوع سے ہم آہنگ ہوسکیں ایسے سامعین کا مجمع مل گیا۔

پیارے سامعین! اس دوکان کے مالک حجازی نے اس دوکان کا نام "شیکسپیئر ردّی ڈپو" رکھا ہے۔ بظاہر شیکسپیئر اور ردّی ان دونوں کے کبھی بھی جائز یا ناجائز کسی قسم کے تعلقات نہیں رہے۔ اور نہ کبھی اس کے کسی ڈرامے کو ردّی کی دوکان دیکھنا نصیب ہوئی۔

مگر کیا کیجئے کہ اکثر ہم پیشہ جان کے دشمن ثابت ہوتے ہیں۔ شکسپیئر کے ہم پیشہ برنارڈ شاہ نے شکسپیئر کو "ردّی ڈرامہ نگار" کہا ہے۔ اس پھبتی کے اسرار و رموز سے واقفیت کے لئے عمر خیام کا تصوّر ضروری ہے۔ اپنے لذتِ کلام سے ساری دنیا کو مسحور کر دینے والے اس شاعر کا جنم ردّی ہی کے انبار سے ہوا ہے۔ مشہور ہے کہ ردّی کی ایک دوکان سے خریدی ہوئی کتاب نے ایک انگریز کو اس قدر متاثر کیا کہ اس نے اس کتاب کے خالق عمر خیام کی شہرت کا ڈنکا ساری دنیا میں بجوا دیا۔

دوستو! ردّی ہی ادب کی ماں ہے۔ عظیم المراتب ادباء و شعراء کا ماویٰ و ملجا ردّی ہی ہے۔ اسی ردّی سے نامور ادبا اُٹھتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ مستقبل کا شکسپیئر بھی اسی ردی کی دوکان سے پیدا ہو۔ اسی حسنِ ظن کے سبب اس دوکان کا نام شکسپیئر ردّی ڈپو رکھا گیا ہے۔

افراط و تفریط سے قطعِ نظر ردّی کی تعریف ابھی تک میرے مطالعہ میں نہ آئی۔ لیکن لگتا ہے ردّی سے متعلق لوگ اعلیٰ تصورات رکھتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے اور میں اس کا چشم دید گواہ ہوں کہ ایک شخص اپنی زندگی بھر کی خط و کتابت ایک ردی کی دوکان پر فروخت کرنے آیا۔ اسی طرح ایک شخص کو میں نے منی آرڈر فارموں کا پلندہ بیس پیسے میں ٹھکانے لگاتے دیکھا۔ (شائد اسی کے بعد اب فی فارم ۵ نئے پیسے لئے جاتے ہیں)۔ بعض لوگ ردّی میں اوٹ پٹانگ چیزیں ملا کر اس میدان میں بھی ملاوٹ کو راہ دینے لگے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ انتقامی کارروائی ہو کہ ملاوٹ کرنے والے دوکان دار کو دی جانے والی ردّی میں ملاوٹ کر کے حساب بے باق کر لیتے ہوں۔ ردّی میں "شیر کا حصّہ" ادیبوں اور اخبار والوں ہی کا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے پر منحصر ان دونوں دھندوں کو مشترک بزنس کی صورت دینا چاہیئے۔ میں اس بات کا زبردست حامی ہوں کہ یا تو ردّی والے اخبار نکالیں یا اخبار والے ردّی کی دوکان کھولیں۔

انگریزی کی افضلیت ہمیں ردّی کے میدان میں بھی خاطر خواہ نظر آتی ہے۔ انگریزی اخباروں کی ردّی کے دام دیسی ردّی کی قیمتوں سے ہمیشہ دو قدم آگے ہی رہتے ہیں۔ اخباری ردّی پر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ میرا ایک دوست اخبار خریدنا چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے مشورةً ملا اور کہنے لگا۔

"مجھے ایک اخبار لگوانا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تو لگوالو۔"

وہ بولا۔ "مگر کون سا اخبار لگواؤں اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "کوئی بھی اخبار لگا لو۔ سبھی میں یکساں خبریں ہوتی ہیں۔ کون سا اخبار اچھا ہے کون سا بُرا یہ فیصلہ کرنا ذرا مشکل ہے۔ ہمیں پڑھنے کو خبریں ملیں۔ بس کافی ہے۔"

"میں خبروں کے لئے تھوڑا ہی پوچھ رہا ہوں۔"

"پھر؟" - میں نے حیرت سے پوچھا۔

اس پر وہ بولا۔ "کوئی ایسا اخبار بتاؤ جس کی ردّی مہنگی بکے اور دو آنے زیادہ حاصل ہوں۔"

اب اس سوال کا میں کیا جواب دیتا۔ اپنا سر پیٹ لیا۔

میرے اس دوست کی طرح کاروباری نظر رکھنے والے سیکڑوں ہیں۔ دور کیوں جائیے۔ ایک مرتبہ میری بیوی نے مجھ سے اون کا سوٹ سلوانے کو کہا۔ نہ صرف کہا بلکہ بار بار اصرار کرکے سلوالیا۔ اس وقت تو میں اس کی محبت سے مسحور سا ہو گیا۔ مگر جب عقدہ کھلا تو حیران رہ گیا کہ وہ گرم سوٹ محبت کی حرارت کا نتیجہ نہ تھا۔ اس کے پیچھے، پھیری والوں سے پرانے سوٹ کے بدلے برتن اچھے ملتے ہیں، یہ لالچ کارفرما تھا۔ اسی لئے بصد اصرار وہ سوٹ سلوایا گیا تھا۔ برتن اور پرانے کپڑوں پر سے مجھے پھر ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب کپڑے کمیاب ہو گئے تھے اور دھوتیاں تو تقریباً ناپید ہی ہو گئی تھیں تو میرے ایک دوست کی ماں نے گھر کے برتنوں کے عوض دھوتی خریدی تھی جبکہ عموماً پرانے کپڑے بیچ کر برتن خریدے جاتے ہیں۔ ہمارے ادیبوں کی کاوشیں عموماً ردّی کی نذر ہو جاتی ہیں لیکن پھیری والوں سے فراہم ہونے والی مذکورہ بالا اُترن (دھوتی) کیا واقعی ردّی سے برآمد ہونے والے ادب ہی کی طرح نہیں ہے؟

میں جب ردّی ڈپو میں لگے انبار پر نظر کرتا ہوں تو میرا دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ جن فنکاروں نے دنیا کو بہترین اور اعلیٰ خیالات دیئے ان کی عظیم تخلیقات سے لے کر ریلوے ٹائم ٹیبل تک سب اسی انبار میں دھول کھاتے پڑے ہیں۔ پبلسٹی سے محروم بیکار ماندہ ادب ردّی فروش کو اٹھا دینا اپنی اولادِ حقیقی فروخت کر دینے کے مترادف ہے۔ مگر فطرت بھی لاڈ کی حنا بندی کچھ اس طرح کرتی ہے کہ اس ادب کو ردّی کی پڑیوں میں بندھوا کر صاحبِ ذوق قاری تک پہنچا دیتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پنساری کی دوکان پر پڑیوں میں بندھ کر ملک و قوم کی خدمت انجام دینا ہی اس ادب کی قسمت میں لکھا ہوا ہو۔

پچھلے دنوں کوکنی زبان کو ساہتیہ اکیڈمی نے آزاد زبان قرار دیا اسی کو بنیاد بنا کر ادیبوں میں خاصی چپقلش چلی۔ یہ خطوط اخبارات میں چھپے بھی۔ یہ مباحثہ ادب اور ردّی دونوں کو چھوتا ہوا گذرا۔ لہٰذا میں اس طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس بحث کے دوران ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ ایک تھیلی میں سما جائیں۔ اتنی کتابوں پر جس زبان کا ادب مشتمل ہو، اسے آزاد زبان کیسے کر قرار دیا جا سکتا ہے۔ تب جواباً دوسرے صاحب بولے۔ جناب ادب کو کانٹے پر مت چڑھائیے۔ مجھے اس بحث سے غرض نہیں۔ یہی بتانا مقصود ہے کہ ادب کا ردّی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ بحث میں نے اخبار کے اس کاغذ سے پڑھی جس میں گُڑ لپیٹ کر آیا تھا۔ عمر خیام والی کہاوت کو کچھ اور آگے بڑھاؤں تو کچھ میرا بھی ذکرِ خیر ہو جائے کہ برائے اشاعت بھجوائے گئے میرے مضامین کے نصیب میں اکثر ردّی کی ٹوکری کا پیٹ بھرنا ہی لکھا ہے۔ عمر خیام کی طرح ردّی کے انبار سے شہرت کے حصول کے لئے میرا لکھا ردّی میں پہنچنا بہت ضروری تھا مگر یہ ہو کیونکر۔ یہ فکر مجھے دامن گیر تھی اور ادھر ردّی والے پرانے کاغذات پر لکھی ہوئی میری تخلیقات کو شرفِ قبولیت بخشنے کو کسی طرح تیار نہ تھے۔

چنانچہ ایک دن ایک ترکیب سوجھی۔ پرانی کتابیں دیکھنے کے بہانے میں ایک ردّی کی دوکان پر گیا اور دوکاندار کی آنکھ بچا کر اپنی تخلیقات بڑی چابکدستی سے ردّی میں "اسمگل" کر دیں۔ اور اب میں برسوں سے اس آدمی کے انتظار میں ہوں جس کے ہاتھ لگتے ہی میں "شکسپیر دی سکنڈ" بن کر ردّی سے باہر آ جاؤں گا۔

(تلخیص)

انجم مانپوری

اینٹی فادر کانفرنس

(دوسری قسط)

"اما بعد" آپ حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ اس دورِ ترقی میں جب ہر طرف آزادی کی ہوا نہیں بلکہ آندھی چل رہی ہے اور ہر جماعت غلامی کا رستہ توڑ کر آزادی کے میدان میں سرپٹ دوڑتی جا رہی ہے۔ کاشت کار جو زمین داروں کے ہل میں بیل کی طرح ہر وقت جتے رہتے تھے اب اپنے کاندھوں سے ان کی حکومت کا جوا اتار پھینکنے کے لیے تیار ہیں۔ مزدور سرمایہ داروں کے پنجۂ ظلم سے چھٹکارا پانے کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ اچھوت مہاتما گاندھی کے بل پر اونچی ذات والوں کو نیچا دکھانے پر تلے ہوئے ہیں۔ عورتیں مردوں کے دباؤ میں رہنا نہیں چاہتیں تو کیا وجہ ہے کہ اس آزادی کے زمانے میں ملک کے نوجوان والدین کی اطاعت و فرماں برداری پر مجبور کیے جائیں اور انہیں اس غلامانہ زندگی سے نجات نہ دلائی جائے۔ جب یہ ایک مسلم امر ہے کہ کوئی نیم مہذب، مہذب قوم یا جماعت پر حکومت نہیں کر سکتا تو کس قدر ظلم کی بات ہے کہ ایک دقیانوسی خیال کا باپ ایک تعلیم یافتہ جنٹلمین بیٹے کے ساتھ حاکمانہ برتاؤ کرے اور اس کے ذاتی معاملات میں بیجا دخل دے کہ اس کی آزادی میں دخل انداز ہو۔ تھیٹر دیکھنے کیوں گئے۔ سینما جانے کی کیا ضرورت تھی، ایکٹرسوں سے خط و کتابت کی کیا وجہ ہے۔ میڈیکل نرسوں کی تصویریں کیوں البم میں ہیں ان قدامت پسندوں کو اتنی بھی خبر نہیں کہ موجودہ دورِ تہذیب میں کسی کی پرائیویٹ زندگی میں دخل دینا کس قدر ایٹی کیٹ کے خلاف ہے مگر کہے کون۔ باپ جو ہوئے۔ ہر کام میں نکتہ چینی ہر بات میں باز پرس بیٹا نہ ہوا کسی کے باپ کا نوکر ہوا کہ بغیر اجازت کوئی حرکت کر ہی نہیں سکتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ فادرازم کو دنیا سے مٹا دیا جائے۔ اور خاکسار صدر کی رائے میں پہلے کل والد صاحبان کو ایک ایک مہینہ کی نوٹس دی جائے کہ اگر عزت و آبرو کے ساتھ نام نہاد باپ کی پوزیشن قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ڈانٹ ڈپٹ تو بڑی چیز ہے کوئی باپ اپنے بیٹے کے ذاتی معاملات میں دخل نہ دے۔ ورنہ یہ اینٹی فادر کانفرنس ہر باپ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے جہاد کا فتویٰ صادر کر دے گی۔

بس ختم شد خطبۂ صدارت۔

العبد خاکسار

صدر انجمن فادر کانفرنس بقلم خاص اس کے بعد ایک
جوشیلے اسٹوڈنٹ نے اسٹیج پر آکر حسب ذیل تقریر شروع کی۔

"میرے نوجوان دوستو! یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں
کہ ترقی یافتہ ممالک میں ایک عرصہ سے پوپ کی طرح اب "فادر"
بھی کوئی قابل ہستی نہیں سمجھی جاتی اور اب خدا کے فضل سے
ہندوستان میں جیسے جیسے مغربی تعلیم کے فیوض و برکات سے
لوگ مستفید ہوتے جاتے ہیں، باپ کا اثر خود بخود زائل ہوتا
جا رہا ہے۔ سنتا ہوں کہ پہلے کسی بیٹے کی مجال نہ تھی کہ اپنے والد
کے خلاف مرضی کوئی لفظ منہ سے نکالے لیکن انگریزی تعلیم
کے فیوض نے نوجوانوں میں ایسی اخلاقی جرات پیدا کر دی ہے
کہ باپ کو صرف ترکی بہ ترکی جواب نہیں بلکہ ڈانٹ ڈپٹ میں
بھی تامل نہیں کرتے۔ کالجوں اور اسکولوں میں جس بیباکی
کے ساتھ ان والد صاحبان کا مضحکہ اور تمسخر اڑایا جاتا ہے
اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ فادرازم کے خلاف طلبا میں
کافی احساس پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی تک بہت سے کمزور
خیال کے ایسے ناسمجھ نوجوان موجود ہیں جو باپ کے حکم کی تعمیل
کو اپنی سعادت مندی سمجھتے ہیں۔ ان کی اس غلامانہ ذہنیت
سے ہماری تحریک کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس لیے
ان پرانے خیال کے نوجوانوں کو "باغیان پدر" کی جماعت میں
شامل کرنے کے لیے سخت پروپگنڈا کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اینٹی فادر
کانفرنس کے ہر ممبر پر فرض ہے کہ آج سے احکام پدری کی
علانیہ خود بھی خلاف ورزی کرے اور اپنے ساتھیوں کو
بھی اس پر عمل کرنے کی ترغیب دے۔"

اس کے بعد میڈیکل کالج کے ایک فیشن ایبل
اسٹوڈنٹ نے حسب ذیل اسپیچ دی۔

"دوستو! یہ کنزرویٹو قسم کے والد صاحبان
ہم نوجوانوں کے لیے تو ایک مستقل مصیبت
بن گئے ہیں۔ قدم قدم پر رکاوٹ بات بات پہ
سرزنش یہ فیشن آوارگی کا ہے۔ یہ وضع شریفوں
کی نہیں۔ ایک بجے شب تک باہر رہنا شہدا پن
ہے۔ دیر کر کے صبح کو اٹھنا صحت کے لیے مضر
اور اسی پر بس نہیں۔ مذاق یہ کہ نماز کی تاکید کی
جاتی ہے (شیم شیم) ایک مغربی تعلیم یافتہ نوجوان
سے مذہبی پابندی کے لیے کہنا کس قدر مضحکہ خیز
حرکت ہے۔ اسکول اور کالج کے اسٹوڈنٹ کو بھی
گویا مدرسہ کا طالب علم سمجھ رکھا ہے اور ساتھیوں
کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر میں نے عاجز آکر
اپنے ابا جان کو صاف کہہ دیا کہ قبلہ اب وہ زمانہ
نہیں رہا کہ آپ خاندان کے زار روس بنے بیٹوں
پر بلاوجہ حکومت کرتے رہیں اور بیٹے ؎

سر تسلیم خم ہے جو مزاج باپ میں آئے

کہہ کر چپ رہیں۔ حضرات اب زمانہ ہے آزادی کا کوئی
تعلیم یافتہ فرزند کسی کی اندرونی مداخلت کو برداشت
نہیں کر سکتا۔ چاہے وہ باپ ہی کیوں نہ ہو۔ بس خیریت اسی
میں ہے کہ آئندہ میری کسی بات میں دخل نہ دیجیے۔
یہ سن کر بڑے میاں چپ ہی تو ہو گئے۔ اس واقعہ
کے بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ اسی طرح
اگر ہر نوجوان ہمت و جرات سے کام لے کر
کھلے لفظوں میں اپنی آزادی کا اعلان کر دے
تو کسی کے باپ کی مجال نہیں کہ کسی کو دق کرے۔
(ہر طرف سے نعرۂ تحسین) اس اسپیچ کے بعد کوٹ
پتلون، ہیٹ چڑھائے ایک صاحب بہادر ٹائپ
کے نوجوان نے یوں لکچر شروع کیا:

مسٹر پریسیڈنٹ اینڈ جنٹلمین! قدرت کی ستم ظریفی

دیکھئے کہ مجھے ایک ایسے بیٹو قسم کے باپ کا بیٹا بنا دیا جو خیالات وضع قطع صورت و شکل کسی دھڑ سے ایک مہذب اور تعلیم یافتہ نوجوان کے باپ ہونے کا اہل نہیں لیکن چونکہ اس بے جوڑ رشتہ کا توڑنا میرے اختیار سے باہر ہے اس لیے مجبوراً اس مصیبت کو بھی برداشت ہی کرنا پڑتا ہے۔ میں مصلحتاً حتی الامکان اس رشتہ کے چھپانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر پدر بزرگوار آپ ہیں کہ ہر جگہ فخریہ میری فرزندگی کا اعلان کر کے دوستوں کی نظروں میں مجھے ذلیل کرنے سے باز نہیں آتے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ میں بورڈنگ میں ایک دوست کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا کہ ایک کلاس فیلو نے آکر مسکراتے ہوئے کہا کہ ایک دیہاتی وضع کا آدمی اپنے ساتھ کھانے کی چیزیں لیے ہوئے تمہیں تلاش کر رہا ہے۔ میں نے کھڑکی سے گردن نکال کر جھانکا تو دیکھا کہ بغل میں چھوٹی سی گٹھری اور ہاتھ میں ٹفن کیریر لیے وہاں جان قبلہ صاحب کھڑے ہوئے ہیں

اس ڈر سے کہ لوگوں پر ظاہر نہ ہو جائے فوراً قریب پہنچ کر ناشتہ کی چیزیں لے کر آہستہ سے کہا کہ اس وقت آپ کا یہاں ایک منٹ کیلئے بھی ٹھہرنا مناسب نہیں۔ شہر میں کسی ملاقاتی یا رشتہ دار کے یہاں جا کر قیام کیجئے میں کسی اور وقت آ کر اطمینان سے مل لوں گا۔ یہ سنتا تھا کہ بگڑ کر انہوں نے کہا کہ کیا انگریزی تعلیم کا یہی نتیجہ ہے کہ میں تو تمہاری خیریت اور حالات دریافت کرنے کے لیے دیہات سے چل کر یہاں تک آؤں اور تم سیدھی طرح بات بھی کرنے کے روادار نہیں۔ دو چار منٹ میرا ٹھہرنا ناگوار۔ یہ اچھی سعادت مندی کا ثبوت تم نے دیا۔ یہ کہتے ہوئے مارے غصہ کے وہ حضرت ادھر روانہ ہوئے ادھر یاروں نے پوچھنا شروع کیا کہ کہاں سے یہ ناشتہ کی چیزیں آئیں اور لانے والا کون تھا۔ میں نے نہایت ہی متانت سے کہا کہ گھر سے جناب والد صاحب قبلہ مدظلہ نے یہ چیزیں بھیجی ہیں اور دیوڑھی کا ملازم ہے۔ اس پر انھیں ساتھیوں میں سے ایک نے مسکرا کر کہا: یہ دیوڑھی کا ملازم تمہارا نہایت بدتمیز اور شوخ معلوم ہوتا ہے۔ اپنے آقا سے اس طرح کی گستاخانہ گفتگو۔ میں تمہاری جگہ پہ ہوتا تو چانٹوں سے اس شوخی کا ایسا مزا چکھاتا کہ باپ باپ کہتا بھاگتا۔ میں نے کہا دیہات کے گنوار جاہل ملازم سے تہذیب کی امید کرنا ہی فضول ہے۔ پرانے ملازم ہونے کی وجہ سے تنبیہہ کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ یہ کہنا تھا کہ یاروں نے قہقہہ لگا کر کہا: "ہم لوگوں نے پہلے ہی آپ کے اس دیوڑھی کے ملازم سے پوچھ لیا تھا کہ حضرت کون تھے۔ مگر یار تم نے بھی عجیب [illegible] قسم کا باپ پایا ہے۔"

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت مارے ندامت کے میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ ان واقعات کے دہرانے سے میرا مطلب صرف یہ ہے کہ جہاں تک جلد ہو باپ کی مصیبت سے نجات دلائی جائے۔

یہ تقریر جیسوں ہی ختم ہوئی ایک امپورٹیڈ فیشن کے اسٹوڈنٹ صاحب، داڑھی مونچھ صاف، ناک پر سنہری کمانی کی عینک، ننگے سر، نازک کلائی پر گھڑی کا تسمہ ہاتھ میں ہنٹر نما چھڑی، کوٹ کا بٹن کھلا ہوا۔ غرض کہ اس دلبرانہ شان سے اسٹیج پر تشریف لائے کہ بے ساختہ لوگوں کی زبان پر آ گیا۔ ع

اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

آتے ہی انھوں نے گوہر افشانی شروع کی۔

"صاحبو! فادرازم کی وبا صرف پرانے خیال کے بڈھے بوڑھوں میں نہیں پھیلی ہوئی ہے بلکہ نئی روشنی کے حضرات بھی اس سے مستثنیٰ نہیں مثال کے طور پر میں خود اپنے فادر صاحب کا حال کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں شک

نہیں کہ مغربی تعلیم یافتہ اور موجودہ تہذیب کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے سینما تھیٹر، گانے کے جلسوں میں خود اپنے ساتھ لے جا کر اپنی روشن خیالی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ میری بہت سی پرائیویٹ دلچسپیوں سے واقف ہونے پر بھی اندرونی معاملات میں دخل دینا ایٹی کیٹ کے خلاف سمجھتے ہیں۔ لیکن ان روشن خیالیوں کے باوجود فادرازم کے اثر سے ان کا دماغ خالی نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ جنسی تعلقات انسانوں کے جذباتی میلان کے ماتحت ہیں۔ مگر میرے فادر صاحب اپنے پدرانہ تحکم سے میری اس فطری آزادی کو چھین کر ہمیشہ کے لیے اپنے ایک قریبی رشتہ دار کی لڑکی کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں۔ اور وہ بھی معمولی اردو فارسی پڑھی لکھی اور اس پر طرہ یہ کہ پردہ نشین جس سے کورٹ شپ کے ذریعہ تبادلۂ خیالات و جذبات بھی نہ کیا جا سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب باپ کی شادی میں بیٹے کی رائے کو کوئی دخل نہیں تو باپ کو کیا حق ہے کہ اس کے ذاتی معاملات میں دخل دے کر ایک آزاد خیال بیٹے کو ازدواجی زنجیر میں جکڑ دے تو غرض میرے کہنے کی یہ ہے کہ جب تک فادرازم دنیا سے نیست و نابود نہ کر دیا جائے۔ اس وقت تک کوئی نوجوان آزادانہ لطفِ زندگی نہیں اٹھا سکتا۔"

• فادر مردہ باد" کے نعرہ پر لکچر ختم کیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ تقریروں کا سلسلہ رکتا ہی نہیں۔ ہر نوجوان اپنے باپ کے خلاف کچھ نہ کچھ دل کا بخار نکالنا چاہتا ہے اور اس طرح سے تو جلسہ ختم ہونے ہی والا نہیں۔ خدا صدر کے ویٹو کے خاص اختیار کو کام میں لا کر لکچر ایک دم اسٹوپ کا آرڈی ننس جاری کر دیا اور ساتھ اس خیال سے کہ پھر ریزولیشن کے پیش کرانے اور اس کی تائید کرنے میں دوبارہ تقریروں کا سلسلہ شروع ہوگا، تو خدا جانے کتنی دیر قائم رہے گا۔ میں بہت سے ریزولیشن کو ساتھ لایا تھا۔ اسے پیش کر کے سنانے کے بعد اکٹھے سب کے پاس ہونے کا اعلان کر دیا۔ جو حسب ذیل ہیں:

(۱) مذہب اور پرانی سوسائٹی نے جو غیر محدود اختیارات والد صاحبان کو دے رکھے ہیں، اینٹی فادر کانفرنس ان کل حقوق پدری کو آج سے منسوخ کرتی ہے۔

(۲) اس کانفرنس کے ہر ممبر پر یہ فرض ہے کہ صرف ترک سوالات ہی نہیں بلکہ سول ڈس اوبی ڈینس، یعنی احکام پدری کی علانیہ خلاف ورزی کرے۔

(۳) اینٹی فادر کانفرنس کا کوئی ممبر آئندہ سے کبھی قبلہ و کعبہ جیسے تعظیمی الفاظ سے کسی باپ کی ہمت افزائی نہ کرے۔ خط و کتابت میں زیادہ سے زیادہ ڈیئر فادر لکھ سکتا ہے۔

(۴) اس کانفرنس کی رائے میں ہر سعادت مند فرزند کو پورا حق ہے کہ نا خلف باپ کو عاق کر کے کل حقوق پدری سے محروم کر دے۔

(۵) یہ کانفرنس نہایت غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہونچی ہے کہ چونکہ باپ کی جائیداد آئندہ چل کر ایک نہ ایک دن بیٹے کے قبضہ میں آ جاتی ہے اس لیے اس کا حقیقی مالک گویا بیٹا ہی ہے۔ باپ کی حیثیت منیجر یا خزانچی سے زیادہ نہیں۔ اس بنا پر ہر بیٹے کو پورا اختیار ہے کہ اس کی آمدنی کو جس طرح چاہے خرچ کرے۔ باپ کو بہ حیثیت خزانچی کے اس میں مداخلت کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔

(۶) چونکہ والد صاحبان کے حاکمانہ سلوک سے نئی پود کے دماغی نشو و نما پر برا اثر پڑنے کا احتمال ہے اس لیے ضرورت ہے کہ جا بجا فادرس ٹریننگ اسکول کھولے جائیں۔ جن میں تہذیب کے اصول پر بیٹوں کے ساتھ

شریفانہ برتاؤ کی تعلیم دی جائے۔ تاکہ ہونہار نوجوانوں کے جذبات لطیف کو ابھرنے کا کافی موقع ملے۔

(۷) اس کانفرنس کی رائے میں ان ساری خرابیوں کی جڑ وہی شادی بیاہ (عقد و نکاح) کا غیر ضروری پرانا رواج ہے۔ یہ باپ بیٹے کا تکلیف دہ مہمل رشتہ کی بنیاد اسی قدیم رسم نے ڈالی ہے۔ یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ جنسی تعلقات کو شادی (عقد) کے جھگڑوں سے آزاد کرکے جہاں تک جلد ممکن ہو آئندہ نسل کو باپ کی مصیبت سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔

مذکورہ بالا تجاویز کے اکٹھے پاس ہوجانے کے بعد صدر کی حیثیت سے جلسہ کو برخواست کرنا ہی چاہتا تھا کہ سکریٹری کانفرنس نے لوگوں کو مخاطب کرکے کہا۔

"جناب صدر و حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کرنے سے قبل "اینٹی فادر کانفرنس" کے ایک سرگرم کارکن اور اہم رکن مسٹر فہیم کو اس کانفرنس کی طرف سے ان کے والد کے انتقال پر مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ خدا نے اس مصیبت سے انہیں نجات دی۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی اشاعت میں عملی حصہ لیتے تھے۔ اس بلا کے ٹلنے کے بعد اس میں اسی طرح کافی دلچسپی لیں گے۔"

اس تعزیتی تجویز کی تائید کے لیے ایک صاحب اٹھ کر کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ جلسہ کے ایک گوشہ سے میاں فہیم نے کھڑے ہوکر سب کو مخاطب کرکے کہا۔

"صاحبو! اس وقت جس مصیبت سے نجات پانے پر مجھے مبارکباد دی گئی ہے۔ اس کے ظاہر کرنے میں مجھے تامل نہیں کہ جب تک وہ ہستی جسے مصیبت، قہر، عذاب بلا، جو کہیے اس دنیا میں موجود تھی۔ میں نے اس سے چھٹکارا پانے کے لیے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گستاخیاں اور بیہودگیوں سے بھی باز نہیں آیا۔ اب آج جب کہ میں ایک دم آزاد ہو چکا ہوں اس پر اظہار مسرت سے پہلے کچھ ایسے واقعات عرض کرنا چاہتا ہوں جو پہلے میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ دوستوں میں اکثر اصحاب اس بات کو جانتے ہیں کہ انھوں نے انتقال کے کئی ماہ پہلے ناراض ہوکر میرے کل اخراجات سے ہاتھ روک لیا تھا۔ ایسے موقع پر ایک متوسط الحال دوست جس کا نام ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں، بروقت میری مدد نہ کرتا تو بھیک مانگنے کی نوبت آجاتی۔ اور صرف وقتی مدد نہیں بلکہ عرصہ تک اتنی کافی رقم مجھے ملتی رہی کہ پہلے سے بھی زیادہ شان سے رہنے لگا۔ مجھے اپنے دوست کی اس اولوالعزمی پر خود حیرت تھی۔ لیکن آج گھر کے کاغذات و حساب دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ان حضرت کی یہ پرکھانت نہیں تھی بلکہ اس کے پردے میں وہی غیبی فرشتہ تھا جس نے ایک طرف تو تنبیہاً کفالت سے ہاتھ روک لیا اور دوسری طرف میری تکلیف کو برداشت نہ کرکے دست غیب بن کر مجھے دربدر ٹھوکریں کھانے سے بچائے رکھا۔ بعض احباب کو اس کی بھی خبر ہوگی کہ میری ناشائستہ حرکتوں سے تنگ آکر ہر قسم کے تعلقات منقطع کرکے گویا مجھے انھوں نے عاق کر دیا تھا۔ لیکن اس کا علم شاید کسی کو نہیں کہ جس تاریخ کو مجھے عاق کرنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اسی تاریخ کو اپنی کل جائیداد پوشیدہ بذریعہ رجسٹری میرے نام منتقل کر دی۔ اور انتقال کے ایک روز پہلے وہ کل کاغذات میرے حوالے کر دیئے۔

میں سمجھے ہوئے تھا کہ جس ملاقاتی سے جب ضرورت پیش آئی، بے تکلف قرض لے آیا، جس دکان سے جب چاہا باقی چیزیں اٹھا لایا، یہ صرف میری ہر دلعزیزی اور ذاتی تعلقات کی بنا پر ہے۔ لیکن درحقیقت اس میں اُس ایک ایک پیسے کے خرچ پر سرزنش کرنے والے کا ہاتھ تھا۔ جس کی ایما سے احباب اور دوکان دار سے ہر طرح کی آسانیاں مجھے بہم پہونچائی جاتی تھیں۔ ان انکشافات کے بعد اب جو بعض واقعات پر غور کرتا ہوں جو اس وقت میری سرکشی نے سمجھنے نہیں دیا تھا تو ایک دوسری دنیا میں اپنے آپ کو پاتا ہوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک شب سینما دیکھ کر چند دوستوں کو لیے ہوئے گھر پہونچا، سب کے ساتھ کھانا کھا کر پھر دوسرے شو میں جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ خدمت گار نے آکر کہا کہ سرکار بلا رہے ہیں۔ "میں اس وقت باہر جا رہا ہوں" کہہ کر زینہ سے اتر کر صحن میں قدم رکھا ہی تھا کہ بلائے ناگہانی کی طرح پہنچ کر حسب عادت ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ میں نے بھی بگڑ کر کہا کہ میرے ذاتی معاملات میں آپ کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ اس پر غصہ میں بھوت ہو کر گستاخ، بدتمیز، نالائق دور ہو سامنے سے میں تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتا" اسی طرح کے اور بھی بہت سے نا ملائم الفاظ ادا کر گئے۔ میں نے محض دب کی بڑ سمجھ کر اس کی طرف دھیان نہ دیا میں نے سوچا کہ جس باپ کو اپنی اولاد کی صورت سے نفرت ہو اس کا لحاظ کیسا۔۔۔؟ سینما پہنچ کر اپنی خفت مٹانے کے لیے دوستوں کے سامنے اپنے والد کی خوب خوب پھبتیاں اڑائیں۔ تقریباً ایک بجے شب کو جب سینما سے گھر واپس آیا اور چپ دروازے سے خانہ باغ میں داخل ہو کر اپنے کمرہ کی طرف جانے کے لیے دبے پاؤں بارہ دری کے قریب پہونچا تو کان میں گلوگیر آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو سامنے سائبان میں لالٹین کی دھیمی روشنی میں تخت پر جائے نماز بچھائے سجدہ میں پڑا ہوا گڑگڑا کر کوئی کہہ رہا تھا ۔۔۔" خدا وندا میرے نہتو کو بری صحبتوں کے اثر سے بچا۔ اے ہادیٔ مطلق اسے دوست دشمن اور برے بھلے سمجھنے کی توفیق دے۔ اے مقلب القلوب اس کے دل کو بدل دے ۔۔۔۔ میں نے غور سے سنا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ چند گھنٹے قبل جس کی صورت بھی دیکھنا نہ چاہتا تھا کہ اس کے لیے کیوں گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہا ہے۔ چونکہ اس وقت میں ایک خاص عالم میں تھا اس لیے ان متضاد حرکتوں پر مسکراتا ہوا جا کر اپنے کمرے میں سو گیا۔

دوستو! وہ حال میری آنکھوں کے سامنے جب کہ میری ناشائستہ حرکتوں پر غصہ کی آگ بھڑکی تو آنکھوں سے انگارے برسنے لگے لیکن تھوڑی ہی دیر میں جو شفقت پدری نے جوش مارا تو وہی شعلہ بار آنکھیں ڈبڈبا کر محبت کا چھلکتا ساغر بن گئیں۔ ان واقعات کے بعد مجھے معاف کریں۔ جی چاہتا ہے کہ وہ غیض و غضب اور لطف و کرم کی جامع ہستی اپنے بیدردانہ تیور سے نالائق، جاہل اور بدتمیز، گستاخ مجھے کہتا اور میں اس کے قدموں کو مضبوطی کے ساتھ تھامے سر جھکائے خاموش سنتا رہتا۔ اس خاموشی پر اور زیادہ بگڑ کر مردود دور ہو سامنے سے یہ کہہ کر پاؤں چھڑانے کی کوشش کرتا اور میں تسمہ پا بن کر چمٹا رہتا۔ آخر آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے اٹھا کر سینے سے لگا لیتے رقت آمیز لہجہ میں اس کی زبان سے نکلتا کہ تمہارے ہی بھلے کو کہتا ہوں۔ مگر آہ۔ مجھ بدنصیب کے لیے اب وہ موقع کہاں۔ شاید میری ہی کرتوتوں سے روٹھ کر بستی کے

ٹھیرا ایک سنسان جگہ میں لمبی تان کر ایسی میٹھی نیند سو رہا کہ اب اپنے سرکش و نافرمان لخت جگر کی پشیمانی کی بھی خبر نہیں۔

کاش قدرت اس موت کی گہری نیند سونے والے کو لمحہ بھر کے لیے بھی بیدار کر دیتی تو منہ پر سے کفن کی چادر ہٹا کر دیکھتا کہ اس کا باغی سرکش نور نظر اپنے قصور کے عفو کے لیے مزار کے پائینتانہ میں سر جھکائے کس طرح ندامت کے آنسو بہا رہا ہے۔

یہاں پر پہنچ کر مارے رقت کے آواز گلوگیر ہوگئی بھرائی ہوئی آواز زیادہ کام نہ کر سکی۔ مجبوراً رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

خدا جانے فہیم کے ان چند جملوں میں کیا اثر تھا کہ جلسہ جو چند منٹ پہلے بھانڈوں کی محفل بنا ہوا تھا لوگوں کی پُرنم آنکھوں نے مجلس ماتم بنا دیا۔ اس جلسہ کے بعد پھر "ایٹمی فادر کانفرنس" کا لفظ کسی نے نہیں سنا۔

□□

تمنّا مظفر پوری

اُردو ادب کا تیسرا بیل

[یہ مضمون جناب نعمان ہاشمی کی طنزیہ سرگزشت "۲ بیل سیاسی شکنجے میں" کی رسمِ اجراء کے موقع پر دفتر ماہنامہ شگوفہ میں پڑھا گیا۔]

گول مٹول چہرہ، چندی، اور اُونچی پیشانی، چشمے کے اندر سے جھانکتی ہوئی شرارتی آنکھیں اور مخملی گدّی والی مونچھ کے نیچے مسکراہٹ لئے۔ پہلی بار نعمان ہاشمی سے میری ملاقات "دو بیل" سیریز کے دفتر میں ہوئی تھی۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے کم اور جدید لغت کے مرتب کی حیثیت سے زیادہ میں ان سے متاثر ہوا تھا۔ لفظ "بزرگ" کی تشریح جو اُنہوں نے کی تھی وہ نوجوانوں کے نزدیک بڑا با معنی ہے۔ یعنی

بُز + رگ۔

خوش آمدید کے معنی = جو مہمان کے آنے پر جبراً ادا کیا جائے۔

ایماندار = جو دوکان دار کی طرح بیچنے کے لئے ایمان رکھتا ہو۔

داماد = جو دام دے کر خریدا جائے۔

امن = بزدلوں کا نعرہ

اسی طرح نعمان ہاشمی اردو کے زبان زد الفاظ کے مزاحیہ معنی لکھ کر شائع کراتے تھے اور اس نئی لغت اور الفاظ کے مزاحیہ معنی تلاش کرنے کا سلسلہ اب بھی جاری ہے مثلاً ان کی اس کتاب (دو بیل سیاسی شکنجے میں) میں "جانِ وفا" کی تشریح نعمان ہاشمی کے قلم سے ملاحظہ کیجئے۔

جانِ وفا = جو وفا کے نام پر دوسروں کی جان لے لے۔

نعمان ہاشمی نے ایک اور نئی بات بتائی ہے آپ بھی نوٹ کریں FIVE STAR HOTEL کو اُردو میں "پنج انجم ہوٹل" لکھا جائے۔ یہ ایک اچھی اُردو ہے۔

نعمان ہاشمی لغت مرتب کرنے کے ساتھ لغسا نے بھی لکھا

کرتے تھے پھر شاعری شروع کردی آخر میں ان کی ظریفانہ فطرت نے زور مارا تو طنز و مزاح نگاری شروع کردی اور آج ان کی طنزیہ تخلیق ایک سرگذشت کی صورت میں حاضر ہے۔

"دو بیل سیاسی شکنجے میں" ہندوستانی سیاست پر کراری چوٹ ہے۔ پریم چند کے دو بیل کو لے کر سیاست میں کتنی گندگی ہے اُنہوں نے عریاں کر دکھلایا ہے۔ ایک بار جب جھوری سیاسی نیتاؤں کو اپنے بیل ہیرا اور موتی دینے سے انکار کرتا ہے تو نیتا کس طرح دھمکی دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"ہم نیتا لوگ ہیں ہمارا وعدہ کچا ضرور رہے لیکن ارادہ ہمیشہ پکا رہتا ہے۔ کل یہ دونوں بیل تمہارے یہاں نہیں رہیں گے۔"

اب جھوری اور اس کی بیوی ڈر جاتے ہیں کہ نیتا لوگ کہیں غنڈوں کے ذریعے ہمیں چروا نہ لیں۔ اور اسی ڈر سے بیل دینے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ اس سے نیتاؤں کی غنڈہ گردی کی صفت ظاہر ہوتی ہے۔

سیاست میں چھینا جھپٹی کے سلسلے میں نعمان ہاشمی لکھتے ہیں جب کہ ایک بزرگ نیتا جھوری کو لائف بوائے صابن کی ٹکیہ دیتا ہے۔ وہ بیلوں کو خوب اچھی طرح نہلا کر جلسہ میں لائے تاکہ وہ دیکھنے میں بھی خوبصورت لگے۔ تو ایک نوجوان جھوری کے ہاتھ سے یہ کہتا ہوا صابن چھین لیتا ہے کہ "کیا خود تمہیں لائف بوائے سے نہانا نصیب ہوا ہے؟" اور جھوری ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ نعمان ہاشمی لکھتے ہیں۔

"سیاست اسی چھینا جھپٹی کا دوسرا نام ہے۔ ابھی وہ نوجوان ٹریننگ پا رہا ہے۔ اس لئے صابن قلم اور گھڑی پر ہی اکتفا کرتا ہے جب وہ دوسرے نیتاؤں کے لئے چناؤ میں بیلٹ پیپر چھینتا ہے۔ بڑا ہو کر مضبوط جاتا ہے۔ کچھ اور بڑا ہونے پر عوام سے ووٹ چھینے گا، پھر کرسی چھینے گا۔"

اہل سیاست کو اخلاقیات سے کوئی واسطہ نہیں وہ صرف اپنا اُلّو سیدھا کرنا جانتے ہیں۔ نعمان ہاشمی لکھتے ہیں۔

"سیاست کا اخلاقیات سے کوئی واسطہ نہیں دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ سیاست کا پہلا اُصول ہے موقعے سے فائدہ اٹھانا۔"

انسانوں میں مذہبی تعصب اور خدا کی نافرمانی کا چلن عام ہے اس کے متعلق نعمان ہاشمی بزبان موتی بیل انسانوں پر طنز کرتے ہیں

"ہم جانوروں کو خدا نے مذہب کے بندھن سے آزاد کر رکھا ہے ہم جانور کہے جاتے ہیں لیکن ہم ازل سے ہی اس قدر خدا کے حکم کے پابند رہے ہیں کہ کبھی خدا نے ہمارے لئے کسی پیغمبر کو بھیجنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ جبکہ انسانوں کے لئے ہر دور میں کوئی نہ کوئی پیغمبر آتے رہے۔"

میں نے پہلے ہی ذکر کیا ہے کہ پیشے کے اعتبار سے میرا کام ٹور پر رہنا ہے۔ اس لئے نعمان ہاشمی سے اکثر اسٹیشن پر یا ٹرین میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کی جلد سازی کے زمانے میں بھی ان سے جلد ساز کے یہاں ملاقات ہو گئی تھی۔ میں نے سرورق پر بیل کی صرف ایک تصویر دیکھ کر پوچھا "برادرم اس میں صرف ایک بیل ہے جبکہ آپ نے دو بیل لکھا ہے۔"

اُنہوں نے فرمایا۔ "بھائی میرے دونوں بیل کی تصویر موجود ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک سرورق پر ہے دوسری پُشت پر۔"

میں نے کتاب پلٹ کر دیکھی تو دوسری جانب پُشت پر نعمان ہاشمی کی تصویر تھی۔ شاید نعمان ہاشمی کا ارادہ ہے کہ بیل بن کر ادب کے میدان میں خوب ہل چلائیں۔ مجھے اس کا یقین بھی ہے کیونکہ اس کتاب کے آخر میں ان کی دوسری کتاب کا اعلان ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو خدا کرے کہ وہ ادب کے میدان میں خوب ہل چلائیں اور خوب فصل اُگائیں۔

■ ■



کمزور طبقات کیلئے دستِ تعاون



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے بیس نکاتی معاشی پروگرام کی عمل آوری میں آندھرا پردیش پیش پیش ہے۔ اس پروگرام کے جُز کے طور پر حالیہ برسوں میں کمزور طبقات کے لئے کئی فلاحی اسکیمات روبعمل لائی گئی ہیں۔

فلاحی اقدامات کے سلسلے میں کئے گئے کچھ نمایاں واہم کارنامے یہ ہیں۔

فاضل زمینات کی تقسیم

۷۴۰۶۲ درج فہرست اقوام میں ۱،۰۵ لاکھ ایکڑ

۲۴۳۷۱ درج فہرست قبائل میں ۳۹،۹ ہزار ایکڑ

۴۰۸۷۱ پسماندہ طبقات میں ۵۸،۷ ہزار ایکڑ

سرکاری زمینات کی تقسیم

- ۴۶۳۶۷۲ کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں ۱۱،۸ لاکھ ایکڑ زمین تقسیم کی گئی
- کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے ۱۲ لاکھ افراد میں مکانات کے لئے بھی اراضی کی تقسیم عمل میں لائی گئی

۱۰،۱۲ مکفول مزدوروں کو آزاد کرایا گیا جن میں سے ۵۸۰۰ مزدوروں کی بازآباد کاری عمل میں لائی گئی۔

- کھیت مزدوروں کے لئے اقل ترین اُجرتوں پر عمل آوری کرائی گئی ہے۔ اور ایسے مزدوروں کا تعلق کمزور طبقات سے ہے۔
- سرکاری ملازمتوں میں پسماندہ طبقات کے لئے تحفظات کی معیاد کو مزید دس سال کی توسیع دی گئی۔

(سلسلہ صفحہ ۵۸ پر)

▪ بین فرقہ جاتی شادیوں کے لئے ترغیبات دی جارہی ہیں۔

R. No. 15822/68 Postal Regd. No. H.HD-8
SHUGOOFA
Vol. 14 Copy 10 31 Bachelor Quarters, M. J. Market Hyderabad-1 Oct. 1981 Phone: 57716



. 2-50

NOVEMBER 198

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

جلد ــــ ۱۴

شمارہ ــــ ۱۱

نومبر ۱۹۸۱ء

ایڈیٹر :

سید مصطفیٰ کمال

سرورق : غیاث قریشی

سالانہ (۲۵) روپے

بیرونِ ہند سے (۴۵) شلنگ

فی پرچہ (۲) روپیہ (۵۰) پیسے

طباعت :
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان۔ حیدرآباد ۔ ۲

خط وکتابت کا پتہ :۔ شگوفہ، ۳۱ مجرد گاہ ۔ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۰۱ ۔ فون 57718

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

ڈسٹری بیوٹرس برائے :-

۱۔ موہن میکن بریوریز
۲۔ انڈین ایسیٹ کمپنی لمیٹڈ
۳۔ پیری سوئٹس اینڈ ٹافیس
۴۔ اجنٹ ڈیری، آگرہ
۵۔ کیکو کیننگ انڈسٹریز ٹریچور
۶۔ ڈرک بھ ٹان فوڈ پراڈکٹس
۷۔ ہارکو۔ سری نگر
۸۔ میڈونا کیننگ کمپنی
۹۔ چمپئین وہائٹ روٹس
۱۰۔ سل SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ



سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچنے اور اصلی کشمیری قوام
خریدنے کے لئے اس کے ڈبے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے۔

--- تیار کنندگان :---

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس ۔ گلزار حوض۔ حیدرآباد ۲۰۰۰۰۵

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

کرنل محمد خان

ریٹائرمنٹ کا ذائقہ

جانشینِ من - آپ نے پوچھا ہے، ریٹائرمنٹ کا ذائقہ کیسا ہے؟ ذائقہ کچھ کھٹ مٹھا سا ہے۔ مٹھاس میں تو کچھ شک نہیں لیکن کھٹاس سے بھی انکار مشکل ہے۔

پہلے کھٹاس کی سنیئے۔ ریٹائرمنٹ کا پہلا جھٹکا ہمیں اس وقت لگا جب پتہ چلا کہ الہ دین کا چراغ کھو گیا ہے۔ آپ شاید نہ سمجھے ہوں۔ اگر آپ اسی میز پر بیٹھتے ہیں جس پر میں بیٹھا کرتا تھا تو چراغ اس میز کے دائیں کونے میں پائیں گے۔ اس چراغ سے کام لینے کیلئے اسے رگڑنے کی ضرورت نہ تھی۔ فقط اس پر انگلی رکھنے سے ہی جن نمودار ہوتا تھا۔ بلکہ ایک نہیں تین چار جن! میرے وقت میں سب سے بڑے جن کا نام گلاب[1] خان تھا ——— گلاب خاں بھی کیا حاجت روا جن تھا۔ حرفِ سوال لب تک آیا نہیں اور اس جن نے مُراد پوری کردی۔ میں نے کبھی اسے کوہ قاف کی پریوں کی شہزادی لانے کو نہ کہا، ورنہ بالیقین، یہ اُسے بھی ورغلا لاتا۔ یہ تجربہ اب آپ کریں بہر حال گلاب خان، بجائے خود ایک مضمون ہے اور اس موضوع پر پھر کبھی ——— کہنا یہ ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد الہ دین کے چراغ کی، جسے کوتاہ اندیش افسر گھنٹی کا بٹن کہتے ہیں، دلخراش کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ گھنٹی اور اس کا بٹن تو خیر، بازار سے دو چار پیسے میں خرید کر گھر کی میز پر بھی لگایا جا سکتا ہے اور اپنی تسلی کے لئے اس پر افسرانہ انگلی بھی رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن اس عمل کے بعد کسی جن کے نمودار ہونے کا امکان نہیں۔ شاید بیوی نمودار ہو کر ایک ہراس انگیز لہجے میں کان میں سرگوشی کرے گی۔ "گھنٹی ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے باہر پھر چندہ لینے آئے ہیں۔" اور چندہ لینے والوں کے آگے جن بھی بے اثر ہوتے ہیں۔

ایک اور حسرت! اب ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد جی[2] او[3] اور جی تھری دروازے پر مؤدبانہ دستک کے بعد، شن[4] کرکے عرض مدعا

---

[1] ایگزیکٹو ڈائریکٹریٹ کا اٹک چپراسی [2] جی-2 اور جی-3 مخفف ہیں گریڈ دوم اور گریڈ سوم افسر کے، جو بالعموم میجر اور کپتان ہوتے ہیں۔ [3] جی-1 لیفٹننٹ کرنل ہوتا ہے۔ [4] شن مخفف ہے انگریزی لفظ ATTENTION کا جس کے حکم پر فوجی دونوں ایڑیاں جوڑ کر سیدھے اکڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کرنے نہیں آتے ۔ اور عرض بھی ایسی کہ جس میں لاکھ سر[1] کے بعد ایک حرفِ مدعا ہوتا تھا ۔ ریٹائرمنٹ کے دوسرے دن تو ان لوگوں کا بڑا انتظار کیا لیکن آخر غیب سے ندا آئی کہ "اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا ۔" اور کوئی نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری روح فاقے کرنے لگی، کیونکہ ایک تازہ ریٹائرڈ افسر کی روحانی غذا بھی شن اور سیلوٹ ہی ہیں ۔شن اور سیلوٹ سے اچانک محرومی ایسی ہی ہے جیسے کسی معصوم کا یک لخت دودھ چھڑا دیا جائے آپ ذرا کسی متاثرہ معصوم سے انٹرویو کرکے دیکھ لیں۔ بہرحال اب ہماری افسری کا دودھ چھڑایا جا چکا ہے ۔ ہم تو اب یہ منظر بھی بے آہ کئے برداشت کر لیتے ہیں کہ ایک ایک پھول والے نرم لفٹین بھی پاس سے گزرتے وقت ہمیں سویلین سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ جیسے ہم خط مستقیم ہی نہیں، بلکہ ۳۰۳[2] سے ایک ہیں ۔ پھر چلتے چلتے ہمیں سنا سنا کر کچی سی انگریزی میں ہونٹ گپ بھی مارتے ہیں، وہی گپ جو سالہا سال ہم بچی انگریزی میں مار چکے ہیں اور اب بھی چاہیں تو ان لونڈوں کو دو چار سبق پڑھا دیں، مگر ان تمام رموزِ افسری کو سینے میں چھپائے خاموش رہ جاتے ہیں ۔

شن اور سیلوٹ کا کیا ذکر، اب تو سر، سر کی آواز بھی کم سنائی دیتی ہے ۔ آپ نے کبھی غور فرمایا کہ ایک اوسط درجے کا افسر دن میں کتنی مرتبہ سر کرتا ہے ۔ اگر آپ کو اندازہ نہیں تو میں آپ کو بتاتا ہوں ۔ کیسٹو[3] کے ایک معتبر افسر نے خفیہ ریسرچ کے بعد دریافت کیا ہے کہ ایک لفٹین دن میں چار سو بیس مرتبہ سر سر کرتا ہے ۔ ایک کپتان تین سو دس مرتبہ، ایک میجر دو سو پانچ مرتبہ اور قس علیٰ ہذا ۔ آپ ان اعداد کو متعلقہ افسروں کی تعداد سے ضرب دیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ فوج مسلسل سرسراہٹ کے عالم میں ہے ۔ البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ اسی سرسراہٹ پر فوج کی زندگی اور ضبط کا دارومدار ہے ۔ ریسرچ کی رو سے اعلیٰ افسر بھی سرسراتے ہیں، مگر کم اور جیسا کہ مناسب ہے ۔ سر کی آواز سے ان کی زبان سے زیادہ کان مانوس ہوتے ہیں ۔ ڈی ۔ اے[4] ۔ ای بھی ان برگزیدہ افسروں کی نچلی کڑی میں آتا ہے اور اس کی انا کی بھی سرسری تسکین ہو جاتی ہے، مگر افسوس کہ ایک ریٹائرڈ ڈی ۔ اے ۔ ای کو بے تسکین ہی گزارا کرنا پڑتا ہے ۔

اس دفعہ ریٹائرمنٹ کے بعد پہلی عید آئی تو ایک نئی کھٹاس کا تجربہ ہوا ۔ یعنی باہر سے آنے والے عید کارڈوں کی تعداد یک لخت گر کر آدھی رہ گئی ۔ مجھے یقین ہے کہ اس عید پر، جو آپ کی ڈائریکٹری کی پہلی عید ہے ۔ آپ کے عید کارڈوں میں اتنا ہی اضافہ ہو گیا ہوگا ۔ برادرِ عزیز، یہ دراصل میرا ہی مال ہے ۔ اگر آپ مجھ سے عید کے بعد چارج لیتے تو یہ نامے بھی میرے نام ہی آتے ۔ بہرحال اب خدا آپ کی عمر اور ملازمت دراز کرے ۔ آپ چھ سات عیدیں تو مزے کریں، لیکن اس دن کے لئے تیار رہیں جب ان عید کارڈوں کا بحرِ بیکراں ایک جوہڑ سے کم آب میں بدل جائے گا ۔ ایک دانشور کا قول ہے کہ ان عید کارڈوں کو دوام نہیں جن کے بھیجنے والے آپ کی محبت سے زیادہ اے ۔ سی[5] ۔ آر کی محبت میں گرفتار ہوتے ہیں ۔ یہ قول تو شائد غلط نہیں، لیکن اس کا اطلاق کرنل سردار[6] خان، کرنل این ۔ ڈی ۔ احمد اور کیپٹن انور خان

---

۱ : SIR سینئر افسروں سے بات کرتے ہوئے اکثر استعمال کیا جاتا ہے ۔

۲ : ان افسروں کی تعداد جو جنرل یحییٰ کے مارشل لا کے بعد نکالے گئے ۔

۳ : فوج کا وہ محکمہ جو مختلف قسم کے اعداد و شمار کا ریکارڈ رکھتا ہے ۔ ۴ : ڈائریکٹر آف آرمی ایجوکیشن

۵ : A . C . R یعنی سالانہ خفیہ رپورٹ جو ہر افسر پر لکھی جاتی ہے ۔

۶ : مصنف کے چند رفقائے کار اور آرمی ایجوکیشن کور کے ممتاز افسر ۔

پر نہیں ہوتا۔ ہر چند کہ اگلے وقتوں کے ہیں، ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔

فوج سے فارغ ہونے کے بعد دل میں ایک پوشیدہ سی خوشی تھی کہ اب فائلوں، نوٹوں اور پی۔یو۔سی[1] وغیرہ سے نجات مل گئی۔ اور اب مل بھی گئی ہے، لیکن ایک لفظ عرصے تک میرا پیچھا کرتا رہا۔ یہی ہمارا پرانا دوست (IMMEDIATE[2])۔ ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد میں جب یہ لیبل کہیں دیکھ لیتا، بدک سا جاتا اور کافی دیر بدکا رہتا۔ حتیٰ کہ یاد آتا، ریٹائر ہو گیا ہوں۔ اب وقت گذرنے کے ساتھ سنبھل گیا ہوں۔ آج کل ایمی ایٹ کا لفظ سامنے آجائے تو گہرا سانس لے کر اُسے مناسب حقارت سے دیکھتا ہوں اور دل کو سمجھاتا ہوں کہ اختلاج کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ اب اِس لفظ میں ڈنک باقی نہیں۔ اگر دل میں خفیف سا مرمر بھی پیدا ہو تو اُسے طعنہ دیتا ہوں کہ تو کوئی جی ون یا ڈی اے ای کا دل ہے جو اتنی سی بات پر دھڑک اُٹھا۔ اِن طعنوں کا دل پر خاطر خواہ اثر ہوا ہے۔ چنانچہ اگلے روز ہمارا سامنا MOST IMMEDIATE[3] سے ہو گیا۔ آنکھ پھر ذرا جھپکی لیکن دل؟ ہمارا دل اسی مستانہ رفتار سے چلتا رہا!

بے قراری تھی سب اُمیدِ ملاقات کے ساتھ　　اب وہ پہلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

بھئی ریٹائرمنٹ کا ایک نہایت ہی وحشتناک پہلو ہے جس سے آج چھ ماہ بعد بھی مفر نہیں۔ آپ سب گواہ ہیں کہ ہم فقط ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ زندگی سے ہی ریٹائر نہیں ہو گئے لیکن لوگ ہیں کہ تعزیت کو چلے آرہے ہیں اور بڑے رقت خیز مکالمے کرتے ہیں۔ آہ بھر کر ابتدا اِسے کلام کرتے ہیں۔

"خدا کی مرضی۔"

میں صبر و رضا کی تصویر بن کر جواب دیتا ہوں۔

"خدا کے علاوہ اسے۔ آئی۔ بی[4] کی مرضی بھی تھی۔ ویسے صورتِ احوال یہ ہے کہ زندہ ہوں۔"

"کیا ممکن نہ تھا کہ آپ کو توسیع مل جاتی؟"

"پھر بھی ایک دن تو کوچ کرنا تھا۔"

"ٹھیک ہے، مگر ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے؟"

"عمر؟ یہی برس پندرہ یا کہ سولہ کا سِن!" —— کچھ نہیں سمجھتے۔

"اور سردار خان[5] کو تین سال کی مل گئی تھی۔"

"جی ہاں۔ وہ بھی آخر تمام ہو گئی۔"

"پیچ ہے ثبات فقط اللہ کی ذات کو ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۔"

---

[1]: P.U.C پیپر انڈر کنسیڈریشن　[2]: فوری توجہ کا مستحق　[3]: اشد فوری

[4]: A.I.B آرمی انسٹرکشن، جس میں ملازمت اور سبکدوشی کے قواعد و ضوابط لکھے ہوتے ہیں۔

[5]: کرنل سردار خان، سابق کمانڈنٹ ملٹری کالج جہلم

یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس آخری آیۂ کریمہ کا روئے سخن میری طرف ہے یا سردار خان کی طرف، جو دونوں صورتوں میں ہرچند کہ برحق ہے، ذرا قبل از وقت ہے۔ بہرحال تعزیت ختم ہوتی ہے اور وہ بزرگ اس کام کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کے لئے تشریف لائے تھے یعنی نئے ڈائریکٹر کو سفارش کردیں کہ سارے قاعدے توڑ کر ہمارا نورِ چشم لڑکی کالج میں داخل کرے اور کالج کا چراغ گُل کردے۔ ریٹائرمنٹ اب پُرانی ہونے کو ہے مگر سوچتا ہوں کہ کب تک یہ مہربان بر سرِ مطلب آنے سے پہلے تعزیتی تمہیدیں باندھتے رہیں گے کھٹاس کے چند اور پہلو بھی ہیں لیکن اب اِس قصّے کو مختصر کرتا ہوں کہ ریٹائرمنٹ کے میٹھے پہلو کہیں زیادہ قابلِ ذکر ہیں اور بخدا ایک پہلو تو شہد کی طرح شیریں ہے اور وہ ہے صبح کا جاگنا؛ یعنی سوئے رہنا؛ بلکہ جاگ کر سو جانا! غالبؔ کا خیال تھا کہ نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اُس کی ہیں۔ تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں۔ نئی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ غالبؔ کو مغالطہ ہوا تھا۔ ورنہ نیند، دماغ اور راتیں اس شخص کی ہیں جو تازہ تازہ ریٹائر ہُوا ہو۔

——آپ نے غور کیا کہ کم و بیش پچیس برس سے آپ اور مَیں ایک ایسے وقت جاگ رہے ہیں جب پرند، چرند اور حجلۂ تہجّد گزار بھی سو رہے ہوتے ہیں۔ اور یہ جاگنا خوفِ خدا یا شوقِ نماز کے لئے نہیں بلکہ پریڈ سے لیٹ ہونے کے خوف سے۔ آپ اور میں تو شاید ایسے اسیرِ زُلف نہیں لیکن وہ جن کے بازوؤں پر پیچ پیچ زلفیں پریشاں ہوتی ہیں انہیں بھی صبح چار بجے کے بعد یہ جاں بخش زلفیں ڈسنے لگتی ہیں۔ اِدھر گھڑی نے الارم بجایا اور اُدھر یہ زلفوں کا جال توڑ کر بھاگے۔ اور وہ نیک بخت دل پر ہاتھ رکھ کر یہ کہتی رہ گئی کہ:

وہ چلے جھٹک کے دامن میرے دستِ ناتواں سے

لیکن غریب دامن نہ جھٹکے تو خواہ مخواہ ریپرامانڈ[1] لے لے۔ لیکن دوست، آ تجھ کو بتاؤں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد دامن جھٹکنے کی ضرورت ہے نہ زلفیں سمیٹنے کی۔ بلکہ کوئی دامن گیر میسّر ہو تو اسے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر، اور پھر اس کے بعد اتنا وافر وقت ہوتا ہے کہ نہایت تسلّی سے اپنے قلب و نظر اور ہوش و خرد کھونے کی برملا پیشکش کر رہے ہیں۔ اگر آپ ایسا کریں تو دوسرے دن کرنل شعیب[2] کے پاس بھیج دیئے جائیں —— اب وقت کا دیو ہم پر مسلط نہیں، بلکہ ہم اس پر سوار ہیں۔ گھڑی پہنتے ہیں لیکن اس سے مشورہ نہیں کرتے۔ اگلے روز ایک بدتمیز نے ہم سے ایک عجیب سا سوال کیا۔ بولا: "جناب۔ آج کل جی ایچ کیو کے بجے کھلتا ہے؟"۔ ہم نے کہا: "او خدا کے بندے۔ کوئی ہوش کی بات کر۔ اگر ہم اب بھی جی ایچ کیو کھلنے کا وقت یاد رکھیں تو ہمارے ریٹائر ہونے کا کیا فائدہ؟ کل تم ہم سے پوچھنے آؤگے کہ جی ایچ کیو کا رستہ کون سا ہے؟"

اور ہاں، اب ہمارے دل سے ڈاکٹر کا خوف نکل گیا ہے حتّیٰ کہ دماغی ڈاکٹر کے سامنے جانے سے بھی ہمیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہے گا نا کہ دیوانہ ہے۔ تو دیوانہ سہی۔ کیٹیگری[3] ہی گرے گی نا۔ تو ٹھیک ہے، فرش پر ہی پڑے رہے گی۔ باقی

---

[1] : REPRIMAND ایک سزا جو افسروں کو دی جاتی ہے۔

[2] : کرنل شعیب فوج کے مشہور دماغی ڈاکٹر ہیں۔

[3] : CATEGORY ہر افسر اپنی صحت کے لحاظ سے میڈیکل کیٹیگری A یا B یا C وغیرہ میں ہوتا ہے۔ سب سے پست کیٹیگری D ہے اور ایسا افسر بیکار رہتا ہے اور گھر بھیج دیا جاتا ہے۔

رہے بخیر دماغی ڈاکٹر تو وہ تو بالکل بے ضرر نظر آتے ہیں۔ آپ لوگ انہیں اپنی نبض دکھاتے ہوئے بھی کا نپتے رہتے ہیں اور اے۔ سی۔[1] آر کے موسم میں تو آپ کی نبض ڈاکٹر کو دیکھ کر ہی ڈوبنے لگتی ہے۔ لیکن ہم بے لحاظ موسم دھڑلے سے پوری آستین کھول کر بازو پیش کر دیتے ہیں کہ لو کالی پٹی باندھ کر ہمارے دل کا حساب لے لو۔ بنیان اتار کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ لو' ٹوٹی لگا کر ہمارے سینے کے راز پالو اور ہمیشہ جواب ملتا ہے کہ تمہارے اندر ہیروں اور موتیوں کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے منہ سے ڈاکٹر کے حق میں دُعا نکلتی ہے کہ جیتے رہو۔ آپ ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ کبھی کسی ڈاکٹر کو دُعا دی ہے ؟ یا ریٹائرمنٹ سے پہلے کسی کو دُعا دینے کا ارادہ ہے؟ اگر آپ کا جواب نفی میں ہے تو آپ سچ بول رہے ہیں۔

ایک اور ظلم جو مجھ پر ہوتا تھا ——— اور اب آپ پر ہو رہا ہوگا ——— بندہ اس سے آزاد ہو گیا ہے۔ میری مُراد دوپہر کی چائے سے ہے جو جی ون کے کمرے میں پائنتی میں بیٹھ کر پی جاتی تھی' اور غالباً آج کل بھی وہیں پی جاتی ہے۔ جُملہ چائے نوش جمع ہوتے تھے اور زبیری[2] صاحب دستِ خاص سے ایک گرما گرم پیالی تیار کرکے میرِ مجلس یعنی ہمیں پیش کرتے تھے اور ہم اسے ایک مستی کے عالم میں پی جانے کی نیت سے اُٹھاتے ہی تھے کہ ڈائریکٹر کے کمرے میں سفید[3] ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی تھی۔ اس خیال سے کہ ایک لمحے کی تاخیر سے ٹیلی فون کے دوسرے سرے پر مزاجِ یار برہم نہ ہو جائے۔ ہاتھ میں پھڑ پھڑاتی پیالی لئے' کرسیوں پر سے کودتے' کواڑوں سے ٹکراتے' ٹیلی فون پر جا گرتے تھے لیکن اسی اثناء میں ہمارے کرم فرما سچ مچ زحمتِ انتظار سے نڈھال ہو کر دستِ ناز سے ریسیور رکھ چکے ہوتے تھے اور ہماری لبیک کی صدا مائیکروفون کے حلق سے ٹکرا کر ہمارے اپنے کمرے میں پریشاں ہوتی رہتی تھی۔ بلکہ کئی دفعہ تو لبیک کی نوبت ہی نہ آسکی۔ ٹیلی فون تک پہنچتے پہنچتے کبھی پیالی کے اور کبھی خاکسار ڈائریکٹر کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ مگر اب' ریٹائرمنٹ کے بعد یہ حادثے یکسر بند ہو گئے ہیں۔ اب چائے کے دوران گھنٹی بجے تو افراتفری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں لگتا ہے جیسے ٹیلی فون نے از خود ہی جواب دے دیا ہو کہ صاحب چائے پی رہے ہیں۔ ذرا ٹھہر کر رنگ کیجئے گا۔

اوپر کہیں اس کے ضمن میں عرض کیا تھا کہ الہٰ دین کا چراغ کھو گیا ہے اور یہ کہ ریٹائرمنٹ کے پہلے ایام میں اس چراغ کے کھو جانے سے بہت رنج ہوا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ رنج بے جا تھا کہ قدرت نے اس کی بڑی مثبت تلافی کر دی ہے۔ یعنی بے شک اب ہماری گھنٹی پر ہمارے سامنے کوئی جن نمودار نہیں ہوتا لیکن اب ہمیں بھی بیرونی گھنٹی پر کسی کے سامنے جن بن کر نمودار ہونا نہیں پڑتا۔ اب فون اُٹھانے سے پہلے یہ وسوسے نہیں ہوتے کہ یہ گھنٹی کسی بڑے الہٰ دین کی ہے یا درمیانے کی۔ اور نہ خوف طاری ہوتا ہے کہ خدا جانے کون سی مہم سر کرنے کے لئے طلب کیا جا رہا ہے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے بعض اوقات ہمیں بڑی کٹھن مہمیں سر کرنی پڑتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ دو گھنٹے کے اندر ثبوت

---

[1] ہر سال خفیہ رپورٹ میں ڈاکٹر افسر کا طبی معائنہ کرکے اس کی گریڈنگ کا تعین کرتا ہے۔

[2] مصنف کی ڈائریکٹری کے زمانے میں سویلین افسر تھے۔ انیس مرتضیٰ زبیری اپنی شرافت اور قابلیت کی وجہ سے جی ایچ کیو کی جانی پہچانی شخصیت تھے اور ہیں۔

[3] وہ ٹیلی فون جس پر پرنسپل صاحب سے بات چیت ہوتی تھی۔

اُوکہ نوج کو تعلیم کی واقعی ضرورت ہے ! کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ؟

اب اس بات کی بھی تشویش نہیں کہ آج ہمارے "باس" کے جگر میں فتور ہے یا نہیں۔ یا صبح دفتر میں آنے سے پہلے ان کی بیگم کا مزاج معتدل تھا یا متلاطم کہ اُن دنوں ان حادثات کا ہماری قسمت پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ اب ہمیں اپنے باس کی نسبت اپنے جگر اور اپنی بیگم کے مزاج کا زیادہ پاس ہے اور بفضلِ خدا دونوں خیریت سے ہیں۔

سوچا نشینِ من۔ مژدہ ہو کہ مجموعی طور پر ریٹائر منٹ میں شیرینی ہی شیرینی ہے۔ تُرشی کی مقدار بس اسی قدر ہے جتنا طعام میں نمک۔ یعنی اس ترشی سے شیرینی کا شیرہ اور گاڑھا ہو گیا ہے لیکن اس شیرینی سے لطف اندوز ہونے کی ایک شرط ہے۔ اور وہ یہ کہ ریٹائر ہونے سے کچھ روز پہلے لنڈی کوتل جائیں اور دو ایک اعلیٰ ولایتی سوٹ، سویٹر، ٹائیاں اور موزے لے آئیں۔ باٹا سے کچھ تابدار جوتوں کے جوڑے خریدیں۔ ولایت میں کوئی ورک ہو تو کرسٹی کی فیلٹ ہیٹ اور وان ہیوسن کی قمیصیں منگوائیں اور ریٹائر منٹ کے دوسرے دن گھر سے باہر نکلیں تو دولہا بن کر نکلیں یعنی آپ کی ہمسائی دیکھے تو اپنے میاں کے بال نوچ لے۔ مقصد ہمسائی کا گھر برباد کرنا نہیں بلکہ اپنی ریٹائر منٹ کو آباد کرنا ہے۔ ہمسائی کو تو محض لٹمس پیپر کی طرح ٹسٹ کے طور پر استعمال میں لانا ہے۔ وہ میاں بیوی تو زود یا بدیر صلح کر ہی لیں گے۔ اگر آپ دولہا بن گئے تو آپ خوش ہوں گے۔ آپ کا خدا خوش ہوگا اور خلقِ خدا خوش ہوگی۔ لیکن اگر آپ خدانخواستہ پھیچڑ نکلے تو نہ ہمسائی بخشے گی اور نہ خدا۔ اور طعنہ دیں گے بُت کہ کرنل کا خدا کوئی نہیں۔ اور معلوم ہے یہ بُت کس انداز سے طعنہ دیتے ہیں ؟ یہ کہتے ہیں کہ اگر بس اسٹاپ پر کوئی شخص میلی ٹوپی، چکیلی ٹائی، ان دُھلی قمیص اور بے استری سُوٹ پہنے، دو دن کی شیو بڑھائے، بس کے انتظار میں کھڑا مانگ کر اخبار پڑھ رہا ہو تو ضرور کوئی ریٹائرڈ کرنل ہوگا۔ دیکھا ہماری نصیحت نہ ماننے کا نتیجہ ! ریٹائر شدہ کرنلی بڑی چیز ہے لیکن الباس کی محتاج ہے۔ جس نے یہ نکتہ نہ پایا وہ بس اسٹیشن پر پہنچ جائے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مجسٹریٹ صاحب سبزی منڈی میں پہنچ گئے تھے۔ ہُوا یہ کہ مجسٹریٹ صاحب نے کرسیِ عدالت پر بیٹھے ایک سبزی فروش سے کہا کہ گواہ پیش کرو کہ ملزم تمہاری دکان سے مولیاں لے بھاگا۔ بولا۔ "حضور، اس عدالت میں سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے کہ وقوعہ کے وقت عدالت خود ساتھ کی دکان سے گاجریں خرید رہی تھی۔"

سبق اس کہانی سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ عدالت بے شک گاجریں خریدتی رہے مگر کرنلی سے مت گاجریں خریدوائے۔

ناچیز حیدرآبادی

سی آئی اے

پوچھے ہم سے کہ ہیں کون جو سی آئی اے کے
ہم رہ و ہم قدم و ہم نفس و ہمدم ہیں

اُن میں لیڈر بھی، ایڈیٹر بھی ہیں دانشور بھی
لاکھ وہ کہتے رہیں "ہم تو نہیں" تاہم ہیں

بَیر ہے اُن کو اُبھرتی ہوئی تہذیبوں سے
دشمنِ عافیت دامن ہیں، ایٹم بم ہیں

غاصبِ دولتِ بیدار چمن ہیں تو یہی
یہی غارت گرِ ناموسِ گل و شبنم ہیں

حکمت و فلسفہ و شعر و ادب کے حق میں
ایک آشوبِ مسلسل، خطرِ پیہم ہیں

ان کو آتا ہے مزا تفرقہ اندازی میں
سچ تو یہ ہے کہ، یہ ابلیس صفت آدم ہیں

ناخدا ان کا ہے ڈالر تو خدا بھی ڈالر
موجبِ خواری و رسوائی دوعالم ہیں

چند سکّوں کے عوض بیچتے پھرتے ہیں ضمیر
اس پہ نادم بھی نہیں بلکہ خوش و خرّم ہیں

نکہتِ گُل سے خفا، موجِ صبا سے ناراض
اک فقط اپنے سوا سب سے سدا برہم ہیں

رات دن عیش و طرب سے ہے سروکار انہیں
غرقِ امواجِ مئے سرخوشیٔ پیہم ہیں

اور اس بات کی تو سب کو خبر ہے ناچیز
کس کے بل بوتے پہ یہ ٹھاٹ ہیں یہ دم خم ہیں

کیریکٹر

عتیق شفائی

اس سے بچھڑے ہوئے گو ایک زمانہ بیتا
لیکن اس بات سے تکلیف مجھے ہوتی ہے
کر گئی جس کے لئے ترکِ تعلق مجھ سے
پالیا اس کو تو اب میرے لئے روتی ہے

ڈاکٹر وزیر آغا

بارہواں کھلاڑی

کل ٹیلی ویژن پر کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے میرے ایک دوست نے اپنی آنکھوں میں ایک شریر چمک اور ہونٹوں پر ایک مکروہ سی پان زدہ مسکراہٹ سجائے ہوئے دفعتاً مجھ سے سوال کیا۔ "آغاجی! اگر آپ کو قومی کرکٹ ٹیم میں شامل ہونے کی دعوت ملے تو کیا آپ اسے قبول کرلیں گے؟" — میں نے فوری طور پر اس غلیظ سوال کا جواب دینے کے بجائے پہلے ایک اچٹتی سی نگاہ اپنے ہاتھوں پر ڈالی جن پر وقت اپنی لکیریں چھوڑ کر جا چکا ہے۔ جیسے سمندر پیچھے کو ہٹ جائے تو اس کے ریتیلے ماتھے پر برہم سی سلوٹیں باقی رہ جاتی ہیں۔ پھر میں نے ایک لمبی سانس لی اور چاہا کہ سانس چند لمحے میرے سینے میں مہمان رہے لیکن اس نے اندر جاتے ہی جانے کس موہنجو دڑو کے آثار دیکھ لیے کہ پل بھر بھی نہ رکی اور فوراً نتھنوں کے راستے باہر آگئی۔ تب میں نے اپنے دوست کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ایک شرط پر۔"

"وہ کیا؟" — دوست نے حیران ہوکر پوچھا۔

"وہ یہ" میں نے ڈراما پیدا کرنے کے لئے قدرے توقف کیا اور پھر زور دے کر کہا۔ "وہ یہ کہ مجھے بارہویں کھلاڑی کا منصب جلیل عطا کیا جائے۔ بصورت دیگر میں قومی مفاد کی پرواہ کیے بغیر ٹیم میں شامل ہونے کی دعوت کو مسترد کر دوں گا؟"

میرا یہ جواب سن کر میرے دوست کی آنکھوں سے شرارت کی رمق اور ہونٹوں سے تبسم کی نمی آنِ واحد میں رخصت ہوگئی۔ غالباً وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس شخص کو بارہویں کھلاڑی کی حیثیت میں بھی شامل کیا گیا تو ٹیم کو یقینی شکست سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ مگر دوسری طرف میں مطمئن تھا کہ میں نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جس میں ان گنت انسانی نسلوں کا تجربہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا مگر جس تک میرے دوست کے گنبد نما سر کی رسائی قیامت تک بھی ممکن نہیں تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اس بھلے آدمی کو تو یہ تک معلوم نہیں کہ ٹیم کے گیارہ کے گیارہ کھلاڑی دراصل "مشتق" ہیں جو بارہویں کھلاڑی کی تفریح طبع کے لئے میدان میں اترتے ہیں۔ وہ بیچارے میدان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑتے ہیں اور دوڑ دوڑ کر نڈھال ہو جاتے ہیں — محض اس لئے کہ وہ کوڑی کے اس بدنما گیند کو دبوچ سکیں جسے مخالف ٹیم کے کسی بددماغ بلّا باز نے ہوا میں اچھال دیا تھا یا پورا ایک فرلانگ سرپٹ دوڑنے کے بعد گیند کو اس طرح پھینکیں کہ لکڑی کی تین بدوضع کھلیوں میں سے کم از کم ایک اس کی زد میں ضرور آجائے یا بلّے کی مدد سے گیند کو خلق خدا کے سروں کے

اُوپر سے گذارنے کا اہتمام کریں۔ سوچیے کس درجہ مضحکہ خیز حرکات ہیں۔ مگر بارہواں کھلاڑی ایک بڑی حد تک ان جملہ حرکات سے محفوظ اور قعرِ دریا کے درمیان "تختہ بند" ہونے کے باوجود ہوشیار رہتا ہے اور اپنا دامن تر نہیں ہونے دیتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ طبعاً محض ایک تماشائی ہے۔ وہ کرکٹ کے میدان میں ضرور اُترتا ہے مگر اس وقت جب کسی کھلاڑی کو پیر اسٹامول کی ایک آدھ گولی پہنچانا درکار ہو یا اسے تیز باؤلنگ سے بچاؤ کی وہ ترکیب بتانا مقصود ہو جو خاندانی نسخے کی طرح صرف کپتان ہی کو معلوم ہے لیکن جس پر خود کپتان کو اپنی باری میں عمل کرنے کی توفیق نہ ہوسکی تھی یا جب کپتان محسوس کرے کہ اگر بارہواں کھلاڑی میدان میں جاکر دو چار بے معنی دوڑیں نہیں لگائے گا تو اس کی صحت بالکل برباد ہو جائے گی۔ باقی تمام عرصہ یہ "مردِ مجاہد" کھلاڑیوں کی گیلری میں براجمان بڑے مزے سے بازیچۂ اطفال کو دیکھتا ہے، مونگ پھلی کھاتا ہے یا اُچک اُچک کر ٹیلیویژن کیمرے کی زد میں آنے کی کوشش کرتا ہے تاہم اس کی اصل حیثیت ایک تماشائی ہی کی رہتی ہے اور کسی بھی کھیل میں یہی بنیادی اور مرکزی حیثیت ہے۔

ممکن ہے آپ سوچیں کہ بارہویں کھلاڑی کو تماشائی قرار دینا تماشائیوں کے جمِ غفیر سے ناانصافی کے مترادف ہے مگر آپ یقین کریں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے کیونکہ تماشائی "تماشائی" ہوتے ہی کب ہیں۔ وہ تو اپنی اپنی ٹیم کے غیر حاضر کھلاڑی ہیں جو میچ کے دوران سارا وقت باؤلروں کے ساتھ باؤلنگ اور بلّا بازوں کے ساتھ بیٹنگ کرتے ہیں اور کبھی جب طبیعت ذرا گدگدائے تو وکٹ کیپنگ بھی کر لیتے ہیں۔ جب مخالف ٹیم کے بلّا باز کی گیند ہوا میں اُچھلتی ہے تو اسے دبوچنے کے لئے ہزاروں نادیدہ ہاتھ از خود ہوا میں اُٹھ جاتے ہیں اور جب ٹیم کے سب سے ہونہار اور خوبصورت کھلاڑی کے دونوں ہاتھوں میں موجود کسی مستقل سوراخ سے گیند پھسل کر زمین پر آرہتی ہے تو انہیں یوں لگتا ہے جیسے گیند خود ان کے ہاتھوں سے پھسلی ہے۔ پھر جب کبھی ان کی اپنی ٹیم کا بلّا باز چھکّا لگاتا ہے تو ان کے ہزار ہا بازوؤں کا زور بلّا باز کے بازو میں سمٹ آتا ہے۔ وہ اپنی ٹیم کی فتح و شکست میں اس درجہ "مبتلا" ہوتے ہیں کہ اگر ٹیم جیتے تو یہ ان کی ذاتی جیت ہے اور اگر ٹیم ہارے تو یہ ان کی ذاتی شکست ہے۔ کھیل دیکھنے والوں کا یہ مجمع حقیقتاً ایک ایسی "ہستی" ہے جس کے ہزاروں سر اور بازو ہیں جس کی لاتعداد آنکھیں اور اَن گنت کان ہیں اور جو بیک زبان اپنی خوشی، غمی یا برہمی کا برملا اظہار کرتی ہے اور کھیل میں بھرپور شرکت سے یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ بیچ میدان کھڑی ہے نہ کہ کرچ کرچ ہو کر گراؤنڈ کے چاروں طرف کی نشستوں پر بکھری پڑی ہے۔ یہ "ہستی" بیک وقت اپنی ٹیم کی ہمزاد، ساتھی منصف اور ضمیر کی آواز ہے۔ لہٰذا جب کوئی کھلاڑی میدان میں کسی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس ہستی کی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھتا ہے اور جب اس سے کوئی حماقت یا کوتاہی سرزد ہوتی ہے (جو اکثر ہوتی ہے) تو یہ ہزار پایہ ہستی اس کی طرف گھور کر دیکھتی ہے اور وہ اس کی بھیم آنکھ کی تاب نہ لاکر فوراً ہلمٹ میں اپنا منہ چھپا لیتا ہے۔ گویا ان دونوں میں "گفتگو" ہر وقت جاری رہتی ہے اگر گفتگو کا یہ سلسلہ کسی وجہ سے ٹوٹ جائے تو میچ قطعاً بے معنی اور بے لطف ہو کر رہ جائے۔ بلکہ میں تو یہ تک کہوں گا کہ گیارہ افراد کی ٹیم اس ہزار پایہ ہوکٹوپس (Octopus) سے ایک جذباتی رشتے میں منسلک ہوتی ہے اور ایک دوسرے کی تلافی قرار پاتے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کوئی بھی "تماشائی" نہیں۔ دونوں مبتلائے عشق ہیں۔

دوسری طرف بارہواں کھلاڑی ایک مرحِ آزاد ہے۔ اس کی بلا سے اگر ٹیم ہارے یا جیت سے سرفراز ہو۔ اگر ٹیم خدانخواستہ جیت گئی تو اس کے گلے میں کوئی ہار پہنانے نہیں آئے گا اور اگر ٹیم ہار گئی تو کوئی اس سے باز پُرس نہیں کرے گا۔ اسے دیکھ کر "شیم شیم"

کے نعرے نہیں لگائے گا اور اس پر سنگترے کے چھلکے نہیں پھینکے گا۔ یہ شخص ٹیم کی فتح و شکست ہی سے بے نیاز نہیں بلکہ اپنی کارکردگی کے بارے میں بھی کسی خوش فہمی کا شکار نہیں۔ اسے معلوم ہے کہ کوئی سرپھرا اسے "مین آف دی میچ" کا ایوارڈ نہیں دے گا اور کوئی اخبار اس کی صحت یا علالت کے بارے میں اپنے قارئین کو مطلع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔ بارہواں کھلاڑی راہ و رسم عاشقی کے ان جملہ نازک مقامات سے قطعاً محفوظ ہے۔ وہ میچ کے پانچوں دن اپنی نیند سوتا اور اپنی نیند جاگتا ہے۔ خوش خوراکی کے معاملے میں بھی اسے کسی احتیاط کی ضرورت نہیں۔ کپتان کی تعریف یا سرزنش سے بھی اسے کوئی سروکار نہیں۔ غرضیکہ بارہواں کھلاڑی، کھلاڑی کہلانے کے باوجود اپنی ٹیم کی تمام تر ذمہ داریوں سے سبکدوش اور اس کی تمام تر الجھنوں سے بے نیاز ہے۔ یہی تماشائی کا اصل منصب بھی ہے کہ وہ تماشا میں شریک ہونے کے باوجود تماشا سے الگ بھی رہے۔

بارہویں کھلاڑی کی لوحِ دل ہر قسم کے نقش اور نام سے بھی محفوظ ہے۔ وہ کمال بے نیازی سے ان خوش وضع کھلاڑیوں کو دیکھتا ہے جو نازک سی بیاضوں پر کلک گوہرین کا جادو جگاتے ہیں اور جن کے خود نوشت دستخطوں پر جھکی ہوئی ان کی مسکراہٹ لمحہ بہ لمحہ وکٹیں گراتی چلی جاتی ہے۔ بارہویں کھلاڑی کو اپنی آنکھوں کے سامنے شب و روز ہونے والے اس بیہودہ ناٹک سے کوئی سروکار نہیں۔ بعض اوقات تو وہ اس ساری کارگزاری کو بھی میچ ہی کا حصہ سمجھتا ہے۔ اور پھر اس کی طرف سے منہ موڑ کر دوبارہ اونگھنے لگتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ بیاض پر دستخط کا حصول تو محض ایک بہانہ ہے۔ اس کے پیچھے وہی کاروباری رویہ موجود ہے جو میچ دیکھنے کو میچ میکنگ کے لئے ایک زینہ بنانے کا متمنی ہے اور وہی جبلت کارفرما ہے جو بقائے بہترین کے لئے موزوں انتخاب کو ناگزیر قرار دیتی ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ شکاری خود شکار ہو رہا ہے۔ بے چارہ شکاری!

بارہواں کھلاڑی اصلاً ایک صوفی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ دنیائے رنگ و بو یہ ہر لمحہ صورت بدلتا ہوا جیون، یہ شادیانے، پٹاخے، چیخیں اور قہقہے ـــــ یہ سب کچھ بے معنی ہے۔ یہ کرکٹ کے میدان میں بنائی جانے والی اور بعد ازاں نامۂ اعمال میں لکھی جانے والی وکٹیں، کیچ اور سنچریاں محض ایک فریبِ نظر ہے۔ کھیلنے والوں کے علاوہ دیکھنے والوں کو بھی اس بات کا پوری طرح احساس نہیں کہ پانچ روز پر پھیلی ہوئی مہابھارت کی یہ جنگ ایک بے نتیجہ پیکار ہے۔ اس میں نہ کسی کا کچھ بگڑتا ہے اور نہ کسی کو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ اگر کچھ حاصل ہوتا ہے تو فقط سانس رک جانے کا وہ لمحہ جب آسمان سے اترتا ہوا سنہری گیند کھلاڑی کے دست بہ دعا ہاتھوں کی طرف آتا ہے اور پھر جیسے ہوا میں معلق سا ہو کر رہ جاتا ہے اور دیکھنے والوں کے دل چند لمحوں کے لئے دھڑکنا بھول جاتے ہیں۔ مگر بارہواں کھلاڑی کوئی تارک الدنیا نہیں اور نہ اسے رہبانیت کا مبلغ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ اس شخص کی طرح نہیں جو اپنے گھر بار کو خدا پہ چھوڑ، کسی درخت کے نیچے دھونی رما اپنے تئیں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اس نے دنیا کو ترک کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ دنیا کو ترک کر بھی دے تو دنیا اسے ترک نہیں کرتی۔ دنیا کا سب سے بڑا ایجنٹ جسم خواہشات کے ہتھیاروں سے لیس اس پر ہر وقت پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار ہے۔ وہ چند دنوں یا مہینوں اس پیرِ تسمہ پا کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو بھی جائے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیوں کہ آخر میں اس پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ اس بارہویں کھلاڑی سے جان چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی لیے ایک سچا صوفی کبھی ترکِ دنیا کا منصوبہ نہیں بناتا وہ ترکِ دنیا کے عمل کو نفرت کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اسے احساسِ شکست پر منتج قرار دیتا ہے۔ سچا صوفی تو بیچ منجدھار ایک لائٹ

وس کی طرح بالکل شانت کھڑا رہتا ہے۔ یعنی یم موج سے آشنا ہوتا ہے مگر موج کو نوک پا سے ٹھکرانے میں لذت بھی محسوس کرتا ہے۔ بس یہی اصل بات ہے کہ آپ انبوہ میں رہتے ہوئے بھی اکیلے ہوں۔ مطلب یہ کہ آپ ایک سچے تماشائی کے منصب کو اپنائیں جو تماشے کو زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں بناتا بلکہ ہمیشہ اسے ذرا فاصلے ہی سے دیکھتا ہے۔

بارہواں کھلاڑی ایک ایسا ہی سچا صوفی ہے۔ وہ بیک وقت اپنی ٹیم سے منسلک بھی ہے اور جدا بھی۔ وہ میدان میں پہلی کے چاند کی طرح آتا ہے جو دوسرے ہی لمحے رخصت بھی ہو جاتا ہے۔ وہ کرکٹ کے کھیل کا نباض، مفسّر، کارکن اور جاسوس ہونے کے باوجود اپنے دامن کو تر نہیں ہونے دیتا۔ ہونٹوں پر ایک عارفانہ مسکراہٹ سجائے وہ قلب مطمئنہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ متسلسل کی طرح سرپٹ دوڑنے کا قائل نہیں بلکہ مرور زماں کی طرح مسلسل حرکت کے باوجود ٹھہراؤ کے ایک مستقل عالم میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ میچ کو دیکھتا ہے۔ مونگ پھلی کھاتا ہے اور خوش رہتا ہے۔

میں نے ٹیلی ویژن کی طرف نظریں اٹھائیں جہاں ایک ہی لمحہ پیشتر ہماری ٹیم کے ایک خوش شکل کھلاڑی سے تیسری بار کیچ چھوٹا تھا اور پھر مجمع کی طرف دیکھا جیسے گویا سانپ سونگھ گیا تھا اور تب اپنے دوست پر ایک نظر ڈالی جس کا چہرہ ہلدی ہو گیا تھا۔ میں مسکرایا۔ وہی عارفانہ مسکراہٹ جو صوفی کا واحد اثاثہ ہے اور پھر میں نے چپکے سے بارہویں کھلاڑی کی سفید براق ڈریس سے دھلی ہوئی وردی پہنی اور بڑے اطمینان سے پلنگ پر دراز ہو کر مونگ پھلی کھانے لگا۔

--

جوہر سیوانی

آشوبِ چشم

اک دن علی الصباح جو بستر سے میں اُٹھا
کھلا رہی تھیں آنکھیں بہت سخت درد تھا

کھانے کے بعد وقت پہ آفس چلا گیا
دن بھر میں فائلوں کے مسائل میں گم رہا

دفتر سے ہو کے شام کو آیا جب اپنے گھر
تھا درد میری آنکھوں کا اپنے شباب پر

آشوبِ چشم میں جو گرفتار میں ہوا
لوگوں کے تجربات کا دفتر ہی کھل گیا

سُرخیٔ چشم دیکھ کے اہل و عیال نے
سمجھا کہ محترم کو ہے گھیرا جلال نے

بستر پہ میں جو لیٹ گیا کچھ کہے بغیر
بیگم ڈریں کہ آج نہیں ہے کسی کی خیر

دیکھی اُنہوں نے جب مری آنکھوں کی سُرخیاں
سمجھیں کہ طیش میں ہیں کسی بات پر میاں

جب یہ پتہ چلا کہ ہے آنکھوں میں گڑبڑی
بے خوف میرے سامنے آکر ہوئیں کھڑی

بازار میں کسی سے ملی جب اُنھیں خبر
بہرِ علاج آئے مرے دوست ڈاکٹر

بیکس نے یہ کہا کہ ہماری دوا چلے
اختر نے آکے رائے دی "نئے نول" ہی لگے

اک وید ہیں پڑوس میں سنتے ہی آگئے
ویدک دوا لگانے کو وہ بھی بتا گئے

پہنچے عقیل بھی لئے ہمدرد کی دوا
آنکھوں کا درد اس سے تو کچھ اور بڑھ گیا

شاعر بھی سُن کے میری خبر لڑکھڑا گئے
آئے لئے بیاض مرے گھر پہ چھا گئے

ہر اہلِ فن نے جم کے سُنائی غزل نئی
محفل جمی جو صبح میں تو شام ہو گئی

سب نے کہا کہ لیٹے رہو اور غزل کہو
آنکھوں میں درد ہو تو غزل پر غزل پڑھو

شاعر چلے گئے تو مری ساس آگئیں
سالوں کی بیگمات مرے پاس آگئیں

اک نے کہا "دو غزلہ" کا سُرمہ لگائیے
اور اس کے بعد نظموں کی پٹی چڑھائیے

اک نے کہا کہ پیجئے انگور کی شراب
آشوبِ چشم کے لئے کمپھر ہے لاجواب

سالی نے یہ کہا کہ لگے مرہمِ سخن
سُرخیٔ چشم جلد ہی ہو جائے گی ہرن

قارورہ نوش نے بہ یقیں مجھ سے یہ کہا
نسخہ بہت مفید ہے آبِ حیات کا

حالت ہے غیر آپ نہ شرمائیے ذرا
کل صبح اُٹھ کے پیجئے قارورہ رات کا

تنہا تھا میں مریض، معالج ہزار تھے
میرے علاج کیلئے سب بے قرار تھے

جوہر عجیب حال تھا، آشوبِ چشم سے
سُنتا رہا میں سب کی پلنگ پر پڑے پڑے

ڈاکٹر سید حامد حسین

رہنمائے تنقید

عرف

ادبی مضمون گائیڈ

میرے چچا جنت مکانی حکیم ہر فن المتخلص بہ مولا نے جب پچاس سال قبل اپنی معرکۃ الآرا کتاب "بیجو گائیڈ" لکھی تو لوگ راتوں رات یہ نازک ساز بجانا سیکھ گئے اور رنگون سے کابل تک لوگ اپنی اپنی زبانیں بھول کر صرف بیجو کے ذریعے آپس میں گفتگو کرنے لگے اس کے بیس سال بعد جب انھوں نے "موٹر گائیڈ" چھاپی تو ملک کا بچہ بچہ اپنی چال بھول گیا اور موٹر چلانے پر بضد ہو گیا۔ اس صورت حال سے انگریز اس قدر خوف زدہ ہوا کہ ملک چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ تب چچا مرحوم نے راتوں رات لکھ پتی بننے کا نسخہ لوگوں بتایا اور اس کی برکت سے خود چچا مرحوم تو دیکھتے کے دیکھتے لکھ پتی بن گئے دوسروں کی دوسرے جانیں یا خدا جانے۔ اب چچا کو جنت کے صوفوں پر کروٹ کروٹ سکھ بھوگتے دس سال گذر چکے ہیں اور ان کی جائیداد میں سے کچھ انکم ٹیکس والے اور باقی جو بچا تھا د کالے پیلے چور لے جا چکے ہیں۔ لیکن ان کے خاندان کے رگ و ریشے میں عوام کے لیے اپنی جان تک لگا دینے کا جو مبارک جذ سرایت کر گیا ہے اس نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں بھی دکھی دکھیاروں کی مدد کے لیے اپنی زندگی وقف کر دوں اور ان کو ایسے معاملات میں گائیڈ کروں جن کے حل کے لیے پہلے زمانے کے لوگ مسیحا کا انتظار کیا کرتے تھے۔

دنیا کو معلوم ہے کہ ہم لوگ فن و ادب کے کتنے سچے عاشق ہیں۔ ہمارا یہ عشق، خالص، بے لوث اور دنیا کی لاگ لپیٹ سے ایک دم پاک ہے۔ دیکھیے ہم شعر، افسانے اور ادبی مضمون کو کتنا چاہتے ہیں کہ ان کے آگے نہ ہمیں معاش کے مسائل مزا دیتے ہیں اور نہ نفسیات کے لٹکے ہمیں رجھا پاتے ہیں۔ ہر ماہ ہمارے یہاں ہزاروں رسالے چھپتے ہیں۔ انھیں پڑھ کر بھول جاتے ہیں کہ دنیا میں تاریخ، سیاست، سائنس، معاشیات، سماجیات اور ایسی ہی دوسری خرافات ہیں جن میں یا دنیا الجھی رہتی ہے۔ جہاں تک رسالوں کے ذریعے اترنے والی غزلوں اور نظموں کی کھیپ کا تعلق ہے بزرگوں سے استاد کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔ جو فی سبیل اللہ ہر طبع موزوں و ناموزوں کو ثواب دارین کا مستحق ہونے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔ افسانہ نگاری کے لیے بھی بعض ورکشاپ کھل گئے ہیں جو مناسب محنتانے پر اطمینانی کام کا بورڈ بڑے جلی حروف میں لکھ لگاتے ہیں۔ شعر و افسانے کے علاوہ ہمارے رسائل میں ادبی مضامین کی بھی خاص قدر ہوتی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس اہم میں ضرورت مندوں کی مشکل کشائی کا ابھی تک کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ لہذا خاکسار یہ چاہتا ہے کہ وہ آڑے وقت

...نے ہم وطنوں کے کام آئے اور انھیں کچھ ایسے آزمودہ گُر بتائے جن کے ذریعے وہ راتوں رات تنقید کے اماموں کی صف میں جا کھڑے ہوئے
کھم کا کام ہے لیکن جوکھم کو پانی کر دینا ہی استاد کا فن ہے۔ اور اسی بلند مقصد کے پیشِ نظر ناچیز نے اس کام کو سنبھالا ہے۔ سانپوں اور آموں کی طرح تنقید کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں اور ان کی قسم کے لحاظ سے ہی تنقید کا کاٹا پانی مانگتا یا ہ... ٹتا ہے۔ اس مختصر مضمون میں صرف چند قسموں کا ذکر ہے۔ انھیں آزمائیے اور شہرت کے گنبد پر پالتی مار کر بیٹھ جائیے۔

(۱) محققانہ تنقید

اس تنقید کا ادبی بازار میں بہت اونچا بھاؤ ہے۔ اس کا لکھنے والا "علامہ" کے خطاب کا اسی طرح مستحق سمجھا جاتا ہے جیسے پرانا ... دالا "استاد اور ماہر طبلہ نواز "ماسٹر" کہلانے لگتا ہے۔ اس تنقید کی بنیاد تحقیق پر ہوتی ہے۔ کوئی پرانی چیز ڈھونڈھ نکالیے جو بے سر و پیر، نامکمل، دریدہ اور شکستہ ہو اور ثابت کیجیے کہ اسی کی گمشدگی کی وجہ سے آدم کو جنت سے نکلنا پڑا تھا، اور اسی کی تلاش میں نسلِ آدم ہنوز سرگرداں ہے۔ اس تنقید کے لیے جو امدادی سامان ضروری ہے اس میں لمبائی ناپنے کا ایک اچھا اسکیل ایک پرکار، ایک زاویہ پیما اور ایک محدب شیشہ نہایت اہم ہیں۔ ان کی ترکیبِ استعمال بھی آسان ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ کو چھیدی لال خونچے والے کے پاس ہاتھ کے لکھے ہوئے ساڑھے بائیس صفحے ملتے ہیں۔ سب سے پہلے صفحات گنیے۔ پھر ہر صفحے پر موجود سطریں پھر ہر سطر میں لکھے گئے الفاظ اور پھر الفاظ میں شامل حرف اور پھر حروف پر لگے نقطے اور پھر وہ نقطے جو نہیں لگائے گئے۔ اس کے بعد حاشیے کا رخ کیجیے اور وہاں موجود نشانات، ان کا حلیہ بشرہ اونچ نیچ، نشست و برخاست دیکھیے، ناپیے، تولیے اور محدب شیشے کا استعمال کرکے ان سے پوشیدہ حالات دریافت کیجیے۔ پھر اپنا مضمون کچھ اس طرح لکھیے۔

دنیائے ادب میں اس وقت تہلکہ آ گیا جب میرے ہاتھوں اس صدی کی عظیم ترین دریافت ہوئی۔ یہ تب ہوا جب ۲۲ر جنوری کو شام کے پانچ بج کر ۴۳ منٹ پر راقم الحروف نے ٹیگور مارگ پر شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف جاتے ہوئے ایک خونچے والے (یہاں حاشیے میں خونچے والے کا نام، ولدیت، سکونت، عمر اور اس سے انٹرویو لکھیے) کو چاٹ کھانے کے لیے روکا تو اچانک میری نگاہ اس مخطوطے پر پڑی جو کہ خونچے والے نے ردی کے طور پر استعمال کرنے کے لیے رکھا تھا (یہاں تحقیق میں ردی کا کی اہمیت پر ایک نوٹ لکھیے جس میں اپنی پچھلی تحقیقات کا ذکر مع صفحات نمبر کرنا نہ بھولیے) اس دولتِ بیش بہا کو دیکھتے ہی میں بے ساختہ خونچے والے کے سامنے دوزانو ہو گیا۔ جیب سے رنگین دستی نکال کر (یہاں دستی کی پیمائش، رنگ اور اس کے نقش و نگار کا ذکر بھی کیجیے) اس کے پنجوں پر سے کارپوریشن کی سرخ گرد صاف کی اور پھر انھیں بوسہ دیا۔ میرے اس جوشِ عقیدت کو دیکھ کر وہ نیک مرد بھی آبدیدہ ہوا اور مجھ سے میری دل کی مراد پوچھی اور صرف ۳۵ نئے پیسے میں دونوں جہان کی یہ دولت میرے سپرد کر دی۔ اب یہ خطی نسخہ دو ماہ پانچ دن سے میرے دنوں کا رفیق راتوں کا دمساز ہے اور اس کے مطالعے سے روز نت نئے راز منکشف ہو رہے ہیں۔

آج ہی یہ راز کھلا کہ مخطوطے کو ترچھا رکھ کر دیکھیے تو سطریں ترچھی نظر آتی ہیں۔ نسخے کو الٹا رکھ دیجیے تو واللہ کیا کمال ہے ایک دو نہیں بلکہ سارے کے سارے حروف اوندھے نظر آتے ہیں۔ مخطوطے کے ورق ۳ ب پر جدول سے اعشاریہ دو دو سینٹی میٹر فاصلے پر د... سے نیچے عدد بعدد چھ کا پہاڑہ لکھا ہوا ہے جو اچانک ۵۴ پر ختم ہو جاتا ہے۔ درمیان میں ایک سہو کتابت بھی ہے یعنی ۳۶ کو ۳۲ لکھا ہے۔ یہ تحریر اس لحاظ سے زبردست تحقیقی اہمیت کی مالک ہے کہ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ شاعر نے یہ دیوان اپنے قلم سے طفلی کے اس دور میں لکھا ہے جب اس کا کم سوادِ مکتبی استاد شاعر کے آزاد تخیل کو پہاڑوں کی مشقت سے

گرانبار کرنا چاہتا تھا اور شاعر فکر سخن میں گم رہتا تھا۔ چنانچہ پہلے وہ بے توجہی کے عالم میں ۳۶ کی جگہ ۳۲ لکھتا ہے اور پھر بالآخر بیچارے کو ۳۵ پر چھوڑ کر وہ مقطع لکھتا ہے جو عین اس عدد کے سامنے درج ہے۔

محقق کو خوش قسمتی سے مخطوطے پر ایک اور اہم نشان ملا ہے جس کی مدد سے یہ امکان ہے کہ علم کے سامنے حقائق کی ... کی تہیں کھلتی چلی جائیں گی۔ ورق ۸ الف پر صفحے کے وسط سے ایک اعشاریہ تین سینٹی میٹر نیچے اور ورق کی دریدہ انتہا اعشاریہ دو پانچ سینٹی میٹر داہنی جانب ایک خون کا دھبہ ہے۔ جس کے بارے میں ماہرین کی رائے ہے کہ وہ کسی مچھر کو مہلک حادثہ پیش آنے سے پیدا ہوا ہے کیونکہ محدب شیشے کی مدد سے اس بدقسمت کے جسد فانی کا تین بٹا آٹھ حصہ ابھی بھی صفحے پر چسپاں نظر آتا ہے۔ محققانہ رائے یہ ہے کہ مچھر نے شاعر مذکور کے تخلیقی عمل میں خلل اندازی کی جس کے لیے شاعر نے اس کو قرار واقعی سزا دی۔ اس کی تصدیق اس شعر سے ہو جاتی ہے جو اس نشان سے ایک اعشاریہ ایک پانچ سینٹی میٹر نیچے درج ہے اور جس میں دنیا کے ستم ناروا کی انتہائی تلخ انداز میں شکایت کی گئی ہے۔ اس نشان کی وجہ سے ڈاکٹر مشکل کشا نے شاعر کا بلڈ گروپ بھی دریافت کر لیا ہے اور حکیم بے معز ولیمہ بیا اس نشان کو سونگھ کر بتاتے ہیں کہ شاعر موصوف کو لہسن بہت پسند تھا اور اُن کا مزاج بلغمی تھا۔ مخطوطے پر بہر حال تحقیق کا کام جاری ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہم بہت جلد شاعر کے جوتے کا ناپ معلوم کرنے کے بعد اس کتے کا حلیہ بھی دریافت کر لیں گے جس نے شاعر کو کاٹ لینے کی دھمکی دی تھی ..... وغیرہ وغیرہ۔

(۲) ماہرانہ تنقید

اس قسم کی تنقید کے لیے بھی زمانہ نہایت ساز گار ہے۔ آج کل دل بیٹھنے کے امراض کے ڈاکٹروں سے لے کر ایسے اسپیشلسٹ بڑھئیوں تک کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو کرسی کے صرف پچھلے پائے میں کیلیں ٹھونکتے ہیں۔ ادب میں بھی ایسے ماہرین کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور انھیں یونیورسٹیوں کے طاق در میں سجایا جاتا ہے۔ ہمارے ایک دوست عرصے سے نابینا شعراء پر کام کر رہے ہیں۔ معذوروں کے اس سال میں انھیں ماہر تسلیم کر لیا گیا ہے اور وہ جلد نابیناؤں کی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بننے والے ہیں۔

اس قسم کی تنقید کے لیے نمک کی مقدار میں صبر اور گیلن بھر روشنائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور وہاں بات میں خمیر اٹھانے کے لیے کوئی ایسا نام بھی جس کی ۲۵ سالہ ، ۵۰ سالہ یا سو سالہ برسی یا سالگرہ دو چار سال میں منائی جانے والی ہوگی۔ یاد رہے کہ جتنا بڑھیا خمیر اٹھے گا اتنا ہی میٹھا آپ کے صبر کا کیک ہوگا۔

مثلاً مشہور زمانہ شاعر علامہ دوشالہ پوش کی سو سالہ سالگرہ منوانا ہے تو پہلے چند دن زمانے کی بے حسی کے خلاف ایسی مہم چلایئے کہ علامہ نہ صرف اپنی قبر میں اپنا دوشالہ پھینک کر اٹھ بیٹھیں بلکہ اپنا کتبہ مزار اکھاڑ کر آپ کے سر پر دے مارنے کی خواہش ان کے سینے کو زیر و زبر کرنے لگے۔ جب ملک کے طول و عرض میں اُن کی ولادت کی تاریخ کے مسئلے پر کلینڈر کی تاریخیں کم پڑتی دکھائی دینے لگیں۔ تب آپ علامہ کی دائی کی پڑپوتی اور رسم عقیقہ کے رکن خاص مقراض منزلت خلیفہ بھیو ندی خاں کے نواسے وغیرہ سے انٹرویو لے کر تاریخ ولادت مقرر کر دیں اور پھر دو ہفتے میں تین مضامین کی رفتار سے آپ علامہ کی زندگی اور ان کے کلام کے اُن اُن گوشوں کو اجاگر کریں کہ اگر علامہ خود واقف ہو جائیں تو اپنا سارا سرمایہ مع اپنے کفن کے آپ کے قدموں میں رکھ کر سکون کی تلاش میں جہنم کی جانب روانہ ہو جائیں۔

آپ کے موضوعات اس قسم کے ہوں گے۔ علامہ نے نوکیلی مونچھیں کس سنہ میں رکھیں۔ ان کی مونچھوں پر جنرل

ڈاڑھ کا کیا اثر تھا۔ کیا گندک کا پانی پینے سے علامہ کو زکام ہوجایا کرتا تھا۔ کیا ان کے کلام میں بیضۂ مرغ کا ذکر نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ انڈا انہیں مرغوب نہیں تھا۔ کیا علامہ اشعار کو ارکان کی بجائے فیتے سے ناپتے تھے۔ علامہ کس قسم کے خطوط اپنے ہاتھ سے لیٹر بکس میں ڈالتے تھے۔ علامہ کی وفات کے بعد کتنے لوگوں نے اپنے بچوں کے نام علامہ پر یا ان کے مجموعوں پر رکھے۔ ایسے لوگوں کا پورا شجرہ اور ان کے خاندانی حالات لکھیے اور ان کے خاندان میں ضرورت رشتہ کے امکانات پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔

اگر آپ علامہ کی شیروانی سے ٹوٹ کر گرا ہوا کوئی بٹن، رسیدی ٹکٹ پر ان کے دستخط یا محکمۂ جرائم میں محفوظ ان کے نشانات انگشت ڈھونڈھ لائیں تو پھر آپ کو "ماہر دو شالہ پوشیات" کے لقب سے کوئی محروم کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان نوادر کی دریافت کے اعلان کے ساتھ ہی آپ کو اپنے نام کے ساتھ یہ لقب لکھنا شروع کردینا چاہیے۔

(۳) عالمانہ تنقید

یہ تنقید بھی بڑا مرعوب کرتی ہے۔ اس قسم کی تنقید لکھنے والوں کو رسالوں کے خاص نمبروں میں لکھنے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے اور اگر احباب معاون ہوں تو انھیں سمیناروں وغیرہ میں بھی سرکاری خرچ پر بلایا جاتا ہے۔ اس قسم کی تنقید کے لیے سو سوا سو غیر ملکی ادیبوں اور مفکروں کے ایسے نام اولین ضرورت ہیں جن کا تلفظ یا ہجے دشوار ہوں۔ ان ناموں کے بار بار اعادے اور الٹ پھیر سے بڑی پُر وقار فضا پیدا ہوتی ہے۔ اگر بر وقت صحیح نام میسر نہ ہوں تو ایلوپیتھک دواؤں اور امراض کے انگریزی نام بھی کبھی کبھی کام دے جاتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ایک بزرگ نے فلابیر، گسنبرگ، کرکے گارڈ، ژاں پال سارتر کے ساتھ ساتھ اور ژاں ژنے ایک کاریونا ین کا بھی ذکر کیا اور روحانی بیان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس قسم کی تنقید کے لیے بھرپور آواز میں پڑھی جانے والی اصطلاحات کا ایک ایسا "کِٹ" بھی ضروری ہوتا ہے جس کو پڑھتے ہی قاری اپنی لاعلمی کے اعتراف کے ساتھ اپنے خول میں دبک جائے۔ نمونے کے طور پر عرض ہے:-

نابغۂ زماں حضرت کمر بستہ تخلیق کے ایجابی عمل میں ایک ایسی فوق الشعوری صلاحیت رکھتے ہیں جس میں اسپنگلر کی مادی اثباتیت اور ژونگ کی عائلی مستقیمیت کے غیر احتسابی عناصر نے آندرے ژید کی خلقی تجریدیت اور اور آلبیر کامیو کی نو تولیدی مجہولیت کے اختلاط باہمی کے ذریعے اینگلز کی جدلیاتی فکر اور ہرشل کی آفاقی العادیت سے مستعار اقدار اور جہات کی مدد سے ایک خیال انگیز اسلوبیاتی بافت کو متشکل کیا ہے۔

(۴) تلنگی تنقید

اس تنقید کا تعلق تلنگانے سے نہیں تلنگوں سے ہے۔ جب نئے نئے ادبی کیمپ کھلتے ہیں تو چوکسی کا کام کچھ ادبی تلنگوں کے سپرد کیا جاتا ہے جو اپنے پرچم میں بلّم فِٹ کر کے ہر سایے کو للکارتے ہیں اور ناعاقبت اندیشوں کو عاقبت اور سر پھروں کو سر کی قیمت یاد دلاتے ہیں۔ ان تلنگوں کی اسٹنٹ تنقید کی بڑی مانگ رہتی ہے جو خیال کو کٹار اور جملے کو کانٹے دار تار کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر روشن چشم کی رائے کا کوئی چھینٹا کسی کیمپ دھاری کے طرّے پر اتفاقاً لگ جاتا ہے تو اسٹنٹ تنقید نگار لکھے گا:

"روشن چشم ایک ایسا بگڑی نسل کا گھوڑا ہے جو اَدَب کی ناند میں منہ ڈالنے سے پہلے ہنہناتا ہی نہیں بلکہ لید بھی کرتا ہے۔ اسے تخلیق کے معنی سمجھنے کے لیے پہلے منطق کی سیڑھی پر سر کے بل کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ اچھا شعر اس کے لیے قبض کشا گولی کا اور اچھا جملہ اس کی خارش زدہ پیٹھ کے لیے مرچوں کا کام کرتا ہے۔ اس کا ٹھکانا ایسے ادبی گڑھے ہیں جن میں وہ چوہوں کی ادھ گلی

لاشوں پر ۔ کھال ادھیڑ ادھیڑ کر اپنے پیٹ بھرتا ہے ۔ سنا گیا ہے کہ ایک بار وہ اور ایک کاک روچ ایک ہی ٹیبل پر مصروف گفتگو تھے کہ پاس سے کوئی عطر کی مہک بکھیرتا گذر گیا ۔ روشن چشم اور اس کے ہم نشین دونوں یک لخت بے ہوش ہوگئے ۔ کاک روچ کی روح ابدی کثافت میں تحلیل ہوگئی لیکن سخت جان روشن چشم فنا کی دہلیز چوم کر لوٹ آیا اور آج تک حسن، شرافت، عقل اور منطق سے صلیبی جنگوں کے جوش کے ساتھ لوہا لے رہا ہے ۔

(۵) تنقید کی دوسری قسمیں

ان کے علاوہ اور بھی کئی قسم کی تنقیدیں ہیں جن کو اتنا سماجی رتبہ تو نہیں ہے لیکن اُن کے لکھنے والے کو پڑھا لکھا اور تھوڑا بہت قابل ضرور سمجھا جاتا ہے ۔ اس قسم کی تنقیدوں میں ایک محتاط تنقید ہوتی ہے جس میں تنقید نگار احتیاط کے پیش نظر ادبی کے دروغ کو اپنے دامن پر ہاتھ نہیں ڈالنے دیتا اور اس کے بیان کو الٹے کا مے لگا کر سختی کے ساتھ بند کر کے رکھتا ہے اس کا طبعی انکسار اسے اپنی جانب سے صرف عنوان اور فٹ نوٹ لکھنے کی اجازت دیتا ہے ۔ ایسی تنقید، خالی خولی تنقید نہیں ہوتی بلکہ وہ تنقید کا جلوس ہوتی ہے جو محتاط تنقید نگار جلوس سے ڈرتے ہیں وہ ہاتھ میں "لیکن" کی چھڑی رکھتے ہیں ان کی تنقید کا خیمہ بغیر "لیکن" کے کھمبوں کے کھڑا ہونے سے انکار کر دیتا ہے ۔

ایک اور قسم فرمائشی تنقید کی ہوتی ہے ۔ فرمائشی تنقید نگار کو خدا اور وصال صنم دونوں سے پیدائشی محرومی ہوتی ہے ۔ فرمائش کی تکمیل سے پہلے تک اس کے نفس کو فربہ کرنے کے لیے بڑے زود اثر اور مجرب نسخے استعمال کیے جاتے ہیں لیکن اگر وہ اپنی زنبیل میں سے عظمت کا تاج نکال کر فرمائش کرنے والے کے سر پر رکھنے میں ناکام رہتا ہے تو اسے اس کا قد یاد دلانے کے لیے اس کے پیر سے جوتیاں کھینچ لیا جاتا تو اولیں مرحلہ ہے ۔ پھر اس کے بعد یہ جوتیاں کدھر جاتی ہیں ۔ اس کی طرف سے فرشتے نگاہیں پھیر لیتے ہیں ۔ ہاں تجربہ کار فرمائشی ناقد رسوائی سے بچنے کے لیے موضوع کے نیک و بد کو خدا پر چھوڑ دیتا ہے ۔ اور مناسب حال عنوان و تمہید کے پیکنگ میں چپ چاپ سے ہینگ کے فوائد یا حماموں کے فن میں تنزل پر چند صفحات سیاہ کر کے راستہ لیتا ہے اور کسی درگاہ پر جا کر لوبان سلگاتا ہے ۔

الغرض حضرات تنقید نگاری ایک ایسا منتر ہے جس سے آپ ادبی دنیا میں عزت و وقار، دھاک اور دبدبہ سب حاصل کر سکتے ہیں ۔ آزمائش شرط ہے ۔ چند دیگر آزمودہ نسخے خط و کتابت یا بالمشافہ گفتگو سے حاصل کیے جا سکتے ۔ کیونکہ یہاں پیش کرنے کی شغل میں نجی مشورے کی فیس کے نقصان کے ساتھ ساتھ تعزیرات ہند کے حرکت میں آجانے کا بھی خطرہ ہے ۔

عاتق شاہ

گھر کا کتّا

گلی کا کتا صرف ایک کتا ہی نہیں ہوتا بلکہ گلی کا وہ شیر ہوتا ہے جو ڈکارتا ہوا ہر آنے جانے والے پر کڑی نظر رکھتا ہے۔ کیا مجال کوئی اجنبی چپکے سے گلی میں گھس آئے۔ اگر کسی نے اس قسم کی کوشش کی تو اس کی خیر نہیں۔ وہ فوراً اس پر جھپٹ پڑتا ہے اور بھوں بھوں والی زبان میں پوچھتا ہے۔

— کون ہو تم ؟ کیا نام ہے تمہارا — اس گلی میں کس سے ملنے آئے ہو — کیا کام ہے اُس سے — ؟

بھوں، بھوں —— بھوں، بھوں !!

اگر کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو پوچھئے مت کہ اُس کا کیا حشر ہوگا۔ ورنہ کوئی ہکّا بکّا خاموش کھڑا ہو جائے تو وہ اُسے سونگھ کر ہی پتہ چلا لے گا کہ آدمی اچھا ہے یا بُرا — !

سونگھ کر کسی شخصیت یا شئے یا مقام کو پہچاننے کی معجزاتی صفت صرف کتّے کے ہی حصے میں آئی ہے۔ اس خصوص میں اور کوئی مخلوق کتّے کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لئے ہر ترقی یافتہ سرکار اور مہذب حکومت بڑی بڑی تنخواہیں دے کر کتوں کو ملازم رکھتی ہے۔ تاکہ حکومت کے خلاف سازش کرنے والے غدّاروں کا پتہ چلایا جا سکے —— اور کتّے یہ کام بہت آسانی سے کر لیتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ مجرموں اور قاتلوں کی گرفتاری کے لئے بھی کتوں سے مدد لی جاتی ہے۔ جہاں پولیس اور سی آئی ڈی کے بڑے بڑے افسر اور شہر کے وائرلیس سٹ کسی خطرناک مجرم کو پکڑنے میں ناکام ہو جاتے ہیں وہاں کتّا اُسے پکڑ لیتا ہے۔ صرف شرط یہ ہے کہ اُسے اُس مقام پر لے جایا جائے جہاں یہ جرم سرزد ہوا۔ وہ منظر قابلِ دید ہوتا ہے جب کتّا مقامِ واردات کی ایک ایک شئے کو سونگھ کر کسی ایک سمت کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ اور بڑے بڑے افسر اُس کے پیچھے اپنی جیپ کاروں کو دوڑانے لگتے ہیں۔ پھر کتّا کسی نہ کسی اسپاٹ پر پہنچ کر رُک جاتا ہے۔ اس طرح ملزم کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔

یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ کتّا اُن ہی گلی کوچوں، سڑکوں اور راستوں سے گذرتا ہے جہاں جہاں سے ملزم گذرا۔ اگر ملزم ہوشیار

ہے اور وہ ٹکٹ کٹا کر چپکے سے ٹرین میں بیٹھ گیا ہے تو کتّا ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر رُک جائے گا۔ اور پلیٹ فارم کو سونگھ سونگھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے گا۔ اب انٹلی جنس کے عہدہ داروں کا کام ہے کہ وہ کُتّے کی زبان کو سمجھ کر ملزم کو گرفتار کریں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر عہدیدار اس زبان کو نہیں سمجھتے۔ یا سمجھنا نہیں چاہتے۔ ایسے کُتّوں کو سرکاری زبان میں پولیس ڈاگ کہا جاتا ہے۔

ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ ملکوں کے پولیس ڈاگ نہ صرف اپنے ملکوں کی خصوصیات کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ اپنی قوم کی صفات کے بھی حامل ہوتے ہیں۔ بہت سی ترقی یافتہ حکومتیں کُتّوں کو پولیس کے علاوہ ملٹری میں بھی ملازم رکھتی ہیں۔ یہ "حضرات" بغیر ڈریس پہنے دوسرے ملکوں میں جاسوسی کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ اور وہ معلومات فراہم کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ چاہیں تو کسی کے گھر میں جھگڑا کروادیں۔ اور چچا کو بھتیجے کے ہاتھوں قتل کروادیں اور پھر بھتیجے کو کسی عام آدمی کے ہاتھوں۔ تاکہ قتل کی وجہ ہی معلوم نہ ہو۔

قوتِ شامہ کے علاوہ کتّوں میں بلا کی قوت حافظہ بھی ہوتی ہے۔ بس ایک بار اگر آپ کو اپنی گلی میں دیکھ لے تو پھر ہمیشہ کیلئے آپ کی تصویر اُس کے دماغ پر مرتسم ہو جائے گی اور وہ کبھی آپ کو نہیں بھلائے گا۔ دوسری بار دیکھتے ہی سونگھ کر یوں بھونکے گا جیسے کہتا ہو، ہلو —— ہلو۔ آئیے۔ بہت دنوں کے بعد تشریف لے آئے۔ بھوں، بھوں —— بھوں بھوں —!!

گلی کے کُتّے اور سڑک کے کُتّے میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اصل میں ایک ہی شخصیت کے یہ دو نام ہیں۔ گلی کا کتّا صرف گلی کی حد تک ہوتا ہے۔ اس کے سماجی تعلقات اور شخصی روابط گلی سے باہر کچھ نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ اِس دنیا سے واقف نہیں ہوتا اور نہ واقف ہونا چاہتا ہے۔ بس وہ اپنے حلقے کے عوام سے ہی ربط رکھتا ہے۔ اس کے بجائے سڑک کے کُتّے کی سرگرمیوں کا کینوس بڑا وسیع ہوتا ہے۔ وہ کسی ایک سڑک اور شاہراہ کا ہو کر نہیں رہتا۔ شہر کی تمام سڑکیں اور شاہراہیں اُس کی اپنی ملکیت ہوتی ہیں۔ آج اِس سڑک پر تو کل اُس سڑک پر۔ یہ دوسری بات ہے کہ سڑک کے کتّے کو کوئی دُکان یا ہوٹل یا کسی بس اسٹانڈ یا سینما کے بکنگ کاؤنٹر کا نچلا حصہ پسند آجائے۔ آخر سر چھپانے کیلئے کوئی چھت تو چاہیئے!

سڑک کا کُتّا دن بھر شہر کے مختلف مقامات کا دورہ کر کے شام کو یا بڑی رات کو اپنے مقام پر لوٹ جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنے کسی دوست کے اصرار پر اُس کے یہاں ٹھہر جائے۔ یا خود بور ہو کر کسی اور مقام کو منتقل ہو جائے۔ کیونکہ مکان کے تخلیے کا کتّے کے ہاں کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوتا۔ دوسرا کتّا آنے والے کُتّے کا مسکراتے ہوئے استقبال کرتا ہے۔ صرف اس لئے کہ دُکھوں اور غموں میں کُتّے ایک دوسرے کے شریک ہو جاتے ہیں۔ اور ایک ہو کر حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی کسی کُتّے پر خواہ وہ گلی کا ہو یا سڑک کا، حملہ کرے تو ایک ہی آواز پر آس پاس کے تمام کُتّے جمع ہو جائیں گے۔ اور اپنے مظلوم ساتھی کی ہمدردی میں اُسے کاٹ کھائیں گے۔

ویسے کتّوں کے کاٹنے کا علاج ہے بشرطیکہ کاٹنے کے فوری بعد کسی ڈاکٹر سے رجوع ہو جائیں۔ ورنہ مریض کو موت سے پہلے کُتّے کی بولی بولنے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ اگر کورس مکمل ہونے سے پہلے کُتّا مرجائے تو مریض کا خدا ہی حافظ ہے۔ اِس لئے ڈاکٹر کہتے ہیں، کُتّے کو واچ کرو۔ اس کی ہر حرکت پر نظر رکھو۔ مگر کہتے ہیں کہ آدمی کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں۔

کُتّے بڑے سیکولر ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی مذہب ہوتا ہے، اور نہ کوئی زبان۔ لیکن اس کے باوجود دنیا کے تمام کُتّے آپس میں خود کو ایک دوسرے کا بھائی سمجھتے ہیں۔ تاریخی اور جغرافیائی فرق کے باوجود مغرب کا کُتّا مشرق کے کُتّے کو اتنا ہی عزیز رکھتا

۱۔ جتنا مشرق کا کُتا مغرب کے کُتے کو۔ ان کے یہاں رنگ، نسل اور ذات کا کوئی بھید بھاؤ نہیں ہوتا۔ شاید اسی لئے ان میں آپس میں ہی جھگڑے نہیں ہوتے۔ بھائی چارگی اور اتحاد کی ایسی مثال بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔

کُتوں کا یہ بین الاقوامی کردار بڑا ہی اٹوٹ ہے۔ عشق اور محبت کے بارے میں یہ بڑے حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ اور سیکس کو بڑے ہی سائنٹفک نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کے اظہار کیلئے کبھی نہیں شرماتے اس لئے جہاں کہیں اور جس کسی سے انھیں سیکس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہیں فوراً وہ اپنی پیاس بجھا لیتے ہیں۔ اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ وہ دن کا وقت ہے یا رات کا۔ سڑک ہو یا فٹ پاتھ یا گلی، سب ان کے لئے برابر ہے۔ فری سیکس کا یہ خیال غالباً کسی انٹلکچوئل کے دل میں کُتوں کی وجہ سے پیدا ہوا!

دیوجانس کلبی کا جواب نہیں تھا۔ جس فطری نظریئے کی اس نے حمایت کی یا وکالت کی اُسے اپنی زندگی میں برتا ـــــ اور عمر بھر گلی، کوچہ کوچہ ننگا پھرتا رہا۔ اور کچا گوشت کھاتا رہا۔ کوئی جواب نہیں تھا اُس کا۔ ویسے آج بھی اُس کے شاگرد موجود ہیں۔ لیکن اُس کی طرح ماروں اور درختوں کے نیچے زندگی نہیں گذارتے اور نہ کچی غذائیں استعمال کرتے ہیں، البتہ ننگے ضرور پھرتے ہیں۔ بازاروں اور سڑکوں پر۔ خیر اس میں نرالی کیا ہے ـــ!

آدمی نے کُتے سے اور کُتے نے آدمی سے کیا سیکھا نہیں معلوم۔ البتہ ایک عورت کی آواز ہمیشہ ذہن کی وادیوں میں گونجتی رہتی ہے۔ اُس عورت نے کہا تھا، مجھے چاہو، اور مجھ سے پہلے میرے کُتے کو چاہو۔ ضرورت ہے کہ اس بات پر ریسرچ کی جائے۔ ہوسکتا ہے کہ کتوں سے انسانی تعلقات کا کوئی دلچسپ اور چونکا دینے والا گوشہ سامنے آجائے!

اس خطۂ زمین پر قسم قسم کے کُتے رہتے اور بستے ہیں۔ کُتا خواہ وہ افریقہ کے کسی تاریک علاقہ کا ہو یا انتہائی ترقی یافتہ ملک کا، کُتا ہرحال کُتا ہوتا ہے۔ گرم ممالک اور سرد ممالک کے کُتے اپنے رنگ روپ اور عادتوں کی وجہ سے الگ پہچانے ہی نہیں جاتے بلکہ ان میں تھوڑا بہت فرق بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ فرق کتوں کے مجموعی کردار پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ اور نہ ان کے بیچ میں کوئی دیوار کھڑی کرتا ہے۔ ان کا ایک ہی سماج ہوتا ہے۔ اور ایک ہی رویہ جو مختلف تہذیبی اور معاشی سطحوں پر دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے ـــــ بھوں بھوں ـــ بھوں بھوں! ان کے سامنے ہڈی پھینکئے۔ اور پھر تماشہ دیکھئے کہ یہ سب لپک کر کس طرح آپ کے قدموں کے قریب پہنچتے ہیں ـــ چند سخت اور کٹر قسم کے نیشنلسٹ کتوں کو چھوڑتے ہوئے سب کے سب بکاؤ ہیں۔ قیمتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ لیکن جیب میں پیسہ ہو تو انہیں خریدنا کوئی مشکل کام نہیں۔ صرف ایک ہڈی پھینک کر دیکھئے کہ عالمِ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے!

گلی اور سڑک کے کُتے سے لے کر دُنیا جہاں کے تمام کُتوں کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے لیکن کُتوں میں کُتا، گھر کا کُتا بڑا ہی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ وہ اِس زمرے میں نہیں آتا۔ بشرطیکہ اسے اس بات کا احساس ہو کہ آپ ہی اس کے سرپرست ہیں یا اُسے یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ آپ کے گھر میں پیدا ہوا۔ یا آپ نے اُسے اپنے کسی عزیز اور دوست سے بخوشی و رضا گود لے لیا ہے۔ ایسی کسی بھی صورت میں وہ اپنی جان آپ پر نثار کردے گا۔ آپ ایک ہی کیا، آپ کے خاندان کے ایک ایک فرد اور ایک ایک بچے سے محبت کرے گا۔ خواہ آپ اسے کھانے کو دیں یا نہ دیں۔ لیکن اس کی وفاداری میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ آپ کو دیکھتے ہی دوڑ کر قریب آئے گا۔ دُم ہلاتا ہوا قدموں پر لوٹ جائے گا۔ اگر آپ دو چار دنوں، ہفتوں یا برسوں کے بعد لوٹے ہوں تو قدموں کی آہٹ پر بے تحاشہ دوڑ کر آئے گا۔ اور دامن کو منہ سے پکڑ کر پوچھے گا۔ میرے آقا، میرے مالک!! اتنے دن کہاں رہے؟ ـــــ بھوں، بھوں!!

یہ نہیں پوچھے گا کہ میرے کھانے اور پہننے کے لئے کیا کیا لائے ، اور میرے لئے وہ کون سا قیمتی تحفہ ہے جسے آپ نے چھُپا کر رکھا ہے؟

گھر کے کُتّے کے اس کردار سے کون ہے جو متاثر نہیں ہوگا ۔ دوسروں کی کیوں میں اپنے ہی گھر کی بات کروں ۔ میرے گھر میں بھی ایک کتّا ہے جسے میرے چھوٹے بھائی نے پالا ہے۔ لیکن بحیثیت صدر خاندان وہ میرا اُتنا ہی احترام کرتا ہے جتنا دوسرے ۔ حالانکہ میں نے اُسے کبھی کچھ کھانے کو دیا اور نہ اُس کے سامنے کبھی ہڈی پھینکی۔ اس کے باوجود گھر میں قدم رکھتے ہی وہ دوڑ کر قریب آتا ہے یا میرے پہنچنے سے پہلے وہ میرے استقبال کیلئے تیار کھڑا رہتا ہے ۔ پتہ نہیں اُسے میری آمد کی کیسے اطلاع ہو جاتی ہے۔ لمبی لمبی اور بڑی راتوں میں بھی وہ برانڈے یا انگنائی میں ٹہلتا ہوا میرا منتظر رہتا ہے ۔ میں کہتا ہوں ، ٹائیگر! جاؤ اور سوجاؤ' ـــــ اور وہ بڑے ہی معززانہ اور خاموش انداز میں ہلکی سی بھوں بھوں ، والی زبان میں کہتا ہے ، اچھا مالک ! میں سوجاتا ہوں ۔ اب آپ بھی سوجائیے ۔ بڑے تھک گئے ہیں آپ ـــ !!

میں تو واقعی اپنے بستر پر لیٹتے ہی سو جاتا ہوں۔ لیکن وہ نہیں سوتا ۔ ساری رات ایک فوجی سپاہی کی طرح پہرہ دیتا رہتا ہے اور گھر کے ایک ایک فرد اور ان کے سامان کی حفاظت کرتا رہتا ہے ۔ کیا مجال کوئی چور ، اُچکا یا غنڈہ میرے گھر کا رُخ کرے ۔ سارا محلہ جانتا ہے کہ میرے گھر کا کُتّا کسی اجنبی کو گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیتا ۔ اگر رات کے گہرے سناٹوں میں کسی کُتّے کے بھونکنے کی آوازیں آرہی ہیں تو سمجھ جائیے کہ وہ میرے گھر کا کُتّا ہے جس کی وفاداری شُبہ سے بالاتر ہے ۔ یہ وہ کُتّا ہے جو کسی قیمت پر بک نہیں سکتا۔ اور نہ آج تک اس کا کوئی خریدار پیدا ہوا ۔ یہ بھوکا مرجائے گا لیکن اپنے آقا سے غداری نہیں کرے گا ۔ لیکن یہ سب کچھ اُسی وقت ممکن ہے جب آپ گھر کے کُتّے کو یہ احساس دلادیں کہ آپ ہی اُس کے سرپرست ہیں ۔ یا اُسے آپ کے گھر میں پیدا ہونے کا فخر حاصل ہے ۔ یا ـــــــ بھوں ، بھوں ـــــــ بھوں بھوں !! ـــ !

--

دو شعر

خون روئے گا ، جگر بیٹھے گا مرجائے گا
آئینہ آپ کو دیکھے گا تو ڈر جائے گا

مسکراتے ہوئے چہرے سے جھٹک دو زلفیں
نقلی بالوں کا ذرا حسن نکھر جائے گا

عطاء الرحمٰن طارق

کس قدر گندی ہے [illegible] ہے دنیا
جیسے سسرال کو جانے کی گلی ہے دنیا

سر ہلاتی ہے تو آجاتے ہے بھونکپ یہاں
گائے کی سینگ پہ کہتے ہیں ٹکی ہے دنیا

طلعت سہسرامی

محمد بُرہان حسین

"فِلمی کیلنڈر"

تاریخوں کا حساب کتاب اہم واقعات سے یاد رکھنے کا طریقہ بہت پرانا ہے۔ عیسوی سن حضرت عیسیٰ سے شروع ہو کر پیچھے کی طرف اور آگے کی طرف چلتا ہے جیسے مارچ پاسٹ میں بچوں کی ٹکڑیاں رنگین جھنڈیاں لئے ایک مقام پر پہنچ کر دونوں طرف مخالف سمتوں میں روانہ ہو جاتی ہیں۔ ایک طریقہ یوں تھا کہ 'ا' سے 'ی' تک کے حروف کو قیمتیں دے دی گئیں اور کسی اہم واقعہ کی تاریخ کو مصرعہ یا چند الفاظ میں محفوظ کر دیا جاتا تھا کہ ان الفاظ کے حروف کی قیمتیں جمع کریں تو سن نکل آتا تھا۔ غالب کی موت کی تاریخ "غالب بمرد" سے نکلتی ہے۔ لیکن یہ طریقہ ختم ہو گیا چونکہ ان حروف کی قیمتیں صدیوں سے ویسی کی ویسی رہیں ۔ قیمتیں نہ بڑھنے کا مطلب یہی ہے کہ ان کی مارکٹ میں طلب نہیں رہی۔

آج کل ہم لوگ تاریخیں فلموں سے یاد رکھتے ہیں۔ جیسے ہم غدر کا سنہ ہرگز نہ یاد رکھ سکتے اگر غدر ۱۸۵۷ء نام کی ثریا کی فلم نہ بنتی۔ ہم دوستوں میں بحث چل نکلی کہ شرفو میاں کے والد کس سن میں اکسائز کے محکمہ کی نوکری چھوڑ کر جنت سدھارے۔ ہر شخص علحدہ سن بتاتا تھا اور بضد تھا کہ وہی درست کہہ رہا تھا۔ یہ بحث بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ اس سے پہلے عمر شریف کی عمر پر چاقو چل گئے تھے۔ مگر خانصاحب نے اپنی عقل کو چراگاہ سے عین وقت پر طلب کر لیا اور کہا کہ اُن کی موت کا سن ۱۹۶۰ء تھا اور ثبوت کے طور پر ایک مشہور واقعہ پیش کر دیا۔ "یا ہے ہم سب دوست مغلِ اعظم کے ٹکٹ کی قطار میں کھڑے تھے کہ بچہ شرفو میاں دوڑتا ہوا آیا اور بولا کہ ' ایک ٹکٹ کم لیجئے چونکہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا وہ شائد فلم نہ دیکھ سکیں'۔ اور جب ہم لوگ فلم دیکھ کر نکلے ہیں تو ایک طرف انارکلی کی ٹریجڈی دوسری طرف دوست کی موت۔ ان صدمات کو ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔

خواتین اپنی عمریں قرض لی ہوئی رقم کی طرح بھول جاتی ہیں۔ ایک دفعہ سفیہ اور رفیعہ میں اپنے ننھوں کی عمروں پر تنازعہ کھڑا ہو گیا ہر ایک اپنے بچہ کو کم عمر ثابت کرنے پر تُل گیا۔ لیکن صفیہ نے کہا۔ "اری جب تو اور میں "شعلے" دیکھنے گئے تھے تو تیرا ابو تیری گود میں تھا اور میرا منّو میرے پیٹ میں تھا۔"

دراصل صفیہ فلموں کی اہمیت کو سمجھ چکی تھی۔ شادی سے پہلے کچھ عورتیں شادی کے لئے اُسے دیکھنے آئیں تو ایک لڑکی نے اُسے دیکھتے ہی پہچان کر کہا۔ "ارے یہ تو بڑی اوباش لڑکی ہے ہر فلم پہلے دن پہلا شو دیکھتی ہے۔"

کسی نے کہا۔ "کسی نے آپ کو غلط کہہ دیا ہے۔"

"غلط ؟ ـــ ارے میں خود اسے دیکھتی رہی ہوں توبہ۔ چلو چلو۔ کبھی ہم شریفوں میں اس کا گذر مشکل رہے گا۔"

اس واقعہ کے علاوہ ایک اور بات تھی کہ عرصہ تک عورتیں صفیہ کو دیکھنے آتی رہیں اور واپس جاکر کہلا دیتیں کہ لڑکی کی عمر زیادہ ہے۔ رشتہ دار عورتیں ایک دوسرے کو الزام دیتیں کہ عمر کا ذکر کس نے کیا۔ گھوم پھر کر بات چھوٹی خالہ پر پہنچ جاتی کہ وہی صفیہ کے اچھے گھر، عزت و وقار سے جلتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہی واقعہ ہوا تو خاندان میں اختلافات کی چنگاری لگانے والی زمرد خالہ نے صفیہ سے پوچھا "اُس لڑکی نے تم سے پوچھا تھا۔ "آپ فلم دیکھتی ہیں ؟"

صفیہ نے کہا۔ "ہاں پوچھا تھا، میں نے جواب دیا تھا۔ "جی کبھی کبھی، بہت کم۔"

زمرد خالہ نے پوچھا۔ "اور یہ پوچھا تھا کہ آپ نے فلم 'انداز' دیکھی ہے۔؟"

"ہاں پوچھا تھا۔ میں نے کہا تھا۔ ہاں ! دیکھی ہے۔" صفیہ نے کہا

"اور یہ پوچھا تھا کہ آپ کو کون سے ہیرو پسند ہیں ؟"

"میں نے کہا تھا۔ میں کرنٹ ہیروؤں میں ونود کھنہ کو، اُس سے پہلے والوں میں دھرمیندر کو، اُس سے پہلے دور میں دلیپ کمار کو پسند کرتی ہوں۔"

زمرد خالہ نے کہا۔ "بس ! اسی سے تو وہ لوگ اندازہ لگا لے کہ تم قدیم چیز ہو۔ آجکل لوگ فلموں کے کیلنڈر میں تاریخیں دیکھتے ہیں۔"

صفیہ نے کہا۔ "لو یہ خوب رہی ارے ساری پرانی فلمیں تو ٹی۔وی پر دکھائی جاتی ہیں۔"

لیکن صفیہ معاملہ کو سمجھ گئی۔ اس کے بعد ایک اور پارٹی اُسے دیکھنے آئی تو کچھ اس قسم کی گفتگو رہی :۔

سوال :۔ "آپ نے فلم 'دیکار' دیکھی تھی ؟ صفیہ کا جواب :۔ "اس نام کی فلم بنی تھی ؟"

سوال :۔ "آپ نے اشوک کمار، مدھوبالا کی مشہور فلم 'محل' دیکھی تھی۔ کیسی لگی آپ کو ؟"

جواب :۔ "اشوک کمار تو کیچڑ اداکار ہیں۔ 'محل' فلم میں ہیرو کون تھا ؟ ۔ مدھوبالا بڑی خوبصورت اداکارہ تھی۔ سُنا ہے 'مغل اعظم' کی ہیروئن وہی تھی۔"

سوال :۔ "آپ نے 'زنجیر' فلم تو ضرور دیکھی ہوگی ؟"

جواب :۔ "وہ بھی، امی کی گود میں بیٹھ کر دیکھی تھی۔"

سوال :۔ "آپ کو امیتابھ بچن پسند ہے ؟"

جواب :۔ "ہاں۔ بڑے میاں مار دھاڑ اچھی کر لیتے ہیں۔"

ایک عورت نے آگے بڑھ کر صفیہ کی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "لڑکی ہمیں پسند ہے اور عمر کے لحاظ سے بھی ہمارے لڑکے کیلئے موزوں ہے۔ میں منہ میٹھا کئے دیتی ہوں۔"

—

٭ ٭ ٭

شفیع پرویز انجم (حیدرآباد)

(آزاد نظم)

"لمحوں کی خوشی"

ایک مہاشے تھے کرایہ کے گھر میں
ایک ہی کمرہ تھا جس میں
ساس سسر گھر میں براجمان تھے
تین ہفتوں سے وہ مہمان تھے
بیٹی کا دل تو تھا سرشار
داماد تھا مگر بیزار

ایسے میں . . .
رفتارِ زندگی کم ہوگئی
وقت کا دھارا تھم گیا
محبت کے دیوتا نے منہ پھیر لیا
وہ اپنی بیوی سے کہنے لگا
چلو چل کر کوئی دیکھیں گے پرانی پکچر
بالکنی کا ٹکٹ لے لیں گے
سیٹ پر کونے کی جا بیٹھیں گے
ہنس پڑی بیوی یہ سن کر
پھر ایک انداز سے کہا مسکرا کر
سیٹ کونے کی نہ ملی تو ؟
شوہر جھنجھلا کر کہہ اٹھا
"تو پھر پکچر ہی دیکھ لیں گے" !!

❋ ❋ ❋ ❋ ❋

غزل

سراج نرملی

راہبری راہبری ہے کیا کہیئے
لیڈری لیڈری ہے کیا کہیئے

جسم فربہ ہے اُن کا اور ابتر
لاغری لاغری ہے کیا کہیئے

بی-اے پڑھ کر بھی اپنی قسمت میں
ویٹری ویٹری ہے کیا کہیئے

چھٹیاں بیس دن مہینے میں
ٹیچری ٹیچری ہے کیا کہیئے

شام ہوتے ہی گھر پہنچنا ہے
شوہری شوہری ہے کیا کہیئے

کیا بتائیں کہ وائف کیسی ہے؟
سرپھری سرپھری ہے کیا کہیئے

پانچ سو کے ہزار ہوتے ہیں
تاجری تاجری ہے کیا کہیئے

اے سراج! اُنکی شان و شوکت تو
ظاہری ظاہری ہے کیا کہیئے

قطعہ

اشرف ملاوی

یاد آئی اُن کو اپنی جوانی تو رو پڑے
کہنے لگے کہ اب کسی قابل نہیں رہا
نوّے برس کی عمر میں یہ حال ہوگیا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

علی عباس امید

قصہ تیسرے درویش کا

تیسرے درویش نے کان سے بیڑی کا ٹکڑا نکالا اور ماچس کے لیے پہلے درویش کا جیب ٹٹولنے لگا۔ قریب تھا کہ پہلا درویش آپے سے باہر ہو جاتا لیکن چوتھے نے آگے کھسک کر اپنے جاپانی لائٹر سے اس کی ہندوستانی بیڑی کا ٹکڑا سلگا دیا۔ تیسرے درویش نے جلدی جلدی دو چار کش لگائے پھر ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اور بڑی پرسوز آواز میں اشعار پڑھنے لگا:

بن کے لیڈر اور منسٹر کچھ نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
پیٹ کے آگے مگر سب طاقِ نسیاں ہو گئیں

یہ سنتے ہی دوسرے درویش نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کی بے ترتیب داڑھی چوم لی اور گلوگیر آواز میں بولا:

اسی چکر نے مجھ کو بھی کیا ہے در بہ در بھائی
وگرنہ تھی چچا غالب سے اپنی بھی شناسائی
کبیر و میر اور ٹیگور تو اپنے ہی گھر کے تھے
رہا ہوں مدتوں پی۔ بی۔ شیلی تک کا تماشائی

چوتھے درویش نے سگریٹ کا طویل کش لے کر انتہائی بھیانک قہقہہ لگایا اور پہلے سے کہانی شروع کرنے کی فرمائش کی
تیسرے درویش نے بیڑی ایک طرف پھینکی، منہ میں تمباکو کی چٹکی دبائی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کے بعد داستان شروع کی:

میرے نوزائیدہ ساتھیو! اس ذرہ ناچیز کی داستانِ حیرت بیان کہاں سے شروع ہوتی ہے اسے خود بھی علم

نہیں، پھر بھی موٹی موٹی باتوں اور بڑے بڑے واقعات اور تجربات کو یکجا کرنے سے پاکٹ بکس میں شائع ہونے والے ناولوں جیسی ایک چیز بن گئی ہے۔ جسے آپ حضرات کو سنانے جا رہا ہے۔

حقیر پُر تقصیر آج سے صرف اٹھارہ ماہ پہلے ایک سرکاری دفتر میں کلرک تھا۔ چونکہ کلرکی سے آپ سب خوب واقف ہیں اس لیے تشریح کی ضرورت نہیں۔ بہرحال خاک رہی۔ جیسے حال بسر ہو رہی تھی۔ کہ ایک دن دفتر کے بڑے بابو نے بلایا، پہلی بار بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھایا اور بڑے صاحب کی جعلی دستخط بنانے کا گُر سکھایا۔ جب میں الٹے سیدھے دستخط کھینچنے لگا تو ایک ٹائپ شدہ کاغذ مع نوٹوں کی ایک گڈی کے میری طرف بڑھایا اور دستخط کرنے پر اکسایا۔ نوٹ دیکھ کر میرے منہ میں سیلاب آگیا۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ شرافت اور ایمان کی ایک نامعقول چنگاری بچ رہی تھی اس نے وہ سارا پانی جذب کر لیا، نتیجہ میں میرے لیے انکار کے سوا کچھ بھی چارہ نہ رہا۔ بڑا بابو بہت بگڑا بنا، نیلی پیلی آنکھیں دکھائیں، دھمکیاں دیں۔ لیکن میں اس کے سامنے کھڑا وداپنی بات پر اڑا رہا۔ اس واقعہ کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد دفتر کے بڑے صاحب کی طرف سے مجھے نالائقی کا پروانہ مل گیا۔ میں نے لاکھ گریہ وزاری کی، علیے ماندے کا واسطہ دیا لیکن وہ مرد ناہنجار، بدخوار بداطوار ٹس سے مس نہ ہوا۔ مجبوراً میں نے وہ کاغذ ہاتھ میں تھام دوسرے دفتروں کے چکر لگانے شروع کر دیئے۔ لیکن بے فائدہ جہاں جاتا چپراسیوں کی جھڑکیاں کھاتا۔ اور دور ہی سے "نو ویکنسی" کی دیرینہ تختی دکھا کر واپس کیا جاتا۔ ایک دفتر میں اپنے کلرک دوست کی سفارش لے کر گیا وہاں نوکری کے تذکرے سے پہلے ہی لوگوں نے میری جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ چونکہ بندے کی اکلوتی قمیص کی واحد جیب پہلے ہی داغ مفارقت دے چکی تھی اس لیے انھوں نے بڑے خلوص سے چپراسی کو آواز دی۔ پھر مجھے دھکے دے کر باہر نکالنے کا حکم صادر فرما کر اپنے کام میں محو ہو گئے۔

چند ہی دنوں میں ہر طرف سے مایوس ہو کر اور حضرت پیٹ کی درندگی سے عاجز آکر میں نے اسٹیشن کا رخ کیا اور قلیوں میں شامل ہونے کی ٹھانی۔ گاڑی آئی اور سارے قلی اس ہڈی پر جھپٹ پڑے۔ میں نے ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کا رخ کیا اور جیسے ہی سامان اٹھانے کے لیے جھکا سامان والے کی کڑک دار آواز سنائی دی" ٹھہرو! پہلے یہ بتاؤ کہ تم کیا لوگے؟"

میں بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا، عاجزی سے بولا" جو بھی آپ دیں گے لے لوں گا۔"

ابھی وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ ایک دوسرا قلی وہاں آکر ٹھہر گیا اور مسافر سے کہنے لگا "صاحب! میں ایم۔اے پاس ہوں۔ ایک سال ریسرچ کر چکا ہوں۔ صرف ساٹھ پیسے لوں گا۔ اٹھالوں؟"

اتنا سنتے ہی باوجود نقاہت کے میں بی۔اے پاس تصور میں دم دبائے باہر بھاگا، لیکن گیٹ ہی پر ٹکٹ چیکر نے پکڑ لیا اور میری خستہ حالی پر رحم کھا کر ایک ماہ کی جیل کرا دی۔

میری اصل داستان جیل سے ہی شروع ہوتی ہے۔ جیل میں مجھے نامی گرامی فن کاروں کے ساتھ رہنے اور بڑے بڑے گر سیکھنے موقع ملا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں صرف جیل کی بدولت ہوں۔ میں اپنے جیل کے ساتھیوں میں استاد ننکو کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس کی قابلیت اور واقفیت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اتنا مکمل فنکار آج تک مجھے نہ مل سکا۔

اس نے جیب تراشی سے لے کر کوکین فروشی تک کا طریقہ مجھے بتایا، سکھایا

خیر تو ساتھیو! جیل سے چھوٹ کر میں بے فکری کی زندگی گذارنے لگا، بغیر ہلدی پھٹکری لگے زیادہ سے زیادہ کمانے اور اچھے سے اچھا کھانے لگا۔ ایک شام شہر کے چوراہے پر مراقبے میں کھڑا ہوا تھا کہ ایک بے ڈول کھدر پوش کی متعدد وزنی جیبیں نظر آئیں۔ اندھا تو دو آنکھیں چاہتا ہے، پیچھے لگ لیا۔ چلتے چلتے و ٹاؤن ہال میں پہنچ گیا۔ وہاں زبردست بھیڑ اکٹھا تھی اور ایک شخص نشے میں دھت نشہ بندی کے خلاف دھواں دھار تقریر کر رہا تھا۔ اس کی تقریر میں خاص بات یہ تھی کہ ہر جملہ الگ الگ ہوتا تھا۔ پچھلے سے اگلے کا سوتیلا رشتہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی مجمع تالیاں بجا کر داد دے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں اسکے پاس پہنچا اور کان میں جھک کر بولا "حضرت مقرر! ایسا بھاشن لگنے سے منہ میں چیونگم ڈال کر بیٹھ رہنا زیادہ بہتر ہے۔ ابھی ابھی جو جملہ آپ نے ادا کیا ہے اس میں عارضی اور مستقل کا استعمال غلط ہے یوں بھی آپ نشہ میں ہیں اس لیے صحیح کی توضیح فضول ہے۔"

اس پر وہ چیخ کر بولا "میں سمجھ گیا، تم گریجویٹ ہو۔ بے شک میں نشے میں ہوں۔ لیکن میرا نشہ ایک عارضی چیز ہے اور تم سب کی بے وقوفی مستقل"، اتنا سنتے ہی تالیاں بجانے والا مجمع بغلیں بجانے لگا اور میں اپنا سا منہ لے کر اس جلسے سے باہر نکل آیا اور ایک لوکل بس میں بیٹھ گیا۔

بس عجیب طرح سے لہراتی ہوئی چل رہی تھی۔ سارے کے سارے مسافروں کا منہ کھلا ہوا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ایک نیم مرد نے اس سے کہا" ڈرائیور صاحب، آپ بہت ہوشیار معلوم ہوتے ہیں جبھی اتنی لاپرواہی سے بس چلانے کے بعد بھی ہنس رہے ہیں۔"

یہ سن کر ڈرائیور نے پہلے سے زیادہ تیز قہقہہ لگایا۔ پھر اطمینان سے بولا" تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس طرح بس چلانے پر نہیں ہنس رہا ہوں بلکہ یہ سوچ کر خوش ہو رہا ہوں کہ میرے چلے آنے پر پاگل خانے کے نگراں کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے۔" اس کے آگے کچھ اور سننے کی ضرورت نہیں تھی لہذا میں نے چلتی بس سے چھلانگ لگا دی۔

صبح سے کوئی اسامی ہاتھ نہیں آئی تھی اس لیے یونہی بھوکا پیاسا گھوم رہا تھا۔ بھوک مٹانے کا تو کوئی خودی انتظام تھا نہیں، میں نے پیاس ہی کو نیست و نابود کرنے کی ٹھانی اور ایک سرکاری نل کھول کر چلّو بڑھایا ہی چاہتا تھا کہ اس سے پانی کے بجائے ایک تنومند سیاہ سانپ دست بوسی کو بڑھا۔ میرے دماغ کی ساتویں کھڑکی کے دونوں پٹ ٹوٹ کر نیچے آ رہے اور میں سر پر ہاتھ رکھ کر بھاگا۔

ایک گیدڑ بھی شہر کی طرف بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ میں بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ اور چند ہی منٹوں میں اس سے جا ملا۔ پاس پہنچ کر اس سے کہا" نامعقول، کیوں اپنی جان کا دشمن ہوا ہے۔ جانتا نہیں کہ گیدڑ شہر کی طرف کب بھاگتا ہے؟"

وہ زوروں سے ہنسا پھر جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے سوال کیا" اگر شہر میں بھی اپنی برادری بستی ہو تو؟"

میں لاجواب ہو کر اسے دو چار ہاتھ رسید کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ وہ بولا" بگڑنے کی ضرورت نہیں۔ چلو میرے ساتھ تم خود ہی دیکھ لوگے" میں اسکے ساتھ ہو لیا۔ ہم سے چند قدم پہ چلتے ہوئے دو نوجوانوں میں سے ایک نے کہا" میں تو آئی۔ سی۔ ایس ہوں؟"

دوسرے نے ایک قدم آگے بڑھ کر سینہ پھلایا "میں نے تو اپنے مزاج کو دیکھتے ہوئے پی۔ سی۔ ایس کی لائن چنی" میں آنکھیں پھاڑے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا کیونکہ آئی۔ سی۔ ایس تو کجا وہ دفتر کے باوردی چپراسیوں سے بھی کمتر نظر آ رہے تھے۔ میری کھلی آنکھیں دیکھ کر گیدڑ طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بولا "تم اس بستی کے رہنے والے ہو۔ پھر بھی نہیں سمجھے!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس نے کہا "دونوں ہی نے صحیح بولا ہے۔ ایک آئس کریم سیلر ہے اور دوسرا پوٹیٹو چاپ سیلر چونکہ یہ ذہنی طور پر مکمل ہیں۔ اسلئے معاف کہتے ہوئے ڈرتے ہیں — ندامت چھپانے کے لیے میں نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک لنگڑے بھکاری کو مخاطب کر لیا۔ بھائی لنگڑا ہونا بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ تم اندھے نہیں ہو۔ وہ اس سے بھی بڑی لعنت ہے۔

لنگڑے بھکاری نے مسکرا کر جواب دیا "شریمان جی۔ ایک کا تجربہ بالکل درست ہے۔ میں بھی جب اندھا تو لوگ مجھے کھوٹے سکے دے جایا کرتے تھے!"

گیدڑ نے تمسخر سے میری طرف دیکھا اور میں نے خواہ مخواہ قدم تیز کر دیئے۔

کچھ دور چلنے پر ایک جگہ بھیڑ نظر آئی۔ گیدڑ کے جتو سے میں اس کا سبب دریافت کرنے بڑھا۔ قریب پہنچ دیکھا کہ ایک جانور نما شخص نے ایک سیلے مانس جس کے سر سے گاڑھا گاڑھا رنگین پانی بہہ رہا تھا، کا گریبان پکڑ رکھا اور چیخ چیخ کر لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا "مہر کیا دیکھتے ہو، خدا لگتی کہو۔ اس کمینے نے میری لاٹھی توڑ دی ہے۔ تو بولو مجھے بدلا ملنا چاہیے یا نہیں؟"

اس عجیب ترین بات پر مجھے کچھ اس قدر حیرت ہوئی کہ گیدڑ کو فراموش کر کے میں نے آگے بڑھ کر اس جانور نما انس سے پوچھا "کیوں جناب انھوں نے آپ کی لاٹھی کیسے توڑ دی؟"

اس نے پہلے تو سر سے پیر تک مجھے گھور کر دیکھا پھر منہ کو اور بھی بگاڑ کر بولا "اتنی بھی عقل نہیں ہے تم کو؟ اسے اپنا پہاڑ جیسا سر میری نازک سی لاٹھی پر دے مارا اور وہ تقریباً شہید ہو گئی۔"

میں بھاگنے ہی والا تھا کہ گیدڑ نے میرا پیچھے کا دامن پکڑ لیا اور بولا میرے بھائی شرم غیروں سے ہوا کرتی ہے اپنوں سے نہیں! بھاگنے کی کیا ضرورت ہے، کافی چل چکے ہو۔ تھک گئے ہو گے۔ میں بھی تکان محسوس کر رہا ہوں۔ بھوک بھی محسوس ہو رہی ہے۔ چلو کسی اچھے ہوٹل میں تھوڑی دیر بیٹھیں گے اور کھانا کھائیں گے۔ بھوک اور کھانے کا ذکر سن یاد آیا کہ میری آنتیں پی ایل ۴۸۰ کی گردان کرتے کرتے نیم مردہ ہو چکی ہیں۔

گیدڑ مجھے لے کر ایک آراستہ پیراستہ رستوران میں داخل ہوا۔ بیروں سے لے کر منیجر تک مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ گیدڑ نے بے شمار چیزوں کا آرڈر دیا۔ چار بیرے سامان لانے گئے اور ہم دونوں ہاتھ صاف کرنے لگے۔ اقسام مقدار دونوں ہی لحاظ سے میری زندگی کا وہ "ہٹ" کھانا تھا۔ کھانے کے بعد گیدڑ نے "بنت عنب" سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی میں خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ دو گھنٹہ بعد جب ہم چلنے لگے تو بیرے نے بڑے ادب سے بل پیش کیا۔ بل دیکھتے ہی گیدڑ آپے سے باہر ہو گیا۔ شور سن کر منیجر بھاگا بھاگا آیا اور ہنگامے کا سبب دریافت کرنے لگا۔ گیدڑ نے اور بھی زور سے چیخ کر کہا "یہ

تم سب کا چالان کرا دوں گا" تمہارے یہاں گھی سے لے کر مسالہ اور اناج تک ہر چیز نقلی ہے اور ملاوٹ استعمال کی جاتی ہے ....." اس کے کچھ اور بولنے کے پہلے منیجر نے پاس سے گزرتے ہوئے بیرے کی ٹرے سے دو کوفتے نکال کر اس کے منہ میں ٹھونس دیئے اور ہاتھ جوڑ کر منت کرتے ہوئے بولا " ہماری عزت آپ کے قدموں میں ہے۔ بزنس کا واسطہ، خاموش ہو جائیے کہ اس وقت آپ نے ہماری لاج رکھ لی تو ہم آپ کو دو اصلی مرغ دیں گے۔"

وہ گردن اکڑا کر بولا " نہیں، میں رشوت نہیں لیتا۔ لیکن اپنے بیروں کو کم از کم اتنا تو سمجھا دو کہ شخصیت دیکھ کر برتاؤ کیا کریں۔ یہ سبھی کو آدمی سمجھتے ہیں۔" اور وہ آگے بڑھ گیا۔ میں اس کی تقلید کرنا ہی چاہتا تھا کہ منیجر نے مجھے گریبان سے پکڑ لیا اور کہنے لگا " تم کہاں جاتے ہو؟ نہ تو یہ تمہارے والد کے دادا کا گھر ہے نہ یتیم خانہ۔ آہستہ سے بل کی رقم نکالو۔"

میں نے اپنی بغیر جیب کی قمیص اسے دکھائی تو وہ اپنا والیوم کم کرنے کو بولا " اچھا تو میں تمہارا نام لکھ لیتا ہوں ——— جب روپے ہو جائیں دے جانا۔"

اس کی اس اچانک تبدیلی پر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ وہ مجھے کاونٹر پر لے گیا اور نام دریافت کر کے رجسٹر کے بجائے دیوار پر لکھنے لگا۔ اور بھی تعجب ہوا۔ بہر حال شکریہ ادا کر کے میں چلنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے کہا " اپنی قمیص اتار کر اس نام پر ٹانگ دو، ورنہ لوگ دیوار پر تمہارا نام دیکھ کر تمہاری عافیت تنگ کر دیں گے۔"

میں نے قمیص اتارنے ہی میں عافیت کی وسعت دیکھی۔ جب میں صرف بنیان پہنے باہر نکلا تو گیدڑ کو اپنا منتظر پایا۔ مجھے اس مردود پر ہٹلری غصہ آ رہا تھا کیونکہ اس نے ہر جگہ مجھے شکست دی تھی۔ لہٰذا بے تحاشہ اسے مارنے کے لیے دوڑا، لیکن وہ خوش بخت ایک ہی جست میں سڑک کے دوسری طرف پہنچ گیا اور میں بدبخت اس تک پہنچنے کی ناکام کوشش میں ایک برق رفتار ٹیکسی کی زد میں آ گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو اسپتال کے بستر پر پایا۔ جسم پر جگہ جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، درد کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہو چکی تھی۔ میری بغل والے مریض کے پاس کئی لوگ کھڑے تھے اور ڈاکٹر اس کے جسم کے مختلف حصوں کو بڑی بے چینی سے ٹٹول رہا تھا۔ آخر اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا " مجھے افسوس ہے کہ اب یہ اس فانی دنیا میں نہیں ہے۔"

یہ سنکر اس کی بیوی زور زور سے چیخنے اور پیٹنے لگی، لٹ گئی والا قدیم بین کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نحیف الجثہ مردہ نے کروٹ لی اور مری ہوئی آواز میں بولا " تمہیں اس طرح اپنا دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے، ابھی تو میں زندہ ہوں۔"

وہ عورت چونک پڑی پھر بگڑ کر بولی " ہمیشہ بے تکی بات کرتے ہو۔ بھلا اتنے بڑے ڈاکٹر جھوٹ کہیں گے۔؟"

کچھ دیر بعد مجھے اسٹریچر پر ڈریسنگ روم میں لے جایا گیا۔ وہاں کمپونڈر سگریٹ پھونک پھونک کر نرس کی عدم موجودگی کے غم کو غلط کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا " بیٹے چپ چاپ پڑے رہو۔ جب تک 'ہنی' نہیں آئے گی، کوئی کام نہیں ہو سکتا۔"

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد نرس صاحبہ خراماں خراماں تشریف لائیں۔ میرے خود ساختہ والد محترم یعنی حضرت کمپونڈر نے آگے بڑھ کر اپنی خیالی دُم ہلاتے ہوئے اس سے دیر میں آنے کا سبب دریافت کیا۔ اس نے یہ جملہ پڑھا ہی سے اچانک

ست کرتے ہوئے جواب دیا۔ "کیا بتاؤں۔ آج جو نوجوان میرا پیچھا کر رہا تھا اس کی چال اتنی دھیمی تھی کہ بے وقت ہو گیا۔

صاحبانِ نامہربان! دو ہفتہ بعد جب میں اسپتال سے نکلا تو بینائی بھی میرے جسم سے غائب ہو چکی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ روزی بالفاظ دیگر روٹی کا چکر سدا کی طرح آگے تھا، اس لیے جستجو میں چل پڑا۔ کچھ دور جانے پر ایک بہت بڑے میدان میں ایک عالی شان پنڈال رنگ برنگی جھنڈیوں اور قمقموں سے سجا ہوا نظر آیا۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ بہت بڑا مشاعرہ ہو رہا ہے۔ میں یہ یک کرشمہ دو کار، کو حقیقت کا روپ دینے کے خیال سے ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ پنڈال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آدھ گھنٹہ بعد بھانت بھانت کے شاعروں کی فوج ڈائس پر آکر بیٹھ گئی۔ صاحبِ صدر نے متعدد ہار قبول کرنے اور متعدد ریپز دینے کے بعد اپنی پونے تین منٹ کی تقریر میں اٹک اٹک کر انکشاف کیا کہ "پرانی شاعری بالکل اوندھی تھی۔ اگر سچی شاعری کا لطف لینا اور زندگی کو سمجھنا ہو تو آدمی کو علامتی شعراء کے بعد والے گروہ کے کلام بے لگام سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ چنانچہ آج کے مشاعرہ میں جدید تر نسل کے شعرائے کرام اکٹھا ہیں۔ اور وہ عوام کو اس نئی صنف سے روشناس کرائیں گے۔ یہ شاعری شاعر اور سامع دونوں ہی کے لیے روح سے زیادہ جسمانی طور پر مفید ہو گی۔"

میں نے بی اے تک اردو ادب پڑھا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس جدید تر شاعری سے بالکل ہی ناواقف تھا۔ لہٰذا دھندے کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر کے شاعری سننے کی ٹھانی۔ ایک سے ایک رنگروٹ اپنی بے ترتیب لیٹس سنوارتا بلکہ مروڑتا ہوا مائک پر نازل ہوتا اور مجذوب کی بڑ کی طرح نہ جانے کیا اناپ شناپ بک کر چلا جاتا۔ ایک خاص بات جو میں نے اس مشاعرہ میں دیکھی وہ یہ کہ ہر شاعر کے کچھ مخصوص لوگ تھے جو اس کے ایک ایک لفظ پر باجماعت رونا شروع کر دیتے تھے۔ عوام کا داد دینے کا طریقہ بھی نرالا تھا۔ متعدد لوگ وجد میں آجاتے اور امداد باہمی کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کا سر پیٹنے لگتے تھے۔

رجعت پرست صاحبو! یہ نئی شاعری سن کر میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ ٹھیک اسی وقت پیٹ میں باغی نفتوں نے جدید تر شاعری بدھو ایکشن، شروع کر دی۔ مجھے دھندے کا خیال آیا۔ میں نے سوچا موقع لاجواب ہے، لوگ شاعری سن کر نیم بسمل ہیں، میں کچھ لے ہی اڑوں۔ پاس بیٹھے ہوئے ایک سوٹ بوٹ والے جنٹلمین کا بٹوہ بڑی صفائی سے نکال کر میں چلتا بنا۔ پنڈال سے نکل کر کچھ ہی دور گیا تھا کہ کسی نے میرے ننگے کاندھے پر لوہے کے ہاتھ رکھ دیئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہی شخص تھا جس کا پرس میں نے پار کیا تھا۔ میرے قدموں کے نیچے سے زمین نکلنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ وہ بولا "گھبراؤ نہیں۔ تم میرے دوست ہو۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہے۔ چلو پہلے کھانا کھالو۔ لیکن نہیں، پہلے کپڑے پہننے پڑیں گے ورنہ ہوٹل والے تمہیں اندر نہیں جانے دیں گے۔"

ایک ریڈی میڈ کی دوکان سے اس نے مجھے انگریزی سوٹ دلایا اور پھر مجھ کو لے کر ایک اعلیٰ درجہ کے ریستوران میں داخل ہوا۔ بیرے نے از حد خاکسارانہ انداز میں سلام کیا جس سے پتہ چلا کہ وہ کوئی بہت بڑا اور بارسوخ آدمی ہے۔ عمدہ قسم کا کھانا کھانے کے بعد بغیر بل دیئے ہوئے ہم باہر نکلے۔ باہر آتے ہی اس نے کہا "بزنس" میں کچھ بھی نہ سمجھا میں نے پھر پوچھا "بولو تیار ہو؟" میں نے یہ سوچ کر کہ وہ کوئی بہت بڑا بزنس مین ہے اقرار میں گردن ہلا دی۔ اور بولا "جی ہاں! میں

جویٹ ہوں - پانچ سال تک سرکاری کلرک رہ چکا ہوں۔ اس پر اس نے قہقہہ لگایا پھر بولا۔ میں تو تمہارے ہی بزنس کی بات کر رہا ہوں، وہی جو تم نے ابھی میرے ساتھ کیا تھا۔" اس کے بھیانک جبڑے اور خوفناک آنکھوں کی تاب نہ لا کر میں نے تھوڑی دن سے ملا دی - اس نے کہا: "چلو پہلے تمہیں استاد پیر ملّو شاہ سے ملنا ہوگا۔"

ٹیکسی میں ہم شہر کے باہر ایک قبرستان میں پہنچے وہاں ایک بوسیدہ لیکن کشادہ مکان کے صحن میں بڑے سے تخت مسند کے سہارے عقیدت مندوں کے ہجوم میں ایک ادھیڑ عمر مجذوب فقیر بیٹھا ہوا تھا۔ کبھی وہ گالی بکنے لگتا، کبھی کوئی چیز اٹھا کر لوگوں پر پھینک دیتا اور مجمع ہو حق کے نعرے لگانے لگتا۔ میرے ساتھی نے اس کے پاس پہنچ کر آہستہ سے کچھ کہا۔ اس نے تحاشہ گالیاں بکنی شروع کر دیں اور اپنا ڈنڈا اٹھا لیا۔ مجمع آہستہ آہستہ اُلٹے پیروں پیچھے کھسکنے لگا - جب سب چلے گئے تو اس نے کھا جانے والی نظروں سے میرا جائزہ لیا پھر بولا" تم پر اعتماد کر لوں ؟" میرے منہ کے بجائے گردن سے اثباتی جواب دیا آدمی نے کہا" استاد! میں نے اس کا ہاتھ دیکھ لیا ہے۔ پہلے ہی منجھا ہوا ہے۔ دوسرے کاموں سے بھی چند ہی دنوں میں اسے واقف کرا دیا جائے گا۔ ملّو شاہ نے مجھ سے کہا "بے ایمان لوگوں کے لیے اس قبرستان میں بہت جگہ ہے۔" میں نے جلدی جلدی گردن ہلا کر تائید کر دی۔

پہلا آدمی مجھے لے کر مکان کے دوسرے حصہ میں گیا اور صبح تک شراب پی پی کر کاموں کی تفصیل بتاتا رہا۔ سورج نکلنے کے بعد اس نے کہا "اب سونا چاہیے۔" میں نے پوچھا "جب دنیا جاگ گئی تو ہم سوئیں گے ؟" وہ مسکرایا۔ "جب دنیا سوئے گی ہم جاگیں گے۔" میں چونکہ کئی راتوں سے سکون سے سویا نہیں تھا۔ اس لیے خوب ڈٹ کر سویا۔ چھ بجے ملّو شاہ کی بھڑ کرنے مجھے بیدار کیا۔ سوٹ والا مجھے ساتھ لے کر بازار کی جانب چل پڑا۔ اس نے سارے اڈّے اور ان سبھی کرتا دھرتاؤں سے مجھے روشناس کرایا۔ میرے سامنے بہت ہی شاندار مستقبل رقص کر رہا تھا۔ واپسی میں فرط عقیدت سے میں نے اس کے ہاتھ چوم لیے اس نے کہا "دھیرج دھیرج سوچنے کی چیز ڈیرے پہ ملے گی" اور واقعی قبرستان والے ڈیرے پر پہنچ کر تو مجھے ایسا احساس ہوا جیسے کوئی حوروں کا گلہ ہنکا لایا ہو۔ ہر طرف شراب و شباب کا سیلاب چڑھا ہوا تھا۔ میں پورے طور پر اس سیلاب میں غرق ہو گیا۔

اے میرے ہم مشرب ساتھیو! تفصیل میں کیا پڑو - اتنا کہنا کافی ہوگا کہ چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں نہ تو دنیا کا کوئی عیش باقی رہا جو میں نے نہ کیا ہو، نہ ہی ایسا کوئی فعل باقی بچا جو مجھ سے سرزد نہ ہوا ہو۔ شاہوں سے بڑھ کر گزرتی تھی کہ جانے کس اچھے فعل کی سزا ملی جو آج تمہارے ساتھ اس تکیہ کو آباد کرنا پڑا۔ ہوا یوں کہ پیر ملّو شاہ سے ایک شخص نے بد دیانتی کی، دھوکا دیا۔ ملّو شاہ بہت ہی بااصول انسان ہے، منت سماجت کرنے پر بھی اُسے پورے طور پر معاف نہ کر سکا اور سزا کے لیے ایک کان کاٹ کر اس شخص کو نکال دیا۔ اس کمبخت نے انتقاماً چپکے چپکے سارے راز پولیس تک پہنچا دیے۔

ایک دن رات میں پیر ملّو شاہ کا دربار سجا ہوا تھا کہ چاروں طرف سے گھیرا ڈال کر پولیس نے دھاوا بول دیا۔ ملّو شاہ بڑا جیدار آدمی ہے۔ بالکل نہ گھبرایا۔ پولیس افسر نے گرفتار کرنا چاہا لیکن اس جیالے انسان نے اس کا اور اس کے ساتھیوں کا بھی ہاتھ چوم کر عقیدت مندوں میں شامل ہو گیا۔ کہتے آئے ہیں کہ آئی کبھی ٹلتی نہیں۔ اسے بد قسمتی ہی کہیے کہ خوش قسمتی

. . اپنی قابلیت، علمیت اور درویشیت کا "سکہ" جمانے کے خیال سے یہ مصرعہ پڑھ دیا۔ "خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر" خالص سودیشی پولیس افسر یہ بدعت نہ برداشت کر سکا۔ اور ساری عقیدت و خوف کے باوجود ان پر پل پڑا، گرفتاری کے بعد تلاشی ہوئی۔ کوکین سے لے کر اغوا شدہ لڑکیاں تک برآمد ہوئیں۔ گروہ کے کچھ لوگ گرفتار ہوئے کچھ بھاگ گئے۔ میں بھی آج ایک ماہ سے داڑھی بڑھائے وِگ لگائے گھوم رہا ہوں۔ جب تک ملوشاہ کا فیصلہ نہیں ہوجاتا چھپ چھپا کر اسی تکیہ میں تم لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔

داستانِ حسرت بیان تمام کرکے جب اُس نے غور سے دیکھا تو پایا کہ بقیہ تینوں درویش آنکھوں میں عرقِ پیاز کی سلائیاں پھیر کر آنسو بہا رہے ہیں۔ وہ ان کی ہمدردی سے نہ صرف متاثر بلکہ مرعوب بھی ہوا اور عرض عرض کرکے بولا:

داستان ختم ہوئی دل نہ دُکھا ڈیارڈ
تھک گیا ہوں مجھے سگریٹ تو پلا ڈیارڈ

لیکن سگریٹ والے نے فوراً ہی یہ قطعہ سنا کر اس کے سوال کی گردن منقطع کردی:

پیارے درویش عرض حال نہ کر
شوقِ ماضی کو جی کا کال نہ کر
تکیہ میں گر پناہ لینی ہو
دوستوں سے کوئی سوال نہ کر





زیادہ سے زیادہ افراد کیلئے تعلیم کا اہتمام

آندھرا پردیش اپنے وجود کے گذشتہ ۲۵ برسوں کے دوران عوام کے زیادہ سے زیادہ طبقات کو تعلیمی سہولتوں کی فراہمی کے معاملہ میں پیش پیش رہا ہے۔

اعلیٰ تعلیم

سال ۵۷-۱۹۵۶ء میں یہاں صرف ۳ یونیورسٹیاں اور ۵۷ ڈگری کالجس تھے۔ سال ۸۲-۱۹۸۱ء تک یونیورسٹیوں کی تعداد بڑھ کر ۹ ہوگئی اور ان کے علاوہ دو پیشہ ورانہ یونیورسٹیاں بھی ہیں۔ ڈگری کالجوں کی تعداد ۲۷۷ تک پہونچ گئی ہے۔ اس وقت ریاست میں ۵۷۷ جونیر کالج ہیں جبکہ ۷۰-۱۹۶۹ء میں ان کی تعداد صرف ۸ تھی۔ کالجوں میں داخلوں کی تعداد میں بھی مثالی اضافہ ہوا ہے جو اس وقت ۳٫۵۰ لاکھ ہے۔ آندھرا پردیش پہلی ریاست ہے جس نے یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ کو اُن کی نمایاں و ممتاز خدمات کے اعتراف میں ریاستی اوارڈس کی پیشکشی کا آغاز کیا ہے۔

تعلیم بالغان

ریاست میں اس وقت ۲۳ تعلیم بالغان پراجکٹس کام کر رہے ہیں۔ ہر پراجیکٹ ۳۰۰ مراکز تعلیم بالغان کا اہتمام کرتا ہے اور ہر کز میں ۳۰ طالب علم داخل کئے جاتے ہیں۔

مدرسہ جاتی تعلیم

ابتدائی یا تحتانوی تعلیم کے شعبہ میں لائق ستائش کارنامہ انجام دیا گیا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں پرائمری اسکولوں کی تعداد ۲۹۸۷۶ تھی اور طلباء کی تعداد ۲۴٫۵۴ لاکھ تھی جو اب بڑھ کر علی الترتیب ۳۹۹۵۵ اور ۵۱٫۱۳ لاکھ ہوگئی ہے۔ اسی طرح ہائی اسکولوں کی تعداد ۳۳ سے بڑھ کر ۸۰-۱۹۷۹ء تک ۳٫۵۹۹ ہوگئی۔ مدرسہ جاتی تعلیم میں شامل کیا جانے والا ایک خصوصی

باقی صــــ پر

عنصر یہ ہے کہ غیر رسمی تعلیمی مراکز ، ماڈل اسکولس اور رہائشی اسکولس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان کے علاوہ کمزور طبقات کے بچوں کے لئے آشرم اسکول قائم کئے گئے۔

فنی تعلیم خواتین کے لئے ۶ پالی ٹکنکس کے علاوہ اس وقت ۳۵ پالی ٹکنکس ادارے قائم ہیں جبکہ ۱۹۵۶ء میں ان کی تعداد صرف ۳ تھی۔ فی الوقت انجینئرنگ کے ۱۵ کالج ہیں جو یا تو کام کر رہے ہیں یا جن کے قیام کی منظوری دی جا چکی ہے۔

آندھرا پردیش نے عوام کے تمام طبقات میں تعلیم کو عام کرنے سے متعلق دستورِ ہند میں موجود شرط کی تکمیل کر رہی ہے۔

جاری کردہ : ــــ ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش

D.I.P.R— 51 — 1687/81.

چکر

رام پال (جالندھر)

پتہ نہیں کہ دنیا میں یہ چکر کا چکر کب سے چلا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ چکر، ازل سے چلا ہے جب سے آدم نے حوّا کے اصرار اور شیطان کے بہکانے سے اوّلاً نافرمانی کی اور ابد تک چلے گا جب تک یہ ابن آدم دوبارہ فرمانبردار نہ بن جائے۔

پراچین اتہاس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا چکر، شائد مہا بھارت کے زمانے کا چکرویو تھا جس میں سات جانے پہچانے اُس وقت کے مہارتھیوں نے ایسا چکر چلایا کہ ایک ویر بالک "ابھیمنیو" اُن کے چکر میں پھنس کر مارا گیا اور اس کے بعد ارجن نے کوروؤں کو تہس نہس کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اور تب سے یہ چکر اتنی تیزی سے چلا کہ بہت سے غیر معروف اُس کے سہارے اُبھرے۔ عروج پر پہنچے۔ میلے میں اُس بڑے چکر کی سر میں چکر پیدا کرنے والی کنگھیوں کی طرح۔ لیکن پھر ایسا اُلٹا چکر چلا کہ وہ وقت سے بچ نہ پائے اور زوال کی گمنامی میں ڈوب مرے ـــــ اور آجکل۔ ویر چکر تو معدودے چند جیالے ہی ہوتے ہیں جو ہتھیلی پر سر رکھ کے دشمن کے چھکے چھڑا دیتے ہیں۔ البتہ، فی زمانہ جھنگائی کے چکر "اچھے بھلے ذی ہوش، ذی فہم انسانوں نے دونوں ہاتھوں میں سر کو تھامے، عزت کی گرتی دیواروں کو بچانے کی ناکام کوشش کی اور گھن چکر بن گئے۔

میں بھی اُس ان گنت مخلوق میں سے ایک ہوں۔

دراصل میری جوانی، ادھیڑ عمری اور بڑھاپے کی آمد، جیل کی چار دیواری میں گذری۔ میں بذاتِ خود اتنا بڑا گنہگار نہ تھا کہ عمر عزیز کے ۳۳ برس محبوس رہتا۔ مگر کیا کروں۔ پیشہ ایسا اختیار کیا کہ گناہ میرا رازق بن گیا۔ اُدھر کسی نے جانے انجانے میں قانون شکنی کی اور اِدھر میری ملازمت میں بہار آئی۔ لوگوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہی جھنکار سے پیدا ہوئی۔ اور میرے دل و دماغ کے تار، سرگم کی لے میں جھنجھنانے لگے۔ اب کسی فلسفی کا قول ہے کہ آدمی ماحول کی پیداوار ہے۔

لہذا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اس چکر سے بچ نکلتا۔ گو بدیں عرصہ میرے بیشتر سنگی ساتھی، قاتل، ڈاکو اور رہزن تھے لیکن بن پیدائشی بزدل تھا۔ دل میں کئی بار خیال تو آیا۔ مگر اتنا حوصلہ کبھی بھی پیدا نہ کر سکا۔ کہ قتل تو درکنار کسی کا سر بھی پھوڑ سکوں۔ مگر صاحب، بچپن میں ایک نظم پڑھی تھی کہ اگر آگ کے پاس بیٹھو گے جاکر۔ تو اٹھو گے ایک روز کپڑے جلاکر۔

نوکری کے اولین دور میں جرم و مجرم سے گہری اور شدید نفرت پیدا کرلی۔ پھر نیا چکر چلا تو ان سے ہمدردی پیدا ہوئی. تھے تو وہ ہمارے ان داتا ہی۔ جب یہ سلسلہ کچھ دیر اور چلا تو ان کے پیشوں سے دلچسپی پیدا ہونا ایک لازمی سا امر تھا۔ کہ میاں تم نے قتل کیوں کیا؟ ڈاکہ کیوں ڈالا؟ وہ کون سی تحریک تھی جس کے تحت تم نے لڑکی کو بہکایا، پھسلایا، بھگایا اور وغیرہ، وغیرہ۔ آخر چوری کرنے، تالے توڑنے، نقب زنی کے آلات پرکھنے، اچکاپن اپنانے کی ضرور کوئی ٹھوس وجوہات ہونگی۔ اُن سے پوچھیں۔ غور کیا۔ شراب کشید کرنے، افیون۔ چرس۔ بھنگ اور دیگر منشیات کی ناجائز تجارت کے امکانات پر غور کیا۔ اور منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے جیب تراشوں سے کہا کہ جیل میں اپنے فن کا مظاہرہ کرو۔ اور جب اُنہوں نے ہمارے دیکھتے دیکھتے ہماری جیب سے بٹوہ نکال کر ہمیں واپس کر دیا تو ہمیں اُن کی ایمانداری پر رشک آیا۔ اور ہم نے اُن سے یہ فن بطور فن سیکھا۔ جیسے سوسائٹی میں مقبول ہونے کے لئے لوگ علم الکف یا ہاتھ کی لکیریں پڑھنے کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ ہم نے جیب صاف کرنے کا گُر سیکھا۔ جس سے ہم احباب کو مرعوب کر سکیں۔ اور بعد میں اس پیشہ کو اتنی مہارت بہم پہنچائی کہ اگر ہم اس کو باقاعدہ طور پر اپنا لیتے تو اندھیری دنیا کے بے تاج بادشاہ ہوتے۔ مگر برا ہو اس متوسط طبقہ کے ارد گرد کھنچے ہوئے، خاندانی روایتوں اور سماجی قدروں کے دائروں کا، کہ ہم کبھی بھی ان کو عبور نہ کر پائے۔ یعنی ہاتھ کی صفائی تو سیکھ لی لیکن پروفیسر کا لقب اختیار نہ کر پائے۔ حالانکہ ہمارے دیکھتے دیکھتے، ہمارے دوستوں میں سے بہتوں نے اپنا بھلا کرنے کو اٹھائی گیرے کو مات کر دیا۔ یعنی اڑھائی روپے سیر والی چینی کو سات روپے کلو بیچ کے بیک وقت لاکھوں جیبوں کو تراش کے رکھ دیا۔ لیکن ہم وہیں رہے۔ جہاں سے چلے تھے۔ یعنی جوں جوں مجموعی طور پر تنخواہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ آمدہ رقم کی قوت خرید اس سے دگنی رفتار سے گھٹتی رہی۔ لوگوں کی تجوریاں بھرتی رہیں اور ہم فقط "سر" اور "جناب" کے القاب سے دل بہلاتے رہے۔ لیکن تابکے۔ آخر ایک دن ارادہ کر ہی لیا۔ اس چکر سے کب تک بچتے۔؟

بات یوں ہوئی ـــ کہ دنیا کا ہر آدمی بنیادی طور پہ سماجی جانور ہونے کے ناطے ایک تکون میں محبوس ہے۔ جس کا نام روٹی۔ کپڑا اور مکان ہے۔ دنیا کا ہر شخص اپنی محدود یا لامحدود آمدنی کا بیشتر حصہ پیٹ پر صرف کرتا ہے۔ خود اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے یا امارت کا مظاہرہ کرنے کے لئے۔ کچھ بھی ہو، یہ زندگی کا اہم جز ہے۔ اور میں نے بھی اِس دوزخ کا ایندھن خریدنے کے لئے ایک پنساری کا سہارا لے رکھا تھا۔ اپنے مراسم بھی گہرے تھے۔ لیکن اُس دوستی کی دیواریں رخصت اس روز پڑا، جس روز اُس نے ہم سے عین مین اُن اشیا کی قیمت جو پچھلے ماہ ہم نے ڈھائی صد میں خریدی تھیں۔ اُس کے تین صد روپے، مُسکرا کے، یاری دوستی کے ناطے ہتھیا لئے۔ ہم بھی مسکرا کے چُپ رہے۔ لیکن دل میں سوچا۔ کہ اب کے اس کی جیب ضرور کاٹوں گا۔ کیونکہ ڈاکہ ڈالنے کی رسم پہلے اس نے ادا کی ہے اور اس کا جواب دینا اپنا فرض ہے۔ لیکن پھر وہی

ایمانداری کی حس۔ ضمیر کی آواز اور دیگر زنجیریں کھٹکنے لگیں تو پھر اس مسئلہ پر غور کیا۔ اور آخر اس بات پہ تعمیری اور تخریبی قوتوں کا سمجھوتہ کروادیا کہ جیب اس کی ضرور تراشی جائے گی۔ لیکن صرف پچاس روپے کی حد تک۔ کیونکہ اُس نے مجھے صرف اس حد تک زیب بنایا ہے۔ اور یہ بھی تہیہ کرلیا کہ بالغرض اس کی جیب سے پچاس سے زیادہ کی رقم نکلی تو اپنا حق وصول کرکے بقیہ رقم سے اس کے نام کی ایک سنگِ مرمر کی سل کسی مندر میں اپنی طرف سے نصب کرادوں گا۔ جہاں وہ اور میں۔ دونوں بھگوان کی پوجا کرنے جاتے ہیں اور یہ ضروری تھا کہ وہ اس کو پڑھے گا۔ تو میں اس کی تسلی یہ کہہ کر کرادوں گا کہ یہ ہمارے تعلقات کی امر کہانی ہے۔ جس سے اُس کی ایمانداری اور اُس پر میرا اعتبار ٹپکتا ہے۔ اور وہ اس وقت کی اشتہار بازی سے کتنا خوش ہوگا۔ اور اپنے احباب کی مجلس میں میری سادہ لوحی پر کتنے بھرپور قہقہے لگائے گا۔ وہ منظر میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ اور میں پرانی مثل "آپ کی جوتیوں کے طفیل" کی افادیت پر غور کرنے لگا۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی سوچا کہ رقم کم بھی ہوسکتی ہے تب۔ اس حالت میں جب میں یہاں سے تبدیل ہوں گا۔ تو بقایہ رقم کی اشیاء اُس سے اُدھار لوں گا۔ اور دوسرے دور افتادہ مقام پر اُس کے اصرار والے جوابی خط کا کبھی بھولے سے بھی جواب نہ دوں گا۔

اس نتھورام پنساری کی دوکان، صنم سنیما کی بغل میں تھی اور مجھے علم تھا کہ وہ شام کو دوکان کے باہر کا پھاٹک تو سرکاری وقت پر بند کرلیتا ہے۔ لیکن دن کا حساب کتاب اور ریکرڈ بہی سے جب فارغ ہوتا ہے تب سنیما کا پہلا شو چھوٹتا ہے۔ یعنی نو۔ ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ۔ اور مجھے جیب کتروں کا وہ سنہری گُر زبانی یاد تھا یعنی جیب کاٹو اور اژدھام میں کاٹو۔ تاکہ تم آسانی سے بھیڑ میں گم ہو سکو۔ اور اگر تمہارے شکار کو اپنے لُٹنے کا احساس ہوجائے تو فوراً۔ پکڑو۔ پکڑو۔ کی آواز اُس سے بھی اونچی بلند کرو۔ تاکہ لوگوں کی توجہ تم سے ہٹ جائے۔ تاکہ لوگ یوں ہی کسی چلتے پھرتے لونڈے کو پیٹنے میں مشغول ہوجائیں۔ اور تم وہاں سے سٹک جاؤ۔ دوسرے میں معزز شہری اور مظلوم کا دوست تھا۔ مجھ پر شک کرنا کفر تھا۔ کتنا مکمل اور جامع پلان تھا۔ نہ غلطی کا احتمال۔ نہ ہی کوئی سقم جس پر اُنگلی اُٹھ سکے۔

حسبِ پروگرام، میں شام کا کھانا کھا کے منہ میں پان اور سگریٹ ہاتھ میں چھڑی۔ تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئے۔ نہایت شریفانہ انداز سے ہاں۔ ایک بات اور، اچھے، چابکدست اور مشاق جیب کتروں پر اکثر نہایت شریف آدمی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اور یہ اُن کو کام کرنے اور بچ نکلنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ آخر مجھے برسوں اس کی ذہنی مشق تھی۔ استعمال کا موقع آج ملا تھا اور میں خراماں خراماں آخر اُس کے پاس پہنچ گیا۔ اُس کے کندھے سے کندھا ٹکرایا۔ لیکن وہ قطعی نہ چونکا۔ تب میں چونکا۔ ایک بات اور، جیب کترے عام طور پر نہایت خلیق۔ ملنسار اور دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے والے ہوتے ہیں۔ وہ مردار نہیں کھاتے بلکہ ماہر شکاری کی طرح للکار کے شکار مارتے ہیں۔ اور میں اِس مردے پہ سو درّے کیوں مارتا۔ میں نے اُس کا کندھا جھنجوڑ کے اُس سے اُس کی اُداسی کی وجہ دریافت کی تو وہ روہانسا ہوکر کہنے لگا۔

"کیا پوچھتے ہو صاحب۔ حساب کتاب میں ذرا سی غلطی تھی اور سیلز انسپکٹر نے پکڑلی اور اُس نے پچاس روپے نقد لے کے جان بخشی کی ہے۔ اور مجھے مزید کہنے لگا۔ "آپ جانتے ہیں۔ میں نے کبھی کسی سے ایک پیسہ کی بے ایمانی نہیں کی۔"

وہ کہتا رہا۔ لیکن میں نے وضاحت سُننا قطعی بند کر دیا۔ مجھے اب اُس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ اب میرے پچاس روپے اُس کی جیب سے نکل کر سیلز انسپکٹر کی جیب میں منتقل ہو چکے تھے۔ اس لئے میرا شکار۔ یہ نہیں، وہ تھا۔ مجھے تو اپنے پچاس پورے کرنے تھے۔ اور اصلی گناہگار سے۔ چکر چل پڑا تھا۔ اسے اپنے کئے کی سزا مل چکی تھی۔ اور اُس سماجی دھبے کی جیب کو دھونا ضروری تھا۔

اتفاق سے یہ [illegible] تھا۔ کچھ دن ہونے۔ اس کے لڑکے کے منڈن سنسکار کے موقع پر، میں بھی شہر کے اُن معززین میں سے تھا جو مدعو تھے۔ لیکن یہ سوچ کے مجھے اُبکائی سی آنے لگی کہ جو چار پانی کی تواضع اُس موقع پہ اُس نے ہماری کی تھی۔ اُس پہ جو رقم خرچ ہوئی۔ وہ اسی ناجائز طریقے سے اکٹھا کی ہوئی ہوگی۔ اب اس سے دوہرا بدلہ چکانا تھا۔ اب میں لالہ نتھو رام کو اس کی پریشانی میں مست چھوڑ کے گنگشٹ اُس گلی کی طرف گھوما جس میں وہ رہتا تھا۔ لیکن وہ مجھے نکڑ پر ہی مل گیا۔ پریشان حال۔ ہاتھ میں دوائیاں، چہرے پہ ہوائیاں۔ اسے دیکھ کے میں بھی پریشان ہو گیا۔ میں پوچھنے ہی والا تھا۔ "خیریت"۔ پھر یہ سوچ کے چُپ ہو گیا کہ خیریت تو لا ولد والدین کی ہوتی ہے۔ یہ تو خدا کے فضل سے . . . لیکن میرے بنا پوچھے سوال کا جواب اُس نے خود دے دیا۔ بھرا بیٹھا تھا۔ دل ہلکا کرنے کو آدمی چاہیئے، تھا مل گیا۔ کہنے لگا۔ "کلجگ ہے۔ گھور۔ ڈاکٹر صاحب سے روز کا آنا جانا ہے۔ اور آج وہ عزیز جس کے منڈن میں آپ آئے تھے۔ بیمار ہو گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے دو دفعہ گھر آنے کے پچاس روپے لے لئے۔ دوائیاں تو ٹھیک۔ لیکن نسخہ لکھنے کے اتنے روپے۔ اور پھر کہنے لگے، سب سے بتیس روپے لیتا ہوں۔ آپ اپنے آدمی ہیں۔" ـــــ اور پھر اُس نے چائے کیلئے پوچھا۔ اب میں نے اُس کے متعلق رائے بدل لی تھی۔ چائے پینے میں ہرج بھی نہ تھا۔ مگر وقت کم تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ میں جلدی میں تھا۔ اور اس لئے جلدی جلدی میں ہی میں نے اُسے عزیز کی صحتیابی کی دُعا دی۔ پھر کبھی چائے پینے کا وعدہ کیا۔ اور ڈاکٹر کی دوکان کی طرف بھاگا۔ مجھے علم تھا کہ ڈاکٹر لوگ گئی رات تک مریضوں میں گھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور اُنہیں اپنے گرد و پیش کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ اس لئے اس کی جیب کاٹنے میں آسانی رہے گی۔ اُدھر وہ مریض کو دیکھنے اُٹھا۔ اور ادھر میں نے اپنا کام ختم کر لیا۔ اِس آسانی سے میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں تقدیر کی اِس خوبی پہ خود بخود مسکرا اُٹھا۔ لیکن وائے قسمت ـ جوں ہی میں ڈاکٹر کی دوکان پہ پہنچا۔ وہ دوکان بڑھا کے باہر اپنی کار کا ہڈ اُٹھائے اسے نہایت غور سے دیکھ رہے تھے۔ گویا کسی کا آپریشن کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ میرے قدموں کی چاپ اُنہوں نے سُن لی تھی۔ پہلے تو یہ سمجھے کہ شائد کوئی مریض ہے اور کھٹ سے ہڈ بند کر دیا۔ لیکن جب پہچانا تو ماتھے پر تیوری چڑھا کے بولے۔ "لوگ مجبور ہو گئے ہیں۔ یہ کالے دھندے والے کسی کو نہیں بخشتے۔ آپ بھی قانون کے محافظوں میں سے ایک ہیں۔ دیکھئے۔ اس پٹرول والے نے پچاس روپے مزید لے کر بھی کچرا دے دیا۔"

اب مجھے بیچارہ ڈاکٹر معصوم نظر آیا۔ اور ذہن پٹرول کے مالک کی طرف گھوم گیا۔ مگر اب رات کافی ہو چکی تھی۔ لہٰذا ڈاکٹر کی کار میں گھر واپس آ گیا جو اِس کی کوٹھی کے راستے پہ تھا۔

اب چکر چل پڑا تھا۔ اور گئی رات کے کئی گھنٹے بیکار گذارنے کا رنج بھی تھا۔ غصہ بھی، لیکن جو منصوبہ بنایا تھا۔ اسے پایۂ تکمیل پہ پہنچانا بھی بہت ضروری تھا۔ رات میں پوری طرح سوچ بھی نہ سکا۔ اُس پٹرول والے کا مکان میری رہائش کے قریب ہی بازار کے راستے میں پڑتا تھا۔ اور ابھی میں پوری طرح اُس کی جیب کاٹنے کے متعلق کوئی جامع اسکیم ذہن میں مرتب نہ کر پایا تھا۔ کیونکہ دفتر و رہائش گاہ کے قرب کے باعث۔ کبھی اسکوٹر یا کار کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اب میں پٹرول پمپ پر کس بہانے سے جاؤں۔ لہٰذا اُس کے مکان پر

اُس سے ملنا زیادہ سود مند تھا۔ اب جب میں اُس کے قریب پہنچا تو اندر سے اونچی اونچی آوازیں آرہی تھیں۔ پٹرول پمپ کا مالک اپنی بیوی کو کوس رہا تھا کہ جو کپڑے فلاں بزاز سے خرید لائی ہے۔ اس میں وہ پچاس روپے لٹوا آئی ہے۔ وہ شخص نہایت بے ایمان ہے۔ اور بیوی بیچاری بھی روہانسی اپنے نصیب کو پیٹ رہی تھی۔ اُدھر میں یہ سن کے عجب تذبذب میں مبتلا ہوگیا۔ اب اس پٹرول والے کو سزا مل چکی تھی

—— یہ راستہ سیدھا بازار میں بزاز کی دوکان پہ جاتا تھا۔ بزاز نے مجھے نہایت مخملی اور ملائم مسکراہٹ عنایت کی۔ اور تھان پہ تھان کھولنے لگا۔ اِدھر میں اپنے ذہن کے تھان کو کھول رہا تھا۔ کہ اس کے پچاس روپے کیسے قابو میں کئے جائیں۔ اور وہ بار بار اپنی تجوری کھولتا اور بند کرتا۔ اور اس میں نوٹوں کی کئی گڈیاں تھیں۔ لیکن میں تو ایمان دار آدمی ہوں۔ مجھے ان سے کیا غرض! — میں ریشمی کپڑوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا کہ بزاز کا بڑا لڑکا گھبرایا ہوا آیا اور بزاز کا شگفتہ بہار جیسا چہرہ۔ خزاں کے پہلے پتّے کی طرح مرجھا گیا۔ اُس نے تھان کی تعریف کے بجائے ، اپنے ساتھی کاروباری بھائیوں کی بُرائی شروع کردی۔ " ڈائن بھی سُنا ہے، سات گھر چھوڑتی ہے۔ لیکن یہ سمنٹ والے تو بھگوں پر بھی رحم نہیں کھاتے۔ چوبارے کا فرش مرمت کرانا تھا۔ معمار، مزدور آئے تھے۔ سمنٹ کی کمی پڑ گئی۔ اور اُس کمبخت نے پچاس روپے زیادہ لے کر بوریاں دیں۔ مرتے کیا نہ کرتے۔ نہیں تو اُن کی مزدوری خواہ مخواہ دینی پڑتی " —— اب یہاں مزید وقت ضائع کرنا بیکار تھا — سمنٹ ڈپو دور نہ تھا۔

سمنٹ والوں سے انتقام کا جذبہ بہت عرصے سے میرے دل میں پرورش پا رہا تھا۔ پبلک ، پریس ، پلیٹ فارم ، ہر جگہ سے ان کی بدعنوانیوں کے قصّے سنائے جاتے تھے۔ آپ بھلے کسی شکستہ دیوار کے نیچے دب کے مر جائیں۔ اِن کے کان پہ جوں نہیں رینگے گی۔ اور جب میں اس جوش کے عالم میں ڈپو پہ پہنچا تو پہلی دفعہ بے ثباتی عالم کا منظر نظر آیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ میں خاکی ہوں۔ خاک سے پیدا ہوا ہوں۔ اور آخر میں خاک میں مل جانا ہے۔ کیونکہ اندر داخل ہوتے ہی میں سرتا پا لت پت ہوگیا۔ لیکن ڈپو ہولڈر قطعی میری طرف متوجہ نہ ہوا۔ وہ پرمٹ والے سے بھی بات نہیں کرتے اور میں تو ... ، وہ جانتا تھا — لیکن اُس کے پاس ایک لحیم شحیم بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی اُس کے کان میں کھسر پھسر کر رہا تھا۔ اور پھر ایکدم اُس نے کہا۔ " اچھا۔ میں چلتا ہوں۔ " اور بڑے رعب سے ایک رکشہ والے کو بُلا کے اُس کی گاڑی پہ دو بوریاں لادیں۔ اور یہ کہہ کر کہ پیسے کل کو بھجوا دوں گا، ہوا ہوگیا۔ اور اِدھر وہ رکشہ چلی، اُدھر ڈپو ہولڈر کی زبان۔ نہ معلوم وہ پہلے کیا بدبدایا۔ پھر کہنے لگا۔ " لو۔ ذرا سی بات بتلانے پہ — کہ چھاپہ شاید پڑ جائے۔ پچاس روپے کا مال لے کے چلتا بنا۔ میں اِن حضرت کو جانتا ہوں، پہلی اِن کی کبھی نہ آئے گی " —— اور اُدھر میں بھی ان حضرت کو جانتا تھا۔ یہ مقامی تھانے میں حوالدار تھے۔ اور پھر اپنی برادری کے تھے۔ اِسلئے دوستی نہ سہی ، جان پہچان تو ضرور تھی۔

تھانے میں پتہ لگا کہ ، حوالدار صاحب گھر پر ہیں۔ اور اُس روز چونکہ اتفاق سے حوالات میں ملزم کوئی نہ تھا۔ لہٰذا وہ اپنے لڑکے پہ مار پیٹ کی مشق فرما رہے تھے۔ مجھے پہچان کر، ایک زوردار چانٹا لڑکے کو رسید کرکے تمکنتاً عرض کرنے لگے۔ " کہ صاحب! کیسا زمانہ آگیا ہے۔ ویسے تو لڑکا نالائق ہے لیکن اس کو پاس کروانے کے لئے ماسٹر جی کو پچاس روپے دیئے تھے۔ اور وہ ماسٹر — " اُنہوں نے اُس کی شان میں چند نہایت ناخوشگوار الفاظ ادا فرمانے کے بعد ایک دُھول اور لڑکے کے جڑ دی۔ اور وہ "انکل، انکل" کہتا مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے تسلّی دیتے ہوئے اُس سے ماسٹر جی کا نام، پتہ اور نشان پوچھا — " ارے وہ " میں انہیں جانتا تھا۔ نہایت مرنجان

مرنج قسم کے معاف پان قسم کے آدمی تھے ۔ اور مجھے علم تھا کہ وہ کسی حالت میں بھی اس دیو زاد کے سامنے نہیں آئیں گے ۔ لڑکا چونکہ نہایت ڈھیٹ قسم کا تھا ۔ اور روزانہ پٹنا اُس کا دستور تھا ، لہٰذا اسے اتنا فرق نہیں پڑتا تھا ۔ اب میں ماسٹر جی کی تلاش میں تھا ۔ اور وہ مجھے اپنے مکان کے دروازے سے پر ہی مل گئے ، اور ایک دودھ والا ، سائیکل کے دونوں جانب المونیم کے بڑے بڑے برتن لٹکائے اُن سے تکرار کر رہا تھا مجھے دیکھ کے وہ تو سائیکل پر سوار ہو گیا ۔ اور ماسٹر جی مجھ پر چڑھ گئے ۔ اور تب میں نے اُن سے حوالدار کے لڑکے کے بارے میں استفسار کیا تو منہ بنا کے کہنے لگے ۔ " اجی ! وہ لڑکا ہی نالائق ہے ۔ میں نے اسے لاکھ کہا کہ دائیں بازو والے لڑکے کی نقل کر ۔ لیکن اسے ، دائیں ، بائیں کی تمیز نہیں ۔ بائیں بازو والے لڑکے کی نقل کی ۔ مارا گیا ۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ بائیں بازو والے سدا اُلٹا سیدھا لکھتے ہیں ۔ غریبوں کی ناجائز حمایت میں ہم شریف آدمی مارے جاتے ہیں ۔ اب اس دودھ والے کو دیکھیں ۔ لڑتا تھا کہ آج کل تو شہزادہ ہیں ۔ دودھ مہنگا ہے ۔ بس پچاس روپے فالتو لے گیا ۔ مانتا ہی نہ تھا ۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم بھی براہمن ہیں ۔ کیا ہوا اگر پروہت جماں کا دھندہ نہیں کرتے ۔ لیکن مان مریادا بھی کوئی چیز ہے ۔ اندھیر ہے ۔ لاقانونی کی حد ہے ۔ وہ کہہ رہے تھے لیکن میں سوچ رہا تھا کہ دودھ والا سائیکل پہ اور میں پیدل ۔ اب بات کیسے بنے گی ۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے ماسٹر جی کو کن الفاظ میں تسلی دی ۔ کیونکہ میرا دماغ تو اپنے کام میں اُلجھا ہوا تھا ۔ کسی اور سے مجھے کیا غرض تھی ۔

دو تین دن اسی حیص بیص میں گذرے ۔ اور پھر ایک دن میری بیوی نے کہا ۔ وہ ، دودھن ۔ یعنی دودھ والے کی بیوی آئی ہے ۔ جس سے ہم کبھی دودھ خریدا کرتے تھے ۔ اب تو بھگوان کی کرپا سے ہم افسر ہیں ۔ کھونٹے پہ اپنی گائے بندھی ہے ۔ اس لئے اِن چھوٹے موٹے آدمیوں سے واسطہ رکھنا اپنی شان کے خلاف ہے ۔ مگر پھر بھی ۔ پرانی واقفیت کے ناطے ، مل لینے میں کیا ہرج ہے ۔

" کیا کام ہے ۔ ؟ " میں نے پوچھا ۔ لگا کہ اس کا گھر والا یعنی دودھی ، پانی میں دودھ ملاتا گرفتار ہو گیا ہے اور آجکل جیل میں ہے ۔ اور مجھ سے یہ کہنے آئی تھی کہ ذرا اُس کا دھیان رکھوں ۔

وہ اندر آئی تو اُس کے ہاتھ میں دو کلو کا ایک ڈبّہ تھا ۔ خالص گھی سے بھرا ہوا ۔ کیونکہ وہ گاہکوں کو تو فدا ز دودھ سپلائی کرتے تھے اور بالائی میں سے جو گھی بنتا تھا ۔ بقول دودھن کے ، دودھی اس کا شوقین تھا اور چونکہ وہ جیل میں تھا ۔ لہٰذا وہ اِس عورت کے لئے بیکار تھا اور شائد اسے میری عادت کا اُس وقت سے علم تھا ۔ جب ہم اُس سے دودھ لیتے تھے اور ملاوٹ کی شکایت کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ' مجھے دیسی گھی بہت مرغوب ہے ۔ خیر صاحب ۔ میں نے آنکھوں کے پیمانے سے دل ہی دل میں دو کلو کو روپوں میں ماپا تقریباً پچاس روپے کا مال تھا ۔ میں بنیادی طور پر تو ایماندار آدمی ہوں ۔ لیکن اتنی تگ و دو کے بعد ۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ پہیئے نے اپنا چکّر پورا کر لیا ہے ۔ اور اب ۔ حق را بحقدار رسید ۔ تو میں نے دل کڑا کر کے وہ مال رکھ لیا ۔ اور ضمیر کو سمجھا دیا ۔



آندھرا پردیش کی سلور جوبلی

وسیع ترقیاتی سرگرمیاں



آندھرا پردیش جو ایک ترقی پذیر ریاست ہے، وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی رہنمائی میں اور شری ٹی انجیا چیف منسٹر کی فعال اور پُرجوش قیادت میں خوشحالی کی سمت تیز رفتاری کے ساتھ پیش قدمی میں معروف ہے۔ ریاست نے سلور جوبلی سال کے دوران میں دانشمندانہ اسکیمات اور مفکرانہ منصوبوں کے ذریعہ ہمہ گیر ترقی اور مرفع الحالی حاصل کی ہے۔ آندھرا پردیش نے اپنی معاشی بہتری اور اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے ضمن میں قابل قدر کارنامے انجام دئیے ہیں۔ شریمتی اندرا گاندھی کے ۲۰۔ نکاتی اور سنجے گاندھی کے ۵۔ نکاتی پروگراموں کی سرگرمی کے ساتھ عمل آوری نے آندھرا پردیش کو یقینی خوشحالی کی راہ پر گامزن کر دیا ہے۔

کسانوں کیلئے ترغیبات

- دس ایکڑ خشکی اور (۵) ایکڑ تری سے کم اراضیات رکھنے والے حصول اراضی سے بالکلیہ طور پر مستثنیٰ کر دیئے گئے
- فصلوں کے بیمہ سے متعلق اسکیم رائج کی گئی۔

برقی قوت میں اضافہ

- برقی پیداوار کے لئے تنصیبی صلاحیت ۲۲۹۸ میگاواٹ تک ترتیج گئی جو ایک ہمہ وقتی ریکارڈ ہے۔

ضرورت مندوں کیلئے مکانات ۔ سماجی بھلائی

- سال ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۱۵۔۴۷۸ خاندانوں کو رہائشی جگہیں فراہم کی گئیں۔ اس مقصد کیلئے (۷۲۳۸) ایکڑ خانگی اراضی حاصل کی گئی اور (۲۱۶۱) ایکڑ اراضی کی منتقلی عمل میں لائی گئی۔
- درج فہرست اقوام کی فلاح کیلئے جاریہ سال کے دوران میں خصوصی منصوبہ کے تحت (۵۲) کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں جبکہ سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں اس غرض کے لئے فراہم کردہ رقم (۲۵،۵) کروڑ روپے تھی۔
- جسمانی معذورین کیلئے ایک کارپوریشن قائم کیا گیا۔

صنعتوں کو فروغ ۔ مزدوروں کی ہمت افزائی

- ماہ جولائی ۱۹۸۱ء میں سنگارینی کالریز سے (۱۰) لاکھ ٹن کی ریکارڈ مقدار میں کوئلہ کی پیداوار حاصل ہوئی۔
- آندھرا پردیش ہینڈی کرافٹ ڈیولپمنٹ کارپوریشن قائم کیا گیا۔

آبی وسائل کے ذریعہ اندرونی علاقوں تک خوشحالی کی رسائی

- پولاورم پراجکٹ کا سنگ بنیاد رکھا گیا
- سری سیلم رائٹ کنال پر کام شروع کیا گیا
- جورالا پراجکٹ پر کام شروع کیا گیا۔

رام راج ۔۔۔ گرام سوراج کی سمت پیشقدمی

- دس سال سے زائد مدت کے بعد گرام پنچایتوں اور سمیتیوں کے لئے پُرامن طور پر راست انتخابات عمل میں لائے گئے۔
- اٹھارہ سال کی عمر والوں کو پہلی مرتبہ حق رائے دہی عطا کیا گیا۔

امداد باہمی

- سال ۸۱-۱۹۸۰ء کے دوران میں ۹٫۹۰ کروڑ روپے قلیل مدتی اور اوسط مدتی قرضوں کے تحت دیئے گئے۔ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے۔
- مرکزی امداد باہمی زرعی ترقیاتی بنک کی جانب سے ۶۸ کروڑ روپیوں کی ریکارڈ میں طویل مدتی قرضے اجراء کئے گئے۔

مستقبل کے شہریوں کیلئے بہتر تعلیم

- کرشنا دیوارایہ یونیورسٹی کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔
- جامع تعلیمی مسودہ قانون منظور کیا گیا۔

برتر کارکردگی کیلئے خدمات میں سدھار

- عوامی تقسیم کے نظام کو بہتر بنانے کی غرض سے کارپوریشن برائے فراہمی اشیائے ضروریہ قائم کیا گیا۔
- سال ۸۱-۱۹۸۰ء میں ریاستی آمدنی ۵۹۷٫۵۲٫۸ کروڑ روپیوں سے بڑھ کر ۶۹۱۵٫۵۱ کروڑ روپے ہوگئی۔ یعنی ۱۵٫۷ فی صد اضافہ ہوا۔
- تمام بلدیاتی علاقوں میں جھونپڑیوں کیلئے آتشزدگی بیمہ اسکیم شروع کی گئی۔

جاری کردہ : ۔۔ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

NO :(50) DIPR . 1686/81.

شادی خانہ

محمد احمد حسین

پچھلے زمانہ میں برائی جتانے کے مختلف طریقے تھے۔ مثلاً یہ کہ آپ کی تنخواہ کے علاوہ "اُوپر کی آمدنی" کتنی ہے، کتنے مکانات رہن پڑے رکھے ہیں۔ کتنی دُکانوں میں آپ کا کھاتہ ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کتنی بیویوں کے مجازی خدا ہیں؟ —— لیکن یہ سب باتیں اب قصۂ پارینہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ اب تو صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کتنے شادی خانوں کے مالک ہیں۔ یا کم از کم آپ کے محلے میں کتنے شادی خانے ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کے پڑوس میں ہی ایک شادی خانہ ہے۔

ہم پہلے جس گھر میں تھے، مہینوں بلکہ برسوں ہمارے گھر کوئی پھٹکتا بھی نہ تھا۔ ہم ہمارے رشتہ داروں اور دوست احباب سے ملنے کو ایسا ترستے تھے جیسے آجکل لوگ اصلی گھی، تیل کو ترستے ہیں۔ لیکن اب —— اب تو ہماری پوزیشن ہی بالکل بدل گئی ہے، جب بھی پڑوس کے شادی خانہ میں صبح سے جھنڈیاں لگنی شروع ہوتی ہیں اور لائٹ اور مائیکروفون والے "ہلو، ہلو، میکروفون ٹسٹنگ وَن، ٹو، تھری . . . ." کی رٹ لگانا شروع کرتے ہیں۔ ہم بھی ہمارے گھر میں صفائی شروع کر دیتے ہیں۔ ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ آج شام ہمارے ہاں کوئی نہ کوئی آنے والا ہے۔ سہ پہر سے ہی ہم کپڑے بدل کر گھر کے سامنے اس طرح کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اب جو بارات آنے والی ہے گویا شادی خانہ میں نہیں بلکہ ہمارے گھر کو آرہی ہے۔ باراتیوں میں کوئی نہ کوئی خدا کا بندہ ایسا مل ہی جاتا ہے جو ہم سے اس خلوص کے ساتھ ہاتھ ملاتا ہے جیسے ہم ہی دولہے کے یا دلہن کے باپ ہوں۔ اور جب دھکا نہ کے لئے شادی خانہ کا گیٹ بند ہو جاتا ہے تو اس وقت تک ہمارا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اُن کو ہم اپنے ڈرائنگ روم میں لائیں اور چائے بسکٹ سے تواضع کریں۔ بعض بے تکلف دوست تو صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ بھئی چائے تو شادی خانہ میں ہی پئیں گے۔ "اب کچھ ٹھنڈا مشروب چاہیئے۔" ہم فوراً تھمس اپ یا فنٹا کو کا کولا کا آرڈر دے دیتے ہیں۔ اور اس وقت کا انتظار شروع کر دیتے ہیں جبکہ شادی خانہ میں ہونے والے "مسلے" ہزار، ڈیڑھ ہزار سے دھکانہ کی بولی شروع کرکے دس پندرہ روپے اپنے ہونے والے بہنوئی سے وصول نہیں کر لیتے۔

بعض وقت ہم اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ ہماری شادی کے وقت آخر یہ شادی خانے کہاں تھے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری شادی رمضان کے مبارک مہینہ میں ایک مسجد میں ہوئی تھی۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ہم نماز بالکل نہیں پڑھتے۔ شروع ہی سے ہم جمعہ کو جمعہ

پابندی سے نماز پڑھنے کے عادی ہیں۔ لیکن اُس روز ہم کو پانچوں نمازیں مسجد میں ہی ادا کرنی پڑیں۔ لیکن اصلی پریشانی اُس وقت ہوئی جبکہ لوگ جوق در جوق تراویح کی نماز کیلئے مسجد میں آنے لگے۔ ہم نہیں جانتے کہ ہم نے تراویح کس طرح پوری کی۔ لیکن ایسا محسوس ہوا گویا بے وزنی کی وجہ سے ہم کسی خلائی جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔

لیکن آج کا نوجوان اِن باتوں سے بالکل بے نیاز ہے۔ اور جب سے یہ شادی خانے کرایے پر ملنے لگے ہیں، ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ "اگر فردوس بروئے زمین است۔ ۔ ۔ ۔" صرف کسی شادی خانہ کی شان میں کہا گیا ہوگا۔ بات تو خوبی کی یہ ہے کہ جتنی کڑی شرائط ان شادی خانوں کے حاصل کرنے میں عائد کی جاتی ہیں، اتنی ہی اِن کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ ہمارے نوجوان بھی صرف انھیں شادی خانوں کو پسند کرتے ہیں جہاں کڑی سے کڑی شرائط لگائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ لائٹ کا کنکشن ایک مخصوص میٹر سے لینا ہوگا۔ کرایہ کے برتن فلاں کمپنی کے ہی قابل قبول ہوں گے۔ برقی لائٹ چاہے فیل ہو یا نہ ہو، جنریٹر کا کرایہ دینا ہوگا۔ شادی کے روز کا ایٹ ہوم اور چوتھی و ولیمہ کا انتظام فلاں کمپنی کو ہی لازماً دینا ہوگا۔ اب تو سُنتا ہے کہ بعض شادی خانوں نے یہ شرط بھی لگا رکھی ہے کہ دلہن کا انتخاب بھی ان کی پسند سے ہوگا۔ واللہ عالم بالصواب

اب ہم صرف اُن چند فوائد کو گنوا کر رخصت ہوتے ہیں جو شادی خانہ کے پڑوس میں رہنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ بغیر ریڈیو یا ریکارڈ پلیر کے بیٹھے بیٹھے فلمی گانے سُن سکتے ہیں۔ اگر آپ میں ہماری آواز کی سماعت کی ہمت ہے تو ہم ابھی "چھوڑ بابل کا گھر ۔ ۔ ۔" سے لے کر "۔ ۔ ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں۔ ۔ ۔ ۔" اور "دل والے دُلہنیا لے جائیں گے" تک سارے گانے گا کر سُنا سکتے ہیں۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ شادیاں چونکہ عام طور پر امتحانوں کے زمانے میں ہوتی ہیں تو بچے جب پڑھتے پڑھتے تھک جاتے ہیں تو ان کی تفریح طبع کے لئے یہ ریکارڈنگ بہت کام آتی ہے۔ یوں بھی آجکل امتحان کی تیاری نوٹ بُک یا کاغذ پر نہیں ہوتی بلکہ بشکوٹ، شرٹ بلکہ اُوڑھنی پر ہوتی ہے۔

تیسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ سوسائٹی میں ہمارا وقار بڑھ جاتا ہے۔ کچھ لوگ ہمارے پاس آتے ہیں اور اکثر ہم خود شادی خانہ چلے جاتے ہیں جس سے شادیوں کے زمانے میں ہمارے گھر کا چانے کا خرچ اور دوسرے اخراجات میں کافی بچت ہوتی ہے۔ یہ ایک راز ہے جس کو اس آسانی سے آشکارا نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی اس کو سُننے کیلئے بے چین ہیں۔ لہذا مجبوراً ہم آپ کو سُنا دیتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہم نے یہ اُصول بنا رکھا ہے کہ بارات کے بینڈ باجے کی آواز کے ساتھ ہی ہم اپنا لباس تبدیل کرتے ہیں۔ اس کے لئے ہم نے ایک عدد سوٹ اور ایک عدد شیروانی سلا رکھی ہے۔ شادی خانہ کے چوکیدار سے پہلے ہی دریافت کر لیتے ہیں کہ آج جو شادی ہونے والی ہے وہ لڑکی کے اِدھر کی ہے یا اُدھر کی۔ اگر اِدھر کی ہے تو ہم شیروانی پہن لیتے ہیں اور اگر اُدھر کی ہو تو سُوٹ زیب تن کر لیتے ہیں۔ چاہے رقعہ آئے یا نہ آئے جب بارات گھر کے سامنے سے گذرتی ہے تو ہم چُپکے سے اس میں شامل ہو جاتے ہیں اور کبھی دلہا والے بن کر جانا پڑتا ہے اور کبھی دلہن والے ـــ لیکن کب دلہن والے بنیں اور کب دلہا والے، یہ بات بتانے کی نہیں۔ صرف تجربہ سے ہی نکتہ سمجھ میں آسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمیں ایک مرتبہ کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہم اپنے آپ کو اس مرتبہ دولہا کا ماموں ظاہر کریں لیکن ہمیں بہت جلد بازو کی کرسی سے کسی صاحب کے رونے کی بلکہ سسکیاں بھرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ رونے والے بزرگ دُلہا کے والد ہیں اور شادی کے موقعہ پر اپنے سالے یعنی دُلہا کے ماموں کو یاد کرکے رو رہے ہیں جن کا انتقال حال

ہی میں ہوا تھا۔ ہم نے فوراً چولا بدلا۔ اور چاہتے تھے کہ دلہن کے کسی قریبی عزیز کے روپ میں ظاہر ہوں۔ لیکن یہ جان کر پسینے چھوٹ گئے کہ یہ لڑکا اور لڑکی کی محبت کی شادی تھی۔ اس بنا پر لڑکی کے سارے رشتہ داروں نے اس شادی کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ ہم نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور نکاح کے ساتھ ہی فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور مسند پر جا کر مائیکروفون پر قبضہ جما لیا۔ اور اپنے فنِ خطابت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک زور دار اور متاثر کن تقریر کر ڈالی۔ جس میں ہم نے آجکل کے نوجوانوں کو اس بات پر خوب لتاڑا کہ وہ غلط طور پر گھوڑے جوڑے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اور اس لعنت سے اب چھٹکارا پانا چاہیئے۔ ہم نے موقعہ پا کر مالکینِ شادی خانہ پر بھی ریمارک کیا کہ وہ بھی صرف اسی پارٹی کو شادی خانہ کرایہ پر دیتے ہیں جو مالدار ہو۔ اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ ہر طرف سے واہ، واہ اور خوب، خوب کا شور بلند ہوا۔ اور اس روز ہم کو نہ صرف چاؤ کی دو پیالیاں ملیں بلکہ نوشاہ کے ساتھ ایٹ ہوم میں بھی مدعو کیا گیا۔

دُلہے کے والد نے اس ایٹ ہوم کے بعد چوتھی اور ولیمہ کا وعدہ لے کر ہی چھوڑا۔ اس طرح ہم نے بہ کمال ہوشیاری بن بلائے مہمان ہو کر بھی مہمان بننے کا اعزاز حاصل کر لیا۔ اور جب ہم چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر شادی خانہ سے خاص مہمان کی طرح نکل رہے تھے تو بینڈ والے اپنی مخصوص دھن "چھوڑ بابل کا گھر . . . . ." شروع کر چکے تھے۔

داماد بلہاروی

انگور لومڑی نے توڑے اُچھل اُچھل کے — بلی گئی ہے حج کو جو ہے نکل نکل کے
کیسا زمانہ آیا بدلے رواج کتنے — پھرتے ہیں لوگ اپنے چہرے بدل بدل کے
اپنے میں آپ شاید یہ خود ہی دفن ہوگی — گھٹنے لگی ہے شمع غم سے پگھل پگھل کے

افسوس پا رہے ہیں وہ شاعری میں شہرت
معیار سے ہے ہٹ کر جن کی غزل غزل کے

افسر جالی

جو بھی مہنگائی سے بنتا ہے وہ مال اچھا ہے
ملک میں اپنے بنے ریشم و کمخواب تو کب
یوں ہی پڑتے رہے گر گال پہ گال اچھا ہے
آرٹ فارن سے اگر ہو تو رومال اچھا ہے

ڈی کے کنول

کیا دن تھے وہ بھی.....!

بات برسوں پہلے کی ہے ۔

بس یوں سمجھ لیجئے کہ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم زیر و زبر و زیرو تھے ـــــ اور ہیرو بننے کا ارمان دل میں لئے۔ اپنے محلّے کے گلی کوچوں میں پھرا کرتے تھے ۔ مگر حسیناؤں کو تو جیسے چیچک نکل آئی تھی ۔ ایک بھی حسین چہرہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا ۔

ایک دن کیا ہوا کہ ہماری نگاہوں کا تصادم ایک ماہ جبیں سے ہوا جو کبھی کبھی گلی کوچوں کے ساتھ ساتھ دلوں پر بھی جھاڑو پھیرا کرتی تھی ۔ بڑی حسین وجمیل اور بلند قامت عورت تھی وہ ـــ شروع شروع میں اُسے دیکھ کر ہمارے دل میں گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں مگر کچھ دنوں کے بعد گھنٹے بجنے لگے ۔

وہ زمانہ ہمارے عنفوانِ شباب کا تھا ۔ چونکہ ہمارا ارادہ ہیرو بننے کا تھا اس لئے ہم اس کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑ گئے ۔ مگر ہائے رے قسمت ـــ اُس کمبخت کو نہ جانے ہماری کون سی ادا کھل رہی تھی کہ جب بھی ہم اُسے پیار بھری نظروں سے تاکنے لگتے تھے۔ وہ غصّے سے نتھنے پھُلانے لگتی تھی ۔ کبھی کبھار تو وہ ہمیں موٹی موٹی گالیاں بھی دے جاتی تھی جنھیں ہم شربت کی طرح چُپ چاپ پی جاتے تھے وہ کمبخت ہم سے جتنا کُڑھتی تھی ـــ ہم اُسی شدت سے اُس سے پیار کرنے لگتے تھے ـــ ظالم چیز ہی کچھ ایسی تھی ۔

چونکہ ہمارا ارادہ ہیرو بننے کا تھا اس لئے ہم سماج سے بغاوت کرکے اسے اپنے گھر کی ملکہ بنانا چاہتے تھے۔ ہم اونچ نیچ اور ذات پات کا بھید بھاؤ مٹاکر اخبار کی سرخیوں کی زینت بننا چاہتے تھے ـــ مگر وہ کم بخت ہمارے خلوص اور بلند خیالی کو ٹھوکریں مار رہی تھی اور ہم ماہی بن آب کی طرح کچھ فراق کے غم سے اور کچھ وصل کی تڑپ سے اور کچھ ہیرو بننے کے جنون سے تڑپ رہے تھے ۔

جب ہمارے صبر و تحمل کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو ہم نے دوسرا راستہ اختیار کیا ـــــ دن دھاڑے اس خاکروب کا اغوا کرلیا ۔

چونکہ ہمارا پلان انتہائی ناقص اور بچکانہ تھا اسلئے پولیس نے ہمیں دھرلیا اور ہم بنفس نفیس چھ مہینے کے لئے اندر ہوگئے ـــ یہ ہماری

پہلی جیل یاترا تھی۔

اسی دوران ملک میں آزادی کی تحریک چلی۔ ہزاروں لاکھوں لوگ مر گئے اور بالآخر انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ کر جانا پڑا۔ —— ملک کی آزادی کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی آزادی نصیب ہوئی۔

محبت کے ہاتھوں پہلا جھٹکا کھانے کے بعد ہمارے شعور میں پختگی آ گئی تھی۔ جیل میں ہر قماش کے لوگوں کے ساتھ رہ کر ہم نے بھی کئی طرح کے جوڑ توڑ سیکھ لئے تھے۔ اس لئے جیل سے باہر آکر ہم بھی داؤ پیچ کھیلنے لگے۔ جنتا بڑی بھولی بھالی تھی اس لئے ہم نے جنتا کو یہ کہہ کر اُلّو بنایا کہ آزادی مانگنے کے جرم میں ہم جیلوں میں ٹھونسے گئے جہاں ہم کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں بیچاری جنتا ہمیں آزادی کا ہیرو سمجھ بیٹھی اور ہماری ہر طرف سے جے جے کار ہونے لگی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اغواء کے جرم میں اندر کر لئے گئے تھے۔

بس پھر کیا تھا —— ہماری کایا ہی پلٹ گئی۔ ہم گیدڑ سے لیڈر بن گئے اور پھر لیڈر سے منسٹر ——

منسٹر بننے کے بعد تو ہمارے دن ہی پھر گئے۔ پہلے ہم کوڑی کوڑی کے محتاج رہتے تھے۔ لیکن منسٹر بننے کے بعد ہمارے وارے نیارے ہو گئے۔ لکشمی ہم پر کچھ اس طرح سے مہربان ہو گئی کہ مٹی میں ہاتھ ڈالو تو وہی سونا ہو جائے۔ ہمارے چاہنے والے سویرے سویرے ہمارے لئے تحفے تحائف لے کے آتے تھے جنہیں ہم بادلِ نخواستہ قبول کیا کرتے تھے کیونکہ ہمیں اپنے سے زیادہ اپنے چاہنے والے کی فکر رہا کرتی تھی۔ ہم اپنے چاہنے والوں کا کسی بھی طور دل توڑنا نہیں چاہتے تھے۔

وقت کتنی جلدی بیت جاتا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب ہماری منسٹری کی میعاد ختم ہو گئی اور ہم ہیرو سے پھر زیرو ہو گئے۔ ساری شان و شوکت، سارا دبدبہ ختم ہو چکا تھا۔ اب ہم منسٹر نہیں رہے تھے۔

ہماری سامنے والی کوٹھی میں بڑی گہما گہمی رہتی ہے —— جانتے ہیں کیوں —— ؟ اس کوٹھی میں جنتا سدھار کے منسٹر شریمان غریب چند جی رہا کرتے ہیں۔ ہم جب کبھی لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ ہاتھوں میں تحفے تحائف اور گلدستے لئے دیکھتے ہیں تو دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی ہے اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں —— جب تک ہم منسٹر تھے سب ہماری جے جے کار کیا کرتے تھے۔ ہماری راہوں میں پلکیں بچھایا کرتے تھے مگر اب کوئی ہماری طرف بھولے سے بھی نہیں دیکھتا۔ کتنے کم ظرف اور طوطا چشم لوگ ہیں۔

ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس سال ہم محفوظ حلقہ سے الیکشن لڑیں گے۔ ہریجن ہمیں پورا پورا تعاون دیں گے کیونکہ اُن پر ہمارے بہت سارے احسانات ہیں —— میری بیوی جو کبھی میری معشوقہ تھی اور جسے اغوا کرنے کے جرم میں مجھے چھ مہینے کی قید ہوئی تھی، اسی طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ووٹروں کی بھاری اکثریت سے کامیاب ہو جائیں گے۔

اب آپ کی بچتوں پر
اور بھی زیادہ سود

صرف چھ برسوں میں

اپنی رقم کو دگنی سے بھی زیادہ کیجیے
قومی بچت سرٹیفکیٹ (چھٹے اجراء) میں لگائیے

اس نئے سیریز میں 100 روپے چھ برسوں میں 201.50 روپے ہو جاتے ہیں جس میں 12 فیصد سالانہ کی شرح سے ششماہی مرکب سود بھی شامل ہے۔

ایک نیا ساتواں اجراء بھی ہے جس میں 12 فیصد سالانہ سود ششماہی ادا ہوگا اور اصل زر 6 سال کے بعد واپس کیا جائے گا۔

دونوں سیریز کو تین سال کے بعد بھنایا جا سکتا ہے۔ رقم لگانے کی کوئی حد نہیں۔ نامزدگی، شناختی پرچی اور منتقلی کی سہولیات۔

انکم ٹیکس کے مقاصد کے لیے سرٹیفکیٹ ڈاک گھروں سے بلا معاوضہ جاری کیے جاتے ہیں۔

ایک لاکھ 50 ہزار روپے تک دولت ٹیکس سے چھوٹ۔ 3,000 روپے سالانہ تک سود بمعہ دیگر متعینہ سرمایہ کاریوں پر سود کے انکم ٹیکس سے مستثنیٰ۔

یہ سرٹیفکیٹ ڈاک گھروں سے انفرادی یا مشترکہ طور پر یکم مئی 1981ء سے دستیاب ہیں۔

مزید تفصیلات کے لیے ان سے رجوع کیجیے۔

— کسی مجاز ایجنٹ
— ڈسٹرکٹ سیونگز افسر معرفت ڈسٹرکٹ کلکٹریٹ
— نزدیکی ڈاک گھر
— ریجنل آفیسر، نیشنل سیونگز آرگنائزیشن (ریاستی/مرکزی/سرکار)

یاد رکھیے: **قومی بچت ادارہ**

(LOGO)
(NSO)

12 ٹیمپرزی ہلز، ناگپور - 440006

davp 81/30

شگوفے

(لطیفے)

- دو روایت پرست انگریز ایک دریا کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ آناً فاناً جھکڑ چلے، آندھی آئی۔ اس افراتفری میں ایک انگریز پھسلا کر دریا میں گر پڑا اور جاں بحق ہوگیا۔ یہ سارا منظر ایک امریکی مسافر اپنی ہوٹل کی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ جب طوفان تھما تو وہ نیچے آیا اور اس نے انگریز سے پوچھا کہ "جناب معاف فرمائیں۔ آپ چاہتے تو اپنے دوست کی جان بچا سکتے تھے۔" انگریز نے قہر آلود نگاہوں سے امریکن مسافر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی وہ شخص مجھ سے متعارف نہیں تھا۔"

~~~

- آدم اور حوا کے درمیان ایک غلط فہمی پیدا ہوئی۔ حوا نے آدم سے شکایت کی کہ "تم کسی دوسری عورت میں دلچسپی لینے لگے ہو" آدم نے سمجھایا کہ یہ سراسر بہتان ہے۔" بھلا اس دنیا میں تمہارے سوا اور کوئی عورت بھی ہوسکتی ہے؟ حوا اس جواب سے زیادہ مطمئن نہ ہوئیں۔ جب آدم سر شام سو گئے تو حوا نے ان کا قمیص سرکایا اور آدم کے پسلیوں کی ہڈیاں گننے لگیں۔

~~~

- بور وہ ہے جو کچھ کہنے نہیں دیتا۔ بور وہ بھی ہے جو کچھ سننے نہیں دیتا۔ جی ہاں، بور وہ بھی ہے جو نہ کچھ سنتا ہے اور نہ ہی بولتا ہے۔

~~~

- دو لڑکیاں اپنی ماؤں کی تقریری صلاحیتوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ ایک نے کہا کہ "تم نہیں جانتیں [illegible] میری ماں کسی بھی موضوع پر فی البدیہہ گھنٹوں تقریر کرسکتی ہے۔ دوسری نے فخریہ انداز میں کہا "یہ تو کوئی خاص بات نہیں۔ میری ماں بغیر کسی موضوع کے گھنٹوں تقریر کرتی ہے!"

~~~

- ڈاکٹر: "جناب، آپ نے کل جو چیک عنایت فرمایا تھا وہ آج بینک سے واپس آگیا ہے۔"
  مریض۔ "بالکل اسی طرح، جس طرح میرا مرض پھر لوٹ آیا ہے۔"

~~~

- بینک کے خزانچی نے خوف سے لرزتے ہوئے چور سے گزارش کی "جناب یہ کیش بک بھی اپنے ساتھ لے جائیں کیونکہ خود مجھے دو ہزار [illegible]یوں کی ضرورت ہے!"

~~~

- وہ دن گئے جب اداکارائیں فلموں میں اپنے اپنے رول ادا کیا کرتی تھیں۔ آج کل تو وہ خود اپنی شخصیتوں کا اظہار کرتی ہیں۔

~~~

- لیٹے لیٹے سگریٹ نہ پیا کرو۔ اس طرح بستر سے گرنے والی راکھ تمہاری اپنی ہوگی!

~~~

(مرسلہ: ڈاکٹر بی کاف)



گاندھی جی، ٹیگورؔ، نہرو اور پرکاشم کے خواب حقیقت بن گئے



گرام راج کے قیام کے لئے باپو جی، ٹیگور، نہرو اور پرکاشم جیسے قائدین نے جو خواب دیکھا تھا وہ اب حقیقت بن گیا ہے کیونکہ دیہی عوام کی ترقی کیلئے حکومت محکمۂ پنچایت راج کے ذریعہ نت نئی اسکیمیں شروع کرنے کی جدو جہد میں مصروف ہے

پنچائت راج کے تحت نت نئی اسکیمیں

قومی دیہی روزگار کے پروگرام

اس پروگرام کے تحت ۸۱ ۔ ۱۹۸۰ء تک اسکول عمارتوں، کمزور طبقات کے لئے امکنہ، سڑکوں کی تعمیر، چھوٹی آبپاشی کے لئے ۴۰ کروڑ ۵۵ لاکھ روپے صرف کئے گئے۔ چھٹے منصوبے کی مدت کے دوران اس پروگرام کے تحت تقریباً (۲۰۰) کروڑ روپے خرچ کرنے کی تجویز ہے جس سے دیہی عوام کو روزگار ملے گا۔

دیہی سربراہی آب

سابقہ منصوبوں کے دوران ریاستی حکومت نے مواضعات میں پینے کے پانی کی سربراہی کے لئے ۶۳ کروڑ روپے صرف کئے تھے۔ سال ۸۱ ۔ ۱۹۸۰ء کے دوران ۲۲ کروڑ ۸۲ لاکھ روپے کے خرچ سے خشک سالی سے متاثرہ ۱۴ علاقوں میں ۱۷ ہزار ۱۷۱ بورویل نصب کئے گئے۔ سال ۸۲-۱۹۸۱ء کے دوران بورویلس پر ۶ کروڑ روپے اور چھوٹے و بڑے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی اسکیموں پر ۱۰ کروڑ روپے صرف کرنے کی تجویز ہے۔ (۶) اضلاع کے لئے ناگ ارجنا ساگر سے پانی کے حصول کی خاطر ۱۱ کروڑ ۵۵ لاکھ روپے کے خرچ سے ایک پروگرام کو منظور کیا گیا ہے۔ مارچ ۸۲ ۱۹ء تک اس پراجیکٹ کے مکمل ہونے پر فلورائیڈ سے متاثرہ

باقی صـ۵۸ پر

(۱۷۱) مواضعات کو فائدہ پہونچے گا۔

دیہی طبّی امداد

حکومت پوری ریاست میں (۴۲۰) پرائمری ہلتھ مراکز ، (۱۵۶) ایورویدک اور (۵) ہومیوپیتھی ڈسپنسریاں چلارہی ہے۔

دوپہر کے کھانے کا پروگرام

باقاعدہ اداروں کی مدد سے اِس پروگرام کے تحت اسکول جانے والے بچوں کی ایک بڑی تعداد کو فائدہ پہونچانے کی تجویز ہے۔

گرام پنچایتوں کے وسائل

پنچایت راج اداروں کی ترقیاتی سرگرمیوں کے لئے ۱۲ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔

پنچایت راج انتخابات

ملک میں پہلی مرتبہ عام انتخابات کی طرح پنچایتی انتخابات میں نشستیں محفوظ کردی گئی تھیں۔ سرپنچ کے عہدے کے لئے درج فہرست ذاتوں ، درج فہرست قبائل اور خواتین کے لئے ۵ و ۴۴ فیصد کی حد تک نشستیں محفوظ کی گئی تھیں۔ سمیتی کی سطح پر درج فہرست طبقات کے (۳) اور درج فہرست قبائل کے ایک ایک اُمیدوار کے لئے نشست محفوظ کی گئی تھی ، ۴۰ تا ۴۵ لاکھ عوام کو حق رائے دہی سے استفادہ کا موقع ملا کیونکہ ووٹ دینے کی عمر کو ۲۱ سال سے گھٹا کر ۱۸ سال کردیا گیا تھا۔ متفقہ انتخابات کے لئے منفرد انعامی اسکیم کے آغاز کے نتیجہ میں (۴۲۶۰) دیہی پنچایتوں اور سمیتیوں کے انتخابات متفقہ طور پر عمل میں آئے۔ اِس اسکیم کے تحت ۳ کروڑ ۲۵ لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی۔ یہ بات باعثِ مسرّت ہے کہ انتخابات پُرامن رہے اور باقاعدہ طریقہ پر عمل میں آئے۔

انتظامی ڈھانچہ

تمام ترقیاتی محکمہ جات کو پنچایت سمیتیوں اور ضلع پریشدوں کے کنٹرول میں لاکر نئی منتخبہ مجالس کی سرگرمیوں کو ہمہ پہلو بنادیا گیا ہے۔

وزیراعظم کے ۲۰ نکاتی اور آنجہانی سنجے گاندھی کے ۵ نکاتی پروگرام پر موثر عمل آوری کے لئے ضلع کی سطح پر ان مجالس کو ان محکمہ جات کا مشورہ اور رہنمائی حاصل رہے گی۔ سماجی بہبود کی انوکھی اسکیموں کے آغاز اور ریاست گیر پنچایت انتخابات کے ذریعہ پنچائت راج کے مقصد کی تکمیل ہوچکی ہے۔ اگرچہ کہ حکومت اِس مقصد کے حصول کے لئے پنچایت راج اداروں سے مکمل تعاون کررہی ہے، لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے عوام کے تعاون کی بھی ضرورت ہے۔

محکمہ پنچایت راج حکومت آندھرا پردیش

جاری کردہ :- ناظم اطلاعات و تعلقاتِ عامہ حکومت آندھرا پردیش

D.I.P.R. 39 (1688/81)

R. No. 15822/68 Postal Regd. No. H. HD-6

SHUGOOFA

Vol 14 Copy 11 31 Bachelor Quarters, M. J. Market, Hyderabad-1 Nov. 1981 Phone : 57716

حیدرآباد

شگوفہ

ماہنامہ



DECEMBER 1981 Rs. 2/50

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

ماہنامہ — حیدرآباد

جلد ۱۴ — دسمبر ۱۹۸۱ء — شمارہ ۱۲

ایڈیٹر:
سید مصطفیٰ کمال

سالانہ (۲۵) روپیہ ، بیرونِ ہند سے (۲۵) شلنگ
فی پرچہ (۲) روپیہ (۵۰) پیسے
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ، چار کمان ، حیدرآباد ۲
خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۴۰ چیمبرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ [فون 57711]

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

کرنل محمد خان

بیگم کی کھوج

کبھی آپ نے غور فرمایا کہ عہدہ بڑھنے کے ساتھ ایک عام پاکستانی میں کیا تبدیلیاں آتی ہیں؟ سب سے پہلے تو اُسے دوسری شادی سوجھتی ہے۔ اچانک اس پر منکشف ہوتا ہے کہ وہ جو ایک مدت سے رفیقۂ حیات بنی آرہی تھی، یک لخت رفاقت کے قابل نہیں رہی! بےچاری کی وضع کی سادگی جناب کے مشاغل کی رنگینی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اب وہ ایسی بیوی کے خواب دیکھنا شروع کردیتا ہے جو پروردگار حسن ہو اور پیغمبر جمال۔ اور کوئی ایسی جنس نظر آجائے تو مزید جستجو میں رہتا ہے کہ خوب سے خوب تر کہاں؟

شروع شروع میں تو ایسی یزداں شکار بیویاں فرنگ سے آتی تھیں، لیکن بعد میں کچھ دنوں کیلئے بناتِ عرب و دختران عجم کی درآمد بھی فیشن بن گیا کہ اس طرح ایک اچھی خاصی میم بھی حبالۂ عقد میں آجاتی تھی اور اسلامی اخوت کا تقاضا بھی پورا ہو جاتا تھا۔ یعنی خاصا رنگین ثوابِ دارین حاصل ہو جاتا تھا، لیکن بحمد اللہ، اب پاکستان ماڈرن بیویوں میں خاصی حد تک خودکفیل ہوگیا ہے، لہٰذا اب نئے عہدے کے اعلان ہونے کے ساتھ ہی ایک نئی بیوی کی پاکستان گیر تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ تلاش اس لئے کہ ہر پاکستانی لڑکی بڑے صاحب کی دلہن بننے کی اہل نہیں اس مرتبے پر فائز ہونے کے لئے ——— سپریم سروسز کی شرائط کی طرح ——— چند کوالیفکیشنز کی ضرورت ہے اور اس ضمن میں پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ رنگ گورا ہو۔ کسی سانولے رنگ کی لڑکی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اوّل درجے کے افسر کے ساتھ شادی کا خیال دل میں لائے۔ یہ قواعد کی رُو سے گستاخی ہے۔

گورا رنگ اس لئے لازم ہے کہ میم نہ سہی، میم کا دھوکہ ہوتا ہے۔ نیز چونکہ دھوکہ اسی صورت میں کھایا جا سکتا ہے کہ گورا رنگ مستور نہ ہو، لہٰذا دوسری لازمی شرط یہ ہے کہ پردہ نہ کرتی ہو۔ لیکن یہ چادر اور چار دیواری سے بے پردگی نہیں جو برقع ترک کرنے سے پیدا ہوتی ہے، بلکہ یہ وہ فعال بے پردگی ہے جس میں دوپٹہ اور آستینیں کم ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہیں اور باقی ماندہ پیرہن کی تنگی اور تنگی خطوطِ بدن کی اس وضاحت سے غمازی کرتی ہیں کہ تماشائی کو تصور پہ بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سسر کے ہاں صاحبِ زر ہونا گو کوئی منافی نہیں، لیکن ایسے لوگ جیسے خدا نے فکر کرنے بھیجے تھے بلکہ قدرت کی تمام غلطیوں کی کسی

بحالتِ مجبوری سست مشاطہ (مشاط ہو تو بہتر ہے) نے مُو بمُو اصلاح کی ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ دُلہن سوشل (SOCIAL) ہو۔ سوشل ہونا بڑی جامع اصطلاح ہے۔ اس میں مخلوط کھانوں اور کھیلوں میں شامل ہونے سے لے کر ناچنے تک سب کچھ آتا ہے۔ یا یُوں کہیں کہ اگر کچھ باقی رہ جاتا ہے تو برائے نام ہی رہ جاتا ہے۔ اور آخر میں متوقع بیوی کو انگریزی بولنا اور موٹر چلانا بھی آتا ہو تو دیگر شرائط کو اور نرم بھی کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اگر موٹر جہیز میں لائی گئی ہو۔

عہدہ بڑھنے کے ساتھ دوسری تبدیلی یہ آتی ہے کہ جنابِ عالی انسان سے "صاحب" بن جاتے ہیں۔ انہیں کوئی شیخ یا میاں کے لقب سے پُکارے تو اس طرف دیکھتے ہی نہیں۔ صرف زیرِ لب بلانے والے کے حق میں کچھ بدزُبانی کر دیتے ہیں، لیکن کوئی خدا کا بندہ انہیں "صاحب" سے مخاطب کر دے تو اسی انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ پھر کب صاحب کہہ کر پکارے گا۔ جب نوکر کو دھوبی سے یہ کہتے سنتے ہیں کہ "نالائق آدمی، تم نے صاحب کا سوٹ خراب کر دیا۔" تو خوشی سے پھُولے نہیں سماتے خواہ سُوٹ کا واقعی ستیا ناس ہو گیا ہو۔ اگر بیرا کسی ملنے والے سے کہہ دے کہ "صاحب سو رہے ہیں" تو یہ قیامت تک سوئے رہیں گے کہ ان کی صاحبی کا تذکرہ جاری رہے۔

لیکن جہاں دوسروں کے لئے یہ صاحب بہادر اور بیگم صاحبہ ہیں، خود آپس میں ایک دوسرے کو خاصے لغو اور بے معنی ناموں سے پُکارتے ہیں۔ کوشش حتی الوسع یہ ہوتی ہے کہ یہ "نِک نام" انگریزی نما ہوں۔ مثلاً صاحب کا نام جمیل ہے تو بیگم جمی بلائیں گی اور بیگم صاحبہ شادی سے پہلے شمیم تھیں تو اب شمی کہلاتی ہیں۔ میاں بیوی بالاتفاق اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ اِن ننھے مُنّے ناموں سے پکارنا ماڈرن ہونے کی علامت ہے ثبوت یہ کہ انگریز اور تمام بڑے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ نیز اِن ناموں سے بلانے سے باہمی پیار بڑھتا ہے، چنانچہ آپس میں لڑائی ہو جائے تو پھر ایک دوسرے کے نام نہایت سنوار کر بُلاتے ہیں اور معاملہ زیادہ گرم ہو جائے تو وہ اسے مسٹر کہے گی اور یہ اُسے محترمہ سے خطاب کریں گے۔ ناراضگی بڑھ جائے تو اب وہ پہلی بیوی والی بات نہیں کہ "جب تک آپ راضی نہ ہوں گے اور کھانا نہ کھائیں گے میں روٹی کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔" اب تو ابتدائی گالی گلوچ کے بعد بیگم صاحبہ سینما کو چل دیتی ہیں اور صاحب کلب کی راہ لیتے ہیں اور اس وقت تک باہم راضی نہیں ہوتے جب تک بیرے، خانسامے اور جملہ ہمسائے اِن کی خانہ جنگی سے تنگ آکر صلح نہ کرادیں۔ وہ شرفا بھی کوئی شرفا تھے جن کی گھر کی بات حویلی سے باہر نہ جاتی تھی؟ بیچارے اگلے وقتوں کے لوگ تھے۔

یہ گھر کے اندر اور باہر کی تمیز بھی اگلے وقتوں کی بات ہے۔ وہ چھوٹے آدمی ہوتے تھے جن کے گھر کے دو واضح حصے ہوتے تھے۔ سامنے صحن اور بیٹھک یعنی مردانہ اور پیچھے زنانہ۔ لیکن صاحب بنتے ہی زنانہ حصہ منسوخ ہو جاتا ہے۔ اب اس طرف فرصت کے وقت نوکر لوگ بیٹھ کر صاحب کی "کوئی ہے" کا انتظار کرتے ہیں۔ مردانہ میں اب زنانہ التفات کی بدولت ہر وقت رونق رہتی ہے۔ بیٹھک وہی ہے مگر اب گول کمرہ کہلاتی ہے اور کسی زمانے میں اگرچہ مردوں کے لئے مخصوص تھی مگر اب اس کے استعمال میں تذکیر و تانیث کی تمیز نہیں۔ بلکہ اپنے اور غیر کا امتیاز بھی نہیں رہا۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں

کے لئے۔

عہدہ بڑھنے کے ساتھ صاحب کے فرائض میں اضافہ ہونا چاہیئے لیکن ہوتا نہیں۔ البتہ صاحب کے آرام کے اوقات میں نمایاں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اس آرام میں صبح کی بیداری اب عذاب معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ جب تک خدام ادب دس بارہ دفعہ یاد نہ دلائیں کہ آج جمعہ نہیں، آپ اس وقت تک نہیں اُٹھتے اور اُٹھیں بھی تو پورے کہاں اُٹھتے ہیں۔ پہلے تو ذرا نیم دراز ہو کر بستر ہی میں مارننگ ٹی پیتے ہیں۔ پھر غسل خانے میں داخل ہوتے ہیں تو اس وقت تک خارج نہیں ہوتے جب تک بیگم صاحبہ بزور برآمد نہ کریں کہ ناشتہ کے لئے ایک معینہ مدت سے زیادہ وہ بھی انتظار نہیں کر سکتیں۔

پھر جناب دفتر میں جاتے ہیں۔ بہت دیر سے جاتے ہیں اور قصداً کہ صحیح وقت پر دفتر پہنچنا ہتک سمجھتے ہیں۔ پابندیٔ وقت افسر کی شان نہیں، کلرک کی پہچان ہے اور جب دفتر کے دروازے کے قریب پہنچتے ہیں تو اندر داخل ہونے سے پہلے ایک عمل لازم اور لابدی ہے وہ یہ کہ کوئی چپراسی، اور چپراسی نہیں تو کوئی جنّ یا بشر دروازے کی چق اُٹھائے تاکہ صاحب اندر قدم رکھ سکیں۔ اگر سچ مچ صاحب کو اپنے ہاتھ سے چق اُٹھانا پڑ گئی تو دفتر میں قیامت آجائے گی اور چند نچلے درجے کے پاکستانیوں کا روزگار خطرے میں پڑ جائے گا۔ لیکن پاکستانی چپراسی کہ اپنے صاحبان کی مزاج شناسی کے اسپیشلسٹ ہیں، بروقت چق اُٹھانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ اس لئے ملک کا کاروبار چل رہا ہے۔

اَب دفتر کا کام شروع ہوتا ہے۔ صاحب بہادر پہلے تو وہ نوٹ بُک کھولتے ہیں جس میں گھر سے چند اہم گھریلو پوائنٹ لکھ کر لائے ہیں۔ اِن پوائنٹس کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے۔

۱۔ رحمٰن اینڈ سنز کو فون کرنا کہ بیگم صاحبہ کو لپ اِسٹک پسند نہیں۔ ذرا گہرے شیڈ کی بھیجو۔
۲۔ پلازا سینما پر آخری شو کے لئے دو فری پاسوں کا انتظام۔
۳۔ مَری جانے کے لئے چھٹی کی درخواست۔۔ لیکن ہو سکے تو ڈیوٹی بناؤ۔
۴۔ شمی کے میکے والوں کو خط اور مری آنے کی دعوت۔
۵۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ اہم کام یکے بعد دیگرے ہونے شروع ہوتے ہیں۔ صاحب کے قریب فائلوں کا انبار لگ رہا ہے۔ جب آخری گھریلو پوائنٹ پر ٹِک (✓) لگ جاتی ہے تو صاحب دل کڑا کر کے فائل کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے، لیکن اسی لمحے اچانک کوئی دروازے پر دستک دیتا ہے اور ایک اور ہنستا، گنگناتا صاحب اندر داخل ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ جو فائل کی طرف بڑھ رہا تھا، مہمان کے مصافحہ کو بڑھتا ہے۔ تخلیہ ہو جاتا ہے۔ سرکاری کام دھک سے رُک جاتا ہے۔ چائے آجاتی ہے، قہقہے لگتے ہیں، سگریٹ جلتے ہیں۔ گپیں چلتی ہیں۔ موضوع ایک تیسرا صاحب اور اس کی بیگم ہے . . . .

کلرک بیچارہ ہر پانچ منٹ دس منٹ کے بعد جھانکتا ہے۔ لیکن صاحبان قہقہے اسے پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔ خدا خدا کر کے مہمان رخصت ہوتا ہے تو کلرک فائلوں کا پلندہ صاحب کے قریب سرکا دیتا ہے، لیکن عین

اسی لمحے ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ یہ بیگم صاحبہ کا فون ہے۔ کچھ اس طرح کی گفتگو ظہور میں آتی ہے۔

"تم ہو جی ؟ ۔"

"ہیلو شمی ۔"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ۔"

"اچھا ؟ ابھی آتا ہوں۔ ذرا یہ فائل . . . . ."

"فائل جائے بھاڑ میں ۔"

"ضرور جائے ۔"

اور صاحب فوراً ٹوپی اٹھائے موٹر کار میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔ رہیں فائلیں، تو وہ ایک مدت سے جمع ہو رہی ہیں ہوتی رہیں۔ کوئی نئی بات نہیں۔ کار جہاں اگر اتنا ہی دراز ہے تو صاحب کا انتظار کیا جا سکتا ہے !

--

الحاج برقؔ آشیانوی

جان عذاب میں ہے کاتبوں سے

کاتب وہ خطرناک مخلوق ہے جو انسان کی پیدائش سے پہلے ہی سے اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے تو قبر میں منہ چھپانے تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ابھی ہم پیدا بھی نہیں ہونے تھے کہ ایک کاتب کاغذ قلم لے کر ہمارے پیچھے پڑ گیا۔ یہ کاتب تقدیر تھا ـــــ! کاتب کا سب سے پہلا اور اہم کام کتابت کی غلطیاں کرنا ہے۔ جس طرح گناہ کرنا انسان کی سرشت میں داخل ہے اسی طرح کتابت کی غلطیاں کرنا کاتب کے مزاج کا حصہ ہے۔ مصنفِ تقدیر نے ہماری کتابِ تقدیر لکھ کر مسودۂ کتاب کاتب کے حوالے کر دیا۔ اس کاتب نے ہماری تقدیر کی کتابت میں اتنی ساری غلطیاں کر دیں کہ ہماری تقدیر کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہو گئیں تقدیر کے مسودے میں صاف طور سے لکھا گیا تھا ہم روس یا امریکہ کے پریسیڈنٹ یا جرمنی کے ڈکٹیٹر یا انگلستان کے بادشاہ یا ہندوستان کے لیڈر بنیں گے لیکن جب کاتب مسودہ لے کر کتابت کرنے بیٹھا تو لکھ دیا کہ ہم ایک ادیب و شاعر بنیں گے۔ تاکہ عمر بھر کاتبوں سے پیچھا نہ چھڑا سکیں۔ ہماری تقدیر میں شرع کے مطابق بیک وقت چار بیویاں لکھی تھیں لیکن کاتب نے صرف ایک بیوی لکھ کر مسئلے کو ختم کر دیا۔ ہماری تقدیر میں کئی عظیم الشان عمارتیں، موٹر شاندار باغیچوں کے لکھی ہوئی تھیں لیکن کاتب نے کسی معمولی قسم کے مکان جن کو آشیانے کہا جاتا ہے لکھ کر ہمیں خسارے میں ڈال دیا اور وہ بھی نیلام کرا دیے گئے ـــــ آشیانے کے بارے میں تو آپ جانتے ہیں کہ ہر موسم میں کسی نہ کسی چمن کی شاخ پر رہتا ہے۔ چنانچہ کبھی کرایے کے اور کبھی سرکاری آشیانوں میں ایک چمن سے دوسرے چمن اور ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اڑتے پھر رہے ہیں۔ اور ہر گلستان میں ایک نہ ایک باغبان ہمارے پیچھے لگا رہا جس کو ہم مالکِ مکان سمجھتے رہے۔ اس نے کبھی مکان کی طرف کان تک دھرنے نہیں دی۔ حتیٰ کہ برقؔ

اس میں آکر بس گئی تو ہم بھی وہ تماشہ دیکھتا رہا۔ بچوں کی تعداد میں بھی ایک کے ہندسے میں صفر کا اضافہ کر دیا اور اس کے برعکس آمدنی میں سے کئی صفر کم کر دیئے۔ ہماری تقدیر میں کئی قیمتی کاریں لکھی تھیں۔ لیکن کاتب نے کاروں کی جگہ بسیں لکھ دیں۔ تقدیر میں لکھا تھا کہ ہم کئی نوکروں کے آقا بنیں گے لیکن "نوکروں" کی جگہ "آقاؤں" اور "آقا" کی جگہ "نوکر" لکھ کر ہمارے سر پر کئی قسم کے آقا مسلط کر دیئے جن میں سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت بیوی ثابت ہوئی۔ البتہ ہم دونوں کی عمروں کے معاملے میں بڑی فراخ دلی سے کام لے کر اکائی میں جو بڑا ہندسہ تھا اس کو دہائی میں لکھ دیا اور دہائی میں جو چھوٹا ہندسہ تھا اس کو اکائی میں لکھ کر سمجھ رہا ہے کہ ہمارے ساتھ بڑی فیاضی اور فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ بچوں کے معاملے میں بھی تناسب بدل دیا جس کی وجہ سے توازن بگڑ گیا اور وہ پلہ بھاری ہو گیا جس کا بوجھ اُتارتے اُتارتے ہم خود اُترتے چلے جا رہے ہیں۔ بہرحال کتابت کی ان تمام غلطیوں کے ساتھ ہماری کتابِ تقدیر چھپ گئی اور اسی کے مطابق ہماری زندگی گزرنے لگی۔

ایک عرصے تک تو زندگی یوں ہی گزرتی چلی گئی اور ہمیں "گزارنے" کی زحمت نہ اُٹھانی پڑی بلکہ یہ زحمت ہمارے بجائے دوسروں نے یعنی والدین اور دیگر عزیز و اقارب نے اٹھائی۔ البتہ ہماری زندگی کو جب خود ہمیں "گزارنا" پڑا تو اس وقت کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جوڑ دو دو کاتب ہمارے پیچھے سی۔ آئی۔ ڈی کی طرح لگے ہوئے ہیں۔ سی آئی ڈی کے کارندے پھر بھی غنیمت ہیں کہ رات کو سوتے وقت بلکہ اور کئی ایسے مواقع جن کا ذکر کرنا اس لئے ضروری نہیں کہ عقل مند کو اشارہ کافی ہے، ہمارے پیچھے نہیں آتے۔ لیکن وہ دو کاتب جنہیں کاتبِ اعمال کہا جاتا ہے۔ ہمارے داہنے اور بائیں ہر دو جانب رات دن سوتے جاگتے اور اُن تمام مقامات پر جہاں "اندر داخل ہونے کی سخت ممانعت ہے" کی تختی لگائے بغیر کسی کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ کاغذ قلم لئے موجود رہتے ہیں اور ہمارے اعمال کی کتابت کرتے رہتے ہیں۔ یہ کاتبین جتنی بھی کتابت کی غلطیاں کریں ہمارے حق میں مفید ثابت ہوں گی ورنہ اگر یہ لوگ ہمارے اعمال کی کتابت صحیح صحیح کر بیٹھیں تو یہی اندیشہ ہے کہ ہمارے لئے جنت کے دروازے اسی طرح بند ہو جائیں گے جیسے "خواتین" کے مشاعرے میں "حضرات" کا داخلہ یا نمائش کے "یوم خواتین" میں مرد آدمیوں کا داخلہ (سوائے اُن مردوں کے جو اسٹالوں پر موجود رہتے ہیں جن کو غالباً خواتین مرد نہیں سمجھتیں یا وہ مرد، خواتین کو خواتین نہیں سمجھتے۔ یا پھر کوئی تیسری بات ہو تو وہ خواتین جانے اور اسٹالوں پر موجود رہنے والے جانیں) غرض ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ یہ کاتبین شروع سے آخر تک پوری کتابت ہی غلط کر دیں تاکہ اُن کی غلطیاں ہماری نجات اور بخشش کا باعث ہوں۔

آخر میں ہم اُن کاتبوں کا نہایت سرسری انداز میں ذکر کرتے ہیں جنھوں نے ہمارے مضامین، منظومات، ڈرامے اور کہانیوں میں کتابت کی غلطیاں کی ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ ان کاتبوں پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب مزید لکھنے کی گنجائش باقی نہیں ہے۔ اس کے باوجود اگر کسی کاتب نے کوئی توجہ کی ہو تو اُس سے قسم لے لیجئے۔ بڑے سے بڑے کاتب کا یہ حال ہے کہ پورے مضمون میں کم از کم ایک غلطی کتابت کی ضرور کرے گا ورنہ فنِ کتابت پر حرف آجانے کا سخت اندیشہ رہتا ہے۔ یہاں ہمیں ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک گوالے سے ہم دودھ لیا کرتے تھے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ خالص دودھ دیتا ہے۔ چنانچہ جب وہ اپنی بھینس کو بہ نفس نفیس لاکر ہمارے دروازے کے سامنے دوہنے لگا تو آخر میں اس نے انتہائی دیانت داری اور ایمانداری کے

ساتھ ہمیں دکھلاکر ایک قطرہ پانی کا پورے دودھ میں ملا دیا ۔ ہم نے دریافت کیا کہ " بھائی یہ ایک قطرہ پانی تم نے دودھ میں کیوں ملایا ۔ ؟" تو اُس نے جواب دیا ۔ " صاحب دودھ میں پانی ملانا ہمارا ایمان ہے ۔ یہ ایک قطرہ پانی نہ ملائیں تو ہمارا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا ۔"

غرض کوئی کاتب ہر صفحہ میں ممکن نہ ہو تو کم از کم پوری کتاب میں کتابت کی ایک غلطی ضرور کرے گا لیکن ہم بھی پوری ایمان داری کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمیں کاتبوں سے اب تک نہ کوئی شکایت ہوئی ہے نہ آئندہ ہوگی ۔ وہ کتابت کی غلطیاں کرتے رہیں اور شوق سے کرتے رہیں ۔ ہم صبر و تشکر سے کام لیتے رہیں گے ۔

کتابت کی کسی غلطی سے جہاں ہماری عافیت یا عاقبت خطرے میں پڑ جائے ایک ایسے اعلان کے ذریعہ اس کی تلافی کر دیں گے جس میں پھر ایک غلطی کتابت کی ضرور ہوگی ۔ کتابت کی غلطیوں سے ہم جیسے لکھنے والوں کو ایک خاص فائدہ پہنچتا ہے ۔ جتنی املا کی غلطیاں کسی مضمون یا کتاب میں ہم سے سرزد ہوتی ہیں ، گرفت میں آنے پر صاف کاتب کے سر تھوپ دے کر اپنا دامن بچا لیتے ہیں ۔

— —

مختار یوسفی
مالیگاؤں

فلم بینی اور ہم

مفتیانِ قوم کو یہ ہو رہا ہے اختلاج — عورتوں میں بڑھ رہا ہے فلم بینی کا رواج
ان کا غصہ ہے کہ مردوں سے زیادہ عورتیں — ہر سنیما میں کھڑی ہیں یا پیادہ عورتیں
اس قدر رش عورتوں کا الحفیظ و الاماں — تُو تُو میں میں اور جھگڑا الحفیظ و الاماں
ایک بی بی اور اس کے ساتھ منّے منّیاں — جیسے چوزوں کو چراتی پھر رہی ہوں مرغیاں
کوئی عورت چیختی ہے میرا مُنّا ہے کہاں — دوسری کہتی ہے، ہوگا اس کا ابّا ہے جہاں
ہوتی رہتی ہے وہاں آنکھیں لڑانے کی بھی مشق — عشق کرنے کی، بھگانے بھاگ جانے کی بھی مشق
تھیٹروں میں بے جھجک ہوتا ہے غیروں سے ملن — دیکھ کر شرمائیں جس کو آج کے فلمی وِلن
عورتوں کا رش زچہ خانوں میں کم ہونے لگا — تھیٹروں میں اب تو بچوں کا جنم ہونے لگا

ان مریدوں کو مگر ملتی ہے فرصت شام سے
دوسرے شو تک پڑے رہتے ہیں جو آرام سے

مفتیانِ قوم کی یہ ساری باتیں ہیں بجا — لیکن ان باتوں میں کیا وہ خود نہیں ہیں مبتلا
کیا سنیما دیکھنے سے خود انہیں پرہیز ہے؟ — کیا نظر بازی میں ان کی آنکھ بھی کم تیز ہے!
کیا وہ سڑکوں پر نہیں کستے ہیں فقرے بازیاں! — جب نظر آتی ہیں ان کو لڑکیوں کی ٹولیاں
وقت خود ان کا گزرتا ہے کلب میں بار میں — بے ضرورت گھومتے رہتے ہیں یا بازار میں
کیا جوئے اور سٹے بازی میں نہیں وہ مبتلا! — عورتوں کی فلم بینی پر یہ واویلا ہے کیا!
کیا نہ ذمہ داریوں سے اپنی وہ غافل رہے — کیا نہ وہ خود اپنے گھر میں مولوی فاضل رہے
عورتیں جو گھر میں ہیں پروردۂ ماحول ہیں — مرد جب بے راہ ہیں تو عورتیں بے ڈول ہیں
ہے کہاوت "خشتِ اول چوں نہد معمار کج — پھر زمیں سے "تا ثریا می رود دیوار کج"
کھا کے ستر چوہے بلی حج کو جیسے جائے گی — اس کی نیت نیک ہے اس پر نظر کم جائے گی

"کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر
فعلِ بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر"

ڈاکٹر سمیع [illegible]
([illegible])

ترکِ خودی

بات بہت پرانی ہے۔ آدم کی تخلیق ہو رہی تھی، اس پروٹوٹائپ کو فرشتے اسی حیرت سے دیکھ رہے تھے جیسے کسی کارخانے میں کسی نئی مشین کا پروٹوٹائپ تیار ہوتا ہے تو کاریگر متعجب ہو کر ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟ اس کا مصرف کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ آج کل کے اس پروٹوٹائپ کے اندر کیا ہے، فرشتوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے روبوٹ یا کمپیوٹر کی ایک اہم خصوصیت دکھانی منظور ہوئی تو فرشتوں کے سامنے آٹومیٹک ٹی وی پر کائنات کی تمام اشیاء کو پیش کر کے فرمایا ان کے نام بتاؤ۔ فرشتے حیران رہ گئے۔ وہ تو صرف وہی جانتے تھے جس کا علم خدا نے ان کو دیا تھا۔ اس امتحان میں تو وہ صفر ہو کر رہ گئے۔ اب آدم کے سامنے انہیں اشیاء کو پیش کیا گیا تو آں جناب نے ان تمام کے نام خوامخواہ فٹافٹ بتا کر فرشتوں کو اس طرح حیران کر دیا تھا جس طرح [illegible] دنیا دیکھا ملاقات آدمی ہمہ دانی کے دعووں میں ہر ایک کو اپنی باتوں سے حیران کرتا ہے۔ آدم علیہ السلام ہی کی ایک صفت یہ بھی موجود ہے کہ نہ صرف اشیاء کے نام رکھ دیتے ہیں بلکہ ان کی خصوصیات بھی اپنی طرف سے ساتھ ظاہر کر دیتے ہیں۔ جس طرح ایک بازاری دوا فروش جڑی بوٹیوں کی بیچ قیمت بتاتا ہے۔ ([illegible])

ہمارے جد امجد کی یہی عادت یا خصوصیت ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور چیز کا نام رکھ دیتے ہیں (اچھا یا برا)۔ ہماری سب سے بڑی عادت بن گئی۔ جہاں کوئی چیز دیکھی نہیں کہ اس کا نام معلوم کرنے کی فکر ہوئی اور معلوم ہو تو ٹھیک ورنہ رکھ دیا۔ صرف نام رکھ دیا تجربہ بازی کی اور اس کی صفت بھی مقرر کر دی۔

[illegible] مثالیں [illegible] کہ اگر دنیا [illegible]

فرمایا تھا۔ فلسطین، شام، مصر، ایران کے عام لوگ اس کو زندگی کا جزو لازم سمجھتے ہیں۔ لیکن اس عابد، شاکر، عاقل، مانع، محقق جاندار کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا ذرا دیکھئے تو ہمارا ادب اس کا آئینہ دار ہے۔ ہمارے خیالات، گفتگو، ہمارا برتاؤ سب اس بات کا غماز ہے۔ ہمارے یہاں اُلو سے زیادہ احمق، جاہل نالائق، قابل نفرت کوئی جاندار شاید ہی نکلے۔

اب دوسری مثال ملاحظہ فرمائیے۔ شہباز شب، بوم زماں، چغد دوراں، حضرت اُلو عرف گھگو وغیرہ۔

وہ بیچارہ، عابد شب زندہ دار، صوفی وقت شب، فارغ زمانہ، تنہائی پسند جانور ہمارے یہاں مفت مارا گیا ہے۔

اس کا قصور صرف یہی ہے کہ وہ کوّے چڑیوں کی طرح دن بھر ہماری نظروں کے سامنے نہیں رہتا اور نہ ہمارے بچوں کے ہاتھوں سے روٹی بوٹی کے ٹکڑے چھین لے جاتا۔ رات کی تنہائی میں جب سارا عالم محو خواب ہو تو یہ عابد شب زندہ دار کسی ویرانے میں تنہا مقام پر گپھاؤں میں مرتاضی رشی منیوں کی طرح ہو حق کرتا ہے۔ اسے سوائے قوت لایموت کی تسکین کے کسی سے واسطہ نہیں، چند روز ہے باقی اللہ اللہ خیر صلا، طوطے نہیں تو ہوائی کپڑوں سے ہی شکم دوزخ کو پُر کر لیا اور ہو حق میں مصروف۔ وہ آوازیں نکال کر غافلوں کو جگاتا رہتا ہے کہ ..... سوتا ہے کیا۔

ایسے پرندے کو ہم نے کس نظر سے دیکھا۔ جہاں کسی نامعقول کو دیکھا، احمق کو دیکھا کہہ دیا۔ نرا اُلو۔ دنیا بھر کی نحوست اس بیچارے کے سر لادی گئی، طرح طرح کی حکایات گھڑی گئیں۔ بچوں سے لے کر بڑے تک اس سے ڈرنے لگے، نفرت کرنے لگے۔ جہاں بھولے سے اس نے کسی چھت پر قیام کر کے آواز لگائی، وہاں اہل خانہ بش بش کہہ کر اُڑانے لگے اور پڑوسیوں کے گھروں پر پتھر برسانے لگے۔ کیونکہ توہم یہ ہے کہ اگر اُلو پر پتھر مارا جائے تو وہ جھیل کر پنجے میں پکڑ کر اُڑ جاتا ہے اور پھر پتھر کو گھولتا رہتا ہے اور پتھر پھینکنے والا گھل گھل کر مر جاتا ہے۔

مشرقیوں نے اس پرندے کو اس قدر منحوس سمجھا لیکن مغربیوں کا معاملہ ذرا اُلٹا ہے۔ جناب شیکسپیر نے اس کی تعریف کی ہے اور اس کی ہوٹ کو پُر مسرت (a merry note) قرار دیا ہے۔ مغرب کی کئی کمپنیوں کا نشان تجارت اُلو ہے۔ HENRY HOLTS مشہور کتب فروش ہے ان کا نشان بھی اُلو ہی ہے۔

اُلو کو بُرا کہنا ہماری زبانی جمع خرچ ہے۔ ورنہ ہمارے مشرقی ادب میں کہیں کہیں یہ تاریخ ساز ہستی نظر آتی ہے۔ مثلاً اس مشہور اُلو کا ذکر ہم صدیوں سے پڑھتے رہے ہیں جس نے نوشیروان عادل کی تشکیل کی تھی۔ قصہ مشہور ہے کہ ابتدا میں یہ بادشاہ اشوک اعظم کی طرح بڑا جنگجو تھا اور اس کے ظلم و ستم سے ملک تباہ و برباد ہو رہا تھا۔ ایک دن وہ اپنے وزیر بزرجمہر کے ساتھ شکار کے لئے جنگل میں سے گزر رہا تھا کہ ایک درخت پر دو جانوروں کو ایک دوسرے پر آوازیں کستے دیکھ لیا۔ بزرجمہر سے کہا۔ تم تو جانوروں کے بہت اچھے ترجمان اور ماہر لسانیات ہو۔ بتاؤ تو یہ دونوں بزرگ کیا فرما رہے ہیں۔

وزیر چونکہ موقع شناس و مردم شناس تھا، گرم لوہے کو دیکھ کر چوٹ کی کہ دونوں حضرات اُلو شادی کی نسبت باتیں کر رہے ہیں (مشرقی جوڑیں وہ ان کی لڑکی لڑکا تو موجود کو حد شب کے ذریعے ایک دوسرے کو پسند فرما لیتے) ایک صاحب کہ پدر دختر نیک اختر اور دوسرے کہ پدر فرزند نیک فال ہیں۔ پدر نوشہ کا کہنا ہے کہ جان عزیز اگر بیٹے سے شادی کرنا چاہتے ہو تو دس ویرانے ڈاوری میں دے دیجئے تاکہ ہمارا پورا خاندان اس جاگیر سے مستفید ہو سکے۔ پدر دختر نیک اختر فرماتے ہیں کہ بھائی فی الحال تو میرے پاس ایک ہی ویرانہ ہے جہاں ہو حق کر لیتا ہوں لیکن ہمارا بادشاہ اپنے کاروبار سلطنت کو اسی طرح جاری رکھے تو جلد ہی دس کیا سو ویرانے مہیا ہو جائیں گے اور وہ سب بخوشی نذر کروں گا فقط کی۔ اور پھر اس کے بعد جو ہوا وہ تاریخ میں لکھا ہوا ہے۔ نوشیروان عادل بن گئے اور تاریخ میں اپنے ساتھ اس عقلمند اُلو کا بھی نام ثبت کر گئے۔

آج کا زمانہ ہوتا تو اس کے سونے کے بت جگہ جگہ چوک، چوراہوں پر نصب ہو جاتے تاکہ بت بنانے والوں کاریگروں اور اسکیم نکالنے والوں کا بھلا ہو جاتا اور بچوں کو ان پر کھیلنے کودنے، ان کے سروں پر پھاندنے، گھوڑا بنانے کا موقع ہاتھ آجاتا اور اشتہار والوں کو اشتہار لگانے کی جگہ میسر ہو جاتی۔

اُلّو ایک قسم کا نہیں ہوتا، انسانوں کی طرح کئی قسم کا ہوتا ہے۔ اس میں بزرگی اور بڑائی جسامت کے لحاظ سے نہیں بلکہ نام کی وجہ سے آتی ہے۔ مثلاً ایک بازار میں جب چڑی مار نے بڑے جسیم اُلّو کے مقابلے میں چھوٹے اُلّو کی قیمت زیادہ بتائی تو وجہ دریافت کی گئی۔ فرمایا کہ یہ فارن کا مال ہے (حالانکہ اصل ملکی تھا) اور بڑا الو صرف اُلّو ہے۔ یہ چھوٹا، اُلّو کا پٹھا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب قیس کا انتقال ہو گیا تو لیلیٰ اس کی قبر پر آئی اور قیس کا ہی ایک شعر پڑھا کہ لیلیٰ میری قبر پر آکر آواز دے گی تو میری روح قبر سے نکل کر آواز دے گی۔ اور زور سے آواز دی —— افسوس کہ دورِ حاضر کے عاشقانِ نامدار کی طرح قیس بھی اپنا وعدہ وفا نہ کر سکا۔ اس کی قبر سے ایک اُلّو جسے صدی کہتے ہیں نکل کر بدحواسی میں جھپٹا۔ لیلیٰ کی اونٹنی کے منہ پر لگا۔ جس سے وہ بدک گئی اور بے چاری لیلیٰ اپنے عاشق سے جا ملی۔

اُلّو کی کئی ادبی خدمات میں سے ایک قابلِ ذکر یہ ہے کہ اس نے اُردو کو کئی محاورے دیئے ہیں۔

اُلّو کا پٹھا۔ اُلّو کی دُم۔ بے دم کا بودم۔ اُلّو بننا۔ اُلّو بنانا۔ اُلّو کا گوشت کھلانا۔ اُلّو سیدھا کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

عرصہ ہوا ہماری نظر سے ایک پُرانی بوسیدہ چھوٹی سی کتاب "ادبیاتِ اُلّو" گذری تھی۔ ہم حیران ہوئے کہ اُلّو کب سے حکیم بن گیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ نسخہ علم طب کی کم اور ٹونا ٹوٹکا کے نسخوں سے زیادہ مزین ہے۔ افسوس کہ اس وقت ہم نے اس میڑیا میڈیکا آف اُلّو کی قدر نہ جانی اور پچھتا رہے ہیں۔ اس کے اندر اُلّو کی ہر ہر شئے سے دواؤں اور ان کے طلسماتی اثرات کا ذکر تھا۔ بطورِ نمونہ۔ ھوالشافی

۱۔ اُلّو کے پروں کا کاجل لگا کر پیشِ معشوق جائیں تو چشم زدن میں بے قرار و گرفتارِ عشق ہو جائے۔ (اس نسخہ میں رازداری برتیں۔ کیونکہ آجکل سب کی انگشتریاں، کاجل اور سُرمے دھڑا دھڑ بک رہے ہیں اور نوجوان ان کے دیوانے ہو رہے ہیں۔ ورنہ یہ لوگ اُلّو کا وجود ہی ختم نہ کر دیں)۔

۲۔ اُلّو کے خون سے رنگا کپڑا جلا کر راکھ حاصل کریں۔ جن دو شخصوں کے سر پر چھڑکیں گے ان میں جنم جنم کی دشمنی پیدا ہو جائے گی۔ (آج کی سیاسی پارٹیوں پر کسی ستم ظریف نے شاید یہی نسخہ آزمایا ہے)

۳۔ ایک اہم اور قیمتی نسخہ برائے امتحان دہندگان۔ (ہوشیار کہ ہماری باری آئی) —— اُلّو کا دماغ سکھا لیا جائے۔ چالیس رات تاروں کی چھاؤں میں چھت پر رکھا جائے۔ روغن زیتون میں ڈال دیا جائے۔ اماوس کی رات اس تیل کو نتھار لیا جائے۔ نسخہ تیار ہے اس کو سر میں لگائیں چہرہ طبق روشن۔ اس کا کاجل بنا کر آنکھ میں لگا کر جائیں۔ نقل کریں نقل پکڑی نہ جائے گی۔ آپ بھلے ہی پکڑ لیے جائیں۔

اس کتاب میں یہ نسخے بھی تھے:—

بے موسم پھل کھائیں۔ محبت کے کئی نسخے اور فارمولے، ڈاکو گرفتار کرنے کے نسخے، عقل حاصل کرنے کے نسخے، روزگار کے نسخے، نیند لگانے اور اُڑانے کے نسخے، دودھ پر سے جانور اُڑانے کے نسخے، اپنا بھلا دوسروں کا نقصان کرنے کے نسخے وغیرہ وغیرہ۔

اگر آج اس کتاب کو کوئی ہمیں لا دے تو ہم نہ جانے اسے کیا کیا دے دیں۔ کیونکہ ہم تو اس کی بدولت ہزار پتی ہو جائیں گے لانے والے کا بھی بھلا ہو گا۔ یہ کتاب ہماری غیر حاضری میں بیگم نے شیخ چلی نے غائب کر دی۔ وہ عرصے سے ڈھونڈ رہے تھے، ... مطلب کچھ ...

میں لگے ہوئے تھے۔ کسی کاتم ظریف نے پتہ دے دیا کہ ہمارے پاس دیہاتی معالج۔ رہنمائے صحت ۔ ہمدردِ صحت۔ مستانہ جوگی وغیرہ کے پرچے ہیں اور وہ کسی کر بیٹھیں کا معائنہ کرتے ہوئے وہ کب اس کتاب کو اپنی تھیلی میں رکھ کر رفو چکر ہو گئے پتہ نہ چلا۔ بعد میں ان کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ اللہ عالم الغیب ہے۔

اب اُلّو خرافاتِ آخری مراحل کی طرف قدم زن ہوتی ہے۔ ادب میں اس کے کئی نام ہیں۔ اُلّو۔ چغد۔ بوم۔ صدی۔ گھگھو۔ شہبازِ شب (یہ نام علامہ اقبال نے دیا ہے)

تعارف و تعریفاتِ اُلّو کے خاتمہ پر یہی کہہ سکتے ہیں کہ۔ مصرعہ

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ادارۂ شگوفہ

کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	١٥/- روپے
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	〃	٥/٥٠
تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	٧/٥٠
چھیڑ چھاڑ	پرویز یداللہ مہدی	〃	٦/-
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	〃	٦/-
فقط	〃	〃	٦/-
البتہ	〃	〃	١٠/-
توزمیں	پرویز یداللہ مہدی	ڈرامے	١٠/-
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	مضامین	٨/-
سخن دار	خواجہ عبدالغفور	〃	٨/-
دھرمگیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعۂ کلام	٨/-
بہرحال	مجتبیٰ حسین	مضامین	٧/-
آدمی نامہ	〃	خاکے	٩/-
مسیح ساقی	یحییٰ مصلح	مضامین	١٠/-
رشحاتِ ساقی	وجاہت علی سندیلوی	〃	١٥/-
بلاعنوان	شیخ رحمٰن آکولوی	〃	١٠/-

ڈاکٹر غیاث صدیقی

پڑوسن

ناشتے میں پھیکی دال، چپاتیاں اور آملیٹ میز پر رکھنے کے بعد میری بیوی کچن کو قیمہ لانے کیلئے گئی تھی۔ میں نے دال چکھی اور پکارا کہ دال میں نمک بہت ہے قیمے میں نمک کم ڈالو۔ میرے اور پڑوسن کے گھروں کے درمیان ایک چھوٹی سی دیوار ہے۔ اس دیوار میں سہولت کے لئے ایک گوشے میں چھوٹی سی کھڑکی بنائی گئی ہے۔ دال میں نمک کی زیادتی کے الفاظ دیوار پار کر چکے تھے۔ کھڑکی کھلی اور اس میں پڑوسن کا سایہ نظر آیا۔ اس کے بعد سالن کا کٹورہ، میری بیوی معذرت کر رہی تھی۔ "آپا اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں پھیکا قیمہ بنا رہی ہوں۔" لیکن اس جانب سے اصرار، اِس طرف سے انکار، آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔ "ارے بھابی دے رہی ہیں تو لے لو ورنہ وہ بُرا مانیں گی۔" کٹورہ ادھر آیا، اُدھر کھڑکی کے پٹ بند ہو گئے۔

پڑوسن کی آواز کا مقابلہ شاید پلے بیک سنگر ہی کر سکتے تھے۔ اسے گانا بجانا چھوڑ دینے۔ وہ خادم کو ڈانٹتے تو ایسا معلوم ہو کہ ساغر کھنک رہا ہے۔ جلترنگ بج رہے ہیں۔ اس پر مستزاد میری بیوی کا بیان — "ہائے بھابی کا چہرہ۔ چغتائی آرٹ کا نمونہ۔ ستواں ناک، نرگسی آنکھیں، گلاب کی پتیوں جیسا باریک ہونٹ۔ موتی جیسے دانت وغیرہ وغیرہ۔" میرے دل میں کبھی کوئی بُرائی نہیں آئی۔ پڑوسن کے شوہر جب زندہ تھے اس وقت انہوں نے دو ایک مرتبہ درمیانی پردہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ میری بیوی نے اس تجویز کو مسترد کر دیا تھا کیونکہ میری بیوی کو مجھ سے خوف تھا۔ ایک تو میں شاعر، دوسری بات، میں پڑوسن کی آواز کا مداح اور وہ خود بھی پڑوسن کی خوبصورتی کی مداح۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ بیچاری بیوہ تک ہو گئی لیکن مجھ سے آمنا سامنا نہ ہوا۔

یہ بات فطرت کے مطابق ہے کہ اگر کسی سے کوئی چیز چھپائی جائے تو اُسے دیکھنے کی خواہش اور بڑھ جاتی ہے۔ بیچاری پڑوسن کے شوہر مرحوم ... ایک عالی شان مکان کا ... کر دیا تھا۔ وہی گھر کے کام کاج کرنا پڑتا تھا۔ دو ایک مکانات اور دو ایک گھروں کے کرائے سے زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ کبھی بجلی روشنی منقطع ہونے کی شکایت آتی یا پھر ایک ٹیکس وصول کرنے والا بل لے کر آتا تو پڑوسن میری بیوی کے توسط سے مجھ سے رجوع کرتی۔ اس وقت میں کھڑکی کے قریب فوراً پہنچ جاتا تاکہ آتے ہوئے کھنک ساغر کی سن سکوں، بلکہ زرقی

پھر گر کر چمن سے کیسے ٹوٹتا ہے۔ بہرحال کانوں سے دیکھنے کی کوشش کرتا۔ کیوں ؟ کیا کانوں سے نہیں دیکھا جا سکتا ؟ دیوار کے پیچھے دوسری جانب اگر آپ کا کوئی شناسا بات کرے تو کان آواز سن کر ہی پہچان لیتے ہیں کہ کون ہے۔ فوراً اس کا چہرہ آپ کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ایسے کان بینا کان کہلاتے ہیں۔ جن کانوں میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی وہ "اندھے کان" کہلاتے ہیں۔ اسی طرح بعض آنکھیں بھی کہانیاں سناتی ہیں۔ سامنے بیٹھنے والوں کی آنکھیں وہ کہانیاں سن لیتی ہیں تو ایسی آنکھیں "سننے والی آنکھیں" کہلاتی ہیں اور جو آنکھیں سننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں انھیں "بہری آنکھیں" کہا جاتا ہے۔ رعایتِ لفظی کے ساتھ اسی مفہوم کا ایک شعر ہے۔ ؎

جب سے تعبیرِ خواب اُلٹی ہے
کان اندھے ہیں، آنکھ بہری ہے

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پڑوسن کی آواز کبھی نغمہ بن جاتی تو کبھی دھنک بن کر آنکھوں میں اترتی۔ میری بیوی عام معاملات میں بھولی ہے لیکن اپنا اُلو سیدھا کرنے میں ماہر ہے۔ جب بھی اُس کو فلم دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے اُس روز وہ مزید معمولی ڈشوں کے علاوہ ایرانی داشت کباب، انگلش سیوبری ایگس اور براؤن اسٹو، یا بنارسی مرغ اور اسپیشل پڈنگ کا اضافہ کر دیتی ہے۔ اس طرح کا طعام خاص دیکھ کر فوراً میرا ہاتھ اپنی جیب کی طرف چلا جاتا ہے اور میں پاکٹ کو بائیں ہاتھ سے مضبوط پکڑ کر دائیں ہاتھ سے کھانا شروع کر دیتا ہوں۔ اُدھر بیوی شروع ہوتی ہے۔

"اجی، بے چاری پڑوسن نے چھ ماہ سے کوئی پکچر نہیں دیکھی۔ آج مجھ سے کہہ رہی تھی دن کا سینما دیکھا جائے بشرطیکہ آپ اجازت دیں۔"

میرے گھر کا یہ اُصول ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی ہو جانے تک انھیں فلم دیکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس لئے میری بیوی مجھ سے چھپ چھپا کر فلم دیکھنے کو چلی جاتی ہے۔ اس معاملے میں وہ بہت ہوشیار ہے۔ اپنی خواہش کو ہمیشہ کسی کے کندھے پر رکھ دیتی ہے اور معصوم و بے بس بن کر سامنے آتی ہے۔ کبھی کسی پروفیسر کی بیوی کی خواہش میں لپٹی ہوئی، کبھی نند کی آرزو بن کر، کبھی پڑوسن کے روپ میں پکچر کی آرزو انگڑائیاں لیتی ہے۔ آخر کو یہاں تک بھی ہو چکا ہے کہ میں رات کا کھانا کھا کر آرام لے رہا ہوں۔ وہ آئی۔ "اجی! یہ ہماری یاسمین کتنی بے وقوف ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

کہنے لگی۔ "آج تک اس نے کوئی پکچر نہیں دیکھی۔ سوچتی ہوں ایک پرانی پکچر گھر کے قریب لگی ہے، غریب کو دکھا لاؤں۔"

میں نے کہا۔ "ضرور ضرور، ورنہ اس کی عاقبت خراب ہو سکتی ہے۔" وہ ہنس پڑی اور یاسمین کو ساتھ لے کر چلی گئی۔ پروفیسر کی بیوی سے لے کر یاسمین تک "پکچر دیکھنے کی تمنا" کیسے کیسے روپ بھرتی ہے۔

ایک روز یہ پڑوسن کے ساتھ پکچر دیکھنے کو نکلیں اُدھر علامہ بدرالدین نوفستاں بریک بینی وریش سفید آدھمکے۔

"ڈاکٹر! آج کا اخبار دیکھا ہے؟"

میں نے کہا۔ "دیکھا۔"

وہ بولے۔ "خاک دیکھا۔ ارے سکندرآباد میں وہ پکچر لگی ہے کہ آنکھیں روشن ہو جائیں، سیکس سے بھرپور۔ انگریزی فلموں کی بات ہماری ہندی فلموں میں کہاں آسکتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "علامہ آج میں نے نفل روزہ رکھا ہے۔"

علامہ فوراً بولے۔ "تو پھر کل چلیں گے۔ دیکھو ڈاکٹر، میں اس بات کا قائل ہوں کہ چھوٹے موٹے نگاہ بازی کے گناہ کر لو اور بڑے بڑے عملی گناہوں سے بچ جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "علامہ، مجھے آپ کے اس فلسفے سے صدفی صد اتفاق ہے، اسی لئے تو آج نفل روزہ رکھا ہے۔"

مولانا بولے۔ "یہ کیا بات ہوئی؟"

میں نے کہا۔ "ارے، آج پڑوسن میرا روزہ کھلوا رہی ہے۔ دیوار والی کھڑکی کھلے گی اور ساغر کی کھنک والی آواز بار بار آئے گی۔ یہ لو سالن، یہ لو روٹی، یہ چاول یہ میٹھا۔"

علامہ تھوک نگل کر بولے۔ "میں نے بھی بہت کوشش کی لیکن آپ کی پڑوسن کی زیارت نصیب نہ ہو سکی۔ بڑا کاڑھا پردہ کرتی ہیں۔ پھر بھی ڈاکٹر میں کہتا ہوں کہ جب آپ کی بیوی کہتی ہیں کہ وہ چغتائی آرٹ کا نمونہ ہے تو پھر زیادہ تردد کی کیا بات ہے۔ غالب کا چغتائی آرٹ ایڈیشن نکالئے اور کسی تصویر کے منہ سے ساغر کی کھنک والی آواز خیال ہی خیال میں سن لیجئے۔ سامنے پڑوسن حاضر ہے۔"

میں اُن کے مذاق پر ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔ "علامہ میں پیکر اور آواز کو نہیں ملا پا رہا ہوں۔ جیسے ربر کی گڑیا کو تیل میں ڈالنے سے عمل انجذاب کہاں ہوتا ہے۔"

علامہ بولے۔ "تو پھر ایک تدبیر کرو۔ میرے گھر میں دعوت دی جائے۔ وہاں میں ایسا انتظام کر سکوں گا کہ چہرے کی زیارت ہو ہی جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس اتوار، پڑوسن اور میری بیوی میٹنی شو دیکھنے کو جا رہی ہیں۔ میں وہیں جا کر درشن کر لوں گا۔"

اتوار کو دو بجے دونوں پکچر کو نکلیں۔ ادھر میں بھی آٹو میں اُن کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ دونوں پکچر ہاؤس میں داخل ہوئیں اور میں ایک قریب کی دوکان میں گھس گیا۔ میں نے اُن پر نظر رکھی تھی۔ جوں ہی وہ ٹکٹ لے کر اُوپر چلیں میں بھی ونڈو سے ٹکٹ لے کر آگے بڑھا۔ چونکہ سیٹیں بہت سی خالی تھیں اور منتظمین نے سیٹ کے انتخاب میں آزادی دے رکھی تھی اس لئے میں اپنے چہرے پر دستی رکھ کر کھانستا ہوا ہال میں داخل ہوا اور لباس سے اپنی بیوی کو پہچان لیا۔ بالکل ایک جاسوس کی طرح اُن سے تین قطاریں چھوڑ کر پیچھے کی جانب اپنے لئے سیٹ پکڑ لی۔ وہاں بیگ رکھ دیا اور باہر واپس آ گیا۔ جب اندھیرا چھایا تب اپنی سیٹ پر پہنچ گیا۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ دونوں وہاں سے اُٹھ کر ٹھیک میرے سامنے والی سیٹوں پر آ گئی تھیں۔ وہی ہنسی، کھنکش سب کچھ سن رہا تھا۔ ساغر کھنک رہے تھے اور بلور فرش پر گر کر چھن سے ٹوٹ رہے تھے مگر چہرہ؟

آخر کو انٹرول ہوا اور میں فوراً منہ پر دستی رومال رکھ کر کھانستا ہوا باہر آ گیا۔ ہر دروازے سے جھانکنے کی کوشش کی۔ لیکن پڑوسن نے ساری کا پلو سر پر اس طرح اوڑھ لیا تھا کہ چہرہ نظر ہی نہ آ سکا۔ انٹرول ختم۔ پھر پکچر شروع ہوئی۔ وہی کھنکش، وہی ہنسی، مجھے ایک شعر یاد آیا ہے

چاندنی تھی کہ ہنسی اس پہ برستی جاتی تھی
اس کی نظروں میں کوئی اپنا پرایا بھی نہ تھا

جیسے ہی پکچر ختم ہوئی میں EXIT DOOR سے باہر آ گیا اور عزم کر لیا کہ خواہ کچھ ہو جائے اب تو آمنا سامنا

ہوگا ہی۔ سیڑھیاں اُتر کر باقاعدہ اس طرح کھڑا ہوگیا کہ کسی صورت شانہ نکلنے نہ پائے۔ چنانچہ میری بیوی آگے آگے اور اس کا ہاتھ پکڑے پڑوسن اُتری۔ ادھر میری نظر اُن پر پڑی۔ اُدھر اُن کی نظر مجھ پر پڑی۔ ایک چیخ کے ساتھ وہ میری بیوی کی پشت میں چھپ گئی لیکن اُس وقت تک میں سب کچھ دیکھ چکا تھا۔ پچکے ہوئے چہرے پہ پھوٹے ہوئے دیدے، چپٹی ناک، پچکے گال، جھرّیوں کا تھیلا، رنگ سرخ و سفید لیکن بال؟ ہزاروں سفید بالوں میں ایک کالا بال، موٹے موٹے بھدّے ہونٹ۔

خدا کی پناہ۔ بارہ برس تک پڑوس میں رکھ کر میری بیوی مجھے چغتائی آرٹ کا دھوکہ دیتی رہی۔ گرتا پڑتا کسی نہ کسی طرح گھر پہنچا۔ میری بیوی پڑوسن کو اس کے گھر چھوڑ کر جب اپنے گھر میں داخل ہوئی تو مجھے دیکھ کر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

بارہ سال تک میں نے چغتائی آرٹ کو اور ساغر کی کلک کو ایک ساتھ رکھا تھا۔ لیکن اس خواب کو ٹوٹنا تھا ٹوٹ گیا۔ اور اب یہ حال ہے کہ ؎

جب سے تعبیر خواب اُلٹی ہے
کان اندھے ہیں آنکھ بہری ہے

— —

بیگم

شیخ رحمٰن اکولوی

انسان کی زندگی میں بیگم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جنت جیسے پُر لطف مقام پر حضرت آدم کا دل نہ لگا تو ان کی وحشت کو دور کرنے کیلئے خدا نے حوّا کو پیدا کیا جو دنیا کی خاتونِ اوّل کہلائیں۔ (یہ اور بات ہےکہ انہیں کی باتوں میں آجانے کی وجہ سے حضرت آدم کو خارج جنت ہونا پڑا)۔

بیگمات دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جنہیں مرد اپنی مرضی (اور خوشی) سے اپنے اوپر مسلط کر لیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو والدین کی طرف سے مسلط کردی جاتی ہیں اور جن کی وجہ سے شوہر حضرات اور ان کے والدین کے درمیان ایک طویل سرد جنگ کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً قسط وار چلتا رہتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ والدین نے اپنی پسند کی لڑکی اُن کے گلے باندھ کر اپنے ناکام تجربوں کو دوبارہ آزمایا ہے۔ انہیں تختۂ مشق بنایا ہے۔

گھر کی رونق، گھر کا سکون، بیگم کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ اسی لئے مردوں کو ان باتوں کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیئے :-

(۱) بے موقع بھی بیگم کی تعریف کیجئے۔ نہ بھولئے کہ تعریف عورت کی ازلی فطری کمزوری ہے۔ احتیاطاً دوسری عورت کی تعریف بھی بیگم کے سامنے نہ کیجئے۔ مبادا اس سے تعریف کا کوئی پہلو نکل آئے یا نکال لیا جائے اور بیگم بات کا بتنگڑ بنا کر آپ کا جینا دو بھر کر دے۔

(۲) عورتیں عموماً مسخرا پن پسند کرتی ہیں۔ گھر کی حد تک تھوڑے بہت مسخرے بنے رہیئے۔ اور مسخرے مردوں سے بالکل تعلقات مت رکھئے انشاء اللہ آپ کی ازدواجی زندگی اُس رومانی فلم کی طرح خوشگوار ہوگی جو ولن کے کردار سے مبرّیٰ ہو۔

(۳) بیگم سے وعدہ خلافی نہ کیجئے (کوئی وعدہ ہی نہ کریں تو اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی)

(۴) چھوٹے موٹے غیر اہم معاملات میں بھی نہ جانے بابتی سے کام لیجئے کہ بیگم سے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کیجئے، اس طرح بیگم کا اعتماد آپ کو حاصل ہو جائے گا اور اس کا فائدہ آپ اُٹھا سکیں گے۔

(۵) عورت سے زیادہ محبت جتانے سے پرہیز کیجئے ورنہ بیگم سمجھ جائے گی کہ دال میں کچھ کالا نہیں تو سپیدا ضرور ہے۔

تحائف کے معاملے میں خیال رکھئے کہ وہ بیگم کی توقعات سے زیادہ نہ ہوں اور جلدی جلدی نہ دیئے جائیں ورنہ آپ مشکوک ہو سکتے ہیں۔ آپ کا راز کھل سکتا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مرد بیگم کو گھر کی مرغی، دال برابر سمجھتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اپنی بیگم کے متعلق ہر شخص کی رائے مختلف ہو سکتی ہے۔ لیکن اس بات سے تمام شوہر برادری متفق ہے کہ دوسرے کی بیگم زیادہ خوبصورت اور پُرکشش ہوتی ہے۔

یہ تو ہوئی عام بات، اب خاص بات سُنئے۔ ہمارا مطلب اپنی آپ بیتی سے ہے۔ جب سے ہم ایک دوشیزہ کو بیاہ کر لائے ہیں بے غم ہو کر رہ گئے ہیں۔ مطلب یہ کہ اب کوئی ہمیں کتنا ہی بُرا بھلا کہے۔ لعن طعن کرے اثر ہم پر ذرا نہیں ہوتا۔ ان معاملات میں بیگم نے تختۂ مشق بنا بنا کر ہمیں بے اثر ضرور کر دیا ہے اور نتیجتاً ہماری ازدواجی زندگی خوشگوار ہو کر رہ گئی ہے۔ (شوہر بیگم کی حکومتِ خود مختاری تسلیم کر لے تو پھر کسی قسم کے جھگڑے یا کشمکش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔)

ہماری بیگم شکیل اعجاز کی بہن ہونے پر جتنی نازاں ہیں اسی قدر اس بات سے دُکھی ہیں کہ ان کے شوہر نامدار یعنی کہ ہم لیکم پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے ہیں کہ پیدا ہونا انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ ورنہ ہم کم از کم برنارڈ شا کے ہاں پیدا ہونے پر اکتفا کرتے۔ اس بار ہمیں معاف کر دیں۔ اگلے جنم میں اس معاملے میں ہم انشاء اللہ پوری پوری احتیاط برتیں گے۔ لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ہماری بات کاٹ دیتی ہے کہ "بس بس رہنے دیجئے۔ کیا اس بار تسلی نہیں ہوئی کہ میرا دوسرا جنم بھی خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

حسبِ روایت ہماری بیگم کو ہم سے کچھ شکایتیں ہیں۔ اُنہیں شکایت ہے کہ ہم ان کے ساتھ پیدل سفر کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ہمارا قد ۵ فٹ ۱۱ انچ ہے اور اُن کا ۴ فٹ ۲ انچ۔ قد کے اس (نمایاں) فرق کی وجہ سے ہم ان کے ساتھ پیدل چلنے سے گریز کرتے ہیں۔ ازدواجی زندگی کے ابتدائی دنوں میں ایک دو مرتبہ مواقع آئے تو ہنگامہ ہو گیا۔ بچے "گلی ڈنڈا" کہہ کر آوازیں دینے لگے تو نوجوانوں نے ڈیڑھ متوالے کہہ کر فقرہ چُست کیا۔ بُوڑھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرح گھورنے لگے جیسے بچے چڑیا گھر کے عجیب و غریب جانوروں کو تکتے ہیں۔ نتیجتاً ہم نے بیگم کے ساتھ پیدل چلنے سے توبہ کر لی۔ اب آپ ہی غیر جانبدارانہ فیصلہ کیجئے کہ بیگم کی شکایت بجا ہے یا اس معاملے میں ہماری توبہ بھلی۔

دوسری شکایت انہیں یہ ہے کہ Shopping کے معاملے میں ہم بالکل اناڑی ہیں اور ہمارے اس اناڑی پن کی وجہ سے انہیں اکثر اپنی سہیلیوں کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ وہ ہمیں کیلے، ٹماٹر لانے کو کہتی ہیں، ہم دل پسند اُٹھا لاتے ہیں۔ وہ چاہتی ہیں ترائی، ہم ککڑی لے آتے ہیں اور مشکل یہ ہے کہ گھر میں شاپنگ کرنے والا دوسرا کوئی ہے نہیں کہ اس معاملے میں بیگم ہم سے اور ہم Shopping سے چھٹکارا حاصل کریں۔

جب آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں گے۔ ہم نے بیگم کی شکایت نمبر دو دور کر دی ہے۔ جب ہم کوئی چیز خرید کر لاتے ہیں، کہہ دیتے ہیں کہ شکیل اعجاز صاحب نے دلائی ہے اور بیگم اس چیز کو بہ ہزار جان سے اپنا لیتی ہیں۔ چاہے وہ چیز کتنی ہی عیب دار کیوں نہ ہو۔ ان کو یقینِ قوی ہے کہ ان کے بھائی جان shopping کے فن میں طاق ہیں۔

بیگم ہماری اور نیند بیگم کی کمزوری ہے۔ شام ہوتے ہی ان کے ذہن پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگتا ہے اور وہ جلدی جلدی

گھر کے سب کام نپٹا کر آٹھ بجے بستر پکڑ لیتی ہے۔ ایک رات کا ذکر ہے۔ پونے آٹھ بج رہے تھے۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ صبح کا اسکول ہے شیو کر لینا چاہیئے بیگم کو بلیڈ لانے کیلئے کہا اور خود داڑھی کو صابن لگانے بیٹھ گئے۔ صابن لگنے کے بعد سوکھ گیا۔ بیگم نہ لوٹیں۔ ہم نے سوچا کوئی گھریلو کام نکل آیا ہوگا اس لئے دیر ہو رہی ہے۔ دوسری مرتبہ صابن لگایا۔ اس مرتبہ بھی بیگم نہیں آئیں اور صابن خشک ہو گیا۔ ہم نے تیسری مرتبہ صابن لگایا اور وقت گذاری کے لئے آئینہ میں مختلف زاویوں سے اپنا چہرہ دیکھنے لگے (بالفاظ دیگر ڈارون کے اس قول کی صداقت کو ٹیسٹ کرنے لگے کہ "انسان تھا پہلے بندر")۔ چند لمحے اس شغل میں گذرے تھے کہ ایک آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ "کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے پاپا"۔ یہ ہماری بیٹی عرشی تھی جو نہ جانے کب سے ہمارے کمرے میں موجود تھی اور ہم اس کے وجود سے بے خبر تھے۔ ہم اپنی حرکات پر جھینپ گئے اور اپنی خفت مٹانے کیلئے گویا ہوئے۔ "نہیں بیٹے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آپ کی ممی بلیڈ لانے گئی ہیں اور ہم اُن کا انتظار کر رہے ہیں۔" عرشی ہمارے لب و لہجے کے کھسیانے پن کو محسوس کر کے مسکرا دی پھر بولی۔ "آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ ممی بلیڈ لانے گئی ہیں، وہ تو اپنے بیڈروم میں خواب کے مزے لے رہی ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "پگلی کی بچی تم نے خوب کہی۔ ارے بھئی کچھ دیر پہلے وہ ادھر سے گذریں تو ہم نے خود ان سے کہا تھا۔"

صبح ہم نے رات کا واقعہ بیگم سے بیان کیا تو انہوں نے اسے اتنے پُرزور انداز میں ہمارا جاگتے کا خواب قرار دیا کہ اگر عرشی اس واقعہ کی چشم دید گواہ نہ ہوتی تو ہم بھی اُن کی بات تسلیم کر لیتے۔ کچھ سمجھے آپ۔؟ ہماری بیگم کبھی کبھی چلتے پھرتے میں بھی نیند کے مزے لے لیتی ہیں۔

بیگم کو یقین کامل ہے کہ لڑکیاں ادبی شخصیتوں کی دیوانی ہوتی ہیں۔ اور اس دیوانگی کی وجہ سے خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو" والی کہاوت کو کسی بھی لمحہ عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ پھر مسخرے مرد (مزاح نگار) تو انہیں سینڈوچ کی طرح مرغوب ہوتے ہیں۔ ہم نے انہیں بارہا سمجھایا کہ بیگم آپ جیسی اعلیٰ ونظر خاتون سے بیاہ کرنے کے بعد کسی مرد کی اتنی ہمت ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ لے۔ لیکن بیگم پر ہماری باتوں کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ وہ اس نہج پر وقتاً فوقتاً سوچتی رہتی ہیں۔ جب کبھی ہم اس معاملے میں بحث پر اُتر آتے ہیں تو وہ برہم ہو جاتی ہیں اور کہتی ہیں "خوب سمجھتی ہوں۔ شاعر اور ادیب بڑے دل پھینک ہوتے ہیں۔ ادب کا سہارا لے کر پتہ نہیں کیا کیا بے ادبیاں کرتے پھرتے ہیں۔ کیا میں نے یوسفی کی حماقتیں ہماقت۔ "مام عل، کرنل محمد خاں اور مجتبیٰ حسین کے سفرنامے نہیں پڑھے۔ ان کی بیویاں سیدھی سادی ہیں ورنہ . . . ."

اپنی منطق کو سچ ثابت کرنے پر بیگم تلی ہوئی ہیں اور اسی سلسلے میں اب وہ ہمارے نام آنے والے خطوط بھی چیک کرنے لگی ہیں۔ آج تک تو خیریت ہے۔ لیکن کل اس مضمون کو پڑھ کر کسی منچلے قاری نے فرضی نام سے ایسا ویسا خط پوسٹ کر دیا تو پتہ نہیں، بیگم ہماری کیا گت بنائیں گی۔

— —

قمر الزماں قمر
(مانچی)

عشقیات میں ڈاکٹریٹ

اک محقق نے مقالہ لکھ کے ڈی۔لٹ کے لئے
عشق کے سبجکٹ پر بیچارہ طبق روشن کئے

صاحبِ تحقیق نے ایسے نکالے ہیں نکات
مثلِ آئینہ چمک اٹھا ہے فنِ عشقیات

ابتدائے عشق کا مرکز ہر اک اسکول ہے
جو نہ سمجھے اس حقیقت کو وہ اک دم فول ہے

مبتلا اٹھانوے پرسنٹ ہیں اس کھیل میں
نورِ چشم و نورِ چشمی سب ہیں قید اس جیل میں

عشق جب سے ہوگیا سبجکٹ اک کمپلسری
لڑکیوں میں بڑھ گئی ہے دل رُبائی دلبری

اس محقق نے سہولت کے لئے ایسا کیا
ملک کا نقشہ بنایا اور اس پر لکھ دیا

سیکڑے چالیس ہیومن عشق میں ہیں مبتدی
رہ گئے باقی جو بس ان کو سمجھئے منتہی

نقشہ نذرائیں دے کر روس و کابل کی مثال
کوچۂ جاناں کی سرحد کو دکھایا بال بال

دے کے برہان و دلائل اس نے سمجھائی یہ بات
"شاخِ آہو پر ہی کیوں رہتی ہے عاشق کی برات"

فارسی کا یہ مقولہ آج بھی ہے مستند
عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود

عشق دونوں میں ہے وہ سائنس ہے یا آرٹ ہے
یوں سمجھ لیجئے کہ بس اک دوسرے کا پارٹ ہے

ذیل کے مرقوم ٹوپکس عشق کے ہیں فیکٹر
"شامِ غم، شامِ جدائی، دردِ دل، دردِ جگر"

پہلے شامِ غم کی لمبائی ہزاروں میل تھی
اور چوڑائی شبِ ہجراں کی بے تمثیل تھی

اب مگر یہ فاصلہ گھٹ کر ہے اک نقطہ سے کم
اب شبِ فرقت کی کمائی ہے فقط دو اک قدم

از روئے تحقیق اب معلوم ہوتا ہے یہی
قیس اور فرہاد تھے اس فن میں بالکل مبتدی

دورِ موجودہ میں الفت کی نئی تعریف ہے
پہلے جو کچھ بھی رہی ہو اس میں اب تحریف ہے

ماہرِ الفت کا ہے ڈنکے کی چوٹ ایسا بیاں
عشق اک سگریٹ ہے جلتا ہوا اور بے دھواں

جیسے ہی دو اجنبی مل جاتے ہیں فٹ پاتھ پر
وصل کی درخواست ہوجاتی ہے فوراً کنسیڈر

علیم جہانگیر (اورنگ آباد)

تاریخ کیا ہے؟

کسی نے ٹھیک ہی کہا "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔" یہی وجہ ہے کہ سالِ رواں کا "ماتم" اور نئے سال کا "جشن" منانے سے قبل ہی ہمارے ڈرائنگ روم کے در و دیوار، کتب فروش کی "دوکانیں" "نت نئے ڈیزائن، دلفریب و دلکش مناظر اور حسن و رعنائی کے کلینڈرز سے آراستہ و پیراستہ ہو جاتی ہیں۔

یوں بھی بعض مقولوں اور مشوروں کا صحیح اندازہ انسان کو اسی وقت ہوتا ہے۔ جب وہ ان پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کرلیتا ہے۔ اب ہماری ہی مثال لیجئے۔ ہم رمضان المبارک کی عید کا چاند دوستوں، رشتہ داروں کے ساتھ چاند رات سے ایک دن قبل آسمان پر دیکھنے کی بے سود جستجو میں لگ جاتے ہیں۔ انواع و اقسام کی جنتریوں کے مطابق فراہم کردہ "تین تفرقہ" تاریخیں ہمیں شک و شبہ میں ڈال دیتی ہیں۔ یہ اور بات کہ کہیں سے چاند نظر آنے کی اطلاع پر ہماری مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

ازل سے انسان اور تاریخ کا ساتھ چولی اور دامن کا سا ہے۔ دورِ حاضر کے بہت سے مسائل کا بوجھ صرف تاریخیں اٹھائی ہوئی ہیں۔ روزمرہ تاریخ کا بار ہم لئے پھرتے ہیں۔ اگر آپ فرصت کے لمحات میں کبھی غور کریں تو یہ حقیقت آپ پر عیاں ہو جائے گی کہ آپ کہیں بھی اور کسی بھی حالت میں ہوں۔ آپ سے "بھیا" یا "بہن جی" یہ ضرور دریافت کیا جائے گا۔ "آج تاریخ کیا ہے؟" "ڈیٹ پلیز" وغیرہ وغیرہ۔ خواہ آپ کو تاریخ یاد ہو یا نہ ہو۔ اب ہم آپ سے کیا چھپائیں۔ تاریخ بتانے پر ہم بڑے تلخ تجربوں سے گذرے ہیں۔

ہمیں وہ دن یاد ہے۔ جب ہم ریل میں سفر کر رہے تھے۔ کسی سُریلی آواز کی سرگوشی پر ہم نے پہلی بار تاریخ بتاتے ہوئے معصومیت سے کہہ دیا۔ "محترمہ خدا کے لئے اب بہت مت پوچھئے" دوسرے ہی لمحے میں ہماری نیم ضخیم باڈی کا جنازہ نکلا

گیا تھا۔

"اس مشینی دور میں انسان نے تاریخ سے باخبر رہنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ہیں۔ وہ ہر وقت تازہ اخبار کی ایک عدد کاپی اپنے ساتھ ضرور رکھتے ہیں۔ لوگ انہیں بہت بڑا سیاست داں سمجھتے ہیں۔ آفس میں کبھی اخبار ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو کبھی ٹیبل پر۔ دراصل وہ مسودوں پر اخبار دیکھ کر تاریخ درج کرتے ہیں۔ بلکہ حاجت مندوں کی حاجت بھی رفع کرتے ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے ڈھیر سارے مسودے باس کے ملاحظہ میں بھیج دیئے۔ باس نے بلاکر ان کی خوب خبر لی۔ بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ گھر سے نکلتے وقت عجلت میں وہ پرانے اخبار کی کاپی ساتھ لیتے آئے تھے۔ جس کی تاریخ تمام مسودوں پر درج تھی۔

آپ اسے مبالغہ نہ سمجھیں۔ ہمارے ایک اور دوست ہیں۔ جن کے گھر خدا کے فضل سے ہر سال ایک نیا کلینڈر تیار ہو جاتا ہے۔ نتیجے میں اب ان کے پاس قسم ہا قسم کے اس قدر کلینڈرز جمع ہو چکے ہیں کہ انہیں خود کی تاریخ یاد نہیں۔ ہر کسی سے تاریخ پوچھنا ان کی ہابی ہے۔ ہم نے انہیں اس خطرناک بیماری سے بچانے کی خاطر سنجیدگی سے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "آپ ماضی یا مستقبل دونوں میں سے کسی ایک تاریخ کو اچھی طرح یاد رکھیے۔"

وہ فرمانے لگے۔ "اس سے فائدہ؟"

ہم نے مزید سمجھاتے ہوئے بتایا۔ "مستقبل کی تاریخ میں سے "ایک" کا عدد منفی کرنے یا ماضی کی تاریخ میں "ایک" کا عدد جمع کرنے پر خود بخود حال کی تاریخ حاصل ہو جایا کرے گی۔"

اس پر انہوں نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے غمگین آواز میں کہا۔ "اگر ماضی یا مستقبل پر میری نظر ہوتی تو آج میں حال میں بے حال نہ ہوتا۔"

ہم کلینڈرز کی مدد سے انسان کے معیار اور ذوق کا بآسانی اندازہ لگا لیتے ہیں۔ ہمارے ایک باذوق پڑوسی ہیں۔ جنہوں نے اپنے گھر کو نہ صرف اچھا خاصہ تاریخ گھر بنا رکھا ہے۔ بلکہ قومی یکجہتی کی عمدہ مثال بھی قائم کر رکھی ہے۔ ہماری رائے میں انہیں کم از کم نوبل پرائز ضرور ملنا چاہیئے۔ ان کے پاس ہر ٹائپ کے کلینڈرز موجود ہیں۔ ہر کلینڈر کے لئے جگہ بھی مخصوص ہے۔ فلمی ستارے، سیاسی لیڈر ایک طرف تو مختلف مذہبی، تعلیمی اور ادبی کلینڈرز دوسری طرف۔ ان کے گھر میں کلینڈرز کی بھرمار دیکھ کر ہم نہ صرف طبقاتی کشمکش کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے حسنِ سلیقہ کے قائل بھی ہو کر آتے ہیں۔

بہت دن ہوئے۔ ہم کسی جلسے میں شریک تھے۔ ایک مقرر نے دورانِ تقریر مجمع سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ لوگوں کا قیمتی وقت ضائع کیا۔ مجھے ابھی بہت کچھ کہنا ہے۔ افسوس کہ میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔" مجمع میں سے کسی نے چلاتے ہوئے کہا۔ "آپ کے پیچھے کلینڈر تو ہے۔"

ہم کلینڈر کے ذریعے ملک کی معاشی صورتحال کا بخوبی اور عمدہ طریقے سے جائزہ بھی لے لیتے ہیں۔ مثلاً خلیل خاں کے گھر امپورٹیڈ کلینڈرز سے یا حلیم کے گھر عظیم الشان، دیدہ زیب، رنگ برنگی جنتریوں سے ان کی معیشت کا رعب ہم پر چھانے لگتا ہے۔ لیکن جب اچانک لطیف کی جیب سے "پاکٹ سائز" جنتری نکل آتی ہے تو ہم یوں محسوس کرتے ہیں، اس ملک

غربت اتنی آسانی سے نہیں ہٹے گی۔

خیر کچھ بھی ہو کلینڈر ہے بڑی دلچسپ چیز، اگر یہ نہ ہو تو دنیا کے کاروبار ٹھپ ہو جائیں۔ اکثر اوقات ہم کثرتِ کار کی وجہ سے کلینڈر کا صفحہ اس وقت بدلتے ہیں جب ریڈیو "سری لنکا" سے براڈ کاسٹ ہونے والے ریکارڈ کے اس بول سے ہمارے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔

"خوش ہے زمانہ آج پہلی تاریخ ہے"

لیکن جوں جوں کلینڈر کی تاریخ کے ساتھ ساتھ عمر بڑھتی جاتی ہے، توں توں زندگی کے ساتھ ساتھ ہماری جیب کا وزن بھی گھٹتا چلا جاتا ہے۔ ہم ہر وقت سوچتے ہیں کہ کاش ہر تاریخ "پہلی تاریخ" ہوتی!

غزل

مہمل لکھنوی

کس کے آگے ہاتھ پساروں یاں تو سب بھک منگے ہیں
کس سے اپنا انگ چھپاؤں میری طرح سب ننگے ہیں

کانچ کے گھر میں بیٹھ کے پھینکیں سنگ رہنے ہمسایوں پر
ان اشراف سے اچھے تو ہم بے گھر اور لفنگے ہیں

آپ کی کالی زلفوں کو بدنام کیا ہے مصلحتاً
انسانوں کو ڈسنے والے ورنہ اور بھجنگے ہیں

سحر زدہ لو اور مرد تم صبح کے لانے والے میں
اس صبح میں جینے کو تو رات سے بیش آڑنگے ہیں

جس کے دل میں چور چھپا ہو وہ خود کو انسان کہے
ہم نے اپنا خون پیا ہے ہم خوں خوار پلنگے ہیں

آڑے ترچھے سیدھے میں آئیں ایسی ظالم وقت کی مار
ہم سمجھے تھے مہمل سدھرے مگر وہی بے ڈھنگے ہیں

چار بیٹے

پرنس ہنری

اک کہانی ہے کہ اک راجہ کے تھے فرزند چار
عقل سے عاری تھا اک باقی کے تینوں ہوشیار
ہاں مگر ان تین بیٹوں میں بھی اک اک نقص تھا
اس طرح چاروں کے چاروں عیب میں تھے مبتلا
عقل سے عاری تھا اک اور دوسرا نابینا تھا
تیسرا گونگا تھا، چوتھا کان سے سنتا نہ تھا
ان کے مستقبل سے تھا راجہ ملول و دل فگار
ان کے غم میں رات دن روتا تھا وہ زار و قطار
خوبیٔ قسمت سے آیا ملک میں اک انقلاب
جلد ہی روشن ہوا جمہوریت کا آفتاب
پھر تو ہر غنچہ کو گلشن میں چٹکنا آگیا
بلبلوں کی طرح زاغوں کو چہکنا آگیا
چھٹ گئی راجہ کی نگریں بھی، ہوا وہ شادکام
اس کے بیٹوں نے بھی پایا ملک میں اونچا مقام
عقل سے عاری تھا جو پولیس کا افسر بن گیا
اور اندھا ایک صوبے کا گورنر بن گیا
وہ جو گونگا تھا کسی کالج میں ٹیچر بن گیا
اور بہرہ، وہ تو مرکز میں منسٹر بن گیا

کنواری کی دُعا

صفدر بخاری

یارب مرے دل کو وہ دوشیزہ تمنا دے
دنیائے محبت میں جھنڈا مرا لہرا دے
وہ جوش جوانی دے وہ چال وہ مکھڑا دے
ہاں غازہ و پوڈر کا وہ شوق وہ چسکا دے
تاثیر زباں میں وہ مجھ کو مرے مولا دے
جس سمت نکل جاؤں گلزار وہ رستہ ہو
سکھلا دے مرے داتا کچھ ایسی ہنرمندی

جو عشق کو تڑپا دے جو خود مجھے شرما دے
چہرے پہ وہ رونق دے آنکھوں میں وہ نشہ دے
لڑکوں میں رقابت کی جو آگ کو بھڑکا دے
جو میری طبیعت میں اک برق سی لہرا دے
بھائی کو جو دھوکا دے ماں باپ کو جھکا دے
ہاں میرے سراپا کو گلشن کا سراپا دے
پیسے سے جو الفت لے، الفت سے جو پیسہ دے

القصہ تو یا رب کی اک بیوی کو دعا سن لے
شوہر مجھے ملے مالک مگر عقل کا اندھا دے

مبارک حسین پرویز (عادل آباد)

چوروں کا کنونشن

آزادی کے (۳۴) سالوں میں ترقی کی چوٹی پر پہونچنے میں صرف دو ہی چیزیں کامیاب ہو سکی ہیں۔ ایک گرانی اور دوسری یونین سازی۔ یونینوں کا وجود ادھورا ہی رہتا اگر ایک ڈیو کیٹڈ چور کے دل میں چور یونین بنانے کا خیال نہ پیدا ہوا ہوتا۔ چنانچہ اس نے آل انڈیا چور کنونشن کے نام پر ایک اجلاس طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کا سارے ہندوستان کے چوروں نے گرمجوشانہ خیر مقدم کیا۔ بیرونی ملکوں کے چوروں نے اس کنونشن سے اپنی نیک توقعات وابستہ کیں۔ ملک کے کونے کونے سے کنونشن کو اعلیٰ پیمانے پر منعقد کرنے کے لئے چندے وصول ہونے لگے۔ ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے چور نے حسبِ حیثیت اس کارِ خیر میں دل کھول کر حصہ لیا۔ ویسے ہر ایک کو اس بات کا یقین تھا کہ اُن کے چندے کا غلط استعمال نہ ہوگا۔ (ایک چور دوسرے چور کو کبھی دھوکہ نہیں دے سکتا)

الغرض کنونشن کا دن بھی آپہنچا۔ خفیہ میٹنگ کے لئے ایک بڑے ہال کو سجا دیا گیا۔ جس میں دیش کے نامی گرامی چوروں اور ڈاکوؤں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ جلسہ گاہ میں چاروں طرف بڑے بڑے بورڈوں پر کچھ اس قسم کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔

(۱) چور یونین زندہ باد ــــ! چوروں کی یکجہتی بنی رہے !! ہم سب چور ہیں ــ !!!

جلسہ کی کارروائی کا آغاز اس گیت سے کیا گیا۔ ۔ "شہروں کی گلیوں میں جب اندھیرا ہوتا ہے، ایک آواز آتی ہے۔ چور ــ چور ــ چور ... !" اس کے بعد صدرِ جلسہ نے ہندوستان کے مشہور چوروں کا تعارف کرایا۔ اپنی تقریر میں اُنھوں نے دیش کے کونے کونے سے آئے ہوئے چوروں کو جلسہ میں شرکت کرنے اور اسے کامیاب بنانے پر پُر خلوص مبارکباد دی۔ ان کے اس یکجہتی کے جذبے کو سراہا۔ اپنی تقریر میں اُنھوں نے کہا۔ " آزادی سے قبل ہماری برادری بالکل محدود تھی۔ آزادی کے ساتھ ساتھ، جوں جوں گرانی بڑھتی گئی ویسے ہماری برادری میں بے پناہ اضافہ ہونے لگا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ جمہوریت پر صرف ہماری برادری ہی عمل کر رہی

ہے۔ دیکھئے نا۔ آج اس کنونشن میں ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ شریک ہیں۔ ان میں گورے بھی ہیں اور کالے بھی۔ ہندو بھی ہیں، مسلم بھی سکھ بھی ہیں، عیسائی بھی۔ لیکن آپس میں سب بھائی بھائی ہیں۔ نہ مذہب کا بھید بھاؤ ہے، نہ صوبے کی لڑائی اور نہ ہی زبان کا جھگڑا۔ ہم سارے ہندوستان کے لئے ہیں اور سارا ہندوستان ہمارے لئے ہے۔ (تالیاں) ہم میں معمولی چپل چور، پاکٹ مار، بنک توڑ موجود ہیں۔ لیکن سب شانے سے شانہ ملائے بیٹھے ہیں۔ آج جبکہ ہر طرف آزادی کا دور دورہ ہے ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر روز کوئی نہ کوئی انجمن وجود میں آتی ہے، کوئی نہ کوئی جلسہ ہوتا ہے۔ جلوس نکلتا ہے۔ ہزاروں یونینیں وجود میں آگئی ہیں پھر ہم کیوں کسی سے پیچھے رہیں۔ ہماری تعداد کروڑوں میں نہ سہی لاکھوں میں تو ہے۔ لہٰذا ہم نے اپنی برادری کی بھلائی کی خاطر "آل انڈیا چور یونین" کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔ اس سلسلے کا یہ پہلا جلسہ ہے۔ جلوس نکالنا ہمارے مفاد کے خلاف ہے، آج کے اس جلسہ میں چند قراردادیں پیش کی جارہی ہیں، انھیں بہ اتفاق آرا منظور فرمائیے تاکہ حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جاسکے۔

قراردادیں : ۔۔۔ (۱) حکومت نے غریبی ہٹانے کا تہیہ کیا تھا لیکن وہ غریبی ہٹانے میں قطعی ناکام رہی ہے۔ غریبی ہٹانے کی ذمہ داری ہمیں سونپ دی جائے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ امیروں کے پاس جمع شدہ دولت کو چوری، نقب، ڈاکہ، لوٹ کھسوٹ جیسے مشہور و معروف پلانوں کے تحت حاصل کر کے غریبی دور کریں گے۔ بشرطیکہ حکومت ہمیں اس سلسلے میں موجودہ مراعات سے زیادہ مراعات دینا قبول کرے۔

(۲) ہم دیکھتے ہیں کہ ہر سال حکومت فلمی ایکٹروں اور صنعت کاروں وغیرہ کو مختلف خطابات سے نوازتی اور انہیں نقد انعام بھی دیتی ہے لیکن ہماری برادری کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ہم آج مطالبہ کرتے ہیں کہ ہماری چور برادری میں جو شخص سال کا بہترین کارنامہ انجام دے اُسے بھی خطاب اور انعام ملنا چاہیئے تاکہ ہمارے پیشہ کی حوصلہ افزائی ہو سکے اور ساتھ ساتھ سماجواد قائم ہو سکے۔

(۳) ہماری یونین سے تعلق رکھنے والے ہوشیار اور ذہین شخص کو چوری کی اعلیٰ تعلیم کیلئے سرکار اپنے خرچ پر فارن بھیجے تاکہ ہم وہاں کی نئی تعلیم اور ٹریننگ سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

(۴) ہماری یونین کو بھی بنک سے قرض ملنا چاہیئے۔ تاکہ ہم نئی نئی تجوریاں اور قفل جو دریافت ہوئے ہیں ریسرچ کر کے اُن کا توڑ دریافت کر سکیں۔ اور سائنسی دور کا مقابلہ سائنسی ہتھیاروں سے کر سکیں۔ اس کے لئے ہمیں نئے ہتھیار، نئے آلے ایجاد کرنے ہوں گے جس کے لئے ہمیں رقم کی ضرورت ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ حکومت ہمارے جائز مطالبات پر ہمدردی سے غور کرے گی۔

(۵) ہماری یونین پر پولیس ظلم بند ہو جانا چاہیئے اور قاعدے قانون میں نرمی پیدا کی جانی چاہیئے۔

(۶) چوری کی تعلیم کے لئے سرکاری اسکول اور کالج کھولے جائیں جہاں پر چوری کے مختلف گُر، تھیوری اور پریکٹیکل کے ذریعے سمجھائے جائیں۔ ہمارے پیشے کو مختلف پروپگنڈے کے ذریعہ جو بدنام کیا جارہا ہے اُسے فوری روکا جائے۔

(۷) ایوانوں میں بھی ہمارے نمائندوں کا داخلہ ازحد ضروری ہے تاکہ وہ ہماری برادری کی صحیح رہنمائی کر سکیں اور ہمارے خلاف بننے والے ہر قانون پر کڑی نظر رکھ سکیں۔

(۸) معذور چوروں کے لئے وظیفے جاری کئے جائیں۔

(۹) بہت سے مقامات پر اس قسم کی تختیاں لگی ہوئی پائی جاتی ہیں جیسے ۔ "چوروں سے ہوشیار رہیں ۔ !" انہیں فوراً ہٹا دیا جائے یا پھر لفظ چور کا صحیح ڈیفنیشن ڈکشنری میں لکھا جائے کہ چور آخر کہتے کس کو ہیں !

ابھی جلسہ جاری ہی تھا کہ کسی نے جلسہ گاہ سے نعرہ لگایا ۔ "پولیس ۔ ! پولیس !!" اس آواز کو سنتے ہی حسب عادت سارے مہمان چور بھاگ کھڑے ہوئے۔

--

سرور ڈنڈا

سمنٹ کی سڑک پو ریلاں کا اے دوست چلانا مشکل ہے
ہور جب سے ملی ہے آزادی عزت کا نبھانا مشکل ہے

دھرتی پو رہنا مشکل ہے ہور اس میں سمانا مشکل ہے
دنیا میں رہ کو دنیا سے اب انگ چرانا مشکل ہے

ایمان کے باتاں ڈل ڈل کے بہروں کو سنانا مشکل ہے
ان پنڈت ہور ملاؤں کو انسان بنانا مشکل ہے

پولیس کے ہندسے قانوناں شرفا پو قیامت ڈھاتے ہیں
موٹر تو مزے سے چلتی ہے سیکل کا چلانا مشکل ہے

کیا لاڈ سے ہنس ہنس کو مجھ سے اک بار انوں بی بولے تھے
دنیا کو تو ہم بھول جائیں گے پن تیرا بھلانا مشکل ہے

* * *

وہ مج پو میں ان پو مرے مرکا نئیں ہے
محبت کا رمنا چھرے سرکا نئیں ہے

زمانے کی صحبت میں دلبر تو بن گئیں
عمر بھر مرا دم بھرے سرکا نئیں ہے

وزیر وفا (ع) تو بنتیں بانکے رستم
وقت پو دو دھولاں دھرے سرکا نئیں ہے

انوں آنا آبھیناں کے بانہوں میں آکو
مرے سات جینا مرنا کرے سرکا نئیں ہے

* * * * *

ظفر کمالی
(پٹنہ سٹی)

جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

وہی لیڈر کی عیاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
وہی جنتا کی دشواری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

انھیں فرصت نہیں ملتی کبھی مرغِ مسلّم سے
مری قسمت میں ترکاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

ترقی کر گیا ہے کنٹری لیکن غریبوں کی
وہی آہ و بکا زاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

نہیں کچھ زور اتی کا نہ میں کچھ بول سکتا ہوں
فقط بیگم کی سرداری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

میں جب سے بیاہ کر لایا انھیں گھر میں رہی کھٹ پٹ
سدا لڑنے کی تیاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

وہ کہتی ہیں سدا مجھ سے "چلی جاؤں گی میں میکے"
غضب کی ہے اداکاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

کہا اک مسخرے نے مجھ سے کل، چینی نہیں ملتی
وہی شوگر کی بیماری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

جو ہیں قاتل وہ آزادی سے سڑکوں پر ٹہلتے ہیں
شریفوں کی گرفتاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

وہی دھینگا وہی مشتی ہے میدانِ سیاست میں
وہی مارا وہی ماری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

کریں کیسے اطاعت باپ ماں کی آج کل لڑکے
وہی تعلیم سرکاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

بہت اُلفت ہے بیگم کو ظفرؔ تنخواہ سے میری
مری صورت سے بیزاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

○

چکر نظام آبادی

کھپریل چھلنے خالو چڑھے تھے مکان پر
پھسلا جو پاؤں دھم سے گرے خالہ جان پر

خرگوش کے شکار کو جانا جو دوستو
بندوق لے کے بیٹھنا اونچی مچان پر

تعریف میں نے کی جو ذرا اُن کے حسن کی
ان کا دماغ چڑھ گیا پچھلی کمان پر

گھر، کھیت، زیورات لگاتے رہے شکے
اُسنے دیا نہ حرف مگر آن بان پر

کٹتی ہے رات دیکھئے چکرؔ کی کس جگہ
دن تو کٹتا ہے اس کا شکر کی دکان پر

گھامڑ محبوب نگری

چاک کر کے پیرہن آدھا اِدھر آدھا اُدھر
ڈھلتے ہو کیوں بدن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

کر دیا اس ینگ جنریشن نے ہپی ازم میں
اعتبارِ مرد و زن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

ایک قومی نظریہ پر کر دیا انگریز نے
جذبۂ حبِّ وطن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

لے رہی ہے پھر نئی مسجد کمیٹی جائزہ
ہوگا پھر چندہ غبن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

آتے ہی دیجیٹرین بیوی نے بٹوارہ کیا
بٹ گیا میرا کچن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

بانٹ لی دانشوروں نے مل کے دھرتی اُدھم
بانٹ لیں گھامڑ گگن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

احمد حسین حیات (ہنمکنڈہ۔ ورنگل)

ضرورت ہے

۱۔ ضرورت ہے ہمارے لڑکے کیلئے ایک لڑکی کی۔ جہیز کی کوئی "خاص" پکڑ نہیں۔ لڑکی توتے کے پیچھے کا چاند یا بہری یا گونگی ہو تو کوئی بات نہیں۔ ہمارا لڑکا بھی کم نہیں ہے۔ سب کو "ایک نگاہ" سے دیکھتا ہے اور چلتے وقت صرف اُچھلتے ٹھلکتے چلتا ہے۔ اسی ہفتہ کے اندر اندر ربط پیدا کیجئے۔

بخشش اللہ خاں
لنگڑوں کی بستی

۲۔ ضرورت ہے جہیزوں میں آئی ہوئی پرانی سیکلوں کی جنھیں آپ درست کراتے کراتے نااُمید ہوگئے ہوں یا ایسی کھٹارا کاریں، موٹریں یا لوہے کی سلاخیں جسے آپ اپنی "ہوشیاری" سے تعمیری عمارتوں کے سامنے سے ہی کیوں نہ اُٹھالائے ہوں۔ ہم اُنہیں مناسب قیمتوں پر لیں گے۔

ہوشیار پاشا
اولڈ اینڈ گولڈ کمپنی
نزد چور مارکیٹ

۳۔ ضرورت ہے ایک سب ایڈیٹر کی ماہنامہ "گپ شپ" میں۔ درخواست گذار میں مندرجہ ذیل خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔

(۱) درخواست گذار کسی ماہنامہ میں بطور ایڈیٹر یا سب ایڈیٹر رہ چکا ہو۔ (یہ نہ پوچھا جائے گا کہ ماہنامہ کیوں بند ہوا)

(۲) درخواست گذار کا مختلف رسائل کے "سوال جواب" کے کالموں میں یا اخباروں کے ایڈیٹر کی ڈاک میں کم از کم سو مرتبہ نام چھپا ہو۔

(ب) کسی مشہور افسانہ نگار کا پُرانا افسانہ اپنے نام سے چھپا یا ہو اور کتابوں کے چور ایڈیشن اور مشہور مصنف کے نام سے جعلی ناول نکالنے کے "گر" جانتا ہو۔

نوٹ:۔ شرط نمبر ۲ (ب) کو صیغۂ راز میں رکھا جائے گا۔

ایڈیٹر "گپ شپ"
جرنلسٹ کالونی۔ آزاد نگر

۴۔ ضرورت ہے ایک پیش امام کی۔ محلّے میں چندہ وصول کرنے والے کو ترجیح دی جائے گی۔

صدر کمیٹی
مسجد جہت دیور

۵۔ ضرورت ہے ایک باورچی کی جو تیس سال سے ڈھلی ہوئی عمر کا ہو۔ براہ کرم وہ اشخاص جو ہوٹل کے باورچی رہ چکے ہوں

ربط پیدا نہ کریں

۶۔ ضرورت ہے ایک لیڈر کے لئے چمچے کی۔ مندرجہ ذیل قابلیت ضروری ہے ورنہ درخواست بغیر کسی اطلاع کے مسترد کردی جائے گی۔

۱. اُمیدوار وقت پر گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کی قابلیت رکھتا ہو۔

۲. تعلیمی قابلیت، تیسری یا چوتھی جماعت پاس۔

۳. پارٹی کے پوزیشن میں بہتر کرانے کیلئے ہندو مسلم فسادات کراسکتا ہو۔

۴. نئے نئے نعروں سے عوام کو مرعوب کرنے کی قابلیت رکھتا ہو۔

۵. وعدے کرنے کی صلاحیت ہو لیکن وعدوں کو نبھانے کے معنی اپنی ڈکشنری میں نہ رکھتا ہو۔

۷۔ ضرورت ہے ہماری لڑکی کو چوتھی جماعت کا ٹیوشن پڑھانے والے کی۔ ماسٹر صاحب میں ذیل کی خوبیاں ہوں۔

۱. ماسٹر صاحب کم از کم نویں جماعت پاس یا دسویں جماعت فیل ہوں۔

۲. وہی اس سلسلہ میں ربط پیدا کریں جو ہمارے گھر کا کبھی کبھار سودا سلف لاسکیں۔

۸۔ ضرورت ہے، ایک خستہ حال نواب کی جو محترمہ واجدہ تبسم کے ناولوں اور افسانوں کو بخوبی سمجھا سکتا ہو۔

۹۔ ضرورت ہے، ایک ایسے شخص کی جس کے پاس اس ماہ کے WANTED (ضرورت ہے) کے اشتہارات اُردو، انگریزی اور تلگو میں موجود ہوں۔ مناسب معاوضہ دیا جائے گا۔ فوری ربط پیدا کریں۔

حیران الدین
۳۲۔ انتظار کالونی۔ بیکار نگر

۱۰۔ ضرورت ہے، ایک دلال کی۔ جس شخص میں مکاری دغابازی، خودغرضی، فریب دہی کی خصوصیات ہوں یا لیڈرانہ ذہن کا حامل ہو۔ اپنے پورے پتہ کے ساتھ ہمیں لکھئے۔ ہم اس سال کے بجٹ پر غور کرکے آپ کو انٹرویو کے لئے مطلع کریں گے۔

پاکس صفر
ٹھنگی منڈی۔ چاول پور

مستقبل اُن کا ہے

- جدید ہندوستان کے معمار جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ "آج کے بچوں کے ذریعہ ہم کل ہندوستان کی تعمیر کریں گے۔ اس زرین خیال سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے آندھرا پردیش کی جانب سے ریاست میں رہنے والے بچوں کے حالات کو بہتر بنانے کی زبردست کوشش کی جارہی ہے۔
- آندھرا پردیش پہلی ریاست ہے جہاں ۱۹۷۶ء میں بالا اکیڈیمی قائم کی گئی جس کا مقصد بچوں میں چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا ہے جس کے لئے ریاستی سطح کی سالانہ مقابلہ منعقد کئے جاتے ہیں۔
- ریاست میں ۶۶ بال واڑیاں ہیں اور ۲۸ بالا وہار ہیں جو بچوں میں کھیل کود کی ضرورتوں کی تکمیل کرتی ہیں۔
- یتیم، محتاج اور پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والے بچوں کی نگہداشت کے لئے ۵۵ چلڈرنس ہوم ہیں۔
- ۵ گھر ایسے ہیں جن میں صرف جذامیوں کے بچوں کو ہی رکھا جاتا ہے۔ ریاست میں کھیت مزدوروں کے ۵ سال کی عمر تک کے بچوں کے لئے ۱۳۵ دایہ خانہ ہیں جن میں ۲۳ دایہ خانہ صرف قبائلیوں کے بچوں کیلئے ہیں۔
- ریاست میں بچوں کو متعدی امراض سے محفوظ کرنے اور ان کی صحت کی جانچ کرنے و نیز اصلاحی پہلو پر نظر رکھنے اور

باقی ص۳۳ پر

وحید قادری

ہم بھی بیمار ہوئے

خدا کا کرنا یوں ہوا کہ ایک دن ہماری اچھی خاصی صحت کو گھن لگ گیا۔ ہم اداس رہنے لگے۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ مگر طبیعت "پینے کھانے" پر مائل رہی۔ گھر سے باہر نکلنے کے خیال سے ہی وحشت ہونے لگی۔ گویا ہم گھر پر قید ہو گئے۔

ہماری غیر حاضری سے ساری انجمنیں ویران ہو گئیں۔ دوست احباب نہایت ہی پریشانی کے عالم میں گھر پر وارد ہوئے۔ جب اس کی اطلاع ہمیں ملی تو دل خوف سے گھنٹے بجانے لگا۔ ہاتھ پیر لرزنے لگے۔ چہرے پر پسینہ آگیا۔ ہم بحالتِ مجبوری ان کے روبرو پیش ہوئے۔ انہوں نے حالت دیکھی تو سب کے حواس باختہ ہو گئے۔ ان کے چہرے اتنے مرجھا گئے جیسے صدیوں سے بیمار رہے ہوں۔ کچھ دیر بعد ایک صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے۔ "میاں مرنے کے قریب ہو گئے اور ہمیں اطلاع بھی نہ دی۔"

دوسرے صاحب نے پوچھا۔ "علاج کس کا چل رہا ہے؟"

ہم نے دھیمے لہجے میں ڈاکٹر کا نام بتا دیا۔ اس پر وہ برہم ہوئے اور کہنے لگے۔

"اس کو ڈاکٹر کہتے ہیں میاں۔۔! اس کے پاس شفا نہیں ہے۔ فلاں ڈاکٹر سے رجوع ہو کر علاج کرائیے۔"

ایک دوست کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ انہوں نے کہا۔ "یہ ڈاکٹر بہت ہی اچھا علاج کرتے ہیں۔ ان کی دوا سے ہزاروں صحت یاب ہوتے ہیں۔" مجھ سے کہا۔ "تم نے نہایت موزوں ڈاکٹر کا انتخاب کیا ہے۔ ان ہی سے علاج کرائیے۔"

یہ سن کر وہ صاحب پھر بگڑے اور اتنا بگڑے کہ دیوان خانہ جنگ کا نمونہ پیش کرنے لگا۔ جو احباب ٹھہر گئے تھے وہاں جان بن گئے۔ کوئی کہتا کہ جادو کا اثر ہے۔ فلاں عامل کے پاس لے جائیں۔ کوئی کسی اور کے پاس۔ کوئی ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتے تھے تو کوئی حکیم کے پاس۔ ان باتوں کی وجہ سے ہم موت کی دعا مانگ رہے تھے۔ ہم گھر سے باہر کہیں جانا نہیں چاہتے تھے اور یہ لوگ گھر کے باہر رکھنا چاہتے تھے۔ ہنگامے کے اثرات ذہن میں محفوظ تھے۔ اس لئے کسی کو کچھ نہ کہہ سکے۔ ورنہ دوسرا ہنگامہ ہو جاتا۔ لیکن ایک صاحب بضد رہے کہ عامل کے پاس لے جائیں گے۔ آخر کار لے کر ہی گئے۔ وہ عامل انسان تھا کہ کوئی عجیب الخلقت جانور۔ جس کے لانبے لانبے بال، موٹی موٹی مونچھیں، سرخ آنکھیں، وحشیانہ لباس، عجیب ماحول، عجیب سی بو جس سے دماغ بوجھل ہو جائے۔ بہت دیر کے بعد ہماری باری آئی۔ ہم کو گھور کر دیکھا۔ کوئی شے آگ میں ڈالی۔ اچانک شعلہ لپکا۔ عجیب سی بو پھیلی، وہ کچھ پڑھتا رہا پھر بیمار کی طرف دیکھ کر کہا کہ تمہارے ہمزاد عاشق ہو گیا ہے۔ اسی نے تم کو گھر پر قید کر رکھا ہے۔ اگر اس سے نجات حاصل نہ کی تو یہ تمہاری

جان لے لے گا۔ یہ سُن کر ہم پریشان ہو گئے۔ نیند اُڑ گئی۔ غذا کی مقدار بہت کم ہو گئی۔ چند روز اسی کسمپرسی میں رہے کہ علاج کرائیں یا نہ کرائیں ہماری حالت بیٹھتی جا رہی تھی۔

ایک دوست ہماری حالت پر ترس کھا کر ایک نجومی کو لے آئے۔ نجومی نے ہمارے گھر کو منحوس قرار دے کر ہمارے ستاروں کو گردش میں لا دیا۔ ستارے اچانک گردش سے گھبرا کر غلط برجوں میں گھس گئے جس سے ہم کو مزید نقصان ہوا۔

نجومی نے ہماری صحتیابی کی تاریخ آج سے دس سال بعد کی بتائی جو ہماری سمجھ سے قاصر ہے۔ یہ تاریخ ہماری موت کی بھی ہو سکتی ہے ہم حیران تھے کہ نجومی نے ہمارے عاشق جن کا نام نہیں لیا۔ جن کے تصور سے ہم پر غشی طاری ہو گئی۔ نہ جانے کتنے گھنٹوں بعد ہوش آیا ——— الغرض اب ہم باہوش وحواس رونے کی آوازیں سُن رہے تھے۔ جو ہر لمحہ اُونچی ہو رہی تھیں۔ ہم سے برداشت نہ ہو سکا پلکوں کو ذرا سا ہٹا کر ماحول کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ہم مر گئے ہیں۔ ہمارے سرہانے اگربتیاں جل رہی تھیں۔ ہمیں گھیر کر بعض لوگ رو رہے تھے۔ بعض تلاوت کر رہے تھے۔ ہم کسمپرسی کے عالم میں بے سُدھ پڑے رہے۔ سوگواروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اکثر لوگ ہماری تعریف کر رہے تھے۔ ہم کو جنتی کہہ رہے تھے۔ جو خوبیاں ہم میں نہیں تھیں وہ ہمارے نام سے منسوب کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اچھا ہی ہوا موت آ گئی۔ ورنہ درد و کرب کی زندگی گذارنا مشکل تھا۔ اتنے میں کسی نے غسّال کی آمد کی اطلاع دی۔ اب ہم سے رہا نہ گیا۔ فوراً اُٹھ بیٹھے۔

ہمارے اس اچانک عمل سے لوگ ڈر گئے اور خوف سے چیخ و پکار کرتے بھاگ نکلے۔ دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔ ہم نے دروازے پر دستک دی اور کہنے لگے کہ ہم کو کچھ نہیں ہوا صرف بیہوش ہو گئے تھے۔ لیکن کوئی ہماری بات پر یقین کرنے والا نہ تھا۔ ہم مجبوراً بے بسی میں اپنا سر پیٹنے لگے۔ یہ منظر شاید کسی نے دیکھ لیا اور کہہ اُٹھا کہ مُردہ پر جن وارد ہو گیا ہے .....

کچھ دیر بعد ایک عامل صاحب آئے بہت سے منتر پڑھے گئے۔ ہم پر کئی رنگ ڈالے گئے۔ ہمارے جسم کے ہر حصے پر لیمو کاٹے گئے۔ ہم کو اُٹھک بیٹھک کرائی گئی۔ ان فضولیات سے تنگ آ کر ہم نے ہتھیار ڈال دئیے۔ عامل جو چاہتا وہی کہتے اور کرتے رہے ورنہ بید کی بارش سے ہماری ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ بہت دیر بعد عامل صاحب نے ہم کو چھوڑا۔ لیکن جانے سے پہلے گلے میں اتنے تعویز ڈالے کہ ہمارا سینہ اُبھر گیا۔ ہر وہ جگہ جو کپڑوں سے ڈھانکی ہوئی تھی تعویز باندھے گئے۔ دھواں دیا گیا۔ وحشت کے جتنے طریقے تھے ہم پر آزمائے گئے۔ ہم آزمائش میں پورے اُترے، ہمارا جن بھاگ گیا۔ گویا عاشق و معشوق جدا ہو گئے۔ عامل صاحب کافی رقم لیکر واپس ہو گئے۔

ان فضولیات سے ہماری معاشی حالت پر گہرا اثر ہوا۔ ہم ہنگاموں سے تنگ آ چکے تھے۔ جلد سے جلد صحت یاب ہونا چاہتے تھے۔ ایک حکیم کی یاد آئی جو پیچیدہ امراض کے ماہر مانے جاتے ہیں۔ خیال آیا کہ ان سے علاج کرائیں۔ دوسرے دن حکیم صاحب کے پاس جانے کے لئے لباس تبدیل کر رہے تھے تو دیکھا کہ گھر کے سارے افراد ہماری ہر حرکت کا بغور معائنہ کر رہے ہیں۔ اس سے دل تکلیف ہوئی لیکن اُف بھی نہ کی۔ دل میں بُرا بھلا کہتے ہوئے تیار ہوئے اور گھر سے نکل گئے۔ کافی دور جانے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک عزیز ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ ہم نے پرواہ نہ کی۔ آگے بڑھتے رہے۔ پھر ہم حکیم صاحب کے سامنے تھے۔ حکیم صاحب دلچسپی سے معائنہ کرتے رہے۔ جب معائنہ ختم ہوا تو لمبی سانس لی اور فضا میں گھورنے لگے۔ جیسے فضاء میں ہمارے مرض کی دوا لکھی ہوئی ہو۔ جب اس حرکت سے اُکتا گئے تو ہم

کو گھورنے لگے۔ کافی دیر بعد ایک عجیب سا نام ہمارے مرض کو دیا۔ پھر کئی اقسام کے معجون، گولیاں و سفوف ہمارے حوالے کئے اور پابندی سے کھانے کو کہا۔

ہم سارا بوجھ اُٹھائے گھر پہونچے۔ گھر والوں کو بتایا کہ ہم مریض ہیں سحر زدہ نہیں۔ مگر گھر والے اس پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد حکیم صاحب کی تجویز کردہ دوا استعمال کی۔ کچھ دیر آرام رہا۔ پھر پیٹ میں گڑ بڑ ہونے لگی

بہرحال" سانس کی طرح سے ہم آتے رہے جاتے رہے۔" ایک وقت وہ آیا کہ چلنے پھرنے کی طاقت بھی نہ رہی۔ یہ عالم دیکھ کر گھر والے پریشان ہو گئے اور حکیم صاحب کو لیکر آئے جنھوں نے دوسری دوائیں دیں۔ دو چار دن بعد ذرا سنبھلے تو معلوم ہوا کہ دراصل ایک ہفتہ کا معجون ہم نے ایک ہی وقت میں کھا لیا تھا۔

اور اب گھر والے دوائیں وقت پر کھلاتے ہیں۔ وقت پر دھواں دیتے ہیں۔ کاغذ جلائے جاتے ہیں۔ صدقہ اُتارا جاتا ہے۔ ہمیں بھی ان مشاغل سے عشق ہو گیا ہے۔ اس لئے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم کو صحت عطا نہ کرے ورنہ ہم مرجائیں گے۔ --

---

غزل

قمر زاہدی (پٹنہ)

دیش کی جس سے شان ہے پیارے
تو وہ ہستی جوان ہے پیارے

عشق کا امتحان ہے پیارے
تیرا فادر پٹھان ہے پیارے

بنگلہ، موٹر، ضیافتیں دن رات
جنتا سیوک کی شان ہے پیارے

ہے کہیں اور بھی مرا رومانس
دشمنوں کا بیان ہے پیارے

عشق اور منتری کی بیٹی سے
اتنی اونچی اُڑان ہے پیارے

روشن پٹیالوی

ستم دیکھو سرِ محفل یہ پوچھا ہم سے اس بس نے
بُری نظروں سے محفل میں مجھے دیکھا کس کس نے

ہوئی سیرِ چمن بھی اک وبالِ جاں حسینوں کو
دوپٹہ خار نے کھینچا، لڑائی آنکھ نرگس نے

سراسر موئے مژگان تیلیاں تھیں نامسعود کی
نگاہوں سے رگڑ کھا کر لگا دی آگ ماچس نے

جب جن نے کہا میرے آقا

شکیل رضا منظوری

ملک کے بیشتر نوجوانوں کی طرح انجم بھی نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ مگر لاکھ سعی و جہد کے بعد بھی اسے کوئی کام نہ مل سکا تھا۔ وہ زندگی سے اُکتائے ہوئے مایوس مسافر کی طرح صحرا میں اُڑتے ہوئے بگولے کے مانند بس اسٹاپ کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً کوئی شئے اس کے پاؤں سے ٹکرائی۔ اُس نے جب نظر جھکائی تو زمین پر ایک نقرئی انگوٹھی دکھائی دی، وہ جھکا اور انگوٹھی اُٹھا کر آگے بڑھنے لگا۔

بس کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ اس لئے وقت گذارنے کے ارادے سے اُس نے انگوٹھی کا جائزہ لیا۔ انگوٹھی کو گرد و غبار میں اَٹی دیکھ کر وہ اپنے رومال سے انگوٹھی صاف کرنے لگا۔ اچانک اُس انگوٹھی سے سفید دھواں نکلنے لگا۔ وہ چونک پڑا اور اس کی حیران و پریشان نگاہیں پتھرا کر رہ گئیں۔ دھواں بتدریج ایک ہیولے میں تبدیل ہوتا گیا اور پھر چند لمحے بعد اُس نے اپنے سامنے ایک کمزور اور مریل جن کو کھڑے ہوئے پایا۔ جس کی ہڈیاں سوکھی شاخوں کی طرح جھانک رہی تھیں۔ اور آنکھوں کی جگہ دو گہری گڑھے دکھائی دے رہے تھے۔

"کیا حکم ہے ...... میرے آقا ؟ ..... اس ناچیز غلام کو ..... آپ نے کس لئے یاد فرمایا ..... ؟" جن نے محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں کام کی تلاش میں ہوں ... تم مجھے کوئی کام دلا دو" انجم نے سارا ماجرا سمجھتے ہوئے پُر مسرت لہجے میں کہا۔

"کیا بتاؤں میرے آقا ... آپ کی طرح میں بھی صدیوں سے کام کی تلاش میں ہوں! جب آپ نے مجھے یاد فرمایا تو میں بہت خوش ہو گیا تھا کہ چلو آج مجھے کام مل گیا! مگر مجھے بیحد افسوس ہے ... میرے آقا میں آپ کو کوئی کام نہیں دلا سکتا!"

"ایسا نہ کہو جن بھائی! تم تو بہت طاقتور ہو، تم میری مدد ضرور کر سکتے ہو!" انجم نے انکساری سے کام لیا ——— "وہ زمانہ تو لد گیا ..... میرے آقا ... جب ہم بہت طاقتور تھے۔ اور منٹوں میں اِدھر کی چیز اُدھر کر دیا کرتے تھے۔ یہ زمانہ اور ہے۔ اور ہماری ساری طاقت سیاستدانوں کے پاس چلی گئی ہے۔ جائیے! آپ بھی کسی لیڈر یا وزیر کا دروازہ کھٹکھٹائیے۔ انگوٹھی کو رگڑنے کی بجائے کسی وزیر کے در پہ ناک رگڑئیے۔ اور ہاں۔ میرے لئے بھی سفارش فرمائیے۔ میں بھی آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

——

ڈاکٹر شمیم افزا قمر
(گورکھپور)

دیوانِ غالب

(ایک کمرے کا منظر۔ تخت بچھا ہوا ہے۔ من موہن پرساد بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے۔ سامنے دوات اور قلم رکھا ہوا ہے۔ ایک طرف حقہ لگا ہے۔ دیوان غالب اور چند دوسری کتابیں تخت پر رکھی ہوئی ہیں۔ دیوار پر مرزا غالب کی تصویر لٹک رہی ہے۔ منموہن پرساد آہستہ آہستہ گنگناتا ہے)

منموہن پرساد : ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

(ریتا دوسرے دروازے سے اندر آتی ہے)

ریتا : اے من موہن پرساد جی! کچھ میری بھی سنو گے یا
جیون بھر ایسے ہی بیٹھے قلم گھسیٹتے جاؤ گے۔

من موھن : اے ہے بیگم یہ تم نے کیا کیا! میری ساری کلپنا نشٹ کر دی۔ میرا تصور توڑ ڈالا۔ قسم ہے تمہاری ان ککڑی جیسی انگلیوں کی کہ تمہاری انگلیوں میں قلم نہ تھا، ساری زندگی برباد کر لی۔ ابھی میں اپنے تصور کی آنکھوں سے مرزا غالب کی محبوبہ کو دیکھ رہا تھا.... ہا.... غالب بھی کیا چیز تھا اور اس کی محبوبہ...... ہائے!
(آنکھ بند کر لیتا ہے اور گنگناتا ہے)
ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

ریتا : من موہن جی! تم یہ شاعری وائری چھوڑو گے یا نہیں؟ اگر تم نے میری باتیں نہیں سنیں تو یاد رکھو میں یہ ساری کویتائیں چولہے میں جھونک دوں گی۔

من موھن : سنگیتا رانی! تم ایسے نہ بگڑو۔ میں ڈر سے چوہا بن جاتا ہوں۔ چوہا۔ ہاں۔ تمھیں کچھ سمجھ سمجھتا ہوں بلی کے بچے کو شیر
سنا آپ نے میں ہوں ایسا دلیر

ریتا : اجی! میں نے تم سے کتنی بار کہا کہ میرا نام ریتا ہے، سنگیتا نہیں۔

من موھن : بھاڑ میں ڈالو ریتا کو۔ تم میری بیگم ہو سنگیتا یعنی غالب کی محبوبہ۔ اس لیے میں نے تمہارا نام بدل کر ریتا سے سنگیتا کر دیا ہے۔ سنگیتا کے معنی ہوتا ہے سنگیت یعنی ترنم یعنی نغمہ یعنی غزل یعنی غالب کی محبوبہ۔ ہائے غالب کی محبوبہ کیا چیز ہو گی۔ ابھی میں اسے اپنے تصور کی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکا۔ سنگیتا رانی! تم میری کلپنا بھرشٹ کر دیتی ہو (غصہ سے) ایک میں ہوں کہ تمہیں غالب کی محبوبہ بنانا چاہتا ہوں۔ ایک

تم ہو کہ کسی طرح نہیں بنتیں۔ لیکن میری بنوا آج
کان کھول کر سن لو کہ تم یہ ساڑی اور لہنگے پہننا
چھوڑ دو اور غرارہ جمپر پہننا شروع کر دو۔ تم آج
ہی بازار جا کر غرارہ، جمپر کا بہترین کپڑا خرید لاؤ
اور سب سے اچھے لیڈیز ٹیلر سے اس کا ایک
بہترین سٹ بنوا لو (سینہ پر ہاتھ رکھ کر آگے جھکتا
ہے) جانِ من! میں تمہارے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔

دیپتا: (سر پکڑ کر رونے لگتی ہے) ہائے میں نے کون سا
پاپ کیا تھا جو تمہارے پلے بندھی۔ تم تو میرا دھرم
ہی نشٹ کیے جاتے ہو۔ غالب کی محبوبہ تو مسلمان
ہو گی اور میں برہمن کی بیٹی ٹھہری۔ کبھی تم مجھے کرتا
پاجامہ پہناتے ہو تو کبھی غرارہ جمپر۔ کیا میری سات
پشتوں نے بھی یہ کپڑے پہنے تھے؟

من موہن: اری پاگل۔ غالب کی محبوبہ تو بڑی اونچی چیز
تھی۔ اپنے بھارت درش جیسی اونچی نہاں وہ نہ
ہندو تھی نہ مسلمان۔ نہ عورت تھی، نہ مرد۔۔۔۔

دیپتا: ہائے مر گئی۔ پھر وہ کیا بلا تھی؟

من موہن: (آنکھ بند کر کے)

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

دیپتا: چولہے میں ڈالو اپنے غالب کی محبوبہ کو۔ کچھ پتہ بھی
ہے آج گھر میں چولہا نہیں جلا ہے۔ جب تک
پچھلا حساب صاف نہیں ہو گا، ادھار نہیں ملے گی
راموں نے سودا دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اب پیٹ
پر پتھر باندھ کر شاعری کرتے رہو اور میں غالب کی
محبوبہ کو دعائیں دیتی رہوں گی۔

من موہن: قرض کی پیتے تھے مے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
کوئی بات نہیں سنگیتا! اگر چولہا نہیں جلا ہے تو
ٹھیک ہی ہے اس لیے کہ ہندوستانی بیویوں کو
اس کی بڑی شکایت رہتی ہے کہ ان کا جیون تو
چولہا پھونکتے ہی پھونکتے بیت جاتا ہے۔ تم چولہا
نہ جلاؤ۔ بس غرارہ جمپر پہن کر، مانگ میں افشاں
بھر کر بالوں کو جھومر سے سجا کر میرے سامنے بیٹھی
رہو۔ یں۔۔۔۔ ہاں یونہی۔۔۔۔ اور میں تمہیں
دیکھ دیکھ کر کہتا رہوں گا

جبیں اس کی ہے نیند اس کی ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں تمہیں تصور کی آنکھ سے غالب کی محبوبہ بنا
دیکھ رہا ہوں۔ بس یونہی۔۔۔ ہاں یونہی بیٹھی رہو۔ تیری
زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں۔

سنگیتا: دیکھو من موہن جی! تمہاری شاعری وائری سے
میرا پیٹ بھرنے کا نہیں۔ اگر تم مجھے دو وقت
کھانا نہیں دے سکتے تو مجھے میرے میکے چھوڑ آؤ
اور ہاں یہ تو بتاؤ ذرا کہ ابھی تم سیٹھ دھنا مل
کا حوصلہ دکھا کر میرے غرارہ جمپر کا نیا سٹ
بنوا رہے تھے اور بہترین لیڈیز ٹیلر سے سلوا
رہے تھے، اس کے روپے کہاں سے دو گے؟

من موہن: جانِ من! میں تمہارے لیے سب کچھ کر سکتا
ہوں (جوش میں بولتا ہے) جان دے دوں گا۔
ایمان دے دوں گا، مزدوری کر لوں گا اور
تمہارے لیے غرارہ، جمپر کا نیا سٹ بنوا کر
رہوں گا۔ تمہیں غالب کی محبوبہ بنا دوں گا اور
پھر گنگنا دوں گا ع

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

سنگیتا: اٹھو بھی جلدی۔ من موہن جی۔ کب تک باتیں بناتے
جاؤ گے۔ میں کہتی ہوں جب تمہیں یہ ہی قلم
گھسیٹ کر پیٹ بھرنا ہے تو تم اپنے ایڈیٹر ول

سے روپیہ کیوں نہیں لیتے؟

من موھن: بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔ تمہیں قسم ہے
تمہاری ان طوطے جیسی آنکھوں کی جو پہچاننا نہیں
جانتیں۔ تم مجھے کیا طعنے دوگی۔ میں تو تمہارے عشق ہی
میں نکما ہوگیا ورنہ روپیوں کا ڈھیر لگا دیتا

سنگیتا: اب تم اپنے سہریا میں کوئی دوسرا انتظام کر دوں۔ میں
نے کہہ دیا نا کہ آج تمہیں کھانا نہیں ملے گا۔ جب تک
تم روپیوں کا انتظام نہیں کرتے۔

من موھن: ابھی جاتا ہوں اور منٹوں میں تمہیں روپیہ لا کر دیتا
ہوں۔ تمہیں قسم ہے تمہارے ان بھوسے بھرے
دماغ کی جو کچھ سمجھنا نہیں جانتا۔ تم کیا جانو کہ غالب کے
کلام میں کتنی طاقت ہے۔ لیکن میرے محبوب، تجھے
میری محبت کی قسم! بس ایک بار پھر وہی غالب کی محبوبہ
بن جاؤ اور میں ـــــ بیٹھا رہوں تصور جاناں کیے ہوئے

سنگیتا: تو تم نہیں جاؤ گے؟

من موھن: جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔ لیکن ایک دفعہ وہی
غرارہ اور جمپر پہن کر آجاؤ جو تمہیں پچھلے سال بنوا دیا تھا۔

سنگیتا: (عاجز آکر) پھر اس کے بعد کوئی جھنجھٹ نہیں کروگے؟

من موھن: نہیں کروں گا بس جاؤں گا اور منٹوں میں روپیہ کما کر
لاؤں گا۔

سنگیتا: پھر ٹھیک ہے۔ تم بیٹھو۔ میں ابھی آئی۔ (دروازہ سے
نکل جاتی ہے)

من موھن: آہستہ آہستہ گنگناتا ہے ؎

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

(سنگیتا غرارہ، جمپر پہن کر داخل ہوتی ہے)

من موھن: ارے ہے۔ ٹھیک وہی بالکل وہی۔ میں تمہیں تصور
کی آنکھوں سے غالب کی محبوبہ بنا کر دیکھ رہا ہوں۔
اور غالب کہہ رہے ہیں ؎

جبیں اس کی ہے نیند اس کی ہے راتیں اس کی
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

(باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

سنگیتا: کون ہے؟

آواز: دروازہ کھولو۔ کیا یہاں من موہن پرساد جی رہتے ہیں؟
تشریف لائیے۔ شوق سے آئیے۔

(ایک کانسٹیبل اندر آتا ہے)

کانسٹیبل: کیا وہ شاعری بھی کرتے ہیں؟

من موھن: جی ہاں، جی ہاں۔ کیا آپ کو اپنے میگزین کے لیے
کوئی غزل چاہیئے؟ دیکھئے جناب، میں غالب کی
طرز پر چٹکیوں میں غزل لکھ دیتا ہوں۔ دیکھا سنگیتا
رانی! میں نہ کہتا تھا کہ منٹوں میں روپیہ کما کر ڈھیر لگا
دوں گا۔ اب تم میری قدر پہچانو۔

کانسٹیبل: من موہن پرساد جی! مجھے آپ کی کوئی غزل
ورل نہیں چاہیئے۔ یہ آپ کے نام سمن ہے۔ آپ اسے
لیجئے اور میرے ساتھ عدالت چلئے۔ آپ کے خلاف
شرف الدین بتیا، رام سیٹھ اور دھنپت لال نے
کیس کیا ہے کہ آپ کئی ہزار روپیہ ان سے قرض لے
چکے ہیں اور جب وہ آپ سے روپیہ مانگتے ہیں تو آپ
انہیں غزل تھما دیتے ہیں۔

من موھن: لیکن..... لیکن..... میں تو......

کانسٹیبل: لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آپ سیدھے میرے ساتھ
چلئے ورنہ میں دوسرا راستہ اختیار کروں گا۔

سنگیتا: (روتی ہے) یہ کیا کر رہے ہو سپاہی جی منموہن پرساد
جی تو بالکل پاگل ہیں تم انہیں لے جا کر کیا کروگے؟

کانسٹیبل: تم گھبراؤ نہیں۔ وہاں جا کر ان کا پاگل پن دور
ہو جائے گا۔

(چلا جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

(دوسرا سین)

(جج عدالت میں بیٹھا ہے۔ ایک طرف کٹہرے میں
من موہن پرسا دکھڑے ہیں۔ ایک طرف سرکاری
وکیل اور دوسری طرف من موہن کے وکیل کھڑے
ہیں۔ مقدمہ کی کارروائی شروع ہوتی ہے)

سرکاری وکیل: تمہارا نام کیا ہے۔

من موھن: ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

سرکاری وکیل: می لارڈ! ملزم گستاخی کر رہا ہے اور
صحیح باتوں کا جواب نہ دے کر بات بنانے میں مصروف ہے

من موھن کا وکیل: می لارڈ! ملزم اپنی یادداشت کھو
چکا ہے اور خود کو غالب سمجھتا ہے
وہ اپنا نام دیوان غالب بتاتا ہے ایسے
انسان کے ساتھ عدالتی کارروائی سخت (OBJECT-
IONABLE) ہے۔

جج: آرڈر ...... آرڈر ......

سرکاری وکیل: تمہارا پیشہ کیا ہے؟

من موھن:
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینہ قرض اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا ہو گیا ہے شریک ساہوکار

سرکاری وکیل۔ می لارڈ! ملزم اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے کہ وہ
اپنی زندگی قرض لے کر گزار رہا ہے۔ پھر بھی وہ
گستاخی سے باز نہیں آتا اور ہاں ٹالنے کی کوشش
کرتا ہے۔ آپ اسے حکم دیں کہ صحیح جواب دے۔

ملزم کا وکیل، می لارڈ! یہ غالب کا بھگت ہے اور اس کی
شاعری میں اس طرح گم ہو گیا ہے کہ اسے اپنا کچھ ہوش
نہیں رہتا۔

جج، من موہن جی! غالب آپ کے کون تھے؟

من موھن: پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون تھے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

سرکاری وکیل، می لارڈ! ملزم نہایت بدتمیز ہے۔

من موھن: اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

سرکاری وکیل: می لارڈ! ملزم کو اس کی بدتمیزیوں کی سخت سے سخت
سزا دی جائے۔

من موہن: حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گنہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

من موہن کا وکیل: می لارڈ! آپ دیکھ رہے ہیں کہ ملزم خود کو کس
حد تک غالب کے اشعار میں گم کر چکا ہے۔ وہ کورٹ
کی کارروائی سمجھنے سے قاصر ہے۔ میں عدالت سے
رحم کی درخواست کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ ملزم
کو LUNATIC ACT کے تحت رہا کر دیا جائے۔

من موہن: اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم عدالت میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

جج: آرڈر ..... آرڈر ..... میں نے ملزم سے جتنے سوال
کیے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ملزم حقیقتاً غالب
شاعری کا دیوانہ ہو گیا ہے اس لیے میں مقدمہ خارج
کرتے ہوئے آج کی عدالتی کارروائی ختم کرتا ہوں
(ایک طرف سے جج اور سرکاری وکیل نکل جاتے ہیں
دوسری طرف سے من موہن اور اس کا وکیل نکلتے ہیں)

من موہن: سنگیتا ..... سنگیتا ..... سنگیتا پانی ...
دیکھو! میں نہ کہتا تھا کہ غالب کے کلام میں بہت دم
ہے۔ تم ذرا اپنی طوطے جیسی آنکھوں سے بچا
سیکھو اور میری قدر کرو۔

(پردہ)

محمد اسد اللہ (ورُوڈ)
(امراؤتی)

ودربھ میں مزاح نگاری

انسانی مزاج اور عادات کی بوالعجبیاں انسانی زندگی کی ناہمواریاں، اس کی قول اور سوچ کی کرتب بازیاں اس کے لیے کافی ہیں کہ انسان خوب ہنسے۔ کبھی خود پر کبھی دوسروں پر۔ اور یہ بات واضح ہو جائے کہ انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے جو ہنس سکتی ہے اور جس پر دل کھول کر ہنسا جا سکتا ہے۔ جب اونٹ پر یہ پھبتی کسی گئی کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی" تو وہ بے زبان چپ رہا۔ تب جا کر ہے کہ خدا نے مزاح نگاروں کی قوم پیدا فرمائی تاکہ وہ انسانوں کو مثالیں دے کر سمجھائیں اور پوچھیں کہ بتاؤ تمہاری کون سی کل سیدھی ہے؟ غرض ہماری ہنسی اور طنز کا پہلا اور آخری نشانہ ہم خود ہیں۔ بہترین مزاح نگار کی تعریف بھی یہی ہے کہ وہ خود اپنے آپ پر ہنس سکے مزاح نگاری ایک مشکل اور نازک فن ہونے کے باوجود اسے دوسرے درجے کا ادب سمجھا جاتا ہے۔ ناقدینِ ادب مزاح نگار کی بلا سے اسے جو کہیں درحقیقت مزاح نگار بذاتِ خود انسانی زندگی کا ناقد ہے۔ یہ اپنی خوش طبعی سے کب باز آنے والا ہے۔ بقول شخصے — "ایک مریضِ لادوائے خندہ ہے۔"

یہاں اس مضمون کے ذریعہ ودربھ میں پروان چڑھتی ہوئی مزاح نگاروں کی نئی نسل کا تعارف مقصود ہے۔ اب تک بنارسی ساڑیاں، ناگپوری سنترے اور مرادآبادی برتن ہی کی طرح بہار کے افسانہ نگار اور لاہور و حیدرآباد کے مزاح نگار مشہور تھے مگر اب یہ اجارہ داری قریب الختم ہے۔ مزاح نگاری کی یہ میراث ملک کے مختلف حصوں میں تقسیم ہونے لگی ہے۔ ودربھ میں شاعروں اور افسانہ نویسوں ہی کی طرح مزاح نگاروں کا ایک طبقہ ادبی اُفق پر نمودار ہونے لگا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان مزاح نگاروں میں اکثریت ایسے افراد کی ہے جنھیں اُردو کے واحد مزاحیہ رسالے 'شگوفہ' نے متاثر کیا اور لکھنے پر اُکسایا۔ شگوفہ ہی کے توسط سے یہ لوگ ادبی حلقوں میں پہچانے گئے اور ان کی ادبی تربیت بھی اسی کے ذمہ ہے جسے وہ تا ہنوز بڑی تندہی سے انجام دے رہا ہے۔

ارضِ دکن سے اُٹھنے والے بعض مزاح نگاروں اور ہزل گو شاعروں نے دکنی زبان کو ذریعۂ اظہار بنا کر اُردو ... مزاحیہ ا...

میں بیش بہا اضافے کئے اور اسی تخصیص سے وہ فنکار پہچانے گئے ۔ مرحوم سلیمان خطیب کا نام ان میں سرِ فہرست ہے۔ دکنی ہی کی طرح براری زبان بھی اپنے جلو میں ایک مخصوص تہذیبی سرمایہ رکھتی ہے۔ یہ ممکن تھا کہ براری میں بھی دکنی زبان ہی کی طرح مزاحیہ شعر و ادب کی تخلیق ہوتی جس طرح " براری مراٹھی " میں مزاحیہ ادب پایا جاتا ہے۔ 'مراٹھی ورّاڑی کادیہ' میں مختلف موضوعات پر سنجیدہ طرز اسلوب میں بھی وافر شعری سرمایہ موجود ہے۔ ہماری براری اُردو اس طرزِ نگارش سے ناآشنا ہے۔ اس میں سنجیدہ یا مزاحیہ شعر و ادب تقریباً عنقا ہے۔ وجہ شائد یہ ہے کہ مزاح نگاروں کی نئی نسل جو آج ودربھ میں اُبھر رہی ہے۔ یہ اس سلسلے کا آغاز ہے۔ ابھی محض ادب کی ایک مخصوص صنف طنز و مزاح کے پنپنے کے لئے سازگار ادبی فضا کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ ممکن ہے مستقبل قریب میں براری میں بھی مزاحیہ شعر و ادب کی تخلیق کی طرف بھی توجہ کی جائے ۔

ودربھ کے مزاح نگاروں کی اس نئی نسل نے موضوع، اسلوب اور طرزِ فکر میں اسی روایت کو آگے بڑھایا ہے جو اُردو کے بزرگ مزاح نگاروں نے ہمیں سونپی ہے۔ ودربھ مختلف اعتبار سے UNDER DEVELOPMENT DIVISION کی حیثیت رکھتا ہے یہاں دیہی زندگی کی پگڈنڈیاں شہروں کی جانب رواں ہیں، ایک تہذیب دوسری میں ادغم ہو رہی ہے ۔ اس صورت میں یہاں کا فنکار ایک تفاوت سے دوچار ہوگا ہی ۔ یہی تفاوت بعض صورتوں میں مزاح کی پیداوار کا باعث ہے۔ اسی نسل کے بیشتر لوگ شہروں میں سکونت پذیر ہیں ۔ اور اُردو کے اکثر مزاح نگار شہروں ہی کے واسی رہے ہیں۔ لہٰذا اُردو طنز و مزاح کے بنیادی مزاج کو اپنانے میں انہیں کسی قسم کی جد و جہد نہیں کرنی پڑی ۔ آئیے اسی پس منظر میں ودربھ کے ان نو مزاح نگاروں پر ایک نظر ڈالتے چلیں ۔

اس بات سے قطع نظر کہ ہمارے یہاں انشائیے کی حیثیت اس ہاتھی کی سی تھی جس کے متعلق ۴ اندھے مختلف قیاس آرائیوں میں مبتلا تھے ۔ اردو میں شروع ہی سے لکھنے والوں کا جھکاؤ انشائیے کی طرف رہا ہے۔ ودربھ میں بھی یہی صورتحال ہے۔ البتہ خالص طنز و مزاح بھی نایاب نہیں ۔ اُردو میں اب واضح سمت کے تعین کے بعد بہترین انشائیے لکھے جارہے ہیں ۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا کی کوششیں قابلِ ستائش ہیں ۔

ودربھ میں جو لوگ طنز و مزاح اور انشائیہ کی تخلیق کررہے ہیں۔ ان میں صفدر، شکیل اعجاز، شیخ رحمٰن اکولوی، ایس ایس علی، محمد طارق، رفیق شاکر، انصاری اصغر جمیل، عمر حنیف، محمد اسد اللہ، رحمت اللہ خاں مالوی، شیخ محمد نیاز اکولوی، نادر کامٹوی، آریو خان، اطہر حیات، ایم اے اختر، محمد وحید اللہ ایاز وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ان مزاح نگاروں میں ودربھ کے جدید شاعر صفدر اپنے لہجے کی ندرت، شگفتگی، گہرا مشاہدہ، طنز کے تیکھے پن اور تخلیقی طرزِ اظہار جیسی خصوصیات کی بناء پر نمایاں نظر آتے ہیں ۔ انشائیے کے مناسب رواں دواں شگفتہ زبان ان کے طرزِ تحریر کا خاصہ ہے۔ صفدر کے انشائیوں کا یہ منفرد اسلوب ان کے ان تنقیدی مضامین کی بھی جان ہے جو پچھلے دنوں ملک کے مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوئے ۔ یہ اندازِ تحریر وارث علوی سے قدرے مشابہ ہے۔ البتہ ان کے انشائیوں میں طنز کا عنصر زیادہ ہے۔ میں انھیں " طنزیہ نثراد انشائیے " کہتا ہوں ۔ انشائیہ "پوسٹ مین" کا یہ اقتباس، ملاحظہ فرمائیے :-

" پوسٹ مین سے محبت کے جراثیم کم و بیش سب ہی شاعروں اور ادیبوں میں پائے جاتے ہیں ۔ بلکہ میرا تو یہ نظریہ ہے کہ جس شخص

کا دل پوسٹ مین کی محبت سے خالی ہو وہ شاعر یا ادیب ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے ایک دوست کا ریمارک ہے کہ اگر ہم بجائے شاعر کے شاعرہ ہوتے تو ہماری پہلی اور آخری محبت یقیناً پوسٹ مین سے ہوتی اور ہمارے بچے پوسٹ مین کے بچے کہلاتے۔"

ان ہی مزاح نگاروں میں اکولہ کے مشہور شاعر غنی اعجاز کے فرزند اور مشہور آرٹسٹ شکیل اعجاز کے یہاں ذہین کہانی کہنے کی کوششیں نظر آتی ہیں۔ "ڈھونڈ کہیں کا"۔ "بے دال کا بودم" اور "جنی بھائی" بہترین مزاحیے ہیں۔ شکیل اعجاز کے یہاں اطراف کے ماحول کی فوٹو گرافی کو فن کی حدود میں داخل ہوتا ہوا دیکھا جاسکتا ہے۔ تحریر کی روانی، ظرف بینی اور بہترین قوت مشاہدہ اور حساس طبیعت کی کارفرمائی ان کے مزاحیوں میں نظر آتی ہے :-

"گھر پر صرف ان کے والد ہوتے ہیں جو گھر تک دوسروں کا آنا جانا پسند نہیں کرتے۔ پتہ چلا کہ ایک دن کوئی شخص ان کے گنجے سر پر چپت رسید کرکے گھر سے فرار ہوگیا۔ اسی دن سے انہوں نے باقاعدہ ورزش شروع کی، بندوق خریدی اور لوگوں کا گھر تک آنا جانا ممنوع قرار دیا۔" ——— (ڈھونڈ کہیں کا ——— شکیل اعجاز)

اکولہ ہی کے ایک مزاح نگار شیخ رحمن اکولوی بھی ہیں۔ ان کے انشائیوں میں جس تخلیقی توانائی اور حسِ مزاح کا اظہار ہوا ہے اس سے یہ امید بندھتی ہے کہ شیخ رحمن اکولوی مستقبل میں ایک بہترین مزاح نگار بن کر ابھریں گے۔ ان کے مزاحیہ مضامین میں ابھرنے والے مزاح کا ہدف خود ان کی ذات ہے۔ مگر اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا طنز پلٹ کر اطراف کی اشیاء پر وار کرتا ہے۔ 'سلام' ان کا بہترین انشائیہ ہے۔ منی کہانیوں کے ایک مجموعے 'عکسِ شعور' کے علاوہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'بلاعنوان' منظرِ عام پر آرہا ہے۔

شیخ رحمن ہی کی طرح ایس ایس علی کے یہاں بھی انشائیوں میں گہرے مشاہدے کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ البتہ لفظوں کا چابکدستی سے مزاحیہ ڈھنگ میں استعمال اور طنز کی کاٹ، ایس ایس علی کی انفرادی خصوصیات ہیں۔ ایس ایس علی کے مضامین میں عصری مسائل کا شعور اور سماج اور سیاست پر بھرپور طنز کے نمونے ملتے ہیں۔

اسی قبیل کے ایک اور مزاح نگار محمد طارق کولہاپوری بھی ہیں جو بحیثیت افسانہ نویس زیادہ مشہور ہیں۔ مزاح میں انہوں نے نسبتاً کم لکھا ہے —— ان تینوں فنکاروں سے مزاحیہ ادب کو یقیناً اچھی توقعات وابستہ ہیں۔ البتہ ایک چیز جو یہاں قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ ان کے یہاں مزاح نگاری کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ (شیخ رحمن اکولوی اس سے مستثنیٰ ہیں)۔ اگر اس طرف یہ باقاعدگی سے متوجہ ہوں تو یقیناً مستقبل میں بہترین مزاح نگار ثابت ہوں گے۔ ان کے مضامین کے چند اقتباسات یہ ہیں :-

۱۔ "شاعروں کے تین مختلف گروہ ہیں۔ ایک گروہ وہ جو مشاعروں اور ادبی نشستوں میں اپنا کلام سناتا ہے اور سامعین کی واہ واہ کے سہارے جیتا ہے۔ دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو مشاعروں اور ادبی نشستوں کو "جشنِ خود فریبی" کہتے ہیں اور اسے شہرت حاصل کرنے کا گھٹیا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنا کلام مختلف رسائل کو اشاعت کی غرض سے بھیجتے ہیں۔ تیسرے گروہ میں وہ شعراء شامل ہیں جو اپنا کلام دوسروں کو سناتے ہیں اور نہ اشاعت کی غرض سے رسائل کو بھیجتے ہیں۔ یہ بیچارے اپنا کلام تنہائی میں خود ہی گنگناتے ہیں۔ اور خود ہی داد بھی دے لیتے ہیں۔" ——— ('جہاں میں رہتا ہوں' —— شیخ رحمن اکولوی)

۲۔ "ہم اس ذہنی سکون کے دریا میں بہتے چلے جاتے ہیں کہ بیک گراؤنڈ سے کھٹ کی آواز ابھرتی ہے۔ ہم سوچنے لگتے ہیں کہ یہ آواز

کیسی ہے۔ ذہن کے جھٹکے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ہاتھ خالی پلیٹ سے ٹکراؤ کی آواز پیدا کر رہا ہے اور ساتھ ہی ایک کرخت آواز گونجتی ہے کیا کھانے کے بعد اب پلیٹ بھی کھا جاؤ گے۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے۔" ——— (خیالوں میں' — ایس ایس علی بالاپور)

"اس لئے دو کان ہماری طرح سننے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک کان سے سننے کا کام لیتا ہے اور دوسرے کان سے اس بات کو نکال دیتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر لیڈر اپنے کانوں پر دو چھوٹی چھوٹی تختیاں لٹکانی شروع کر دے۔ ایک پر لکھا ہو ان (IN) تو دوسری پر آؤٹ (OUT)۔" ——— (لیڈر اور جنتا محمد طارق کھولاپوری)

انصاری اصغر جمیل ناگپور کے ایک مزاح نگار ہیں جنھوں نے انشائیوں کے علاوہ مقامی شعراء کو قلمی خاکوں کے شیشے میں اُتارا ہے۔ شاہد کبیر کے خاکے میں لکھتے ہیں۔

"چند مہینے پیشتر شاہد بھائی سے ملاقات ہوئی تو دیکھا کہ وہ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ داڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی اور پریشان سے تھے میں نے پوچھا کہ شاہد بھائی کیا بات ہے آپ نے اپنی حالت مجنوں کی سی کیوں بنا رکھی ہے۔ نہایت نحیف آواز میں فرمایا کہ کیا بتاؤں میرا دیوان شائع ہو رہا ہے۔"

ودربھ میں مزاح نگاروں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر اسلامی فتوحات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس بات کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب کون اچھا بھلا آدمی سنجیدگی کے جامے سے باہر ہو کر مزاح نگاری پر اُتر آئے گا۔ مزاح نگاری بہر صورت ایک مشکل اور نازک فن ہے۔ بہ تجربہ ادب عالیہ نہ سہی لیکن اعلیٰ ادب ان ہی تجربات کا حاصل ہے۔ ودربھ کے ان نوجوان قلمکاروں کے نوک قلم سے بکھرنے والے شگوفے قارئین کے مجموں کو تو زعفران زار بنائے ہوئے ہیں ہی، ان کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان ہی کاوشوں کا تسلسل ادب میں اضافے کا باعث ہوگا۔ درج ذیل اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:—

"ہمدرد صاحب مسکراتے ہوئے بولے، ہمدردی تو میں نے الکشن ہی کی تقریروں میں اتنی جتائی کہ سارا اسٹاک ختم ہو گیا۔ ایک ڈوبنے والے کی تم کیوں فکر کر رہے ہو۔ کیا آئندہ الکشن میں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے۔ اگر ایسا ہی ارادہ ہے تو جاؤ ڈوبنے والوں کو بچاؤ۔ شائد وعدوں کی آواز سن کر وہ نکل آئیں۔ ——— (وعدوں کی حقیقت' ——— عمر حنیف، امراؤتی)

"جب سے آپ گئے ہیں پاندان اُجڑ چکا ہے۔ چائے کی کیتلی بیوہ ہو گئی ہے۔ آپ کے کتب خانے کی آہ و زاریاں پڑوسن بڑی آسانی سے سن سکتی ہے۔ آپ کے نئے جھتو اور مفت خور دوست آپکے ہاتھوں کا تشکار رکھانے کو ترس گئے ہیں (یہ بڑا یاد کرتے ہیں)۔" ——— (بھگوڑے شوہر سے' — رفیق شاکر، کھام گاؤں)

"ایک بار دسمبر کی سردیوں میں ہم نے علی الصبح صدر دروازہ کھولا تو دروازے کے قریب برف کا ایک مجسمہ برآمد ہوا۔ تحقیق کی تو معلوم ہوا کر پڑوسیوں نے آدھی رات تک ایک صاحب کو آوازیں اور دستکیں دیتے سُنا تھا۔ وہ مجسمہ آتشدان کے قریب رکھا تو معلوم ہوا، برف کا یہ زندہ مجسمہ ہمارے جگری دوست مرزا صاحب ہیں۔" ——— (برقی دستکیں' — محمد اسد اللہ، ورود)

ودربھ کے ہزل گو شعراء میں ناظم انصاری، فیاض افسوس اور محبوب راہی قابل ذکر ہیں۔ ان کا تذکرہ ایک علٰحدہ مضمون کا متقاضی ہے۔ ودربھ میں طنزیہ و مزاحیہ ادب میں پائی جانے والی یہ کاوشیں اس سفر کا نقطۂ آغاز ہے جس کے ختم تک یقیناً بہترین منزلیں ملیں گی۔

— —

خواتین کی فلاح و بہبود میں تیز رفتار پیش رفت

ہم معاشی اور تعلیمی سہولتوں سے محروم لاکھوں خواتین کی زندگی اور کام کے حالات کو بہتر بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ خواتین اپنی طاقت اور استطاعت سے روشناس ہوں اور اپنی صلاحیتوں کو خود اپنے اور قوم کے فائدے کیلئے استعمال کریں۔

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے مذکورہ بالا الفاظ خواتین کی فلاح و بہبود سے متعلق مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی حکمت عملی کا انکشاف کرتے ہیں

یہ ایک انتہائی موزوں و مناسب بات ہے کہ ہم شریمتی اندرا گاندھی کے یوم پیدائش پر ریاست کی سلور جوبلی تقاریب کے جزو کے طور پر یوم خواتین منا رہے ہیں۔ آندھرا پردیش ان ریاستوں میں اولیت کی حامل ریاست ہے جہاں خواتین کیلئے ایک علحدہ امداد باہمی مالیاتی کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا ہے اب تک کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والی ۴۲۰۰ خواتین اس کارپوریشن کی امداد سے خود روزگار اسکیمات شروع کرنے کے سلسلہ میں مستفید ہوئی ہیں۔

شریمتی درگا بائی دیشمکھ سے منسوب حیدرآباد میں قائم ادارہ فنی تربیت برائے خواتین، نوجوان خواتین کو مختلف فنی نوعیت کی مہارتوں میں تربیت دے رہا ہے۔ اس قسم کا ایک ادارہ نیلور میں بھی قائم کیا جا رہا ہے۔

ملازم عورتوں کے لئے حیدرآباد، وشاکھاپٹنم اور تروپتی میں ہاسٹل قائم ہیں اور رضاکارانہ اداروں کے زیراہتمام اسی طرح کے ہاسٹلوں کو رقمی امداد فراہم کی جارہی ہے۔

چتور اور حیدرآباد میں دو بیت المعمرین قائم ہیں۔ ریاست میں ۱۸ ہزار سے زیادہ کی تعداد میں مہیلا منڈل ہیں جو اپنے ارکین میں سماجی ذمہ داری کا احساس پیدا کر رہے ہیں۔

بے سہارا خواتین کے لئے ریاست میں اداروں کا ایک وسیع جال پھیلا دیا گیا ہے۔ ان اداروں

باقی صفحہ ۵۲ پر

مناظر عاشق ہرگانوی ۔ بھاگلپور (بہار)

"پیکرانِ بے سخن"

پیروڈی

ڈاکٹر مظفر اقبال، ڈاکٹر ناز قادری، پروفیسر محمد اکرام، پروفیسر عقیل احمد، عبدالعزیز عزیز، اور مناظر عاشق ہرگانوی ایک دعوت میں بیٹھے کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے رحمٰن جامی کی ایک تازہ غزل، مظفر اقبال اور ناز قادری کو دکھلاتے ہوئے کہا کہ اس کی پیروڈی ہو جائے۔ پہلے پانچ اشعار منتخب کئے لیتا ہوں ؎

دل ہے اپنا نہ اب جگر در پیش
ہے تری چشم معتبر در پیش
لوگ بیمار کیوں نہ پڑ جاتے
جبکہ تھا حسنِ چارہ گر در پیش
میں ہوا چاہتا تھا بے قابو
زندگی ہو گئی مگر در پیش
شب کے ماروں سے اتنا کہنا ہے
شب کے پردے میں ہے سحر در پیش
اہلِ نقد و نظر پریشاں ہیں
جب سے جامی کا ہے ہنر در پیش

کھانا آتے آتے تینوں کی مشترکہ کوشش سے ایک غزل تیار ہو گئی۔ ویسے بیشتر اشعار مظفر اقبال نے کہے ہیں ؎

دل ہے اپنا نہ اب جگر در پیش
ہے ترا مرغِ معتبر در پیش
لوگ بیمار کیوں نہ پڑ جاتے
جبکہ کھانا تھا سیر بھر در پیش
میں ہوا چاہتا تھا اُب اُلو
جانے کیوں آگیا ہے خر در پیش
سب کنواروں سے اتنا کہنا ہے
رہگزاروں میں ہے سفر در پیش
اہلِ نقد و نظر پریشاں ہیں!
کوئی مادہ نہ کوئی نر در پیش

٭

تضاد!

ایک بیحد موٹے شاعر بہت ہی باریک آواز میں غزل پڑھ رہے تھے۔ سامعین میں سے کسی نے چلّا کر کہا ؎

منمناتی ہوئی آواز میں پڑھتے ہیں غزل
جسم فربہ ہے مگر دل کو گھلا رکھا ہے

دوسرے کونے سے آواز آئی ؎

شاعری مانگے ہے پورا آدمی
اب اسے بھی مونچھ والا چاہئے

٭

مضامینِ نو!

پروفیسر ابوذر عثمانی، پروفیسر صدیق مجیبی، پروفیسر حسن امام، پروفیسر ظفر سعید، پروفیسر شاداں یزدانی، مناظر

عاشق ہرگانوی اور دوسرے لوگ بیٹھے، پڑھے لکھے جاہلوں کی بات کر رہے تھے۔ صدیق مجیبی نے بتایا کہ — ایک پروفیسر صاحب نے خلیل الرحمن اعظمی کے مجموعۂ مضامین "مضامینِ نو" کو دیکھنے کے بعد کہا

"اس میں تیرہ مضامین ہیں لیکن نام رکھا ہے مضامینِ نو، کیسی ناشِ غلطی ہے۔"

-:-

کلی کا کھلنا

اسی محفل میں صدیق مجیبی نے بتایا۔ "ایک پروفیسر صاحب کلاس میں یہ مصرعہ یوں پڑھاتے تھے۔ ؎

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے

کئی بار شکایتیں ملیں تو ایک مرتبہ میں نے جان بوجھ کر ان سے اس مصرعہ پر گفتگو کی ٹھانی۔ میرے سامنے بھی وہ اس مصرعہ کو اسی طرح پڑھ گئے۔ میں نے بل کھول کر کہا "جی ہاں، کھلنا ڈھاکہ کے قریب ہے۔"

-:-

صاحب سلام میرا

ڈاکٹر مظفر اقبال، ڈاکٹر ناز قادری، ڈاکٹر ابو عبیدہ ابدالی، ڈاکٹر آفتاب عالم، ڈاکٹر عزیز الرحمٰن، پروفیسر عقیل احمد اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ابدالی نے بتایا۔ "ایک بار ڈاکٹر عزیز الرحمٰن صاحب دیوار پھاندتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔"

تبھی لوگ ہنسنے لگے تو مظفر اقبال نے کہا۔ "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ پہلے مقصد کا علم ہونا چاہیئے۔ کہیں اس شعر والی بات نکل آئی تو ؎

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

-:-

جغرافیہ ساز

ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر مظفر اقبال، ڈاکٹر شمیم افزا قمر، ڈاکٹر ناز قادری، مناظر عاشق ہرگانوی اور دوسرے لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شمیم احمد نے بتایا کہ جب مشرقی پاکستان پر قبضہ ہو گیا اور نیا ملک بنگلہ دیش بنا تو بہت سارے لوگ اندرا گاندھی کو مبارکباد دینے پہنچے۔ شمیم احمد شمیم نے بالکل نئے انداز سے مبارکباد دیتے ہوئے کہا "آج تک میں نے تاریخ ساز شخصیتوں کے بارے میں سنا تھا لیکن آج جغرافیہ ساز شخصیت کو دیکھ رہا ہوں جنھوں نے ایک نئے ملک کو جنم دیا ہے۔"

مرسلہ :- ڈاکٹر یے کاف

شگوفہ

• جب ایک حسین اور نوجوان خاتون کا بوڑھا اور دولت مند شوہر چل بسا تو شہر کے ایک صحافی نے نوجوان بیوہ کا انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا ۔ " محترمہ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپکی ازدواجی زندگی کامیاب تھی ؟ "

نوجوان بیوہ نے جواب دیا ۔ " بہت کامیاب ۔"

منچلے صحافی نے ایک اور سوال داغا ۔ " آپ کے معاملاتِ محبت کیسے تھے ۔ ؟ "

نوجوان بیوہ نے کہا ۔ " وہ اس معاملے میں بہت چُست تھے روز صبح جب گرجا کی گھڑی ۹ گھنٹے بجاتی وہ مجھ سے محبت کرتے تھے حقیقت تو یہ ہے کہ انتقال کے دن ٹھیک صبح ۹ بجے اگر فائر انجن نہ گزرا ہوتا تو وہ آج تک بھی زندہ رہتے ۔"

❊ ❊ ❊

• ایک دیوار پر فریم میں لگی ہوئی تجریدی تصویر جس کے نیچے عنوان لکھا تھا " مرحومہ " ۔۔۔ اس تصویر کو مہمان نے بہ غور دیکھ کر اپنے میزبان سے پوچھا " جناب یہ تصویر تو انناس کی معلوم ہوتی ہے ۔ "

مہمان نے میزبان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ " جناب آپ پہلے آدمی ہیں جس نے اس تصویر کے موضوع کو بالکل صحیح پہچانا کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ نے کس طرح اس تصویر کو پہچانا اور عنوان سے آپ گمراہ ہونے سے بچ گئے ؟ "

مہمان نے جواب دیا " ان دونوں سوالوں کا تعلق میری نجی زندگی سے ہے ۔ ایک زمانے میں میری میوے کی دکان ہوا کرتی تھی اور میری بیوی کو مرے ہوئے کئی سال گذر چکے ہیں ۔"

❊ ❊ ❊

• ایک صاحب نئے مقام پر وارد ہوئے اور وہ وہاں زمین خرید کر گھر بسانے کے خواہاں تھے ۔ نووارد نے ایک مقامی دوست سے پوچھا کہ " جناب آپ مجھے بتائیں یہاں کے کیا حالات ہیں ؟ موسم کیسا ہے ؟ زراعت کیسی ہوتی ہے ؟ روزگار کے کیا مواقع ہیں ؟ "

نووارد کو اس صحت افزا مقام کی خوشحالی کی تفصیلات بتاتے ہوئے انہوں نے ایک دُبلے پتلے اور نڈھال آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ " مختصر یہ کہ یہ جو شخص آپ کو نظر آرہا ہے ۔ یہ اس علاقے کا گورکن ہے اور یہ کئی سال سے بیکار ہے ! "

❊ ❊ ❊

• بیٹے نے اپنے امریکی باپ سے دریافت کیا ۔ " ڈیڈی کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ممی سے آپ کی پہلی ملاقات کب ، کہاں اور کیسے ہوئی تھی ؟ "

باپ نے جواب میں بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا " اس سوال کا تم سے کوئی تعلق نہیں " ۔ پھر کچھ دیر توقف کے بعد باپ نے خود کلامی کے انداز میں کہا کہ " ہاں مجھے یاد ہے تمہاری ممی سے ملاقات کے بعد ، میں نے سیٹی بجانا ترک کر دیا تھا ۔ "

❊ ❊ ❊

• ایک ہی سڑک پر واقع دو حجاموں کے درمیان تجارتی مسابقت نے اشتہاری جنگ کی صورت اختیار کی ۔ ایک نے اشتہار لگایا " ہم صرف ایک روپیہ میں حجامت کرتے ہیں ۔ " تو دوسرے نے بورڈ پر لکھا کہ " ہم صرف پچاس پیسے میں بال بناتے ہیں ۔ " دو گھنٹے کے بعد دوسرے حجام نے ایک اور اعلان کیا " ہم روپیہ والی حجامت کی مرمت کی دیتے ہیں

خرافات

(مراسلے)

★ "شگوفہ" کی صحت اچھی ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا حسن نکھر کر ادارت کی فنی عظمت کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔ اس دورِ کشاکش میں طنز و مزاح کے ایسے موقر رسالے کا باقاعدگی کے ساتھ نکالتے رہنا مدیر کی بے مثل فنی حوصلہ اور ادبی سرگرمی کی ٹھوس دلیل ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی مقالوں، نظموں، اور مضامین کی حسنِ ترتیب ایک عظیم فنکار کے فنی شعور کی بلندی کی دین ہے۔ دعاگو ہوں کہ "شگوفہ" ترقی کی مختلف منازل طے کر کے طنز و مزاح کا سنگِ میل ثابت ہو۔ خدا آپ کے عزم کو استحکام اور حوصلہ کو پختگی عطا کرے۔ آمین!

جوہر سیوانی (بہار)

★ برادرم۔ خلوصِ فراواں — پرچہ برابر مل رہا ہے۔ ہر ماہ مزاح کا اتنا نادر اور اچھوتا خزانہ جمع کرنا پھر بانٹنا یہ آپ کی پرخلوص شخصیت کی محنت و محبت کا نتیجہ ہے۔ خدا کرے سالارِ مزاح اور کاروانِ مزاح ہمیشہ خوش و خرم رہ کر مزاح نوازی سے انسان کو ہنساتے رہیں۔

رؤف خوشتر

★ مکرمی صاحب کمال — سلام تکمیل — ابھی ابھی تازہ "شگوفہ" ملا۔ میں کھانا کھا رہا تھا۔ خوشی سے پیاس اور مسرت سے بھوک جاتی رہی۔ "شگوفہ" کھلا ہے تو پھول بھی ہوگا۔

طارق بشیر، ریاض

★ مصطفیٰ بھائی! آداب!! — تازہ "شگوفہ" اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ خدا اسے نظرِ بد سے بچائے آمین —!

انصاری اصغر جمیل (ناگپور)

★ مکرمی شفیق۔ آداب!

"شگوفہ" کا اکتوبر ۸۱ء کا شمارہ بصیرت نواز ہوا۔ یہ شمارہ ہر لحاظ سے شاندار ہے۔ آپ اور اراکینِ "شگوفہ" واقعی قابلِ مبارکباد ہیں کہ بڑی کامیابی سے شگوفے بکھیرے چلے جا رہے ہیں۔ مشینی دور کے تھکے ہوئے ذہنوں کو شگفتگی بخش رہے ہیں۔ خدا آپ کو اس نیکی کے طفیل جنت عطا کرے۔

یس کے رحمٰن اکولوی

★ "شگوفہ" پابندی سے پڑھتا ہوں۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ یہ مکتوب شکریہ نامہ نہ بن جائے اس لئے مزید شکریہ ادا نہ کرتے ہوئے بس اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ آپکا رسالہ گرانی کے مارے گراں بار ذہنوں کو ایک تبسم عطا کرتا ہے۔ ورنہ تبسم بھی کہاں ملتا ہے۔ کرنل کی سیریز پڑھ کر بس یہی سوچتا ہوں کہ ایک تو پٹھان، اس پر فوجی یعنی "کریلا اور نیم چڑھا" اور اس پر کیا انداز پایا ہے ظالم نے۔ یہ تو صرف سوچ کر رہ جانا پڑتا ہے۔ زبان سے کہتے ہوئے اسلئے ڈرتا ہوں کہ کہیں پٹھانی کا جوش اور کرنلی کا ہوش میرے لئے کورٹ مارشل کا حکم نہ صادر فرما دے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے مضمون "اخبار نویس" کے تعلق سے صرف شوکت تھانوی کا یہ شعر درج کر رہا ہوں ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
جو میں کہنے چلا تھا وہی کہہ گئے اقبال

خیر۔ یہ نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی۔

رحمت اللہ خاں مالوی۔ اکولہ

کاریگروں اور صناعوں کے ساتھ نیا طرزِ سلوک

آندھرا پردیش کئی مشہور دستی مصنوعات کا گھر ہے جیسے بیدری کام کے لئے کئے ہوئے برتن ، نرمل پینٹنگ کونڈہ پلی کھلونے، قلمکاری ، سوزن کاری پیتل برتن ، عطریات اور جڑاؤ کنگن وغیرہ ۔

متذکرہ مصنوعات کی تیاری کے کام میں تقریباً ۶۵ ہزار صناع لگے ہوئے ہیں۔ دستی مصنوعات کو فروغ دینے کے لئے ۲ کروڑ روپے کے سرمایہ سے اسٹیٹ ہینڈی کرافٹ ڈیولپمنٹ کارپوریشن قائم کیا گیا۔ کارپوریشن کی جانب سے ٹریننگ، ڈیزائننگ و مارکیٹنگ ریسرچ کی ضروریات کی تکمیل کرنے کے علاوہ دستی مصنوعات کی تیاری کیلئے درکار بہترین ماہرین کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔

ریاست کے کاریگروں اور صناعوں کی امداد کرنے کیلئے بلند حوصلہ پروگرام تیار کئے جارہے ہیں۔ ہر پنچایت سمیتی میں آرٹیزن کامپلکس قائم کئے جائیں گے جو کاریگروں کی ٹریننگ اور کام کرنے کے لئے درکار ضروری اشیاء کی سربراہی میں مدد دیں گے۔ اس کے علاوہ ۳ منتخب مواضعات میں دیہی کاریگروں کی امداد کے لئے رہائشی اور مصنوعات کی تیاری کے دوسرے مقصد کے لئے ورک شیڈز تعمیر کئے جائیں گے۔ دیہی کاریگروں کو خاطر خواہ مشنری اور جدید آلات کی سہولت مہیا کرنے کے لئے مرکز کے قیام کا منصوبہ بھی بنایا گیا ہے۔

ہر ضلع میں کاریگروں اور صناعوں کے لئے کم سے کم ایک مینی انڈسٹریل اسٹیٹ قائم کیا جائے گا۔ ناریل کے ریشے سے بنائی جانے والی اشیاء کیلئے تقریباً ۸ ہزار افراد کو ٹریننگ دی جائے گی۔ اضلاع مشرقی و مغربی گوداوری اور سریکاکلم میں ۲۱ کوآپریٹیو سوسائٹیاں قائم کی جائیں گی۔ اندازہ ہے کہ ریاست میں ناریل

باقی صفحہ ۵۸ پر

کے ریشے سے ۰۷۴ لاکھ روپے لاگت کی اشیاء تیار کی جائیں گی۔

اس وقت ریاست میں تقریباً ۱۰۳۷۴ کاریگروں کی یونٹیں ہیں جن میں مشغول شدہ سرمایہ یہ شمارہ ۳۲ ۵ ۵ لاکھ روپے اِن یونٹوں سے ۳۹۲۱۷ افراد کو روزگار فراہم ہوا ہے۔

گزشتہ دو برسوں کے دوران کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز بورڈ کی جانب سے ۶۰ ہزار سے بھی زیادہ کاریگروں کی مدد کی گئی ۔ بورڈ نے سال رواں کے دوران اس ضمن میں ۱۴۹ دیہات کا انتخاب کیا ہے جہاں .۱۶۳۱۲ کاریگروں کو امداد دی جائے گی۔ اس مہم میں بینکوں کی شرکت سے ۳۴ لاکھ روپے مشغول کئے جائیں

بید ۔ بمبو ۔ چمڑے اور ریشے سے بننے والی اشیاء کی تیاری، صابن بنانے ، کھانے کی اشیاء محفوظ کرنے کیلئے ویلیج انڈسٹریل یونٹس قائم کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ ایسی ۲۰۰ یونیٹوں کے ذریعہ سے ۰۰۲۴ کاریگروں کو روزگار مہیا ہوگا۔

دستی مصنوعات اور دیہی صنعتوں کی ترقی کے لئے آندھرا پردیش کاریگروں اور صناعوں کی بھرپور کر رہا ہے۔

(جاری کردہ :- محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش)

IPR. 52429 -04- 1.12.81.

5822/68 Postal Regd. No. H. HD-6

SHUGOOFA

opy 12 31 Bachelor Quarters, M.J. Market, Hyderabad-1 Dec. 1981 Phone : 67716

Watch Out

for our

Bumper Issue

of

January 1981

(Price Rs. 5-00 only)